ماہنامہ

پیام تعلیم

دہلی

Accession number 40354
Date 2.2.1975

جلد ۷

شمارہ ۱

ایڈیٹر: محمد حسین حسان ندوی

8V02

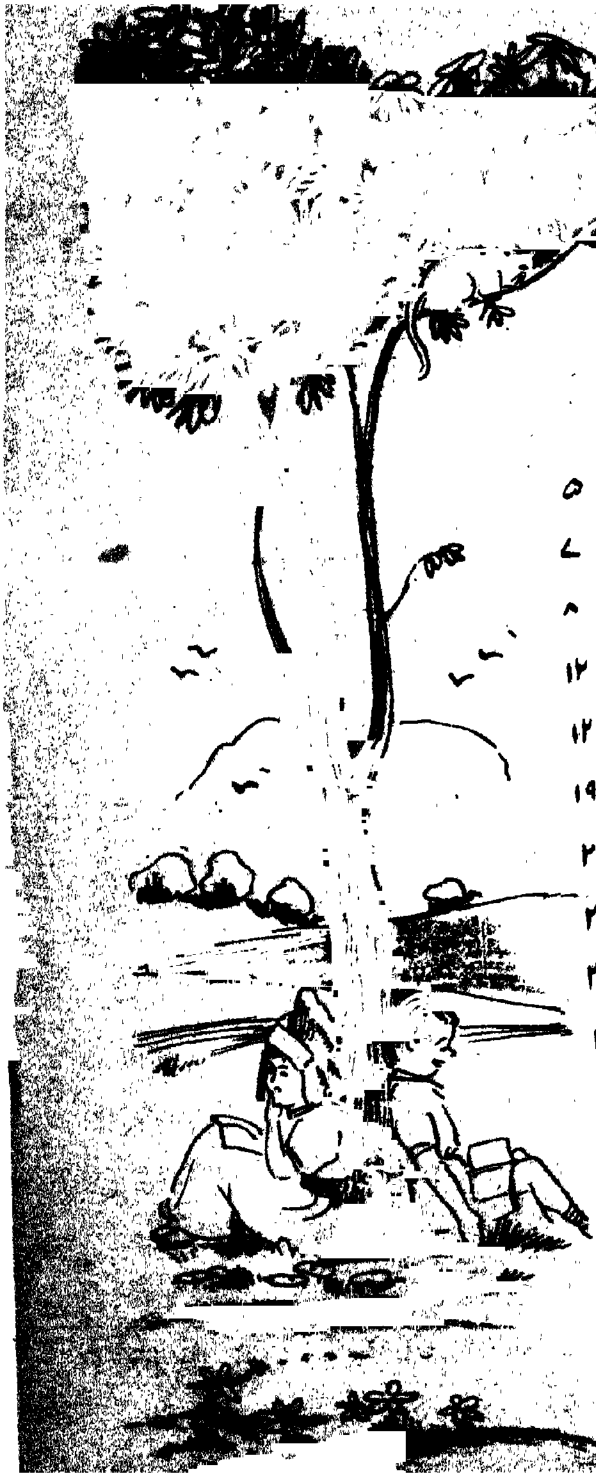
جنوری ۱۹۷۷ء

صدر دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، دہلی ۶
شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳
شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

بچوں کی دل چسپ و مزیدار کہانیاں

چاچا نہرو	۱/-	حضرت امام حسین ع	۲۵/-	تین شہزادے	۲۰/-
اصلاحی کہانیاں	۳۰/-	حضرت امام حسن ع	۲۵/-	جادو کا ہاتھ	۲۰/-
بچوں کی اخلاقی کہانیاں	۴۰/-	حضرت رابعہ بصری رح	۲۵/-	جادو کی بطخ	۲۰/-
بچوں کا ادب	۵۰/۱	حضرت سلمان رضؓ	۲۵/-	جادو کا گھوڑا	۲۰/-
بہادر لڑکا	۴۰/-	حضرت بلال رضؓ	۲۵/-	جادو کا پھل	۲۰/-
ٹیپو سلطان شہید	۳۰/-	حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ	۲۵/-	چڑیوں کی ملکہ	۲۰/-
جنگل کی دنیا	۴۰/-	حضرت فاطمۃ الزہراء خاتون جنت رضؓ	۲۵/-	خوفناک جادوگر	۲۰/-
دل چسپ لطیفے	۳۰/-	ابھرتا سورج	۵۰/-	دیوپیکر پرندہ	۴۰/-
دل چسپ کہانیاں	۳۰/-	زمین کے تارے	۵۰/-	ڈاکٹر بوجھ بجھکڑ	۲۰/-
ڈاکٹر اقبال	۳۰/-	چمکتے موتی	۵۰/-	رحمدل پریاں	۲۰/-
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت	۳۵/-	تین قلندر	۲/-	رستم و سہراب	۲۰/-
ریل کا سفر	۲۵/-	ایک تھی راجکماری	۲۰/-	شیش محل	۲۰/-
سنہری چڑیا	۴۰/-	ایک تھی رانی	۲۰/-	شہزادی بدورا	۲۰/-
کبڑا گھوڑا	۳۰/-	آدم خور زنگی	۳۰/-	شہزادی پری زاد	۲۰/-
مولانا ابوالکلام آزاد	۳۰/-	افراسیاب کی بیٹی	۲۰/-	عراق کی شہزادی	۲۰/-
ننھی منی کہانیاں	۳۰/-	بہادر راجکمار	۲۰/-	لنگڑا دیو	۲۰/-
سرور دوعالم ﷺ	۵۰/-	باغی شہزادہ	۲۰/-	مسٹر عقلمند	۲۰/-
حضرت صدیق اکبر رضؓ	۲۵/-	بے وقوف پریاں	۲۰/-	مغرور شہزادی	۲۰/-
حضرت فاروق اعظم رضؓ	۲۵/-	پریوں کے تحفے	۲۰/-	ہنس مکھ شہزادہ	۲۰/-
حضرت عثمان ذی النورین رضؓ	۲۵/-	پھول شہزادی	۲۰/-	ہیروں کا جزیرہ	۲۰/-
حضرت علی شیر خدا رضؓ	۲۵/-	تیسرا انعام	۲۰/-		

[illegible]



فہرست

بچوں سے باتیں

۱۹۶۹ء صاحب رخصت ہوئے ان کی جگہ نئے سال نے جنم لیا ۱۹۷۰ء صاحب تشریف لے آئے۔ آپ کو سب کو مبارک ہو۔

۱۹۶۹ء صاحب نے بڑی تاریخی حیثیت حاصل کرلی۔ امریکی بہادروں نے دو بار چاند پر اپنے قدم رکھے۔ روسی سائنس والوں نے الگ اپنے کارنامے انجام دیے۔ گورونانک مہاراج کا ۵۰۰ سوواں جنم دن اور باپو کا سوواں منایا گیا۔ خان عبدالغفار خاں صاحب ۲۲ برس بعد ہندوستان تشریف لائے۔

40354

اور آپ کے یہ ۱۹۶۹ء صاحب بہت خونی بھی نکلے۔ ہمارے ساری جامعہ بلکہ سارے ہندوستان کے محبوب ذاکر صاحب اللہ کو پیارے ہوئے۔ یہودیوں نے بہت ہی پاک مسجد مسجد اقصیٰ میں آگ لگا کر ساری دنیا کے مسلمانوں کے دلوں کو تکلیف پہنچائی۔ خود اپنے دیس میں جگہ جگہ دنگے فساد ہوئے۔ بنگال مدھیہ پردیش وغیرہ میں کم تعداد کی قوموں کے ساتھ بہت زیادتیاں کی گئیں۔

حکومت میں [illegible] ہوا اس نے تو [illegible] نے

ساتھ ہی خان عبدالغفار خاں صاحب کا دل بھی توڑ دیا اور ان مظالم کو ان سے چھپانے کی جو گھٹیا اور کمینہ حرکتیں کی گئیں اس سے ان پر اور بھی بُرا اثر ہوا۔ یہ بات ذہن میں رکھیے کہ باپو کا سو سالہ جنم دن منایا جا رہا تھا۔ اور گجرات باپو کا دیس، باپو کی جنم بھومی ہے۔

خیر اب دعا کیجیے کہ ۱۹۷۰ء ہمارے آپ کے لیے خوشیوں کا سال ہو، دیس کا ہر شہری عزت، آبرو، امن و سکون کی زندگی گذارے، دلوں سے نفرت، کدورت دور ہو۔ محبت، شرافت، انسانیت اور رواداری سے زندگی گذارنے کا ڈھنگ آئے۔ آمین۔

آپ کے اس سالنامے کی تیاری کے سلسلے میں بھی ایک خاصی پریشانی رہی۔ اوّل تو کاتب صاحب اور ان کا سارا گھر فلو میں مبتلا ہو گیا۔ دسمبر کا پرچہ اسی پریشانی میں تیار ہوا۔ پھر ہمارے محترم منیجر صاحب نے جھرجھری لی۔ وہی فلو۔ میری صحت اس عرصے میں کافی ڈانوا ڈول رہی۔ اور آخر آخر میں فلو کا شکار ہو گیا۔

ہمارے مضمون نگار بزرگوں اور دوستوں نے

بھی اب کے نہ جانے کیوں کہانیاں، مضمون اور نظمیں بھیجنے میں دیر کر دی۔ بعض حضرات نے تو اس وقت کرم فرمایا جب وہ کاپیاں پریس جا چکی تھیں۔

باوجود اس کے تیاری کا سلسلہ برابر جاری رہا اور آپ اپنے سالنامے کی مجلس کو دیکھیے۔ پروفیسر اکبرالدین صدیقی۔ جناب رام لال۔ جناب ستیش بترا، جناب ڈاکٹر کیول دھیر، جناب فراق گورکھپوری، جناب ابوتمیم فریدآبادی، جناب رتایا، یوسف ناظم، جناب مرزا شکور بیگ، مولانا عبدالسلام قدوائی، محترمہ رضیہ سجاد ظہیر، جناب محمد عثمانی۔ مولانا مقبول احمد سیوہاروی۔ جناب خالد عرفان، محترمہ آصفہ مجیب، محترم غلام ربانی۔ جناب غلام یزدانی، جناب اظہر افسر، جناب شانتی رنجن بھٹاچاریہ۔ جناب سبط حسن، قیصر سرمست، سلیم تمنائی۔ فرحت قمر وغیرہ۔ شاعروں میں حضرت ساحر بھوپالی، حرمت الاکرام، خورشید جامی، سعادت نظیر، بزمی بھارتی۔ واحد پریمی، علقمہ شبلی، پروفیسر ظفر، عادل جعفری وغیرہ۔ سبھی اچھے اچھے مضمون نگار اور شاعر نظر آئیں گے۔

محترم رام لال صاحب نے نہ صرف اپنا لکھا ہوا خاکہ مرحمت فرمایا بلکہ حضرت فراق صاحب کے ایک مضمون کا ترجمہ بھی کر کے بھیجا، بھلا فراق صاحب ایسی چیزیں بھی لکھ سکتے ہیں جو بچوں کے لیے دلچسپ ہوں۔ یہ ہمارے لیے انکشاف

محترمہ رضیہ صاحبہ اور جناب اقبال متین صاحب کی کہانیاں بالکل آخر میں ملیں۔ مجبوراً انھیں آخر میں جگہ دینی پڑی۔ اس طرح کی اونچ نیچ آپ کو پورے رسالے میں ملے گی۔ اس کی وجہ ہم آپ کو بتا چکے ہیں۔

...ول کے علاوہ معلوماتی مضامین بھی آپ کو کافی نظر آئیں گے تاریخی بھی سائنسی بھی۔ اور بھئی منھ کا مزہ بدلنے کے لیے مزاحیہ بھی۔ اب آپ انھیں پڑھیے اور اپنی رائے ہمیں بتائیے۔ یہ نیا سال اور سالنامہ دونوں آپ کو مبارک۔

ہمارے پاس محترم شفیع الدین نیر صاحب، جناب کوثر اعظمی کی نظمیں اور رشید الوحیدی صاحب کا مضمون، یہ سب سالنامے کے لیے آیا تھا مگر یہ تینوں چیزیں ہر پھر کے ذاکر صاحب سے متعلق ہیں۔ فروری میں ذاکر صاحب کا یوم پیدائش ہے اس لیے یہ تینوں فروری کے پرچے کی زینت بنیں گی۔

جامعہ کی پچاس سالہ جوبلی اسی سال آخری مہینوں میں منائی جائے گی۔ جوں جوں وقت قریب آ رہا ہے کارکنوں کا جوش بڑھتا جا رہا ہے۔ جامعہ کی بڑی مسجد کی بنیادیں بھر گئی ہیں۔ اس کے پاس ہی کتب خانے کی عمارت بن رہی ہے مسجد اور جشن جوبلی کے چندے کے سلسلے میں جگہ جگہ وفد بھیجے جا رہے ہیں۔

جناب علقمہ شبلی

سالِ نو ہمارا ہو



آؤ ہاتھ اٹھائیں ہم
ہم کہ رنگیں غنچے ہیں
گلشنِ تمنا کے
ہم کہ ننھے تارے ہیں
رنگ و بو کی دنیا کے
ہم کہ دل کش نغمے ہیں
آرزو کی بینا کے

ہم دعا مانگیں
اس اندھیری دنیا کو
روشنی کی دولت دے
جن دلوں میں نفرت ہے
ان میں تو محبت دے
اے خدائے خشک و تر
تو ہمیں مسرت دے

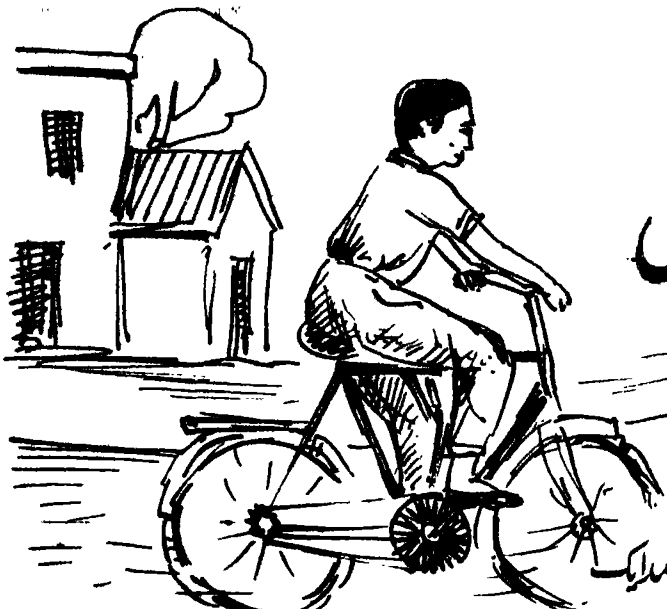
ہے نمونہ دوزخ کا
جن "بڑوں" سے یہ دنیا
ان "بڑوں" کے دل میں دے
درد سارے انساں کا
جذبۂ محبت کو
عام کردے اے مولا



پھول، چاندنی، نغمہ
ہر کسی کا حصہ ہو
ہو ہنسی ہر اک لب پہ
درد و غم فسانہ ہو

جناب رام لعل

انکل جولی



ہماری کالونی میں انکل جولی کی آمد ایک اوتار سے کم نہیں تھی۔ لیکن اس بات کا احساس ہمیں اس دن ہوا جب وہ ہم سب سے روٹھ گئے۔

دو سو کے قریب گھر۔ شہر سے سات میل دور۔ شاہراہ سامنے سے گذرتی تھی۔ دوسرے شہروں کو جانے والے اور وہاں سے آنے والے سینکڑوں ٹرک، موٹریں اور بسیں ہر وقت چلتی رہتی تھیں۔ لیکن نہیں آتی تھی تو صرف سٹی بس! ایسا لگتا تھا ٹرانسپورٹ ِ وبھاگ کو ہماری کالونی کے وجود کا علم ہی نہیں تھا۔ اُن کے نقشے پر ہماری کالونی کے وجود کو ثابت کر دینے کا سہرا انکل جولی کے سر پر بندھا تھا۔ یہ کارنامہ انھوں نے ہماری کالونی میں آکر بسنے کے دو مہینے کے اندر ہی انجام دے دیا تھا۔ لیکن یہ بھی ایک تلخ حقیقت تھی کہ دو مہینے تک تو کالونی والوں کو انکل جولی کے ہی وجود کا احساس نہیں ہو سکا تھا۔

یہ بات تو سب کو معلوم ہو گئی تھی کہ کوئی

آ بسے ہیں۔ مارکیٹ میں ایک دکان اور اس کے اوپر والے فلیٹ کو الاٹ کرایا ہے۔ دکان کا نام رکھا ہے "جولی اسٹورز" اور لکڑی کے تختوں اور الماریوں پر ہوزری، صابن، تیل، کاپیاں، پنسلیں اور کئی دوسری چیزیں رکھ دی گئی ہیں لیکن اس قسم کی دکانیں تو اور بھی کئی تھیں۔ کسی نے خاص نوٹس نہیں لیا۔ کسی نے ان کی طرف دھیان دیا۔ کسی نے نہیں دیا۔

ایک دن کالونی کے کچھ بچے بہت خوش خوش گھر لوٹے۔ سب کے ہاتھ میں دو دو ٹافیاں تھیں۔ معلوم ہوا جولی اسٹورز کے مالک نے انھیں مفت دی ہیں۔ اب کیا تھا۔ ان کی دکان پر بچوں کی بھیڑ رہنے لگی۔ جیسے اسکول کی کاپی، کتاب یا پنسل وغیرہ کی ضرورت پڑتی وہ اُسی دکان کا رخ کرتا۔ ممی یا ڈیڈی کو انگلی سے پکڑ کر وہاں لے جاتا۔

ضرور معنت ملے گی۔ بچّوں نے ان کا نام انکل جولی رکھ دیا تھا۔ ان کا اصلی نام معلوم کرنے کی کسی نے بھی ضرورت محسوس نہ کی اب تو بڑے بھی ان کو اسی نام سے پکارنے لگے۔ وہ کبھی بُرا نہیں مانتے تھے۔

بعد میں معلوم ہوا انھوں نے بچّوں کو خود ہی اپنا یہ نام بتایا تھا۔ اگر یہ سچ تھا تو ان کی شخصیت کا یہ پہلو بہت دل چسپ تھا۔ اجنبی لوگوں میں پہچانے جانے کی خواہش کس میں نہیں ہوتی! پہچانے جانے سے مراد وہ ناجائز شہرت نہیں ہے جس سے بعض اوقات ایسے لوگوں کا دامن بھر جاتا ہے جو اس کے قطعاً حق دار نہیں ہوتے۔ انکل جولی تو اس قابل تھے کہ انھیں زیادہ سے زیادہ لوگ جانتے اور ان کی عزت کرتے۔

انکل جولی کو دیکھنے کے بعد دو باتیں خاص طور پر سمجھ میں آئیں۔ آدمی میں مشہور ہونے کے لیے پہلی بنیادی خوبی یہ ہونی چاہیے کہ اُس کا قد یا تو بہت لمبا ہو یا پھر بہت ہی چھوٹا۔

فلیپائن کے مسٹر رڈمولو نے اپنے چار فٹ قد کے بارے میں ایک بار اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا تھا چھوٹے قد کا آدمی اگر معمولی قسم کا کوئی آرٹیکل کسی اخبار میں چھپوا لیتا ہے تو وہ لمبے سے لمبے آدمی سے بھی زیادہ اہمیت حاصل کر سکتا ہے جو اس سے بہتر اچھا آرٹیکل لکھ لیتا ہو۔

پہلے مسٹر رڈمولو کا بیان کیا ہوا ایک لطیفہ بھی سنا تا چلوں۔ ایک بار وہ مداری والے کا تماشا دیکھنے کے لیے ایک بستر میں گھسے تو اوپر سے ایک لمبے آدمی نے ان سے پوچھا "کہو برخوردار نیچے موسم کیسا ہے؟" اس پر سارے لوگ جو وہاں جمع تھے زور سے ہنس پڑے۔

ہمارے انکل جولی کا قد بھی چار فٹ سے زیادہ نہیں تھا۔ بچوں کی بھیڑ میں بھی بالکل کھو جاتے تھے۔ پچپن سال کی عمر میں بھی نوجوانوں کے سے دم خم سے سائیکل چلاتے تھے۔ لیکن جس وقت سائیکل پر سوار ہوتے یا اس پر سے اترتے تھے۔ وہ نظارہ بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ بچے تو خاص طور پر یہی دیکھنے کے لیے تاک میں لگے رہتے تھے اور خوب ہنستے تھے۔ وہ کود کر سوار ہوتے اور کود کر ہی سائیکل پر سے اترتے تھے۔

میں نے شروع میں ہی بیان کر دیا تھا کہ انکل جولی کا ہماری کالونی میں پہلا کارنامہ وہاں تک سٹی بس لے آنے کا تھا۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے آتے ہی لوکل اخباروں میں کئی خطوط چھپوائے تھے۔ اور سب کے سب انکل جولی کے نام سے۔ اسی لیے وہاں کے لوگوں نے بھی اُن کی طرف بڑی حیرانی سے دیکھا۔ یقین نہیں آتا تھا اتنا چھوٹا سا آدمی اس قدر بڑا کام کیسے کر سکتا ہے!

کے لیے انکل جولی نے دو روزانہ اخبار منگانے شروع
کر دیئے۔ لوگ صبح سویرے سڑک پار کے گاؤں میں
دودھ لینے جاتے تھے جب لوٹتے تو انھیں جولی اسٹورز
کے سامنے ایک تخت پر اخبار پڑے ہوئے نظر آجاتے۔
اخبار پر ایک نظر ڈال لینے کے لیے وہ دو چار منٹ
کے لیے ضرور رک جاتے تھے۔

پتہ نہیں کونسی گھڑی میں انھیں ٹیلیفون
لگوانے کا بھی خیال آگیا جس روز ان کی دکان پر فون
فٹ ہوا انھوں نے لوگوں کو بلا بلا کر مفت کال کرنے
کی دعوت دی۔ جو لوگ دفتروں میں کام کرتے تھے
انھیں اپنا نمبر نوٹ کرا دیا تاکہ وہ دفتر سے اُسے فون
ضرور کریں۔

ٹیلیفون کی وجہ سے انکل جولی کی مقبولیت
بہت بڑھ گئی۔ اب تو ہر شخص خود ہی ان کے ساتھ
راہ و رسم رکھنے کی فکر میں رہنے لگا۔ اس علاقے میں
انکل جولی کے فون کے علاوہ دور دور تک کسی کے
یہاں فون نہیں تھا۔ ضرورت مند اکثر و بیشتر انھیں
شہر سے فون کر کے اپنے گھروں یا واقفکاروں
کے پاس پیغام بھجوا دیتے تھے۔ انکل جولی بہت
خوش ہو کر یہ خدمت بھی انجام دیتے۔ اپنی دکان
چھوڑ کر بھاگے بھاگے جاتے اور پیغام پہنچا آتے
تھے۔ کبھی کبھی تو انھیں سڑک پار کر کے گاؤں میں بھی
جانا پڑتا۔ لیکن اس خدمت کے صلے میں انھیں کئی
بار نقصان بھی اٹھانا پڑا۔ ان کی غیر موجودگی میں کسی

نے ان کے روپے صاف کر لیے کسی نے دوسری چیز لے لی
لیکن وہ یہ صدمہ بھی برداشت کر گئے۔ ماتھے پر بل نہ
آنے دیا۔

جو لوگ ان کے پاس پڑوس میں تھے زیادہ تر
انہی کے فون آتے تھے۔ انھیں بلانے کے لیے
دکان چھوڑنے سے بچنے کے لیے انھوں نے ایک
نیا طریقہ نکال لیا۔ ان سب کے گھروں میں بجلی کی
گھنٹیاں لگوا دیں۔ ان کی دکان پر کم سے کم بیس سوئچ
لگ گئے۔ ہر سوئچ کے اوپر ایک نیم پلیٹ تھی معلوم
ہوتا تھا ان کی دکان نہ ہو کوئی انفارمیشن سینٹر ہو۔
انفارمیشن سینٹر ہی کہا جائے تو مناسب ہوگا کیونکہ
ان سب کے بارے میں جن کی نیم پلیٹیں اور کال بیل
کے سوئچ لگے ہوئے تھے۔ انکل جولی کے پاس آکر
ہی پوچھتے تھے۔

اس کالونی میں اُن کا آخری کارنامہ پنچایت
کا الیکشن تھا۔ وہاں پنچایت قایم کرنے کے لیے بھی
انھوں نے ہی کاغذات منظور کرائے تھے۔ جب
الیکشن ہونے کا وقت آیا تو انھیں پورا یقین تھا کہ
وہ بلا مقابلہ پنچ چن لیے جائیں گے۔ لیکن یہ ان کی
خوش فہمی تھی۔ زمانہ بلکہ کالونی اتنی آگے بڑھ چکی تھی کہ
پنچ بن جانے کے لیے چار درجن امیدوار اکھاڑے میں
کود پڑے۔ الگ الگ سیاسی پارٹیوں کے جھنڈے
لے کر۔ جن پارٹیوں کا پہلے کبھی نام تک نہیں سنا
[illegible]

اگرچہ انکل جولی نے بھی اپنی دکان کے سامنے اپنے ہاتھ سے لکھا ہوا اپنے امیدواری کے سلسلے میں ایک نوٹس لگا دیا تھا۔ لیکن کوئی اس کے متعلق ان کے ساتھ گفتگو نہیں کرتا تھا جن لوگوں کے فون پر آئے ہوئے پیغام لے کر انکل جولی بھاگے بھاگے جاتے تھے۔ وہ کسی نہ کسی پارٹی کا جھنڈا اٹھا کر نعرے لگاتے ہوئے جولی اسٹورز کے سامنے سے نکل جاتے تھے لیکن کوئی بھول کر بھی انکل جولی زندہ باد کا نعرہ نہیں لگاتا تھا۔

کچھ بچوں نے چاہا کہ انکل جولی انھیں اپنا جھنڈا اور بورڈ بنوا کر دیں تاکہ وہ بھی دوسروں کی دیکھا دیکھی ان کے حق میں پرچار کریں لیکن انکل جولی نے آنکھوں میں آنسو لا کر انھیں منع کر دیا۔ بچوں کو ٹافیاں بانٹ کر واپس بھیج دیا۔

انکل جولی کو اب بھی پوری امید تھی کہ انھیں ضرور چن لیا جائے گا۔ انھیں اپنی خدمات پر پورا بھروسا تھا۔ لیکن وہی ہوا جو اکثر خدا کے سادہ لوح بندوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ انھیں ایک بھی ووٹ نہیں ملا۔ وہ بہت ہی شکستہ دل ہو کر دوسرے دن کالونی سے چلے گئے۔ اپنی دکان اونے پونے دام بیچ گئے۔ جولی اسٹورز کا سائن بورڈ ہمیشہ کے لیے غائب ہو گیا۔ جیسے [illegible] کے سامنے چار [illegible] کے ایک [illegible] اور شفیق بزرگ کا سراپا آنکھ [illegible]

نہیں ہے۔ ان کی غیر حاضری کو سب سے زیادہ بچوں نے محسوس کیا جو اسکول جاتے اور واپس آتے وقت ان کی دکان کی طرف ایک نظر ضرور دیکھ لیتے ہیں۔ اب ایک بنیے نے اپنا کاروبار شروع کر رکھا ہے۔

آج ہماری کالونی بہت ترقی کر چکی ہے۔ اب یہاں گھر گھر میں ٹیلی فون ہیں۔ بہت صبح سے رات گئے تک سٹی بسیں دوڑتی رہتی ہیں۔ سینما، کالج اور کھیل کے کئی میدان ہیں۔ یہ کالونی اب شہر کا ایک حصہ بن گئی ہے۔ بلکہ شہر کی بڑھتی ہوئی آبادی نے سات میل دور آکر ایک اژدہے کی مانند چھوٹی سی کالونی کو ہڑپ کر لیا ہے۔ یہاں کسی کو یاد بھی نہیں رہا کہ کبھی یہاں کا باہر کی دنیا سے ہمارا پہلا رشتہ ایک شریف بھولے بھالے انسان نے جوڑا تھا۔ رشتہ جو بلاشبہ زندگی کا ہی رشتہ تھا۔ بھرپور، جوشیلی اور مسلسل آگے بڑھتی ہوئی زندگی کا جس کے تند و تیز دھارے کے ساتھ ساتھ ہم بہتے چلے جا رہے ہیں۔

(آگے کی فکر کا بقایا)

سوداگری اس بات سے لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں اور ان کے سامنے کامیابی کا صحیح راستہ کھل گیا اور انھیں نظر آیا کہ ماضی کی یاد مستقبل کی ضامن نہیں بن سکتی۔ خدا نے آنکھیں دی ہیں کہ آگے دیکھا جائے۔ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے رہنے میں گردن [illegible]

جناب حرمت الاکرام

یہ موسم







پھر آیا جاڑوں کا موسم
پھر آیا جاڑوں کا موسم
پنکھوں سے منہ موڑا سب نے　　آگ سے رشتہ جوڑا سب نے
صحنوں، دالانوں کو تج کر　　جا پہنچے کمروں کے اندر
ختم ہوا شربت کا زمانہ　　بھولا، روح افزا کا فسانہ
برف نے کر دی محفل خالی　　سامنے آئی چائے کی پیالی
کافی بولی، کیا میں ہوں کم؟
پھر آیا جاڑوں کا موسم

شبنم نے دکان سجائی　　کہرے نے چادر پھیلائی
دھوپ کا پیار دلوں میں جاگا　　سایہ ڈھونڈھے کون ابھاگا
کھیلوں کے شیدائی بھڑکے　　میدانوں میں پہنچے لڑکے
بلّے نکلے، گیندیں اچھلیں　　کھٹ کھٹ کی آوازیں گونجیں
کرکٹ نے چھیڑا ہے سرگم
پھر آیا جاڑوں کا موسم

سوئٹر، کوٹ، دوشالے نکلے　　چسٹر کالے کالے نکلے
کاندھوں پر کمبل لہرائے　　رنگ لحافوں نے دکھلائے
گنّوں نے ساغر چھلکایا　　سرسوں نے سونا بکھرایا
چھیڑی چنے نے کیا شہنائی　　دھوم مٹر پھلیوں نے مچائی
یہ ہے گاجر وہ ہے شلجم
پھر آیا جاڑوں کا موسم



جناب ابوتمیم فریدآبادی

شکار ہم بھی کھیلے تھے جناب!

غازی صاحب، میرے بچپن کے دوست تھے جنگلات کے محکمے کے افسر بنتے ہی موٹے بھی ہوگئے اور تکلیف دہ بھی جس زمانے میں وہ دیودون میں افسر جنگلات تھے۔ خط پہ خط لکھ کر مجھے سیر کرانے کو بلایا۔ میں نہیں جانا چاہتا تھا مگر گیا۔

دعا سلام کے بعد ہی کہا "بولو شکار کرو گے؟"

میں نے کہا "مجھے پانی پلواؤ۔"

چھدا خاں، ان کا سرکاری ملازم پانی کا گلاس لے کر آگیا۔

غازی صاحب نے پھر وہی سوال دہرایا۔

"کیا ارادہ ہے؟ شیر مارنا چاہتے ہو؟"

اس مرتبہ میرا حلق خشک نہیں ہوا۔ بدن میں تھرتھری سی پیدا ہوئی۔ "ابھی میں تو لیٹوں گا۔ بہت تھک گیا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔

دراصل میں اپنے دل کی بات ان سے کہنا نہیں چاہتا تھا اس لیے کہ ایک تو ان سے عمر

فٹ اونچا تھا۔ اب ان سے یہ کہتا کہ شیر کے نام سے مجھے کپکپی آرہی ہے۔ تو وہ یقیناً میرا مذاق اڑاتے۔ سوائے شکار کے میں ان سے کسی بات میں ہیٹا نہ تھا۔ مثلاً دوڑ، کشتی، کبڈی یا تیراکی میں۔

جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے یہ ایک ڈاک بنگلہ تھا۔ نہایت گھنے جنگل کے بیچ میں جہاں کوسوں کوئی آبادی نہ تھی۔

دوسرے ہی دن شام کی چائے پی کر غازی صاحب نے "ٹہلنے" کی تجویز کی، اور میرے انکار کے باوجود میرا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور چل پڑے چھدا خاں نے دوڑ کر غازی صاحب کو رائفل دی اور دونال بندوق، اس کے کارتوس چھدا نے حوالے کیا۔

میں نے کہا "ارے، یہ بوجھ؟ کیا فائدہ۔"

چھدا نے کہا "حضور کچھ مل جائے تو شکار کیجیے گا۔ (غازی صاحب سے) حضور رائفل تو دیجیے"

میرے جواب دینے سے پہلے غازی صاحب

ابھی ہم جنگل کی ایک کچی سڑک پر چلتے ہوئے چند فرلانگ طے کرنے پائے تھے۔ کہ غازی صاحب نے ایک دم اپنی بات ادھوری چھوڑتے ہوئے کہا۔

"مارو میاں مارو، کرو فیر"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سب طرف گھنا جنگل، آدم نہ آدم زاد۔ چڑیا کی آواز تک نہیں۔

"ٹھہرو جی، چلے جا رہے ہو۔ وہ اُڑ جائیں گی"

"کیا اُڑ جائیں گی؟"

"دیکھتے نہیں وہ سامنے مرغیاں۔۔۔۔"

سڑک کے ایک کنارے پر دس بارہ مرغیاں، چوزے سے بڑی، انڈے دینے والی مرغی سے چھوٹی۔ چُگ چَر رہی تھیں۔ قریب ہی ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔۔۔ "ان کو ماروں؟ میں کوئی پاگل ہوں"

"ارے میاں ان کا بڑا لذیذ گوشت ہوتا ہے۔ لگاؤ نشانہ۔ بحث کی کیا بات ہے"

بحث کی یہ بات تھی کہ میں ان کو پالتو مرغیاں سمجھ رہا تھا۔ اور چوں کہ ایک جھونپڑی قریب ہی تھی۔ اس لیے یقین تھا کہ مرغیاں جھونپڑی والے کی ملکیت ہوں گی۔ یہ بات تو غازی صاحب نے بعد میں بتائی کہ یہ ایک فارسٹ گارڈ (جنگل کا پہرے والا) کی جھونپڑی تھی۔ میں اپنی دھن میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ اور وہ کہتے رہے۔

"کیا غضب کرتے ہو۔ اچھا تم یہ رائفل لو۔

"بالکل نہیں"

مجھے اس وقت بچپن کا قصہ معاً یاد آ گیا تھا۔ بچپن کیا بس یہی سترہ اٹھارہ سال کی عمر کا۔ جب ہمارے بھائی صاحب کسی پنچایت میں سو پچاس میل کے سفر پر جاتے۔ تو ہم ان کی دونالی بندوق لے کر نکلتے تھے یعنی چوری سے۔

ایک دن یہی مسٹر غازی اور ایک اپنی عمر کا تگڑا دیہاتی "چھوٹا" نامی ساتھ تھا۔ بندوق میرے کندھے پر تھی۔ قصبے سے دو ڈھائی میل کے بعد ہی ایک ہرن خالی کھیت میں چرتا نظر آ گیا۔ غازی صاحب بلبلا کر بولے "یارا داؤں کرو۔ اس منڈیر کے پیچھے جا کر کیکر کے درخت کی اوٹ سے فیر کرو۔ دھرا رکھا ہے"

میں نے یہی کیا۔ دبکتا دبکتا کیکر کے درخت تک پہنچ گیا۔ اب ہرن بہ مشکل بیس گز کے فاصلے پر تھا۔ میں نے احتیاطاً پلٹ کر اپنے ساتھی شکاری کی طرف دیکھا۔ یہ معلوم کرنے کو داغوں یا آگے بڑھوں۔

غازی صاحب نے دانت کچکچا کر اشارہ کیا کہ داغو۔

میں نے بندوق میں کارتوس بھرا۔ اس میں دو چار سکنڈ تو لگ ہی گئے ہوں گے۔ سوچا اپنے دوست کی رائے ایک مرتبہ مزید لے لی جائے۔ تو مناسب ہوگا۔ یہ پلٹ کر دیکھا۔

غازی صاحب نے وہیں سے اپنی پاتھ

لبلبی دبائی جاتی ہے۔ بات صاف تھی۔ وہ گویا کہہ رہے تھے کہ فیر کرو۔ اب میں نے بندوق کندھے پر رکھی۔ ہرن نے میری طرف دیکھا، آنکھیں چار ہوئیں۔ نہ دوڑا، نہ اچھلا بلکہ پالتو کتے کی طرح اپنی ننھی سی دم ہلانے لگا۔ ایسا منظر میں نے کسی شکار میں نہیں دیکھا تھا۔ ہرن ہمیشہ شکاری کو، بلکہ سفید پوش کو دیکھ کر چوکڑی بھرتا ہے۔ یا سرپٹ دوڑتا ہے۔ مگر یہ کیسا ہرن ہے کہ مجھے گھور رہا ہے۔ میں نے سوچا ایک مرتبہ پھر غازی سے مشورہ کر لیا جائے۔ پلٹا اُن کو دیکھا۔ وہ اور چھوٹا، دونوں مٹھیاں بھینچ کر سگنل دے رہے تھے کہ جلدی کرو۔

"آخاہ" میں نے دل میں کہا "حقیقت میں یہ دونوں بے خبر ہیں بات کھول دینی چاہیے" چنانچہ میں نے بآواز بلند کہا "ارے میاں یہ بھاگتا کیوں نہیں"۔

غازی صاحب نے دانت کچکچا کر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں سے لبلبی دبانے کی نقل کی چھوٹا بھی اسی قسم کے اشارے کر رہا تھا کہ فوراً فیر کر دیا جائے۔

میں نے سوچا کہ دو دوستوں کو مایوس کرنا مناسب نہیں چنانچہ پھر زور کی آواز میں کہا "اچھا بھئی، یوں تو یوں ہی سہی"۔

دونوں نے اس مرتبہ ہاتھ جوڑے مطلب یہ تھا کہ خدا کے واسطے جلدی کرو۔

میں نے اسی بلند آواز میں کہا "ٹھیک کام ہے"

اب میں نے شست باندھی اور بڑی بوڑھی عورتوں کے مقولے کے مطابق عمل کیا یعنی خاصی اونچی آواز میں کہا "کوئی جن وِن ہو تو سامنے سے ہٹ جائے۔ مرنے مرانے کا میں ذمہ دار نہیں"

اب میں نے ذرا انتظار کیا۔ یہ دیکھنے کو یہ اگر جن ہے تو چل پڑے گا۔ یا سانپ بن جائے گا۔ (جیسا کہ دادی اماں سے سنا تھا) مگر نہ وہ سانپ بنا نہ وہاں سے ٹلا۔ بلکہ مجھے مسلسل گھورتا رہا۔

"تیری ایسی کی تیسی" موت کے بکرے تو لے یہ کہہ کر، اب بھی میں نے اس کو موقع دیا تھا کہ ٹل جائے مگر وہ نہ ٹلا لبلبی دبائی۔ دھماکے سے سنسان جنگل گونجا اور ہرن وہیں تڑپنے لگا۔

غازی اور چھوٹا پوری رفتار سے اس کھردرے کھیت میں دوڑ لگاتے ہوئے میرے پاس پہنچے اور کہا "چاقو نکالو"

"چھوٹے" نے اس کی ٹانگیں پکڑیں۔ غازی نے تھوتھنی۔ میں نے ذبح کرنے کا قصد کیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ اس کی گردن میں ایک چمڑے کا پٹہ ہے۔ اور پٹے میں ایک چھوٹی سی گھنٹی لٹک رہی ہے۔

"ابے مار ڈالا۔ یار یہ تو پالتو ہے"

"تم ذبح کرو"

ذبح کیا چمڑے کے پٹے کو کاٹا۔ اس کے

گلے

سب احتیاطی تدابیر اس لیے کیں کہ آس پاس ہندو گوجروں کے گاؤں تھے۔ اندیشہ تھا کہ اگر پٹے والے جانور کا شکار ہوتا وہ دیکھیں گے تو فساد کریں گے۔۔۔۔

۔۔۔۔ قصہ تو بہت لمبا ہے مگر میں اسے یہیں ختم اس لیے کرتا ہوں کہ آپ کو دہرہ دون کے جنگل میں شکار کھلانا مقصود ہے۔

تو صاحب مرغیوں کو چگتا دیکھ کر مجھے ہرن کا شکار یاد آ گیا تھا۔ غازی صاحب بندوق مانگتے۔ بلکہ بڑی التجائیں کرتے رہے اور میں انکار کرتا رہا۔ دو چار قدم ہی آگے بڑھے تھے کہ ان مرغیوں نے کمال کر دیا۔ یعنی ہیلی کوپٹر کی طرح اس مقام سے ایک دم اوپر اٹھیں اونچے اونچے دیار کے درختوں کو پار کرتی ہوئی یہ جا، وہ جا۔

اب تو میں شرمندہ ہوا۔ واقعی یہ تو جنگلی مرغیاں تھیں۔ غازی صاحب نے میرے بڑے پن کی پرواہ نہ کرتے ہوئے مرغیوں کے اڑتے ہی کہا۔ "یار بالکل چغد ہو" ان کو واقعی سخت غصہ آ رہا تھا۔

اس جنگل یعنی ڈاک بنگلے سے دس میل کے فاصلے پر ایک دکان گوشت والے کی تھی۔ غازی صاحب اور ان کے ملازمین انھیں مرغیوں سے اپنا پیٹ بھرتے تھے۔ ایسا تر لقمہ ہاتھ سے جاتا دیکھ کر غازی صاحب کو ملال ہونا قدرتی بات تھی۔

" انہہ۔ سروتے کیوں ہو جب اس جنگل میں

اس مصالحانہ بات کا غازی صاحب نے نہایت دل خراش جواب دیا۔

"تو آپ ان کو بھی اُڑا دیں گے۔ اِدھر دیجیے بندوق یہ رائفل تھامیے"۔

غازی صاحب کھانے پینے کے معاملے میں بہت بلانوش تھے۔ میں سمجھ گیا کہ ان کا غصہ حق بجانب ہے۔

"لو بھائی لو، بندوق اور رائفل دونوں ہی تم لادو"

وہ ایسے بگڑے ہوئے تھے کہ یہ بات بھی مان گئے۔ میں ہلکا پھلکا رہ گیا۔

باتیں کرتے کرتے، بچپن کے بعد کے واقعات کہتے سنتے ہم بڑھے ہی چلے گئے۔ اس بات کا اندازہ ہی نہیں کیا کہ سورج کہاں ہے؟ ہم کتنی دور آ گئے ہیں حتیٰ کہ اب ہم کو دو گز آگے کی کوئی شے نظر نہیں آ رہی تھی۔

" واپس چلو۔ تم نے شکار میں کر کے ہماری شام تباہ کر دی"۔ یعنی غازی صاحب کا غصہ پھر عود کر آیا تھا۔

واپس ہوئے۔ کالج کے زمانے کا قصہ ادھورا رہ گیا تھا۔ میں نے شروع کر دیا۔ میں اپنی کہانی سنا تا، ان کو ہنساتا جا رہا تھا کہ دفعتہً مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی شے سامنے، دو تین گز کے فاصلے پر

رہر اسے محسوس ہوئی اور غازی صاحب کو دیکھا
،وہ رائفل جو ہاتھ میں تھی، پھینک کر بندوق چھینا
لئے ہیں۔

"ڈن۔ ڈن" انھوں نے چار نمبر کے دونوں
رتوس چلا دیے۔ ایک گٹھڑی سی اچھلی یا کیا ہوا کہ
ری صاحب نے بندوق پھینک کر پھرتی سے رائفل
الی اور چٹ چٹ کے بعد "چڑاخ" کی آواز گونجی۔
یہ سب بہ مشکل پانچ یا چھے سکنڈ کے عرصے میں
یا، میں جو ان تمام واقعات سے تقریباً بے خبر تھا
ا پڑا۔ "میاں کیوں کارتوس خراب کر رہے ہو"
فقرہ ختم نہیں ہوا تھا کہ دوبارہ چٹ چٹ اور
اخ" سے رائفل بولی۔

رائفل کا دوسرا فیر کر کے غازی نے اتنا گہرا
نس لیا گویا دو میل کی دوڑ جیت کر پہنچے ہیں۔ اب
سے مخاطب ہوئے۔

"شکر ہے میاں ستوں چتوں، دیکھ رہے ہو یہ کیا ہے؟"
اب جو میں نے آنکھیں پھاڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی
رمرا پڑا تھا۔ بے اختیار کہا "یہ موت کا بکرا کہاں
آگیا؟"

غازی بولے "موت کا بکرا نہیں ہے بیموت
[illegible] تیندوا۔"

اس [illegible] کے باوجود میرے ہاتھ پیر
[illegible] تیندوا؟ تیری دم میں نمدا۔"

چل پڑے۔ میں بھی گھسٹا۔ قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جسم
کے رونگٹے جھوڑ رہے تھے۔ بولنا چاہتا تھا۔ الفاظ لبوں
پر نہیں آرہے تھے۔ اس وقت دماغ میں صرف یہی
تصور تھا کہ تقریباً ایک گز کے فاصلے پر ہماری موت
رہ گئی تھی۔ صرف ایک گز۔ بندوق کے دو فیر جب ہوئے
یہ خون خوار جانور پانچ فٹ کے فاصلے پر ہوگا۔ اس کے
اچھلنے سے یہ فاصلہ مزید کم ہوگیا تھا۔ ابھی ہم نصف راستہ
طے کر پائے تھے کہ ٹارچ کی روشنیاں نظر آئیں۔ چھدا
خاں چار آدمیوں کے ساتھ بہت جلد ہم تک پہنچ گیا۔
معلوم ہوتا ہے فیر کی آواز ڈاک بنگلے تک پہنچ گئی تھی۔
چھدا خاں نے ہم کو آتے دیکھ کر پوچھا "کیا مارا تھا
حضور؟"

"نہیں۔ تیندوا"

"بھاگ گیا حضور؟"

"جاؤ۔ آگے چلو۔ وہیں پڑا ہے۔"

ہمارے پہنچنے کے کچھ دیر بعد ہمارا شکار ڈاک
بنگلے میں لایا گیا۔ چھدا خاں نے پیٹرومیکس کی لال ٹین
سے تیندوے کا باریک بینی سے معائنہ کیا۔ "اوہ حضور
کھال خراب ہوگئی۔ سارا منھ چھلنی ہوگیا۔"

جب وہ لوگ چلے گئے تو غازی نے تیندوے
کو بہت تاسف سے دیکھتے ہوئے کہا "تمھاری
ضد نے کام بگاڑ دیا۔ کتنا جوان اور حسین تھا۔ یہ چہرہ
منھ اور گردن ساری داغ دار ہوگئی۔" پھر انھوں نے

گئے تھے۔

"میاں منوں چیتوں! دیکھا۔ منہ پھاڑ چکا تھا یہ حملہ کرتے وقت۔"

"تم نے بہت بے احتیاطی کی۔ اس کو منہ بند کرنے کی مہلت دینی چاہیے تھی۔"

"اس کا منہ تمہاری گردن پکڑنے پر ہی بند ہوتا۔"

"بلکہ تمہارے ٹینٹوے پر۔"

یہاں ہماری بحث شروع ہو گئی۔ وہ کہتے تھے کہ تم کو اس نے تاکا تھا۔ میرا منطقی جواب یہ تھا کہ اُن سے وہ بیزار تھا! اول تو اس کے راستے سے ان کا اکثر گذر ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ ہتھیار بند تھے اور ہتھیار لے کر ہی چلتے ہیں۔ میں مسافر آدمی، تنہا مجھ سے اسے کوئی شکایت نہیں تھی۔ غازی کا جواب تھا کہ تیندوا ایسا کمینہ جانور ہوتا ہے کہ وہ مسافروں، نہتوں پر ہی جھپٹتا ہے۔

"اگر کھانے میں دیر ہو تو چائے منگاؤ۔ مجھے سردی محسوس ہو رہی ہے۔" اس درخواست پر غازی صاحب بہت خوش ہوئے، فوراً صلح کر لی۔ بلکہ مجھ سے لپٹ گئے "یار میں تمہارا ڈر نکال کر ہی رہوں گا۔"

اِس فقرے نے میرے سامنے خطرات کی ایک طویل فہرست پیش کر دی۔ "اگر جناب آئندہ شیر کا شین بھی زبان سے نکالا۔"

"تو کیا ہو گا؟"

[illegible]

"وہ آپ کو ملے گا نہیں۔"

"وہ کیا؟"

"شش۔ شیر نہیں، گھر کا راستہ۔ پورے بارہ میل جنگل میں آپ اکیلے، نہتے سفر نہیں کر سکتے۔"

(شیر کے شکار کا قصہ اگلے ماہ سنایا جائے گا۔ انشاء اللہ)

ضروری اعلان

(۱) فروری ۶۵ء (۲) اکتوبر ۶۵ء (۳) فروری ۶۶ء (۴) دسمبر ۶۷ء (۵) مارچ ۶۷ء کے پیام تعلیم کے پرچے ضائع ہو گئے ہیں۔ فائل کو مکمل کرنے کے لیے ان پرچوں کی سخت ضرورت ہے۔ ان میں سے کوئی ایک رسالہ بھیجنے والے کو میں پیام تعلیم کا سالانہ شمارہ رجسٹرڈ ڈاک سے بھجوا دوں گا۔ اگر وہ خریدار ہیں تو مکتبہ کی ڈیڑھ روپے والی کتاب بھجوائی جا سکتی ہے۔ تمام شمارے بھیجنے والے کو میں ایک سال کے لیے اپنے خرچ پر پیام تعلیم کا خریدار بنوا دوں گا۔ اگر وہ پہلے سے خریدار ہیں تو چھ روپے کی قیمت کی کتابیں مکتبہ جامعہ کی ان کے نام روانہ کر دی جائیں گی۔

خلیق انجم اشرفی :- ۳۵۰۰ پہاڑی دہلی

از ساحر بھوپالی



کدھر جا رہی ہے ...!

پھر انسانیت آج گھبرا رہی ہے — جلن کی ہر اک دل سے بو آ رہی ہے
محبت کی دولت لٹی جا رہی ہے — بدی ہر طرف آگ بھڑکا رہی ہے
ہوس لیڈری اپنی چمکا رہی ہے — گھٹا فرقہ بندی کی پھر چھا رہی ہے
نحوست ترے سر پہ منڈلا رہی ہے
تھکی ہاری جنتا کدھر جا رہی ہے

جو نکلے ہیں لیڈر تیری جان بن کر — یہ بہکاتے ہیں تجھ کو شیطان بن کر
تجھے چھوڑ دیں گے یوں انجان بن کر — کہ دیکھا کرے گی تو حیران بن کر
بہت دکھ اٹھائے گی حیوان بن کر — ملے گا تجھے سکھ تو انسان بن کر
نہ جا اس طرف دیکھ انجان بن کر
او مت ماری جنتا کدھر جا رہی ہے

تری تاک میں ہے یہ فرقہ پرستی — سمیٹ اپنا دامن بچا اپنی ہستی
اگر چھوڑ دی تو نے الفت پرستی — اجڑ جائے گی ساری بستی کی بستی
تو رہ جائے گی یونہی سکھ کو ترستی — ترے لیڈروں کو تو سوجھی ہے مستی
سنبھل جا کہ آگے ہے پستی ہی پستی
او دکھیاری جنتا کدھر جا رہی ہے

صدا دے رہا ہے صدا دینے والا — کسی کا نہ ڈالے خدا اس سے پالا
بنا ڈالے تجھ کو نہ منھ کا نوالا — کرو فرقہ بندی کا منھ آج کالا
رہے آشتی کا سدا بول بالا — یہی تجھ سے ساحر تھا بس کہنے والا
ادھر ہے اندھیرا ادھر ہے اجالا

جناب ستیش بترا

امریکہ کا ایک تفریحی پارک

امریکہ کے سفر میں مجھے مینیاپولس (MINNEAPOLIS) شہر کے بالکل باہر منی ٹانکا (MINNE TONKA) جھیل کے پاس ایک امریکی خاندان کے ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ صوبہ (MINNESOTA) کی راج دھانی سینٹ پال (ST. PAUL) ہے لیکن مینیاپولس اور سینٹ پال "جڑواں شہر" کہلاتے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح حیدرآباد اور سکندرآباد۔ ان دو ہندوستانی شہروں کے بیچ ایک چھوٹی سی جھیل ہے۔ لیکن ان دو امریکی شہروں کے درمیان امریکہ بلکہ دنیا کا سب سے لمبا دریا مسس پی (MISSISSPI) (لمبائی چار ہزار میل) ہے۔

جھیلوں کا تو خیر ذکر ہی کیا! مینیاسوٹا کا اپنایا ہوا نعرہ "وہ صوبہ جس میں دس ہزار جھیلیں ہیں" سارے امریکہ میں مشہور ہے۔ دس ہزار جھیلیں تو سرکاری طور پر بتائی جاتی ہیں۔ وہاں کے رہنے والوں کا اصرار ہے کہ یہ جھیلیں تعداد میں پندرہ سولہ ہزار سے کم کہاں ہوں گی! ۸۴۰۶۸ مربع میل کے اس صوبہ میں یہ جھیلیں کچھ اس طرح سے ہیں جیسے کسی نے چاندماری کی ہو۔



کہتے ہیں کسی زمانے میں صوبہ کا شمالی حصہ ایک بہت بڑے گلیشئر (برف کے پہاڑ) سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور جب ایک مرتبہ یہ گلیشئر تیزی سے سرکنا شروع ہوا تو جگہ جگہ دیو قامت گڑھے بنتا گیا۔ یہ گڑھے بعد میں پانی سے بھر جانے کے بعد خوبصورت جھیلیں بن گئے۔ "مینیاسوٹا" کا مطلب ریڈ انڈینز کی زبان میں "بادلوں کا نیلگوں پانی" ہے۔ اب ان جھیلوں کی جغرافیائی وجہ کچھ بھی ہو۔ ان کے صاف شفاف نیلگوں پانی میں تیرتی ہوئی بادبانی کشتیاں بہت ہی پیاری لگتی ہیں۔

جھیل منی ٹانکا دیکھتے ہی مجھے نینی تال کی جھیل یاد آئی لیکن نینی تال کی جھیل تو اس کے مقابلے میں ایک چھوٹا بچہ دکھائی دیتی ہے۔ یہ جھیل بھی دوسری کئی جھیلوں سے ملی ہوئی ہے جیسے اپنے ہاں اودے پور کی جھیلیں۔ بلکہ یوں کہیے جیسے کشمیر میں ڈل جھیل جہلم اور وولر جھیل سے ملی ہوئی ہے۔ منی ٹانکا جھیل میں تو آپ دو تین سو میل کا چکر لگا سکتے ہیں۔ مینیاپولس کے شہر کے اندر ہی چار پانچ بڑی بڑی جھیلیں

ان ہی جھیلوں کی کشش ناروے، سویڈن اور
آئیرلینڈ کے لوگوں کو اس صوبے میں کھینچ لائی ہے۔ یہاں
زیادہ تر آبادی ان ہی لوگوں کی ہے۔ اسی لیے یہاں کشتیوں
کا پیدائشی شوق بالکل اچنبھے کی بات نہیں، شاید ہی کوئی
خاندان ہوگا جس کے پاس کسی نہ کسی جھیل میں ایک آدھ کشتی
نہ ہو۔ چاہے بادبانی ہو یا موٹر بوٹ۔ یہاں کے شہریوں کا
رتبہ اور مالی حیثیت بھی ان کشتیوں کی تعداد سے لگائی جاتی
ہے۔ میرے میزبان کے پاس ایک تو چھوٹی بادبانی کشتی
بچوں کے لیے مخصوص تھی جو بے حد شوق سے (YATCHTING)
یعنی بادبانی کشتیوں کے مقابلوں میں حصہ لیتے، ایک بڑی
بادبانی کشتی تھی جسے میرا میزبان اور اس کی بیوی استعمال
کرتے اور ایک اچھی خاصی فیملی موٹر بوٹ تھی جس میں سارا
کنبہ اور اس کے علاوہ مہمان گھمانے کے لیے لے جائے
جا سکتے۔

ہم سارا دن ان کشتیوں کو گھومتے دیکھتے رہتے
شام ہوتے ہی جھیل کے سامنے کنارے پر روشنیوں کا
ایک شہر آباد ہو جاتا۔ اونچی اونچی، بلند رنگ برنگی روشنیاں
پانی میں ان کا کانپتا عکس بہت ہی بھلا لگتا۔ پوچھنے پر
معلوم ہوا کہ یہ ایکسلسیر پارک (EXCELSIOR PARK)
کی روشنیاں تھیں۔ اس پارک میں بچوں کے کھیل کود اور
تفریح کا رنگا رنگ سامان تھا۔ میں نے ایسے پارک بڑی
بڑی نمائشوں میں دیکھے تھے — جنھیں عام طور
پر (AMUSE MENT PARK) یا تفریحی پارک کہا جاتا
تھا لیکن یہ ایک تو بہت ہی بڑا معلوم ہوتا تھا۔ میں
نے سوچا شاید اس پارک کی نوعیت بھی ویسی ہی ہوگی جیسے
اپنے ہاں سرکس یا ایسے ہی تفریح پارکوں کی ہوتی ہے
آج آئے، مہینہ دو مہینے کے بعد چلے گئے لیکن جب
مجھے یہ بتایا گیا کہ یہ پارک شہر کا اتنا ہی اہم حصّہ تھا
جتنا سڑکیں، بازار، رہایشی مکان۔ تو میں دنگ رہ گیا۔

مینیاپولس کوئی بہت بڑا شہر نہیں۔ اس کی
آبادی بھی کوئی پانچ چھ لاکھ ہوگی۔ سینٹ پال ملا کر
دس لاکھ ہو جاتی ہوگی جتنی کہ اپنے ہاں کان پور کی ہے۔
لیکن یقین مانیے یہ دونوں شہر کان پور سے دس گنا تو
ضرور بڑے ہوں گے بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ ہمارے
ہاں، حیدرآباد اور سکندرآباد یا کان پور جیسے بڑے شہروں
کے لیے بھی کسی سرکس یا ایسے تفریحی پارک کا خرچ مستقل
طور پر برداشت کرنا مشکل ہے۔ تو پھر یہ "جڑواں شہر"
کیوں کر اس بوجھ کو برداشت کرتا ہوگا۔ مانا کہ وہاں کے
لوگ ہماری طرح غریب نہیں، کھاتے پیتے، خوش حال
ہیں لیکن اس کا بھید مجھ پر اس دن کھل گیا جب میرے
میزبان نے بتایا کہ اگلے اتوار کو ان کی فرم نے اپنی سالانہ
تقریب کے سلسلے میں اپنے سٹاف ممبران اور ان کے
کنبوں کے لیے یہ پارک ایک شام کے لیے بک کروا دیا ہے۔

بھلا میں تو بچپن سے ان تفریحی پارکوں کا بیحد
شوقین ہوں اور یاد نہیں کہ میں نے کوئی ایسا موقع کھویا
ہو۔ اب میں بھی بہت جوش اور شوق سے یہ پارک دیکھنے
گیا۔ پارک کیا تھا، جادو کا شہر تھا، جادو کی ایک رنگین
دنیا تھی، معلوم ہوتا تھا گویا الف لیلے کی کوئی داستان

زندہ ہو گئی ہوں۔ ایک بہت ہی بڑا دیو پیکر چکّر تو تھا ہی جو ہر ایسے پارک کی خصوصیت مانی جاتی ہے، لیکن اتنے اونچے "ہنڈولے" پر میں کبھی سوار نہیں ہوا تھا۔ میری گو۔ راؤنڈ (MERRY-GO-ROUND) بھی ویسا ہی تھا جیسے اپنے ہاں لیکن [illegible] جانوروں کی شکلوں کی جگہ نئی تہذیب کے نشانوں سے بنی تھیں کسی کی شکل راکٹ کی تھی تو کسی کی موٹر بوٹ کی، کوئی ہوائی جہاز کی پائلٹ سیٹ تھی تو کوئی سمندری جہاز کے ڈیک کی۔ اس میں کہیں کہیں جانور بھی تھے لیکن ذرا بدلے ہوئے ڈھنگ سے۔ لمبی گردن والا زراف (GIRAFFE) بھی تھا اور دو کوہانوں والا اونٹ بھی۔ مجھے میرے میزبان کے بچّوں نے اونٹ کی سواری کے لیے اکسایا۔ میں نے بھی سوچا کہ ہندوستان میں تو کبھی کبھار اونٹ کی سواری کا موقع مل جاتا ہے، امریکہ میں کہاں ملے گا؟ مجھے اس کی سواری میں وہی مزا آیا جو شاید حقیقی اونٹ کی سواری میں آتا ہوگا۔ جب یہ گورکھ دھندا تھما اور میں اونٹ سے اترا تو جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا! میری ٹیڑھی کمر دیکھ کر بچّوں نے خوب تالی بجائی۔ میرا میزبان میری طرف دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا "آپ ابھی اناڑی ہیں!"

اس پارک میں کئی ایسے کھیل تھے جو میں نے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اس میں سب سے زیادہ دہشت انگیز اور رونگٹے کھڑے کرنے والا کھیل (RAIL COASTER) تھا۔ یہ ایک طرح کی گاڑی سی تھی جو پٹری پر چلتی تھی۔ لیکن یہ کوئی سیدھی سادھی پٹری نہ تھی اس کا تعلق ضرور شیطان کی آنت سے تھا۔ آپ یقین کیجیے کہ یہ بجلی کی سی رفتار کے ساتھ پچاس ساٹھ فٹ کی گہری کھائی میں سے اتر کر سو دو سو فٹ کی بلن پر چشم زدن میں چڑھ جاتی ہے۔ اور پھر پہاڑوں، غا اور پلوں پر سے ہوتی کہیں کی کہیں نکل جاتی۔ ان غا اور جنگلوں میں پلاسٹک، ربڑ اور نہ جانے کس کس چ بنے ہوئے (یہ تو بعد میں ہی معلوم ہوا)، ہولناک اس انداز میں ملتے جیسے وہ آپ پر جھپٹا مارنا ہی ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ باقیوں کی طرح میرے منھ بھی ضرور چیخیں نکلی ہوں گی۔ اس پانچ منٹ کی ش سیر میں پہلی بار احساس ہوا کہ کلیجہ منھ کو کیوں کر آتا آج بھی جب یہ سیر یاد آتی تو بدن پر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں!

اس کے بعد ایک گھومتی ہوئی سرنگ سابقہ پڑا۔ اس کو پار کرنا اگرچہ آسان معلوم تھا اور لوگوں کو اس کے اندر گرتے دیکھ کر ان بے وقوفی پر ہنسی آتی تھی لیکن جب خود اس سر کو پار کرنا پڑا تو شاید میں ان لوگوں سے بہت پہ گر گیا تھا۔ یہ شیطانی جنتر بھی کسی کج دماغ کی تخ معلوم ہوتی تھی۔ سرنگ کے اندر دو گائیڈ رہتے جو اپنا توازن سنبھالنے کے ساتھ ساتھ ہم جیسے لوگوں کو پکڑ پکڑ کر سرنگ کے باہر پہنچوا دیتے کا راستہ "ننھے بہادروں" کے لیے کھلا رہے خاصا دلچسپ مشغلہ تھا۔ میرے ساتھ والے

گرنے کے باوجود بھی دوسری تیسری مرتبہ سرنگ پار کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ لیکن میرے حوصلے نے ساتھ نہیں دیا۔ اور میں دور کھڑا ان کی ثابت قدمی کی دل ہی دل میں داد دیتا رہا۔ شکر اس بات کا تھا کہ میرا میزبان بھی اس خطرے کا سامنا کرنے میں اتنا ہی کامیاب تھا جتنا کہ میں!

پھر ہم نے خلائی SPACE SHIP کی سواری کی۔ مختلف جہاز ایک بڑے سے اونچے کھمبے کے ساتھ بندھے تھے۔ ہر جہاز میں ایک ہی سیٹ تھی۔ ہر کسی کو پہننے کے لیے ایک خلائی ٹوپی دی جاتی تاکہ خلائی پائلیٹ ہونے کا بھرم رہ سکے ورنہ اس اڑان میں اسکی قطعی ضرورت نہ تھی۔ اس زنجیر سے بندھی اڑان کا راز اصل یہی تھا کہ یہ جہاز اس کھمبے سے بندھے تھے، دلچسپ حصہ ہوائی جہاز کی JOYSTIC جیسی چیز تھی لیکن اس کا عمل کشتی کے RUDDER جیسا تھا۔ اس کو کام میں لانے سے جہاز کی سمت، زاویہ اور رفتار تک بدلی جا سکتی تھی۔ جب جی چاہتا آپ جہاز کو خلا کی نچلی سطحوں پر اور جب جی چاہا بلندیوں پر اڑا سکتے تھے۔ ہم چڑھنے سے پہلے ڈر رہے تھے کہ خوب چکر آئیں گے، طبیعت خراب ہو گی لیکن ہماری ہوشیاری کی داد دیجیے کہ سمت، زاویے اور رفتار کو بدل سکنے کی وجہ سے ہم ان چکروں سے بچ گئے۔ جب ہم نیچے اترے تو ہم نے بڑی شان سے اس خلائی مہم کو بڑی خوبصورتی سے سرانجام دینے کے لیے اپنے

میزبان سے "میڈل" مانگا۔ لیکن ہماری حیرانی کی انتہا نہ رہی جب کہ اس SPACE STATION کے منتظمین سچ مچ ایسے پائلٹوں کو ایک خوبصورت بیج BADGE سے نوازا۔

اس کے بعد ہم "نصف کرّوں" میں بٹھائے گئے اور ان "نصف کرّوں" نے گھوم گھوم کر وہ بے ہنگم ناچ ناچا کہ ہمارے انجر پنجر سب ڈھیلے ہو گئے۔ جب ہم اترے تو ہم میں سے بیشتر لوگوں کے رنگ سفید تھے اور ہونٹوں پر کھسیانی ہنسی۔

پارک میں اور بھی کئی طرح کے کھیل اور تفریحی سامان تھے لیکن "آئس کریم" کی پکار کو ہم سب لوگ ٹھکرا نہیں سکے۔ اور آئس کریم بھی کیسی۔ یہاں خصوصی ہونے کی وجہ سے مجھے تیس قسم کی آئس کریم کھلائی اور چکھائی گئی۔

مجھے ایسا معلوم ہوا کہ جیسے میرا بچپن ایک بار پھر لوٹ آیا ہو اور میری زندگی کے دس سال کم ہو گئے ہوں۔

انوکھا عجائب خانہ

از محمد حسین حسان ایڈیٹر پیام تعلیم

جی ہاں۔ یہ عجائب خانہ سچ مچ بہت انوکھا ہے۔ مزے کی بات یہ کہ اس عجائب خانے کی ساری چیزیں خود آپ کے گھر میں موجود ہیں۔ جیسا یہ انوکھا ہے ویسے ہی انوکھے انداز میں لکھا بھی گیا ہے۔ زبان ایسی نکھری ستھری ایسی پیاری کہ پڑھنا شروع کیجیے تو بس پڑھے ہی جایئے جب تک ختم نہ ہو جائے بہت ہی مزے دار کہانی ہے۔

قیمت :- پہلا حصہ ۵۰/- دوسرا حصہ ۴۰/ تیسرا حصہ ۴۰/ چوتھا حصہ ۴۰/

جناب سعادت نظیر

سچّی بات

کسی بستی میں ایک لڑکا تھا — واقعہ یہ ہے، نیک لڑکا تھا
جارج واشنگٹن تھا اس کا نام — اور سچ بولنا تھا اس کا کام
عمر جب اس کی بارہ سال ہوئی — ایک کلہاڑی اس کو تحفہ ملی
تحفہ پاکر خوشی سے پھول گیا — ساری دنیا کو جیسے بھول گیا
کھیل کا اور اِک بہانہ ہوا — اب چمن کی طرف روانہ ہوا
تھے وہاں تین چار پیڑ ایسے — باپ نے شوق سے لگائے تھے
ان کی جو ڈالیاں ہری دیکھیں — سب وہ لڑکے نے کاٹ کر رکھ دیں
باپ بھی اس طرف ہی جا نکلا — اپنے پیڑوں کو دیکھا اُجڑا ہوا
اس نے پوچھا بلا کے مالی سے — "کاٹ دیں اس کی ڈالیاں کس نے؟"
مالی بولا "نہیں یہ میرا قصور — جو سزا ہو، وہ پھر بھی ہے منظور"
باپ بولا "یہ تیرا ہی ہے قصور — میں سزا اس کی تجھ کو دوں گا ضرور"
باپ کی بات سن کے لڑکے نے — دل میں سوچا "بلا ٹلی سر سے"
پھر یہ سوچا کہ یہ نہیں اچھا — ہو خطا میری، مالی پائے سزا
اب نڈر ہوکے باپ سے بولا — پوچھیے سچ تو یہ ہے میری خطا
جوں ہی بیٹے کی بات اس نے سنی — اس کے دل کو ہوئی بہت ہی خوشی
اپنے بیٹے پر اس کو پیار آیا — پیار کرکے اسے یہ سمجھایا
سچ سے ہوتا ہے ہر قصور معاف — اور رہتا ہے دل ہمیشہ صاف

کون ہے؟ جس کو سچ عزیز نہیں
سچ سے بہتر تو کوئی چیز نہیں

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی۔ استاد جامعہ کالج

آگے کی فکر

بچپن میں ایک کہانی پڑھی تھی۔ کسی شکاری نے ایک چڑیا پکڑی۔ چڑیا نے اس سے کہا۔ کہ مجھے چھوڑ دے۔ چڑیمار بولا۔

"واہ کہیں آئی ہوئی چیز چھوڑی جاتی ہے؟ میں تجھے گھر لے جاؤں گا، ذبح کرکے پکاؤں گا اور مزے سے کھاؤں گا"

چڑیا نے کہا "میں اتنی چھوٹی ہوں کہ نہ تیرا پیٹ بھرے گا، نہ زبان ہی کچھ دیر لطف لے سکے گی، میری جان لے کر تجھے کچھ حاصل نہ ہوگا، بہتر یہ ہے کہ میرا خون اپنی گردن پر نہ لے، اور مجھے چھوڑ کر ثواب حاصل کر"

چڑیمار نے سوچا۔ چڑیا سچ ہی تو کہتی ہے۔ یہ ایک نوالہ کے برابر بھی تو نہیں ہے۔ اس کی جان لے کر کیا کروں، یہ سوچ کر اس نے چڑیا کو چھوڑ دیا۔

چڑیا اڑ کر ایک درخت پر جا بیٹھی اور چڑیمار سے کہنے لگی "تیرا شکریہ۔ مگر تو نے بڑا نقصان اٹھایا۔ میرے پیٹ میں ایک چھٹانک کا قیمتی پتھر (لعل) تھا، تو مجھے ذبح کرتا تو یہ پتھر تیرے ہاتھ آجاتا اور ہزاروں کی دولت ہاتھ آتی"

یہ سن کر چڑیمار ہائے ہائے کرنے لگا۔

چڑیا نے کہا "جو چیز ہاتھ سے جاتی رہے عقلمند اس کا ماتم نہیں کرتے۔ جو چیز ہاتھ سے گئی رونے چلانے سے کہاں مل سکتی ہے۔ اور میں تو تیری عقل کا امتحان لے رہی تھی، ورنہ کہاں میں اور کہاں لعل، دو تولے کی جان بھلا چھٹانک بھر کا لعل کس طرح نگل سکتی ہے"

یہ کہانی مختلف طریقوں سے بیان کی گئی ہے، لیکن اس کی روح سب میں ایک ہی ہے "جو چیز ہاتھ سے جاتی رہے اس کا ماتم نہ کر"۔ اس کہانی کا حاصل ہے۔ اس فقرہ میں ایسا صحیح مشورہ دیا گیا جس کو اگر ذہن میں رکھا جائے تو سینکڑوں غموں سے چھٹکارا مل جائے اور آہ و زاری میں وقت برباد کرنے کی جگہ کامیابی حاصل کرنے کے لیے نئے

کوشش کی جائے۔

بچپن سے ذہن پر اس کہانی کا اثر ہے۔ اور بیسیوں موقعوں پر چڑیا کے فقرے نے رنج و افسوس سے بچا کر ہمت و ولولہ سے قدم آگے بڑھانے میں مدد دی ہے۔ کچھ عرصہ ہوا مصر کے نامور ادیب ڈاکٹر احمد ابن امین کی ایک کتاب (فیض الخاطر) پڑھ رہا تھا۔ اس میں چڑیا کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ پُر اثر ایک واقعہ نظر سے گزرا۔ جی چاہا کہ پیام تعلیم کے پڑھنے والوں کو بھی یہ واقعہ سناؤں شاید میری طرح وہ بھی متاثر ہوں، اور ماضی (گزرے ہوئے زمانے) کے بجائے مستقبل (آنے والے زمانے) ان کی توجہ کا مرکز بنے اور ماضی کی یاد کے بجائے مستقبل کی فکر کی عادت پڑے۔ ڈاکٹر احمد لکھتے ہیں:-

مصر کی راجدھانی قاہرہ میں ایک بہت بڑا سوداگر تھا۔ اس کی دُکان اعلیٰ درجہ کے سامان سے بھری ہوئی تھی، چیزیں بہت اچھی ہوتی تھیں اور کفایت سے ملتی تھیں۔ دکاندار کا برتاؤ بھی خریداروں کے ساتھ بہت اچھا تھا، مسکراتے ہوئے ملتا، عزت سے پیش آتا۔ لوگ اس کے اخلاق سے متاثر تھے۔ اور اس کی ایمانداری اور سچائی کی دُور دور تک شہرت تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس کی دُکان پر خریداروں کا بڑا ہجوم ہوتا تھا۔ ہر وقت لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے تھے۔

کاروبار برابر ترقی کرتا جا رہا تھا اور
کی حیثیت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ اتفاق
ایک دن دُکان میں آگ لگ گئی۔ بجھانے کی بہ
کوشش کی گئی لیکن جب تک آگ بجھے بجھے د
کا سارا سامان جل کر راکھ ہو گیا اور لاکھوں کی د
رکھنے والا کوڑیوں کا محتاج ہو گیا۔

اس واقعہ کی خبر تھوڑی دیر میں سارے
میں پھیل گئی اور سوداگر کے گھر پر ہزاروں ہمدرد
والے جمع ہو گئے۔ لوگوں نے اس حادثہ پر رنج
افسوس ظاہر کیا اور تاجر کو اپنی ہمدردی کا یقین
سوداگر نے ان تمام لوگوں کی ہمدردی کا شکریہ
لوگوں نے پوچھا آخر آگ کس طرح لگی اور اس کے
میں اتنی دیر کیوں ہوئی۔ سوداگر نے کہا جو ہونا
ہو چکا اب کیوں اور کیسے سے کچھ حاصل نہیں
اسی لیے میں اس طرح اس حادثہ پر غور نہیں
ہوں، میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ آئندہ کے لیے
جائے۔ جلی ہوئی دُکان رنج و افسوس سے در
نہیں ہو سکتی ہے، نہ آہ و زاری سے مٹا ہوا
واپس مل سکتا ہے۔ اس لیے ہائے وائے بے
اب تو کوئی ایسی تدبیر کرنی ہے کہ جلی ہوئی دکان
درست ہو، کہیں سے نیا سامان حاصل کیا جا
بازار میں نئے سرے سے کاروبار کی فکر کی جا
سنا ہے کہ ہمت کرنے والے کی خدا مدد کرتا ہے
محنت کا پھل ضرور دیتا ہے۔

(باقی

جناب یوسف ناظم

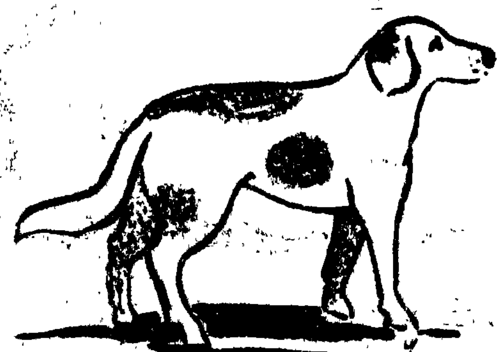
کچھ نہ کچھ... پالنا چاہیے



کتّا:- کتا ہمیشہ دم والا پالنا چاہیے۔ بغیر دم کا کتا کسی کام کا نہیں ہوتا۔ مالک کو دیکھ کر کتا ہمیشہ اپنی دم ہلاتا ہے۔ اگر اس کے دُم نہیں ہوگی تو کیا وہ اپنا سر ہلائے گا۔ کتا بہت وفادار جانور ہوتا ہے۔ دن بھر سوتا رہتا ہے۔ دن میں اگر چور آجائیں تو یہ انھیں پہچان نہیں سکتا کیونکہ اس کے ذہن میں یہ بات بٹھادی گئی ہے کہ چور ہمیشہ رات ہی میں آتے ہیں حالانکہ چور کتوں سے زیادہ ہوشیار ہوتے ہیں۔ کتوں کو آدمیوں کا سیٹی بجانا بہت پسند ہے۔ سیٹی سن کر جھوم جھوم جاتے ہیں۔ سڑک پر جب بھی کوئی آدمی سیٹی بجاتا ہے یہ فوراً متوجہ ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ سیٹی انھی کی خاطر بجائی جارہی ہے۔ کتے اپنی گلی میں [illegible]ن کر رہے ہیں۔ دوسری گلی میں البتہ دُم دباکر چلتے ہیں اور بڑے جھکتے رہتے ہیں یہ طریقہ انھوں نے آدمیوں سے سیکھا ہوگا۔

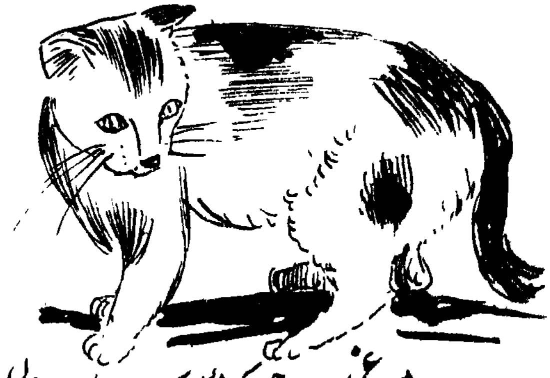
انگریز لوگ کتوں پر اپنی جان چھڑکتے ہیں۔ ان کے ہاں کتا پالنا بے حد ضروری ہوتا ہے۔ بچوں کے لیے [illegible] رکھیں گے۔ یہ اگر ممکن نہ ہوا تو ماں بچوں کو آیا کے حوالے کرکے خود کتے کی پرورش کرے گی۔ انگلستان میں لوگوں سے زیادہ کتے خوش قسمت ہوتے ہیں۔

ہندوستان میں سمجھ دار لوگ کتے نہیں پالتے صرف گھر کے پھاٹک پر ایک تختی لگا دیتے ہیں "کتوں سے ہوشیار رہیے"۔ اس تختی کی وجہ سے گھر میں آرام رہتا ہے۔

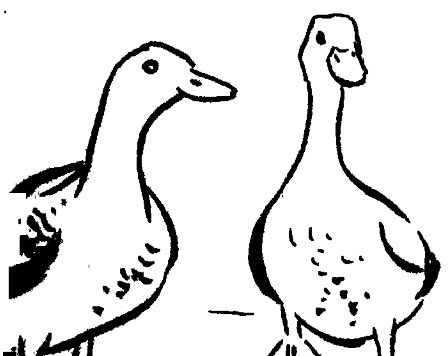


بلّی:- بلی پالنے کا فایدہ یہ ہے کہ خود آپ کو دودھ پینے کو نہیں ملتا۔ بلی اگر نازک ہوئی تو گھر میں چوہے بھی پل سکتے ہیں۔ بلی چوہوں سے ڈرکر آپ کے بستر میں چھپ جاتی ہے اور چوہے اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے [illegible]

اس پر بار بار ہاتھ پھیرنے سے اس کی عمر بڑھتی ہے۔ بلّی جب کھانے کی میز پر چڑھ کر بیٹھ جاتی ہے تو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ بچہ اگر کوئی چیز میز پر گرا دے تو پٹ جاتا ہے۔ بلی کوئی چیز گرائے تو سب خوش ہو جاتے ہیں۔ بعض تندرست بلّیاں چوہوں کے پیچھے دوڑتی ہیں اور جب تک انھیں بلوں کے اندر نہیں بھجوا دیتیں چپ نہیں بیٹھتیں۔ بلیوں نے چوہوں کا شکار کرنا بالکل چھوڑ دیا ہے۔ وہ بہت مہذب ہو گئی ہیں۔ اس لیے اب چوہے مارنے کے لیے آدمیوں کو انعام دیے جانے لگے ہیں جس گھر میں بلّی نے بچے دیے ہوں۔ وہاں گھر کے لوگوں کو رہنے کے لیے جگہ کم پڑ جاتی ہے۔ بلّی ایک دم کئی بچے دیتی ہے۔ اور روزانہ انھیں گنتی رہتی ہے۔



مرغی:۔ جسے کوئی اور کام نہ ہو اسے مرغیاں پالنا چاہییں۔ مرغیاں گھر میں غلاظت پھیلانے کے کام آتی ہیں۔ مرغیوں والے گھر میں آنے والے مہمان، مرغیوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں اور دو چار دن زیادہ ٹھہرنے میں تکلف نہیں کرتے۔ مرغیاں مہمانوں کی نظر لگ جانے کی وجہ سے بیمار پڑنا شروع ہو جاتی ہیں۔ اور میزبان انھیں مجبوراً ذبح کر دیتا ہے۔ مرغیوں کے ساتھ مرغ بھی چاہیے۔ ہر مرغ بانگ دیتا ہے اور ہر مرغی انڈا دیتی۔ جب گھر میں مرغ بانگ دیتا ہے۔ اس گھر میں الا[رم] ٹائم پیس کی ضرورت نہیں ہوتی۔ مرغیوں میں یہ خوبی ہے کہ وہ دانے کا انتظار نہیں کرتیں۔ خود ہی اپنی خو[راک] تلاش کر لیتی ہیں۔ مرغیوں کو انڈے دینے کا شوق ہر مرغی روزانہ ورنہ ہر دوسرے روز ایک انڈا بغیر چُپ نہیں بیٹھتی۔ خرابی یہ ہے کہ ہمیشہ چھپ دیتی ہے اور انھیں ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ مرغی کی خو[بی] ہے کہ اسے انڈے سے بالکل دلچسپی نہیں ہوتی جب اسی انڈے سے بچے نکلتے ہیں تو وہ ان کی سب سے جھگڑا مول لیتی ہے اور کیا مجال کوئی اس بچوں کو ہاتھ تو لگا لے۔ جو لوگ مرغیاں پالتے ہیں۔ شام کے دھندلکے میں اپنی مرغیوں کی تلاش میں اُدھر مارے مارے پھرا کرتے ہیں۔



قاز:۔ جو لوگ مرغیوں کو حقیر سمجھتے ہیں مرغیاں نہیں قاز پالتے ہیں۔ قاز پالنے کے دو فا[ئدے] ہیں۔ قازوں کی موجودگی میں کتا پالنے کی ضرورت

ہوتی ۔ قاز جب چلّانا شروع کرتی ہے تو پھر دو دن تک چُپ نہیں ہوتی ۔ اگر کسی گھر میں چار چھ قازیں ہوں اور وہ سب مل کر چلّانا شروع کر دیں تو گھر کی چھت اڑ جانے کا ڈر ہوتا ہے ۔ قاز کی ٹھونگ سے ہمیشہ بچنا چاہیے ۔ قاز اگر ٹھونگ مار دے تو پتلون اور جسم کی کھال دونوں کی خیر نہیں ۔ قاز پالنے کا دوسرا فایدہ یہ ہے کہ یہ انڈا بھی دیتی ہے اور یہ انڈا مرغی کے انڈے سے بڑا ہوتا ہے ۔ اگر یہ ذرا اور بڑا ہوتا تو ٹینس کھیلنے کے کام آتا ۔

جب گھر میں مرغیاں اور قازیں پلی ہوں اس میں ایک عجیب طرح کی بو پھیلی ہوتی ہے ۔ اس بو کو بدبو کہا جاتا ہے ۔



توتا ۔ توتا پالنے کا فایدہ یہ ہے کہ اس کے ساتھ ایک پنجرہ بھی گھر میں آجاتا ہے ۔ اس پنجرے کو گھر کی بالکنی میں یا کھڑکی کے اوپر لٹکانا چاہیے تاکہ یہ باہر سے بھی نظر آئے ۔ اور راستہ چلنے والوں کو معلوم ہو جائے کہ اس گھر میں ایک توتا پلا ہوا ہے ۔ توتے کے جسم میں سب سے خوب صورت چیز اس کی چونچ ہوتی ہے ۔ اس قدر حسین چونچ کسی اور پرندے کو نہیں ملی ۔ یہ گہرے سرخ رنگ کی ہوتی ہے اور اس چونچ کے پیچھے توتے کا منھ چھپا ہوا ہوتا ہے ۔ توتے بھی ضرور مسکراتے ہوں گے ۔ لیکن چونکہ ان کی چونچ کسی برتن کے ڈھکن کی طرح ہوتی ہے ۔ اس لیے ان کی مسکراہٹ کسی کو نظر نہیں آتی ۔

توتوں کو بچوں کی چھوٹی چھوٹی اور نازک انگلیاں بہت پسند آتی ہیں ۔ بچے توتے کو ستانے کے لیے جب پنجرے کے اندر اپنی انگلی ڈالتے ہیں تو توتا بہت خوش ہوتا ہے اور بچے کے ہاتھ کھینچ لینے سے پہلے اس کی انگلی پر چونچ لگا دیتا ہے ۔ بچہ سمجھتا ہے کہ توتے کی چونچ کا رنگ اس کی انگلی پر لگ گیا لیکن یہ رنگ نہیں ہوتا اس کا اپنا خون ہوتا ہے ۔ بچہ رونے لگتا ہے اور توتا جی ہی جی میں ہنسنے لگتا ہے ۔

توتا ہر زبان سیکھ لیتا ہے کیوں کہ توتے کی کوئی اسٹیٹ نہیں ہوتی ۔ توتا کچھ بھی بولے اس کا مالک سمجھتا ہے کہ توتا وہی بول رہا ہے جو اسے سکھایا گیا ہے ۔ بہت سے لوگ توتے کو گالیاں سکھاتے ہیں اور جب بھی انھیں بھوک لگتی ہے اس سے گالیاں کھاتے ہیں ۔

توتے چوروں کو بہت پسند کرتے ہیں ۔ رات کے اندھیرے میں جب چور گھر میں داخل ہوتا ہے تو توتا ہی سب سے پہلے ان کا استقبال کرتا ہے لیکن چور اپنا استقبال پسند نہیں کرتے اور گھر کے لوگوں کے اٹھنے سے پہلے ہی واپس ہو جاتے ہیں ۔ توتا ان کو واپس جاتا دیکھ کر پھولے نہیں سماتا اور خوش ہو کر اپنی چونچ کا سوئچ آف کر دیتا ہے ۔

جناب مہر وردلوی

سالِ نو کا پیغام

لو آیا جنوری وہ دسمبر چلا گیا
سالِ گذشتہ باندھ کے بستر چلا گیا

پھر صبحِ نو کے ساتھ نیا سال آگیا
دنیا پہ ایک نورِ مسرت کا چھا گیا

ظلمت کو اپنے ساتھ وہ ہر غم کی لے گیا
یہ اور بات ہے ہمیں اک داغ دے گیا

کتنے ہی داغِ ماضی کے ہم بھولتے رہے
یونہی خوشی کے جھولے میں ہم جھولتے رہے

دل سے بھلا کے سالِ گذشتہ کی تلخیاں
جینا ہے سال نو میں امیدوں کے درمیاں

کرنا ہے ہم کو جشنِ مسرت کا اہتمام
دنیا ہے اتفاق و مساوات کا پیام

پیدا سکون و امن کی ہو جائے گی فضا
جنتا خوشی کے دیپ جلائے گی جابجا

بھارت کے نونہالو! ملا کر قدم چلو
اس طرح اپنی راہ ترقی پہ تم بڑھو

قایم تمہارے دم سے رہے امن و اتحاد
تم سے بڑھے گی دیس کی توقیر زندہ باد



جناب اہر اسر

سالار جنگ میوزیم کی سیر

یہ مضمون جو آپ ابھی پڑھیں گے یہ وہ تقریر ہے جو میں نے آل انڈیا ریڈیو دلی سے پہلی جون ۶۹ء کو صبح نو بجے اُردو سروس پروگرام میں نشر کی تھی۔

اگر کوئی شخص ہندوستان کے مشہور شہر حیدرآباد کی سیر کر چکا ہے تو اس نے کم سے کم حیدرآباد کی دو چیزیں ضرور دیکھی ہوں گی، ایک سلطان قلی قطب شاہ کا تعمیر کیا ہوا "چار مینار" جس نے چار سو سال پہلے شہر حیدرآباد بسایا تھا اور حیدرآباد کے نواب میر یوسف علی خاں کا سالار جنگ میوزیم۔

نواب میر یوسف علی خاں (جن کا خطاب سالار جنگ تھا) کے باپ دادا آصف جاہی بادشاہوں کے وزیر رہ چکے ہیں، باپ دادا نے کافی عرصے تک آصف جاہی بادشاہوں کی وزارت کی مگر یوسف علی خاں صرف ۱۲ ۱۹ء سے ۱۴ ۱۹ء تک حیدرآباد کے وزیر رہے۔

انھیں بچپن ہی سے صرف نایاب و نادر چیزیں دیکھنے کا شوق تھا۔ جہاں کہیں کوئی انوکھی چیز دیکھ لیتے فوراً خریدنے یا اسے حاصل کرنے کے لیے ضد کرتے اور خرید کر رہتے، ان کا یہ شوق عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتا گیا انھوں نے اپنی ساٹھ سال کی عمر تک اتنی چیزیں خریدیں یا جمع کیں کہ کہا جاتا ہے کہ اس سامان کا صرف ایک حصہ سالار جنگ میوزیم کی زینت ہے اور میوزیم بھی ایسا کہ ساری دنیا میں مشہور ہے اور دنیا بھر کے لوگ اسے دیکھنے کے لیے کڑی سے کڑی مشقت اٹھا کر حیدرآباد پہنچتے ہیں اور میوزیم کی آرائش اور اس کے عجائبات دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔

یہ میوزیم پہلے خود نواب یوسف علی خاں سالار جنگ کے محل دیوان ڈیوڑھی میں تھا۔ اب حال ہی میں یعنی پچھلے سال ٹھیک پہلی جون کو سارے کا سارا میوزیم نئی عمارت میں منتقل کر دیا گیا ہے۔

جونہی آپ میوزیم میں داخل ہوں گے تو سب سے پہلے تو آپ کو نواب صاحب کی بچپن سے بڑھاپے تک کی مختلف تصویریں نظر آئیں گی۔ کچھ آگے بڑھیے تو وسیع اونچے اونچے ستونوں والے دالان میں سنگ مرمر کے اتنے خوب صورت مجسمے آپ کو ملیں گے کہ آپ سمجھیں گے یہ سچ مچ کے انسان کھڑے ہیں اور

ذرا دم لے کر آگے چلیں گے۔

پاس والے کمرے میں طرح طرح کی گڑیاں ہیں، چینی، جاپانی، انگلینڈ کی بنی ہوئی شیشے کی گڑیاں، تانبے کانسے کی گڑیاں، پیتل کی گڑیاں، کانچ کی گڑیاں، صندل کی لکڑی کی گڑیاں، ایک خاص شوکیش میں جواہرات سے ترشی ہوئی ننھی ننھی گڑیاں پھر ان گڑیوں کے کھانے پینے کے برتن، ان کے گھر، ننھا سا اسکول، ایک چشمہ لگائے استاد جو لڑکوں اور لڑکیوں کے انتظار میں ہے۔ چھوٹا سا چپراسی جو گھنٹہ بجا رہا ہے، پھر ذرا ہٹ کر بے شمار چائے کے سٹ، شربت کے گلاس رنگ برنگ کی چڑیاں ایسی انوکھی انوکھی چڑیاں کہ ہم نے آپ نے اتنی اور ایسی چڑیاں تصویروں میں بھی نہ دیکھی ہوں گی۔

ہال میں کچھ آگے بڑھیے تو یہاں باجے ہیں، طرح طرح کے باجے، مشرقی ملکوں میں بجائے جانے والے باجے اور دور دراز ملکوں میں بجائے جانے والے باجے، آپ چاہے کوئی ساز بجانا نہ جانتے ہوں، مگر آپ کا دل چاہے گا کہ ان باجوں کو فوراً اٹھالیں اور رول رول شروع کردیں، پاس والے وسیع کمرے میں ننھی سی ریل گاڑی اسٹیشن پر کھڑی ہے۔ بڑا پیارا اسٹیشن ہے۔ آپ خود ہاتھ نہ لگائیں گائیڈ سے کہیے وہ آپ کو یہ ننھی سی ریل گاڑی چلا کر دکھادے گا۔ چھوٹا سا انجن پٹریاں بدلتا ہوا آگے بڑھے گا سگنل سے گزر کر ایک سُرنگ میں گھس جائے گا۔ بچے بھاگ کر سُرنگ کی دوسری طرف پہنچیں گے، اور ان پہنچنے تک رنگین پیارے پیارے نوڈبوں کو لیے انجن سُرنگ سے نکل کر ایک پل پر سے گزرتا ہوتا ہوا ... کے گیٹ کو طے کرکے دوسری طرف بنے اسٹیشن پر رُک جائے گا۔ بچے تالیاں بجاتے ہوئے اس کمرے سے نکل کر پاس والے کمرے میں داخل ہوتے ہیں یہاں دیہات کا نقشہ کھنچا ہوا ہے، ایک گاؤں میں کیا کیا چیزیں ہوتی ہیں۔ یہاں مورتیوں مجسموں، عمارتوں کی شکل میں دکھائی گئی ہیں۔

سلونے پہاڑ، بچھاتی ندیاں، پھیلے ہوئے ہرے ہرے کھیت، آم کے پیڑ، پیڑوں میں جھولے پینگیں لیتی ہوتی لہنگا پہنے ہوئے عورتیں، کنواں، کسی کے سر پر دو کسی کے سر پر چار مٹکیاں، پھر تحصیل، عدالت کا گھنٹہ، وکیل، موکل، پاس ہی کا مدرسہ، بچے پڑھ رہے ہیں۔ اپنی لمبی لمبی سلیٹ پر اور تختیوں پر لکھ رہے ہیں، گاؤں کا استاد پگڑی باندھے چھڑی لیے ایک لڑکے کو مُرغا بنائے کھڑا ہے۔ اسکول سے آگے بڑھیے تو ایک مندر ہے، مسجد ہے، ملّا اذان کے لیے ہاتھ کانوں سے لگائے ہوئے۔ ادھر جوہڑ میں بھینسیں ہیں، ایک بھینس پر چرواہا بیٹھا بانسری بجا رہا ہے، دوسری طرف شادی ہے۔ منڈپ سجا ہے، نوبت والے جھوم جھوم کر بجا رہے ہیں۔ پھر ادھر کھپریل کے کچے گھروں کی قطاریں اور پختہ مکان ہیں۔ پھر سبزہ زار ہے

ہے) میدان سے ادھر کچھ گلیاں اور آخر میں دریا کے کنارے مرگھٹ اور قبرستان تک دکھا دیا گیا ہے۔

دوسرے کمرے میں آیئے تو سارا کمرا ہاتھی دانت کے سامان سے بھرا ہے، ہاتھی دانت کی ڈبیاں، ایش ٹرے، چھوٹی بڑی کٹوریاں، سنگھار کے آئینے، پیالیاں، گلاس، تاج محل اور دوسرے منظر، تصویریں، پرندے، شیر، ببر، ہاتھی گھوڑے، ہرن، طرح طرح کی کھیل کی چیزیں، پہاڑ درخت غرض وہ کون سی چیز ہے جو ہاتھی دانت کی بنی ہوئی نہیں ہے۔

اس کمرے سے ملا ہوا ایک وسیع ہال ہے جس میں ایسی جنگ کے میدان کا نقشہ ہے جس میں دنیا بھر کے بے شمار ملکوں کی فوجیں طرح طرح کے رنگین لباس پہنے جنگ کے لیے تیار کھڑی ہیں، میدان میں قدیم طرز کی لڑائی کے سامان بھی ہیں تو جدید طرز کی لڑائیوں میں کام آنے والے خوف ناک طیارے ٹینک اور بم موجود ہیں۔ سارے میدان میں ننھے ننھے سپاہی صفیں بنائے کھڑے ہیں۔ اتنے سپاہی ہیں اتنے سپاہی ہیں کہ گننا مشکل ہے۔

آگے اس کمرے میں آیئے یہاں انگلستان اور فرانس کے قدیم اور مشہور کارخانوں کے بنائے ہوئے طرح طرح کے رنگ برنگے کھلونے ہیں۔ اتنے کھلونے اور ایسے عجیب غریب کھلونے کہ آپ انھیں دیکھ کر دنگ رہ جائیں، یہ تو تھا اس حصّے کا

اس کے علاوہ سامنے میوزیم میں کانسے تانبے، لکڑی سنگِ سیاہ اور سنگِ مرمر کے بے شمار قدِ آدم مجسمے ہیں زہر پہچاننے والے کھانے کے برتن ہیں، یشب عقیق الماس اور دوسرے جواہرات کی انگوٹھیاں ہیں۔ مشہور بادشاہوں اور شہزادیوں کے خنجر ہیں، بابر ہمایوں اور نور جہاں کے تاریخی خنجر ہیں۔ طرح طرح کے گل دان ہیں چینی اور جاپانی نوادرات ہیں، مشہور مصوروں کی بنائی ہوئی بڑی بڑی تصویریں ہیں۔ مصری سامان ہے۔ برما کی قیمتی لکڑیوں سے تراشے ہوئے بت مورتیاں اور مندر ہیں۔

لکڑی میں تراشا ہوا ایک بہت بڑا ایسا مجسمہ ہے جس کو آپ سامنے سے دیکھیں تو ایسا معلوم ہوگا کہ کوئی مال دار عرب تاجر اکڑا ہوا کھڑا ہے، اور اسی مجسمے کو دوسری طرف سے دیکھو تو ایک حسین عورت اپنا سر خم کیے ادب سے سلام کر رہی ہے، سنگِ مرمر کا ایک ایسا مجسمہ بھی ہے جس میں ایک دلہن کو سر سے پاؤں تک نہایت نفیس ریشمی نقشی چادر اوڑھے ہوئے دکھایا گیا ہے، چہرہ چادر سے ڈھکا ہونے کے باوجود یہ نقش صاف دکھائی دے رہے ہیں اور یہی نہیں چہرے پر شرم وحیا کے بھی پورے پورے آثار ہیں۔

پھر قیمتی قالینوں، میزوں کرسیوں اور دوسرے قیمتی فرنیچر سے کمرے کے کمرے بھرے پڑے ہیں۔ دو بڑے بڑے ہال قدیم طرز کے کپڑوں اور ہتھیاروں کی وضع کی

اور جامدانی کے انگرکھے، ان دنوں کی بنائی ہوئی کشمیر کی شالیں، کمخواب زربفت مشرو ہمرو کے تھان، بنارسی ساڑیاں، ڈوپٹے، قدیم اوڑھنیاں لٹکی ہوئی ہیں تو شیشوں کی الماریوں پر سونے کا کام کیا ہوا ہے۔ یہاں ہاتھی دانت کی دو چار کرسیاں بھی ہیں جو فرانسیسیوں نے ٹیپو سلطان کو تحفہ میں دی تھیں۔ کمرۂ جواہرات، قدیم و جدید ہتھیاروں کے کمرے، یہاں نہ صرف مشرقی

لوہار ایک گرم سلاخ کو پیٹ رہا ہے۔ سلاخ کی ہر چوٹ ایک سکنڈ کو ظاہر کرتی ہے۔ دوسری طرف ایک چھوٹا سا کمرہ ہے جس میں ایک چھوٹا سا خوبصورت دروازہ لگا ہوا ہے۔ جو اندر سے بند ہے۔ جب دس یا گیارہ بارہ جب بھی گھنٹہ بجنے کا وقت آتا ہے جیسے ہی گھڑی کی بڑی سوئی بارہ پر پہنچتی ہے اس کمرے سے ایک ننھا سا آدمی نکلتا اور رک رک کر گھنٹے مارا

زندگی کی بات کرو

ہٹاؤ غم کے فسانے خوشی کی بات کرو
نیا ہے سال نئی زندگی کی بات کرو

قدم قدم پہ دیے جل اٹھیں گے الفت کے
بنے یہ کام جو تم دوستی کی بات کرو

حیاتِ نو کا پڑے عکس خشک کلیوں پر
چمن میں اب تو اسی تازگی کی بات کرو

بھرا ہے عزم کی دولت سے دل کا دامن جب
تو زندگی میں نہ ہرگز کمی کی بات کرو

مٹا سکے جو اندھیرا دلوں سے نفرت کا
جہاں میں اب تو اسی روشنی کی بات کرو

جناب سید محمد شفیع تمنا کلکتوی

ملکوں کا سامان ہے بلکہ یورپی نوادرات کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ بلکہ نایاب تصویروں کے علاوہ سات سو سے زیادہ چھوٹی بڑی گھڑیاں ہیں۔

میوزیم دیکھنے کے لیے آنے والا بچہ ہو یا جوان ہو یا بوڑھا ہو۔ جب گھنٹہ بجنے کا وقت آتا ہے تو وہ میوزیم کے کسی حصے میں ہو اس وسیع صحن میں ضرور پہنچ جاتا ہے جہاں ایک بہت بڑی گھڑی رکھی ہوئی ہے۔ اس گھڑی کے اوپر کے حصے میں داہنی طرف ایک

جاتا ہے جو وقت ہوتا ہے اس حساب سے وہ رک رک کر گھنٹے مارتا جاتا ہے اور جیسے ہی گھنٹے ختم ہیں۔ وہ اپنے کمرے میں واپس جا کر دروازہ اندر سے بند کر لیتا ہے اور لوگ تعجب سے دنگ رہ جاتے ہیں۔

کبھی حیدرآباد آؤ تو چاہے ہم سے ملو نہ ملو مگر اس میوزیم کی طرف ضرور جاؤ۔

جناب محمد یوسف پاپا

اُلّو



جس طرح پرندے ہوتے ہیں — اڑتے ہیں کھاتے سوتے ہیں
اُلّو بھی ایک پرندہ ہے — اب تک دھرتی پر زندہ ہے
ویرانے میں وہ رہتا ہے — انساں سے نہیں کچھ کہتا ہے
وہ دن میں نکل سکتا ہی نہیں — سورج سے بہل سکتا ہی نہیں
اندھیرے سے ہے پیار اُسے — راتوں کا کہو سردار اسے
منحوس وہ سمجھا جاتا ہے — بدبختی سب پر لاتا ہے
جو وہم کی پوجا کرتے ہیں — اس کے سائے سے ڈرتے ہیں
جس آبادی میں بولے گا — ویراں اس کو کر ڈالے گا
یہ باتیں دنیا والوں کی — گوروں کی کہو یا کالوں کی
سب اُلّو کے اوصاف میں ہیں — انسانوں کے انصاف میں ہیں
لیکن بچّو سب جھوٹ ہے یہ — بے انصافی ہے لوٹ ہے یہ
منحوس کوئی جاں دار نہیں — بے پر بھی نہیں پردار نہیں
انساں جو حماقت کرتا ہے — وہ غیروں کے سر دھرتا ہے
خود بستی کو ویراں کر دے — الزام پرندے پر دھر دے

دراصل بُرا انساں خود ہے
ظالم کا چہرا انساں خود ہے

سوشندا داس لپتا
ترجمہ جناب حمید عثمانی

سری



"ٹوٹن۔ ٹوٹن۔ ٹوٹن چندا"

کوٹھے کی چھت سے ٹوٹن نے سُنا چھوٹی پھوپھی گھر بھر میں اُسے ڈھونڈتی پھر رہی تھیں۔ نیچے کی منزل میں اتنا ہنگامہ کہ ٹوٹن کو وہاں قطعی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ پہلے اس وقت ہمیشہ دادی جی ہر کمرے میں سندھیا کرتی تھیں۔ ان کے ساتھ ساتھ ٹوٹن گھومتا رہتا تھا۔ پھیلاتی ہوئی اگر دانی سے لہراتا ہوا خوش بودار دھواں اٹھا کرتا۔ ٹوٹن کو یہ بہت اچھا لگتا۔ اس کے بعد کچھ اور اندھیرا ہو جاتا تو ٹوٹن کوٹھے کی چھت پر چڑھ جاتا۔ چٹائی بچھا کر بابا کے پاس لیٹا ہوا چپ چاپ گہرے نیلے آسمان کی طرف دیکھتا رہتا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے ستارے اسے اشارے سے بلا رہے ہوں۔ بہت دور آسمان پر ایک چھوٹا سا تارا ہے۔ اس کے نزدیک ہی ایک سبز رنگ کا تارا جگمگایا کرتا ہے۔ لیکن وہ کوئی معمولی تارا نہیں ہے۔ دراصل وہ ایک سبز جزیرہ ہے۔ وہ پریوں کا دیس ہے۔ پریوں کا دیس ہیروں کا بنا ہوا ہے۔ اسی لیے تو ہر وقت جگمگاتا رہتا۔

اسی سبز رنگ کے خوابوں کے دیس میں ٹوٹن کی ماں گھومنے گئی ہیں۔ بہت دور کے دیس میں ہی چلی گئی ہیں۔ مگر اب واپس آنے کا راستہ نہیں کر پا رہی ہیں۔ اس لیے ٹوٹن کی ماں اس طرف ٹکٹکی باندھے دیکھا کرتی ہیں۔ شام کا ستارا آسمان پر اپنے سنگی ساتھیوں کو بلاتا ہے تو کچھ ستارے نکل آتے ہیں۔ اور پھر ٹوٹن اپنی ماں کو بھی کے ستارے میں صاف دیکھ سکتا ہے۔

ٹوٹن سب جانتا ہے۔ بابا ہی نے تو اس کو کچھ بتایا ہے۔ شام کے تارے کے پاس والے میں ہی تو ماں رہتی ہیں۔ ٹوٹن بڑا ہو کر راکٹ کے ذریعے سبز ستارے کے ملک جائے گا۔ اور ماں کو پھر واپس لیتا آئے گا۔ بابا کو کس قدر تعجب ہوگا۔ دادی جی تو یقین ہی نہ کریں گی کہ ان کا ٹوٹن اس قدر بہادر ہے۔

پھوپھی زاد نیلو بھیا کہتے ہیں: "ہٹ با

تاروں کے دیس میں بھلا کوئی رہتا ہے تو تو کچھ بھی نہیں جانتا۔"

ٹوٹن کہتا ہے "میں جانتا ہوں میری ماں وہاں ہیں بابا نے بتایا ہے۔ بابا تم سے کتنے بڑے ہیں کیا تم بابا سے زیادہ جانتے ہو۔"

نیلو بھیا کہتے ہیں "تم خاک جانتے ہو مما نے تو "

نیلو بھیا کی بات پوری نہیں ہونے پاتی کہ چھوٹی پھوپھی ڈانٹنے لگتی ہیں "افسوس نیلو تم ایک معصوم بچے کو بہلائے نہیں رکھ سکتے۔"

چھوٹی پھوپھی کی آواز بھرا جاتی ہے۔ وہ اسے اپنی گود میں اٹھا لیتی ہیں۔

"ٹوٹن چاند چلو میں تم کو ایک بہت اچھی سی کہانی سناؤں۔"

ٹوٹن پھوپھی کے کان میں چپکے سے اپنے دل کی بات کہہ دیتا ہے "ماں کی کہانی سناؤ پھوپھی۔"

یہ کہانی سناتے وقت پھوپھی کی آنکھیں ڈبڈبا آتی ہیں۔ اس کہانی میں برآمدے کے سبز فرش پر اچھے اچھے بیل بوٹے بنائے جاتے ہیں۔ چھم چھم کرتی لال بنارسی ساری اور ڈھیر سارے گہنے پہنے پریوں کی کہانی والی شہزادی کی طرح ماں اس سجے سجائے فرش پر چلتی ہیں۔ دادی جی اور پھوپھیاں سب بہت خوشیاں مناتی ہیں۔ سنکھ بجائے جاتے ہیں۔ چراغ کی روشنی میں دادی جی شہزادیوں جیسی ٹوٹن کی ماں کو دیکھتی ہیں۔ اس کہانی کے سارے و... ٹوٹن کے سامنے ناچا کرتے۔ اسے یہ قصہ اتنا... ہو گیا تھا کہ جیسے کل کی ہی بات ہو۔ اس کے ... سے دل نے کچھ بھی تو نہیں بھلایا تھا۔

اس دن کی صبح خوب روشن اور چمکیلی تھی سو کر اٹھنے پر ٹوٹن نے سنا تھا کہ ماں کی طبیعت بہ... خراب ہے۔ آج بالکل ہی شرارت نہیں کرنی ہے۔ ماں کو تکلیف ہوگی۔ آج وہ اور دنوں کی طرح بہا... نہیں کر رہی ہیں۔ اچھے لڑکے کی طرح اس نے خو... سے ہی دودھ پی لیا۔ پرانی ماما اسے گھمانے لے جا... ہے۔ باغ میں مدھ مالتی اور دوسری رنگین پھولو... پر بیٹھی تتلی کو وہ بڑے تعجب سے دیکھتا رہا۔ پارو... ماں نے اس کے لیے بہت خوب صورت سا ہا... بنا دیا۔ تھوڑی دیر کھیل لینے کے بعد ماں کے ... اس کی طبیعت بے چین ہونے لگی۔ قریب پہنچتے ہی ٹوٹن کی جانب ماں نے ہاتھ بڑھایا۔ وہ بہت دیر تک اسے سینے سے لگائے رہیں۔ دھیرے د... سر اور جسم پر ہاتھ پھیر کر پیار کیا۔ اس کے بعد انھوں نے اس کے سر کو چوم کر کہا "خوب اچھے لڑکے بن کر رہنا۔"

کچھ دیر بعد ماں کو کہیں اور لے جایا گیا۔ وہاں بچوں کے لیے جانا منع تھا۔ دادی جی کی گود میں ٹوٹن پھاٹک تک آیا۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے ماں کو زرد رنگ کے پھول دیئے۔ اس نے کہا

ممّاں اسے اپنے بالوں میں لگا لیجیے۔" گاڑی دھیرے سے باہر نکل گئی۔ اَپّو کے مکان کے سامنے سے گذری، کونے والے مکان کے تاڑوں کا جھنڈ گذرا اور تھوڑا آگے بڑھ کر گاڑی مڑ گئی اور نظروں سے اوجھل ہو گئی۔ اس وقت تک لوٹن کا ننھا سا ہاتھ ماں کے لیے ہلتا رہا۔

دوپہر ڈھل چکی تھی۔ جب اسے جگایا گیا تو موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ اس بڑے سے مکان میں جو روز اسکول جاتے وقت راستے میں پڑتا تھا سب لوگ گئے۔ مکان میں نہ جانے کس طرح کی تیز تیز بو پھیلی تھی۔ خوب لمبے چوڑے برآمدے سے ملے ہوئے نمبر لگے۔ ایک قطار میں بہت سے کمرے تھے کمروں کے دروازوں پر پردے پڑے تھے۔ سفید کپڑے پہنے اور اپنے سروں پر رومال باندھے کچھ عورتیں کاموں میں مصروف اِدھر اُدھر آجا رہی تھیں۔ ڈاکٹر چچا سے بھی ایک بار لوٹن کی ملاقات ہوئی۔ بابا نے نہ جانے کیا ایک کاغذ پر لکھ کر انھیں دیا جس کو پڑھ کر دادی جی نے کہا "خدا کو یاد کرو وہ بڑا کریم ہے اپنا فضل کرے گا۔"

لوٹن یہ سب باتیں ٹھیک سے نہیں سمجھ سکا۔ تجسس بھری نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کھڑکی کے پاس ایک شیشے کے بکس میں لال نیلی مچھلیاں کھیل رہی تھیں۔ دیوار پر گھڑی کا پنڈولم یکساں ٹک ٹک کیے جا رہا تھا۔ دور ٹیلی فون کے پاس ایک میم صاحب بیٹھی ہیں وردی پہنے ہوئے دو آدمی سیڑھیوں نیچے اترے۔ وہ لوگ بستر کی طرح کوئی چیز اٹھا۔ ہوئے لا رہے ہیں۔ اس طرح اس نے پہلے کبھی دیکھا تھا۔

"اس بستر پہ کون لیٹا ہے دادی ماں۔" نے بہت دھیمی آواز میں پوچھا۔ دادی جی نے کہ تمھاری ماں لیٹی ہوئی ہیں۔

برآمدے کے ایک سرے پر سبز رنگ ایک کمرے میں سب جاتے ہیں۔ کمرے کا پردہ کش بادبان کی طرح بار بار پھول رہا ہے۔ بارش سے دھلا یا آسمان چمک رہا ہے۔ بڑی سی کھڑی۔ لوہے کا ایک اونچا سا پلنگ ہے، دودھ کی سفید بستر پر ماں لیٹی ہوئی سو رہی ہیں۔ سفید کے باہر ماں کا چہرہ اور بھی سفید نظر آرہا ہے پلنگ پاس ہی سلاخ سے ایک الٹی بوتل لٹک رہی۔ اس کے ساتھ ایک ٹلکی لگی ہوئی ہے۔ اس کا ایک ماں کی پٹی بندھے ہوئے ہاتھ میں لگا ہوا ہے۔ ا لوٹن کو ڈر محسوس ہونے لگا۔

"ماں کب جاگیں گی؟" لوٹن نے دادی کان میں پوچھا۔

"بس تھوڑی ہی دیر میں جاگیں گی میرے دادی جی نے کہا۔

"چلو ہم لوگ گھر چلیں ماں جاگیں گی آ آجائیں گی۔"

ماں کو چھوڑ کر وہ نہیں آنا چاہتا تھا۔ پھر بھی آنا ہی پڑا۔ پوری شام لوٹن کا دل بے چین رہا کوئی چیز اچھی ہی نہیں لگتی تھی۔ رات گئے جب چھوٹی پھوپھی آئیں اس وقت بھی وہ بہت اُداس تھا۔ اس کے بعد پتہ نہیں کب روتے روتے سو گیا۔

صبح ہونے پر لوٹن نے سنا کہ ماں گھر واپس آئیں گی۔ کتنے مزے کی بات ہے۔ وہ تالیاں بجانے لگا۔ اچھا تو ماں ٹھیک ہو گئیں۔ اب ماں کو لوٹن کہیں نہ جانے دے گا۔ کل شام کو سنائن بھیّا نے سیار اور بھالو کا جو مزے دار قصہ سنایا تھا اسے وہ ماں کو بھی سنائے گا۔

ماں ابھی آئیں گی مگر دادی جی کی آنکھوں میں آنسو کیوں ہیں۔ لوٹن کے کچھ سمجھ ہی میں نہیں آ رہا تھا۔ ایک ایک کر کے سب پھوپھیاں آئیں۔ ماموں جان کے یہاں سے لوگ آئے۔ اتنے سارے لوگ آئے کہ پورا مکان بھر گیا۔ یہ لوگ اس قدر پھول کیوں لائے ہیں؟ کیا کسی کی پیدائش کا دن ہے۔ لوٹن کی پیدائش کے دن پورا گھر پھولوں سے سجایا جاتا ہے۔ پھولوں کا تاج پہنا کر لوٹن کو اس کی ماں راجہ بناتی ہے۔ نئے کپڑے پہن کر وہ ماں کی گود میں بیٹھ کر کھاتا ہے۔ کون جانے ہو سکتا ہے آج کسی کی پیدائش ہی کا دن ہو۔

"لوٹن ایک بار ماں کو دیکھ لو" مینا خالہ نے

دادی جی کے پاس سویا تھا۔ سب بار بار یہی کہتے تھے کہ اب لوٹن بڑا ہو گیا ہے۔ وہ ایک بارگی جیسے شرما شرمایا سا رہنے لگا۔ ماں ضرور کہیں گی "میرا دلارا میرا چاند سچ مچ کتنا بڑا ہو گیا ہے"۔

دروازے کے قریب سے لوٹن نے جھانک کر دیکھا۔ یہاں ماں سو رہی ہیں۔ اگر ایسا ہے تو انھوں نے کپڑے کیسے تبدیل کر لیے اور ان کے چہرے پر چندن کیسے لگا۔ پھر تو یقینی ماں کی ہی پیدائش کا دن ہو گا۔ لیکن ماں سوتی ہی کیوں رہتی ہیں۔ لوٹن بے چین ہو جاتا ہے "اے دادی بی بی اے پھوپھی۔ ماں جاگتیں کیوں نہیں"؟ کوئی اس کے سوال کا جواب نہیں دیتا۔ لوٹن چیخ پڑتا ہے "ماں اے ماں آپ نہ اٹھیے گا کیا؟" وہ ماں کے سینے سے لگ جاتا ہے۔ اتنا پکارتا ہوں مگر ماں جواب ہی نہیں دیتی ہیں۔ اس کی ماں شاید بہت زیادہ تھک کر ہلکان ہو گئی ہیں اور اسی وجہ سے مسلسل سوتی رہتی ہیں۔

شام ہو جاتی ہے سیاہ رات اپنے ساتھ گہرا اندھیرا لیے ہوئے آتی ہے۔ بابا سے لوٹن کی ملاقات ہوئی۔ اُلجھے اُلجھے بال سرخ سرخ آنکھیں اسے دیکھتے ہی اٹھا کر سینے سے لگا لیتے ہیں۔

ماں کہاں ہیں۔ ماں نہیں ہیں کیا۔ راتوں کو جب نیند نہ آتی تو لوٹن ہاتھ بڑھا کر ماں کو تلاش کرتا ہے۔ تمام رات ماں کے کمرے میں روشنی رہتی

گئی ہیں لیکن ٹوٹن کو کیوں نہیں لے گئیں کل سے تمام دن وہ اچھا لڑکا بنا رہا۔ پھر بھی نہیں لے گئیں۔

جب ٹوٹن پریشان کرتا ہے تو بابا اسے کوٹھے کی چھت پر لے جاتے ہیں۔ بھائیں بھائیں کرتے ہوئے بالکل سنسان آسمان پر نکلے ہوئے تارے دکھاتے ہیں کس تارے پر ماں ہیں کس تارے پر دادا میاں ہیں۔ سب اس کو پہچنواتے ہیں ۔۔۔۔ بڑا ہو کر اسپٹ نک پر چڑھ کر ٹوٹن وہاں جائے گا۔ وہ بہت بڑا سائینس دان بنے گا۔ ماں کو پھر واپس لائے گا۔ خاموش دوپہر کو جب دل اداس ہو جاتا ہے تو ٹوٹن ماں کی تصویر کے پاس جا کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

"اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ سب تو سیکھ گیا ہوں دیکھیے گا آپ کو کتنا اچھا خط لکھوں گا۔ ماں آپ مجھ کو خط کیوں نہیں لکھتی ہیں۔ میں کیا آپ کو بالکل ہی نہیں یاد آتا؟"

خوب بڑے سے فریم میں لگ جانے کے بعد ماں کی تصویر ہر وقت جیسے ہنستی رہتی ہے۔

ایک دن ٹوٹن سے چھوٹی پھوپھی نے بہت پیار سے کہا "ٹوٹن بہت جلد ہی تمھاری ماں آنے والی ہیں"۔

"سچ چھوٹی پھوپھی" خوشی کے مارے وہ جوش میں نیلو بھیا کی سائیکل سے دست بردار ہو کر اٹھ کھڑا ہوا "ماں کب آئیں گی"

"بہت بدھو کہیں کا" نئی ممانی آنے والی ہیں" نیلو بھیا نے کہا۔

ٹوٹن بہت ناراض ہوا "نئی ممانی کون ماں ہی آئیں گی نا" پھوپھی اسے دلاسا دیتی ہیں۔

آخر کار ماں نے واپسی کا راستہ تلاش کر ماں کو کتنا تعجب ہوگا کہ ٹوٹن نے کتنی ڈھیر ساری چیزیں سیکھ لی ہیں اور کتنا بڑا ہو گیا ہے۔ ٹوٹن دل ہی دل سوچتا ہے، ماں کو کون کون سی نظمیں سنائے گا ماں۔ کہے گا کہ وہ روز انھیں کوٹھے کی چھت سے دیکھا کرتا ماں کی تصویر کے پاس جا کر وہ کہنے لگا۔ ماں تم کب آؤ گی۔ میرے لیے چاند تاروں کے دیس سے کیا لاؤ

ٹوٹن نے دن گننے شروع کر دیے۔

پھر ایک دن بڑے برآمدے کے فرش پر پتیاں بنائی گئیں۔ ہر کمرے میں سنکھ بجنے لگے۔ وا بی بھی کتنی ناسمجھ ہیں ماں آ رہی ہیں مگر وہ پھر بھی آنچل سے آنکھ پونچھتی رہتی ہیں۔ بڑی رونی ہیں با خالہ کے چھوٹے بچے کی طرح۔

کوٹھے کی چھت پر آکر چھوٹی پھوپھی بلاتی "کیا ماں کو نہیں دیکھو گے"

لال سلک کا کرتا پہنے ٹوٹن متانت سے ہے "ماں مجھ کو پہچان ہی نہ پائیں گی ــــــ دیکھیے چھوٹی پھوپھی میں کس قدر بڑا ہو گیا ہوں۔ مگر میں پہلے ماں سے بات نہ کروں گا۔ ماں مجھ کو اپنے لے کر کیوں نہیں گئی تھیں"۔

چھوٹی سی مٹھی میں پھوپھی کا آنچل پکڑ کر

نیچے اترا- دوسری منزل کے بڑے کمرے میں کتنی بھیڑ ہے
ٹولو آپا بولو آپا بینو پھوپھی سب ہی تو ہیں- اس کی ماں کہاں
ہیں- انگلی کے اشارے سے چھوٹی پھوپھی اسے بتا دیتی
ہیں- ٹوٹن کے دل میں خوشی اور رنج کا ایک چشمہ اُبل پڑتا ہے-
یہی تو ہیں ٹوٹن کی تصویر والی ماں خوابوں میں
رہنے والی ماں- بنارسی ساڑی پہنے سر جھکائے بیٹھی
ہیں- ماں کتنی گوری ہو گئی ہیں دودھ کی طرح سفید ہاتھوں
میں جگ مگ کرتی چوڑیاں کڑے اور کنگن ہیں جن پر نظر
نہیں ٹھہرتی ... ٹوٹن کو دادی بی قریب بلاتی ہیں- پھر
بھی ماں اپنا چہرہ اوپر نہیں اٹھاتیں- ٹوٹن ٹھٹھک
کر کھڑا ہو جاتا ہے- اس کا گلا رُندھنے لگتا ہے- کیوں آخر
پہلے کی طرح بے تاب باہوں سے ماں اسے سینے سے کیوں
نہیں لگاتیں؟ پریوں کے دیس میں رہ کر کیا ماں اسے
بالکل بھول گئیں- شہزادی کی طرح سجی ہوئی ماں کے کنول
جیسے ہاتھ میں گہرے سرخ رنگ کا ڈبا ہے- اس کے اندر
کیا ہے اس کے اندر ٹوٹن کے لیے کوئی تحفہ ہے کیا؟

دادی بی بہت پیار سے بولیں "بہو یہ رہا تمہارا بیٹا-
تمام دن ماں کب آئیں گی، ماں کب آئیں گی کی رٹ لگائے
راستے کی طرف تکتا رہتا ہے- لو اس کو اپنی گود میں کھینچ لو"
ماں کیا سچ مچ اسے پہچان نہیں رہی ہیں- وہ اتنا بڑا ہو گیا
ہے؟ اس کی آنکھیں جلنے لگتی ہیں وہ زور سے اپنے ہونٹ
دانتوں کے نیچے دبا لیتا ہے- دوڑتا ہوا کر وہ ماں
کے پاس جانے کی کوشش کرتا ہے- بڑی پھوپھی اسے
آگے کر دیتی ہیں، ماں کی گود کے قریب پریوں کے دیس
سے آئی ہوئی گوری چٹی سجی سجائی ماں ٹوٹن کی طرف
دیکھنے لگتی ہیں-

یہ کون سی ماں ہیں- ان کی نظروں میں ٹوٹن کی
پرانی ماں کی طرح نرمی اور ٹھنڈک نہیں- ان کی دھیری پر
لگی آنکھوں میں ایک طرح کی کرختگی ہے- یہ تو اس کی وہ
ماں نہیں جو تاروں میں چھپی رہتی ہیں- جو ماں بادلوں میں
ٹوٹن کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتی ہیں- اُن کے وہ امرت
برسانے والے چراغ کہاں کھو گئے- آنکھ جھپکتے ہی وہ
بڑی پھوپھی سے ہاتھ چھڑا کر تیزی سے بھاگا-

سب نے اسے ٹھگ لیا ہے-... کیا اُس
دن وہ اسی دوسری ماں کی راہ دیکھتا رہا- ان دوسری
ماں کی اسے ضرورت نہیں- اس کی پرانی ماں جو غصہ
ہو جانے پر مارا کرتی تھیں اور اچھے لڑکے بن کر رہنے پر
خوب جی بھر کر پیار کیا کرتی تھیں یہ تو وہ والی ماں نہیں
ان کی گود میں تو وہ لیٹ کر کہانیاں سنا کرتا تھا اور نیند
میں رہ رہ کر ان کے گلے لگ جایا کرتا تھا- وہ دکھ سکھ کے
دنوں کی اس کی جانی پہچانی ماں کدھر گئیں-

40359 اس کی وہی اکیلے اکیلے چلی جانے والی ماں جو
دور ستاروں کے دیس میں راستہ بھول کر واپس نہیں
آسکیں، وہ اس تصویر میں جانے والی ماں کو یاد کرتا
گہری بے پناہ تاریکی میں کوٹھے کی چھت پر تنہا ٹوٹن
سسکیاں بھر بھر کر [illegible] ہے- [illegible] گالوں پر
موتیوں کی طرح کے آنسوؤں میں دور سبز ستارے کی
روشنی ٹمٹمایا کرتی ہے-   (بنگلہ سے)

جناب ڈاکٹر امانت

اے میرے نورِ نظر

نور برساتی ہوئی صبح کی دیوی آئی
اُٹھ میرے نورِ نظر جگ میں اجالا پھیلا

کھول کر آنکھ ذرا دیکھ سحر کا منظر
نور ہی نور نظر آتا ہے ہم دیکھیں جدھر
ہوگیا آنکھ جھپکتے ہیں اندھیرا غایب
جس طرح شام کو ہوتا ہے اجالا غایب
پھر چمکنے لگیں سورج کی بدولت کلیاں
دیکھ پانے لگیں کھوئی ہوئی زینت کلیاں
صبح کی یہ پہلی کرن سب کو جگا جاتی ہے
ایک ہلچل سی جہاں بھر میں مچا جاتی ہے
کارخانوں میں بڑے شوق سے مزدور چلے
گنگناتے ہوئے، ہنستے ہوئے، مسرور چلے
لوتا مینا ہوں، کبوتر ہوں یا کوے، بگلے
صبح ہوتے ہی سبھی پیٹ کی خاطر نکلے
چہچہاتی ہیں درختوں پہ بھی پیاری چڑیاں
تجھ کو گا گا کے جگاتی ہیں یہ ساری چڑیاں
ان پرندوں کا ہے انسان پہ احسان بہت
سیکھنا ہے تجھے ان سب سے مری جان بہت
جگ میں راحت اسے ملتی ہے جو تکلیف سہے
چاہیے تجھ کو سدا وقت کا پابند رہے




نور برساتی ہوئی صبح کی دیوی آئی
اٹھ میرے نورِ نظر جگ میں اجالا پھیلا

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

جنت اور دوزخ کے اشارے

ہر مسلمان بچے اور بچی کو جب شعور آتا ہے، جنت اور دوزخ کا نام سن لیتا ہے، پھر جوان ہوتا ہے، بوڑھا ہوتا ہے۔ مگر جنت اور دوزخ کا نام برابر سنتا رہتا ہے، وہ سنتا ہے کہ جنت میں موتیوں اور زمرد کے محل ہوں گے۔ ایک سے بڑھ کر ایک پھل ہوگا، تازہ پھل، نہ جس میں داغ ہوگا نہ کٹا پھٹا ہوگا۔

اعلیٰ قسم کے کھانے، مہکتی ہوئی ہوائیں، نہ سردی نہ گرمی، نہ گھٹن، نہ بیماری۔ پھر جب وہ قرآن پڑھتا ہے اور ترجمہ دیکھتا ہے۔ جب بھی جنت، دوزخ کا ذکر سامنے آجاتا ہے۔ وہ پڑھتا ہے کہ نیک اور اچھے کام کرنے والوں کو آخرت میں جنت ملے گی، اور برے کام کرنے والے دوزخ میں جائیں گے جنھوں نے خدا کی نافرمانی کی جنھوں نے لوگوں کو گالیاں دیں، جنھوں نے کسی کی دولت لوٹی یا کسی کی چیز چرائی۔

دوزخ میں زہریلے سانپ ہوں گے کہ جس کسی کو لپٹ جائیں گے تو ڈستے ہی رہیں گے۔ آگ ہوگی جس کی لپٹ انھیں جلائے گی۔

لیکن اگر ہمارے بچے اور بچیاں ذرا سوچیں تو دوزخ اور جنت خود ان کے گھروں میں ہے۔ مگر ان کے اشارے سے انھیں عبرت نہیں ہوتی سبق نہیں ملتا۔ دیکھیے۔

یہ فرید اور فریدہ ہیں۔ ان کے ابا بڑی اونچی سرکار کے نوکر ہیں۔ فرید کے ابا نے بڑی محنت سے نوکری کی ہے۔ اس لیے انھیں تنخواہ بھی زیادہ ملتی ہے اور الاؤنس بھی بڑھ گیا ہے۔

فرید کے گھر میں اب تک سبزی اور دال کے سوا کچھ نہ پکتا تھا، اور وہ بھی کم گھی کا جس میں نام کو مزہ نہ ہوتا تھا، مگر اب روز کے روز حلوے پکتے ہیں قورمہ پکتا ہے، بریانی تیار ہوتی ہے۔ صبح کے ناشتہ میں پراٹھے اور انڈے اور کبھی توس اور مکھن بھی۔

باریک اور خوشبودار چاولوں کی بوری آگئی ہے عمدہ قسم کی چینی بھی منگالی گئی ہے۔ خالص دیسی گھی بھی۔ فرید کے گھر میں اب کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ نہ سامان کی نہ روپیہ پیسے کی۔

مکان پر رنگ ہو رہا ہے، ریشمی پردے لٹکائے جا رہے ہیں، ریڈیو آگیا ہے جس سے دنیا کی خبریں سنی جاتی ہیں، اور جس میں گانے گائے جاتے ہیں۔

یہ سب فرید کے ابا کی جاں فشانی کا پھل ہے۔ انھوں نے نہ گرمی دیکھی نہ سردی کا خیال کیا۔ محنت سے ملازمت کرتے رہے اور کوئی ایسا کام نہ کیا جس سے ان کا مالک ناراض ہو جاتا۔

لُو چل رہی ہے، آگ برس رہی ہے اور فرید کے ابا بھری دوپہر میں پسینہ پسینہ ہیں اور دوڑے دوڑے پھر رہے ہیں۔ سردی سے ہاتھ پاؤں ٹھٹھر رہے ہیں اور فرید کے ابا یہی کرتے دکان دکان اپنے مالک کا سامان لیے پھر رہے ہیں۔

دنیا سو رہی ہے اور فرید کے ابا حساب کے نقشے بنا رہے ہیں۔

اس کا پھل انھیں یہ ملا ہے کہ ان کا مالک ان سے خوش ہے ان کی قدر کرتا ہے، ہنس ہنس کر ان سے باتیں کرتا ہے۔

اگر فرید کے ابا سستی کرتے۔ وقت پر اپنے مالک کا کام نہ کرتے اکھڑے اکھڑے رہتے۔ وہ کہتا [illegible] بجے آؤ اور یہ بارہ بجے پہنچتے۔ وہ کہتا ہما [illegible] رہا کرو" اور یہ بیٹے پیچھے رہتے۔ وہ انھیں رقم دیتا کہ بینک میں جمع کر دو اور یہ اسے خرد برد کر دیتے۔ تو کیا انھیں ترقی ملتی؟ ہرگز نہیں۔

[illegible]

کہیں سود میں نہ لکھا جائے

ایک شخص حضرت امام اعظمؒ کا مقروض تھا۔ ایک مرتبہ تقاضے کے لیے گھر تشریف لے گئے۔ دروازے کے پاس درخت تھا اور دھوپ نہایت تیز تھی مگر امام سایہ میں نہ کھڑے ہوئے۔

لوگوں نے کہا حضرت! سایہ میں تشریف لے آئیے۔

فرمایا، یہ درخت مقروض کا ہے ڈرتا ہوں اس کے سایہ میں کھڑا ہونا سود میں نہ لکھا جائے۔

ریڈیو بج رہا ہے۔ ریشمی کپڑے سل رہے ہیں جنھیں فرید اور فریدہ کی امی پہنیں گی اور خوش ہوں گی۔

یہ بریانی، قورمہ، حلوے، شامی کباب، سنترے، انار، انگور اور سیب جو الماری میں سجے ہوئے ہیں، یہ ریشمی پردے جو لٹک رہے ہیں اور ہوا سے لہرا رہے ہیں، جنت کا نمونہ نہیں ہیں؟

پھر اگر خدا کی خوشنودی کے لیے خدا کی تابعداری کی جائے تو کیا خدا خوش نہ ہوگا اور خدا انعام نہ دے گا؟

کیا خدا تعالیٰ ان سے راضی نہیں ہوتا جو

[illegible]

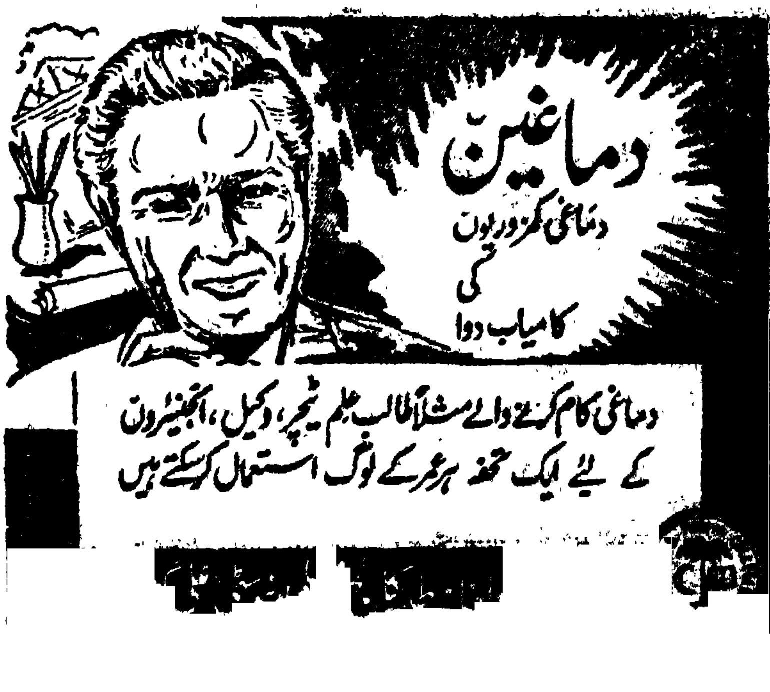
کرتے ہیں، بُرے کاموں سے رُکتے ہیں اور اچھے کام انجام دیتے ہیں؟

یقیناً وہ جنت کے پھلوں سے، جنت کی صاف و شفاف نہروں سے، جنت کے اونچے اور شان دار مکانوں سے لطف اٹھائیں گے اور سب سے بڑھ کر بات یہ ہوگی کہ پروردگارِ عالم جو تمام جہانوں کا مالک ہے۔ ان سے خوش ہو کر انھیں اپنا جمال دکھائے گا۔ اور ان سے بات کرے گا۔

پھر فرید کے ابّا نے اپنے ہی کو فائدہ نہیں پہنچایا بلکہ ان کے کنبہ والے بھی ان کی ترقی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ ۝ (سورۂ طور)
جو لوگ ایمان لائے اور ان کی اولاد نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ ہم ان کی اولاد کو بھی ان کے ساتھ شامل کر دیں گے۔

یہ دنیا کی جنت جس کا نقشہ تم نے پڑھا ہے کچھ بھی نہیں ہے۔ آخرت کی جنت ایسی ہے کہ تم نے ایسی نعمتیں کبھی دیکھی ہیں نہ سنی ہیں۔ نہ تمھارے تصور میں کبھی آئی۔ بڑا خوش نصیب ہوگا وہ لڑکا اور لڑکی جو اس کے حاصل کرنے کے لیے خدا کی اطاعت اور فرماں برداری اختیار کرے اچھے کام کرے اور بُرے کاموں کے قریب نہ جائے۔



جناب ناوک حمزہ پوری

صبح کی تازگی

مسافر کوئی بھول کر اپنا رستہ — کسی شام کو ایک جنگل میں پہنچا
مسافر پریشان، انجان جنگل — بھیانک بھیانک سا سنسان جنگل
اندھیرا ہر اک چیز پر چھا رہا تھا — مسافر بہت دل میں گھبرا رہا تھا
پرندوں، چرندوں، درندوں کی ہلچل — سے سہما ہوا جان پڑتا تھا جنگل
عجب حال تھا بے بسی، بے کسی کا — نشاں تک نہ تھا واں کسی آدمی کا
گرج جب درندوں کی کانوں میں آئی — مسافر یہ سمجھا قضا سر پہ چھائی
سنائی دی جس دم ذرا کوئی آہٹ — ہوئی جسم میں زور کی کپکپاہٹ
گذاری اسی حال میں رات ساری — رہی رات بھر بے کلی، بے قراری
بجاتی مسرت کا میں ساز آئی — یہ سورج کی کرنوں سے آواز آئی

گذاری ہو شب جس نے اس بے بسی سے
نشاطِ سحر کوئی پوچھے اسی سے



جناب محمد اکبرالدین صدیقی

مُشک محل

قطب شاہی سلاطین کو عمارتیں بنانے کا بہت شوق تھا۔ بادشاہ کی خوشی اور رضامندی کے لیے ان کے امیر اور عہدہ دار بھی اپنے لیے بڑے بڑے اور شاندار محل تعمیر کرتے تھے۔ قطب شاہی سلطنت کے ایک امیر مَلِک مُشک تھے۔ یہ سلطان عبداللہ قطب شاہ (۱۰۳۵ھ - ۱۰۸۵ھ) کی حکومت کے زمانے میں کرناٹکی لشکر کے سردار تھے اور سلطان ابوالحسن تانا شاہ (۱۰۸۵ - ۱۰۹۸) کے زمانہ میں معتمد اور کلید بردار تھے۔ تاریخ کی کتابوں میں ان کے متعلق بہت کم لکھا گیا۔ البتہ انھوں نے حیدرآباد میں قطب شاہی دور میں موسیٰ ندی پر جو سب سے پہلا پل بنایا اور جس کو اب "پرانا پل" کہا جاتا ہے۔ اس کے قریب ایک مسجد، خانقاہ اور گرم حمام تعمیر کیا اور اس پر کئی بڑے بڑے کتبے لگائے۔ یہ کتبے ابوالحسن قطب شاہ کے فرمان۔ کے ہیں جو ملک مشک سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک فرمان میں یہ کہا گیا ہے کہ مستعد پور اور عطا کو کے لیے خرچ ہوگی مستعد پور اب حیدرآباد کا ایک بہت گنجان آباد محلہ ہے۔ اور مستعد پورہ کہلاتا ہے۔ جہاں یہ مسجد، خانقاہ اور حمام بنے ہوئے ہیں۔ یہ سب ابھی اچھی حالت میں ہیں۔ ملک مُشک کا مقبرہ بھی یہیں ہے۔ اس پر بھی کالے پتھر کا خوبصورت کتبہ لگا ہے جس کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک مُشک نے یکشنبہ ۲۹ ربیع الاول ۱۰۹۲ھ کو انتقال کیا۔ اس کے صرف چھ سال بعد قطب شاہی سلطنت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ملک مُشک افریقہ کے رہنے والے اور بہت بلند مرتبہ کے شخص تھے۔ عالم فاضل تھے اور علم و فضل کو پھیلانے میں دل چسپی لیتے تھے۔ مسجد کے ساتھ خانقاہ کی تعمیر سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں اچھے اچھے کام کیے ہوں گے اس لیے عوام میں میاں مشک مشہور ہوگئے اور آج بھی ان کی نشانی موجود ہے

خانقاہ دینی مدرسہ کا کام دیتی ہے اور حمام بھی بہتر
حالت میں ہے۔

ممکن ہے کہ انھوں نے اپنے اس علاقے
مستعدپور میں بھی کوئی محل اپنے رہنے کے لیے بنایا
ہو۔ یہاں اب بھی قطب شاہی زمانے کے بے گنتی
مکانات کھنڈر کی شکل میں موجود ہیں بعض دیواریں
ایسی ہیں کہ اب لوگوں نے ان پر اپنے مکان تعمیر کر
لیے ہیں۔ کسی بڑے محل کا پتہ نہیں ملتا۔ ممکن ہے زمانہ
کی گردشوں نے انھیں مٹا دیا ہو۔ آخر چار سو سال
بھی تو گذر گئے۔

ملک مشک کا دوسرا مقطعہ یا جاگیر عطاپور
ہے۔ یہ موسیٰ ندی کے جنوبی ساحل پر حیدرآباد کے جنوب
مغرب میں چار مینار سے چار میل کے فاصلہ پر ایک
چھوٹا سا گاؤں رہ گیا ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کے زمانے
میں ملک مشک نے ایک محل بنایا۔ اس کی لمبائی اندازاً
سو فٹ اور چوڑائی پچاس فٹ ہوگی۔ یہ دو منزلہ ہے
نیچے کی منزل بہت خراب ہوگئی ہے۔ حکومت اگر توجہ
نہ دے تو اور خراب ہوجانے کا اندیشہ ہے۔ دوسری
منزل میں کوئی نقص پیدا نہیں ہوا۔ اس میں اب
عطاپور کا پرائمری اسکول ہے۔ ڈیڑھ دو سو بچے تعلیم
پاتے ہیں۔ میاں مشک نے جیتے جی علم و فضل کے پھیلانے
میں دلچسپی لی تھی۔ مستعدپور میں مسجد کے ساتھ خانقاہ
بنا کر مدرسہ قایم کیا تھا۔ چار سو سال سے اس میں
اب تک مدرسہ چلا آرہا ہے۔ میاں مشک نے محل
بنایا۔ یہ بھی مدرسہ کا کام دے رہا ہے۔ یہ ان کی نیت
کی برکت ہے۔

اس محل کی تعمیر کے بارے میں ایک کہانی
مشہور ہے۔ جب اس کی بنیادیں کھودنے کے بعد ان
کو بھرا جانے لگا تو تاجروں کا ایک قافلہ آکر ندی
کے کنارے اترا۔ دو مہینے گذر گئے۔ یہ سوداگر گئے
نہیں اس لیے کہ ان کا لایا ہوا سامان فروخت نہ ہوا۔

ایک دن سلطان عبداللہ قطب شاہ اپنے
مصاحبوں کے ساتھ ادھر سے گذرے۔ پوچھا یہ کیا
لوگ ہیں جو اتنے دنوں سے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں
بادشاہ نے قافلہ کے سردار کو بلایا اور اتنے دنوں تک
یہاں دھوپ اور بارش کی تکلیفیں اٹھاتے رہنے
سبب دریافت کیا۔

سردار نے کہا "آقا! ہم سوداگر ہیں۔
گولکنڈہ کی سلطنت کا نام سن کر یہاں مشک
فروخت کرنے لائے تھے۔ یہاں آنے پر معلوم ہوا
کہ ہم سے پہلے تاجروں کا ایک اور قافلہ آکر
مشک فروخت کر گیا ہے۔ اب ہمارے مشک کا کو
خریدار نہیں۔ اگر آپ شاہی دربار میں ہماری سفارش
کردیں تو ہم اپنے مال کا ایک اونٹ بوجھ آپ
نذر کریں گے۔"

بادشاہ نے اپنے ایک مصاحب کی طرف
دیکھ کر کہا کہ تاجر سے کہو کہ کل سہ پہر میں شاہی
کے جھروکے پر آجائے۔

دوسرے دن تاجر کچھ امید اور نا امیدی کی
یت میں دیے ہوئے وقت پر جھروکے پر پہنچا۔
یکھتا ہے کہ کل جس شخص نے اس سے گفتگو کی
وہی جھروکے میں بیٹھا ہے۔ سردار کو معلوم نہ تھا کہ
س نے خود بادشاہ سے بات کی تھی۔ بادشاہ
چھا۔ تمہارے پاس کتنا سامان ہے اور کیا ہے؟
سردار:۔ جہاں پناہ۔ مشک ہے اور بیس
اونٹ ہیں۔

بادشاہ:۔ مشک کی قیمت کیا ہے؟

سردار: پچاس ہزار اشرفی۔

بادشاہ:۔ (اپنے خانساماں سے) مشک کی
ادا کردی جائے۔

خانساماں:۔ جہاں پناہ! مشک رکھنے کے
م تو بھرے ہوئے ہیں۔ اب اور مشک رکھنے
ے جگہ نہیں۔

بادشاہ:۔ ندی کے کنارے عطاپور میں جہاں
ٹھہرا ہے۔ وہیں ہمارے معتمد الخدمت ملک
کا محل بن رہا ہے۔ یہ مشک اس کی بنیاد میں
جائے۔

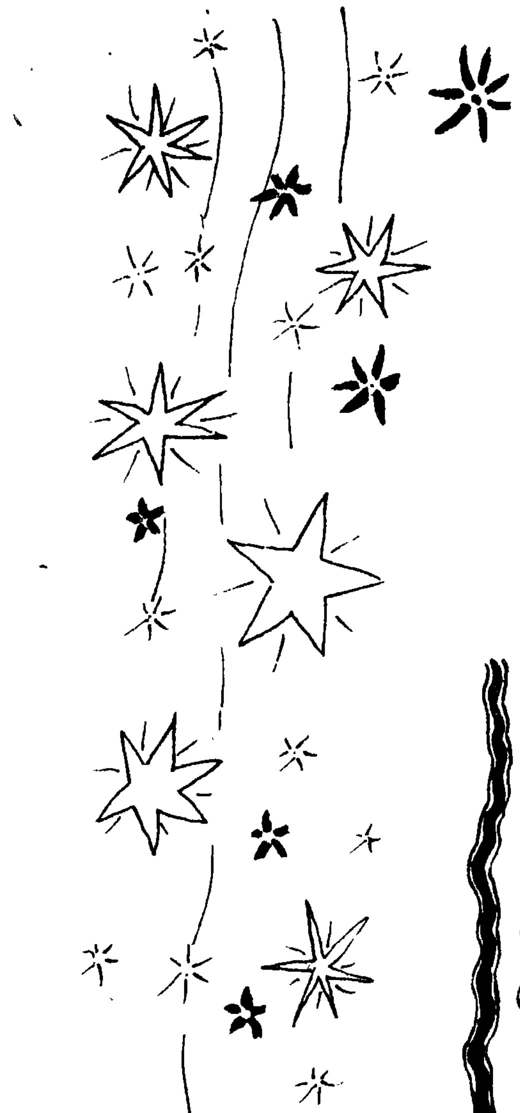
حکم کی تعمیل کی گئی اور یہ کہانی عام لوگوں
تک آگئی اور قطب شاہوں کی مسافر نوازی
ت بن کر اب تک بچہ بچہ کی زبان پر ہے۔
یہ محل بہت بڑا تو نہیں مگر اس میں اوپر پانی

چھوٹے حوض بنے ہوئے اب بھی نظر آتے ہیں جن میں
باریک سی نالیاں بنی ہیں۔ ان نلوں میں شاید گرم اور ٹھنڈا
پانی آنے کا انتظام ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ محل
ایک بہت بڑے باغ میں بنایا گیا تھا۔ جہاں چاروں طرف
اب بھی پانی کی نالیاں ٹوٹی پھوٹی حالت میں نظر آتی ہیں۔

اس محل سے قریب ہی میاں مشک نے ایک
بہت خوبصورت اور شاندار تین کمانوں والی مسجد
بھی بنائی جس کے شمال اور جنوب کے رخ پر دیواروں
کی بجائے مسجد کی پوری چوڑائی میں ایک شان دار
خوبصورت پتھر کی کمان بنی ہے اور اسی کے بالکل اوپر
دوسری کمان ہے اور دور سے ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ یہ مسجد بھی دو منزلہ ہے۔ بناوٹ میں ایسی مسجدیں بہت
کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ کمان پر کمان آنے سے اس کی
خوبصورتی میں بہت اضافہ ہوگیا ہے۔ مگر افسوس یہ
ہے کہ یہ مسجد اور محل دونوں عطاپور کی آبادی سے کچھ فاصلے
پر ہیں۔ محل میں تو اوپر کی منزل میں [illegible] ہے مگر مسجد
آباد نہیں۔ اس کی چھت پر درخت اُگ آئے ہیں۔
حیرت ہوتی ہے کہ یہ چار سو سال سے بارش آندھی
اور موسیٰ ندی کی طغیانیوں کا مقابلہ کر رہی ہے
کاش محکمۂ آثار قدیمہ اس کی طرف توجہ کرے
اس کی حفاظت کا انتظام کرے۔

جناب خورشید احمد جامی

نیکی کا ستارا



جگمگاتے ہوئے حسیں تارے
آؤ دیکھو ہیں کس قدر پیارے
کوئی چھوٹا تو ہے بڑا کوئی
کوئی اچھا تو خوش نما کوئی

ایک سے ایک بڑھ کے پیارا ہے
جیسے جنت کا یہ نظارا ہے
صبح کو اپنا منھ چھپاتے ہیں
رات کے وقت جگمگاتے ہیں

جگمگانا ہی کام ہے ان کا
یاد ہر ایک کو نام ہے ان کا
ایک تارے کا نام آزادی
ایک امن و اماں کی شہزادی

ایک ان میں ہے جو مسرت ہے
ایک کا نام تو محبت ہے
ایک ہے علم ایک دولت ہے
ایک ترقی ہے ایک شہرت ہے

ایک تارا ہے زندگانی کا
ایک تارا ہے [illegible]

ایک ان میں جو سب سے پیارا ہے
سب سے روشن جو اک ستارا ہے
اس ستارے کا نام ہے
اور دن رات کام ہے

ہر برائی سے یہ بچاتا ہے
نیک ہونا یہی سکھاتا ہے
صرف نیکی ہی وہ اجالا
[illegible]

نابِ فراق گورکھپوری

جمہ از:-

نابِ رام لال

جادو کے کھیل

(فراق صاحب کے ایک انگریزی مضمون کا ترجمہ)

کوئی ایک برس ہوا، ایک مشہور جادوگر اپنی
رٹی کے ساتھ ہمارے شہر میں آیا۔ اس کے بارے
ں اخباروں اور اشتہاروں کے ذریعے بہت پبلسٹی
ں گئی تھی۔ مقامی سینما گھروں میں بھی اس کی آمد کے
رے میں اشتہار دیے گئے تھے۔ اُس کے کھیل دیکھنے
ے لیے ہم بہت بے چین تھے۔ جو کچھ ہم نے دیکھا
ں کا حال سنو۔

لکڑی کے چوکھٹوں میں تیز دھار والی پانچ
اریں فٹ کر دی گئی تھیں۔ جادوگروں کی پارٹی کے
ے آدمی نے ان تلواروں کے اوپر ڈانس (ناچ) کر
دکھایا۔ اس کے پاؤں اس قدر پھرتی سے سری
خوش اسلوبی سے تلواروں پر چلتے تھے کہ ذرا
زش تک نہ آئی۔ بدن کو سادھے رکھنے کی یہ ایک
رتناک ورزش تھی۔

[illegible]

یقیناً زخمی ہو جاتا۔ اس کا کرتب دیکھ کر خوب تالیاں
بجائی گئیں۔

اس کے بعد لکڑی کے ایک چھکڑے پر ایک
پستول رکھ کر لایا گیا۔ اسے ایک طوطے نے چلایا۔
اس کے بعد پانی سے لبالب بھرے ہوئے ایک
برتن کے اوپر ایک اور ڈانسر نے ڈانس کیا۔ پانی
کے ساتھ اس کے پاؤں اتنی آہستگی اور جلدی جلدی
چھوتے تھے کہ اس میں ہلکورے بھی مشکل سے پیدا ہو
پاتے تھے۔ اسی ڈانسر نے دہکتے ہوئے کوئلوں پر
بھی ناچ پیش کیا اور اس کے پاؤں کو کوئی بھی گزند
نہ پہنچا۔ ایک اور جادوگر نے تاش کے کئی تماشے
دکھائے۔

پلیٹ فارم پر چاک کے ساتھ ایک ٹیڑھی
میڑھی لکیر کھینچ دی گئی تھی۔

[illegible]

کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر لایا گیا اور اس نے ٹیڑھی میڑھی لکیر پر ٹھیک ٹھیک چلتے ہوئے اسٹیج پر چل کر دکھایا۔

اس کے بعد سب سے بڑے جادوگر کا کھیل شروع ہوا۔ اُس نے اپنی بیٹی کو فرش پر لٹا دیا۔ اس کے جسم کے اوپر کئی بار اپنا ہاتھ لہرایا۔ دھیرے دھیرے اس کا جسم بغیر کسی مدد یا سہارے کے فرش پر سے اٹھنا شروع ہوگیا۔ ہوا میں کئی فٹ اونچا اٹھ گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے لڑکی کے جسم کا سارا وزن ہی ختم ہوگیا ہو۔ تب جادوگر نے لوگوں سے اپنی گھڑیوں پر نظر ڈالنے کے لیے کہا۔ کسی انجانی طاقت کی وجہ سے ساری گھڑیاں بند ہو گئی تھیں۔ کئی منٹ تک وقت کے رُکے رہنے کے بعد گھڑیاں پھر سے حرکت کرنے لگیں۔ یہ تماشا واقعی عجیب و غریب تھا۔ اس کے جادو بھرے کھیل کا راز کوئی بھی نہ جان سکا۔

آخری تماشا سب سے عجیب تھا۔ جادوگر نے حاضرین سے کہا کہ وہ اپنے اپنے سوالات کو لکھ لیں۔ کاغذ اور لفافے دے دیے گئے۔ تماشائیوں میں سے کئی لوگوں نے سوالات لکھے اور انھیں لفافوں میں رکھ کر بند کر دیا۔ انھیں جادوگر کے حوالے کر دیا گیا۔ اس نے لفافوں کو اپنی بیٹی کے سر پر رکھ دیا۔ اس کی آنکھوں پر پٹی بندھی تھی۔ لفافوں کے اندر رکھے ہوئے کاغذوں پر جو کچھ لکھا تھا اُسے جادوگر نے نہیں دیکھا تھا۔ لیکن لڑکی نے ہر ایک سوال کو پڑھ کر سنا دیا۔

یہ بڑا حیرت ناک جادو کا تماشا تھا۔ اور ہم وہاں سے سوچتے ہوئے واپس آئے کہ یہ سب کیسے کیا گیا تھا؟

جناب ظفر احمد نظامی

آؤ کھیلیں

دُریا، بدریا، پپّی، گڈّو
گڈّی، بشّی، نسرین، نیلو
پھیل رہی ہیں پیار کی بیلیں
آؤ کھیلیں

گلّی ڈنڈا، پکڑا پائی
چمک اشٹے، آنکھ مچولی
اپنے اپنے داؤں لے لیں
آؤ کھیلیں

ہم نے محنت کا پھل پایا
تب ہنسنے کا موسم آیا
موسم سے رنگینی لے لیں
آؤ کھیلیں

اسکولوں کی چھٹی ہے اب
پاس ہوئے ہیں شان سے ہم سب
پھر کیوں کوئی آفت جھیلیں
آؤ کھیلیں

بخشی آرائشی اشیاء سے اپنی مسرتوں میں اضافہ کیجیے

سندری سہاگ

...لوں کی آرائش، نشو نما اور دماغی تازگی کے لیے۔

سُرمۂ نورِ نظر رجسٹرڈ ۱۹۲۶ء

آنکھوں کو روشن، صحت منداور جاذبِ نظر رکھنے کے لیے

اوٹو سندری بہار

...نہ پھولوں کی مسحور کن خوش بو جو اپنی نفاست اور ...ہائی کے لیے مقبول خاص و عام ہے۔

چگ مگ

دانتوں کو موتی جیسا چمک دار اور پہاڑ جیسا مضبوط بنانے کے لیے خوش بودار منجن

بیش بہا تحفہ

بخشی جنتری ۱۹۷۰ء

پیشِ خدمت ہے

فوٹو آفسیٹ کی دیدہ زیب طباعت اور بیش قیمت مفید معلوماتی مضامین سے آراستہ بخشی جنتری ۱۹۷۰ء ...ی اپنے قریبی کتب فروش سے حاصل کیجیے۔ یا ہم سے ۲۵ پیسے کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر طلب کریں۔

...بخشی کمپنی ... نمبر ۱۱۲ ...

جناب اے۔ اے منظر

چیتے کے ذریعے شکار

آپ جانتے ہیں شروع شروع میں انسان کی گذر بسر بس شکار پر تھی۔ یوں سمجھیے کہ یہ زندگی کی سب سے اہم ضرورت تھی۔ دھیرے دھیرے کھانے پینے کی اور چیزوں کا پتہ چلا تو اس اہم ضرورت نے ہابی یا دلچسپ شغل یا شوق کی شکل اختیار کر لی اور یہ شغل زیادہ تر امیروں، نوابوں، راجاؤں اور بادشاہوں نے اپنا لیا۔

اور ان راجاؤں اور بادشاہوں نے شکار کے نئے نئے طریقے ایجاد کیے، طرح طرح کی جدتیں پیدا کیں۔

کہتے ہیں اکبر بادشاہ نے شکاری جانوروں کے ذریعے شکار کرنے کے طریقے کو خوب ترقی دی۔ اسے چیتے پالنے اور چیتوں کے ذریعے شکار کرنے کا بہت شوق تھا۔ اکبر کے وزیر ابوالفضل نے بہت تفصیل سے اس کا ذکر کیا۔ ایک جگہ لکھا ہے۔

شہنشاہ کی عمر کل ۱۳۔ سال کی تھی تو انھوں نے چیتے کے ذریعے شکار کا نظارہ خود اپنی آنکھو دیکھا۔ شہنشاہ اس وقت پنجاب کے دورے پر ت بعد میں یہ شکاری چیتا شہنشاہ اکبر کو تحفے میں پیش گیا۔ اکبر نے اس چیتے کا نام "فتح یار" رکھا۔ او تو شہنشاہ اکبر کا یہ شوق اتنا بڑھا کہ اس کے چ میں ان گنت چیتے جمع ہو گے۔

خود یہ چیتے کئی طریقوں سے پکڑے جا ت ایک طریقہ کھائی کھود کر اس پر گھاس بچھا کر تھا جی کے پاس کسی چیتے کے پکڑے جانے کی خبر آتی، تو گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں پہنچتے۔ اس چیتے کا ج معائنہ کروایا جاتا کہ کہیں جسم کے کسی حصے میں زیاد تو نہیں آئی۔ جب یہ فیصلہ ہو جاتا کہ چیتا صحیح وسا تو اسے ٹرینر (سدھانے والے) کے حوالے کرد

ایک بار چھ نر چیتے ایک مادہ چیتے کا ی ہوئے ایک ہی کھائی میں جا گرے۔

ایک ساتھ اتنے چیتوں کا ایک ہی کھ

پکڑے جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ جیسے ہی یہ اطلاع اکبر کو دی گئی، وہ بجائے خوش ہونے کے پریشان ہو گیا اور اس نے فوراً آدمی دوڑائے کہ کہیں چیتے فرار نہ ہو جائیں یا اس کوشش میں اپنے ہاتھ پیر نہ توڑ بیٹھیں۔ ۔ ۔ ۔

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس طریقے میں چیتے زخمی ہو جاتے تھے۔ ان کا کوئی نہ کوئی حصہ بے کار ہو جاتا تھا اور یہ اکثر ہوتا تھا جس چیتے کی ٹانگ ٹوٹ جاتی تھی وہ پھر شکار کے لائق نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اکبر نے اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے نئے ڈھنگ کے کٹہرے بنوائے۔ جو کھائی میں فٹ کر دیے جاتے تھے اس کا دروازہ اس طرح کا ہوتا تھا کہ چیتے کے گرتے ہی خود بخود بند ہو جاتا۔۔۔

چیتے کے شکار کا دوسرا طریقہ یہ تھا کہ بہیلیے جنگل میں گھومتے پھرتے رہتے تھے۔ چیتے کی ایک خاص فطرت ہوتی ہے۔ وہ جس جگہ رہتا ہے۔ اس کے آس پاس ہی کسی ملایم چھال والے درخت کے تنوں پر پنجے کھروچ اپنے ناخن تیز کرتا ہے۔ چنانچہ بہیلیوں کو فوراً پتہ چل جاتا تھا کہ اس درخت کے پاس ہی وہ روزانہ آتا ہے۔ پھر وہ ایک ایسے جال کا استعمال کرتے تھے۔ جس میں وہ پھنس جاتا تھا۔

چیتوں کو سدھانے میں عموماً دو سے تین مہینہ کا عرصہ لگ جاتا تھا۔ لیکن اکبر نے ایک ایسا طریقہ اپنایا جس سے چیتے محض اٹھارہ دنوں کے اندر

"اس نئے تجربے کو دیکھ کر اچھے اچھے شکاری استادوں نے دانتوں تلے انگلی دبائی اور اکبر کی ذہانت نے قایل ہو گئے۔"

لوگوں کا کہنا تھا کہ اکبر میں جانوروں کو بس میں کرنے کی عجیب و غریب صلاحیت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار اٹھارہ دنوں کی ٹریننگ کے بعد ایک چیتے کو لے کر اکبر پہلی مرتبہ شکار کھیلنے گیا۔ حکم ملتے ہی اس چیتے نے شکار کیا اور اسے اٹھا کر اکبر کے پاس لے آیا۔ اس وقت ایک دوسرا چیتا بھی موجود تھا جو بغیر کسی زنجیر اور پٹے کے اکبر کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

اکبر کا یہ شوق رفتہ رفتہ اس قدر آگے بڑھا کہ پالتو چیتوں کی تعداد ایک ہزار تک پہنچ گئی۔ جن کی حفاظت پر تقریباً دو سو لوگ مقرر تھے۔ ہر چیتے کا نام اس کی فطرت پر مبنی ہوتا تھا اور انھیں دس دس کے گروپ میں رکھا جاتا تھا۔ ہر چیتے کو اس کی ضرورت کے مطابق روزانہ ڈھائی سیر سے پانچ سیر تک گوشت دیا جاتا تھا سنیچر کو انھیں ڈبل راشن دیا جاتا تا کہ اتوار کو وہ بھوکے نہ رہیں۔ اتوار کو انھیں گوشت نہیں ملتا تھا کیونکہ اس روز بکرے ذبح نہیں کیے جاتے تھے۔

چیتوں کی رُووں پر مکھن ملا جاتا تھا اور خارش کھجلی دور کرنے کے لیے کھریرا بھی کیا جاتا تھا۔

کہتے ہیں یہ چیتے ہیرے جڑی زنجیروں میں باندھے جاتے تھے۔ سردیوں میں کمبل اوڑھنے

تھے۔ جب وہ شکار کرنے کے لیے لے جائے جاتے تو انھیں ان کے رتبہ کے مطابق مختلف ڈھنگ کی سواریاں پیش کی جاتیں۔ کچھ کو ہاتھیوں، گھوڑوں یا اونٹوں پر، کچھ کو بیل گاڑیوں پر اور کچھ کو چھوٹی پالکیوں میں بٹھا کر لے جاتے تھے۔

اعلیٰ ترین چیتے کو مخملی اور ہیرے جواہرات جڑے جھوڑول پہنائے جاتے تھے۔ ان کے محافظ اور سدھانے والے اس کے اغل بغل دوڑتے چلتے اور اس کے آگے نقاروں کا غلغلہ رہتا تھا۔

جو چیتے گھوڑے پر رہتے، ان کے لیے تین آدمی بیل گاڑی اور پالکی پر چلنے والوں کے لیے دو دو آدمی مقرر کیے جاتے تھے۔

ان حفاظتی لوگوں کو اس زمانہ میں پانچ سے تیس روپے ماہانہ تنخواہ دی جاتی تھی۔ اگر ان کا چیتا اچھا شکار کھیلتا تو انھیں منھ مانگا انعام بھی دیا جاتا تھا۔

اکبر کے بعد میسور کے حکمراں ٹیپو سلطان (۱۷۷۲ - ۱۷۹۹) کو اس کا بہت شوق تھا۔

اس شوق کی ایک نفسیاتی وجہ تھی۔ چیتے اُسے اس قدر پسند تھے کہ اس نے اپنی اور اپنے خاندان کی پوشاکوں پر چیتے کی تصویریں کاڑھنے کی ہدایت کی تھی۔ اس کے تختِ شاہی، بندوقوں اور تلواروں وغیرہ پر چیتے کی تصویر کھدی رہتی تھی۔

چیتے کو حملہ کرتے اور اپنے شکار پر بازی کی طرح جھپٹتے دیکھ کر ٹیپو سلطان کے دل میں اپنے دشمنوں پر فتح حاصل کرنے کی امنگ اور حوصلہ پیدا ہوتا تھا۔

فورٹ ولیم کے گورنر جنرل مارکوئیس ویلزلی کے اے۔ ڈی۔ سی۔ کیپٹن بنجامن سڈنہم نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائرکٹروں کے پاس ٹیپو سلطان کے چیتوں کا ذکر کیا تھا۔

یہ سارا ریکارڈ اور اس کے کاغذات آج انڈیا آفس لائبریری لندن میں محفوظ ہیں۔

ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ٹیپو سلطان کے پاس سولہ چیتے تھے۔ سلطان نے رنگ پٹن کے جنوب و مغرب کی جانب ایک جنگل محفوظ کر رکھا تھا جس میں وہ اپنے چیتوں کو لے کر شکار کھیلنے جایا کرتا تھا۔ ہر چیتے کے پیچھے چار افراد تعینات رہتے تھے ایک شکار کرانے والا۔ دو سائیس اور چوتھا گاڑی بان۔ جسے چار مضبوط اور تربیت یافتہ بیل رکھنے کا حق بخشا گیا تھا۔

ٹیپو کا جی جب کبھی شکار کھیلنے کو چاہتا تو وہ چیتوں کو ایک روز قبل روانہ کر دیتا تھا۔ دوسرے روز صبح ٹیپو اپنے احباب کے ساتھ طے شدہ مقام پر پہنچ جاتا۔ چیتوں کو ان گاڑیوں میں آنکھ پر پٹی باندھ کر بٹھایا جاتا تھا۔ جب ہرن یا چیتل دکھائی دیتے تو چیتے کی آنکھ کی پٹی اور کمر کی رسی کھول دی جاتی۔ اگر ہرنوں کا گروہ کافی مضبوط ہوتا تو تین چار چیتوں کو ایک ساتھ کھلایا جاتا تھا۔ [illegible]

ہی گاڑی سے لپکتے اور خود کو جھاڑیوں میں چھپاتے ہوئے ہرنوں کے پیچھے جاکر دو سو گز کی دوری پر رک جاتے پھر ہرنوں کو وہ کھدیڑتے ہوئے تین چار سو گز تک لے جاتے اور اچانک اپنے شکار پر لوٹ پڑتے۔ وہ سامنے کے پنجوں سے اس قدر زبردست حملہ کرتے کہ ہرن لڑکھڑا کر زمین پر گر جاتا اور چیتا اس کی گردن دبوچ لیتا۔ اگر چیتا ہرن کو پکڑنے میں ناکام رہتا تو واپس آکر ایک جگہ پر غصے میں تب تک بیٹھا رہتا جب تک اس کا محافظ اسے پٹا نہ پہنا دے۔ پٹا پہنانے کے بعد پھر اسے گاڑی پر سوار کرا دیتے۔ اگر وہ ہرن کو پکڑ لاتے تو اسے اس وقت تک بائے رہتا ہے۔ جب تک کوئی شخص ہرن کی پچھلی ران کاٹ کر اسے پیش نہ کر دے۔ اس طرح ایک دن میں ایک چیتے سے دو سے تین مرتبہ شکار کرایا جاتا تھا

تنجور کے سرفوزی (۱۷۹۸ - ۱۸۳۲) کو بھی اس طرح کے شکار کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ و اپنے ہر چیتے کی تصویر اور اس کے متعلق پوری تفصیل لکھ کر انگلینڈ بھیجا کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

"بڑے، جوان چیتوں کے مقابلے میں چھوٹی عمر کے چیتے کو جلدی شکار کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے جس روز چیتا اپنے شکار میں ناکام رہتا ہے اس روز وہ بے انتہا خوں خوار نظر آتا ہے اور گوشت کھائے بغیر نہیں مانتا، نہ واپس گاڑی میں آتا ہے۔"

ماہنامہ **کتاب نما** نئی دہلی ۲۵

ارباب ذوق کے لیے مکتبہ جامعہ کا یہ ماہوار رسالہ نہایت ضروری چیز ہے۔ اردو کی تمام نئی کتابوں کی اطلاع آپ کو اس رسالے سے مل سکتی ہے۔ کسی قابل ذکر دارالاشاعت کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہوتی جس کا اشتہار ہم فوراً کتاب نما میں شائع نہ کرتے ہوں۔ آپ کتاب منگائیں یا نہ منگائیں اردو ادب کی رفتار ترقی سے واقف رہیں گے۔

یہ رسالہ علاوہ عام با مذاق حضرات کے لیے مفید ہونے کے خاص طور پر لائبریریوں اور انجمنوں کے لیے ضروری ہے۔ کوئی کتب خانہ بغیر اس رسالے کی مدد کے نئی کتابوں کا صحیح انتخاب نہیں کر سکتا۔

نمونہ مفت

قیمت سالانہ دو روپے

[illegible]

جناب کیف احمد صدیقی



نیا سال

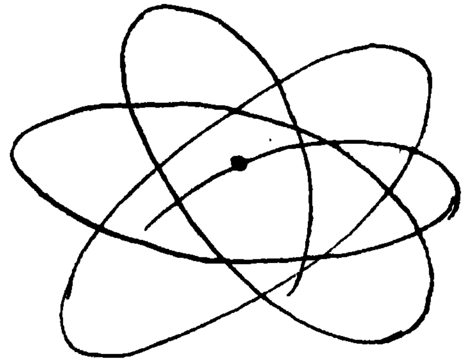
پھر ہماری عمر کا ایک سال گھٹ گیا
پھر کتابِ وقت کا ایک ورق اُلٹ گیا
پھر فضا میں کھل گئی عشرتوں کی چاندنی
پھر چمک چمک اٹھا آسمانِ زندگی
پھر خوشی کے چاند سے غم کا ابر ہٹ گیا
پھر کتابِ وقت کا اک ورق الٹ گیا

رفتہ رفتہ روز و شب[1] برف بن کے ڈھل گئے
حادثوں کی دھوپ میں خود بخود پگھل گئے
لمحہ لمحہ وقت کی گود میں سمٹ گیا
پھر کتابِ وقت کا ایک ورق الٹ گیا

ہر کرن چمک اٹھی نورِ آرزو لیے
ہر کلی مہک اٹھی کیفِ رنگ و بو لیے
دورِ عیش آگیا دورِ غم پلٹ گیا
پھر کتابِ وقت کا اک ورق الٹ گیا
پھر ہماری عمر کا ایک سال گھٹ گیا

[1] دن اور رات

جناب خالد عرفان



ایٹم کی دنیا

ہمارا یہ زمانہ ایٹمی عہد کہلاتا ہے۔ جب سے اس ننھے سے ذرّے یعنی ایٹم کا پتہ لگا۔ اس دنیا کی ترقی کو جیسے پر لگ گئے ہیں۔ اس ایٹم کی طاقت سے بجلی پیدا کی جاتی ہے۔ خلا میں اڑنے والے جہازوں کے لیے ایندھن تیار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح کے اور بڑے بڑے فائدہ اٹھائے جاتے ہیں۔

ایٹم کی اصلیت کو سمجھانے کے لیے یورپ، امریکہ اور دوسرے ملکوں میں نہ جانے کتنی کتابیں چھپ چکی ہیں۔ بچّوں اور بڑوں کے لیے نہ جانے کتنے مضمون لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن اُردو میں خصوصًا بچّوں کے لیے کوئی ایسی کوشش ہماری نظر سے نہیں گذری۔ ہمارے عزیز دوست محترم خالد عرفان صاحب نے آپ کے لیے قلم اٹھایا ہے۔ اس مشکل مضمون کو زیادہ سے زیادہ آسان بنانے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلے میں انھیں غیر معمولی محنت کرنا پڑی ہے۔ بار بار مضمون کو کاٹنا چھانٹنا پڑا ہے۔ تب جا کر یہ چیز تیار ہوئی ہے۔ ہم احتیاط کے خیال سے مضمون کو جوں کا توں شایع کر رہے ہیں۔ ذرا بھی قلم نہیں لگایا ہے۔ خالد عرفان صاحب کی خواہش ہے کہ آپ اس مضمون کو ایک بار نہیں کئی بار پڑھیں اور پھر اس کے بارے میں اپنا خیال بھی ضرور بتائیں۔ امید ہے کہ آپ ان کی خواہش کا احترام کریں گے۔

"ایڈیٹر"

امّی نے باجی سے کہا "بیٹا ناشتہ پر گلاب
من ہوں گے، چاشنی تیار کر لو۔"

• آپا نے رسوئی گھر سے شکر ناپ کر لی، برتن میں
ن لیا اور شکر گھولنے بیٹھ گئیں۔

جاوید میاں ابھی مدرسہ سے لوٹے تھے۔

کہا تھا کہ جس راکٹ سے انسان چاند تک پہنچ سکتا ہے
اس میں جو ایندھن استعمال ہوتا ہے وہ ....
بھلا آپ ہی بتائیے، وہ کیا ہو سکتا ہے؟ —
کوئلہ، بھاپ، بجلی، تیل، گیس، پٹرول — نہیں بھئی،
ان میں سے کوئی نہیں۔ ماسٹر صاحب نے کہا تھا بس وہ

آپ میرا منھ تکنے لگے، آپ کو یقین نہیں آیا۔ جاوید میاں کا بھی بالکل یہی حال ہے، وہ سمجھ نہیں پا رہے ہیں کہ ایک ذرہ اور اس کے اندر اتنی طاقت کہ چاند تک راکٹ کو پہنچا دے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اس طاقت سے بغیر پٹرول کے کاریں دوڑا کریں گی، بغیر کوئلہ کے ملیں اور ریلیں چلا کریں گی، بغیر بجلی کے بلب روشن ہوا کریں گے اور چولھے جلا کریں گے اور نہ جانے ایسے کتنے ہی کام ہوں گے۔

جاوید اپنے انھی خیالات میں مگن، ڈرتے ڈرتے آپا کے قریب بیٹھ گئے۔

"آپا کیا ہو رہا ہے؟"

"دیکھتے نہیں، شکر گھول رہی ہوں۔"

"کیوں؟"

"چاشنی تیار کرنی ہے۔"

"کس لیے؟"

"گلاب جامن بناتے ہیں۔"

"اوہ ——" وہ چونکے اور آپا کو کام کرتے بغور دیکھنے لگے۔

آپا ان کے سوالات سے جھنجھلا گئیں، انھوں نے پوری شکر یونہی پانی میں جھونک دی اور چمچہ چلانے لگیں۔ چلاتی رہیں، لیکن شکر نہیں گھل رہی تھی۔ کچھ دیر دیکھنے کے بعد جاوید کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ آپا نے انھیں گھورا۔ وہ کہنے لگے "آپا، اگر آپ شکر کو باریک پیس لیتیں تو وہ آسانی سے گھل جاتی۔"

آپا کو ان کی دخل اندازی بری لگی۔ انھوں نے جھڑکا "اچھا، میاں لقمان، یہاں سے چلتے بنو۔"

جاوید میاں اٹھ کر بھیا کی طرف گئے۔ کمرہ دروازہ کھٹکھٹایا —— ایک بار، دو بار، تین بار —— نہیں ملا۔ دروازے کو کچھ دھکا دیا، جھانکا، بھیا نہیں الماریوں سے کتابیں جھانک رہی تھیں، وہ فوراً لپکے: الٹ پلٹ کرنے لگے۔ ایک کتاب نکالی "عجائبات کھولی اور پڑھنے لگے۔

"جب تم شکر کی ڈلی کو پیستے ہو تو اس کا سفوف بنتا ہے، نہایت ہی باریک، لیکن ہر ذرہ شکر ہی کا ہے۔ باریک ہو کر وہ کچھ اور نہیں بن جاتا۔ اب فرض کر نے اس کو پانی میں حل کر دیا ——"

"ایں ——" جاوید رک گئے۔ "آپا —— چاشنی گلاب جامن ——" ان کے منھ میں پانی بھر آیا۔ انھو پھر سے کتاب پر نظریں جما دیں —— اور سلسلہ ملا

"—— تو یہ باریک ذرے غایب ہو جاتے ہیں نظروں سے اوجھل ہو جاتے ہیں۔ ان کو طاقتور سے طاقت خوردبین کی مدد سے بھی دیکھا نہیں جا سکتا —— لیک کیا یہ ذرے ختم ہو گئے؟ بدل گئے؟ نہیں! اگر بدل جا ختم ہو جاتے تو پانی میں مٹھاس کیسے پیدا ہو جاتی! پانی میٹھا اسی لیے بنا کہ یہ ذرے وہاں پائے جاتے ہیں، لیکن دکھائی نہیں دیتے —— تم سانس لیتے ہو، تم جانتے کہ تمھارے نتھنوں سے ہوا اندر جاتی ہے، باہر آتی ہے ہوا میں آکسیجن، نائٹروجن اور دوسری گیسیں ہوتی ہیں ہوا دکھائی نہیں دیتی، لیکن [illegible]

ے ہوتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے — تو پتہ چلا کہ ہر شے
ے ذرے ہوتے ہیں — جو نظر نہیں آتے، لیکن ان میں وہ
م خصوصیتیں پوری کی پوری پائی جاتی ہیں جو اس شے
، پائی جاتی ہیں — اس طرح فلسفی اور سائنس داں ان
ِچنے لگے آخر مادّہ کو تقسیم کرنے کی حد کہاں جا کر ختم
تی ہے ؟

جاوید مسکرائے، انھیں ان بڑے لوگوں پر بڑا
ں آیا، "کیا یہ اتنا بھی نہیں جانتے کہ تقسیم کی آخری
—" ابھی وہ اتنا ہی سوچ پائے تھے کہ ان کے
ن میں آواز آئی۔

"اجی، مادّہ کیا ہے ؟" — بے اختیار ان کے
سے نکل گیا تھا۔

"مادّہ ؟! — ہر وہ چیز —" انھوں نے
، کتاب کے صفحے پر ایک بڑے میاں ہیں سوٹ
ہوس، ان کی برف جیسی سفید نکونی داڑھی لہرا رہی
لمبی لمبی مونچھوں کی نوکیں دونوں طرف تلوار کی نوک

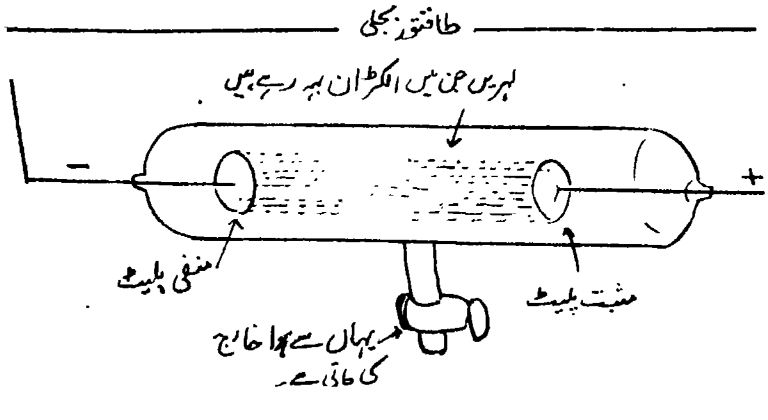
کی طرح اٹھی ہوئی ہیں۔ اپنے ہاتھ میں شیشے کا ٹیوب
پکڑے ہوئے ہیں۔ جاوید نے ان کی طرف دیکھا، وہ مسکرائے
ان کے ہونٹ ہلے اور جاوید نے سُنا — "ہر وہ چیز
جس کو ہم چھو سکیں، دیکھ سکیں، چکھ سکیں ---- یعنی
اپنے حواس کے ذریعہ محسوس کر سکیں، مادّہ ہے"۔

"یعنی ؟" — جاوید نے وضاحت چاہی۔

"میاں، اس دنیا میں ٹھوس، سیّال اور گیس کی
شکل میں جتنی چیزیں پائی جاتی ہیں، اور جن کی کمیت (MASS
یا مقدار) ہوتی ہے، جو جگہ گھیرتی ہیں، ان سب کو مادّہ
کہا جاتا ہے"۔

"اچھا، اچھا، میں سمجھ گیا، جیسے لوہا، پانی اور
ہوا۔ ہے نا" جاوید نے کہا۔

بڑے میاں مسکرائے اور کہا "ٹھیک سمجھے
میاں، اس مادہ کو فلسفی کبھی نہ مٹنے والی چیز سمجھتے آئے
تھے۔ کوئی چیز تقسیم بھی ہو اور نہ بھی مٹے، یہ عجیب بات
ہے۔ لیکن تم اسی تقسیم کے بارے میں پڑھ رہے تھے نا،



کے اس ٹیوب سے حتی الامکان ہوا کو خارج
جاتا ہے۔ پھر اس کے اندر انتہائی طاقتور بجلی
ئی جاتی ہے۔ بجلی مثبت پلیٹ سے منفی پلیٹ
ت دوڑتی ہے۔ ٹیوب میں دباؤ نہایت قلیل
ے۔ ان حالات میں منفی پلیٹ سے لہریں نکلتی
ر مثبت پلیٹ کی طرف بہنے لگتی ہیں۔ ٹیوب
ِانی رنگ کی روشنی پھیل جاتی ہے۔ لہروں
ِان کے ذرات چھپے ہوتے ہیں۔ یہ ذرے
کا اندازہ شکل نمبر ۲ سے ہوتا ہے۔

آگے بڑھو، کام کی بات معلوم ہو جائے گی۔"

اور جاوید میاں پڑھنے لگے: "چار سو برس قبل مسیح یونانی فلسفیوں نے سوچا کہ مادہ کو تقسیم کرتے چلے جائیں تقسیم کرتے چلے جائیں —— تو ایک مقام ایسا ایسا آتا ہے جس کے بعد تقسیم ممکن نہیں ہوتی اور اس نہایت ہی باریک ذرے کو "جوہر" یا "ایٹم" کا نام دیا گیا۔ ان ہی ایٹموں سے مل کر مادّہ بنتا ہے، یعنی مادے کی ابتدائی اکائی یا یونٹ ہے "ایٹم" اس ایٹم کا حجم جانتے ہو کتنا ہوتا ہے۔ اتنا ننھا، اتنا ننھا کہ تصور بھی نہیں کر سکتے اگر میں کہوں کہ دس لاکھ ایٹم لیے جائیں اور ان کو ایک دوسرے سے لگا کر ایک قطار میں کھڑا کیا جائے تو تم جانتے ہو اس کی موٹائی کتنی ہوگی، بس آپ کی کتاب کے ایک ورق جتنی۔ حالاں کہ ایٹم کا یہ اولیں تصور تھا جو تھا تو فلسفیانہ فکر کا نتیجہ، لیکن آج کے سائنس دان تجربوں کی مدد سے بنیادی سچائیوں کا پتہ چلاتے ہیں، اور انھوں نے اس ایٹم کو ایک حقیقت ثابت کر دیا" ——

"لیکن —— ؟" جاوید میاں کی بھویں تن گئیں پیشانی پر بل پڑ گئے، انھیں یاد آیا کہ کل ہی ماسٹر صاحب نے بتایا تھا کہ اکائی اب ایٹم نہیں رہی۔ اب تو اس ایٹم کو بھی توڑ دیا گیا ہے۔ اس کے بھی ٹکڑے کیے گئے ہیں اور اس ایٹم کو توڑنے سے ہی اتنی طاقت فراہم ہوتی ہے کہ چاند کو راکٹ بھیجا جا سکتا ہے"۔

جاوید میاں نے ورق الٹا اور ان کی نظر جہاں پڑی وہیں سے پڑھنا شروع کر دیا۔

"یہ ایک بنیادی حقیقت ہے کہ مادّہ کی اکائی ہے۔ لیکن اس ایٹم کو توڑ کر اس کے اندر کی دنیا کو بھی د گیا ہے۔ ایٹم کو ایک مشین کے ذریعہ اور اسی کے توڑا جا سکتا ہے، اس مشین کو سائیکلوٹرن CL TRON کہا جاتا ہے۔ اگر کائنات کو عظیم عمارت تص کر لیا جائے تو اس عمارت کی اینٹیں ہیں ایٹم اور ا کی عمارت جن اینٹوں سے بنی ہے اس کا پتہ اس مشین میں ایٹم کو توڑ کر لگایا جا سکتا ہے۔ اس مشین کی ایجا سے پہلے بھی ویسے ایٹم کے اندر کی اس دنیا کا کچھ حال جا لیا گیا تھا۔ اس انوکھی دنیا کا حال جاننے کے لیے جس عظیم قوت کا سہارا لیا گیا وہ تھی بجلی"۔

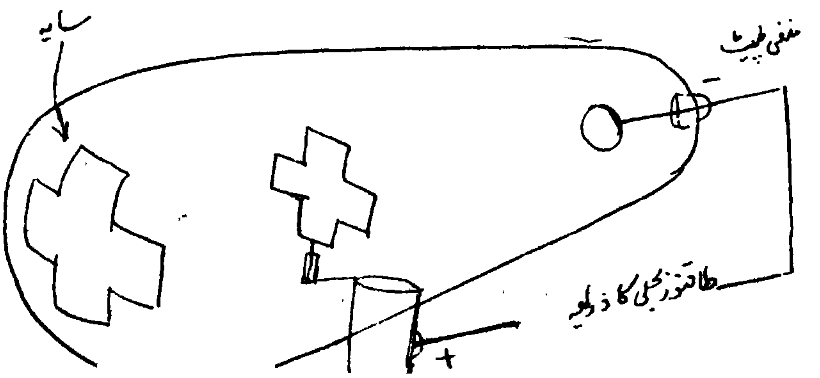
جاوید میاں کا اشتیاق بڑھ گیا۔

عموماً کسی گیس میں بجلی نہیں دوڑائی جا سکتی لیکن سائنس والوں نے پتہ چلایا کہ جب شیشے کی کسی بند ٹیوب (نلکی) میں سے جتنی ہوا خارج کی جا سکتی ہے نکال لی جا اور بچی ہوئی ہوا میں بہت ہی طاقتور بجلی دوڑائی جائے تو ٹیوب میں لہریں سی بہنے لگتی ہیں، ٹیوب روشن ہو جاتا ہے اور اس روشنی کا رنگ ٹیوب کے اندر بچی ہوئی گیس پر منحصر ہوتا ہے۔ مثلاً ٹیوب میں ہوا رہی تھی تو اس روشنی کا رنگ گلابی ہوتا ہے۔ یہ لہریں اصل میں برقی ذروں کی قطاریں ہوتی ہیں۔ پتہ چلایا گیا کہ یہ برقی ذرے یا برقیے نہایت ہی ہلکے ہوتے ہیں یعنی اگر ترازو کے ایک پلڑے میں ایک گرام کا وزن رکھ دیا جائے اور دوسرے پلڑے میں ان ذروں کا ڈھیر لگایا جائے تو

رب (یعنی نو کے آگے ۲۴ صفر) ذروں کے رکھنے پر
ٹے برابر ہوں گے۔ ان ذروں پر پائی جانے والی
قوت کی حقیقت جاننے کے لیے ٹیوب کے قریب ایک
ناطیس پہنچایا گیا تو یہ لہریں مثبت مقناطیس کی طرف
لئیں جس سے اس بات کا اندازہ ہوا کہ ان ذروں پر
نی برقی قوت پائی جاتی ہے۔ مزید پتہ چلایا گیا کہ ٹیوب
چاہے کوئی گیس لی جائے، یہ جو برقی ذرے بہتے ہیں
ی بالکل ایک ہی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اس طرح چاہے
ے کی کوئی بھی قسم لی جائے ہر کسی میں یہ ذرے پائے جاتے
۔ان ذروں کو ''الکٹران'' کا نام دیا گیا۔''

''الکٹران ——'' اس نام کے ساتھ ہی جاوید
کے جسم میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔ انھیں یاد آیا کہ
مرتبہ ان کی انگلی غلطی سے بجلی کے تار کو چھو گئی تھی تو
ے بدن میں کپکپی دوڑ گئی تھی اور بھیّا نے کہا تھا کہ بجلی
اروں میں دراصل الکٹران چھپے ہوتے ہیں۔ یہ الکٹران
بڑھنے کے لیے، بھاگنے کے لیے بے چین رہتے ہیں،
رہتے ہیں اور جب بھی دھات یا جسم کا حصہ یا کوئی گیلی
چیز تار سے چھو جاتی ہے تو وہ فوراً اس میں کود جاتے ہیں،
تیزی سے بہنے لگتے ہیں۔ اس طرح ایک دھکا سا لگتا
ہے، کبھی کبھار وہ اتنی زور سے کودتے ہیں کہ آدمی یا کوئی
جاندار مر جاتا ہے۔ اسی لیے بجلی کے کسی تار کو یونہی ہاتھ سے
یا کسی دھات کے ذریعہ ہرگز کبھی نہیں چھونا چاہیے ——

جاوید میاں کے بدن میں جھرجھری کیا دوڑی
انھیں محسوس ہوا کہ وہ بھی برقیائے ہوئے ہیں، ان کے اندر
الکٹران دوڑ رہے ہیں، ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ان
کو محسوس ہونے لگا کہ وہ گرتے جا رہے ہیں —— نیچے بہت
نیچے، پھر یکایک انھیں محسوس ہوا کہ کوئی انھیں کھینچ رہا ہے،
انھوں نے گھبرا کر آنکھیں کھولیں، دیکھا تو ایسا لگا کہ وہ بڑی
تیزی سے چکر لگا رہے ہیں، وہ گھبرا گئے۔ انھوں نے اپنے
ارد گرد نظر دوڑائی، اور یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ چکر کاٹنے
میں وہ اکیلے نہیں ہیں۔ ان کی طرح بے شمار دھندلے نقوش
ہیں کہ چکر لگا رہے ہیں۔ بلکہ ایک طرف نظر اٹھی تو لگا کہ
ایک ہجوم سا ہے اور ایک مرکز کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ مرکز
میں انھیں ایک بڑا سا گولا دکھائی دیا، کافی وزنی معلوم ہوتا
تھا۔



جاوید میاں چاہتے تھے کہ رکیں، کسی کو روکیں اور
پوچھیں کہ ایسی اندھی بھاگ دوڑ کا کیا مطلب ہے لیکن ان
کو اپنے پر قابو نہیں تھا۔ بس وہ چکر لگا رہے تھے، حرکت
کر رہے تھے، وہ دوسروں کو بھی نہ روک سکتے تھے۔
مزے کی بات یہ تھی کہ ہر چکر لگانے والے کا اپنا ایک راستہ
تھا، مدار تک، جس پر وہ اپنے ایک اور ساتھی کے ساتھ چکر
لگا رہا تھا۔ اکیلے تھے تو بس وہ ایک ہی، اور مرکز سے دور۔
انھیں بڑا برا محسوس ہوا۔ ٹھیک اسی وقت ان کو ایک دھچکا
لگا اور کوئی ان کو بازو سے تھامے کھینچتا چلا گیا۔ وہ ہوش
بھی سنبھال نہیں پائے تھے کہ ان کے کانوں میں آواز آئی۔

"کہو بھئی، یہاں کیسے؟ کیا ساتھی کی تلاش ہے؟"

"جی — جی ہاں" جاوید میاں ہکلائے "کیوں
نہیں، آپ ہی میرے دوست بن جاتے"

"کچھ دیر کے لیے میں آپ کے ساتھ ضرور رہوں،
لیکن پھر جدا ہو جاؤں گا۔ مجھے کہیں اور جانا ہے، کسی اور
کی تلاش ہے"

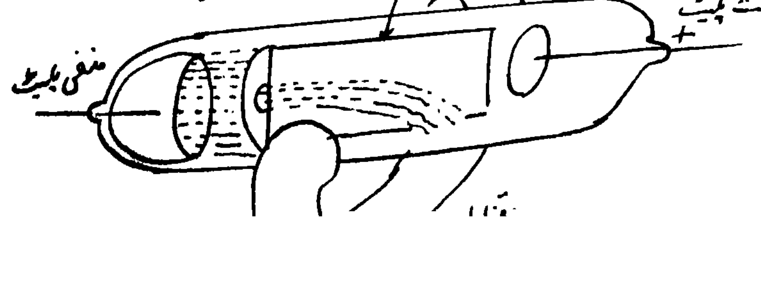
"اچھا چلیے، یوں ہی سہی، ذرا بتانا، اس پار وہ
کیا ہو رہا ہے، اتنی بھیڑ کیوں ہے؟"

"ارے، کچھ نہیں بھئی، ہمارے بھائی بند ہیں الکٹران
چکر لگا رہے ہیں"

"وہ درمیان میں کیا ہے؟"

ساتھی نے غور سے ان کی طرف دیکھا،
اور پوچھا۔ "تو آپ ہم میں سے نہیں ہیں، اچھا۔
یہاں کی سیر کرا دوں"

جاوید میاں بہت خوش ہوئے۔ وہ
ہو گئے۔ ساتھ چکر لگانے لگے۔ ان کے ساتھی نے
کیا — "دیکھو بھئی، آپ ایٹم کی دنیا میں ہیں۔
دنیا — سمجھ لیجیے، آپ کے ہاں کا نظام شمسی۔
الکٹران سیارے ہیں، زمین عطارد، مشتری، ز
سیارے سورج کے گرد چکر لگاتے ہیں، ان کے ا
ہوتے ہیں جن کو مدار کہا جاتا ہے، بالکل اسی طرح
بھی مرکز کے گرد چکر لگاتے ہیں، اور ہمارا اپنا بھی ا
راستہ ہوتا ہے۔ یہ راستہ انڈے کی شکل کا ہوتا ہے
ہمارے راستہ کا تعین بڑی مشکل سے ہوا ہے۔ پہلے
سمجھ رہے تھے کہ ہم حرکت ہی نہیں کرتے۔ پھر کہا جا
نہ کریں تو مرکز کی طرف کھینچتے چلے جائیں اور ٹکرا کر ا
ختم کر دیں۔ اسی لیے انھوں نے صحیح سوچا کہ ہم حر
ہیں اور مرکز کے گرد چکر لگا رہے ہیں۔ اس طرح چ



اقت پیدا ہو گی وہ مرکزی کشش کی مخالف ہو گی اور اس
ح ہم اپنے مدار پر ہی مرکز کے گرد گھومتے رہیں گے۔ ان کا
یال صحیح تھا اور جب اس حقیقت کو پالیا گیا تو انھوں نے
رے مدار کی شکل کی طرف توجہ دی۔ پہلے کہا گیا کہ ہمارا
تہ دائرے کی شکل کا ہے، بعد میں پتہ چلایا گیا کہ نہیں
رہ نہیں، اس کی شکل بیضوی ہے اور اس بیضوی راستہ پر
بس چلتے رہتے ہیں، چکر لگاتے رہتے ہیں، مرکز کے گرد۔
ی رفتار بڑی تیز ہوتی ہے لیکن پھر بھی ہم روشنی کا
بہ نہیں کر سکتے۔ روشنی ہم سے دس گنا تیز رفتار ہوتی
۔ ویسے ہم مرکز سے کبھی نہیں ٹکراتے۔ دراصل ایٹم کی
یت ہم سے ہی رہتی ہے۔"

"نہیں، یہ غلط ہے۔" جاوید میاں نے احتجاج کیا۔

"اس کو ثابت کیجیے کہ ایسا نہیں ہے۔" ادھر سے
تی سے جواب آیا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایٹم میں صرف آپ رہیں؟
عی ہیں اور پھر بھی ایٹم مجموعی حیثیت سے نہ منفی
مثبت۔"

میاں برقیے کھل کھلا کر ہنس پڑے، کہنے لگے۔
جی، سچ کہا۔ آپ نے پہلے پہل جب ہمیں ڈھونڈ
یا تھا تو یہی مسئلہ سائنس والوں کے پیش نظر تھا،
ن منفی برقیے ہیں۔ لیکن ایٹم برقی حیثیت سے بے
وتا ہے۔ ظاہر بات ہے منفی برق ہو تو مثبت کا ہونا
زمی ہے۔ اب مثبت برق کی تلاش شروع ہوئی۔"

"جس ٹیوب کے ذریعے ہم کو دریافت کیا گیا تھا، بالکل اسی طرح کا ٹیوب لیا گیا اور جس پلیٹ سے ٹیوب سے بجلی خارج ہوتی تھی اور جس سے ہم نکلتے تھے اس کے مقابل میں ٹیوب کے اندر بجلی لے جانے کے لیے جو پلیٹ لگائی گئی۔ اس میں سوراخ بنا دیے گئے، ایسے جیسے نالیاں بنی ہوئی ہوں اور آپ جانتے ہیں کیا ہوا؟"

"بھلا کیا؟" جاوید میاں کی دلچسپی بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

"ان نالیوں کی راہ سے پلیٹ کی دوسری طرف ایک اور طرح کی لہریں بہنے لگیں۔ ان لہروں میں ذرات پائے جاتے تھے۔ سائنس والوں کو بڑا اچنبھا ہوا۔ ٹیوب کے قریب مقناطیس لے جایا گیا تو الکٹران کی طرح یہ ذرات بھی مڑ گئے، لیکن ان سے مقابل کے رخ میں یعنی منفی مقناطیس کی طرف۔ اس کا مطلب ہوا کہ ان ذرات پر الکٹران کی مخالف برق لگی ہوتی ہے یعنی مثبت۔ اب کے سائنس والوں نے اس جھکاؤ کو ناپا جو ان ذرات میں پیدا ہوا تھا تو ان کو پتہ چلا کہ الکٹران کی بہ نسبت یہ جھکاؤ بالکل کم ہے۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ یہ ذرات الکٹران سے کہیں زیادہ وزنی ہیں۔ ان ذرات کو "پروٹان" کہا گیا۔ ایک پروٹان ایک الکٹران سے تقریباً دو ہزار گنا زیادہ وزنی ہوتا ہے۔"

"لیکن کیا ہر ایٹم میں ان کا وزن یکساں ہوتا ہے؟"
جاوید میاں نے [illegible]

ملا۔ لیکن جواب آسان ہے۔ جس طرح ٹیوب میں مختلف گیسیں بھر کر پتہ چلایا گیا تھا کہ ہر قسم کے مادے میں بالکل ایک ہی طرح کے الکٹران پائے جاتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جب ٹیوب میں مختلف گیسیں لی گئیں تو پتہ چلا کہ ذرات کا جھکاؤ گیس پر منحصر ہے یعنی جتنی زیادہ وزنی گیس ہوتی اسی قدر جھکاؤ کم ہوتا۔ اس کا مطلب یہ نکالا گیا کہ اکیلے پروٹان کا وزن تو وہی ہے جو اوپر بتایا گیا ہے یعنی الکٹران سے دو ہزار گنا۔ لیکن ایٹم کا وزن پروٹان کے مجموعے پہ جاتا ہے۔ جو اس ایٹم میں موجود ہوتے ہیں یعنی جھکاؤ ایٹم کے وزن سے تعلق رکھتا ہے۔ اب ایک اور مشکل آپڑی۔ ایٹم کے وزن کا انحصار محض پروٹان پر نہیں تھا۔ سائنس دانواں نے پتہ چلایا کہ اکثر عناصر کے ایٹم کا وزن اس ایٹم میں پائے جانے والے کل پروٹان کے مجموعی وزن سے کہیں زیادہ ہے۔ انھوں نے سوچا کہ ایٹم میں پروٹان کے علاوہ بھی کوئی اور ذرہ موجود ہے۔"

"ـــــ اب اس کی تلاش شروع ہوئی" جاوید میاں نے لقمہ دیا۔

میاں برقیہ ہنس پڑے "ہاں بھئی اس کی تلاش شروع ہوئی۔ اس کے متعلق جاننے سے پہلے ایک بات اور جان لیجیے۔ آپ نے کہا تھا کہ ایٹم برقی حیثیت سے بے رنگ ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ ایٹم میں جتنے الکٹران ہوتے ہیں۔ اتنے ہی پروٹان بھی ہونے چاہئیں اور ہوتا بھی یہی ہے۔ مختلف عناصر کے ایٹم بنتے ہی الکٹران ہوتا جاتا ہے ویسے ویسے ایک نئے عنصر کا ایٹم بنتا جاتا ہے۔ سب سے سادہ ایٹم ہائیڈروجن گیس کا ہوتا ہے اسی ہائیڈروجن کا جو پانی میں آکسیجن کے ساتھ پائی جاتی ہائیڈروجن کے ایٹم میں صرف ایک الکٹران ہوتا ہے تو بھلا کتنے پروٹان ہوتے ہیں اس میں؟"

"اوہ، ایک سے کیا زیادہ ہوں گے؟" میاں جاوید نے بڑے اعتماد سے جواب دیا۔

"بالکل صحیح، اور اس ایٹم کا وزن ایک پروٹان جتنا ہی ہوتا ہے۔ ہر ایٹم میں مجموعی طور پر اتنے ہی پروٹان ہوتے ہیں جتنے الکٹران تاکہ برقی قوت برابر رہے۔ اس میں کمی بیشی کی وجہ سے ایٹم ختم ہو سکتا ہے۔ یوں ایک وقت میں ایک ہی الکٹران کا اضافہ ہوتا ہے، اسی کے ساتھ ایک پروٹان بھی بڑھ جاتا ہے اور نئے ایٹم بنتے جاتے ہیں۔ ہائیڈروجن کے ایٹم میں جب ایک اور الکٹران کا اضافہ ہوتا ہے تو جو عنصر بنتا ہے وہ بھی ایک گیس ہوتی ہے، اس کا نام "ہیلیم" ہے۔

"یعنی وہ ہلکی گیس جو طیاروں کے پہیوں میں بھری جاتی ہے؟"

"ہاں بھئی، خوب سمجھے۔" "ہیلیم" کے ایٹم میں دو پروٹان ہوتے ہیں نا!" ـــــ جاوید نے اپنی ذہانت کا مزید ثبوت دیا۔ "اور اس طرح ہیلیم کے ایٹم کا وزن ہائیڈروجن کے ایٹم سے دگنا ہوا نا؟"

مسکراتے ہوئے میاں برقیہ نے کہا "ٹھیک،

ں۔ اس حساب سے اس کا وزن ہائیڈروجن کے ایٹم کا
نا ہی ہونا چاہیے تھا۔ لیکن اصل میں یہ چار گنا ہوتا ہے۔"
"ایں، چار گنا ــــ؟" جاوید کا منھ حیرت سے کھل گیا۔
"ہاں بھئی، اس سے سائنس داں بھی حیران ہوئے
نکل آپ کی طرح، انھیں بڑی تشویش ہوئی کہ یہ دو یونٹ
زن کیسے بڑھ گیا۔ اسی زمانے میں ایک اور انوکھی دریافت
رئی، بہت ہی عجیب اور اہم ــــ"
میاں برقیہ رکے، جاوید میاں کو اور کھوج ہوئی۔
ہ کچھ پوچھنے ہی والے تھے کہ میاں برقیہ نے کہنا شروع کیا۔
"بعض ایسی دھاتوں کا پتہ چلایا گیا جو خود بخود د
وسرے عناصر میں لگاتار تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ ان دھاتوں
سے لگاتار شعاعیں نکلتی رہتی ہیں۔ ان شعاعوں کو "تابکاری
شعاعیں" کہا جاتا ہے۔ تابکاری شعاعیں تین طرح کی
رتی ہیں۔ اور ان میں ایسے ذرات پائے جاتے ہیں جن کا
بنا وزن اور بجلی ہوتی ہے۔ یہ تابکار شعاعیں ایٹم کے
ندر کی دنیا جاننے میں بڑی مددگار ثابت ہوئیں۔ ان
ے ذریعہ دو بنیادی باتیں دریافت ہوئیں ــــ اوّل تو یہ
ہ ایٹم میں پروٹان پھیلے ہوئے نہیں ہوتے بلکہ ایک جگہ
مٹے ہوتے ہیں۔ گویا ایٹم کا ایک مرکز ہوتا ہے جہاں ایٹم کی
مثبت بجلی اور وزن چھپے ہوتے ہیں۔ اس مرکز کو "نیوکلیس"
ہا گیا (NUCLEUS) نیوکلیس ایٹم کے مقابلہ میں نہایت
چھوٹا ہوتا ہے۔ آپ اس کا اندازہ یوں کر سکتے ہیں ــــ سمجھ
لیجیے ایٹم ایک بڑا گھر ہے۔ اب اس گھر میں کہیں ایک پن
(PIN) پڑی ہوتی ہے۔ اس گھر کے مقابلے میں اس پن
کے سرے کی جو حیثیت ہے وہی حیثیت ہے نیوکلیس کی
ایٹم کے مقابلے میں ــــ دوسرے یہ کہ اس نیوکلیس میں
پروٹان کے علاوہ ایسے ذرے بھی پائے جاتے ہیں جن کا
وزن ہوتا تو پروٹان کے جتنا ہی ہے لیکن ان پر کسی طرح کی
بجلی نہیں پائی جاتی۔"
"یعنی وہ بے برقیائے ہوئے ہوتے ہیں ایٹم کی
طرح" ــــ جاوید نے ٹوکا۔
"اوں ــــ جی، کچھ اسی طرح سمجھ لیجیے۔ تو بھئی
تیسری قسم کے ان ذروں کو "نیوٹران" کے نام سے پکارا
گیا ــــ تو بھئی یہی تین بنیادی اینٹیں ہیں جن سے دنیا
کی ہر شے کے ایٹم بنتے ہیں۔"
"میں بتاؤں" جاوید سے رہا نہ گیا۔ "ہر شے کا
ایک خاص طرح کا ایٹم ہوتا ہے۔"
"بالکل صحیح۔"
"ایٹم میں تین طرح کے ذرات پائے جاتے ہیں۔"
"ہوں۔"
"یہ ذرات ہر ایٹم میں پائے جاتے ہیں۔ ان کے
اپنے خصوصیات ہر ایک ایٹم میں ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔"
"خوب ــــ"
"ایٹم کے دو حصے ہوتے ہیں ــــ ایک نیوکلیس
یا مرکز اور دوسرا نیوکلیس سے باہر کا حصہ۔"
"بہت اچھے۔"
"نیوکلیس میں دو طرح کے ذرات ہوتے ہیں ــــ
ایک پروٹان دوسرے نیوٹران۔ دونوں ذرات کا وزن

تقریباً برابر ہوتا ہے۔ ان کی تعداد مختلف ہوتی ہے، اور ان دونوں کا مجموعی وزن اس ایٹم کا وزن ہوتا ہے۔"

"شاباش!"

نیوٹران پر کسی طرح کی بجلی نہیں لگی ہوتی۔ لیکن پروٹان پر مثبت برق لگی ہوتی ہے۔"

"تو ۔۔۔"

"تو یہی کہ نیوکلیس میں جتنے پروٹان ہوتے ہیں۔ نیوکلیس سے باہر اتنی ہی تعداد میں منفی برقیے یعنی الکٹران پائے جاتے ہیں تاکہ مجموعی طور پر ایٹم پر کسی طرح کی بجلی نہ پائی جائے۔" جاوید نے کہا۔

"اور" میاں برقیہ نے سلسلہ ملایا "یہ الکٹران نیوکلیس کے گرد بیضوی مداروں پر لگاتار چکر لگاتے رہتے ہیں۔ چونکہ یہ نہایت ہلکے ہوتے ہیں اسی لیے ایٹم کے وزن میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔"

"لیکن ایک بات سمجھ میں نہیں آتی۔" جاوید نے کہا۔

"کیا؟"

"نیوکلیس ہے تو اتنا چھوٹا اور پھر اس میں مثبت برق والے کئی پروٹان ایک ساتھ کیسے رہ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ خود پروٹان اور نیوٹران کی اتنی کثیر تعداد اس چھوٹے سے حصہ میں کیسے رہ سکتی ہے؟"

"بھئی! اس کا جواب اتنا آسان نہیں ہے، بس سمجھ لو کہ ایٹم کی طاقت کا سارا راز اسی میں ہے۔ اتنے چھوٹے سے نیوکلیس میں کئی پروٹان کو باہم ملائے رکھنے میں، ممکن ہے، نیوٹران کا بھی کچھ حصہ ہو لیکن ان سب کو ملائے رکھنے والی ایک ایسی قوت ہوتی ہے۔ جس کو مرکز یا نیوکلیر فورس کہا جا سکتا ہے۔ اب اگر کسی طرح نیوکلیہ کو توڑا جائے تو اس سے بے پناہ طاقت نکلتی ہے جس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اسی کو جوہری توانائی کہتے ہیں۔ اسی جوہری توانائی کو ایٹم کو توڑ کر حاصل کرنے کے اصول پر ایٹم بم بنایا گیا تھا ۔۔۔ ویسے ۔۔۔"

"ہاں ہاں میں سمجھ گیا، ویسے یہ ہم پر منحصر ہے اس طاقت کو صرف تعمیری کاموں میں لگایا جائے ۔۔۔" جاوید میاں نے کہا۔

"خوب! بس ایک اور بات جان لو۔ اب اگر کسی طرح نیوکلیس کو توڑا جائے یا دو ہلکے نیوکلیس کو باہم جوڑا جائے تو اس سے نئے ایٹم بنائے جا سکتے ہیں یعنی اس طرح ایک عنصر کے ایٹم کو دوسرے عنصر کے ایٹم میں تبدیل کیا جا سکتا ہے؟"

"یعنی تانبے اور لوہے کو سونے میں تبدیل کیا جا سکتا ہے؟"

"جی ہاں ایسا کیا جا سکتا ہے، بلکہ کیا گیا۔ لیکن یہ بڑا پیچیدہ عمل ہے اسی طرح کا ایک اور پیچیدہ عمل وہ ہے جس کے ذریعہ ایک عنصر کا ایٹم دوسرے عنصر کے ایٹم سے جڑتا ہے اور مرکب اشیاء بنتی ہیں۔"

"جیسے پانی، جس میں ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ایٹم جڑتے ہیں۔" جاوید میاں نے واقعی ایٹم کے راز جان لیے تھے۔

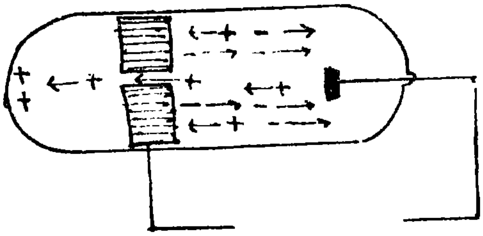
"بالکل صحیح، مختلف عناصر کے ایٹموں کے

رمیان اس قسم کا بندھن الکٹران کے ذریعہ ہی ہوتا ہے۔
پ نے ایکس رے (XRAYS) کا نام سنا ہوگا۔
ہی شعاعیں جن سے جسم کے اندرونی اعضا کی خرابی
پہچانا جاتا ہے، اور جن سے ہڈیوں کی تصویریں اتاری
اتی ہیں۔ ان شعاعوں کا تعلق بھی الکٹران ہی سے ہوتا
۔ یہ اور ایسی دوسری تبدیلیوں کی تفصیل پھر کبھی سننا
۔ تو میں چلا، لو وہ میرا ساتھی مجھے آواز دے رہا ہے۔"

اتنا کہہ، میاں برقیے نے جاوید میاں کا ہاتھ
ڑا اور لپک کر ساتھی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ یہ ساتھی اسی
ہیں تھا جو جاوید میاں نے دور سے دیکھا تھا اور
جس کے نیوکلیس کے گرد الکٹران کا ہجوم سا تھا۔ دونوں
گھومتے ہوئے اب اس کے قریب آگئے تھے۔

برقیہ نے جاوید میاں کا بازو کیا چھوڑا ——
انھیں ایک جھٹکا لگا اور وہ —— ایک دھما کا
ہوا، اور وہ کتاب کے ساتھ کرسی سے نیچے آرہے۔
آنکھیں کھلیں تو نہ وہاں میاں برقیہ تھے، نہ ایٹم، نہ
وہ چکر لگا رہے تھے —— البتہ ان کا سر گھوم رہا
تھا اور انھیں ایسا لگ رہا تھا کہ ان کے اردگرد کی دنیا
الکٹران کی طرح گھوم رہی ہے اور وہ نیوکلیس کی طرح
رکے ہوئے ہیں —— باوقار، باوزن ——"

ٹان کی دریافت:۔
رخ والی منفی پلیٹ کی طرف مثبت ذرات والی لہریں بہہ رہی
اور سوراخ سے پار ہو رہی ہیں۔ منفی پلیٹ سے الکٹران بھی
کر مثبت پلیٹ کی طرف بہہ رہے ہیں۔۔۔ الکٹران کے
منفی نشان (-) اور پروٹان کی لہروں کے پیچھے مثبت
ن (+) بنایا گیا ہے۔



ندھی جی کی بیوہ عورتیں

ایک مرتبہ دہلی میں آل انڈیا کانگریس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا۔ ایک نشست ختم
نے کے بعد کانگریس کے لیڈر پنڈال سے باہر نکلنے لگے۔ بلبلِ ہند سروجنی نائیڈو پنڈال سے باہر نکل چکی تھیں۔
امریکن نامہ نگار جو اس سے قبل ہندوستان نہیں آیا تھا —— ان سے سوال کر بیٹھا۔
"مجھے یہ بتائیے کہ کانگریس میں کتنی عورتیں شامل ہیں؟"
"عورتوں میں یہاں صرف میں ہی اکیلی ہوں۔" سروجنی نائیڈو نے کہا۔
یہ سن کر امریکی نامہ نگار کو بہت تعجب ہوا اور اس نے ڈائس پر نظر ڈالی تو وہاں راجندر
، کرپلانی، پٹیل بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے چہروں پر نہ داڑھی تھی نہ مونچھ۔ بالکل صفاچٹ، اس پر یہ تینوں
ت قیمتی شالوں سے اپنے تمام جسم کو چھپائے بیٹھے تھے۔ ان کی طرف نامہ نگار نے اشارہ کیا اور کہا — "تو پھر یہ کون
—؟" سروجنی نائیڈو نے نامہ نگار کی عدم واقفیت کو تاڑتے ہوئے ہنس کر کہا — "یہ تینوں گاندھی جی کی بیوہ

جناب ہاشم آفاقی (بی۔اے۔علیگ۔)

ہمت و کوشش

پہاڑوں کی بلندی سے
نہایت ارجمندی سے

چلا اک چشمۂ خوش تر
ملا اک راہ میں پتھر

کہا نرمی سے چشمے نے
ذرا رستہ مجھے دے دے

وہ پتھر سنگ دل سا تھا
جواب اس نے دیا اکھڑا

ابے چشمے کے بچے چل
کچل ڈالوں گا بہ کس بل

نہ سیلابوں سے میں ٹلتا
مرے آگے تو کیا ٹھہرا

طمانچہ کھینچ کے دوں گا
ٹھکانے پر لگا دوں گا

ہمارے سامنے سے ہٹ
نہ کر اس جا ذرا کھٹ پٹ

یہ سن کر چشمہ بے چارا
زباں سے کچھ نہیں بولا

وہ استقلال کا پتلا
جواں مردی میں رستم سا

نہ باز آیا وہ کوشش سے
کسی صورت بڑھے آگے

لگا وہ کھودنے مٹی
ہوئی تر اس جگہ خشکی

ہوئی مٹی جو نرم و تر
لگا پھر کانپنے پتھر

لڑھک کر آگیا نیچے
دبک کر آگیا نیچے

یہی کوشش سے ہوتا ہے
کہ پتھر موم بنتا ہے

اگر ہمت نہ ہاریں ہم
تو سب میدان ماریں ہم

یہی ہے ہمتِ مرداں
یہی ہے رحمتِ یزداں

پیارے نونہالو تم
چلو بستہ سنبھالو تم

ماب مرزا شکور بیگ



لغت کے لحاظ سے بیٹے کی بیوی کو بہو کہتے ہیں۔ ہر بہو، بہو بننے سے پہلے، دلہن بنتی ہے۔ اپنے نکاح سے پہلے، نکاح کے وقت اور نکاح کے بعد، بہو عجیب اداکاری کرتی ہے۔ اُس کی آنکھیں ہوتی ہیں مگر وہ انھیں کھولتی نہیں۔ بند رکھتی ہے۔ منھ میں گز بھر کی زبان رہتے گونگی بنی رہتی ہے۔ ہاتھ پاؤں رکھ کر بھی معذور بن جاتی ہے۔ وکیل اور گواہ نکاح کے وقت اُس کی مرضی دریافت کرنے آتے ہیں تو انھیں اپنے دل کی بات نہیں بتاتی۔ خاموش رہتی ہے یا رونے لگتی ہے۔ وہ بے چارے اسی رونے اور خاموشی کو رضامندی سمجھ کر لوٹ جاتے ہیں۔ اگر کہیں رضامندی سننے پر اصرار ہو تو روتے روتے "ہوں" بھی کہہ دیتی ہے۔ جلوہ یا منھ دکھائی کے لیے آتی نہیں لائی جاتی ہے۔ یوں قدم اٹھاتی ہے جیسے بچہ پاؤں چلنا سیکھ رہا ہو۔ میکے والوں اور سہیلیوں میں ہو تو خوب باتیں کرتی ہے ہنستی بولتی ہے۔ مگر جب کوئی مہمان یا سسرال کا آتا دکھائی دے تو جھٹ گھونگٹ چھوڑ، دبکی دبکائی۔ سکڑی سکڑائی بیٹھ جاتی ہے۔ اس کا منھ دیکھنا ہو

تو ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ سے اٹھانا ہوتا ہے۔ ورنہ اس کی گردن جھکی رہتی ہے، آنکھیں بند ہوتی ہیں، نہ اپنے ہاتھ سے کھاتی ہے نہ پیتی ہے کوئی نوالہ بنا کر قریب لے جائے تو منھ کھول دیتی ہے مگر نوالہ منھ میں لیے بیٹھی رہتی ہے، اصرار پر آہستہ آہستہ چباتی ہے رخصتی کے وقت روتی ہے مگر رونے میں اس کا خیال رکھتی ہے کہ چہرے کی آرائش بگڑنے نہ پائے یعنی آنسو کم نکلتے ہیں اور رونے کی آواز زیادہ نکلتی ہے۔ جاگتے میں اس طرح پڑی رہتی ہے کہ نیند کا گمان ہوتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ اپنی سسرال میں پہلی دفعہ چور کی طرح منھ چھپائے خاموشی سے دبے پاؤں داخل ہوتی ہے۔ ابتدا میں وہاں اس کی خوب آؤ بھگت ہوتی ہے۔ اچھے اچھے کھانے پکتے ہیں۔ خوب خوب دعوتیں ہوتی ہیں بڑو کا ادب اور چھوٹوں سے پیار قائم ہوتا ہے۔ ہر صبح گھر کے بڑوں کو سلام کے لیے گھمائی جاتی ہے۔ ان دعائیں لیتی ہے۔ مگر جب کچھ دن گزر جاتے ہیں تو دلہن گھونگٹ اٹھ جاتا ہے۔ اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اس کے ہاتھ پاؤں کام کرنے لگتے ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر اس کی زبان چلنے لگتی ہے تو اس وقت کا اصلی رنگ ظاہر ہوتا ہے۔

سمجھدار لڑکیاں شادی کے بعد اپنے حسن کی مقبولیت پر ناز نہیں کرتیں بلکہ اپنے خلوص اور محبت اور اپنے سلوک سے سسرال والوں کے دلوں کو موہ لیتی ہیں۔

جناب علی احمد انجم شیرکوٹی

دیانتداری

سوئٹزرلینڈ کا ایک سیاح فرانس میں موٹر پر سفر کر رہا تھا۔ ایک دلفریب نظارے کا فوٹو لینے کے لیے وہاں مقام پر رکا۔ دو سو میل جا کر اسے احساس ہوا کہ وہ اپنا کیمرہ اسی مقام پر بھول آیا ہے۔ اس پر کوئی نام یا پتہ نہ لکھا تھا۔ سیاح نے سوچا اب کیمرہ نہیں ملے گا لیکن اس کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہی جب کچھ ہی دن بعد ایک شخص اس کے گھر پہنچا اور کیمرہ لوٹا گیا۔

ایک فرانسیسی کو وہ کیمرہ ملا مگر اس پر نام اور پتہ موجود نہ تھا۔ وہ کیمرہ گھر لے گیا اور اندر کی فلموں ڈیولپ کیا کہ شاید اسے کوئی سراغ مل جائے۔ ایک فلم پر موٹر کا نمبر تھا مگر اتنا چھوٹا مدھم تھا کہ پڑھا نہ جاتا تھا۔ اس نے اس فلم کو انلارج کیا اور نمبر پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ اب اس نے سراغ رساں ایجنسی کے ذریعہ اس سیاح کا پتہ لگانا شروع کیا۔ پوری معلومات حاصل کرنے کے بعد وہ فرانسیسی سوئٹزرلینڈ گیا اور وہ کیمرہ

ب جمشید اشرف جامعہ نگر



خرگوش کا گھونسلا

فروری کا مہینہ تھا۔ ڈے وڈ اپنی خالہ کے
ہوا تھا۔ دن بہت بوریت (اکتاہٹ) سے
رہے تھے۔ اس وقت بھی وہ یونہی بلامقصد
یسی کھیت میں سے گزر رہا تھا۔ اچانک اس
یک سوراخ پر پڑ گیا۔ گرا تو نہیں مگر انگوٹھا
زخمی ہو گیا اور اس کے منھ سے ہلکی سی
ری نکل گئی۔

"یہ تمھاری اپنی ہی غلطی ہے۔"

ایک بہت ہی ہلکی سی آواز سنائی دی اور
حیرت سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ آواز اسی
ہ کے اندر سے آ رہی تھی۔

"تم انسان یہ تو کبھی سوچتے ہی نہیں کہ سامنے
ہے، کہاں جا رہے ہو اور کیا کر رہے ہو۔ تم
زمین دوز گھونسلا تباہ کر دیا۔ کیا عجب جو
ی اس حرکت سے میرے بچے ڈر بھی گئے ہوں۔"

"تم کون ہو بھئی۔ اور کہاں ہو؟" ڈیوڈ نے

"میں جن ہوں اور میرا نام پکسی ہے۔" ایک
چھوٹا سا آدمی گھاس سے باہر نکلتے ہوئے بولا۔
یہ چھوٹا سا آدمی ڈیوڈ کی چھنگلیا سے زیادہ بڑا نہیں
تھا۔ اس کے چھوٹے سے کپڑے بھی گھاس کے رنگ
کے تھے جبھی تو اب تک ڈیوڈ اس کو دیکھ نہ سکا تھا۔

پکسی بولا "میں اپنے ایک دوست سے
ملنے کے لیے گھر سے باہر نکلنے والا ہی تھا کہ تم نے
اپنا یہ پہاڑ جیسا پاؤں میرے دروازے پر رکھ دیا۔"

"بھئی مجھے تو یقین نہیں آتا۔ کیونکہ چڑیاں
زمین کے اندر تو گھونسلا بناتی نہیں ہیں۔" ڈیوڈ بولا۔

"ارے بھائی یہ کون کہتا ہے کہ یہ چڑیا کا
گھونسلا ہے۔ یہ تو ایک جانور کا گھونسلا ہے بھائی۔"
پکسی نے کہا۔

"اچھا تو آپ مجھے اب بے وقوف بنا رہے
ہیں یعنی جانور اور گھونسلا؟" ڈیوڈ نے پکسی کو حقارت
سے دیکھتے ہوئے کہا۔



جانوروں کو گھونسلے میں دیکھ لو تو پھر تو یقین کر لو گے۔"
پکسی نے پوچھا۔

"بالکل بالکل۔ مگر سوال یہ ہے کہ میں دیکھ کس طرح سکتا ہوں۔ تم تو کہتے ہو کہ گھونسلا زمین کے اندر ہوتا ہے۔؟" ڈلیوڈ نے پوچھا۔

"اس کی تم فکر نہ کرو۔ میں تم کو چھوٹا کر دوں گا اور پھر تم کو زمین کے اندر لے جاؤں گا۔" پکسی نے کہا۔ "کیا خیال ہے؟ چلو گے نا۔؟"

"اچھی بات ہے۔" ڈلیوڈ تیار ہو گیا۔ اسے پکسی کی بات پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ سچ مچ ایسی بات ہے تو پھر تو یہ ایک دلچسپ اور عجیب و غریب بات ہو گی اور جب وہ واپس اسکول جائے گا تو لڑکوں کو خوب مزے مزے سے سنائے گا۔ اس نے پکسی پوچھا۔

"ہاں بھئی تو تم اب کیا کرو گے اور کیسے گے ؟" پکسی بولا۔

"تم میرا ہاتھ پکڑ لو۔"

ڈلیوڈ نے ہاتھ پکڑ لیے۔ پکسی کا ننھا سا ڈلیوڈ کے ہاتھ میں چھپ کر رہ گیا۔ پھر اس نے کر کہتے ہوئے جادو کے بول دہرائے۔

میرے وزن تو کم ہو جا۔ کم ہو جا میں جن جیسا چھوٹا ہو جاؤں۔ چھوٹا ہو جاؤں۔"

جیسے ہی اس نے جادو کے یہ بول کہے اسے ایسا لگا جیسے اس کا قد چھوٹا ہوتا جا رہا اور پھر تھوڑی دیر بعد اس کا قد بس اتنا ہو گیا پکسی کا۔

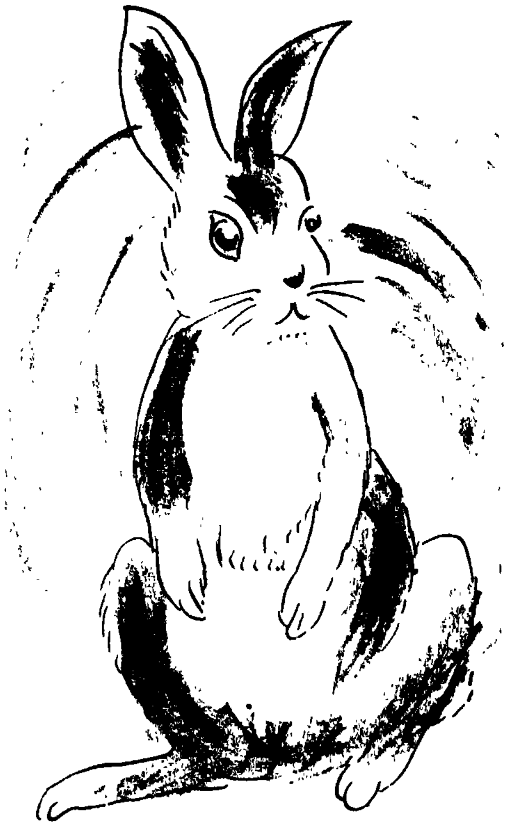
"اب چلو بھئی۔" پکسی بولا۔ پہلے تو میں کے اندر جاؤں گا اور تم میرے پیچھے پیچھے آنا۔" اور پکسی دونوں سوراخ میں چلے گئے۔ یہ سوراخ اتنا بڑا تھا۔ جتنا بڑا اس کا ہاتھ چھوٹے ہونے پہلے تھا۔ مگر اس وقت اس کو یہ سوراخ ایسا رہا تھا جیسے وہ ریلوے کی بڑی سرنگ اسٹیشن بڑے ہال کے اندر چل رہا ہو۔ اس سے زیادہ تعج کی بات یہ کہ سرنگ میں اندھیرا گھپ تھا۔ پھر بڑے مزے سے دیکھ سکتا تھا۔ اس سرنگ میں جانے کتنے راستے تھے۔ اگر پکسی ڈلیوڈ کے سا



ڈیوڈ اب تک اس بھول بھلیاں میں گم ہو چکا

چلتے چلتے وہ آخری سرے پر پہنچ گئے اور
گھر میں داخل ہو گئے۔ سامنے ہی ایک
رنگ کا جانور انھیں گھور رہا تھا۔ اس جانو
نی حصّہ سفید تھا۔ چھوٹی سی دم پر ایک سفید
ٹپّا تھا۔
ارے خرگوش!" حیرت کے مارے ڈیوڈ

نہیں دیکھی تھی۔ اچانک اس نے کچھ سوچتے ہوئے
پکسی سے کہا" مگر بھئی یہ گھونسلا تو نہیں ہے۔
دیکھا میں نہ کہتا تھا کہ تم غلط کہہ رہے ہو۔"
"ایک منٹ صبر کرو دوست۔ ابھی دکھاتا ہوں"
پھر وہ خرگوش کی طرف مڑا اور بولا۔
"معزز خاتون۔ میں آپ کے پاس ایک چھوٹا
سا آدمی لایا ہوں۔ بات دراصل یہ ہے کہ ان کو اس
بات کا یقین ہی نہیں ہے کہ جانور بھی گھونسلے میں
رہتے ہیں۔ کیا آپ مہربانی کر کے ہم کو اپنا گھر دکھائیں
گی ——؟"
"ضرور ضرور مسٹر پکسی۔ آپ کہیں اور ہم نہ
دکھائیں۔ دوسرے اتنے ذرا سے آدمی سے تو ہم کو ڈر
بھی نہیں لگتا ہے۔" اس نے اپنے گھر کا دروازہ کھولتے
ہوئے کہا "تشریف لایئے۔ مسٹر ڈیوڈ۔ ڈیوڈ نے
اندر جھانکا۔ اندر آٹھ چھوٹے چھوٹے خرگوش کے بچے
بڑے مزے سے سو رہے تھے۔ یہ بہت ہی چھوٹے
تھے۔ ابھی ان کے بال بھی نہیں نکلے تھے۔ آنکھیں بھی
نہیں کھلی تھیں مگر یہ بچے بڑے آرام سے لیٹے تھے
ان کی ماں نے انھیں ایک گھونسلے میں بہت سلیقے
سے لٹا دیا تھا۔
بی خرگوشنی بولیں" دیکھیے یہ چھوٹی سی
نرسری میں نے ان بچوں کی پیدائش سے پہلے ہی بنالی
تھی۔ پہلے تو میں [illegible]



لگا دیے اور یہ بال میں نے اپنے جسم میں سے آہستہ آہستہ نکال کر جمع کیے تھے۔"

پکسی نے ڈیوڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کہیے مولانا۔ اب تو آپ کو یقین آگیا۔ کہ کچھ جانور ایسے بھی ہوتے ہیں جو گھونسلے میں رہتے ہیں۔"

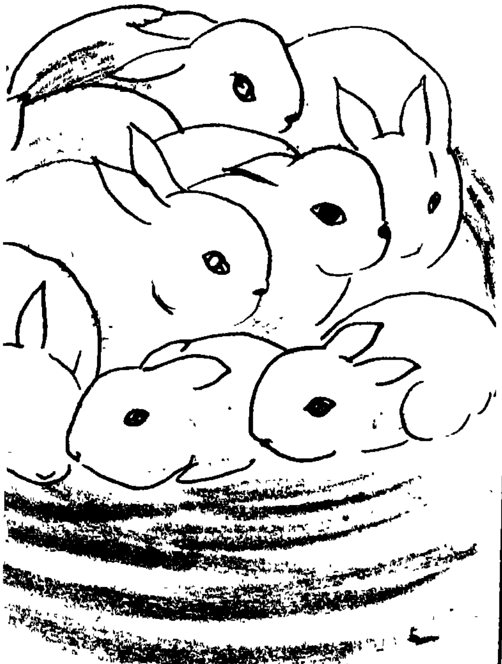
"کمال ہے بھئی۔ اب تو یقین آہی گیا ہے۔ مگر بھائی ہمیں تم اس خرگوش کے گھونسلے کے بارے میں کچھ اور بھی بتاؤ۔

"ایک بات تو یہ سمجھ میں نہیں آئی کہ ان محترمہ نے ان بچوں کو اپنے ساتھ کیوں نہیں رکھا۔"

"بات دراصل یہ ہے کہ ان بچوں کے ا... مزاج ذرا گرم ہے۔ انھیں غصہ آتا ہے تو اپنا... بچوں پر اتارتے ہیں۔ اس لیے ہم نے انھیں ا... الگ کمرے میں رکھا ہے۔" یہ کہتے ہوئے اس... کا دروازہ بند کر دیا۔

"اچھا ـــــ لیکن ان بچوں کے ساتھ آ... خود کیوں نہیں رہتیں۔؟" ڈیوڈ نے سوال کیا۔

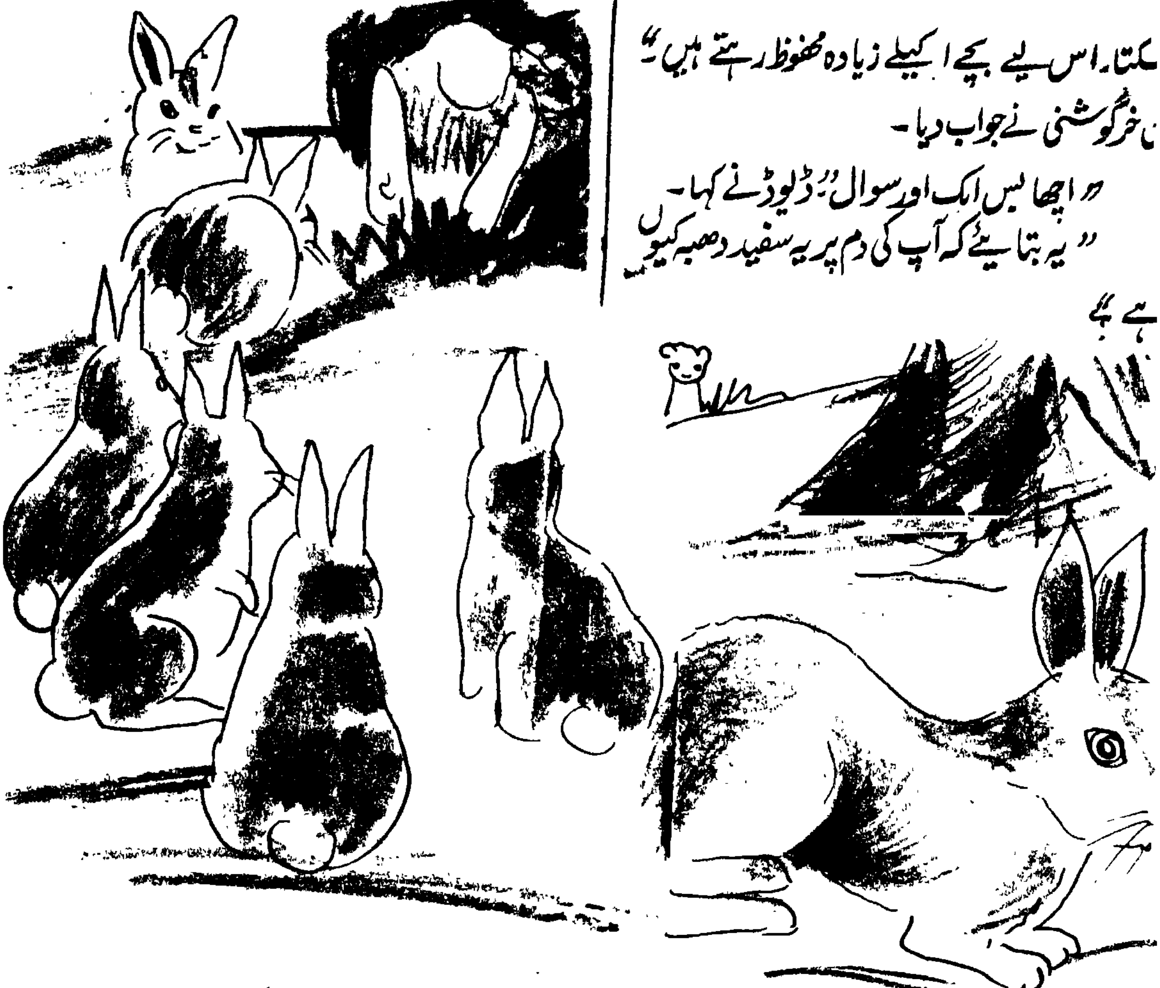
"بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کے دشمن... ہیں۔ سب سے خطرناک دشمن نیولا ہے۔ اسے...



کا پتہ چل جائے تو وہ انھیں کھا جائے۔ وہ خ... کی خوشبو سونگھ کر پیچھا کرتا ہے۔ اگر میں ان بچو... ساتھ رہوں گی تو اس کو پتہ چل جائے گا۔ بچوا...

سکتا، اس لیے بچے اکیلے زیادہ محفوظ رہتے ہیں۔"
ن خرگوشنی نے جواب دیا۔

" اچھا بس ایک اور سوال"، ڈیوڈ نے کہا۔
" یہ بتائیے کہ آپ کی دم پر یہ سفید دھبہ کیوں
ہے؟"



" یہ تو بڑے کام کی چیز ہے۔ دیکھیے جب بچے کچھ بڑے ہو جائیں گے تو میں ان کو باہر میدان میں کھلانے کے لیے لے جاؤں گی۔ اب فرض کیجیے ایسے وقت میں کوئی خطرناک جانور آ جائے تو میں فوراً اپنی پچھلی دو ٹانگوں کے بل زور سے زمین پر کودوں گی — یہ ہمارے خطرے کا الارم ہے۔ اس سے تمام دوسرے خرگوش چوکنا ہو جائیں گے اور اپنے اپنے گھروں سے نہیں نکلیں گے۔ پھر اسی وقت میں اپنے بچوں سے

" اب دیکھیے میری دم کتنی کارآمد ہے — بچوں کو یہ تو جلدی میں معلوم نہ ہوگا کہ کونسا گھر زیادہ قریب ہے نہ مجھے بھاگتے ہوئے دیکھ سکیں گے۔ اس لیے بھاگتے وقت میں اپنی دم کو اونچا کر لوں گی۔ اب بچے میری دم کا سفید رنگ دیکھتے ہی سمجھ جائیں گے اور میرے پیچھے بھاگ پڑیں گے اور میرے ساتھ ساتھ ہی جلدی سے گھر میں گھس جائیں گے۔"

" بھئی واہ — کمال کر دیا آپ نے بھی۔ مگر یہ

وصبا نظر نہیں آرہا ہے۔ حالانکہ آپ اس وقت بھی کود رہی تھیں،" ڈیوڈ نے کہا۔

خرگوشنی بولی "میری دم کا سفید دھبا اسی وقت نظر آتا ہے جب میں خوف سے اپنی دم اٹھا لیتی ہوں۔"

"اچھا محترمہ۔ بہت بہت شکریہ میں آپ کو یاد رکھوں گا۔ آپ نے مجھے بہت کام کی باتیں بتائی ہیں۔ اور اب مجھے گھر جانا چاہیے۔ اچھا بھئی پکسی اب مجھے کیا کرنا چاہیے" اس نے پکسی سے پوچھا۔

پکسی نے بھی خرگوشنی کا شکریہ ادا کیا اور ڈیوڈ پکسی کے ساتھ ساتھ باہر آگیا۔ باہر آکر ڈیوڈ پھر اپنے اسی سائز کا ہوگیا۔ پکسی نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"اچھا اب تو تم کو یقین آگیا میری بات" اس نے ڈیوڈ سے ہنستے ہوئے پوچھا۔

"اچھا بھئی خرگوش کا گھونسلا تو دیکھ لیا کیا تم ہمیں اور بھی جانوروں کے گھونسلے دکھا گے؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

ضرور ضرور۔ جن نے کہا "تم ایک مہینے کے بعد پھر یہاں آنا۔ پھر میں تم کو دوسرے جانو کے گھونسلے دکھاؤں گا۔"

"اچھی بات ہے تو پھر وعدہ رہا" ڈیوڈ نے کہا۔ اور پھر اچانک پکسی اس کی آنکھوں سے اوجھ ہو گیا۔ ڈیوڈ بھی اپنے گھر آگیا۔ اب اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اب اس کی چھٹیاں بڑے مزے گزریں گی۔ اور پھر وہ ایک مہینہ گزرنے کا انتظ کرنے لگا۔ (ترجمہ)

اس سرخ نشان کا مطلب ہے کہ اس مہینے کے بعد آپ کی مدت خریدا ختم ہوچکی ہے۔۔۔۔۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے پیارے پیام تعلیم کی سرپرستی جا رکھیں گے۔۔۔۔۔ براہ کرم مبلغ ۴ چھ روپے کا منی آرڈر اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک بھیج دیجیے تاکہ یہ سلسلہ قایم رہے۔ آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا اور افسوس کے ساتھ بند کر دیں گے۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے۔ آپ کا خریداری نمبر

جناب کے۔ ایل پردیسی



جس کو اللہ رکھے

بلّی نے ایک چوہا پکڑا ننھا منا چار دنوں کا
دیکھ اسے خوش من تھا اس کا جیسے یہ اک دھن تھا اس کا
بھوکی تھی وہ کئی دنوں کی دیر تھی بس اب دو لمحوں کی
چوہے کا دل کانپ رہا تھا ڈر کے مارے ہانپ رہا تھا
رو کر بولا چھوڑ دے خالہ میں ہوں ابھی گودوں کا پالا
ایک نوالہ بھی نہ بنے گا آپ کا کیسے پیٹ بھرے گا
چوہا جتنی منت کرتا بلّی کا دل اور اُبھرتا
اور زیادہ چھیڑتی اس کو چھوڑ چھوڑ کر گھیرتی اس کو
کھیل کود کی رو میں بلی چوہے سے کچھ دور ہوئی تھی
اتنے میں اک چھوٹا سا بل دیکھ کے چمکا چوہے کا دل
تیزی سے بلّی بھی لپکی اور ابھی تھی آنکھ نہ جھپکی
چوہا پہنچا بل کے اندر اپنی ننھی جان بچا کر
شور مچاتی رہ گئی بلّی اپنے من میں کہہ گئی بلّی

سچ ہے جس کو اللہ رکھے
کمر، کی ہمت - ۳۱، کو حکم



جناب ڈاکٹر گیول دھیر

جسم کی پانچ طاقتیں

ہمارے جسم میں پانچ بڑی طاقتیں ہیں ۔

۱ آنکھ ۔

۲ کان ۔

۳ ناک ۔

۴ زبان ۔

۵ جلد ۔

ہم جو کچھ بھی کھاتے ، پیتے ، سنتے ، دیکھتے یا محسوس کرتے ہیں ، انھی طاقتوں کی مدد سے ، انھی طاقتوں کے ذریعے دماغ کو بیرونی حالات سے آگاہی ہوتی ہے ۔ یہ طاقتیں ذریعہ ہیں ۔ ان کا مرکز دماغ میں ہوتا ہے ۔ انھی طاقتوں کے ذریعہ دماغ باہر کے حالات سے واقف رہتا ہے ۔ اگر آنکھ نہ ہو تو انسان کے لیے دنیا اندھیری ہو جائے ۔ زبان نہ ہو تو زندگی کا مزا ختم ہو جائے ۔ اسی طرح دوسری طاقتوں کی بھی اتنی ہی اہمیت ہے ۔ ان طاقتوں کے بغیر انسان کچھ بھی دیکھ ، سن یا سمجھ نہیں سکتا ۔



ان طاقتوں میں آنکھ ہی سب سے نازک عضو ہے ۔ اس میں ہر ایک چیز کی شکل کو اپنانے کی ؟ ہوتی ہے ۔

آنکھ کی بناوٹ کیمرے کی طرح ہوتی ہے آنکھ کا سامنے کا حصہ ہی (بیرونی طور پر) دکھا ؟ ہے ۔ باقی حصہ اندر کی طرف ہوتا ہے ۔ سب ۔ ایک سفید اور موٹی تہہ ہوتی ہے ۔ اس پر ایک ہوا حصہ ہوتا ہے جو ایک حد تک شیشے کی کھ کام کرتا ہے ۔

اس تہہ کے نیچے اور دوسری تہہ ہو دونوں تہوں کے درمیان میں ایک قسم کی رطو بھری رہتی ہے ۔ اس رطوبت سے دونوں تہ پرورش ہوتی ہے ۔ دوسری تہہ کالے رنگ ہے ۔ آنکھ کا گولا اسی کا ایک حصہ ہوتا ہے ۔ اس میں خون کی بہت سی نالیاں ہوتی ہیں پتلی ؟ تہہ میں ہوتی ہے ۔ اسی پتلی کے ذریعہ روشنی کی اندر جاتی ہیں ۔ گولا آنکھ کے اندرونی حصہ کو میں رکھتا ہے ۔ زیادہ روشنی کی حالت میں یہ سوراخ کو چھوٹا کر دیتا ہے ۔ اندھیرے میں

جاتا۔ اس کے پھیلنے سے سوراخ کی گولائی بڑھتی ہے۔ اور روشنی کی زیادہ کرنیں اندر جا سکتی ہیں۔

دوسری تہہ کے پیچھے مسور کے دانے کے برابر ایک لینس رہتا ہے۔ یہ ایک سخت پٹی میں بندھا رہتا ہے۔ روشنی اس پر اپنا مخصوص زاویہ قایم کرتی ہے۔ اس کے پیچھے ایک گاڑھی رطوبت ہوتی ہے۔ اس کے پیچھے آنکھ کا اندرونی پردہ ہوتا ہے جس پر شکل بنتی ہے۔ اس پردے کا تعلق سیدھا دماغ سے ہوتا ہے۔ اسی طرح ہم کسی بھی چیز کو دیکھ سکتے ہیں۔۔ انسان اگرچہ ایک ہی چیز کو دو آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ لیکن دونوں آنکھوں کے اندرونی پردہ پر اس کا عکس یا اس کی چھاپ ایک جیسی ہی پڑتی ہے اور آپسی تعلقات کی بنا پر دونوں کا توازن قایم رہتا ہے۔

آنکھ بہت ہی نازک عضو ہے۔ اس کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ اس کی حفاظت محض باہر سے ہی نہیں اندر سے بھی ہونی چاہیے۔ دوسرے اعضا کی طرح آنکھوں کو بھی خوراک ملنی چاہیے اور ان کی گندگی اور فضلات کا اخراج ہونا چاہیے۔

آنکھوں کی پرورش خالص خون سے ہوتی ہے۔ خون جتنا بھی صاف ہوگا بینائی اتنی ہی تیز ہوگی۔ کسی بھی نشہ آور چیز کے استعمال سے خون خراب ہو جاتا ہے۔ اس لیے چائے۔ سگریٹ قہوہ اور سے بھی بینائی کمزور ہو جاتی ہے۔ اس لیے اس کا دھیان رکھنا بھی لازمی ہے۔ اس لیے خون کو ہمیشہ صاف رکھنا چاہیے۔ آنکھوں پر خون کی گندگی کا اثر بہت جلد ہوتا ہے۔

دھوئیں، دھول، تیز روشنی اور دھوپ وغیرہ سے بھی آنکھوں کی حفاظت کرنی چاہیے۔ ان سے آنکھوں میں درد ہو جاتا ہے اور دوسرے بہت سے امراض لاحق ہونے کا خطرہ رہتا ہے۔ آنکھوں میں سرخی اور سوجن آ جاتی ہے۔ دھوپ سے دماغ میں گرمی پیدا ہوتی ہے۔ اس کا اثر آنکھ پر بھی پڑتا ہے۔ آنکھیں لال اور خشک ہو جاتی ہیں۔

آنکھوں کا استعمال صحیح طریقہ سے کرنا چاہیے۔ دیر تک چمکتی چیزوں کی طرف دیکھتے رہنا۔ بہت باریک الفاظ پڑھنا، لیٹ کر یا حرکت میں پڑھنا وغیرہ بینائی کو کمزور کرتے ہیں۔

آنکھوں کو ہمیشہ صاف رکھنا چاہیے اور صاف تولیہ وغیرہ سے پونچھنا چاہیے۔



کان کے دو اہم کام ہوتے ہیں۔ الفاظ سننا اور جسمانی توازن قایم رکھنا۔ اس کا مرکز بھی دماغ ہوتا ہے۔

کان کے تین اہم حصے ہوتے ہیں۔

(۱) بیرونی حصہ۔

(۲) درمیانی حصہ۔

بیرونی حصہ کے ذریعہ آواز کی لہریں اندر داخل ہوتی ہیں۔ دونوں حصّوں کے درمیان بھی ایک حصّہ ہوتا ہے۔ یہاں کان کا پردہ ہوتا ہے۔ اسی پردے میں آواز کی لہریں ٹکراتی ہیں۔ یہاں پر تین چھوٹی چھوٹی ہڈیاں ہوتی ہیں۔ یہ ہڈیاں رطوبت سے بھری ایک نالی میں ہوتی ہیں۔ آواز کی لہریں ٹکرانے سے یہ تینوں ہڈیاں ہلتی ہیں۔ اس سے رطوبت میں ہلچل ہوتی ہے یہ ہلچل ریشوں کے ذریعہ دماغ تک پہنچ جاتی ہے۔

کان کا اندرونی حصّہ کنپٹی کے اندر ہوتا ہے یہ تین نالیوں سے بنتا ہے جن کے اندر رطوبت بھری رہتی ہے یہ رطوبت آواز کی تیزی کو کم کرتی ہے اور آواز کو دماغ تک پہنچاتی ہے۔

کان کے پردہ کی حفاظت کرنا لازمی ہے۔ تیز آواز یا چوٹ لگنے سے اس پردے کے پھٹ جانے کا خطرہ رہتا ہے۔ اس حالت میں آدمی بہرہ ہو جاتا ہے۔ کان میں میل جمع ہونے سے بھی کم سنائی دیتا ہے۔ اس سے کان میں اور بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ کان کو کبھی کسی تیز چیز سے نہیں کریدنا چاہیے۔



ناک کے دو کام ہوتے ہیں۔

(۱) سانس لینا۔

(۲) بو حاصل کرنا۔

اس کا مرکز بھی دماغ ہوتا ہے۔ دماغ کی ایک مخصوص نالی کی بیس عدد شاخیں اس کی ایک جھلّی کے نیچے تک پھیلی ہوتی ہیں جو بو دماغ تک پہنچاتی ہیں۔

اس جھلّی یا نالی کی شاخوں میں خرابی سے وغیرہ بیماریاں لاحق ہوتی ہیں۔ گہری سانس راستہ سے لی جاتی ہیں۔



زبان کے بھی دو کام ہوتے ہیں

(۱) بولنا۔

(۲) مزا حاصل کرنا۔

زبان کی سطح پر مزا حاصل کرنے والے حصّے ہوتے ہیں جن کا تعلق دماغ سے ہوتا ہے مرکز بھی دماغ ہی ہوتا ہے۔

سردی، زکام، بخار اور پیٹ کی وجہ سے زبان میں بھی خرابی آجاتی ہے زیادہ گرم کے استعمال سے۔ سگریٹ پینے سے مزے کے حصّے جل جاتے ہیں۔ اس کا اثر پورے جسم پر ہوتا

جلد: یہ بھی ہمارے جسم میں ایک اہم طاقت ہے تعلق دماغ سے ہوتا ہے اور اس کا مرکز بھی دماغ ہی اگر ہم جسم کے کسی حصّہ پر کاٹتے ہیں تو دماغ کو اس ہوتا ہے اور تکلیف ہوتی ہے۔

جلد میں بہت سے مسامات ہوتے ہیں پسینہ کے ذریعہ جسمانی فضلات کو خارج کرتے ہیں اس فعل میں اہم پارٹ ادا کرتی ہے۔ اسی جلد صاف رکھنے اور اسے [illegible]

جناب محمد عبداللہ شرقی مدراسی



گھوڑا

ذرا سامنے دیکھو گھوڑا کھڑا ہے
وہ کیسا ہے اچھا، وہ کیا خوش نما ہے

وہ لمبی سی گردن، وہ لمبی سی ٹانگیں
وہ ٹانگیں کہ جن سے وہ مارے چھلانگیں

وہ چال اس کی، کرتا ہے باتیں ہوا سے
یہ نعمت ملی اس کو کیسی خدا سے

ابھی تھا یہاں وہ، ابھی ہے وہاں وہ
وہ دیکھو کہ پہنچا کہاں سے کہاں وہ

کھڑا ہے وہ میدان میں تن کے دیکھو
ہیں کتنے بھلے بال گردن کے دیکھو

وہ سینے کی چوڑائی، دُم کی سجاوٹ
نمونہ ہے قدرت کا اس کی بناوٹ

وہی، جس کے چہرے سے ظاہر ہے چستی
وہی، الاماں جس سے کہتی ہے سُستی

بہادر ہے گھوڑا، دلاور ہے گھوڑا
اسی واسطے زیبِ لشکر ہے گھوڑا

لڑائی کے بھی کام آتا ہے گھوڑا
سواری کے بھی کام آتا ہے گھوڑا

امیروں کو بھاتی ہے اس کی سواری
جو گھوڑا خریدا تو بھاری سے بھاری

دلھن کی طرح سے سجاتے ہیں اس کو
غذائیں بھی اچھی کھلاتے ہیں اس کو

کبھی تم نے دیکھا ہے گھوڑے کا اڑنا
کبھی وہ سنبھلنا، کبھی وہ بگڑنا

برابر وہ کھاتا ہے کوڑے پہ کوڑا
نہیں باز آتا مگر ہٹ سے گھوڑا

وفا اس کی مانی ہوئی ہے جہاں میں
خدا کی یہ نعمت بڑی ہے جہاں میں

اشارہ جو مالک کا پاتا ہے گھوڑا
دل و جاں کو دکھ میں پھنساتا ہے گھوڑا

جو رستہ دکھایا ہوا یاد شرقی
[illegible]

محترمہ آصفہ مجیب

خواجہ نصرالدین کے لطیفے

ایک دن خواجہ نصرالدین گوشت کا ایک بہت اچھا ٹکڑا لے کر آئے اور بیوی سے کہا "پکاؤ" لیکن وہ جب چلے گئے بیوی نے اس کے کباب بنا کر سہیلیوں کو کھلا دیے۔ واپس آئے تو ان کے سامنے یخنی کا ایک پیالہ لاکر رکھ دیا۔ انھوں نے پوچھا "میں جو گوشت لایا تھا وہ کیا ہوا؟" بیوی نے جواب دیا "وہ تو بلی کھا گئی" خواجہ نے پوچھا "کیا وزن تھا اس کا؟" بیوی نے کہا "آدھ سیر" خواجہ کی بلی بہت چھوٹی تھی وہ باورچی خانہ سے ترازو لے آئے اور بلی کو تولا تو وہ ٹھیک آدھ سیر نکلی۔ انھوں نے کہا "عجیب بات ہے اگر یہ بلی ہے تو گوشت کیا ہوا اور اگر یہ گوشت ہے تو بلی کیا ہوئی۔"

ایک آدمی نے خواجہ سے پوچھا "آپ کی عمر کیا ہے؟"

انھوں نے کہا "چالیس سال" دس برس گذر گئے۔

پھر کسی نے ان سے پوچھا۔ آپ کی ع
ہے؟

بولے "چالیس سال" اس وقت
لوگ کھڑے تھے جنھوں نے ان کا دس برس
کا جواب سنا تھا۔ انھوں نے کہا "دس برس
بھی تو آپ نے کہا تھا کہ میں چالیس سال کا

خواجہ نے جواب دیا "بالکل ٹھیک۔ آدمی کو اپنے قول پر قایم رہنا چاہیے"

خواجہ نصرالدین کے ایک پڑوسی نے تھوڑ
دیر کے لیے ان کا گدھا مانگا۔

خواجہ نے کہا "گدھا یہاں نہیں ہے"
وقت مکان کے پیچھے سے گدھے کی آواز سنائی د
"ڈھینچوں ڈھینچوں"

پڑوسی نے شکایت کے لہجے میں کہا "آ
آپ نے تو کہا کہ گدھا نہیں ہے اور مجھے گدھے
آواز سنائی دے رہی ہے۔

خواجہ نے جواب دیا "خدا تمھارے ایمان کی کمزوری کو معاف کرے۔ ایک گدھے پر اعتبار کرتے ہو اور میرے جیسے سفید داڑھی والے انسان پر اعتبار نہیں کرتے۔"

ایک رات کو خواجہ نصرالدین نے اپنی کھڑکی سے سر نکالا تو دیکھا کوئی عجیب شکل کا آدمی دونوں ہاتھ پھیلائے باغ میں کھڑا ہے۔ بیوی سے کہا جاؤ میرا تیر کمان لے آؤ۔ باغ میں بہت خطرناک آدمی کھڑا ہے۔ بیوی تیر کمان لے آئیں۔ خواجہ نے تیر کھینچ کر جو مارا تو آدمی کے بیچوں بیچ جا کے لگا۔ صبح کو انھوں نے جا کر دیکھا کہ ان کے اپنے جبّہ میں جسے بیوی نے دھو کر ٹانگا تھا تیر جا کر لگا۔ وہ سجدے میں گر پڑے اور زور سے خدا کا شکر ادا کرنے لگے۔ بیوی نے پوچھا "شکر کاہے کا ادا کر رہے ہو؟"

خواجہ نے کہا "اری نیک بخت یہ نہیں دیکھتی کہ میرا تیر میرے جبّہ کے بیچوں بیچ سے گزر گیا۔ میرا کیا حال ہوتا اگر میں یہ جبّہ پہنے ہوتا۔"

خواجہ گدھے پر ترکاری لاد کر بیچنے کے لیے نکلے۔ جب یہ آواز لگاتے تو گدھا بھی ساتھ ساتھ [illegible]تا تھا۔ اور ان کی آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ ایک [illegible]ک پر پہنچے جہاں بہت مجمع تھا۔ انھوں نے پھر صدا لگائی، او گدھا ساتھ ساتھ اتنے زور زور سے بولا کہ ان کی آواز دب گئی۔ اس پر ان کو غصہ آ گیا۔ گدھے کو ڈنڈا مار کر کہا "بتا ترکاری میں بیچ رہا ہوں یا تو بیچ رہا ہے؟"

جناب واحد پریمی

انسان بنیں

وقت کی دھوپ میں ہم اتنا تپیں
دوسروں کے لیے کندن بن جائیں
لے کے ہم علم و ہنر کی مشعل
دیس سے دور اندھیرے کر دیں
بات بنتی ہے کہیں دعووں سے
اتنا ہی گرجیں کہ جتنا برسیں
راستے لاکھ کٹھن ہیں لیکن
ہم کو چلنا ہے تو کانٹوں پہ چلیں
چاہے نقصان ہو کتنا ہی مگر
فرض ہے اپنا کہ ہم سچ بولیں
دوست دشمن میں تو کچھ فرق رہے
جو بھی کہنا ہو ہمیں منھ پہ کہیں
بعد میں کچھ نہیں واحد پہلے
ہم [illegible] لازم [illegible]

جناب غلام ربانی



مریخ

جس راستے پر زمین آفتاب کے گرد گھومتی
ہے اس کو مدار ارضی کہتے ہیں۔ اس مدار کے ایک
طرف زہرہ کا مدار ہے اور دوسری طرف مریخ کا۔
چنانچہ زہرہ اور مریخ ہمارے پڑوسی ہیں، اور ہمارا
فرض ہے کہ اپنے پڑوسیوں کا کچھ حال جانیں۔ اب
تک جتنے سیارے معلوم ہوئے ہیں، ان میں سب سے
زیادہ توجہ مریخ پر دی گئی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس
کے سمندر، کرۂ ہوائی نہریں، برف باری بادل
اور دوسرے جغرافی حالات ہماری زمین کی آب و
ہوا سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لیے خیال کیا گیا ہے
کہ شاید مریخ پر بھی ہماری طرح کی مخلوق ہوگی۔
چنانچہ انسان اب مریخ کے سفر کی کوشش کر رہا ہے
اور امریکہ کے سائنس دانوں کا خیال ہے کہ اس صدی
کے آخر میں انسان مریخ پر پہنچ جائے گا۔

اب سوال یہ ہے کہ اسے کب دیکھیں اور
کہاں دیکھیں کیونکہ وہ ہمیشہ دکھائی نہیں دیا کرتا۔
اس کے دیکھنے کے موقعے ہر دوسرے سال آیا کرتے

چمکتا رہتا ہے۔ زہرہ کے بارے میں بیان
ہے کہ وہ مشرق میں سورج نکلنے سے پہلے
میں آفتاب چھپنے کے بعد دکھائی دیتا۔
کے لیے کوئی خاص مقام یا وقت مقرر نہیں
آدھی رات کو دیکھنا چاہیے، جب وہ خوب
لیکن اس کا پہچاننا مشکل ہے، اس کی ا
یہ ہے کہ اس کا رنگ سرخی مایل ہوتا ہے۔
یہ ہے کہ بعض ستاروں کا رنگ بھی ایسا
دوسری پہچان یہ ہے کہ تمام ستارے ٹمٹما
سیارے ٹمٹماتے نہیں، چنانچہ مریخ نہیں
اس کی روشنی قائم رہتی ہے۔ معلوم ہوتا
لیمپ روشن ہے۔ مریخ ایک بدنام س
نجومی اس کو خونی ستارہ کہتے ہیں، چنانچہ
"جلاد فلک" بھی ہے۔

مریخ میں ایک بڑا عیب یہ
چال بڑی پیچیدہ ہے، وہ آسمان میں برا
کو نہیں چلتا۔ بعض وقت چلتے چلتے ز

ہے اور پھر اسی طرف کو چلنے لگتا ہے، جدھر کو وہ پہلے جا رہا تھا۔ مگر اس کی پیچیدہ چال سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی حرکت میں کوئی قاعدہ یا انتظام نہیں ہے، اس میں آوارگی ضرور ہے مگر ایک خاص قاعدے کے تحت چلتا ہے۔ ستاروں کا علم جاننے والے اس کے راستوں کے ہیر پھیر سے خوب واقف ہیں، ان کو معلوم ہے کہ مریخ اب کہاں ہوگا اور آیندہ رات کو وہ کہاں دکھائی دے گا۔

مریخ کی رفتار میں اب تک جو بے قاعدگی بیان کی گئی، اس کا الزام اس بیچارے کے سر ہی نہیں تھوپنا چاہیے، اس میں ہماری زمین کا بھی کچھ قصور ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم خود جو زمین پر ہیں، جلد جلد اپنی جگہ بدلتے رہتے ہیں۔ ہماری زمین اٹھارہ میل ۱۸ فی ثانیہ کی رفتار سے چل رہی ہے، جتنی دیر میں آپ نے یہ مضمون پڑھا ہے۔ اس دوران میں ہم یعنی ہماری زمین ہزاروں میل آگے نکل گئی ہے چنانچہ ہماری نظر کی نشست، جس سے ہم مریخ کو دیکھتے ہیں ادلتی بدلتی رہتی ہے۔

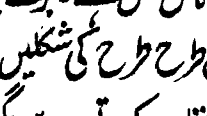
یوں سمجھیے کہ جب ہم ریل میں تیزی سے سفر کرتے ہیں تو ہمارے سامنے کے درخت اور ٹیلے ہماری مخالف سمت کی طرف جاتے دکھائی دیتے ہیں۔ درخت اور ٹیلے تو وہیں قایم ہیں، دراصل ہماری جگہ بدل گئی ہے۔ پہلے زمانے کے لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ زمین

کو "رجعت قہقری" کہتے تھے۔

مریخ کی اس رجعت قہقری نے ہیئت دانوں کو پریشان کر رکھا تھا۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ گول شکلوں میں صرف دائرہ ہی کامل شکل ہے۔ بڑے بڑے ریاضی داں اور ہیئت داں طرح طرح کی شکلیں بناتے اور لمبے چوڑے حساب کتاب کرتے رہے مگر کسی طرح مریخ کی چال کا حساب ٹھیک نہیں بیٹھتا تھا۔ آخر کار ایک شخص "کیپلر" کامیاب ہو گیا۔ اسے ایک خاص قسم کی بیضوی شکل معلوم ہو گئی، جس سے مریخ کی پیچیدہ چالوں کا حال کھل گیا۔

یاد رکھیے کہ بیضوی شکل کے دو مرکز ہوتے ہیں۔

کیپلر نے معلوم کر لیا کہ مریخ کا مدار بیضوی ہے۔ اور آفتاب اس کے ایک مرکز پر ہے۔ وہ شکل کچھ اس طرح کی تھی



کیپلر کی یہ دریافت بہت بڑا انکشاف تھا۔ اس کے بعد معلوم ہو گیا کہ تمام سیارے بیضوی دائروں میں گردش کرتے ہیں۔ علم ہیئت میں اس کو "کیپلر کا قانون" کہتے ہیں۔

قدرت کو بیضوی شکل بہت پسند ہے۔ تمام پرندوں کے انڈے بیضوی شکل کے ہوتے ہیں، درختوں کے پتے اور پھولوں کی پتیاں بیضوی ہوتی ہیں۔ دریاؤں کی تہہ میں جو روڑے بہہ کر چلے آتے ہیں وہ گھس پس کر

تو وہ ایک بیضوی شکل بنا کر زمین پر گر پڑے گا۔ ہماری زمین کا مدار بھی بیضوی شکل کا ہے۔ اس کا ایک مرکز آفتاب ہے۔ اس لیے آفتاب سے زمین کا فاصلہ ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ جب زمین سورج سے دور ہوتی جاتی ہے تو اس کی رفتار سست ہوتی جاتی ہے اور جب آفتاب کی طرف آتی ہے تو اس کی کشش کی وجہ سے زمین کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔ غرض سال کے ۳۶۵ دن میں کہیں دو دن بھی یکساں رفتار سے نہیں چلتی، کہیں سست، کہیں تیز اور کہیں بہت تیز ہو جاتی ہے۔

ریل کی سڑک کے کنارے بعض جگہ تختیاں لگی رہتی ہیں جن پر لکھا ہوتا ہے "رفتار پندرہ میل فی گھنٹہ"، کہیں "دس میل فی گھنٹہ" لکھا ہوتا ہے۔ انجن کا ڈرائیور ان ہدایتوں کے مطابق ریل چلائے گا۔ خدانخواستہ اگر کہیں چوک جائے تو نہ معلوم کیا حادثہ پیش آجائے۔ زمین کے کروڑوں میل لمبے راستے میں کہیں کوئی اس قسم کی تختی نہیں ہوتی ہے مگر زمین بڑی احتیاط سے موقع کا لحاظ رکھتی ہے اور اپنی رفتار کو کم یا زیادہ کرتی رہتی ہے کبھی غلطی نہیں کرتی۔

مدار کا ایک سرا جہاں سے وہ مڑتی ہے آفتاب سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ یہ مقام بہت خطرناک ہوتا ہے۔ کیونکہ سورج اسے اپنی طرف کھینچتا

بڑی تیزی سے بھاگ جاتی ہے۔ ورنہ قیامت ہی آجائے۔

اب تک جتنے سیارے معلوم ہوئے ہیں ان میں مریخ ہی ایسا سیارہ ہے جس کی سطح کا حال سب سے زیادہ معلوم ہوا ہے۔ یہ سیارہ ہمار زمین سے چھوٹا ہے۔ اس کا قطر ہمارے قطر سے آد ہے۔ اس حساب سے اس کی سطح کا رقبہ زمین کی سے چوتھائی ہے۔ مریخ ۲۴ گھنٹے اور ۳۷ منٹ میں اپنے گرد پھرتا ہے۔ گویا اس کے دن رات ہمارے دن رات کے برابر ہیں۔ صرف آدھ گھنٹے کا فرق۔

آفتاب سے مریخ کا فاصلہ چودہ کروڑ لاکھ میل ہے۔ وہ چھ سو ستاسی (۶۸۷) دن میں آ کے گرد اپنی گردش پوری کرتا ہے۔ ہمارے دو سا کے ۷۳۰ دن ہوتے ہیں اس لحاظ سے مریخ ایک سال ہمارے دو سال سے کچھ ہی کم ہے چنا وہاں کے موسم بھی ہمارے موسموں سے طویل ہوتے ہ

مریخ پر ہماری زمین کی طرح بر اعظم، سم جھیلیں، جزیرے، آبنائے وغیرہ ہیں۔ ان میں سب سے عجیب وہ بڑے بڑے سفید مقام ہیں جو اس قطب شمالی اور قطب جنوبی پر دکھائی دیتے ہیں۔ م کی یہ سفید ٹوپی جمی ہوئی برف ہے۔ مریخ کے گرم موسم میں دھوپ کی تیزی سے برف کسی قدر پگھل جا ہے اور یہ ٹوپی چھوٹی ہو جاتی ہے، پھر وہاں کی ہو

بڑھ جاتا ہے۔ غرض کہ برف کا خطہ گرمی میں
اور سردی میں بڑا دکھائی دیتا ہے۔

کوئی دو سو سال (۱۸۷۷) ہوئے کہ ایک
دان شیاپریلی (SHAIPARELLI)
علان کیا کہ مریخ کی سطح پر جو دھاریاں سی نظر آتی
یہ نہریں ہیں۔ یہ لکیریں زیادہ تر سیدھی ہیں۔
ن کا جال سا پھیلا ہوا ہے جو وہاں کے لوگوں کا
مہ خیال کیا جاتا ہے۔ یہ مسئلہ بہت دلچسپ
یا ہے۔

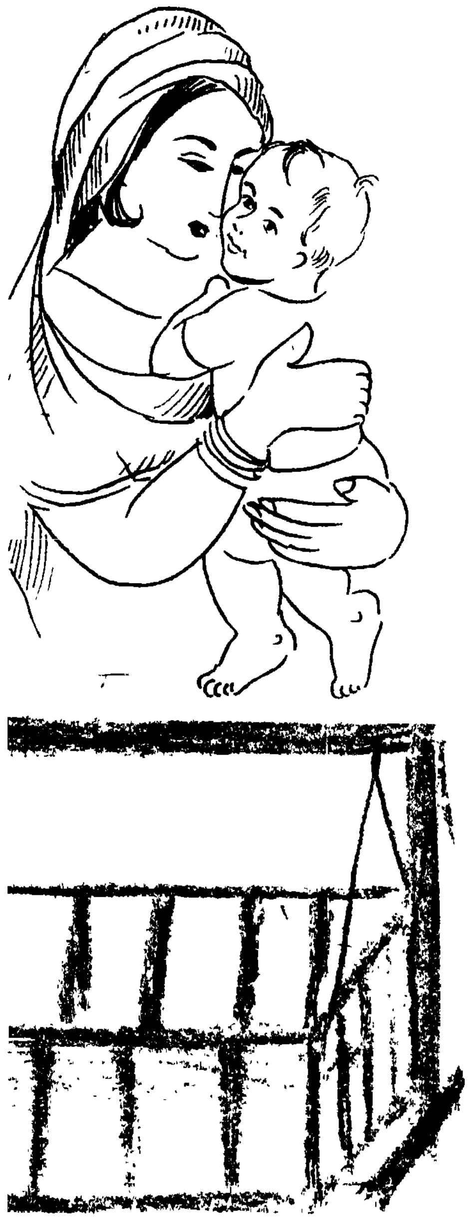
دو سال ہوئے کہ امریکہ کے سائنس دانوں
لی مرتبہ مریخ کی تصویر بہت قریب سے لی۔ اب
س سے اچھی تصویر نہیں لی جا سکی تھی، پتہ چلا کہ
لی سطح (CRATER) یعنی آتش فشاں
ں کے دہانوں سے پر ہے۔ یہ کریٹر اور دوسری
حالات ہمارے چاند کی سطح سے بہت ملتے
یں۔ اس کی سطح چاند کی سطح کی بہ نسبت زیادہ
ہے۔ اب تک کریٹرز کی تعداد سو خیال کی جاتی
مگر حالیہ تصویروں سے معلوم ہوا کہ ان کی تعداد
سے زیادہ ہے۔

ہماری زمین کو خدا نے ایک خوب صورت بیٹا
ے اسے ہم چاند کہتے ہیں۔ مریخ کو خدا نے دو چاند
ہیں۔ ہمارے چاند اور مریخ کے چاندوں میں
ن ہے۔ ایک یہ کہ ہمارا چاند ۲۷ دن میں زمین
دکھتا ۔۔ مریخ کا ایک چاند ۳۰ ... نو گھنٹے
میں مریخ کے گرد چکر لگاتا ہے۔ ہمارا چاند ہم سے دو لاکھ
اڑتیس (۲۳۸۰۰۰) میل دور ہے۔ مریخ کا ایک
چاند صرف پانچ ہزار سات سو (۵۷۰۰) میل کے
فاصلے پر ہے۔ ہمارے چاند کا قطر چار ہزار میل سے
کچھ زیادہ ہے۔ مریخ کے ایک چاند کا قطر صرف سات
میل کے قریب ہے۔ مریخ کے لوگوں کے لیے آسمان
کا نظارہ بہت دلچسپ ہوگا۔

تم کو شاید تعجب ہوگا کہ ہیئت دانوں نے تمام
سیاروں کو تول رکھا ہے۔ مریخ زمین سے چھوٹا ہے
اس میں کشش کی طاقت کم ہے۔ حساب لگانے سے
معلوم ہوا کہ وہاں، چیز کا وزن تہائی رہ جائے گا۔
کوئی پلے دار جو یہاں دو من غلہ کی بوری اٹھا کر لے
جاتا ہے۔ مریخ پر چھ من کی تین بوریاں لے جا سکے گا۔
جو لڑکا یہاں سولہ سترہ فٹ لمبا کودتا ہے
مریخ پر وہ پچاس فٹ لمبی چھلانگ لگا سکے گا۔ فٹ بال
کھیلنے میں بڑا مزا آئے گا۔ جب تم وہاں گول کک لگاؤ
گے تو تمھاری کک اتنی لمبی ہوگی کہ گیند مخالف کے گول
پوسٹ کو پار کر کے گرے گی۔ ہمارا خیال ہے کہ تم
میں جو کھلاڑی ہیں ان کا جی چاہ رہا ہوگا کہ کسی طرح
مریخ پر پہنچ جائیں۔

اگر آپ کو اردو سے محبت ہے تو
کتابیں اور رسالے

جناب احمد وصی



لوری

جھولے، جھولے، جھولے رے
میرا مُنّا جھولے
نیند کی دیوی آ، آ کر
سندر مکھڑا چھولے
میرا مُنّا جھولے
چھم چھم کرتی نیند کی پریاں دور دیس سے آئیں
خوابوں کے ڈولے میں بٹھا کر ساتھ تجھے لے جائیں
چاندی کی تھالی میں تجھ کو دودھ ملائی کھلائیں
میرے لال جیے جُگ جُگ تو
پھولوں جیسا پھولے
میرا مُنّا جھولے
تجھ سے میری آشائیں ہیں تو ہی میرا سہارا
تو ہے میرا راج دلارا، ان آنکھوں کا تارا
ہونے والی کل کا پیارے تو ہی تو اجیارا
میری دعا ہے ہاتھ بڑھا کر
تو آکاش کو چھولے
میرا منا جھولے
جھولے جھولے جھولے رے
میرا مُنّا جھولے

باب غلام حیدر

نیلم اور فرّخ

(مسلسل)

بڑے سو مٹکے دودھ سے بھرے ہوئے تمھیں مل جائیں گے، ناشتہ میں وہ بھی پینے ہیں۔

فرّخ:۔ کیا میں کچھ مہمان اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا؟

ملکہ:۔ اچھا چلو جاؤ اس کی بھی اجازت ہے۔ ملکہ مذاق اڑاتے ہوئے ہنسی "تم اپنے ساتھ ایک آدمی کو اور ناشتہ پر بلا سکتے ہو، مگر اس سے زیادہ نہیں!"

شہزادہ اپنے آدمیوں کے پاس گیا اور مولٹو میاں سے کہا۔

فرّخ:۔ مولٹو میاں، کل تم ناشتہ میرے ساتھ کروگے۔ ممکن ہے تمھیں ایک دن تو کچھ پیٹ بھر کر کھانے کو مل جائے۔

بس مولٹو میاں کے تو مزے آگئے۔ اگلی صبح بہت سویرے آگ جلوائی گئی۔ مولٹو میاں اونٹ بھونتے جاتے تھے اور مزے میں کھاتے جاتے تھے۔ آخری نوالے کے بعد انھوں نے مٹکوں میں بھرا ہوا دودھ بھی پیا، اور آخری بوند تک پی چکنے [illegible]



ملکہ:۔ محل کے باہر وہ چراگاہ تمھیں نظر آ رہی ہے؟

فرّخ:۔ ہاں۔

ملکہ:۔ اس میں اونٹوں کا ایک گلہ چر رہا ہے۔ اس میں سو سے کچھ زیادہ اونٹ ہیں۔ تمھیں [illegible]



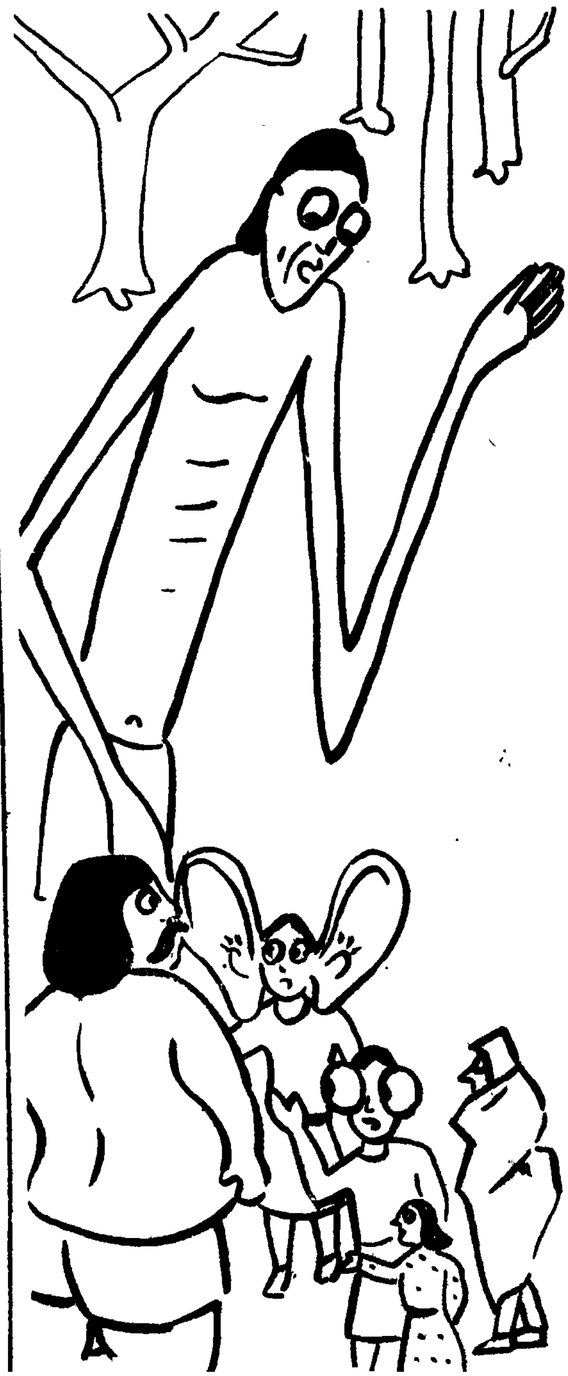
مولو میاں: شہزادے! بس یہی تھا
یا اور بھی کچھ ہے۔ انھوں نے انگلیاں چاٹتے ہوئے
پوچھا۔
شہزادہ فرخ فوراً ملکہ کے پاس چلا گیا اور



اسے جاکر بتایا کہ دوسرا کام بھی پورا کر دیا گیا۔
کو اب تو بہت فکر ہوئی اور وہ سوچ میں پڑ
اب اسے شہزادہ فرخ کے ہاتھوں اپنی ہار کا
ہونے لگا تھا۔ مگر اس نے دل ہی دل میں کہ
یں تمھیں اتنا سستا نہیں چھوڑوں گی۔ میرا
ختم نہیں ہوا ہے۔ جب تک اس شہزادے ک
اس کے جسم سے الگ نہیں کیا جاتا مجھے چین
آسکتا۔

ملکہ:۔ اچھا آج شام کو میں شہزادی
تمھارے پاس لاؤں گی، تاکہ وہ تمھیں اچھی طرح
مگر یاد رکھو کہ تم آدھی رات تک ایک منٹ
بھی سوئے یا تم نے ایک لفظ بھی منھ سے نک
تم ہار گئے۔
فرخ د ملا رہتا ہوا

ملکہ:- میں تمھارے پاس دوبارہ آؤں گی
جس وقت گھڑیال میں بارھواں گھنٹہ بجے گا، اگر تم

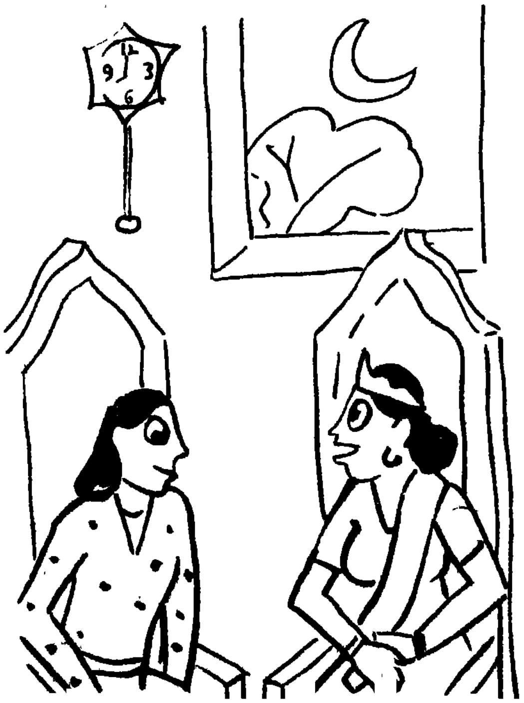


اس سے پہلے سوئے تو شہزادی نیلم خود بخود غائب ہو جائے گی اور تمھیں مروا ڈالا جائے گا۔

شہزادہ فرخ بہت خوش تھا کہ یہ تو بہت آسان کام ہے ۔جاگتے رہنا کیا مشکل بات ہے آدھی رات تک کیا میں تو صبح تک چوکیداری کرتا رہوں گا۔ اس نے اپنے پانچوں خدمت گاروں کو بلایا اور انھیں بتایا کہ وہ بھی ہشیار رہیں۔ کوئی شخص رات کو ان کے دروازے کے پاس بھی نہ بھٹک پائے۔

فرخ:- ممکن ہے اس میں بھی کوئی چال چھپی ہو۔ ملکہ بہت چالاک عورت ہے۔ ہمیں ہشیار رہنا ہوگا۔

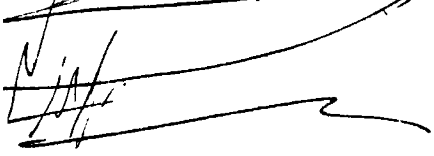
جب شام ہوئی تو ملکہ شہزادی نیلم کو شہزادے





فرخ کے گھر میں چھوڑ گئی ۔ وہ دونوں دو کرسیوں پر بیٹھ گئے ۔

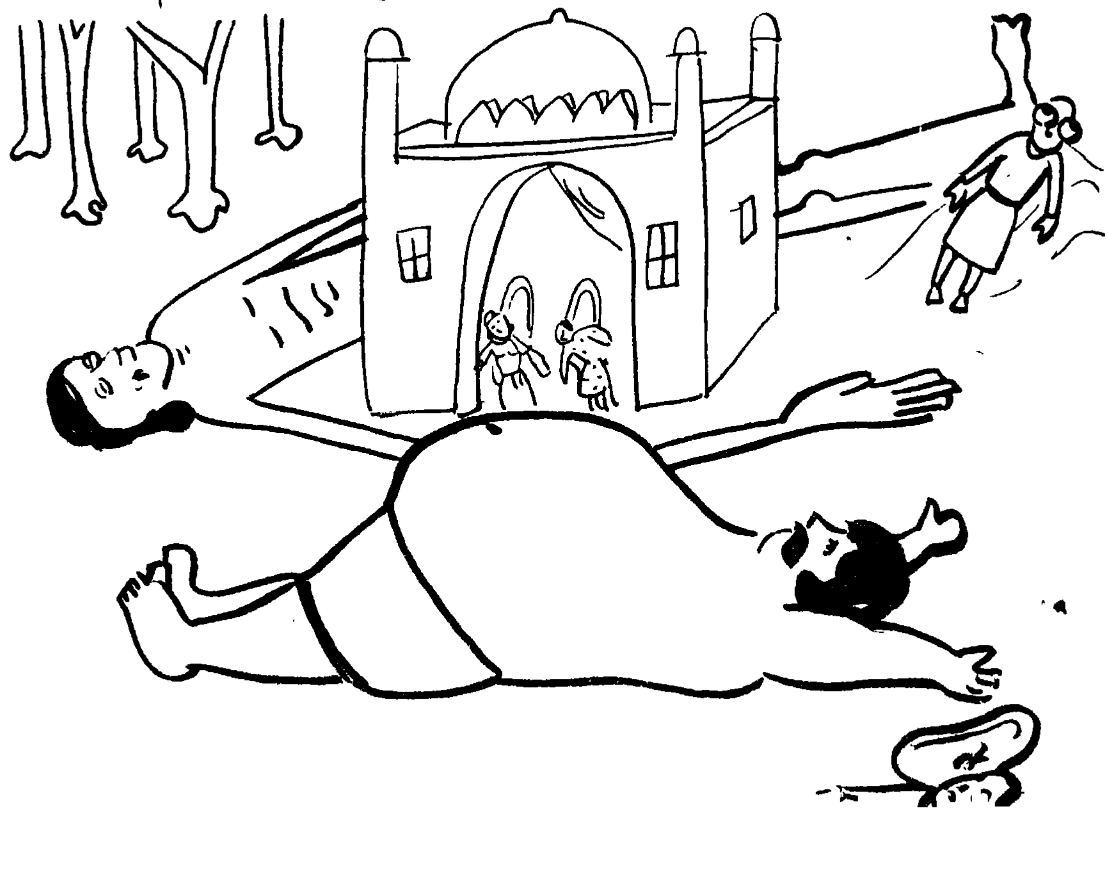
باہر آ") کے دوستوں نے انتظام مکمل کر لیا۔
لمبو خان نے اپنے جسم کو شہزادے کے گھر کے چاروں طرف سانپ کی طرح لپیٹ لیا۔
مولو میاں دروازہ پر ایسے جم کر بیٹھ گئے کہ کوئی جاندار چیز بھی دروازہ میں نہ گھس سکے ۔
سوالکھا خاں محل سے کچھ دور ایک اونچے



سے پتھر پر بیٹھ کر دیکھنے لگے تاکہ گھر کے چا
طرف کی ہر چیز ان کی آنکھوں کے سامنے ر
کننیت صاحب زمین سے کان
بیٹھ گئے کہ وہ گھر کے اندر باہر ہونے و
آس ٹ کو س بیکا



۲۵ بجے تک شہزادے کی آنکھ تک نہ جھپکی۔ مگر اب ملکہ نے جادو کے زور سے شہزادے اور اس کے تمام ساتھیوں کو سلادیا۔



معصوم سوال

جناب اظہر عزیز

امی ـــ یہ تو بتاؤ مجھ کو
کل ہی تم نے مجھ سے کہا تھا
جب پہلے دھرتی یہ بنی تھی
یہ نیلا آکاش بنا تھا
چندا کی جب آنکھ کھلی تھی
سورج جب پہلے نکلا تھا
جھلمل جھلمل کرتے تارے
نیل گگن پر جب چمکے تھے
رنگ برنگ کے پھول بھی جس دم
باغوں میں مہکے تھے پہلے
اس دن یہ انساں تھا گویا
سب سے پیارا پھول چمن کا
جو تھا سب چیزوں سے اعلیٰ
حسن کا تھا جو خود متوالا
پھر ـــ تم نے یہ بھی تو کہا تھا
انساں جیسے پھول سے بڑھ کر
پھول نہیں ہے کوئی انوکھا
اس کے حسن سے بڑھ کر کوئی
حسن نہیں دنیا میں سجیلا
لیکن اتنا پوچھوں امی ؟
کل کی دھرتی آج وہی ہے
آج بھی وہ آکاش وہی ہے
چاند وہی سورج تو وہی ہے
کوہ وہی دریا تو وہی ہے



لیکن وہ انسان کہاں ہے
پھول سا وہ مہمان کہاں ہے
کدھر گیا وہ حسن کا مالک
کہاں گیا خوش بو کا ساتھی

امی ـــ بس اتنا تو بتاؤ
پھول سا انساں کھو تو گیا ہے
حسن کا مہماں چھپ تو گیا ہے
لیکن چاند تو چمکے گا نا ؟
پھول تو یونہی مہکیں گے نا ؟
چڑیاں یونہی چہکیں گی نا ؟

بولو امی کچھ تو بولو
آخر تم [illegible]

ب فرحت قمر

نیلا آسمان

زمین کے چار طرف آسمان ہی آسمان ہے۔
آسمان۔ اب تو سائنس دانوں کی لگاتار کھوج
ت اس نیلے آسمان کی ساری حقیقت سامنے
ہے۔ پر اب سے ہزاروں لاکھوں برس پہلے
ان آسمان کے بارے میں بھلا کیا سوچتا ہوگا۔
ت اَن پڑھ بھی تھا عقل کا بھی کچا تھا۔ وہ تو
ہو کے رہ جاتا ہوگا۔ اس کی سمجھ میں کچھ آتا ہوگا
ہی آتا ہوگا کہ آسمان ہماری چھت ہے اور
تارے اس چھت میں جھاڑ فانوس کی طرح
وئے ہیں۔ اور سچ مچ شروع شروع میں اس کا
ال تھا۔

گرمیوں کی راتوں میں خاص طور پر چارپائی پر
لیٹے کبھی کبھی تو آپ کا دھیان بھی آسمان کی
جاتا ہوگا اور شاید آپ یہ بھی سوچتے ہوں
اونچا بہت اونچا سا مکان بن جائے تو
چھت پر چڑھ کر آپ آسمان کو چھو لیں گے یا
آسمان پر پہنچ جائیں گے اور بھئی دیکھنے میں سچ مچ
ایسا ہی لگتا ہے۔

ریل میں یا بس میں جاتے وقت آپ کو
ایسا لگتا ہوگا کہ آسمان اور زمین دونوں ملے ہوئے
ہیں۔ لیکن دو چار میل آگے بڑھنے کے بعد آپ
زمین سے ملتے ہوئے آسمان کو پھر اتنا ہی دور پاتے
ہیں۔ اور جناب آپ کتنا ہی دور بڑھتے جائیں،
کبھی اس جگہ نہیں پہنچ سکتے جہاں زمین آسمان
ملتے دکھائی دیتے ہیں۔ اب اصلی بات ہم بتائیں۔
آسمان اور زمین کبھی ملتے ہی نہیں۔ ایک اور
چونکا دینے والی بات! آسمان حقیقت میں کچھ ہے
ہی نہیں۔

ارے! آپ تو سچ مچ چونک پڑے! اور
یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ واقعی یہ بات عجیب سی
لگتی ہے کہ جو چیز آنکھوں سے صاف صاف نظر آتی
ہو وہ حقیقت میں کچھ بھی نہ ہو۔ پر بھئی اس کو کیا کیا

دیتی ہیں۔ ہماری یہ زمین بھی تو دور دور تک پھیلی ہوئی بالکل چپٹی چپٹی سی لگتی ہے۔ پر چپٹی تو ہے نہیں گول ہے۔

بات یہ ہے کہ جو باتیں ہماری سمجھ میں نہ آئیں یا جو چیزیں نظر کا دھوکا ہوں ان کے بارے میں یہ نہ سوچنا چاہیے کہ جو کچھ ہم سمجھتے ہیں وہی ٹھیک ہے۔ سائنس دانوں کی کھوج یا تحقیق (ریسرچ) سے پہلے لوگ یہی غلطی کرتے تھے۔ بھلا آسمان کو دیوتاؤں کا دیس مانتے تھے۔ بلکہ کچھ مذہبوں کے لوگ تو اب بھی اسی بات کو مانتے ہیں۔

مگر ہمارے سائنس داں تو کہتے ہیں آسمان نہ چھت کی طرح ہے نہ چھتری جیسا ہے۔ نہ کوئی ٹھوس چیز ہے۔ بس یوں کہیے کہ کچھ بھی نہیں ہے۔ آسمان آپ کی زمین کی طرح کوئی ٹھوس چیز نہیں بس بکھرا ہوا نیلا رنگ ہے۔

دیکھیے آپ اپنا ہاتھ ادھر ادھر گھماتے ہیں۔ جس جگہ آپ ہاتھ گھماتے ہیں وہاں کچھ محسوس ہوتا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ بالکل خالی خالی سا لگتا ہے لیکن جہاں آپ کا ہاتھ ہل رہا ہے۔ وہاں تھوڑی سی جگہ میں بہت کچھ ہے۔ زمین پر یا زمین کی سطح پر، ہمارے سروں پر مکانوں پر پیڑوں پر، پہاڑوں پر، غرض چپے چپے پر ہوا پانی، بہت سے گیس، دھول، مٹی وغیرہ موجود ہے۔ آپ کہیں گے کہ ہمیں تو کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔ کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔

آپ کی بات ٹھیک ہے لیکن کمرے کے دان، یا کھڑکی کے سوراخ سے آنے والی ر دھیان سے دیکھیے۔ کروڑوں ذرّے نا- آئیں گے۔

تو بھئی آپ کی زمین پر۔ فضائی ما ہوا، پانی، دھواں، دھول، مٹی اور دوسر سے گیس بہت ہی باریک باریک ذروں سے ہوئے ہیں۔ انھی ذروں کو تو ایٹم کہتے ہیں۔ چھوٹے ہوتے ہیں کہ ایک سوئی کی نوک کی تعداد میں آجائیں۔ بھلا جب یہ اتنے ننھے ہوں تو ہمیں کیا دکھائی دیں اور کیا ہمارے سے ٹکراتے محسوس ہوں۔

یہ مختلف ذرّے زمین کی سطح سے دو سو میل پائے جاتے ہیں۔ دو سو میل کی اس تہہ کو "فضائی" کہا جاتا ہے۔ اس کی گولائی پچیس ہزار میل ہے بڑے گولے کے چاروں طرف پھیلی ہوئی اس تہ ایسا ہی سمجھیے جیسے ناشپاتی کے اوپر چھلکا۔

یوں تو زمین کے فضائی ماحول کو بہت میں تقسیم کر سکتے ہیں لیکن بہت موٹے طور پر ما تین طبقے ہیں۔ پہلا طبقہ زمین کے فوراً اوپر سے ہو جاتا ہے۔ اس میں ہوا، دھول، پانی، دھوا مقدار میں ہیں جہاں تک گیسوں کا سوال ہے نائٹروجن ۲۱ فی صدی آکسیجن اور باقی گیس

[illegible]

ن پر جانداروں کی زندگی کے لیے آکسیجن بہت
ِروری ہے ۔اس لیے یہ کافی مقدار میں ہے ۔ مگر
ں جوں اوپر جائیے آکسیجن کم ہوتی جاتی ہے ۔
تھ ہی ساتھ ہوا کی DENSITY بھی کم ہوتی
تی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پہاڑوں پر زیادہ اونچائی
۔ سانس لینا مشکل ہے۔ بادل تقریباً چودہ کلومیٹر
ب پائے جاتے ہیں ۔ پانی کے ذرّے بس اسی
انی تک فضا میں موجود رہتے ہیں ۔ فضائی ماحول
دوسرے طبقے میں دھول، دھواں، مٹی اور گیسیں
تو مگر بتدریج کم ہوتی جاتی ہیں۔ نائٹروجن اور
یم جیسے ہلکے گیس ہی وہاں پائے جاتے ہیں اور
ں DENSITY بھی کافی کم ہو جاتی ہے۔
ب سے اوپری طبقہ میں اوزون اور آیون گیس
ئے جاتے ہیں ۔ان دونوں کی یہ خصوصیت ہے کہ
رج کی بہت تیز اور بہت نرم روشنی کو اپنے اندر
ب کر لیتے ہیں ۔ مقناطیسی اثرات اور بجلی سے چارج
انے کی وجہ سے سورج کی شعاعوں کے نقصان
انے والے اثرات بھی اسی طبقہ میں گم ہو جاتے
۔ اس طرح ماحول کا یہ اوپری طبقہ زمین کی انسانی
حیوانی زندگی کے لیے ضروری ہے ۔ قدرت ایسا
ام نہ کرتی تو سورج کی گرم اور طاقتور شعاعیں
ندار کو بھسم کر دیتیں ۔

زمین کے اوپر دو سو میل کے اس فضائی
ل میں تو بہت کچھ ہے ۔ ۲۱۰ کے بعد کچھ بھی نہیں۔
کروڑوں اربوں میل تک کچھ نہیں ۔بس سورج کی روشنی
کا بکھرا ہوا رنگ اور خلا یا خالی پن ۔اسی کو آپ
خلا کہہ سکتے ہیں ۔اسی کو آسمان کہہ لیجیے ۔یہ اتنی دور
تک پھیلا ہوا ہے کہ ہم اپنے تصور میں بھی نہیں لا سکتے
ہیں ۔ اور اسی دوری میں چاند سورج اور ان گنت
تارے گھومتے رہتے ہیں ۔

تو اس کو آپ خلا کہیے یا کچھ اور ۔ اس کے
"کچھ نہیں" میں بھی بہت کچھ ہے ۔ سائنس داں کہتے
ہیں زمین کے فضائی ماحول میں بھی اور اس کے بعد
بھی ہر جگہ ایتھر پھیلا ہوا ہے ۔لیکن یہ ایتھر ایک
خیالی چیز کے علاوہ ہے کچھ نہیں ۔

اب دوسری بات رنگ کے بارے میں سمجھنی
ہے ۔ سورج کی دھوپ میں سات رنگ ہوتے ہیں ۔
ان سات رنگوں کو آپ قوس قزح میں، تکونے شیشے
میں یا فوارے کی بوندوں میں دیکھ سکتے ہیں ۔ دنیا
کے باقی تمام رنگ انھی سات رنگوں سے مل کر بنتے
ہیں ۔ اور جب یہ سات رنگ ملتے ہیں تو سورج کی
اجلی پیلی دھوپ بن جاتے ہیں ۔

آسمان نیلا کیوں نظر آتا ہے ؟ اس کے
دو سبب بتائے جاتے ہیں ۔ ایک تو سورج کی دھوپ
میں ملا ہوا نیلا رنگ کم زور رنگ ہوتا ہے ۔یعنی نیلے
رنگ کی لہریں زیادہ دور تک نہیں چل سکتیں اور
خلا میں بکھر جاتی ہیں یہی پھیلا ہوا نیلا رنگ ہمیں دکھائی
دیتا ہے ۔

آسمان کے نیلے رنگ کے بارے میں دوسری بات ذرا ٹیڑھی ہے اور وہ یہ کہ سورج کی روشنی میں تو سات رنگ ہوتے ہیں لیکن دنیا کی کسی بھی چیز میں اپنا کوئی رنگ نہیں ہوتا۔ جو چیز جس طرح کے مادہ کے ذروں سے مل کر بنی ہے۔ وہ روشنی سے اس رنگ کو لے کر دکھاتی ہے۔ عام لفظوں میں ہم اس بات کو یوں کہتے ہیں کہ یہ چیز اس رنگ کی ہے۔ وہ چیز اُس رنگ کی!

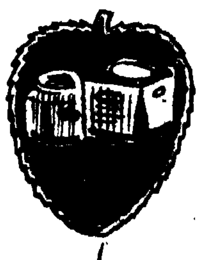
دراصل کسی چیز کا اپنا کوئی رنگ نہیں، نہ پتّے ہرے ہیں نہ کوئلا کالا۔ یہ تو ان چیزوں میں ملے ہوئے اجزا ہیں جو روشنی کے مختلف رنگوں کو دکھاتے ہیں۔ روشنی نہ ہو تو ہر چیز کالی ہے۔

دن میں زمین کے "فضائی ماحول" میں بکھرے مختلف چیزوں کے ذرے سورج کی روشنی کے صرف نیلے رنگ کو بکھیرتے ہیں۔ ماحول میں کچھ بات ہی ایسی ہے کہ دھوپ کا صرف نیلا رنگ ہی بکھر پاتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ فضا میں جب کسی ایک مادہ کے ذرّے بڑھ جائیں تو آسمان مٹیالا ہو جائے اور کوئی دوسرا مادہ بڑھ جائے تو ہلکا نارنجی سا۔ لیکن عام طور سے فضائی ماحول جس رنگ کو بکھیر رہا ہے، وہ رنگ آسمانی رنگ ہی ہے۔ اور اس پھیلے ہوئے رنگ کو عام لفظوں میں آسمان کہا جاتا ہے۔

رات کو سورج کی روشنی نہ ہونے کی وجہ سے آسمان کالا لگتا ہے۔ اور اس میں ان گنت تارے پھیلے دکھائی دیتے ہیں۔ اچھا ایک نظر میں تارے دیکھ سکتے ہیں؟ لاکھوں؟ جی نہیں۔ ہزار کے لگ بھگ! آسمان صاف ہو تو ایک بنا دوربین کے لگ بھگ چار ہزار تارے ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ تارے کل ہزار کے قریب ہیں۔ تارے تو آسمان کے حساب پھیلاؤ میں اربوں کی تعداد میں ہیں ا ہی کیا نہ جانے کتنے سورج اور کتنے چاند ہیں جو دکھائی نہیں دیتے۔

بڑی بڑی ریڈیو دوربینوں سے ات کے تاروں کو دیکھا جا چکا ہے جتنی دور تک خی سے ہی پہنچتا ہے۔ ذرا سوچ کے دیکھیے کی رفتار ہے ایک سیکنڈ میں تقریباً ایک لاکھ چ میل — جی ہاں۔ صرف ایک سیکنڈ میں۔ ا چھیاسی ہزار میل۔ اس رفتار سے نو کروڑ س سورج کی روشنی ہماری زمین تک ۸ منٹ م پاتی ہے؟ لیکن بہت سے تارے اتنے کہ اسی رفتار سے ان کی روشنی کو ہماری پہنچنے میں لاکھوں سال لگتے ہیں۔ اتنی دو تارے بھی آسمان ہی میں ہیں۔ اب آپ سمجھ ہوں گے کہ زمین کے اوپر نیلی سی یہ چھتری آسمان نہیں۔ آسمان کی وسعتوں کے بار کوئی حساب تو کیا لگائے گا تصور بھی مشکل کر سکتا ہے۔





پہلے صرف شاہوں اور رؤسا کے لیے مخصوص تھی،
اب اس عوامی دور میں طیبی دواخانہ نے عام کر دی ہے۔

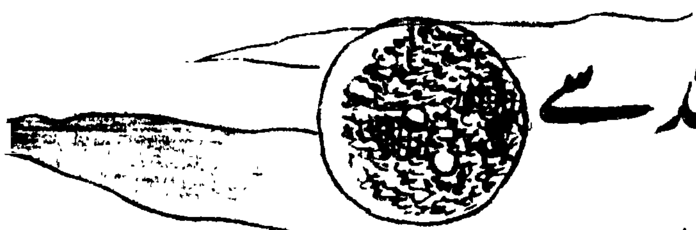
طیبی کی تیار کردہ شاہی خاندان بھر کے لیے بہترین ٹانک ہے۔ دل،
دماغ، اعصاب کو تقویت دیتی ہے۔ معدہ اور جگر کی اصلاح کر کے
بکثرت خونِ صالح پیدا کرتی ہے۔ تمام جسم میں طاقت و توانائی کی
نئی لہریں دوڑا کر صحت کو قابلِ رشک بنا دیتی ہے۔

دی طیبی دواخانہ اندور پرائیویٹ لمیٹڈ

چوک بازار اجین —— مہارانی روڈ —— اندور
رجسٹرڈ آفس :- ۵۱ بوہرہ بازار —— اندور
شاخ :- ۷۷ - محمد علی روڈ - بمبئی ۳ فون : ۳۲۴۸۸۳

جناب عادل جعفری

بچّہ — چاند سے



تیری ہر ایک بات پہ سر دُھن رہا ہوں میں
اے چاند کچھ دنوں سے یہ کیا سن رہا ہوں میں

بنیاد تیری عزت و شہرت کی ہل گئی
کہتے ہیں تجھ پہ فتح بزرگوں کو مل گئی

ہر شخص تیرے ذکر پہ ہنستا ہے بار بار
بدصورتوں میں ہونے لگا اب ترا شمار

کل تک تو تجھ سے حسن کا قایم وقار تھا
کل تک جسے بھی دیکھیے تجھ پہ نثار تھا

دلہن بھی چاند جیسی ہو دولھا بھی چاند سا
دادی یہ چاہتی تھیں کہ پوتا ہو چاند سا

روتا تھا میں کبھی تو تجھے وہ دکھاتی تھیں
بڑھیا کی تیری مجھ کو کہانی سناتی تھیں

کل تک تو مجھ کو دیکھتا تھا گھور گھور کے
لڈو مجھے کھلاتا تھا تو موتی چور کے

اب کیا ہوا کہ پست تری ذات ہو گئی
یہ دیکھتے ہی دیکھتے کیا بات ہو گئی

اے چاند کچھ تو بول یہ تو کیوں خموش ہے
اچھا! میں سمجھا دل میں ترے غم کا جوش ہے

اجڑی ہوئی بتاتے ہیں سب تیری کائنات
کہتے ہیں ہر طرف نظر آتے ہیں کھنڈرات



پانی کا ایک قطرہ ہے نہ ہے ہوا کا نام
سورج سے لے کے روشنی چلتا ہے تیرا کام

کہنا یہ چاہیے کہ تو ہے ڈھول دور کا
آتا ہے دیکھنے میں نظر ٹکڑا نور کا

افسوس ہے کہ گر گیا سب کی نظر سے تو
اب آرم اسٹرانگ کے چرچے ہیں چار سو

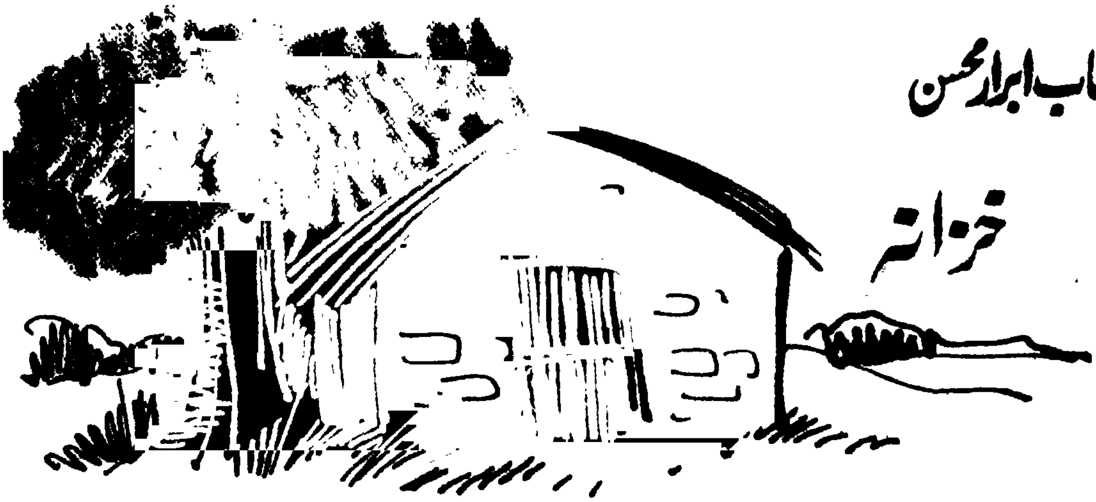
حیرت کے ساتھ خرم و بشاش کر دیا
پردہ تری حقیقتوں کا فاش کر دیا

سارے جہاں میں خوب وہ مشہور ہو گیا
عزت سے تو سدا کے لیے دور ہو گیا

ہونے کو تو زمانہ میں جو بھی ہوا کرے
تیری طرح کسی کو نہ رسوا خدا کرے

خزانہ

جناب ابرار محسن



گاؤں کے سب لوگ چوپال میں رامو کو گھیرے بیٹھے تھے۔ آج سے ٹھیک بیس برس پہلے وہ گاؤں چھوڑ کر نہ جانے کہاں چلا گیا تھا اور بس اچانک ہی آگیا۔ گاؤں چھوڑ کر گیا تھا تو وہ صرف بیس برس کا کھلنڈرا لڑکا تھا۔ دن بھر گاؤں کے لڑکوں کے ساتھ گلی ڈنڈا کھیلتا یا باغوں میں گھس کر آم چراتا اور کھیتوں میں سے چپکے سے باجرے کی بالیاں توڑ کر لے آتا۔ سارے گاؤں کے لڑکے مزے سے ایک جگہ جمع ہو کر عوتیں اُڑاتے۔

رامو کی ماں ابھی تک زندہ تھی۔ رامو اس کا وتا لڑکا تھا۔ باپ تو شروع ہی میں مر گیا تھا۔ ماں نے ہی محنت مزدوری کر کے ننھے رامو کو بیس سال تک ل پوس کر کڑیل جوان بنا دیا تھا ——— اور اس ے اچانک غائب ہو جانے پر وہ بہت روئی تھی۔ ے ایک آدمی کے سامنے گڑگڑائی تھی کہ اس کے مو کو ڈھونڈ کر لا دے۔ مگر رامو تو کچھ ایسا غائب ہوا ہزار کوشش کرنے پر بھی اس کا پتہ نہ لگا۔ جیسے اس کے زخم پر مرہم رکھ دیا اور اب بیس سال گذرنے کے بعد تو بس رامو کی ایک دھندلی سی یاد ہی اس کے ذہن میں باقی رہ گئی تھی۔

اور جب اس کا بیٹا رامو اچانک آگیا تو وہ دیوانی سی ہو گئی تھی۔ مارے خوشی کے آنکھوں سے آنسو تھمتے ہی نہ تھے۔ اس نے رامو کو لپٹا کر خوب خوب پیار کیا بلائیں لیں۔

لیکن وہ کیوں گیا تھا؟ اور بیس سال تک کہاں رہا؟ یہی بھید جاننے کے لیے آج سب لوگ اسے چوپال میں کھینچ لائے تھے۔

دن ڈھل رہا تھا رات کے اندھیرے پھیل رہے تھے۔ سب لوگ غور سے رامو کا سر سے پیر تک جائزہ لے رہے تھے۔ اب رامو ایک کھلنڈرا جوان نہ تھا ایک سنجیدہ آدمی تھا۔ سفید سفید بال سر میں بکھرنے لگے تھے۔ چہرے پر بھی ایک آدھ جھرّی پڑ گئی تھی۔

"ہاں بیٹا رامو! کہاں رہے اب تک؟ بڑے دنوں بعد آئے۔ کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ۔" بوڑھے چودھری

"ہاں ہاں رامو! یار تو تو بڑا بے وفا نکلا بیس سال بعد گاؤں کی یاد آئی ——— مگر تو رہا کہاں ؟ ذرا ہم بھی تو سنیں" اس کے دوست گوپال نے کہا۔

رامو نے ایک بار اُن سب کے چہروں پر نظر ڈالی۔ ان میں زیادہ تر اس کے بچپن کے وہی دوست تھے جن کے ساتھ وہ گلی ڈنڈا کھیلا کرتا تھا جن کے ساتھ وہ باغوں اور کھیتوں میں چوریاں کیا کرتا تھا۔ مگر اب تو سب کے سب بدل چکے تھے۔ کوئی وقت سے پہلے ہی بوڑھا ہو گیا تھا تو کوئی بوڑھا ہونے کی تیاری کر رہا تھا۔

رامو نے ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا "کیا کروگے سن کر میری کہانی بڑی دکھ بھری ہے"

سب ایک ساتھ چلائے "نہیں نہیں۔ ہم ضرور سنیں گے"

"اچھا تو سنو" رامو نے اطمنان سے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ میرے باپ میرے بچپن ہی میں مر گئے تھے اور انھوں نے زمین جائداد کچھ بھی نہ چھوڑی تھی۔ میری ماں بڑی مشکل سے اپنا اور میرا پیٹ بھرتی تھی۔ میں غریبی سے تنگ آگیا تھا۔ ہر گھڑی یہی سوچتا رہتا تھا کہ کہیں سے کوئی خزانہ ہاتھ لگ جائے یا الہ دین کا چراغ ہی مل جائے۔ مگر مجھے تو کبھی کوئی کھوٹا سکہ بھی سڑک پر پڑا ہوا نہ ملا۔

"ایک دن میں انھی خیالات میں کھویا ہوا سو گیا اور خواب [illegible]

مجھ سے کہہ رہا تھا، رامو ایک بہت بڑے خزانے کا مالک ہے۔

"کہاں ہے وہ خزانہ؟ میں نے بے تابی سے پوچھا"

"یہ میں تجھے نہیں بتا سکتا۔ ہاں اتنا ضرور بتا سکتا ہوں کہ اس خزانے کے پاس ہی برگد کا ایک درخت ہے۔ جب تو خزانے کے پاس پہنچے گا برگد کا درخت تجھے اشارے سے بتا دے گا۔"

"یہ کہہ کر سادھو غائب ہو گیا۔ فوراً ہی میری آنکھ کھل گئی، برگد کا درخت اشارے سے مجھے بتا گا! یہ الفاظ میرے ذہن میں گھوم رہے تھے۔ لیکن خزانے کو ڈھونڈا کہاں جائے؟ اس سوال کا جواب بڑا ہی مشکل تھا۔

"ایک دن میں نے خزانے کو ڈھونڈنے کا ارادہ کر ہی لیا اور رات کے وقت جب کہ ماں گہری نیند سو رہی تھی میں چپکے سے گھر سے چل پڑا۔

"دن رات چلتے چلتے میں عرب جا پہنچا وہاں ہر طرف جلتی ہوئی ریت ہی ریت تھی تیز ہوا ریت کے ٹیلوں کو ادھر ادھر اڑاتی پھرتی تھی ریگستان میں بے شمار مصیبتوں کا مقابلہ کرتا ہوا کی تلاش میں لگا رہا۔ بھوک لگتی تو کھجور کے درخت پر چڑھ کر کھجوریں توڑ کر کھا لیتا اور پیاس لگنے پر نخلستان میں جا کر پیاس بجھا لیتا ——— لیکن [illegible]

ناامید ہو کر میں آگے چلا اور افریقہ جا پہنچا۔ یہاں بھیانک اور گنجان جنگل تھے۔ ہر قسم کے درندے وہاں موجود تھے۔ اس کے علاوہ جنگلی قبیلے بھی تھے جو جانوروں کی سی زندگی بسر کرتے تھے۔ میں نے افریقہ کے جنگلوں میں بھی خزانہ تلاش کیا لیکن بے کار۔ خزانہ کا پتہ یہاں بھی نہ ملا۔

" اسی طرح بیس سال ادھر ادھر بھٹکنے کے بعد اب اپنے گاؤں واپس آگیا ہوں کیونکہ چلتے چلتے تھک گیا ہوں اور اب کچھ دن آرام کرنا چاہتا ہوں۔ لیکن خزانے کو میں اب بھی ڈھونڈتا رہوں گا۔ خزانہ مجھے مل کر رہے گا۔ سادھو نے کہا تھا۔ رامو ایک بہت بڑے خزانے کا مالک ہے۔ ایک نہ ایک دن میں ضرور خزانے کا مالک بنوں گا۔"

رامو نے اپنی داستان ختم کی۔ سب لوگ بڑے غور سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو نظریں بچا کر اس کی بے وقوفی پر ہنس رہے تھے۔

چودھری کی چلم جل چکی تھی انھوں نے اسے ایک کونے میں رکھ کر کہا "اچھا رامو بیٹا تو بہت تھکا ہوا ہے جا گھر جا کر سو جا۔"

رامو چودھری کو پرنام کر کے چوپال سے اٹھ کھڑا ہوا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ گاؤں میں ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دور کہیں سے گیدڑوں اور کتوں کی ملی جلی آوازیں آ رہی تھیں۔ اب وہ گھر کے بہت ہی پرانا درخت تھا جس کی داڑھی زمین میں گھس گئی تھی۔ برگد کے نیچے آکر وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اور ایک شاخ کو غور سے دیکھنے لگا۔

" ارے" وہ حیرانی سے بول اٹھا "ایسا لگتا ہے جیسے یہ شاخ کسی طرف اشارہ کر رہی ہو ــــ ہاں ہاں یہی بات ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے یہ برگد کا ہاتھ ہو۔ لیکن اس شاخ کا رخ کس طرف کو ہے؟ ارے واہ یہ تو میرے گھر کی طرف ہی اشارہ کر رہی ہے ــــ کمال ہے۔ تو کیا خزانہ میرے گھر میں ہی کہیں چھپا ہوا ہے ــــ؟"

وہ تھوڑی دیر تک برگد کے نیچے کھڑا رہا پھر گھر کے اندر چلا گیا۔

ماں کھانا لیے بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی بولی۔ "کہاں تھا میرے لال۔ کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ ڈر رہی تھی کہیں تو پھر غائب نہ ہو جائے۔"

یہ کہتے کہتے ماں کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ رامو نے ماں کو دلاسا دیا "نہیں ماں اب میں کہیں نہ جاؤں گا۔"

ماں نے اسے بڑے پیار سے کھانا کھلایا اور بستر کر کے لٹا دیا۔

"سو جا میرے بچے۔ تو بہت تھکا ہوا ہے۔" اس نے رامو کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیر کر کہا۔

تھا۔ آج کھانا کھانے میں اُسے وہ لطف آیا تھا جو
پچھلے بیس برسوں میں کبھی نصیب نہ ہوا تھا۔ اور جب
ماں نے اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرا تو اسے
اس قدر سکون ملا کہ فوراً ہی سو گیا۔

خواب میں اسے وہی سادھو نظر آیا۔ وہ
مسکرا کر کہہ رہا تھا: "رامو ایک بہت بڑے خزانے
کا مالک ہے۔"

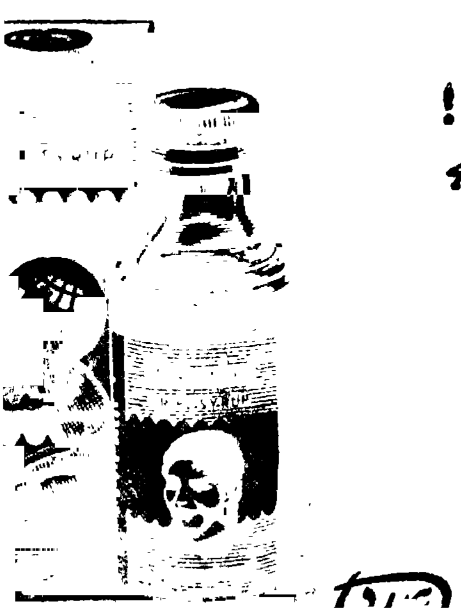
"کیوں جھوٹ بولتے ہو۔" رامو نے غصّے
سے چلّا کر کہا "پچھلے بیس برسوں سے خزانے کی
تلاش میں بھٹکتا رہا ہوں مگر بے کار۔"

سادھو پھر مسکرایا اور کہا: "تجھ سے
بھٹکنے کے لیے کس نے کہا تھا۔ خزانہ تو تیرے پاس
ہی ہے۔"

"کہاں ہے وہ؟" رامو نے جھلّا کر
وہ خزانہ تیری ماں ہے۔ ماں سے
دنیا میں اور کوئی بھی خزانہ نہیں۔" یہ کہہ کر
غائب ہو گیا۔

رامو کی آنکھ کھل گئی اور رو رہے
وہ ماں سے لپٹا ہوا رو رو کر کہہ رہا تھا: "میر
ماں۔ تو ہی میرا خزانہ ہے آج مجھے معلوم ہ
اب میں ساری زندگی تیری خدمت کرتا ہو

اسی وقت ماں کی گود میں چالیس
رامو بالکل چار برس کا ننھا مُنّا بچّہ لگ رہا
ماں اس کو چمکار رہی تھی۔


میٹھی نیند کے مزے لیتے ہوئے
ننھے مُنّے بچّے کتنے پیارے لگتے ہیں!
قدرتی اور بھرپور نیند اُن کے لیے اچھی صحت کی علامت ہے
اور ماں باپ کے لیے سُکھ کا سانس!
انھیں ہمیشہ نونہال گرائپ سیرپ دیجیے
خاص کر پیٹ کی خرابی اور دانت نکلنے کے دنوں میں.
نونہال گرائپ سیرپ
بچّوں کی ہضم کی شکایتوں، عام بے چینی اور دانت نکلتے

ناب عبدالمنان رہبر بہرائچی

نیا سال آیا بلند حوصلے ہیں



یا سال آیا بلند حوصلے ہیں
ں ہیں چراغِ محبت جلے ہیں
سا دیں گے اب ہم مزاجِ زمانہ
دے ہمارے جواں ہو چلے ہیں
نیا سال آیا، بلند حوصلے ہیں

ریں گے نہ اب بھول کر بھی شرارت
یا ہو گئی علم و دانش سے رغبت
ھائیں گے ہم دیش کی شان و عظمت
ی ہے دلوں میں وطن کی محبت
نیا سال آیا، بلند حوصلے ہیں

سی کو بھی باہم جھگڑنے نہ دیں گے
بت کی بستی اجڑنے نہ دیں گے
یا ہے یہی فیصلہ اپنے دل میں
سی کو کسی سے بچھڑنے نہ دیں گے
نیا سال آیا، بلند حوصلے ہیں

ئیں گے ہم شمع علم و بصیرت
ا دیں گے اب ظلمت جہل و غربت
ی فرض سے اپنے غافل نہ ہوں گے
ن کو بنائیں گے ہم رشکِ جنت

بزرگوں کی تعظیم و عزت کریں گے
جو چھوٹے ہیں ہم ان پہ شفقت کریں گے
کوئی سکھ ہو، ہندو، یا ہو مسلماں
ہر اک بھائی سے پیار و الفت کریں گے
نیا سال آیا، بلند حوصلے ہیں

ہمیں دیس کے ماہ و اختر بنیں گے
تلک، بوس و گاندھی و جوہر بنیں گے
ہم آزاد، آصف، جواہر بنیں گے
ہمیں ملک و ملت کے رہبر بنیں گے

جناب عبدالغنی شیخ
(لیہہ - لداخ)

خدمت

اماوس کی رات تھی۔ چھرنگ اپنے بھیا کے ساتھ اپنے مکان کی کھڑکی کے راستے سے جھانک جھانک کر جنگلا کی بلندی کو تاک رہے تھے۔ جنگلا سطح سمندر سے ۱۷۲۵۴ فٹ بلند ہے۔ یہاں سے ایک سڑک گزرتی ہے جو تبت کی سرحد کے پاس جا کر ختم ہوتی ہے۔ جنگلا کی بلندی پر ایک بورڈ پر یوں لکھا ہے۔ "لیجیے۔ دنیا کی سب سے اونچی سڑک آگئی۔ اپنے انجن کے سلینڈر سنبھال لیں۔"

رات بہت ہی سرد تھی اور حد نظر تک تارے ٹھنڈ سے گویا ٹھٹھر رہے تھے۔ لیکن چھرنگ سردی سے بے نیاز ان کالی پہاڑیوں کے نظارے سے لطف لے رہا تھا جو کبھی کبھی جنگلا کی برف میں چھپی ہوئی چوٹی سے نشیب (نیچے) کی طرف آتی تھیں۔ پہلے دور سے روشنی کا ایک دھبا سا نظر آتا۔ یہ دھبا بڑا ہوتا جاتا اور آس پاس کی چوٹیاں روشنی میں نہا جاتیں، کبھی یہ روشنی چھپ جاتی، پھر نظر آتی ٹیڑھی میڑھی سڑک سے دوڑتی ہوتی روشنی اور اندھیرے کی یہ آنکھ مچولی چھرنگ کو بہت بھاتی تھی۔ اسی لیے وہ اور اس کا بھیا کبھی کبھی تو رات گئے تک لے دیکھتے رہتے۔ ایک موڑ پر جب گاڑی پہنچتی تو اس کے گھر کے مکان کی کھڑکی کے سامنے کے پیڑ اور پھر ایک لمحہ کے لیے مکان روشنی کا لبادہ اوڑ

اس رات کافی انتظار کے بعد کوئی گاڑی سنے نہیں آئی۔ ابھی چھرنگ یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اس بلندی پر روشنی کا دھبا نظر آیا اور حسب معمول روشنی تاریکی آنکھ مچولی کھیلنے لگی۔ موڑ کے پاس جب گاڑی تو چند لمحوں کے لیے اس کے باغیچہ کے ننگے پیڑوں پھننگوں پر روشنی ناچنے لگی اور ایک لمحہ کے لیے مکان روشنی سے جگ مگا اٹھا۔ چھرنگ اور اس ننھے بھائی کی آنکھیں چندھیا گئیں۔

لیکن دوسرے ہی لمحہ ایک خلاف توقع پیش آیا۔ روشنی موڑ پر لرزنے سی لگی اور بائیں طرف پر روشنی نے دو تین قلابازیاں کھائیں۔ چھرنگ اور ا بھیا حیرت سے یہ دیکھ رہے تھے کہ روشنی غائب چھرنگ کے گلے سے ایک گھٹی ہوئی چیخ ابھری۔ ننھا بھائی گھبرا گیا۔ چھرنگ بھاگم بھاگ باپ کے جو پاس کے باورچی خانہ میں اپنے پھٹے پرانے اوڑھے اونگھ رہا تھا۔ چھرنگ کی آواز سن کر

"کیا بات ہے" وہ آنکھیں میچتا بولا۔

"گاڑی نیچے لڑھک گئی ہے"

"گاڑی؟ کہاں؟" اس کے باپ نے غنودگی میں گھبرا کر پوچھا۔

"ناغا کے موڑ کے پاس"

باپ نے جلدی جلدی اپنے پھٹے کپڑے پہنے۔ شور سن کر اس کی ماں اور بہنیں بھی جاگ اٹھیں۔ چھرنگ ھاگم بھاگ چھت پر گیا اور اپنے ہمسایوں کو پکارنے لگا۔ شور سن کر تاریکی میں کتے بھونکنے لگے اور دور دور کے کتوں نے بھی بھونک کر جواب دیا۔ ہم سائے چھتوں پر جمع ہوئے اور چھرنگ نے سبھوں کو حادثہ سے آگاہ کیا۔

تھوڑی دیر میں سبھی لوگ محلہ کے یکوڈا کے پاس یع ہوگئے۔ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے شبہ کیا کہ کہیں کے کی نظر نے دھوکا نہ کھایا ہو۔ لیکن چھرنگ نے چلّا کر ہا کہ اس نے سچ مچ گاڑی کو ناغا کے موڑ کے پاس ے لڑھکتے ہوئے دیکھا ہے۔

"ناغا یہاں سے تین میل دور ہے۔ سردی زیادہ ہے" ایک آدمی نے اپنی ٹوپی کانوں سے لپیٹتے ہوئے کہا۔ دوسرے نے اس کی تائید کی۔ لیکن ایک جوان مداخلت کرتے ہوئے کہا "مصیبت میں پھنسے ہوئے ل کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ ہمیں اسی وقت چلنا چاہیے"

"ہاں ہاں سب ناغا چلیے"۔ یہ باتیں کرنے کا

سبھوں نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی اور یہ چھوٹا سا قافلہ ناغا کی طرف بڑھا۔ کسی کے ہاتھ میں بیلچہ تھا کسی نے کدال اٹھائی تھی۔ ایک آدمی دھیمی سی روشنی کی لالٹین تھامے تھا۔ چھرنگ کے چچا نے اپنا گھوڑا لیا۔ چھرنگ سب سے آگے تھا۔ سردی سے ناک اور کان پھٹے جا رہے تھے۔

لیکن یہ مختصر سا قافلہ برف پر پھسلتا برف میں دھنستا ہوا تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ پیچھے سے گاؤں کے کتے زور زور سے بھونک رہے تھے۔ جوں جوں کتوں کی آوازیں کم ہوتی گئیں۔ ناغا کا موڑ نزدیک آتا گیا۔ جب یہ لوگ موڑ کے پاس پہنچے تو گہری سی خاموشی چھا گئی۔ رات کے سناٹے میں یہ پراسرار ماحول دل کو لرزاتا تھا۔ سب کے دلوں پر ایک ہول سا تھا۔ وہ بلندی پر چڑھتے ہوئے گاڑی کو تلاش کرنے لگے۔ اچانک کسی نے آواز دی۔

"وہ دیکھو اس کالی چیز کو!"

سب بے تحاشا اس کی طرف دوڑ پڑے۔ یہ ایک جیپ تھی جو اوندھی پڑی ہوئی تھی۔ کسی نے لالٹین کی روشنی دکھائی اور دوسرے نے دروازہ کھول دیا۔ ڈرائیور کی سیٹ پر ایک آدمی بے سدھ پڑا تھا۔ اس کی ٹانگوں پر جمے ہوئے خون کے دھبے تھے۔ لالٹین کی دھیمی روشنی میں اس کے شانوں پر لگے تین ستارے نظر آرہے تھے۔ دوسرا آدمی جو ڈرائیور تھا۔ اس سے آگے باہر گرا ہوا تھا۔ ڈرائیور پر غشی طاری تھی۔ اس کے ہونٹ چھل گئے تھے۔ ایک کڑیل جوان نے کپتان کو

کچھ لوگوں نے ڈرائیور کو سنبھالا ۔ ان کے بدن اور ہاتھوں پیروں کی مالش کی ۔ کپتان نے آہستہ سے آنکھ کھولی ۔ اور ایک سوٹ کیس کی طرف اشارہ کیا ۔ سوٹ کیس کا ایک کنارا پھٹ گیا تھا اور اس میں سے نوٹ کی گڈیاں نظر آتی تھیں ۔ وہ مزدوروں کے لیے روپے اپنے ساتھ لا رہا تھا ۔ چھرنگ کا چچا ہندی جانتا تھا ۔ بولا ۔

" کپتان صاحب ۔ مبارک ہو ۔ آپ کی جان اب بچ گئی ہے ۔ ہم آپ کو ہسپتال لے جائیں گے ۔"

کپتان نے آنکھوں سے اشارہ کیا کہ وہ سوٹ کیس سے تین روپے لے لیں ۔

چھرنگ کا چچا بولا " نہیں ہم اس میں سے ایک پیسہ نہیں لیں گے ۔ یہ ہمارے لیے پاپ ہوگا ۔"

کپتان کو بولنے کی سکت نہیں تھی کئی آدمیوں نے آہستہ سے گھوڑے پر سوار کیا اور اس کے پیچھے چھرنگ کا چچا سوار ہوا ۔ اس نے اپنے لمبے بالوں والے کپڑے میں کپتان کو تھام لیا ۔ دوسرے گھوڑے پر اسی طرح ڈرائیور کو سوار کیا گیا اور آہستہ آہستہ یہ قافلہ منزل کی طرف بڑھا ۔

جب وہ نشیب (نیچے کی طرف) میں واقع فوجی کیمپ پہنچے تو رات کے ڈیڑھ بجا تھا ۔ اس رات دیوالی کے سلسلے میں بڑا کھانا تھا ۔ لوگ ابھی تک جاگ رہے تھے ۔ اس وقت دونوں زخمیوں کو فیلڈ ہسپتال میں داخل کرا گیا ۔ اور [illegible]

کیا گیا ۔

دوسرے روز چند لوگ ہسپتال گئے ۔ کپت[illegible] اور ڈرائیور ہسپتال میں بستر پر لیٹے مسکرا رہے [illegible] ان کی جانیں بچ گئی تھیں ۔

" اس دس سالہ لڑکے نے ہمیں اس سے آگاہ کیا اور آپ دونوں کی جانیں بچ گئیں " چھرنگ کا چچا بولا ۔ چھرنگ کو کیمپ کمانڈر کے سا[illegible] پیش کیا گیا ۔ کیمپ کمانڈر نے اس سے ہاتھ [illegible] اور اس کی بہادری، ایثار کی تعریف کی ۔ پھر ا[illegible] نام اور پتہ نوٹ کر کے مقامی ڈویژنل کمانڈ[illegible] گیا کہ کس طرح اس دس سالہ لڑکے نے دو انسا[illegible] کی قیمتی جانیں بچائیں ۔ اب وہ ڈویژنل کمانڈر [illegible] انعام کا انتظار کر رہا ہے ۔

جناب خورشید شیدائی

لطیفہ

چلتی ہوئی بس میں ایک صاحب سگریٹ جلا کر پینا شروع کیا تھا کہ کنڈکٹ[illegible] کہا: " بس میں سگریٹ پینا منع ہے ۔" ا[illegible] بس کے اندر لگے ہوئے ایک اشتہار " ہم[illegible] کیپسٹن سگریٹ پیا کیجیے " کی طرف اش[illegible] کرتے ہوئے کہا " آپ دیکھ سکتے ہیں کہ [illegible]

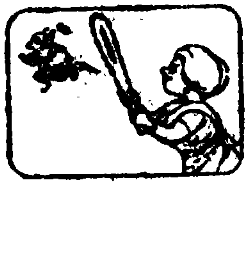
اچھا خاصا اسکرٹ مسٹر شرنک کی بدولت سکڑ کر چھوٹا سا ہو گیا... "سینفورائزڈ" کو ساتھ لیجئے اور اسے گھر سے باہر نکالئے!

·SANFORIZED·
REGD TD MK



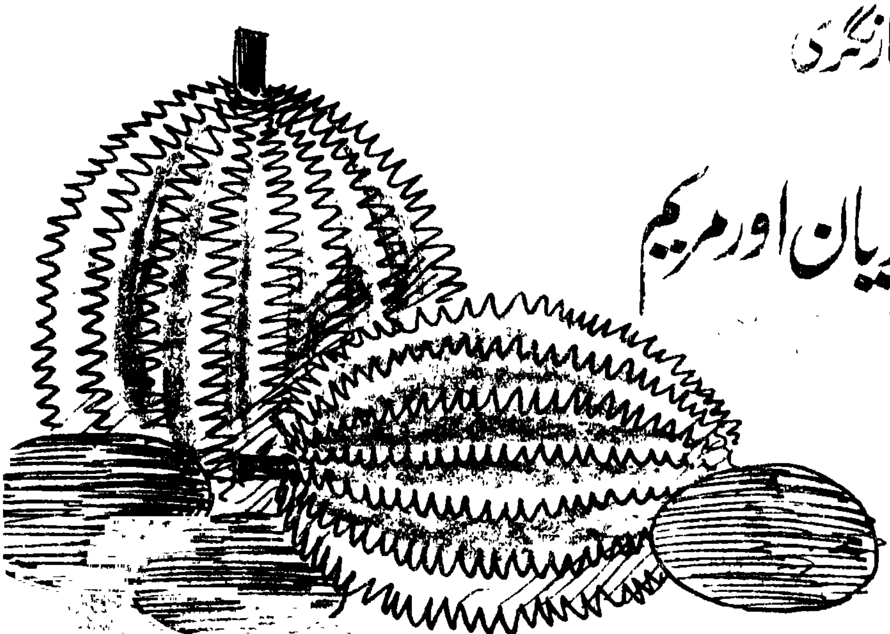
مسٹر شرنک کے ہاتھوں خود کو مجبور اور پشیمان نہ ہونے دیجئے۔ آپ کے کپڑے کبھی سکڑ کر تنگ نہ ہوں گے اگر وہ ایسے سوتی یا سوت ملے ہوئے کپڑوں سے بنے ہوئے ہوں جن پر "سینفورائزڈ" کی چھاپ ہوتی ہے۔ دنیا بھر میں مانا ہوا اور جانا پہچانا یہ ٹریڈ مارک ـ جو ہندوستان میں تیار شدہ کپڑوں کی برآمد بڑھانے میں بہت اہم تعاون کرتا ہے ـ آپ کے کپڑے نہ سکڑنے کا قابل اعتماد ضامن ہے اتنا ہی نہیں بلکہ "سینفورائزڈ" چھاپ والے کپڑوں کو سلائی سے پیشتر پانی میں بھگونے کی قطعی ضرورت نہیں۔ سوتی یا سوت ملا ہوا کپڑا خریدنے سے پہلے اس کے ہر میٹر پر "سینفورائزڈ" کا نام دیکھ لیجئے۔





رجسٹرڈ ٹریڈ مارک "سینفورائزڈ" کے مالکان کلوئٹ پی باڈی اینڈ کمپنی انکارپوریٹڈ (محدود ذمہ داری) کے ساتھ لائسنس ایگریمنٹ (تکمیل شدہ) کا جاری کردہ صرف ان جانچے گئے چنندہ کپڑوں پر اس ٹریڈ مارک کا استعمال کیا جاتا ہے یا کرنے کی اجازت دی جاتی ہے جو نہ سکڑنے کی کڑی کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔

SAN 7863 UR



جناب نثار نگری

دُریان اور مریم

دُریان اور مریم کے لفظ پڑھ کر تم سوچتے ہو گے کہ یہ کسی لڑکے اور لڑکی کے نام ہوں گے مگر یہ معلوم کر کے تم کو اچنبھا سا ہوگا کہ یہ دو پھلوں کے نام ہیں۔ تم نے جغرافیہ کی کتاب میں برما کا نام تو پڑھا ہوگا۔ برما ہندوستان کے مشرق میں ہے۔ حکومتِ برطانیہ کے وقت میں برما ہندوستان کا ایک صوبہ کہلاتا تھا۔ یو۔پی، بنگال، بہار، وغیرہ کی طرح برما میں بھی ایک گورنر رہتا تھا جو وائسرائے ہند کے ماتحت ہوتا تھا۔

ہمارے ملک کی آزادی سے پہلے ہی برما ہندوستان سے جدا ہو کر علیحدہ ملک کہلانے لگا تھا۔ اب تو وہ ہندوستان کی طرح خود مختار ملک ہے۔

تم پھر سوچتے ہو گے کہ ہم نے دُریان اور مریم کا ذکر کرتے کرتے [illegible] برما کا قصہ کہاں سے چھیڑ دیا تو [illegible]

پھل ہیں۔

دُریان: ۔ دُریان کا درخت ساگون کے درخت طرح اونچا ہوتا ہے۔ اس کا پھل ناریل کی شکل ناریل جتنا بڑا ہوتا ہے لیکن رنگ پھل کا ۔ اس پر بہت تیز کانٹے ہوتے ہیں۔ کٹھل کے چ تم نے کانٹے تو دیکھے ہوں گے لیکن دریان کانٹے اس سے بھی سخت اور تیز ہوتے ہیں ا کہ دریان انسان کے سر پر گرے تو سر زخمی ہو قدرت کے کام دیکھو۔ یہ پھل پکنے کے بعد دا وقت کبھی خود بخود درخت سے نہیں گرتا اور ا دریان کے باغ میں نہیں جاتا۔ اس لیے یہ را گرتے ہیں۔ باغ کے رکھوالے ان پھلوں کو بانسوں کی مدد سے توڑتے ہیں لیکن ہر ایک پر لوہے کی ٹوپی ہوتی ہے۔

ے ہوئے ہوتے ہیں۔ چیرنے سے وہ خانے بالکل
ے ہو جاتے ہیں۔ ہر خانے میں دو یا تین بیج مغز میں
بٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ بیج بڑے اور مغز کا رنگ ذرا
زردی مائل ہوتا ہے۔ دریان کا مغز مکھن کی طرح
یم اور شہد کی طرح میٹھا ہوتا ہے۔ اس کی مٹھاس
ا خوش گوار ہوتی ہے کہ جس قدر بھی کھاؤ دل کو
بری نہیں ہوتی۔

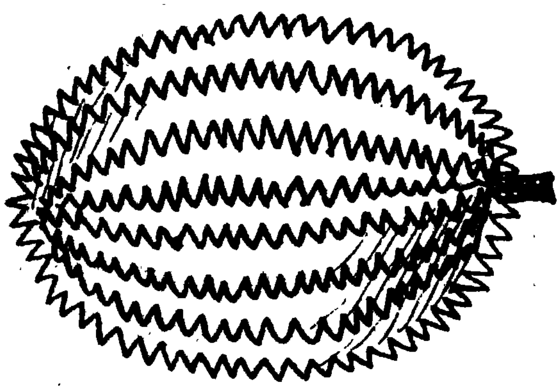
لیکن یہ معلوم کر کے تم کو سخت تعجب ہوگا
۔ اتنے لذیذ میوے میں ایک بہت بڑا عیب بھی
۔ یعنی اس میں ایک عجیب ناگوار اور مکروہ بو ہوتی
۔ جو ایک نئے آدمی کے لیے کسی طرح قابل برداشت
ں ہوتی۔ ہر نیا آدمی پہلے پہل اس کو منہ لگاتے
ئے نفرت ضرور کرتا ہے۔ ہم نے کسی کو نہیں دیکھا
ں نے پہلی بار دریان کو خواہش اور رغبت سے کھایا
۔ لیکن جب بو کو برداشت کر کے ایک بیج چوس
ے تو پھر کھاتا ہی چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ
راس کو تعجب ہونے لگتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ایسی
ت کسی میوے میں نہیں پائی گئی۔

دُریان برسات کے موسم میں ہوتا ہے چین
۔ باشندے اس کو بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔
ا بھی قیمت ہو ضرور خریدتے ہیں۔

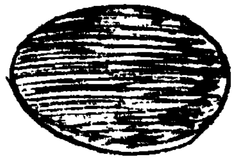
مول مین کے علاقے میں جو شہر رنگون سے
سُو امیل کے فاصلے پر ہے دریان کی پیداوار بکثرت

پھل سوائے برما کے اور کسی ملک میں نہیں ہوتا۔ لوگ
کہتے ہیں کہ یہ بہت قوت دینے والا پھل ہے۔

(دُریان کی شکل)



مَریَم: ۔ مریم کا درخت آم کے درخت کی طرح ہوتا
ہے لیکن اس کے پتے آم کے پتوں سے ذرا چھوٹے
ہوتے ہیں۔ پھل مولسری کے پھل کی شکل کا ہوتا ہے۔
جو کچا ہو تو ہرا اور پختہ ہونے پر آم کی طرح زرد ہو جاتا
ہے۔ پختہ مریم کا چھلکا بھی کھایا جاتا ہے۔ مریم کی دو
قسمیں ہیں۔ ایک کھٹا دوسرا میٹھا۔ کھٹا مریم پختہ ہوکر
بھی کھٹا ہی رہتا ہے۔ اور میٹھا مریم کچا ہو تو کھٹا اور
پختہ ہونے پر میٹھا ہوتا ہے۔ لیکن آم جیسا میٹھا نہیں
اس کی مٹھاس میں کچھ پھیکا پن بھی شامل ہوتا ہے۔
میٹھا مریم بھی لوگ شوق سے کھاتے ہیں۔ مگر قابل
تعریف تو کھٹا مریم ہے۔ کیونکہ اس کا اچار بہت عمدہ
ہوتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اچار کے لیے مریم سے
بہتر کوئی پھل نہیں۔



نوٹ: ۔ دُریان اور مریم کس زبان کے الفاظ ہیں۔ یہ ہمیں بھی نہیں معلوم۔ لیکن ملک برما میں رہنے والے اُردو داں اِن کو انھیں ناموں سے پکارتے ہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ نام برمی زبان سے لیے گئے ہیں۔ برمی زبان میں دُریان کو "دُوُرِین دِیَ" مریم کو "مَیان دِیَ" کہتے ہیں۔

برمی زبان میں (ر) کی جگہ (ی) لکھتے اور بولتے ہیں۔ مثلاً رنگون کو "یان گون" لکھتے بولتے ہیں۔ اسی طرح دُوُرِین سے دُریان اور مَیان سے مریم بن گیا ہے۔ اور "دِیَ" برمی زبان میں پھل کو کہتے ہیں۔

بچّوں کی کتابیں

مذہب

آں حضرت	-/۶۵
ارکانِ اسلام	-/۵۰
چاریار	۱/۳۰
خلفائے اربعہ	۱/۵۰
رسولِ پاک	۱/۵۰
سرکارِ دوعالم	۲/-
عقائدِ اسلام	-/۵۰
مسلمان بیبیاں	-/۷۵
نبیوں کے قصے	۱/-
ہمارے رسول	۱/۲۰
ہمارے نبی	-/۴۰

معلومات

آدمی کی کہانی	۱/۲۵
بجلی کی کہانی	-/۵۰
بجلی اور مقناطیس کے کھیل	-/۷۵
تاریخِ ہند کی کہانیاں اول	-/۸۰
〃 〃 〃 دوم	-/۸۰
〃 〃 〃 سوم	-/۸۰
〃 〃 〃 چہارم	-/۹۵
بڑدادا کی کہانی	-/۵۶
ٹیگور	۱/۲۵
چٹانوں کی کہانی	۱/۷۵
خبررسانی کے طریقے	-/۸۵
دہلی	۱/۵۰
دنیا کے بسنے والے	-/۷۵
دنیا کے بچے	-/۶۵
سمندر کے کنارے	۱/۳۰
سمندر کے نیچے	۲/-
سماجی زندگی اوّل	
〃 〃 دوم	-/-
سماجی زندگی سوم	۱
〃 〃 چہارم	۱
قدرت کے کرشمے	۲
گاندھی بابا کی کہانی	
مفید معلومات دوم	۵
〃 〃 سوم	۵
معلومات کی پانچویں کتاب	.
مقناطیس کی کہانی	۴
میر تقی میر	
میر انیس	۵
ہماری پارلیمنٹ	.

کہانیاں

ابو خاں کی بکری	.
اس نے کیا کرنا چاہا	۷
[illegible]	

جناب ابو علقمہ

اگر انسان میں ہمت نہ ہوتی



اگر انسان میں ہمت نہ ہوتی
نہ ہوتی سر کبھی پربت کی چوٹی
سمندر کا نہ ہوتا چاک سینہ
رواں ہوتا نہ پھر اس میں سفینہ
نہ طیارے فضاؤں میں گرجتے
نہ سیارے خلاؤں میں چمکتے
زمیں پر دوڑتی پھرتیں نہ کاریں
نظر آتیں بس اونٹوں کی قطاریں
نہ ریل ہوتی نہ اسکوٹر نہ لاری
کہاں ملتی بھلا ایسی سواری
نہ بجلی دوڑتی تاروں کے اندر
نہ یہ آسائشیں ہوتیں میسر
نہ جلتے بلب سڑکوں پر نہ گھر میں
اندھیرا ہی رہا کرتا نگر میں
نہ کمروں میں کہیں پنکھے یہ چلتے
گھروں میں اور یہ ہیٹر نہ جلتے
کلیں چلتیں نہ کھلتے کارخانے
نہ کچھ انجام پاتے کارنامے
نہ آوازوں کی لہریں دور جاتیں
صدائیں ریڈیو کی پھر نہ آتیں
نہ پھر موجود ہوتا ٹیلی ویژن
جہاں سارا نہ بنتا گھر کا آنگن
ہزاروں میل دور انسان بیٹھا
نہ ٹیلی فون پر یوں بات کرتا
نہ خبریں دم بدم ہم تک پہنچتیں
نہ اخباروں کی دھومیں ایسی مچتیں
پریس ہوتا نہ تو چھپتیں کتابیں
نہ علم وفن کی ہوتیں اب یہ باتیں
قلم کاغذ نہ ہوتی روشنائی
نہ ملتی آدمی کو یہ بڑائی
نہ ہوتے کیمرے نہ دوربینیں
نظر آتیں نہ پھر لاکھوں زمینیں
ستاروں کا سفر پھر خواب ہوتا
بس اک بڑھیا نگر مہتاب ہوتا
جو چاہے سربلندی، سرفرازی
نکونامی و شانِ امتیازی
تو رکھو یاد یہ میری نصیحت

سبط حسن صدیقی ہومیو پیتھ

ایک انوکھی بیماری

سورا — یا شیطان

ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کے ہاں سورا ایک نہایت خطرناک مرض کا نام ہے اس مرض کو سمجھنے کے لیے ڈاکٹر سیمیوسیل ہنی من (موجد ہومیو پیتھی) نے پورے ۱۲ سال گذار دیے۔

جب وہ اپنے مطب میں نئی اور پرانی بیماریوں کا علاج ہومیو پیتھی کے ذریعے کرتے تھے تو انھوں نے دیکھا کہ بہت سی بیماریوں میں کمی تو ضرور ہو جاتی ہے مگر مرض کی جڑ نہیں جاتی۔ اس کا سبب معلوم کرنے کے لیے ڈاکٹر ہنی من نے بڑے پاپڑ بیلے آخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ ان بیماریوں کی تہہ میں ضرور کوئی اور چیز ہے جو بیماریوں کو ٹھیک نہیں ہونے دیتی۔ اس کا نام انھوں نے 'سورا' رکھا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ سورا کیا ہے؟ اس کی علامتیں کیا ہیں اور اس سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

یہ عنوان بہت دل چسپ ہے کسی نے اسے وہم بتایا کسی نے غلط خیال۔ کسی نے خارش کا نام یا تو کسی نے گناہ کہہ کر پکارا۔

ڈاکٹر کینٹ نے سورا کی تشریح انجیل کی روشنی میں کی ہے۔ وہ بتاتے ہیں۔

دنیا میں جس وقت آدم اور حوا پیدا ہوئے بالکل گناہ سے پاک صاف تھے اور نہایت آرام سے زندگی بسر کرتے تھے۔ مگر جوں جوں ان کی اولاد بڑھتی گئی۔ ان میں ایسے لوگ بھی پیدا ہوتے گئے جو خدا کے احکام کی خلاف ورزی کرنے لگے یہاں تک کہ حضرت نوح کے زمانے میں اللہ تعالیٰ کا عذاب طوفان یا سیلاب کی شکل میں آیا اور عام طور سے گنہگار ندیوں میں بہہ گئے۔ لیکن ان کے گناہوں کا اثر آدم وحوا کی اولاد یعنی انسانی نسل پر باقی رہا۔ ان کے گناہوں کے اثر سے کچھ انسان کوڑھ جیسی بیماری میں مبتلا ہو گئے جو متعدی (چھوت سے پھیلنے والی) بیماری ہے۔ اس لیے آہستہ آہستہ پھیلتا رہا۔ مگر اس کی شدت بتدریج کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ کوڑھ کے بجائے صرف خارش یا کھجلی رہ گئی۔ ڈاکٹروں کے نزدیک خارش کی بیماری جلدی اچھی نہیں ہوا کرتی بلکہ نسل در نسل چلتی رہتی ہے۔ اس لیے ڈاکٹر کینٹ کے نزدیک اس ہی کا نام سورا ہے۔ مگر یہ تو کینٹ صاحب کا ایک نظریہ ہے۔

ہیں۔ جان نکل جائے تو جسم بے کار ہو جاتا ہے جسم پر جان کی حکومت ہے۔ جان ہی کی بدولت یہ جسم چلتا پھرتا ہے اور سب کام کرتا ہے۔ اسی جان کو روح بھی کہا گیا ہے۔ جس جسم سے روح نکل جاتی ہے وہ مردہ ہو جاتا ہے۔ پھر نہ تو اسے بخار ہوتا ہے اور نہ دردِ سر۔ نہ کہیں پھوڑا نکلتا ہے اور نہ خارش۔ اس لیے ہومیوپیتھک ڈاکٹروں کے نزدیک دراصل جسم نہیں بیمار ہوتا بلکہ روح بیمار ہوتی ہے۔ چونکہ روح کا ہر فعل جسم کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے اس لیے روح کی بیماری بھی جسم سے ظاہر ہوتی ہے۔ اسی روح کو نفس یا من بھی کہا گیا ہے۔

روح کے متاثر ہونے سے جسم کیسے حرکت میں آتا ہے۔ یہ ہم روزانہ دیکھتے ہیں۔ اول نفس یعنی من میں خیالات پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ان خیالات کے آنے پر آدمی کام کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور جسم کام کرنے لگتا ہے۔ پس اگر خیال ہی نہ پیدا ہو تو پھر کوئی فعل نہ واقع ہو۔ اسی طرح اگر انسان برے خیالات ہی نہ سوچے تو دنیا سے گناہ کا نام و نشان ہی مٹ جائے۔ معلوم ہوا کہ خیالات ہی سے سب کچھ ہوتا ہے لہذا سورا کو سمجھنے کے لیے خیال کی قوت کو سمجھنا ہوگا۔

حضرت عیسیٰ مسیح فرماتے ہیں: "جیسے تم سوچو گے ویسے ہی بن جاؤ گے"۔

یعنی اگر انسان برے خیالات سوچتا ہے تو ایک نہ ایک دن برائی میں ماہر ہو جائے گا۔ اسی طرح

گا۔ مذہب اسلام نے "انما الاعمال بالنیات"
کہا ہے۔ یعنی ہر شخص کا عمل اس کی نیت پر منحصر ہے۔
ہر مذہب کے بزرگ یہی بتاتے ہیں۔ اسلام کی ریاضت
اور عبادت۔ ہندوؤں کا یوگ۔ مغربی تہذیب کا
ہپناٹزم اور مسمریزم سب قوت خیال ہی پر منحصر
ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی شراب خانے یا برائی کی جگہ
جاتا ہے تو اس کے من میں بھی برائی کرنے کے خیالات
پیدا ہو جاتے ہیں برخلاف اس کے مقدس مقامات
مسجدوں گرجوں اور مندروں میں جانے سے خیالات
پاکیزہ ہو جاتے ہیں اور لوگوں میں اچھے اور نیک کام
کرنے کا شوق پیدا ہونے لگتا ہے۔ یہ تو سبھی محسوس
کرتے ہیں کہ ایسا ہوتا ہے۔ مگر کم لوگ یہ سوچتے ہیں کہ ایسا کیوں
ہوتا ہے؟ دراصل بات یہ ہے کہ انسان کے نفس
سے نکلے ہوئے خیالات ضایع نہیں ہوتے ایک
نہایت لطیف شکل میں کرۂ ہوائی میں موجود رہتے ہیں
اور جس طرح کہ ایک ہی طرح کی چیزیں مثلاً ایک ہی
طرح کے جانور ایک ہی طرح کے پرندے ایک
ہی طرح کے کیڑے مکوڑے ایک ساتھ رہنا چاہتے
ہیں اسی طرح ایک ہی طرح کے خیالات بھی ایک
جگہ سمٹ جاتے ہیں اور جب کوئی اسی طرح کا
خیال والا انسان ان کے قریب آتا ہے تو سارے
خیالات سمٹ کر اپنے ہم جنس کے پاس جمع ہو جاتے
ہیں۔ اس طرح برے خیالات والے آدمی کو برائی کرنے
[illegible]

قوت مل جاتی ہے۔ اور وہ برائی یا بھلائی
کرنے لگتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انسان
مقام پر پہنچتا ہے تو وہاں کے جمع شدہ
اس کے گرد اکٹھا ہو کر اسے نیکی کی طرف یا
لگتے ہیں۔ اس کے برخلاف بری جگہوں
خیالات انسان کو برائی کی طرف لے جاتے
ہر ایک شخص کی سیرت و طبیعت کے مطابق
چاروں طرف نیک یا بد خیالات کا جمگھٹا ر
ان سے ہمیشہ نیک آدمی نیکی کی طرف اور بد
کی طرف چلتا رہتا ہے۔ برائی کے کام قانو
کے خلاف ہوتے ہیں اس لیے برے خیالات
کے پاس جمع ہونا نفس کے لیے مضر ہوتا ہے
لفظوں میں نفس کو بیمار کر دیتا ہے۔ اس
خیالات کا پیدا ہونا ہی بیماری ہے اور اگر
نفس میں پیدا ہو گی تو یہ نسل در نسل چلتی ہے
کا نفس جس طرح کا مریض ہوتا ہے اولاد بھی
کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔

انجیل میں ایک دلچسپ قصہ لکھا
کہ کس طرح خیالات کا اثر ماں کے پیٹ پر
پڑتا ہے۔ ایک بار حضرت عیسیٰ مسیح نے سمندر
کنارے ایک رنگ برنگ کا کپڑا لگا دیا ج
کی بھیڑیں روزانہ پانی پیا کرتی تھیں۔ جب
بچے پیدا ہوئے تو سب کا رنگ اس رنگ
[illegible]

عادتوں کا اخلاق کا اثر بچوں پر ہوا کرتا ہے اور
بھی ان بیماریوں کے اثر میں مبتلا ہو جاتے ہیں جن
ان کے والدین ہوتے ہیں یعنی بُرے خیالات کو
ٹروں کی زبان میں سورا کہا گیا ہے۔ جہاں ان بُرے
لات کی کمی ہے۔ وہیں تندرستی ہے اور جہاں ان
یادتی ہے وہیں تندرستی کی کمی ہے۔ طرح طرح کی
یاں ہیں

آئیے ہم آپ کو ایک سادہ زندگی گزارنے
بھولے بھالے پہاڑوں اور غاروں میں رہتے
لوگوں سے ملائیں۔ جہاں تہذیب کا دیوتا تشریف
لایا۔ جہاں تندرستی کے اصولوں کی پرواہ نہیں
اتی، جہاں ہمارے جیسے دستر خوان نہیں چنے جاتے
پینے کے لیے عمدہ اور صاف کیا ہوا پانی بھی
ب ہوتا ہے تاہم چونکہ ان کے یہاں بُرے خیالات
ہے اس لیے ان کی زندگیاں ہم تہذیب یافتہ
کی زندگیوں سے کہیں زیادہ لمبی اور ان کی طاقت
ت ہم سے کہیں زیادہ بہتر ہوتی ہے۔ قدرتی طور
ہوتے ہیں۔ عمر طبعی گزارنے کے بعد قدرتی طور پر
تے ہیں۔ مگر تہذیب کی دنیا والے انسان باوجود
کی اعلیٰ ترقی کے اپنی زندگیوں کو پیچیدہ بنا کر
بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور اعلیٰ ترین
کی موجودگی میں وقت سے پہلے عمر طبعی کو پہنچے
نیا سے کوچ کر جاتے ہیں۔

(۳) لے آگر النساء، دنیا میں صحت ...

تندرست رہنا چاہتا ہے۔ تو اسے سورا سے بچنا چاہیے اور سورا سے بچنے کے لیے اپنے من کو بُرے خیالات سے پاک کرنا چاہیے۔ قانون قدرت کے مطابق سادی زندگی گزارنا چاہیے۔ جب تک ان بُرے خیالات کا خاتمہ نہ ہوگا انسانی نسل کو بیماریو سے مکمل شفا ملنا ناممکن ہے۔

دراصل سورا نہ خارش ہے نہ جذام بلکہ بُرے خیالات کا نام ہے جو گناہوں کا سرچشمہ ہوتا ہے جو بیماریوں کو پیچیدہ بنا کر تندرستی کے راستے سے ہٹا دیتا ہے۔ اسلام نے ٹھیک جسے شیطان کہا ہے ڈاکٹروں کی نظر میں وہی سورا ہے۔

بچوں کی کتابیں

پاک کہانیاں	اوّل	۱/۲۰
"	دوم	۱/۱۵
پرندوں کا ایکا		-/۳۰
پوری جو کڑھائی سے نکل بھاگی		-/۳۵
تانبیل خاں		-/۳۰
ترکوں کی کہانیاں		-/۵۵
جنگو کی بلی		-/۲۵
چغتائی کی ڈبیا		-/۴۰
چھوٹی لالٹین		-/۳۱

جناب احسان الحق



انوکھا انعام

(ایک مشہور اور پرانی کہانی ڈرامے کے روپ میں)

(مچھیرا آواز لگا کر بیچ رہا ہے)

مچھیرا:۔ مچھی والا۔ تازی مچھی والا ...... مچھی!

خریدار:۔ ارے او مچھی والے۔ ادھر آؤ۔

مچھیرا:۔ بولو بابو۔

خریدار:۔ سنگھاڑا مچھی ہے۔

مچھیرا:۔ پندرہ دن بعد تو کہیں جا کے مچھی پھنسی ہے اور تم پوچھتے ہو سنگھاڑا مچھی ہے۔ جو پھنسی ہے وہ بیچتے ہیں۔

خریدار:۔ اوہو، ہے ہ دیکھیں تو آج کون سی مچھی پھنسی ہے۔

مچھیرا:۔ ارے اس دفعہ تو بھگوان نے سن لی۔ کوئی قدرداں مل جائے تو قسمت کھل جائے۔

خریدار سیندھی ہوگی۔

مچھیرا:۔ سیندھی کا دادا ہے۔ یہ دیکھو بابو لاکھوں میں ایک ہوتی ہے۔ یہ دیکھو اس کی آنکھوں کے [illegible]

پاس دیکھو کیسا خوبصورت چکر ہے۔ ہیں کہ ساری جمنا میں ایسی صرف دو ہیں۔ اٹھا کر دیکھو ہاتھ سے پھسل جا[illegible]

خریدار:۔ بالکل تازی لگتی ہے۔ کتنے میں

مچھیرا:۔ میں ضرور دے دیتا لیکن بابو تم [illegible] کر پاؤ گے۔ کوئی شوقین رئیس ل[illegible] شاید وارے نیارے ہو جائیں۔

خریدار:۔ تب تو تم مہاراج کے پاس لے [illegible] سے زیادہ شوقین تو دنیا میں نہ [illegible] میری مانو۔ مانو گے؟ اسے [illegible] دو۔ کیا خبر تیر نشانے پر بیٹھ جا[illegible]

مچھیرا:۔ تم نے بات بڑے پتے کی بتائی۔ ابھی جاتا ہوں۔

خریدار:۔ لیکن سنو مچھی والے۔ راجہ کا د[illegible] پاجی آدمی ہے۔ وہ تمہیں اندر نہ [illegible] [illegible] گا۔

مچھیرا:۔ جانے کیسے نہیں دے گا۔ میں جب اسے
بتاؤں گا کہ میرے گھر میں فاقے ہو رہے ہیں۔
بیوی بچے بھوکے بیٹھے ہیں تو اسے ترس
آجائے گا۔

ریدار:۔ ارے وہ بہت بڑا بے ایمان ہے۔

یرا:۔ مجھ سے کیا بے ایمانی کرے گا۔ میرے
پاس کیا رکھا ہے۔ مجھے پورا یقین ہے۔ وہ
مجھ غریب کو جانے دے گا۔ بابو ایک بات
بتاؤں۔ آدمی پر بھروسا رکھو۔

یدار: قسمت آزما کر دیکھ لو۔

یرا:۔ میں ضرور دیکھوں گا۔ دربان آخر انسان
ہو گا۔

مچھی۔ تازی مچھی والا ــــ

یرا:۔ دربان بابو مجھے مہاراج سے ملنا ہے۔

ان:۔ (قہقہہ مار کر ہنستا ہے) بہت خوب بہت
خوب۔ راجہ سے ملنا ہے (طنزاً) یہ پوچھنے
کی ضرورت نہیں کہ راجہ کو بھی آپ سے ملنا
ہے یا نہیں ....

ابے دماغ خراب ہو گیا ہے! بھاگ جا یہاں سے

مرا:۔ دربان بابو۔ میں غریب مچھیرا ہوں۔ پندرہ
دن سے فاقے ہو رہے ہیں۔

ن:۔ (ہنستا ہے) تو اپنے گھر فاقے کھاتا ہے۔
یہاں کوڑے کھانا پڑیں گے

کے پاس تاج ہے۔ دم پر چکر ہے۔

دربان:۔ مچھلی کی دم پر چکر ہو گا۔ لیکن تو بالکل گھن
چکر ہے۔ اب سیدھی طرح بھاگ جاؤ ورنہ
چمڑی ادھیڑ دوں گا۔

مچھیرا:۔ بابو تیرے بچے جئیں۔

دربان:۔ بچوں کو جینے کے لیے تیری دعا کی ضرورت
نہیں ہے۔ تیری جیب کی ضرورت ہے۔
کچھ ہے تیری جیب میں۔

مچھیرا:۔ دربان بابو۔ اگر جیب میں کچھ ہوتا تو میں
یہاں کیوں آتا۔

دربان:۔ (چلا کر) تو یہاں کیوں آیا؟ میں بھی تو یہی
پوچھتا ہوں۔

مچھیرا:۔ میں نے سوچا کہ مہاراج نے ایسی مچھی کی بات
کہانیوں میں سنی ہو گی۔ ہو سکتا ہے انھیں
کھانے کا موقع نہ ملا ہو۔ میں نے سوچا
مہاراج خوش ہو گئے تو انعام مل جائے گا۔

دربان:۔ (سختی سے) اس گیٹ کے بھیتر وہی جاتا
ہے جس کے پاس سلامی دینے کی سکت
ہوتی ہے۔

مچھیرا:۔ لیکن بابو میرے پاس تو ایک پیسہ نہیں
ہے۔ میں تمھیں کہاں سے دوں گا۔ میرے
پاس تو فقط یہ مچھی ہے جس کی دم پر....

دربان:۔ (چلا کر) مچھی کی دم کے بچے جاتا ہے

مچھیرا:۔ دیا کرو بابو۔
دربان:۔ دیا کروں!!! (سوچتے ہوئے) ہاں ہو سکتی ہے۔ ادھر آؤ۔ صرف ایک صورت ہے دیا کی۔
مچھیرا:۔ بولو بابو۔ ہاں ہاں۔ بولو مجھے منظور ہے۔
دربان:۔ دیا کی صورت صرف یہ ہے کہ مہاراج تم کو جو بھی انعام دیں اس کا آدھا حصّہ میرا ہوا۔
مچھیرا:۔ (تعجب سے) آدھا حصّہ تمھارا ہوگا۔
دربان:۔ ہاں آدھا حصّہ میرا ہوگا۔
مچھیرا:۔ بابو تمھاری مرضی۔ میرے لیے تو آدھا بھی بہت ہے مجھے منظور ہے۔ میں انعام کا آدھا حصّہ تم کو دے دوں گا۔
اعلان:۔ "با ادب با ملاحظہ ہوشیار۔ شیر دستر خوان مہاراجہ پکوان، والئی نمکدان تشریف لاتے ہیں۔"
(ہلکے ہلکے گھنگروؤں کی آواز کے ساتھ قدموں کی چاپ۔ مہاراج بے تکلفی سے باتیں کرتے قہقہے لگاتے داخل ہوتے ہیں)
مہاراجہ:۔ (ہنستے ہوئے) ارے بھئی ایک دفعہ تو میں نے مہاراجہ کفگیر کو ہرانے کے لیے ہاتھیوں کی فوج میدان میں اتار دی تھی کیا گھمسان کا مقابلہ ہوا تھا۔ اور جانتے

منتری:۔ اگر جان کی امان پاؤں تو پوچھ کس لیے ہوا تھا؟"
مہاراجہ:۔ نہیں سمجھے (ہنستا ہے) نہیں۔ مہاراجہ کفگیر سے ایک دفعہ میں نے کہ اپنا باورچی مجھے دے دو۔ اس نہیں دیا۔ میں نے لڑ کر لے لیا۔
منتری:۔ باورچی کی خاطر جنگ کرنا پڑی
مہاراجہ:۔ معمولی بات ہے معمولی بات۔ جانے وہ چاول کس طرح پکاتا ایک ایک چاول پھول کر گاؤ تک برابر ہو جاتا تھا۔
منتری:۔ گاؤ تکیے کے برابر۔
مہاراجہ:۔ ہاں ہاں بھئی یہی تو اس کا
منتری:۔ حضور کھانے کا شوق ہو تو آ ہو۔ جان کاری ہو تو آپ کی طر
مہاراجہ:۔ اب تم ہی دیکھو نا۔ آدمی دماغ زندہ رہ سکتا ہے لیکن کھانے رہ سکتا۔ اسی لیے میں نے سوچا پیچھے کون بھاگے۔ ساری زندگی کے پیچھے تج دی۔ شوقین لوگوں ہوں (ہنستا ہے) خود بھی جی بھر کے کھاتا ہوں۔
منتری:۔ جبھی تو مہاراج کی ٹیکتی ہوئی

جائیں۔

راجہ :۔ (ہنستا ہے) کیا بات کہی ہے منتری تم نے۔ اچھا یہ بتاؤ مہمان سب آگئے یا نہیں۔

منتری :۔ جی ہاں سرکار، کھانا لگ چکا ہے۔ آپ نوالہ توڑیے مہمان تو دسترخوان پر ٹوٹنے کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔

راجہ :۔ (ہنستا ہے) بھئی ہمیں بڑی ہی خوشی ہوتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ کوئی دبا کے کھا رہا ہے (ہنستا ہے)

منتری :۔ کیوں نہیں، کیوں نہیں۔

راجہ :۔ آج ہمارے پاس ایک مچھیرا آیا تھا۔ اس نے ایک عجیب و غریب مچھلی ماری ہے۔ جس کے سر پر آنکھوں کے پاس تاج بنا ہوا ہے اور دم پر چکر ہے۔ کہتے ہیں کہ ساری جمنا میں ایسی صرف دو مچھلیاں ہیں۔

منتری :۔ اس مچھلی کا ذکر میں نے کتابوں میں دیکھا ہے۔

راجہ :۔ ضرور دیکھا ہوگا۔ میں نے اس مچھیرے کو روک لیا ہے۔ اگر مچھلی واقعی ویسی ہی ہوئی جیسا وہ کہتا ہے تو ہم اس کو مالا مال کر دیں گے۔

موسیقی

(تین چار آدمی ایک کے بعد ایک، ڈکاریں لیتے ہیں)

مہاراجہ :۔ (ڈکار لے کر) ایسا لگتا ہے جیسے آج پہلی دفعہ مچھلی کھانے کو ملی ہو۔ کیا لاجواب مچھلی تھی۔

منتری :۔ دودھ کی طرح سفید، اپنی خوشبو میں بسی ہوئی۔ خوردبین لے کر کانٹا ڈھونڈو تو نہ ملے۔

ایک مہمان :۔ حضور جانے کتنے درباروں میں کھانے کا موقع ملا ہے۔ لیکن ایسی مچھلی نہ کبھی ملی تھی اور شاید نہ کبھی ملے گی۔

مہاراجہ :۔ بلاؤ اس مچھیرے کو۔ ہم اس سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔

اعلان :۔ "میر دسترخوان۔ مہاراجہ پکوان۔ والیِ نمک دان کی اجازت سے کلو مچھیرے کو حاضر کیا جائے"

مچھیرا :۔ سرکار کی جے ہو۔

مہاراجہ :۔ کلو مچھیرے، مچھلیوں میں ایک عجیب طرح کی بو ہوتی ہے لیکن تمہاری مچھلی میں زعفران کی خوشبو تھی۔ میرا باورچی قسم کھا کر کہتا ہے کہ اس نے زعفران، کیوڑا یا عطر کو چھوا تک نہیں ہے۔

مچھیرا :۔ حضور میں نے سنا ہے کہ یہ مچھلی صرف موتی کھاتی ہے۔ اسی لیے یہ ہمیشہ بہاؤ کے رخ پر تیرتی ہے۔

منتری :۔ صرف موتی کھاتی ہے؟

مہاراجہ:۔ ضرور کھاتی ہوگی۔ اس کی خوش بو بتاتی
ہے۔ کلو مچھیرے تم نے ہم سب کی طبیعت خوش
کردی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ہم بھی تمھاری
طبیعت خوش کردیں۔ بولو کیا مانگتے ہو۔
مچھیرا:۔ مہاراج میں تو آپ کی رعایا ہوں۔ مجھے کسی
چیز کی ضرورت نہیں ہے۔
مہاراجہ:۔ لیکن ہم کو ضرورت ہے تمھیں انعام دینے
کی۔ منتری تم اس مچھیرے کو ہمارے خزانے
سے موتیوں کا ہار نذر کردو۔ اس کی مچھلی موتی
کھاتی تھی۔ اور ہاں یہ ہار ایک دوشالہ پر
رکھ کر دیا جائے۔
مچھیرا:۔ (گھبرا کر) نہیں نہیں حضور۔ مجھے نہیں
چاہیے۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے حضور۔
مہاراجہ:۔ کیوں؟ کیا تم اس کو کم سمجھتے ہو۔
مچھیرا:۔ جہاں پناہ ایسا نہ کہیے۔ یہ تو میری اوقات
سے بہت زیادہ ہے۔
مہاراجہ:۔ ہم تمھاری اوقات بڑھادیں گے۔
بولو تمھیں کیا چاہیے۔
مچھیرا:۔ جان کی امان پاؤں تو کہوں۔
مہاراجہ:۔ ہاں کہو۔
مچھیرا:۔ حضور میرے بیس کوڑے لگائے جائیں۔
منتری:۔ (تعجب سے) بیس کوڑے لگائے جائیں۔
تم اس کو انعام کہتے ہو۔ بے وقوف کہیں کا۔
مچھیرا:۔ حضور میرے بیس کوڑے لگائے جائیں
بھرے دربار میں لگائے جائیں۔
مہاراجہ:۔ تم پاگل ہوگئے ہو۔
مچھیرا:۔ مہاراج میں پاگل بالکل نہیں ہو
میں غریب آدمی ہوں۔ آپ بڑے د
مہاراج آپ مجھ غریب کی خواہش
کردیں گے۔
مہاراجہ:۔ منتری تمھارا کیا خیال ہے۔
منتری:۔ مہاراج کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ لیکن آپ
کی مرضی پوچھی تھی۔ اس لیے اب پو
چاہیے۔ آہستہ آہستہ لگائے جائ
مہاراجہ:۔ تو بلاؤ ہمارے سپاہی کو۔
منتری:۔ (تالی بجاتا ہے) دیکھو یہ کوڑا اٹھا
اس مچھیرے کے بیس کوڑے گن کر
لیکن آہستہ آہستہ چوٹ نہ آنے پا
کوڑوں کی آواز اور ساتھ ا
دو۔۔ تین۔
مچھیرا:۔ (بیچ بیچ میں) ٹھیک ہے سرکار با
ہے۔ دس کوڑوں کے بعد مچھیرا کہتا
مچھیرا:۔ بس سرکار، بس مہاراجہ۔
مہاراجہ:۔ لیکن ابھی تو صرف دس کوڑے
مچھیرا:۔ حضور باقی دس کوڑے آپ کے د
لگیں گے۔
مہاراجہ:۔ دربان کے؟ دربان کے کیوں لگیں
مچھیرا:۔ سرکار سرکار۔

مہاراجہ:۔ (چلاکر) ہم جاننا چاہتے ہیں۔
مچھیرا:۔ سرکار وہ مجھے آپ سے ملنے نہیں دیتا تھا۔
مہاراجہ:۔ آخر کس لیے؟
مچھیرا:۔ سرکار وہ رشوت چاہتا تھا اور میرے پاس پیسے نہیں تھے طے یہ ہوا تھا کہ مجھے جو بھی انعام ملے گا۔ اس کا آدھا حصہ وہ لے لے گا۔
مہاراجہ:۔ (چلاکر) منتری: ہمارے راج میں یہ اندھیر۔ دربان کو بلاؤ۔ مچھیرے اب تم موتیوں کے دو ہاروں کے حق دار ہو گئے ہو جو تم کو ملیں گے (چلاکر) کہاں ہے دربان۔
دربان:۔ جہاں پناہ۔
مہاراجہ:۔ تم نے مچھیرے سے آدھے انعام کا سودا کیا تھا۔ بولو۔
دربان:۔ جی نہیں۔ جی جی۔
مہاراجہ:۔ (چلاکر) بولو کیا تھا۔
دربان:۔ جی ہاں سرکار جی ہاں کیا تھا۔
مہاراجہ:۔ یہ غریب آدمی ہے ہو سکتا ہے کہ اس کی نیت خراب ہو جائے اور یہ بے ایمانی کر جائے تم سے۔ اس لیے ہم اپنے سامنے تم کو انعام کا آدھا حصہ دلوانا چاہتے ہیں۔
سپاہی۔ اور آج ہم تمہارے بازوں کی قوت بھی دیکھنا چاہتے ہیں۔
سپاہی:۔ آپ خوش ہو جائیں گے سرکار۔
سڑاپ۔ ایک۔ دو۔ تین۔
دربان کے چلانے کی آوازیں۔

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو دہلی)

بچوں کے ناول

بے انتہا دلچسپ اور مزیدار

ان ناولوں کی خوبی یہ بھی ہے کہ ان میں سے کسی میں بھی کوئی مخرب اخلاق کہانی نہیں ملے گی۔

تیس مار خاں کے کارنامے	م۔ ندیم	۱/۵۰
تین اناڑی	عصمت چغتائی	۱/۴۰
جن حسن عبدالرحمٰن (اول)	ترجمہ قرۃ العین حیدر	۲/-
جن حسن عبدالرحمٰن (دوم)	" " "	۲/-
خیالی پلاؤ	ترجمہ قرۃ العین حیدر	۱/۷۵
ڈاکو کی گرفتاری	ابرار محسن	-/۵۰
ستاروں کی سیر	کرشن چندر	۱/۷۵
کوے دادا	مجیب احمد خاں	۱/۷۵

ناشر

جناب سید منیر الحسن منیر



دنیا

یہ نظم مدرسہ ابتدائی جامعہ کے سالانہ جلسے میں پڑھی گئی اور بہت پسند کی گئی۔

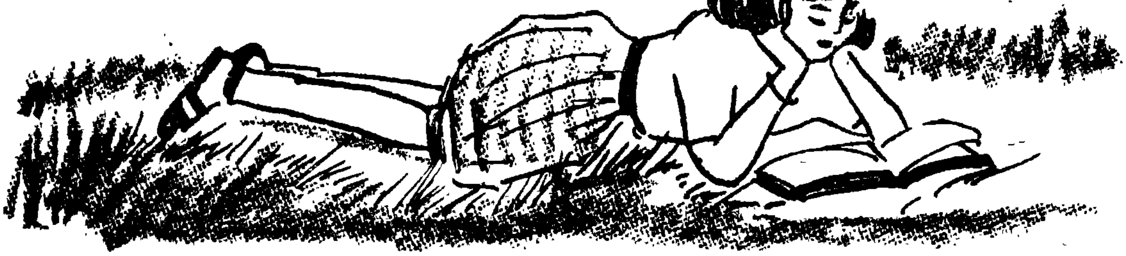
سبھی سچائی کمالات سے بھری دنیا (۱) ہنروروں کے خیالات سے بھری دنیا
نمونے اس میں ملیں گے تمھیں تمدن کے
نئے زمانے کے پیغام سے بھری دنیا (۲) نئے خیال نئے جام سے بھری دنیا
عجائبات دکھائے گی تم کو چن چن کے

شمیم گل سے ہے شاداب یہ بھری دنیا (۳) جہانِ حسن کا اک خواب یہ بھری دنیا
خزانے خالقِ قدرت کے ہیں جدھر دیکھو
نگارخانہ و کمخواب یہ بھری دنیا (۴) فنون و علم کا اک باب یہ بھری دنیا
نمونے صنعت و حرفت کے ہیں جدھر دیکھو

منیر رونق تصویر حال ہے دنیا (۵) نہ سمجھے اس کے لیے قیل و قال ہے دنیا
بساط اپنی زمانے میں ہے بچھائے ہوئے
چمک دمک میں ہے یہ ماہ و مشتری دنیا (۶) جہاں میں صنعت قدرت کی ہے بھری دنیا

جناب سلیم تمنائی

میں دن بھر کیا کرتی ہوں



میں دن بھر کیا کرتی ہوں ؟ یعنی ہم غوثیہ بانو صاحبہ دن بھر کیا کرتے ہیں یا کیا کرتی ہیں تو بھائی جان کچھ نہ کچھ تو ہم کرتے ضرور ہیں ۔ بھلا ہم بچوں سے نچلا کہاں بیٹھا جاتا ہے ۔ ہے نا سچی بات ؟ لیجیے آپ بھی کیا یاد کریں گے۔ ہم آپ کے سامنے تفصیل سے اپنے دن بھر کے کام کی فہرست پیش کیے دیتے ہیں ۔

ہاں تو لیجیے صبح ہوگئی، صبح کیا ہوئی ایک مصیبت ساتھ لائی ۔ سورج نکلنے سے کہیں پہلے نانی اماں جاگیں اور چیخنا شروع کیا: "کب تک یوں گھوڑے بیچ کر پڑی سوتی رہو گی"!

جی چاہتا ہے کہہ دوں کہ گھوڑے تو گھوڑے گدھے بھی نہیں بیچے ۔ مگر کچھ کہنے سے پہلے ہی نانی اماں نے بم پھینکا "اٹھو!" اور ہم نے بھائی جان کے ترنم کی نقل بنائی ع اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگا دو ۔ لیکن نانی اماں برابر کہتی رہیں "منھ ہاتھ دھولو، اپنا بدن سنبھالو ۔ کم بخت نماز بھی نہیں پڑھتی ۔ ہم جب سے وضو کرکے نماز پڑھتے تھے ۔

"خدا جھوٹ نہ بلوائے نانی اماں! برف جیسے پانی سے غسل کرکے نماز پڑھتی تھیں آپ"! ہم اپنی رضائی کے اندر ہی اندر بڑبڑائے ۔ لیکن نانی اماں کی باتوں کا انجن چھک چھک آگے ہی آگے بڑھ رہا تھا "تم سب کی سب دوزخ میں جلو گی، ضرور جلو گی"۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کیا جائے، کم بخت نیند صبح صبح ہی تو خوب گہری ہوتی ہے بڑی میٹھی ہوتی ہے سچ پوچھیے تو نانی اماں کے ایٹم بموں کے بیچ شاید ہی کوئی سو سکتا ہے، البتہ رو سکتا ہے ۔ میں کوشش تو کرتی ہوں کہ کسی طرح یہ باتیں نہ سنوں ۔ وہ جیسے جیسے تقریر کرنا شروع کرتی ہیں میں رضائی اوڑھ لیتی ہوں ۔ مگر نانی اماں کی چیخیں ہیں کہ رضائی سے چھنتی ہوئی کانوں کو برما دیتی ہیں بس غصہ ہی تو آتا ہے ۔ پر آپ جانیں "فقیر کا غصہ فقیر کی جھولی پر" خاموش رہ جاتی ہوں ۔ کروں ہم کیا آخر ۔ مجھ جیسے شریف کے

امی کی مار سے بھی تو ڈر لگتا ہے جی تو پھر کیا عرض کروں۔ بڑی مشکل سے بستر سے اٹھ دو منٹ منہ پھلائے بیٹھی رہتی ہوں۔ پھر نانی اماں کی پلک جھپکنے سے پیشتر ہی بستر میں گھس جاتی ہوں اور اس وقت تک نہیں اٹھتی جب تک نانی اماں کی صلواتوں کا سلسلہ پھر سے نہ شروع ہو جائے، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ضد بڑھ جاتی ہے اور ہم بستر سے اٹھتے ہی نہیں۔ لمبے لمبے خراٹے بھرتے ہیں۔ جیسے ہم گہری نیند سو رہے ہوں، گھوڑے بیچ کر مردوں سے بازی، اور نانی اماں سے شرط لگا کر۔ نانی اماں کچھ بنتا نہ دیکھ کر امی کی مدد لیتی ہیں اور یہاں ہمارے خراٹے طوفان میل سے مال گاڑی بن جاتے ہیں۔ امی کا تھپڑ گھر بھر میں مشہور تھا۔ ہماری بال ہٹ مشہور تھی لیکن ہم ڈر سے کانپ بھی رہے تھے۔

"غوثیہ! چلو اٹھو، سورج نکلا چاہتا ہے" امی کو ہم کوئی جواب نہیں دیتے، ارادہ ہوتا ہے کہ کہہ دیں کہ سورج نکلا چاہتا ہے تو نکلنے دیجیے۔ ہاتھ سے نکلا چاہتا ہے تو مٹھی میں پکڑ لیجیے، لیکن ہم کہہ نہیں پاتے اور ہماری رضائی پاؤں سے دور جا پڑتی ہے اور کان خدا جانے کب امی کی لمبی لمبی انگلیوں کی گرفت میں آ جاتے ہیں۔

اب ہم منہ بسور کر "امی! آہ!" کرتے ہیں۔

"یا اللہ! ہم نے اللہ میاں کو پکارا اور امی سے رحم کی درخواست کی، اس طرح کی درخواست "امی پیٹ میں بڑا درد ہے۔ رات بھر سو نہ سکی یعنی جاگتی رہی۔"

میں جان آئی۔

"ارے تو تو رات میں سو گئی تھی" امی بولیں

"نہیں امی!" ہم نے دبی زبان میں کہا "رات نیند بالکل نہیں آئی۔ خیال ہوا کہ آپ کو جگاؤں، آپ تو دن بھر کے کام سے تھکی ہوئی سوتی ہیں، اس لیے آپ کو تکلیف دینا مناسب نہ سمجھا"

امی پر یہ جادو چل گیا "منہ ہاتھ دھو کر کھا لے پھر کچھ دیر سو کر اٹھنا"

ہم نے فوراً ہاتھ منہ دھویا اور بستر پر تشریف لائے۔ رضائی اوڑھتے ہوئے ہم نے غیر معمولی خوشی محسوس کی اور رضائی میں ایک چھوٹی موٹی کھڑکی بنا کر نانی اماں کو دیکھا۔ وہ پان چبا رہی تھیں۔ ہم نے نانی اماں سے عرض کریں کہ نانی اماں سلام۔ ہم اور تم ہار ہیں۔ مگر ہم کہہ نہ سکے۔ ورنہ سلام کے بدلے ہماری سلامتی خطرے میں پڑ جاتی اور امی کے ہاتھ دن کو تارے دیکھنے نصیب ہو جاتے۔

غرض اس قسم کی چور بیماریوں کی ضرورت کبھی پڑ جاتی تھی۔ ذرا ملاحظہ ہو۔ ریڈیو پر خبریں ناپسند اور فلمی گانے پسند ہیں یا من پسند ہیں اور گھر میں ا پر اپنے من پسند گانے اسی وقت شروع ہوتے ہم پلس بی ہول سکیورنے ( ) کے فار پر ذہن لڑا رہے ہوں یا مدرسے کا کوئی اور کر رہے ہوں۔

بڑے انہماک سے سنتے ہیں ڈاکٹر ہماری موجودگی میں خبریں
اور ہمارے بیٹھ پیچھے گانے اور ہمیں ڈانٹتے ہیں کہ
جاؤ مدرسہ کا کام کرو۔ یا مدرسہ کا وقت "نکل جانے"
کی بات ہوتی۔

کبھی کبھی اسکول جانے کو جی نہ چاہتا۔ اور
ماغ کو فوراً بیمار بننے کی سوجھتی۔ اتنے ہماری سہیلی آجاتی
ور کہتی "کہ بہن ہم بھی آپ ہی کی کشتی میں سوار ہیں ہم مسکرا
لر کہتے۔ چلو اچھا ہوا۔ ایک سے دو بھلے۔ لیکن ہم نیک
بیاں جو ٹھہریں اس لیے کوئی نہ کوئی ترکیب یا بہانہ
ڈھونڈتے رہتے ہیں مثلاً ایک ترکیب سوچی ہم نے سہیلی سے
مایا " ہم کاغذ کی پرچیوں پر کوئی ہندسہ او صفر
کھ دیتے ہیں۔ کسی ڈبے میں ڈالو اور ہلاؤ آنکھ بند کر
ے ایک پرچی اُٹھائی جائے۔ ہندسہ والی پرچی اٹھائی
مدرسہ ہر حال میں جانا ضروری اور لازمی۔ اگر قسمت
ے صفر والی پرچی نکلی تو اسکول کی چھٹی! ہم جانے
ان جانے ایک بات کا خیال ضرور رکھتے کسی طرح
رسہ نہ لکھا جائے یا صفر کی تعداد زیادہ ہو۔ لیجیے
ے کام سے نپٹ گئے۔

مگر امی سے خلاصی پانا پھر بھی کچھ آسان نہیں
ا۔ بہت دشوار تھا۔ پہلے بیماروں کی صورت بنائی
ٹ میں جھوٹ موٹ کا ایسا درد شروع ہوا کہ کم ہی
ر ہوتا۔ اور اسکول کے وقت گزرنے تک برابر
نا ہے۔ اب ہم امی سے برابر کہہ رہے ہیں کہ اسکول
برابر لگا ہوا ہے کہ کہیں امی ہاں نہ کر دیں۔ ہاں بھی کر دیں
تو کیا ہوا۔ درد پھر سے اٹھے گا اور امی مامتا سے مجبور
ہو کر جانے نہ دیں گی اسکول۔ البتہ ایک اور ڈر اپنی جگہ
تھا کہ امی کہیں انجکشن اور کڑوی دوا کی بات نہ کریں۔

بی سہیلی ہماری اداکاری یا کمال پر اپنی شہادت
کی انگلی بتیس دانتوں میں دبائے ہوئے ہیں: "کیوں
بہن میرا کیا ہو گا؟" سہیلی نے دبی زبان سے پوچھا اور
ہم نے کامیابی کے غرور میں فرمایا "تمھارا؟ جہنم میں جاؤ۔"

" اگر خالہ جان کے سامنے سارا بھانڈا پھوڑ
دوں تو کیسا رہے؟" سہیلی نے ہماری دکھتی رگ پر
انگلی رکھی اور ہم تڑپ کر بولے "نا نا پیاری تم کسی طرح
الٹی کر دو۔ گھر جاؤ بیمار پڑ جاؤ۔" چلیے وہ بھی کامیاب
فرمائیے کیسی رہی ترکیب؟ توبہ! میرے مذاق کو آپ
نے سچ سمجھ لیا؟ میں تو سچ مچ ہزار فی صدی مذاق کر رہی
تھی۔ امی ریڈیو سن رہی ہیں نا، ریڈیو بھیا؟ پھر یہ باتیں
ہر روز تھوڑی ہوا کریں گی، بس کبھی کبھی۔ ورنہ ہوتا یہ
ہے کہ صبح اٹھتی ہوں، وضو کر کے قضا نماز پڑھتی ہوں۔
صبح سویرے اٹھنا بس کا روگ نہیں۔ اللہ میاں معاف
ہی کر دیں گے۔ کیوں کہ امی کہتی ہیں کہ ہمارے اللہ میاں
ستر ماؤں کی محبت رکھتے ہیں۔ پھر میں جناب ناشتے یا
چھوٹی حاضری میں مشغول ہو جاتی ہوں۔ تیر سے کچھ زیادہ
ہی کھاتی ہوں۔ کھیل کود میں غذا جلد ہضم ہو جاتی ہے تو
میں کیا کروں۔ لیکن نانی اماں کے اتنی بات سمجھ میں نہیں

ہیں۔ یہ سن کر سچ جانیے موڈ خراب ہو جاتا ہے۔ خدا جانے کیا بات ہے دکھ اور غصّے میں دو لقمے زیادہ ہی کھاتی ہوں۔ شاید یہ میں نہیں کھاتی غم اور غصّہ دونوں مل جل کر اور بانٹ کر کھا جاتے ہیں۔ اگر اس میں نانی اماں کا حصّہ بھی بھولے سے ان دونوں کے حصّے میں چلا جائے تو میں کیا کروں۔

نانی اماں ریڈیو سن رہی ہیں اور وہ مجھ سے بہت بہت پیار کرتی ہیں۔

ہاں تو اس کام سے فراغت پا کر اسکول کے سبق پڑھنے پڑتے ہیں ۔استانیاں جنھیں ہم باجی یا آپا کہتے ہیں۔ ڈھیر سا کام دیتی ہیں۔ خود کریں تو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو۔ جی جل ہی تو جاتا ہے۔ اللہ میاں سے ایک خواہش کرتی ہوں کہ ستر ماؤں والے خدا یہ ساری استانیاں میری شاگرد بن جائیں۔ پھر مزا آئے، اتنا لکھنے کو دوں اتنا لکھنے کو دوں کہ ہاتھ بے کار ہو جائیں۔ مگر ایسا نہیں ہوتا ۔بلکہ الٹے ہمیں اس طرح سزا ملتی ہے کہ یہ آپا باجی وغیرہ اپنے ننھے منوں کو لے آتی ہیں۔ بس انھیں اٹھائے پھرو۔ کم بخت کبھی کبھی تو منھ اور گلا پھاڑ پھاڑ کر اس طرح روتے ہیں کہ توبہ بھلی، جی چاہتا ہے کہ تھپڑ مار کر خاموش کر دوں۔ کبھی ہم چٹکی بھی لیتے ہیں۔ مگر استانی صاحبہ کے سامنے خاصا پیار کرنا پڑتا ہے اگر ہم نے آپا کا یہ کام نہیں کیا تو کسی بہانے ہمیں سزا ضرور ملے گی اور امی حضور کی خدمت میں شکایت بھی ہو گی اور امی تو ہر بات کو سچ سمجھ لیتی ہیں۔

' مدرسے یا کلاس میں میسوری بادام یعنی مو
پھلی کھانا منع ہے۔ مگر جتنا منع کیا جاتا ہے ا
کھانے کو جی چاہتا ہے۔ محترمہ خادمہ اس سے
اکٹھا کر پولس کا سپاہی بن جاتی ہیں، ڈراتی دھ
ہیں اور استانیوں سے شکایت کرنے کی دھمکی
اب ہم مجبوراً انھیں حصّہ دار بنا لیتے ہیں۔ بس پھر ا
لہجہ بدل جاتا ہے اور رزم بزم بن جاتا ہے۔ فرماتی
" مونگ پھلی کھانے سے صفرہ پیدا ہوتا ہے۔
ہے، بخار آتا ہے۔ اس لیے میں منع کرتی ہوں

ٹن ٹن گھنٹی بجی۔ خیر سے ہوم سویٹ
پیارے گھر پہنچے۔ کتابیں ایک طرف رکھیں یا
چائے پی اور کھیلنے میں مشغول ہو گئے۔ اب نانی
حکم احکام شروع ہوئے ذرا یہ لا دینا! وہ لا د
ہمارے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ بھلا کیسے رینگتی
سر کے بالوں میں دبکی سہمی بیٹھی تھی۔ اب ایٹم بم
جانے یہ بچے مدرسے میں کیسے نچلے بیٹھتے ہیں
کتابیں پھینک کھیلنے لگے۔ اس صدی کے
ہیں۔ مدرسہ سے کیا لوٹتی ہیں بی صاحبہ، بس
بن کر آتی ہیں۔

اب ہم نے آہستہ سے جواب دیا کہ پورے قرآن کے نہ سہی دو دو چار سورتوں کے ہیں ہم۔

اب ان کے کچھ کہنے سے پہلے، امی سے ہم ان کی بات مان لیتے ہیں تو بس جھٹ

لیتی ہیں ۔ ہزار سال جینے کی دعا مانگی جائے گی اور ہم دعاؤں کے بدلے صرف پیسے مانگ بیٹھتے ہیں ۔

اب دن گیا ۔ بی رات آئیں ۔ ریڈیو کی فرمائش تو یہ ہے کہ میں صرف اپنے دن بھر کے کام بتاؤں ۔ لیکن میرے دن کے ساتھ "کچھ" رات بھی ہے، میں جب تک باگوں ۔ اس کا شمار دن ہی میں ہوگا ۔ ہاں تو جیسے ہی ھڑی نے رات کے سات بجائے ہمارے ہاتھ کتاب ا گئی ۔ پڑھنے کو جی نہیں چاہتا اور اس میں ننگا رنگ وب صورت تصویریں بھی نہیں ہیں ۔ بھدی تصویریں ی چھپائی ۔ اونٹ کی کوئی کل سیدھی نہیں، لیکن ہاتھ سے کتاب چھوٹی کہ امی کی آنکھوں نے انگارے برسائے تاب ہاتھ میں، دماغ کھیل میں، کھاتے میں ۔ امی کے روں کی چاپ جیسے ہی سنی شریف بچوں کی طرح زور رسے پڑھنا شروع کر دیا "سلطان ٹیپو ہندوستان پہلے حکمراں تھے جنھوں نے آزادی کی خاطر لڑتے لڑتے ن دے دی"

اِدھر امی باورچی خانے میں ہوئیں کہ بس کتاب ھ سے چھوٹی اور چھوٹے بھیا سے پوچھا: "کہو کیا حال منو میاں اسبق بھی یاد کیا؟ ہاں میں جانتی ہوں کہ میرے بھائی ہو کہو بھوک تو نہیں لگی ۔ ضرور لگی ۔ امی منو میاں کو بھوک لگی ہے؟ اب امی ایک دم "ابھی رات کے آٹھ بھی نہیں بجے اور ان لاٹ صاحب بھوک لگ گئی ۔ دوپہر کا کھانا اتنا جلدی ہضم ہو گیا؟"

کھاتے وقت اگر بھول سے انگڑائی لی تو کھانا میاں کتے کے پیٹ میں چلا گیا ۔ مگر کچھ نہیں پاتی ۔ معاملہ بگڑا اور مفت میں رسوا ہوتا دیکھ چھوٹا بھیا خاموش نہ رہا ۔ جھٹ سے گلا پھاڑ کہنے لگا ۔

"امی اصل میں بھوک چاند آپا کو لگی ہے، میرا نام جھوٹ موٹ لیا ہے"

اب ہمیں چپ لگ گئی ۔ اپنے چھوٹے بھیا کو منانے لگے اور اپنا غصہ گھڑی پر نکالا کہ کتنی سست رفتار ہے ۔ کم بخت ہمیشہ کی مریض ہے ۔ ہم نے کبھی اس کا علاج کیا تھا مگر امی کو پتہ چل گیا پھر ہمارے سات طبق روشن ہو گئے ۔

خیر جوں توں وقت گزرتا ہے ۔ کچھ کھایا اور پیا اور امی کی خاطر کچھ پڑھا بھی ۔ پھر سوتے ہوئے اللہ میاں سے بنتی کی رات شیطان کی آنت کی طرح لمبی ہو ۔ ہاتھی کی آنکھ نہ ہو ۔ مگر اللہ میاں ہم شریر بچوں کی تھوڑی سنتے ہیں ۔ بہت جلد صبح ہو گئی ۔ عجیب مذاق ہے اللہ میاں کا ۔ ہم بچوں کے ساتھ ۔ نہیں نہیں ۔ اللہ میاں تو بہت اچھے ہیں ۔ کم سے کم کل کی رات ضرور لمبی کر دیں گے ۔

میں جتنی خوشامد کرتی ہوں اللہ میاں کی، اتنی ہی راتیں چھوٹی ہوتی ہیں ۔ شاید انھیں خوشامد پسند نہیں ۔

جناب احمد محمود

آدابِ گفتگو

یوں نہ ہو کہ بعد میں خود اس پہ واویلا کرو   اس لیے کہنے سے پہلے بات کو تولا
منھ سے نکلی بات پھر واپس کبھی ہوتی نہیں   اس لیے کیوں دل کسی کا بات سے میلا

زخم بن جاتے ہیں جو الفاظ سے بھرتے نہیں   بات کڑوی یا کسیلی اس لیے کرتے نہ
گفتگو میں چاہئے منھ سے جھڑیں ہر وقت پھول   پیار کے کلمے امر ہوتے ہیں جو مرتے نہ

بول ہی امرت ہے بچو! بول ہی جادو بھی ہے   بول مصری کی ڈلی ہے، پھول کی خوشبو بھ
بول کڑوا گھونٹ بھی ہے، زہر بھی ہے قہر بھی   دیکھنے کی بات ہے یہ، بات پر قابو بھ

بات سچی موتیوں کے مول، جھوٹی بات خاک   اس لیے لازم ہے رکھو، گفتگو کو صاف،
یاوہ گوئی، بدزبانی، تلخ گفتاری غلط!   یہ وہ طرزِ گفتگو ہے جو کٹا دیتی ہے نا

اِن سے کچھ اور اُن سے کچھ کہہ کے لڑا دینا غلط   پیار کے رشتے پہ یوں قینچی چلا دینہ
بات منھ سے اور کوئی دل میں کوئی اور بات

جناب غلام یزدانی



شبنم یا سچے موتی



اپنے ابا میاں یا دادا جان سے کہیں کہہ مت بیٹھنا مگر یہ بات بالکل سچی ہے کہ اتنی چھوٹی سی عمر میں جتنی باتیں تم جانتے ہو تمھارے دادا جان اور شاید ابا میاں بھی نہ جانتے ہوں۔ چاند تارے کیا ہیں ہم سے کتنی دور ہیں، موسم کیسے بدلتے ہیں، دن رات کیوں چھوٹے بڑے ہوتے ہیں، مینہ کیسے برستا ہے، بجلی کیوں کڑکتی ہے، دھنک کیا ہے، شفق کیسے بنتی ہے اور ایسے ہی بیسیوں سوال ہیں جن کا جواب تمھارے لیے کوئی مشکل نہیں مگر دنیا کے بڑے بڑے عقل مند آدمیوں نے ان میں سے ایک ایک سوال کو حل کرنے کے لیے برسوں سوچا ہے غور کیا ہے۔ بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو دن رات ہمارے سامنے رہتی ہیں اور دیکھنے میں بہت معمولی اور آسان نظر آتی ہیں۔ مگر تمھیں یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ایسی معمولی باتوں کو سمجھنے کے لیے بھی آدمی کو زیادہ سوچنے اور محنت کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ زمین سورج کے گرد پھرتی ہے اس بات کو اب کون ہے جو نہیں جانتا لیکن یہی بات جاننے

کچھ ایسا ہی حال شبنم کا ہے۔ دیکھنے کو یہ معمولی سی چیز ہے جو روزمرہ نظر آتی ہے مگر اس نے سینکڑوں برس تک دنیا کے بڑے بڑے سمجھ دار آدمیوں کو حیران کر رکھا تھا۔

صبح سویرے جب تم سیر کو جاتے ہو تو گھاس کی نرم نرم پتیوں پر جھلملاتے ہوئے پانی کے ننھے ننھے قطروں کو اپنے بوٹ سے اڑانے میں تمھیں بڑا مزا آتا ہے۔ پانی کے انھی ننھے ننھے چمک دار موتیوں کو شبنم یا اوس کہتے ہیں جب ٹہل کر تم واپس ہونے لگتے ہو اور سورج نکل آتا ہے تو سورج کی کرنوں میں یہ خوب صورت موتی طرح طرح کے رنگوں کے ساتھ اور بھی زیادہ چمکنے لگتے ہیں۔

کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ یہ شفاف چمک دار موتی کیا ہیں اور کہاں سے آتے ہیں۔ دنیا کے بڑے بڑے سائنس داں بھی برسوں حیران رہے کہ یہ موتی کہاں سے آتے ہیں اور شبنم کیسے بنتی ہے۔ آؤ آج ہم تمھیں اسی کے بارے میں کچھ مزید باتیں بتائیں۔

پرانے زمانے سے لوگ جانتے تھے کہ شبنم

ہوں اور تارے چمک رہے ہوں۔ اسی لیے بہت دنوں تک لوگوں کا یہ خیال رہا کہ شبنم تاروں سے آتی ہے۔ مگر تجربوں سے دیکھا گیا کہ شبنم ان چیزوں پہ زیادہ جمتی ہے جو زمین کی سطح کے قریب ہیں اور جو چیزیں زمین کی سطح سے اونچائی پر ہوتی ہیں ان پر شبنم کم جمتی ہے۔ اس لیے بعض سائنس داں یہ کہنے لگے کہ شبنم آسمان سے نہیں اُترتی بلکہ زمین سے نکلتی ہے۔

جن لوگوں میں چیزوں کو سمجھنے اور ان کی اصلیت جاننے کی لگن ہوتی ہے وہ برابر سوچتے اور غور کرتے رہتے ہیں اور اس وقت تک چین نہیں لیتے جب تک اصل بات کا پتہ نہیں لگا لیتے۔ تجربے ہوتے رہے اور بعد میں سائنس دانوں نے دیکھا کہ سطح زمین سے اونچائی پر بادل بھی ہو تو بھی بعض چیزوں پر شبنم زیادہ جمتی ہے اور بعض پر کم۔

اس سے یہ اندازہ ہوا کہ شبنم کے بننے کا تعلق ان چیزوں سے بھی ہے جن پر وہ جمتی ہے اور یہ سمجھنا غلط ہے کہ شبنم زمین میں سے نکلتی ہے کیونکہ اگر زمین میں سے نکلتی تو زمین پر جتنی چیزیں ہیں سب پر برابر برابر جمتی۔ اس طرح تجربے سے یہ بات معلوم ہوئی کہ اگر زمین کے کچھ حصّہ کو کسی چیز سے ڈھک دیا جائے تو ڈھکے ہوئے حصّے کے اندر بھی شبنم جمتی ہے۔ اس سے یہ خیال بھی غلط ثابت ہو گیا کہ شبنم آسمان سے گرتی ہے۔ جب شبنم نہ تو آسمان سے آتی ہے اور نہ زمین میں سے نکلتی ہے تو آخر یہ آتی کہاں سے ہے؟

ایک بات ہمیشہ یاد رکھو کہ سائنس اور علم دنیا میں ساری بڑی بڑی باتیں سوچنے اور سامنے چیزوں پر برابر غور کرتے رہنے سے معلوم ہوئی ہیں کو مشاہدہ کہتے ہیں۔

روزمرہ کے تجربے اور مشاہدے سے اور چیز جو معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ شبنم اس رات بنتی ہے جب سردی ہو اور ہوا نہ چلے۔ اس سے سائنس دانوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ شبنم اصل میں پانی کے ان سے بنتی ہے جو ہوا میں ہوتے ہیں۔ یہی بخارات سرد جم کر شبنم بن جاتے ہیں۔ برسوں کی سوچ بچار کے بارے میں یہ ایک ٹھیک ٹھیک بات معلوم ہو

اس کا تجربہ تم خود بھی بڑی آسانی سے ہو۔ ایک شیشے کے گلاس کو برف سے بھر کر رکھ تھوڑی دیر میں گلاس دھندلا ہو جائے گا اگر تم پر ہاتھ لگاؤ تو معلوم ہوگا کہ گلاس کی سطح پر بہت چھوٹے چھوٹے قطرے جم گئے ہیں۔ کیونکہ کی وجہ سے گلاس بہت ٹھنڈا ہو گیا تھا اس لیے کی ہوا میں پانی کے جو بخارات تھے وہ ٹھنڈے ہو پر جم گئے۔ بالکل اسی طرح رات کو ٹھنڈک کی وجہ کے بخارات جم کر شبنم بن جاتے ہیں۔

مگر سوال یہ تھا کہ رات کو یہ سردی کہاں آتی ہے۔ کیونکہ تم نے دیکھا ہوگا شبنم یا اوس گرم بھی گرتی ہے۔ یہاں پھر تجربے اور مشاہدے نے

کر کر

دیکھا گیا کہ پہاڑوں پر بہت کم شبنم جمتی ہے میدانوں میں سب سے زیادہ اور جس رات ہوا نہ اس رات اور بھی زیادہ شبنم بنتی ہے۔ ان ساری ں پر غور کرنے اور ان کو ملا کر سوچنے سے آخر بھید ل گیا۔

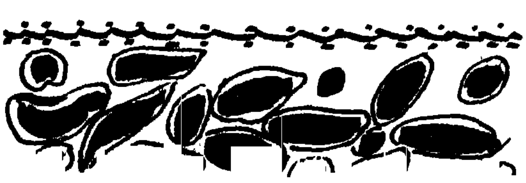
یہ تمھیں معلوم ہے کہ ہوا میں ہر وقت پانی کے رات موجود ہوتے ہیں۔ کیوں کہ دن بھر سورج کی گرمی تالابوں، ندی نالوں اور سمندر کا پانی بھاپ لراڑاتا رہتا ہے۔ رات ہوتے ہی زمین کی سطح سے دن کی حرارت خارج ہونے لگتی ہے۔ اس کی وجہ سے ن کے قریب کی ہوا ٹھنڈی ہونی شروع ہوتی ہے۔ ے جیسے رات گذرتی ہے زمین میں سے گرمی نکلتی جاتی ، اور زمین کی سطح پر ہوا ٹھنڈی ہوتی جاتی ہے۔ آخر اتنی ڈی ہو جاتی ہے کہ اس میں پانی کے جو بخارات ہوتے ، وہ جم کر شبنم بن جاتے ہیں۔ اگر آسمان پر بادل ئے ہوں تو وہ ایک غلاف کا کام کرتے ہیں اور زمین سے حرارت کو نکل کر اوپر فضا میں جانے نہیں دیتے کی وجہ سے زمین کی سطح ٹھنڈی نہیں ہونے پاتی اور شبنم ں بنتی۔

اور اسی طرح اگر رات کو ہوا چلتی رہے تو کی سطح سے ملی ہوئی ہوا کو اتنا ٹھنڈا ہونے کا موقع ملتا کہ اس کے بخارات جم جائیں کیوں کہ وہ برابر جگہ بدلتی رہتی ہے۔ اس لیے شبنم نہیں بنتی۔

رات کو زمین سے خارج ہونے والی حرارت ہوا میں اوپر اٹھتی رہتی ہے اس لیے زمین کی سطح کے مقابلے میں اونچے مقامات رات کو کم ٹھنڈے ہوتے ہیں اور اسی لیے پہاڑوں پر شبنم بہت کم بنتی ہے۔ کہر، پالا اور دھند بھی سب اسی طرح بنتے ہیں بس درجہ حرارت کا فرق ہوتا ہے۔

اللہ میاں نے ہر چیز سب سوچ سمجھ کر اور بڑی مصلحت سے بنائی ہے۔ شبنم صبح کے وقت باغوں اور میدانوں کو صرف خوبصورت ہی نہیں بناتی اور بھی کئی اچھے کام کرتی ہے۔ بنجر اور خشک میدانوں کو جہاں بارش نہیں ہوتی شبنم کی صورت میں کچھ نمی مل جاتی ہے جس سے وہاں کی جھاڑیاں گھاس پھوس اور کیڑے مکوڑے زندہ رہتے ہیں۔

پانی جب بھاپ بنتا ہے تو اس میں حرارت جذب ہوتی ہے۔ رات کو جب یہی بھاپ ٹھنڈی ہو کر شبنم بنتی ہے تو اس میں سے حرارت خارج ہوتی ہے۔ یہی وہ حرارت ہے جو ٹھنڈی راتوں میں پودوں اور سبزیوں کو ٹھٹھرنے سے بچاتی ہے۔ اگر شبنم نہ ہوتی تو رات کو سردی میں کوئی پودا زندہ نہ بچتا اور ہمیں کھانے کو نہ کوئی ترکاری ملتی نہ کوئی پھل اور اناج۔ کل صبح جب تم ٹہلنے نکلو اور گھاس پر بکھرے ہوئے یہ ننھے ننھے موتی تمھیں نظر آئیں تو ان کی قدر کرنا۔ یہ واقعی سچے موتیوں سے زیادہ قیمتی ہیں۔



جناب ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ، کلکتہ

دیس دیس کے نام

پیارے پیامیو ! ـــــ نئے سال کا سلام لو اور چند دلچسپ باتیں اس دنیا کے سلسلے کی جان لو۔ جب تم جغرافیہ کی کتابوں میں مختلف دیسوں کے نام پڑھتے ہو تو تمھارے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہوگی کہ تم ان ملکوں کو خود جاکر دیکھو۔ ـــــ ہے نا یہ بات ؟

جب تم بڑے ہوجاؤگے تو اس سرزمین پر جو مختلف دیس ہیں اور وہاں جو طرح طرح کے لوگ بستے ہیں ان کے بارے میں بہت سی اور باتیں معلوم کرلوگے۔ اپنی جغرافیہ کی کتابوں سے یہ باتیں تو اب بھی معلوم کرسکتے ہو کہ کس ملک میں کیا کیا پیدا ہوتا ہے، وہاں کون سے ندی نالے اور پہاڑ ہیں، وہاں کی آب وہوا کیسی ہے، وہاں کے لوگ کیا کھاتے پیتے ہیں، کیسے رہتے سہتے ہیں وغیرہ وغیرہ ـــــ اور جب تم بڑے ہوجاؤگے تو مجھے یقین ہے کہ تم میں سے کئی ہونہار دنیا بھر کا سفر کرکے اپنی آنکھوں سے ان ملکوں کو دیکھیں گے۔ وہاں کے لوگوں سے ملیں گے، ان سے بات چیت کریں گے، دوستی کریں گے دونوں ایک دوسرے کی بھلائی کے لیے کام کریں گے۔

آج اس مضمون میں میں تمھیں صرف چند ملکوں کے [illegible]

اور ان ملکوں کو جن کے نام کی کہانی اس مضمون میں کہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالو تو ـــــ

ابسے نیا :۔ ایک عربی زبان کے "لفظ" حبسہ پورتگیز زبان کا یہ لفظ نکلا ہے جس کے معنی ہیں ملی کے۔ پورتگیز لوگ جب اس ملک میں آئے تب انھو یہاں طرح طرح کے لوگ پائے اور اس لیے انھوا اس دیس کو "ابسے نیا" کہا ہے لیکن یہ بھی یاد ابسے نیا کے باشندے اپنی زبان میں اپنے وطن کو " کہتے ہیں۔

اٹلی :۔ لفظ "اٹلی" اطلاوی زبان کا لفظ نہیں۔ یونانی زبان کے لفظ "بھٹولی" یا "بھٹولیا" کی بگڑ شکل ہے جس کے معنی ہیں مویشی کے۔ اس نام سے نتیجہ پر آسانی سے پہنچ جاتے ہیں کہ پرانے زمانے میر گائے بھینس وغیرہ کے لیے مشہور تھا اور یونان کے اس علاقے سے مویشی لے جاتے تھے۔

ارجن ٹائن یا ارجن ٹانیا :۔ اب یہ ملک کے لیے مشہور نہیں ہے لیکن غالبًا پہلے یہاں بہت ملتی تھی۔ یہاں کی ایک ندی کا نام

، چاندی کی ندی ہے ۔ اس ملک کے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ
ی جس جگہ سے نکلی ہے وہاں کافی چاندی پائی جاتی ہے ۔
ا کی وجہ سے اس ندی کا پانی اتنا صاف ہے ۔ لفظ
ین ٹوم" کے معنی چاندی کے ہیں اور اسی لفظ سے یہ
رجن ٹائن" نکلا ہے ۔ یعنی وہ سرزمین جہاں چاندی
ا پائی جاتی ہے ۔

ٹریلیا :- "اسٹرالس" (AUSTRALIS)
طینی لفظ ہے جس کے معنی جنوب یا دکن کے ہیں ۔ یہ
دنیا کے جنوبی حصہ میں ہے ۔ یورپ کے جہاز رانوں نے
ں تجارت کرنے آتے تھے اس ملک کو آسٹریلیا اس
ر دیا ہے کہ یہ ملک یورپ کے جنوب میں ہے ۔ اسٹریلیا
پ عجیب جانور کانگرو دنیا بھر میں مشہور ہے ۔ ہمارے
ستان کے بڑے بڑے شہروں میں جہاں چڑیا گھر ہیں وہاں
یا سے ہی کانگرو لاکر رکھے گئے ہیں ۔ اگر تم کبھی چڑیا گھر
جاؤ تو وہاں اس انوکھے جانور کو ضرور دیکھو ۔

یہ :- مشہور جہازی کولمبس اپنے جہاز میں سوار ہوکر
ستان کی تلاش میں نکلے تھے لیکن ہندوستان پہنچنے
ئے وہ جس ملک میں پہنچے اسے آج امریکہ کہا جاتا ہے ۔
کولمبس نے اس ملک کا راستہ دریافت کیا لیکن
کا نام پڑا ہے   ایک اور جہازی
پر جس کا نام تھا "امریگو"

لڈ :- ملک انگلینڈ کو ہم ہندوستانی انگلستان کہتے
یم زمانے میں اس علاقے کو جس قوم نے فتح کیا وہ
انجلس کہلاتی تھی ۔ اسی فاتح ANGL
قوم کی بنا پر اس ملک کا نام انگلینڈ یعنی انجلس یا انگلس
قوم کا وطن پڑ گیا ۔

ایران :- ایران کو ہم فارس بھی کہتے ہیں یعنی وہ ملک جو
افغانستان اور بلوچستان کے مغرب میں واقع ہے سنسکرت
زبان کا ایک لفظ ہے "آیریا بیج" یعنی آریاؤں کا وطن ۔
ایران قدیم آریاؤں کا وطن ہے ۔ یہی سنسکرت لفظ پہلوی
زبان میں "ایران بیج" بنا اور زمانے کے ساتھ ساتھ مختصر
ہو کر اب یہ ملک ایران کہلانے لگا ہے ۔

بھارت :- ہم سب جس ملک کے رہنے والے ہیں اس
ملک کو ہم مختلف ناموں سے یاد کرتے ہیں ۔ بھارت ، آریہ ورت
ہند ، ہندوستان یا انڈیا ۔ ان تمام ناموں میں ہندوستان
ہی سب سے زیادہ عام نام ہے اور ہم اپنے آپ کو ہندوستانی
کہتے ہیں ۔ بھارت یا بھارت ورش ہمارے ملک کا ایک قدیم
نام ہے جو عہد قدیم کے ایک مشہور راجا بھرت کی وجہ سے پڑا
ہے ۔ اس ملک کو "آریا ورت" اس لیے کہتے ہیں کہ
یہاں آریہ لوگ آکر بس گئے ۔ ہمارے ملک کا ایک مشہور
نام "ہند" ہے ۔ چونکہ یہ ملک دریائے سندھ کے پار ہے ۔
لفظ سندھ سے لفظ ہند نکلا ہے پشتو میں جو نہ صرف ایک
قدیم زبان ہے بلکہ اب بھی افغانستان اور سرحدی علاقے
کے پٹھانوں کی مادری زبان ہے ، دریا کو ہند کہتے ہیں ۔
یہ پٹھان بھی آریہ نسل کے لوگ ہیں ۔ بہر حال دریائے سندھ کی
وجہ سے اس ملک کا نام "ہند" ہوا ہے اور یہاں کے
باشندے ہندی کہلائے اور اس ملک کو ہندوستان یعنی
[illegible]

کو "انڈیا" کہتے ہیں جو کہ لفظ "ہند" سے ہی نکلا ہے۔

برجیل :- پورتگی زبان میں "برجا" کے معنی لال کوئلہ ہے لیکن یہ لفظ عام طور پر لال لکڑی کے لیے استعمال ہوتا آیا ہے۔ یورپ کے باشندے ایک قسم کی لال لکڑی جیسے سرخ چندن سے سرخ رنگ تیار کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سرخ لکڑی کا درخت بحر اوقیانوس کے کسی جزیرے میں پیدا ہوتا ہے لیکن جب جنوبی امریکہ کے ایک ملک میں ان کو یہ درخت ملے تب انھوں نے اس ملک کو برجیل یعنی لال لکڑی کا ملک قرار دیا۔

بغداد :- یہ ایک قدیم شہر ہے جو خلفائے عباسیہ کا دارالخلافہ بھی رہا ہے اور یہاں کی جامعہ علوم اسلامی علوم کے لیے ایک زمانے تک مشہور رہی ہے۔ پورے عراق اور عرب میں یہ شہر نوشیرواں کے زمانے میں کافی آباد تھا "بیبی لن" کی طرح بغداد بھی دنیا کا ایک قدیم تاریخی شہر ہے اور یہ نام بھی دیوی دیوتاؤں کی وجہ ہی سے پڑا ہے۔ سنسکرت زبان کا لفظ "بگ یت" ہے جس سے قدیم فارسی لفظ "بگ دات" یا "بغدات" یا "بغداد" نکلا ہے۔ "بگ" یا "بغ" کے معنی دیوتا یا بھگوان ہے۔ اس طرح بغداد کے معنی ہوئے وہ شہر یا مقام جسے خود دیوتا یا بھگوان نے تعمیر کیا ہے

بلجیم :- اس دیس کے لوگ اپنے وطن کو "بلگو ٹیکو" کہتے ہیں اور مختصر طور پر اسے BELGIE بلگی کہا جاتا ہے۔ ملک روما کے باشندے اس ملک کے لوگوں کو "بلگے" کہا کرتے تھے اور یہی نام اس ملک کے لوگوں کی بنیاد ہو گئی اور یہ ملک بلجیم کہلایا۔ بلجیم کے کانچ اور آئینے دنیا بھر میں مقبول ہیں۔ اور یہاں کے باشندوں کو آج ہم بلجی کہتے ہیں۔

بیبی لن :- دنیا کی تاریخ میں یہ ایک نہایت قدیم ہے اور انسانی سماج کی تہذیب و تمدن کے سلسلے اس شہر کو ایک بلند مقام حاصل ہے۔ دنیا کے کئی مقامات کے نام دیوی دیوتاؤں کے نام پر رکھے گئے بیبی لن کا وہی حال ہے۔ سنسکرت زبان کا لفظ "بھ" سے قدیم فارسی لفظ "باب ردس" نکلا اور اسی سے "بیبی لن" نکلا ہے۔ لفظ "باب" کے معنی بارگاہ یا مند اور "یلو" کے معنی "دیوتا" یا بھگوان کے ہوتے ہیں۔ طرح "باب" اور "یلو" دونوں لفظ مل کر بیبی لن ت کے معنی دیوتا کا مندر یا بارگاہ دیوتا کے ہوتے ہیں عہد قدیم میں اس شہر کا چرچا دور دور تک پھیلا ہوا جس کی وجہ سے اس شہر کا یہ نام ہوا ہے۔

پنجاب :- کبھی کبھی جغرافیائی حالات بھی ملک کی بنیاد بنتے ہیں۔ مثلاً دریائے سندھ کی وجہ سے سندھ۔ اسی طرح "پنج۔ آب" یعنی پانچ دریاؤں ہونے کی وجہ سے یہ ملک پنجاب کہلایا۔ "پنج" کے پانچ اور "آب" کے معنی پانی کے ہیں۔

پورتگل :- عہد قدیم میں اس علاقے کا مشہو بندرگاہ تھا "پورتس گل" نامی ایک شہر۔ یہاں ملک روما کے تجارتی جہاز آتے تھے اور رومیوں تجارتی مرکز کی وجہ سے اس ملک ہی کو "پورٹو کالیا" کہا۔ یہی لفظ زمانے کے ساتھ ساتھ

بدلتے پورتگل بن گیا ہے ۔

جاپان :۔ ہم جس ملک کو جاپان اور جس کے باشندوں کو جاپانی کہتے ہیں۔ وہ لوگ اپنے ملک کو جاپان نہیں بلکہ نپّن کہتے ہیں۔ جاپان کا کالا رنگ آج بھی دنیا بھر میں مشہور ہے اور یہ کالا رنگ جس درخت سے نکلتا ہے وہ درخت ملک جاپان میں خوب ہوتا ہے۔ غیر ملکی تاجر جو اس سیاہ رنگ کی تجارت کرتے تھے وہ اس رنگ کے درخت پائے جانے والے ملک کو جاپان کہنے لگے اور آخر کار یہ ملک دنیا بھر میں جاپان ہی مشہور ہوا لیکن جیسا کہ ہم نے کہا ہے جاپانی اپنے ملک کو "نپن" کہتے ہیں یعنی وہ ملک جہاں سے آفتاب طلوع ہوتا ہے ۔

جرمن :۔ ملک جرمن کے باشندے جرمنی کہلاتے ہیں۔ قدیم فرانس کے لوگوں نے یہاں کے باشندوں کو جرمنی قرار دیا۔ جس لفظ کے معنی زور زور سے چلانے والے ہوتے ہیں کہا جاتا ہے کہ قدیم جرمنی کے باشندے دورانِ جنگ میں خوب بلند آواز میں چیخ پکار کرتے تھے اور اسی وجہ سے فرانسیسی لوگوں نے انھیں جرمنی یعنی زور زور سے چلانے والے کہا ہے اور یہ ملک جرمن کہلایا۔

ڈنمارک :۔ جس طرح راجا بھرت کی وجہ سے ہمارے ہندوستان کا ایک نام بھارت ورش ہوا ہے اسی طرح "ڈین" نامی ایک راجا کی وجہ سے یورپ کا یہ چھوٹا سا ملک ڈنمارک کہلایا۔ اس ملک کا رقبہ کوئی ۱۷ ہزار مربعہ میل سے زیادہ ہے اور یہاں کی زبان ڈیانس کہی جاتی ہے ۔

محمد رسول اللہ صلعم پیدا ہوئے اور جہاں آج بھی دنیا کے کونے کونے سے لاکھوں مسلمان شہر مکہ اور مدینہ کا حج کرنے جاتے ہیں ۔

ایک زمانہ وہ بھی تھا جب کہ اس ملک کے باشندے خانہ بدوش تھے۔ کہتے ہیں کہ ایک خانہ بدوش قبیلہ جس جگہ جا کر بس گیا اُس مقام کو "عربہ" کہا گیا اور اسی وجہ سے یہ ملک آخر کار "عرب" کہلایا۔ لیکن چند عالموں کی رائے ہے کہ یہودیوں کی زبان عبرانی لفظ "عراب" یا عربہ (جس کے معنی ریگستان کے ہیں) سے اس ملک کا نام "عرب" ہوا ہے چونکہ یہ ملک ریگستانی ہے ۔

کناڈا :۔ کناڈا کے سلسلے میں ایک کہانی ہے۔ کہتے ہیں کہ پُرانے زمانے میں جب ایک پورتگیز جہاز راں یہاں آ نکلا تو اس نے یہاں کی برفیلی زمین پر قدم رکھ کر چاروں طرف نظریں ڈالیں۔ حدِ نظر تک اسے صرف برف ہی برف دکھائی دیا اور اس نے حیرت سے کہا "کا۔ ناڈا" یعنی یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ پس اسی پورتگیز لفظ سے اس ملک کا نام ہوا ہے۔ لیکن سب اس کہانی سے متفق نہیں ہیں۔ چند عالم کہتے ہیں کہ کناڈا کی زبان میں لفظ "کناڈا" کے معنی دیہات کے ہیں اور چونکہ اس ملک میں پہلے محض چھوٹے دیہات ہی تھے لہذا یہ ملک کناڈا کہلایا۔

ہنگری :۔ HUNGRY "ہن" ایک قدیم قبیلے کا نام ہے اور چونکہ یہاں اس "ہن" قبیلے کے لوگ پرانے زمانے سے آباد تھے اس وجہ سے اس ملک کا نام

جناب مختار بارہ بنکوی

قدم ملا کے چلو



وقارِ قوم کا بچو! مرے، بڑھا کے چلو
وطن کی شان مرے لاڈلو دکھا کے چلو
ہر اک قدم پہ محبت کے گل کھلا کے چلو
یہ کہہ رہا ہے زمانہ قدم ملا کے چلو

پڑھو بڑھو بھی مرے بچو! مسکراتے ہوئے
ادائے حسن سے ہر ایک کو بھاتے ہوئے
یہی ترانۂ دل کش مزے میں گاتے ہوئے
یہ کہہ رہا ہے زمانہ قدم ملا کے چلو

تمھارے پھول سے چہروں پہ چھا رہی ہے بہار
دلِ زمانہ تمھاری اداؤں پہ ہے نثار
تمھارے پیارے لبوں پہ یہ پیاری ہے گفتار
یہ کہہ رہا ہے زمانہ قدم ملا کے چلو

تمھیں ہو نور، وطن کے تمھیں اجالے ہو
بہت ہی عمر ہے کم، اور بھولے بھالے ہو
وطن کی لاج کو، لیکن تمھیں سنبھالے ہو
یہ کہہ رہا ہے زمانہ قدم ملا کے چلو

تمھیں سے اپنے چمن میں بہار آئے گی
مہک سے اپنی زمانے کو یہ بسائے گی
یہ بھید بھاؤ جو دل میں ہے سب مٹائے گی
یہ کہہ رہا ہے زمانہ قدم ملا کے چلو

بڑھے ہو میرے عزیزو! یونہی بڑھے جاؤ
یونہی ترقی کے زینے پہ تم چڑھے جاؤ
ہر اک قدم پہ، یہ مصرعہ مگر پڑھے جاؤ
یہ کہہ رہا ہے زمانہ قدم ملا کے چلو

بچھڑ گئے ہیں جو ساتھی انھیں بڑھا کے چلو
جو کانٹے راہ میں پاؤ انھیں ہٹا کے چلو
جو تھک کے بیٹھ گئے ہوں انھیں اٹھا کے چلو
یہ کہہ رہا ہے زمانہ قدم ملا کے چلو

جناب اقبال متین

ایک رانی کی کہانی

ایک ملک میں ایک رانی حکومت کرتی تھی۔ اس لک کے لوگ بڑے محنتی تھے ذمہ دار تھے۔ اپنے فرائض کے راکرنے میں پیچھے نہ ہٹتے تھے۔ اپنے ملک کے بڑے فادار می تھے۔ وقت آنے پر اپنی جان تک دیس پر قربان کر دیتے ں پس وپیش نہ کرتے۔ رانی کو اپنے ملک کے عام لوگوں ں ان باتوں کا اچھی طرح علم تھا۔ وہ جانتی تھی انھی لوگوں نے ملک کو دنیا بھر میں اونچا اٹھایا ہے۔ انھی لوگوں کے بوتے پر میں کچھ کر سکتی ہوں اور مجھ سے پہلے میرے یش رو راگلے، حکمرانوں نے بھی انھی کو اپنا کر کامیابیاں اصل کی ہیں۔

یہ رانی مزاج کی بڑی سیدھی تھی جو دل میں ہوتا بان پہ آتی۔ کسی مصلحت سے بات کو گھما کر پھرا کر کرنے فن اس کو آتا ہی نہ تھا۔ اور سچ پوچھو تو وہ اس فن کو یس کو عرف عام میں سیاست کہتے ہیں)، کچھ پسند بھی نہ رتی تھی۔ اتنے بڑے ملک کی رانی تھی پھر بھی بڑی نرم ر منکسر مزاج تھی۔ اس کے مزاج کے انکسار اور نرم دلی اس کی رعایا کو اس کے بہت قریب کر دیا تھا۔

دیس کی جنتا رانی کو بہت پیار کرنے لگی تھی۔

پاس پہنچ جاتے اور اپنا دکھ درد بیان کرتے۔

رانی نے حکم دے رکھا تھا کہ کوئی بھی غرض مند یا فریادی جب چاہے اس کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔ پہرہ داروں اور سنتریوں کو حکم تھا کہ دن ہو کہ رات جو بھی رانی سے ملنا چاہے اس کو پیش کیا جائے۔

آہستہ آہستہ جب وہ اپنے ملک کے عام لوگوں کے اتنا قریب ہو گئی تو عام لوگوں میں یہ احساس پیدا ہوا کہ حکومت کے انتظام میں اپنی بہتری کے لیے ہمیں مشورہ دینے کا حق حاصل ہے اور رانی کے پاس بلا کسی مزاحمت کے ہماری باریابی ہو سکتی ہے تو ہم رانی ہی سے بلا توسط بات چیت کر سکتے ہیں اور اپنے ملک کی بہتری کی نسبت اچھے منصوبے اس کے آگے رکھ سکتے ہیں۔

اب عوام جوق در جوق رانی سے ملنے کو آنے لگے۔ شہر بھر میں یہ بات آگ کی طرح پھیل گئی کہ رانی حکومت کے کاروبار میں رعایا سے مشورہ چاہتی ہے۔ لوگوں نے مل جل کر اسکیمیں بنائیں۔ ملک کی ترقی کے لیے منصوبے تیار کیے اور رانی سے ملنے کو چل پڑے۔ رانی نے ان کی باتیں صبر و تحمل سے سنیں اور ان کے نمائندوں کی اچھی باتیں گرہ میں باندھ کر رکھتی گئی۔ دن، مہینے، برس۔ یہ سلسلہ طویل بہت طویل ہوتا گیا ــــ لوگ رانی سے ملتے، خوش خوش لوٹ آتے۔ لیکن ان کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوتی۔ رانی سب کو تسلیاں دیتی۔ دلاسے دیتی کہ اب برے دن ختم ہو جائیں گے اب ہو جائیں گے ــ

کہنے کو وہ اپنی رعایا کے آگے یہ سب کہہ دیتی لیکن دن رات متفکر رہتی کہ میں اپنے عوام سے جو وعدہ کر بیٹھی ہوں آخر انھیں نبھاؤں کیسے۔ وہ خوش حالی، وہ امن وسکون انھیں کہاں سے لاکر دوں جس کا میں نے ان سے بار بار وعدہ کیا ہے۔ اور وہ سب کے سب میری طرف نظریں جمائے مجھے تک رہے ہیں۔ وہ رات رات بھر سو نہ سکتی۔ اُلٹے سیدھے خواب دیکھتی اور چمک چمک کر اٹھ بیٹھتی

اس نے ایک روز خواب میں دیکھا کہ اس کے ملک کی جنتا اس کے پیچھے چل رہی ہے اور وہ ایک ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی طرف بڑھ رہی ہے۔ سمندر بڑے غیض وغضب کے عالم میں ہے لیکن رانی اونچی اونچی اُٹھنے والی پہاڑ جیسی موجوں کی پرواہ کیے بغیر سمندر کی طرف بڑھ رہی ہے اور پلٹ کر اس سمندر کی طرف دیکھ رہی ہے جس کو انسانی سروں نے اس کے پیچھے بنا رکھا ہے۔ لاکھوں عوام اس کے پیچھے چل رہے ہیں۔ انسانی سروں کا ایک سیلاب ٹھاٹھیں مارتے سمندر کی طرف بڑھ رہا ہے اور سمندر غیض وغضب کے عالم میں اپنا پانی اُچھال اُچھال کر پھینک رہا ہے۔

اب رانی سمندر کے بہت قریب ہوگئی ہے طوفانی موجوں کا پانی اس کے چہرے پر پڑ رہا ہے، وہ ذرا گھبرا کر پیچھے مڑتی ہے اور لاکھوں سروں کو دیکھتی ہے جب اس کو یقین ہوتا ہے کہ اتنے لوگوں کی طاقت میرے پیچھے ہے تو وہ اپنے اوسان درست کرکے بڑھتی ہی جاتی ہے یہاں تک کہ سمندر خاموش ہوجاتا ہے موجیں اس طرح [illegible]

سمندر کا پانی برف کی طرح منجمد ہوگیا ہے۔ رانی سارا سمندر اس کے پیروں کے نیچے ہے جو منجمد ہو سمندر پر اس طرح چلتی ہے جیسے دھرتی پر چل پھر وہ رکتی ہے۔ پلٹ کر دیکھتی ہے۔ کا سیلاب دم بھر کو ٹھٹک کر ٹھہر گیا ہے لیکن و یقین کے ساتھ مسکراتی ہے اور لوگ چل پڑتے پھر یکایک شور وغل بلند ہوتا ہے۔ را آگے ہے لوگوں کی آنکھیں رانی کے چہرے پر ان کے قدموں کے نیچے برف پگھل رہی ہے اور میں اتر رہے ہیں۔

آوازیں بلند ہوتی ہیں ——— "را دھوکا دیا جا رہا ہے۔ ہمیں دیکھو۔ ہماری سنو۔ ملک کے ادیب ہیں شاعر ہیں۔ ہم بھی اس سمن جز ہیں جس پر تمھیں ناز ہے۔ تمھارے قدموں برف کی طرح چمکتا ہوا ٹھنڈا سمندر تمھارے پیچھے ہوئے انسانی سمندر کو اپنے میں غرق کرکے فنا ہے ——— ٹھہر جاؤ رانی، ہم اپنے قلم لیے لائے ہیں جن کو اپنے خون میں ڈبو کر انھی برف کے تودوں پر حق وباطل کی داستان اس گے جو مٹائے نہ مٹے گی۔"

آوازیں اور بلند ہوتی ہیں۔

"ہاں ہاں ٹھہر جاؤ رانی۔ ہم تمھارے چتر کار ہیں۔ یہ ہمارے برش ہیں، یہ ہمارے رنگ تمھارے لیے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ برف میں ہمارا

"ٹھہر جاؤ رانی! ہم اپنا علم اپنی کتابیں تمھارے
ے ہیں۔ ہم اس ملک کے طالب علم ہیں۔"

"رانی۔ رانی۔ او رانی! ہم مزدور ہیں، ہم کسان
۔ یہ گرجتی مشینیں یہ لہلہاتے کھیت سب تمھارے ہیں
! اس لیے کہ تم ہماری ہو۔ یہ ٹھنڈا برفانی سمندر جو
ے قدموں کے نیچے ڈول رہا ہے وہ آہستہ سے تمھیں
ں لے گا۔"

"رانی سارے قانون انسان کی برتری کے لیے
سارے قانون انسان کی زندگی کے لیے موت کا کوئی
نہیں ہے۔"

"موت کا کوئی قانون نہیں ہے۔ موت کا کوئی
نہیں ہے ——— موت کا کوئی ......! دوردور
وازوں کی گونج تھی۔ ساری دھرتی گونج رہی تھی
ن کے پہاڑ گونج رہے تھے، ہمالیہ سے ٹکرا کر صدائیں
آ رہی تھیں۔ سمندر ڈول (لہریں لے) رہا تھا۔ سفید
جس کی برف رانی کے قدموں تلے پگھل رہی تھی اور
یں رانی کے کانوں کے پردے پھاڑ رہی تھیں ——
بی۔ اپنے بستر پر ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتی رہی
مایک چونک کر اس نے اپنے بدن پر پڑا ہوا لحاف
ے دیا اور اٹھ بیٹھی۔

رانی بڑی پشیمان تھی۔ اس کو یہ احساس ستا رہا
میں نے اپنی جنتا سے جو عہد و پیمان کیے ہیں وہ
ے کے سارے جھوٹے ثابت ہو رہے ہیں۔ عملی طور پر
وں کو اس لیے لوما نہیں کر سکتی ہوں کہ میرے
ساتھ حکومت چلانے والے بڑے بڑے وزیر لوگ اور
کوتوال ان کاموں کے پورا کرنے میں روڑے اٹکا رہے
ہیں۔ عوام کی طاقت کو وہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں
وہ تو یہ کہتے ہیں کہ ہم حاکم ہیں حکومت ہماری ہے۔
عام لوگ بے چارے حکومت کے کاروبار میں کیسے دخل
دے سکتے ہیں۔ یہ ادیب اور شاعر نرے بے وقوف ہیں،
بکواس کرتے ہیں۔ چترکار تو جنم جنم کا باؤلا ہے۔ طالب علم
وقتی جوش کا دوسرا نام ہے۔ عوام ——— عوام ———
تو جاہل ہیں۔

سفید کپڑے رانی کے پُرکھوں کو بہت پسند تھے
اور برس ہا برس سے ان کی حکومت کا یہی پہناوا چلا آرہا
تھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس جب وزیروں اور کوتوالوں
کا غول رانی کو گھیر لیتا اور الٹی سیدھی باتیں کرتے اس کو
مطمئن کرنا چاہتا کہ حکومت کے کام سب ٹھیک ———
ٹھاک چل رہے ہیں، ساری مصیبتیں بس کچھ دنوں کی ہیں
تو رانی خاموش خاموش سی ان کے چہرے کو تکتی۔

لیکن رانی تھی بڑی ذہین۔ ایک دن یوں ہوا کہ
پلکیں جھپکا جھپکا کر اپنے وزیروں اور کوتوالوں کی باتیں سنتے
سنتے اسے بڑی بے دلی اور بوریت کا احساس ہونے لگا
اس نے سوچا میں تو کتنے ہی دن سے ان سب سے یہی
باتیں سنتی ہوں اور عوام کے آگے جا کر جھوٹ موٹ دہرا
دیتی ہوں۔ کتنے ہی بار میرا دل نہیں مانتا ہے کہ جو کچھ میں
کہہ رہی ہوں میری اس حکومت میں ہو کر ہی رہے گا
لیکن عوام کے آگے جب میں اس طرح سوچتی ہوں اور ان

سے کچھ کہنا چاہتی ہوں تو الفاظ زبان پر آ کر رک جاتے ہیں زبان میں جیسے لکنت سی پیدا ہو جاتی ہے اور الفاظ ادا نہیں ہوتے تھے۔ لیکن میرے وزیروں اور کوتوالوں میں کتنے ہی ایسے ہیں جو بار بار میرے سامنے جھوٹ بولتے آئے ہیں پھر ایک جھوٹ کو مسلسل دہراتے رہتے ہیں پھر بھی ان کے دل میں کسی قسم کی شرمندگی کا احساس کیوں پیدا نہیں ہوتا۔

رانی کو خیال آیا کہ ان وزیروں اور کوتوالوں کو شاید کوئی نئی قسم کی بیماری ہوئی ہے اور اس بیماری سے شاید انسان جوں کا توں رہتا ہے لیکن اس کے جذبات اور احساسات مرجاتے ہیں۔

اس نے باتیں کرتے کرتے آہستہ سے اُن کی آنکھوں کے راستے جھانک کر ان کے اندر دیکھا۔ رانی اس فن میں بڑی ماہر تھی۔ یہ فن اُس کو اس کے باپ نے سکھایا تھا جب رانی نے غور سے دیکھا تو اس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اور اس نے اس چیخ پر قابو پا لیا ورنہ وہ بے تحاشہ چیخنے لگتی۔ رانی نے دیکھا کہ بہت سارے وزیروں ـــــ کوتوالوں اور عہدہ داروں کا خون تیزی سے سفید ہو رہا ہے۔ بعضوں کا تو سارے کا سارا خون اس حد تک سفید ہو گیا ہے کہ ان کے اجلے اجلے سفید کپڑوں پر ان سے سرخ سرخ دھبہ بھی نہیں پڑ سکتا تو رانی بے حد متفکر ہو گئی وہ سمجھ گئی کہ یہ بہت خطرناک بیماری ہے۔ یہ بیماری جب کسی آدمی کو ہو جاتی ہے تو آدمی نہیں بچتا۔ شہروں کو ہوتی ہے تو شہر تباہ ہو جاتے ہیں۔ حکومتوں کو ہوتی ہے تو حکومتیں دم توڑ دیتی ہیں۔ قوموں کو ہو جاتی ہے تو قومیں مٹ جاتی ہیں اس طرح کہ ان کا پھر کوئی نام نہیں لیتا۔

وہ خاموشی سے اٹھی اور سیدھے اُس میدان کی راہ لی جہاں وہ اپنے عوام سے باتیں کر اس وقت چلی جاتی تھی جب اس کا جی گھبرانے لگتا تو وہ بے حد اداس تھی اس کی حکومت کو خطرناک لگ چکی تھی اور وہ بیمار حکومت کی رانی بنی گویا سا، ملک میں اس بیماری کو پھیلتی ہوئی دیکھ کر بھی بند کیے ہوئے تھی

جب وہ میدان میں پہونچ کر اُس اونچے ٹیلے پر چڑھنے لگی جہاں سے وہ اپنے دیس کے عوام مخاطب ہوتی تھی۔ لوگ اس کو دیکھ کر جمع ہونے انسانی سروں کا سمندر پھر ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

رانی نے بڑے اداس لہجے اور رندھے گلے سے کہا۔

بھائیو! بہنو! ساتھیو! دوستو! ہماری میں ایک خطرناک بیماری پھیل گئی ہے۔ ہماری حکومت کا خون سفید ہو رہا ہے، اس خون میں سُرخ ذرّے نہ رہے ہیں۔ مجھے نیا خون چاہیئے اور سب سے پہلے اپنا خون دینے کے لیے تیار ہوں کہ میری حکومت بیماری دور ہو۔ ورنہ یہ بیماری سارے ملک میں پھیل ہے ـــــ

اب تو انسانی سروں کا سمندر جوش میں اتنی آوازیں بلند ہوئیں، اتنی آوازیں بلند ہوئیں

سر فخر سے اونچا ہوگیا اور وہ سر سے پیر تک مارے
ی کے بیر بہوٹی کی طرح سُرخ ہو اٹھی ــــ "ہم سب
ادے ساتھ ہیں رانی۔ تمھارا خون ہمارا خون ایک ہی
ہے ہم اپنا خون دے کر اس بیماری کو دور کریں گے۔"

اور جب لوگ بیماروں کو بچانے کے لیے جوش و
ش سے رانی کے پیچھے پیچھے ان کی رہایش گاہوں کی
ف چلے تو اس وقت تک سارے بیمار ایک جگہ جمع
چکے تھے۔ ان لوگوں نے کالی سی عمارت اپنے لیے
لی تھی اور سب کے سب اس عمارت میں بند ہوگئے
۔ اس عمارت پر ایک بڑا بورڈ لگا تھا جس پر جلی حروف
لکھا تھا "سونا کھیٹ پیلس"۔ یہ بورڈ بالکل سیاہ تھا اور حروف
سفید۔

رانی نے بیماروں کو کہلا بھیجا۔ ملک کے عوام آپ
ں سے بات چیت کرنا چاہتے ہیں۔ آپ کی مزاج پرسی
چاہتے ہیں۔ آپ لوگوں کی بیماری کا حال انھیں معلوم
ا ہے۔ انھیں آپ لوگوں سے ہمدردی ہے وہ چاہتے
۔ آپ سب سے مل آپ لوگوں کی صحت بحال کرنے میں
ریں۔

بیماروں نے جب بند کمروں میں یہ پیام سُنا تو وہ
پنے کمروں سے نکل کر ایک بڑے سے کمرے میں جمع ہوئے
یک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ایک بیمار جو بالکل
بلب تھا اس نے نحیف آواز میں دوسرے بیماروں
ہا۔ "دروازوں کو اندر سے مقفل کر لو۔ ہم خود اپنے ڈاکٹر
ہم خود [illegible]

چاہتے۔ یہ چھوٹے لوگ ہمارا کیا علاج کر سکیں گے جنھیں ڈھنگ
سے دھوکہ کھانا بھی نہیں آتا اور ہم تو سونے کی اینٹوں کی
اینٹیں کھا جاتے ہیں۔ ہمیں اپنے سونا کھیٹ پیلس سے
باہر نہیں جانا ہے۔"

لوگ ٹھہرے رہے۔ انتظار کرتے رہے پہلے انھیں
بہت غصّہ آیا پھر انھوں نے رانی کی طرف دیکھا۔ رانی نے
مسکرا کر کہا۔ "ہمیں مرنے والوں کو معاف کر دینا چاہیے۔ یہ لوگ
تو اپنی موت آپ مر رہے ہیں۔"

پھر ایک ہاتھ اٹھا۔ دو ہاتھ اُٹھے۔ لاکھوں
ہاتھ اُٹھے اور ان ہاتھوں نے سونا کھیٹ پیلس کے
بورڈ پر سے پیلس کا لفظ مٹا کر ہسپتال لکھ دیا، اور اس
دن سے سفید خون والے ان مریضوں کی یہ عمارت سونا
کھیٹ ہسپتال کہلانے لگی۔

بچو! جب عوام کے لاکھوں کروڑوں ہاتھ کہیں
کچھ لکھتے ہیں تو ان کی یہ تحریر تاریخ کا ایک حصّہ بن جاتی
ہے۔

"سونا کھیٹ ہسپتال" سنتے ہیں اس کی چھتی رانی
کے دورِ حکومت میں تاریخ کا ایک سیہ دھبّہ بن کر محفوظ
ہوگیا ہے۔ اب سونا کھیٹ ہسپتال کی یہ کالی عمارت منہدم
بھی ہو جائے تو تاریخ میں ایک سیاہی چھوڑ جائے گی۔
لیکن رانی کے دورِ حکومت کی تابانی سے اسی تاریخ کے
صفحات سنہرے ہو جائیں گے۔

ڈاکو: (مسافر کے سینے پر پستول رکھ کر) جان دینا ہے یا روپیہ؟
[illegible]

جناب خضر برنی

چور کا دشمن



شیر کی صورت چوڑا چکلا   لمبے لمبے بالوں والا
گھر کی حفاظت کرنے والا   بھیّا نے اک کتّا پالا

دوڑ لگائے گیند اچھالے   پیٹ بھرے تو خوش ہو جائے
بھولا بھالا سیدھا سادا   کچھ نہ ملے بھوکا سو جائے

اچھا ٹامی پیارا کتّا   در پہ دھونی رمانے والا
پیار سے دُم کو اپنی ہلا کر   سچّا پریم جتانے والا

رات کو ہم سب سو جاتے ہیں   یہ ہے محافظ گھر کا اپنے
کھو جاتے ہیں ہم خوابوں میں   اس کو نہیں بھاتے ہیں سپنے

بارش ہو یا سردی گرمی   اس کا بسیرا گھر کا آنگن
لیتا نہیں ہے رشوت ہرگز   اچھا سا ہی چور کا دشمن۔

ب خلیق انجم اشرفی

ڈائنامائٹ سے خطرناک

۱۸۶۷ء دنیا میں تاریخی سال تھا جب سویڈش
س داں الفریڈ نوبل نے دنیا کو ایک نیا مادّہ دیا۔
نام اس نے ڈائنامائٹ رکھا تھا اور جب لوگوں
خوف ناک تباہ کرنے والی طاقت کا پتہ چلا جو اس
کے صرف ایک چھوٹے سے فلیتہ میں پوشیدہ تھی تو
نے حیرت سے دانتوں تلے انگلیاں دبالیں اور
— آج تو ڈائنامائٹ کو لوگ اتنی اچھی طرح جان
کہ اس کا نام سنتے ہی ان کے ذہن میں آجاتا ہے
یہ انتہائی خطرناک آتش گیر مادہ ہے اور اسے
حتیاط سے استعمال کرنا ہوتا ہے۔

لیکن اگر میں آپ سے کہوں کہ آج ہمارے روزانہ
تعمال میں چند رقیق (پتلی) چیزیں ایسی بھی ہیں
تباہ کرنے والی قوت ڈائنامائٹ سے زیادہ
روہ ڈائنامائٹ سے زیادہ خطرناک ہیں تو شاید
ین نہ کریں لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور ان رقیق
یں پیٹرول کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔
آج کے مشینی ...

طرح پیٹرول استعمال کرتا ہے۔ موٹر میں، لائٹر میں، گرم کپڑوں کی صفائی کے لیے لیکن اس کے باوجود زیادہ تر لوگ اس کا استعمال بڑی لاپروائی سے کرتے ہیں۔ یہی لوگ اگر ڈائنامائٹ کا ایک فلیتہ دیکھ لیں تو شاید جان بچانے کے لیے سر پہ پیر رکھ کر بھاگ کھڑے ہوں حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ ایک چلّو بھر پیٹرول ہوا میں شامل ہو کر ایک عام کمرے میں اتنے بخارات (گیس) بھر دیتا ہے کہ اگر اسے آگ دکھائی جائے تو وہ ڈائنامائٹ کے ایک فلیتہ سے کہیں زیادہ تباہی مچا دے۔ اس کے علاوہ یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ پیٹرول کے بخارات ڈائنامائٹ کی بہ نسبت کہیں جلد آگ پکڑ لیتے ہیں۔

پیٹرول ایک ایسا جن ہے جسے اگر بند رکھا جائے تو وہ انسان کے مفید ترین "غلاموں" میں سے ایک ہے لیکن اگر اس جن کو بھاگنے اور ہوا میں اپنے بخارات پھیلانے کا ذرا سا موقع بھی مل جائے

یہ خطرہ کوئی عجیب اور پُراسرار چیز نہیں ہے۔
کوئی بھی اسے آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔ جب پٹرول کو ہوا میں ملنے کے لیے کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے تو یہ بخارات یا گیس میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ایسا عموماً اس وقت ہوتا ہے جب پٹرول کا ٹن کھلا چھوڑ دیا جاتا ہے یا یہ کسی طرح زمین پر گر جاتا ہے۔ اور یہ معلوم کر کے آپ کو حیرت ہوگی کہ جب یہ رقیق سے گیس میں بدلتا ہے تو اس کا حجم (پھیلاؤ) اتنا بڑھ جاتا ہے کہ ایک گیلن سے سینکڑوں مکعب فٹ گیس بن جاتی ہے۔

آپ نے شاید ان جنوں کا حال پڑھا سنا ہوگا جنھیں جادوگر بوتلوں میں قید کر دیتے تھے لیکن جب کوئی قسمت کا مارا ان بوتلوں کو کھول دیتا تو وہ بہت بڑے بن کر اس کو کھانے پر تل جاتے تھے بس پٹرول کا حال بالکل اسی جن کا سا ہے۔ بوتل میں بند ہے تو کچھ نہیں۔ بوتل سے نکلا تو بڑھ کر کھانے کو تیار۔

دوسری رقیق چیزوں کے بخارات تو ہوا میں مل کر دور چلے جاتے ہیں لیکن پٹرول ایسا نہیں کرتا اور اس کی بھی وجہ ہے یہ ہوا سے بھاری ہوتا ہے۔ اس لیے اس کے بخارات ہوا کے ساتھ ساتھ اڑنے کے بجائے فرش پر جم جاتے ہیں اور اس کے ساتھ کسی پتلی نہر یا چشمہ کی طرح بہتے ہوئے ہر کونے کھدرے کو بھرتے چلے جاتے ہیں۔

یہ بخارات کئی کئی روز ایک ہی جگہ ڈیرا ڈالے

[illegible]

کسی کو ان کی موجودگی کا شبہ ہوتا ہے جب تک شعلہ یا چنگاری انھیں غصہ نہیں دلا دیتی۔ اس جس جگہ بھی پٹرول کا ذخیرہ ہو وہاں ہوا کی نکاس بہترین انتظام ہونا ضروری ہے۔

اس "جن" کی تباہ کاری کا ایک واقعہ انگلینڈ کے کسی شہر کے مضافات میں ایک پٹرول پر ایک لاری پٹرول کا ٹینک بھر رہی تھی۔ پٹرول کچھ حصہ زمین پر گر گیا اور فوراً ہی گیس بن کر ہوا میں ہو گیا۔ کسی طرح وہاں کوئی شعلہ یا چنگاری پہنچ گئی اچانک اتنا زوردار دھماکہ ہوا کہ پٹرول ٹینک سے اڑ کر اڑتالیس فیٹ کے فاصلہ پر جا گرا۔ ایک موقع ہی پر ہلاک ہو گیا اور دوسرے اس بری گئے کہ آخر ان کے زخم جان لے کر ہی ٹلے۔ کچھ لو پچاس فٹ کے فاصلے پر کھڑے تھے ان کے میں آگ لگ گئی۔ وہ لوگ جو اس جگہ سے ڈیڑھ سو سے زائد فاصلے پر موجود تھے اس گرمی سے جھلس جو اس دھماکہ سے پیدا ہوئی۔ دوسرے لوگ جو فٹ کے فاصلے پر تھے اگرچہ جھلسے نہیں لیکن نے انھیں زمین پر گرا دیا۔ ایک سمت میں پانچ تک تمام فصل تباہ ہو گئی۔ پورا پٹرول پمپ بر پٹرول کی وہ لاری اس دھماکہ کے بعد پرزوں کا ڈھیر معلوم ہو رہی تھی۔

کسی کار، ٹرک یا اسکوٹر وغیرہ میں کبھی

[illegible]

ممکن سی بات ہے یہی پیٹرول تیزی سے گیس بن جاتا ہے اور کسی ایسے دن جب ہوا رکی ہوئی ہے تو بہت ی کاروں اور اسکوٹروں میں پیٹرول بھرے جانے کے ند ہوا میں اس گیس کی مقدار کافی ہو جاتی ہے ۔

آپ نے پیٹرول پمپ کے آس پاس بھی پیٹرول ا بو سونگھی ہوگی ۔ اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ پیٹرول پ کے آس پاس کی ہوا میں بھی پیٹرول کے بخارات امل ہیں ۔ اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ جب کسی کار ، اسکوٹر یا ٹرک پیٹرول پمپ پر یا اس کے س پاس کھڑا ہو تو ڈرائیور یا سواریوں کو بیڑی یا سگر ٹ نہ پینا چاہیے ۔ ویسے تو ہر پیٹرول پمپ پر بڑے بڑے فوں میں "یہاں بیڑی ، سگریٹ پینا منع ہے " ھا ہی رہتا ہے ۔

گرم کپڑوں کی صفائی میں پیٹرول کا استعمال م ہے ۔ لیکن اس کا نتیجہ بڑے بھیانک حادثات کی رت میں نکلا ہے ۔ دستانے اور دوسرے گرم کپڑے ول سے صاف کرنا بہت مناسب اور بڑا آسان گتا ہے لیکن ایسا کرنا بہت خطرناک ہے ۔ اس صفائی" نے کئی لوگوں کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھلوا یے ۔ اور کتنی ہی عمارتیں صاف کر دیں ۔

ہوتا یہ ہے کہ پیٹرول کے بخارات چاروں طرف یلتے ہیں اور جہاں ان کا واسطہ کسی جلتے ہوئے سگریٹ ، ٹوو کے شعلے ، آتش دان یا انگیٹھی میں دہکتے کوئلے

جاتی ہے اور جہاں تک شعلہ یا چنگاری کا تعلق ہے وہ محض کسی کے جوتے کی نکلی ہوئی کیل کے فرش پر رگڑ کھانے سے پیدا ہو سکتا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ صفائی کے دوران آگ سے احتیاط ناممکن کی حد تک مشکل ہے ۔ اور تو اور دستانوں کی صفائی کے وقت محض ان کی رگڑ ہی سے اتنی گرمی پیدا ہو سکتی ہے جو دھماکا کر دے ۔ ایسے لوگ جو پیٹرول سے کپڑے صاف کرتے ہیں یہ سمجھ لیں کہ ایک چلو بھر پیٹرول ایک عام مکان کو اڑانے کے لیے کافی ہے ۔

پیٹرول جس آسانی سے آگ پکڑ لیتا ہے وہ حیرت انگیز ہے ۔ ایک بار ایک عمارت کے کسی کمرے میں ایک شخص پیٹرول سے کپڑے صاف کر رہا تھا ۔ اس پیٹرول کی گیس اس عمارت سے باہر نکل کر ایک دوسری عمارت میں جو تیس فٹ کے فاصلے پر تھی پہنچ گئی اور ایک جلتے ہوئے لیمپ سے اس نے شعلہ پکڑ لیا اور پھر یہ شعلہ اسی راستہ سے واپس آیا اور نتیجہ کے طور پر پوری عمارت راکھ کا ڈھیر بن گئی ۔

ایسے ہی ایک دوسرے حادثہ میں ایک کمرے میں دستانے پیٹرول سے صاف کیے جا رہے تھے اور دوسرے میں لیمپ جل رہا تھا ۔ ایک کمرے کا کھولنا غضب ہو گیا اور زوردار دھماکے نے تباہی مچا دی ۔

ان واقعات سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ پیٹرول سے کپڑے صاف کرنا ہمیشہ خطرناک ہوتا ہے ۔ پیٹرول

ہے جو آگ نہ پکڑتی ہو اور ایسے بہت سے رقیق کیمیکل کے یہاں ملتے ہیں۔ اگر پیٹرول ہی استعمال کرنا ہو تو اسے عمارت سے دور اور کسی ایسی جگہ استعمال کیا جائے جہاں دور دور تک آگ کا نام ونشان نہ ہو۔

بہت سے بھیانک دھماکے محض پیٹرول سے آگ جلانے کی کوشش کا نتیجہ ہوتے ہیں ویسے تو مٹی کے تیل سے آگ جلانا بھی خطرناک ہے لیکن اگر مٹی کے تیل کی جگہ پیٹرول استعمال کیا جائے تو یہ خطرہ بڑھ جاتا ہے۔

ان سب باتوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے یہ بہت ضروری ہے کہ ہر ایک پیٹرول کو رکھنے اور استعمال کرنے کے صحیح طریقے جانے۔ پیٹرول کو کبھی کسی کھلی بوتل یا ٹن میں نہ رکھا جائے۔ اسے پانی یا مٹی کے تیل کی طرح نہ انڈیلا جائے بلکہ کوئی نلی وغیرہ استعمال کی جائے۔ پیٹرول کو کبھی شیشے کی بوتل یا کسی ایسے برتن میں نہ رکھا جائے جو گر کر ٹوٹ سکتا ہو۔

گھر کے اندر یا اس کے آس پاس پیٹرول کا بڑا ذخیرہ رکھنا بہت خطرناک ہے۔ کچھ ملکوں میں تو ایسے قانون بنا دیے گئے ہیں جن کی رو سے پیٹرول کے ٹنوں کو گہرے سرخ رنگ سے رنگ کر ان پر کسی دوسرے رنگ سے لفظ "پیٹرول" لکھا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح کوئی غلطی سے پیٹرول کو مٹی کے تیل کی جگہ استعمال نہیں کر سکتا۔ کیوں کہ ایسی غلطی بڑی ہلاک ہو سکتی ہے اور اس سے بھیانک آگ لگ سکتی ہے یا خطرناک دھماکے ہو سکتے ہیں۔

جناب وقار خلیل



پھولوں کی غزل

خوش نما ہے حیات پھولوں کی
دیکھنا کائنات پھو
جُوہی، چمپا، چنبیلی اور گلاب
نام بچّوں کے، ذات پھو
تتلیوں کی طرح سجل، نازک
ان کی ہر بات، بات پھو
یہ نہیں جانتے کہ غم کیا ہے
دن ہے پھولوں کا رات پھو
آج بچّوں کی یہ حسیں دنیا
جیسے ہے کائنات پھو
وہ جو پڑھتے ہیں اور لکھتے ہیں
اور کرتے ہیں بات پھو
لہلہاتا چمن، ہجوم بہار
مسکراتی ہے ذات پھو
علم کی روشنی کے دیپ جلیں
کیسی مہکی ہے رات پھو
نذرِ مخدومؔ[1] ہے غزل بچّو!
شخصیت تھی حیات پھو
پھول کی طرح مدرسوں میں وقارؔ
سج رہی ہے برات پھو

---

[1] اُردو کے سدا بہار شاعر مرحوم مخدوم محی الدین کی غزل سے استفادہ اور ردیف "پھولوں کی" دنیا بھر کے مہکتے پھو کی طرف اشارہ ہے (و، خ)

محترمہ رضیہ سجاد ظہیر



صبر شہزادہ

ایک پرانی لوک کہانی نئے انداز میں لکھی گئی

ایک تھا بادشاہ، اس کی تین بیٹیاں تھیں، سب چھوٹی بڑی خوبصورت اور حسین تھی، چندے آفتاب، چندے ہتاب! جب کالی چوڑیاں پہن لیتی تو یوں لگتا جیسے صندل ڈالی میں کالا سانپ لپٹا ہے، پان کا ایک سے دوسرا کھاتی تو گلے میں سرخی جھلکنے لگتی، نازک اتنی کہ جوہی کے پھول میں تلتی تھی اس لیے اس کا نام جوہی شہزادی نیا تھا۔

پھر اچھے گنوں کی اچھے ڈھنگ والی، اچھے سے کھانا پکانا جانتی، سینا پرونا جانتی، پھول پتیاں بنانا ن، سب سے محبت کا برتاؤ کرتی، پڑھی اتنی کہ جانوروں لی بھی سمجھتی تھی، سب ہی اس کو چاہتے تھے اور باپ بادشاہ تو جان چھڑکتے۔ اسی لیے دونوں بڑی بہنیں سے جلتیں۔

پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ملکہ مر گئیں، بادشاہ نے جلدی دونوں بڑی بہنوں کی شادیاں کر دیں، جوہی دی باپ کے پاس اکیلی رہ گئی۔ بادشاہ کو جوہی کی شہزادی کا دلہا بنے۔ وہ بیٹی کو چاہتے تو بہت تھے پر بیاہنا تو تھا ہی، بیٹی تو ایسا ہاتھی ہے جو کبھی بادشاہوں سے بھی نہیں باندھا گیا۔ جوہی شہزادی بہت سمجھدار تھی، سب کچھ سمجھتی تھی پر چپ رہتی تھی۔

ایک دن بادشاہ کو بہت دور کسی ملک کے بادشاہ کے یہاں سے بلاوا آیا۔ بڑی تیاریاں ہونے لگیں، لاؤ لشکر، سپاہی گھوڑے، خیمے ڈیرے۔ جوہی شہزادی نے باپ کا سارا سامان اپنی نگرانی میں بندھوایا۔ جب بادشاہ محل کے دروازے سے باہر نکلنے لگے تو سبھی لوگ وہاں اکٹھا ہو گئے۔ بادشاہ نے ہر ایک سے پوچھا کہ اس کے لیے کیا لائیں۔ سب نے اپنی اپنی فرمائشیں بیان کیں۔ مگر جوہی شہزادی وہاں نہیں تھی، باپ کو جاتا دیکھ کر اس کی بڑی بڑی کٹورا سی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے اور وہ اپنے آنسو چھپانے کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور وہاں سے جا نماز بچھا کر دونوں ہاتھ اٹھائے، رو رو کر خدا سے دعا مانگ رہی تھی کہ اس کے ابا جان سلامتی کے ساتھ واپس آ جائیں۔

آیا کہ میری لاڈلی جوہی نے تو کوئی فرمائش کی ہی نہیں۔ انھوں نے ایک نوکرانی کو حکم دیا: "جلدی سے جاؤ جوہی بی بی سے پوچھ کر آؤ، ان کے لیے ہم کیا لائیں"

نوکرانی دوڑی گئی اور جوہی سے بولی: "بی بی بادشاہ سلامت سدھار رہے ہیں، آپ سے دریافت فرمایا ہے کہ آپ کے لیے کیا لائیں"

جوہی دعا مانگ رہی تھی، "بیچ میں کیسے بولتی" ایک ہاتھ اٹھا کر آہستہ سے کہا: "صبر" یعنی ذرا سا رک جاؤ بتاتی ہوں!

نوکرانی اتنی جلدی میں تھی کہ وہ رکی ہی نہیں، دوڑتی باہر بھاگ گئی۔ بادشاہ ہاتھی پر سوار ہو چکے تھے، انھوں نے وہیں سے جھک کر نوکرانی کی طرف دیکھا اس نے منھ اٹھا کر زور سے کہا: "سرکار، بی بی نے عرض کیا ہے، صبر لیتے آیئے گا"

بادشاہ نے شور و غل میں کچھ سنا، کچھ نہیں سنا، سمجھا کہ صبر اس جگہ کی کوئی سوغات ہوتی ہوگی ——— نقیب نے سواری روانہ ہونے کا اعلان کیا ڈنکے پر چوٹ پڑی، شاہی قافلہ چل پڑا۔

اس دوسرے ملک میں بادشاہ کی بڑی خاطر مدارات ہوئی، عمدہ سے عمدہ ناشتہ عمدہ سے عمدہ کھانا۔ سونے کے برتنوں میں لگ کر، چاندی کے خوانوں میں سجا، کارچوبی خوان پوش پڑے رہتے۔ دن کے وقت دربار لگتا، کاروبار کی باتیں ہوتیں، رات کو دونوں بادشاہ امیروں وزیروں کے ساتھ بیٹھتے، زرق برق کپڑے پہنے، ہیروں کی انگوٹھیاں اور بازوبند، گلے میں سچے موتیوں کی مالائیں۔ شمعیں اور کنول روشن ہوتے، رات کا سماں، شعر شاعری، گانا بجانا، ناچ رنگ ۔ شہزادی کے باپ بادشاہ اپنے میزبان کے کلاکاروں، شاعروں داستان گویوں کو انعام اکرام دیتے ۔

کئی دن بعد بادشاہ نے اپنے میزبان سے اجازت مانگی۔ میزبان نے اسی وقت شہر کے سوداگروں کو حکم دیا کہ ملک بھر کی بہترین سوغاتیں لے کر حاضر ہوں۔ سوداگر قیمتی اور خوبصورت سامان لے کر آ پہنچے۔ بادشاہ نے اپنے سب خاندان والوں کے لیے تحفے پسند کر لیے۔ پھر یاد آیا کہ جوہی نے کس چیز کی فرمائش کی تھی میزبان سے کہنے لگے: "بھائی میری بیٹی جوہی نے 'صبر' لانے کی فرمائش کی تھی۔ آپ کے ملک میں ایسی کوئی چیز ہے؟" بادشاہ نے سوداگروں کی طرف دیکھا سب نے سر ہلا کر انکار کیا۔ مگر بادشاہ نے امیروں اور سوداگروں سے کہا: "آپ لوگ ملک بھر میں تلاش کیجیے۔ میرے مہمان کی عقل مند بیٹی کسی ایسی چیز کی کیوں خواہش کریں گی جس کا کوئی مطلب ہی نہ ہو" ملک بھر میں شہر شہر ڈھنڈورا پیٹا گیا، کونا کونا چھان مارا گیا، کنوؤں میں بانس پڑ گئے۔ مگر ہر طرف سے یہی جواب ملا کہ اس نام کی چیز یہاں نہیں ہے۔

جس دن بادشاہ روانہ ہونے والے تھے اس دن شہزادے سے ان کی ملاقات ہوئی۔ وہ ایک کام سے ملک کے باہر گیا ہوا تھا، مہمان بادشاہ

سے مل کر نہایت خوش ہوئے۔ سجیلا جوان، پڑھا لکھا۔ بہادری میں شہرۂ آفاق، نیکی میں طاق، اپنے ماں باپ اکلوتا تھا مگر لاڈ پیار نے اسے بگاڑا نہ تھا۔ مہمان کو جھک کر تسلیم بجا لایا۔ انھوں نے اس کو گلے لگایا، نام ر کام پوچھا۔

اس نے عرض کیا "بندے کو صبر کہتے ہیں۔ جان نے تجارت کی وزارت میرے سپرد کر دی ہے۔ ی سلسلے میں باہر گیا ہوا تھا یہی وجہ ہے کہ اب تک ہور کے سلام کو حاضر نہ ہو سکا۔"

بادشاہ اس کا نام سن کر چونک پڑے مگر چپ ہے۔ پھر شہزادے کے باپ بادشاہ نے کل ماجرا بیان یا۔ شہزادہ مسکرایا با ادب بولا "بندہ ابھی حضور کی دمت میں صاحبزادی کے لیے ایک سوغات پیش کرتا ہے۔" اپنے کمرے میں جا کر خود ایک لال مخمل کا بکس لایا اور دونوں شاہوں کے سامنے رکھ کر کھولا۔ اس میں ایک سونے کا وٹا سا نازک پنکھا رکھا ہوا تھا جس کی ڈنڈی پر ہیرے ئے تھے۔ پنکھے پر لال اور زمرد جگمگا رہے تھے، سچے تیوں کی دوہری جھالر تھی۔ اور چوٹی پر ایک کلغی بنی تھی ں پر کندن سے شہزادے کا نام "صبر" کھدا تھا۔ ت خوش ہوئے۔ پنکھے والے بکس کو انھوں نے اپنے ص سامان میں رکھ لیا۔

جب بادشاہ اپنے ملک پہنچے، سب کی سوغاتیں ر تحفے بانٹ دیے تو چوہی شہزادی کو گلے لگا کر بہت [illegible]

اور پنکھے کی خوبصورتی پر حیران رہ گئی، دو چار منٹ اسے دیکھا اور بکس بند کر کے اپنے زیورات کی تجوری میں رکھ دیا۔

پھر جب گرمیوں کا موسم آیا تو ایک دن شہزادی اپنا کمرہ اندر سے بند کیے، پلنگ پر لیٹی کوئی کتاب پڑھ رہی تھی، وہ چوہی کے رنگ کے ریشمی کپڑے پہنے تھی گرمی کے مارے اس نے اپنا چوہی کے رنگ کا، پیاز کے چھلکے سا باریک کامدانی کا دوپٹہ پاس ہی تخت پر ڈال دیا تھا۔ لیٹے لیٹے اسے ایک دم خیال آیا کہ ابا جان جو پنکھا لائے تھے وہ تو میں نے اب تک ایک بار بھی نہیں جھلا، دیکھیں ذرا اتنے قیمتی اور خوبصورت پنکھے سے ہوا کیسی نکلتی ہے۔ اُف کتنی گرمی ہے! وہ اٹھی تجوری کھولی، پنکھا نکالا، پھر پلنگ پر لیٹ گئی اور پنکھے کو جھلا ——— اوئی اللہ دیکھتی کیا ہے کہ سامنے ایک شہزادہ کھڑا ہے ——— لمبا قد، سجیلا جسم خوبصورت، کمر میں تلوار لگائے، اس شہزادے نے جھک کر شہزادی کو سلام کیا ——— شہزادی نے لپک کر تخت پر سے دوپٹہ اٹھا کر اوڑھا اور دروازہ کی طرف بھاگی مگر شہزادے نے اس کے دوپٹہ کا لہراتا دامن پکڑ لیا اور بولا "چوہی شہزادی، کیا آپ کے یہاں گھر آنے والے کے ساتھ یہی کیا جاتا ہے۔ میں اتنی دور سے آیا اور آپ مجھے دیکھ کر بھاگی جا رہی ہیں۔"

شہزادی کو بڑا غصہ آیا۔ بولی "آپ ہیں کون؟ اور میرے کمرے میں اس طرح آنے کی آپ ہمت کیسے ہوئی؟"

[illegible]

میں فلاں ملک کے بادشاہ کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ اور مجھے آپ نے بلایا ہے اس لیے میری ہمت یہاں آنے کی ہوئی۔

شہزادی اور بگڑی "میں نے؟ میں نے تو آپ کو نہیں بلایا، میں تو آپ کو جانتی بھی نہیں ہوں"

"کیا آپ نے اپنے ابا جان سے صبر نہیں منگوایا تھا؟ میں نے ہی تو آپ کو یہ پنکھا بھیجا ہے جسے سیدھی طرف جھل کر آپ نے مجھے یہاں بلایا، ویسے اگر آپ خفا ہوتی ہیں تو پنکھا الٹا جھل دیجیے، میں چلا جاؤں گا۔ میں کسی برے ارادے سے نہیں آیا ہوں۔ میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتا"

اب شہزادی کو ایک دم یاد آیا کہ اس نے نوکرانی سے کہا تھا "صبر" — وہ مسکرا پڑی، اس کو مسکراتے دیکھ کر شہزادہ بھی مسکرا دیا۔ اتنے میں کچھ آہٹ ہوئی۔ شہزادی سہم گئی "ہائے اللہ، کوئی آ رہا ہے" صبر شہزادہ دھیمے سے بولا "فوراً پنکھا الٹا جھل دیجیے"

شہزادی نے پنکھا الٹا جھل دیا، شہزادہ غائب ہو گیا۔ شہزادی پلنگ پر بیٹھ کر سوچنے لگی کہ یہ سب کیا خواب تھا یا سچ؟

دوسرے دن وہ پنکھا لے کر باغ کے ایک اکیلے کنج میں گئی اور دھڑکتے دل سے پنکھا جھلا — جھم سے صبر شہزادہ آ گیا۔

پھر تھوڑے دنوں بعد صبر شہزادے کے باپ بادشاہ نے اپنے بیٹے کے واسطے جوہی شہزادی کے [illegible] پیغام بھیجا۔ بادشاہ نے بڑی خوشی سے قبول کر لیا کہ اس نے صبر شہزادے کو ہر طرح اپنی شہزادی کے لائق [illegible]

دونوں طرف سے بڑی دھوم دھام سے شا[illegible] کی تیاریاں ہوئیں۔ جوہی شہزادی کی دونوں بڑی بہنیں بھی شادی میں آئیں، مگر وہ صبر شہزادے کو دولہا دیکھ کر جل کے خاک ہو گئیں، کیونکہ ان دونوں کے شوہروں میں سے کوئی بھی اتنا خوبصورت اور سجیلا نہیں تھا نہ کسی کی بہادری کی اتنی دھوم تھی، نہ وہ اتنے پڑھے لکھے۔ اور ان دونوں کو اس بات کی بھی جلن تھی کہ جوہی جب چاہے پنکھا جھل کر شہزادے کو بلا لیتی تھی۔

شادی کے بعد شہزادہ رہ گیا اور برات واپس چلی گئی، دونوں سمدھیوں نے یہ طے کیا تھا کہ دولہا د[illegible] اور جہیز، سب سامان دو چار دن بعد جائے۔

ایک دن جوہی شہزادی کی دونوں بہنوں نے اس سے کہا کہ "آج رات کو ہم دونوں تمہاری سیج سجا[illegible] گے، ہم کو اس کا بہت ارمان ہے" بھولی بھالی جو[ہی] نے مان لیا۔ دونوں بہنوں نے کیا کیا کہ بہت سی چوڑیاں توڑیں اور باریک شیشہ بستر پر بچھا دیا اور اس پر ایک بالکل مہین زری کی چادر بچھا دی۔ رات کو کھانے کے بعد دونوں بہنیں اپنے اپنے گھر چلی گئیں۔ جب شہزادہ اور جوہی اپنے کمرے میں گئے تو جوہی کو کپڑے بدلنے میں ذرا دیر لگی، شہزادہ پہلے ہی جا کر سیج پر لیٹ گیا مگر لیٹتے ہی وہ زور سے چلایا، شہزادی جلدی پنکھا الٹا جھ[ل] [illegible]

بلکہ اس دوڑی ہوئی آئی "کیا ہوا کیا ہوا؟"

"تم پہلے پنکھا جھلو، میری جان نکل رہی ہے، پھر دیکھنا کہ اس سیج میں کیا ہے۔" شہزادی نے پنکھا جھل دیا، شہزادہ غائب ہوگیا۔ پھر شہزادی نے سیج دیکھی تو اپنا سر پیٹنے لگی۔ ہائے اس کی بہنوں نے بے قصور اس کے ساتھ ایسا کیا۔

تھوڑی دیر بعد اس نے پنکھا جھلا تو شہزادہ آیا ہی نہیں ——— آتا کیسے، وہ تو اپنے یہاں بستر پر پڑا تھا۔ شیشے اس کی رگ رگ میں بیٹھ گئے تھے دنیا کے حکیم وید سب اکٹھے تھے مگر کسی سے کچھ بن نہیں پڑ رہا تھا۔ پل پل صبر شہزادے کی حالت بگڑ رہی تھی۔

جوں ہی شہزادی نے جوگی کا بھیس لیا، بدن پر بھبوت ملا، پاؤں میں چیتھڑے باندھے، لمبی لمبی ناگن ایسی زلفوں میں مٹی لگائی اور باپ سے اجازت مانگی کہ اپنے شہزادے کے دیس کو جائے۔ باپ اس کی یہ حالت دیکھ کر دھاڑوں دار رو دیا، بولا۔ "بیٹی تیرے ساتھ لاؤ لشکر سپاہی کردوں، تو نازوں کی پالی، اکیلی جنگلوں کی خاک چھانے گی ———"

مگر شہزادی نہ مانی، بولی "باباجان قسمت تو میری لیلی کی ہی پھوٹی ہے۔ پھر کون میرا ساتھ دے سکتا ہے۔ میں اکیلی ہی پیا کی نگری جاؤں گی۔"

سنسان جنگل تھا، رات کا وقت، چاندنی پیڑ کے پتوں سے کرتی تھی جیسے چھلنی سے روشنی، درخت پر دو بکھو بیٹھے تھے۔ نر اور مادہ۔ [illegible]

پوچھا "یہ کون لڑکی ہے؟"

نر ہنسا — بولا "تو پہچان گئی کہ اس جوگی کے بھیس میں لڑکی ہے؟"

مادہ بولی "ہاں، سو تو میں پہچان گئی پر یہ ہے کون؟"

نر بولا "یہ ایک قسمت کی ماری شہزادی ہے، اس کی بہنوں نے اس کے ساتھ چلتر کیا" اور پھر اس نے سارا قصہ سنا دیا۔ مادہ افسوس کرتی ہوئی بولی — "ہائے ہائے تو کیا اب کوئی ترکیب نہیں ہو سکتی کہ شہزادہ بچ جائے؟"

"ہو تو سکتی ہے، مگر انسان ہماری بولی نہیں سمجھتے، ہم کیسے ان کو سمجھائیں کہ اس پیڑ کے نیچے جو یہ ہماری بیٹ پڑی ہے اس کا لیپ اگر شہزادے کے جسم پر کر دیا جائے تو سب شیشے جھڑ جائیں گے اور وہ بھلا چنگا ہو جائے گا۔"

جوں ہی شہزادی تو جانوروں کی بولی سمجھتی تھی۔ ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی اور جلدی جلدی انگوچھے میں اس نے پکھیرؤوں کی بہت سی سوکھی بیٹ اکٹھی کرلی۔

شہر پہ سوگ چھایا تھا، سب رعایا سڑکوں پر نکل آئی تھی، لوگ دعائیں مانگ رہے تھے اور رو رہے تھے، ایک جوگی، شہر کے پھاٹک سے اندر آیا۔ پوچھا۔

"کیا ماجرا ہے لوگو! کیوں رو رو کے جان کھوتے ہو؟"

ایک دکان دار بولا "کیا بتائیں کہ کیا بیتا [illegible] ہمارا ایک ہی شہزادہ [illegible]

کا مہمان ہے۔"

جوگی بولا "مجھے اس کے پاس لے چلو، میرے پاس ایک دوا ہے، اکسیر ہے، لگاتے ہی اچھا ہو جائے گا۔"

بستر پر شہزادہ مردوں کی طرح پڑا تھا۔ اس کے منہ پر ہلدی سی تھپ گئی تھی، سانس الٹا چل رہا تھا۔ ماں باپ تڑپ رہے تھے، محل بھر میں کہرام مچا تھا۔ جوگی نے اپنا لیپ تیار کیا، شہزادے کے جسم پر ملا اور لوگوں نے خدا کی قدرت کا تماشہ دیکھا، شیشے لوں اس کے بدن سے جھڑنے لگے جیسے کوئی مصری پیس کر بکھیر رہا ہو!

بادشاہ اور ملکہ جوگی کے پیروں پر گر پڑے "جوگی جی مہاراج، آپ کی کیا خدمت کریں، جو کہیے حاضر کریں۔ آپ کو اپنی کھال کے جوتے پہنائیں، زندگی بھر ہمارے یہاں رہیے، آدھی سلطنت کے مالک بنیے، جو حکم دیجیے، پلک جھپکتے میں پورا ہوگا۔"

جوگی مسکرایا "بابا، جوگی کی کیا میت، جلتے پھرتوں کو کس بات کا لالچ ـــــ ہاں شہزادے کی انگلی میں آپ نے جو یہ لال کی انگوٹھی پہنائی ہے یہ جوگی کے من کو بہت بھائی ہے۔"

شہزادہ بولا "جوگی جی، یہ انگوٹھی میری بیوی نے مجھے اپنے ہاتھ سے پہنائی تھی، عورت کے دل میں بڑی جلدی شک آجاتا ہے۔ آپ کوئی اور چیز مانگیں۔"

جوگی، پھر مسکرایا، اٹھ کر چلنے لگا، شہزادے کی ماں نے شہزادے کی انگلی سے انگوٹھی اتار جوگی کے ہاتھ پر رکھ دی، پھر جوگی کسی سے کچھ نہ بولا اور نہ کسی

نے جانا کہ وہ کدھر گیا۔

جو ہی شہزادی نے دھانی ریشم کا جوڑا پہن بال گنج موتی پروپا، ماتھے پر ٹیکہ، ناک میں نتھ، گلے اور ہیرے کے زیور ہاتھوں میں سہاگ کی لال چوڑیاں ــــ کی چادر پر بیلے کی سیج پر بیٹھی، دروازہ اندر سے اور پنکھا آہستہ سے جھلا ــــــ

صبر شہزادہ مسکراتا ہوا آپہنچا، دونوں مراد برآئی۔ مگر جو ہی شہزادی نے جب شہزادے پکڑا تو اپنی انگوٹھی اس کی انگلی میں نہ پائی آنکھ آنکھوں میں شکایت کی، شہزادے نے سارا قصہ مگر شہزادی کو یقین نہ آیا بولی "آپ نے کسی عو دی ہے۔"

اب شہزادہ ہے کہ بار بار قسمیں کھاتا ہے کرتا ہے، مناتا ہے مگر شہزادی یہی کہے جاتی۔ آپ نے کسی عورت کو دی ہے۔ آخر جب وہ شہ کو خوب تنگ کر چکی تو اس نے تکیے کے نیچے سے نکالی اور ہتھیلی پر رکھ کر شہزادے سے پوچھا "یہ نے کس عورت کو دی تھی!" ــــــ تب شہزادے کی سب کچھ آگیا اور وہ جو ہی شہزادی کی محبت اور ہمہ گیا ــــ اگلے دن جو ہی شہزادی بہت سا دان اور بابل کی دعائیں لے کر اپنے سسرال چلی گئی اور ہنسی خوشی رہنے لگی۔ جیسے اُن دونوں کے دن پھ ویسے ہی کہتے سنتوں کے دن پھریں اور جیسے ان پوری ہوئیں کہتے سنتوں کی پوری ہوں۔

سناب بزمی بھارتی



رام محمدؐ ڈیسوزا

کلیوں کا ارمان ہیں ہم سب　　غنچوں کی مسکان ہیں ہم سب
ہم نے گلوں کو خوش بو دی ہے　　گلزاروں کی جان ہیں ہم سب
چاند کی دنیا سے بھی آگے　　کل کو اڑ کر ہم جائیں گے
سینے پر اب نیل گگن کے　　پرچم اپنا لہرائیں گے
مسجد، مندر، گرجا والے　　دھرم کی دیوی کے رکھوالے
نفرت اپنی حد تک رکھیں　　ہم ہیں الفت کے متوالے
کندن اور پکھراج کے ٹکڑے　　دھرتی کے ہم چاند ستارے
سورج بننے والے ذرّے　　یعنی دنیا کے سب بچّے
سنگم گنگا، جمنا کا ہیں
رام محمدؐ ڈیسوزا ہیں



عزیزہ مہ نور

درخت کی کہانی

ایک دن ہوا یوں کہ منّے میاں اکیلے ہی سیر کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے ایک پارک میں پہنچ گئے۔ وہاں انھوں نے جب اپنے چاروں طرف سبزہ دیکھا۔ پیڑ پودے دیکھے۔ بے چارے سوچ میں پڑ گئے کہ اتنے بہت سے درخت، اتنے بہت سے پیڑ پودے کیسے کھڑے ہو گئے۔ یہ نہ تو چلتے پھرتے ہیں نہ ہماری طرح کھاتے پیتے ہیں نہ بات چیت کرتے ہیں نہ برسات میں بھیگ کر بیمار ہوتے ہیں نہ دھوپ میں سوکھ کر کانٹا ہوتے ہیں

منّے میاں اور آگے بڑھتے گئے اتنے میں انھیں ایک بڑا اور بوڑھا درخت نظر آیا اس کی شاخیں ایسے جھول رہی تھیں گویا منّے میاں کو اشارے سے اپنے پاس بلا رہی ہوں۔ وہ دوڑتے دوڑتے اس کے پاس گئے اور بلا جھجک بول پڑے۔

"بوڑھے دادا بوڑھے دادا۔ کیا ایک بات تم مجھے بتا سکتے ہو، تم نہ تو چلتے پھرتے ہو، نہ کچھ کھاتے پیتے ہو، نہ کھیلتے ہو پھر اتنے بڑے کیسے ہو گئے۔ اتنے دنوں سے زندہ کیسے ہو؟"

"بیٹا!" بوڑھے دادا نے منّے میاں ک
پریشان دیکھا تو کہنے لگے: "ہاں ہاں آؤ بیٹا"
ہی نہیں بلکہ اپنی برادری کا قصّہ بھی سناتا ہو
دراصل تمھاری ہی طرح ہوں۔ تمھاری ہی
ہوں اور نہ صرف اپنی غذا آپ تیار کرتا
بھی میری ہی برادری کا بنایا ہوا اناج، تر
کھاتے ہیں۔ میرا جسم بس اتنا ہی تو نہیں ہے
کے اوپر دیکھ رہے ہو۔ میری جڑیں تو ز
بھی بہت دور تک چلی گئی ہیں۔

"کسی زمانے میں میں ایک ننھی
تو تھا بس ایک بیج یا دانہ۔ نہ جانے کس
چلا گیا۔ شاید کسی نے جان بوجھ کر بیج ک
مجھے بویا ہو یا پھر وہ ہوا میں یہاں تک
کہہ نہیں سکتا۔"

"زمین کے اندر پہنچا تو مجھے و
اس پانی میں گھلے نمک ملے، میرے اندر
ابھارا۔ سو بڑا تھا لودے کی شکل میں با

یا اور پتیوں اور ڈنٹھل کے ساتھ باہر آگیا اور پھر بڑھتے
نے دیکھو میں کتنا بڑا ہو گیا۔

"ارے ہاں یاد آیا ذرا ٹھہرو، لگے ہاتھوں میں
بیجوں کے بارے میں بھی کچھ بتاتا چلوں۔ بیج
کے ہوتے ہیں۔ ایک تو اکلوتے دانے کے ہوتے
سے۔ راگی، چاول، ناریل اور مکئی وغیرہ۔ دوسرے
جڑواں دانے ہوتے ہیں جیسے مونگ۔ اور آم
۔ تربوز اور خربوزہ وغیرہ۔ بیج جسامت میں
کے دانے جتنے باریک بھی ہوتے ہیں اور آم کی
طرح بڑے بھی ہوتے ہیں۔

"جڑواں بیجوں کے اوپر ایک سخت اور سوکھا چھلکا
۔ کسی میں موٹا ہوتا ہے کسی میں باریک ہوتا ہے
اندر ایک اور نہایت ہی پتلا اور نرم چھلکا ہوتا
والے چھلکے کے ایک طرف ایک لمبی سی باریک اور
ہوتی ہے یہیں پر بیج پھل سے لگا ہوتا ہے اس
سرے پر ننھا سا سوراخ ہوتا ہے۔"

دال ان چھلکوں کے اندر محفوظ ہوتی ہے جس
ہونے والے پودے کے لیے غذا ہوتی ہے۔"
دال کے دونوں پاٹوں کے درمیان دو ننھے سے
ہوتے ہیں یہ ایک طرف نوک کے سے عضو کے
ے ہوتے ہیں۔ اکلوتے دانے والے بیجوں میں صرف
کا ہوتا ہے اور یہ پتے ایک کونے میں لگے
۔"

بڈھے دادا سانس لینے کے لیے کچھ رکے ہوا چلی

شروع کیا: "بیج سے درخت کیسے پیدا ہوتے ہیں؟ بیج کو جب بویا جاتا ہے تو چھلکے پر جو سوراخ ہے اس کے ذریعہ پانی اندر جذب ہونے لگتا ہے اور بیج پھولتا جاتا ہے یہاں تک کہ دونوں چھلکے پھولتے ہوئے دال کے دباؤ سے پھٹ جاتے ہیں ساتھ ہی نوکیلا سرا اور دونوں پتے بھی بڑھنے لگتے ہیں۔ بیج کے دونوں پاٹ کھل جاتے ہیں اور نوک بیج سے نکل کر زمین میں اندر کی طرف بڑھتی جاتی ہے۔ اور جڑ بن جاتی ہے لیکن پتے اوپر نکل آتے ہیں۔ کبھی کبھی بیج کے کھلے ہوئے پاٹ بھی اوپر آجاتے ہیں یہ پتے دھوپ لگنے پر سبز ہو جاتے ہیں اور غذا پیدا کرنے لگتے ہیں۔ پھر جڑ سے کئی چھوٹی چھوٹی جڑیں اِدھر اُدھر پھوٹتی اور نیچے کی طرف بڑھنے لگتی ہیں۔ اُوپر ٹہنیاں اور پتے بھی پھوٹنے اور بڑھنے لگتے ہیں۔ اس طرح یہ پودا دھیرے دھیرے بڑھنے لگتا ہے اور پھر بیل کا پودا ہو تو بیل یا درخت ہو تو درخت بن جاتا ہے۔"

اتنا کہہ کر بوڑھے دادا ذرا کی ذرا سستائے اور پھر کہا: "تم تو یہ جانتے ہی ہو کہ پیڑ کے دو حصے ہوتے ہیں ایک تنا جس میں شاخیں پتے پھول اور پھل لگے ہوتے ہیں اور دوسرا جڑ۔ اب ہر حصّہ اپنے کام میں لگ جاتا ہے تم جانو جب طوفانی ہوائیں چلتی ہیں تو سمندر میں بڑے بڑے جہاز اُلٹ جاتے ہیں زمین پر تم جیسے چھوٹے بچے اور کمزور آدمی گر پڑتے ہیں لیکن کچھ کمزور یا بوڑھے درختوں کو چھوڑ کر سارے درخت صرف جھولتے ہیں پر گرتے نہیں! تو گویا یہ سارا کارنامہ جڑ کا ہے اور اس کا کام

بھی ہے۔ اس کے علاوہ زمین میں جو پانی اور نمک ہوتا ہے بعض جڑوں کے ذریعے ہمارے جسم میں داخل ہوکر نس نس میں سما جاتا ہے۔ چھوٹے پودوں کی جڑیں زمین میں صرف تھوڑی دور تک پہنچتی ہیں لیکن اونچے اور بھاری درختوں کی جڑیں بہت گہرائی تک چلی جاتی ہیں تاکہ کافی مقدار میں نمک اور پانی حاصل کر سکیں اور درخت مضبوطی سے زمین میں جما رہے۔ کچھ پودے بچی ہوئی غذا اپنی جڑوں میں جمع کر لیتے ہیں یہ جڑیں ترکاریوں کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ مولی، شکرقند، اور گاجر ایسی ہی جڑیں ہیں۔

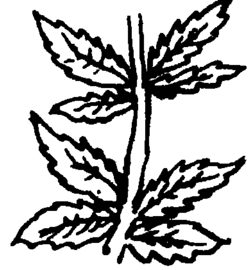
"پھر تم جانو درخت کے لیے تنا کتنے کام کا ہے تنا ہمیشہ دھوپ کی طرف بڑھتا ہے۔ اس پر جگہ جگہ گرہیں بنی ہوتی ہیں جہاں سے ڈالیاں، پتے اور پھول نکلتے ہیں۔ کچھ درختوں کا تنا مضبوط ہوتا ہے اور سیدھا بڑھتا ہے لیکن چند کا کمزور ہوتا ہے اس صورت میں وہ کسی مضبوط سہارے سے اپنے کو لپٹتا ہوا اوپر چڑھتا ہے جیسے پان کریلا اور چمیلی کی بیلیں وغیرہ۔ کچھ پودوں کے تنے زمین پر ہی رینگتے ہوئے پھیلتے ہیں جیسے ہریالی، ککڑی وغیرہ۔ اسی طرح کچھ درختوں میں شاخیں ہوتی ہیں جیسے برگد اور گھنا پیڑ لیکن کچھ بے شاخ ہوتے ہیں جیسے ناریل پپیتا کیلا اور چھالیا کے پیڑ عموماً اکلوتے دانے والے بیجوں کے پیڑ بے شاخ ہی ہوتے ہیں۔ پھر کچھ تنے کھوکھلے ہوتے ہیں تو کچھ تنے مضبوط ہوتے ہیں۔ تنے کے اندر نیچے سے اوپر تک نلکیاں سی بنی ہوتی ہیں بالکل اسی طرح جیسے [illegible]

کے ذریعے جڑوں میں جذب کیے ہوئے پانی اور نمک پتوں اور پھولوں تک پہنچائے جاتے ہیں۔ ایک اور ط نلکیوں کے ذریعے پتوں میں تیار کی ہوئی غذا دوسر کو بھیجی جاتی ہے۔ کسی درخت میں جب پتے نہیں ہوت خود ہی غذا پیدا کرتا ہے۔ اور تو اور..."

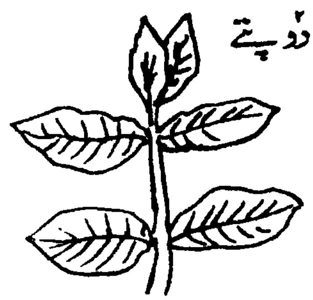
اتنا کہہ کر بوڑھے دادا کچھ دیر خاموش میاں بے چین ہو گئے انھوں نے جھٹ سے پوچھا: "ا پتوں میں تیار ہوتی ہے" بوڑھے دادا نے پھر بولنا

"ہاں بھئی پتے تو کارخانہ ہوتے ہیں ناجہاں ہوتی ہے۔ اور یہ پتے مختلف خاندان والے درختو شکل کے ہوتے ہیں۔ کسی درخت یا پودے کی پہچان پتوں کی شکل ہی سے ہوتی ہے۔ تم جانو کسی خاندان کے کنارے کھٹے پھٹے ہوتے ہیں تو کسی کے سالم کا پتہ تکونا ہوتا ہے تو کسی کا گول اور کسی کا کنگو کسی درخت کا پتہ تین حصوں میں بٹا ہوتا ہے تو چار حصوں میں۔ کسی ایک خاندان والے درختوں ک ہوتی ہے تو کسی اور خاندان کے درختوں کی پتیو ہوتی پھر پتوں میں جو یہ لکیریں لکیریں سی نظر آ پانی اور غذا کی نلکیوں کی مہین اور باریک شا شاخیں ایک دال والے بیج کے درختوں کے پتوا دوسرے کے متوازی یا مقابل بنی ہوتی ہیں او سے کہیں نہیں ملتی ہیں۔ دو دال کے بیج والے د پتوں میں ان شاخوں یا نسوں کا ایک جال۔ پھر ٹہنی پر پتوں کے لگنے کا طریقہ بھی مختلف [illegible]

اندان کے درخت میں یہ گھیردار طریقے سے لگتے ہیں یعنی
ماخ یا تنے کے چاروں طرف ایک ہی قطار میں



ں اور میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ڈالی کے دائیں
ر بائیں دو دو پتے



ی میں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر ڈالی کے دائیں اور
ںا ایک ایک پتہ لگا ہوتا ہے



ں میں کچھ کچھ فاصلے پر ایک ہی جگہ پر بہت سے
ں کا گچھا سا لگتا ہے۔"



بوڑھے دادا نے اتنا کہا تھا کہ اندھیرا بڑھنے لگا اور منّے میاں کچھ گھبرائے گھبرائے سے نظر آئے اس لیے بوڑھے دادا نے کہا۔

"اچھا ننھے میاں تم اب گھر کی راہ لو تمھاری امّی اور ابّا پریشان ہوں گے۔"

ہاں بھئی ایک بات :- آپ بھی منّے میاں کی طرح کہیں یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ یہ روداد بوڑھے درخت نے سنائی، کہیں درخت بھی بات کرتے ہیں بھلا؟ یہ تو ایک صاحب پیڑ پر بیٹھے سنا رہے تھے اور منّے میاں کے سوال پر جھٹ سے درخت دادا کا روپ دھار کر درخت کی کہانی سنانے لگے تھے۔

[redacted]

صفحہ ۶۴ کا بقایا

دیر کھودتا رہا۔ دم کا کچھ حصّہ باہر آیا تو گیدڑ بھیڑیے کی دم کو پکڑ کر کھینچنے لگا۔ یکایک گیدڑ اور بھیڑیے دونوں دور جا گرے۔ دم کا نکلا ہوا حصّہ زور لگانے کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا ——— پھر بھی بھیڑیے کو بہت خوشی ہوئی۔ قید سے رہائی جو مل گئی تھی۔ حالانکہ اس کی دم بہت چھوٹی اور کم بالوں والی ہو چکی تھی۔ لیکن اسے اس وقت اس بات کی فکر نہیں تھی۔

لطیفہ

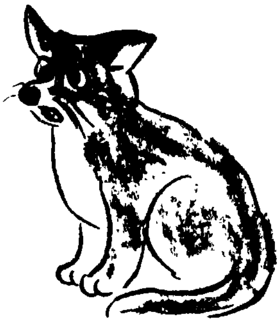
جیب کترا : (اپنے ساتھی سے) آج تمھارے ہاتھ میں تسبیح کیسے ہے؟ کیا خدا بہت یاد آ رہا ہے؟

ساتھی : [illegible]

جناب مناظر عاشق ہرگانوی



بھیڑیا اور گیدڑ



افریقی لوک کہانی

افریقہ کے کسی گھنے جنگل میں ایک بھیڑیا رہتا تھا۔ ایک دن اس کی ملاقات ایک گیدڑ سے ہوئی۔ دونوں میں بہت جلد دوستی ہو گئی۔ دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ باتیں کرتے کرتے بھیڑیے کی نظر گیدڑ کی لمبی دم پر پڑی۔ اسے اس کے گھونگھریلے بال اور اس کی گاؤدم شکل بہت پسند آئی۔ اس بات کا دکھ بھی ہوا کہ اس کی اپنی دم نہ تو گیدڑ کی دم کی طرح ٹیڑھی تھی نہ اس پر گھونگھرالے لہراتے بال تھے۔ وہ اپنے دل میں بہت جلا رہا نہیں گیا تو بولا۔ "گیدڑ بھائی، تمھاری دم اتنی لمبی، ٹیڑھی اور لہردار کیسے ہوئی؟"

"بھائی یہ راز کی بات ہے۔" گیدڑ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "یوں تو میں یہ بات کسی کو نہیں بتاتا۔ لیکن تم میرے دوست ہو۔ اس لیے تم سے کیا چھپانا؟ ہاں شرط یہ ہے کہ یہ بات تم کسی اور کو نہ بتانا۔"

"نہیں بھئی، مجھے کیا پڑی ہے؟" بھیڑیے کے لیے بے تاب تھا۔

"سنو، میں بتا ہی دوں۔" گیدڑ نے بڑ ڈرامائی انداز سے کہا۔ "ایسا مت سمجھو کہ میری ہمیشہ ایسی ہی رہتی ہے۔ کبھی کبھی یہ سیدھی بھی ہے۔ اور لہراتے بال تمھاری دم کے بالوں کی طر ہیں جب کبھی ایسا ہوتا ہے شام کو سیدھا اس کی چوٹی پر چلا جاتا ہوں۔ وہاں زمین میں سورا ہوں۔ سوراخ کو گہرا کھود کر اس میں اپنی دم دیتا ہوں۔ پھر میری بیوی اسے مٹی سے بھ ہے۔ رات بھر میں ویسے ہی بیٹھا رہتا ہوں۔ صبح ہی میری بیوی آتی ہے اور سوراخ سے مٹی ہٹ دم نکال دیتی ہے۔ رات بھر میں میری دم ٹیڑ لہردار ہو جاتی ہے۔"

کتنی آسان ترکیب ہے۔ بھیڑیے۔ وہ سیدھا گھر کی طرف بھاگا۔ گیدڑ نے اسے کتنی ترکیب بتائی تھی۔ جلدی میں وہ اس کا شکر

گھر آتے ہی بھیڑیے نے اپنی بیوی کو ساری بات بتائی۔ پھر اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ اس کی بیوی کو بہت ہنسی آئی۔ اس نے کہا "تمھیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ گیدڑ بڑا چالاک جانور ہے۔ اس نے یقیناً تمھیں بے وقوف بنایا ہوگا۔"

"نہیں جی، وہ تو میرا دوست ہے۔ بھلا مجھی کو بے وقوف بنائے گا؟" بھیڑیے نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ پھر بولا "اگر تمھیں میری خوب صورتی پسند نہیں ہے تو بات دوسری ہے۔"

بے چاری بیوی چپ رہ گئی۔ لیکن اسے یقین نہیں آیا۔ اس نے سوچا چلو مذاق ہی سہی میاں کو خود ہی سبق مل جائے گا۔

اسی دن شام کو بھیڑیا اپنی بیوی کے ساتھ پہاڑ کی چوٹی پر گیا۔ اس نے ایسی جگہ ڈھونڈھی جہاں مٹی ملایم تھی۔ بیوی کی مدد سے سوراخ کھودا۔ پھر گیدڑ کے کہنے کے مطابق اس سوراخ میں اپنی دم ڈال دی۔ بیوی نے اسے بھرنا شروع کیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں تھوڑی ہی دیر بعد اکتا کر بھیڑیا دم نکال نہ لے۔ اس لیے سوراخ کو اچھی طرح بھر دیا۔ پھر اس پر کود کود کر مٹی کو خوب دبا دیا۔ مٹی میں اس طرح دبنے سے بھیڑیے کی دم میں تکلیف ہونے لگی۔

"ارے ذرا مٹی کم کر دو۔ بہت تکلیف ہو رہی ہے، بہت درد ہو رہا ہے۔ مجھے نہیں چاہیے ٹیڑھی لہردار دم۔ اسے نکال دو" بھیڑیے نے گڑگڑا کر کہا۔ لیکن اس کی بیوی اتنے کمزور ارادے کی نہیں تھی۔

"ابھی ذرا صبر سے کام لو۔ میں نے تو تمھاری بات مان کر گڑھا کھودا۔ پھر مٹی بھری۔ اب میری بات مانو۔ رات بھر یہیں بیٹھو۔ میں سویرے آکر گڑھا کھود دوں گی۔ پھر اپنی ٹیڑھی دم کو ہوا میں لہراتے گھر واپس چلنا" اتنا کہہ کر بیوی نے گھر کی راہ لی۔

بھیڑیے کو بیوی پر بڑا غصہ آیا لیکن اب کر بھی کیا سکتا تھا۔ اداس اور مایوس نظروں سے اسے گھر کی طرف واپس جاتے دیکھتا رہا۔

پہاڑ کی اس چوٹی پر کوئی درخت نہیں تھا۔ زوروں کی ہوا چل رہی تھی۔ سردی بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ بھیڑیا سردی سے کانپنے لگا۔ اس کے دانت کٹکٹانے لگے۔ وہ زور زور سے غرانے لگا۔ لیکن اس سنسان جگہ میں آسمان کے تاروں کے علاوہ اس کی آواز کون سنتا؟ کبھی کبھی اسے اس بات کی یاد آجاتی کہ کل اس کی دم لمبی، ٹیڑھی اور لہردار ہو جائے گی۔ یہ سوچتے ہی خوشی کی ایک لہر اس کے چہرے پر دوڑ جاتی۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ وہ دم کے درد سے پریشان ہو جاتا اور اپنے آپ کو کوسنے لگتا۔

آہستہ آہستہ ٹھنڈک بڑھتی گئی۔ وہ زور زور سے چلانے لگا۔ لیکن وہاں دور دور مدد کو کوئی نہیں تھا؟ ساری دنیا آرام کی نیند سو رہی تھی۔

آخر رات ڈھلنے لگی اور سویرا ہوا۔ سورج کی کرنوں کے پڑتے ہی بھیڑیے کے جسم میں گرمی آئی۔ وہ خوشی خوشی بیوی کا انتظار کرنے لگا۔

پھر اس نے بیوی کو آتے دیکھا۔

"ارے جلدی کرو۔ میری دم تو نکالو۔ ذرا دیکھو تو سہی کہ کتنی خوب صورت ہو گئی ہے بیٹھے بیٹھے جی بھی اکتا گیا ہے۔" بھیڑیے نے زور سے پکار کر کہا۔

"کیا کہا؟ پہاڑ کی اس سنسان چوٹی پر بڑا مزہ آیا؟" بیوی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر جلدی جلدی زمین کھودنے لگی۔

"مجھے تو کوئی تکلیف نہیں ہوئی۔" بھیڑیے نے اطمینان دلاتے ہوئے کہا۔ "سچ پوچھو تو اس تنہائی میں بڑا مزا آیا۔ ایک بات اور سوچو۔ جب دوسرے بھیڑیے تمھارے شوہر کی ٹیڑھی اور لہراتی دم کو دیکھ کر جلیں گے تو تمھیں کتنا مزہ آئے گا؟ تمھاری وہ جھگڑالو پڑوسن سر پیٹے گی کہ اس کے دلہا کو یہ عقل کیوں نہیں آئی۔ اور دیکھو پہلے مجھے بھر پیٹ کھانا کھلانا۔ پھر ہم دونوں سبھی رشتے داروں سے ملنے چلیں گے۔ دیکھیں اب وہ مجھے کس طرح نیچی نظر سے دیکھتے ہیں۔ سب کا گھمنڈ ٹوٹ جائے گا۔ ٹھیک ہے نا؟"

"بات تو بہت اچھی کر رہے ہو۔ لیکن پہلے دم تو باہر نکالو۔" بیوی نے ہنستے ہوئے کہا۔

مٹی بہت کڑی ہو گئی ہے۔ مجھ سے کھودی نہیں جاتی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کیا کروں؟"

"نہیں جی ہمت مت ہارو۔" بھیڑیے اس کی ہمت بڑھاتے ہوئے کہا۔ "آخر میں زندگی یہاں بیٹھا تو نہیں رہ سکتا۔" وہ اداس بولا۔

بھیڑیے کو پھر تکلیف ہونے لگی۔ وہ سے چیخنے لگا۔ اس کی بیوی بھی ہمدردی میں رو لگی۔ ان کی آواز دور دور تک جنگل میں پھیل گئی۔ نے اپنے نئے دوست کی آواز پہچانی تو دوڑ آ پہنچا۔ راستہ بھر سوچتا آیا کہ آخر بھیڑیے پر کیسی بپتا آ پڑی ہے۔ وہاں آیا تو دیکھتے ہی ماجرا سمجھ گیا۔ اسے ہنسی آ گئی۔ زور زور سے ہنس

گیدڑ کی ہنسی سے بھیڑیے کو بے حد آیا۔ اس نے ڈانٹ کر کہا۔ "یہ مصیبت تمھ وجہ سے آئی ہے اور تمھی الٹے ہنس رہے ہو میری دُم کو جلدی سے نکالو۔"

"تمھارا مطلب سوراخ سے نکالنے ہے نا؟" گیدڑ نے ہنس کر پوچھا۔ اسے بھیڑ پر رحم آ گیا اور خود سوراخ کھودنے لگا۔ بھیڑ کی بیوی بھی ہمت کر کے کھودنے میں جٹ گئی لیکن دم تو برف سے جکڑی ہوئی تھی۔ نکلے کیسے؟

گیدڑ نے ایک بار زور لگایا۔ تھوڑ

ناب قیصر سرمست

شکار درندہ

صبح ہونے کو تھی جنگل کے تمام جانور اپنی اپنی پیاس
اپنی پناہ گاہوں کا راستہ لے چکے تھے جنگل کا شہنشاہ
ـ طویل انگڑائی کے بعد اپنی شکم پری کا اعلان کر چکا
ں لرزہ خیز دھاڑ کے باوجود تمام جانور صرف مطمئن
س لیے مطمئن تھے کہ وہ اپنا پیٹ بھرنے کے بعد
ی بجھا چکا ہے اور اب کسی جانور پر حملہ نہیں کرے گا۔
مگر یہ کیا؟ یہ ہرن اور بارہ سنگھے وغیرہ اتنے بدحواس
ں بھاگ رہے ہیں؟ اور یہ پیلی پیلی سی چیز بھاگتے
ارہ سنگھے پر کس طرح آ پڑی؟ بارہ سنگھا خون میں لتھڑا
ور اسی کے قریب وہ پیلی سی شئے پھولی ہوئی کھڑی
تھی پیٹ بھر چکا تھا۔ پھر یہ شرارت کس کمینہ جانور
؟

یہ تو بور بچّہ ہے جس کی فطرت میں درندگی اور
کی چیر پھاڑ ہے۔ پیٹ بھرنے کے بعد بھی وہ خاموش
ا۔ دوسرے درندے صرف رات کو شکار کرتے
ں کے لیے رات اور دن سب برابر ہیں۔ آدم خور
سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے کیونکہ [illegible]

سیدھا اور شریف جانور ہے اور یہ اتنا ہی مکار۔ درختوں
پر بآسانی چڑھ سکتا ہے اور درختوں پر سے گھروں میں
اتر آتا ہے۔ اس کے علاوہ شیر بے چارہ ہمیشہ دن میں
آدمیوں کا شکار کرتا ہے مگر یہ رات کی سیاہی سے فائدہ
اٹھا کر غفلت میں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار
دیتا ہے۔ شیر یا ببر سے ان ہی لوگوں کو خطرہ ہوتا ہے جن
کو جنگل میں جانے کی یا رہنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔
لیکن یہ کم بخت تو بستیوں ---- اور گاؤں میں آ کر مصیبت
ڈھاتا ہے۔ آدم خور ہوا تو انسان کی خیر نہیں ورنہ مرغا مرغی،
بھیڑ، بکری، ہرن وغیرہ سے ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ پالتو
کتّوں کو بھی اس سے پناہ نہیں ملتی۔ اس لیے کہ کتے کا
گوشت اسے بے حد پسند ہے، ہر فرعونے را موسیٰ کے مصداق
بور بچّہ کے جانی دشمن شیر اور مگرمچھ ہیں تیندوا بھی پرچھائیں
سے بھی بور بچہ بدکتا ہے اس لیے کہ تیندوا اس کے
مارے ہوئے جانور پر اس کو بھگا کر قبضہ کر لیتا ہے۔
بور بچّہ بڑا حریص اور بلانوش درندہ ہے۔
جنگل [illegible]

سانپ بھی کھا جاتا ہے۔ اپنے مارے ہوئے جانور کو تھوڑا سا کھا کر بچا ہوا حصہ شیر کی طرح وہیں نہیں چھوڑتا بلکہ کسی اونچے اور گھنے جھاڑ میں کسی محفوظ مقام پر رکھ دیتا ہے اور بار بار کئی دن تک یہی گوشت کھاتا رہتا ہے۔ سڑا گلا گوشت کھانے اور چیرنے پھاڑنے سے اس کے ناخن اور دانت زہریلے ہو جاتے ہیں۔ اگر کسی انسان کو یہ زخمی کر دے اور فوراً اس کا علاج نہ ہو تو زخم سڑنے لگتا ہے۔

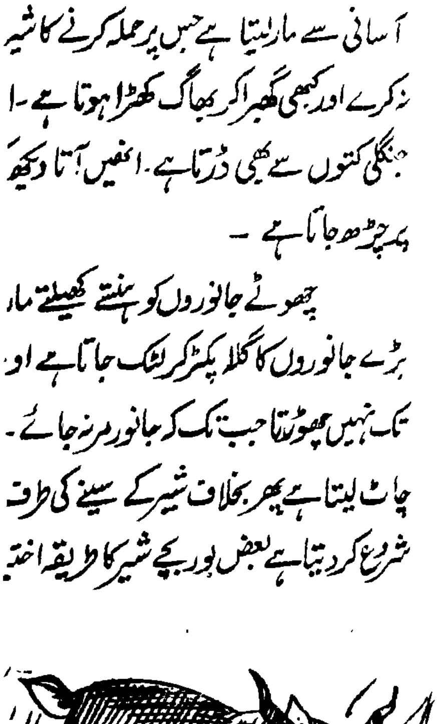
خونناکی اور ایذا رسانی میں بھی بور بچہ کا ثانی نہیں۔ بے چارا شیر اس کا قطعی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ شیر کے چھپنے کا پتہ انسان لگا سکتا ہے لیکن بور بچہ کا کوئی خاص ٹھکانا نہیں۔ اس کا جسم اور رنگ وغیرہ جنگل کے ماحول کے عین مطابق ہیں۔ اور حملہ میں مددگار ہو جاتے ہیں۔ تھوڑے سے فاصلے سے بھی اس کی موجودگی کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لیے یہ جانور انسان کے لیے بڑا خطرناک اور ایذا رساں ہے۔

شیر جیسی قوت تو خیر اس میں نہیں آ سکتی لیکن مکاری اور چالاکی سے بڑے بڑے معرکے سر کر لیتا ہے۔ بلی کی جماعت کا کوئی جانور چستی اور چالاکی میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ اس کے دیکھنے کی، سننے کی اور سونگھنے کی قوت بہت قوی ہے۔ قوت برداشت اور خاموشی اس کی سرشت میں داخل ہیں۔ انتہائی مصیبت اور تکلیف کے وقت بھی آواز نہیں نکالتا اگر بھٹ کے اندر چھپ جائے تو کوئی طاقت اسے باہر نکلنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ اور اگر درخت پر چڑھ جائے تو اس وقت تک نہیں اترتا جب تک کہ اسے خطرہ ٹل جانے کا پورا یقین نہ ہو جائے۔ ایک

مشہور شکاری مسٹر بلا بتھ کا بور بچہ کے متعلق کہنا۔ بہت خاموش رہتا ہے۔ اسے بولتے ہوئے نے سنا ہوگا اور اس میں اتنی چھوٹی جگہ چھپ صلاحیت ہوتی ہے کہ اس قد و قامت کا دوسرا ہی چھپ سکے۔"

بور بچہ اس وقت تک بہادری اور دکھاتا ہے جب تک کہ تجربہ نہ ہو۔ ایک بار تجربہ ا بعد بڑی ہوشیاری سے کام لیتا ہے۔ پھر بھی ا کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ اس کی ہمت کے متعلق ظاہر ہوتے ہیں۔ بڑا نر بور بچہ کبھی ایسے بڑے آسانی سے مار لیتا ہے جس پر حملہ کرنے کا شیر نہ کرے اور کبھی گھبرا کر بھاگ کھڑا ہوتا ہے۔ ا جنگلی کتوں سے بھی ڈرتا ہے۔ انھیں آتا دیکھ پر چڑھ جاتا ہے۔

چھوٹے جانوروں کو ہنستے کھیلتے مار بڑے جانوروں کا گلا پکڑ کر لٹک جاتا ہے او تک نہیں چھوڑتا جب تک کہ جانور مر نہ جائے۔ چاٹ لیتا ہے پھر بخلاف شیر کے سینے کی طرف شروع کر دیتا ہے بعض بور بچے شیر کا طریقہ اختیا

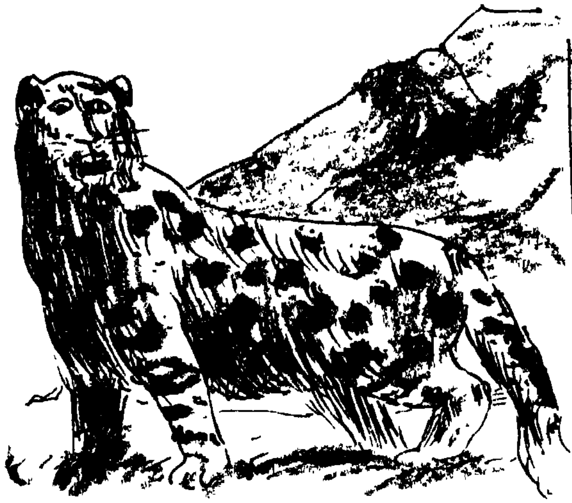


الوں کے پاس سے کھانے کی ابتدا کرتے ہیں۔

بور بچہ پانی میں شاذونادر ہی اترتا ہے۔ تیرنا تو سم گیلا کرنا بھی اسے پسند نہیں۔ شیر، ببر، چیتا، وغیرہ اندھے COLOUR BLIND ہوتے ہیں یہی ہے کہ وہ شکار کے لیے رات کو نکلتے ہیں جب کہ ساری ات اپنا اصلی رنگ روپ کھو کر خاکستری رنگ میں ڈوب ہے مگر بور بچہ دن میں بھی شکار کرنے سے نہیں چوکتا۔

مختلف علاقوں میں بور بچے کئی طرح کے پائے جاتے بعض جنگلوں میں سیاہ بور بچے بھی پائے جاتے ہیں یہ بور بچہ کی کوئی علیحدہ قسم نہیں ہے کیونکہ بعض اوقات مادہ بور بچہ کے بچوں میں سے ایک سیاہ بچہ بھی پیدا ہے۔ سیاہ بور بچہ عام رنگ کی بور بچی سے یا سیاہ عام رنگ کے بور بچے سے بآسانی میل ملاپ پیدا ہے۔

ہمالیہ پر نو ہزار فٹ کی بلندیوں پر اور کشمیر اور شیا، کے پہاڑوں پر بھی سفید بور بچے پائے گئے لو "برف کا تیندوا" SNOW LEOPARD "، یہ بے انتہا خوش نما جانور ہے۔ اس کے سفید بالوں بم پر سیاہ دھبے ہوتے ہیں جن کے اطراف نیلے ابرنما تے ہیں۔ یہ عام بور بچوں سے نسبتاً چھوٹے ہوتے ن کی خوب صورت کھال بہت قیمتی ہوتی ہے۔ بور بچوں فرق پایا جاتا ہے وہ علاقائی ہوتا ہے۔ یہ ہیں تو ی کی قسم لیکن چیتے سے ان کا کوئی تعلق نہیں



اور بور بچہ بالکل ہی علیحدہ قسم کے جانور ہیں جس طرح شیر اور ببر میں کوئی مطابقت نہیں پائی جاتی اسی طرح چیتا اور بور بچہ میں کوئی مطابقت نہیں سوائے اس کے کہ یہ دونوں بلی کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔

پنڈت نہرو: آزادی سے قبل جواہر لال نہرو لاہور گئے۔ لاہور ضلع کانگریس کمیٹی نے ان کے استقبال کا ریلوے اسٹیشن کے باہر ہی انتظام کیا۔ جب وہ ریل کے ڈبے سے باہر آئے تو مختلف کمیٹیوں، اداروں اور انجمنوں کی طرف سے لوگوں نے ان کے گلے میں ہار ڈالنے شروع کیے۔

رائے زادہ ہنس راج سے نہرو خاندان کے تعلقات بے تکلفانہ تھے جب وہ ہار گلے میں ڈالنے آئے تو جواہر لال نہرو نے ہنستے ہوئے کہا۔

"کیا مجھے آپ لوگوں نے کھونٹی سمجھ لیا ہے جو آتا ہے اپنا ہار لٹکا کر چلا جاتا ہے؟"

جناب سیف سہسرامی

سالنامہ



وہ دیکھو ڈاکیہ پھر آرہا ہے
کوئی اچھا سا تحفہ لا رہا ہے
ذرا تم بھاگ کے پوچھو تو کیا ہے
یہ اس پیکٹ کے اندر کیا چھپا ہے
ارے یہ سالنامہ ہے ہمارا
بڑا ہی خوب صورت پیارا پیارا
بہارِ علم کی خوش بو لٹاتا
دلوں میں پیار کے جادو جگاتا
ابھی یہ جامعہ سے آرہا ہے
خوشی کے ساز پہ کچھ گا رہا ہے
سبھی نظمیں ہیں اس کی پیاری پیاری
سجی ہو جس طرح پھولوں سے کیاری

کوئی راجا بنا ہے کوئی رانی
بڑی دلچسپ ہے ہر اک کہانی
سبھی مضمون اس کے پھول ہوں گے
ڈرامے اس کے سب مقبول ہوں گے
ادب کے خوش نما پھولوں کی مالا
یہ سالِ نو کی کرنوں کا اجالا
یہ ہر چھوٹے بڑے کو بھا گیا
خوشی کا نور بن کے چھا گیا

جناب شفیق سہسرامی

سہسرام

۶۸ کے سالنامے میں آپ نے شیر شاہ سوری کے مقبرے کا حال پڑھا ہوگا۔ دنیا نے سہسرام کو اس پٹھان شہنشاہ کی وجہ سے جانا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ یہ شہر شیر شاہ کے عہد سے پہلے سے بہت پہلے سے آباد ہے اور شروع سے اسے تاریخی اہمیت حاصل ہے۔

ونش خاندان کے وقت سے اس کی تاریخ ملتی ہے۔ پہلے ونش خاندان کے لوگ یہاں آباد تھے۔ اس کے بعد یہ بودھ مذہب کا مرکز رہا۔ چندن شہید پہاڑ تحریری شکل میں اس کا ثبوت موجود ہے۔

کہتے ہیں اس سرزمین پر رام اور سیتا کے قدم بھی آئے ہیں۔ اپنے بن باس کے زمانے میں وہ گھومتے پھرتے سہسرام پہنچے۔ بکسر میں تارکا نام ایک راکشش سے لڑائی ہوئی وہ مارا گیا۔ لیکن اس کا ساتھی ارجن جان بچا کر بھاگا سہسرام کی پہاڑیوں میں آکر چھپ گیا، دھیرے دھیرے اس نے ہاتھ پیر نکالنے شروع کیے اور لوگوں کو تنگ کرنے لوگ اس سے بہت پریشان ہوگئے۔ جب رام اور سیتا سہسرام آئے تو یہاں کے لوگوں نے ارجن کی شرارتوں کا بیان کیا۔ رام نے انھیں یقین دلایا کہ وہ ارجن کو مار بھگائیں اپنے علم سے معلوم ہوا کہ ارجن کی موت رام کے نہیں سیتا کے ہاتھوں سے ہے۔ تب سیتا جی نے لڑائی کی تیاری شروع کی، اس تیاری کی اطلاع ارجن کو ملی تو وہ خوف زدہ ہوگیا اور سہسرام سے بھاگ جانا چاہتا تھا لیکن سیتا جی نے اپنی تدبیر سے اس کا کام تمام کردیا۔ ارجن یہاں کے لوگوں کے ذہن پر اس بری طرح سوار ہوگیا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اپنی بستی کا نام ہی لوگوں نے ارجن پورہ رکھ دیا اور بہت دنوں تک اس بستی کو اسی نام سے یاد کیا جاتا پھر نہ جانے کیسے ونش خاندان کا خاتمہ ہوگیا اور بستی ویران ہوگئی۔

پھر سا سارام نام کے ایک آدمی نے پہاڑ کے دامن میں ایک بستی بسائی جس کا نام اس کے نام پر پڑا۔ لیکن یہ بستی زیادہ محفوظ نہ تھی۔ برسات کے موسم میں جب بارش ہوتی پہاڑوں سے جھرنے بہنے لگتے اور پہاڑی نالے بھر جاتے تو جھونپڑیاں گر پڑتیں، تیز ہوا سے چھتیں اڑ جاتیں اور لوگوں کو ایک بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا۔

پھر اللہ نے ان کی سن لی، اس وقت حسن خاں سُور کو یہ علاقہ جاگیر میں ملا اور فوج سمیت موجودہ سہسرام میں اس نے ڈیرے ڈال دیے۔ دھیرے دھیرے سا سارام

لگے ۔ یہ جگہ پہاڑ سے دور تھی اس لیے پہاڑی نالوں کا خطرہ نہ تھا پھر اچھی خاصی آبادی تھی اس لیے پرانی جگہ کو چھوڑ کر لوگ نئی بستی میں آ بسے ۔

نئی بستی حسن خاں سُور نے بسائی تھی ۔ اس لیے اس کا نام حسن پورہ پڑا لیکن مقبول نہ ہو سکا ، لوگوں نے اس کا نام پُرانی بستی کے نام پر سا سارام ہی رکھا جو کثرتِ استعمال سے سہسرام ہو گیا ہے اور آج تقریباً پانچ سو سالوں سے یہ اِسی نام سے مشہور ہے ۔

سہسرام کی سب سے خاص چیز یہاں کے پہاڑ ہیں ۔ برسات کے دنوں میں جب بارش ہوتی رہتی ہے ، پہاڑوں کا منظر بڑا دل فریب ہوتا ہے ۔ آبشاروں کا پانی دُودھیا ہو جاتا ہے جس طرف بھی نظر اٹھتی ہے سبز پہاڑوں میں سے سفید سفید چشمے بہتے رہتے ہیں ۔ آسمان سرمئی اور سیاہ بادلوں سے ڈھکا رہتا ہے اور کبھی کبھی پہاڑ کی چوٹی پر بادل اتر آتے ہیں اُس وقت کا منظر اور بھی دل فریب ہو جاتا ہے ۔

سہسرام کا پہاڑ دو حصوں میں بٹا ہوا ہے ۔ ایک شہر کے قریب ہے اور دوسرا کچھ دُور ہے ۔ قریب کے حصّے کے پہاڑوں کے نام ہیں ۔ چندن شہید پہاڑ ، بھنور کھوہ ، چھریا ہی ، چنن جھرنا ۔

چندن شہید پہاڑ سہسرام کا سب سے بلند پہاڑ ہے ۔ اس پر چندن شہید پیر کا مزار ہے ، دوّ دالان ہیں ایک مسجد اور تین چھوٹے بڑے حوض ہیں جن میں بارش کے دنوں میں پانی رہتا ہے ۔ مزار کے بغل میں ایک چٹان ہے جس پر

ہے کسی زمانے میں یہ بودھ مذہب کا مرکز بھی تھا چند پہاڑ کے دامن میں سہسرام کا شانتی پرساد جین کالج ۔

بھنور کھوہ ۔ ایک سیدھا پہاڑ ہے جہاں سے نیچے گرتا ہے اس کی چٹانوں پر پھسلن بہت رہتی ہے اس لیے لوگ غسل کرتے خوف کھاتے ہیں ۔ چھریاہی ا جھرنا ، کمزور بوڑھے مردوں اور عورتوں کے لیے اچھا ہے ۔ یہاں نہ باڑھ کا خطرہ ہے نہ غسل کرتے وقت گر کا ۔ اس لیے خاص طور سے عورتیں یہاں زیادہ آ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ شہر سے بہت نزدیک ہے ۔

دوسری طرف جو پہاڑی سلسلہ ہے ۔ اس بھوتیا پہاڑ ، ماجر کنڈ ، موتی کنڈ ، سیتا کنڈ اور کنڈ قابلِ ذکر ہیں ۔ بھوتیا پہاڑ کا آبشار ایک ایسے گرتا ہے جس کے دونوں طرف پتھر کی دیوار ہے وہاں پر ایسا لگتا ہے جیسے غسل خانے میں ہیں ، لیکن آبش پاس جانے کا راستہ بہت مخدوش ہے اور ذرا سی نیچے گرا دیتی ہے اور گر کر بچنا ناممکن ہے ، ہر سال ا آدمی گر کر مر جاتے ہیں اس لیے اسے بھوتیا پہاڑ سے یاد کیا جاتا ہے ۔

ماجر کنڈ میں ایک بڑی پہاڑی ندی ہے ندی کہاں سے آتی ہے کسی کو پتہ نہیں کیوں بھیانک جنگل ہے جس میں خوں خوار جانور شیر وغ رہتے ہیں ، ماجر کنڈ میں کئی قدرتی غار ہیں جن میں ا ہیں ۔ یہاں کا منظر بھی بہت اچھا ہے ۔ پھر دہی :

موتی کنڈ کی چٹانوں کی ساخت کچھ اس قسم کی ہے کہ وہاں ندی کا پانی منتشر ہو جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے پرسے موتی برس رہے ہیں۔ موتی کنڈ ایک گہرا حوض ہے جس میں گرمی کے دنوں میں بھی پانی رہتا ہے۔ ٹھہرنے کے لیے ایک دالان ہے۔ پھر ندی اور آگے بڑھتی ہے اور لوٹتی ہوئی سیتا کنڈ میں گرتی ہے یہ جگہ اور جگہوں کی نسبت محفوظ ہے پھر یہاں ٹھہرنے کے لیے قدرتی غار میں و مندر ہیں، نہانے کا بھی آرام ہے۔ اس لیے یہاں بھیڑ زیادہ رہتی ہے۔ پھر ندی وہاں سے اور آگے بڑھتی ہے اور ایک بھیانک غار میں ہیبت ناک شور کے ساتھ گرتی ہے اسے دھواں کنڈ کہتے ہیں۔

پانی بہت بلندی سے نیچے گرتا ہے اور اتنا پانی اڑتا رہتا ہے کہ پوری وادی میں دھند پھیلی رہتی ہے اور دور سے دیکھنے سے دھواں ہی دھواں معلوم ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کا نام دھواں کھنڈ پڑ گیا ہے۔

اس ندی میں کبھی کبھی باڑھ بھی آجاتی ہے۔ اس وقت بہت نقصان ہوتا ہے۔ آدمی، سامان، جانور جو زد میں پڑا اسے بہا کر دھواں کنڈ میں گرا دیتی ہے اُس میں پھنسے ہوئے آدمی کی کوئی مدد نہیں کر سکتا کیوں کہ پانی اچانک ہی بڑھ جاتا ہے اور اچھلتا ہوا آتا ہے۔ اس کی پہچان بھی ہے کہ باڑھ آنے سے کچھ دیر پہلے آبشار کا پانی سفید کے بجائے پیلا ہو جاتا ہے۔

سہسرام کی بستی میں شیر شاہ کے مقبرے کے علاوہ دیکھنے کے لائق اور بھی چیزیں ہیں حسن خاں سوری کا مقبرہ ہے جو شیر شاہ کے والد تھے۔ گاندھی اسمارک ہے جس پر ان شہیدوں کے نام کھدے ہیں جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے اپنی جانوں کی بازی لگادی تھی۔۔۔۔ مدرسہ خانقاہ کبیریہ ہے جس کی شہرت پورے ہندوستان میں ہے۔ یہ مدرسہ شاہ کبیر درویش کا قایم کیا ہوا ہے۔ اس میں ہر جگہ کے لڑکے دور دور سے پڑھنے آتے تھے۔ انھیں کھانا مدرسہ کی طرف سے مفت ملتا تھا لیکن جب سے کھانے کا انتظام ختم ہوا ہے طالب علموں کی تعداد کم ہونے لگی ہے۔ اس کے دو بورڈنگ ہاؤس بھی ہیں۔ اس مدرسے نے نہ جانے کتنے ذروں کو آفتاب بنایا ہے۔ لیکن اب دن بدن اس کی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے۔

سہسرام میں محرم بڑے زور شور سے منایا جاتا ہے۔ طرح طرح کے تعزیے بنتے ہیں۔ بڑے بڑے اکھاڑے نکلتے ہیں اور لوگ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ پھر یہاں نعل نکلتا ہے۔۔۔ نعل ہلالی شکل کا ہوتا ہے۔ اُسے ایک ڈنڈے سے باندھ کر لوگ اپنی کمر سے باندھ لیتے ہیں اور درود پڑھتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں نعل کو جوش آتا ہے اور اچانک بھاری ہو جاتا ہے اور پھر آدمی بے بس ہو جاتا ہے۔ اس کے پیر زمین سے اکھڑ جاتے ہیں اور پھر نعل بزرگانِ دین کے مزاروں پر جاتا ہے اور جب جوش ختم ہو جاتا ہے تو پھر بہت ہلکا ہو جاتا ہے اور آدمی بھی اپنے ہوش میں آجاتا ہے۔ مگر بھئی آج کل کے پڑھے لکھے اور سمجھ دار لوگ ان باتوں کا یقین نہیں کرتے واللہ اعلم۔

جناب محسن نظامی سہسرام



نئے سال کے موقعہ پر

خدا کا شکر مناؤ کہ سالِ نو آیا
نئے فسانے سناؤ کہ سالِ نو آیا
سرور و عیش مسرت عنائتیں لے کر
ادا ادا میں نظر میں لطافتیں لے کر
بلند حوصلے لے کر محبتیں لے کر
چراغ شام جلاؤ کہ سالِ نو آیا
نئے فسانے سناؤ کہ سالِ نو آیا
مچل رہی ہے تمنا نظر میں دید کی سی
ہر ایک دل میں خوشی ہے نوید عید کی سی
ہر ایک سمت جھلک ہے نئی امید کی سی
مے سرور پلاؤ کہ سالِ نو آیا
خدا کا شکر مناؤ کہ سالِ نو آیا
کھلا کھلا ہوا ہر گل ہر اک چمن دیکھا
ہر ایک ادائے دیکھی نیا چلن دیکھا
ہر ایک شے میں مسرت کا بانکپن دیکھا
دلوں میں دھوم مچاؤ کہ سالِ نو آیا
نئے فسانے سناؤ کہ سالِ نو آیا
مسرتیں ہوں نئے ولولے ہوں الفت ہو
نئی امنگ ہو خوشیاں ہوں رابطہ الفت ہو
خدا کرے یہ نیا سال دورِ عشرت ہو
ترانے زیست کے گاؤ کہ سالِ نو آیا
نئے فسانے سناؤ کہ سالِ نو آیا
یہ قہقہے یہ صدائیں سلام کہتی ہیں
یہ رنگ و نور دعائیں سلام کہتی ہیں
صبا یہ شوخ ہوائیں سلام کہتی ہیں
خلوص دل سے وفائیں سلام کہتی ہیں
نظر نظر سے ملاؤ کہ سالِ نو آیا
نئے فسانے سناؤ کہ سالِ نو آیا
خدا کرے یہ مسرت ہزار بار
فضا میں گونجتے پھرتے ہیں
خدا کرے یہ نیا سال جاو

جناب خاور جبل پوری



چچا میاں

سکندر خاں سرکاری ملازم تھے اور میرے ماتحت تھے مجھ سے عمر میں زیادہ تھے طبیعت کے شریف، ہنس مکھ، اگلے وقتوں کے لوگوں جیسے صاف دل، ہمدرد وفادار۔ بڑی خوبیوں کے انسان تھے۔

میں ادب سے ان کا نام نہ لیتا چچا میاں کہہ کرتا میری دیکھا دیکھی اور لوگ بھی چچا میاں کہنے لگے اور تھوڑے ہی دنوں میں وہ جگت چچا بن گئے۔

پچاس برس کی عمر، گورا گورا کتابی چہرہ، لانبا قد، ستواں ناک، سفید داڑھی، ہونٹوں پر بکھرا ہوا تبسم، بات بات میں شوخی، ہر وقت ہنسنا اور ہنسانا ان کا معمول تھا۔

ہمارا علاقہ ڈاکوؤں کا مرکز تھا ان دنوں وہ اکیلے دکیلے سرکاری افسروں کو بھی نہیں بخشتے تھے اور کچھ نہیں تو گھڑی سائیکل یا بندوق چھین کر لے جاتے اس لیے ہر محکمے کے افسروں نے طے کر لیا تھا کہ سب ساتھ مل کر دورہ کریں گے۔ کسی بڑے گاؤں میں ٹھہر کر آس پاس کے دیہاتوں میں کام کرتے اور شام کو ایک ہی جگہ آ ملتے اور کھانا کھا کر سو جاتے۔ اس طرح وقت بھی اچھا کٹ جاتا اور جماعت کی کرامت سے ڈاکوؤں کی توجہ بھی ہماری طرف نہیں ہونے پاتی تھی۔

چچا میاں لطیفہ گوئی اور حاضر جوابی کی وجہ سے سارے افسروں میں مقبول ہو گئے تھے۔ ہم سب اُن کی خوش مذاقی پر ہنستے اور اپنا دل خوش کرتے رہتے انھیں بہت سی دل چسپ کہانیاں بھی یاد تھیں رات کو سونے سے پہلے اپنے خاص انداز میں کہانی سناتے تو ہم لوگ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔

اس وقت مجھے ان کی زبان سے سُنی ہوئی کچھ باتیں ان کی ذات خاص سے متعلق بدحواسیاں یاد آگئی ہیں۔ وہ فارسی زبان کا ایک دل چسپ لطیفہ بیان کرتے تھے۔

"ایک خُراسانی اپنے گدھے پر شکر لادے ہوئے جنگل میں سفر کر رہا تھا کہ یکایک گہرا بادل اُٹھا اور اس زور سے گرجا کہ اُس کا دبلا پتلا گدھا کانپتے کانپتے بے دم ہو گیا تو خراسانی نے اللہ میاں سے اپنی زبان میں شکایت کی۔ "خر را کشتی، خر را کشتی۔" (تو نے گدھا مار ڈالا، گدھا مار ڈالا تو نے) اس کے فوراً بعد ہی زور شور کی بارش

ہونے لگی۔ اتنی زیادہ ہوئی کہ خراسانی کی ساری شکر شربت بن کر بہہ گئی تو خراسانی نے زور زور سے چیخنا شروع کر دیا۔ اول خر راکشتی دوئم قند راشستی (پہلے میرے گدھے کو مار ڈالا پھر ساری شکر دھو ڈالی) اسی وقت بجلی چمکی اور خراسانی کے قدم چومنے کے لیے لپکی تو خراسانی زیادہ بدحواس ہو کر چلّایا۔

"اول خر راکشتی دوئم قند راشستی سوئم برق را فرستادی کہ خراسانی کجاست۔" (پہلے گدھے کو مارا پھر شکر کا ناس مٹایا اور اب بجلی بھیج دی کہ خراسانی کہاں ہے۔)

ان کی والدہ بیان کرتی تھیں کہ جب وہ خاصے سمجھ دار ہو چکے تھے ایک دن ذرا رات گئے واپس آئے اس وقت ہم سب لوگ سو گئے تھے گھر میں کسی کو زکام کی شکایت تھی گیہوں کی بھوسی اُبال کر پانی ملانے کے بعد کسی برتن میں ڈھک کر رکھ دیا تھا۔ جب انھوں نے کھانے کا تقاضہ کیا تو والدہ نے پلنگ پر لیٹے لیٹے کہہ دیا کہ باورچی خانے میں دال اور روٹی رکھی ہے جا کر کھا لو۔ آپ گئے اور دال کی جگہ اُبلی ہوئی بھوسی نکال کر خوب پیٹ بھر لیا صبح جب ان کی والدہ کو دال برتن میں موجود ملی تو انھوں نے پوچھا رات تم نے روٹی کاہے سے کھائی؟ کہنے لگے دال سے مگر اس میں نمک کچھ کم معلوم ہوتا تھا

اسی طرح گرمی میں دن دہاڑے گلاس لے کر شہد کا شربت بنا کر پینے کے لیے گئے جس برتن میں شہد رکھا تھا اس کے قریب ہی گوند کا برتن بھی تھا آپ نے بجائے شہد کے بہت سارا گوند گلاس میں انڈیل کر اور غٹ غٹ چڑھا گئے۔

اسی طرح جب کہیں سفر پر جانے والے تھے تو ساتھ بڑے بھائی اور بھاوج تھیں۔ گاڑی اسٹیشن آ چکی تھی آپ ٹکٹ لینے باہر چلے گئے اور بھائی ایک مردانے ڈبّے میں بیٹھ گئے۔ واپسی پر کیا دیکھتے ہیں کہ بھیڑ بہت زیادہ ہونے پر بھی انکی بھاوج تو خوب پھیل کر بیٹھی ہوئی ہیں اور ایک عورت جگہ نہ ملنے کی وجہ سے علاحدہ کھڑی ہے آپ نے بھاوج سے کہا۔ اسے بھی اپنے پاس ہی جگہ دیدو مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوئیں تو آپ نے اور بھاوج کو دھکا دے کر الگ سرکاتے ہوئے کہنے لگے تم تو اس طرح بیٹھی ہو کہ ساری گاڑی خرید لی ہو اوروں کی تکلیف کا ذرا بھی خیال نہیں ہے تمھیں۔

وہ بے چاری پرے ہٹ گئیں کھڑی ہوئی عورت سیٹ پر جا بیٹھی۔ اب جو دوسری سیٹ پر نظر ڈالتے ہیں تو حیران ہو کر نظریں شرم کی وجہ سے نیچی کر لیتے ہیں کیونکہ ان کی بھاوج اور بھائی دوسری سیٹ پر بیٹھے تھے انھوں نے ناحق ایک غیر خاتون کو ڈانٹ پلا دی۔

عید کی نماز شروع ہو چکی تھی۔ پچھلی صف میں ایک صاحب نیت باندھ رہے تھے کہ اتنے میں ایک گنوار آیا اس نے انھیں جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا "ابے نیت تو بتا دے، نیت تو بتا دے"...

انھوں نے نیت توڑ کر جلدی جلدی نیت بتائی پھر نیت باندھ لی۔ انھوں نے اتنی تیزی سے نیت بتائی کہ دیہاتی کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس نے چند سکنڈ کچھ سوچا اور پھر خوب زور سے ان صاحب کے کندھے کو تھپ تھپاتے ہوئے یہ کہتے ہوئے نیت باندھ لی۔

"تو نے کہی، میں نے سنی، اللہ اکبر"

منے کی لوری

ب عبدالمتین نیاز



سوجا پیارے سوجا

ے راج دلارے سوجا

تارے سنائیں تجھ کو کہانی

کتنی دل کش کتنی سہانی — میرے دل کے سہارے سوجا

تجھ کو بلائے نندیا رانی — میرے راج دلارے سوجا

ب کی آنکھ کے تارے سوجا — تجھ کو بلائیں میٹھے سپنے

ے راج دلارے سوجا — کتنے رنگ رنگیلے سپنے

رات نے اپنی بانہہ پساری — مسکاتے خوشیوں کے سپنے

نیند میں ڈوبی دنیا ساری — کہتے ہیں یہ سارے سوجا

آنکھیں ہیں تیری نیند سے بھاری — میرے راج دلارے سوجا

گئے دیکھ نظارے سوجا — تو جو سوئے میں بھی سولوں

ے راج دلارے سوجا — آنکھوں میں اپنی نیند سمولوں

گائے پون بھی ہولے ہولے — سپنوں کے سنسار میں ڈولوں

نیل گگن میں چندا ڈولے — سوتی رات پکارے سوجا

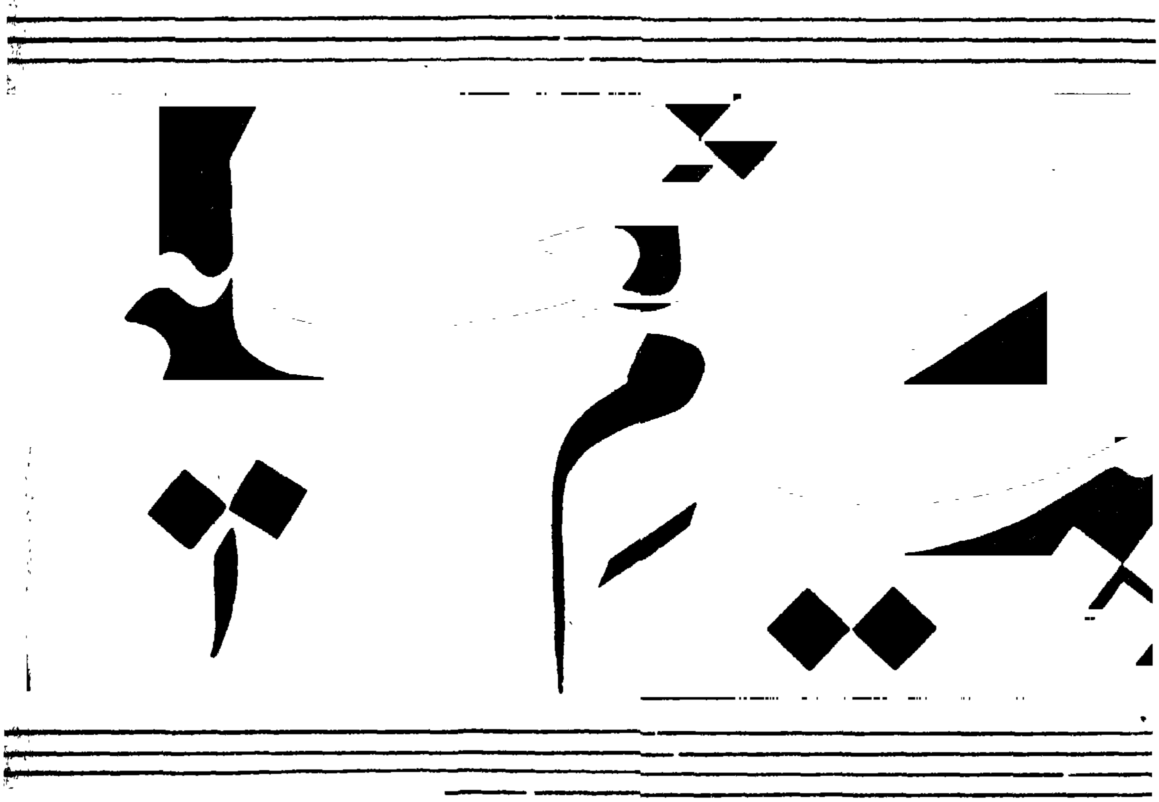
بنا بچھ و کوئی نہ بولے [illegible] — [illegible] سوجا

پیام تعلیم

کلینڈر سنہ ۱۹۷۰ء

عبدالمجید آنیکل (بنگلور)					فروری		ستمبر	اپریل	جنوری		
					مارچ	جون				مئی	اگ
					نومبر		دسمبر	جولائی	اکتوبر		
۲۹	۲۲	۱۵	۸	۱	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	
۳۰	۲۳	۱۶	۹	۲	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	
۳۱	۲۴	۱۷	۱۰	۳	منگل	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	
☆	۲۵	۱۸	۱۱	۴	بدھ	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	
☆	۲۶	۱۹	۱۲	۵	جمعرات	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	
☆	۲۷	۲۰	۱۳	۶	جمعہ	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	
☆	۲۸	۲۱	۱۴	۷	ہفتہ	اتوار	پیر	منگل	بدھ	جمعرات	

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ کے لیے جمال پرنٹنگ پریس میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا



No. D. 1457

JANUARY 197[illegible]

Payam - i - Taleem

NEW DELHI-25.

ان کتابوں کو اپنی لائبریری کی زینت بنائیے

[illegible]	[illegible]	دہلی	۱/۵۰
[illegible]	[illegible]	ہماری پارلیمنٹ	۱/۵۰
[illegible]	[illegible]	برف کا گھر	۰/۸۷
ہیرا میں	[illegible]	برف کے تیرتے پہاڑ	۰/۳۷
[illegible]	[illegible]	آستین کا سانپ	۰/۵۰
[illegible]	[illegible]	انٹی دوا	۰/۵۰
[illegible]	[illegible]	بادشاہ کے کپڑے	۰/۵۰
[illegible]	[illegible]	زمین کی گردش	۰/۵۰
تاروں کی سیر	[illegible]	سونے کی چڑیا	۱/-
خرگوش کا سپنا	[illegible]	چمپاوت کا آدم خور	۰/۳۵
[illegible]	[illegible]	[illegible] کا بادشاہ	۰/۳۰
آدمی کی کہانی	[illegible]	انوکھی ملاقات	۰/۳۵
دادا کی کہانی	[illegible]	[illegible]	۱/-
پٹھانوں کی کہانی	[illegible]	[illegible]	۰/۳۵
[illegible]	[illegible]	[illegible]	۰/۳۵

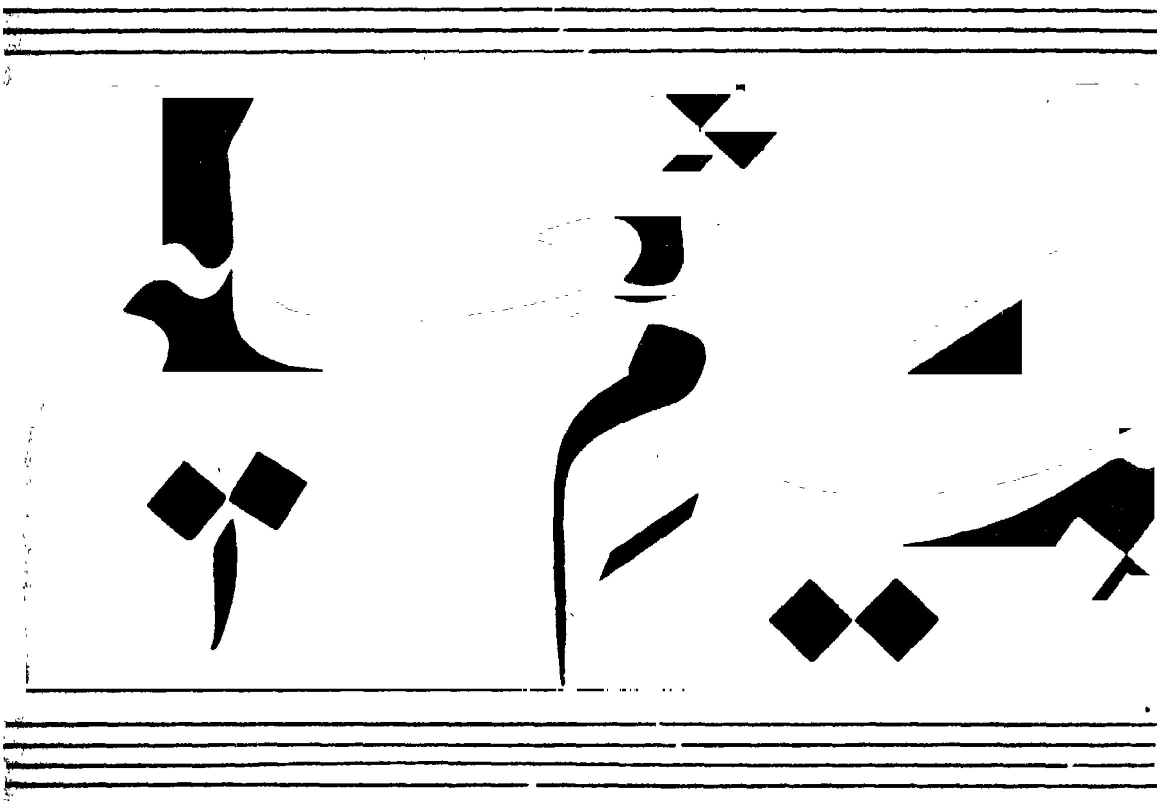
ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار دہلی ۶

[illegible] نیشنل فائن پرس دہلی میں طبع ہو



ریاست ہائے میسور، مدھیہ پردیش جموں و
کشمیر کے تعلیمی اداروں کے لئے منظور شدہ

پیام تعلیم
نئی دہلی

۲ | فروری ۱۹۷۰ء | جلد ۷

ایڈیٹر
محمد حسین حسان ندوی

دفتی: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

ا خ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی ۶

خ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳

خ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

فہرست

بچوں کی دل چسپ اور معلوماتی کتابیں

انوکھی مشین	دیداس گپتا	۱/۲۵	مصنوعی چاند	اطہر پرویز
ایٹم کیا ہے ؟	پ، گن میکر	-/۷۵	مندر	وسنت نیل کنٹھ
انمول رتن	اطہر پرویز	۱/۵۰	نجومی آیا	اطہر پرویز
ایک اچھوت کی کہانی	سوامی مہامنے	-/۹۰	نیا تیرتھ	راجندر اوتھی ترشنہ
اکبر اور بیربل کے لطیفے	اطہر پرویز	-/۴۰	نہرو امر ہیں	فصاحت حسین خاں
بچوں کے حالی	اطہر پرویز	-/۷۵	ہولی اور چراغ	اطہر پرویز
بچوں کے اقبال	اطہر پرویز	-/۵۰	ہماری کھیتی باڑی	سیما
باپو کے قدموں میں	منو بہن گاندھی	۱/-	ہماری آباد دنیا	فصاحت حسین
بھارت دیس ہمارا دیس	جاوید اقبال	۱/۲۵	ہندوستان ترقی کی شاہراہ پر	ادھیرج موہن سیہ
پنچ تنتر کی کہانیاں - (اوّل)	شکنتلا دلوی	-/۷۵	ہمارے بن ہماری دولت	رام چندر تیواری
پنچ تنتر کی کہانیاں - (دوم)	، ،	-/۷۵	ہمارا ذہن	وریجا اڈوبا
بدن کی کہانی	اطہر پرویز	۱/۲۵	ہماری سائنس	وزارت حسین
تیس مار خاں	شاہد علی خاں	-/۷۵	ہمارا ہندوستان	اطہر پرویز
توانائی کا راز	اطہر پرویز	۱/۲۵	اچھا شہری	پبلیکیشنز ڈویژن
چار درویش	یدوناتھ تھتے	۱/۲۵	اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	، ،
خلا کا سفر	اطہر پرویز	۱/۲۵	بھارت کی لوک کہانیاں	، ،
روشنی کے مینار	جے بھکو	-/۷۵	پنڈت نہرو سے بات چیت	ٹیبر منڈی
سائنس کے کرشمے	وزارت حسین	۲/-	خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	پبلیکیشنز ڈویژن
سائنس کی دنیا	، ،	۲/۶۴	رنگا کے گیت	مترجم شمیم کرہانی
ستاروں کی دنیا بہت دور تک ہے	اطہر پرویز	۲/-	سائنس کے چند پہلو	سی وی رامن
سورج کا گھرانا	اے وی ایس راما راؤ	-/۷۵	وویکانند	پبلیکیشنز ڈویژن
سائنس کے راستے پر	سیما	-/۹۰	ہمارا جھنڈا	، ،
شہر اور گاؤں	نردیشور شرما	-/۷۵	ہندوستان کی تاریخ	، ،
شرابی	اطہر پرویز	-/۵۶	ہندوستان کی نامور ہستیاں (اوّل) ،	، ،
کاغذ کی کہانی	محمد آفاق	۱/-	ہندوستان کی ، (دوم) ،	، ،

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ - پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال ، بمبئی نمبر ۳ ...

بچّوں سے باتیں

خدا کا شکر ہے۔ پیامِ تعلیم کا سالنامہ آپ نے پسند کیا جامعہ نگر کے حلقے میں (اور یہ حلقہ بہت بڑا ہے) بچوں اور بڑوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ جامعہ سے باہر کے بزرگوں اور پیامیوں کے خط برابر چلے آرہے ہیں۔ ایک آدھ کو چھوڑ کر سبھی نے اسے آنکھوں سے لگایا ہے۔ کچھ خط اس پرچے میں پڑھیے۔

یہ تعریفیں امید سے بڑھ کر ہیں۔ ہم نے پچھلے پرچے (سالنامے) میں اس کی ترتیب کے سلسلے میں اپنی مجبوریوں اور پریشانیوں کی طرف ایک ہلکا سا اشارہ کر دیا تھا۔ پھر بھی آپ نے ہماری کوششوں کو سراہا تو یہ بڑی بات ہے!

پر ہمارے پیامی تو خدا کے فضل سے سارے ہندوستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ یہ سب پیامی اپنی اپنی رائیں لکھ بھیجیں، ہمیں اچھے اچھے مشورے دیں۔ ان کی رائیں اور مشورے ہمارے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ خالی تعریف سے تھوڑی دیر کے لیے جی خوش ہو جاتا ہے مگر آگے کے لیے روشنی نہیں ملتی۔

دیکھیے وقت کتنی جلدی گزرتا ہے۔ ہمارے ذاکر صاحب قبلہ کے انتقال کو لگ بھگ دس مہینے ہو گئے۔ مرحوم فروری میں پیدا ہوئے تھے۔ اس پرچے میں ایک مضمون دو نظمیں اور ایک قطعہ شائع کیا جا رہا ہے۔ جناب رشید الوحیدی صاحب کے مضمون کا معیار چھوٹے پیامیوں کے لیے ذرا اونچا ہو گیا مگر بڑے پیامی امید ہے کہ اسے شوق اور دلچسپی سے پڑھیں گے۔

جامعہ کی سنہری جوبلی (پچاس سالہ) اسی سال (۱۹۷۰ء) تو منائی جا رہی ہے۔ غالباً اکتوبر کی آخری تاریخوں میں منائی جائے گی کُل نو دس مہینے رہ گئے ہیں۔ جامعہ کی پچیس سالہ جوبلی (۱۹۴۶ء) کی یاد ابھی تک تازہ ہے۔ اللہ اللہ کس قدر شان و شوکت تھی۔ قدردانوں کا کتنا ہجوم تھا۔ ان قدردانوں میں بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے سبھی طرح کے لوگ تھے۔ اس تقریب کو کامیاب بنانے کے لیے ذاکر صاحب نے اور ان کی رہنمائی میں ان کے ساتھیوں نے کیسے کیسے پاپڑ بیلے تھے۔ رات دن ایک کر دیا تھا۔

کیسا اچھا ہوتا جو قدرت ذاکر صاحب کو

کچھ اور مہلت دیتی اور اس پچاس سالہ تقریب کو
وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے۔ ان کی موجودگی سے رنگ
ہی کچھ اور ہوتا۔ مگر خدا کی مرضی میں بھلا کون دخل
دے سکتا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ان کے قریبی بہت
قریبی ساتھی۔ ابھی جامعہ میں موجود ہیں اور وہ
اسے کامیاب بنانے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔

جگہ کی کمی کی وجہ سے ہم سالنامے میں اپنے
ان ہمدردوں اور مخلصوں کا ذکر نہ کر سکے تھے جنھوں
نے پیام تعلیم کو مقبول بنانے میں ہماری مدد کی ہے۔
محترم عطاء الرحمٰن صاحب (بھساول) نے سات خریدار
مرحمت فرمائے ہیں اور ایک ایجنٹ بنایا ہے جو بہت
سی کاپیاں خریدتے ہیں۔ محترم پروفیسر اکبر الدین صدیقی
صاحب اور محترم حافظ باقوی صاحب نے تین تین
خریدار مرحمت فرمائے ہیں۔ محترم سردار خاں صاحب
(پیلی بھیت)، مولانا بدر الدین صاحب (جامعہ) جناب
عبد الوحید خاں صاحب مکتبہ جامعہ نے ایک ایک
خریدار مرحمت فرمایا ہے۔ وردھا کے مرزا عزیز اللہ
بیگ نے دس خریدار مرحمت فرمائے۔ ہاں ہماری بمبئی
کی شاخ نے آٹھ خریدار بنائے ہیں۔

ان کے علاوہ جناب اشرف بابو ایم تور گل
دھارواڑ، جناب محمد عارف صاحب چوپڑا جلگاؤں
جناب سراج انور سیتا رام پور بردوان، فاروقیہ
ہائر سکنڈری اسکول میسور۔ جناب م
محمد یحییٰ رام پور۔ جناب زین الدین
دہلی۔ جناب افتخار حسین صاحب گورکھ
خود خریدار بنے ہیں۔ محترمہ زلیخا بیگم
اسکول (گورنمنٹ گرلز اسکول وارو
بنایا اور ایک اسکول کا چندہ اپنے پا
بھیجا۔ ہم ان سب کا دلی شکریہ ادا کر

جگہ کی کمی کی وجہ سے کئی اچھے
دلچسپ مضمون اس پرچے میں شائع
یہ اب مارچ کے پرچے میں چھپ سکیں
ان میں ایک تو دلچسپ جاسوسی کہانی ہے
گروہ) ایک باتصویر مضمون شیر ہے
انداز میں لکھا گیا ہے۔ ایک مضمون الو
پر ہے۔ یہ بھی بڑے مزے کا ہے۔

اس پرچے میں آپ " جیب
کے عنوان سے ایک بہت ہی دلچسپ
یہ ہم نے محترمہ آصفہ مجیب سے خاص طو
ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اس تیزی سے بد
زمانے میں آپ اپنے پرانے رہن سہن کو
یہ رہن سہن بہت سی باتوں میں آج
رہن سے بہتر تھا۔ بہت بہتر تھا۔

جناب محمد شفیع الدین نیر

مرحوم ذاکر صاحب کو خراجِ عقیدت

تھے راشٹرپتی جناب ذاکر صاحب
تھی ان کی ضیا سے روشنی ہر جانب
تھے اپنا جواب آپ ذاکر صاحب
بھارت کے تھے آفتاب ذاکر صاحب

فطرت کی انگوٹھی کا نگینہ ذاکر
افسوس ہوا بحرِ فنا میں غرقاب
علم اور ادب کا آبگینہ ذاکر
تھا ہند کی قوم کا سفینہ[2] ذاکر

اخلاق و مروّت کا بیاں جب ہوگا
کانوں نے سُنیں بھلائیاں تو بولی زباں
ایسا کوئی دوسرا کہاں اب ہوگا
ایسا انساں اب یہاں کب ہوگا

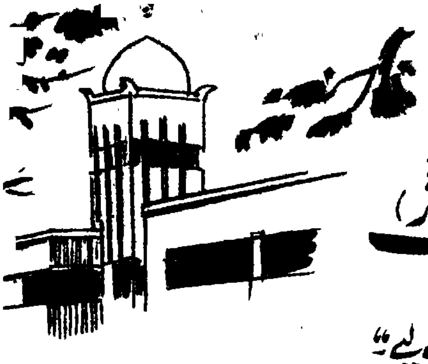
آپس کی محبت کا ترانہ نہ رہا
ہے اُن کی وفات ایک نقصانِ عظیم
بھارت کا بلند آستانہ نہ رہا
علم و دانش کا ایک خزانہ نہ رہا

کی خدمتِ مخلوق میں عمر اپنی بسر
خدمت ہی نے مخدوم بنایا ان کو
ہر وقت رہی دیش کی جنتا پہ نظر
ہر فرد کو اللہ یہ بخشے جوہر

ذاکر کی تھی شخصیت کا ادنیٰ یہ کمال
اِس دور میں زندگی تھی بے مثل ان کی
تھا اُس میں رچا ہوا جلال اور جمال
نیّر وہ خود آپ ہی تھے بس اپنی مثال

علم اور ہنر کا قدر داں اب نہ رہا
ہر ایک کا حوصلہ بڑھانے والا
اک دوست شفیق و مہرباں اب نہ رہا
نیّر وہ ہمارے درمیاں اب نہ رہا

[1] یعنی موت کا سمندر [2] کشتی



جناب رشید الوحیدی

جامعہ ملیہ اور ذاکر صاحب (ایک تاثر)

"بڑے پیامیوں کے لیے"

بچپن ہی سے میرے ذہن میں ذاکر صاحب اور جامعہ کا تصور ساتھ ساتھ آتا تھا۔ پہلی بار جامعہ میں طالب علم کی حیثیت سے حاضر ہوا، تو میری نگاہوں نے بے اختیار ذاکر صاحب کی تلاش شروع کر دی۔ مگر ذاکر صاحب کہیں نظر نہ آئے۔ کچھ عرصے بعد میں جامعہ کے بہت مانوس اور دلچسپ ماحول میں کھو گیا۔ مجھے جامعہ میں بہت پیاری عجیب اور اچھی اچھی چیزیں دیکھنے کو ملیں۔ یہاں کی ہر چیز میں ایک انفرادیت اور سلیقہ نظر آیا۔ کبھی کبھی میں سوچتا شاید ذاکر صاحب اور جامعہ دو الگ الگ چیزیں ہیں اور جی چاہتا کاش ذاکر صاحب کہیں نظر آ جائیں تو دیکھ سکوں مگر یہ خیال ایک لمحے کے لیے آتا اور جامعہ کا بہت دلچسپ پرسکون اور پراسرار ماحول اپنی طرف کھینچ لیتا۔

میں نے جامعہ کے لوگوں میں محبت، ہمدردی اور ایک خاندان کا سا تعلق پایا۔ اسی جذبے کا اثر ہے کہ جامعہ میں "جامعہ برادری" کے نام سے لوگ ایک دوسرے کے رنج و راحت میں شریک نظر آتے ہیں، اور اس برادری نے لوگوں کے احساس کو اس قدر متاثر کر رکھا ہے کہ عہدے کی تقسیم اور کرسی کے اختلاف کے باوجود نجی اور ذاتی زندگی میں بڑے چھوٹے کا فرق نظر نہیں آتا۔ انسانیت برابری ہمدردی اور بھائی چارے کا یہ تصوّر ذاکر صاحب کی دین تھی۔ ذاکر صاحب اس وقت وہ جامعہ کے پودے کی آبیاری کر رہے تھے۔ اور جـ ہندوستان کے صدر بن گئے۔ اس وقت بھی۔ برادری کے کسی ملازم، چپراسی، طالب علم، استا رنج و شادی کی تقریب کے لیے وقت نکالتے اور پہنچتے، ہر طرح شریک ہوتے۔

میں نے جامعہ کے ننھے ننھے بچوں میں بعض اچھی اچھی باتیں دیکھیں جو اس عمر کے عام بچوں میں پائی جاتیں۔ میں نے یہاں "بچوں کی حکومت" اور ا مستقل دفتر دیکھا جہاں بچوں ہی میں سے صدر، و اور کیبنٹ کے ممبر تھے۔ یہ عہدے باقاعدہ الیکشن حاصل کیے گئے تھے یہ بھی ذاکر صاحب اور ان کے غفار مدھولی صاحب کی ایجاد تھی۔ وہ ان ننھے معص کو مستقبل کا تجربہ اور سیاسی سوجھ بوجھ کا عملی سبق چاہتے تھے۔ ہر وزیر (بچہ) اپنے معاملے کو پوری ذ سے نبھاتا تھا اور باقی بچے اپنے عہدے داروں کا ا کرتے اور بے چون و چرا ان کی بات مانتے تھے میں کیسے ہوں گے وہ ذاکر صاحب جو اتنے بڑے اور عظیم ہو کر بچوں کے لیے بھی سب کچھ کرتے ہیں۔ ان کے معا میں اس قدر دلچسپی لیتے ہیں۔ سچ پوچھو تو ان کی

بھید یہی ہے۔

ایک دن گھومتے گھومتے ایک بورڈ پر نظر پڑی و بچوں کا بینک " ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ بہت سے بینکوں کے نام سُنے تھے، یہ نہ سُنا تھا۔ دیکھا تو وہاں کا سارا انتظام بچوں کے ہاتھ میں تھا۔ ننھے طلباء کی رقمیں اس میں جمع ہتی تھیں جو ایک خاص فارم کو بھرنے کے بعد مل سکتی تھیں لوئی بچہ بڑی رقم لینے کا حقدار نہ تھا بس ایک خاص رقم جو س کی ضرورت کو کافی ہو مل جاتی تھی۔ ایک طرف تو باری باری بینک کا انتظام سنبھالنے سے بچوں میں احتیاط نساب کتاب سے واقفیت اور ذمہ داری کا احساس پیدا ہو رہا تھا دوسری طرف بچوں کے پیسوں کی حفاظت ان کی پنی نگرانی میں ہوتی۔

کٹہرے کے اندر ایک بچہ کالی شیروانی کالی ٹوپی یں نظر آیا۔ نہایت مہذب، شائستہ اور ذمہ دار۔

کٹہرے کے اندر کوئی صاحب قدم نہیں رکھ سکتے تھے نہ کسی بچے میں اس کی خواہش ہی نظر آئی۔ جو قاعدہ ور ضابطہ مقرر تھا بچے اس کے مطابق پیسے نکلواتے ور چلے جاتے۔ میری زبان سے بے اختیار نکلا "یہ نئی یز دیکھی" اور جھٹ کسی صاحب نے بتایا "یہ بھی ذاکر صاحب کی دین ہے"

تعلیم و تربیت کا یہی وہ پاکیزہ تصور تھا جس نے تجربے کے لیے ذاکر صاحب کی بے چین طبیعت ایک یدان تلاش کر رہی تھی۔ اور وہ غربت، افلاس، مایوسی اور امیدوں کے ساتھ، صرف اپنے بلند ارادوں کو راہبر بنا کر چند سرپھرے نوجوانوں کے قافلے کو لے کر چل پڑے تھے جو آج "جامعہ ملیہ اسلامیہ" کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔

عجیب عجیب ڈھنگ سے ذاکر صاحب آدمی کو انسانیت اور آدمیت کے قریب لانا چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کتابوں میں لکھی ہوئی باتوں کو عمل کے روپ میں ننھے ننھے دماغوں سے قریب لایا جائے تو ان کا ذہن انھیں زیادہ آسانی سے قبول کرے گا۔ ان کا خیال صحیح تھا۔ اس خیال نے ارادے کو قوت بخشی اور عمل شروع ہو گیا جو جامعہ میں "پروجیکٹ میتھڈ" کے نام سے چلا، اور خوب چلا۔ کوئی اخلاقی کہانی ہے جسے بچے نے خوب صورت تصویروں میں پیش کر دیا۔ اب وہ بڑی قدر و منزلت کے ساتھ ایک چھوٹی سی نمائش گاہ میں رکھی ہے۔ باہر سے آنے والوں کو دکھایا جا رہا ہے، بچے کی ہمت افزائی ہو رہی ہے تصویر نے مصوّر کے اور دوسرے دیکھنے والوں کے ذہن کو کچھ اخلاقی سبق دیا۔ یہ فائدہ سب کے لیے عام ہے ایک خاص انعام اس بچے کو یہ ملا کہ اس کی خوب خوب ہمت افزائی ہوئی، یہ اس کا مزید انعام ہے جس نے اس میں کام کرنے کی سچی لگن اور حوصلہ عطا کر دیا۔ ایک طرف مٹی کے۔ لکڑی کے۔ پنسل کے۔ چونے کے اور رنگ کے مجسمے رکھے ہیں جن کے پیچھے کوئی واقعہ کوئی سبق ہے۔

یہ بچوں کی کوشش ہے۔ بچے بڑے فخر سے اپنے

سے متعلق تھوڑی بہت تفصیل بتاتے ہیں، معلوم ہوتا ہے یہ بچے کورس اور کلاس تک محدود نہیں ہیں۔ عام معلومات کے بارے میں بھی بہت باہوش ہیں۔ کتنے اچھے انسان ہیں، کتنے مہذب شہری ہیں، ملک و ملّت کے کتنے مخلص خادم بنیں گے ۔۔ انسانیت کی کس قدر عظیم خدمت کریں گے، ذاکر صاحب کو کس قدر پیار ہے ان پھولوں سے۔

چمن کی روش اس میں پھولوں کا انتخاب، ہر کمرے کا مخصوص رنگ مخصوص سجاوٹ جامعہ کا مخصوص انداز رفتار و گفتار غرض جامعہ کا ذرّہ ذرّہ پکار کر کہہ رہا تھا ہمیں کس نے سنوارا ہے۔ کس کے ذوق نے نکھارا ہے۔

یہاں ہر شخص جامعی ہے اور ہر جامعی جامعہ کی روایات کا امین ہے، اور جامعہ کی روایات میں شرافت، انسانیت، خدمت، ذوق حسن، پاکیزگی، لطافت بہت سی خصوصیات کا حسین امتزاج ہے۔ یہاں ہر بچے کو اپنے استاد سے اور ہر استاد کو اپنے شاگرد سے ذاتی تعلق ہے یہاں کا استاد اپنے شاگردوں کو کسی قابل بنا دینا چاہتا ہے کیونکہ وہ ایسی جامعہ کا استاد ہے جو بہت بڑے قابل انسان کی جامعہ ہے۔ اور جو پوری انسانیت کو ایک جوہر قابل عطا کرنا چاہتا تھا۔

یہاں آزاد فضا میں جینے کی، رائے کی فکر کی اور خیال کی آزادی کا بہت اونچا تصوّر ملتا ہے کیونکہ یہاں کی ذہنی تربیت میں ذاکر صاحب کی زندہ جاوید کہانی "ابو خاں کی بکری" کو بڑا دخل ہے۔ اس بکری

کی عطا کردہ عیش و عشرت کی زندگی کو لات مار دی کیونکہ وہ عیش و عشرت کے رسی کھونٹے سے بندھے رہنے کی صورت میں ملتی تھی۔

اس کہانی کو پڑھ کر عجیب تاثر ہوتا ہے ا جب کہانی کے ختم پر بکری لڑتے لڑتے مر جاتی ہے جذبات افسردہ ہو جاتے ہیں مگر عقل و ذہن روشن ہونے لگتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں ذاکر صاحب ۔ فتح و شکست کا معیار کس طرح بدل دیا ہے۔ کیونکہ بکری اپنی جنگ میں ہاری نہیں جیت گئی۔ حق کے جدوجہد اور کوشش ہی زندگی اور اسکی کامیابی۔ اور اپنے حق کی طلب و جستجو میں لگا رہنا اور جان دے خود زندگی کا انعام ہے۔

جب بچوں کا ذہن اس انداز پر تربیت پائے گا تب ہی وہ زندگی کے اعلیٰ اصولوں کو اپنائیں گے۔ اور یہی ذاکر صاحب کا مقصد تھا۔

میں جامعہ کے اسی ماحول میں گم ہو چکا تھا ذاکر صاحب کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کی تمنا اب بھی کبھی کبھی ہوتی ہے مگر میری روح کو ذاکر صاحب کی جامعہ میں کھو کر سکون ملتا جا رہا تھا۔ اب پھر پرانا تصوّر زندہ ہو رہا تھا، دل پکار رہا تھا وہ پہلی بات صحیح ہے۔ جامعہ اور ذاکر صاحب دو نہیں ہیں۔ جامعہ ہر ذرّے، ہر انداز ہر ہر ڈھنگ پر ذاکر صاحب کی تہ تھی۔ جامعہ کو بنانے سنوارنے میں ذاکر صاحب کی ذا

اور جامعہ دو ہو بھی کیسے سکتے جو اس جامعہ کو دیکھ
لے گا وہ خود ہی سمجھ سکے گا۔ جامعہ کو اس مقام اور اس
حیثیت میں لانے کے لیے بلاشبہ کسی مخلص کے جسم و جان،
خلوص و ایمان، ذہن و دماغ احساسات و جذبات کی
ساری ہی توانائی درکار تھی، تب جامعہ، جامعہ بن سکی
ہے۔ ماننا پڑے گا کہ ذاکر صاحب نے اپنا سب کچھ
جامعہ کو دے دیا پھر جامعہ اور ذاکر صاحب دو نہیں رہے
اگر ــــــ جامعہ ذاکر صاحب سے الگ
کچھ ہوتی تو جامعہ میں یہ انفرادیت اور اچھوتا رنگ
کیسے پیدا ہوتا۔

دہلی میں ایک جگہ دور ہی سے سب سے
الگ تھلگ بالکل نئے طرز کے چند گنبد نظر آتے ہیں۔
کہا جاتا ہے یہ جرمنی کا آرٹ اور وہاں کا فن ہے
یہ انداز تعمیر ذاکر صاحب اپنے ساتھ اپنی جامعہ کے
لیے لائے تھے۔ جس ادارے کو وہ معنوی لحاظ سے
بے مثال اور منفرد رکھنا چاہتے تھے۔ اسی کی ظاہری
بناوٹ اور انداز تعمیر کو ممتاز رکھنے کے لیے۔

شخصیت سازی کسی انسان کا بہت بڑا
کمال ہے۔ یہ کمال اس وقت اور بھی نکھر کر سامنے
آتا ہے جب عام انسانی ماحول اور مزاج سے الگ
کوئی راہ نکال لی جائے۔ بہت سی داخلی اور خارجی
رکاوٹیں ہوتی ہیں جو تربیت کرنے والے سے زیادہ
تربیت پانے والے کو روکتی ہیں۔ اور اس وقت اس
پڑتا ہے۔

بے شک یہ کمال خدا نے ذاکر صاحب کو
بڑی فیاضی سے عطا فرمایا تھا۔ جرمنی سے آنے کے بعد
ایک طرف ان کو اپنی زندگی سے زیادہ جامعہ کی زندگی کی
فکر تھی اور اس کے لیے اپنے عزیز ساتھیوں "پروفیسر
محمد مجیب، ڈاکٹر عابد حسین، آپا جان" اور دوسرے ان
دوستوں کو جن سے اس سنگلاخ میدان میں کام لینا تھا
تیار کر رہے تھے۔

دوسری طرف دنیاوی عزت و دولت کے
سب دروازے خود ڈاکٹر صاحب اور ان کے دوسرے
ساتھیوں کے لیے کھلے ہوئے تھے اور اپنی لیاقت اور
قابلیت کے بل بوتے پر جس دروازے میں داخل ہونا
چاہتے دولت اور عزت کی دیوی ان کا استقبال کرنے
کو تیار تھی۔ کیا وقت اور کیا سماں تھا۔ اب راہ کا انتخاب
کرنا تھا۔ ذاکر صاحب نے خلوص، جدوجہد، اور شخصیت
کی بلندی کی آنچ اور حرارت سے ساتھیوں کے دلوں
کو گرما دیا تھا۔ ایک آہنی فیصلے کے بعد سارے دروازے
بند کر دیے گئے۔ جامعہ کا دروازہ کھلا اور یہ لوگ اللہ
کا نام لے کر اس میں داخل ہو گئے۔

جس نے جامعہ میں پروفیسر محمد مجیب کو دیکھا اور
سنا ہے۔ ان سے گفتگو کی ہے وہ محسوس کرے گا کہ
اچھے آدمیوں کو ایسا ہی ہونا چاہیے۔ ذاکر صاحب
کی زندگی کے فیضان کا زندہ اور سچا نمونہ۔ اور ڈاکٹر

ان کی محبت کی آنچ محسوس کی ہے وہ اس فیصلے میں حق بجانب ہوگا کہ پاک دل نیک لوگوں کی یہی پہچان ہے اور میں دل اور روح کے پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ ان دونوں پر ذاکر صاحب کی چھاپ ہے —

اب مجھے اپنے سوال کا جواب مل چکا تھا —— مل رہا تھا۔ ذاکر صاحب اور جامعہ دو نہیں ہیں ایک ہیں میرے بچپن کا تصور غلط نہ تھا۔ اور اب ذاکر صاحب اس دنیا میں نہیں ہیں، مگر جامعہ کے متحرک ماحول میں ذاکر صاحب کا نظریۂ حیات "کچھ نہ کچھ کیے جاؤ" ہر جگہ نظر آتا ہے۔ جامعہ کی اس بے سروسامانی میں یقین اور اعتماد کی ایک چمک نظر آتی ہے جس کی روشنی میں جامعہ آگے بڑھ رہی ہے اور اس تیز رفتاری میں ذاکر صاحب کی ایک ہی پیغمبرانہ تبلیغ راہبر ہے " کام کرلیے پیسے کا انتظار نہ کرو کام کیے جاؤ خدا پر بھروسہ پیسہ خود جمع ہوگا۔"

جامعہ کے ماحول میں اشتراک و تعاون سیکولر قدریں ایمان و عقیدے کی طرح ملیں گی ذاکر صاحب کے تابناک عقیدے کی پرورش گاہ او ہے اور ذاکر صاحب کے خوابوں کا عکس جمیل۔

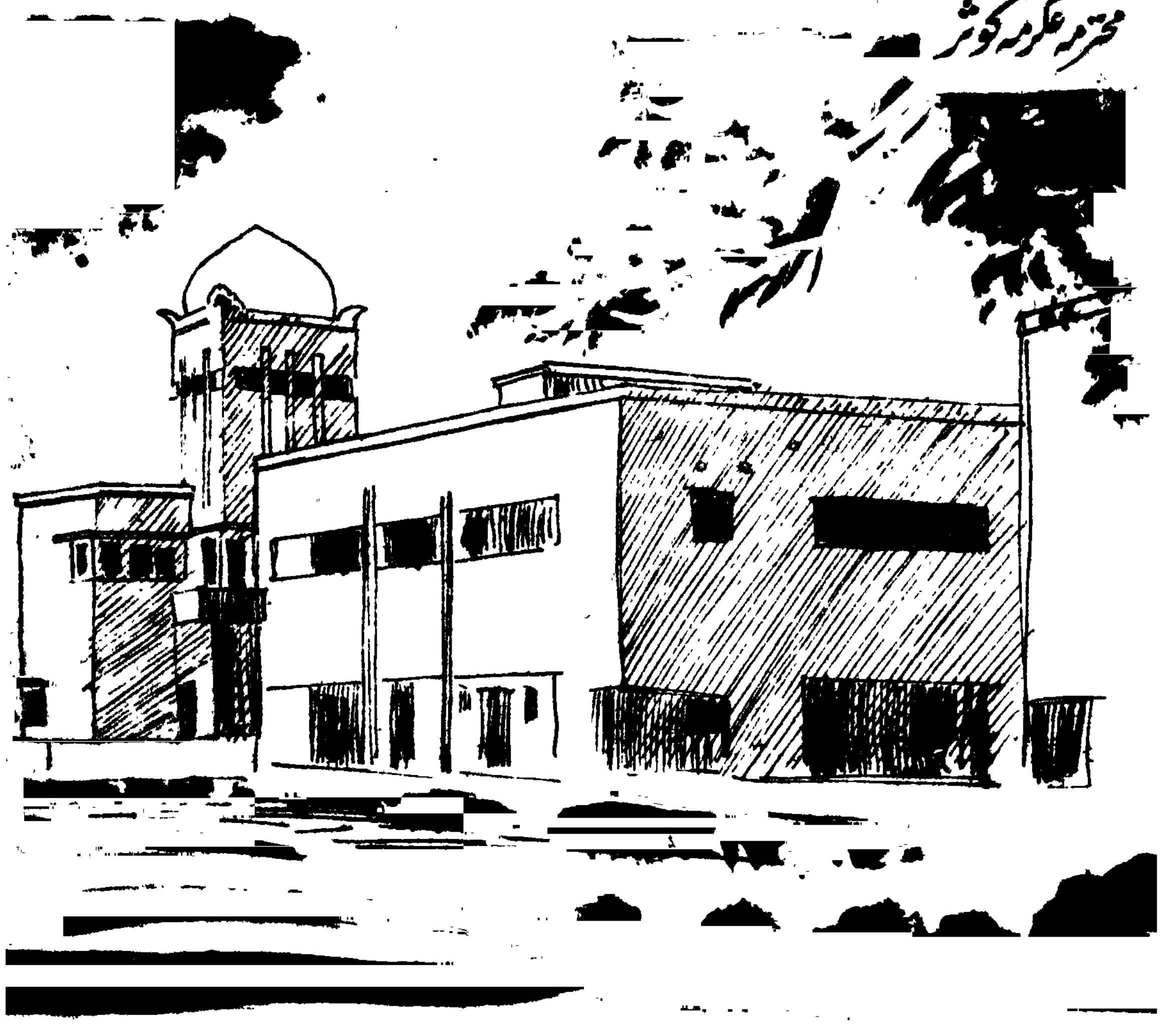
زندگی بھر تھک کر ذاکر صاحب اپنی جا گود میں آسوئے ہیں۔ خدا کی رحمت ہو انکے مزا اور اس جامعہ پر جس نے گود پھیلا کر اپنے ذاکر قیامت تک کے لیے سلا لیا ہے۔ اب ہمارا فرض ہے کہ ا عمل و کردار سے ان کی روح کو سکون دیں۔

جناب عبداللہ شرقی

قطعہ

صدر وہ ہندوستان کے ڈاکٹر ذاکر حسین
تھے نگاہِ ہر بشر میں معتبر ذاکر حسین
جذبۂ ایثار ان کا قابلِ تکریم ہے
خادمِ ملّت رہے ہیں عمر بھر ذاکر حسین
تھی ضرورت ان کی اے شرقی زمانے کو ہنوز
چل دیے افسوس اب منہ پھیر کر ذاکر حسین

محترمہ عکرمہ کوثر



جامعہ کی تعلیم

(بڑے بچوں کے لیے)

آؤ تمھیں بتاؤں ذاکر نے جو کہا ہے — ذاکر نے جو کہا ہے، تعلیم جامعہ ہے
تعلیم جامعہ ہے میرے عزیز بچو! — میرے عزیز بچو! یہ بات یاد رکھو!!
مقصد تمھارا خدمت، راہِ عمل صداقت — یہ فرض ہے تمھارا وہ ہے تمھاری غایت

خدمت کے ولولہ سے بھرپور دل کو رکھو　　اس نور سے ہمیشہ معمور دل کو رکھو
یہ چیز ہے وہ جس سے ہر دل میں گھر کروگے　　انسانیت کی بازی اس طرح سر کروگے
دیکھو نہ جانے پائے ہاتھوں سے اب صداقت　　بن جائے یہ تمھاری پرحوصلہ روایت
سچائی کے چلن کو اپناؤ، عام کردو　　یہ کام کر کے اپنا دنیا میں نام کردو

اس راہ میں جو آئے مشکل سو جھیل جاؤ
منھ موڑنا کہاں کا، جاں تک پہ کھیل جاؤ

تعلیم جامعہ ہے خود سختیاں اٹھاؤ　　خود سختیاں اٹھا کر اوروں کے کام آؤ
کھا کر کے روکھا پھیکا دن کاٹ لو خوشی سے　　موٹے لباس ہی سے تن ڈھانک لو خوشی سے
لیکن دماغ میں تم اونچا خیال رکھو　　پیشِ نظر ہمیشہ اچھی مثال رکھو

آباد دل کو رکھو پاکیزہ آرزو سے
جب تک جیو، جیو تم عزت سے آبرو سے

پھر یہ بھی جامعہ کی تعلیم ہے، یقیں ہے　　اس میں کہیں سے کوئی شبہ ذرا نہیں ہے
سچے بھی تم بنوگے، اچھے بھی تم بنوگے　　پُرعزم اور دھن کے پکے بھی تم بنوگے
جاں باز اور جیوٹ، جیدار اور جیالے　　باحوصلہ، بہادر، بیدار بخت والے
خوش خلق، نیک طینت تم باوقار ہوگے　　اچھوں کے واسطے تم رحمت شعار ہوگے
لیکن بُروں کے حق میں تم ہوگے سنگ خارا　　ہوگا تمھیں نہ ہرگز کارِ بدی گوارا
بے کس کا آسرا تو مجبور کا سہارا　　بن جائے گا یقیناً دستِ کرم تمھارا
سوئے ہوؤں کو اٹھ کر بیدار تم کروگے　　اور ڈوبتے ہوؤں کو اس پار تم کروگے
ہوگے غریب بھی تو دل کے غنی رہوگے　　تم بے نیازِ دولت ہو کر دھنی رہوگے
اوروں کے مال و زر کی چاہت نہیں کروگے　　دولت کی بھول کر بھی حسرت نہیں کروگے
ہوگے جو صاحبِ زر، خود سر نہیں بنوگے　　کج خلقی و ستم کے خوگر نہیں بنوگے
دولت کو اپنے رب کی سمجھوگے اک امانت　　دل کھول کر کروگے خلقِ خدا کی خدمت

تعلیم جامعہ کی اس طرح عام ہوگی
یہ درس گاہِ ملّی یوں نیک نام ہوگی

تمیم فرید آبادی

لو ہم چلے شیر کے شکار کو

جانی گرمیوں پھر غازی صاحب (ڈی ایف۔
ہ نامہ میرے نام آیا۔ اس خط میں جنگل کے پُرفضا
خوش گوار آب و ہوا کا حال انھوں نے اتنے
سے لکھا تھا کہ میں، باوجود اس کے کہ ان سے کہہ کر
ئندہ جنگل کی سیر کو نہیں آؤں گا سفر پر تیار ہو گیا۔
کے شوق کو مہمیز کرنے کے خیال سے خط کی رسید
آنے کا عزم لکھ کر آخر میں ان سے وعدہ کرنے
ں کی کہ وہ مجھے کسی شکار و کار پر مجبور نہیں کریں گے
کیا کھٹاک سے ان کا جواب آیا کہ میں حیران رہ
ے عزم کی ایسی داد دی گویا میں جہاد کرنے جا رہا
خر میں لکھا۔ اس جنگل میں درندے نہیں ہوتے میاں
!

غازی صاحب گو غازی نہیں تھے مگر جھوٹ
آتا ہی نہیں تھا۔ بقول شخصے کمزور دماغ کے
ان کی ہر بات کا یقین کرتا تھا۔ اس مرتبہ بھی
مد میں پتہ چلا کہ ایک دوست سے ملنے کی خاطر
غلط بیانی کی تھی۔

ان کی ہدایتوں کے بموجب چلتے وقت تار دیا۔
اپر سفر کیا جس کی تلقین کی تھی۔ سب کچھ وہی
وں نے لکھا تھا، اور خیریت سے لکھیم پور اترا۔
غازی صاحب کا معتمد چھدا اسٹیشن پر موجود
[illegible]

پر چھپٹتا ہو گا۔ میں نے ایک قلی کو اشارہ کر دیا تھا مگر چھدا نے قلی کو ایسا دھکا دیا کہ وہ تو کیا یاد کرے گا مجھے آج تک یاد ہے یعنی بے چارا قلی پلیٹ فارم پر کھڑا کھڑا ٹرین کے دروازے سے ایسا ٹکرایا کہ بند دروازہ کھل گیا۔ اگر دروازہ بند نہ ہوتا تو وہ ٹرین میں لمبا لمبا لیٹا نظر آتا۔

جب باہر آئے تو میں نے پوچھا: "غازی صاحب کیوں نہیں آئے؟"

اس نے بتایا کہ "صاحب" کل دورے پر چلے گئے۔ اور مجھے وہیں لے جانے کو یہ ملک الموت آیا ہے۔

ملک الموت اس معنی میں کہ وہ جنگل کے ہر جانور کا دشمن تھا۔ اس کا بس چلتا تو کوئی چرند پرند چوپایہ نہ چھوڑتا۔ آخر رام پور کا پٹھان تھا۔

صبح کا وقت تھا چھدا نے مجھے ایک ریسٹ ہاؤس میں پہنچا کر چائے وغیرہ بہت تواضع سے پلائی۔ میں رات کی تھکان اتارنا چاہتا تھا کہ اس نے مجھے ایک ٹٹو پر بٹھا دیا ——— ہوا یہ کہ میں جو ناشتے سے فارغ ہو کر کمرے سے باہر نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ایک مریل سا دیہاتی اُس سے بھی مریل ٹٹو کی رسی پکڑے کھڑا ہے۔ ٹٹو کی حیثیت کے مطابق اس کی زین تھی۔
[illegible]

لگام میں دو پیوند، رکاب سرے سے غائب۔

میں اس عجوبۂ روزگار کو اچھی طرح دیکھنے بھی نہیں
پایا تھا کہ چھدا کسی پر خفا ہوتا گرجتا میری طرف آیا اور
بہت ادب سے کہا "حضور! گھوڑے پر سوار ہوں۔
میں سائیکل پر ساتھ چلوں گا۔"

میری زبان پر یہ فقرہ آیا کہ حضور گھوڑے پر
بیٹھیں بندہ سائیکل پر گذر کرے گا۔ مگر ضبط کر لیا۔
اس لیے کہ غازی صاحب کے "اسٹینڈنگ آرڈرز"
میں ایک حکم یہ تھا کہ "میرے ماتحتوں سے مذاق نہ کرنا"۔
بہر حال میں کچھ مُذبذب تھا کہ چھدا نے رسی پکڑے
دیہاتی کو کڑک دار آواز میں حکم دیا "قریب لا گھوڑا۔"
اور مجھ سے آواز بدل کر کہا "حضور بیٹھیے۔
ورنہ ہم کو دیر ہو جائے گی۔"

میں بیٹھ تو گیا۔ وہ مشکل بھی کیا تھا لمبے آدمی کو
جہاں بہت سی زحمتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے (مثلاً نیچے
چھوٹے دروازے کی چوکھٹ سے سر ٹکراتا ہے) وہاں
کچھ آسانیاں بھی اللہ تعالے نے عطا فرمائی ہیں۔ مثلاً
یہی کہ میں نے چبوترے پر کھڑے ہو کر ایک ٹانگ اٹھائی۔
اور ٹٹو کی کمر پر جا بیٹھا۔ ہلدی لگی نہ پھٹکری۔ ورنہ بغیر
رکاب کی کاٹھی پر بیٹھنے کے لئے ہر پستہ قد کو سرکس والوں
کی طرح اچھل کر بیٹھنا پڑتا ہے۔

ٹٹو شاید کھڑے کھڑے گھبرا گیا تھا کہ فوراً چل
پڑا اتنے فوراً کہ لگام ابھی میرے ہاتھ میں آنے نہیں پائی۔
چھدا تیز قدموں سے پھر ریسٹ ہاؤس کی غلام گردش میں
گیا پھر اس کے گرجنے کی آواز آئی۔ اب جو وہ
ایسی نادر سائیکل کی ناز برداری کرتا آیا کہ میں
خدا کا شکر ادا کیا کہ اس لوہے کے ڈھانچے
پروردگار نے مجھے زحمت نہ دی۔ اس کا ہینڈ
گائے کی طرح سیدھا سیدھا، کئی جگہ سے د
تھا۔ سیٹ کی جگہ رُوڑا اور ٹاٹ کا گدیلا تھ
میں دو موٹے پنچر ٹائر بیں لگے ہوئے تھے
"گھسٹ" کی نوید سنا رہے تھے۔ پیڈل کی جگ
گھسی پسی کیل تھی۔ نہ آگلا مڈگارڈ تھا نہ پچھ
کیا نہائے گی کیا نچوڑے گی" کی تفسیر۔ بریک
"یہ تم کیا سٹر پٹر کر رہے تھے چھدا
"حضور! سودا اب تک نہیں آسد
فورسٹ گارڈ سے کہہ رہا تھا کہ جلدی لا، ا
بنگلے پہ پہنچ"۔

"یہ تمھاری سائیکل، کوئی بتا سکتا
میں بنی تھی؟"

دیکھئے، میں غازی صاحب کے ا
پر اُتر آیا تھا۔ مگر مائی لارڈ، اس کا سبب
اس عربی گھوڑے پر کیسے کاٹوں گا؟

"حضور! یہ سائیکل اسی فورسٹ
شہر میں اس وقت کوئی کرایے کی سائیک

یہ سفر بہت دلچسپ یعنی بہ
تکلیف دہ اور صبر آزما تھا۔ مگر بقول شیخ
عمر کوتاہ، "چلنے والے کی عمر دراز، ہمارا"

نیا۔ نو میل کا سفر تین گھنٹے میں طے ہوا۔ بقول چھدا
یا اچھے وقت پر آگئے۔" شاید اس کی مراد یہ تھی کہ ہم
میل کا سفر نو گھنٹے میں طے کرنا چاہیے تھا۔

یہ بھی محکمہ جنگلات کا بنگلہ تھا۔ وہی وحشت اس
پاس پر، وہی خونخواری اس کے اونچے اور بھیانک
رپہر اور وہی کائی اس کی ٹین کی چھتوں پر تھی، جو ہر
ی بنگلے کا طرۂ امتیاز ہے۔ برآمدے میں پڑی ہوئی
رام کرسیوں میں سے ایک پر غازی صاحب اپنے تن و
س کے ساتھ اور دوسری پر ایک بڑے مقطع پنڈت
تھے پر کئی بھوری خاکی لکیریں ڈالے، خاکی پتلون
ملد دھوتی کو سمائے، ایک خاکی کوٹ کے نیچے روئی
ملدری چھپائے بیٹھے نظر آئے۔

اب ذرا غازی صاحب کا اخلاق ملاحظہ ہو۔
سلام علیکم کے جواب میں انھوں نے مجھے اس طرح
یا پہچاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اور جب
پچکے تو بجائے وعلیکم کے فرمایا "میاں تم نے
وضع بنائی ہے"

ہاں، بے شک میری وضع قطع وہ نہیں تھی جو
پر قدم رنجہ فرمانے سے پہلے تھی۔ میرا چست پاجامہ
ن، میری شیروانی استری شدہ، میرا چہرہ روشن،
آنکھیں منور، میری کمر کھنچی ہوئی اور سخت تھی۔ اور
ا اتراتی کیفیت بلکہ سین یہ تھا ــــــ میرا
پلجامہ کسی تیلی کے کپڑے کی طرح کثیف و ملگجا،
آسودہ خاطر، میرا چہرہ ہونق، میری آنکھیں چندھی نظر
آرہی تھیں۔۔ اور کمر ــــ ہائے جھکی جھکی۔

"یہ وضع آپ کے خلعت فاخرہ یعنی اس بیش
قیمت آہو کا صدقہ ہے، اور مزید اضافہ راستے کی خاک
نے کیا ہوگا۔"

"کیا ہوگا! یعنی آپ کے خیال میں کیا نہیں؟"
انھوں نے بہت رکھائی سے کہا "مہربانی سے فوراً
غسل کیجیے جائیے جائیے"

"ارے بھئی مجھے سانس تو لینے دو ــــ آپ
کی (پنڈت صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) تعریف؟"
غازی صاحب شاید اس بات پر جھینپ گئے۔

"ہاں، ہمارے رینجر پنڈت ــــ"

"آداب عرض پنڈت جی مہاراج نمستے"

واقعی میرا لہجہ بے تکلفی کا پہلو لیے ہوئے تھا۔
غازی صاحب کے چہرے پر خفگی کی تمام علامات چھا گئیں
اور جب ایسا ہوتا ہے تو وہ ہونٹ چبانے لگتے ہیں۔
اس دفعہ بھی چبائے۔

پنڈت جی نے مجھے محبت اور ادب سے ہاتھ
جوڑ کر پرنام کیا۔

"آپ حقہ تو پیتے ہوں گے پنڈت جی؟ جی؟"

غازی صاحب کا پارہ چڑھ کر رہ گیا۔ اب
انھوں نے ہونٹوں کو چبانے کی بجائے زبان کو کلے میں
اس طرح اڑایا کہ کلے میں گومڑا سا نظر آیا۔ پنڈت جی

"آپ کو لکھنؤ کا قوام (قوام) ملے گا یہاں"

"تیری آواز مک ——— مجھے ضبط کرنا ہی پڑا۔ اس لیے کہ غازی صاحب کو غش آنے میں کچھ دیر نظر نہیں آ رہی تھی۔ انھوں نے جلدی سے پنڈت جی کو یہ کہہ کر رخصت کیا "اچھا شام کو آیئے" اور مجھ پر برسنے کا انتظار کرنے لگے۔

دراصل وہ پنڈت جی کے دور چلے جانے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے احتیاطاً ایک فقرہ پنڈت جی کے کان پر خاصا بلند آواز میں مارا۔ "معاف کیجیے گڑگڑی میں نہیں پیوں گا ——— ہاں فرشی حقہ ہو یا خیر حقہ....."

پنڈت جی نے جواباً ارشاد فرمایا "جو آگیا۔ (آگیا بمعنی مرضی)

اب غازی صاحب نے تکلفات برطرف رکھے اور میرا داہنا بازو پکڑ کر اس طرح کمرے کے اندر لے کر چلے جس طرح منہ زور گھوڑے کو سائیس اصطبل میں لے کر جاتا ہے کمرے میں ان کو آزادی کی فضا ملی۔ فوراً بولے "یہ آپ کا کیا طریقہ ہے۔ جان نہ پہچان فرمایش کر دی"

"بھئی تم حقے بازوں کے آداب سے نابلد ہو میں نے عین شرافت کا ثبوت دیا۔

"بالکل نہیں۔ انتہائی اکھڑپن کا مظاہرہ تھا۔ گھٹیا بات"

کا من موہ لیا ہے۔ تم ان سے پوچھنا تو سہی مگر میرا دل تو جلا دیا"

"اس پر مرہم لگانے کی ترکیب جان
پہلی ترکیب ——— کچھ کھلاؤ"

اس فرمایش پر غازی صاحب کا
محبت کے جذبات سے لبریز ہو گیا۔ لپٹ گئے
بھینچا، تھپکا، اور میرے یہاں آنے کی
کی بہت معذرت چاہی۔

دو منٹ کے اندر چھوارے، کچھ چلغوزے
گری اور کشمش دو پلیٹوں میں لے کر آگیا۔ کھا
سے غازی صاحب کو روحانی، جسمانی او
ہوتی ہے۔

لیڈیز اینڈ جنٹل مین! میرا مد
اے ماؤں، بہنو، بھائیو! آپ کچھ نہ کچھ
گے اور شیر کے شکار کے لیے قدرے بے
گے، لہٰذا یہاں کا قصہ چھوڑ کر میں آپ کو شب
کی روئیداد لکھتا ہوں:۔

مجھے اس بن باس میں آئے تیس
سا کھانا حلق تک کھا کر میں اور غازی ص
کرسیوں پہ دراز تھے کہ ——— سنیے
ڈریے نہیں، شیر نہیں آیا، بلکہ چھدا آ
چال سے آیا جو غیر معمولی تھی۔ یعنی کمرے
اور جالی والا دروازہ اس نے اس شائستہ

الی کے کواڑ کو اس طرح بند کرتا کہ آہٹ یا کھٹکا کچھ نہ ہو،
اس بار مرتبہ اس نے کواڑ کو کھولا، اندر آیا اور کواڑ نے
بنے ہی زور میں اپنی ہی دہلیز یا چوکھٹ سے سر مار ا آواز
ئی دھڑاک۔ اور چھدا بولا "حضور اکل ہوا ہے"
غازی صاحب نے بغیر سنبھلے پوچھا "کب ؟"
اور چھدا نے بغیر سوچے کہا "صبح"
غازی صاحب نے فوراً سوال کیا، بلکہ کسمسائے
ہی "کہاں ؟"
چھدا نے نصف قدم آگے بڑھا کر کہا "گاؤں
کے جوہڑ کے پچھم میں"
میں نے اس مکالمے پر مطلق توجہ نہ کی، بلکہ
منتظر رہا کہ یہ چھوٹے سوال اور چھوٹے جواب ختم ہوں
میں اپنی بمبئی والی واردات کا کلائی میکس بیان کروں،
س واردات پر غازی صاحب کرسی پر نیم دراز لیٹے ہوئے
ہقہے مار رہے تھے اور بار بار اپنی توند سنبھال رہے تھے۔
تکیہ کلام کی طرح ان کو "تکیہ عادت" یہ پڑ گئی تھی۔ کہ
ب بے تحاشا ہنستے تو توند دونوں ہاتھوں سے اس
رح سنبھالتے جس طرح فٹ بال گول کیپر کک
فٹ بال سنبھال لیتا ہے۔
ایک بلکہ آدھی کروٹ لے کر وہ کرسی سے اٹین
ن کی طرح اٹھے اور آنکھیں جھپکاتے باہر نکلے میں
نے للکارا۔
"ہیں؟ کدھر؟ پھر میں ۱۹۳۲ کی ملکہ حسن
و ڈبوتا ہوں چوپاٹی کے ساحل میں"

"ایک منٹ۔ پلیز۔ ابھی آیا ــــ دھڑاک
دروازہ بند اور غازی بمعہ چھدا فرار"
"اگر دن میں دس مرتبہ یہ دروازہ ایسے زلزلے
سہتا رہا تو آثارِ قدیمہ کے نوادرات میں جگہ مل جائے
گی" میں نے دل میں کہا۔
ایک کی بجائے غازی صاحب تقریباً دس
منٹ میں پتلون کو اوپر سرکاتے ہوئے۔ واپس آئے۔
جب کوئی اہم معاملہ یا قابلِ ذکر کوئی بات ہوتی تو غازی
صاحب کی پتلون بہ قدر نصف انچ نیچے ہو جاتی ہے۔
اور وہ بہ قدر ڈیڑھ دو انچ اسے گھسیٹ کر اوپر سرکا
دیتے ہیں۔ وہ آئے۔ تو مسکراہٹ کو چھپاتے معلوم
ہوئے ــــ "یہ تمھارا ایک منٹ تھا ؟"
"جناب تو رخصت پر ہیں اور یہ فدوی سرکاری
نوکری پر ہے۔ ۲۴ گھنٹے آپ کی درباداری پر متعین
نہیں ہے"
میں نے اُن کی مسکراہٹ کے باعث اس
فقرے کا نوٹس نہیں لیا۔
"یہ چھدا کیا کہہ رہا تھا ؟" میں نے پوچھا۔
"جنگلات کے معاملات آپ نہیں سمجھ سکتے،
ہاں ہم کہاں تک پہنچے تھے ؟ پھر وہ مس سلطانہ کو
نکالا کس نے ؟"
میں نے آنکھیں بند کر لیں جھوٹ موٹ
روٹھ گیا خفگی کا سبب یہ تھا کہ چھدا اور ان کی گفتگو
میں مجھے ایک لفظ کا مطلب معلوم نہیں تھا ــــ

کل ـــ یہ ناواقفیت مجھے لے ڈوبی۔ غازی صاحب سے پوچھنا بے کار تھا، ان کا کردار اس وقت اسپوتنک سے مل رہا تھا۔ ہر بات مجھ سے چھپا رہے تھے۔

شام کی چائے پی کر غازی صاحب مجھے برآمدے میں ٹھا کر، پتلون اوپر سرکاتے ہوتے، ملازموں کے کوارٹر تک گئے اور جلدی واپس آگئے۔ دعوت دینے کی طرز میں کہا۔

"آج ہاتھی کی سواری ہو جائے۔"

"ہٹو پرے۔ آپ کے ٹٹو کی سواری نے اب تک کمر کا ٹیڑھا پن سیدھا نہیں ہونے دیا۔۔۔"

"آہا ہا۔ کیا بچکانہ استدلال ہے۔۔۔"

بڑی ردّ و قدح اور ان کی منطق سے زچ ہونے کے بعد میں نے ہاتھی پر سواری کرنی منظور کر لی۔

بعض مسجدوں میں لکڑی کے منبر ہوتے ہیں۔ ہاتھی پر چڑھنے کے لئے کچھ اس سے ملتی جلتی سیڑھی پر غازی صاحب اپنے نیم ہاتھی تن و توش کے ساتھ اتنی پھرتی سے ہاتھی پر چڑھے کہ میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

اس وقت اُس بنگلے کا سارا عملہ موجود تھا جن کی تعداد ایک درجن سے کم نہ تھی، مزدور قسم کے چار چھے افراد کچھ فاصلے پر کھڑے تھے۔ مجھے جو اعتراض اس زبردست ڈیل ڈول کے جانور پر سواری کرنے کا تھا۔ حالات کے باعث اس کے اعادہ کی ہمت نہ ہوئی۔ بسم اللہ کہہ کر چڑھا ہودے پر، غازی صاحب کے برابر جا بیٹھا۔ نے دو ڈرالفایس ہاتھ اونچا کر کے غازی صاح پکڑا دیں ـــــ پنڈت جی ایک دونالی لئے چڑھے، اور ہمارے پیچھے جم گئے، ڈپٹی ر ایک چھریرا مگر سوا چھ فٹا جوان ایک نالی بن کمر کے پیچھے چھپائے چڑھا اور پنڈت جی کے سے گھٹنا ملا کر بیٹھ گیا۔ پانچواں چھدرا تھا جس ہاتھ میں کارتوس کا ڈبا، چھن چھن بول رہا تھا۔

اب میرا ماتھا ٹھنکا، "کیا ہم لام پر جا ہیں؟"

غازی صاحب نے، جن کی گدگدی پر میری سوکھی سخت ران رکھی تھی، میری ران لی۔ اس سگنل کا مطلب یہ تھا کہ "خاموش، دشمن کمین گاہ میں بیٹھا ہے۔"

(باقی دلچسپ مضمون مارچ میں پڑھیے)

ہر ماہ بہترین نگارشات پیش کرنے والا اد

جلوہ نما

ملاحظہ فرمائے

سالانہ چھ روپے، نمونہ ساٹھ پیسے۔

پتہ: ماہنامہ جلوہ نما بہار روڈ بریلی

جناب کوثر اعظمی

سردی کا موسم



دکھاتا ہوا چار سو اپنا چم خم
لیے اک نئی رت، نیا ایک عالم
اڑاتا ہوا آگیا اپنا پرچم
ارے توبہ توبہ یہ سردی کا موسم

یہ سردی بھی ہے کس قیامت کی سردی
کہ ٹھنڈک سی لاکر ہر اک شے میں بھر دی
ہر اک پیڑ پودے پہ چھائی ہے زردی
ارے توبہ توبہ یہ سردی کا موسم

جو راتیں کٹھن ہیں تو دن بھی کڑے ہیں
ہواؤں کے جھونکے ستمگر بڑے ہیں
طیور آشیانوں میں دبکے پڑے ہیں
ارے توبہ توبہ یہ سردی کا موسم

کہاں اب چمن میں وہ موسم سہانا
نہ فصلِ بہاراں، نہ گل کا زمانا
نہ طوطی کے نغمے، نہ بلبل کا گانا
ارے توبہ توبہ یہ سردی کا موسم

نہ بستی میں رونق، نہ شہروں میں ہلچل
نہ باغوں میں دھومیں نہ جنگل میں منگل
سبھی سُونے سُونے، اداس اور بے کل
ارے توبہ توبہ یہ سردی کا موسم

بدن کانپتے، دانت بجتے ہیں اب تو
سرِ شام آلاؤ جلتے ہیں اب تو
سبھی کھا کے ٹھنڈک یہ کہتے ہیں اب تو
ارے توبہ توبہ یہ سردی کا موسم

یہ سردی کا موسم ستاتا ہے سب کو
مزا دھوپ کھانے میں آتا ہے سب کو
گیا وقت آنسو رلاتا ہے سب کو
ارے توبہ توبہ یہ سردی کا موسم

بچوں کی دلچسپ اور معلوماتی کتابیں

چاچا نہرو	۱/-	حضرت امام حسینؑ	-/۲۵	تین شہزادے
اصلاحی کہانیاں	-/۳۰	حضرت امام حسنؑ	-/۲۵	جادو کا ہاتھ
بچوں کی اخلاقی کہانیاں	-/۳۰	حضرت رابعہ بصریؒ	-/۲۵	جادو کی بطخ
بچوں کا ادب	۱/۵۰	حضرت سلمان رضؓ	-/۲۵	جادو کا گھوڑا
بہادر لڑکا	-/۴۰	حضرت بلال رضؓ	-/۲۵	جادو کا پھل
ٹیپو سلطان شہید	-/۳۰	حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ	-/۲۵	چڑیوں کی ملکہ
جنگل کی دنیا	-/۴۰	حضرت فاطمۃ الزہرا خاتونِ جنتؓ	-/۲۵	خوفناک جادوگر
دلچسپ لطیفے	-/۳۰	ابھرتا سورج	-/۵۰	دیو پیکر پرندہ
دلچسپ کہانیاں	-/۳۰	زمین کے تارے	-/۵۰	ڈاکٹر بوجھ بجھکڑ
ڈاکٹر اقبال	-/۳۰	چمکتے موتی	-/۵۰	رحم دل پریاں
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت	-/۲۵	تین قلندر	۲/-	رستم و سہراب
ریل کا سفر	-/۲۵	ایک تھی راجکماری	-/۲۰	شیش محل
سنہری چڑیا	-/۴۰	ایک تھی رانی	-/۲۰	شہزادی پدورا
کبڑا گھوڑا	-/۳۰	آدم خور زنگی	-/۳۰	شہزادی پری زاد
مولانا ابوالکلام آزاد	-/۳۰	افراسیاب کی بیٹی	-/۳۰	عراق کی شہزادی
ننھی منی کہانیاں	-/۳۰	بہادر راجکمار	-/۲۰	لنگڑا دیو
سرورِ دو عالمؐ	-/۵۰	باغی شہزادہ	-/۳۰	مسٹر عقلمند
حضرت صدیق اکبرؓ	-/۲۵	بے وقوف پریاں	-/۲۰	مغرور شہزادی
حضرت فاروق اعظمؓ	-/۲۵	پریوں کے تحفے	-/۲۰	ہنس مکھ شہزادہ
حضرت عثمان ذی النورینؓ	-/۲۵	پھول شہزادی	-/۲۰	ہیروں کا جزیرہ
حضرت علی شیرِ خداؓ	-/۲۵	تیسرا انعام	-/۲۰	

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال بمبئی ۳-۰

نیروبی کا حسن اور بانکپن

ناب محمد امین۔ام۔اے

اپریل ۱۹۶۹ء سے پہلے جب میں میکلے (اتھوپیا)
تھا تو ایک دن وہاں کے بین الاقوامی آبرہا کیسبل ہوٹل
ایک ٹورسٹ (سیاح) سے ملاقات ہوئی تھی اس
چالیس ملکوں کی سیر کی تھی اور خود شمال مغربی یورپ
رہنے والا تھا۔ پیرس، لندن، نیویارک وہ آئے دن
تا رہتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ پیرس دنیا کا خوبصورت
ین شہر ہے اور میں اس سے اسی کی تصدیق چاہتا تھا
ن باتوں باتوں میں جب مشرقی افریقہ کا ذکر آیا تو اس
کہا کہ یورپ اور امریکہ کے شہر کچھ پرانے انداز کے ہیں
یں بڑی ہماہمی ہے، بناوٹ اور فیشن پرستی بھی بہت
۔ اس کے برخلاف نئے شہروں میں نہ صرف افریقہ
اندر بلکہ سارے جہان میں نیروبی مجھے سب سے
دہ پسند ہے۔ آپ شاید پوچھیں کہ اس کی وجہ ؟ تو
صراً میں یہ کہوں گا کہ حقیقتاً نیروبی سیاحوں (ٹورسٹ)
لیے جنت ہے
اس کی کچھ اور وضاحت چاہتا تھا لیکن انھوں نے
کہ اب جبکہ تم خود افریقہ میں ہو تو کبھی نیروبی جا کر خود
یکھ لینا اور پھر تمھیں خود ہی یقین آ جائے گا کہ میرا
...

میں موقع کی تلاش میں تھا اور خود دیکھنا چاہتا
تھا کہ آج کل کے زمانے میں آخر کیا بات ہے کہ نیروبی
پیرس اور لندن سے بھی بڑھ گیا۔ خوش قسمتی سے نیروبی
جانے کا موقع بہت جلد مل گیا۔

۳۰ اپریل ۱۹۶۹ء کو ایر انڈیا کے ہوائی جہاز
سے میں عدیس ابابا (اتھوپیا کی راجدھانی) سے نیروبی
پہنچا۔ جہاز شام کو سات بجے پہنچا۔ ہوائی اڈے پر کسٹم
کی چیکنگ بہت سخت ہوتی ہے اس لیے باہر نکلتے
نکلتے کافی دیر ہو گئی پھر یہ کہ ایسٹ افریقین ایرویز
کوچ جس میں ہم بیٹھ کر ہوٹل جا رہے تھے۔ راستے
میں خراب ہو گئی اور تھوڑی دیر تک میں دوسرے مسافروں
کے ساتھ سڑک کے کنارے کھڑا رہا۔ لیکن کوچ کا
ڈرائیور تیز تھا۔ اس نے ٹیلی فون کر کے ہوائی اڈے
سے دوسری کوچ بلوا لی اور جلد سے جلد ہوٹل پہنچنے
میں ہماری مدد کی۔

بہر حال جب میں ہوٹل پہنچا تو رات کے گیارہ
بج چکے تھے۔ اس لیے کچھ ٹھیک سے اندازہ نہ ہو سکا
کہ نیروبی کا کیا رنگ روپ ہے اور کیا خاص

ہوٹل جس میں میں ٹھہرا تھا اس کا نام نیو اسٹینلے ہوٹل تھا یہ شہر اور بازار کے بیچوں بیچ واقع تھا۔ ایمبیسڈر ہوٹل کی طرح یہ بھی بہت ہی اعلیٰ درجے کا ہوٹل تھا بس یوں سمجھو کہ بمبئی کے تاج ہوٹل کی طرح یا نئی دہلی کے انٹرکونٹیننٹل اوبیرائے کی طرح ہر چیز بالکل نئے طرز کی۔ کمرے میں ٹیلی فون، گرم اور ٹھنڈے پانی کا انتظام بیڈ ٹی، بریک فاسٹ، لنچ اور ڈنر کا نہایت عمدہ انتظام، لاونج فرسٹ کلاس۔ ہوٹل کیا تھا اچھا خاصا محل تھا۔

ناشتہ کرنے کے بعد پہلی مئی ۱۹۶۹ء کی صبح کو جب میں باہر نکلا تو میرے ساتھ آئے ہوئے دو تین دوست نیچے میرا انتظار کر رہے تھے۔ ہم نے لاونج سے کھڑے کھڑے شہر پر ایک نگاہِ بازگشت ڈالی۔ پہلا اثر یہ ہوا کہ واقعی نیروبی خوب صورت شہر ہے ، عمارتیں قاعدے اور ترتیب سے بنی ہوئیں سڑکیں اور راستے کشادہ اور ہر طرف سڑکوں کے کنارے پھول کھلے ہوئے۔ ہم نے ٹورسٹ ڈیپارٹمنٹ سے ایک کوچ طے کی اور یہ پروگرام بنایا کہ گھوم گھوم کر شہر دیکھیں گے اور اندازہ کریں گے کہ میکلے کے سیاح نے جو بات کہی تھی وہ کس حد تک صحیح ہے۔

نیو اسٹینلے ہوٹل سے کوچ میں بیٹھ کر ابھی ہم تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ میں نے محسوس کیا کہ نیروبی یقیناً بہترین شہر ہے۔ ہر طرف شادابی، لان پھول دار پودے، بیلیں، اور فضا میں خوشبو۔ لگتا تھا کہ واقعتاً یہ یورپ کا کوئی شہر ہے۔ صفا اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ آگے بڑھے تو ہیں کہ پھولوں کی بھرمار ہے۔ پورا شہر کھلا ہوا جیسے اور بہار کی کیفیت چھائی ہوئی۔ ڈرائیور سید گیم پارک (چڑیا خانہ) لے گیا جس کا علاقہ ک میل سے زیادہ تھا۔ اس میں سیاحوں کے لیے جانور دیکھنے کا انتظام جنگل اور قدرتی ماحول ج ہم نے پورا دن اس پارک میں گذارا اور اپنی گاڑ بیٹھے بیٹھے مشرقی افریقہ کے سبھی جنگلی جانور مث چیتا، زرافہ، زیبرا کئی قسم کے ہرن، شتر مرغ، گینڈا، بھینسے، لکڑ بگھے، دریائی گھوڑا، مگر گوریلا اور چمپینزی سبھی دیکھ ڈالے۔ باہر نکلے ت جانوروں کو چڑیا خانہ میں دیکھا۔ اس کے بعد د دن نیروبی کا میوزیم دیکھا۔ اسی کے ساتھ ایک طرف سینکڑوں قسم کے سانپ بھی دیکھے گورمنٹ ہاؤس پارلیمنٹ کی بلڈنگ، یونیور اور اسی طرح بیسیوں چیزیں دیکھیں۔ ہم کچھ قیام کرنے کے بعد واقعی یقین ہوگیا کہ نیروبی کے لیے نہ صرف جنت بلکہ جنتِ بے نظیر۔ اس کے حسن اور بانکپن کا کوئی جواب نہیں

اگر آپ کو اُردو سے محبت ہے

تو

اردو اخبار اور رسالے خرید کر

ترجمہ آصفہ مجیب

آنگن

بچو آؤ تم سے کچھ پچھلے زمانہ کی باتیں کروں۔ لگ
ب چالیس برس پہلے کی باتیں، حسین حسان صاحب چاہتے
یہ باتیں یادگار کے طور پر آپ کو بتائی جائیں جب سے
تک زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے۔ کہیں کہیں اس کی
جائیاں نظر آتی ہیں مگر وہ بھی اب دھیرے دھیرے نظروں سے
ب ہو رہی ہیں۔

پرانے لوگوں نے مل کر زندگی، تہذیب، رسم و رواج
یک رنگا رنگ گنگا جمنی نقشہ بنایا تھا۔ علم اور اخلاق کے
راغ انھوں نے جلائے ان سے دوسروں نے روشنی
مل کی بصیرت حاصل کی۔ کچھ پایا کچھ کھویا، کچھ سیکھا کچھ
یا ——— اور بھلاتے جا رہے ہیں۔

نرکھی کہانی ہے:۔ کہانیاں آپ کو پسند ہیں۔
کہانی میں دیو نہیں پریاں نہیں جن نہیں، سیدھی
ی سچی سچی کہانی ہے۔ مگر اتنی ہی انوکھی اور نئی کہانی ہے
نے شاید کم سنی ہو گی۔ اس میں پھیلاؤ بہت ہے ہیں
رہن سہن رسم و رواج اور کچھ طور طریقے لے لیے ہیں۔
ر کچھ ساتھ دے گی سناؤں گی۔

پہلے بڑے بڑے خاندان ہوتے تھے سب ساتھ
مل جل کر رہتے تھے۔ شادیاں زیادہ تر آپس ہی میں ہوتیں یا
غیر جگہ سے رشتہ آتا تو بڑی چھان بین ہوتی کہیں دور سے
بھی سلسلہ ملتا تو کرتے اور جو ذرا کمی ہوتی تو کہتے "بھلا
کہیں کمخواب میں ٹاٹ کا پیوند لگتا ہے" دولت یا روپیہ
سے زیادہ اچھا خاندان اور ذات دیکھی جاتی ایک ہی سے
کئی رشتہ ہوتے کوئی خالہ بھی لگتی پھوپھی بھی نند بھی اور کسی
طرف سے بھاوج، کوئی بھائی بھی ہوتا، بہنوئی، دیور اور
چچا بھی۔ کے ایسے پیچ ہوتے سوچنے سے دماغ چکرا جائے۔

بہت بڑے راجاؤں مہاراجوں کو تو چھوڑیئے کچھ اچھی
اونچی حیثیت والے بھی بڑی شان سے آن بان سے عیش اور
فراغت سے رہتے تھے۔

گھر کیسے ہوتے تھے:۔ بڑے بڑے گھر ہوتے تھے محل
کہیے محل۔ اب ایسے کہاں نصیب کسی کو دو تین کمروں کا مکان
مل جائے تو خوش نصیب ہے۔ سنہ ۱۹۳۵ء اور اس کے کچھ بعد
تک جب جامعہ قرول باغ میں تھی۔ چار پانچ کمروں کا مکان
جس میں اچھا خاصا آنگن ہوتا پچیس تیس روپیہ مہینہ کرایہ
پر بڑی آسانی سے مل جاتا تھا۔ بہت سے ایسے نئے گھر بنے
تھے۔ مگر جامعہ غریب تھی جامعہ والوں کے پاس پیسے کا کال
تھا۔ اتنا کرایہ بھی نہ دے پاتے کئی کئی مہینے کا کرایہ چڑھ جاتا
مالک مکان غم کھاتے۔ کچھ استاد اپنے اچھے اچھے اور پرانے
گھروں کو چھوڑ کر ہوسٹل کے ایک کمرے میں تنگی سے گزارا کرتے
شام کو میں اور مجیب صاحب ٹہلنے نکلتے تو دیکھتے کرایہ کے
بہت گھر خالی پڑے ہیں۔ کوئی پسند آتا تو کہتے یہ لے لیں۔
مگر ہمارا مکان خاصا تھا۔ جامعہ نگر آنے تک اسی میں رہے۔
سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مالک مکان کرایہ کبھی نہیں

مانگتے تھے چھ چھ مہینے بعد کسی نہ کسی طرح پکا یا جاتا پھر
لوگ چھٹیوں میں گھر چھوڑ دیتے کہ دوسرا لیپ دے گا مفت
میں کرایا کون دے۔

ہاں تو وہ پہلے کے پرانے پرانے محل عالی شان
محل کہ دیکھ کر آنکھیں کھل جائیں۔ اب زیادہ تر کھنڈرات
کی صورت میں نظر آئیں گے لکھوری (چھوٹی اینیٹ)
کے بنتے تھے۔ ان چھوٹی لکھوری اینٹوں کو اس خوبصورتی
سے تراش کر لگاتے جیسے نگینے جڑے ہوں۔ نیو یا بنیاد
ہاتھی کے ڈباؤ کی رکھی جاتی خوب چوڑے آثار ہوتے۔
گرمیوں میں ٹھنڈے ٹھنڈے، جاڑوں میں دھوپ آتی۔
کافی اونچی زمین پر گھر بنائے جاتے، پھر مکان کی کرسی
بہت اونچی رکھی جاتی۔ مردانہ حصہ الگ جسے دیوان خانہ
کہتے۔ وہ بھی ایک عالی شان گھر ہوتا۔ تہ خانے ہوتے۔
احاطے کی دیوار قد آدم سے اونچی۔ پکے خوش نما چبوترے
جہاں شام کو بیٹھتے۔ ملنے جلنے والے آتے۔ پھاٹک ایسے
شاندار کہ اللہ اللہ! دیکھ کر رعب پڑے۔ اس کے دونوں
طرف دربانوں کے بیٹھنے کی کرسی نما چبوترے بعض گھروں
میں پھاٹک پر چھجے نما ایک عمارت بنی جہاں شادیوں میں
شہنائی والے بیٹھ کر شہنائی بجاتے۔ اس کی میٹھی مدھر
آواز ہر طرف لہراتی اور دلوں کو خوشی اور امنگ سے
بھر دیتی۔

اندر بڑا سا صحن۔ کمرے شہ نشین صحنچیاں دالان
در دالان محراب دار، طاق الماریاں دیوار گیریاں زیب
دیوار، جھاڑ فانوس جس میں موم کی شمعیں جلتیں۔ کمروں میں
بہار دار کپڑے کی چھت گیری لگائی جاتی تخت اور
قرینے سے بچھے ہوئے بستر کے چاروں کونوں
کے پایوں کے ساتھ سوت اور ریشم کی رنگ برنگی
کس دی جاتیں کہ لیٹتے بیٹھتے میں چادر سر کے نہ
فرش اور تخت پر اجلی اجلی چاندنی قالین اور گاؤ تکیے
ہوتے۔ پاس ہی چھوٹی چوکیوں پر منجھے منجھائے
کٹورے جھلا جھل کرتے۔ وضو کرنے ہاتھ منھ دھو
سلفچی لگی ہوتی پان دانی رکھی ہوتی۔

بیٹے بہو اور بیٹیوں کے رہنے کے لیے
ہوتے، ہوادار کمرے، دروازوں میں لوہے کی
ہوتیں چقیں پڑی ہوتیں برآمدہ، بڑا سا صحن غسل
وہاں وہ بے تکلفی سے رہتیں کیونکہ اس زمانے
بوڑھوں کا لحاظ بہت تھا۔ لڑکیاں اپنی سہیلی
کے ساتھ کھیل تماشے ڈرامے کرتیں ہنسی مذاق

عام طور سے اندر کے صحن میں کنواں
لگی ہوتی۔ تازہ تازہ پانی جب جی چاہتا نکال لیا
عورتیں کبھی ڈول سے کبھی ہلکی پھلکی لٹیا وغیرہ ڈال
بھشتی مشک لاتے۔ لال لال لنگی اور صافہ باندھ
بیویاں پردہ کرتی تھیں۔ اس لیے وہ ڈیوڑھی
آواز دیتے "بھشتی آیا ہے" بیویاں جہاں کھڑی
ہوئیں۔ دو خادمائیں وہیں پر وہ تان کر کھڑی ہو
جدھر جدھر بھشتی جاتا ہے۔ وہ گھومتی جاتی ہیں۔
گھروں شکوں پیتل تانبے کے گگروں میں پانی بھ
جاتا۔ کہیں کہیں بھشتی کو اجازت ہوتی کہ اپنے منھ پر کہ

چلا آئے۔ سمجھئے کا ناپردہ ہو جاتا۔

ورفت کے ذریعے:۔ بیویاں ایک گھر سے دوسر ڈولی یا فینس پر جایا کرتیں۔ اس پر رنگین پردہ بندھا کبھی بچہ بھی ماں کی گود میں ہوتا۔ اسے معلوم ہوتا جھولا رہا ہے۔ بہت خوش ہوتا پردہ سے جھانکتا بھی تھا۔ میں دو کہار اور فینس میں چار لگے ہوتے۔ دونوں طرف ڈال کر فینس کے موٹے ڈنڈے کاندھوں پر بسم اللہ ر اٹھا لیتے۔ نائن یا ملازمہ ساتھ ہوتی جو جلدی جلدی بڑھاتی ہوئی چلتی تھی۔ ڈیوڑھی میں ڈولی رکھ کر کہار دیتے "سواری آئی ہے"۔ ڈیوڑھی کے دروازے کے باہر نکل جاتے۔

اندر سے خادمہ سواری اتارنے دوڑتی بیگم صاحبہ بڑے پائنچے سنبھالتی دوپٹہ کاندھے پر ڈالے اترتیں ماں خالہ پھوپھی کوئی لے لیتا۔ اور سب بیوی سے تیں۔ کہاری (ڈولی کا کرایہ) بھیج دی جاتی جو دو تین ہوتی۔ پہلے یہ دستور تھا کہ آنے والے کا ایک طرف کا یہ میزبان ہی دیتے تھے۔ واپسی کا خود دیتے۔ چاہے ینس ہو یا گاڑی ہو کہیں دور جانا ہوتا تو بیگمات ڑی میں جاتیں۔ اس میں جھلملی کی کھڑکیاں ہوتیں کہ بھی رہے ہوا اور روشنی بھی آئے۔ پالکی گاڑی گھوڑے جتے ہوتے۔ مرد سوار ہوتے تو کھڑکیاں رہتیں، و کھلی فٹن اور تانگے پر بھی بیٹھتے۔ فٹن پر تو چھوٹے لڑکوں اور لڑکیوں کو لے کر کسی اچھی جگہ [illegible]

گاڑی اور گھوڑے ہوتے۔ غریب غربا زیادہ تر اکوں پر جاتے یہ سستی سواری تھی۔

لباس یا پہناوا:۔ بیویاں کئی کلیوں کا بڑے پائنچوں کا پائجامہ پہنتیں اس پر خوب چوڑی گوٹ۔ پائنچا ہاتھ میں اٹھا لیتیں اور کمال یہ کہ اس طرح اپنے کام دھندے بھی کرتیں۔ باریک چنے دوپٹے کسی میں کامدانی کسی میں چکن کڑھی ہوتی۔ کپڑے عطر اور سہاگچی (ایک خوش بودار مصالحہ) میں بسے ہوئے۔ غسل کرتیں تو سہاگچی دان میں تھوڑی سی آگ رکھ کر سہاگچی سلگاتیں اور نم بالوں میں اس کی خوش بو بساتیں بھینی بھینی مہک آتی۔ کچھ بڑی بوڑھیاں ایک عرض کے پائنچے اور پتلی سی گوٹ کا کھڑا پائجامہ پہنتیں، آدھی آستین کی کمر تک کرتی یہ اور پرانا لباس تھا۔ دوہرا آنچل لیتیں سارا بدن ڈھک جاتا اور سر تو کبھی کھلتا ہی نہیں تھا۔ جوج کر آتیں اکثر چوڑی دار پائجامہ اس پر لمبا کرتا پہنتیں۔

مرد جامہ دار وغیرہ کی شیروانی پہنتے گرمیوں میں جامدانی چکن کے انگرکھے، دوپلی ٹوپی۔ عطر میں بسے ہوتے۔ جاڑوں میں روئی کے دگلے اور مرزئی پہنی جاتی۔ خوب گرم اور نرم۔ اس میں نوکروں اور غریبوں کا بھی بھلا ہو جاتا۔ ہر سال نئے نئے بناتے۔ جو اترتے وہ ان کو ملتے۔ رضائی لحاف توشک ساری پرانی جڑاول تقسیم کر دی جاتی۔

کپڑوں کے نام بھی ایسے تھے کہ طبیعت خوش [illegible]

زیب دینے والا) شبنم، گلبدن، کمخواب، آب رواں، سب کے اچھے اچھے معنی ہیں۔

اور بھئی چھوٹے بچوں اور بچیوں کو شوق سے ایسے اچھے اچھے کپڑے بنا چنا کر پہنائے جاتے کہ وہ بہت ہی پیارے لگتے۔ کار چوبی مخمل اور بنارسی پوت کی شیروانی کا مدار ٹوپی۔ اور گوٹے پٹھے کی طرح طرح کی ٹوپیاں۔ سردی میں مرزئی دگلا، سر پر کنٹوپ۔ گرمیوں میں سفید چکن وغیرہ کے کپڑے پہنے پھول جیسے لگتے۔ بڑی لڑکیاں عام طور سے سادہ لباس پہنتیں۔

کھانے کے آداب :- فرش اور تخت پر کھانا کھانے کا دستور تھا۔ ناشتہ چاہے الگ الگ کرلیں مگر کھانا گھر کے سب لوگ ساتھ ہی کھاتے۔ بڑا سا دسترخوان بچھتا۔ اکثر چھپا ہوتا پھول پتی اور بیچ بیچ میں اشعار ہوتے۔ اردو کے بھی اور فارسی کے بھی ان کا مطلب اس طرح کا ہوتا کہ "خدا ہی سب کو روزی دیتا ہے اس کی نعمتوں کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ اور چاہے کوئی اس خوان میں شریک ہو وہ اپنا حصہ پاتا ہے۔" اس پر نظر پڑتی تو وہی احساس دل میں پیدا ہوتا، شکر اور خوشی کی ایک کیفیت پیدا ہو جاتی۔ جو بچے ذرا بڑے ہوتے وہ بھی کھانے میں شریک کیے جاتے کہ کھانے پینے کے آداب سیکھیں۔ بڑے نوالے ٹھونستا اور منہ سے زور زور آواز نکالنا تہذیب کے خلاف تھا۔ کوئی بچہ غلطی کرتا تو ٹوک دیا جاتا۔ بڑے پیار محبت سے سمجھا دیتے۔ بہت قرینے اور ادب سے بیٹھتے۔ لڑکیاں [illegible]

صورتوں سے ایسی بہار ہوتی کہ جیسے گا یا موتیوں کی لڑی ہے۔ بچوں کی میٹھی میٹھی سے کھانے کا لطف بڑھ جاتا۔ ان سے کو اور بات جو کہی جاتی اس میں بھی کوئی نکتہ کہ وہ سمجھیں اور سوچ سمجھ کر بات کرنے کی عادت پڑے۔

کھانے کے بعد :- کھانے کے بعد کھلتے، حقے کا دور چلتا، چٹکلے اور لطیفے سنا ہنستے ہنساتے۔ کبھی زمانہ کے حالات پر تبـ کوئی خاندانی مسئلہ چھڑ جاتا، اور سب کـ سردی ہوتی تو انگیٹھیاں پاس رکھی ہاتھ تاپتے کبھی بیویاں ڈلیا سروتا لے کر لگتیں بنائی کرتیں۔ کچھ لڑکیاں سر جوڑ کر دیتیں۔ چھوٹے بچوں سے کبھی کوئی یا اقبال کی غزل یا نظم سنانے کو فرمائش سُریلی آواز سے سناتے تو سماں بندھ ملتی۔ کبھی ان کے سبق کے معنی مطالب کبھی شطرنج بچھ جاتی یا تاش کھیلے لڑکیوں کو بیت بازی کا شوق تھا۔ ا یاد ہوتے کہ ذخیرہ ختم ہی نہ ہوتا۔ مشکل ہوتی۔ پہیلیاں اور مکرونیاں ایک بجھائی جاتیں۔

(باقی آئندہ)

محمد ارمغان ساحل سہسرامی

سالِ نو

عزیزو! جشن مناؤ کہ سالِ نو آیا — دیئے خوشی کے جلاؤ کہ سالِ نو آیا
مسرتوں کی گھڑی سال بھر پہ آئی ہے — سبھوں کو ہنس کے ہنساؤ کہ سالِ نو آیا
ترس رہے ہیں مرے کان ایک مدت سے — خوشی کے گیت سناؤ کہ سالِ نو آیا
چہک رہے ہیں پرندے تمام شاخوں پر — چمن کو اور سجاؤ کہ سال نو آیا
فضا میں گونج رہی ہے یہ ہر طرف آواز — خوشی کے ساز بجاؤ کہ سال نو آیا
بڑا حسین بڑا خوش گوار یہ دن ہے — گلے سے سب کو لگاؤ کہ سالِ نو آیا
چمن میں دھوم مچی ہے بہار آئی ہے — خوشی کے لطف اٹھاؤ کہ سالِ نو آیا
یہ وقت آئے گا اک سال کے گذرنے پر — جو خواب میں ہیں جگاؤ کہ سال نو آیا
جوان و پیر سبھی کی زبان پہ یہ ہے — نئی اُمنگ دکھاؤ کہ سال نو آیا
پرانے گیت جو ہیں ان کو طاق پر رکھ دو — نئے ترانے سناؤ کہ سالِ نو آیا

ادب کی دنیا میں ساحل تمھیں بھی لازم ہے
ترانے جشن کے گاؤ کہ سالِ نو آیا



جناب خورشید لطیف

ایک لڑکا اور مگرمچھ



ایک دن ایک لڑکا دریا کے کنارے ٹہل رہا تھا کہ کسی کے چیخنے چلانے کی آواز کانوں میں آئی۔ اس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی ایک مگرمچھ رسّیوں سے بندھا ہوا دکھائی دیا۔

"ارے! کیا ہوا؟" لڑکے نے پوچھا "کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں"

"مہربانی کر کے یہ رسّی کاٹ دیجئے" مگرمچھ نے کہا "اس مہربانی کے بدلے میں تم کو سونے کی ایک انگوٹھی دوں گا"

لڑکے نے رسّی کاٹ دی اور کہا "لاؤ اب انگوٹھی"

"انگوٹھی کے لیئے دریا کے دہانے تک چلنا پڑے گا" مگرمچھ نے جواب دیا "انگوٹھی میرے پاس نہیں ہے۔ میری نہ تو انگلیاں ہیں کہ پہن سکوں اور نہ جیب ہے کہ رکھ سکوں۔ میری پیٹھ پر سوار ہو جاؤ، وہاں سے انگوٹھی لے آئیں گے"

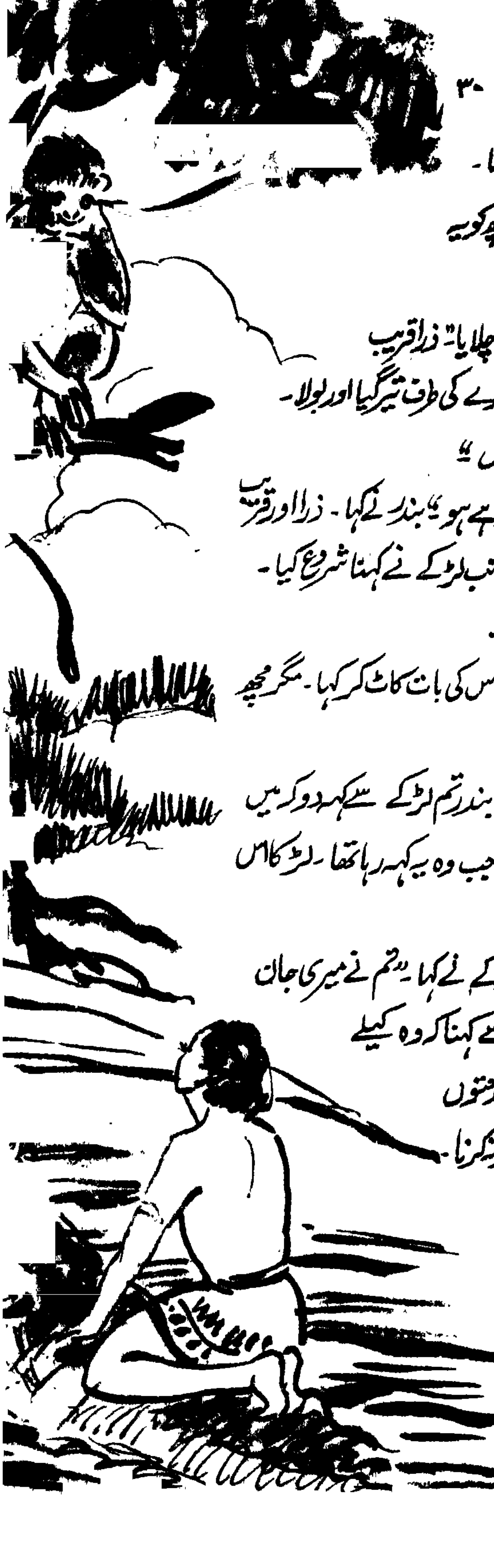
لڑکا مگرمچھ کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اور وہ دونوں بہاؤ کی طرف روانہ ہو گئے۔ جب وہ دریا کے سب سے گہرے حصّے میں پہنچے تو مگرمچھ یکایک رُک گیا اور اس نے کہا "میرے ننھے دوست! بے تکلفی معاف، میرے پاس کوئی انگوٹھی نہیں ہے"

"پھر تم نے وعدہ کیوں کیا تھا؟" لڑکے نے تعجب سے پوچھا۔ لڑکے کی بات سُنی اَن سُنی کر کے مگرمچھ نے اپنی بات جاری رکھی۔

"اب تو میں تمھیں اپنا نوالہ بناؤں گا، بڑا لطف آئے گا" "یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" لڑکے نے گھبرا کر پوچھا "میں نے تمھاری جان بچائی ہے" "تم نے سن لیا جو کچھ میں نے کہا ہے" مگرمچھ نے کہا

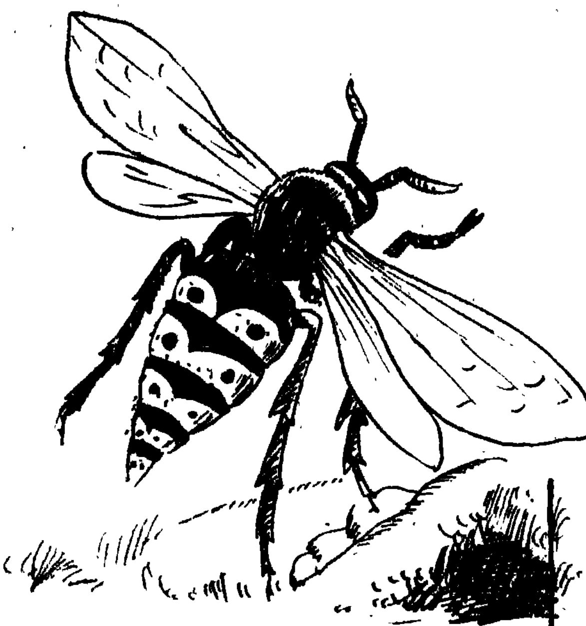
" یہ بے انصافی ہے ۔ یہ ظلم ہے " لڑکے نے کہا ۔
" بے انصافی ؟ مگرمچھ نے قہقہہ لگایا " ہر لڑکے
و مگرمچھ کے پیٹ کی زینت بننے کا موقع نہیں ملا کرتا ۔
اچھا تو آؤ پہلے تین چیزوں سے پوچھیں کہ تمھیں ایسا
رنا چاہئے یا نہیں " لڑکے نے کہا ۔
مگرمچھ یہ بات مان گیا ، کیونکہ اسے یقین تھا کہ
س پاس کا کوئی بھی جاندار انسان اور اس کے
ں سے ہمدردی نہیں رکھتا ۔
" اگر تم چاہتے ہو تو چلو تین چیزوں سے پوچھ لیتے
یں " اس نے جواب دیا ۔ فوراً ہی دھان کی ایک ٹوکری
گئی جو کہیں سے بہتی ہوئی چلی آ رہی تھی
" ٹوکری اے بی ٹوکری ! " لڑکے نے آواز دی ۔
ہربانی کر کے ذرا ہمارا جھگڑا چکا دو "
" تمھارا جھگڑا کیا ہے ؟ " ٹوکری نے سوال کیا ۔
" مگرمچھ ایک جال میں پھنس گیا تھا " لڑکے نے
ہنا شروع کیا " اس نے مجھ سے چھڑانے کو کہا اور اس
بدلے میں مجھے سونے کی ایک انگوٹھی دینے کا وعدہ کیا
ب میں نے جال کاٹ کر اس کو آزاد کر دیا ۔ تو اب اپنا
رہ پورا کرنے کے بجائے کہتا ہے کہ میں اب تم کو کھاؤں
تمھیں فیصلہ کرو کہ اسے ایسا کرنے کا کوئی حق ہے ؟ "
" جب میں نئی تھی تو میں نے اپنے مالک کی اچھی طرح
مت کی " ٹوکری نے کہا " لیکن جب میں پرانی ہو گئی
ر مجھ میں بہت سے سوراخ ہو گئے ۔ تو میرے مالک نے
[illegible]

سمندر میں جا گروں گی اور وہاں ختم ہو جاؤں گی ۔ مگرمچھ
اپنا کام کرو ۔ انسان بہت ہی ناشکرا ہے " ٹوکری نے
کہا ۔ " میں ضرور اسے کھاؤں گا ، تمھارا شکریہ "
مگرمچھ نے کہا " کہو اب تم کیا کہتے ہو بچے "
" ٹوکری بڑی بدذات تھی " لڑکے نے جواب دیا ۔
مگر ابھی تو ہم نے ایک ہی سے پوچھا ہے ۔ آؤ اس ہیٹ سے
پوچھیں " چٹائی کی ایک پرانی ہیٹ بہتی ہوئی ان کے
قریب آئی تو لڑکے نے کہا " ہیٹ اے بھئی ہیٹ ! ذرا
فیصلہ کرنا کہ مگرمچھ حق پہ ہے یا میں ؟ "
" آخر کون سی مصیبت آن پڑی ہے " ہیٹ نے
پوچھا ۔ لڑکے نے پورا واقعہ بیان کر دیا ۔
" جب میں نیا نیا تھا " ہیٹ نے گہری سانس لے کر
کہا " میں نے اپنے مالک کی بہت اچھی طرح اور بہت دنوں
تک سخت دھوپ میں اور تیز بارش میں خدمت کی لیکن جب
میں پرانی ہو گئی ۔ تو اس نے مجھے دریا میں پھینک دیا ۔ انسان
بہت ہی ناشکرا ہے " ہیٹ یہ کہہ کر سمندر کی طرف روانہ
ہو گئی " اچھا ہے مگرمچھ لڑکے کو کھا جائے " آخر میں ہیٹ
کے یہ الفاظ سننے میں آئے ۔
" کہو سن لیا " مگرمچھ نے خوش ہو کر کہا ۔
" اب تو تمھارے پیٹ کی بھٹی میں مجھے جانا ہی پڑے
گا " لڑکے نے کہا " مگر ابھی تو ہم نے صرف دو ہی سے پوچھا
ہے ۔ آؤ دریا کے کنارے درخت پر وہ بندر بیٹھا ہے اس سے
بھی پوچھ لیں ۔ وہ جو کہے گا اس پہ عمل کریں گے "
[illegible]



ہے مگرمچھ نے یاد دلایا۔ "مجھے معلوم ہے" لڑکے نے کہا۔
وہ بندر کی طرف متوجہ ہوا اور چلایا۔ بندر، بندر! کیا مگرمچھ کو یہ
حق پہنچتا ہے کہ وہ مجھے کھالے؟
"تم کیا کہہ رہے ہو؟" بندر دریا کے کنارے سے چلایا۔ "ذرا قریب
آؤ میں سن نہیں رہا ہوں" ——— مگرمچھ کنارے کی طرف تیر گیا اور بولا۔
"لڑکا تم سے اجازت مانگ رہا ہے کہ میں اس کو کھا سکوں"
"میں ایک لفظ بھی نہیں سن سکا کہ تم لوگ کیا کہہ رہے ہو" بندر نے کہا۔ "ذرا اور قریب
آجاؤ" ——— مگرمچھ تیر کر اور قریب آگیا۔ تب لڑکے نے کہنا شروع کیا۔
"میں دریا کے کنارے ٹہل رہا تھا۔ تب....."
"میں اب بھی نہیں سن پا رہا ہوں" بندر نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "مگرمچھ
تم اور قریب کیوں نہیں آجاتے"
مگرمچھ تب بالکل کنارے پہ آگیا اور کہا "بندر تم لڑکے سے کہہ دو کہ میں
اس کو کھالوں۔ بس اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے" لیکن جب وہ یہ کہہ رہا تھا۔ لڑکا اس
کی پیٹھ سے کود کر زمین پہ آگیا اور بھاگ کھڑا ہوا۔
"بہت بہت شکریہ بندر" بھاگتے ہوئے لڑکے نے کہا "تم نے میری جان
بچائی" "خوش آمدید!" بندر نے کہا "اپنے والد سے کہنا کہ وہ کیلے
کے اور درخت لگا دیں اور جب کبھی تم ان کیلے کے درختوں
کے جھنڈ میں مجھے دیکھنا تو آنکھیں بند کر لینا اور شور نہ کرنا۔
"بہت اچھا" لڑکے نے جواب دیا۔
اس وقت سے بندر پوری آزادی کے
ساتھ اس لڑکے کے باغ میں کیلا کھایا کرتا
اور لڑکا اسے کبھی نہ ٹوکتا۔
(انگریزی سے)

ایلما اسٹیمپر
ترجمہ:- جناب جمشید اشرف جامعہ نگر



کاغذ کا گھونسلا

مارچ کا مہینہ شروع ہو چکا تھا۔ ایک دن صبح صبح ڈیوڈ پکسی کے پاس گیا۔ آپ کو یاد ہو گا ڈیوڈ نے پکسی کے پاس جانے کا وعدہ بھی کیا تھا۔

"ہیلو مسٹر ڈیوڈ" پکسی اسے دور ہی سے دیکھ کر چیخ پڑا۔ دونوں نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملائے پھر پکسی بولا۔ "کہو بھئی جانوروں کے گھونسلے دیکھنے آئے ہو"

"جی ہاں"۔ ڈیوڈ بولا۔ اگر آپ دکھا سکیں۔ اور دوسرے جانوروں کے گھونسلے ہوں بھی۔

"کیا مطلب؟ پکسی بولا۔ کیا تم کو اب بھی یقین نہ آیا۔ تو پھر تم آئے ہی کیوں ہو؟"

اچھی بات ہے اب آپ تشریف لے جائیے۔ پکسی نے کچھ ناراضگی سے کہا۔

ارے، ارے۔ ڈیوڈ چلایا۔ ناراض نہ ہو جیے بھائی صاحب۔ پھر اچانک اس نے سوچا کہ میں ایک شہری لڑکا ہوں اور یہ حضرت جنگلی آدمی ہیں شاید ان کی بات چیت کا انداز ہی یہ ہو گا۔ اس لیے اس نے کہا "میں سمجھ گیا——

آپ کسی بھی جانور کا گھونسلا مجھے دکھا ہی نہیں سکتے۔ گھونسلا ہو تو دکھائیں۔ بھلا کوئی جانور بھی گھونسلا بناتا ہے وہ تو اتفاق سے ایک خرگوش ------"

"یہ بات ہے؟" پکسی نے جوش میں کہا۔ دیکھو آج ہم تم کو بِرّ کا گھونسلا دکھائیں گے"

"مگر آپ نے تو کہا تھا کہ جانور کا گھونسلا دکھائیں گے؟" ڈیوڈ نے سوال کیا۔

"ہاں ہاں دکھاؤں گا مگر آج نہیں پھر کسی وقت اور مجھے یقین ہے کہ تم اس بات کا بھی یقین نہیں کرو گے کہ رینگنے والے جانور بھی گھونسلا بناتے ہیں۔ وہ دیکھو سامنے ایک بِرّ آ رہی ہے۔ معلوم ہے یہ کیا کرنے والی ہے۔ یہ گھر بنانے کے لیے جگہ تلاش کر رہی ہے۔ اچھا چلو پہلے میں تم کو چھوٹا تو کر دوں تب ہم اس سے چل کر پوچھیں گے"

بِرّ؟ بِرّ کہاں۔ ڈیوڈ نے چاروں طرف

دیکھتے ہوئے کہا۔
"خیریت تم اتنے پریشان کیوں ہو گئے؟" پکسی نے حیرت سے پوچھا۔
"بہت زور سے کاٹتی ہے کم بخت۔ میں تو اسے جان سے مار ڈالوں گا۔" ڈلیوڈ بولا۔ "دیکھو میاں ڈلیوڈ تم اس قسم کی کوئی حرکت نہیں کرو گے۔" پکسی نے بڑی سختی سے ڈلیوڈ کو ڈانٹ دیا۔ پھر اس نے ڈلیوڈ کا ہاتھ پکڑ کر جادو کے زور سے اس کو بَر کی برابر چھوٹا کر دیا۔
"ہاں اب بولیے حضرت آپ بَر کو کیوں مارنا چاہتے تھے؟" پکسی نے ہنستے ہوئے پوچھا۔
آپ نہیں جانتے۔ یہ جانور بغیر کہے حملہ کرتا ہے اور اتنے زور سے کاٹتا ہے کہ بس نانی یاد آجاتی ہے۔" ڈلیوڈ نے کہا۔
"یہ بات نہیں ہے" پکسی بولا۔ "اگر تم اس کو چھیڑو گے نہیں تو یہ کبھی حملہ نہیں کرے گی۔"
مگر ہم کو اس سے فایدہ بھی کیا ہے۔ بلکہ میرے خیال سے نقصان ہی ہے۔ ناک پر کاٹ لے تو ناک پکوڑا ہو جائے۔ ڈلیوڈ نے بَر کو گھورتے ہوئے کہا۔
"واہ۔ آپ نے یہ کیا بات کہی۔ جناب یہ بَر آپ لوگوں کے لیے بہت کارآمد ہے۔" پکسی نے کہا۔
"مگر بھئی کیسے کارآمد ہے۔ کچھ بتایئے بھی تو؟" ڈلیوڈ نے پوچھا۔
"دیکھو میں بتاتا ہوں" پکسی بولا۔ "یہ جتنے بھی چھوٹے چھوٹے جانور انسان کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہ بَر ان سب کو کھا جاتی ہے۔ دوسرے یہ مکھیو نہیں چھوڑتی اب اگر تم کسی بَر کو مارو گے تو یہ تم نے کئی مکھیوں اور دوسرے جانوروں کی جا جن سے تم کو نقصان پہنچے گا۔"
"بھئی واہ۔ آپ تو بَروں کے بارے میں کچھ جانتے ہیں۔" ڈلیوڈ نے حیرت سے پکسی کو دیکھ
"مگر ہاں تم تو ان کے گھونسلا دکھانے کو کہہ رہے
"ارے ہاں۔ دیکھو۔ یہ جو بَر ہے اس کہتے ہیں۔ صرف رانیاں ہی ایسی ہوتی ہیں جو کے موسم میں بھی نہیں مرتیں یہ سردیوں بھر کسی جگہ سوتی رہتی ہیں اور اب اپنی پوشیدہ جگہ سے آئی ہیں۔"
"مگر یہ اس وقت کر کیا رہی ہے؟ نے پوچھا۔
بھئی میں نے کہا نا کہ یہ اس وقت گھونسلے کے لیے جگہ تلاش کر رہی ہے۔ دیکھو دیکھو وہ اس میں گھس گئی اور کیا تم اس کے وہ تیز ڈنگ دیکھ ہو اس سے یہ دو کام لیتی ہے۔ ایک تو کاٹتی اور دوسرے سامان اِدھر سے اُدھر اٹھا کر لے جا اب دیکھو یہ باہر آ رہی ہے۔
"مگر یہ اپنے جبڑے میں ذرا سی مٹی کیوں ہے؟" ڈلیوڈ نے پوچھا۔
"دیکھو ابھی معلوم ہوا جاتا ہے۔ یہ بر میں اپنا گھر بنائے گی۔" پکسی بولا۔

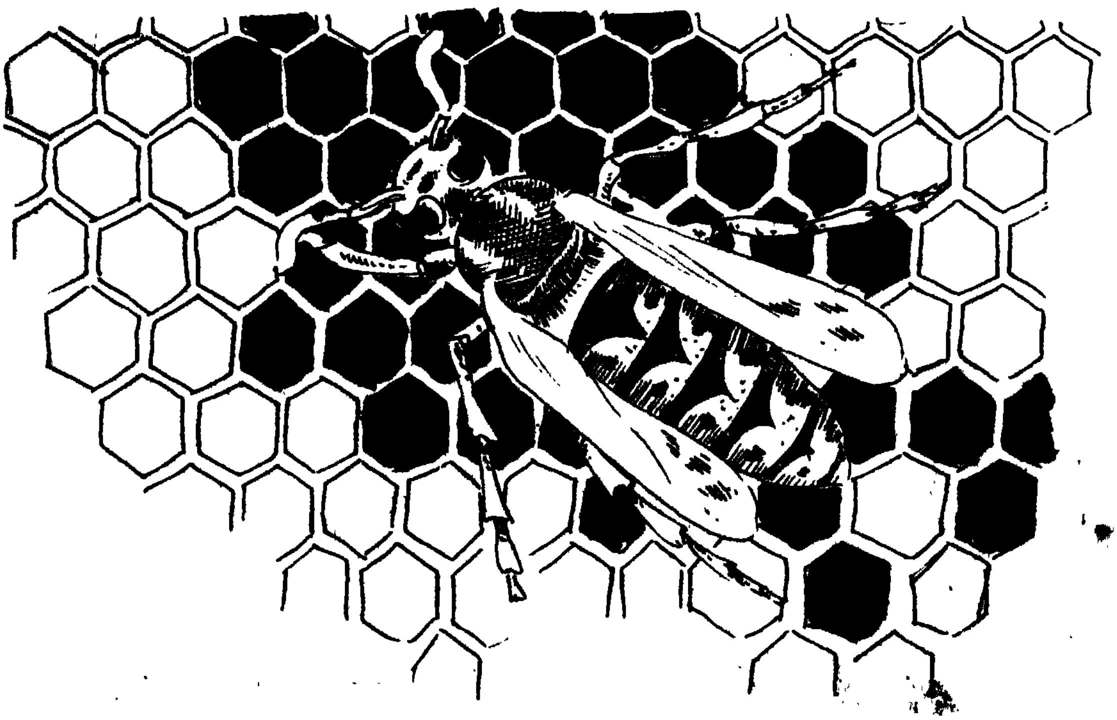
یہ دونوں دیکھتے رہے۔ بِر اُڑی اور ایک پیڑ پر بیٹھ گئی۔ پھر آہستہ آہستہ پیڑ کی چھال چھیلنے لگی۔ اس نے اس چھال کو آہستہ آہستہ چبا کر چھوٹا سا گولا بنا لیا اور پھر اس گولے کو اپنے منھ میں دبا کر پھر سے اُڑی اور اس جگہ لے آئی جہاں اپنا گھر بنا رہی تھی۔ اب وہ پھر اڑی اور اپنے منھ میں مٹی کا گولا لے آئی اور اسی طرح وہ یہ کام کرتی رہی۔

پکسی نے ڈاڈو سے کہا۔ "اب کی جو یہ اپنے گھر میں جائے گی تو ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے چلے جائیں گے۔" اور پھر جیسے ہی بِر اندر گئی یہ دونوں بھی اندر چلے گئے۔ انھوں نے دیکھا کہ بِر نے بڑے سلیقے سے ہر گولے کو ایک سیدھی قطار میں لگانا شروع کر دیا۔

"اچھا دیکھو میں پوچھتا ہوں" پکسی بولا۔

"السلام علیکم۔ شہزادی صاحبہ" پکسی نے فرشی سلام کرتے ہوئے کہا۔ "کیا مہربانی فرما کر آپ ہمیں اپنے گھر کے بارے میں کچھ بتائیں گی؟"

بِر بولی۔ "دیکھیے یہ جو گھر میں بنا رہی ہوں اس میں چار کمرے ہوں گے اور ہر کمرے میں ایک ایک انڈا دوں گی اور پھر اس کمرے کو چاروں طرف سے بالکل بند کر دوں گی۔ پھر اس کے بعد میں اور بہت سے کمرے بناؤں گی۔ یہاں تک کہ یہ گھر کئی منزلہ ہو جائے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح آپ لوگوں کے ہوتے ہیں۔ یہ تمام منزلیں ایک دوسرے سے جڑی رہیں گی اور پھر میں ان سب کمروں میں انڈے دوں گی۔"



"اچھا پھر انڈوں کا کیا ہوگا" ڈیوڈ نے پوچھا۔
"انڈوں کا یہ ہوگا کہ ۹ یا دس دن بعد ان میں سے بچے نکل آئیں گے۔ اور جس وقت بچے نکلیں گے اس وقت سے میں رانی کہلاؤں گی کیونکہ اس وقت میرے ساتھ میری رعایا ہوگی"

"آپ کا مطلب ہے کہ آپ کے بچے ہی آپ کی رعایا ہوں گے۔؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"یہی بات ہے" بَر نے کہا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مجھے ان کی فکر نہیں ہو گی۔ نہیں بلکہ میں ان کی دیکھ بھال کروں گی۔ میں ان کے لیے پھولوں کا شہد لاؤں گی۔ کچھ کھانا میں آپ کے گھروں کے نعمت خانے سے چراؤں گی۔ صرف یہی نہیں بلکہ مجھے ان کے لیے مکھی، تتلیاں، بھنگے بھی مار مار کر لانے ہوں گے۔ بد ہزاروں دوسرے قسم کے رینگنے والے جانور بھی مار ڈالا گی کیوں کہ یہ کسانوں کو نقصان پہنچاتے ہیں پھر مجھے بھی کرنا پڑے گی۔ کیونکہ بچے بڑے ہوتے رہیں گے میں گھروں کو بڑا کرتی رہوں گی۔ یہاں تک کہ یہ اند ہی کافی بڑے ہو جائیں گے"

ڈیوڈ بولا" یہ بچے ہوں گے کیسے ؟"

"شروع شروع میں یہ بالکل سفید ہوں گے۔ جیسے جیسے یہ بڑے ہوتے جائیں گے۔ یہ اپنی سفید اتار دیں گے اور پھر جب یہ کمروں سے باہر آئیں تو اپنی اس کھال کو بھی اتار دیں گے اور پھر یہ پو بن جائیں گے۔ اور میری مدد کریں گے۔"



"کس قسم کی مدد؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"جب بچّے کام کے قابل ہوجائیں گے تو میں پھر انڈے دینا شروع کر دوں گی۔ اس مرتبہ تو مجھے امید ہے کہ میں ہزاروں ہی انڈے دوں گی تب میرے بچّے ان دوسرے بچّوں کی دیکھ بھال کریں گے کوئی گھونسلے میں صفائی کرے گا۔ اگر گھونسلا کہیں سے ٹوٹ گیا ہوگا تو کوئی اُسے جوڑنے کا کام کرے گا۔"

پکسی بولا ——"اچھا یہ بتائیے کہ کیا یہ تمام بچّے ایک جیسے ہوں گے؟"

"نہیں نہیں۔ ان میں سے بہت سے لمبے اور دبلے ہوں گے۔ لمبے اور دبلے بچّے تو مادائیں ہوں گی ہم ان کو کاہل نر کہتے ہیں کیوں کہ یہ زندگی بھر کبھی کام نہیں کرتیں۔ نر بِھڑوں کے ڈنک نہیں ہوتا۔ ہاں ان ماداؤں کے پاس ڈنک ہوتا ہے سمجھے آپ؟" بِھڑ بولی۔

"یہ آپ نے بڑے کام کی بات بتائی" ڈیوڈ بولا "اب اگر مجھے کوئی لمبی اور پتلی بِھڑ ملے گی تو فکر کی کوئی بات نہیں۔ کیوں کہ یہ کاٹے گی ہی نہیں —— اچھا کیا یہ سب جاڑے کے آتے ہی مر جاتی ہیں؟"

"صرف نئی شہزادیاں ہی دوسرے سال تک زندہ رہتی ہیں اور باقی سب مر جاتی ہیں۔ یہ اپنے آپ کو کسی گرم جگہ چھپا لیتی ہیں۔ خاص طور پر یہ ایک گھاس میں بیٹھ جاتی ہیں۔ یہ گھاس بہت گرم ہوتی ہے اور پھر بہار کے موسم میں وہی کام شروع کر دیتی ہیں جو اس سال میں کر رہی ہوں۔"

ارے بھئی بہت وقت ہو گیا۔ بِھڑ نے کہا اور پھر سے اُڑ گئی۔

ڈیوڈ اور پکسی بھی باہر آ گئے۔

اچانک پکسی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور ڈیوڈ نے دیکھا کہ وہ اپنے پُرانے قد پر لوٹ آیا ہے۔

آہستہ آہستہ وہ گھر کی طرف چل پڑا۔

ماہنامہ کتاب نما نئی دہلی ۲۵

ارباب ذوق کے لیے مکتبہ جامعہ کا یہ ماہوار رسالہ نہایت ضروری چیز ہے۔ اردو کی تمام نئی کتابوں کی اطلاع آپ کو اس رسالے سے مل سکتی ہے کیسی قابلِ ذکر دارالاشاعت کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہوتی جس کا اشتہار ہم فوراً کتاب نما میں شائع نہ کرتے ہوں۔ آپ کتاب منگائیں یا نہ منگائیں اُردو ادب کی رفتار ترقی سے واقف رہیں گے۔

یہ رسالہ علاوہ عام باذاق حضرت کے لیے مفید ہونے کے خاص طور پر لائبریریوں اور انجمنوں کے لیے ضروری ہے۔ کوئی کتب خانہ بغیر اس رسالے کی مدد کے نئی کتابوں کا صحیح انتخاب نہیں کر سکتا۔

نمونہ مفت :۔ قیمت سالانہ دو روپے

جناب محسن نظامی سہسرامی

۲۶ جنوری

فضا میں دھوم مچی کیف و سرخوشی آئی
لیے پیام یہ چھبیس جنوری آئی
کھلے ہیں پھول امیدوں کے صحن گلشن میں
بہار شوق ہے رقصاں ہر اک کے دامن میں
جہاں میں پرچم امن و اماں بلند ہوا
دلوں پہ جبر و تشدد کا باب بند ہوا
نظر نظر میں محبت کی روشنی لے کر
بہار آئی گلستاں میں سرخوشی لے کر
زمین ہند سے نفرت کا چند باب ہوا
جہاں پہ بغض و عداوت کا بند باب ہوا
فضا میں طنطنۂ عہد بہار ہوا
افق پہ مہر جہاں تاب آشکار ہوا
چمن میں پھول کھلے ساعت خوشی آئی
دلوں میں امن و مساوات نے جگہ پائی
یہ حسن سرو گل و یاسمن مبارک ہو
نشاط و کیف چمن در چمن مبارک ہو

جناب مہر وردلوی

دل نواز تحفہ

یہ سالنامہ پیام تعلیم کا ہے اک شاہکار

ادب کا اک شاہکار ہے یہ پیام تعلیم
جو سالنامہ کی شکل میں اب ملا ہے یہ دل آ...
گو مکتبہ جامعہ سے نکلا ہے ننھے منے پیام...
مگر بڑوں کے لئے ہے دلچسپ پر کشش مہ...

دل و نظر کو نہیں گوارا یہ زحمت انتظار...
خدا کرے ہفت روزہ بن کر ہو جلوہ گر اب
یہ سالنامہ پیام تعلیم ... اک ...
جہان علم و ادب میں جس سے ہوا ہے ...

۱؎ ناچتی ہوئی ۲؎ دروازہ ۳؎ ... ۴؎ منور روشنی دینے والا

جناب رضوان احمد

علم اور عقل



شکیل اور صفدر شہر کے دو مشہور وکیل تھے۔ دونوں آپس میں بہت گہرے دوست تھے۔ ایک دن باتیں کرتے کرتے چلتے چلتے عقل اور علم کی بات چھڑ گئی۔ دونوں کے خیالات مختلف تھے۔ شکیل کا کہنا تھا کہ علم ہی سب سے بڑی چیز ہے علم حاصل کر لے اس میں عقل و شعور خود بخود پیدا ہو جاتا ہے لیکن صفدر کا خیال تھا کہ عقل کی اہمیت زیادہ ہے۔ کم عقل یا بے عقل کے لیے علم بھی حاصل کرنا ممکن نہیں ہے اور بغیر عقل کے علم بے مصرف ہے۔ دونوں وکیل تھے اپنی اپنی دلیلوں سے ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن کوئی بھی ہار ماننے کو تیار نہ تھا۔ اس طرح گرما گرم بحث ہو رہی تھی جیسے وہ کچہری میں اپنے مجرم کو بے قصور ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ لیکن بحث نامکمل ہی رہی، کوئی کسی کو قائل نہ کر سکا۔

صفدر نے سوچا اس طرح شکیل کو قائل کرنا مشکل ہے اس کے لیے عملی ثبوت پیش کرنا زیادہ بہتر ہوگا۔

ایک دن صفدر جنگل میں شکار کھیلنے گئے اس جنگل میں طوطے بہت زیادہ تھے۔ وہ شکار کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے کہ ان کی توجہ طوطوں کے شور کی طرف گئی تمام [illegible] شکاری آئے گا، جال بچھائے گا، دانا ڈالے گا، سب کو پھنسائے گا"۔

صفدر نے یہ سنا تو ان کو بہت حیرت ہوئی۔ انھیں گمان تک نہ تھا کہ اس جنگل کے طوطے اتنے چالاک ہوں گے۔ یقیناً ان کو جال میں پھنسانا ناممکن ہے اس لیے کہ وہ پہلے سے ہی ہوشیار ہیں۔

وہ کافی دیر تک اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے کوئی شکار ہاتھ نہ آیا۔ انھیں پیاس لگی ہوئی تھی اس لیے وہ پانی تلاش کرنے لگے۔ جنگل کے باہر انھوں نے ایک کُٹیا دیکھی اور پانی پینے کُٹیا کے اندر چلے گیے۔ کُٹیا ایک سادھو کی تھی، شکیل نے وہاں خوب سیر ہو کر پانی پیا اور وہیں آرام کرنے لگے۔ صفدر نے سادھو سے طوطوں کی بابت بھی دریافت کیا۔

"بابا! جب اس جنگل کے طوطے اتنے ہوشیار ہیں تو ہر شکاری کو مایوسی ہی ہوتی ہوگی"۔

سادھو صفدر کی بات سن کر ہنسا اور اس نے بتایا کہ کافی دن ہوئے ایک پالتو طوطا کہیں سے بھاگ کر اس جنگل میں آ گیا، وہ ہر وقت یہی رٹا کرتا تھا 'شکاری آئے گا، جال بچھائے گا، دانا ڈالے گا، سب کو پھنسائے گا' دھیرے دھیرے تمام طوطوں نے یہ سبق رٹ لیا اور اب ہر وقت اس کی رٹ لگاتے رہتے ہیں۔ لیکن بیٹا علم کے لئے عقل ضروری ہے۔ ان طوطوں کو بس یہ سبق یاد ہے عمل سے کوئی واسطہ نہیں"۔

صفدر یہ سُن کر ہنس پڑے انھوں نے سوچا دراصل شکیل کو قائل کرنے کے لیے یہی عملی ثبوت کافی ہے۔ وہ سادھو سے کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ سادھو نے بتایا "یہ

بات حیوانوں ہی میں نہیں انسانوں میں بھی پائی جاتی ہے جن کے پاس علم تو ہوتا ہے لیکن عمل یا عقل سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اسی وجہ سے وہ اپنے علم سے کام بھی نہیں لے پاتا۔ مثال کے طور پر میرا ایک شاگرد ہے، اسے میں نے کئی سال تک جوتش کی تعلیم دی، اب وہ اس علم میں ماہر ہوگیا ہے لیکن وہ علم کے ساتھ ساتھ عقل استعمال نہیں کرتا، ہمیشہ غلط نتیجے نکالتا ہے"۔۔۔

صفدر نے سادھو سے پوچھا "کیا آپ مجھے اپنے اس شاگرد سے ملا سکتے ہیں؟"

"میں آپ کو اس سے ضرور ملاتا لیکن افسوس وہ اس وقت باہر گیا ہوا ہے اگر آپ ایک ہفتہ کے بعد آئیں تو اس سے ملاقات ہو سکتی ہے۔"

صفدر وہاں سے چلے آئے، پھر ایک دن انھوں نے شکیل سے کہا "اگر آپ میرے ساتھ جنگل چلیں تو میں اپنے قول کا عملی ثبوت پیش کر سکتا ہوں"۔ شکیل تیار ہوگئے۔ صفدر نے اپنے ساتھ جال میں چڑیاں پھنسانے والے ایک چڑیمار کو لیا اور اسی جنگل میں پہنچے۔

وہاں طوطے شور مچا رہے تھے۔ "شکاری آئے گا جال بچھائے گا، دانا ڈالے گا، سب کو پھنسائے گا۔"

صفدر نے شکیل سے کہا "سن رہے ہیں کہ یہ طوطے کیا شور مچا رہے ہیں؟"

"جی ہاں! طوطے کہہ رہے ہیں" شکاری آئے گا جال بچھائے گا، دانا ڈالے گا، سب کو پھنسائے گا"

"اب دیکھتے جائیے" صفدر نے شکاری کو جال ڈالنے کا حکم دیا۔ شکیل ہر چیز کا بغور مطالعہ کر رہے تھے نے وہی رٹ لگا رکھی تھی۔

تھوڑی دیر میں بہت سے طوطے جال میں پھنس
صفدر نے شکیل کی طرف فاتحانہ انداز میں مسکرا کر دیکھا نے تعجب سے کہا "میں اس کا مطلب سمجھا نہیں"۔

"واہ یہ بھی خوب رہی، آپ کا خیال تھا کہ سب سے بڑی چیز علم ہے، علم ہو تو انسان کو عقل بھی آجاتی دیکھیے ان طوطوں کو علم تھا کہ شکاری آکر دانہ ڈالے گا جال میں ہم سب کو پھنسائے گا۔ یہ معلوم ہونے پر بھی میں پھنس گئے۔" صفدر نے مسکرا کر کہا۔

"اچھا یہ بات ہے، لیکن میں اب بھی اپنے عقید قائم ہوں، یہ بیچارے تو حیوان ہیں جو کچھ سنیں گے و لگائیں گے۔" شکیل نے کہا۔

"اچھا اب میں آپ کے سامنے دوسری مثال" یہ کہہ کر صفدر نے شکیل کو ساتھ لیا اور سادھو کی کٹیا پھر صفدر نے سادھو سے آنے کا مقصد بیان کیا۔ فوراً شاگرد کو طلب کیا اور کہا کہ "یہ لوگ تمہارے علم لینا چاہتے ہیں"۔ شاگرد نے خوشی سے منظور کر لیا۔

صفدر نے مٹھی بند کر کے اس سے پوچھا میری مٹھی میں کیا ہے؟"۔

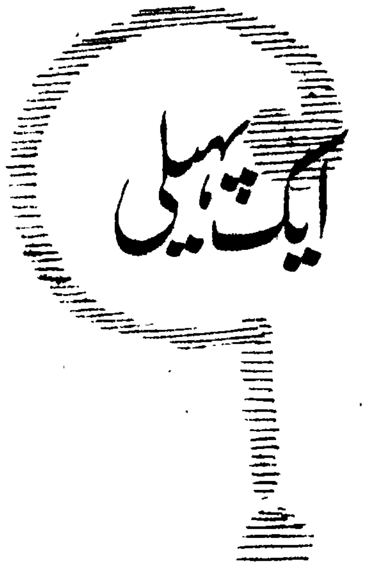
شاگرد نے زائچہ نکالا پھر کچھ حساب لگا

"آپ کی مٹھی میں کوئی گول سی چیز ہے"۔

صفدر نے کہا "بے شک وہ تو ٹھیک ہے"۔ چیز کا نام تو بتائیے"۔

بقیہ ص ۵۲

نابِ اشفاق گوہر



ایک پہیلی

تا صاحب نے یہ بہت دل چسپ پہیلی لکھی ہے اور اعلان کرنے کی اجازت دی ہے کہ جو
، صحیح جواب دیں گے انھیں وہ ایک اچھا سا انعام دیں گے (غالباً فاؤنٹن پین) — تو جھٹ
وری تک اس کا جواب بھیج دیجیے۔

ایڈیٹر

- کی جس کی باپو نے بھی — گو ۔۔ جس کو جاں کہتا تھا
کا ایمان تھا جس پر — غالب جس کا دلدادہ تھا

ہے جس کی خنجر بھالے — کٹ جائیں دھاگوں کی طرح
ل کے پیکر جس کو — اپنائیں بھاگوں کی طرح

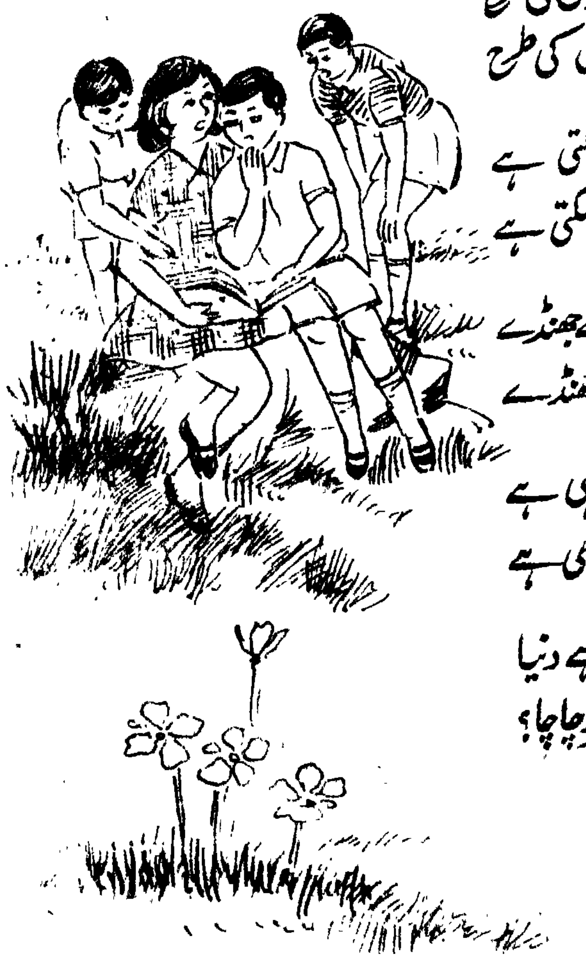
ں کی آواز سے دنیا — ایک جگہ پر آسکتی ہے
ں کی اک ہلکی جنبش — محل دو محلے ڈھا سکتی ہے

سکتے ہیں سانس سے جس کی — ظلم کے سب لہراتے جھنڈے
ں اک ادنیٰ سی جھلک سے — ہو سکتے ہیں شعلے ٹھنڈے

نیا کس کے دم سے — چاند سے آگے پہنچ رہی ہے
ن اور نکسن پر بھی — کس کی نگاہِ فیض اُٹھی ہے

! کیا ہے وہ شے؟ — جس کے آگے جھکے ہے دنیا
ے ہاتھوں میں کیا ہے — کس کی جاں تھے نہرو چاچا؟

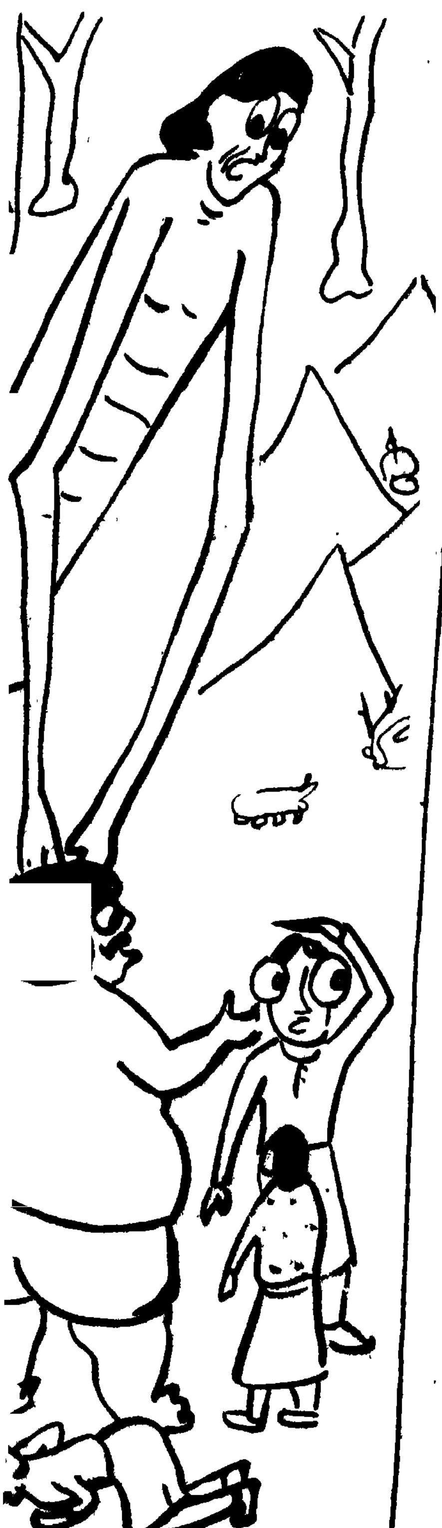
پڑھے لکھے بچوں کی طرح — چن لاؤ لفظوں کے گلاب
بچو یہ منظوم پہیلی — مانگ رہی ہے تم سے جواب



نظم کا ... ، ... ، ...

جناب غلام حیدر

نیلم اور فرخ



-پونے

بارہ بجے جادو کا اثر کچھ کم ہوا تو شہزادہ کی آنکھ کھلی اور ساتھ ہی اس کے ساتھی بھی گھبرا کر اُٹھ بیٹھے انھوں نے دیکھا کہ شہزادی غائب ہو چکی ہے۔ شہزادے کو یقین ہو گیا کہ وہ ہار گیا ہے۔ اسے اپنے قتل ہونے کا اتنا افسوس اور ڈر نہیں تھا جتنا اسے اپنی ہار کا افسوس ہو رہا تھا۔

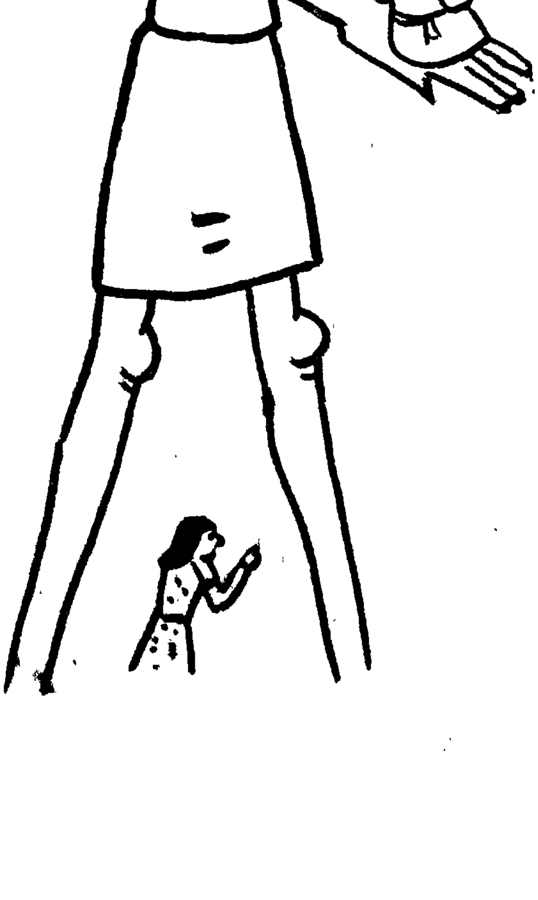
وہ دوڑ کر باہر آیا اور اپنے سب ساتھیوں کو جلدی سے جمع کیا۔

فرخ:۔ افسوس میں ہار گیا۔ میرا انجام اب اچھا نہیں ہے۔

اس کے سب ساتھی بہت اداس نظر آنے لگے۔ انھیں خود اپنے اوپر افسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنے آقا کے کام نہ آ سکے۔ لیکن تھوڑی سی دیر میں ہی کنیت نے کہا۔

کنیت:۔ ٹھہرو، ابھی بارہ بجنے میں تھوڑی دیر ہے۔ میں ابھی سن کر بتاتا ہوں کہ شہزادی کیا کر رہی ہے۔" وہ ذرا سی دیر خاموشی سے زمین پر لیٹ کر سنتا رہا۔ پھر ایک دم بول پڑا۔ "شہزادی بہت





سوانکھا: — میں ابھی دیکھتا ہوں وہ کہاں ہے۔
ُس نے تھوڑی دیر چاروں طرف دیکھا، پھر ایک طرف
ب غور سے گھورا۔ پھر وہ بھی چیخ پڑا — "وہ ہے۔
یں نے دیکھ لیا۔ وہ یہاں سے تین سو میل کے فاصلے
ایک چوٹی پر بیٹھی ہوئی ہے۔ اب لمبو خاں تمھارا
کام ہے۔ اب اگر تم کھڑے ہو جاؤ اور انگڑائی لے
کر ذرا اپنے جسم کو کھینچ لو تو تم ایک قدم میں ہی اس
تک پہنچ سکتے ہو۔

لمبو خاں: "بہت اچھا" اور یہ کہہ کر لمبو خاں
کھڑے ہو گئے۔ انھوں نے ایک انگڑائی لی اور نیچے
کھڑے ہوئے لوگوں کو ان کا سر نظر آنا بند ہو گیا —
نھوں نے سوانکھا خاں کو اپنے بائیں ہاتھ پر اٹھالیا

ہوئے لوگ ان کے ایک پیر کا صرف ٹخنہ ہی دیکھ سکتے
تھے۔ بس ایک منٹ میں شہزادی نیلم ان کے دوسرے
ہاتھ میں تھی اور وہ اسے شہزادے کے پاس کھڑا
کر رہے تھے۔

اور ٹھیک بارھویں گھنٹہ کی چوٹ پر ایک
بار پھر شہزادہ فرخ شہزادی نیلم کے سامنے بیٹھا ہوا تھا
اسی وقت ملکہ غصّہ میں پھنپھناتی ہوئی شہزادے
کے کمرے میں داخل ہوئی جیسے وہ ابھی ابھی خود ہی
شہزادے فرخ کو قتل کر ڈالے گی۔ مگر وہ یہ دیکھ



کر حیرت سے بالکل پتھرا سی گئی کہ وہی شہزادی جسے

لے جا کر بٹھایا تھا۔ اب پھر اس کے سامنے
ہے۔ وہ تو کمرے میں اس خیال سے داخل ہو
بس آتے ہی شہزادے کے قتل کا حکم سنا د
مگر یہاں آ کر اسے پتہ چلا کہ آج اُسے پہلی ا
بات ہو گئی ہے۔ مگر ساتھ ہی اسے یہ ضرور
گیا کہ یہاں کوئی اس سے بھی زیادہ چالاک
موجود ہے۔ اب وہ دل ہی دل میں اس خ
جل رہی تھی کہ آج اسے مات کیوں ہوئی۔ ا
شہزادی سے کان میں کہا۔

ملکہ:۔ بڑے شرم کی بات ہے کہ
چند ملازموں کی مدد سے اتنی آسانی سے جیت
جائے۔ اب تمھیں خود بھی کوئی ایسی شرط رکھنی
جسے فرخ کا کوئی ملازم پورا نہ کر سکے۔

ملکہ کے ساتھ رہتے رہتے شہزادی
بڑی مغرور اور کڑوے مزاج کی لڑکی ہو گئی تھ
اگلی صبح جب شہزادہ فرخ اس سے ملنے گیا تو ا
بہت غصّہ میں شہزادے سے کہا۔

شہزادی نیلم:۔ چند نوکروں کی
تم نے مجھے جیت لیا ہے اب تمھیں میری بھی
شرط پوری کرنی ہوگی۔ ورنہ میں تم سے کبھی شاد
کر سکتی۔

فرخ:۔ تم بھی بتاؤ، تم کیا چاہتی ہ

نیلم:۔ میں اب دیکھوں گی کہ تمھارے



نے کے لیے تیار ہوتا ہے ۔ میں اپنی شرط عین
وقت بتاؤں گی اور پھر شہزادی نے حکم دیا
سوکھی لکڑیوں کے تین سو بڑے بڑے گھٹے جمع
جائیں ۔ جب ان کا ایک پہاڑ برابر ڈھیر لگا دیا گیا
ہزادی نے فرخ سے کہا ۔

نیلم :۔ اب اپنے نوکروں میں سے کسی
ے کہو کہ وہ اس پر بیٹھ جائے تاکہ میں اس ڈھیر
آگ لگوا دوں اور اسے جلتے دیکھوں ۔

شہزادی نیلم کو اس کا پورا یقین تھا کہ شہزادے
کے نوکروں میں سے ایسا کوئی بھی نہ ہوگا جو اس
[illegible]

کے لیے تیار ہو جائے ۔ اور پھر جب سارے نوکر فرخ سے انکار کر دیں گے تب دیکھوں گی کہ فرخ مجھ سے کتنی محبت رکھتا ہے ۔ پھر کیا وہ خود میری خاطر اس آگ میں بیٹھنے کے لیے تیار ہو جائے گا ؟

شہزادے نے جب یہ بات اپنے ساتھیوں کو بتائی تو فوراً بے وقت خاں باہر نکل آئے ۔

بے وقت خاں :۔ شہزادے ! میں ابھی تک تمھارے کسی کام نہیں آیا ہوں ، میں تیار ہوں ۔ اس شرط کو پورا کرنے کے لیے ۔ مجھے اتنی آگ میں سردی تو بہت لگے گی مگر شاید میں اتنی ٹھنڈ جھیل لوں گا تم شہزادی سے کہہ دو ۔

لکڑیاں تیار ہی تھیں ۔ بے وقت خاں کو





ان پر بیٹھنے کے لیے لایا گیا...

اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ دلچسپ اور مزے دار کہانی مارچ کے پرچے میں پڑھیے۔

جناب ایم۔ اسلم رفیع گنج (گیا)

لطیفے

دو انیمی رات کے وقت ٹارچ لیے گھر جا رہے تھے، راستے میں ایک نے ٹارچ آسمان کی طرف کی اور روشنی کی طرف اشارہ کر کے اپنے ساتھی سے کہنے لگا۔ "تم اس پر چڑھ سکتے ہو؟"

"میں اتنا بے وقوف نہیں" اس کے ساتھی نے جواب دیا "جب میں اوپر پہنچ جاؤں گا تو تم ٹارچ گل کر دو گے۔"

(۲) ایک مسافر نے ٹیکسی والے سے کہا۔ "ارے بھئی ٹیکسی والے اسٹیشن چلنے کا کیا لوگے؟"

"بڑی سواری کے آٹھ آنے اور بچے مفت" ٹیکسی والے نے کہا۔

مسافر نے کہا "چلو بچہ ... تم ...

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

(دسمبر ۱۹۶۹ء سلسلہ ملائیے)

قطب الملک نے ایک فوجی افسر کو بھیج دیا جس نے محصول لینے والے سے کہہ دیا کہ مجھے محصول سے مستثنےٰ کر دے۔ دو سال بعد یہ سب محصول معاف ہو گئے تھے۔

قطب الملک بڑا فاضل شخص ہے۔ اس نے میری بڑی تعظیم کی مصافحہ کیا اور اپنے قریب بٹھایا۔ میں نے اُسے ایک غلام، ایک گھوڑا، کشمش اور بادام بطور تحفہ نذر گذرانے، بادام اور کشمش یہاں نہیں ہوتے خراسان سے آتے ہیں۔

قطب الملک کے سامنے بہت سی کمانیں پڑی تھیں اور فوج کے سپاہی سامنے سے گذر رہے تھے۔ ان میں جو کوئی چاہتا کمان کھینچ کر اپنی قوت کی نمائش کرتا۔ بہت سے سپاہی گھوڑے کی سواری کا کمال دکھا رہے تھے اور برچھے کی انی سے انگوٹھی اٹھا کر لے جاتے تھے۔ کچھ سپاہی پولو کھیل رہے تھے، لمبے لمبے بلوں سے گھوڑے پر سوار ہو کر میدان میں ہمہی ہوئی گیند کو

سب سے اچھے ہوتے ہیں اسے ترقی دی جاتی ہے اور انعام ملتا ہے۔ بادشاہ کا حکم تھا کہ جو کوئی خراسان آئے جب تک یہ اقرار نہ کرے کہ مستقل قیام کے لیے آیا ہے اسے ملتان سے آگے نہ بڑھنے دیا جائے مجھ سے پوچھا تو میں نے کہہ دیا کہ میں تو سلطان کی ملازمت کرنی چاہتا ہوں۔ میرے کہنے پر قاضی اور دو گواہ بلائے گئے اور ایک عہد نامے پر دستخط لے کر قاضی اور دو گواہوں نے تصدیق کر دی

دستر خوان :- ایک دن مجھے قوام الدین کے ساتھ کھانے کا اتفاق ہوا۔ قوام الدین، قاضی شہر ترمذ اپنے خاندان کے ساتھ بطور شاہی مہمان - دار السلطنت جا رہے تھے۔ اب ذرا دستر خوان کی بہار دیکھئے۔

پتلی پتلی چپاتیاں آئیں۔ پھر بھنا ہوا گوشت بکری کا۔ ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہر ایک کے سامنے رکھا۔ پراٹھے آئے جن کے بیچ میں حلوا بھرا تھا پھر سموسے

اور پیاز تھی، ہر ایک کے سامنے پانچ سو سے رکھے گئے۔
پھر مرغ پلاؤ، پھر ہاشمی، پھر قاہریہ ۔

کھانے سے پہلے حاجب دسترخوان پر کھڑا ہو کر جھک گیا اور جتنے شریکِ دسترخوان تھے وہ بھی جھک گئے۔ یہ غائبانہ بادشاہ کی تعظیم تھی تعظیم کے بعد دسترخوان پر بیٹھے تو چاندی سونے یا شیشہ کی پیالیوں میں مصری اور گلاب کا شربت آیا۔ پھر حاجب نے بسم اللہ کہا اور کھانا شروع کر دیا گیا۔

کھانا ختم ہو گیا تو پان آئے اور حاجب نے پھر ایک مرتبہ بسم اللہ کہا جس کا مطلب یہ تھا کہ دسترخوان سے اُٹھ جانا چاہیے چنانچہ بادشاہ کی تعظیم کے لیے ایک دفعہ جھک کر سب دسترخوان سے اُٹھ گئے ۔

ہندوستان کے میوے :۔ ہندوستان کے میووں میں سب سے زیادہ خوش ذائقہ آم ہے۔ یہ کچا بھی کام آتا ہے اور پکا بھی کچے کا اچار بنتا ہے۔ پکا چوس کر اور تراش کر کھایا جاتا ہے، آم کی ہزاروں قسمیں ہیں اور ہر ایک اپنے مزے اور خوشبو میں الگ ہے ۔ ایسا میوہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں نہیں ہوتا ۔

کٹھل :۔ کٹھل کا درخت خوب بڑا ہوتا ہے۔ اس کے پتے اخروٹ کے پتے جیسے ہوتے ہیں۔ کٹھل کا پھل جڑ میں زیادہ ہوتا ہے اور ایسا ہوتا ہے جیسی مشک ۔

جو پھل جڑوں میں لگتے ہیں۔ انھیں بَرکی کہتے ہیں۔ اور شاخوں کے پھل کو جکی۔ بَرکی میں مٹھاس زیادہ ہوتی ہے کٹھل کے بیج بھی ابال کر اور بھون کہ کھاتے ہیں ۔

تیندو :۔ تیندو آبنوس کا پھل ہے خوبانی رنگ اور خوبانی کی برابر، بے حد میٹھا ہوتا ہے ۔

ہندوستان کے میووں میں جامن، مہو انار، چھوٹا کٹھل، رنگترہ، نارنگی اچھے پھل ہیں۔ سب سے اچھی چیز ہے۔ مہوا زیادہ کھایا جائے آ میں درد ہونے لگتا ہے مہوا سوکھ کر انجیر جیسا اس کے بیج کا تیل بھی نکالتے ہیں اور چراغوں ڈال کر جلاتے ہیں ۔

غلے :۔ ہندوستان میں ہر قسم کا غلہ پیدا ہوتا ہے۔ جب گرمی میں بارش ہو جاتی ہے تو خریف کی فص ہیں اور ساٹھ دن میں پیداوار کاٹ لیتے ہیں ربیع کی فصل ہے۔ خریف میں دھان، اُ مونگ، لوبیا، موٹھ، گنا وغیرہ پیدا ہوتا ہے۔

ربیع میں چنا، گیہوں، مسور کی پیداوار ہے چاول سال میں دو مرتبہ ہوتے ہیں۔ اور چاول پیداوار ہر ایک اناج سے زیادہ ہے ۔

ہندوستان والے مونگ کی کھچڑی گھی صبح کو ناشتہ میں کھاتے ہیں۔ گھوڑوں اور بیلوں موٹھ اور چنے پانی میں بھگو کر دانہ کھلاتے ہیں ۔

ڈاکوؤں سے مقابلہ :۔ الوہر سے چل کر گذر ایک جنگل میں ہوا۔ ہم بائیس آدمی تھے جن میں اور عجمی دونوں تھے۔ سفر میں ایک دن گذرا تھا لٹیروں نے ہم پر چھاپا مارا۔ یہ اسی لٹیرے تھے دو سوار۔ اور باقی [illegible]

ہوئی بارہ آدمیوں کو ہم نے مار ڈالا اور ایک کا گھوڑا چھین لیا۔

اجودھن :۔ اجودھن چھوٹا سا شہر ہے یہ شیخ فریدالدین کا شہر ہے۔ شاہِ ہندان کا مرید ہے اور اس نے یہ شہر انھیں دے دیا ہے۔ شیخ قریب ہو کر کسی سے نہیں ملتے نہ کسی سے ہاتھ ملاتے ہیں۔ کسی کا کپڑا بھی ان سے چھو جاتا ہے تو اسے دھو ڈالتے ہیں۔

شیخ کے دو بیٹے ہیں ایک کا نام علم الدین ہے۔ دوسرے کا نام معزالدین۔ دونوں عالم اور فاضل ہیں۔ میں نے ان کے دادا شیخ فریدالدین بدایونی کی قبر کی زیارت بھی کی ہے۔ بدایوں، سنبھل کے علاقے میں ایک شہر ہے۔ جب میں اجودھن سے رخصت ہونے لگا تو شیخ علم الدین نے مجھ سے کہا۔ حضرت والد صاحب کی زیارت بھی کر لیجیے۔ شیخ اس وقت سب سے اونچی چھت پر تھے۔ سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ ایک بڑا عمامہ بندھا ہوا تھا۔ میرے لیے دعا فرمائی۔ مصری اور شکر تری کا تبرک عطا فرمایا۔

(ابن بطوطہ کی یادداشتیں جن میں سفر کے حالات تھے لٹیروں نے لوٹ لی تھیں برسوں بعد ذہنی یادداشت پر دوسرا سفرنامہ مرتب کیا تو بہت سی باتوں میں سہو ہو گیا ہے۔ حضرت بابا فریدالدین جن کا ذکر وفات پا چکے تھے۔ ان کے پوتے شیخ علاء الدین نوح سجادہ نشین تھے۔ یہ خاندان بدایونی نہ تھا۔ شاید حضرت سید احمد بخاری بدایونی کی جگہ فریدالدین لکھ گیا ہے۔ شیخ علاء الدین سلطان محمد تغلق کے پیر و مرشد تھے۔)

شیخ کی زیارت کے بعد دیکھا تو ہمارے کچھ ساتھی قیام گاہ کی طرف بھاگے چلے آ رہے تھے۔ میں نے ان سے بھاگنے کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایک ہندو مر گیا ہے اور چتا پر اس کی بیوی زندہ جلائی جائے گی۔ پھر یہ سب لوگ چلے گئے اور واپس آ کر بتایا کہ عورت اپنے خاوند کی لاش سے لپٹ کر خوشی خوشی آگ میں جل گئی۔

(باقی آیندہ)

پندرہ روزہ
منصف
ادبی، سیاسی اور فلمی پندرہ روزہ
کا پہلا سالنامہ یکم فروری ۱۹۷۰ء کو شایع ہوگا
جس میں ہر شخص کی دل چسپی کا سامان موجود ہے۔
فی پرچہ ۲۰ پیسے، سالانہ ۵ روپے
نئے ایجنٹس کی ضرورت ہے۔ نمونہ کے پرچے کے لیے خط لکھیے

پنچ تنتر کی کہانیاں



جناب محمد رفیق شاستری۔ ام اے

(دسمبر ۱۹۶۹ء سے سلسلہ ملائیے)

کسی ملک میں ایک بہت بہادر راجہ حکومت کرتا تھا۔ راجہ نند کی دور دور شہرت تھی۔ براچی پنڈت اس کا وزیر تھا۔ وہ بہت عقل مند اور ہوشیار تھا۔ بادشاہ اپنے وزیر سے بہت محبت کرتا تھا اور اسے اپنے محل ہی میں رکھتا تھا۔ مگر بادشاہ اور وزیر دونوں اپنی بیویوں کے غلام تھے۔ ایک دن براچی پنڈت کی بیوی کسی بات پر اس سے ناراض ہو گئی۔ بہت منانے پر بھی نہ مانی۔ براچی پنڈت اس سے بولا "تمھاری جو بھی شرط ہے وہ میں ماننے کو تیار ہوں۔" یہ سُن کر بیوی بولی "تم اپنا سر منڈا دو تب میں معاف کروں گی۔" بے چارے براچی پنڈت کو اپنی بیوی کی خاطر سر منڈانا پڑا۔

اگلے دن براچی پنڈت کی بیوی نے یہ بات راجہ کی ملکہ کو سنائی۔ ملکہ نے سوچا کہ وزیر کی بیوی جب اپنے شوہر پر اس طرح حکم چلا سکتی ہے تو کیوں نہ میں راجہ پر بھی اسی طرح حکم چلاؤں۔ راجہ صاحب محل میں آئے تو رانی صاحبہ روٹھی بیٹھی تھیں۔ لاکھ سمجھایا مگر نہ مانیں۔ ناراضگی کی وجہ پوچھی مگر جواب ندارد۔ آخر ہار کر راجہ نے کہا "تم

رانی صاحبہ تو جیسے انتظار میں تھیں کہنے لگی "تم گھوڑا
سواری کروں گی۔ راجہ صاحب کو گھوڑا بننا پڑا۔
صاحبہ ان پر سوار ہو کر سارے کمرے میں گھومیں۔

صبح سویرے رانی نے یہ بات وزیر کی بیو
بتا دی اور وزیر کی بیوی نے یہ ساری باتیں وزی
پہنچا دیں۔ اگلے دن جب دربار لگا تو براچی پ
سر منڈائے دربار میں پہنچا۔ راجہ وزیر کا سر منڈا د
پریشان ہوا۔ پوچھا "خیر تو ہے تمھارا یہ سر کیسے منڈا"

وزیر بولا "کیا بتاؤں مہاراج جس زما
میں آدمی کو منھ میں لگام ڈال کر گھوڑا بن کر ہنہنا
اُس زمانے میں سر منڈانا تو بہت ہی معمولی بات

راجہ یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ مگر سارے
والوں نے دیکھا کہ راجہ براچی پنڈت کا جواب سن کر
شرمندہ ہوا۔

بندر نے یہ کہانی سنا کر مگرمچھ سے کہا "م
مگرمچھ تم بھی عورت کے غلام بن کر اندھے بن گئے

بنایا تھا۔ لیکن تمھارے باتونی پن نے تم سے دل کی بات کہلوا دی تم جانتے ہو کہ باتونی ہونے کی وجہ سے سارس مارے جاتے ہیں مگر بگلا چونکہ خاموش رہتا ہے اس لیے بچ جاتا ہے۔ خاموشی سے بہت سے کام بن جاتے ہیں اور بے وقت کی بات موت کا سبب بن جاتی ہے۔ بے وقت کی راگنی چھیڑ کر ہی شیر کی کھال اوڑھے ہوئے گدھے میاں اپنی جان نہیں بچا سکے تھے۔"

مگر مچھ نے پوچھا "وہ کیسے؟"

تب بندر نے مگر مچھ کو گدھے کی یہ کہانی سنائی۔

بے وقت کی راگنی:۔ ایک شہر میں ایک عقل مند دھوبی رہتا تھا۔ آپ جانتے ہیں جہاں دھوبی ہو وہاں گدھا بھی ہوتا ہے۔ دھوبی کے پاس شیر کی ایک کھال تھی جب رات ہوتی تو وہ گدھے کے اوپر شیر کی وہ کھال ڈال کر کسی کھیت میں چھوڑ دیتا۔ کھیت والے اسے شیر سمجھ کر بھاگ جاتے اور گدھے میاں خوب آرام سے پیٹ بھرتے اور صبح سے پہلے گھر واپس آجاتے۔ دھوبی میاں کی یہ ترکیب بہت کارگر رہی۔ اس طرح گدھا سردی سے محفوظ بھی رہتا اور آرام سے اپنا پیٹ بھی بھرتا ۔۔۔۔۔۔ مگر ایک دن یہ پول کھل ہی گیا۔

گدھے میاں ایک کھیت میں چر رہے تھے کہ قریب ہی سے گدھوں کے ایک غول کا گذر ہوا۔ ان میں سے ایک گدھا رینکنے لگا۔ شیر کی کھال اوڑھے گدھے میاں کا پیٹ بھی بھر چکا تھا۔ گدھے کی رینکنے کی آواز سن کر وہ [illegible]

ہوئے کھیت والوں نے سنا تو وہ لاٹھیاں لے کر اس پر پل پڑے اور لگے ڈنڈے بجانے۔ بیچارہ گدھا بے وقت کی راگنی چھیڑنے کی وجہ سے مارا گیا۔

بندر مگر مچھ کو یہ کہانی سنا ہی رہا تھا کہ مگر مچھ کے ایک پڑوسی نے آکر خبر دی کہ تیرے گھر پر ایک دوسرے مگر مچھ نے قبضہ جما لیا ہے۔ یہ سن کر مگر مچھ اور بھی اداس ہو گیا۔ اس کے اوپر تو گویا مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا تھا۔

بندر کی عقل مندی کا اس پر کافی اثر تھا۔ اس نے بندر سے پوچھا دوست میرا اب تو سب کچھ لٹ چکا ہے۔ ایک دوسرا مگر مچھ میرے گھر پر قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ کوئی ایسی ترکیب بتاؤ کہ میں اپنے گھر پر پھر سے قبضہ کر سکوں۔

بندر بولا "ارے احمق اب میں تجھے کوئی تدبیر نہیں بتاؤں گا۔ تم اب مجھے دوست بھی مت کہو۔ اب تیری بربادی کے دن آگئے ہیں۔"

مگر مچھ کے رونے گڑگڑانے پر بندر نے اسے صلاح دی کہ تو جا کر اس مگر مچھ سے مقابلہ کر جو تیرے گھر پر ناجائز قبضہ کئے بیٹھا ہے۔ دور اندیشی اسی میں ہے کہ اگر دشمن طاقتور ہو تو مصلحت سے کام لے کر اسے زیر کیا جائے۔ اگر مکار ہے تو اس کے ساتھ مکاری کی جائے اور اگر برابر کی طاقت کا ہو تو اس کے ساتھ دو بدو لڑائی کر کے اس پر فتح پائی جائے۔

مگر مچھ نے پوچھا وہ کیسے۔

یہ کہانی سنائی۔

ایک جنگل میں ایک چالاک گیدڑ رہتا تھا۔ ایک دن اس نے جنگل میں ایک مرا ہوا ہاتھی دیکھا۔ گیدڑ نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اس کی کھال میں اپنے دانت گڑو دے۔ مگر ہاتھی کی سخت کھال کو وہ نہیں کاٹ سکا۔ اسی وقت ادھر سے ایک شیر آگیا۔ شیر کو آتا دیکھ کر گیدڑ آداب بجالایا اور بہت ادب سے کہا کہ حضور آپ ہی کے لیے میں اس ہاتھی کی رکھوالی کر رہا تھا۔ آپ آگئے ہیں تو یہ کھانا آپ کے لیے حاضر ہے۔

شیر بولا: "ارے میاں گیدڑ تمھیں معلوم نہیں کہ میں کسی اور کے ہاتھوں مارے ہوئے جانور کو ہاتھ تک نہیں لگاتا ہوں۔ چاہے بھوک سے مر جاؤں مگر اپنا یہ اصول نہیں چھوڑتا۔ یہ مرا ہوا ہاتھی تمھیں کو مبارک ہو۔

شیر کے جانے کے بعد وہاں ایک تیندوا آگیا۔ گیدڑ نے سوچا ایک مصیبت کو تو ہاتھ جوڑ کر ٹالا تھا۔ اب کیسے ٹالوں۔ اس کے ساتھ تو مصلحت سے کام لینا ہوگا۔ یہ سوچ کر وہ تیندوے کے سامنے اور اونچا سر کر کے گیا اور بولا: "اے میاں تیندوے اس ہاتھی پر دانت نہ گڑانا اسے شیر نے مارا ہے۔ وہ ذرا منھ ہاتھ دھونے چلا گیا ہے اب آتا ہی ہوگا۔ میں تو اس کی رکھوالی کر رہا ہوں، اور ہاں وہ یہ بھی کہہ گیا ہے کہ کوئی تیندوا ادھر آئے تو اسے بتا دوں کہ وہ سب اس جنگل سے دور

[illegible]

گیدڑ کی بات سن کر تیندوا بہت ڈرا اور ... سے بھاگ کھڑا ہوا۔

تیندوے کے جانے کے بعد ادھر سے ایک ... آیا۔ گیدڑ نے سوچا کہ چیتے کے دانت کافی تیکھے ہیں۔ کیوں نہ اس سے کسی بہانے ہاتھی کی تھوڑی ... ادھڑوائی جائے۔ یہ خیال آتے ہی وہ چیتے کے ... گیا اور کہنے لگا "معلوم ہوتا ہے آپ کئی دن ... ہیں۔ بھائی یہاں تو بس یہ ہاتھی پڑا ہے۔ شیر نے مارا ہے اور مجھے رکھوالی پر چھوڑ کر نہانے دھو... پر چلا گیا ہے جب تک شیر نہیں آتا ہے تم اس ... تھوڑا بہت کھالو۔ میں اوپر پہاڑی پر بیٹھ کر ... رکھتا ہوں۔ جیسے ہی میں بتاؤں تم رفو چکر ہو ... نہ ہو کہ شیر تمھیں دیکھ لے اور تمھارے سا... شامت آجائے۔"

اتنا کہہ کر گیدڑ پاس کی پہاڑی پر چڑ... چیتے میاں ہاتھی کی کھال اُدھیڑنے لگے۔ کھال اد... جیسے ہی گوشت کھانے کے لیے چیتے نے دانت ... تھے۔ گیدڑ چلایا "بھاگو شیر آرہا ہے۔ بھاگو ... ہے" یہ سننا تھا کہ چیتے میاں بغیر ہاتھی کا ... کھائے وہاں سے بھاگ نکلے اور گیدڑ میاں ... ادھڑی ہوئی کھال کے اندر سے گوشت ... کر کھانے لگے۔ ابھی تھوڑا سا گوشت کھایا ... ایک دوسرا گیدڑ آنکلا۔ یہ طاقت میں اس ...

[illegible]



جناب مہور دلوی

سنترہ

جس طرح انگور کے لیے ناسک انجیر کے لیے پونا اور ہاپس یا الفانسو آم کے لیے رتناگیری کا نام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح سنترہ کے لیے ناگپور مشہور ہے۔

سنترے کی دو قسمیں ہیں سخت چھلکے والے اور نرم پول چھلکے والے۔ دہلی اور شمالی بھارت میں سخت چھلکے والے سنتروں کی زیادہ مانگ ہے۔ بمبئی والوں کو سنترے کی دوسری قسم زیادہ پسند ہے۔ کیوں کہ نرم اور پول چھلکے والے سنترے چھیلنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے۔

بہترین۔ میٹھے اور اونچی ذات کے پھل کھانے کے لیے بازاروں میں بھیجے جاتے ہیں اور ہلکے اور کھٹے یا زیادہ پکے ہوئے سنترے رس نکالنے کے لیے کارخانوں میں روانہ کیے جاتے ہیں۔ سڑے گلے پھل ضایع کیے جاتے ہیں۔

ناگپوری سنتروں کی دو فصلیں ہوتی ہیں۔ یعنی مبر اور پھر (۲) اپریل میں سنترے پیڑوں پر سے اتارے جاتے ہیں۔ باقاعدہ اور بھرپور پانی دینے سے دسمبر میں پھل نے میں اور پانی کی کمی کے باعث دسمبر سے اپریل تک تیار نہیں ہو پاتے۔ اپریل میں عام طور پر سنترے رسیلے ہو جاتے ہیں۔ وقت سے پہلے پھل توڑنے کے دوسرے دن وہ پک جاتے ہیں۔ یعنی بمبئی یا دہلی کے گاہکوں کے میں دو تین یا چار روز بعد پہنچتے ہیں۔

ہے جس سے ان کی پوری پوری حفاظت ہوتی ہے۔ ایرکنڈیشن والے ریل کے ڈبوں میں یا لاریوں میں وہ زیادہ محفوظ رہتے ہیں۔ ہاں ریل کے لوہے کے ڈبوں میں جلد خراب ہوتے ہیں۔ سنتروں کو توڑتے وقت زیادہ لمبے ڈنٹھل توڑنے سے وہ جلد خراب نہیں ہوتے اور توڑنے کے بجائے قینچی سے کاٹنے سے تازہ اور محفوظ رہتے ہیں۔

امریکہ میں یہی طریقہ رائج ہے۔ وہاں سنترے عام طور پر نہیں سیلوفین کاغذ لپیٹ کر بیچتے ہیں جس پر جراثیم کش پاؤڈر چھڑکتے ہیں۔ ہندوستان کی بہ نسبت امریکہ میں سنترے کے پیڑ زیادہ بڑھتے اور پھیلتے پھولتے ہیں۔

سنترے کے پیڑ پانچ سو تا ایک ہزار پھل دیتے ہیں۔ جراثیم کش دواؤں کے استعمال سے ان میں دوگنا پھل پیدا کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔ سنترے کے پیڑوں کی عمر چالیس پچاس سال تک ہوتی ہے۔

ناگپور اور آس پاس کے مقامات پر پیدا ہونے والے سنتروں کی تعداد تیس کروڑ ہے اور سالانہ آمدنی تقریباً دو کروڑ سے زیادہ ہوتی ہے۔ یعنی موجودہ ہندوستان کی آبادی کے لحاظ سے ایک شخص کے حصے میں ایک سنترہ بھی نہیں آتا۔

بقیہ مضمون پنچ تنتر کی کہانیوں کا۔

نے لڑ کر اس نئے آنے والے گیدڑ کو بھگا دیا اور پھر مدتوں اس ہاتھی کے گوشت کو کھاتا رہا۔

~~~~~~~~

یہ کہانی سنا کر بندر نے مگر مچھ سے کہا کہ اگر تو اپنی خیر چاہتا ہے تو جا اس مگر مچھ سے لڑنے کی تیاری کر اگر تو اسے لڑ کر اپنے گھر سے انہیں نکالتا ہے تو پھر زندگی بھر بے گھر بے ٹھکانے کے گھومتا رہے گا۔

وہ اپنے گھر کی طرف پوری ہمت اور حوصلے سے واپس گیا اور لڑ کر اس مگر مچھ کو اپنے گھر سے نکال دیا اور آرام اور اطمینان کی زندگی بسر کرنے لگا۔

(چوتھا تنتر ختم)

(اب اگلے شمارے سے پانچواں تنتر شروع ہوگا جو پنچ تنتر کا آخری تنتر یا باب ہے)

بقیہ مضمون "علم و عقل" کا

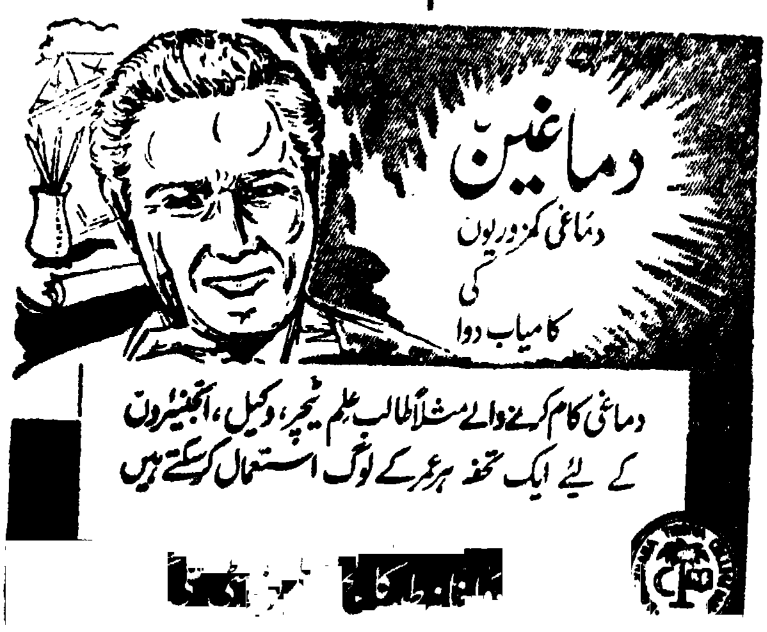
اس نے پھر کچھ حساب لگایا اور بولا اس چیز کے بیچ میں ایک گول چھید بھی ہے۔

صفدر نے مسکرا کر کہا۔ "آپ کی بات درست۔ وہ چیز گول ہے اور اس کے درمیان چھید بھی ہے لیکن میں چیز کا نام معلوم کرنا چاہتا ہوں"۔

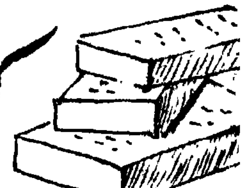
اس نے پھر کچھ دیر تک زائچہ کا مطالعہ کیا، حسا اور پھر فاتحانہ انداز میں سب کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "آ مٹھی میں آٹا پیسنے والی چکی کا پاٹ ہے"۔

اور یہ جواب سن کر سب ہنس پڑے۔

صفدر نے شکیل کی طرف دیکھا وہ بہت شرم ہو گئے تھے


~~~~~~~~





محمد شاہد عظیم

کتب خانے کی کہانی

آپ ہر روز کتابیں پڑھتے ہیں۔ رنگ برنگی
ویروں والی کتابیں جن میں مزے دار قصے ہوتے ہیں۔
چسپ کہانیاں ہوتی ہیں۔ اسکول میں حساب، جغرافیہ،
نس اور دوسرے ملکوں کے حالات وغیرہ پڑھتے ہیں
ت سی نئی نئی باتیں سیکھتے ہیں۔ کبھی آپ نے سوچا ہے کہ
ابیں کہاں سے آئیں؟ انھیں لکھنے کا خیال سب سے پہلے
پیدا ہوا؟ کیونکر ہوا ___؟

کتاب کے معنی ہیں لکھی ہوئی چیزیں۔ ہم جو
چتے اور لکھتے ہیں وہ باتیں کتاب کے ذریعہ دوسروں
پہنچتی ہیں۔ ہزاروں برس پہلے جب کتابوں کو کوئی
جانتا تھا۔ کسی کو اگر کچھ کہنا ہوتا تو وہ اسے دوسروں
سامنے دہراتا دوسرے اس کو بار بار دہراتے ساری
تیں یاد ہو جاتی۔

شروع میں قوموں کے کارنامے، حکومتوں کے
ت اور مذہبی باتیں ان لوگوں کو یاد کرائی جاتی تھیں
ں اس کام کے لئے تیار کیا جاتا انھیں پروہت
بیٹھے) کہا جاتا تھا اور وہ روزانہ کئی کئی گھنٹے ان
کو دہرایا کرتے تھے۔ ہندوؤں کی مقدس کتابیں

ہزاروں برس تک یہ ایک دوسرے کو اسی طرح یاد کرائی
گئیں۔ یہ کتابیں اتنی موٹی موٹی ہیں کہ انھیں دیکھ کر اس
بات کی حیرت ہوتی ہے کہ اتنی موٹی موٹی کتابیں ان
لوگوں کو کس طرح یاد رہی ہوں گی۔ اپنے خیالات کا
اظہار کرنے کے لئے انسان نے پہلے پہل پتھر کو ذریعہ
بنایا۔ ان دنوں کاغذ قلم تو تھا نہیں اگر کسی کو کچھ لکھنا
ہوتا تو وہ اسے پتھر پر کھود دیتا۔ ایسے پتھر دیکھنے کا اتفاق
ہو تو آپ کو تعجب بھی ہوگا اور ہنسی بھی آئے گی وہ تصویریں
ہوتی ہی ایسی بے ڈھنگی تھیں۔ اگر کسی کو یہ لکھنا ہوتا
کہ اس کا بیل مر گیا تو وہ پہلے مرے ہوئے بیل کی تصویر
اتار دیتا۔ آپس میں لڑائی جھگڑا ہوتا تو تصویریں پہلے ایک
آدمی بنایا جاتا جس کے ہاتھ میں کوئی ہتھیار ہوتا اس کے
بعد مرنے والے کو مقابلہ کرتے ہوئے دکھایا جاتا تھا، آخر میں
ایک مردہ انسان کی تصویر ہوتی، اس طرح اول اول
تصویری زبان بولی جاتی تھی۔

کہتے ہیں کہ مصر میں ایک بڑے بت کے گھٹنوں پر
ایسی ہی تصویریں آج بھی موجود ہیں جو عیسائیوں کے
پیغمبر مسیح کی پیدائش سے بھی سات سو سال پہلے بنائی

اسے نرم نرم چکنی مٹی پر لکھنا زیادہ آسان معلوم ہوا۔ پھر کیا تھا پتھر کی جگہ مٹی کی اینٹیں استعمال کی جانے لگیں۔ اور اینٹوں کے مجموعہ کو اس زمانے کی کتاب سمجھنا چاہیے۔ یہ اینٹیں مٹی یا بید کے بنے ہوئے بکس میں عبادت گاہوں اور مندروں کے کمرہ میں رکھی جاتی تھیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ کتب خانہ وجود میں آیا۔ جس جگہ بہت سی کتابیں اکٹھی کر دی گئی ہوں اسے کتب خانہ کہتے ہیں۔

راجاؤں اور بادشاہوں کے شوق نرالے ہوتے ہیں۔ انھیں ہر دم کچھ نہ کچھ کرنے کی دھن رہتی ہے۔ اس زمانے میں بادشاہوں کو اینٹوں والی کتابیں بہت پسند آئیں۔ چلو بہت ساری کتابیں تیار ہو گئیں۔ بادشاہ ان پر بڑے شوق سے اپنے خاندانی حالات، فتوحات اور سلطنتوں کے انتظامات کے بارے میں لکھوا کر محفوظ رکھتے۔ رفتہ رفتہ ان میں اوپری باتیں بھی بڑھائی گئیں۔ اس طرح کئی بادشاہوں نے کتب خانے بنا ڈالے۔ بادشاہ جیمس دوئم کی لائبریری جو ایتھنز میں تھی بڑی مشہور تھی۔ اسکندریہ میں ٹولمی بادشاہوں کی لائبریری تو گویا ساری دنیا میں مشہور ہو گئی تھی۔

جولیس سیزر کے کتب خانہ میں جنگ اور فتوحات کے بارے میں بہت سی اچھی اچھی کتابیں تھیں یہ چمڑے پر لکھی ہوئی تھیں۔ اس زمانے میں مٹی کی جگہ درخت کی چھال اور چمڑے کا رواج ہو گیا تھا۔

قدیم زمانے میں کتابوں کو نقل کرنے میں بڑا وقت لگتا تھا۔ روپیہ بھی خوب خرچ ہوتا تھا۔ اسی لئے کتابیں بڑی مہنگی ملتی تھیں۔ ایک عام آدمی کے لیے ا خریدنا ناممکن سا تھا۔ اسی لیے ان کتابوں کو بڑی حفا سے رکھا جاتا تھا۔ یورپ کے بعض ملکوں میں کتابیں ز سے باندھ کر الماریوں میں رکھی جاتی تھیں۔

آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے کاغذ بنانے کا عام ہو گیا تو کتابیں لکھنے میں آسانی ہو گئی پھر چھاپہ ایجاد ہوا۔ اور بھی پھر تو کتابیں ساری دنیا میں پھیل اب کتب خانہ کی الماریاں سب کے لئے کھلی رہتی ہ ہم اپنے پسند کی کتابیں بلا کھٹکے پڑھ سکتے ہیں۔

ہندوستان میں کتابوں کا ذکر ہزاروں س سے ملتا ہے۔ آپ نے ہیونتسانگ اور فاہیان کا تاریخ کی کتابوں میں ضرور پڑھا ہوگا۔ یہ بدھ بھکش بہت پرانے زمانے میں ہندوستان میں آئے تھے نے اپنے ملک چین واپس لوٹ کر ہندوستان کے میں دل چسپ باتیں لکھی ہیں انھیں پڑھ کر معلوم کہ ہندوستان میں اس زمانے میں بڑی بڑی لا تھیں۔ یہی نہیں بلکہ کتابوں کو دوسرے ملکوں بھیجا جاتا تھا۔

فاہیان نامی چینی سیاح اپنے ساتھ تاڑ پتوں پر لکھی ہوئی کتابوں کے پانچ سو بنڈل۔ ہیونتسانگ نے بھی پانچ سو سے زاید کتابیں چ بھیجی تھیں ان میں سے ہر کتاب میں چھ سو سطر

آج سے کوئی بارہ سو برس پہلے نالند "رتنودھی" کتب خانہ بڑا مشہور تھا۔ اس کی

۹ منزل کی تھی۔ اور اس میں تین سو کمرے تھے۔ گپت
خاندان کے حکمرانوں نے مندروں اور مٹھوں میں ہزاروں
کی تعداد میں کتابیں جمع کی تھیں۔ دھار میں راجہ بھوج
کا کتب خانہ بہت مشہور تھا۔ مسلمان بادشاہوں کے
بھی بڑے بڑے کتب خانے تھے۔ علاؤالدین خلجی کے
کتب خانے کے نگران مشہور صوفی شاعر حضرت امیر خسرو
تھے۔ مغل بادشاہ تو کتابوں پر جان چھڑکتے تھے۔
غل بادشاہ ہمایوں نے شیر منڈل نام کی عمارت
ں اپنا کتب خانہ بنا رکھا تھا اور وہ اس کتب خانے
ی سیڑھیوں سے گر کر مرا تھا۔

ان دنوں ہندوستان میں کلکتہ کی امپیریل
بریری کو سب سے بڑا اور اچھا کتب خانہ سمجھا جاتا
ہے اب دنیا کی دو بڑے کتب خانوں کا حال سنیے۔
یا میں سب سے بڑا کتب خانہ واشنگٹن میں ہے۔
وہاں "لائبریری آف کانگرس" کہتے ہیں آپ کو یہ
ن کر حیرت ہوگی کہ اس لائبریری میں چھ کروڑ
زیادہ کتابیں، تعلیمی ٹیپ، گراموفون ریکارڈ، چارٹ
نے اور دوسری ڈھیر ساری چیزیں شامل ہیں یہ تو
موجودہ کتابوں کی تعداد۔ کہتے ہیں کہ ہر سال
یں اوسطاً سترہ ہزار نئی کتابیں چھپتی ہیں جو لائبریری
نگرس میں کسی نہ کسی طرح پہنچ جاتی ہیں اس طرح
ن وہاں نئی نئی کتابیں آجاتی ہیں۔ ان کتابوں
بھال کے لیے ظاہر ہے کہ بہت سے لوگوں

لوگ ملازم رکھے گئے ہیں جنھیں ہر سال ستر لاکھ ڈالر
تنخواہ دی جاتی ہے اس لائبریری کی خاص خاص
کتابوں میں امریکہ کی آزادی کے اعلان کا مسوّدہ جو
اس وقت کے صدر ٹامس جیفرسن نے لکھا تھا۔ لائبریری
آف کانگرس میں صدر ابراہیم لنکن کے لکھے ہوئے
خطوط بھی محفوظ ہیں۔ دنیا کا دوسرا سب سے بڑا کتب خانہ
روس کی راجدھانی ماسکو میں ہے آپ نے روس کے
مشہور لیڈر لینن کا نام ضرور سنا ہوگا اس کتب خانے
کا نام انھیں کے نام پر "لینن لائبریری" رکھا گیا ہے۔
لینن لائبریری میں ہر روز کوئی نوّے ہزار لوگ کتابیں
پڑھنے آتے ہیں۔ لینن لائبریری میں چار کروڑ
کتابیں ہیں۔ وہ بھی ایک سے ایک نئی اور اچھوتی۔
سائنس، ٹکنالوجی اور انجینیرنگ پر یہاں بہت سی
اچھی اچھی کتابیں جمع کی گئی ہیں۔

کتب خانوں میں کتابیں کہاں سے آتی ہیں۔
اس کا طریقہ سیدھا سادھا ہے وہ یوں کہ جب بھی کوئی
کتاب چھپ کر بازار میں فروخت ہونے کے لئے آتی
ہے تو کتب خانہ کی طرف سے اسے خرید لیا جاتا ہے۔
بعض کتابیں چھاپنے والے اپنی کتابیں مفت بھیج دیتے
ہیں۔ اس سے ان کو ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا کہ وہ کتاب ہمیشہ
کے لئے محفوظ ہو جاتی ہے اس لئے کتب خانوں میں
کتاب خواہ کتنی ہی پرانی کیوں نہ ہو پڑھنے کے لیے
مل سکتی ہے۔ ہر جگہ کتب خانے دوسرے ملکوں کے

اس طرح ایک ملک کی کتابیں دوسرے ملک کو بہ آسانی پہنچ جاتی ہیں۔

ان دنوں کئی ملکوں میں چلتے پھرتے کتب خانے بڑے پسند کئے جاتے ہیں۔ کتابیں چھوٹے چھوٹے صندوقوں بھر کر گاؤں کو ٹرک کے ذریعہ بھیجی جاتی ہیں۔ ان کا دورہ ہر آٹھویں دسویں روز ہوتا ہے پہلے کسی گاؤں میں پہنچ کر کتابیں پڑھنے کے لئے تقسیم کی جاتی ہیں پھر کچھ دنوں بعد وہی لوگ آکر کتابیں واپس لے جاتے ہیں۔ گاؤں والوں کو دوسری نئی کتابیں پڑھنے کو مل جاتی ہیں۔

روس والے تو اس معاملہ میں سب سے آگے ہیں۔ وہاں گاؤں والوں کو متوجہ کرنے کے لئے طرح طرح کے کھیل تماشے دکھائے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں چلتی پھرتی لائبریریاں زیادہ مقبول ہیں۔ ان ٹرکوں میں ایک کمرہ بنا ہوتا ہے جس میں چاہو تو بیٹھ کر کتابیں پڑھ سکتے ہو۔ ایسے ٹرک صبح یا شام کے اوقات میں کسی پارک کے قریب ٹھہر جاتے ہیں، امریکہ روس اور یورپ کے بیشتر ترقی یافتہ ملکوں میں سینما گھروں اور ریلوے میں بھی کتب خانے ہوتے ہیں۔

★۔۔★ ———

بچوں کی کوششوں کا بقایا۔

لالاین :۔ (چلاّ کر) کیوں نرک میں (دوزخ) جانے کے کام کر رہے ہو ؟ ——— پڑوسی کی بیوی مر گئی ...

(قمیص کو لالاجی کی طرف پھینکتی ہے) کیا آج چائے نہیں پیو گے۔ اگر دُکان کا اتنا ہی خیال رہا ... تو دنوں میں پرلوک سدھار جاؤ گے۔ — ذرا رُک جا میں ابھی ۔۔ ابھی چائے لے کر آتی ہوں (اتنا کہ لالاین کمرے سے نکل جاتی ہیں ۔)

(تھوڑی دیر کے بعد ہریش کمرے میں داخل)

ہریش :۔ پتاجی ... اسکول کی گھنٹی بجنے والی آج پندرہ تاریخ ہے ... فیس کے روپے دے

لالاجی :۔ (گھبرا کر) کیا کہا ؟ دُکان میں آگ لگ گئی ہے۔ (اتنا کہہ کر لالاجی قمیص ہاتھ میں لیے ہی زور سے "میں لُٹ گیا، ہائے میں لٹ گیا" کہہ کر روتے ہوئے سے باہر نکل جاتے ہیں)

لالاین :۔ (چاروں طرف دیکھ کر بڑبڑاتے ہوئے) سوچتی تھی وہی ہوا۔ وہاں باورچی خانے میں چائے ہو رہی ہے اور وہ (لالاجی) چھو منتر ہو گئے۔ (ہریش کی طرف دیکھ کر) کیوں رے تو کیسا کھڑا اسکول نہیں گیا ۔

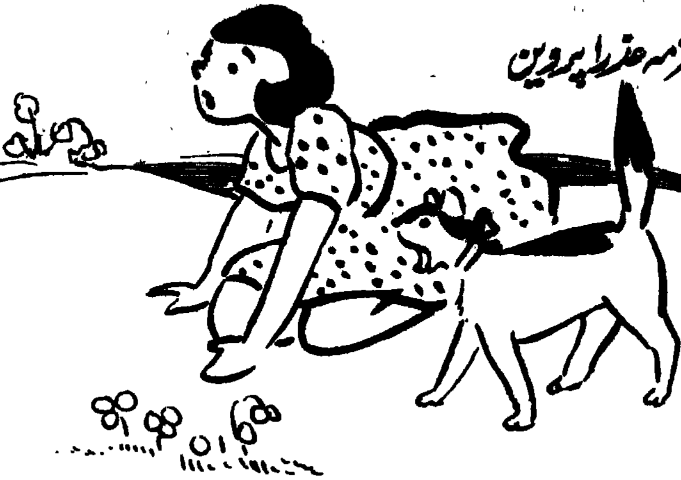
ہریش :۔ پتاجی ... ابھی ابھی باہر گئے ہیں ۔

لالاین :۔ (چلاّ کر) کیا کہا دوارکا پرساد کے لڑکے نے تجھے گالی دی ہے۔ آ تو میرے ساتھ ابھی اس کی ٹانگیں چیر کر آتی ہوں۔ آ تو میرے ساتھ۔ (اتنا کہہ کر لالاین ہریش کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر نکل جاتی ہیں)

(پردہ گرتا ہے)

کاش امی میں بلّی ہوتی!

محترمہ عذرا پروین



کہتے ہیں بری گھڑی کہہ کر نہیں آتی۔ ایک دن اچھے خاصے بیٹھے بٹھائے فاطمہ کے منہ سے نکل گیا ـــــ

کاش" امی کہ میں ایک بلی ہوتی"

"کیوں بھئی یہ اچانک بلی ہونے کی تمنا کیوں جاگ ـمی خیریت تو ہے؟" فاطمہ کی امی نے حیرت سے پوچھا۔

اس لیے کہ بلی نہ اسکول جاتی ہے نہ لکھتی ہے ـمر نہ گھر کے کام میں اپنی ماں کا ہاتھ بٹاتی ہے!" فاطمہ نے ـڈے بھولے پن سے جواب دیا۔

"اچھا تو یہ بات ہے تم کام سے جی چرا کر انسان بلی ہونا پسند کرتی ہو، ہے نا یہی بات؟" اس کی امی معنی خیز لہجے میں جواب دیا۔ "اچھا فاطمہ صاحبہ آج سے ـتھوں آپ کا اور آپ کی خواہش دونوں کا امتحان ہو جائے ـ۔ آج تم سے کوئی کام نہ لوں گی پڑھائی لکھائی بھی اٹھا ـم طاق پر رکھ دو اور اسکول کی بھی چھٹی کرو"

اندھا کیا چاہے دو آنکھیں بی فاطمہ کو تو جیسے ـہاں کی دولت مل گئی وہ خوشی میں جھومتی ہنستی مسکراتی خوبصورت سے باغ میں آگئی۔ وہاں وہ کھیلتی رہی بس ـبلتی رہی، زیادہ موج میں آئی تو بلی کی طرح میاؤں میاؤں بھی کرنے لگتی مگر کوئی کب تک کھیل سکتا ہے۔ اور پھر اکیلے اکیلے تھوڑی دیر بعد وہ گھر کی طرف لوٹ رہی تھی۔ فاطمہ کی نے جب اس کو کمرے میں دیکھا تو بہت بری طرح دھتکارا "اے بی بلی چل نکل یہاں سے بلیاں کمرے میں نہیں گھستیں۔ فاطمہ شرمندہ ہو کر پھر باغ میں لوٹ آئی۔

تھوڑی دیر بعد فاطمہ نے اپنی امی کو بازار کی طرف جاتے دیکھا اس نے سوچا میں بھی ذرا بازار تک ہو آؤں اس ارادے سے وہ اپنی امی کے پاس آئی۔ امی نے اس کو آڑے ہاتھوں لیا اور لہجے میں ذرا سختی پیدا کر کے کہا۔

"نہیں میں تمھیں ہرگز بازار نہیں لے جا سکتی۔ بھلا کہیں بلیاں بازار جاتی ہیں"

ملا کی دوڑ مسجد فاطمہ پھر مرے قدموں سے باغ میں آگئی۔

دوپہر کو کھانے کا وقت ہوا تو فاطمہ صاحبہ پھر کھانے کے کمرے میں موجود! امی نے دیکھا تو بڑی بے دردی سے اٹھا دیا۔

"اے بی بلی صاحبہ آپ یہاں سے تشریف لے جائیے۔ آپ کی قوم دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا نہیں،

کھایا کرتی، اس کے لیے تو بچا کھچا سالن روٹی کے ٹکڑے نوالے اور چھیچھڑے وغیرہ باورچی خانے کے ایک کونے میں رکھ دیئے جاتے ہیں۔ جاؤ تم وہیں بیٹھو میں ابھی تمھارے لیے چھیچھڑے بھیجتی ہوں، آج میں نے خوب بہت سے چھیچھڑے منگائے ہیں کیوں کہ ہمارے گھر بیس دو بلیاں ہو گئی ہیں۔"

فاطمہ نے سوچا برے پھنسے کہیں آج سچ مچ ہی چھیچھڑے کھانے کو نہ ملیں کیوں کہ اس کی امی سے کچھ بعید بھی نہیں تھا۔ ان کی منھ کی نکلی ہوئی بات پتھر کی لکیر ہوا کرتی تھی۔ وہ بہت سخت قسم کی تھیں۔

فاطمہ بھوک سے بے قابو تھی مگر مرتا کیا نہ کرتا اٹھنا پڑا۔ یہ بیج تو اس نے خود بویا تھا جس کا یہ پھل مل رہا تھا۔

پر اب بھوکی پیاسی فاطمہ پر دھیرے دھیرے نیند نے غلبہ پانا شروع کیا وہ سونے کے لیے اپنے کمرے میں آگئی۔ وہ پھر بھول گئی کہ امی نے ابھی تھوڑی دیر پیشتر یہاں سے بڑی بری طرح نکالا تھا۔ ذرا دیر بعد فاطمہ صاحبہ اپنے پلنگ پر پڑی خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھیں۔

کھانا ختم کرنے کے بعد فاطمہ کی امی نے سوچا چلو دیکھوں فاطمہ کیا کر رہی ہے۔ اس کو یوں مزے سے سوتا پا کر مسکرا اٹھیں۔ دوسرے ہی لمحے انھوں نے فاطمہ کو بڑی بے دردی سے گھسیٹ کر زمین پر ڈال دیا۔ اس سے پہلے کہ فاطمہ سمجھ سکے کہ یہ ناگہانی آفت کہاں سے نازل ہوئی۔ اس کے کانوں سے اس کی امی کی آ ٹکرائی "یہاں بڑی سو رہی ہے تجھے پتہ نہیں کہاں سویا کرتی ہیں۔"

فاطمہ بے اختیار رو پڑی۔ اس نے اپ سے کہا: "امی اب مجھے معاف کر دیجیے۔ اب میں تو ہوں آئندہ کبھی ایسی بے ہودہ خواہش ظاہر نہ کروں گی اور وعدہ کرتی ہوں کہ کل سے باقاعدہ اسکول جایا کروں گی گھر کے کام میں بھی آپ کا بٹاؤں گی۔"

دوسرے دن فاطمہ صبح اٹھی تو وہ بہت تھی۔ اس نے حسب وعدہ لباس تبدیل کیا اور ہوتی اسکول چلی گئی۔

اس کی امی نے اسے معاف کر دیا۔

(عربی سے)

اس سرخ نشان کا مطلب ہے کہ اس مہینے کے بعد آپ کی مدت خریداری ختم ہو گئی۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے پیارے پیام تعلیم کی سرپرستی گے۔ براہ کرم مبلغ چھ روپے کا منی آرڈر اس مہینے کی ۲۵ تاریخ ضرور بھیج دیجیے تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے۔ آپ کی طرف سے کوئی نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا اور افسوس بند کر دیں گے۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ

آپ کا خریداری نمبر ______ ہے

منیجر

بچوں کی کوششیں

ھیل میں چاند :- ایک جنگل میں بہت سے بندر رہتے
تھے۔ ان کا راجہ ایک بوڑھا بندر تھا، بوڑھے اور سمجھ دار بندر
سے پسند کرتے تھے اور اس کی بات مانتے تھے لیکن جوان بندر
سے پسند نہیں کرتے، ان کا رہنما ایک جوان بندر تھا۔ ان لوگوں
ن بندروں نے اسے اپنا راجہ مان لیا تھا وہ باتیں بہت
رتا تھا۔ پر تھا بڑا بے وقوف۔ ایک رات سبھی بندر جنگل
ا ایک جھیل کے کنارے سوئے ہوئے تھے۔ آدھی رات کو
ان بندروں نے ایک دوسرے کو اٹھایا جھیل میں چاند کا عکس
دیکھ کر ان لوگوں نے سمجھا کر چاند جھیل میں گر گیا ہے یہ پانی
میں ڈوب جائے گا۔ ان کے راجہ نے کہا ہم لوگ بندروں کی
ایک زنجیر بنالیں اور اسے پانی سے باہر کھینچ لیں۔ ان بندروں
نے کہا آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ ہم لوگ چاند کو بچائیں گے جوان
بندر کے راجہ نے چاروں طرف دیکھا جھیل کے کنارے ایک
بہت بڑا درخت تھا۔ اس کی ایک شاخ جھیل کے اوپر آگئی
تھی۔ جوان بندر ایک ایک کر کے اس درخت پر چڑھ گئے۔
ایک دوسرے سے مل کر بندروں کی ایک زنجیر بنائی۔
ان کا راجہ سب سے آخر میں تھا۔ اس نے اپنا ہاتھ چاند کو
پانی سے نکالنے کے لئے باہر کیا۔ اتنے میں شاخ ٹوٹ گئی
سبھی بندر جھیل میں گر گئے۔ وہ پانی سے نہیں نکل سکے
لگے چیخنے چلانے۔ ان کی چیخ پکار نے بوڑھے بندروں کو
جگا دیا۔ وہ جھیل کے کنارے پر آئے اور ان جوان بندروں کو

آسمان پر بادل چھا گئے تھے۔ اس لیے پانی میں چاند کا عکس
نہیں نظر آتا تھا، بوڑھے بندروں کے راجا نے سب بندروں
کی گنتی کی اور جوان بندروں سے کہا "مجھے تمہارا راجا چاند
کے ساتھ ڈوب گیا مجھے بہت افسوس ہے۔

عشرت جہاں اکبر پور (انگریزی سے اپنایا)

سب ہی بہرے :-

کام کرنے والے :-

لالاجی -

لالائن - لالاجی کی بیوی -

ہریش - لالاجی کا لڑکا -

بھولا - لالاجی کا نوکر -

• پردہ اٹھتا ہے "

(صبح کا وقت۔ ایک بڑے کمرے میں لالاجی خالی
دھوتی باندھے کھری چارپائی پر بیٹھے ہیں تھوڑی ہی دور
پر ایک چارپائی اور بچھی ہے۔ اس پر لالائن بیٹھی ہوئی لالاجی
کی قمیص میں بٹن لگا رہی ہیں)

لالاجی (زور سے چلا کر) بٹن بعد میں لگانا۔ پہلے
مجھے چائے تو پلا دو۔ بڑی دیر ہو جائے گی۔ دکان کو "
(پھر چلا کر) ارے سنتی ہو ---" میں چائے مانگ رہا ہوں۔
چائے ...

لالائن (چلا کر) "کیا عقل کے ساتھ آنکھیں بھی چلی

پھر بھی گدھوں کی طرح چیخ رہے ہو... جیسے میں کوئی بہری
ہو گئی ہوں... اتنی جلدی کاہے کی ہے۔ کیا ڈاکا ڈالنے کو نکلے
ہی جاؤ گے... (بڑبڑاتے ہوئے) بھگوان اس دھوبی کو
جلدی ہی دنیا سے ناپید کردے... ہر دفعہ کلموا... بٹن ہی
توڑ لاتا ہے... اب کی آئے کپڑے لینے... اگر پیسوں کے
نام پہ جھاڑو ہی نہ پھیری ہو... تو میں بھی آج سے...
(اتنے میں بھولا گھبرایا ہوا کمرے میں داخل ہوتا ہے)
بھولا:۔ (ہانپتے ہوئے) سیٹھانی جی (لالاین) گجب
(غضب) ہو گیا... گائے کھونٹے سے رسّی تڑا کر غسل خانے
کی دیوار پر چڑھ گئی ہے... توبہ... توبہ... کیا منھ سے
نکل گیا (دونوں ہاتھوں سے اپنا منھ پیٹتا ہے)... سیٹھانی
جی۔ گائے کھونٹے سے رسّی تڑا کر غسل خانے میں گھس
گئی ہے۔ میں نے اس کو (گائے کو) نکالنے کی بہت کوشش کی۔
... مگر سیٹھانی جی وہ تو غسل خانے میں بری طرح پھنس گئی
ہے۔ بات یہ ہے... سیٹھانی جی غسل خانے کا دروازہ
چھوٹا ہے... اور گائے کا باہر نکلنا بہت مشکل ہے —
آپ جلدی ہی کوئی ترکیب کیجیے... ورنہ بے چاری کا دم ہی
نکل جائے گا۔
لالاین:۔ (چلّاکر) اے سنتے ہو... پڑوس کے غسل خانے
کی دیوار گر گئی ہے... اور اس کی بیوی شانتی دب کر مر گئی
ہے۔ (بڑبڑاتے ہوئے) "ہائے رام یہ تو بڑا ہی گجب
(غضب) ہو گیا... ابھی بے چاری کی عمر ہی کیا تھی دو تین
چھوٹے چھوٹے بچے ہیں... سب بھگوان کی مایا ہے۔"

صبح پڑوسی کو کوس رہی ہو۔ کیوں بڑھاپے میں پاپ کر
ہو... بھگوان سے ڈرو... بھگوان سے۔ ایسا پڑوسی
چراغ لے کر ڈھونڈنے پر بھی ملنا بہت مشکل ہے...
ذرا جلدی سے چائے تو لے آؤ... یا اسی طرح پلنگ
بیٹھی ٹراتی رہوگی۔
بھولا:۔ (ہاتھ ہلاکر) سرکار، سبزی کو ماریے گولی
اگر دو گھنٹے بعد بھی آئی تو کون سا فرق پڑتا ہے...
گائے تو سرکار... سیکڑوں روپیوں کی ہے...
اگر آپ نہیں مانتے تو میں بازار چلا جاتا ہوں...
سرکار... ذرا گائے کی بھی خیر ---
لالاجی:۔ (چلّاکر) حرام خور... نمک حرام...
سامنے میری برائیاں کر رہا ہے... چل...
دفان ہو جا... میری نظروں کے سامنے سے...
اگر دوبارہ اس گھر میں قدم بھی رکھا تو... ٹا
دوں گا ---
بھولا:۔ سرکار... آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں
کہیں برسات میں بھی گوبھی ملتی ہے... آج کل
بھنڈی اور لوکی کے کچھ نہیں مل سکتا۔
اگر مل گیا تو ضرور لیتا آؤں گا...
(بھولا بڑبڑاتا ہوا کمرے سے نکل جاتا ہے)
لالاجی:۔ (غصّے سے) اور تم بھی کان کھول کر
اگر تم نے اس بھولا کے بچے کو گھر میں قدم رکھنے
نہیں ہوگا... اچھا جلدی جاکر چائے لے آ

آدھی ملاقات

ترمہ آصفہ مجیب :-
سالنامہ پڑھ رہی ہوں ب
ت ہی اچھا ہے۔ نوع بہ نوع مضامین
یک گلدستہ سجا ہوا ہے۔ میں آپ
مبارک باد دیتی ہوں۔
ب رام لال لکھنؤ
سالنامہ پیام تعلیم رجسٹری سے
مول ہوا۔ بچوں کو آپ نے نئے سال
ک بیش بہا تحفہ دیا ہے۔ مبارک
!
ب علقمہ شبلی کلکتہ :-
سالنامہ آپ کے ذوقِ انتخاب
ب کی اچھی مثال ہے۔ خوب سے
بہتر کی گنجایش تو بہرحال ہے مگر
درت موجودہ بھی یہ بہتوں کے لیے
ث رشک ہوگا۔ بچوں کے رسایل
س کی انفرادیت سے کون انکار
سکتا ہے؟
ب رضوان احمد صاحب ایڈیٹر زیور پٹنہ
اس بار سالنامہ بہت ہی شاندار
ہے۔ مصروفیت کے باعث ابھی پورا
ہیں سکا ہوں، جتنی چیزیں پڑھی
ن میں رام لال کی کہانی "انکل جولی"
عثمانی کی ترجمہ کی ہوئی کہانی "دو دوست"
"اور اقبال متین کی کہانی "ایک سرائی
مانی" نے بہت متاثر کیا۔ "امریکہ کا

ہی معلوماتی ہیں۔ مزاحیہ تخلیقات
میں یوسف ناظم کا انشائیہ "کچھ نہ کچھ
پالنا چاہیئے" بہت کامیاب ہے۔
ان کا انداز بہت پیارا ہے۔ بڑے
اچھے انداز میں تمام جانوروں اور
چڑیوں کا تعارف کرایا ہے ــــ
ایک ساتھ دو فایدے۔ معلومات
میں اضافہ بھی اور مزاح کی چاشنی
بھی۔ علقمہ شبلی، حرمت الاکرام اور
کیف احمد صدیقی کی نظمیں بہت جاندار
ہیں۔ گویا ۱۷۶ صفحات میں دلچسپ
معلومات طنز و مزاح کا خزانہ موجود
ہے۔ اتنا اچھا سالنامہ شایع کرنے
پر جانب سے دلی مبارکباد قبول
فرمایئے۔
جناب واحد پریمی :-
"پیام تعلیم" کا سالنامہ ملا۔
نوازشِ خاص کا دلی شکریہ! یہ
سالنامہ بھی "پیام تعلیم" کے گذشتہ
خاص نمبروں کے سالناموں کی طرح
شاندار اور معیاری ہے۔ تقریباً تمام
مضامین نثر و نظم جاذبِ نظر اور دل
کش ہیں۔ میری طرف سے اس شاندار
سالنامے کی اشاعت پر دلی مبارک
باد قبول فرمایئے اور نیک خواہشات
بھی ــــ ناچیز کی تصویر اور نظم

قبول فرمایئے۔ آخری شعر کا مصرعہ اولیٰ
اس طرح چھپ گیا ہے ع
بعد میں کچھ نہیں واحد پہلے
جب کہ یہ مصرعہ اس طرح ہے ع
بعد میں کچھ "بنیں" واحد پہلے
یعنی "نہیں" کی جگہ "بنیں" ہے۔ براہ کرم
تصحیح فرمادیں۔ کرم ہوگا۔ خدا کرے آپ
مع بخیر ہوں۔
جناب شاہد علی خان انچارج شاخ مکتبہ بمبئی
ابھی ابھی "پیام تعلیم" کا سالنامہ ملا۔
سارے کام چھوڑ کر پہلے "پیام تعلیم" کے
ایک ایک ورق پر نظر ڈالی۔ سالنامہ واقعی
خوب ہے۔ بچوں کے پرچے کے لیے ایسے
بڑے بڑے ادیبوں کی خدمات حاصل کرنا
معمولی بات نہیں۔ آپ کے سالنامے میں
کچھ ادیب تو ایسے ہیں جو معاوضہ لے کر بھی
نہیں لکھتے۔ ہماری طرف سے دلی مبارکباد
قبول کیجیے۔
جناب ناوک حمزہ پوری
"پیام تعلیم" کا سالنامہ ملا۔ ہندوستان
سے بچوں کے لیے نکلنے والے پرچوں میں
پیام تعلیم اپنی خوبیوں کے لحاظ سے بہت
بہتر ہے۔ بہترین قلمکاروں کی شمولیت کے
قطع نظر دوسرے لوگوں کی بھی جو چیزیں
اس میں چھپتی ہیں اکثر رسایل ان سے خالی
نظر آتے ہیں۔ کتابت و طباعت کی صفائی
ستھرائی کا کیا کہنا، سبحان اللہ۔
جناب انجم اشرفی :-
تین دن تک مکتبہ کا چکر لگایا تب
کہیں جاکر تیسرے دن ۳۱ر دسمبر کو گوہر
مقصود ہاتھ آیا۔ سالنامہ بغل میں مار

پر نظر پڑتے ہی رعنا صاحبہ نے نعرہ لگایا
" آہا سالنامہ آگیا" حسنین صاحب کیوں
پیچھے رہتے، فلسفیانہ انداز میں فرمایا۔
اب بھی کیوں نہ آتا۔ میں نے کہا سالنامہ
میں لے کر دفتر جاؤں گا۔ وقت ملنے پر
مطالعہ کروں گا۔ رعنا کا کہنا تھا کہ بس
ایک کہانی نیلم اور فرخ کی پڑھتے دیں آخر
ترس آگیا۔ اپنی بے چینی کو دبایا اور سالنامہ
ان لوگوں کے ہاتھوں میں دے آیا۔ رات
میں گھر واپس آیا تو پتہ چلا کہ سالنامہ
کے پیچھے چھینا جھپٹی کی نوبت ہوئی۔
غرض رات کو گیارہ بجے سالنامہ
میرے ہاتھ آیا اور جب تک آنکھوں کا
احتجاج اپنی آخری حد کو نہ پہنچ گیا وہ
آنکھوں سے لگا رہا۔

اپنی رائے کیا دوں۔ اس بار کے
سالنامہ کا پچھلے سالناموں سے مقابلہ
کرتا ہوں تو یہی کہنا پڑتا ہے کہ اگر پچھلے
سالنامے گلستانِ ادب کے حسین اور
خوشبودار پھولوں کا ایسا خوبصورت
گلدستہ تھے جنھیں بہت عمدہ گلدانوں میں
سجا کر ان کے حسن کو چار چاند لگائے گئے
تھے تو اس بار کا سالنامہ ایسا گلدستہ
ہے جس کی خوبصورتی کو گلدان کی بدصورتی
سے گہن لگا ہے۔

مگر آپ کی مجبوری اور اردو والوں
کی بے حسی کو جانتا ہوں۔ اس لیے یہی
کہوں گا کہ ان حالات میں سالنامہ نکالنا
ہی معجزہ تھا اور آپ نے نہ صرف سالنامہ
نکالا بلکہ اپنی روایات کو قایم رکھا اور
آگے بڑھایا۔ بڑے نام ہوں یا چھوٹے
نام، تخلیقات کی بیشتر تعداد عمدہ ہے

جولی" اور حمید عثمانی صاحب کی ترجمہ
کردہ کہانی "دوسری ماں" نے متاثر
کیا تو محترمہ رضیہ سجاد ظہیر کی "صبر
شہزادہ" نے محظوظ۔ سائنسی
مضامین میں خالد عرفان صاحب کا
مضمون سرفہرست ہے محترم ابو تمیم
صاحب اور جناب یوسف ناظم کے
ہلکے پھلکے مزاحیہ مضامین بہت
پسند آئے۔

نئے سال پر سبھی نظمیں خوب ہیں۔
دوسری نظموں میں "آدابِ گفتگو"
پسند آئی۔

مہر دردلوی تھانہ (بمبئی) :۔
پیام تعلیم کا شاہکار سالنامہ
۱۹۷۰ء نظر نواز ہوا۔ دل باغ باغ
ہوگیا۔ سرورق سادہ مگر دیدہ زیب،
تصاویر دل کش اور مضامین و نظم و
نثر معیاری، دلچسپ معلوماتی ہیں۔
ملک کے مقتدر، بلند پایہ اور مقبول
شعراء اور ادباء کی بزم سالنامے میں
شرکت ہی اس کی کامیابی اور مقبولیت
کی دلیل ہے۔

جناب مناظر عاشق ہرگانوی :۔
نئے سال کا تحفہ "پیام تعلیم"
کے سالنامہ کی شکل میں پاکر جی خوش
ہوگیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کا
دعویٰ بہت حد تک سچ ثابت ہوا۔
سالنامہ کے سلسلے میں آپ نے جس
انفرادیت کا اعلان کیا تھا، اس کا
عملی روپ نکھرا، ستھرا، معلوماتی اور
بہ لحاظ مجموعی پہلے سبھی سالنامے سے
کہیں زیادہ معیاری اور تخلیقی میرے

سے لطف اندوز ہو رہا ہوں اور
محسوس کر رہا ہوں۔ اس کامیاب
کش پر میری طرف سے دلی مبا
فرمائیں۔

جناب محمد انوار عالم شمسی بہار شر
رسالے کو روز بروز بہتر
بنانے کے لیے آپ کی کوششیں
تعریف و توصیف کی مستحق ہیں۔
رسائل کی اس ناقدری کے دو
پر شکوہ خاص نمبر نکالنا آپ ہی
ہے۔

جناب بدر وفا شیدائی۔ سہسرا
سالنامہ ۱۹۶۹ء اپنے
میں وہ ساری خوبیاں سمیٹے ہو
جس کی توقع اس سے کی جا سک
شروع سے لے کر آخر تک تمام
پڑھ ڈالا۔ تمام مضمون نگار حضر
باد کے لایق ہیں۔ جنھوں نے بہت
نظمیں، معلوماتی مضامین سپرد
جناب شکیل جاوید دامرو
پیام تعلیم کا سالنا
شکریہ!

اس بار سالنامہ اپنی سابقہ
سے ایک دم مختلف ہے پہلی
یہ کہ سیٹنگ میں عجیب کھچڑی
گئی ہے۔ دوسری بار پرچے
طباعت ٹھیک نہیں مصورہ
بھی کیا مذاق فرمایا ہے۔ آپ کے
بڑی سہولت بخش جگہ میں کسی
نہیں رونا چاہیے۔ اچھے سے
کا تعاون آپ کو مل سکتا ہے
سالنامہ ہونے پر بھی تصویر

ادھر ادھر

صحافی

[ل]ینن کی ایک انوکھی یادگار:۔

لینن ۱۸۷۰ء میں پیدا ہوئے تھے اور اب ۱۹۷۰ء
[...]ں ان کی پیدائش کی تقریب بڑے اہتمام سے مختلف طریقوں
[...]ے منائی جا رہی ہے۔ مولداویا کے ماہرین جنگلات نے
[...]ے پہاڑی کی ڈھلان پر اس انداز سے درخت اگائے
[...] کہ اسے وی۔ آئی۔ لینن کی شبیہ بنتی ہے۔ اس انقلابی
[...]ما کی یہ انوکھی شبیہ پورے ایک ہکٹر کے رقبے پر پھیلی ہوئی
[...] اور سدا بہار سرو کے کئی ہزار پودے لگا کر بنائی گئی
[...]۔ شبیہ کے نیچے پودوں سے ہی "۱۸۷۰ - ۱۹۷۰ء" کے
[...]ے بنائے گئے ہیں۔ وی۔ آئی۔ لینن کی جیتی جاتی
[...]ر پہچانی کیشینف سڑک پر ہے۔ یہ یادگار ان متعدد
[...]اروں میں شامل ہے جو مولداویا کے ماہرین جنگلات
[...]ین کے سوسالہ جشن سالگرہ کے سلسلہ میں قایم کی
[...]۔ اس مقام سے کچھ ہی فاصلہ پر انھوں نے صنوبر کے
[...]ں کی مدد سے "لینن ۔ ۱۰۰" کے الفاظ لکھے ہیں۔
[...]ت ۲۵ میٹر اونچے ہیں۔ انھی ماہرین نے مختلف
[...]م کے درختوں کی مدد سے "سوویت یونین کا سرکاری
[...] بنایا ہے۔ جو بہت بڑے رقبہ پر پھیلا ہوا ہے۔

(تاس)

[ہند]وستانی لڑکی نے جرمنی کے ماہرین ریاضی کو اچنبھے [میں ڈ]ال دیا۔ بنگلور کی شریمتی شکنتلا دیوی نے وفاقی جمہوریہ جرمنی کی بڑی بڑی یونی ورسٹیوں کے پروفیسروں اور ماہرین حساب و ریاضی کے چھکے چھڑا دیے ہیں اور ان کی گراں بہا کمپیٹر مشینوں کو مات کر دکھایا ہے۔ اسٹوٹگارٹ یونیورسٹی کے پروفیسروں اور طالب علموں نے مل جل کر مس شکنتلا دیوی کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی تو وہ ان کی تیزی اور ذہانت کو دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ پیچیدہ سوالات جو علم ریاضی کے ان ماہروں نے لکھ لکھ کر آدھے گھنٹے میں تیار کیے تھے وہ شکنتلا دیوی نے چند سیکنڈوں میں زبانی حل کر دیئے۔ ڈیملر بینز کمپنی کے موٹری میوزیم میں جب اس کارخانے کے ماہرین ریاضی نے بعض مشکل مسئلوں کے حل میں اس کی ایک غلطی پکڑنے کی کوشش کی تو انھیں منھ کی کھانی پڑی۔ جیسے ہی یہ لوگ وہ سوال جنھیں گراں بہا کمپیوٹروں کی مدد سے تیار کرواتے تھے تختۂ سیاہ پر لکھتے شکنتلا دیوی جھٹ سے ان کا جواب نکال دیتیں۔ حالاں کہ ان میں سے بیشتر سوالات میں پندرہ سے لے کر بیس عددوں والی رقمیں بھی شامل ہوتی تھیں۔ وفاقی جمہوریۂ جرمنی میں آنے سے پہلے ہندوستان کی یہ ہونہار لڑکی دوسرے ملکوں میں بھی اپنی ناقابلِ یقین صلاحیتوں کے جوہر دکھا چکی ہے۔ جب کبھی بھی کسی صاحب علم و ہنر نے اس کا سبب معلوم کرنے کی کوشش کی تو اس لڑکی نے ہمیشہ اسے "خدا کی دین" بتایا ہے۔

اطلاعات جرمنی

نیند لانے والی مشین :-

بے خوابی کے مریضوں کے لیے روس کے سائنس دانوں نے ایک مشین ایجاد کی ہے۔ یہ مشین لندن کے سوویت تجارتی میلے میں لائی گئی ہے۔ یہ مشین خواب آور دوائیوں کے استعمال کے بغیر ہی نیند لاتی ہے۔ میلے میں آنے والی ایک عورت نے اس مشین کو آزمانے کی خواہش ظاہر کی۔ پہلے اس کا طبی معائنہ کیا گیا۔ شبہ تھا کہ اس پر نیند لانے والا عمل اثر انداز نہیں ہوتا لیکن جب "الیکٹروسون" کا عمل چھ، سات منٹ تک جاری رہا تو وہ آرام سے سو گئی وہاں تماشائیوں کو اس پر بے حد حیرت اور مسرت ہوئی اس تجربے سے عین پہلے، شدتِ جذبات کی وجہ سے مریضہ کے دل کی دھڑکن بڑھ کر ۱۴۰ ہو گئی جب مشین کے نیند لانے والے عمل کا اثر ظاہر ہونے لگا تو اس کی نبض کی رفتار گھٹ کر ۱۰۰، ۱۱۰ رہ گئی۔ سوویت ڈاکٹروں نے اس مشین کو اعصابی خلل، تھکن اور بے خوابی کے شکار مریضوں کے علاج کے لیے بہت مفید پایا ہے۔

ٹیلیفون کرنے کا شوقین ہاتھی :-

اسٹوٹگارٹ (ڈاڈ) مغربی جرمنی کے شہر اسٹوٹگارٹ کے چڑیا گھر "سولہما" کا یہ ٹیلی فون اصل میں ہاتھیوں کے چوکیدار کی سہولت کے لیے لگایا گیا تھا۔ ریسیور اٹھانے پر ایکسچینج میں بتی جل جاتی ہے جب پہلی مرتبہ ایکسچینج کی نگران عورت نے بتی جلتی دیکھ کر اپنا ریسیور اٹھایا تو وہ دوسرے کنارے پر سانسوں کی بھاری آواز سن کر بڑی گھبرائی۔ جب دوسری مرتبہ بجی تھی ماہر ابھی آیا تو اس بحال کرنے والوں کو خبر دی مگر ٹیکنیشین کے ٹیلی فون کرنے کے آرزومند "میسور" نامی ایک بچے نے جھلا کر کہ کوئی اس کی بات نہیں سنتا اپنے ٹیلیفون ہی توڑ ڈالا۔ ایک دوسرے ٹیلی ساتھ بھی جسے اخباری نامہ نگاروں نے تماشا خاطر میں لگایا تھا چند منٹوں بعد یہی معاملہ پیش آیا۔ "میسور" غالباً دنیا کا سب سے پہلا ہاتھی ہے جس نے ٹیلی فون کے ذریعے دوسروں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی ہے۔

برلن کے پولیس کے کتوں کی گیند بازی

کتوں کے ذریعے مجرموں کا پتہ لگانے کا رواج بہت پرانا رہا ہے۔ خود ہندوستان کے بڑے شہروں میں اسے اختیار کیا گیا۔ مغربی برلن کے محکمۂ پولیس کے سراغرساں کتوں کو مجرموں کا تعاقب کرنے کے علاوہ گیند کھیلنے کا بھی شوق ہے۔ تفریحی جلسوں میں ان کے میچوں کو بہت پسند کیا جاتا ہے۔ مغربی برلن کے شہریوں کو ان سے ایک خاص لگاؤ ہے۔ ابھی پچھلے دنوں چھ چھ کتوں کی دو ٹیموں نے ان کے سامنے گیند بازی کا میچ کھیل کر خوب تالیاں وصول کیں۔ ان مشاق کھلاڑیوں کے منہ پر جالیاں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ناکیں بڑی ہی نازک ہوتی ہیں۔ انھیں میچ کی افراتفری میں چوٹ لگ جانے کا خطرہ لاحق رہتا ہے۔ اس ڈر سے کہ کہیں کوئی کتا ان مقابلوں میں زخمی نہ ہو جائے۔ (تصویریں ٹائٹل کے صفحہ ۲ پر دیکھیے)

. D. 1457 FEBRUARY 1970

Payam - i - Taleem

NEW DELHI-25.

اِن کتابوں کو اپنی لائبریری کی زینت بنائیے

کوٹ دادا	۱/۷۵	دہلی	۱/۵۰
سمندر کے نیچے	۲/۰۰	ہماری پارلیمنٹ	۱/۵۰
سمندر کے کنارے	۱/۱۲	برف کا گھر	۰/۸۷
میرانیس	۱/۲۵	برف کے تیرتے پہاڑ	۰/۳۷
میر تقی میر	۱/۰۰	آستین کا سانپ	۰/۵۰
اتو خاں کی بکری	۲/۵۰	اُلٹی دوا	۰/۵۰
انوکھا عجائب خانہ (مکمل)	۱/۶۰	بادشاہ کے کپڑے	۰/۵۰
تین اناڑی	۱/۴۰	زمین کی گردش	۰/۵۰
ستاروں کی سیر	۱/۷۵	سونے کی چڑیا	۱/۰۰
خرگوش کا سپنا	۰/۷۵	چمپاوت کا آدم خور شیر	۰/۳۵
جن حسن عبدالرحمن (مکمل)	۴/۰۰	ایک ٹانگ کا بادشاہ	۰/۳۰
آدمی کی کہانی	۱/۲۵	انوکھی ملاقات	۰/۲۵
بڑے دادا کی کہانی	۰/۵۶	جلّو مُرغابی	۱/—
چٹانوں کی کہانی	۱/۷۵	گُلابو چوھیا	۰/۴۵
دادا نہرو	۱/۵۰	ظالم کسان	۰/۲۵

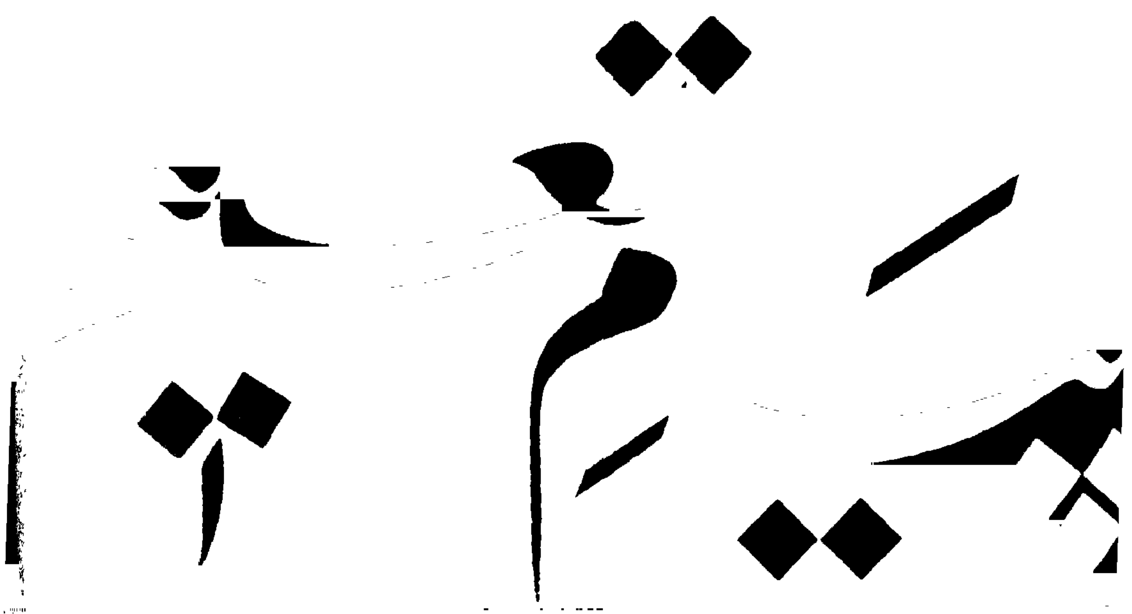
ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار، دہلی ۶

صرف نیشنل فائن پریس دہلی میں طبع ہوا



اِن کتابوں کو اپنی لائبریری کی زینت بنائیے

کوے دادا	۱/۷۵	دہلی	۱/۵۰
سمندر کے نیچے	۲/-	ہماری پارلیمنٹ	۱/۵۰
سمندر کے کنارے	۱/۱۲	برف کا گھر	۰/۸۷
میرانیس	۱/۲۵	برف کے تیرتے پہاڑ	۰/۳۷
میر تقی میر	۱/-	آستین کا سانپ	۰/۵۰
اَبّو خاں کی بکری	۲/۵۰	اُلٹی دوا	۰/۵۰
انوکھا عجائب خانہ (مکمل)	۱/۸۰	بادشاہ کے کپڑے	۰/۵۰
تین اناڑی	۱/۴۰	زمین کی گردش	۰/۵۰
ستاروں کی سیر	۱/۷۵	سونے کی چڑیا	۱/-
خرگوش کا سپنا	۱/۷۵	چمپاوت کا آدم خور شیر	۰/۳۵
جن حسن عبد الرحمٰن (مکمل)	۴/-	ایک ٹانگ کا بادشاہ	۰/۳۰
آدمی کی کہانی	۱/۲۵	انوکھی ملاقات	۰/۳۵
بڑے دادا کی کہانی	۰/۵۶	جلو مُرغابی	۱/-
چٹانوں کی کہانی	۱/۷۵	گُلّابو جھیّا	۰/۴۵
دادا نہرو	۱/۵۰	ظالم کسان	۰/۳۵

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار، دہلی ۶

ریاستہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں و کشمیر کے تعلیمی اداروں
کے لیے منظور شدہ

پیام تعلیم

نئی دہلی

ایڈیٹر
محمد حسین حسان ندوی

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی ۶
شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳
شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

قیمت فی پرچہ … پیسے　　سالانہ ۶ روپے

فہرست

فارم IV　　　حسب قاعدہ بابت　　　پیام تعلیم

۱ مقام اشاعت		جامعہ نگر نئی دہلی
۲ وقفہ اشاعت		ماہنامہ
۳ پرنٹر کا نام	سیّد احمد ولی	قومیت :- ہندوستانی
۴ پبلشر کا نام	سیّد احمد ولی	قومیت ہندوستانی
		پتہ جامعہ نگر نئی دہلی
۵ ایڈیٹر کا نام	محمد حسین حسان	قومیت :- ہندوستانی
		پتہ :- جامعہ نگر نئی دہلی
۶ مالکان کے نام و پتے :-	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی۔	چیرمین پروفیسر محمد مجیب
		پتہ :- جامعہ نگر نئی دہلی

ڈائرکٹرز　۱۔ سید مجتبیٰ حسین زیدی، جامعہ نگر، نئی دہلی

۲۔ ڈاکٹر عبدالعلیم مسلم یونیورسٹی - علی گڑھ

۳۔ مسٹر ایم آر جناے نہر بلڈنگ۔ چوپاٹی، بمبئی

۴۔ ہز ہائی نس نواب اقبال محمد خاں آف پالن پور۔ کف پریڈ، کولابہ بمبئی۔

۵۔ کرنل بشیر حسین زیدی ایم پی ڈاکٹر راجندر پرشاد روڈ نئی دہلی

۶۔ ضیاء الحسن فاروقی، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

کمپنی کے سرمایہ کے ۱ فیصدی سے زیادہ کے حصے دار

جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر نئی دہلی

اسلام جیم خانہ۔ کینیڈی سی فیس بمبئی

میں سیّد احمد ولی تصدیق کرتا ہوں کہ مذکورہ بالا اطلاعات میرے علم و یقین کے مطابق درست ہیں۔

۲۸ فروری ۱۹۷۰ء　　　دستخط احمد ولی

پبلشر

بچوں سے باتیں

فروری کے پہلے ہفتے میں ہمارے ایک پرانے ساتھی جناب عتیق صاحب ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ کئی مہینے پہلے دل کا دورہ پڑا تھا اور اچھے ہو گئے تھے مگر اس مرتبہ یہ اتنا سخت تھا کہ جان ہی لے کر ٹلا۔

عتیق صاحب مدرسہ ابتدائی جامعہ کے نگران تھے۔ مزید تعلیم کے لیے لندن تشریف لے گئے۔ کچھ ایسی صورتیں پیش آئیں کہ وہیں رہ پڑے۔ لندن کے ایک اسکول میں استاد ہو گئے۔ ایک سال بعد ہندوستان واپس آنے کا خیال تھا کہ یہ ناگہانی حادثہ پیش آیا۔

مرحوم بہت اچھے استاد تھے۔ بہت اچھی انتظامی صلاحیت رکھتے تھے۔ بہت با اصول تھے۔ ساتھ ہی ساتھ بہت نیک، شریف، مخلص اور ہم درد تھے۔ دوستوں سے، عزیزوں اور رشتہ داروں سے گہرا لگاؤ رکھتے تھے۔ اسی لیے جامعہ میں اس خبر نے بہت سے دلوں کو ہلا دیا۔ ان کی میت لندن سے جامعہ لائی گئی اور یہیں تجہیز و تکفین ہوئی۔ خدا ان کے ہونہار صاحبزادے آفاق سلمہٗ صاحبزادی شعلہ سلمہا سوگوار بیوہ محترمہ مشیر فاطمہ نگران نرسری اسکول جامعہ اور دوسرے عزیزوں کو صبر کی توفیق دے اور مرحوم کی مغفرت فرمائے آمین۔

سالنامے کے سلسلے میں خط برابر آرہے ہیں۔ اس مرتبہ بزرگوں/بڑے پیامیوں کے ساتھ ہمارے چھوٹے پیامیوں نے سالنامے کو بہت پسند کیا ہے اور یہ ہمارے لیے بڑی خوشی کی بات ہے۔

آپ کا "پیام تعلیم" خدا کے فضل سے سارے ہندوستان میں جاتا ہے۔ پڑھنے والوں کے اتنے بڑے حلقے میں ظاہر ہے کہ سب کی پسند ایک سی نہیں ہو سکتی۔ پھر بھی مجموعی حیثیت سے پرچے کو سب نے پسند کیا۔ بہت پسند کیا۔

اس پرچے میں ہمارے ننھے پیامی نرسری کے پیارے پیارے گیت مزے لے لے کر پڑھیں۔ محمد یوسف صاحب پاپا نے ہمیں بہت سے گیت مرحمت فرمائے ہیں۔ یہ انھوں نے خاص طور پر ننھے پیامیوں کے لیے لکھے ہیں۔

ابو تمیم صاحب کے مضمون کی آخری قسط شائع ہو رہی ہے۔ پیامیوں نے اسے غیر معمولی طور پر پسند کیا۔ کیوں نہ ہو۔ ابو تمیم صاحب کی لکھی ہوئی انوکھی داستان ہے۔ اس میں اڈوینچر، ہلکا ہلکا مذاق یا مزاح بھی ہے اور بھئی دلی کی نکھری ستھری زبان ہے۔ پڑھیے مزے لیجیے۔

اولوجیب اور اب ''؟ یہ مضمون ہم نے پیام تعلیم پڑھنے والی بچیوں کے لیے خاص طور سے لکھوایا ہے اور بچیوں نے اسے بہت پسند بھی کیا ہے۔ مضمون جوں جوں آگے بڑھے گا۔ دلچسپی بڑھتی جائے گی۔

انوکھے کیڑے معلوماتی مضمون ہے۔ خواجہ معین الدین صاحب نے بہت سادہ زبان میں اور دلچسپ انداز میں لکھنے کی کوشش کی ہے۔ پیامیوں کو پسند آئے گا۔ جمشید اشرف کا مضمون مانگے کا گھونسلا ایک بھی بہت مزے دار اور دلچسپ ہے۔

اس مرتبہ جاسوسی کہانی (خطرناک گروہ) بھی پڑھیے۔ کہانی لمبی ہے، دوسری قسط اپریل کے پرچے میں شائع ہوگی۔ ہاں ایک مضمون شیر بھی ہے۔ یہ لطیف اعظمی صاحب نے مرحمت فرمایا ہے۔ اور وعدہ کیا ہے کہ ہر مہینے کسی نہ کسی جانور پر مضمون مرحمت فرمائیں گے۔

اس مہینے برادرم آفاق احمد (کارکن مکتبہ) نے دو اور آزاد بارانوی صاحب اور مکتبے کے سابق کارکن برادرم اسرار ندوی صاحب نے ایک ایک خریدار مرحمت فرمایا۔ شفق سہسرامی صاحب نے سہسرام کے ایک ایجنٹ (اس۔ ام یاسین) کو پیام تعلیم کے پرچے بھجوائے۔ ان کے علاوہ احمدیہ لائبریری گوریے گاؤں (کلابہ) شفاعت احمد خاں موائی (بارہ بنکی) عبدالستار صاحب (بنگلور) گورنمنٹ اپر پرائمری اسکول جگتیال (کریم نگر) اینگلو اردو ہائی اسکول بارسی تاکلی (کوشہ) ملت ہائی اسکول سہسرام میں ساجدہ نور اللہ (میسور) مس عذرا اپر پرائمری اسکول ڈن ڈیلی (میسور) عبداللہ محمد اسحاق مانوت (بمبئی) مس مجیدہ آرسے ہگی (د... حاجی عبدالرحمن پھور (جلگاؤں) سجاد حسین ناگپور مدرسہ ابتدائی عبدالمتین لداخی مدرسہ ابتدائی خو

معمول کے مطابق اس سال بھی جامعہ میں بالچوں کی شو دن بہت اہتمام سے منایا گیا۔ ایکے اس کا انتظام مد کے سپرد تھا۔ ثانوی کے طالب علموں اور استادوں نے بہت بہت خوش اسلوبی سے یہ تقریب منائی۔ خان عبدا صاحب بھی اس تقریب میں شریک تھے۔ خاں صاحب کے مناسب بہت اچھی تقریر کی۔ اور اس لحاظ سے ا تاریخی حیثیت حاصل کرلی، مدرسے کے نگران، استاد اس کامیابی پر دلی مبارک باد کے مستحق ہیں۔

برادرم اجتباء ندوی (استاد عربی مدر کو اچانک ایک دردناک حادثہ پیش آگیا دو برس کا ہنستا کھیلتا۔ بات کہتے میں اللہ کو پیارا ہوگیا۔ بڑا خو بہت چونچال بچہ تھا۔ تندرستی بھی اچھی تھی۔ خدا غم زدہ باپ کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

خلیق انجم اشرفی صاحب کو پیام تعلیم کے پرچوں کی ضرورت تھی مل چکے ہیں اب کوئی صاحب



جناب محمد یوسف پاپا [illegible]

بھالو آیا رے

(ننھے منھے بچوں کے لیے مزے مزے کے نرسری گیت)

چم چم چمبل، اوڑھے کمبل، بھالو آیا رے
چھن من بھالو آیا رے
ناچ دکھاؤ ہم کو بھالو چم چم چم چم، چم چم چم چم
بھالو بھالو
موٹے آلو
نرم کچالو
بھالو نے سنی یہ بات تو خوب مزا آیا رے
چھن من بھالو آیا رے



چیتا آیا رے
بم بم پی کر، پہنے نیکر چیتا آیا رے
چھن من چیتا آیا رے
چیتے اپنے دانت دکھاؤ ہاؤ ہاؤ - ہاؤ ہاؤ
بچوں کو چکھو، مونچھ ہلاؤ ہاؤ ہاؤ - ہاؤ ہاؤ
چیتا چیتا
پانی پیتا
کھاٹ پہ لیٹا
چیتے نے سنی بات تو خوب مزا آیا رے
چھن من چیتا آیا رے

جناب سید ابو تمیم

لو، ہم چلے شیر کے شکار کو

(۳)

ہاتھی کا مہابت ہاتھی کی سونڈ کے سہارے سے مستک پر بیٹھا اور ہاتھی کی دم پکڑ کر بنگلے کا باورچی چڑھا۔ کسی نے اُسے دو ناشتے دان تھما دیئے۔ پنڈت جی کی گردن میں بجائے مالا کے تھرماس لٹک رہی تھی۔ ڈپٹی رینجر کے خاکی کوٹ کی تھیلا نما جیب میں دو لمبی ٹارچوں کے شیشے چمک رہے تھے۔

معاملہ مجھے دگرگوں معلوم ہوا۔ ہاتھی چلا، پیچھے نصف درجن افراد...... ان کے پیچھے وہی کمر توڑ ٹٹوانی — جسے میری سواری کا فخر حاصل ہوا تھا۔ اس کا سوار گیس کی لالٹین لیے ہوئے تھا اور اس کی پشت پر یعنی گھوڑی (یا گھوڑا، خدا معلوم کون سی جنس تھی وہ ذلیل) کے پٹھے پر ایک تھیلا بندھا ہوا جس میں یقیناً پتیلی اور برتن تھے، جو ٹٹوانی کی خراماں چال کے آغاز پر ہی ترانے گانے لگے۔

"بابا، کچھ بتاؤ — یہ یہ یعنی یہ اژدھام یعنی چہ — ؟"

غازی صاحب کو اب یقین ہو گیا ہو گا کہ میں ہاتھی کی پیٹھ سے کود کر فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گا۔ اس لیے بولے "یہ جنگل میں دورہ اسی شان سے ہوتا ہے۔"

اب میں گھنے جنگل کا، یا ہاتھی کی چال کے کمال کا ذکر نہیں کروں گا، جو جنگل کے بیچوں بیچ، بغیر کسی سڑک، راستہ، پگ ڈنڈی کے جھکے درختوں کی ٹہنیوں سے اور درختوں پر پھیلی ہوئی بیلوں سے بچتا کترا تا ہم



کو لیے جا رہا تھا۔ نہ میں مہابت کی تعریف کروں گا کہ وہ کس اس دو گز چکلے تین گز لمبے جانور کو اس طرح لیے جا رہا [illegible] طرح دریا میں لانچ جا رہا ہو، نہ کوئی جھٹکا نہ کوئی کھٹکا، نہ ہٹو بچو کا شور۔

سورج ڈوبا تو نہیں تھا، مگر اندھیرا ہو گیا تھا۔ ڈیڑھ گھنٹے کا یہ سفر ایسا گذرا جیسے گذرا ہی نہیں جس مچان سے ہم چڑھے تھے وہ نہ معلوم کس وقت ہاتھی کی پشت سے دی گئی تھی۔ جواب لگا دی گئی۔ غازی صاحب نے پیش قدمی کی، یعنی مجھے پھلانگ کر اترے میں بھی ڈرتا ڈرتا اترا ——— یہاں ایک جوہڑ تھا اور اس کے پاس درخت ——

سورج ڈوب چکا تھا۔ میں نے نماز پڑھنے کا ارادہ کیا۔ فوراً ایک چادر شاید اپنی کمر سے کھول کر بچھا دی۔

جب میں فارغ ہوا تو غازی صاحب — دس بارہ قدم کے فاصلے پر کھڑے ہوئے اپنے عملے کو

آہستہ آہستہ دے رہے تھے۔ اس آہستگی کو میں نے سمجھا کہ وہ میرے نماز پڑھنے کے احترام میں آہستہ بول رہے ہیں، کہا میاں تم عشاء بھی پڑھ لو۔"

"کیوں؟"

"پڑھ لو، ہرج ہی کیا ہے؟ مسافر ہو۔"

"واپس نہیں جانا؟"

غازی صاحب نے ڈپلومیسی برتی، کہا "جائیں گے۔ ابھی تھوڑی ......"

"آخر کب تک؟" مجھے اب دال میں کالا نظر آنے لگا۔

وہ بولے "اگر میں کہوں صبح تک ــــــ تو؟"

"تم کیوں کہو ایسی بے تکی بات۔ کیا اس غلیظ جوہڑ پر دھونی رمانے آئے ہو؟"

وہ بڑی متانت سے چلتے ہوئے میرے پاس آئے۔ آہستہ سے کہا "دیکھو مان جاؤ۔ عشاء کی نماز پڑھ لو، ورنہ میں ذمّہ دار نہیں؟"

"ذمہ داری کس بات کی؟"

"اس بات کی کہ تم عشاء کی نماز نہ پڑھ سکو۔"

میں کچھ نہ سمجھا، اتنے میں گیس کی لالٹین روشن ہو گئی۔ لیا، دیکھتا ہوں کہ چولہے تیار ہیں، آگ روشن ہو رہی ہے، ارا عملہ سٹر پٹر کر رہا ہے، پنڈت جی اپنے ڈپٹی کے کان میں کانا پھوسی کر رہے ہیں۔

"اگر تم کو یہاں رات گذارنی ہی ہے تو میں دو گھنٹے بعد عشاء ــــ گے"

"ایں؟" معاملہ الجھتا جا رہا ہے۔

"تم عشاء پڑھ لو، پھر بتاؤں گا۔"

اِدھر میں جبراً یا کہیے قہراً عشاء سے فارغ ہوا اُدھر چھدا چائے کی گرما گرم پیالی لے آیا۔ غازی صاحب درخت کے ایک خشک گدّے پر، جو برسوں سے یہاں پڑا آرام کر رہا ہوگا ماہر گھوڑے سوار کی طرح ایک ٹانگ ادھر دوسری اُدھر لٹکائے، چاء سے شوق فرما رہے تھے۔

"اے بھائی، چاء؟" میں نے چھدا سے کہا۔

"حضور، کھانا پکنے میں شاید دیر لگ جائے گی۔"

غازی صاحب، چائے سے فارغ ہو کر مجھ سے اور دور چلے گئے، پنڈت جی اور ان کا ڈپٹی رینجر بھی دائیں بائیں تھے۔

"کیا کھانا بھی تمھارے صاحب اسی ٹھنٹھ پر بیٹھ کر کھائیں گے چھدا؟"

چھدا نے منہ پھیر کر ہنسی روکی۔

"حضور! کھانا یہاں کیوں کھاتے؟"

"وہ تو کہتے ہیں صبح تک بنگلے نہیں جائیں گے۔"

"جی حضور! کھانا آپ کو اگلی منزل پہ کھانا ہوگا۔"

"ایں؟ کیا کہا؟ اگلی پچھلی کیا ہوتی ہے؟"

وہ میرے ہاتھ سے پیالی لے کر چل دیا۔

میں وہیں بیٹھا رہا۔ غازی صاحب آئے۔ "مجھے کہہ رہے تھے، اور دھونی خود رما بیٹھے، اب اٹھو۔"

"کیوں اٹھو؟ کس واسطے اٹھو؟ اٹھ کر جائیں کہاں؟"

"چلو ہمارے ساتھ، ایسی جگہ جو تم نے ساری عمر

" تمھارا اشارہ جنت دوزخ کی طرف ہے ؟"

" لاحول ولا، تم اٹھو تو سہی"۔ پھر انھوں نے حسبِ معمول منطق اور خوشامد سے کام لیا اور مجھے اٹھا کر چلے ——— پیچھے چچا، آگے ایک نیا رنگروٹ چھوٹے ٹارچ کی روشنی زمین پر پھینکتا ہوا، چچا کے کندھوں پر دو رائفلیں اس طرح سوار جیسے دیہاتی اپنے بیٹے، بیٹی کو لے کر چلتے ہیں۔

" ہم کہاں جا رہے ہیں ؟"

" وہیں "

" وہیں کا اتہ پتہ ؟"

اس قسم کے ذو معنی اور ٹال مٹول جوابوں پر ہم نے کوئی پون میل طے کر لیا۔

یہاں ہمارے رنگروٹ رہبر نے ایک درخت پر، اونچی طرف، "ٹارچ چمکائی۔ غازی صاحب نے بہت غور سے اسے دیکھا گردن اقرار یا تعریف کے معنی میں ہلائی اور مجھ سے بولے۔

" جانتے ہو یہ کیا ہے ؟"

میں نے اُدھر دیکھا ——— ٹارچ برابر چمک رہی تھی ۔ درخت کے دو موٹے ٹہنوں کو بانس اور لکڑی سے اس طرح ملایا گیا تھا کہ ایک جھولا سا معلوم ہو رہا تھا، لمبوترا جھولا۔

میرا جواب سن کر غازی صاحب نے شفیق استاد کی طرح کہا۔

" اسے مچان کہتے ہیں "

" کہتے ہوں گے، مجھے کیا "

" تمھیں سب کچھ ——— یہاں تمھیں اور مجھے بیٹھنا ہے گا مجھ ہے "

" یہاں تم اوپر چڑھو تو اس جگہ کی تعریف کرو گے "

یہاں ہمارا مباحثہ شروع ہوا مگر جب میں نے صاحب کی منطق القط کر کے رکھ دی۔ تو انھوں نے ترپ نکالا ۔ " بات بے بات ضد کیا کرو۔ جلدی کرو، چڑھ ورنہ ساری محنت اکارت جائے گی اور ۔ ۔ ۔ ۔ "

" محنت جائے چولھے میں ——— "

" محنت اکارت جائے گی اور بہت ممکن ہے جانیں بھی ——— دونوں کی "

" ایں " معاملہ کھلنا شروع ہوا ۔

" ہو سکتا ہے شیر ابھی اِدھر آ پہنچے "

" کون آ پہنچے ؟"

رونگٹوں کی بابت کوئی صاحب سوال نہ کریں

" شیر میاں شیر۔ وہ یہاں سے دس گز کے فاصلے پر ہے اُدھر دیکھو ——— "

ٹارچ اُدھر گھومی، ایک گٹھڑی سی مجھے نظر آئی

" غور سے دیکھو "

گٹھڑی نہیں، وہ ایک کٹرا تھا، چھوٹا، مگر سے کافی بڑا ۔ ۔ ۔

" یہ شاید مر گیا، سردی سے اکڑ گیا ؟"

غازی صاحب آہستہ سے ہنسے اور بولے شیر مار گیا ہے اور اب کھانے کے لیے اس کے پاس آئے گا۔ جلدی کرو، چڑھو ۔ ۔ ۔

ٖاس مچان پر گدّے تھے اور میں نے اسے بے آرام نہیں سمجھا
ٖل اور نبض — ہاں اس کا حال خدا کو معلوم ہے بس پوچھیے
ٖما —

وہ بھی آگئے پھسکڑا مار کر بیٹھ گئے چھدا نے دونوں
ٖیں، کارتوس کا بکس اور ایک لمبی ٹارچ غازی صاحب کے
مچان پر پہنچا دی۔ چھدا اپنے رہبر کے ساتھ اندھیرے میں
ٖیاب ہو گیا مجھے بات کا یارا ہوا۔

"یعنی اس اندھیری رات میں، اس گنجان جنگل میں آنے
ٖانک ہے؟ فرمایئے"

"ہزاروں روپے خرچ کرتے ہیں لوگ اس موقعہ کے لیے،
ٖلہ رہے ہیں کیا تک ہے۔ خدا نے ہم کو گھر بیٹھے موقعہ دیا"
میں نے "لوگ جھک مارتے ہیں" ہی کہا تھا کہ انھوں نے
ٖطویل تقریر شروع کر دی۔ بکل کے معنی بتائے کہ شیر پہلے اپنے
ٖکا خون پیتا ہے پھر مردہ جانوروں کو چھوڑ کر اپنے آرام کدے میں
ٖتا ہے۔ تقریباً بارہ گھنٹے بعد اس کا گوشت کھانے آتا ہے۔
"اب وہ آتا ہی ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے کے
ٖ مجھے اچھی طرح سمجھا کر انھوں نے ہدایات دینی شروع کیں
ٖرہتی" بولنا ہرگز نہیں۔ بولنا کیا سانس بھی آہستہ سے دبا
ٖنا ورنہ" ———

"ورنہ کیا؟"

"ورنہ یہ کہ وہ خفا ہو گا ممکن ہے جناب سے باز پرس
بیٹھے اگر یہ مچان اتنے فاصلے پر ہے کہ وہ کمر سیدھی کر کے آپ
تک نہیں پہنچ سکتا ہے [illegible] اچھل کر
[illegible] ہے مگر خود مالے [illegible]

وہ اونچ نیچ بتاتے رہے نقشہ جنگ بھی بتایا کہ ڈیٹی
ٖمنیجر کہاں ہوگا اور چھدا کہاں —
اتنے میں اندھیرے میں، سرسراہٹ ہوئی اور چھدا نے
ایک ناشتہ دان ایک تھرماس دے کر آہستہ سے کہا "حضور اب
میں اپنی جگہ جا بیٹھتا ہوں"
"سب لوگ ٹھیک ٹھاک جم گئے؟"
"پہنچ گئے حضور!" اور وہ غائب شد۔
غازی صاحب نے آہستہ سے ناشتہ دان کھولا اور
بولے "جلدی سے کھا پی لو۔ نہ معلوم کب تک منھ بند کر کے بیٹھنا
پڑے"
کھانا پینا کیسا، میرا تو حلق خشک تھا۔ دو گھونٹ پانی
پہلے پیتا پھر ایک کباب کا ٹکڑا اتارتا۔ پراٹھے کا تو ایک نوالہ بھی اتارنا
ناممکن تھا۔ غازی صاحب نے یہاں بھی بے تکلفی برتی۔ ڈٹ کر
کھانا کھایا ڈگڈگا کر پانی پیا، رومال سے ہاتھ منھ پونچھ کر
جلدی سے ناشتہ دان بند کیا اور سنبھل کر بیٹھے۔ ایک رائفل مجھے
پکڑا دی، دوسری خود لے لی۔ ران پر ٹارچ رکھ لی جسے بر وقت
ضرورت مجھے استعمال کرنا تھا۔
اُف موت کا بھی انتظار کچھ ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ ہر پانچ
منٹ بعد میرا پیٹ ابھرتا معدہ سے کان میں کوئی سوال کرتا
کوئی کیا! ایک ہی "ابھی کب آئے گا وہ؟" سانس کی رفتار
بے قابو ہو رہی تھی۔
"خاموش بیٹھے رہو آتا ہی ہوگا"
گزرا گھنٹہ سوا گھنٹہ ہی مگر مجھے ایسا معلوم ہوا کہ
[illegible] آنے لگے۔

" یہ غفلت نہ کرنا، سوئے اور مارے گئے " کہہ کر انھوں نے میری نیند بھی اڑادی اور رگوں کا خون بھی یخ کر دیا۔

وہ کھسر پسر کرتے رہے اور مجھے بہلاتے رہے۔ سرسراہٹ ہوئی، قدموں کی چاپ نہیں، جیسے ہوا سے کوئی پتا ہلا ہو یا گھاس پر کوئی ٹڈا آن بیٹھا ہو۔ غازی صاحب نے مجھے کہنی مار کر ہشیار کیا۔

" ٹورچ ماروں" میں نے کان میں پوچھا۔

"ابھی نہیں " میرے کان میں جواب دیا۔

" پھر کب ؟"

"ابھی دور ہے۔"

" واقعی ؟ کتنی دور ؟" اب مجھے پسینہ آرہا تھا۔

" ششش "

پھر سناٹا، کامل خاموشی۔ دو منٹ بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ کوئی چوہا میرے نیچے سے گزر رہا ہے۔ مردہ کٹڑا تو نظر نہیں آرہا تھا مگر چھدا نے اس کے کھر پر ایک سفید پٹی باندھ دی تھی وہ غور سے دیکھنے پر دھندلی سی نظر آجاتی تھی۔ غازی صاحب اس دھجی پر شست باندھے تیار بیٹھے تھے میں نے ان کے کان میں کہا " کیوں بھئی کیا یہاں چوہے بھی ہوتے ہیں ؟"

" ہوتے ہوں گے خاموش رہو"

اس سوال کے ایک منٹ بعد ایک آواز سنی گئی، جیسے کوئی خشک ٹہنی چٹخی ہو۔

" کیا ؟" میں نے پوچھا۔ اور میرا سانس جواب دینے لگا۔

" ششش "

دوسری ٹہنی چٹخی۔ پھر خاموشی، دس منٹ تک خاموشی۔ مجھ پر موت کی غنودگی طاری ہوئی۔ ایک جھونکا نیند کا آیا، اور غازی صاحب کے کندھے سے میرا سر ٹکرایا " اوں " کی دھمکی دے کر وہ رہ گئے۔

" کرڈ کرڈ " کی آواز گونجی شیر اپنے شکار کی طرف بڑھ رہا تھا۔ میں نے پوچھا " ماروں لائٹ "

" ہوں " انھوں نے کہا اور کلبلائے، یعنی ہوشیار ہو گئے۔ ان کا کلبلانا کوئی معمولی بات ہے، ساری مچان ہل گئی، مچان کے ہلنے سے ناشتہ دان ہل ہلا کر اگرچہ گرا مگر جھنکار گونج گئی۔ میں نے ٹورچ ماری شیر اپنا شکار دبائے زقندیں بھرتا جا رہا تھا۔

" کرو فیر — نہیں تو میں — یعنی مرجاؤں "

" ہرگز نہیں۔ کیا سو گیا "

اب ہم باتیں کر سکتے تھے، بلکہ ڈپٹی رنگ علی خاں جو کون سی ٹہنی پر بیٹھا ہوا چھدا سے باتیں کر رہا تھا لیکن مجال نہیں کہ زمین پر اترے۔

ساری رات اسی مچان پر اونگھ اونگھ کر لیٹ کر ہم دونوں نے اور چھدا اور جمرو نے بھی گزاری جنگل کی سیاہی ڈھلی، تب چھدا اور سارا عملہ ہمارے پاس آیا۔

ڈرامے، پہیلیاں

آؤ ڈراما کریں — پروفیسر محمد مجیب

مریم کی جیت

مزیدار پہیلیاں ۵

— حافظ باقوی

ماں کا پیار

کی نعمت ماں کا پیار
ماں کا پیار امرت کی دھار
بچہ کچھ ہو بیمار
کھو بیٹھے گی دل کا قرار
تک وہ اچھا ہی نہ ہو
سب سے رہے گی وہ بیزار
دعائیں کرتی ہے
اپنے دونوں ہاتھ پسار
ے پیارے منے کو
صحت دے اے پالن ہار
لے پھلے ہو عمر دراز
اس سے روشن ہو گھر بار
و وطن کا دوست بنے
قوم کا ہو سچا غم خوار
ے نام سے الفت ہو
جان بھی کردے تجھ پہ نثار"
کی دعاؤں کے صدقے
ہم ہوں خوشیوں میں سرشار
پوچھو تو دنیا میں
ماں ہی کا سچا ہے پیار
کے دم سے قایم ہے
یہ دنیا اور اس کی بہار
کے پاؤں تلے جنت
یہ خوش تو خوش پالن ہار
کی ناراضی دوزخ
اس کی خوشی جنت کی بہار



ایسی پیاری اماں کے
کیوں نہ بنیں ہم خدمت گار

محترمہ آصفہ مجیب

جب اور اب

(فروری سے سلسلہ ملایئے)

۱ زلف میں جکڑا ہوا ہوں پیر میں زنجیر ہے
گھاٹ کا اترا ہوا ہوں قتل کی تدبیر ہے (اگنا)

۲ گلشن میں ایک پیڑ ہے جس کو نہیں ہے چین
باہر غم حسن ہے تو اندر غم حسین (مہندی)

۳ ہرا ہے من بھرا ہے سوا لاکھ موتیوں جڑا ہے
راجہ جی کے باغ میں دوشالا اوڑھے کھڑا ہے (بھٹا)

۴ ایک میں دیکھا اندھا نر کاندھے اوپر کاٹ کا گھر
بارہ کوس کی منزل کرے پھر بھی گھر کے گھر میں رہے (بیل)

۵ اتنی سی پھدکی پھدکت جائے
نوسے انڈے دیت جائے (سوئی)

۶ سر پر پتھر۔ منہ میں انگلی (انگوٹھی)

۷ سموسا کیوں نہ کھایا جوتا کیوں نہ پہنا؟ (تلا نہ تھا)

۸ ڈوم کیوں نہ گایا گوشت کیوں نہ پکایا؟ (گلا نہ تھا)

بچیوں بچوں کے مشغلے:-

چھوٹی بچیاں گڑیاں بڑے انہماک سے کھیلتیں ان کے بیاہ شادیاں رچاتیں کپڑے سیتیں ہنڈکلیاں پکاتیں اور اس سے بہت کچھ سیکھتیں۔ کوئی بڑی بوڑھی دادی نانی بوا "ہر وقت بچوں" لڑکے لڑکیوں پر نگاہ رکھتیں دیکھ بھال سے کبھی غافل نہ ہوتیں ڈانٹ ڈپٹ بھی کرتیں اور اونچ نیچ سمجھایا کرتیں۔

چھوٹے بچوں کا رکھ رکھاؤ:-

ایک گھما گھمی سی ہے چھوٹے بچوں سے گھر میں کیسی کچھ رونق۔ کے خوب صورت پالنے میں بچہ پڑا ہاتھ پیر پھینک رہا ہے قلقا رہا ہے کوئی پاس بیٹھا جھونکے دے رہا ہے گا گا کر۔

آرام کا ہے پالنا اور سکھ کی ہے ڈور
اللہ نبی جی مدد کریں تو طالع تیرے زور

پالنے میں رنگ برنگ کے غبارے لٹکے دیکھ کر بچہ خوش ہو ہمک ہمک کر پکڑنے کو ہاتھ بڑھاتا ہے مسکرایا تو سارا گھر دیپک سے جل گئے دلوں کے کنول کھل گئے۔

کہیں کسی بچے کو دادی نانی خالہ پھوپھی کوئی بوا کو آہستہ سے ہلا کر کہتی ہے۔

۱ " ہاتھی جھومتا بھلا۔ کھاتا قند کا ڈلا۔ پیتا دودھ جھوم جھوم ہاتھی جھوم۔ دادا کے آگے جھوم نانا کے آگے جھوم
پیار سے کھلا رہی ہے

۲ بھیا آیا دور سے۔ گھوڑا باندھوں کھجور سے۔ علی۔ پھول بکھیروں گلی گلی۔ بھیا گیا شکار۔ ہرن لایا دو چار بھون بھون کھائیں۔ بہنیں جھانک جھانک جائیں۔

۱ کوئی منہ دھلاتے وقت کہتا
چھی چھی چھچھی پچھی کوا کھائے [illegible]

ماں بچے کو بیٹھی [illegible]

سوتا جاگ تیرے ماتھے لاگیں بھاگ
سو جا میرے لال تیری اماں ہو نہال
سو جا میرے پھول اور سکھ سے پالنا جھول
سو جا میرے چندا! مجھے کیا کرنا ہے دھندا
سو جا میرے جانی تری بھاگ بھری پیشانی
سو جا میرے چاند ترے آگے ہیرا ماند
سو جا میرے بالے ، تو سو جا راج دلارے
ی ندیا تو آ کیوں نہ جا میرے ننھے کی آنکھوں میں گھل مل جا
ل ہوری میں آتی ہوں دو چار بالے سلاتی ہوں
موں تیرے نین میرے دل کو آئے چین
موں تیرا مکھڑا بھولوں سارا دکھڑا

بچے بڑے نازوں سے پلتے۔ آنکھوں کا تارا ہوتے
ت نظروں سے اوجھل نہ ہوتے تھے۔ نانی دادی وغیرہ سب
اور قربان رہتیں گودیوں گودیوں پلتے۔ ذرا سی طبیعت خراب
نظر آتاری جاتی۔ صدقہ اور خیرات دی جاتی چڑی مار
چڑیا پکڑ لاتی سات مرتبہ بچے پر سے آتار کر اڑا دیتیں۔ یہ بھی
صدقہ ہوتا۔ بچہ خوش ہو کر پہلے چڑیا کو پکڑنے کی
کرتا۔ وہ پھر سے اڑ جاتی تو حیرت سے دیکھتا رہ جاتا چڑی
کچھ پیسے ملتے۔

دھوم دھام سے بچوں کی تقریبیں منائی جاتی۔ آج کسی کی
ہے تو کل سالگرہ کہ کبھی چھٹی عقیقہ وغیرہ کبھی اپنے یہاں
میرے کے یہاں یہ سلسلہ چلتا رہتا۔ حیثیت والوں کے
ایک کھلائی اور ضرورت پڑتی تو دائی رکھی جاتی۔ کھلائی کو
نہ چلی جانا ورنہ بچہ ہڑک جائے گا۔ اور کئی باتیں پرورش کے بارے
میں سمجھائی جاتیں کھلائیاں زیادہ تر ایسی ہوتیں کہ بچے کی محبت
ان کے گھر میں گھر کر لیتی جان چھڑکتیں کبھی جانے کا نام زبان پر نہ
لاتیں عمر ہی بتا دیتیں۔ ان کا حق بھی بہت مانا جاتا بچے کی ہر تقریب
میں کپڑے ہوئے چاندی کے زیور ملتے۔ کانوں میں سونے کی
بالیاں ہاتھوں میں کڑے۔ گلے میں طوق، ہنسلی پہنے رہتیں۔
بچے کو کوئی روپیہ دیتا تو اس میں چار آنے کھلائی کا حق تھا۔ بچے
بڑے ہونے تو اپنی دائی کھلائی کو بہت مانتے مدد کرتے۔ روپیہ پیسہ دینا نہ بھولتے
ساون آتا تو چھوٹی بڑی لڑکیاں ہاتھوں میں مہندی
رچائے رنگ برنگی چنریاں اوڑھے جھولا جھولتیں بڑے بڑے
پینگ لے کر ساون گاتیں۔

ننھی بندیاں ساون کا میرا جھولنا
ایک جھولا ڈالا میں نے ابا کی ڈال میں
چھوٹے بڑے پینگ مارے ساون کا میرا جھولنا
چھا رہی کالی گھٹا جیارا مورا لہرائے ہے
سن ری کوئل باؤلی تو کیوں ملاریں گائے ہے
آ پپیہا تو ادھر آم پر کیوں جم رہا میں بھی سر اپا زرد ہوں
فرق اتنا ہے کہ اس میں رس ہے مجھ میں ہائے ہے
ہائے کتھا چل دے مجھ کو اکیلا چھوڑ کر
اپنی سیجوں پر نہ رکھا مجھ رنگیلے پھول کو
سچ ہے بے درد کا دل لوہے سے ٹکر کھائے ہے
نوکر بہت ہوتے۔ ایک ایک کام پر ایک ایک نوکر ...
دو چار روپیہ مہینے سے زیادہ تنخواہ نہ ہوتی کھانا کپڑا غلہ دیا

سیر گیہوں اور سیر بھر اصلی گھی بکتا تھا۔ سب کے پاس اپنے گھر اور زمینیں ہوتیں بال بچے سکھ چین سے رہتے عورتیں سر سے پیر تک زیور سے لدی پھندی ہوتیں شادی بیاہ میں انہیں سونے کے زیور انعام میں ملتے یہ کچھ مشکل نہ تھا۔ بائیس روپیہ تولہ سونے کا بھاؤ تھا۔ اور اس لیے ان کو دیتے کہ غریب بھی اچھی زندگی گذاریں۔ بڑھاپے میں پنشن مقرر ہوتی۔

اندر عورتیں ہی کام کرتیں۔ سب کے ذمہ الگ الگ کام تقسیم ہوتے۔ کچھ اوپر کے کام کرتیں کچھ بیویوں کے پاس کام کرنے کے لیے پیش خدمتیں ہوتیں۔

مغلانیاں بیگمات کے کپڑے سیتیں، ٹانکیں بناتیں۔ اپنے فن میں بڑی ماہر ہوتی تھیں۔ بہت سلیقے سے منٹوں میں کام کر کے رکھ دیتیں۔ پاندان سجاتیں اور پاندان میں گلوریاں بنا کر چاندی کے گچھے میں لگا کر رکھتیں۔ بڑے پائنچے کے پائجامہ پہنتیں پائنچے سمیٹ کر سامنے کھونس لیتیں۔ باریک چنا دوپٹہ۔ سب سج دھج سے رہتیں۔

جب نوکر بھی اپنے مالکوں سے تہذیب و شائستگی سیکھ لیتے۔ بات چیت کا سلیقہ آجاتا۔ نوکرانیاں جو پڑھی لکھی نہ ہوتیں باتوں میں شعر مثلیں کہاوتیں کہتیں اور کبھی کبھی فارسی کے بڑے بڑے الفاظ اور مقولے چھانٹتیں۔

۱۔ دیر آید درست آید (دیر میں جو کام ہو اچھا ہوتا ہے)
۲۔ جوئندہ پائندہ (جو ڈھونڈتا وہ پاتا ہے)
۳۔ خس کم جہاں پاک (کوڑا کم ہوا۔ دنیا پاک ہوگئی)
۴۔ چشم بد دور ۵ بہ سر و چشم۔ ایسے ہی اور الفاظ

نہیں ایسے کہو۔" لکھنؤ میں میری خالہ صاحبہ بیگم شیخ مقبول
کمشنر کے پاس ایک بوڑھی مغلانی تھیں نام یاد نہیں دبلی
رنگ نکھرا الفتہ۔ ان کے ساتھ ان کی ایک لڑکی رہتی تھی
اچھی صورت شکل گن ڈھنگ کی بڑی ہوگئی لیکن بی مغلانی
کی شادی نہیں کرتی تھیں۔ کوئی لڑکا جس کا پیغام آتا انہیں
آتا اور فکر بھی بہت تھی۔ ایک دن اس پر گفتگو چھڑی ہم لو
پوچھا "کیسا داماد چاہتی ہو" بولیں میرا داماد ایسا ہونا چاہیے
حسن مقبل ہو۔ شمع انجمن ہو"

سب ہنس پڑے۔ ان کی باتوں میں سب کو مزا آ

مجیب صاحب کے والد صاحب لکھنؤ کے ممتاز
محترم محمد نسیم صاحب کے یہاں ایک لالہ دیبی سہائے ملا
دھوتی اس پر شیروانی پہنتے۔ ایک دن باغ میں انھوں
بیر کے پیڑ پر ایک لڑکا پتھر مار مار کر بیر توڑ رہا ہے انھوں
نے اسے ڈانٹا "اے شجر عناب پر کلوخ اندازی کرتا ہے
کے درخت پر پتھر یا ڈھیلے مار رہے تھے؟) وہ ایسی ہی
کرتے تھے۔ فارسی اور ہندی ملی ہوئی۔ میرے اپنے یہاں
میں بہت پرانے ملازم تھے، عبدا جنھیں ہم عبدا دادی کے
ہوشیار منتظم۔ ان کی بیٹی کلثوم پھوپھی جو ان کے برعکس
بڑی اچھی گھر کے خاص خاص کام کرتیں۔ والد صاحب
حسن صاحب وکیل کے خاص ملازم جنھیں ہم لوگ داروغہ
بڑے وفادار۔ خدمت گذار معتبر۔ کچھ اور بھی تھے۔ سب
ایک خاندانی رکن کی سی تھی۔ ان کا بڑا خیال رکھا جاتا اور
نوکر نوکرانیاں تھیں وہ الگ رہیں۔ یہی حالت مجیب صاحب

ہندوستان میں بہت سے مسلمان ایران اور ترکستان سے آکر آباد ہوئے۔ جیسے ہمارے مورث اعلیٰ شاہ ضیاء الدین کرمانی۔ جب تیمور نے ان کی سلطنت پر حملہ کیا انھیں شکست ہوئی پہلے کچھ عرصہ سمرقند میں نظر بند رہے پھر وہاں سے ۱۴۹۶ء میں ہندوستان آئے۔ ان کی اولاد لکھنؤ سندیلہ۔ دیوہ شریف اور اناؤ میں پھیلی۔ نا میں بڑے بزرگ اور عالم گزرے۔ شاہ جہاں کے زمانہ سے بنیادی عروج حاصل ہوا۔ ایسے بہت سے خاندان ہیں۔ باہر سے جو مسلمان آتے ان کی بڑی قدر کی جاتی۔ اس سے آپ ازہ لگا لیجئے کہ وہ یہاں کے لوگوں میں کیسے گھل مل کر شیر و شکر ہو رہے۔ ان کے رنگ ڈھنگ میں کیسے رچ بس گئے ہندوستان اپنا عزیز وطن بنایا۔ اسے سینے سے لگایا۔ ہندو مسلمان دونوں کے ل جول سے زبان ، تہذیب معاشرت کا ایک سنگم بن گیا۔ ں چیز کا یہ پتہ چلانا کہ کون کس کی ہے بہت مشکل ہے جیسے جمنا کے دو دھارے جو الگ نہیں کیے جا سکے۔ ان کے یاں جو میل ملاپ کا ایک خوش آئند نغمہ سناتے ہیں۔ اب تک ان کے بچوں نے ایک ساتھ مل کر یہ ترانہ گایا۔

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

علم و تربیت

اونچے گھرانوں میں علم کی بڑی قدر اور چرچا تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے یم ضروری سمجھی جاتی۔ مگر ایسی تعلیم جو صرف روزی کمانے نہیں۔ ایسی جس سے انسان اچھا انسان بنے۔ انگریزی رواج ہو گیا تھا لیکن عربی اور فارسی کی قدر دونوں میں بھی ضرور پڑھائی جاتی۔ بچے کی تعلیم [illegible]

سے شروع کی جاتی۔ خوش خطی سکھائی جاتی کیوں کہ اچھے خط کی بھی بہت قدر تھی۔

تعلیم یا پڑھائی لکھائی

اکثر بڑی لڑکیوں کے لیے استاد مقرر کیے جاتے جو انہیں پردے سے پڑھاتے دونوں کے بیچ میں پردہ ڈال دیا جاتا یا گھر کے کوئی بزرگ پڑھاتے۔ اسکول کالج بہت کم جاتی تھیں جب اتنی لائبریریاں نہیں تھیں جتنی اب ہیں مگر پڑھے لکھے لوگوں کے پاس اپنا کتب خانہ ہوتا جس میں ادبی تاریخی ہر قسم کی اونچے اعلیٰ معیار کی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہوتا۔ ہاتھ کی لکھی نایاب خوش خط کتابیں ہوتیں مطالعہ کا شوق تھا لڑکیوں لڑکوں کو بھی وہ کتابیں پڑھنے کو ملتیں۔ بازاری ناولوں کی سخت منادی تھی۔ اتفاق سے کوئی ایسی ویسی کتاب آجاتی بزرگ دیکھ لیتے تو بازپرس ہوتی "یہ کون لایا ہے کیسے آئی؟" اس کے بدلے میں انھیں بہت سی اچھی اچھی کتابیں پڑھنے کو ملتیں اور نئی جو چھپتیں منگائی جاتیں۔ خواتین کے لکھے ہوئے اصلاحی ناول "گودڑ کا لعل۔ روشنک بیگم" مولوی نذیر احمد کی کتابیں توبۃ النصوح۔ مراۃ العروس مولانا راشد الخیری کی کتابیں۔ بشیر احمد کی کتاب اقبال دلہن حسن معاشرت۔ اقبال کی بانگ درا محمدی بیگم کے لکھے ہوئے قصے کہانیاں۔ سید ممتاز علی کا ہفتہ وار رسالہ تہذیب نسواں عورتوں اور لڑکیوں کے لئے اور چھوٹے بچوں کا رسالہ پھول اتنا ہی پسند کیا جاتا جیسا کہ آپ کا "پیام تعلیم" لڑکیاں اور بچوں کو بے چینی سے اس کا انتظار رہتا۔ بزرگوں کی یہی خواہش ہوتی کہ لڑکے لڑکیاں اچھی کتابیں پڑھیں۔ اچھے لوگوں سے ملیں جہاں تک کوئی بری بات کان میں نہ پڑے نہ بری بات [illegible]

مانگے کا گھونسلا

ایلیا اسٹامپر   ترجمہ: جمشید اشرف جامعہ نگر



"ہیلو یکسی!" ڈیوڈ نے یکسی سے کہا "دیکھو میاں اپریل کا مہینہ آگیا اور جھٹی میں بھی آگیا۔ اب بتاؤ کونسا گھونسلہ دکھا رہے ہو۔؟"

"آج ہم تمہیں بالکل عجیب و غریب پرندے سے ملائیں گے تم اب تک دو قسم کے گھونسلے دیکھ چکے ہو۔ یہ پرندوں کے نہیں تھے۔ اور آج ہم ایک ایسی چڑیا دیکھیں گے جو گھونسلا ہی نہیں بناتی ہے"

ارے! چڑیا گھونسلا نہیں بناتی!!" ڈیوڈ نے بڑے تعجب سے پوچھا "مگر یہ رہتی کہاں ہے پھر اور یہ انڈے کہاں دیتی ہے۔ بچے کیسے نکلتے ہیں۔؟"

"یہ چڑیا جنگل میں پیڑوں پر رہتی ہے" یکسی نے کہا مگر اپنے بچوں کے لئے گھونسلا اُدھار لے لیتی ہے۔ آؤ تم خود ہی دیکھو" یکسی نے ڈیوڈ کو اپنے سائز کا کر دیا اور دونوں ایک پیڑ کے پاس گئے پیڑ کے ایک طرف کو ایک گھونسلا بنا یہ دونوں خاموشی کے ساتھ پیڑ پر چڑھ گئے اور گھونسلے کو دیکھا۔ نیلے رنگ کے چار انڈے گھونسلے میں رکھے مگر چڑیا کہیں غائب تھی۔ کچھ دیر بعد ڈیوڈ نے د پرندہ اوپر اُڑتا ہوا ان کی طرف آرہا ہے۔ اس کے رنگ کے مگر سینے کے بال ہلکے بھورے رنگ کے تھے کے بال سفید تھے کہیں کہیں کالی چتیاں بھی پڑی تھیں نے پوچھا۔

"کیا یہ انڈے اسی چڑیا کے ہیں؟" یکسی

"نہیں۔ یہ تو ایک دوسرا پرندہ ہے اسے کگو اس کو غور سے دیکھو کیا کرتا ہے"

ککو بلی کی طرح میاؤں میاؤں کرتا گیا اور پھر اسی گھونسلے میں گھس گیا اور وہاں یہ دیا۔ یہ انڈا بھی دوسرے انڈوں جیسا تھا

پہلے والے چار انڈوں میں سے ایک انڈا کھا لیا اور اُڑ گیا۔

"ارے یہ کیا بات ہے؟" تعجب سے ڈیوڈ بولا۔ "یہ اپنا گھونسلا خود کیوں نہیں بناتی ہے۔"

"اس کے بارے میں تو کسی کو بھی نہیں معلوم" ڈیکی



کہا۔ "یہ چڑیا اس قسم کا گھونسلا تلاش کرتی ہے جیسی یہ پلی بڑھی تھی اور پھر اسی رنگ سے ملتے ہوئے انڈے دیتی جیس رنگ کے گھونسلے میں رکھے ہوئے ہیں۔ اور پھر یہ ان سرے انڈوں میں سے ایک انڈا کھا لیتی ہے تاکہ انڈوں مالک کو پتہ نہ چل سکے کہ انڈوں میں کچھ ادل بدل ہوئی ہے سرے دن یہ چڑیا پھر کسی دوسرے گھونسلے میں جاکر انڈا دے دے وہاں کا ایک انڈا کھا لے گی پھر کچھ دنوں تک یہ آرام رے گی اور پھر بعد میں چار پانچ انڈے مختلف جگہوں پر مختلف گھونسلوں میں دے آئے گی۔"

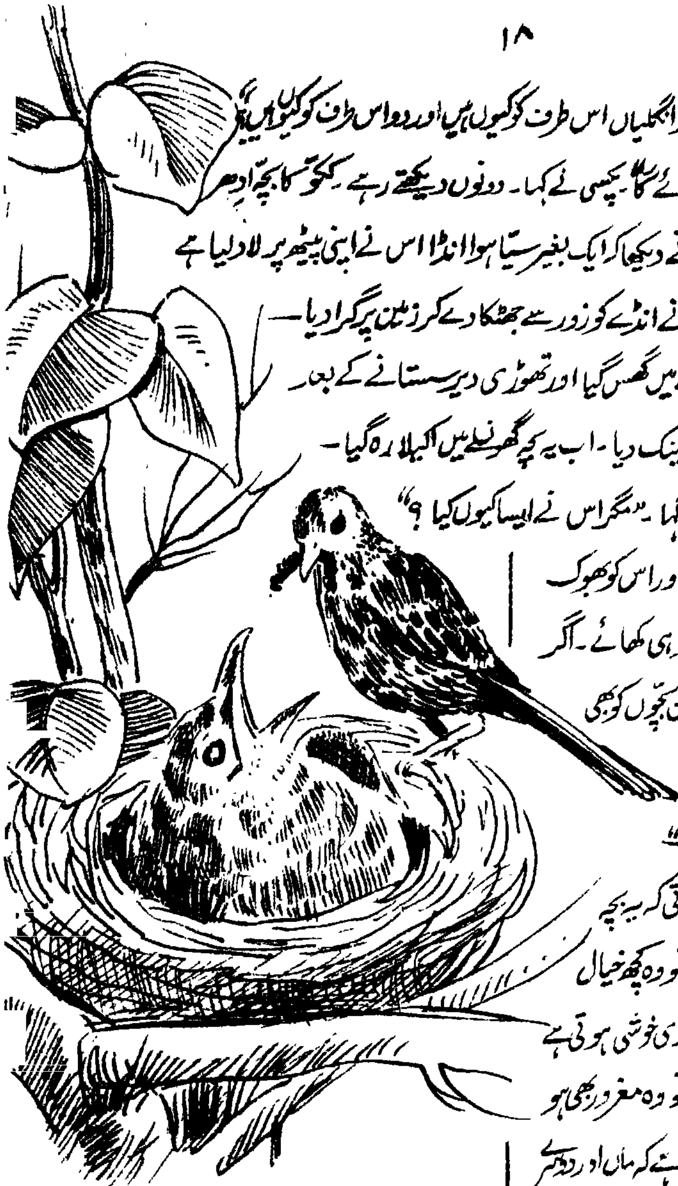
ہوتا ہے" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"وہ تو برابر بھی فرق معلوم نہیں ہوتا چڑیا بڑے مزے سے انڈوں کو سیتی رہے گی۔ جب انڈوں میں سے بچے نکلیں گے تو دوسرے بچے یا اصلی بچے ککو کے رحم و کرم پر ہوں گے۔"

"میں سمجھا نہیں تمھارا مطلب کیا ہے" ڈیوڈ نے سر کھجاتے ہوئے پوچھا۔ "کیا بچے آپس میں لڑیں گے۔"

ڈیکی نے کہا "تم میرے ساتھ دوسرے کھیت میں چلو وہیں بھی ایک ککو کا بچہ انڈے سے نکلا ہے ہم اسے چل کر دیکھیں گے۔"

یہ دونوں دوسرے گھونسلے کے پاس گئے یہ بھی بالکل ویسا ہی تھا۔ یہاں انھوں نے ایک عجیب قسم کا ککو کا بچہ دیکھا یہ بالکل کالا تھا اور ابھی اس کے پر بھی نہیں نکلے تھے اور



ڈیوڈ نے پوچھا "اس کی باؤل کی دو انگلیاں اس طرف کو کیوں ہیں اور دو اس طرف کو کیوں ہیں؟"

"ابھی کچھ دیر بعد تم کو معلوم ہو جائے گا" پکسی نے کہا۔ دونوں دیکھتے رہے۔ ککو کا بچہ اِدھر اُدھر کو ہلتا رہا اور پھر تھوڑی دیر بعد انھوں نے دیکھا کہ ایک بغیر سیا ہوا انڈا اس نے اپنی پیٹھ پر لاد لیا ہے پھر اپنے پنجوں کے بل اوپر آتے ہوئے۔ اس نے انڈے کو زور سے جھٹکا دے کر زمین پر گرا دیا — انڈا زمین پر گر کر ٹوٹ گیا۔ ککو پھر اپنے گھونسلے میں گھس گیا اور تھوڑی دیر سستانے کے بعد اس نے دوسرے انڈے کو بھی اسی طرح باہر پھینک دیا۔ اب یہ بچہ گھونسلے میں اکیلا رہ گیا۔

"اوہ! یہ بچہ کتنا ظالم ہے۔" ڈیوڈ نے کہا "مگر اس نے ایسا کیوں کیا؟"

"بات یہ ہے کہ یہ ایک بڑا پرندہ ہے اور اس کو بھوک لگتی ہے۔ اس لیے چاہتا ہے کہ تمام کھانا خود ہی کھائے۔ اگر ان انڈوں میں سے بھی بچے نکل آتے تو ماں ان بچوں کو بھی کھانا کھلاتی اور یہ بھوکا رہتا کیونکہ اس کی خوراک ان بچوں سے بہت زیادہ ہوتی ہے۔"

"ماں کو یہ بات معلوم ہی نہیں ہوتی کہ یہ بچہ اس کا اپنا بچہ نہیں ہے۔ اور اگر ہوتی بھی ہے تو وہ کچھ خیال بھی نہیں کرتی کیونکہ اس کو تو اس بات کی بڑی خوشی ہوتی ہے کہ اس کا بچہ اتنا خوب صورت ہے۔ کبھی کبھی تو وہ مغرور بھی ہو جاتی ہے۔ اس بچے کی خوراک اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ ماں اور دوسری اڑوس پڑوس کی چڑیاں مل کر اس کے لیے دانا لاتی ہیں تب کہیں جا کر اس کا پیٹ بھرتا ہے۔ وہ دیکھو سامنے وہ ماں آرہی ہے۔"

چڑیا اڑتی ہوئی آئی اور ککو کے بازوں پر بیٹھ گئی اور پھر اس نے ککو کے منھ میں کوئی چیز ڈال دی۔

"یہ اس نے کیا چیز ڈالی ہے۔" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"تم نے دیکھا ہوگا پیڑوں پر عام طور پر ہرے رنگ کے کھلے ہوتے ہیں ...

وقت اس نے بچے کے منھ میں کملا ڈالا ہے۔" پکسی نے کہا "یہ صرف ککو ہی ہے جو اس کو نگل لیتا ہے۔ اور کوئی پرندہ نہیں نگلتا۔"

ڈیوڈ نے پوچھا "کیا ککو ہر سال یہاں پر رہتا ہے"

پکسی نے جواب دیا۔ "نہیں بڑی چڑیاں تو جولائی ... جگہ چھوڑ دیتی ہیں۔ مگر یہ بچے اور اس کے دوسرے ...

"بھائی پکسی میرا دل تو یہ چاہتا ہے کہ میں اس شہر میں ہمیشہ کے لیے رہ پڑوں۔ کیونکہ یہ جگہ تو انتہائی دل چسپ ہے" ڈیوڈ نے خوش ہو کر پکسی سے کہا۔

پکسی نے ڈیوڈ کو دوبارہ بڑا کرتے ہوئے کہا "مجھے خوشی ہے کہ تم میری ملاقات کو اور میری باتوں کو دل چسپ پا رہے ہو۔ اب میں تم کو اور بھی بہت سے جانوروں سے ملاؤں گا۔ اچھا اگلے مہینے ضرور آنا۔ پھر میں تم کو پیڑ پر ایک جانور کا گھونسلا دکھاؤں گا" پھر پکسی غائب ہوگیا اور ڈیوڈ اگلے مہینے کے بارے میں سوچنے لگا۔

آب و رنگ ترقی کی دوسری منزل میں

چلی بھی جا جرسِ غنچہ کی صدا پہ نسیم
کہیں تو قافلۂ نوبہار ٹھہرے گا

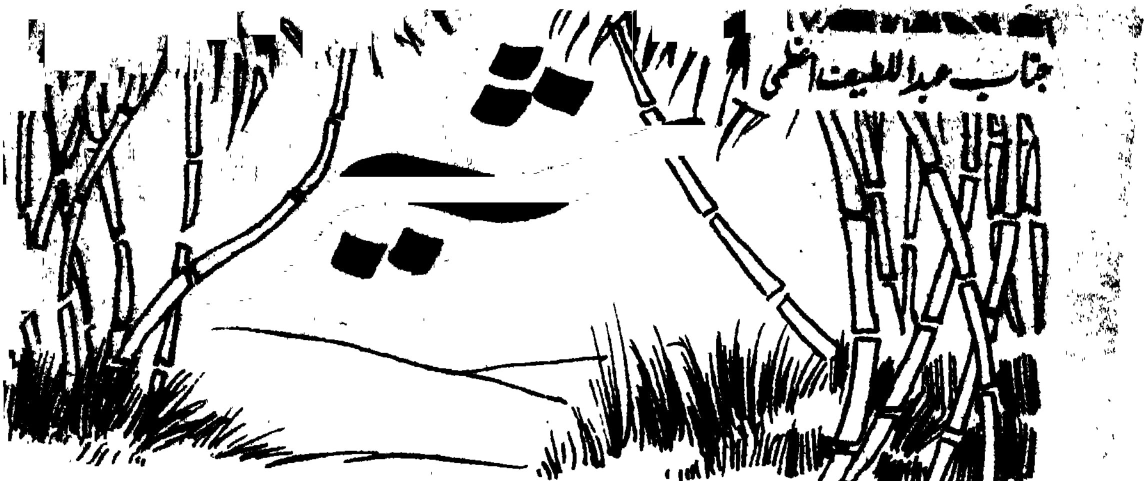
ادارۂ "آب و رنگ"
جولائی، اگست ۱۹۷۰ء
میں — **سالنامہ** — کا
اعلان کرتا ہے۔
اہل قلم سے تعاون کی درخواست ہے .....
مدیر اعلیٰ ستگھ امرتسری

۹۵/۱۵ بیکن گنج کانپور ۱/۱۲۶ جی گوبند نگر کانپور

جناب اقبال نصیب

خان عبدالغفار خان

بائیس سال بعد وہ تشریف لائے ہیں
ان کا ہمارے دل میں بڑا احترام ہے
وہ قوم کے پٹھان ہیں ہندوستان کی آن
باپو کے ہمنوا ہیں وہ انسانیت کی شان
آئے ہیں وہ ہمارے وطن میں خوش آمدید
جیسے بہار آئی چمن میں خوش آمدید
ہندوستاں کو دیکھ کے وہ بے قرار ہیں
کتنے دکھوں کا بوجھ لیے اشکبار ہیں
مشہور ہیں وہ سرحدی گاندھی کے نام سے
ہندوستاں کو فخر ہے ان کے پیام سے



گرمی کی چھٹیوں میں علی گڑھ سے ہما، گڈو، اور فیض آباد سے تزئین، پروین اور افشاں دہلی کی سیر کے لیے آگئے۔ نشاط نے اصرار کیا کہ ان کو سب سے پہلے چڑیا گھر دکھایا جائے۔ تزئین نے فوراً اختلاف کیا۔ "واہ چڑیا گھر دیکھ کر کیا کریں گے، کیا ہم نے چڑیاں نہیں دیکھی ہیں، ہم تو قطب مینار، لال قلعہ وغیرہ دیکھنے آئے ہیں۔"

نشاط نے سمجھایا "نہیں باجی، چڑیا گھر میں صرف چڑیاں نہیں ہیں طرح طرح کے جانور بھی ہیں، ایسے ایسے جانور کہ تم دیکھ کر دنگ رہ جاؤ۔"

پاس ہی خورشید بھی کھڑے تھے، انھیں اپنی قابلیت جتانے کا بڑا شوق ہے، فوراً بولے، "اور چڑیاں بھی تو ایسی ایسی ہیں، جن کو دیکھنا تو در کنار ان کے نام بھی کبھی تم لوگوں نے نہ سنے ہوں گے۔"

پروین جو سب کی باتیں غور سے سن رہی تھیں، بولیں تو بس "طے ہو گیا کہ سب سے پہلے چڑیا گھر دیکھا جائے گا۔"

جاوید کو شرارت سوجھی، بولے جانے سے پہلے سوچ لیجیے، چڑیا گھر میلوں میں پھیلا ہوا ہے، چلتے چلتے لوگوں کا بلیتھن نکل جائے گا، اور یہ گڈو اور بی افشاں چلانے لگیں گی کہ ہائے تھک گئے کوئی گود لے لے۔ سال کی صاحبزادیوں کو گود لیے کون پھرے گا اور پھر د ہاڑ تو ان کے اوسان ہی خطا ہو جائیں گے، اس میں ان لڑکیوں کو لے جا کر دیکھ چکا ہوں، بڑی ڈرپوک ہوتی ہیں، رونا چلانا شروع کر دیتی ہیں، نا بھائی تو ان لوگوں کے ساتھ نہ جاؤں گا، میں سو بھائی کو انڈیا گیٹ اور راشٹرپتی بھون دکھانے جاؤں گا، وقت ملا تو وہیں سے ہوائی اڈے بھی ہم لوگ چلے جائیں گے اور ہوائی جہازوں کو اترتے اور اڑتے دیکھیں گے۔

ہما جو اب تک خاموش تھیں اور جو ان سب سے بڑی تھیں، تنک کر بولیں "شوق سے آپ لوگ گیٹ اور راشٹرپتی بھون جائیے، ہم لوگ تو چڑیا گھر جائیں گے، میں ترائی کے جنگلوں کی سیر کر چکی ہوں، جنگلی ہاتھی، شیر سب ہوتے ہیں، نینی تال کے پاس میں مشہور انگریز شکاری جیم کاربٹ کے نام



مایا گیا ہے۔ اس میں جنگلی جانور بڑی آزادی سے
رتے ہیں اور انھیں دیکھنے کے لیے دور دور سے لوگ
یا۔ اس نیشنل پارک میں تمام جنگلی جانوروں کو
رتے دیکھا ہے، جن کو اگر جاوید صاحب دیکھ لیں
ں ٹھہر بھی نہ سکیں گے، چڑیا گھر کے جانور تو ان
نے بھیگی بلی معلوم ہوتے ہیں اور سلاخوں کے اندر
یا ان سے کیا ڈرنا ہے، چلو بھائی چلو تیار ہو جاؤ
ابی ہے کہ چچا جان اس ہنسا بحثی کے بعد یہ قافلہ
ر چچا جان کی رہنمائی میں روانہ ہوا۔

یہ قافلہ چڑیا گھر پہنچا تو دیر ہو چکی تھی، دھوپ
تیز ہو گئی تھی اور بہت سے جانور اِدھر اُدھر چھپ گئے
تھے، بچوں نے اصرار کیا کہ سب سے پہلے ببر شیر دیکھیں
گے، مگر وہ نہ جانے کہاں چھپا بیٹھا تھا نظر نہ آیا، آگے
بڑھے تو خوش قسمتی سے ٹائیگر یعنی شیر نظر آ گیا، بڑی بچوں
نے خوشی کا نعرہ لگایا اور چھوٹی بچیاں دوسروں کی آڑ
میں آ گئیں، نشاط یوں تو ابھی چھوٹی ہے کوئی آٹھ سال
کی، مگر دہلی میں رہنے کی وجہ سے وہ کئی مرتبہ چڑیا گھر دیکھ
چکی ہے اور کسی جانور سے بالکل نہیں ڈرتی، اس لیے بڑھ

کر سب کے آگے آگئی اور اپنی ہم جولیوں کو آگے آنے کے لیے کہا جب سب بچے جنگلے کے قریب قطار سے کھڑے ہوگئے تو میں نے بتانا شروع کیا: "دیکھو شیر کی سب سے بڑی پہچان یہ ہے کہ اس کے جسم پر پیلے اور براؤن رنگ پر کالی دھاریاں ہوتی ہیں، ٹائیگر یا شیر، ببر شیر سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے، اس کی لمبائی عام طور پر نو ۹ فٹ ہوتی ہے اور وزن کوئی پانچ سو پونڈ۔ کوئی کوئی شیر ساڑھے دس فٹ تک لمبا ہوتا ہے، شیر کی آنکھیں اور کان بہت تیز ہوتے ہیں۔ ہلکی سے ہلکی آواز بھی سن لیتے ہیں، یہ شیر بڑے بہادر، ذہین اور چالاک ہوتے ہیں، شیر ببر کی طرح ان کی گردن پر بڑے بڑے بال نہیں ہوتے۔"

"ان کے بچوں کے بارے میں بھی کچھ بتائیے پھوپھا جان!" گڈو نے سوال کیا۔

"مادہ شیرنی چار مہینے میں دو سے لے کر بچے دیتی ہے۔" میں نے کہا "چھوٹے چھوٹے بچے بلی کے بچے معلوم ہوتے ہیں، سنہرے براؤن جسم سیاہ دھاریاں بڑی بھلی لگتی ہیں، چند مہینے تک ماں کے ساتھ الگ تھلگ تنہائی میں رہتے ہیں، نر کبھی کبھی انھیں مار ڈالتا ہے۔

جب دو مہینے کے ہو جاتے ہیں تو آہستہ اپنے آپ اِدھر اُدھر دوڑنے بھاگنے لگتے ہیں جب ان کی عمر چار مہینے کی ہو جاتی ہے اور ان کا ... کے برابر ہو جاتا ہے تو اپنی ماں کے ساتھ اپنے ... جانے لگتے ہیں۔"

"اب ان کی ماں چھوٹی چھوٹی چیزوں، چوہوں، مرغیوں، مور، سور اور ہرن کا ...



ں کو مارنا سکھاتی ہے، کھیل ہی کھیل میں بتلاتی
کس طرح شکار کیا جاتا ہے اور کس طرح کھایا جاتا
جب ان کی عمر ایک سال کی ہوجاتی ہے تو ان کی
بڑے بڑے جانوروں مثلاً بیل، جنگلی ریچھ اور زیبرا
کا شکار کرتی ہے اور اپنے بچوں کو سکھاتی ہے کہ
زخمی جانوروں کو کس طرح ختم کر کے چٹ کر جائیں
وہ ڈیڑھ سال کے ہوتے ہیں تو اپنی ماں کے بغیر
ہی شکار کے لیے نکلتے ہیں۔"

"دو سال کے وقفے سے مادہ شیرنی پھر بچے دیتی
پانچ سال تک پہلے کے بچے اپنی ماں ہی کے ارد گرد
یں، اس کے بعد وہ اپنا الگ گھر بساتے ہیں، ماں
ں ہوجاتے ہیں۔"

"ابو! کون زیادہ بہادر ہے، شیر ببر یا شیر؟"
نے پوچھا۔

"شیر زیادہ بہادر اور خطرناک ہے۔" میں نے
یا۔ "لیکن شیر کے مقابلے میں مادہ شیرنی زیادہ
ہے اور شکار کرنے میں ماہر ہوتی ہے۔ ایک شیر
چیتے کے مقابلے میں تین گنا زیادہ ہوتا ہے۔
وہ چودہ فٹ چھلانگ لگا سکتا ہے اور چالیس
ی خندق کو کود کر پار کر سکتا ہے۔ شیر، شیر ببر
لے میں زیادہ ذہین اور چالاک ہوتا ہے، اس
کا شکار کرنا بڑا مشکل کام ہے۔"

"شیر کن ملکوں میں پایا جاتا ہے؟" پروین نے

"سائبیریا، ایران، کوریا، ملایا اور برما میں۔"
میں نے جواب دیا۔ "لیکن سب سے اچھا اور بڑا شیر
ہمارے ملک کی ریاست بنگال میں پایا جاتا ہے۔ اسے
بنگال ٹائیگر کہتے ہیں، اس کی لمبائی عام طور پر دس
فٹ ہوتی ہے، ہندوستان ہی ایک ایسا ملک ہے، جس
کے ایک علاقے، ریوا میں کچھ سفید شیر بھی پائے جاتے ہیں،
یہ بہت خوبصورت ہوتے ہیں۔ اس چڑیا گھر میں بھی کچھ
لاکر رکھے گئے ہیں۔"

"کیا شیر انسان کو بھی کھاتے ہیں؟" تزئین نے
سوال کیا۔

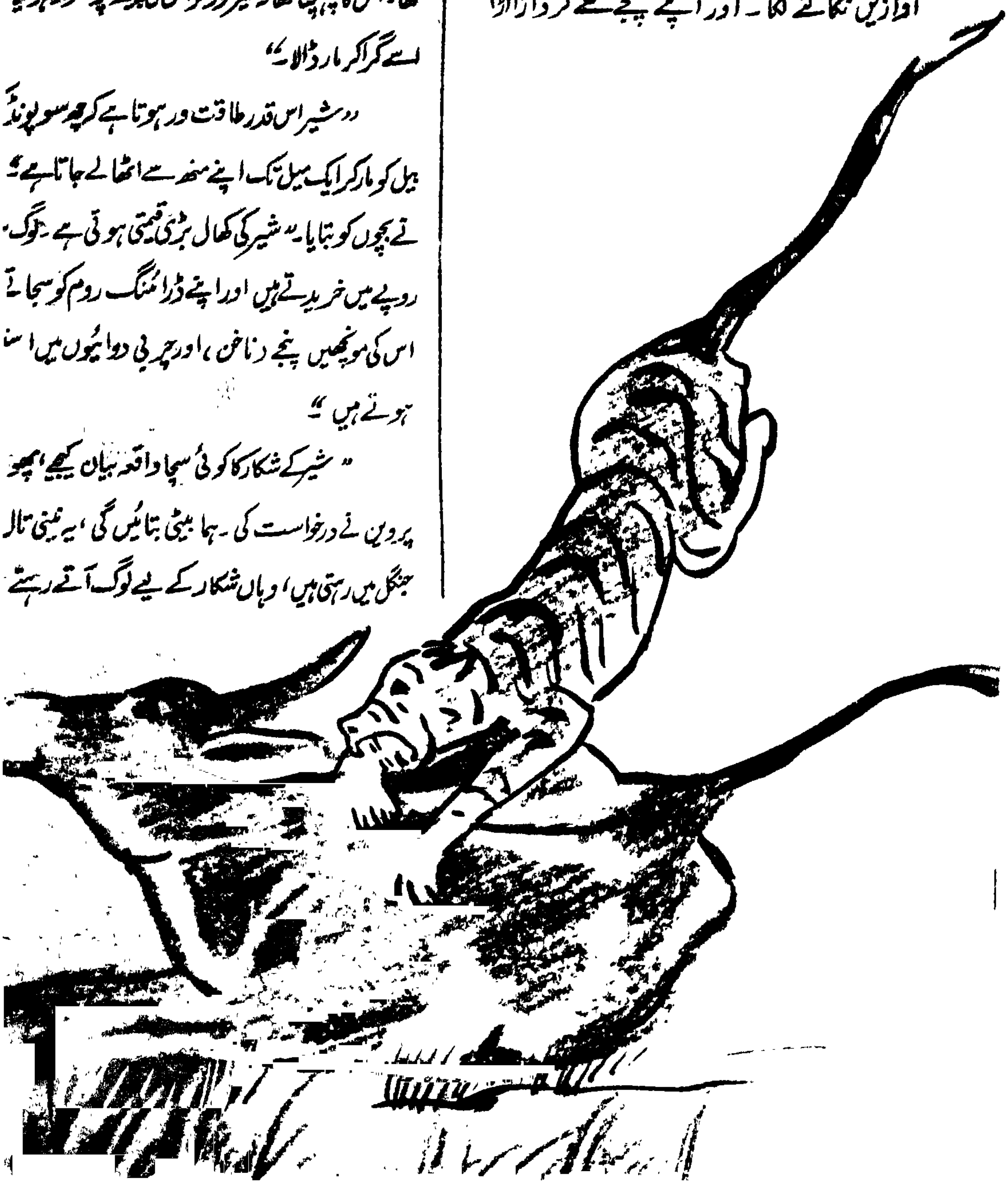
"نہیں" میں نے بتایا۔ "وہ انسان سے بچ
کر گھنے جنگل میں رہتا ہے، لیکن جو انسان کو کھانے
لگے وہ بڑا خطرناک ہوتا ہے، اسے "مین ایٹر" کہتے
ہیں۔ یعنی مردم خور یا انسان کو کھانے والا، اگر کسی شکاری
کی غلطی یا اناڑی پن سے کوئی شیر زخمی ہو کر بچ نکلے
تو وہ بڑا خطرناک ہوجاتا ہے اور انسان کا شکار کرنے
لگتا ہے۔ جو شیر بوڑھے ہوجاتے ہیں اور جانوروں کا
شکار ان کے لیے مشکل ہوجاتا ہے، وہ بھی انسان کا شکار
کرنے لگتے ہیں۔"

"میں نے شیر کی چالاکی کا ایک بہت دلچسپ
قصہ کہیں پڑھا ہے یا سنا ہے۔" ہما نے کہا، سب
لوگ اس کی طرف متوجہ ہوگئے۔ "ہاں باجی وہ کیا قصہ
ہے؟" گڈو، افشاں اور نشاط نے ایک ساتھ سوال کیا۔

شیر ہر طرح آواز نکال سکتے ہیں،" ہما نے سب کو اپنی طرف متوجہ پا کر کہا " ایک مرتبہ ایک شیر لمبی لمبی گھاس میں چھپ گیا اور بیل کی طرح "پھوں پھوں" آوازیں نکالنے لگا۔ اور اپنے پنجے سے گرد اڑا اڑا کر اپنے اوپر ڈالنے لگا، تھوڑے ہی فاصلے پر ایک بیل تھا۔ اس نے سمجھا کہ کوئی اور بیل اس کو لڑنے کے لیے بلا رہا ہے۔ وہ بھی پھوں پھوں کرتا ہوا وہاں پہنچ گیا جہاں شیر تھا۔ اس کا پہنچنا تھا کہ شیر کود کر اس کی پیٹھ پر سوار ہو گیا اسے گرا کر مار ڈالا۔"

"شیر اس قدر طاقت ور ہوتا ہے کہ چھ سو پونڈ بیل کو مار کر ایک میل تک اپنے منھ سے اٹھا لے جاتا ہے۔" ... نے بچوں کو بتایا "شیر کی کھال بڑی قیمتی ہوتی ہے۔ لوگ ... روپے میں خریدتے ہیں اور اپنے ڈرائنگ روم کو سجاتے ... اس کی مونچھیں پنجے، ناخن، اور چربی دوائیوں میں استعمال ہوتے ہیں۔"

"شیر کے شکار کا کوئی سچا واقعہ بیان کیجیے، پھوپھی" پروین نے درخواست کی۔ ہما بیٹی بتائیں گی، یہ نینی تال جنگل میں رہتی ہیں، وہاں شکار کے لیے لوگ آتے رہتے



انھوں نے بہت سے قصّے سنے ہوں گے، مجھے تو شکار وکار سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ۔" میں نے معذرت ظاہر کی۔

"مجھے ایک قصّہ معلوم ہے" خورشید فوراً بول پڑے "یہ ہمارے بڑے ابّا نے کئی شیر مارے ہیں۔ شوکت سلطان چچا بھی شیر کے شکار کے بڑے شوقین ہیں، ایک مرتبہ بڑے ابّا، حاجی لطف الرحمٰن صاحب اور شوکت سلطان چچا شیر کے شکار کے لیے گئے۔ ایک گاؤں کے لوگوں نے بتایا کہ ایک شیر ان کے بہت سے جانوروں کو کھا گیا ہے۔ ایک شخص نے اطلاع دی کہ قریب ہی کے جنگل میں آج وہ شیر دیکھا گیا ہے اور اس نے ایک جانور کو مارا بھی ہے۔ چچا اور بڑے ابّا فوراً وہاں پہنچے اور جس علاقے میں شیر دیکھا گیا تھا، ایک اونچے درخت پر مچان بناکر بیٹھ گئے اور قریب ہی ایک بھینسے کو باندھ دیا گیا۔ جب کافی رات ہوگئی تو شیر کی آہٹ معلوم ہوئی۔ چاندنی رات تھی، اس میں شیر بڑا خوبصورت معلوم ہوتا تھا بالکل بادشاہوں کی طرح بڑی شان سے چل رہا تھا۔ بھی تو اسے جنگل کا بادشاہ کہتے ہیں۔ شیر کی نگاہ بھینسے پر پڑی تو چند سکنڈ اس نے اپنے شکار کو غور سے دیکھا۔ اسے کیا خبر تھی کہ کچھ لوگ خود اس کی تاک میں بیٹھے ہیں اور وہ بھی اسے اسی طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح وہ بھینسے کو دیکھ رہا ہے۔ یکایک وہ اپنی جگہ سے اچھلا اور بجلی کی طرح بھینسے پر گرا، ادھر اس کا بھینسے پر سوار ہونا تھا ادھر فائر ہوا اور شکار کرنے والا خود شکار ہوگیا۔"

"اچھا بچو! اب آگے بڑھو، اب دھوپ کی تیزی کچھ کم ہوگئی ہے، شاید شیر ببر اپنے گھر سے باہر نکلا ہو، چلو اسے دیکھ لیں" میں نے بچّوں کو اس پہاڑی کی طرف موڑتے ہوئے کہا۔ جو شیر ببر کے لیے خاص طور سے بنائی گئی ہے۔

(اگلے ماہ شیر کا حال سنائیں گے۔)

نیچے کے دائرے میں سرخ نشان کا مطلب ہے کہ اس مہینے کے بعد آپ کی مدت خریداری ختم ہوجاتی ہے۔

ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے پیارے پیام تعلیم کی سرپرستی جاری رکھیں گے ۔۔۔۔۔۔ براہ کرم مبلغ ۶ روپے کا منی آرڈر اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک ہمیں بھیج دیجیے، تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے۔ آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا اور افسوس کے ساتھ اسے بند کردیں گے۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے۔ آپ کا خریداری نمبر ہے

"منیجر"

جناب محمد طالب جامعہ نگر نئی دہلی



لطیفے



ایک راجا نے اپنے دربار میں اعلان کیا کہ دربار میں جتنے بھی درباری ہوں وہ سب اپنی اپنی پسند کا پھل دربار میں لائیں۔

اعلان سن کر سب درباری حاضر ہو گئے۔ سب سے پہلے ایک درباری نے راجا کی خدمت میں بیر پیش کیے۔ دیکھ کر راجا غصّہ میں بھر گیا اور اس نے حکم دیا۔ یہ بیر اسی گدھے کے منہ میں ٹھونس دو۔ جلّاد نے فوراً سارے کے سارے بیر اس کے منہ میں ٹھونس دیے۔

پھر ایک اور درباری حاضر ہوا اور اس نے بڑے ادب سے راجا کی خدمت میں تازہ تازہ موٹے موٹے امرود پیش کیے۔ اب تو راجا کا غصّہ اور بھی بڑھ گیا اور اس نے غصّے سے چیختے ہوئے کہا۔ تم لوگوں کا دماغ خراب ہو گیا ہے کیا جو یہ پھل میرے پاس لائے ہو۔ آم، سیب، انگور وغیرہ نہیں لا سکتے تھے۔ یہ امرود بھی اسی کے منہ میں ٹھونس دو۔ جلّاد جلدی جلدی تمام امرود اس کے منہ میں ٹھونسنے لگا۔ یہ درباری بے چارہ روتا بھی جاتا ہنستا بھی جاتا۔ بادشاہ نے پوچھا کیا بات ہے تو ہنس بھی رہا ہے اور رو بھی رہا ہے؟" اس نے کہا" حضور رو تو اس لیے رہا ہوں کہ منہ میں بہت سخت تکلیف ہو رہی ہے اور ہنس اس لیے رہا ہوں حضور کہ یہ سامنے والا درباری تو تربوز لے کر آیا ہے۔"

(۲) ایک صاحب ریل کے فرسٹ کلاس کے ڈبے میں سفر کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد پیشاب کرنے غسل خانے گئے۔ دروازہ کھولتے ہی سامنے چمکدار شیشے میں ان کو اپنا عکس نظر آیا۔ اور وہ سوری SORRY کہکر واپس آ گئے۔ کچھ دیر بعد پھر گئے مگر پھر سوری (معاف کیجیے گا) کہہ کر لوٹ آئے۔ ان صاحب کا پیشاب کے مارے برا حال تھا۔ پھر گئے اور پھر واپس آ گئے ——— تھوڑی دیر بعد اسٹیشن آ گیا۔ انھوں نے پاس سے گزرتے ہوئے ایک ٹکٹ چیکر سے کہا۔ "صاحب ذرا دیکھیے گا۔ باتھ (پیشاب خانے) میں نہ جانے کون بیٹھا ہے کہ نکلتا ہی نہیں"۔ ٹکٹ چیکر نے کھول کر دیکھا اور سوری (معاف کیجیے) کہہ کر جلدی سے دروازہ بند کر دیا۔ پھر ان صاحب سے بولا "معاف کیجیے جو کوئی ریلوے کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ میں مجبور ہوں"۔

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا۔

ب مہر ردولوی تھانہ

جامعہ کا مہِ تاباں ہے
پیامِ تعلیم

سب رسالوں میں نمایاں ہے پیامِ تعلیم
کتنی خوبی سے درخشاں ہے پیامِ تعلیم

صرف بچوں کا نہیں پیر و جواں کا مرغوب
اک سرسبز گلستاں ہے پیامِ تعلیم

یہ رہِ علم کا ساتھی بھی ہے اک رہبر بھی
خوب تعلیم کا ساماں ہے پیامِ تعلیم

ماہِ نو کی طرح ہر ماہ نکلتا ہے یہ
جامعہ کا "مہِ تاباں" ہے پیامِ تعلیم

اس کی نظمیں ہیں طرب افزا مضامیں پیارے
کیسا مرغوبِ دل و جاں ہے پیامِ تعلیم

صدرِ ۱ جمہوریہ ہند سے نسبت ہے اسے
ان کے ہی فیض کا عنواں ہے پیامِ تعلیم

بزمِ اردو کے ابھرتے ہوئے فن کاروں کا
اک سنورتا ہوا ایواں ہے پیامِ تعلیم

قدر دانو! اٹھو کچھ اس کی ضیافت کر لو
علم ۲ کے شہر کا مہماں ہے پیامِ تعلیم

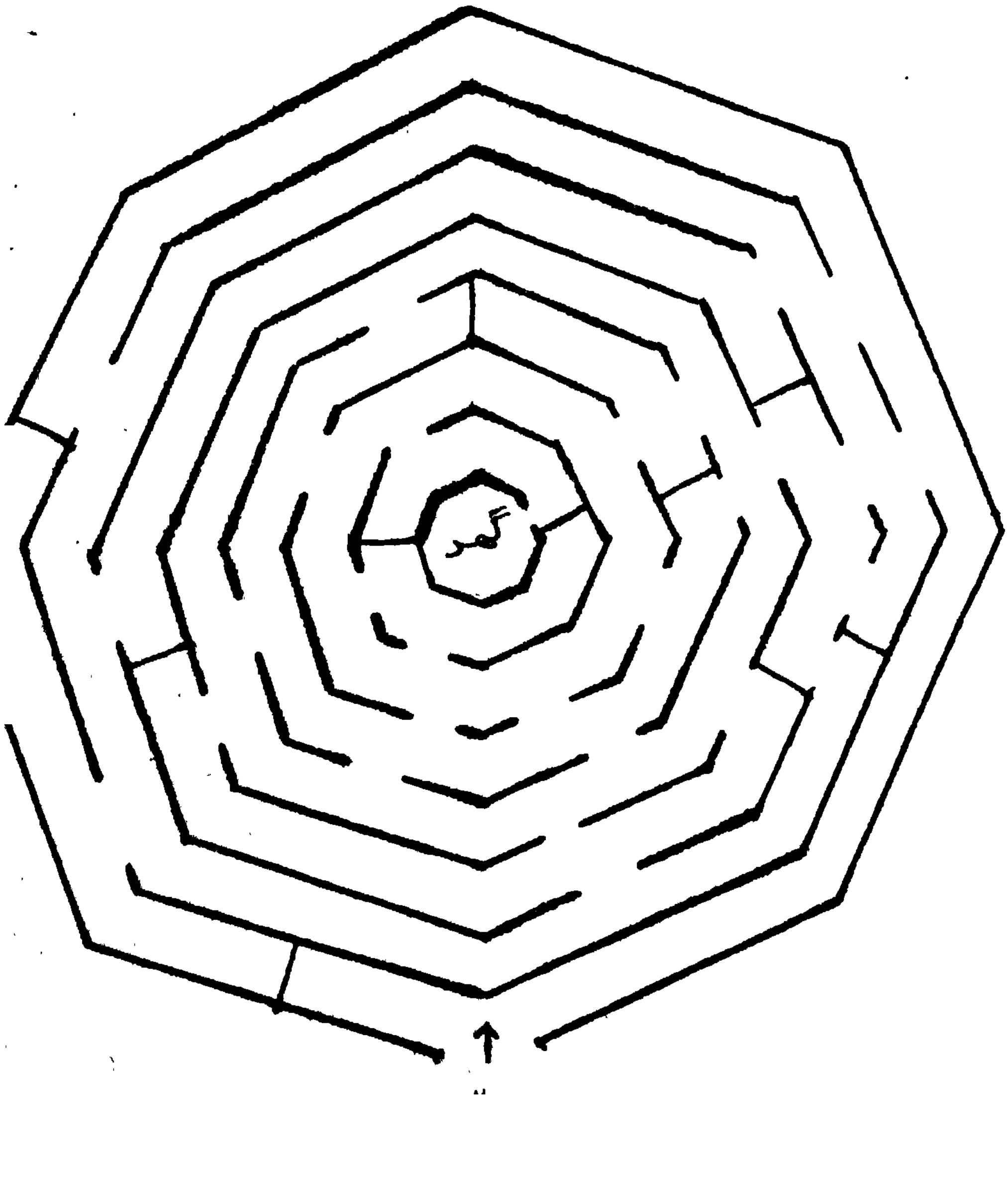
بزمِ احباب میں توسیعِ اشاعت کا ابھی
دوستو آپ سے خواہاں ہے پیامِ تعلیم

مہرؔ میرے لیے اس دورِ پریشانی میں
دل کی تسکین کا ساماں ہے پیامِ تعلیم

۱۔ صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین ۲۔ جامعہ نگر دہلی

دماغی ورزش

یہ دلچسپ کھیل ننھے پیامیوں کے کھیلنے کا ہے۔ اس گورکھ دھندے میں کچھ لائنیں کھینچی ہیں۔ جو کہیں کہیں کھلی ہیں۔ اس میں آپ کو یہ کرنا ہے کہ جہاں تیر کا نشان ہے۔ وہاں پنسل رکھ لیجیے اور پنسل کو بغیر اٹھائے اس گورکھ میں اس طرح لائن کھینچیے کہ لائن پہلی ہی بار میں اندر بنے ہوئے گھر تک پہنچ جائے۔ اور بس اس بات کا خیال رکھیے کہ پنسل ان میں سے کسی لائن کو کاٹے نہیں۔ اب دیکھیں کون پہلے گھر تک پہنچتا ہے۔



مکتبہ جامعہ کی شایع کردہ بچوں کی کتابیں

مذہب

آں حضرت الیاس احمد مجیبی ۔/۷۵ تاریخ ہند کی کہانیاں سوم مشتاق احمد اعظمی ۔/۸۰ میر انیس محمد حسین حسان ۱/۲۵

ارکانِ اسلام مولانا اسلم جیراجپوری ۔/۵۰ ۔ ۔ ۔ چہارم ۔/۹۵ ہماری پالیمنٹ کیلاش چندر ۱/۵۰

چار یار الیاس احمد مجیبی ۱/۳۰ بڑے دادا کی کہانی پروفیسر عبدالغفور ۔/۵۶ **کہانیاں**

خلفائے اربعہ خواجہ عبدالحیٔ فاروقی ۱/۵۰ ٹیگور صفدر حسین ۱/۲۵ ابو خاں کی بکری ڈاکٹر ذاکر حسین ۲/۵۰

رسولِ پاک عبدالواحد سندھی ۱/۸۰ چٹانوں کی کہانی محمد امین ۱/۷۵ اس نے کیا کرنا چاہا آصف مجیب ۔/۳۷

سرکارِ دو عالم محمد حسین حسان ندوی ۲/۔ خبر رسانی کے طریقے رفیعہ امین ۔/۸۵ پاک کہانیاں اوّل مقبول احمد سیوہاروی ۱/۴۰

عقائدِ اسلام مولینا اسلم جیراجپوری ۔/۵۰ دہلی ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی ۱/۵۰ ۔ ۔ دوم ۔ ۔ ۱/۱۵

مسلمان بیبیاں اعجاز الحق قدوسی ۔/۸۵ دنیا کے بسنے والے بشیر حسین زیدی ۔/۷۵ تانبیل خاں محمد حسین حسان ۔/۳۰

نبیوں کے قصے خواجہ عبدالحیٔ فاروقی ۱/۔ دنیا کے بچے محمد حسین حسان ۔/۸۰ ترکوں کی کہانیاں ۔/۵۵

ہمارے رسولؐ ۔ ۔ ۱/۴۰ سمندر کے کنارے سلطانہ آصف فیضی ۱/۳۰ چقماق کی ڈبیا برکت علی فراق ۔/۴۰

ہمارے نبی سید نواب علی رضوی ۔/۴۰ سمندر کے نیچے ۔ ۔ ۲/ چھوٹی لالٹین مشتاق احمد اعظمی ۔/۳۱

معلومات

سماجی زندگی اوّل احمد الیس ہٹیل ہادے چنبیلی محمد حسین حسان ۔/۵۰

آدمی کی کہانی مشتاق احمد اعظمی ۱/۱۵ غلام ابرار ۔/۵۶ چمپاوت کا آدم خور شیر۔ محمد معین ۔/۲۵

انوکھا عجائب خانہ اوّل، محمد حسین حسان ۔/۵۰ ۔ ۔ دوم ۔ ۔ ۔/۸۰ خربوزہ شہزادے کا سر ہوگیا۔ کوثر بانو ۔/۳۰

۔ ۔ (دوم) ۔ ۔ ۔/۸۰ ۔ ۔ سوم ۔ ۔ ۔/۸۱ شہزادی گلنار پروفیسر عطاء اللہ ۔/۴۰

۔ ۔ (سوم) ۔/۸۰ چہارم ۔ ۔/۸۱ شیدلا پروفیسر محمد مجیب ۔/۵۰

۔ ۔ (چہارم) ۔/۵۰ قدرت کے کرشمے ۔/۶۲ لال مرغی عبدالواحد سندھی ۔/۵۰

بجلی کی کہانی علی احمد خاں ۔/۵۰ مفید معلومات دوم ۔/۷۵ مزہ چکھائیں گے۔ ۔/۲۵

بجلی اور مقناطیس کے کھیل ۔/۷۵ ۔ ۔ سوم ۱/۲۵ ننھا ٹٹو خورشید سلطانہ ۔/۳۰

تاریخ ہند کی کہانیاں اوّل خجستہ سلطان ۔/۸۰ چہارم ۱/۵۰

۔ ۔ دوم ضیاء الرحمٰن ۔/ معلومات کی پانچویں کتاب ۱/۵۰

جناب اعجاز اختر

خریدار درخت



ایک زمانہ میں روس میں ایک امیر کسان رہتا تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سے تین تو بڑے چالاک تھے لیکن بے چارہ چوتھا بہت سیدھا تھا۔ اس کا نام تھا ایوان۔ ایوان کے تینوں بھائی اس کا مذاق اڑایا کرتے۔

کسان کے مرنے کے دن آئے تو اس نے اپنا کھیت تینوں ہوشیار بیٹوں میں بانٹ دیا۔ بے چارے ایوان کو صرف ایک گائے دی۔ وہ بھی دبلی پتلی بیمار۔۔ ایک دن صبح ایوان نے اپنے بھائیوں سے کہا "میں اپنی گائے کو بازار لے جا رہا ہوں۔ اسے بیچ دوں گا۔"

اس کے بھائی ہنسنے لگے بے چارے کا مذاق اڑاتے ہوئے بولے "گائے بیچنے کے بعد کہیں تم خود ہی نہ بک جانا" بے چارے ایوان کو بہت ستایا۔ مگر وہ اپنی گائے کو لے کر شہر کی طرف چلا۔ راستے میں جنگل پڑا۔ گائے پیچھے پیچھے چلی آ رہی تھی۔ وہ ایک درخت کے پاس سے گزرا۔ اسی وقت تیز ہوا چلی۔ اس درخت کی ڈالیاں چرمرانے لگیں۔

"چرر۔۔۔۔۔۔۔ چرر۔۔۔"

"ارے، تم کیا کہہ رہے ہو" ایوان نے درخت سے پوچھا۔

"چرر۔۔۔ چرر۔۔۔۔۔" درخت نے جواب دیا۔ ایوان سمجھا جیسے وہ کہہ رہا ہو "میں تمہاری گائے خریدنا چاہتا ہوں"

"اچھا ـــــ تم میری گائے خریدنا چاہتے ہو۔ مگر یہ تو بتاؤ کہ اس کے کتنے پیسے دے سکو گے"

"چرر۔۔۔ چرر" درخت کی آواز پھر آئی۔ ایوان سمجھا کہ درخت نے کہا ہے "بیس روپیہ"

"بیس روپیہ ـــــــ؟" ایوان نے کہا "اچھا! پھر تو میں ملک کا سب سے امیر آدمی بن جاؤں گا ـــ تو دیکھو۔ یہ تمہاری گائے ہے"

اور ایوان نے اپنی گائے کو پیڑ سے باندھ دیا۔ اور پوچھا "ہاں ـــ اب لاؤ ـــ پیسے کہاں ہیں"

"چرر ـــ چرر" درخت کا جواب تھا۔

"کیا کہا تم وعدہ کرتے ہو کہ کل اس کی قیمت دو گے" ایوان نے اس بار بھی درخت کی چرمراہٹ سے

مطلب نکال لیا۔ ”اچھا — تو میں کل صبح آؤں گا۔“

اور ایوان اپنی گائے کو پیڑ سے بندھا چھوڑ کر گھر چلا آیا۔ گھر پر اس کے تینوں بھائیوں نے اس کا خوب مذاق اڑایا۔ ایوان اپنی سب باتیں انھیں بتا جو دیتا تھا۔

”تم تو اس سے بھی زیادہ بے وقوف نکلے جتنا ہم سمجھتے تھے۔“ ایک بھائی نے کہا۔

”تمھیں تمھارے پیسے کبھی نہیں ملیں گے۔“ دوسرے بھائی نے کہا۔

”اور تم اپنی گائے کو کبھی نہیں پا سکو گے۔ رات کو اسے کوئی چور لے گیا ہوگا۔“ تیسرے بھائی نے کہا۔ اور بے چارا ایوان کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

اگلی صبح سورج نکلنے سے پہلے ایوان جنگل کی طرف روانہ ہوا۔ اور جب وہ اس درخت کے نیچے پہنچا جہاں اس نے گائے باندھی تھی تو وہاں گائے نہیں تھی۔

”میری گائے کہاں ہے؟“ ایوان نے غصہ سے پوچھا۔

”چرر — چرر۔“ درخت نے جواب دیا۔ اس کی شاخیں اب بھی ہوا کی وجہ سے آواز پیدا کر رہی تھیں۔

”کیا کہا —“ ایوان نے درخت کی آواز سے مطلب ڈھونڈ کر کہا۔ ”اسے جنگلی درندے کھا گئے۔ خیر — مگر میرے بیس روپیہ کہاں ہیں؟“

”چرر — چرر — چرر۔“ درخت پھر چرچرایا۔

”اچھا تم وعدہ کر رہے ہو کہ کل دوگے۔“ ایوان نے کہا۔ ”مگر نہیں — میں تمھاری چال میں آنے والا [illegible]

اور یہ کہہ کر ایوان نے اپنی کلہاڑی اٹھائی یہ کلہاڑی وہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اور پیڑ کے تنے کو کاٹنا شروع کیا۔ اس نے ابھی تھوڑا ہی سا کاٹا ہوگا کہ اسے ایک جگہ کھوکھلا حصہ نظر آیا۔ اس میں ایک تھیلی رکھی تھی۔ اس تھیلی میں ہزاروں سونے کے سکے تھے۔

”بھلا یہ دولت کس کی ہو سکتی ہے؟“ ایوان نے تعجب سے پوچھا۔

”چرر — چرر۔“ درخت نے جواب دیا۔

ایوان سمجھا کہ درخت کہہ رہا ہے۔ ”کئی سال پہلے میرے تنے میں ڈاکوؤں نے یہ دولت چھپائی تھی۔ اسے سب سے پہلے تم نے ڈھونڈھا ہے اس لیے رکھ لو۔ یہ تمھاری گائے کی قیمت ہے۔“

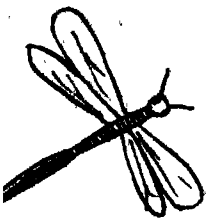
ایوان نے تھیلی اٹھالی۔ سکے گنے اور گھر کی طرف چلا۔

گھر پر اس کے ایک بھائی نے کہا۔ ”کیا تمھیں اپنی گائے کی قیمت مل گئی۔ بیس روپے —؟“

”بیس نہیں ہزاروں۔“ ایوان نے کہا اور پورا واقعہ سنا دیا۔

پھر اس نے ایک کھیت خرید لیا۔ اور محنت کرنے لگا اور خوشی خوشی اپنی زندگی گزارنے لگا — اور ہاں — اس کے کسی بھائی نے پھر اس کا مذاق نہیں اڑایا۔

جناب سید خواجہ معین الدین ام۔ اے۔ بی ایڈ



یہ انوکھے کیڑے





(بڑے پیامیوں کے لیے)

ہماری اس دنیا میں چرند، درند، پرند، پودے اور درخت، ندی نالے، جھیل اور سمندر بھی ہیں انھیں ہم خدا کی مخلوق کہتے ہیں، پر بھئی خدا کی ایک اور مخلوق بھی تو ہے جسے ہم نے آپ نے یا تو نظر انداز کر دیا ہے یا پھر اسے خاطر میں نہیں لاتے اور جناب وہ ان گنت ہے اس کی ہزاروں قسمیں ہزاروں نسلیں ہماری آپ کی اسی زمین پر نہایت کامیاب زندگی گزار رہی ہیں۔

میری مراد "کیڑوں مکوڑوں" سے ہے۔ ان کی ڈیڑھ لاکھ سے زیادہ نسلیں یہاں بستی ہیں اور ہر سال چار ہزار سے زیادہ نئے کیڑے زمین پر پیدا ہوتے ہیں۔ یہ ایک قیاسی گنتی ہے۔ ماہرین کا خیال ہے کہ اصلی حساب اس قیاسی گنتی سے کئی گنا زیادہ ہے۔

ان کیڑوں مکوڑوں کو قدرت نے مختلف رنگ روپ اور عجیب عجیب عادتیں دے رکھی ہیں۔ ان کی مدد سے وہ ہر جگہ ہر ماحول میں رہنے سہنے کے قابل ہوتے ہیں۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ بھونرے کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو صرف سرخ مرچ ہی میں پھل، پھول سکتی بھلا سرخ مرچ میں کوئی جان دار اپنی نسل کو جاری تو دور کی بات ہے چند لمحوں کے لیے جی بھی سکت

حال ہی میں ماہرین نے ایک ایسے چھو مخصوص کیڑے کا پتہ لگایا ہے جو صرف گھوڑے کی زبان پر زندگی گزارتا ہے، یہی نہیں بلکہ اسی زمی آسمان کے درمیان چند ایسے کیڑے بھی ہیں جن ہے، نہ منھ، نہ پیٹ، پھر بھی وہ جی رہے ہیں، زند مزے لے رہے ہیں۔

کیڑے دیکھنے میں تو ایک دوسرے معلوم ہوتے ہیں لیکن ان میں چند باتیں مشترک سی ہیں۔ موسم بہار کے شروع میں ایک بڑا پتنگا د دیتا ہے یہ اپنے رنگین پروں اور بالوں کی وجہ اچھا لگتا ہے۔ اس مکھی کو بھی دیکھیے جو اپنے ریشم ج اور بالوں کے ساتھ کسی ندی کے کنارے ٹھہر پانی میں شام کے وقت ایک خاص آواز

...تی ہے گویا آپ کو سریلے نغمے سنا رہی ہو اور چاروں ... ناچتی بھی جاتی ہو۔

اور سنیے کیڑے کے بدن میں ہڈیاں نہیں ہوتیں، ... ایک بیرونی ڈھانچا ہوتا ہے۔ یہ انسانی ڈھانچے سے ... مختلف ہوتا ہے۔ انسان کا دل جسم کے بیچوں بیچ ... مضبوط صندوقچے کے اندر محفوظ رہتا ہے۔ جیسے ہم سینہ ... ہیں لیکن ایک کیڑے کا دل اس کی گردن کے اوپری ... میں ہوتا ہے، اس کے پیر دراصل اس کے جلدی ... ڈھانچے کے نالی دار حصے ہیں جن کے رگ پٹھے نازک ... سے بھرے ہوتے ہیں اور اندر کی جانب نہایت ... احتیاط کے ساتھ لگے ہوتے ہیں یہی اس کے ہتیار بھی ... ۔ پیر کیڑے کے بھاری جسم کو سنبھالتے ہیں۔

اچھا اب کسی امریکی ماہر کے ایک دلچسپ تجربے ... حال بھی سنیے۔ اس نے ایک دھبے دار بھونرے ... اوپر رفتہ رفتہ ہلکی ہلکی چیزوں کا بوجھ لاد دیا۔ یہ بوجھ اس ... اپنے وزن سے آٹھ سو پچاس گنا زیادہ تھا تعجب ... انتہا نہ رہی جب اس نے یہ دیکھا کہ وہ کیڑا بجائے ... جانے کے، نہایت آسانی سے حرکت کر رہا تھا ... حالاں کہ اوسط درجے کی صحت اور جسم کا آدمی اپنے وزن ... دو تہائی بھی بڑی مشکل سے اٹھا سکتا ہے۔

یہ نرم و نازک ڈھانچا ان کمزور ہڈیوں کے لیے ... ناہی مضبوط بھی ہوتا ہے۔ ایک تیتری جو دیکھنے میں ... نٹ کتارے کے بیج سے بھی کم ہوتی ہے تقریباً تین ... ار میل کا سفر کر سکتی ہے۔ تجربہ کرنے والوں نے مادہ

رنگین تیتریوں کے جسم پر امتیازی نشان لگا کر دیکھا ہے کہ وہ شمالی افریقہ سے آیس لینڈ تک طویل سفر اختیار کرتی ہیں۔ حالاں کہ انھیں راستے میں طوفانوں اور بادلوں کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ صرف اتنا دیکھا گیا کہ ان کے پر پھٹے ہوئے تھے۔

کیڑوں کے باہری ڈھانچوں میں لچک اور پھیلاؤ کی گنجائش نہیں ہوتی۔ انھیں اپنے مقررہ وقت پر اپنی جلد بدلنی پڑتی ہے اور پر و بال بھی بدلنے پڑتے ہیں۔ اپنے وقت پر ان کا غلاف پھٹ جاتا ہے اور اس میں سے نہایت نازک کیڑے نکل آتے ہیں۔ ان کے جسم میں ہڈی نہیں ہوتی اور جلد بھی بہت نرم ہوتی ہے۔ اس لیے یہ کیڑے اپنی جسامت بدلنے کے لیے ہوا اور پانی پی کر اپنے جسم کو پھلاتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اپنی مقررہ جسامت تک پہنچ جاتے ہیں۔ البتہ اس ڈھانچے کے سخت اور مضبوط ہونے تک ان کو ایک ہی جگہ ٹھہر کر انتظار کی گھڑیاں گزارنا پڑتی ہیں۔

کیڑوں کے جسم میں دورانِ خون کا کوئی ایسا انتظام نہیں ہوتا جیسا جانوروں میں پایا جاتا ہے۔ صرف ایک رگ ہوتی ہے جو دل سے نکل کر جسم کے درمیانی حصے تک پہنچتی ہے اور اس کے ذریعے خون سارے بدن میں دوڑ جاتا ہے۔ کیڑے کے جسم میں کئی امدادی دل بھی ہوتے ہیں جو مضبوط پٹھوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔ یہ دراصل خون پھینکنے یا پمپ کرنے والے اسٹیشن ہیں اور یہی امدادی دل خون کو جسم کے مہین ریشوں کے آخری کناروں تک

پہنچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایک جھینگر کا دل اس کے سر میں ہوتا ہے اور یہی دل اس کی مونچھوں میں بھی خون پہنچاتا ہے۔

کیڑے کا سانس لینا نرالی وضع کا ہوتا ہے۔ اس کے نہ پھیپھڑے ہوتے ہیں نہ ہماری طرح وہ ناک اور منھ سے سانس لیتا ہے۔ بلکہ اس کے بازوؤں میں نہایت باریک باریک سوراخ ہوتے ہیں جو سلیقے کے ساتھ قطاروں کی شکل میں ہوتے ہیں۔ ان میں ہر سوراخ ایک ہوائی موری جیسا ہوتا ہے جو جسم کے اندر ہوا کا ایک راستہ ہے۔ پھر اس سے ہزاروں راستے نکلتے ہیں جو جسم کے ہر حصّے تک پہنچ جاتے ہیں، ان میں ہوا کی ایک مسلسل رو جاری رہتی ہے۔

کیڑا سستاتے وقت آکسیجن کم استعمال کرتا ہے، البتہ اڑنے کی حالت میں بہت زیادہ آکسیجن کی ضرورت ہوتی ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اڑنے کی حالت میں اس کو پچاس گنا زیادہ آکسیجن درکار ہے۔ پروں کے پٹھوں کے سکڑاؤ کی وجہ سے سانس تیز تیز چلنے لگتی ہے اور اس کے جسم میں جلد جلد ہوا داخل اور خارج ہوتی رہتی ہے اور اس کی جگہ لینے کے لیے تازہ ہوا نالیوں میں گھس آتی ہے۔ آکسیجن کا یہ عمل اس قدر تیز اور مکمل ہوتا ہے کہ کیڑے کے پر کی ایک ایک حرکت پر اس کے اطراف کی ہوا میں فوراً تبدیلی واقع ہوتی ہے۔

کیڑوں کے جسم میں اس کے پر علمِ حرکت کی ایک عمدہ مثال پیش کرتے ہیں۔ ڈراگن مکھی اپنے ہی پروں کے بل بوتے پر چالیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے اڑتی ہے حالاں کہ اس کے پر بہت ہی نازک ہوتے ہیں [illegible] پھر اپنے پروں کو فی سیکنڈ سو بار حرکت دیتا ہے۔ اسی بناء پر وہ اپنے وزن سے [illegible] اٹھا سکتا ہے۔ یہ بوجھ وہ خون ہے جو وہ کسی [illegible] سے چوستا ہے۔ چوں کہ اس کو اپنی اڑان بھی قا[illegible] ہے اسی لیے وہ اپنے پروں کو بڑی تیزی سے [illegible] جس سے ایک سریلی آواز نکلتی ہے اور یہ آوا[ز] [illegible] حرکت کا نتیجہ ہے۔ آپ نے ذوق کا یہ شعر شاید [illegible]

مچھر سے سیکھے شیوۂ فراغی کوئی - جب کاٹنے کو آئے تو [illegible]

اسی طرح ایک اور کیڑا "مِڈج" ہے [illegible] ہوتا ہے کہ مشکل سے دکھائی دیتا ہے۔ لیکن جب [illegible] اس کے پروں کی آواز سے پتہ چلتا ہے کہ و[ہ] [illegible] وہ اپنے پروں کو، اڑتے وقت فی سیکنڈ ایک [illegible] جنبش دیتا ہے۔

پھر ایسے کیڑے ہیں جو اڑ نہیں سکتے [illegible] ہی چلتے پھرتے اور رینگتے ہوئے اپنی قوت [illegible] ایک اور انداز سے کرتے ہیں۔ ایک چھوٹی مکھ[ی] [illegible] پر گھریلو کتوں پر پائی جاتی ہے اپنے قد سے [illegible] لگاتی ہے۔

کیڑے دیکھنے میں بالکل کمزور معلو[م] [illegible] لیکن ان کی طاقت اور برداشت کی قوت [illegible] میں ایک امریکی سائنس داں ڈاکٹر ایچ۔ [illegible] نہایت دلچسپ تجربے کیے ہیں۔ انھوں نے [illegible] نالیوں میں کیڑے اور تتلیاں بھر دیں [illegible]

ہوا خارج کرکے ان کے اندر ہوا کے دباؤ کو گھٹایا پھر بڑی پھرتی سے توڑ دیا تاکہ ان میں ہوا کا دباؤ فوراً ئے. یہ دھکا اس قدر شدید ہوتا ہے کہ ہاتھی بھی تاب نہیں لا سکتا اور وہیں دم توڑ دیتا ہے. مگر یہ کوڑے بڑی آسانی سے دوبارہ کلبلانے لگے۔

کیڑے بالکل سادہ اور معمولی قسم کا دماغ رکھتے وہ آواز کو صرف دو طرح سے سنتے ہیں (۱) نازک کے ذریعے جو آواز کی موجوں ہی کے لیے حساس ہیں اور انھیں وصول کرتے ہیں - (۲) کان کے ں کی طرح چند جھلیوں کو چند مخصوص قسم کے سُری سکتے ہیں۔ جھینگر کے کان ہوتے ہیں. پانی کا بھنورا سینے سے سنتا ہے۔ جھاڑیوں میں رہنے والے جھینگر کی غیر معمولی قوت کے مالک ہوتے ہیں

بہت سے کیڑے ایسی آواز بھی سن پاتے ہیں کو انسانی کان سن ہی نہیں سکتے۔ کیڑوں کے علم کے ن کا خیال ہے کہ رات کے اندھیرے میں جب موت سا سناٹا چھایا ہوا ہوتا ہے ان ہی کیڑوں کے ترانوں فضا گونجتی رہتی ہے جسے انسانی کان محسوس نہیں سکتے۔

کیڑوں کی آنکھیں بہت باریک ہوتی ہیں۔ بس کی آنکھیں کہہ لیجیے۔ ان آنکھوں کا سر میں ہونا بھی ی ضروری نہیں۔ یہ آنکھیں بعض کیڑوں کے بازوؤں بھی ہوتی ہیں۔

روشنی کو پسند کرنے والا کیڑا باوجود بند آنکھوں کے بے خطر سا یوں ہی میں پہنچ کر دم لیتا ہے۔ اب کس طرح کہا جائے کہ یہ اپنی بند آنکھوں سے دیکھتے ہیں شاید یہ کہنا صحیح ہوگا کہ یہ اپنی جلد سے دیکھتے ہیں کیڑے ان آنکھوں کے ذریعے مرکب اور ملون قسم کے رنگوں کا مشاہدہ بخوبی کرتے ہیں۔

علم کے دیوانوں یعنی سائنس دانوں نے یہاں تک کامیابی حاصل کی ہے کہ انھوں نے مکھی کی آنکھ سے دنیا کے فوٹو لیے ہیں۔ یہ تصویریں نقش و نگاری کاری اور جڑاؤ کام کا بہترین مرقع ہیں۔ جیسے انھیں کسی شوخ مزاج اور منچلے نے سجایا ہو۔ ڈراگن مکھی کی آنکھ میں کوئی دو سو پچاس پہلو ہوتے ہیں۔ دور کیوں جائیے گھریلو مکھی ہی کو اپنے ہاتھ سے پکڑنے کی کوشش کر کے دیکھ لیجیے کبھی جو آپ کے ہاتھ آجائے۔ کیوں؟ اس کا سبب اس کی دہری چوطرفی آنکھیں ہیں۔ اسی طرح کیڑوں کی چکھنے کی قوت بھی تیز ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف منھ سے مزے یا ذائقے کا پتہ لگاتے ہیں بلکہ پیروں سے بھی چیزوں کو چکھتے ہیں۔ یہ کیڑے کھانے کی ایسی باریک چیزوں کا پتہ لگاتے ہیں جنھیں صرف خوردبین کی مدد سے ہی دیکھا جا سکتا ہے۔ انسان کی چکھنے کی قوت شکر یا مٹھاس کا پتہ ایک حصہ شکر اور دو سو حصے پانی کی موجودگی میں لگا سکتی ہے۔ لیکن کیڑے ایک حصہ شکر اور تین ہزار حصے پانی کی موجودگی میں مٹھاس کا پتہ لگا لیتے ہیں۔ یہ صفت ہمارے لیے تو ایک عجوبے سے کم نہیں۔

اور بھی جس قدر طاقت ان کی چکھنے کی قوت

میں ہے۔ اسی قدر تیز ان کی سونگھنے کی قوت بھی ہے۔
ایک کیڑے کے لیے یہ دنیا ایک عطر فروش کی دکان ہے جہاں خوش بو اس کی ناک کی جھلیوں کو گدگداتی رہتی ہے اس قوت کو کیا نام دیا جائے جس کی مدد سے ایک نر پروانہ اپنی مادہ کا پتہ ہوا کے رخ پر نو میل دور فاصلے سے لگا لیتا ہے۔

محسوس کرنے کی ان قوتوں کے علاوہ جو ہمیں بالکل خیالی اور وہمی معلوم ہوتی ہیں، چند اور چیزیں ہیں جن کی حقیقت اور اصلیت کا عملی ثبوت اب تک نہیں ملا۔ لیکن ان سے انکار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ایک بھونرے کے پر، بال اور پیروں پر چپڑا لاک لپیٹ کر اس کے احساس کی تمام قوتوں کو معطل کر کے دیکھا گیا کہ وہ گوشت کے ایک پوشیدہ ذخیرے تک بڑی آسانی سے راستہ بھٹکے بغیر پہنچ جاتا ہے۔

جو کچھ علم ہمیں کیڑوں مکوڑوں کے بارے میں حاصل ہوا ہے۔ اس کی مدد سے صرف یہی کہا جا سکتا ہے کہ کیڑے بھی واقعی ایک عجوبہ ہیں۔ ان کی زندگی ایک معما ہے جس کی حقیقت سے ابھی ہم کوسوں دور ہیں، علم کا اتنا پھیلاؤ ہو گیا ہے پھر بھی بقول "نیوٹن" سمندر کے کنارے ہم نے چند سیپیاں چنی ہیں۔ اور سامنے بہت بڑا سمندر ہے۔ جس کی تہہ تک ہمیں پہنچنا ہے۔

جناب شمیم سہسرامی

نیا سال



نئے سال میں کام کچھ کر
برائی سے تم اپنا دامن بچاؤ
غریبوں کا بیڑا کنارے لگاؤ
بھلے کام سے جی نہ اپنا چراؤ
نئے سال میں کام کچھ کر
خوشی کی کرن بن کے تم جگمگاؤ
اندھیرے سے نکلو اجالے میں آؤ
ہمیشہ قدم اپنا آگے بڑھاؤ
بھلے کام کر کے بھلا نام پاؤ
نئے سال میں کام کچھ کر
ہر اک سے محبت سے تم پیش آؤ
کبھی بے نواؤں کا جی مت دکھاؤ
کبھی زندگی کو نہ یوں ہی گنواؤ
ترانے شمیم حزیں کے سناؤ
نئے سال میں کام کچھ کر

مولینا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

ستی:- ستی کا منظر ایک دفعہ میں نے بھی دیکھا ہے ایک ہندو دیوی بناؤ سنگھار کیے گھوڑے پر سوار تھی۔ ہندو مسلمان جلوس کی شکل میں ساتھ تھے آگے باجا بجتا جاتا تھا اور برہمن سنکھ بجا رہے تھے ایک دفعہ ابرھی میں دیکھا یہ تین بیوائیں تھیں جنہیں ستی ہونا تھا۔

تین دن پہلے سے گانے بجانے میں لگی رہیں۔ ان کے لیے عمدہ عمدہ قسم کے کھانے تیار ہوتے تھے جنہیں یہ کھاتی تھیں اور گاتی تھیں پاس پڑوس کی عورتیں آتی تھیں اور ان سے گلے ملتی تھیں۔ چوتھے دن ہر ایک کے لیے ایک ایک گھوڑا آیا اور یہ سوار ہو کر چلیں ان کے زیور جگمگا رہے تھے اور سب کی سب عطر میں بسی ہوئی تھیں۔ دائیں ہاتھ میں ناریل تھا اور بائیں ہاتھ میں آئینہ تھا۔ آئینہ کو بار بار دیکھتیں اور مسکراتیں برہمن گھیرے ہوئے تھے۔

عزیز اور رشتہ دار ساتھ ساتھ تھے آگے آگے نوبت نقارے بجتے جاتے تھے اور ہر ایک ہندو ڈنڈوت کرتا اور کہتا تھا ہمارے ماتا پتا کو سلام پہنچا دینا ستی ہونے والی عورتیں وعدہ کرتی تھیں۔

میں بھی اپنے دوستوں کے ساتھ ستی ہونے کی جگہ پر گیا، تین کوس چل کر ایسی جگہ آئی جہاں جھاڑیاں تھیں۔ اور اندھیرا تھا بیچ میں چار گنبد تھے اور ہر ایک میں ایک ایک مورتی رکھی تھی۔

گنبد کے بیچ میں پانی کا ایک تالاب تھا جس پر گھنے درختوں کے سبب دھوپ نہ پڑتی تھی جس وقت عورتیں گنبد کے پاس پہنچیں تو تالاب میں اشنان (غسل) کیا اور ڈبکیاں لگائیں قیمتی کپڑے اور زیور اتار کر الگ رکھ دیا اور موٹی موٹی ساڑھیاں باندھ لیں تالاب کے قریب ایک گڑھے میں آگ دہک رہی تھی جس پر سرسوں کا تیل ڈالا جا رہا تھا۔ کچھ لوگ لکڑی کے سرکنڈوں اور پتلی پتلی لکڑیوں کے گٹھے لیے کھڑے تھے۔ آگ کے سامنے موٹے کپڑوں کی اوٹ کر دی گئی تھی۔ ایک طرف باجے نفیری اور نقارے والے کھڑے تھے۔ اتنے میں ایک عورت بڑھی اور اس نے زبردستی اوٹ کو پھینک دیا اور کہا میں جانتی ہوں یہ آگ ہے تم مجھے ڈراتے ہو پھر آگ کی طرف منہ کر کے ڈنڈوت کی اور بے دھڑک کود پڑی۔ عورت کے کودتے ہی لکڑیوں کے گٹھے اور سرکنڈے دھادھم پھینکے جانے لگے۔ اور باجے گانوں کی آوازوں سے پوری فضا گونجنے لگی۔ میں اس منظر کی تاب نہ لا سکا اور بے ہوش ہو گیا۔ میرے دوست سنبھال نہ لیتے تو گر پڑتا اف کتنا ہولناک منظر تھا ستی ہونا واجب نہیں ہے۔ لیکن جو عورتیں ستی نہیں ہوتی ہیں انہیں حقارت سے دیکھا جاتا ہے۔

اور بڑی ذلت کی زندگی بسر کرنی پڑتی ہے بعض ہندو ڈوب کر مرجاتے ہیں خاص طور پر گنگا میں ڈوب کر مرنا زیادہ اچھا سمجھتے ہیں۔ یہ لوگ سال بسال گنگا میں ڈبکی لگانے جاتے ہیں۔ اور اپنے مردوں کی راکھ بھی گنگا میں بہاتے ہیں۔

اگر کوئی گنگا میں ڈوبتا ہے تو یہ کہہ کر ڈوبتا ہے کہ میں کسی سے ناراض ہو کر یا کسی سے ڈر کر نہیں ڈوبتا ہوں گسائیں کی رضامندی کے لیے ڈوبتا ہوں۔ ڈوبنے والے کی لاش نکال کر جلادی جاتی ہے اور اسے گنگا میں یا کسی دوسری ندی میں بہادیا جاتا ہے۔

سرستی :۔

اجودھن سے چل کر ہم سرستی پہنچے۔

سرستی بڑا شہر ہے۔ یہاں چاولوں کی کثرت ہے اور اچھے سے اچھا چاول مل جاتا ہے۔ پھر ہانسی گئے۔ ہانسی کی عمارتیں بڑی اور فصیل بہت اونچی ہے۔

قاضی القضاۃ کمال الدین صدر جہاں قطلوخان اور شمس الدین کا وطن ہے۔ کمال الدین سب سے بڑے قاضی ہیں اور قطلوخان بادشاہ کے استاد تھے، شمس الدین قطلوخان کا بھائی ہے۔ دو دن بعد مسعود آباد پہنچے۔ یہ جگہ دلّی سے قریب ہے، بادشاہ دارالسلطنت میں نہیں ہے۔ قنوج گیا ہے۔ بادشاہ کی ماں مخدومہ جہاں احمد بن ایاز خواجہ جہاں موجود تھے۔

خواجہ جہاں نے ہم میں سے ہر ایک کے مرتبے کے لحاظ سے استقبال کے لیے آدمی بھیجے۔ میرے استقبال کے لیے شیخ بطانی شریف ماژندرانی فقیہ علاءالدین ملتانی اور سلطان کے معزز مقربین میں سے شیخ ظہیر الدین زنجانی تشریف لائے۔

دہلی میں ہمارا داخلہ

دہلی بڑا شہر ہے عمارتیں خوبصورت اور مضبوط ہیں دہلی کی فصیل اتنی مستحکم ہے دنیا میں اس کی مثال نہیں ہے۔ مشرق کا کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا دہلی کئی شہروں سے مل کر بنی ہے۔

وہ دہلی جو راجاؤں کے زمانے کی ہے۔ وہ دہلی جسے دارالخلافہ کہتے ہیں، تغلق آباد جہاں پناہ[1]

دہلی کی فصیل کی چوڑائی گیارہ ہاتھ ہے جس میں کوٹھے اور مکانات بنے ہوئے ہیں۔ ان میں غلّہ کا ذخیرہ بھی رکھا جاسکتا ہے اور محافظ بھی رہتے ہیں اس کی کھتیوں میں غلہ خراب نہیں ہوتا۔ میرے سامنے ان کھتیوں میں سے چاول نکالے گئے، جوار اور مکہ نکالی گئی لوگوں نے بتایا کہ شاہ بلبن کے زمانے میں ان چاولوں کا ذخیرہ کیا گیا تھا۔ گوداموں میں ہوا اور روشنی کے تابدان بنے ہوئے تھے۔

یہ فصیل اتنی چوڑی ہے کہ اس پر دو تین سوار اور پیادے شہر کے چاروں طرف گھوم سکتے ہیں، دیوار نیچے سے پتھر کی اور اوپر سے اینٹوں کی بنی ہوئی ہے۔

شہر کے اٹھائیس دروازے ہیں کچھ نام یہ ہیں ۔

بدایوں دروازہ	مندوی دروازہ	گل دروازہ
نجیب دروازہ	کمال دروازہ	غزنی دروازہ
پالم دروازہ	بجالصہ دروازہ۔ گل دروازہ کے باہر باغات ہیں۔ بجالصہ دروازہ کے باہر شہر والوں کے لیے قبرستان

---

[1] یہ بات ذہن میں رکھئے کہ یہ تغلق آباد والی دلی ہے اور اسی دلی کی فصیل کا ذکر ہے۔

ہیں۔ محلوں میں سبزہ پر قبریں بنی ہیں بعض پر گنبد بھی بنے ہیں جن کے چمن میں چنبلی بیلا شبو اور دوسرے پھولوں کے پودے ہیں۔

جامع مسجد

دلی کی جامع مسجد میں تیرہ گنبد ہیں ایک منبر ہے۔ یہ سب پتھر کے ہیں۔ جامع مسجد بڑی وسیع ہے دیواریں چھتیں اور فرش ہر چیز تراشی ہوئی ہے جنہیں سیسے سے جوڑا گیا ہے۔ مسجد کے بیچ میں ایک لاٹ ہے۔ کہتے ہیں کہ اسے سات دھاتوں سے پگھلا کر بنایا گیا ہے میں نے اس کی پیمایش اپنی پگڑی سے کی تو تیس ہاتھ لمبی نکلی صحن میں سرخ پتھر کا ایک مینار ہے جس کی نظیر دوسرے اسلامی ملکوں میں نہیں مل سکتی۔ اس کے اندر کا زینہ اتنا چوڑا ہے کہ ہاتھی چڑھ جاتا ہے میں جب اس پر چڑھا اور نیچے کے آدمیوں کو دیکھا تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے چھوٹے چھوٹے بچے چل رہے ہیں [1]

مشہور تالاب

تالاب شمسی

یہ تالاب مسجد کے باہر ہے اسے سلطان شمس الدین التمش نے تعمیر کرایا ہے۔ یہ دو میل لمبا اور ایک میل چوڑا ہے۔ مغربی سمت میں پتھر کے گھاٹ ہیں جن کی شکل چبوتروں کی سی ہے۔ ہر چبوترے کے کونے پر گنبد ہیں جن پر بیٹھ کر پانی کی روانی کا منظر دیکھا جا سکتا ہے۔

برسات میں جب پانی بڑھ جاتا ہے تو کشتی میں بیٹھ کر بیچ والے گنبد میں جاتے ہیں جہاں ایک چھوٹی سی مسجد ہے اور اکثر عبادت گذار لوگ اس مسجد میں رہنے لگے ہیں تالاب کی زمین خشک ہو جاتی ہے تو خربوزہ اور تربوز کی کاشت کی جاتی ہے۔ ککڑی اور گنا بھی بویا جاتا ہے۔

حوض خاص

یہ تالاب حوض شمسی سے بھی بڑا ہے اس کے کناروں پر چالیس گنبد ہیں آس پاس گانے ناچنے والے رہتے ہیں گانے بجانے والی عورتیں رمضان کے زمانے میں پوری پابندی سے تراویح پڑھتی ہیں۔

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی

حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کا مزار بہت مشہور ہے اور ان کے مرقد کی بڑی تعظیم کی جاتی ہے مشہور ہے کہ جب کوئی غریب مفلس قرض دار آ جاتا یا کوئی نادار اپنا جو ناداری کے سبب اپنی لڑکی کی شادی نہ کر سکتا تو حضرت خواجہ قطب الدین سونے یا چاندی کا ایک کاک اسے دے دیا کرتے تھے اسی لیے انھیں کاکی کہتے ہیں۔

ایک مزار فقیہ نور الدین کرمانی اور ایک علاء الدین کرمانی کا ہے عیدگاہ کی پشت پر اور بھی بہت سے اولیاء کے مزارات ہیں۔

شیخ محمود کبیا

زندہ بزرگوں میں شیخ محمود کبیا ہیں ہر مسافر کو کھانا کھلاتے ہیں روپیہ اشرفی اور کپڑے تقسیم کرتے ہیں لوگ کہتے ہیں کہ انہیں دست غیب حاصل ہے مجھے بھی ان کی خدمت میں حاضری کا اتفاق ہوا ہے

(باقی آئندہ)

---

[1] [illegible]



جناب مبشر احمد عرسی

خطرناک گروہ

پچھلی سردیوں کی چھٹیوں میں خالہ جان اپنے بچوں تاج، سلیم اور فوزیہ کے ساتھ اور چچی جان اپنے بچوں زیدی، سعید اور ذکیہ کے ساتھ ہمارے گاؤں "کوناپور" آئی ہوئی تھیں، دوسرے دن پھوپی جان کے دو بیٹے جاوید بھائی اور نعیم بھیا موٹر سائیکل پر ہمارے ہاں آ پہنچے، امی نے ان سب کو لکھا تھا کہ اب کی سردیوں کی چھٹیاں وہ سب ہمارے موضع کوناپور میں گذاریں۔

سلیم اور سعید میرے ہم عمر ہیں۔ گیارہویں جماعت میں پڑھتے ہیں، تاج اور زیدی بھیا انجینئرنگ کے طالب علم ہیں، نعیم بھیا میڈیکل کالج میں پڑھتے ہیں اور جاوید بھیا عثمانیہ یونیورسٹی سے سائیکالوجی میں پی، ایچ، ڈی کر رہے ہیں۔

ہمارے گھر میں عجیب چہل پہل تھی روزانہ نئے نئے پروگرام بنتے تھے، بڑی دلچسپی رہتی تھی۔ میں سلیم اور سعید مل کر کبھی گھوڑے کی سواری کرتے، کبھی ایرگن سے میناؤں اور فاختاؤں کا شکار کرتے کبھی قریب کے تالاب میں تیرنے اور مچھلیاں پکڑنے کا مقابلہ ہوتا۔

تاج زیدی اور نعیم بھیا ہم سے کچھ بڑے وہ لوگ ہم سے الگ رہتے۔ ان کی دلچسپیاں بھی سے مختلف تھیں، تاج بھیا کو کہیں سے ایک بھرمار لگ گئی تھی معلوم نہیں اُن کے پاس اُس کا لائسنس بھی تھا یا نہیں۔ مگر ہمیں بندوق دکھا دکھا کر اکڑ ضرور تھے، کبھی ریچھ کو مارنے کا پروگرام بنتا کبھی اور نیل گائے کا شکار کرنے کے خواب دیکھے جا ایک دن تو ان کی خوشی اور اکڑ کی انتہا نہ رہی ہوا ان تینوں نے مل کر بڑی کوششوں سے ایک خرگ کا شکار کر لیا تھا۔

جاوید بھیا کا مشغلہ ہم سب سے مختلف وہ سارا دن یا تو اپنے کمرے میں پڑے سوتے رہتے موٹی موٹی انگریزی کتابوں سے دل بہلاتے ا سوچا کرتا عجیب خشک آدمی ہیں، اگر ان کو مطالعہ تھا تو کیا شہر میں جگہ نہ تھی، کتابیں پڑھ پڑھ کر ڈی کا مقالہ ہی تیار کرنا تھا تو بھلا دیہات آ کیا ضرورت تھی، دیہات میں سیر و تفریح کا اٹھانے کے لیے آتے ہیں یا مطالعہ کرنے کے البتہ جاوید بھیا کی ایک بات مجھے عجیب لگی وہ

انا کھاکر موٹر سائیکل پر کہیں چلے جاتے اور رات کے
ئی بارہ بجے واپس ہوتے۔

غرض چھ سات دن گذر گئے اب ہمیں اپنے
وگراموں کی یکسانیت سے اکتاہٹ سی محسوس
نے لگی، اس لیے ایک دن میں نے سلیم اور سعید
سامنے پکنک کی تجویز رکھی، میں نے ان دونوں کو
یا کہ ہمارے گاؤں سے ۹ میل دور ایک بہت
نا "کرونا" جنگل ہے۔ یہاں تالاب کے قریب کچھ
اڑیاں بھی ہیں، بڑا ہی دلفریب اور پُر فضا مقام
جہاں ہر قسم کے خوش نما درخت ہیں، ہم سیر و تفریح کا
ف اٹھاکر شام تک واپس ہو سکتے ہیں، میری تجویز
سلیم اور سعید نے فوراً اتفاق کر لیا لیکن ساتھ ہی
ی طے ہوا کہ تاج اور زیدی اور جاوید بھائی کو اس
وگرام میں شریک کر لیا جائے۔ ان کی تائید حاصل
نے سے بآسانی اجازت مل جائے گی۔ تاج اور زیدی
ی خوشی سے آمادہ ہو گئے لیکن جب میری توقع کے خلاف
وید بھائی بھی آمادہ ہو گئے تو میری خوشی کی انتہا نہ ہی

دوسرے روز بالکل سویرے ہم نے بیل گاڑی
ضروری سامان لادا، میں نے اپنی ایرگن ساتھ لی،
یدی بھیا سائیکل پر بیل گاڑی کے ساتھ چلنے لگے
ر جاوید بھائی نے غضب ہی کر دیا، انھوں نے موٹر
سائیکل سنبھالی، غرض ہم سب معمولی ناشتہ کر کے روانہ
ئے۔ امی اور خالہ جان لاکھ سمجھاتی رہیں کہ تم اس قدر

لیکن ہم نے سنی ان سنی کر دی، غرض ہم دلچسپ باتیں کرتے ہوئے
ہرے بھرے درختوں کے جھنڈ میں سے گذرتے ہوئے اپنی
منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوئے، راستہ میں بڑا لطف
رہا، ہمارے اس لطف کا وہی لوگ بخوبی اندازہ کر سکتے
ہیں، جنھیں جاڑے کی ٹھنڈی صبح کو بیل گاڑی میں
بیٹھ کر جنگل کے سفر کا اتفاق ہوا ہو، ٹھنڈی ٹھنڈی
ہواؤں کے جھونکے چل رہے تھے، ہر طرح کے پرندوں
کی آوازیں مل کر ایک عجیب کیفیت پیدا کر رہی تھیں،
لال لال سورج کے طلوع کا سماں ایک بہار دکھا رہا تھا
کوئی دو ڈھائی گھنٹوں میں ہم اپنی منزل پر پہنچ گئے۔
جاوید بھائی کے کہنے کے مطابق ہم نے ایک گھنے درخت
کے نیچے اڈا جما دیا، میں نے بیلوں کو ایک درخت
کے سایہ میں باندھ دیا اور انھیں چارہ ڈال دیا، پھر
ہمارا پروگرام شروع ہو گیا، زیدی نے باورچی کا کام
اپنے ذمہ لیا وہ ایسے کاموں میں بڑے ہوشیار ہیں،
جاوید بھیا وہیں پیڑ کے نیچے لیٹ کر کتاب کا مطالعہ
کرنے لگے۔

ہم چاروں طرف پھیل گئے، پرندے چہچہا رہے
تھے، جانور چوکڑیاں بھر رہے تھے، میں نے اپنی ایرگن
سنبھالی، اس وقت میرا نشانہ بلا کا تھا۔ میں نے دو
تیتر اور ایک فاختہ ماری اور تاج بھیا نے اپنی چھرّے دار
سے ایک خرگوش مارا، ہم خوشی خوشی شکار لے کر آ گئے
زیدی نے جلد جلد خرگوش اور فاختہ بھون کر مزیدار

تھے اور پھر جنگل کا مقام تھا کھانا خوب جی بھر کے کھایا کھانا ایسا لذیذ معلوم ہوا کہ مجھے اب تک اس کا مزا یاد ہے۔

کھانا کھانے کے بعد ہم پہاڑ پر چڑھے جاوید بھیا بھی ہمارے ساتھ تھے، پہاڑ پر ہم نے سیتا پھل توڑ کر کھائے، نعیم بھیا کے ساتھ کیمرہ تھا، وہیں چند اچھے منظر دیکھ کر بہترین پوز کے چند فوٹو لیے، پہاڑ سے اتر کر کافی دیر تک تالاب میں تیرتے رہے۔

اب شام ہو رہی تھی، سورج آہستہ آہستہ غروب ہو رہا تھا "اب ہمیں چلنا چاہیے" میں نے رائے دی۔ "تھکے ہوئے ہیں، گاؤں بہت دور ہے، اب کیسے جا سکتے ہیں، رات میں یہیں ٹھہر کر صبح چلے جائیں گے" زیدی نے کہا۔

لیکن میں نے بتایا کہ یہ خطرے کی جگہ ہے۔ شام ہوتے ہی جنگلی درندوں کا ڈر لگا رہتا ہے، پرسوں ہی ایک غریب آدمی شیر کا شکار ہو گیا۔ ایک ہفتہ ہی کی بات ہے کہ ایک چیتا ایک گائے اٹھا لے گیا"

میری ساری باتیں بے کار گئیں، کسی نے میری بات نہ مانی اور کہنے لگے کہ جب سیر ہی کو آئے ہیں تو بے جا دوڑ بھاگ سے کیا فائدہ، رات یہیں پیڑ کے نیچے سو جائیں گے، اگر شیر آیا تو ہم مار بھگائیں گے۔

نعیم صاحب بڑے بزرگانہ انداز میں کہنے لگے "میاں ہر ایک کو اپنی جان پیاری ہوتی ہے" ہم اتنے آدمی ہیں، ہمارے پاس شیر، چیتا بھٹک بھی نہیں سکتا، شاید وہ بے چارہ اکیلا تھا جو [illegible] اس جنگل میں شیر کا شکار ہوا"

میں ان باتوں سے اکتا کر جاوید بھائی طرف دیکھنے لگا، ان کے چہرے سے سنجیدگی ٹپک تھی، پیشانی پر شکنیں ابھر آئی تھیں، جیسے کچھ سوچ ہوں۔

"آپ کا کیا خیال ہے؟" جاوید بھائی نے پوچھا۔

"جیسی بھی تم لوگوں کی مرضی" انھوں نے دیا، ان کے لہجے میں نہ رضامندی کا اظہار ہو ر ناراضگی کا ——— خیر اکثریت کا لحاظ کر ٹھہر گئے، ہم احتیاطاً دو تین بستر لائے تھے، ہم محفوظ مقام دیکھا، بستر بچھا، ہاتھ کا تکیہ بنا لیٹ تمام دن کے تھکے ہوئے، سب تھوڑی دیر م لینے لگے، سب گہری نیند سو رہے تھے، لیکن میری نیند کہاں اڑ گئی تھی، ہزار آنکھ بند کر کی لیکن وہی شیر چیتے کا خیال غالب رہا، د بالکل ساکت تھے، ہوا بالکل نہ چل رہی تھی لیکن کھٹکا اور میرا دل کانپنے لگا، ابھی شیر آئے گا سب کو چیر پھاڑ کر کھا جائے گا، میں پلک جھپ سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا، خیال تھا کہ جب ذ آنے لگے تو سعید کو اٹھا کر پہرہ دینے کے لیے چھوڑ کر سو جاؤں گا، کیوں کہ میرے بعد پہرہ کی باری تھی۔

تقریباً بارہ بج گئے لیکن نیند کا

پھر نہ معلوم کیسے میری آنکھ لگ گئی، واہ ری نیند، واہ ری، رات کی رانی، گھنے جنگل اور شیر چیتوں کے بیچ میں آخر سلا ہی گئی ۔

ٹھائیں! دفعتاً ایک فائر ہوا ۔ سب نیند سے چونک اٹھے، میں آنکھیں پھاڑے چاروں طرف دیکھ رہا تھا، اندھیرے میں ہلکا سا سایہ دکھائی دیا کہ سامنے کچھ لوگ بندوق تانے کھڑے ہیں ۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ سب کے چہروں پر کالی نقابیں تھیں اور ان میں ایک کالی قبا والا ہرن کی کھال اوڑھے ہوئے تھا ۔

"سب اٹھ جاؤ" ایک کرخت آواز سنائی دی۔

ہم سب خوف سے جلد جلد اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اور حیرت سے ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے، میں نے آہستہ سے ہر ایک کا نام لے کر پکارا اور انھوں نے اوں! ہاں کر کے جواب دیا ۔ اور مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ جاوید بھائی غائب ہیں۔

"سب ایک ساتھ جنوب کی طرف چلو" پھر وہی خوفناک آواز آئی اور ہم تعمیل حکم میں سیدھے چل پڑے ہمارا سارا سامان وہیں پڑا ہوا تھا ۔ ہمیں اس کا بالکل خیال نہ تھا، کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے کسی میں یہ پوچھنے کی جرأت تھی ہمیں وہاں کیوں لے جایا جا رہا ہے؟ تم اس طرح حکم دینے والے کون ہوتے ہو، ہم سیدھے اپنی بنائے چل رہے تھے اور ہم سب بندوق کی نالی کی زد میں تھے ۔

ہم [illegible] چلتے چلتے [illegible] مڑ کر [illegible]

کر دیکھا تو ایک آدمی ہمارا سامان سمیٹ رہا تھا، اب مجھے پکا یقین ہو چلا تھا کہ یہ ضرور لٹیرے ہیں، ہم ۲۵، ۳۰ منٹ تک برابر چلتے رہے ۔ ہم کو ایک پہاڑی پر لے جایا جا رہا تھا، جب ہم کافی اوپر پہنچ گئے ۔ دو نقاب پوشوں نے آگے بڑھ کر ایک بڑا سا پتھر اٹھایا اور کچھ کھٹ کھٹ کرنے لگا، میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ایک دم سے ایک بڑی سی چٹان اپنی جگہ سے سرک گئی ، ہمارے سامنے ایک بڑا تہہ خانہ تھا، ایک نقاب پوش سیڑھیوں پر سے اترنے لگا اور آواز دی کہ "میرے ساتھ چلو"

ہم سب یکے بعد دیگرے اترنے لگے ۔

"چلو اترو" ایک لٹیرے نے تاج بھیا کو ڈھکیل دیا ۔

"حرامی" انھوں نے اس کے ہاتھ سے بندوق کھینچ کر ایک کندا جما دیا۔

"باپ رے" "تجھے ابھی مزہ چکھاتا ہوں" وہ جھپٹ پڑا، لیکن تاج بھیا ایک دم پیچھے ہٹ گئے ۔

"یہ کیا حرکت ہے ؟" غالباً ان کا سردار بیچ میں آگیا اور اسے ڈانٹنے لگا وہ شرمندہ ہو کر ایک طرف چلا گیا پھر ہم آہستہ آہستہ اترنے لگے، کافی اندھیرا پھیلا ہوا تھا آخری سیڑھی سے نیچے قدم رکھتے ہی آنکھیں چکا چوند ہو گئیں، حیرت میں میں نے اوپر نظر کی تو کوئی ۲۵، ۳۰ فٹ کی بلندی پر برقی قمقمے اپنی تیز روشنی پھیلا رہے تھے اور بڑے بڑے [illegible]

نیچے اترنے کے بعد ہمیں دو جماعتوں میں تقسیم کیا گیا، میں تاج اور سلیم ایک کمرے میں اور زیدی نعیم اور سعید ایک کمرے میں دھکیل دیئے گئے۔ ہم تینوں کو جس کمرے میں دھکیل دیا گیا تھا وہ کمرہ کافی کشادہ اور بہترین فرنیچر سے آراستہ تھا، چاروں طرف صوفے رکھے ہوئے تھے، بیچ میں چار یا پانچ کرسیوں کے درمیان ایک راؤنڈ ٹیبل رکھی ہوئی تھی، دیواروں سے لگے چینی کے باٹ وارنل بھی تھے ــــ صابن دانی، دانت مانجھنے کا منجن اور ایک صاف تولیہ بھی تھا۔

ہم تینوں صوفوں پر دھنس گئے اور ایک دوسرے کا منھ دیکھنے لگے کمرہ میں بالکل سکوت طاری تھا اور ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک کمرے میں تین گونگوں کو چھوڑ دیا گیا ہے، ۵، ۱۰ منٹ کمرے میں خاموشی رہی آخر اس قیمتی فرنیچر کو دیکھتے ہوئے میں نے ہی سکوت کو توڑا۔

"کیا ہم زبردستی کسی نواب کے مہمان بنائے گئے ہیں" "معلوم ایسا ہی ہوتا ہے" تاج کہنے لگے "اور ابھی آپ کے خیال شریف کے مطابق آپ کے میزبان جناب نواب صاحب آپ کے استقبال کے لیے تشریف لائیں گے اور زحمت دہی کی معافی مانگتے ہوئے جناب کی خدمت میں حلوہ سوہن پیش کریں گے، کیا آج صبح گھاس کھائی تھی تم نے؟"

"کیوں کیا مطلب" میں نے کہا۔

"میاں! ہم بدمعاشوں کے ہاتھوں میں پڑ گئے ہیں اور نہ معلوم ہمیں کس غرض سے لائے"

"تو کیا یہ ہمیں مار ڈالیں گے"

"مجھے کیا معلوم"

"تو کیا یوں ہی پڑے اپنی موت کا انتظار"

"تو تم کیا کرو گے" تاج بھیا بولے۔

"ہم بآسانی یہاں سے بھاگ سکتے ہیں مجھے یاد ہے کہ نقاب پوش نے ہم کو اندر ڈھکیل بند نہیں کیا تھا اور نہ باہر سے چٹخنی لگانے آئی تھی"

"شاباش! کیا ترکیب سوچ نکالی ہے دروازہ کھولنے کی کوشش تو کر دیکھو" تاج بھیا

میں اور سلیم مل کر دروازے تک آئے، د کے کواڑ لگے ہوئے تھے ــــ میں نے کنڈی کھینچنا چاہا لیکن کچھ بھی نہ ہوا، میں نے اور سلیم نے بار زور سے کھینچا لیکن دروازہ ٹس سے مس نہ "بے کار کوشش نہ کرو اس کمرے کے سارے د آٹومیٹیکل سسٹم کے تحت کھلتے اور بند ہو نے شاید غور نہ کیا کہ ہمارے اندر داخل ہوتے خود بخود بند ہو گیا تھا" تاج بھیا بولے۔

"باپ رے باپ" سلیم مجھ سے مخا کہنے لگا "یہ کیا ناگہانی بلا میں پھنس گئے بات مان کر ہم شام ہی کو گھر چلے جاتے تو اور ہم دونوں سلیم کی گھبراہٹ سے اندر ہی اندر ہوتے ہوئے قہقہہ لگانے لگے چھوڑ

نفہ کے بعد میں نے پوچھا کر "سمجھ میں نہیں آتا کہ زیدی
میا وغیرہ کو الگ کیوں کر دیا گیا، ممکن ہے کسی بازو کے
رے میں ہوں۔ شاید ہم آواز دیں تو جواب دیں۔"

"چلو یہ بھی آزما کر دیکھو" تاج نے کہا اور میں
ر زور سے چیخنے لگا لیکن کچھ جواب نہ ملا بلکہ میری ہی
واز کمرے میں گونج کر رہ جاتی تھی "یہ خواہ مخواہ گلا پھاڑ
ہے ہو، یہ کمرہ ساؤنڈ پروف معلوم ہوتا ہے، تم اگر
ہاں توپ بھی داغو گے تو باہر کچھ نہ سنائی دے گا" تا
ج بھیا نے کہا۔

میں خاموش صوفے پر بیٹھ کر سوچ میں ڈوب
گیا، میرا خیال الف لیلیٰ کی کہانیوں میں بھٹکنے لگا
ور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے میں ایک طلسمی عجائب
خانہ میں آگیا ہوں، دو تین گھنٹے یوں ہی گذر گئے، نیند
غائب ہو ہی چکی تھی، نہ جانے کتنے بج گئے تھے کون
ورات ہمارے لیے برابر تھے۔ ہم تینوں میں سے کسی
کے پاس گھڑی بھی نہ تھی کہ وقت معلوم کرتے۔

میں نے اندازہ لگایا کہ غالباً اب صبح ہو رہی
ہے، دیوار میں لگے نل کے پانی سے وضو کیا اور وہیں
صوفے پر زندگی میں پہلی بار اس قدر خشوع و خضوع اور
تہہ دل سے نماز پڑھی اور پھر زور زور سے رو کر
اللہ میاں سے اس قفس سے رہائی کے لیے دعائیں
مانگنے لگا۔

ہم تینوں منہ ہاتھ دھو کر پھر صوفوں پر بیٹھ
گئے، تھوڑی دیر بعد ہم سب کچھ بھول گئے، نہ جانے
کیوں ہمارے چہروں پر اطمینان کی جھلک تھی، حالانکہ
ایک تو ہم قید تھے، دوسرے جاوید بھائی غائب تھے
میں نے تاج بھیا سے پوچھا: "آخر جاوید بھائی کہاں
ہوں گے، کہیں ان شیطانوں نے انھیں قتل نہ کر دیا ہو"
تاج بھیا بولے، "مجھے تو ایسی امید نہیں اور اگر خدانخواستہ
ایسا ہو بھی گیا ہو تو ہماری بھی خیر نہیں۔ جب مرنا ہی
ہے تو پھر ڈرنا کیوں، زندگی کے یہ چند لمحے خوشی سے
کیوں نہ گذاریں، مگر وہ ہمیں مارنے کیوں لگے، ہمیں
مار کر انھیں کیا حاصل ہوگا۔"

میں ان کی فلسفیانہ باتوں سے حیران تھا۔

تاج بھیا نے جیب سے تعلیمی تاش نکالا اور
ہم نے کھیلنا شروع کیا تین چار کھیل ہوئے، میں
بے دلی سے کھیلتا رہا، دھیان ایک طرف ہو تو کچھ
کھیل بھی تے، بھلا اس پریشانی میں مجھے الفاظ بنانا
کہاں سے سوجھتا۔

"اب بس بھی کرو" میں نے اکتا کر کہا، "ہمیں اپنی
جان بچانے اور نکل بھاگنے کی کوشش کرنی چاہیے۔"

تاج بھیا جواب میں کچھ کہنے ہی والے تھے کہ
کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک نقاب پوش اندر داخل
ہوا۔

(باقی اپریل کے پرچے میں)

خط کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر ضرور
لکھیے۔
"منیجر"

جناب محمد شفیع تمناؔ

انساں کی عظمت کا پرچم چاند پہ بھی لہرایا

چاند کی وادیوں میں پہنچنے والے ان تینوں بہادر انسانوں کی قابلِ صد مبارک باد اڑان سے صرف ۲ گھنٹے پہلے یہ نظم لکھی گئی تھی۔

محمد شفیع تمناؔ

بچّو رب نے خوش ہو کر یہ دن بھی اب دکھلایا
انساں کی عظمت کا پرچم چاند پہ بھی لہرایا

ہم تم کہتے آئے تھے جس کو چندا ماما اپنا
لو بھئی پورا ہو کے رہا وہ اپنا پیارا سپنا

اب تو چندا کی نگری میں ہم تم خود جائیں گے
ایک نیا سنسار وہاں بھی بسا کے لوٹ آئیں گے

سچ ہے کہ اس راہ میں کتنی رکاوٹیں تھیں حایل
لیکن دھن کے پکّے رہے اس جدوجہد پہ مایل

آؤ بچّو دیں ایسے انساں کو مبارک باد
چلے جو کرنے چاند پہ بھی اک نیا جہاں آباد

بچوں کی دل چسپ اور معلوماتی کتابیں

	دیپلاس گپتا	۱/۲۵	مصنوعی چاند	اطہر پرویز	۱/۵۰
؟	پ گن میکر	-/۷۵	مندر	دشت نیل کنٹھ گریہ	-/۷۵
	اطہر پرویز	۱/۵۰	نجومی آپا	اطہر پرویز	-/۷۵
۔ کی کہانی	سوامی وہامنے	-/۹۰	نیا تیرتھ	راجیندر راد تھی ترشت	۱/-
پل کے لطیفے	اطہر پرویز	-/۴۰	نہرو امر ہیں	فصاحت حسین خاں	۱/-
ٔی	اطہر پرویز	-/۷۵	ہولی اور چراغ	اطہر پرویز	۱/۶۲
نبال	اطہر پرویز	-/۵۰	ہماری کھیتی باڑی	سیما	۱/-
یوں ہیں	منوہن گاندھی	۱/-	ہماری آباد دنیا	فصاحت حسین	۱/-
ن ہمارا دیس	جاوید اقبال	۱/۲۵	ہندوستان ترقی کی شاہراہ پر	ادھیر موہن سینا پتی	۱/-
کہانیاں (حصہ اول)	شکنتلا دیوی	-/۷۵	ہمارے بن ہماری دولت	رام چندر تیواری	-/۷۵
" (حصہ دوم)	" "	-/۷۵	ہمارا ذہن	وریکا اڈوپا	۱/-
ہانی	اطہر پرویز	۱/۲۵	ہماری سائنس	وزارت حسین	۲/-
ں	شاہد علی خاں	-/۷۵	ہمارا ہندوستان	اطہر پرویز	۱/۷۵
راز	اطہر پرویز	۱/۲۵	اچھا شہری	پبلیکیشنز ڈویژن	۱/-
یں	ییدنا تھو تھے	۱/۲۵	اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	" "	-/۷۵
ر	اطہر پرویز	۱/۲۵	بھارت کی لوک کہانیاں	" "	۱/-
ے بینار	جے بھکو	-/۷۵	پنڈت نہرو سے بات چیت	ثیر منڈی	۲/-
کے کرشمے	وزارت حسین	۲/-	خوش حالی کے لئے منصوبہ بندی	پبلیکیشنز ڈویژن	-/۷۵
کی دنیا	" "	۲/۶۴	رنگا کے گیت	مترجم شمیم کرہانی	۱/-
کی دنیا بہت دور تک ہے	اطہر پرویز	۲/-	سائنس کے چند پہلو	سی وی رامن	۱/۲۵
کا گھرانا	اے وی ایس راما راؤ	-/۷۵	ویکا نند	پبلیکیشنز ڈویژن	۱/۵۰
کے راستے پر	سیما	-/۹۰	ہمارا جھنڈا	" "	۱/-
یادیں	نرولیشو شرما	-/۷۵	ہندوستان کی تاریخ	"	۳/۷۵
	اطہر پرویز	-/۵۶	ہندوستان کی نامور ہستیاں (اول) "	"	۲/۲۵
کہانی	محمد آفاق	۱/-	ہندوستان کی " " (دوم) "	"	۲/۵۰

[illegible]

بچوں کی دل چسپ اور معلوماتی کتابیں

چاچا نہرو	-/۱۰	حضرت امام حسین رضؓ	-/۲۵	تین شہزادے
اصلاحی کہانیاں	-/۳۰	حضرت امام حسن رضؓ	-/۲۵	جادو کا ہاتھ
بچوں کی اخلاقی کہانیاں	-/۳۰	حضرت رابعہ بصریؒ	-/۲۵	جادو کی بطخ
بچوں کا ادب	۱/۵۰	حضرت سلمان رضؓ	-/۲۵	جادو کا گھوڑا
بہادر لڑکا	-/۴۰	حضرت بلال رضؓ	-/۲۵	جادو کا پھل
ٹیپو سلطان شہید	-/۳۰	حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ	-/۲۵	چڑیوں کی ملکہ
جنگل کی دنیا	-/۴۰	حضرت فاطمۃ الزہرا خاتون جنت رضؓ	-/۲۵	خوفناک جادوگر
دل چسپ لطیفے	-/۳۰	ابھرتا سورج	-/۵۰	دیو پیکر درندہ
دل چسپ کہانیاں	-/۳۰	زمین کے تارے	-/۵۰	ڈاکٹر بوجھ بجھکڑ
ڈاکٹر اقبال	-/۳۰	چمکتے موتی	-/۵۰	رحم دل پریاں
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت	-/۳۵	تین قلندر	۲/-	رستم و سہراب
ریل کا سفر	-/۲۵	ایک ننھی راجکماری	-/۲۰	شیش محل
سنہری چڑیا	-/۴۰	ایک ننھی رانی	-/۲۰	شہزادی بدورا
کبڑا گھوڑا	-/۳۰	آدم خور زنگی	-/۳۰	شہزادی پری زاد
مولانا ابوالکلام آزاد	-/۳۰	افراسیاب کی بیٹی	-/۳۰	عراق کی شہزادی
ننھی منی کہانیاں	-/۳۰	بہادر راجکمار	-/۲۰	لنگڑا دیو
سرور دو عالمؐ	-/۵۰	باغی شہزادہ	-/۳۰	مسٹر عقلمند
حضرت صدیق اکبر رضؓ	-/۲۵	بے وقوف پریاں	-/۲۰	مغرور شہزادی
حضرت فاروق اعظم رضؓ	-/۲۵	پریوں کے تحفے	-/۲۰	ہنس مکھ شہزادہ
حضرت عثمان ذی النورین	-/۲۵	پھول شہزادی	-/۲۰	ہیروں کا جزیرہ
حضرت علی شیر خدا رضؓ	-/۲۵	تیسرا انعام	/۲۰	

ب غلام حیدر ام۔اے

نیلم اور فرّخ

(مسلسل)



بے وقت خاں لکڑیوں کے اونچے ڈھیر پر

بیں



لکڑیوں کا ڈھیر جل رہا ہے اور شعلے آسمان
سے باتیں کر رہے ہیں بہت سے لوگ دیکھ رہے ہیں۔

اور ڈھیر میں چاروں طرف سے آگ لگا دی گئی۔ شعلے
اونچے آسمان سے باتیں کرنے لگے۔ شہزادی اس بات پر
یران تھی کہ شہزادے کے ملازموں میں کتنے وفادار لوگ
ہیں جان تک کی پروا نہیں کرتے۔ ملکہ نے بھی کبھی ایسے
دیکھے تھے۔

آگ کے شعلے تین دن تک بھڑکتے رہے۔ آخر پھر وہ بجھ
گئی۔ اور اب وہاں کوئلوں اور راکھ کا ایک ڈھیر نظر آنے لگا۔ اور
لوگوں نے دیکھا کہ بے وقت خاں کوئلوں اور راکھ کے ڈھیر کے بیچ
میں بیٹھے سردی سے اس بری طرح تھر تھر کانپ رہے تھے جیسے
تیز ہوا میں پتہ ناچتا ہے۔ باہر نکلتے ہوئے بے وقت خاں نے
شہزادے سے کہا



کوئلوں اور راکھ کے ڈھیر پر بے وقت خاں
بیٹھے تھر تھر کانپ رہے ہیں۔

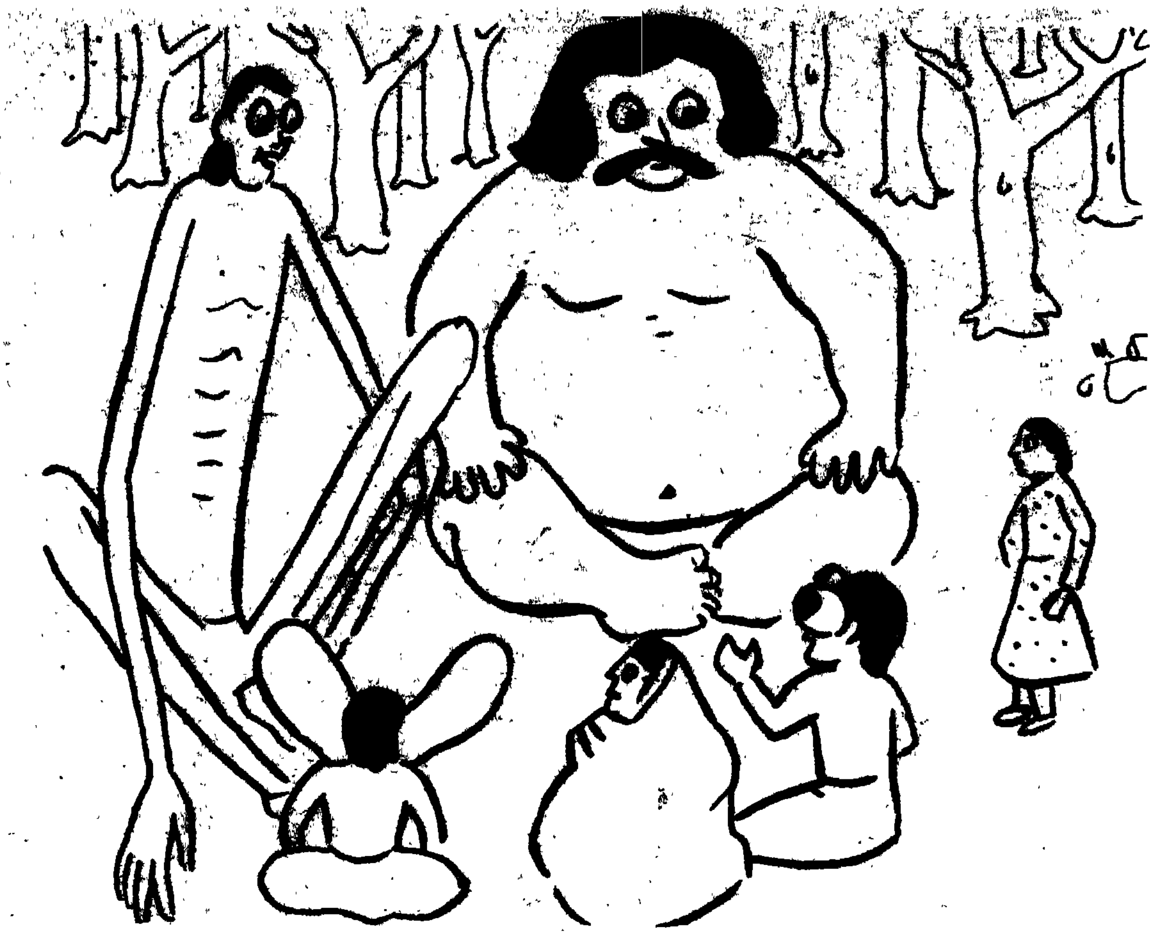


بے وقت خاں :- شہزادہ
ہوں کہ مجھے آج تک اپنی زندگی میں اتنی سخت سردی
اگر ایک آدھ دن مجھے اور یہاں رہنا پڑا تو مجھے یقین ہو
کے مارے میری ہڈیوں کا گودا اور جسم کے سارے جوڑ جم

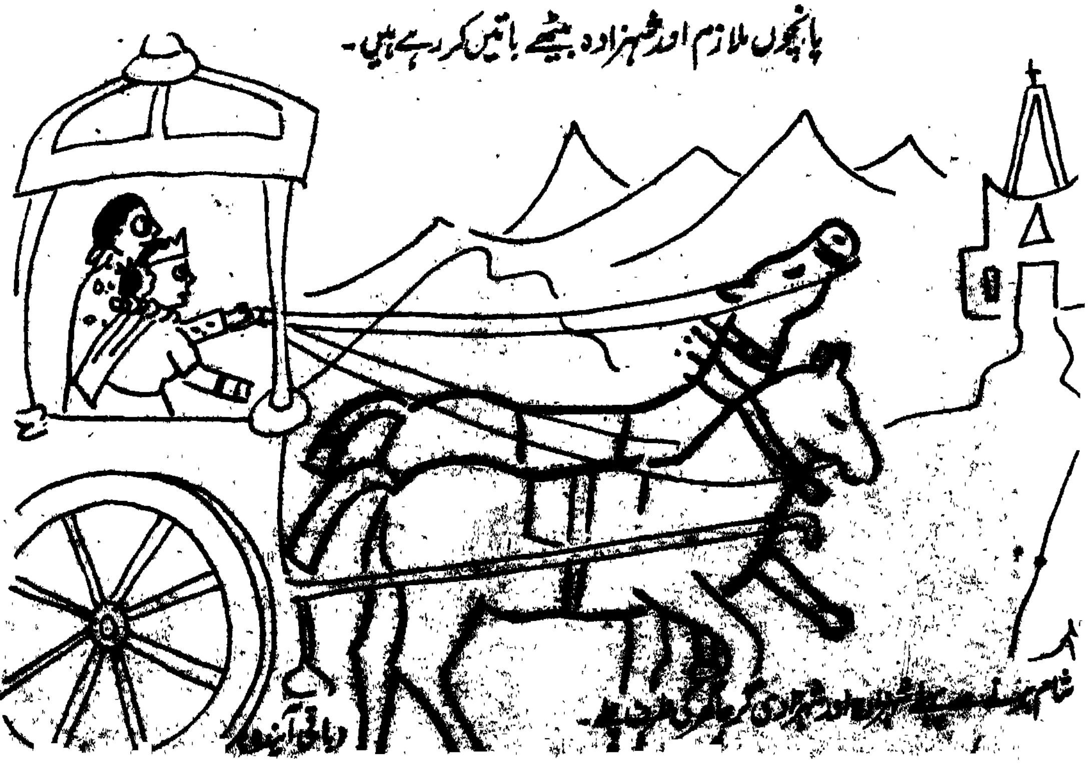
شادی کی تاریخ طے ہو گئی مگر اب بھی ملک
بے ایمانی باقی تھی۔ جس دن شام کو گرجا گھر میں شا
اس نے بہت سے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ پیچھے
کے راستے پر چھپ کر کھڑے ہو جائیں، اور جیسے ہی شہ
شہزادی ادھر سے گذریں وہ چھپ کر فرخ پر حملہ کریں
مار ڈالیں۔

مگر کینٹ نے یہ بات بھی سن لی اور اس
پہلے سے چوکنا کر دیا۔ سوالکا خاں ہشیار ہو گئے۔ اور
سپرد بھی خاص کام کر دیا گیا





پانچوں ملازم اور شہزادہ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔



[illegible]

جناب نثار اعظمی (دہلی)



بھیڑیا اور لومڑی

کسی جنگل میں ایک بھیڑیا رہتا تھا۔ ایک رات اس نے ایک لومڑی کو تاکا اور بے چاری کو پکڑ بھی لیا۔ لومڑی کو اپنے بس میں دیکھ کر بڑے فاتحانہ انداز میں بولا "کیوں بی تم تو اپنے آپ کو بہت چالاک سمجھتی ہو نا؟ پر آج ساری چالاکی دھری کی دھری رہ گئی۔ آگئیں نا میرے قبضے میں ——— اور اب ——— آہا ہا کیسا مزے دار ناشتہ ہوگا۔ بس تیار ہو جاؤ ذرا!"

لومڑی نے جواب دیا "بھیڑیے میاں! یہ تو مجھے معلوم ہے کہ سب کو ایک دن مرنا ہے تو میں موت سے کیوں ڈروں۔"

"ہاں ایک غم مجھے کھائے جا رہا ہے۔ اگر تم مجھے مار ڈالوگے تو میرے خاندان کو بڑی مصیبتیں اور پریشانیاں جھیلنی پڑیں گی اور آج تو میں اپنے ننھے منے بچوں سے ایک وعدہ کر کے آئی ہوں۔ میں ان کے کھانے کے لیے کسان کے کھیت سے پنیر چرا کر لاؤں گی اگر وہ پنیر نہیں پائیں گے تو بہت روئیں گے۔ اس لیے میں تم سے عاجزی سے کہتی ہوں کہ مجھے اپنے لیے پنیر لے جانے کی اجازت دے دو۔ پھر تم سے مار کر ناشتہ کر ڈالنا۔ مجھے کوئی غم نہیں"

بھیڑیے نے کہا "پنیر تو مجھے بھی ... ہے تم کہاں سے لاؤ گی۔ مجھے بھی بتاؤ کہ میں بھی پیٹ بھر لوں۔"

لومڑی نے بھیڑیے کو بتایا کہ کسان اپنے کھیت کے کنوئیں میں رکھتا ہے۔ میں ڈو... کر کنوئیں سے نکال لاؤں گی۔ پھر تم بھی جی ... میرے بچے بھی ذرا زہر چکھ لیں گے۔

بھیڑیا راضی ہو گیا۔ دونوں کنوئیں ... گئے۔ اس وقت چودھویں رات کا چاند نیلے ... چمک رہا تھا۔ ان دونوں نے کنوئیں میں جھانک ... اس کے اندر پانی کی سطح پر گول پیلے چاند ... رہا تھا۔ لومڑی نے بھیڑیے سے کہا کہ دیکھو ... سا پنیر کنوئیں کے اندر ہے۔ جاؤ اسے نکال

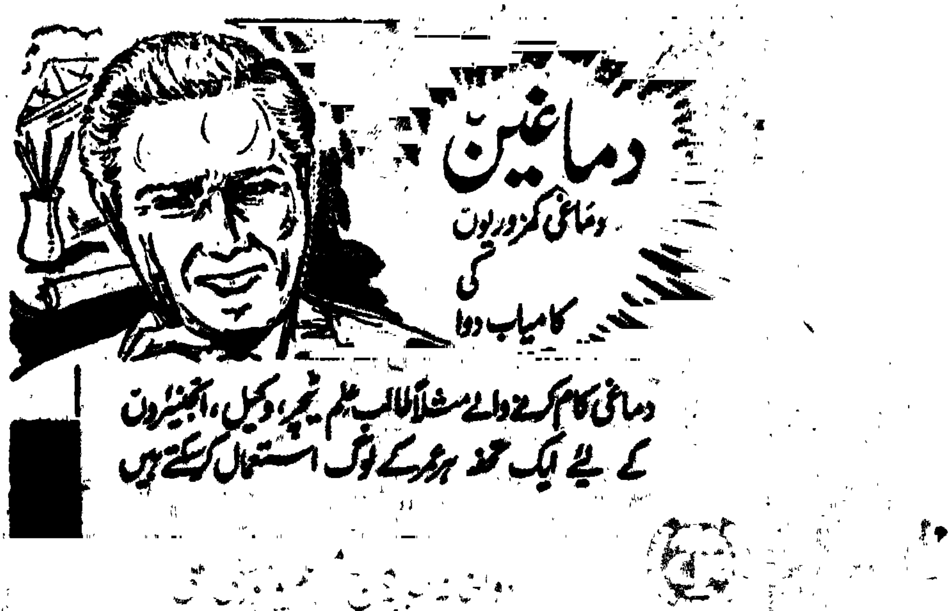
لومڑی کی اس بات پر بھیڑیا اچھل پڑا اور کہنے لگا کہ تم مجھے اتنا بیوقوف سمجھتی ہو۔ میں تمہاری چالوں میں آنے والا نہیں، تم ہی ڈول میں بیٹھ کر جاؤ اور میرے لیے پنیر نکال لاؤ ورنہ میں ابھی تمھیں مار ڈالوں گا۔"

لومڑی مجبوراً ڈول میں بیٹھ گئی اور جب پانی کی سطح کے قریب پہنچی تو بڑے زور سے چلائی کہ یہ تو پنیر کی بہت بڑی ٹکیہ ہے ایسی تو میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھی۔"

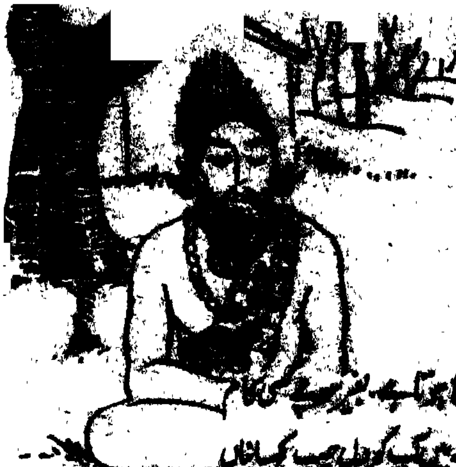
" بھیڑیئے نے اوپر سے چلا کر کہا کہ تم فوراً اسے باہر نکال لاؤ۔"

لومڑی نے جواب دیا "یہ تو بہت بھاری ہے مجھ سے نہیں نکل سکتی۔ تم بھی اندر آجاؤ اسے اوپر لانے میں میری مدد کرو۔" بھیڑیا اندر جانے کے لیے تیار ہوگیا اور کود کر دوسرے ڈول میں بیٹھ گیا اور اندر جانے لگا۔ لیکن جیسے ہی اس کا ڈول نیچے کی طرف چلا لومڑی والا ڈول اوپر آنے لگا۔ کیونکہ دونوں ڈول ایک ہی رسی میں بندھے ہوئے تھے اور چرخی پر چلتے تھے اور جس وقت کنوئیں میں دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ لومڑی نے اپنی زبان نکال کر منھ چڑاتے ہوئے بھیڑیئے سے کہا۔

" بھیڑیئے میاں! خدا حافظ! جلدی کرو کنوئیں میں بڑے مزے کا پنیر ہے!"



جناب محمد رفیق شاستری



پنچ تنتر کی کہانیاں

(مسلسل)

پنچ تنتر کا اب پانچواں اور آخری باب شروع ہوتا ہے۔ بغیر سوچے کسی کام کو کرنے کا کیا انجام ہوتا ہے؟ اس باب میں اسی بارے میں کچھ دلچسپ کہانیاں پڑھنے کو ملیں گی۔

رفیق شاستری

سونے کا سادھو

کسی شہر میں ایک مہاجن رہتا تھا۔ دل کا سخی کا تھا۔ غریبوں کی مدد کرنا اور دل کھول کر خیرات نکالنا۔ اس میں اس کی بہت ساری دولت ختم ہو گئی اور دھیرے دھیرے وہ کنگال ہونے لگا۔ دولت میں کمی آئی تو عزت بھی کم ہونے لگی اور سماج میں مرتبہ بھی گھٹ گیا۔ وہ دن رات اسی فکر میں رہنے لگا کہ کسی طرح امیر بن جاؤں اور پھر پہلے سے زیادہ خیر خیرات کا کام کروں۔ غریبی میں لوگوں پر کیا گذرتی ہے دن رات یہی فکر اس مہاجن کو ستاتی رہتی تھی۔ ایک رات اسی ادھیڑ بن میں اسے نیند آئی تو کیا دیکھتا ہے کہ خواب میں اسے ایک سادھو نظر آیا۔ سادھو نے اس سے کہا کہ میں ایک دیوتا ہوں۔ تمہاری سخاوت سے میں بہت خوش ہوں۔ آج کل تم بہت فکرمند ہو رہے ہو تو سنو کل صبح میں اسی لباس میں آؤں گا مجھے دیکھتے ہی تم مجھے لاٹھی سے مار دینا۔ مرتے ہی میرا جسم سونے کا ہو جائے گا۔ بس اتنے سارے سونے سے تمہارے دن پھر جائیں گے۔

اتنے میں مہاجن کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے سوچا کہ دن رات دھن دولت کی سوچ کرتے رہنے سے ہی اس طرح کا خواب آیا ہے۔ اسی سوچ میں وہ پوری رات گذر گئی اور صبح ہو گئی۔ صبح وہ کیا دیکھتا ہے کہ خواب میں جو سادھو دکھائی دیا تھا وہی صبح اس کے دروازے پر موجود ہے۔ مہاجن کو خواب کی بات یاد آ گئی اور وہ جھٹ گھر کے اندر سے ایک ڈنڈا لے آیا اور سادھو کے سر پر دے ماری۔ سادھو دھڑام سے گر کر مر گیا اور گرتے ہی اس کا سارا جسم سونے کا ہو گیا۔ مہاجن خوش ہوا کہ آخر دیوتا اس پر مہربان ہو گئے۔

یہ سارا تماشا ایک حجام دیکھ رہا تھا اس کو بڑی حیرت ہوئی کہ مہاجن کی لاٹھی سے مر کر سادھو کیسے سونے کا ہو گیا۔ مہاجن نے حجام سے کہا کہ وہ یہ بات کسی سے [illegible] یہ بات کسی سے نہیں کہی۔ اسے [illegible] خواب کی بات تو معلوم نہیں تھی۔ اس نے سوچا کہ سادھوؤں کو مار کر آسانی سے امیر بننے کی ترکیب تو بڑی آسان ہے [illegible] سادھوؤں کو [illegible] تاکہ وہ [illegible] آرام چین سے کٹ جائے۔ اور ایک دن اس نے سادھوؤں کو مارنے کی ٹھان لی۔ وہ قریب کے مندر میں گیا [illegible]

سادھو جو غصّان سے بھاگ کر نکلنے کو کہا گیا۔ ٹھیک وقت پر بنیا کی سادھو کی ٹولی سے حجام کے گھر پہنچ گئے۔ حجام یہاں لاٹھی وغیرہ لے کر سادھوؤں کے انتظار میں پہلے سے بیٹھے تھے۔ جیسے ہی پہلے سادھو نے اس کے گھر کی ڈیوڑھی میں قدم رکھا حجام نے اس کے سر پر زور سے لاٹھی مار دی۔ سادھو تیورا کر گرا اور مر گیا۔ دوسرے سادھوؤں نے یہ دیکھا تو بھاگ کھڑے ہوئے۔ بھاگتے ہوئے سادھوؤں میں سے بھی حجام نے دو تین سادھوؤں کو مار گرایا۔ کئی تو بری طرح زخمی ہوئے۔ مگر حجام کو یہ دیکھ کر بہت حیرت ہوئی کہ ان میں سے کوئی سادھو بھی سونے کا نہیں ہوا۔ وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔ جو سادھو بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے تھے ان میں سے کچھ نے جا کر شہر کے کوتوال کو اس کی اطلاع کر دی۔ قاضی صاحب کچھ کانسٹیبلوں کو لے کر موقع واردات پر پہنچ گئے۔ سادھوؤں کو مرا دیکھ کر قاضی جی کو بھی بہت تعجب ہوا انھوں نے حجام سے دریافت کیا کہ ان سیدھے سادے سادھوؤں کو مارنے کی کیا ضرورت تھی ان کا تو کسی سے کوئی جھگڑا نہیں ہوتا۔

تب حجام نے مہاجن اور سونے کے سادھو کی بات قاضی جی کو سنائی۔ قاضی جی نے یہ بات سن کر مہاجن کو بلایا اور پوچھا۔ کیا تم نے کسی سادھو کا قتل کیا ہے؟ مہاجن نے اپنے خواب اور سادھو کے بارے میں پوری کہانی سنائی۔ قاضی نے حجام کو سزائے موت کا حکم دیا اور کہا کہ بغیر سوچے سمجھے کام کرنے والے کیلئے یہی سزا مناسب ہے۔ آدمی کو چاہیے کہ جو کام کرے اسکے انجام کے بارے میں پہلے ہی [illegible] اور سوچ سمجھ کر [illegible] بے سوچے سمجھے کام کرنے والا اسی طرح پچھتاتا اور دکھی ہوتا ہے جیسے نیولے کو مار کے برہمن کی بیوی کو دکھ ہوا تھا۔

مہاجن نے پوچھا — وہ کیسے؟

تب قاضی نے نیولے اور برہمن کی بیوی کی یہ کہانی سنائی:- (یہ مزے دار کہانی اگلے پرچے میں پڑھئے)

ماہنامہ **کتاب نما** نئی دہلی

ارباب ذوق کے لیے مکتبہ جامعہ کا یہ ماہوار رسالہ نہایت ضروری چیز ہے۔ اردو کی تمام نئی کتابوں کی اطلاع آپ کو اس رسالے سے مل سکتی ہے۔ کسی قابل ذکر دارالاشاعت کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہوتی جس کا اشتہار ہم فوراً اپنے رسالے میں شائع نہ کرتے ہوں۔ آپ کتاب منگائیں یا نہ منگائیں اردو ادب کی ترقی سے واقف رہیں گے۔

یہ رسالہ علاوہ عام باذوق حضرات کے لیے مفید ہونے کے خاص طور پر لائبریریوں اور انجمنوں کے لیے ضروری ہے۔ کوئی کتب خانہ بغیر اس رسالے کی مدد کے نئی کتابوں کا صحیح انتخاب نہیں کر سکتا۔

نمونہ مفت ـــــــ قیمت سالانہ دو روپے

پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی

جناب جنید شرفی پٹنہ



گومیز کا تحفہ

اسپین کی لوک کہانی

کہتے ہیں کہ بہت زمانہ گزرا اسپین میں ایک
نیک دل اور خدا ترس بزرگ رہتے تھے۔ ان کا نام
فرے گومیز تھا۔ ان کی نیکی اور سچائی کی شہرت سارے
اسپین میں تھی۔ بہت دور دور سے لوگ ان کے
پاس آتے اور اپنی عقیدت کا اظہار کرتے، لوگوں کو
یقین تھا کہ وہ خدا کے برگزیدہ بندے ہیں ــــ وہ
اپنے عقیدت مندوں کو صبر، سچائی اور خدا پر بھروسا
کرنے کی نصیحت کرتے۔ اور لوگوں کے دکھ درد دور
کرنے کی کوشش کرتے اپنی شہرت اور نیک نامی پر
گومیز نے کبھی فخر اور غرور نہیں کیا، بلکہ اپنے آپ
کو خدا کا حقیر سا بندہ سمجھتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک غریب آدمی
ان کے پاس آیا ــــ گومیز نے پوچھا۔ "کیوں
میاں تم کیا چاہتے ہو؟"

"میرے محترم بزرگ! میں بہت غریب آدمی
ہوں۔ بڑا سا کنبہ ہے۔ غربت کی وجہ سے میرے
کنبے کے لوگوں کو بھوکوں مرنے کی نوبت آجاتی ہے،
میں سخت مشکلوں اور پریشانیوں میں مبتلا ر
میں چاہتا ہوں کہ کوئی کاروبار شروع کروں
میرے پاس پیسہ نہیں ہے، لوگوں نے مجھے
ہے کہ آپ میری مدد کر سکتے ہیں۔ اور م
دکھ درد دور کر سکتے ہیں۔ اس لیے میں
کے پاس آیا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ
واپس نہیں کریں گے ــــ؟

"خدا پہ بھروسا رکھیے ــــ ساری
وہی آسان کرنے والا ہے۔"

گومیز یہ کہہ کر کچھ سوچنے لگے۔ تھو
دیر بعد بولے۔

"آپ کو کتنا روپیہ چاہیے۔؟"

"صرف پانچ سو روپے۔" اس آد
جواب دیا۔

گومیز کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں
ان کی جھونپڑی میں چند لوٹے پھوٹے بر
معمولی سامان کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

"میں اتنا روپیہ کہاں سے دے سکتا ہوں۔ میں تو خود ایک غریب آدمی ہوں۔"

"مجھے امید ہے کہ آپ مایوس نہ کریں گے۔ میں بڑی امید لے کر آپ کے پاس آیا ہوں ـــ آپ میری ضرورت ضرور پوری کر دیں گے ـــ"

وہ آدمی گڑگڑانے لگا ـ

گومیز خاموش ہو گئے۔ "اچھا جیسی خدا کی مرضی۔"

اتنا کہہ کر وہ جھونپڑی کے اندر چلے گئے اور جھونپڑی کی دیواروں پر نظر دوڑانے لگے ـ انھوں نے دیکھا کہ ایک بچھو کھڑکی کے پاس سے گزر رہا ہے۔ گومیز نے پرانی کتاب سے ایک ورق نکالا اور بچھو اس میں لپیٹ لیا۔

"لیجیے یہ موتی لے جائیے۔ اس کے ذریعے اپنی ضرورت پوری کیجیے، لیکن چھ مہینے کے بعد یہ موتی واپس کر دیجیے گا۔ تاکہ وہ اپنی جگہ چلا جائے۔"

وہ آدمی اپنی مراد پا کر خوش خوش گھر چلا گیا ـــ دوسرے دن وہ ایک جوہری کے پاس گیا۔ جوہری بچھو کی شکل کا نایاب اور بیش قیمت موتی دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ اس نے اپنی زندگی میں [illegible] موتی نہیں دیکھا تھا۔

"[illegible] دے دوں گا۔"

[illegible]

آپ اسے رکھ لیں اور اس کے بدلے مجھے پانچ سو روپے دے دیں ـــ چھ مہینے کے بعد آپ کے روپے واپس کر دوں گا۔ اور یہ موتی لے لوں گا۔"

جوہری نے اس آدمی کو روپے دے دیے۔ اس نے روپے پاتے ہی کاروبار شروع کر دیا اور چھ مہینے کے اندر اس نے خوب ترقی کر لی ـــ ایک روز اس نے روپیہ جوہری کو واپس کر دیے اور موتی گومیز کو دے دیا۔

گومیز نے اس کا شکریہ ادا کیا اور کھڑکی کے قریب موتی کو رکھتے ہوئے بولا۔

"خدا کی مخلوق جاؤ اپنی راہ لگ جاؤ۔"

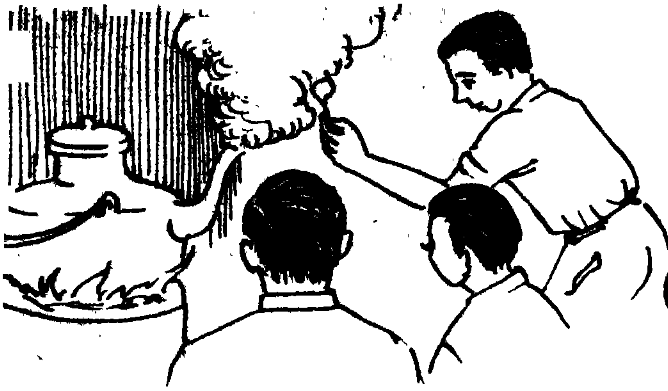
دوسرے لمحہ بچھو کی شکل کا موتی زندہ ہو کر دیوار پر رینگنے لگا۔

لطیفہ

ایک راہ گیر دوسرے سے "مجھے بڑے اسپتال جانا ہے۔"

دوسرا راہ گیر۔ "بھائی سیدھے چلے جاؤ۔"

پہلا راہ گیر۔ "تو کیا میں ٹیڑھا چل رہا ہوں۔"



جناب افضل امام

چند دلچسپ کھیل

غباروں کا کھیل :- ایک لاین بنا کر سب بہن بھائی یا دوست کھڑے ہو جائیں اور اپنے ہاتھ میں ایک ایک چمچہ پکڑ لیں۔ ایک دوست کو ریفری بنائیں وہ دوست ہوا میں ایک غبارہ جس میں ہوا بھری ہوئی ہے اچھالے گا۔

اب آپ میں سے ہر ایک کی یہ کوشش ہو گی کہ اچھالا ہوا غبارہ اپنے چمچے پر رکھ لیں۔ اور جب غبارہ چمچے پر رکھا جائے تو باغ میں دوڑ لگائیں۔ آپ میں جو بھی غبارہ چمچے پر رکھ لے گا اور پورے باغ یا صحن میں دوڑ کر ایک چکر مکمل کر لے گا وہ جیت جائے گا۔ خیال رہے کہ غبارہ چمچے کے اوپر سے گرنے نہ پائے۔

اس کے علاوہ آپ سب دوست اپنے اپنے چمچے پر ایک ایک غبارہ لے کر دوڑ بھی لگا سکتے ہیں اور جس کے چمچے کے اوپر سے غبارہ نہیں گرے گا اور دوڑ میں سب سے آگے رہے گا۔ وہ اوّل آئے گا۔

بھاپ آگ بجھاتی ہے :-

آپ کے گھر میں چاول پکتے ہوں گے۔ جب چاول پھولنے لگتے ہیں تو ہانڈی کے اندر سے بھاپ نکلنے لگتی ہے۔ اس وقت اس میں ایک جلی ہوئی دیا سلائی داخل کریں ـــــ

اور جب اس کی ٹونٹی سے بھاپ باہر نکلنے لگے تو اس جلتی ہوئی دیا سلائی داخل کر دیں۔ بھاپ دیا سلائی بجھا دے گی۔

کیتلی کی ٹونٹی پر دودھ کی ایک بوتل الٹ کر تقریباً بیس سکنڈ تک وہیں رہنے دیں تاکہ اس میں بھاپ اچھی طرح گزر جائے۔ اس کے بعد بوتل کو علیحدہ کر لیں۔ اس میں بھاپ موجود ہو گی۔ اس بھاپ میں ایک جلتی دیا سلائی داخل کر دیں وہ فوراً بجھ جائے گی۔

وجہ صرف یہ ہے کہ بھاپ دراصل پانی ہی ہے، فرق یہ ہے کہ وہ گیس کی شکل میں ہوتی ہے۔ اس میں آگ کو جلنے میں مدد دینے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ آگ اس لیے بجھ جاتی ہے کہ وہ ہوا کو خارج کر دیتی ہے یا آکسیجن کے بغیر آگ روشن نہیں رہ سکتی۔

ایک طالب علم کی کہانی

مہدی صاحب کی تصانیف تعلیمی میدان میں ایک حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی یہ کتاب عجیب بھی ہے اور جس سے بچے اور بڑے سب ہی کچھ نہ کچھ سیکھ سکتے ہیں۔



بچوں کی کوششیں

سب سے چھوٹا بیٹا ہونا بھی
لتنا تکلیف دہ ہے بڑے بھائی کو کچھ کام کرنے کو کہا جائے تو ناک بھوں چڑھا کر کہتے ہیں " ہونھ ! ہم تو دن بھر کام کرتے اور کماتے ہیں۔ تم کیا کرتے ہو ؟ اسکول جاتے ہو اور اسکول سے آکر کھیلتے رہتے ہو۔ چلو تم بھی گھر کا سب کام کرو"۔ تو جناب یہی حال میرا بھی ہے۔ کام کرنے سے تو میں جی نہیں چراتا۔ صبح اسکول جانے سے پہلے بازار جانا اور اسکول سے آکر گھر کا سودا سلف لانا تو مجھے بھاری نہیں پڑتا پر راشن ....

"راشن لانا ہے" سنتے ہی مجھے سانپ سونگھ جاتا ہے۔ درجن بھر آدمیوں کا راشن مزدوروں، قلیوں کی طرح اٹھا کر لانا تو میں برداشت کر لیتا ہوں پر راشن کے لیے لائن لگانا مجھے ذرا بھی پسند نہیں ہے۔

والد صاحب سے اگر کہا جائے کہ ابھی بہت لمبی لائن ہے کل راشن لے آؤں گا تو ان کے غصے کا پارہ ایک سو ڈگری سے تجاوز کر کے تھرمامیٹر کو توڑ دیتا ہے

• لیکن صاحب بات یہ ہے کہ مجھے راشن کے لیے لائن لگانا بالکل پسند نہیں ہے۔ پر میری پسندیدگی یا ناپسندیدگی سے کیا ہوتا ہے یہاں تو کوئی بھی چیز خریدنا ہو تو لائن لگانے

اگر لوگ ایمان داری سے لائن لگائیں تو پھر چاہے کتنی ہی لمبی لائن ہو اور کتنے ہی قیمتی گھنٹوں کا خون کرنا پڑے کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہاں تو بالکل الٹا ہی معاملہ ہے۔ انگریزی کے مقولے مائٹ از رائٹ (MITE IS RIGHT) پر عمل کیا جاتا ہے۔ طاقتور آدمی آکر اپنے سے کمزوروں پر اپنی طاقت کا رعب جما کر لائن میں سب سے آگے کھڑا ہو جاتا ہے اور صبح سے لائن لگائے ہوئے بوڑھے اور عورتیں گھنٹوں انتظار کر کے جب دکان پر پہنچتی ہیں تو کبھی چاول ختم ہو جاتا ہے تو کبھی شکر

اب سوال یہ ہے کہ ......

بمبئی میں اتنی زیادہ راشن کی دکانیں ہیں پھر بھی ہر وقت ہر دکان پر اتنی لمبی لائن کیوں لگی رہتی ہے ؟ زراعتی ملک ہوتے ہوئے بھی ہمارے ملک میں غلے کی اتنی کمی کیوں ہے ؟ دوسرے ملکوں سے اناج خریدنے پر بھی لوگوں کو اتنا کم اناج کیوں دیا جاتا ہے ؟

تو سنیے لوگ کہتے ہیں: ان تمام سوالوں کا جواب ہے چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی! ایک طرف گوداموں میں لاکھوں روپیوں کا اناج پڑا سڑ رہا ہے اور دوسری طرف غریب جنتا کو یا عام آدمیوں کو چور بازار میں مہنگے چوگنے داموں پر بھی اناج

مشکل

کی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے۔

لوگوں کی تکلیفیں دور کرنے کے لیے حکومت کو چاہیے کہ پیداوار بڑھانے کے جتن کرے اور چور بازاری کو ختم کرے ہر راشن کی دکان پر ایک پولیس کے سپاہی کو مقرر کر دے تاکہ لوگ ایمان داری اور بغیر کسی جھگڑے کے راشن حاصل کر سکیں اور مجھ جیسے لوگ "راشن کی لائن" میں کھڑے ہونے سے نہ گھبرائیں۔

شیخ عبداللہ

بسملی :— ایک مرتبہ جامع مسجد کے مولوی صاحب کہیں شادی میں جا رہے تھے۔ ساتھ میں اس مسجد کے مؤذن صاحب بھی ہو لیے۔ خوب ساتھ رہا۔ جب یہ دونوں شادی والے گھر پہنچے تو میزبان نے مولوی صاحب کی بڑی آؤ بھگت کی ان کو دودھ کا گلاس اور مؤذن صاحب کو لسی کا گلاس پیش کیا۔ مولوی صاحب نے گلاس اٹھایا اور "بسم اللہ" کہہ کر پینا شروع کیا۔ مؤذن صاحب نے بھی ادھر ادھر دیکھ کر گلاس اٹھایا اور "بسملی" کہہ کر پینا چاہا، مولوی صاحب نے جب یہ سنا تو بہت خفا ہوئے کہنے لگے "نامعقول یہ بسملی" کس بلا کا نام ہے؟"

مؤذن صاحب نے کہا "جناب آپ کو دودھ کا گلاس ملا ہے اور یہ مذکر ہے اس لیے آپ نے بسم اللہ کہا مجھے لسی دی گئی ہے اور یہ مؤنث ہے اس لیے میں "بسم اللہ" کیسے کہہ سکتا ہوں . . . . ."

مولوی صاحب مؤذن کا منہ تکنے لگے میزبان بھی شرمندہ ہوا۔ فوراً مؤذن صاحب کو بھی دودھ کا گلاس لا کر دیا اور جب تک یہ دونوں اصحاب وہاں رہے میزبان نے پھر اس طرح کا امتیاز نہ برتا۔

تاج قریشی

پہیلیاں :—

(۱) ایک ڈبے میں بارہ خانے ہر خانے میں تیس تیس دا

(۲) ایک قلعے میں نو دس پریاں آپس میں سر جوڑے

(۳) دلی گرجے رتن پور برسے قنوج بہہ گیا پانی
کلارتن پور ڈوبن لاگا بوجھ پنڈت یا بوجھ گیانی

(۴) دن میں چھوٹی رات میں لمبی کمر پڑی زنجیر
چل نہیں سکتا ہوں کہ الفت دامن گیر

(۵) چوپنج نہ ڈوبے گھڑا نہ پھوٹے چڑیا پیاسی جا۔
ایک اچنبھا ایسا دیکھا ہاتھی کھڑا نہا—

لغبہ (۱) سن (۲) جنتری (۳) بادل (۴) سایہ (۵) شبنم ۔(۱)

سید ذوالفقار

ملکوں کے نام بتائیے :—

(۱) سعد پاکس تانگے میں آ رہی ہے۔ (پاک

(۲) آج کل سوڈا نیلے رنگ میں تیار ہو رہا ہے (س

(۳) اتر کی جانب سفر کرو۔ (اتر

(۴) صابر مال لانے گیا۔ (بر

(۵) شام بڑھتی جا رہی ہے۔ (شا

(۶) مشرو سلطانیہ میں اوّل آیا۔ (رد

(۷) رفیع رب کو یاد کرتا ہے۔ (عر

(۸) امبر مصری خوب کھاتا ہے۔ (مر

(۹) نعیم نیلگری کی سیر کرنے گیا۔ (م

(۱۰) راجا پانی سے برف بناتا ہے (ا

محمد رفعت اللہ

آدھی ملاقات

اب اظہر افسر آل انڈیا ریڈیو حیدرآباد۔

بڑا پیارا سالنامہ ہے، اس بار آپ نے کور پیج بالکل
ڈھنگ کا دیا ہے، سادہ ہے مگر خوبصورت ہے ایے شمار
لوماتی مضامین، مزے دار چٹ پٹی کہانیوں اور جھوم جھوم کر
ئے جانے والی نظموں کا یہ ایک نہایت حسین گلدستہ ہے اور
ل قدر مہک اپنے آپ میں رکھتا ہے کہ بچّے تو بچّے ہیں بڑے بھی
پٹ لینے کو تیار ہیں، مگر میں نے جب تک خود ختم نہیں کر لیا
سی کو ہاتھ بھی لگانے نہیں دیا۔

جلی لکھائی پیاری پیاری تصویروں اور ان گنت
ل چسپ مضامین والا یہ سالنامہ اس لائق ہے کہ ہر گھر
ں پہنچے ہر بچّہ پڑھے اور ہر اسکول اور لائبریری میں موجود ہو۔

آپ کو اور جناب اسرار الحق صاحب کو اس سالنامہ پر
ی گئی ان تھک محنت اور اس کے کامیاب شمارہ پر دلی مبارکباد
ش کرتا ہوں۔

اب خورشید حسن خاں شاہ جہاں پور۔

ہم نے تھوڑا بہت نہیں پورا رسالہ پڑھا تھا بھلا ایسا
ن ہو گا جو ایسے اچھے اور معلوماتی رسالے کو کہیں کہیں سے پڑھے۔
پ نے یہ خاص نمبر ایسی اچھی طرح شائع کیا ہے کہ ہم سب کے
ے بہت سی نئی نئی معلومات جمع کر دی ہیں۔ کہانیاں بہت اچھی

بات نہ کہیں کہ چھوٹے پیاسیوں کی کہانیاں اور نظمیں کم ہیں اور
سب کچھ بڑوں کا ہے۔ بڑوں کی باتیں تو یہاں گھر میں اسکول
میں اور گھر سے باہر ہر جگہ اور ہر وقت اور ہر طرح کی سنتے ہی رہتے
ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ بہت سن چکے ہیں۔ چھوٹے پیاسیوں
کی باتیں سنیں تو زیادہ اچھا معلوم ہو۔ ان کی باتیں سمجھ میں بھی
ذرا زیادہ آئیں گی۔

چند بچوں کی رائیں جناب خلیق انجم اشرفی کی زبانی

میری تینوں بہنوں میں سب سے بڑی حنا درجہ ساتویں
درجے کی طالبہ، کو کہانیوں میں "صبر شہزادہ" بہت پسند آئی۔ اس
کے بعد اس نے "دوسری ماں" اور "خزانہ" کو نمبر دیا ہے۔ معلوماتی
مضامین میں "خرگوش کا گھونسلا" اور "ڈائنامائٹ سے خطرناک"
پسند آئے۔

نظموں میں "یہ موسم" "نیا سال آیا بلند حوصلے ہیں" "سلامی"
اور "چور کا دشمن" پسند آئیں۔ ٹائیٹل پسند نہیں آیا۔ اس کا کہنا
ہے کہ پچھلا ٹائیٹل اس سے بہتر تھا۔

"نیلم اور فرخ کے بارے میں رعنا اور اس سے چھوٹی
گنی کی مشترکہ رائے یہ ہے کہ "بہت تھوڑی سی کہانی دیتے ہیں۔
لکھ دیجیے کہ زیادہ سے زیادہ دیا کریں۔ بس تصویریں ہی سب
جگہ گھیر لیتی ہیں۔

گنی کو "خزانہ" سب سے زیادہ پسند آئی۔ سب سے
چھوٹی شائستہ صاحبہ جو ابھی الف سے انار اور ب سے بندر
پڑھتی ہیں اور جنھوں نے ہر ایک سے سالنامہ زور زور سے پڑھنے
کی فرمائش کر کے ہر ایک کہانی اور نظم سنی ان کی پسندیدہ کہانی
"دوسری ماں" ہے جو انھوں نے اپنی ماں سے پڑھوا کر سنی۔

اور "گھوڑا" پسند آئیں۔ "خرگوش کا گھونسلا" بھی ان کی زبان میں
بہت اچھی ہے "۔

میرے دونوں چچازاد بھائیوں حسنین اور منے کو جو بالترتیب
آٹھویں اور چھٹی کے طالب علم ہیں، "دوسری ماں" "صبر شہزادہ"
"خزانہ" کہانیوں میں "خرگوش کا گھونسلا" مضامین اور
نظموں میں "نیا سال آیا" "لوری" "دنیا" اور "آداب گفتگو"
پسند آئیں۔

جناب عبدالواحد میل وشارم ۔

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

دسمبر ۸۴ء کا پرچہ ہمدست ہوا۔ "یتیم بچے کی عید" بہت
پسند آئی۔ اگر چہ ہر شخص اپنے خاندان کے یتیم بچوں کی نگرانی کرلے
تو پھر کوئی بچہ عید کے دن مایوس نظر نہیں آئے گا۔ یتیم کو یتیمی کا
احساس نہ ہونے دینا اخلاق کا بہت بڑا کردار ہے۔ گفتار کے
غازی، کردار کے مرد مجاہد بن جائیں تو "یتیم خانوں" کی ضرورت
ہی نہ رہے گی۔ مگر افسوس ملت کی بے حسی کی وجہ سے ہزاروں یتیم
دربدر کی ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔

عین الحق، سراج انور، ضمیر حسنین، سہیل انجم سہیل راہی سیتاپور

اس سال کا سالنامہ ملا جی خوش ہوگیا۔ سالنامہ نہیں
یہ ایک عظیم تحفہ ہے۔ اللہ اسے ہمیشہ کامیابی عطا فرمائے۔ "آمین"

رشید احمد رشید یادگیر ۔

آپ کا پیام تعلیم کا سالنامہ ملا۔ پڑھ کر دل باغ باغ
ہوا۔ پیام تعلیم کے سالنامہ میں تمام مضمون بہت ہی اچھے ہیں۔ دعا
کرتا ہوں کہ سالنامہ ہر سال اچھے سے اچھا نکلے۔

جناب فرخ جلیل علی گڑھ ۔

کل پیام تعلیم کا رسالہ اپنے بھائی سے لے کر پڑھا
واقعی آپ نے اتنا حسین وجمیل نکالا ہے کہ داد دینے
دو ایک نظموں کو چھوڑ کر اور سب بہت ہی اچھی ہیں۔ مضا
جو پسند آئیں "سالار جنگ میوزیم" "دوزخ اور جنت"
"امریکہ کا ایک تفریحی پارک" "انکل جولی" "ایٹم کی د
محل" "جسم کی پانچ طاقتیں" وغیرہ وغیرہ۔

الرجی بیماری بہت عجیب مضمون ہے۔

نسیم اختر نسیم سیتا رام پور

نیا سال کا تحفہ سالنامہ کے روپ میں نظر نو
اس کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے برا
اپنی کوشش میں کامیاب ہیں۔ سالنامہ ہم سب دوستا
پسند آیا۔

جناب خالد عرفان ام۔ اس۔ سی۔ بنگلور

سالنامہ دیدہ زیب ہے۔ اس بار کا ٹائیٹل
ویسے بعض شکلیں ایسی خاص نہیں ہیں لیکن بیشتر خوب
یونہی ورق الٹتے ہوئے میں نے محسوس کیا ہے کہ اس بار
کہانیوں اور نظموں کے انتخاب میں بھی پچھلے سال کا معیار
معیار پیش نظر رکھے گئے ہیں۔

جناب ظہیر نیازی بھر کنڈا ہزاری باغ ۔ پیام تع
سالنامہ ۸۵ء نے توقع سے زیادہ محظوظ کیا۔ آپ نے اپ
میں ۱۹۸۵ء کے لیے جو پرامن رہنے کی خواہش ظاہر کی ہے خد
فرمائے۔ یہی دعا ہے۔ اس سالنامے میں آپ نے اتنے

اِدھر اُدھر سے

بچّوں کو بھی بہادری کا انعام ملنے لگا:-

انڈین کونسل فار چلڈرنس ویلفیر یعنی بچّوں کی فلاح و بہبود کی ہندوستانی کونسل کو ایک بات بڑی اچھی سوجھی ہے: بچّوں کو بہادری کے کارناموں پر انھیں انعام دیا جائے۔ اس سے بچّوں میں امنگ اور حوصلہ، جرأت اور ہمت کے کارنامے انجام دینے کا ولولہ پیدا ہوگا۔

اس مرتبہ چھبیس جنوری کی ریپبلک ڈے کی تقریبوں کے سلسلے میں دیس کے چھ بہادر بچّوں اور بچّیوں کو انعام دیے گئے ہیں۔ یہ بچّے ہندوستان کے مختلف صوبوں کے ہیں اور ان میں سے اکثر نے اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر دوسرے کی جان بچانے کی کوشش کی ہے یا کوئی اور کارنامہ انجام دیا ہے۔

ان میں ایک بچّی مانی کھوم شانتی بالا دیوی ہے۔ یہ اس وقت سات برس کی ہے۔ یہ جب پانچ برس کی تھی تو اس نے بچ مچ ہمت و جرأت کا اچنبھے میں ڈالنے والا کام کیا۔ اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر اپنے تین برس کے ساتھی کی جان بچائی۔ یہ بچّہ کھیلتے کھیلتے پاس کے ایک بڑے تالاب کے کنارے پہنچا، وہاں اس کا پیر پھسل گیا۔ پانی میں چلا گیا۔ غوطے کھانے لگا۔ قریب تھا کہ ڈوب جائے۔ یہ دیکھ کر شانتی بالا دیوی فوراً پانی میں کود پڑی اور اسے ہاتھوں سے کھینچ کر کنارے پر لانے لگی۔ مگر یہ بات اس کے بس سے باہر تھی۔ اس نے مدد کے لیے چیخنا شروع کیا۔ چیخوں کی آواز سن کر آس پاس کے لوگ دوڑ پڑے اور دونوں بچّوں کو تالاب سے نکالا۔

سر برٹرانڈ رسل چل بسے:-

فروری کے پہلے ہفتے میں سر برٹرانڈ رسل (انگلستان) اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ یہ دنیا کے مانے ہوئے فلسفی اور حساب داں تھے لگ بھگ چالیس کتابیں لکھیں ادب کا نوبل انعام حاصل کیا۔ جو دنیا کے گنے چنے لوگوں کے نصیب میں آتا ہے۔ وہ بڑے انسان دوست تھے۔ ہندوستان کی آزادی سے گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ اب سے بہت دنوں پہلے ہندوستان کی آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے انڈیا لیگ کے نام سے ایک انجمن بنی تھی سر رسل اس کے صدر تھے۔ لڑائی کے بہت مخالف تھے۔ اسی طرح سرمایا داری کے۔ انتقال کے وقت ان کی عمر ۹۷ سال تھی۔

میاں جگنو سائنس کے دربار میں:-

اور لیجیے، جگنو صاحب جو برسات کی راتوں میں چمک چمک کر آپ کا جی خوش کرتے ہیں اور ننھے پیا می انھیں پکڑنے کے لیے بھاگ دوڑ مچاتے ہیں، اب سائنس دانوں کے ہتّھے چڑھ گئے ہیں۔ سائنس دانوں کو ان کے ذریعے سے ایسے مادوں کا پتا لگانے میں مدد ملے گی جو بہت سی بیماریوں کے لیے مفید ہو سکتے ہیں۔

بارہ سنگھے نے دوڑ جیتائی:-

روس میں کہیں لمبی دوڑ کا مقابلہ تھا۔ کھلاڑیوں کا ایک گروہ جنگلوں میں لمبے فاصلے کی دوڑ لگا رہا تھا۔ اچانک ایک دوڑ لگانے [illegible]

سی۔ پیچھے مڑکر دیکھا تو سہم کر رہ گیا۔ ایک بہت بڑا بارہ سنگھا اس کا پیچھا کر رہا تھا۔ بے چارا ڈر کے مارے چیخ پڑا اور بھی تیزی سے بھاگنے لگا پر ایسا لگتا تھا بارہ سنگھے میاں مذاق کے موڈ میں ہیں۔ برابر بے چارے کا پیچھا کرتے رہے۔ بڑھتے ہوتے اس کے سر پر پہنچ گئے ـــ طالب علم نے بڑی مشکل سے اپنے کو بارہ سنگھے کے نکیلے سینگوں سے بچایا قدم اور تیز کر دیئے۔ آخر دونوں دوڑتے دوڑتے ایک سڑک پر آگئے جہاں گاڑیاں آجا رہی تھیں۔ بارہ سنگھے صاحب نے اپنی چال ہلکی کر دی اور جنگل کے اندر لوٹ گئے۔ طالب علم نے دوڑ جیت لی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ طالب علم کو جتانا چاہتے تھے یا اسے دوڑنا سکھا رہے تھے۔ (افکار و جائزے روسی سفارت خانہ)

ہوائی جہاز سے چھلانگ :-

ہوائی جہاز سے چھلانگ لگانا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے۔ پھر بھی مغربی جرمنی میں لگ بھگ ڈیڑھ ہزار شوقین ہیں جو اس خطرناک ایڈونچر کو کھیل ہی سمجھتے ہیں۔ ویسے یہ شوق بہت مہنگا بھی ہے۔ پیراشوٹ سے کودنے کا پورا سامان دو ہزار جرمن مارک میں ملتا ہے۔ ان شوقینوں کا کہنا ہے کہ چھلانگ لگاتے وقت انھیں ایسا لگتا ہے جیسے ان کے پر نکل آئے ہیں۔ یہ نو ہزار میٹر کی اونچائی سے چھلانگ لگا لیتے ہیں۔ مہارت حاصل کرنے کے لیے عین نشانے پر اترنا پڑتا ہے۔ بلکہ چھلانگ لگاتے وقت اپنے جسم پر پورا قابو بھی رکھنا ہوتا ہے۔ سامنے کی تصویر میں ایک جرمن چیمپین مسٹر لوئس پیر ہوائی چھتری کھلنے سے پہلے ہوا میں عقاب کی طرح منڈلاتے نظر آتے ہیں۔

(اطلاعات جرمنی)

ہرے رنگ کا کتا۔ ... کتا بھی ہرے پیدا ہونے لگا ہے نا انوکھی بات! اس کے مالک نے اس ہونے کے بعد پورے دو ہفتے تک انتظار کیا۔ پر اس کا ... کا ہرا ہی رہا۔ کیا عجیب جو یہ رنگ مستقل ہو اور دنیا میں ... رنگ کے کتے کی نسل کا آغاز ہو۔

دیس میں اردو بولنے والے۔

نیچے دیس میں ہندوستان کی تیرہ ریاستوں میں اردو ... کی تعداد دی جاتی ہے۔ یہ تعداد دس سال پہلے یعنی ۱۹۶۱ ... شماری کے مطابق ہے۔

۱۔ یوپی یا اتر پردیش	۳
۲۔ بہار	۴۵
۳۔ مہاراشٹر	۳۷
۴۔ آندھرا پردیش	۷۵۳
۵۔ میسور	۴۸۲
۶۔ مغربی بنگال	۷
۷۔ مدھیہ پردیش	۰۵
۸۔ تامل ناڈ (مدراس)	۰۳
۹۔ گجرات	۶۷۰
۱۰۔ راجستھان	۷۳
۱۱۔ اڑیسہ	۱
۱۲۔ ہریانہ	۹
۱۳۔ دہلی	۱

MARCH 1970

Payam - i - Taleem

NEW DELHI-25.



صرف ۲ اپٹیل فائن پریس دہلی میں طبع ہوا

پیام آشنا

میسور، مدھیہ پردیش، جموں کشمیر و ہریانہ کے تعلیمی اداروں
کے لیے منظور شدہ

پیام تعلیم

اپریل ۱۹۷۰ء شمارہ ۴

محمد حسین حسّان ندوی

دفتر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اُردو بازار۔ دہلی ۶

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

فی پرچہ ۶۰ پیسے سالانہ چندہ چھ روپے۔

پبلشر سید احمد علی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پریس
میں چھپوا کر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شایع کیا

سرورق نے صفحہ ۳۲ کی تصویر: ناصر عبدالحمید شیخ عمر ۱۲ سال
فوٹو: شاہد علی خاں

فہرست

بچوں کے لئے معلوماتی کتابیں

نجومی آپا

اطہر پرویز

زہرہ آپا علی گڑھ سے ام، ایس، سی کا امتحان دے کر کیا آئیں کہ لگیں اپنی قابلیت کا رعب جمانے. جو سوجھی تو اُس نے زہرہ آپا کا نام "نجومی آپا" رکھ دیا۔ لیکن ایک دن جب گھر کے سارے بچے اکٹھا تھے، نجومی آپا بتلائیں، ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ سارے کے سارے دنگ رہ گئے۔ نجومی آپا تو سچ مچ کی نجومی نکلیں۔ تم بھی پڑھ

قیمت:

باپ کے خط بیٹی کے نام

جواہر لعل نہرو۔ ترجمہ: عتیق صدیقی

چاچا نہرو نے اپنی بیٹی اندرا گاندھی کو جب وہ تمھاری طرح دس سال کی بچی تھیں کچھ خطوط لکھے تھے۔ ایسے مزے دار بار بار پڑھنے کو دل چاہے گا۔ پھر اس کے پڑھنے سے تم کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ "ہماری یہ دنیا" "قوموں کا ایک گھرانا"

قیمت: عام ایڈیشن ۵۰/۴

ہمارا ذہن

از۔ وریجا اڈوبا ترجمہ: اطہر پرویز

بات تو کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن امی جان مار بیٹھتی ہیں، ابا جان ڈانٹ پلاتے ہیں، بھائی بہن کوئی جھگڑ ہیں اور دوست احباب ہاتھا پائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کیوں؟ وجہ اس کتاب میں پڑھو۔ اِ پڑھنے سے تم نہ صرف اپنی نفسیات سے واقف ہو جاؤ گے بلکہ کون کیا چاہتا ہے یہ بھی تم کو معلوم ہو نہ تو امی جان کی مار کا خطرہ رہے گا اور نہ ابا جان کی ڈانٹ کا اور نہ ہی بھائی بہن اور دوستوں کے جھگڑے

قیمت: ایک

انمول رتن

اطہر پرویز

فرخ سیر بادشاہ کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ ایک بار جب وہ کشمیر کی سیر کو گیا تو وہاں اُس کی نظر فارسی اور سنسکرت کے بہت بڑے عالم پر پڑی۔ یہ تھے پنڈت راج کول۔ فرخ سیر پنڈت راج کول کو ہندوستان کے دل "دلی" لے آیا اور ایک عالی شان کوٹھی نہر کے قریب رہنے کو دی۔ دلی والوں نے پنڈت جی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پیار سے تمھارے چاچا نہرو اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ چاچا نہرو "انمول رتن" کیسے بنے؟ وہ تمھیں اس سے معلوم ہوگا۔

قیمت:

ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳

بچوں سے باتیں

۹ر مارچ کا انگریزی اخبار پڑھتے وقت نظر اچانک
ـڈی سی خبر پر رک گئی۔ "مشہور اردو شاعر خورشید احمد
ۂ کل شام (۸ مارچ) کو عثمانیہ اسپتال میں انتقال
ـ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر کل ۵۵ سال تھی ...."
ـوانا الیہ راجعون

یہ افسوسناک خبر ہمارے لیے ہی نہیں آپ کے
ـں انتہائی رنج اور افسوس کی خبر ہے۔ وہ پیام تعلیم
ـستقل سرپرست تھے اور آخری دم تک اس پرچے کو
ـے رہے۔ ابھی جنوری ۷۰ء کے سالنامے میں ان کی
ـچھپی ہے "نیکی کا ستارہ" بہت نکھری ستھری،
ـں نظم ہے۔ آپ کے پاس جنوری ۷۰ء کا سالنامہ ہو تو
ـرے پڑھیے۔ بہت لطف آئے گا۔

خورشید احمد جامی مرحوم بہت پڑھے لکھے پختہ کار
ہوئے شاعر تھے۔ ساہتیہ اکادمی کا انعام بھی مل چکا
ـزلوں کے دو مجموعے چھپ چکے ہیں۔ بڑی خوبی کی
یہ ہے کہ اتنا بڑا شاعر بچوں کے لیے لکھتا تھا اور خوب
ـتا۔ بچوں کے لیے انھوں نے مہاتما گاندھی پر بہت
ـنظم لکھی ہے ادارہ ادبیات اردو نے اسے بہت سلیقے
ـابی صورت ... چھاپا ہے۔ ابھی فروری میں اس کتاب
...

کے عزیزوں اور دوستوں سے دلی ہمدردی ہے۔ خدا ان
سب کو صبر کی توفیق عطا فرمائے۔

فروری کے پیام تعلیم میں جناب اشفاق محمد صاحب
کی ایک نظم "پہیلی" چھپی تھی انھوں نے پیامیوں سے اس
پہیلی کی بوجھ یا جواب مانگا تھا۔ ان پیامی بچیوں اور
بچوں نے بوجھ یا جواب بھیجے ہیں۔
(۱) انجم آرا مدرسہ ثانوی جامعہ (۲) جاوید اقبال دھامپور
(۳) سید منور باسط کھیری (۴) موہنی گرگ نئی دہلی (۵) تسلیم
بانو سہسرام (۶) سنیتا ترائی دہلی (۷) ابوالبرکات التفات
گنج (۸) شانتی سروپ کوشک (۹) شعیب احسان الرحمٰن
بستی (۱۰) نوشاد اسرار سیوہرہ (۱۱) مظہر کبیر پٹنہ (۱۲) ماہر
علی جامعہ نگر (۱۳) پروین جمال جامعہ نگر (۱۴) یٰسین محمد
خاں جامعہ نگر (۱۵) سید اعجاز حسین لکھنؤ (۱۶) نیرا رانی۔
نئی دہلی۔

پر بھئی صحیح بوجھ یا صحیح جواب تو بس ایک پیامی
نے بھیجا ہے اور یہ ہیں میاں ابوالبرکات التفات
گنج والے۔ انعام انھی کو ملے گا۔ اچھا تو صاحب صحیح جواب
کیا ہے؟ تو جناب صحیح جواب یا صحیح حل ہے "قلم" میاں
منور باسط (کھیری) نے بھی بہت دماغ لڑایا ہے، لیکن
...

قریب پہنچ گئے ہیں مگر آخری خط جو لکھا ہے اس میں علم کے ساتھ قلم کو بھی جوڑ دیا ہے۔ اس لیے ان کی بوجہ توالتفات ہوگئی مگر ہم منیجر صاحب پیام تعلیم سے درخواست کریں گے کہ منور میاں کو کوئی چھوٹا موٹا انعام بھیج دیں انھوں نے کوشش بہت کی ہے۔

فروری کے پرچے میں "بچوں کی کوششوں" کے سلسلے میں ایک ڈراما شائع ہوا تھا "بہی بہرے" ڈراما نگار صاحب کا نام چھپنے سے رہ گیا تھا۔ یہ ہیں محمد مستحسن بدایونی (بہیڑی) تو بھئی جناب مستحسن صاحب اس غلطی کا ہمیں افسوس ہے۔ امید ہے کہ آپ معاف کردیں گے۔

سالنامے کے بارے میں خطاب تک آرہے ہیں۔ فروری اور مارچ کے پرچے بھی پیامیوں کو بہت پسند آئے۔ ان پرچوں میں ہمارے ننھے پیامیوں کی دلچسپی کا سامان بھی ہے اور یہ بات آپ کو اس پرچے میں بھی نظر آئے گی۔ دھیرے دھیرے ہم پیامی بچیوں اور بڑی لڑکیوں کے مطلب کی چیزیں بھی پرچے میں شامل کررہے ہیں "جب اور اب" والا مضمون یوں تو متفقہ طور پر سبھی کو پسند آیا لیکن لڑکیوں کو خاص طور سے اچھا لگا۔ اس کے علاوہ ایک چھوٹا سا مضمون کڑھائی پر ہے نظموں میں پاپا کا نرسری گیت، کوثر صاحب۔ اور بشاور صاحب کی نظمیں پڑھیے۔

جناب حمزہ ناوک پوری صاحب نے عتیق صاحب

مرحوم کے انتقال سے متاثر ہوکر ایک قطعہ بھیجا ہیں شکریہ کے ساتھ شائع کیا جارہا ہے۔ا
کے پیام تعلیم کی محفل میں ایک نئے صاحب ہیں۔ یہ محترم ڈاکٹر مشیر الحق ندوی (بی اے علیگ پی ایچ ڈی کناڈا) ہیں۔ ہماری درخوا نے بہت اچھا مضمون مرحمت فرمایا ہے۔ آ وعدہ کیا ہے۔

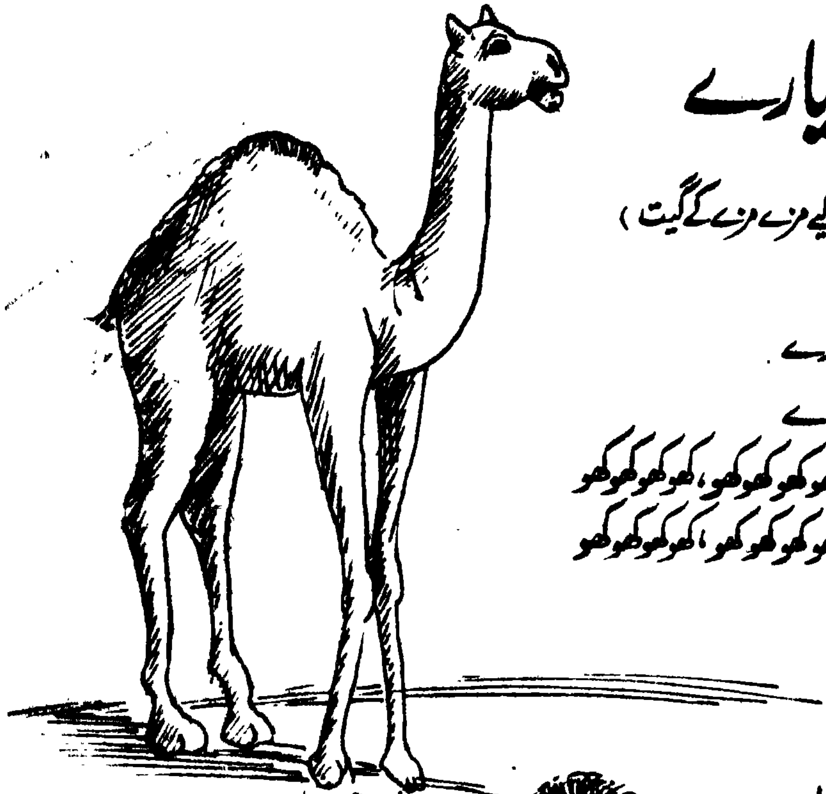
اس جینے مکتبہ کی بمبئی شاخ نے
صاحب کارکن مکتبہ نے دو دو اور جناب ماس
جناب قطب الدین ملا (واسکوڈا گاما) جناب
پوری، جناب ڈاکٹر رضی الدین جامعی نے ایک
مرحمت فرمایا۔ جونیر اسکول لہریا سرائے، ٹرنز
فیروز بخت دہلی، منظہر الدین پلاواں (پٹنہ) ا
اسلام گوا اردو بوائز اسکول۔ احمد خاں الیابنگا
صاحب کا محلہ۔ حافظ حمزہ صاحب شاہ
صاحب رہتاس۔ کمال انجنیرنگ ورکس۔ ہیوگ
اردو اسکول ستارا بھسا دل۔ سید عبداللہ
پٹم آزاد لائبریری کھولا پور (امراوتی) عدنا
صاحب کشن گنج (بہار) محمد عباس صاحب
اس ام مسلم سنڈری دھنباد، خورشید انور شا
امجد مدنی دیوبند، گورنمنٹ اپر پرائمری اسکول
شائستہ محمدی صاحبہ ویجاپور، امینہ نور محمد
محمد فضل اللہ صاحب رائچور، بی اے حمد

جناب محمد یوسف پاپا۔ ایم۔ ایس سی

بندر آیا رے

(ننھے ننھے پیامیوں کے لیے مزے مزے کے گیت)

کم کم کوچی، پہنے ٹوپی، بندر آیا رے
چُن مُن بندر آیا رے
بندر ہم کو کھیل دکھاؤ — کھو کھو کھو کھو، کھو کھو کھو کھو
بڈھی بندریا اُسے مناؤ — کھو کھو کھو کھو، کھو کھو کھو کھو
بندر موٹا
سر کا چھوٹا
پہن لنگوٹا
بندر نے یہ سُنی بات تو خوب مزہ آیا رے
چُن مُن بندر آیا رے



اونٹ

اونٹ بہت لمبا ہوتا ہے
اتنا لمبا جیسے کھمبا
دم اس کی ہوتی ہے چھوٹی
اتنی چھوٹی جیسے ٹونٹی
ٹانگ اس کی ہوتی ہے پتلی
اتنی پتلی جیسے سُتلی
اونٹ پہ چڑھ کے گھومیں گے ہم
بسکٹ کھا کر جھومیں گے ہم





جناب مشیر الحق

کناڈا میں شہری آداب و اخلاق

ہمارے دیس کے اخباروں میں یورپ اور امریکہ کی زندگی کی انھی باتوں کو بڑھا چڑھا کر شائع کیا جاتا ہے جو عام طور پر گھناؤنی ہوتی ہیں، مثلاً بے حیائی اور بے شرمی کی باتیں چوری اور ڈکیتی کے سنسنی پھیلانے والے حادثے وغیرہ

لیکن ان ملکوں اور قوموں کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ یہ بہت روشن پہلو ہے اس قابل کہ ہم اس کی تقلید کریں۔ ان ملکوں کے عام لوگ اپنی روزمرہ کی زندگی میں بہت ایمان دار ہوتے ہیں۔ بہت خوش اخلاق ہوتے ہیں۔ سچے ہوتے ہیں۔ ان باتوں کا اندازہ کچھ وہی لوگ زیادہ کر سکتے ہیں جنھیں ان کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہو۔

مجھے کناڈا میں کافی دنوں تک ٹھہرنے کا موقع ملا۔ وہاں کے لوگوں کی زندگی کے بہت سے خوشگوار پہلو نظر آئے۔ ہم لوگ عام طور پر اس اچھے پہلو سے بے خبر ہیں۔ موقع ملا تو میں اپنی یادوں کے خزانے سے وہاں کی زندگی کی اچھی باتیں وقتاً فوقتاً آپ کی خدمت پیش کرتا رہوں گا۔ لیجیے یہ دو واقعات تو اسی وقت سُنیے

(ڈاکٹر) مشیر الحق

یہ ۱۹۶۱ء کی بات ہے مجھے مانٹریال (کناڈا کا مشہور شہر) پہنچے ہوئے مشکل سے ۴ مہینے ہوئے تھے۔ شہر کے جغرافیہ سے اس وقت تک پوری طرح آشنا نہیں ہوا تھا بس فلیٹ سے یونیورسٹی یا پھر شہر کے مشہور بازار سنٹ کتھرین کا راستہ معلوم تھا۔ یہاں سے جو کپڑے میں اپنے ساتھ لے گیا تھا وہ وہاں کے نقطۂ نظر سے بیکار ہو چکے تھے قمیص کئی ایک تھیں مگر وہاں پر دھوبی سے دھلوانا ایک طالب علم کے لیے آسان نہیں ہے۔ چند بار کی دھلائی میں جتنے پیسے خرچ ہوتے ہیں، بھگ اتنے میں نئی قمیص خریدی جا سکتی ہے۔ اس لیے صورت یہ ہوتی ہے کہ ٹیریلین کی قمیص خریدی! جنھیں صاف کرانے کے لیے دھوبی کا احسان نہیں اٹھانا۔ یہی سوچ کر میں ایک دن شام کو سنٹ کتھرین کے بڑے اور بہت ہی مشہور ڈپارٹمنٹل اسٹور میں گیا۔ یہ کئی منزلہ تھا اور اس [illegible]

خریدی جا سکتی تھی۔ ہر طرف خریداروں کا مجمع تھا۔ شمالی امریکہ
ے بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹور کے اندر تقریباً وہی منظر ہوتا ہے جو اپنے
یہاں بڑے سے بڑے بازار میں ہوتا ہے۔ ایک فرق ضرور ہوتا
ہے، ہمارے یہاں کے بازاروں میں کان پڑی آواز نہیں
نائی دیتی اور وہاں کے اسٹوروں میں زیادہ سے زیادہ
ملیوں کی بھنبھناہٹ کی سی آواز آتی رہتی ہے۔

بہر حال میں نے پانچویں منزل سے تین عدد قمیص
ریدیں اور اس کے بعد صرف تماشہ دیکھنے کی غرض سے لفٹ
ور خود بخود پھسلنے والے زینوں کے ذریعے ایک منزل سے
دوسری منزل پر آتا جاتا رہا۔ دو چار چھوٹی موٹی چیزیں
ور خرید کر گھر چلا آیا۔ کھانا خود ہی پکانا پڑتا تھا اس لیے خریدے
وئے سامان کے سارے پیکٹ ایک میز پر رکھ کر باورچی خانے
ں گھس گیا۔

دوسری صبح کو کپڑے بدلنے لگا تو قمیصوں کا
یکٹ میز پر موجود نہیں تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر
یصیں کہاں غائب ہو گئیں، جب سے بازار سے لوٹ کر آیا تھا
ں اپنے فلیٹ سے باہر نہیں نکلا تھا، کوئی ملنے جلنے والا
ھی نہیں آیا تھا، پھر آخر میز پر سے پیکٹ خود بخود کس طرح
ائب ہو گیا۔

پھر سوچنے لگا اسٹور سے گھر تک آنے میں کہیں راستے
ں پیکٹ گر گیا ہو۔ پھر خیال آیا کہ چھوٹی موٹی چیز تو جیب سے
ر سکتی ہے لیکن اتنا بڑا پیکٹ ہاتھ سے سرک جائے جس میں
ن قمیصیں ہوں اور گرنے کی خبر نہ ہو مدہوشی یا بے ہوشی کا وہ
[illegible]

جنات اٹھا لے گئے۔

رہ رہ کر یہی خیال آتا تھا کہ میں اس پیکٹ کو اسٹور
ہی کے کسی کاؤنٹر پر بھول آیا ہوں، لیکن کس کاؤنٹر پر؟ یہاں
پہنچ کر ذہن کام کرنے سے انکار کر دیتا تھا۔

اتنا تو یقین تھا کہ جس کاؤنٹر سے قمیص خریدی تھی
اس پر نہیں بھولا تھا۔ کیوں کہ اس کاؤنٹر سے ہٹنے کے تقریباً
آدھ گھنٹہ بعد میرے ایک ساتھی اسی اسٹور میں ملے تھے۔
اور انھوں نے میرے ہاتھ سے قمیص لے کر دیکھی تھی۔

اتنے بڑے بازار میں کئی سو کاؤنٹر تھے بھلا میں کس
کاؤنٹر پر جا کر قمیصوں کے بارے میں پوچھ گچھ کرتا۔

بہر حال میں ان قمیصوں کو صبر کر کے بیٹھ گیا۔ چار
پانچ روز کے بعد اتفاق سے میں اسی اسٹور میں اپنے
ایک کناڈین ساتھی کے ساتھ کچھ سامان خرید رہا تھا کہ باتوں باتوں میں
اس سے میں نے قمیصوں کے خریدنے اور انھیں کھو دینے کا
ذکر کیا۔ چند سیکنڈ تک وہ مجھے دیکھتا رہا پھر کہنے لگا کہ تم نے
اسٹور میں آ کر کیوں نہیں معلوم کیا۔ جب میں نے اُسے بتایا کہ
مجھے وہ کاؤنٹر یاد نہیں ہے جس پر میں قمیصوں کا پیکٹ
بھولا ہوں تو وہ کہنے لگا۔ "کاؤنٹر سے کیا مطلب، تمھیں تو
اس شعبہ میں جا کر پوچھ گچھ کرنی چاہیے جہاں وہ سامان جمع رہتا
ہے جسے خریدار کاؤنٹر پر بھول جاتے ہیں"

مجھے کسی ایسے شعبے کا علم نہ تھا۔ میرا ساتھی مجھے لے
کر گیا اور اس شعبے کے کاؤنٹر پر جو لڑکی بیٹھی تھی اس سے میں
نے اتنا ہی کہا کہ تین چار روز ہوئے میں نے قمیصوں کے
شعبے سے تین قمیصیں [illegible]

ابھی میں پوری بات کہنے بھی نہ پایا تھا کہ اس نے ایک تھیلا میرے سامنے رکھ دیا جس میں تین قمیصیں تھیں اور کہنے لگی کہ یہ تھیلا آج چار دن سے میرے پاس رکھا ہوا ہے اور کسی نے بھی اس کے بارے میں پوچھ گچھ نہیں کی۔ تم پہلے شخص ہو جو آئے ہو۔ اگر یہی تمہاری قمیصیں ہیں تو لے جاؤ۔

مجھے اس وقت معلوم ہوا کہ ہر ڈپارٹمنٹل اسٹور میں ایک خاص شعبہ اسی کام کے لیے ہوتا ہے۔ یہاں ہر کاؤنٹر والا ایسی چیزیں شام کو جمع کرا دیتا ہے جسے خریدار بھول جاتے ہیں۔ جو لوگ اپنے پیکٹ اسٹور میں بھول جاتے ہیں وہ اس شعبہ میں جا کر اور تفصیل بتا کر اسے حاصل کر لیتے ہیں۔

بہرحال میں نے اپنے ساتھی اور اس لڑکی کا شکریہ ادا کیا اور اپنے فلیٹ پر واپس آ گیا۔

پاس بک کھو گئی دوسرا واقعہ جو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز تھا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد پیش آیا اس دن میں نے بنک سے ۳۰ ڈالر نکلوائے تھے۔ دس دس ڈالر کے دو نوٹ تو میں نے پاس بک میں رکھ لیے اور دس ڈالر جیب میں ڈال لیے۔ شام کو گھوم پھر کر جب فلیٹ پر واپس آیا تو سب کچھ تو موجود تھا لیکن وہ پاس بک نہ تھی جس میں بیس ڈالر تھے۔ بیس ڈالر کھو جانے کا غم تو خیر اپنی جگہ تھا ہی لیکن زیادہ پریشانی پاس بک کھو جانے کی تھی۔ اپنے ملک کا جو مجھے تجربہ تھا۔ اسے سوچ سوچ کر روح فنا ہو رہی تھی۔

بنک کی پاس بک کھو جانے کا مطلب ہے کہ اس وقت تک روپیہ نہیں نکلوایا جا سکتا جب تک نئی پاس بک نہ بن جائے اور نئی پاس بک بنوانے کے [illegible] خاصی

دینی پڑتی ہے۔ کسی ایسے شخص سے شناخت کرانا پڑتی [illegible] کا حساب بھی اس بنک سے چلتا ہو۔ غرض اچھا خا[صا] [illegible] ہوتا ہے۔

میں سوچتا رہا کہ آخر پاس بک کہاں کھو سک[تی ہے] لیکن کچھ یاد نہیں آ رہا تھا۔ بنک سے نکلنے کے بعد میں ڈاک خانے میں گیا تھا جہاں سے کچھ لفافے اور کا[رڈ لیے] تھے۔ اور وہیں پر خط لکھنے کے کاؤنٹر پر کھڑے ہو کر د[و] خط لکھے تھے۔ اس کے بعد ایک ریستوران میں چائے [پی] لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں تھا کہ وہاں میری پاس [بک اب] تک میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ کل سے لے کر آج تک نہ کتنے لوگ آئے اور گئے ہوں گے۔ بیس ڈالر رقم کم [رقم] نہیں ہوتی۔ جس کے ہاتھ بھی پاس بک لگی ہو گی اس [نے] رقم جیب میں ڈال لی ہو گی۔

تو صاحب میں نے ۲۰ ڈالروں پر تو خاک ڈ[الی] جھجکتے جھجکتے بنک گیا کہ وہاں سے ایک نئی پاس بک [بنواؤں] کاؤنٹر والی لڑکی کو میں نے بتایا کہ میری پاس بک کھو [گئی] اس نے میرے اکاؤنٹ کا نمبر پوچھا جو مجھے یاد نہیں تھ[ا۔ میں] نے اپنا نام بتا دیا۔ نام سے اس نے نمبر کا پتا لگایا اور [بغیر] بحث کے ایک نئی پاس بک بنا کر میرے سامنے رکھ دی۔

یہ ایک ایسی بات تھی جس کے لیے میں بالکل تیار نہ [تھا] میں نے پوچھا اس پاس بک کی مجھے کوئی قیمت دینی ہو[گی] اس نے مسکرا کر کہا کہ نہیں۔ مجھے اور بھی حیرت ہوئی [نئی] پاس بک میرے ہاتھ میں آ چکی تھی اور لال فیتہ کا ڈر نکل [illegible]

پھر گم ہوجائے تو؟" وہ بولی "پھر میں نئی پاس بک بنادوں
ں تم جتنی بار پاس بک گم کروگے میں اتنی ہی بار ایک نئی پاس بک
بناکر دوں گی"۔ اتنی گفتگو کے بعد مذاق کا ایسا ماحول بن چکا تھا۔
میں نے اس سے کہا کہ میری جو پاس بک کھوگئی تھی اس میں دس
دس ڈالر کے دو نوٹ بھی تھے۔ کیا وہ بھی مجھے واپس مل سکتے
ہیں۔ وہ بولی۔ "پاس بک تک تو ٹھیک ہے لیکن اگر میں نوٹ
بناکر تمھیں دوں گی تو ہم دونوں جیل میں نظر آئیں گے۔"

اس واقعہ کو تقریباً دس دن گذر چکے تھے، ایک دن
شام کو یونیورسٹی سے واپسی پر مجھے پوسٹ ماسٹر جنرل مانٹریال
کی طرف سے ایک پراسرار رجسٹری لفافہ ملا۔ یہ لفافہ میں نے
کھولا تو اس میں میری کھوئی ہوئی پاس بک تھی اور ایک خط
جس میں لکھا تھا۔

"جناب من! منسلکہ پاس بک ہمیں سنت کیتھرین
کے ڈاک خانہ کے پبلک کاؤنٹر پر پڑی ہوئی ملی،
پاس بک پر آپ کا پتہ نہیں تھا اس لیے بنک سے
آپ کے اکاؤنٹ کا نمبر بتاکر پتہ حاصل کرنے
میں کچھ وقت لگا۔ اسی وجہ سے پاس بک واپس
کرنے میں تاخیر ہوئی، آپ سے اس کے لیے ہم معذرت
چاہتے ہیں۔ پاس بک میں ۲۰ ڈالر بھی تھے جو ڈاک
خانے میں آپ کے نام سے جمع کرادیے گئے ہیں۔
آپ منسلکہ رسید مانٹریال کے کسی بھی ڈاک خانے
کو دکھاکر پونے بیس ڈالر وصول کرلیجیے۔ ۲۵ سنٹ
یعنی چوتھائی ڈالر خط و کتابت کی مد میں ہم نے جمع
کرلیے ہیں۔" آپ کا مخلص:

پوسٹ ماسٹر جنرل

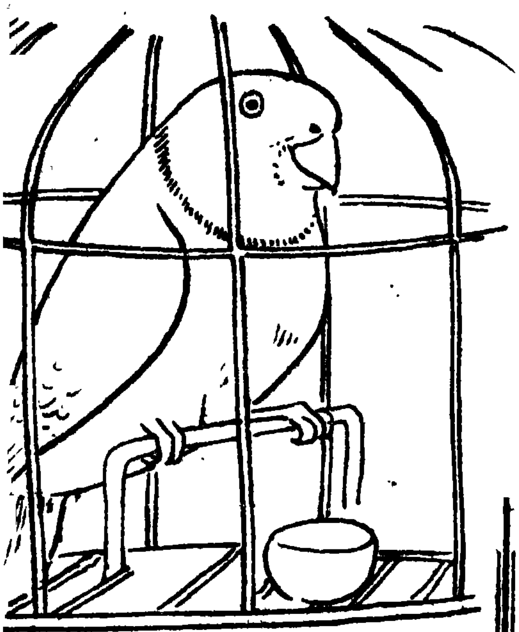
روپے تو میں دوسرے ہی دن پڑوس کے پوسٹ
آفس سے جاکر وصول کرلایا لیکن اب بھی جب اس واقعہ کی
یاد آتی ہے تو سوچتا ہوں کہ پبلک کاؤنٹر سے لے کر پوسٹ
ماسٹر کے دفتر تک پہنچنے میں پاس بک نے کتنے مرحلے طے کیے
ہوں گے۔ کتنے ہاتھوں سے گذری ہوگی لیکن کسی کے دل
میں بھی یہ خیال نہ پیدا ہوا کہ ۲۰ ڈالر نکال لیے جائیں اور
ایمان داری جتانے کے لیے خالی پاس بک بھیج دی جائے۔

برس سے نو برس تک کے بچوں کی حماقت کا واحد ترجمان
ماہنامہ "حماقت"
سالانہ چندہ پانچ روپے فی کاپی پچاس پیسے
ایڈیٹر غازی ادیب۔ ایم کے شاہین اینڈ کو۔ علی گڑھ

تعلیمی تاش
چھوٹے اور بڑے سب ہی کے لئے بہترین کھیل، اس کے کھیلنے سے وقت
ضائع نہیں ہوتا بلکہ قابلیت بڑھتی ہے۔
تعلیمی تاش اردو ۹۰/ تعلیمی تاش انگریزی ۹۰/
" ہندی ۹۰/ " صرف ہندی ۹۰/
صرف انگریزی ۱۵۰/

جناب کوثر اعظمی

ہمارا طوطا



ہم نے ہے پالا کیا بھولا بھالا
ننھا سا طوطا منا سا طوطا
طوطا ہمارا کیا پیارا پیارا
قد میں ذرا سا بالکل ہرا سا
مکھڑے پہ لالی آنکھیں نرالی
گردن میں دھاری کیا تیاری نیاری
ایسی بھلی سی چمپا کلی سی
صورت کٹیلی بولی رسیلی

پنجرے کے اندر بیٹھا وہ اکثر
دیتا ہے سیٹی کیا میٹھی میٹھی
باتیں ادب سے کرتا ہے سب سے
منّے کو بھیّا امّی کو میّا
ابّی کو باجی دادا کو حاجی
کہہ کر بلائے دل کو لبھائے

ننھا پرندہ منا پرندہ
باغوں کا باسی فطرت کا داسی
جنگل کا پنچھی حیوان، وحشی
بستی میں آکر انساں میں رہ کر
انساں بنا ہے کیسا سدھا ہے
قدرت خدا کی حکمت خدا کی
اس سے عیاں ہے کیا خوش بیاں ہے
جو بھی سنا ہے ازبر کیا ہے

دیکھو سنو تو اے ہے ذکو تو
کیا کہہ رہا ہے کچھ پڑھ رہا ہے
کیسا وہ فرفر اللہ اکبر
پڑھتا ہے کلمہ سنتی ہو سلمیٰ
کہتا ہے بچو! یہ یاد رکھو
اللہ اعلیٰ سب سے ہے بالا
سب کا وہ حاکم رحمان و راحم
بے عیب پیاری ہے ذاتِ باری
سارے جہاں کا کون و مکاں کا
والی ہے رب ہے عالی لقب ہے
آقا وہی ہے داتا وہی ہے
سب اس کے نوکر ہم، تم کہ کوثر

منوہر پرشاد ماتھر ایڈوکیٹ حیدرآباد

تارے

رات کو جھِل مِل جھِل مِل کرتے تارے کیسے بھلے لگتے ہیں۔
…رے کہاں سے آئے؟ اس کے بارے میں آج ایک پرانی
…ں سنائیں کہانی پرانی ہے مگر بہت مزے کی ہے۔

بھگوان نے جب زمین بنائی تو اس پر کچھ بھی تو نہ تھا۔
…نہ پودے۔ نہ پھل نہ پھول۔ ندی نالے بھی نہ تھے۔
بھگوان نے سورج بنا دیا تھا۔ چاند بھی بنا دیا تھا۔ سورج
آسمان میں چمکتا رہتا۔ رات ہوتی تو چندا ماموں اپنی پھیکی
…ی زمین پر بھیج دیتے۔ چندا ماموں کا کوئی بھروسا نہ تھا۔ ان
…نی کبھی تو اتنی ہوتی کہ زمین چمکنے لگتی اور کبھی بالکل اندھیرا
…ا۔

بھگوان نے سوچا اس طرح خالی زمین بنانے سے
…ئدہ۔ یہ سوچ کر انھوں نے اس پر قسم قسم کے پیڑ پودے
…ے۔ ندی نالے جاری کیے۔ بڑے بڑے تالاب بنائے۔
…پنی زبان میں انھیں سمندر کہتے ہیں۔ کہیں زمین کو ریگستان
…نے دیا اور کہیں گھنے جنگل اگائے۔ ان جنگلوں میں بھانت
…ت کے جاندار پیدا کیے، رینگنے والے کیڑے، چرند،
اور درندے!

اب ان جنگلوں میں چڑیوں کے چہچہانے کی آوازیں
جنگلی جانوروں کے چیخنے اور دہاڑنے کا شور ہوتا —
[illegible]

پھر انھوں نے ندی نالوں میں، تالابوں میں طرح طرح کی
عجیب و غریب مچھلیاں، مگرمچھ وغیرہ پیدا کیے۔ اور بھی
دیکھتے دیکھتے زمین پر خوب چہل پہل ہوگئی۔ ہزاروں ہزار برس
اسی طرح بیت گئے تو انھوں نے انسان بھی بنا ڈالے۔ جدھر
دیکھیے انسانوں کی بھیڑ نظر آتی۔

ہزاروں ہزار برس بھگوان یہ دیکھتے رہے۔ اور پھر
انھوں نے دیکھا کہ ان کی بنائی ہوئی مخلوق آپس میں لڑنے لگی
ہے۔ جانور تو خیر جانور ہیں انسان بھی آپس میں لڑتے رہتے
ہیں۔ بھگوان کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ جی اچاٹ ہوگیا۔ کوئی اور
نئی دنیا بسانے کی سوچنے لگے۔

پھر ایک دن وہ زمین چھوڑنے لگے تو بڑا تماشا ہوا
ان کے ہٹتے ہی زمین لڑھکنے لگی۔ اب تو وہ پریشان ہوئے
زمین بناتے وقت انھیں یہ خیال ہی نہ آیا تھا کہ اسے کسی چیز
پر ٹکانا بھی چاہیے۔

اب کیا ہو؟ انھوں نے سوچا انھیں دنیا والوں
سے زمین کو ٹکائے رکھنے کی ترکیب پوچھیں۔ مگر کوئی بھی زمین
کو ٹکائے رکھنے کی ترکیب نہ بتا سکا۔

پھر بھگوان کے دل میں ایک خیال آیا۔ انھوں نے زمین
پر بسنے والوں سے پوچھا: تم میں بہت سے طاقتور ہیں،
[illegible]

کوئی اس زمین کا بوجھ اٹھانے پر بھی تیار ہے۔ مگر سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ کسی کو بھگوان کا جواب دینے کی ہمت نہ ہوئی۔ آخر بھگوان سے نہ رہا گیا اور بولے: "ہم نے تمھاری بہادری دیکھ لی۔ آپس میں لڑنے بھڑنے کو اتنی جلدی تیار ہوجاتے ہو مگر اپنی زمین کا بوجھ اٹھانے کی ہمت کسی میں نہیں"

اب بھگوان نے کیا کیا کہ آس پاس کے سوکھے پتے اکٹھے کیے انھیں آگ دکھائی اور چلم میں بھر کر حقہ گڑگڑانے لگے۔

حقے سے دھواں نکلتا تھا۔ بھگوان حقہ پیتے جاتے اور دھواں آسمان کی طرف چھوڑتے جاتے یہ دھواں بادل بن کر آسمان میں تیرنے لگا۔ حقے کی چلم سے جو چنگاریاں نکلیں وہ بھی ان بادلوں کے ساتھ آسمان پر پہنچ گئیں اور آسمان سے چپک گئیں۔ یہی چنگاریاں تو ہیں جو آج تک جھل مل جھل مل کرتی رہتی ہیں۔ ہم تم سب انھیں تارے کہتے ہیں۔ جو دھواں آسمان پر چلا گیا تھا وہ بادل بن گیا ـــــ اور ان بادلوں اور تاروں کی کشش سے یہ زمین ٹک گئی۔ اس کا لڑھکنا بند ہو گیا۔ اور بس پھر بھگوان نے اس زمین کو چھوڑ دیا اور دوسری دنیا بسانے چلے گئے۔"

(ترجمہ)

ماہ نامہ **بچوں کا ڈائجسٹ** بہار شریف کا

عظیم، ضخیم اور باتصویر خاص نمبر

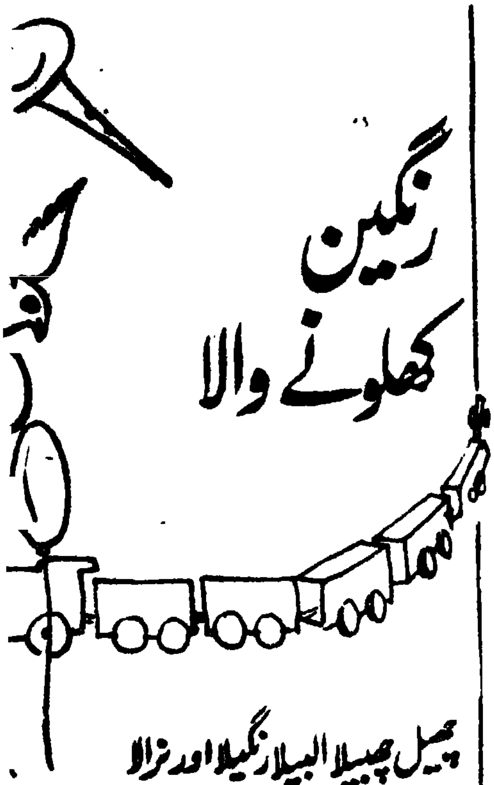
۱۵ مئی کو خاص اہتمام سے شائع ہو رہا ہے۔

ایڈیٹر رضوان رضوی۔ معاون مناظر عاشق

سالانہ قیمت ـــــ صرف چھ روپے

جناب شفیع تمنا کلکتوی

رنگین کھلونے والا



چھیل چھبیلا البیلا رنگیلا اور نرالا
بچو پھر میں آیا ہوں رنگین کھلونے والا

چینی کی گڑیا لے لو رنگ بر
بچو یہ بھی خوب رہے گی چاد

ٹن ٹن کرتا چلا ہے کیسے دیکھو رکشا والا
بچو پھر میں آیا ہوں رنگین کھلونے والا

چھم چھم باجا بجا رہا ہے دیکھو
چھم چھم ناچ رہی کیسے پیاری

لے لو بھیا دو آنے میں طوطا بھولا بھالا

ایلما اسٹیپر
ترجمہ جمشید اشرف

گلہری کا گھونسلا



پکسی نے ڈیوڈ سے وعدہ کیا تھا کہ اگلی مرتبہ
ایک جانور کا گھونسلا دکھاؤں گا" اس لیے جیسے
ئی کا مہینہ آیا وہ پکسی سے ملنے چلا گیا مگر اس کی
میں ابھی تک نہیں آیا تھا کہ ایسا کون سا جانور ہے
ا گھونسلا پیڑ پر بناتا ہے۔

خیر، وہ خوب گرم جوشی سے پکسی سے ملا،
نے جادو کے زور سے اس کا قد چھوٹا کر دیا۔
کے آنے سے پہلے پکسی ایک بھورے رنگ
ری سے باتیں کر رہا تھا۔

اپنے ایک دوست سے ملائیں، یہ ڈیوڈ ہے: میرا
بہت اچھا دوست ہے، آپ سے کچھ باتیں پوچھنا
چاہتا ہے"۔

"ہاں ہاں بڑی خوشی سے" گلہری نے کہا۔
"ضرور پوچھیے"

"شکریہ شکریہ" ڈیوڈ نے جلدی سے کہا۔
"مجھے آپ ہی کے رہن سہن کے بارے میں کھانے
پینے کے بارے میں کچھ پوچھنا ہے۔ اچھا تو یہ بتائیے
کہ آپ کھاتی کیا ہیں"؟

گیا، میں بس کھانا کھانے ہی جارہی تھی آپ چاہیں تو مجھے کھاتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔"

یہ کہتے ہی گلہری ایک دوسرے پیڑ پر کود گئی اس پر سے تھوڑی سی چھال اُتاری اس چھال کو اپنے اگلے دو پیروں سے پکڑ کر ایک کٹے ہوئے درخت کی جڑ پر پھیلا دیا اور پھر اس کو جلدی جلدی کترنا شروع کر دیا۔ وہ پھر ایک مرتبہ جھٹکے سے کودی اور نہ جانے کس کونے سے ایک چھالیہ نکال لائی۔ اور جلدی جلدی اسے بھی کترنا شروع کر دیا۔

"بھئی مجھے چھالیا کھانے کا بہت شوق ہے۔" اس نے ڈیوڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ چھالیا نہیں ملتی تو میں پیڑ کی چھال اور دوسری قسم کی گٹھلیاں کھاکر گزارا کر لیتی ہوں، اور اگر یہ سب بھی نہیں ملتا تو کسی نہ کسی چڑیا کا انڈا کھا لیتی ہوں، مگر ایک بات یاد رکھنا مسٹر ڈیوڈ، تم مجھے کبھی بھی زمین پر بیٹھ کر کھاتے نہیں دیکھو گے۔ ہم سب ہمیشہ کسی نہ کسی پیڑ کے تنے پر یا پیڑ کی شاخوں پر بیٹھ کر ہی کھاتے ہیں۔ جانتے ہو ایسا کیوں کرتے ہیں ہم؟"

اس نے ڈیوڈ سے پوچھا۔

اور ڈیوڈ نے جلدی سے انکار میں سر ہلا دیا۔

"بھئی بات یہ ہے کہ میں پیڑ کی شاخ یا موٹے سے تنے پر بیٹھ کر اپنی پچھلی ٹانگوں پنجوں کو پیڑ کے تنے میں اچھی طرح جما لیتی گرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور خوب سے بیٹھی بیٹھی کھاتی رہتی ہوں۔"

"بہت خوب" ڈیوڈ نے تعریف کی۔ کہا۔ "اور پھر آپ کی دم بھی تو کتنی خوب صورت یہ تو شاید صرف دکھانے کی ہے، کام آتی ہوگی۔"!!

"خوب! یہ کیا بات کہی آپ نے" گلہری نے بُرا مانا اور بولی: "جی جناب مجھے اپنی دم پر بہت ہے یہ بس دکھانے کے لیے نہیں ہے۔ آپ کو ہونا چاہیے یہ جتنی خوب صورت ہے اس سے کارآمد بھی ہے۔"

"آپ کو تو شاید یہ بھی معلوم نہ ہوگا کبھی زمین پر چلتی ہی نہیں ہوں اس کی مثال آ ابھی ابھی دیکھ چکے ہیں کہ میں کیسے پھدک کر سے اُدھر چلی گئی تھی" گلہری نے کہا۔

"یہ بات تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں" نے کہا۔

"اچھا ایک بار آپ اور دیکھیے" گلہری بولی منٹوں میں وہ پیڑ کی سب سے اونچی شاخ پر گئی اور پھر ایک شاخ سے دوسری شاخ پر تیزی سے چلنے لگی کہ ڈیوڈ کو ایسا لگا جیسے اُ چکر آ گیا ہو۔

پکسی بھی گلہری کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا
اس نے کہا۔

"دیکھو میاں ڈیوڈ، یہ کتنی تیزی سے ایک شاخ سے دوسری شاخ پر چڑھ رہی ہے۔ مگر کیا تم کو معلوم ہے کہ اس کا توازن کس طرح برقرار ہے کہ گرتی نہیں؟"

ڈیوڈ نے جلدی سے کہا "ہاں ہاں یہ اپنی دُم سے اپنا توازن برقرار رکھتی ہے"

"دیکھو دیکھو" پکسی چیخا "گلہری سب سے اوپر والی شاخ سے کود رہی ہے، اے وہ کود گئی دیکھو اس نے اپنی دم کو اپنے اوپر کر رکھا ہے اس وقت اس کی دم پیراشوٹ کا کام دے رہی ہے"

اتنی دیر میں گلہری کود چکی تھی۔ اس نے کہا میں اس سے صرف پیراشوٹ ہی کا کام نہیں لیتی یہ میرے لیے چھتری کا کام بھی دیتی ہے۔ جب بھی بارش ہوتی ہے میں اس کو اپنے اوپر رکھ لیتی ہوں جب بھی گرمی بہت تیز ہو، سورج سامنے کا ہو تو چھتری کے طور پر استعمال کرتی ہوں"

اور پھر اس نے اپنی دم کو چھتری بنا کر دکھایا۔

"او یہ نہ سمجھیے گا کہ میری دم بس یہی کام کرتی ہے، جاڑوں میں یہ کمبل کا کام دیتی ہے اور میں مزے سے اپنے گھونسلے میں سوتی رہتی ہوں"

"کیا کہا گھونسلا؟" ڈیوڈ نے حیرت سے کہا

"ارے ہاں گلہری صاحبہ یہ تو میں بھول ہی گیا کہ یہ ڈیوڈ کا بچہ آپ کا گھونسلا بھی دیکھنے آیا ہے اسے تو یقین ہی نہیں آرہا تھا"

"بھئی میری سمجھ میں تو نہیں آتا کہ آپ گلہری



ہو کر گھونسلے میں رہتی ہیں۔ اور اگر واقعی آپ کا کوئی گھونسلا ہے تو ہمیں ضرور دکھائیے" ڈیوڈ نے کہا

اچھی بات ہے چلیے میں آپ کو اپنا گھونسلا دکھاتی ہوں۔ آپ میرے پیچھے پیچھے آئیے

ڈیوڈ اور پکسی نے پیڑ پر چڑھنا شروع کیا

[illegible]

"معلوم ہوتا ہے یہ کام آپ لوگوں کے بس
کا نہیں۔ اچھا آیئے آپ میری پیٹھ پر بیٹھ جائیے"
اور وہ انکو اپنی پیٹھ پر بٹھا کر سب سے
اونچی شاخ پر لے گئی، اور واقعی سب سے اُوپر
ایک گھونسلا بنا ہوا تھا۔

"یہ گھونسلا کیا آپ نے بنایا ہے" ڈیوڈ نے
گلہری سے کہا۔

"ہاں یہ میں نے ہی بنایا ہے" گلہری بولی
"سب سے پہلے ہم مسلسل کئی دن تک
لکڑیاں جمع کرتے رہے پھر اس کے بعد خوب بہت
سی کائی لے کر آئے اور ان لکڑیوں کو کائی سے
جوڑ دیا اور پھر ان پر پتیاں ڈال دیں اِس کے بعد پھر
کائی ڈالی اور اسی طرح کئی تہیں جما دیں تب کہیں جاکر
یہ ہمارا گھونسلا تیار ہوا"

گلہری نے فدا اور تفصیل سے بتاتے
ہوئے کہا۔

"اس گھر کو بنانے میں ہم کو اپنے دانت
استعمال کرنا پڑتے ہیں اور اپنے دونوں ہاتھ اور
پاؤں سے ہم چھوٹی چھوٹی لکڑیاں جمع کرتے ہیں"

"بس گھونسلا تیار ہوگیا؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔
تب گلہری بولی۔

"نہیں بھئی ابھی کہاں۔ اس کے بعد ہم کو پھر کائی
جمع کرنی پڑتی ہے تاکہ آرام دہ کمرے بنا سکیں۔ تمام
لکڑیوں کو ہم اچھی طرح باندھ دیتے ہیں تاکہ گھونسلا
خوب مضبوط ہو جائے، اور آخر کار ام
کر دیتے ہیں کہ پھر وہ آندھی میں بھی نہیں

"پھر تو آپ اس میں مزے ۔
ڈیوڈ نے پوچھا۔

"جی اور کیا! میں رات کو سوتی
مگر رات گھونسلے میں گزارنے کے بجائے
زیادہ پسند کرتی ہوں، ہاں جاڑوں میں یہ
رہتی ہوں۔ اور بھئی اگر میں اسے استعمال
تو میرے بچے تو استعمال کرتے ہیں"

پکسی نے ڈیوڈ سے کہا۔ "اچھا اب
سے چلنا چاہیے، ویسے اگر تم اور کوئی سو
تو کر سکتے ہو"

"صرف ایک سوال اور" ڈیوڈ نے
کہ آپ جاڑوں میں کیا کرتی ہیں"؟

"دیکھیے اگر سردی بہت سخت پ
تو میں اپنی دم کا کمبل بنا کر مزے سے او
رہتی ہوں۔ اور جب سورج نکل آتا ہے تو
نکل آتی ہوں" گلہری نے کہا۔

"مگر اس وقت اگر آپ کو بھوک لگ
تو کیا کرتی ہیں؟" ڈیوڈ نے پوچھا۔

"ایسے موقعوں کے لیے میں کچھ نہ کچھ
جمع کر رکھتی ہوں اور جہاں کہیں بھی موقع
کوئی نہ کوئی چیز چھپا کر رکھ دیتی ہوں۔ مگر یہ
یہ ہے کہ میری یادداشت بہت کمزور ہے۔

بھول جاتی ہوں کہ کہاں رکھا تھا، اگر مل
ٹھیک ورنہ پھر اللہ مالک۔"

" اچھی بات ہے اب اجازت دیجیے، آپکا
بہت شکریہ کہ آپ نے ہمیں اتنی کام کی
باتیں۔" ڈیوڈ اور پکسی گلہری سے ہاتھ ملاکر
گئے۔

اچانک ڈیوڈ کا قد بڑا ہوگیا۔ اس نے
سے کہا۔

" اچھا جناب! اب میں چلتا ہوں۔ اگلے مہینے
ملاقات ہوگی۔"

نے کہا:۔

اگلے مہینے میں تم کو ایک ایسا گھونسلا
دکھاؤں گا جو چاروں طرف سے بند ہوگا۔ نہ کھڑکی ہوگی
نہ دروازہ۔ ضرور آنا۔" اچھا خدا حافظ۔
اور پکسی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔



جناب بدیع الزماں خاور

ایک نظم

مُنّے کو

دادی اماں لوری سنا رہی تھیں
چندا سے کیا ہے اس کا رشتہ، بتا رہی تھیں
وہ پوپلی زباں میں اک گیت گا رہی تھیں
______ اتنے میں
ریڈیو پر، یہ نیوز دی کسی نے
کہ چاند کی زمیں پر
اپنا نشاں اتر کر، گاڑا ہے آدمی نے



دادی کے واسطے تھی یہ نیوز سخت بھاری
فوراً خبر یہ سُن کر وہ چل بسیں بچاری

شکیل جاوید

نیا سویرا



گھر سے ریلوے اسٹیشن تک کا سفر اس نے پیدل کیا تھا۔ وہ خودکشی کرنا چاہتا تھا۔ پلیٹ فارم پر پہنچ ں نے دیکھا کہ دو کانسٹبل اسٹریچر پر کسی کی لاش اٹھائے رہے تھے۔ پیچھے پیچھے ایک بوڑھی اور کمزور عورت طار رو رہی تھی۔ مرنے والا اس کا بیٹا تھا۔ وہ بوڑھی ی پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ لوگ سرگوشیاں کانا پھوسی ے تھے: "اس کے بیٹے نے ریل گاڑی کے نیچے آکر کر لی تھی۔ بے چارہ بے روزگار تھا۔ فاقے کرتے تنگ آ گیا تھا۔"

خودکشی کا بھیانک انجام اس کی نگاہوں کے نے تھا ——!

اس کی روح لرز گئی ——!!

اور اس نے خودکشی کے خیال سے توبہ کر لی

"خودکشی ایک ایسا گناہ ہے جس کو نہ دنیا کی کسی ت میں معاف کیا جاتا ہے، نہ خدا کے یہاں ——!"

"پھر میں ایسا کیوں کروں ——؟"

خودکشی کا خیال چھوڑ کر وہ اپنے سامنے کھڑی ہوئی ہ ایکسپریس میں بیٹھ گیا۔

اس نے سوچا اپنے ہاتھوں مرنے کی بجائے کیوں ہی کیوں نہ ہو —!

اس کے سامنے والی برتھ پر ایک بزرگ اخبار پڑھ رہے تھے —— گاڑی کے روانہ ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی۔

اس نے سرسری طور پر گاڑی کے ڈبّے میں اور پلیٹ فارم پر نظر دوڑائی۔ کوئی جان پہچان والا نظر نہ آیا! گھر سے بھاگنا بھی تو بزدلی ہے۔ اس نے سوچا اور اپنے آپ سے سوال کیا۔

مگر میں کیا کروں، پچھلے دو سال سے ہائی اسکول میں فیل ہو رہا ہوں۔ ایسے اتنے مشکل سوال آئے کہ حساب اور انگریزی کے پرچے بگڑ گئے —— اس سال بھی قسمت میں فیل ہونا لکھا ہے۔ بھلا گھر والوں اور ساتھیوں کو کیا منہ دکھاؤں گا!

وہ چاہتا تھا کہ ان خیالوں سے پیچھا چھڑا کر آئندہ زندگی کے بارے میں سوچے۔ اس نے اخبار کے کالموں پر نظر دوڑائی۔ وہ اخبار کا آخری صفحہ تھا۔ اور اس کے بعد تقریباً آدھے صفحہ پر نئی پرانی فلموں کے اشتہار تھے۔ فلموں سے ہر طالب علم کی طرح اسے بھی دلچسپی تھی۔ ان میں سے کتنی ہی فلمیں اس نے دیکھی تھیں۔ وہ سوچنے لگا ہماری فلم کی دنیا نے کتنی ترقی کی ہے۔ پہلے ایک فلم کو بننے میں کئی سال لگ جاتے تھے۔ اور اب تو تیس دن میں ایک نئی فلم تیار ہو جاتی

اتنی توجہ دیتے تو آج ہندوستان دوسرے ملکوں کا قرض دار نہ ہوتا ——!

فلموں کے ناموں سے ہٹ کر اس کی نظریں ایک اشتہار پر اٹک گییں ایک جگہ جلی حرفوں میں لکھا تھا۔

تلاشِ گمشدہ

میرا لڑکا بھونیش کمار چڈھا سوموار کی شام سے لاپتہ ہے۔ وہ خاکی رنگ کی نیکر اور ٹیری کاٹ کی سفید ہاف شرٹ پہنے ہوئے ہے پیروں میں باٹا کی چپل ہے۔ قد ۵ فٹ رنگ گندمی پہچان کے لیے داہیں آنکھ کے نیچے ایک نمایاں تل ہے جس دن سے وہ گھر سے غائب ہوا ہے۔ اس کی ماں نے کھانا پینا چھوڑ دیا ہے۔ اور اس کے غم میں نڈھال ہو گئی ہے۔ پورا گھر پریشان ہے۔

وہ جہاں کہیں بھی ہو اس اشتہار کو پڑھ کر گھر چلا آئے۔ گھر کے لوگوں میں کوئی اسے کچھ نہ کہے گا۔ تلاش کرنے والے کو مبلغ ایک سو روپے نقد انعام دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ آمد و رفت کا خرچ بھی شکریہ کے ساتھ پیش کیا جائے گا۔

یہ اشتہار پڑھ کر اس کی کیفیت کچھ ع ——اس کے پورے بدن میں ایک سرد لہر سی گھر سے چپکے چپکے بنا کچھ بتائے چلے اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔

اسے اشتہار میں "بھونیش چڈھا" کی لکھا ہوا نظر آیا یہ اس کا اپنا نام تھا۔

اس نے سوچا کہ اگر میرے چلے جا ماں بھی اس طرح پریشان ہوتیں تو کیا ہوگا۔ بے انتہا محبت کرتی ہیں۔ پاپا بھی مجھے کم نہ چھوٹی بہن انشو ہے۔ جب میں اسکول سے وہ اپنی توتلی زبان میں مجھ سے ٹافیاں مانگ "ال سم بھائی! تافی نہیں لائے!

میرے اس طرح چپکے چپکے چلے ج میں کیسا کہرام مچ جائے گا۔ پورا کنبہ ٹرین وسل دے رہی تھی اس نے ا ارادے کے ساتھ کہا۔

"نہیں! ——نہیں ——!! ایسا نہیں ہو ایسا بھیانک قدم ہرگز نہیں اٹھاؤں گا ——!

اور وہ چلتی ٹرین سے نیچے اتر آیا۔

اب وہ پلیٹ فارم پر کھڑا ہوا جاتی ہ رہا تھا جو اسے کلکتہ نہیں بلکہ تباہی و بربادی کی طر تھی۔ اور اس کے قدم آپ سے آپ گھر کی طرف ا جہاں ایک نیا سویرا اپنی باہیں پھیلائے اس

بچوں کی دل چسپ اور معلوماتی کتابیں

مذہب

آں حضرتؐ	الیاس احمد مجیبی	-/65
ارکان اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	-/50
ابرار	الیاس احمد مجیبی	1/42
خلفائے اربعہ	خواجہ عبدالحئی فاروقی	1/50
رسول پاک	عبدالواحد سندھی	1/80
سرکار دوعالمؐ	محمد حسین حسان ندوی	2/-
عقائد اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	-/50
مسلمان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	-/75
نبیوں کے قصے	خواجہ عبدالحئی فاروقی	1/-
ہمارے رسولؐ	"	1/42
ہمارے نبی	سید نواب علی رضوی	-/90

معلومات

آدمی کی کہانی	مشتاق احمد اعظمی	1/25
(انوکھا عجائب خانہ)	محمد حسین حسان	-/50
" " (دوم)	"	-/42
" " (سوم)	"	-/42
" " (چہارم)	"	-/50
بجلی کی کہانی	علی احمد خاں	-/50
بجلی اور مقناطیس کے کھیل		-/55
تاریخ ہند کی کہانیاں (اول)	حجتہ سلطان	-/80

تاریخ ہند کی کہانیاں دوم	ضیاء الرحمن	1/-
" (سوم)	مشتاق احمد اعظمی	-/80
" (چہارم)	"	-/95
پردادا کی کہانی	پروفیسر عبدالغفور	-/56
ٹیگور	صفدر حسین	1/25
چٹانوں کی کہانی	محمد امین	1/75
خبر رسانی کے طریقے	رفیعہ امین	-/85
دہلی	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	1/50
دنیا کے بسنے والے	بشیر حسین زیدی	-/75
دنیا کے بچے	محمد حسین حسان	-/80
سمندر کے کنارے	سلطانہ آصف فیضی	1/20
سمندر کے نیچے	"	2/-
سماجی زندگی (اول)	احمد الیاس پٹیل	
	اور غلام ابرار	-/56
" " (دوم)	" "	-/80
" " (سوم)	" "	-/81
" " (چہارم)	" "	-/81
قدرت کے کرشمے		-/44
مفید معلومات (دوم)		-/75
" " (سوم)		1/25

مفید معلومات (چہارم)		1/50
معلومات کی پانچویں کتاب		1/50
میرانیس	محمد حسین حسان	1/25
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	1/50

کہانیاں

ابوخاں کی بکری	ڈاکٹر ذاکر حسین	2/50
اس نے کیا کرنا جانا	آصف مجیب	-/42
پاک کہانیاں (اول)	قمبوط احمد سیوہاروی	1/42
" (دوم)	"	1/15
تانبیل خاں	محمد حسین حسان	-/42
ترکوں کی کہانیاں	"	-/55
چقماق کی ڈبیا	برکت علی فراق	-/40
چھوٹی لالٹین	مشتاق احمد اعظمی	-/31
چنبیلی	محمد حسین حسان	-/50
چمپاوت کا آدم خور شیر	محمد معین	-/75
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	کوثر بانو	-/42
شہزادی گلنار	پروفیسر عطاء اللہ	-/40
مشیدلا	پروفیسر محمد مجیب	-/50
لال مرغی	عبدالواحد سندھی	-/50
مزہ چکھائیں گے	"	-/40
ننھا ٹٹو		-/42

محترمہ اصفہ مجیب

جب اور اب

تعلیم کے ساتھ اخلاق کے سدھار کا خاص دھیان رہتا۔ کیوں کہ بچپن میں جو نقش دل پر بیٹھ جاتا ہے وہ کبھی نہیں مٹتا۔ نرم و نازک پودے کو جدھر جھکاؤ اُدھر جھک جاتا ہے۔ گھر، خاندان، قوم اور ملک کی ترقی اور بھلائی کی ساری امیدیں بچوں کے ہی دم سے لگی رہتی ہیں۔

گھر میں پالتو پرندے ہمارے ملازم واجد نے بہت سے لال پالے تھے۔ کتنے پیارے، خوب صورت، لال لال چونچ، اور پروں پر لال رنگ کی چتیاں، پنجرے میں اِدھر سے اُدھر پھدکتے بہت بھلے لگتے۔ ان کی بولی بہت اچھی ہوتی ہے۔ سب ساتھ آواز ملا کر ایک خاص لَے سے بولتے ہیں۔ لوگ کہتے یہ قرآن شریف کی آیت صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَہُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ۝ پڑھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو انداز ایسا ہی ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے یہی پڑھ رہے ہیں۔ مہین مہین سریلی آواز سے جلدی جلدی کہہ جاتے۔ قراءۃ کی طرح۔ اتنی بہت سی چڑیوں کا ایک ہی انداز اور آواز کے ساتھ لحن سے بولنا ہی خدا کی قدرت ہے۔

واجد نے بٹیریں بھی پالی تھیں، اکا کن کھلاتے بڑا خیال رکھتے وہ خوب موٹی تازی تھیں۔ اور کبوتر بھی بہت تھے۔ ان کی کابکیں بھی تھیں۔ لمبی سی چھتری بھی، اڑان کر کے اس [illegible]

پالتے تھے۔ اور بعض شوقین ان کے پاؤں میں گھنگرو پہنا [illegible] مرمر پر چلتے تو چھن چھن گھنگر و بجتے۔ باہر بطخوں کا جوڑا قائیں کرتا رہتا۔ بہت شور اٹھتا۔ اس ذکر پر خیال آیا کہ یہاں ایک طوطا تھا جو آثار قدیمہ میں سے معلوم ہوتا۔ بہ[illegible] سا ہرا ہرا۔ لال لال نوکیلی مضبوط چونچ اور لال کنٹھا۔ [illegible] کے در پر اس کا بڑا سا لوہے کا پنجرا رکھا رہتا۔ اتنے قد کا طوطا اس کے بعد میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ شاید کہ[illegible] میں ہو۔ صرف یہی نہیں وہ بڑا بہادر اور ہوشیار بھی [illegible] بہادری سے اپنے دشمن کا مقابلہ کرتا۔ اور اپنی حفا[ظت] آپ کرتا۔ بلّی پاس نہ پھٹکتی اور کبھی شامت کی ماری [illegible] وہ دور ہی سے دیکھ کر شیر کی طرح ڈکارتا اور نیزہ تن[illegible] کی طرح اپنی نوکیلی چونچ اس پر وار کرنے کو بڑھاتا۔ [illegible] میں ٹھونگیں مارتا۔ شاید کبھی بلّی کو زخمی بھی کر دیا ہو۔ کھسیا کر دم دبا کر بھاگ کھڑی ہوتی۔ بلند اور کرخت آوا[ز] ٹائیں ٹائیں بولا کرتا۔ طرح طرح کی بولی۔ "مٹھو بیٹا بہشتی آیا ہے۔ پردہ کر لو" اور بہت کچھ۔ اپنے کھا[نے] کی پیالیاں تک کاٹ کر پھینک دیتا۔ تب کوئی مضبو[ط]

ـــــــــــــــــــــــــــــ

لے دہلی اور لکھنؤ کے حوڑ یا گھ [illegible]

گئی۔ جاڑوں میں روئی کا غلاف پنجرے پر چڑھا دیا جاتا
مرتبہ جناب روٹھ بھی گئے۔ ہوا یہ کہ بچوں کی کھلائی بچوں کے
دودھ پر کی بالائی اسے روز کھانے کو دیتی۔ بچے اور کھلائی کہیں
چلی گئی تو بالائی بند ہو گئی۔ طوطے صاحب نے کھانا چھوڑ
دیا۔ کئی دن گذر گئے جو کھانا آٹا وغیرہ دیا جاتا جوں کا توں
دھرا رہتا۔ یہ منہ نہ لگاتے، کڑھے کڑھے منہ پھیلاتے بیٹھے
رہتے۔ ملازمہ مٹھن بجو کھانا دیتی تھی محترمہ والدہ صاحبہ کے
پاس آئی اور کہا کہ طوطے کو نہ جانے کیا ہوا کچھ نہیں کھاتا۔
والدہ صاحبہ نے کہا "شاید بیمار ہے۔ ادر کانٹا تو نہیں نکل آیا۔"
ئی بیماری ہوتی ہے) کسی آدمی کو جو چڑیوں کے امراض
نتا تھا بلایا گیا فوراً ہی ڈاکٹر آیا دیکھ بھال کے بعد کہا "یہ
بھلا چنگا ہے، کانٹا وانٹا کچھ نہیں" بہت فکر ہوئی کیا
ت ہے؟ پھر خیال آیا کہ بالائی دے کر دیکھیں کیوں کہ
ز بالائی کھاتا تھا۔ اور کئی روز سے بالائی نہیں ملی تب
سے کھانا چھوڑ دیا ہے۔ دودھ پر کی بالائی اتار کر پیالی
رکھی گئی پہلے تو ترچھی نظروں سے دیکھتا رہا جب سب
ٹ گئے تو بالائی خوب کھائی اور اس وقت سے کھانا بھی
رع کر دیا۔ ناراضگی دور ہوئی۔

ایک پہاڑی خوب صورت مینا تھی۔ زرد زرد چونچ
۔ بیسن بھون کر اس میں ہلدی ملا کر کھلایا جاتا۔ ایک گردا
ز بھون کر دیا جاتا۔ خوب بولتی تھی "بی بی گوندا لاؤ۔۔
گوندا لاؤ" بہت پیارے انداز سے کہتی۔ سب کی
یوں کی نقل اتارتی۔ کھانستی، چھینکتی، کھنکھارتی۔ غسل کے

ہو کر کھل بل کھل بل نہاتی۔ سب کی چہیتی مینا تھی ہم سب بڑا
لاڈ پیار اور اس کا سجاؤ کرتے۔ محترمہ بہن طاہرہ خاتون صاحبہ
کبھی اسے چھیڑتیں ہاتھ میں چاقو لے کر اس کے پاس آتیں
اور کہتیں "آج تجھے ذبح کر دوں گی" وہ رونا دھونا شروع
کرتی۔ شکایت کے لہجہ میں شور اور واویلا کرتی۔ دیکھیے
جانوروں کے بھی کتنی سمجھ ہوتی ہے اور آدمیوں کے ساتھ
رہنے سے وہ کیا کچھ سیکھ جاتے ہیں۔

ایک بکرا پال رکھا تھا۔ ڈبی ٹمیا کو جہاں پاتا چبا جاتا۔
سب حیران ہو جاتے۔

مرغیاں عام طور سے سب جگہ پالی جاتیں۔ پرانی
مثل ہے "گھر کی مرغی دال برابر" خوب انڈے اور مرغ
کھائے جاتے، چوزے پکتے۔ ناشتہ میں سب کے لیے
انڈا کھانا ضروری نہیں تھا۔ جب بہت سے انڈے جمع
ہو جاتے خاگینہ بن جاتا۔ انڈوں کا سالن وغیرہ پکتا۔ کھانے
کے وقت کوئی مہمان آجاتا تو کوئی مشکل نہ پڑتی۔ انڈے
اور مرغی پک جاتی۔ جب مرغی کے چھوٹے چھوٹے بچے نکلتے
تو لڑکوں اور لڑکیوں کو ان سے دلچسپی ہو جاتی۔ پھول
جیسے اُچکتے پھاندتے بہت اچھے لگتے، ایک مرتبہ ہم نے
چھوٹے بچوں کے پر رنگ دیے۔ رنگ برنگے پروں کے
بچے کھیل کود رہے تھے ہم تماشہ دیکھ رہے تھے کہ چیل
جھپٹا مار کر ایک بچہ اڑا لے گئی۔ ہمیں بڑا رنج ہوا۔ جب سے
بڑی حفاظت کرنے لگے۔

مجیب صاحب ایک مرغی کو ٹاپے میں بند کر دیتے

وہ انڈا دے دیتی کٹ کٹ کرنے لگتی تب ہی کھولتے۔ ایک مرتبہ ہم ایک کالی مناری مرغی لکھنؤ سے سندیلہ اپنے درجہ میں بٹھا کر لائے راستہ میں سیٹ پر اس نے انڈا دیا۔

اور بھئی دودھ کی تو نہریں بہتی تھیں اس کا کیا کہنا۔ اتنا اچھا سچا دودھ، مکھن، بالائی اب قیمت دے کر بھی نہیں ملتی۔ اس سے بچوں کی اچھی نشو و نما ہوتی تھی۔ اب مشکل ہی سے اس کا انتظام ہو سکتا ہے۔ ورنہ پانی ملا دودھ ملتا ہے وہ بھی اتنا مہنگا۔

محلوں اور شہروں قصبوں میں بوریے کتے بہت پریشان کرتے لکھنؤ میں ایک بوریے کتے نے ایک سیار کو کاٹا اس نے پچاس ساٹھ کتوں کو کاٹا سب بوریے ہو گئے۔ محیب صاحب کے یہاں ایک ملازمہ ظہورن تھی اسے ایک کتے نے کاٹ لیا پھر وہ علاج کے لیے کسولی بھیجی گئی۔ میری کھلائی بھولا بوا کو ایک دن کتے نے کاٹ لیا وہ بوریا تو شاید نہیں تھا پھر بھی ڈر تھا۔ بے چاری گھبرائی گھبرائی پھر رہی تھیں اس نے کہا "بڑھاپے ماں مورے مکدر (مقدر) ماں یہو لکھا تھا" اس نے سات کنوئیں جھانکے اور سات آئینے دیکھے۔ جھاڑ پھونک کرائی علاج ہوا۔ چلو بخیر گذشت بلا سر سے ٹلی۔

شادی بیاہ :- پرانے زمانے میں شادیاں ایسی ہوتی تھیں کہ اب کہیں ایسی ہوتی ہی نہیں۔ کچھ قاعدے اور رسمیں باقی ہیں مگر وہ بات کہاں۔ کہیں شادی کی تیاری شروع ہوتی تو ایسی بہار ہوتی کہ کیا کہنا۔ بہت دھوم دھام سے رچائی [illegible]

جاتی۔ مہینوں پہلے تیاریاں شروع ہوتیں اور ہفتوں چلتا قصبوں کی، دیہات کی اور شہروں کی رسموں میں فرق ہوتا تھا۔

عزیز و اقارب بہت دنوں پہلے آجاتے ڈ[illegible] کپڑے بنوائے جاتے۔ کچھ کار چوب کامدانی بنانے کو [illegible] جاتے طرح طرح کے جوڑے سلتے۔ بڑے سے تخت [illegible] سامان پھیلا ہوتا۔ زربفت، بنارسی پوت، بہار دار [illegible] تھان۔ بچکے، گوٹے۔ سلمے ستارے کی بیلیں چمپا چٹکی [illegible] کرن۔ آنکھوں میں چکاچوند سی ہونے لگتی۔ پٹاخے کی گو[illegible] کہ دیکھ کر جی لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ بیویاں دن رات [illegible] سلائی ٹکائی میں لگی رہتیں۔ کچھ رشتے دار محلے والے گھر کپڑے تیار کرنے لے جاتے۔ کچھ بے سلے جوڑے پر[illegible] کو دینے کے لیے تہہ بہ تہہ رکھ کر اس پر خوبصورتی کے کے پھول پتی بنا کر ٹانکے لگائے جاتے۔ دلھن کی طرف کا جوڑا اور دولھا کی طرف شہانہ جوڑا جو چڑھاوے [illegible] سب سے بھاری اور قیمتی ہوتا۔ اس سے پہلے یہ رسم شہانہ جوڑے میں تاشبادلے کا دوپٹہ اور پیشواز بنتی تا[illegible] میں سنہرا تار ہوتا تھا۔ پائجامہ زرد مشروع کا۔ یہ کپڑے اسی غرض کے لئے بنائے جاتے تھے۔ یہ جوڑا شادی [illegible] بعد پھپھوں کو حق کے طور پر ملتا تھا۔

رات میں محلے ٹولے کی بجیاں لڑکیاں سب جمع ہو کر ڈھولک پر سہرے، بنرے اور غزلیں گاتیں۔

شادی میں جب چند دن رہ جاتے تو [illegible]

[illegible]

ں کا بلاوا) لے کر نکلتیں۔ حیثیت کے مطابق انھیں
جوڑے سونے چاندی کے زیور پہنائے جاتے۔
ہوتی تو گرم کام دار شال اڑھائی جاتی کھڑا پاجامہ
دوپٹہ سب میں خوب گوٹا ٹھپا لگا ہوا جب وہ جھما جھم
پد دیتی پھرتیں تو سب شوق سے انہیں دیکھتے۔ بیویاں
ایک ایک چیز پر نظر ڈال کر پوچھتیں "زیور کون سا ملا ہے؟"
لو دیکھ کر ہی اس کا اندازہ ہو جاتا کہ شادی کتنی شان
ن سے ہو رہی ہے۔ شادی سے ہفتہ بھر پہلے لڑکی
جوڑا پہنا کر مایوں بٹھایا جاتا۔ ابٹن چھلانے کی رسم
مات سہاگنیں لڑکی کے ہاتھ میں ایک ایک انگلی ابٹن
ڈومنیاں ڈھولک پر گانے لگتیں۔

ن تیرے رسیلے بنو بازو بند ڈھیلے
ے ہیر سوہے اور موتیوں کی جوڑی
چنی تیری زیب بنو بازو بند ڈھیلے
ے جھومر سوہے اور ٹیکے کی جوڑی
لڑیاں تیری زیب بنو بازو بند ڈھیلے
یں تیرے چوڑیاں سوہیں اور کڑوں کی جوڑی
پائل تیری زیب بنو بازو بند ڈھیلے
ے شال دوشالے اور تکیوں کی جوڑی
نرا تیرا زیب بنو بازو بند ڈھیلے
ے میری نادان بنو بازو بند ڈھیلے

اس کے بعد لڑکیاں بالیاں ابٹن کھیلنا شروع کرتیں
دوسرے کے پیچھے دوڑتیں بھاگتیں جو نہ لگوانا چاہتی
[illegible]

قہقہے لگاتیں۔ یہ بھی مشہور تھا کہ جس لڑکی کے آج ابٹن لگ
جائے اس کی شادی جلد ہو جائے گی۔ اس لیے لڑکیاں شرمیلیاں
اندر چھپتی پھرتیں۔ پکڑ دھکڑ دھما چوکڑی مچتی۔ لڑکے کے یہاں بھی
ابٹن کھیلا جاتا اور خوب گت بنتی۔ چاروں طرف ابٹن ہی ابٹن،
ہنگامہ جیسے ہولی کھیلی جاتی ہے۔

لڑکی جب مایوں بیٹھ جاتی کہیں آتی جاتی نہیں تھی۔
لڑکیاں گھیرے رہتیں۔ دل بہلاتیں۔ ان دنوں خاص کر لڑکی کے
لیے بہت اچھا ناشتہ آتا۔ حلوے، پنڈی، میوے بھر بھر کے اس کے
ساتھ لڑکیاں بھی شریک ہوتیں۔ اتنے دن ان کے بھی بڑے
مزے رہتے۔ جیسے پانچوں انگلیاں گھی میں۔

دلھن کی طرف سے دولھا کے کپڑوں کا ناپ لینے
درزی آتا اسے نیگ ملتا۔

شادی کے دن اللہ! کیا بہار ہوتی۔ عجیب نظارہ ہوتا
اندر باہر شامیانے لگا دیے جاتے۔ کھچا کھچ مہمانوں سے بھرے
رہتے۔ دالان کمرے صحن کہیں تل رکھنے کی جگہ نہ ہوتی۔ شور و
غل اتنا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ ڈومنیاں جو مع
اپنے پورے خاندان کے قبضہ جمائے ہوتیں۔ پان ڈلی کتھا صبح
ہی صبح ان کو بانٹ دیا جاتا تھا۔ چھکے پر چھکا لگاتیں لہک
لہک کر گاتیں۔ گھونگھرو پہن کر چھما چھم ناچتیں۔ طرح طرح کی
نقلیں کرتیں۔ مہمان بیویاں دلچسپی سے یہ تماشہ دیکھتیں۔
گھر والیوں کو اتنی فرصت کہاں، کام کرتے کرتے شل ہو جاتیں۔
ایک ایک پیر یہاں تو ایک وہاں۔ چیختے چیختے گلا پڑ جاتا۔

(باقی آئندہ)



جناب عبداللطیف اعظمی

شیر

۲

ٹائیگر (شیر) کو دیکھنے کے بعد جب ہم لوگ
اس مصنوعی پہاڑی کے قریب پہنچے تو شیر ببر کی گرج
سنائی دی۔ ایسی ڈراونی تھی کہ گڈو سہم کر اپنے پھوپھا جان
سے لپٹ گئی۔ افشاں رونے لگی، نشاط بھی چھوٹی ہے
مگر کئی مرتبہ چڑیا گھر آچکی ہے، اس لیے وہ ذرا بھی
نہ ڈری ہنس ہنس کر گڈو اور افشاں کو سمجھانے لگی کہ
شیر اور ہمارے درمیان بھلا کتنی چوڑی کھائی ہے
وہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

جب انھوں نے دیکھا کہ بہت سے بچے اُچک
اُچک کر شیر ببر کو دیکھ رہے ہیں اور خوش ہو رہے
ہیں تو ان کی ہمت بندھی اور وہ بھی دوسرے بچوں
کی طرح اُچک اُچک کر دیکھنے لگے، اچکنے کی وجہ یہ تھی
کہ شیر کچھ دور اور آڑ میں تھا۔

اب گرمی اچھی خاصی کم ہو گئی تھی اور موسم خاصا

بہتر ہو گیا تھا مگر نر شیر ببر اب بھی ایک د
لیٹا ہوا تھا اور شیرنی اپنے تین چار بچو
کھیل رہی تھی مگر لوگوں نے ان کو اچھی ط
سے دیکھنے کے لیے بہت شور مچایا، کچھ لڑ
پھینکنے لگے، شیرنی کو بڑا غصہ آیا اور د
بڑے شاہانہ انداز سے اس طرف چلی جدھ
ڈھیلے پھینک رہے تھے اور ہماری طرف
لوگوں نے شیرنی اور اس کے بچوں کو اچھ
کسی نے پوچھا کہ شیر کہاں ہے ؟
کہ وہ بڑا نکھٹو ہوتا ہے، کوئی کام نہیں
چیختا ہے، کھاتا ہے اور سوتا ہے، تمام
کرتی ہے۔ پردین اور تزئین میرے قریب
کہا کہ ٹائیگر کی طرح شیر ببر کے متعلق کچھ
"ضرور بتاؤں گا" میں نے کہا۔ مگر ہما خود
کو بھی ...

دیکھنے میں مشغول ہیں"

انھوں نے آواز دی تو سب میرے اردگرد
ئے مگر ہُما نہیں آئیں، دوبارہ بلانے پر انھوں
ہمیں سب کچھ معلوم ہے" ہم نے اس سے
اس سے زیادہ خطرناک شیر نینی تال کے نیشنل
، دیکھا ہے"

"ہاں وہ ٹھیک ہی کہتی ہے" میں نے کہا
کے کاربٹ نیشنل پارک میں طرح طرح کے جنگلی
یکھنے کا موقع ملتا ہے، ان میں جنگلی شیر بھی ہوتے
لتو شیروں سے کہیں زیادہ خطرناک، مضبوط
ے ہوتے ہیں، مگر وہ عام شیر ہوتے ہیں ببر شیر
تے۔[1]

"عام شیر (ٹائیگر) اور شیر ببر میں سب سے
ں یہ ہوتا ہے کہ ببر شیر کی گردن پر بڑے بڑے
تے ہیں" میں نے بتلایا۔ ببر شیر بہت ہی مضبوط
ہوتا ہے۔ یہ پانی میں تیرنا بھی جانتا ہے۔ ببر شیر
سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اکیلا نہیں
ہمیشہ دس بیس کا گروہ بنا کر رہتا ہے۔ ایک
ر کے ساتھ دو تین شیرنیاں اور بہت سے
چھوٹے بچے رہتے ہیں، یہ سب ایک خاندان کی
سے رہتے ہیں"

تقریباً ساڑھے تین مہینے پر شیرنی بچے دیتی
ام طور پر تین چار بچے ایک جھول میں ہوتے ہیں
کبھی کبھی ان کی تعداد چھ تک پہنچ جاتی ہے۔ جب بچے
جننے کا وقت آتا ہے تو شیرنی کسی تنہائی کی جگہ چلی
جاتی ہے مثلاً دریا کے کنارے یا کوئی جھیل ہے تو وہاں
اور بڑی گھنی گھاس میں بچے دیتی ہے۔ پیدا ہوتے
وقت یہ بچے تقریباً بارہ انچ لمبے ہوتے ہیں، وزن
کوئی ایک پونڈ۔ ان کا پورا جسم سنہرے بالوں میں لپٹا
ہوتا ہے، تین مہینے تک وہ صرف اپنی ماں کا دودھ
پیتے ہیں جب ان کی عمر تین مہینے کی ہو جاتی ہے تو
ان کی ماں انھیں تنہا چھوڑ کر شکار کرنے چلی جاتی ہے
شیرنی کی اس عادت سے لکڑ بگھے بھی واقف ہوتے
ہیں اور تاک میں لگے رہتے ہیں، جہاں بچوں کو تنہا
دیکھا ان میں سے جو کمزور ہوتے ہیں ان کا شکار کر لیتے
ہیں۔ اس طرح ایک شیرنی کے بس دو تین بچے باقی رہ
جاتے ہیں"

"شیر ببر کس طرح دہاڑتا ہے پھوپھا جان؟"
گڈو نے سوال کیا۔ "شیر ببر کو بولنے اور آواز لگانے
کے بہت سے ڈھنگ آتے ہیں" میں نے جواب دیا
مثلاً کبھی کبھی وہ دوسرے شیر ببر کو یہ بتلانے کے
لیے دہاڑتا ہے کہ وہ اس کے علاقے میں آگئے ہیں
بہتر ہے کہ وہ یہاں سے چلا جائے۔ اس کے دہاڑنے
کی یہ آواز اچھے اچھے بہادروں کے دل ہلا دیتی ہے۔
کبھی کبھی وہ زور سے کھانستا ہے۔ اس کا مطلب
یہ ہوتا ہے کہ اگر شیرنی دور چلی گئی ہو تو گھر واپس

[1] ...ونتا (سومو گیر (گجرات) کے نیشنل پارک میں بھی آپ کو شیر ببر گھومتے نظر آئیں گے۔ یہ شیر ان جنگلوں میں پائے جاتے ہیں۔

آجائے۔"

"شیرنی جب اپنے بچّوں کو بلانا چاہتی ہے
تو بہت آہستہ سے ایسی آواز نکالتی ہے جیسے گائے
بیل نکالتے ہیں تاکہ دوسرے جنگلی جانوروں کو خبر نہ
ملے۔ اور جب بچّوں کی کسی بات پر غصّے کا اظہار کرنا
ہو تو غرّاتی ہے۔"

"کچھ بچوں کے بارے میں بھی بتائیے ابّو" انشاط
نے دلچسپی لیتے ہوئے اور افشاں کو اور قریب لاتے
ہوئے سوال کیا۔ "یہ تو میں بتا ہی چکا ہوں کہ تین
مہینے تک بچے الگ تھلگ رہتے ہیں اور صرف ماں کے
دودھ پر گزارا کرتے ہیں۔" میں نے بچّوں کے بارے میں
بتانا شروع کیا۔

"اس کے بعد ان کو شکار کرنا سکھایا جاتا ہے
چھ مہینے کے ہوجاتے ہیں تو ان کے دانت نکلنے شروع
ہوجاتے ہیں اور وہ اپنے ابّو اور امّی کے ساتھ شکار
پر نکلتے ہیں ان کے ابّو اور امّی انھیں بتاتے ہیں کہ
کس طرح جانوروں کو مارا جاتا ہے اور کس طرح
ان کا گوشت الگ کرکے کھایا جاتا ہے۔ شیر، شیرنی
اور ان کے بچّے بہت ہی خاموشی کے ساتھ کسی
ہرن یا کسی اور جانور کو چاروں طرف سے گھیرتے ہیں
جانور بےچارہ گھاس چرنے میں مشغول ہوتا ہے اور
اُسے بالکل خبر نہیں ہوتی کہ اسے گھیرا جارہا ہے۔ جب
شکار نزد میں آجاتا ہے تو شیر حملہ کرتا ہے اور اگر
کامیاب رہا تو شکار کو کھینچ کر اس جگہ لاتا ہے

جہاں شیرنی چھپی ہوتی ہے۔ مگر شیر بہ
وقت شکار کرتا ہے جب اسے بھوک

"دو سال تک بچے اپنے والد
رہتے ہیں، تیسرے سال میں پہنچنے
ہیں اور پانچ سال میں پورے شیر ہو

"کون زیادہ چالاک ہے، شیر
پروین نے سوال کیا۔

"شیر صرف شکار کرتا ہے اور ش
گھسیٹ کر لاتا ہے جہاں شیرنی چھپی
نے بتایا۔" لیکن شکار کو مارنے کا کام شی
شیر اس کام میں اسی وقت مدد کرتا ہے ج
ضرورت ہوتی ہے۔ اور چونکہ شیر اپنے
بادشاہ اور مالک ہوتا ہے اس لیے
ہے شیرنی اور بچّے صرف اس کا بچ
کھاتے ہیں۔"

اب کافی دیر ہوگئی تھی اور میں
چاہتا تھا کہ خورشید بولے۔ "ہما باجی بھی
اگرچہ انھوں نے شیروں کے بارے میں
ہے اور جنگلی شیر دیکھے ہیں مگر کچھ اور با
جو ذرا دلچسپ ہوں۔"

خورشید کے طنز پر میں مسکرا دیا
کہ کہ کوئی جھگڑا شروع ہو، میں نے بتانا

"جنگل میں شیر عام طور پر پندرہ
رہتا ہے، چڑیا گھر (زو) میں تیس سا

رہ سکتا ہے۔ یہ افریقہ، ایران، فلسطین اور بلقان کے جنگلوں میں پایا جاتا ہے۔"

"جب شیر اتنا بہادر اور خطرناک ہوتا ہے تو انسان اس کا شکار کیسے کرتا ہے؟" تزئین جو اب تک خاموش تھیں بول پڑیں۔

"بھئی انسان اس لیے شیر کا شکار کر لیتا ہے کہ وہ زیادہ ذہین اور چالاک ہے۔ لیکن ہے یہ بہرحال بہت خطرناک کام! اور اگر نشانہ خطا کر جائے اور شیر زخمی ہو کر بچ نکلے تو وہ بہت خطرناک ہو جاتا ہے۔ وہ مردم خور ہو جاتا ہے۔"

"مردم خور کیا بلا ہے پھوپھا جان؟" افشاں سہمی سہمی بولیں۔

"جب شیر زخمی ہو جاتا ہے تو اس کے لیے جانوروں کا شکار کرنا مشکل ہو جاتا ہے، اس لیے جب کر آدمیوں کا شکار کرنے لگتا ہے۔ اس کے علاوہ جب شیر بوڑھا ہو جائے، یا اس کے دانت ٹوٹ جائیں اور جانوروں کا سخت گوشت کھانا مشکل ہو جائے تو وہ انسان کا نرم گوشت کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے اور جب کوئی شیر ایک مرتبہ انسان کا گوشت کھالے تو وہ اس کے منہ لگ جاتا ہے اور پھر وہ جانوروں کا گوشت نہیں کھاتا۔ صرف انسانوں کا کھاتا ہے۔"

"لیکن بھئی جب شیر بوڑھا اور کمزور ہو جاتا ہے تو اس کا حشر بہت خراب ہوتا ہے۔ ایسے شیروں کو خود ان کے نوجوان بچے مار پیٹ کر گھر سے نکال دیتے ہیں اور جنگل کے اس شاندار بادشاہ کو لکڑ بگھے کھا جاتے ہیں۔"

اچھا بھئی اب چلو شام ہو گئی۔ کل دوسرے جانور دیکھیں گے۔ (اگلے مہینے ایک اور دلچسپ مضمون پڑھیے گا)

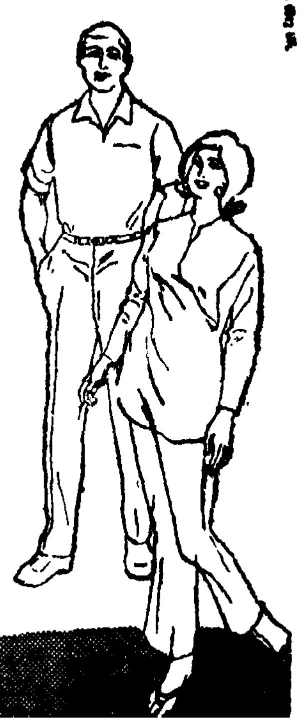


پَینٹ گھر میں کوئی بھی پہنے...
ہر پَینٹ 'سینفورائزڈ'
کی چھاپ دیکھ کر خریدیں

·SANFORIZED·
REGD TD MK

سلیکس ہوں یا ٹرؤزر یا بیل باٹم ۔ ڈرین پائپ ہوں یا ڈینیس یا حرم پینٹ یا پھر وہی پُرانی طرز کی سادی پتلون ۔ گھر میں کوئی بھی پَینٹ پہنے، کوئی بھی خریدے ۔ ہر پَینٹ پر 'سینفورائزڈ' کی چھاپ ضرور دیکھ لینی چاہئے ۔

شہرۂ آفاق ٹریڈ مارک 'سینفورائزڈ' آپ کے کپڑے نہ سکڑنے کی قابلِ اعتماد گارنٹی ہے ۔ اس چھاپ والے لباس خواہ وہ سوتی ہوں یا سوت ملے کپڑوں سے بنے ہوں، متعدد بار دھلنے کے باوجود بھی اپنی اصلی فٹنگ کو برقرار رکھیں گے





سینفورائزڈ چھاپ کے مالکان کلوئٹ پی باڈی اینڈ کمپنی، ... [illegible] ... چھاپ کا استعمال کیا جاتا ہے یا کرنے کی اجازت دی جاتی ہے ... [illegible] ... سکڑنے کی کڑی کسوٹی پر پورا اترتا ہے

جناب اشفاق گوہر



مطالعہ

جس نے سیکھا مطالعہ کرنا
جس کو دولت ملی پڑھائی کی
علم اس کا ہی قدرداں ہوا
اس کے قابو میں اک جہاں ہوا

روز اچھی کتاب کا پڑھنا
اس کو دنیا بھلا نہیں سکتی
لعل و گوہر سے بھی زیادہ ہے
علم سیکھے جو ہر کسی کے لئے

علم کنجی ہے کامیابی کی
کامرانی کے قصر میں تم کو
اور بچو، مطالعہ اک باب ہے
صرف پہنچا سکے گی اچھی کتاب

آبرو چاہیئے اگر تم کو !
علم جن کی کرے نگہبانی
ہر گھڑی تم مطالعہ کرنا !
وہ نہیں سیکھتے کبھی ڈرنا

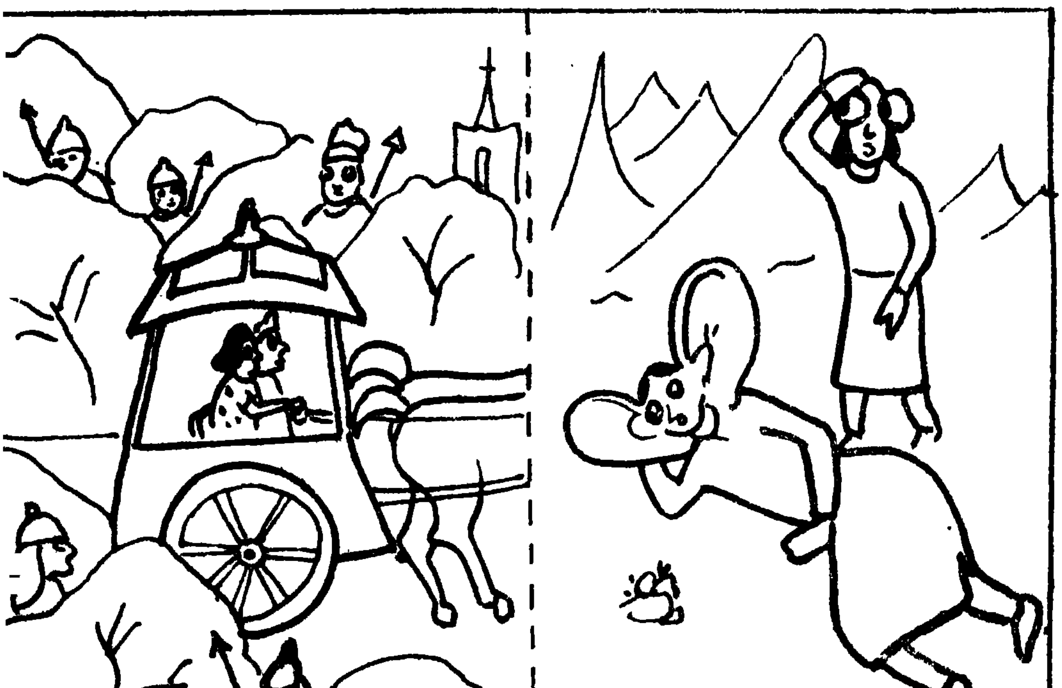
جس کا اچھا مطالعہ ہوگا
اس سے بڑھتی ہے عزت و حشمت
لوگ دیکھیں گے قدر سے اس کو!
ہے ضروری یہ اس لیے بچو



علم کچھ بھی نہیں ہے اس کے بغیر
یہ اگر ہے تو علم بھی ہوگا
چھوڑ بیٹھے اگر اسے بچو !
سارا عالم ہی اجنبی ہوگا

جناب غلام حیدر

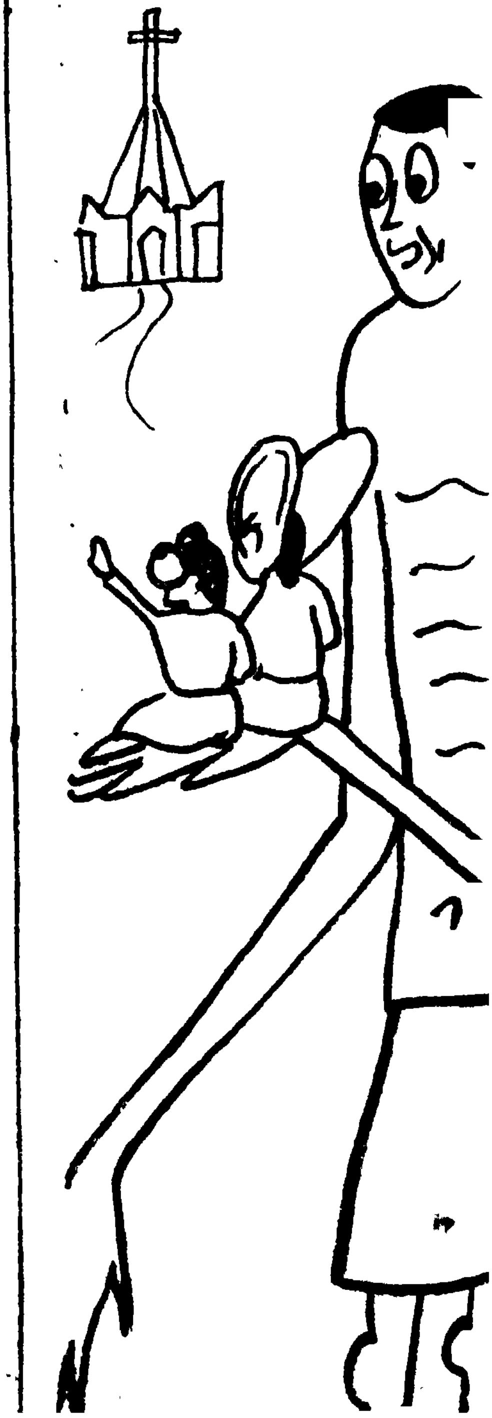
شلم اور فرخ



شہزادی بہت ہی خوبصورت لباس پہنے ہوئے تھی اور پھولوں سے
لدی ہوئی تھی شہزادے نے بھی آج بہت قیمتی لباس پہن رکھا تھا
ادھر گرجا گھر کے راستے پر تھوڑی تھوڑی دور کے فاصلے

ایک طرف گنیت میاں زمین سے کان لگائے سب کچھ سن
تھے اور سہر بلت کی اطلاع سوانگھا خاں کو دے رہے تھے
تھوڑی دیر بعد لبو خاں نے سوانگھا اور گنیت کو اپنے ہاتھ
اور گرجا سے کئی میل دور جا کر کھڑے ہو گئے۔ سوانگھا دیکھ کر

لبدخاں اپنی مٹھیوں میں کئی کئی آدمیوں کو پکڑ پکڑ کر گرجا گھر
س طرف کئی کئی میل کی دوری پر پھینکتے جاتے تھے۔ ذرا سی



دیر میں ان تینوں نے مل کر سارے راستے کو صاف کر دیا۔ اور شہزادہ بڑے اطمینان سے گرجا گھر پہنچ گیا۔



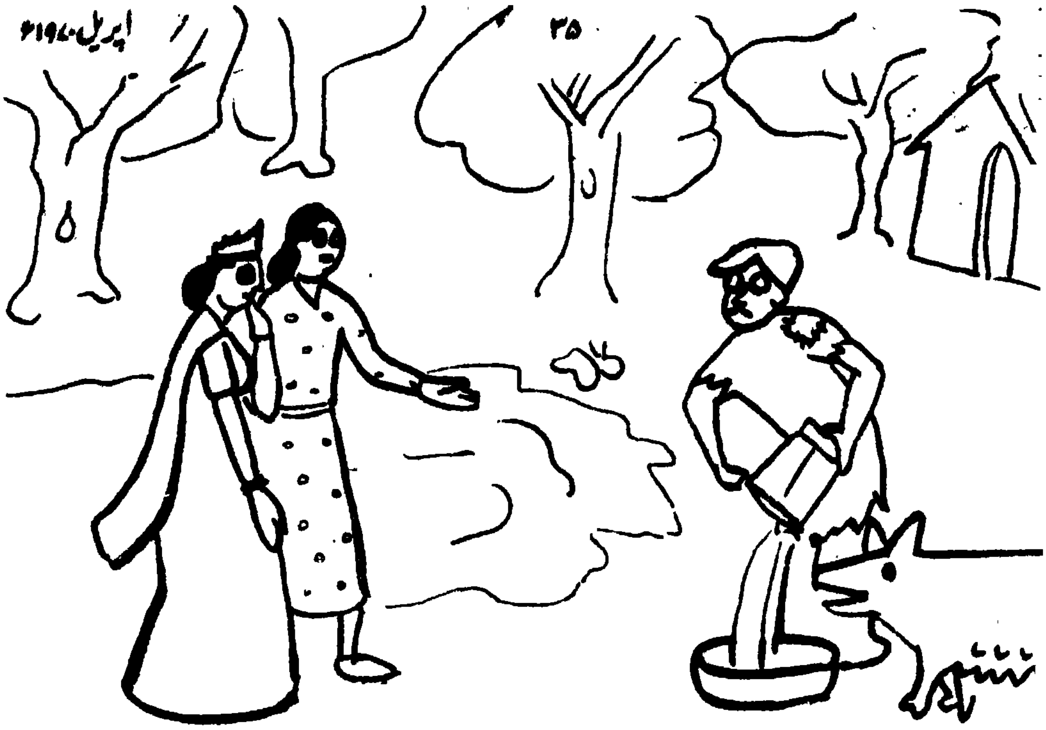


شادی ہوگئی اور شہزادہ فرخ اپنی بیوی نیلم کے ساتھ اپنے ملک روانہ ہوا۔ اس کے پانچوں ساتھی بھی جدھر اُن کا جی چاہا چلے گئے۔

جب ان دونوں نے پورے تین دن سفر کر لیا تو وہ ایک [illegible]

سوروں کو ایک تالاب کے کنارے پانی پلا رہا شہزادے فرخ نے نیلم سے کہا:-

فرخ :- "تمہیں پتہ ہے کہ میں کوئی شہزادہ نہیں ہوں، میں ایک غریب سورپا-





پ ہے۔ اب سے ہم دونوں کا کام اس کی مدد کرنا ہوگا۔
سوروں کی دیکھ بھال کیا کریں گے۔"

یہ کہہ کر وہ شہزادی کو وہیں چھوڑ کر اس گندی سی
ی میں چلا گیا۔ پھر تھوڑی سی دیر میں وہ باہر آیا اور شہزادی
ں جھونپڑی میں لے گیا۔ رات کو جب شہزادی سوگئی تو
ے بڈھے اور بڑھیا سے پوری بات کر کے انہیں سب کچھ
ا کہ وہ کون ہے اور یہاں کیوں رکا ہے

فرخ :۔ "میں شہزادی نیلم کو یہاں کچھ دن اس
بھنا چاہتا ہوں کہ یہ لڑکی بہت ہی مغرور ہے۔ اسے اپنی
ں ہونے پر بڑا ناز ہے۔ کچھ دن جب یہ گندہ کام کرے گی
' علاج ہو جائے گا پھر یہ ہر انسان سے محبت کرنے لگے گی"

رات کو فرخ نے شہزادی کے سارے شاہانہ کپڑے غائب
یئے۔ صبح کو جب وہ سو کر اٹھی تو بڑھیا نے یہ کہہ کر ایک



بڑھیا: "اگر تم میری بہو نہ ہوتیں
کچھ نہ دیتی۔"

اب شہزادی نیلم نے سوچنا شروع کر دیا
میں یہی کہہ تھا اسے یقین ہو گیا کہ فرخ سچ مچ کوئی شہ
بلکہ ایک غریب سوپ پالنے والا ہی ہے۔ مگر اس
زیادہ افسوس نہیں کیا اس نے سوچا کہ شاید یہی میر
ہے۔ اس نے دل میں ٹھان لی کہ اب جو کچھ بھی ہو وہ
ساتھ ہی رہے گی اور اس کے کام میں مدد کرے گی۔
سے وہ سارے دن گھر کے اور باہر کے کام میں لگی ر
کی صفائی کر رہی ہے کبھی باہر سے پانی لا رہی ہے۔
اس نے اس حال میں رہ کر بھی فرخ کو خوش کر دیا۔



مگر نیلم کو اتنے سخت کام کرنے کی کبھی عادت نہ تھی۔ چنانچہ ۔دن بعد ہی اس کی حالت بہت خراب ہوگئی۔ پیروں میں چھالے گئے۔ ہاتھوں میں زخم ہو گئے اور جب وہ بوجھ اٹھاتے اٹھاتے ـجاتی تو وہ کہیں بیٹھ کر اپنی حالت پر رونے لگتی۔

ایک دن صبح فرخ نے شہزادی سے کہا۔

فرخ: میں کچھ دن کے لئے گاؤں سے باہر رہا ہوں۔ مجھے کچھ سور بیچنے ہیں اور کچھ سامان خریدنا ہے۔

یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

دو ایک دن بعد جب نیلم ایک راستے کے کنارے پر ـی ہوئی اپنے زخموں کی تکلیف میں رو رہی تھی، اس کے پاس ـ لوگ آئے اور پوچھا۔

ایک آدمی: تمہیں پتہ ہے کہ تمہارا شوہر ـن ہے؟

نیلم: اس کا نام فرخ ہے اور وہ سور پالنے کا کام کرتا ہے۔

دوسرا آدمی: نہیں تم نہیں جانتیں۔ آؤ ہمارے ساتھ چلو ہم تمہیں تمہارے شوہر کے پاس لے چلیں گے اس نے تمہیں بلایا ہے۔







جب شہزادی ان لوگوں کے ساتھ ایک شاہی محل میں داخل ہوئی تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے شاہانہ لباس میں بوڑھے بادشاہ کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ شہزادی خوشی کے مارے بے ہوش ہو گئی۔

بادشاہ اپنی خوبصورت بہو کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ پھر دعوت کی تیاریاں ہوئیں۔ اور کیا دعوت ہوئی ہے۔ کیا کیا کھ

میں کھائے گئے ہوں، بس

بچوں کے لیے دلچسپ اور معلوماتی کتابیں

جا نہرو	۱/۰	حضرت امام حسینؓ	-/۲۵	تین شہزادے	-/۱۲
لاحی کہانیاں	-/۴۰	حضرت امام حسن	-/۲۵	جادو کا ہاتھ	-/۱۲
ں کی اخلاقی کہانیاں	-/۴۰	حضرت رابعہ بصریؒ	-/۲۵	جادو کی بطخ	-/۱۲
ں کا ادب	۱/۵۰	حضرت سلمانؓ	-/۲۵	جادو کا گھوڑا	-/۴۰
ادر لڑکا	-/۴۴	حضرت بلالؓ	-/۲۵	جادو کا پھل	-/۴۰
وسلطان شہید	-/۴۰	حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ	-/۲۵	چڑیوں کی ملکہ	-/۲۰
ں کی دنیا	-/۴۰	حضرت فاطمۃ الزہرا خاتون جنتؓ	-/۲۵	خوف ناک جادوگر	-/۴۰
چسپ لطیفے	-/۳۰	ابھرتا سورج	-/۵۰	دیو پیکر درندہ	-/۲۰
چسپ کہانیاں	-/۳۰	زمین کے تارے	-/۵۰	ڈاکٹر بوجھ بجھکڑ	-/۲۰
ٹر اقبال	-/۳۰	چمکتے موتی	-/۵۰	رحم دل پریاں	-/۱۲
ٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت	-/۳۵	تین قلندر	۲/۰	رستم و سہراب	-/۲۰
کا سفر	-/۲۵	ایک ننھی راجکماری	-/۲۰	شیش محل	-/۱۲
ری چڑیا	-/۴۴	ایک ننھی رانی	-/۲۰	شہزادی بدورا	-/۳۰
ا گھوڑا	-/۴۰	آدم خور زنگی	-/۴۰	شہزادی پری زاد	-/۴۰
لینا ابوالکلام آزاد	-/۳۰	افراسیاب کی بیٹی	-/۴۰	عراق کی شہزادی	-/۱۲
ی منی کہانیاں	-/۴۰	بہادر راجکمار	-/۲۰	لنگڑا دیو	-/۴۰
رور دو عالمؐ	-/۵۰	باغی شہزادہ	-/۴۰	مسٹر عقل مند	-/۱۲
رت صدیق اکبرؓ	-/۲۵	بے وقوف پریاں	-/۲۰	مغرور شہزادی	-/۲۰
رت فاروق اعظمؓ	-/۲۵	پریوں کے تحفے	-/۴۰	ہنس مکھ شہزادہ	-/۲۰
رت عثمانؓ ذی النورین	-/۲۵	پھول شہزادی	-/۲۰	ہیروں کا جزیرہ	-/۴۰
رت علی شیر خداؓ	-/۲۵	تبسرا انعام	-/۲۰		

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال، بمبئی ۳۔ بی آر

بچوں کی دلچسپ اور معلوماتی کتابیں

انوکھی مشین	ویداس گپتا	۱/۲۵	مصنوعی چاند	اطہر پرویز
ایٹم کیا ہے؟	پ ا گن میکر	-/۷۵	مندر	وسنت تل کنڈ گدر
انمول رتن	اطہر پرویز	۱/۵۰	نجومی آپا	اطہر پرویز
ایک اچھوت کی کہانی	سوامی مہاسنے	-/۹۰	نیا تیرتھ	راجیندر رادھی ترشت
اکبر اور بیربل کے لطیفے	اطہر پرویز	-/۴۰	نہر و امر ہیں	فصاحت حسین خاں
بچوں کے حالی	اطہر پرویز	-/۷۵	ہولی اور چراغ	اطہر پرویز
بچوں کے اقبال	اطہر پرویز	-/۵۰	ہماری کھیتی باڑی	سیما
باپو کے قدموں میں	منو بہن گاندھی	۱/-	ہماری آباد دنیا	فصاحت حسین
بھارت دیس ہمارا دیس	جاوید اقبال	۱/۲۵	ہندوستان ترقی کی شاہراہ پر	لوھیر موہن سیناپتی
پنچ تنتر کی کہانیاں (اول)	شکنتلا دیوی	-/۷۵	ہمارے بن ہماری دولت	رام چندر تیواری
〃 〃 〃 (دوم)	〃	-/۷۵	ہمارا ذہن	دریجا اٹھیا
بدن کی کہانی	اطہر پرویز	۱/۲۵	ہماری سائنس	وزارت حسین
تیس مار خاں	شاہد علی خاں	-/۷۵	ہمارا ہندوستان	اطہر پرویز
توانائی کا راز	اطہر پرویز	۱/۲۵	اچھا شہری	پبلیکیشنز ڈویژن
چار درویش	پدرناتھ تھٹے	۱/۲۵	اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	〃
خلا کا سفر	اطہر پرویز	۱/۷۵	بھارت کی لوک کہانیاں	〃
روشنی کے مینار	جے بھگو	-/۷۵	پنڈت نہرو سے بات چیت	ٹیلسر منڈی
سائنس کے کرشمے	وزارت حسین	۲/-	خوشحالی کے لئے منصوبہ بندی	پبلیکیشنز ڈویژن
سائنس کی دنیا	〃	۲/۶۴	رنگا کے گیت	مترجم شمیم کرہانی
ستاروں کی دنیا بہت رنگ ہے	اطہر پرویز	۲/-	سائنس کے چند پہلو	سی دی رامن
سورج کا گھرانا	اے دی ایس راما راؤ	-/۷۵	وویکا نند	پبلیکیشنز ڈویژن
سا… کے را… …پر	سیما	-/۹۰	ہمارا جھنڈا	〃
شہد اور…	نرویشور شرما	-/۷۵	ہندوستان کی تاریخ	〃
سرالی	اطہر پرویز	-/۵۶	ہندوستان کی نامور ہستیاں (اول)	〃
کاغذ کی کہانی	محمد آفاق	۱/-	ہندوستان کی 〃 〃 (دوم)	〃

ملنے کا پتہ [illegible]

ا احمد سعید بادی

سفرنامہ ابنِ بطوطہ

علاءالدین نیلی : یہ بزرگ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا
یفہ ہیں۔ ہر جمعہ کو وعظ فرماتے ہیں، ان کا وعظ اتنا پُر تاثیر
ہے کہ اکثر سننے والے گناہوں سے توبہ کر لیتے ہیں اور صاحب
ہو جاتے ہیں۔

صدرالدین کہرانی : روزے کثرت سے رکھتے ہیں راتوں
تے ہیں۔ ان کا لباس فقط ایک کمبل ہے۔ بادشاہ اور امیر
ہیں تو چھپتے پھرتے ہیں۔ بادشاہ نے لنگر کے خرچ کے لیے
ہات نذر کرنے چاہے تو انکار کر دیا۔ ایک دفعہ بادشاہ
ہوا اور دس ہزار اشرفیاں پیش کیں شیخ نے ہاتھ بھی نہیں
تین دن سے پہلے روزہ نہیں کھولتے۔

الدین عبداللہ غاری : حضرت خواجہ نظام الدین اولیا
نقاہ کے قریب ایک غار میں رہتے ہیں، میں نے ان کی ایک
کرامت یہ دیکھی کہ میرا ایک غلام بھاگ گیا۔ میں نے اسے ایک
کے پاس دیکھا واپس لینا چاہا اور حضرت شیخ کو معلوم ہوا تو فرمایا
تیرے لائق نہیں ہے۔ میں نے ترک سے سمجھوتا کر لیا اور
رفیاں غلام کی قیمت لے لیں چھ مہینے بعد معلوم ہوا کہ غلام
نے آقا کو قتل کر دیا اور ترک کے بیٹے نے غلام کو مار ڈالا۔
کی واضح کرامت تھی۔

تغلق کی عادتیں : محمد تغلق سخاوت اور ظلم دونوں باتوں

یا کوئی محتاج اور مفلس امیر نہ بنا دیا جاتا ہو۔ اس کی باتیں عجیب و
غریب ہیں جنھیں سن کر آدمی حیرت میں رہ جاتا ہے۔ آیا یہ کسی
انسان کی باتیں ہیں یا کہانی ہے۔ لیکن میں خدا کو، خدا کے رسول
اور فرشتوں کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ جو کچھ میں بیان کر رہا ہوں،
اس میں نہ کوئی جھوٹ ہے نہ مبالغہ ہے۔

شاہی محل کا دروازہ

دہلی کے شاہی محل کو دارِ مرا کہتے ہیں جب کوئی محل
میں جاتا ہے تو اسے کئی دروازوں سے گذرنا پڑتا ہے۔ پہلے
دروازہ پر سپاہی اور نفیری والے بیٹھے رہتے ہیں جب کوئی امیر
یا بڑا آدمی آتا ہے تو نفیری والے اس کی آمد کی اطلاع دیتے ہیں
اور نفیری کے نغمہ میں اس کا نام بتا دیتے ہیں۔ دروازہ کے باہر
چبوترہ پر جلاد حاضر رہتے ہیں۔ قتل کرنے کا حکم ہوتا ہے تو
محل ہزار ستون کے سامنے قتل کر دیتے ہیں۔ اور اس کا سر
پہلے دروازہ پر لٹکائے رکھتے ہیں۔

دوسرے اور تیسرے دروازہ کے بیچ میں ایک بڑے
چبوترہ پر نقیبوں کا افسر زری کی ٹوپی پہنے جس پر مور کے پر
لہراتے رہتے ہیں سونے کی ایک چھڑی لیے بیٹھا رہتا ہے۔
باقی نقیبوں کی کمر میں سنہری پٹیاں بندھی رہتی ہیں۔ ان کے
ہاتھوں میں تازیانے ہوتے ہیں ان کے دستے سونے یا چاندی

ہے۔ تیسرے دروازہ پر متصدی بیٹھتے ہیں جب تک آنے والے کا نام نہیں لکھتے کسی کو اندر جانے نہیں دیتے آنے والے کا نام اور اگر اس کے ساتھ دوسرے لوگ ہوتے ہیں تو ان کے نام اور آنے کا وقت لکھتے ہیں

یہ رجسٹر عشاء کے وقت بادشاہ کے سامنے اس کے بیٹے پیش کرتے ہیں رجسٹر میں وہ حادثات بھی لکھے جاتے ہیں جو دروازوں پر ہوتے ہیں تاکہ بادشاہ ہر بات سے خبردار رہے۔

اگر کوئی امیر تین دن تک بغیر کسی قوی عذر کے نہیں آتا تو جب تک بادشاہ کی خاص اجازت نہ ہو اندر نہیں جانے دیتے۔ اور ایسے امیر کے لیے نذرانہ پیش کرنا ضروری ہوتا ہے

پہلی مرتبہ اگر کوئی آئے تو اسے بھی نذرانہ دینا ضروری ہوتا ہے۔ مولوی ہو تو قرآن پاک یا کوئی کتاب، درویش ہو تو مصلے، تسبیح یا مسواک، امیر ہو تو گھوڑے، اونٹ ہتھیار نذر کرتا ہے۔

دروازہ کے اندر ایک بڑا میدان ہے جس میں ہزار ستون نام کا دیوان خانہ ہے اس کی لکڑی کی چھت ہزار ستونوں پر قائم ہے۔

ستونوں اور چھت پر روغن ہے، دربار عام ہزار ستون میں ہوتا ہے۔

دربار :- دربار اکثر عصر کے بعد اور کبھی دن چڑھے ہوتا ہے۔ بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ سب سے اونچی ہے اسے شہ نشین کہتے ہیں۔ بادشاہ دوزانو بیٹھتا ہے۔ پیچھے بڑا تکیہ اور دائیں بائیں چھوٹے گول تکیے لگائے جاتے ہیں۔ سامنے وزیر کھڑا ہو جاتا ہے۔ وزیر کے پیچھے کاتب (پیشکار) رہتے ہیں۔ ان کے پیچھے حاجب [illegible]

خاص حاجب اور اس کا نائب شریف الحجاب اور سید اس کے بعد ایک سو نقیب۔

بادشاہ بیٹھ جاتا ہے تو حاجب اور نقیب [illegible] ہیں۔ بادشاہ کے پیچھے چتر بردار مکھیاں اڑاتا رہتا ہے۔ بائیں ایک سو مسلح جوان کھڑے رہتے ہیں۔ دیوان خا[نہ] میں دائیں بائیں قاضی القضاۃ خطیب الخطباء قاضی فقیہ، سید، مشائخ، بادشاہ کے بھائی داماد اور بڑے امیر، پردیسی، سفیر، فوج کے افسر کھڑے رہتے ہیں

پھر ساٹھ گھوڑے مرصع ساز و لگام اور [illegible] آراستہ آتے ہیں ان میں کچھ کی لگامیں اور حلقے سیاہ ہوتے ہیں اور کچھ کے مرصع سفید رنگ کے یہ خاص ہوتے ہیں جن پر بادشاہ کے سوا کوئی دوسرا آدمی سوار [نہیں ہوتا] آدھے گھوڑے ایک طرف اور آدھے ایک طرف ہو[تے ہیں]۔ پچاس ہاتھی آتے ہیں جن پر سونے چاندی کی مرصع [جھولیں] ہیں۔

ان کے دانتوں پر لوہے کی نوک دار شام[یں] ہاتھی چلانے والے جنہیں فیلبان کہتے ہیں ان کے ہا[تھ میں] لوہے کا انکس ہوتا ہے۔ ہر ایک ہاتھی کی پشت پر [ہودہ] جس میں پندرہ بیس سپاہی بیٹھ سکتے ہیں یہ ہاتھی [سدھائے] ہوئے ہوتے ہیں کہ جس وقت حاجب بسم اللہ کہتا [ہے] کے سب سر جھکا کر بادشاہ کی تعظیم بجالاتے ہیں [یہ منظر] بڑا دل فریب ہو جاتا ہے۔ ہاتھیوں کی آدھی صف اور آدھی ایک طرف ہوتی ہے اور انھیں لوگوں کے
[illegible]

اگر کوئی غیر ملکی سلام کے لیے آتا ہے تو دروازہ پر
ع کرتا ہے، امیر حاجب نائب، سید الحجاب اور اشرف الحجاب
رہ کر اور تعظیم بجالا کر عرض کرتے ہیں کہ فلاں شخص سلام کے
حاضر ہے۔ اجازت ہو جاتی ہے تو اس کی نذر لوگوں کے
ں پر رکھ کر اس طرح پیش کرتے ہیں کہ بادشاہ کی نظر ہر چیز
ر جائے۔ حکم ہوتا ہے کہ نذر دینے والے کو لاؤ۔

آنے والا بادشاہ تک پہنچنے سے پہلے تین دفعہ تعظیم
لاتا ہے، بڑا آدمی ہوتا ہے تو میر حاجب کی صف میں ورنہ
کھڑا ہو جاتا ہے۔

بادشاہ اس سے نہایت نرمی اور مہربانی سے بات
رتا ہے اور مرحبا کہتا ہے۔ صاحب عظمت ہوتا ہے تو مصافحہ
ا ہے اور گلے لگاتا ہے اور اس کے نذرانہ میں کوئی چیز
الٹ پلٹ کر دیکھتا ہے اور تعریف کرتا ہے پھر خلعت
جاتی ہے اور نذرانہ دینے والے کے حسب حال کچھ مقرر
ہوتا ہے۔ سرکاری اہل کار نذر پیش کرتے ہیں یا کسی ملک کا
ج لاتے ہیں تو سونے کے برتن طشت آفتابے یا سونے کی
یں جوا کر لاتے ہیں اور فراش یہ چیزیں لا کر ایسے رخ سے کھڑے
جاتے ہیں کہ ہر چیز بادشاہ کی نظر سے گذر جائے۔ ہاتھی
ر دیا جاتا ہے تو ہاتھی یا گھوڑا معہ ساز و سامان پھر خچر پھر
ٹ اور جو کچھ ان پر مال ہوتا ہے بادشاہ کی نظر سے گذارا جاتا
۔ بادشاہ دولت آباد سے آیا تھا اور خواجہ جہاں لے بیانہ
ے باہر جا کر نذر پیش کی تھی تو مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اسی
ترتیب سے نذر پیش کی تھی، اس سامان میں زمرد اور موتیوں

شاہی مراسم کے سلسلہ میں بیجا نہ ہوگا اگر عید کا ذکر
کر دیا جائے اور اس کی شان و شوکت کا نظارہ کتاب پڑھنے
والے کر لیں۔

جوں ہی عید کا چاند ہوتا ہے بادشاہ خلعتیں تقسیم کرتا
ہے یعنی امیروں، مصاحبوں، مسافروں، متصدیوں، حاجبوں
نقیبوں اور اخبار نویسوں کو علی قدر مراتب دی جاتی ہیں۔

صبح عید: ۔ صبح ہوتی ہے تو ہاتھی سجائے جاتے ہیں اور ان پر
ریشم کی سنہری اور جڑاؤ جھولیں ڈالی جاتی ہیں۔ ایک سو ہاتھی خاص
بادشاہ کی سواری کے ہوتے ہیں۔ ان سب پر ایک چھتر ہوتا ہے
جس پر جواہرات جڑے رہتے ہیں ڈنڈیاں خالص سونے کی
ہوتی ہیں ہاتھیوں پر جواہرات کی مرصع گدیاں ریشم کی
بچھائی جاتی ہیں۔ جس ہاتھی پر بادشاہ سوار ہوتا ہے وہ تمام تر
زری اور جواہرات سے مرصع ہوتا ہے اس کے آگے غلام اور
مملوک مرصع پیٹیاں باندھے چلتے ہیں اور تین سو نقیب جن کی
کمریں سنہری پیٹی اور ہاتھ میں سونے کے دستے کا تازیانہ ہوتا
ہے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

صدر جہاں قاضی القضاۃ کمال الدین غزنوی،
قاضی القضاۃ ناصر الدین خوارزمی، دوسرے تمام قاضی صاحب
مرتبہ پردیسی، عراقی، شامی، خراسانی سب ہاتھیوں پر سوار
ہوتے ہیں، مؤذن ہاتھیوں پر سوار تکبیر کہتے جاتے ہیں ان کے
پیچھے بادشاہ کی سواری پھر باجے والے پھر خدمت گار پھر بادشاہ
کے بھائی مبارک خاں کی سواری اس کی فوج اور باجے والے،
پھر بادشاہ کے بھتیجے بہرام خاں کی سواری پھر چچا زاد بھائی
[illegible]

ملک تنکبہ کی۔ پھر ملک نبغرا کی۔ پھر ملک مخلص کی پھر قطب الملک کی۔

ان سب کی فوجیں اور باجے بھی ساتھ ہوتے ہیں جب یہ جلوس عیدگاہ کے دروازہ پر پہنچتا ہے تو حکم ہوتا ہے کہ قاضی، مفتی بڑے امیر اور صاحب مرتبہ پردیسی پہلے اندر جائیں، بادشاہ بعد میں سواری سے اترتا ہے۔

بادشاہ کے اترتے ہی نماز شروع ہو جاتی ہے۔ اور نماز ختم ہو جانے پر امام خطبہ پڑھتا ہے بقرعید (عید الضحٰی) میں بادشاہ چادر اوڑھ کر نیزہ سے اونٹ کا نحر (ذبح) کرتا ہے تاکہ کپڑوں پر چھینٹیں نہ پڑیں اور ہاتھی پر سوار ہو کر واپس محل چلا جاتا ہے۔

محمد تغلق کی عادتیں:- محمد تغلق کی عادت ہے کہ وہ پردیسیوں کی بڑی خاطر کرتا ہے۔ بڑے بڑے عہدے دیتا ہے جاگیریں اور انعامات دیتا ہے اور ایسی سخاوت سے پیش آتا ہے کہ جو کوئی سنتا ہے حیران رہ جاتا ہے۔ اس کا حکم ہے کہ پردیسی کو عزیز کہنا چاہیے غریب نہ کہا جائے (غریب کے معنی پردیسی کے ہیں) میں نے اس سے پہلے بادشاہ کی سخاوت کا حال لکھا ہے اور کچھ اب لکھتا ہوں۔

واعظ ترمذی:- ناصر الدین ترمذ کا رہنے والا تھا اور وعظ میں مشہور تھا۔ بادشاہ نے اس کا وعظ نہ سنا تھا۔ جب اپنے وطن واپس جانے لگا تو بادشاہ نے اس کا وعظ سننا چاہا۔

حکم دیا کہ صندل کا ممبر تیار کیا جائے ممبر کی میخیں، اور بتریں سونے کی تھیں ممبر پر ایک قیمتی یاقوت جڑا گیا واعظ کو سیاہ رنگ کا زرکار خلعت دیا گیا اور سیاہ صافہ۔ اگلی امبر

پر بیٹھ کر ترمذی نے شاندار تقریر کی۔

تقریر ختم ہوئی تو بادشاہ نے ترمذی کو۔ پر سوار کیا اور حکم دیا کہ سب لوگ پا پیادہ آگے آگے ایک ریشمی خیمہ میں لے گئے جس کی رسیاں اور قناتیں تھیں۔ خیمہ میں ایک طرف برتنوں کے ڈھیر لگے تھے کو بطور بخشش دینا تجویز کیا تھا۔ اس میں سونے کی د ان گنت رکابیاں کئی گلاس ایک لوٹا ایک دسترخوان، چارپائے لگے تھے ایک کتابوں کا صندوق۔

یہ سب سونے کی چیزیں تھیں اس میں سو بڑا تنور بھی تھا جس میں ایک آدمی بخوبی بیٹھ سکتا تھا۔

اس سے پہلے بھی بادشاہ نے اسے ایک ا اشرفیاں اور دو عدد غلام دیئے تھے۔

فقیہ عبدالعزیز:- عبدالعزیز فقیہ اور محدث تھا۔ اس نے امام ابن تیمیہ سے تعلیم پائی تھی۔ بادشاہ کا م بادشاہ اس کی بڑی خاطر کرنے لگا۔

عبدالعزیز نے ایک دن حضرت عباس او فضائل میں کچھ حدیثیں سنائیں بادشاہ بنی عباس سے رکھتا تھا۔ حدیثیں سنیں تو بہت خوش ہوا اور عبدالعزیز کی حکم دیا کہ سونے کی سینی میں دو ہزار اشرفیاں لائی جائیں آئیں تو بادشاہ نے سینی سمیت سب اشرفیاں عبدا دے دیں۔ (باقی دل چسپ مضمون اگلے

٭ اگر آپ کو اردو سے محبت ہے تو اردو اخبار

ب ڈاکٹر غیاث صدیقی



اپنی ماں کی نصیحت مانو

(اس نظم میں بچّوں کی آتش بازی سے مراد دو ملکوں کا مسلح تصادم بھی ہو سکتا ہے)

دو بچّوں نے آتش بازی
گھر کی چوکھٹ پر جب چھوڑی
موہن کی ماں نے جب دیکھا
احسن کی ماں نے ٹوکا
دونوں نکلیں آگ بجھانے
ناداں بچّوں کو سمجھانے
دولت کو بے جا مت کھونا
آگ لگا کر خوش مت ہونا
پیٹ کی آگ بجھا لو پہلے
گھر کا بوجھ سنبھالو پہلے

دونوں بچّے پانی لائے
آگ بجھائی ہاتھ ملائے
دونوں گھر کی دیواروں پر
پھولوں کی بیلیں پھیلا کر
پڑھنے، لکھنے، کھیتی کرنے
ہنستے کھیلتے گھر سے نکلے
آنکھیں ملتے لوگ اٹھے جب
آپس میں یہ کہنے لگے سب

ہو چی منھ یا ناصر ہوں گے

جناب مبشر احمد عرشی (ورنگل)

خوفناک گھر



آگے کی کہانی

اس نے ہمارے قریب آکر قدرے جھک کر سلام کیا۔ میں یہ غور سے دیکھ رہا تھا کہ اس کا ایک ہاتھ تپلون کی جیب میں ہے۔

"آپ لوگ ڈائننگ ہال میں چل کر کھانا کھا لیجیے، وہاں آپ کے ساتھی آپ کے منتظر ہیں"

مجھے اس کا لب و لہجہ اور ادب دیکھ کر ایک بار پھر محسوس ہوا کہ واقعی ہم کسی نواب کے مہمان ہیں جو ہمیں اچھی طرح جانتا پہچانتا ہے۔ اور ہمیں نہ اس رویہ سے متعجب کر کے لطف حاصل کرنا چاہتا ہے اور پھر ذہن کے کسی نہ کسی گوشے سے کوئی نہ کوئی خطرناک شبہ سر ابھارتا اور میری سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ سچ تو یہ ہے کہ میری کھوپڑی میں برف جم گئی تھی اور مجھے اپنا سر منوں وزنی معلوم ہوتا تھا۔

نقاب پوش ہمارے جواب کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھنے لگا۔ اور ہم بھی ناچار اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ مجھے اس دفعہ یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ دروازے کے کواڑ کھلے ہوئے ہیں۔

ہم ایک تنگ سی گلی میں سے گذرتے ہوئے ایک کشادہ ہال میں داخل ہوئے، زیدی بھیا وغیرہ واقعی بیٹھے ہوئے ہمارے منتظر تھے، اور ان کے چہرے اترے ہوئے تھے۔ ہم تینوں ایک گول میز کے چاروں طرف کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ میز پر قسم قسم کے کھانے چنے ہوئے تھے ... [illegible]

اسی نقاب پوش نے کہا جو ہمیں اپنے ساتھ لایا رہا تھا۔ ہم نے کھانے میں کچھ تامل کیا لیکن جب نے ہاتھ اٹھا کر دو تین نوالے کھائے تو ہم نے بھی کیا۔ کھانا کھا چکنے کے بعد ہمیں پھر اپنے کمرے گیا، ہمیں زیدی بھیا وغیرہ سے بات کرنے کا گیا۔ کمرہ میں پہنچ کر ہم لوگ صوفوں پر کافی دیر رہے۔ پھر اٹھ کر منہ ہاتھ دھوئے۔ بھوک بڑی لگ رہی تھی، میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ یہ دیکھ کر سخت تعجب ہوا کہ گول میز پر چند پرا رکھا تھا، میری سمجھ میں اب تک نہ آیا تھا کہ یہ کو یہاں ہمیں کیوں لائے ہیں اور انھیں ہمارا اتنا ...؟ ہم نے پیٹ بھر کر ۹:۱ پراٹھے اڑائے اپنی اس موجودہ حالت کے متعلق قیاس آرائیاں

تھوڑی دیر بعد وہی صبح والا نقاب پوش ہوا، صبح کی طرح اس نے سلام کرتے ہوئے کہا تنہائی سے گھبرا گئے ہیں تو اس عمارت کے اند گھوم پھر کر واپس آسکتے ہیں"

ہم نے اس قدر شفقت آمیز اور ... کر اندازہ لگایا کہ یہ ہم سے کچھ برا سلوک نہ ... اور [illegible]

ں سے ہماری کچھ ہمت بندھی خوف کچھ کم ہوا اور ہم نے
لہ اس سے کچھ نہ کچھ ضرور معلوم کرنا چاہیئے "ہم ضرور
ے" تاج بھیّا بولے، لیکن آخر یہ تو بتاؤ کہ آخر تم کون

"آپ ہی کی طرح ایک انسان"
"وہ تو میں بھی جانتا ہوں۔ مگر آپ کا نام؟"
"کنیلسر نمبر نائین"
"یعنی نقاب پوش نمبر ۹ عجیب نام ہے" اچھا تم کو
نے بھیجا ہے؟"
"ماسٹر نے" مختصر جواب تھا۔
"تمہارا ماسٹر کون ہے اور اس کا نام کیا ہے؟"
"مجھے نہیں معلوم"
"پھر تمہارا ماسٹر تمھیں کیسے حکم دیتا ہے"
"ٹیلیفون کے ذریعہ، میں ٹیلیفون والے کمرے میں
ضر رہتا ہوں اور وہ مجھے جیسا حکم دیں ویسا عمل
ں"
"اگر تم ویسا نہ کرو تو"
"تو سزا بھگتنی پڑتی ہے"
"اسے کیسے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے اس کے مطابق
لیا"
"ماسٹر کو ہر بات کی خبر ہوتی ہے ہم یہاں جو باتیں
ہیں، اس کا بھی ماسٹر کو علم ہو رہا ہے"
"وہ کیسے......؟"

"اچھا تمھیں عدول حکمی پر کیا سزا دی جاتی ہے؟"
"سزائے موت یا پھر قید" اور ہم کانپ اٹھے۔
"ہمیں یہاں کیوں لایا گیا ہے؟"
"اب میں آپ کو اس سے زیادہ باتیں نہیں بتا سکتا،
آپ خاموشی سے میرے ساتھ چلے چلیے"
ہم خاموشی سے اس کے ساتھ ہو لیے۔ بہت سے کمروں میں سے گذرتے ہوئے اور وہاں کی عجیب وغریب چیزوں کو دیکھتے ہوئے گذرتے رہے۔ ایک کمرے میں کچھ آدمی بیٹھے اونگھ رہے تھے، ایک کمرے میں کچھ لوگوں کو ڈاکٹر انجکشن دے رہا تھا اور انھیں ایک قسم کی دوا پلا رہا تھا۔ (میں نے ڈاکٹر اس لیے کہا کہ وہ وضع قطع سے ڈاکٹر معلوم ہو رہا تھا اور یوں بھی انجکشن دینا ڈاکٹروں کا ہی کام ہے)

"کیا یہ دوا خانہ ہے؟"
"چپ چاپ دیکھتے چلو" نقاب پوش کا لہجہ کسی قدر کرخت ہو گیا تھا، پھر ہمیں ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں کھڑ کھڑ مشین چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ پریس مشین تھی۔ جس پر کچھ چھاپا جا رہا تھا، یہاں دھندلی لال روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ میں غور سے نہ دیکھ سکا کہ کیا چھاپا جا رہا ہے۔ مشین پر کام کرنے والے آدمی اپنے کام میں اتنے محو تھے کہ انھوں نے ہماری طرف پلٹ کر دیکھنے کی زحمت بھی گوارہ نہ کی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بھی ایک قسم کی مشین ہیں یا لوہے کے پتلے۔

سے چھن چھن کی آواز آرہی تھی مشین سے کچھ ٹین کے ٹکڑوں
کی سی کوئی چیز گر رہی تھی جس طرح آٹے کی چکی سے آٹا گرتا ہے۔
کچھ دیر بعد ہم اسی کنج قفس کے اندر مقفل کر دیے
گئے۔ صوفوں پر بیٹھ جانے کے بعد تاج بھیا آہستہ سے
بولے "یہ جعلسازوں کا کارخانہ ہے، یہاں جعلی سکے
اور جعلی نوٹ چھاپے جاتے ہیں۔"

"تو ہمارا یہاں کیا مصرف ہے؟"

"غالباً آپ کے نواب صاحب آپ کو ہزاروں
روپوں کی تھیلیاں بھر کر آپ کو الوداع کریں گے۔"

"مذاق چھوڑو" تاج بھیا "یہ سوچو کہ اب ہمیں کیا
کرنا چاہیے، ہمیں کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کرنا چاہیے۔"

"ناممکن۔ یہ لوگ اس قدر بے وقوف نہیں ہیں کہ
ہمارے بھاگنے کے لیے راستہ چھوڑ رکھیں۔"

"پھر بھی ہمیں کوشش کرنی چاہیے، اللہ کارساز ہے۔"

ہم نے اٹھ کر سارے در و دیوار کونہ کونہ چھان مارا
لیکن راستہ تو راستہ ہم کو ہوا آنے کے لیے کوئی کھڑکی
تک نظر نہ آئی، نہ معلوم ہوا کس سوراخ سے داخل ہو رہی
تھی۔ البتہ برقی پنکھے ضرور چل رہے تھے۔

راستہ ڈھونڈنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے
اور ادھر ادھر کی بکواس کرتے ہوئے صوفوں پر سو گئے۔ کچھ
بھی کام نہ ہو تو سونے کے علاوہ اور کیا کریں گے؟ ہم کافی
دیر تک سوتے رہے۔ غالباً شام ہو چکی تھی۔ ہمارا شام کا کھانا
بھی ہمیں اپنے کمرے میں مل گیا۔ کھانا کھا کر ہم یوں ہی بیٹھے

دل دھک دھک کرنے لگا۔ نہ معلوم آئندہ
والا ہے پھر نہ معلوم کہ کیا بات ہوئی کہ ہمارا
دروازہ خود بخود کھل گیا اور باہر سے کافی شور
اور ہڑبونگ کی آوازیں آرہی تھیں جیسے کئی آدمی
دھینگا مشتی ہو رہی ہو، میز کرسیاں ٹوٹنے کی
لگیں۔

"یہ کیا گڑبڑ ہے؟"

"سمجھ میں نہیں آتا۔" تاج نے کہا۔

"ہمارے لیے بڑا اچھا موقع ہے، در
اور ہم باہر نکل سکتے ہیں۔" میں نے بڑی عقل
ثبوت دیتے ہوئے کہا۔

"خبردار ہرگز نہیں، ایسے وقت بھاگ
دعوت دینا ہے۔ ہم نہیں جانتے کہ اندھیرے
کیا ہے؟ کسی خطرے میں گھر گئے، کسی گڑھے
گر گئے تو۔ یا کہیں بجلی کا شاک ہو گیا تو ہمیں اس
عام دروازہ بھی کھلا ہوا ہے۔ خاموش بیٹھو ا
انتظار کرو۔"

ہم تقریباً آدھ گھنٹہ بیٹھے اس ہڑبو
سنتے رہے، چیخوں کی آوازیں آرہی تھیں، کبھی
کی چاپ اور سیٹیوں کی آوازیں بھی سنائی دے
ایک دم چھت سے ہمارے کمرے کے سارے با
ہو گئے، مسرت سے میری چیخ نکل گئی سامنے
کھڑے تھے۔

اچھا برتاؤ

یہ واقعہ خلیفہ مہدی کے زمانے کا ہے۔ کہتے ہیں
یک غریب عورت نے ملکۂ فرزانہ کے شاہی محل میں حاضر
لکہ سے ملنے کی درخواست کی، ملکہ نے کہا اس عورت
م کرو اور یہ بھی کہ اسے کیا کام ہے۔

لکہ کی کنیز نے باہر آکر غریب عورت سے تمام سوالات
اس نے جواب میں صرف یہی کہا کہ جو کچھ مجھے کہنا ہے
ہ کے سامنے زبانی کہوں گی اور جب تک میری یہ
ری نہ ہو جائے گی محل سے باہر نہ جاؤں گی۔

ملکہ نے مجبور ہو کر اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔
رت جیسے ہی ملکہ کے دربار میں حاضر ہوئی تو پہلے وہ
ری مگر فوراً ہی اس نے سلام کر کے کہا کہ "اے ملکہ میں
محمد کی بیٹی مزنا ہوں۔ جو بنی امیہ کا آخری تاجدار تھا۔

ملکہ مزنا کی یہ بات سن کر بہت خفا ہوئی اور بولی "اے
رت تجھے میرے سامنے آنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ کیا تو
تی کہ تیرے خاندان والوں نے میرے عزیزوں رشتہ
ر کیسے کیسے ظلم کئے ہیں، کیا تو اس بات کو بھول گئی کہ جب
ندان کے کچھ عورتیں تیرے باپ کے پاس ایک نیک کام
مدد کرنے کے بجائے ان کو ذلیل کیا تھا۔ کیا تیری یہ حرکت انسانیت
کے خلاف نہ تھی۔ مانا کہ آپس میں دشمنی تھی لیکن پھر بھی ایک بے بس
اور مجبور دشمن کے ساتھ ایسا برتاؤ کسی طرح مناسب نہ تھا۔ مزنا
خیریت اسی میں ہے کہ تو فوراً میرے محل سے نکل جا ورنہ تجھے موت کا
منہ دیکھنا پڑے گا۔

ملکہ نے مزنا کی بات کو سن کر ایک خوفناک قہقہہ لگایا اور
بولی "بہن فرزانہ بیشک میں یہاں نہ آتی مگر میرے آنے کا مقصد
صرف یہ تھا کہ تم مجھ سے کچھ نصیحت حاصل کرو۔ کیا تمہیں نہیں
معلوم کہ کسی وقت میں تم سے زیادہ مغرور اور تم سے زیادہ مال و
دولت کی مالک تھی۔ مگر تم نے دیکھا کہ چند ہی دن کے اندر میری
غلطیوں کی سزا مجھے مل گئی۔ اور اب میں دانہ دانہ کو محتاج ہوں۔
آج میں اسی خاندان کے آگے اپنا ہاتھ پھیلا رہی ہوں اور ایک
فقیر سے بدتر ہوں۔ فرزانہ کیا تم بھی میرے ساتھ اسی طرح پیش آنا
چاہتی ہو۔ اگر تمہارا یہی ارادہ ہے تو اس کا جو انجام ہوگا وہ بھی
سوچ لو۔"

یہ کہہ کر مزنا نہایت غمگین حالت میں باہر جانے لگی ابھی
وہ چند قدم ہی گئی تھی کہ فرزانہ نے دوڑ کر اسے پکڑ لیا اور چاہا کہ

مجھے کہا "فرزانہ تم ملکہ ہو اور میں ایک غریب اور بے کس عورت۔
میرے کپڑے پھٹے ہوتے ہیں میلے کچیلے ہیں۔ تمہارے لیے یہ مناسب
نہیں کہ تم مجھ سے بغل گیر ہو۔"

لیکن ملکہ فرزانہ پر مزنا کی باتیں اپنا اثر کر گئی تھیں۔
اس نے اپنی لونڈیوں کو حکم دیا کہ وہ وہ مزنا کو نہلا دھلا کر اعلیٰ درجہ
کی پوشاک پہنائیں اور معزز مہمان کی طرح محل میں رکھیں۔

اس کے بعد ملکہ نے علیحدہ سے ایک اچھا سا خوبصورت
مکان مزنا کے رہنے کے لئے تجویز کیا اور کافی رقم وظیفہ کے طور
پر مقرر کر کے اپنے اچھے برتاؤ سے اچھے سلوک کی ایک مثال دنیا
والوں کے لئے چھوڑ گئی۔

•●•

بقیہ بچوں سے باتیں

ڈاکٹر ایم بشیر صاحب سمتی پور، مدرسہ ربانیہ انجھیڑا (بہار)
اردو اسکول پالاہی اجل گاؤں اخود خریدار بنے ہیں۔

~~~

جامعہ کی جوبلی کا ذکر اس سے پہلے کئی بار آچکا ہے۔
یہ اسی سال آخری مہینوں میں منائی جائے گی۔ چو طرفہ سرگرمیاں
تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ لائبریری کی عمارت بننا شروع
ہوگئی ہے، سائنس کے شعبے کی عمارت کی بنیادیں بھر چکی ہیں۔
یہ دو توں شاندار عمارتیں یقین ہے کہ جوبلی سے پہلے تیار ہو جائیں
گی۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سال سالنامے کی جگہ "جوبلی نمبر"
شائع کیا جائے کیا اچھا ہو کہ ہمارے محترم مضمون نگار ابھی سے
مضمون بھیجنا شروع کر دیں۔ جامعہ کے پرانے طالب علموں میں
بہت سے صاحب قلم بھی ہیں۔ ان سے خصوصی توجہ کی

بمبئی میں اردو مدرسین کو اعـ

بمبئی میونسپل کارپوریشن میں میونسپل مدرسہ
کے لیے ایک کواپریٹو کریڈٹ بنک قائم کی گئی ہے یہ مد
کی سہولت پہنچا رہی ہے۔ اس بنک کی مینیجنگ کمیٹی
کیا جاتا ہے جس میں اردو، مراٹھی، انگلش، تامل،
سندھی، ہندی زبان کے اسکولوں کے استاد اپنے اپنے نما
کر کے بھیجتے ہیں۔ پھر ان نمائندوں میں ایک وائس چیر
اس بنک کی مستقل چیرمین جناب مدھودی شاہ ایـ
ہیں۔ وائس چیرمین کا عہدہ ایک سال کے لیے رہتا
ہر سال بڑی رسہ کشی ہوتی ہے۔ خوشی کی بات ہے
۷۷-۱۹۷۶ء کے لیے بہ اتفاق رائے اس عہدہ کے لیے جـ
نشتر ڈپٹی صدر مدرس اینٹاپ ہل میونسپل اردو پرا
ڈوالہ بمبئی ۳۱ کو منتخب کیا گیا۔ مزید باعث مسرت
آج سے پچیس سال قبل جناب یٰسین صاحب کو یہ

جناب عبدالعزیز نشتر صاحب
کے سابق آرگنائزنگ سیکریٹری مہاراشٹر قلم
جنرل سیکریٹری اور سنٹرل ہوکس کمیٹی۔ کرلا کے شعبہ
چیرمین۔ مدرسہ تعلیم القرآن انجمن اتحاد المسلمین کر
آڈیٹر ہیں۔ علاوہ ازیں آپ سماجی کارکن ہونے
ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں سے وابستہ ہیں۔ آپ
وڈالہ علاقے کے باشندے ہیں۔ اس لیے وہاں
عمل کی روح پھونکنے کے لیے وڈالہ سوشل تنظیم
اور ایک اہم عہدے یعنی نائب صدارت کی ذمہ
~~~

ا ے محترم شاعر نے بہت دردناک انداز میں استادوں کے حالِ زار پر آنسو بہائے ہیں۔ اصل میں ہمارے قومی ادارے
ہاشتم پشتم چل رہے ہیں۔ ان کی آمدنی یا سرمایا اتنا نہیں ہوتا کہ استادوں کو ٹھیک سے تنخواہ بھی دے سکیں اس لیے اسکول
لرتا دھرتا اس طرح کی ترکیبیں کرتے ہیں۔ اگر ہمارے آپ کے بڑے بچوں کی تعلیم کی اہمیت محسوس کریں اور شادی بیاہ
تیوہار کے شاہانہ خرچ گھٹا کر ان اداروں کی مدد کریں تو حالت بہت کچھ بدل جائے۔

ایڈیٹر

۳۰ اپریل

(۱)

ست پہ کم بخت سوار آتی ہے
یل مصیبت بہ کنار آتی ہے

(۲)

ا میں نہ ہو گی کوئی تاریخ خراب
یروں کا ہو جاتا ہے اس روز حساب

(۳)

رنی کے پروانے بلے ہوتے ہیں
ستادوں کو قسمت کے گلے ہوتے ہیں

(۴)

بے چاروں کی اب خدمتیں درکار نہیں
فریاد کریں کوئی مددگار نہیں

(۵)

ا ہی نہ سمجھتے تھے مزرات کو رات
ب اگر تھی تو فقط علم کی بات

(۶)

ے سے پڑھاتے تھے ہمیں شان کے ساتھ
ے وہ محبت تھی جو ہے جان کے ساتھ

(۷)

ر جب یہ پڑھانے ہمیں آجاتے تھے
تے تھے خفا کر یوں ہنسا جاتے تھے

(۸)

آتے تھے مرے عزیز بہت خوش ہو کر
...

(۹)

صاحب وہ فکر کا چہرہ پہ نشاں ہے دیکھو
ان کی صورت سے پریشانی عیاں ہے دیکھو

(۱۰)

دوستو! ہو گئی گل رزق کی قندیل ان کی
کس طرح گذرے گی دو ماہ کی تعطیل ان کی

(۱۱)

دیکھیے لاتی ہے ان کے لیے جولائی کیا
یہ ضروری نہیں پھر ان کا تقرر ہوگا

(۱۲)

جینے کو جیتے ہیں لیکن ہیں بڑی مشکل میں
کتنے خدشات سے دو چار ہیں دل ہی دل میں

(۱۳)

بیم و امید کے یہ دیکھ رہے ہیں سپنے
آزمائیں گے پھر اک بار مقدر اپنے

(۱۴)

ان کی اربابِ جفا کو جو ضرورت ہو گی
مرحمت ان کو پھر اک بار یہ خدمت ہو گی

(۱۵)

بننے کو قوم کے معمار کہے جاتے ہیں
در حقیقت تو یہ بیکار کہے جاتے ہیں

(۱۶)

کاش انصاف کی پیدا کوئی صورت ہوتی
...

جناب رفیق شاستری

پنچ تنتر کی کہانیاں

(مسلسل)

کسی شہر میں ایک پنڈت جی رہتے تھے۔ پنڈت جی کے کوئی اولاد نہیں تھی بے چارے بہت دکھی تھے۔ مگر خدا نے ان کی سن لی اور ان کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا۔ اتفاق کی بات جس دن گھر میں لڑکا پیدا ہوا اسی دن گھر میں نیولے کا بھی ایک بچہ پیدا ہوا۔ پنڈت جی اور ان کی بیوی اس پر بہت خوش ہوئیں اور دونوں کو اپنے بچے کے ساتھ ہی ساتھ اس ننھے نیولے سے بھی محبت ہو گئی۔ پنڈت جی کی بیوی نے اس نیولے کے بچے کو بھی اپنے بچے ہی کی طرح پالا پوسا اور خوب کھلایا پلایا۔ دونوں بچوں میں بھی محبت ہو گئی۔ اور دونوں ایک ساتھ کھیلنے لگے۔ پنڈت کی بیوی دونوں کو محبت سے کھیلتا دیکھ کر خوش ہوتی مگر رہ رہ کر ایک ہول سا اس کے دل میں اٹھتا کہ کہیں نیولے کا بچہ اس کے لڑکے کو کاٹ نہ لے۔ اس طرح کی کھٹک اس کے دل میں رہتی مگر وہ دونوں کو کھیلتے دیکھتی تو یہ بات بھول جاتی۔

ایک دن کی بات! پنڈت جی کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ گھر میں پانی نہیں تھا۔

پنڈت جی کی بیوی بچے کو ایک پیڑ کے سائے میں سلا کر پانی بھرنے چلی گئی۔

بچہ پیڑ کے نیچے سو رہا تھا اور پاس ہی نیولے کا بچہ بیٹھا ہوا بچے کی رکھوالی کر رہا تھا۔ ابھی عورت کو گئے کچھ دیر نہیں ہوئی تھی۔ نیولے کے بچے نے طرف ایک کالا سانپ جا رہا ہے۔ نیولے کہ یہ کالا سانپ اس کے دوست کو ڈس نیولے کے بچے نے آؤ دیکھا نہ تاؤ اور جم کے مقابلے پر آ گیا۔ سانپ اور نیولے میں رہی نیولے نے ہمت سے کام لیا اور د کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ سانپ کا خاتمہ کر اس طرف چل پڑا جدھر پنڈت کی بیوی سوچا کہ پنڈت کی بیوی اس کی بہادری سانپ کے ساتھ لڑائی میں نہ ہو گیا تھا۔ گھر کی طرف واپس آتی ہوئی جب نیولے کے بچے کے منہ پر خون لگا د اس کے دل میں بہت دنوں سے نیولے ایک ڈر سا لگا ہوا تھا۔ اس نے دل میں نیولے کے بچے نے اکیلے میں ہمارے بچے یہ خیال آنا تھا کہ عورت نے پتیل کا م کے بچے کے سر پر دے مارا اور بچارا بول گیا۔

پنڈت کی بیوی نیولے کو جان ہوئی اس پیڑ کے پاس پہنچی جہاں وہ

جاں اس نے دیکھا کہ بچہ اطمینان کی گہری نیند سو رہا ہے۔ اور اس سے کچھ دور ایک سانپ مرا ہوا ٹکڑے ٹکڑے پڑا ہے۔ اب عورت اصل معاملے کو سمجھ گئی۔ اسے نیولے کو مارنے پر بہت افسوس ہوا۔ نیولے کے غم میں وہ رونے پیٹنے لگی۔

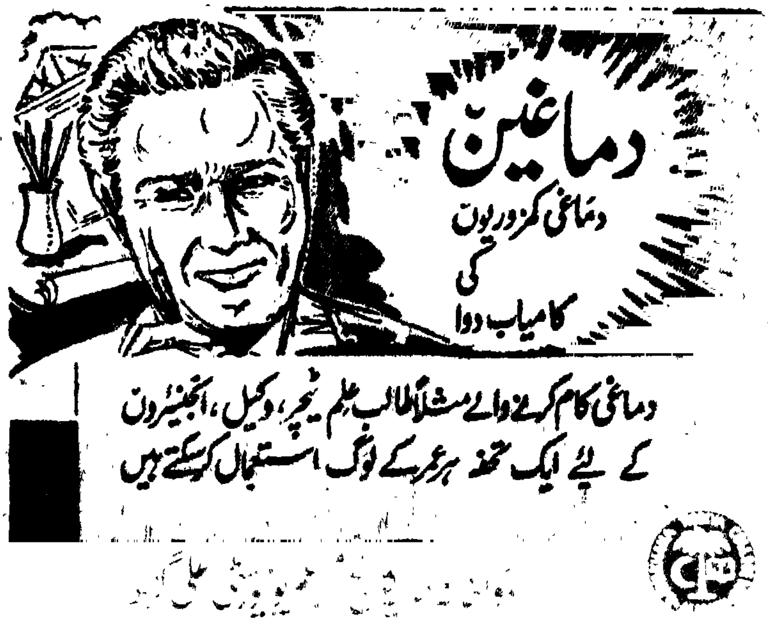
ابھی عورت رو ہی رہی تھی کہ پنڈت جی بھی آ گئے۔ بیوی کو روتا دیکھ کر ان کے دل میں بھی ایک انجانا سا خوف پیدا ہوا۔ مگر جب بچے کو گہری نیند سوتا دیکھا تو انھیں کچھ اطمینان ہوا۔ اور بیوی سے اس طرح زار و قطار رونے کا سبب دریافت کیا۔ بیوی نے بھی روتے ہوئے سارا ماجرا بیان کر دیا۔

پنڈت جی نے پوری بات سننے کے بعد کہا کہ بغیر سوچے سمجھے کوئی کام کرنے کے بعد اسی طرح ہاتھ ملنا پڑتا ہے۔ پنڈت کی بیوی نے کہا مگر تم کیوں گھر چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ایک ذرا سی بھیک کے لالچ میں اگر تم اتنے سویرے گھر سے نہ نکل گئے ہوتے تو میں سارے کام سے فارغ ہو کر بچے کے ساتھ رہتی اور اسے اس طرح اکیلے چھوڑ کر مجھے پانی لینے باہر نہ جانا پڑتا۔ زیادہ لالچ بہت بری بلا ہے۔ کیا تم نے برہمن کے لڑکوں کی کہانی نہیں سنی ہے؟

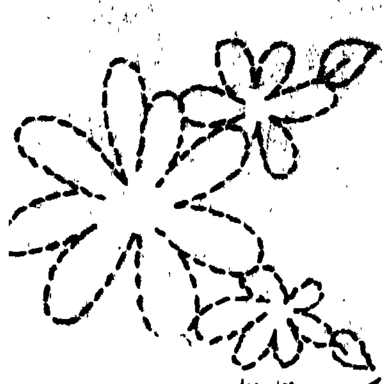
پنڈت نے کہا نہیں تو۔

پنڈت کی بیوی نے تب برہمن کے لڑکوں کی یہ کہانی سنائی۔

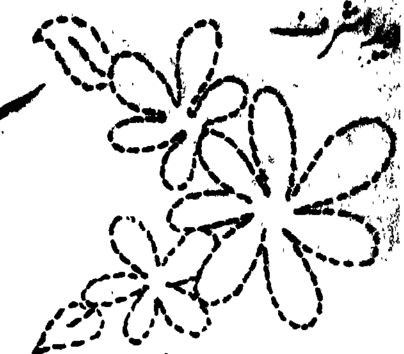
(باقی آئندہ)



...مشرف

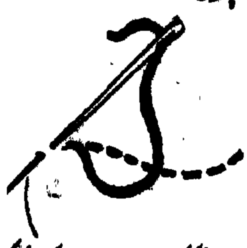


کڑھائی



آپ نے باجی یا آپا کو کبھی کبھی کپڑے پر پھول کاڑھتے
یکھا ہوگا۔ رنگ برنگے ڈورے ان کے پاس ایک ڈبے میں
ے ہوتے ہیں اور وہ انھی ڈوروں سے کیسے اچھے اچھے
بصورت پھول بنا لیتی ہیں۔ ان کو کام کرتے دیکھ کر کتنا
چھا لگتا ہے۔ کیسی تیزی اور پھرتی سے سوئی کپڑے میں
التی ہیں، نکالتی ہیں اور دیکھتے دیکھتے کپڑے پر رنگ برنگ
ے پھول پیاری پیاری پتیاں اور ڈیزائن بن جاتے ہیں۔
پ اپنے دل میں ضرور سوچتی ہوں گی کاش میں بھی اتنا اچھا
پھول بنا لیتی۔ تو بھئی یہ کوئی مشکل کام تو نہیں۔ لیجیے ہم
آپ کو بتائے دیتے ہیں کہ ایسے ہی اچھے پھول کس طرح
کپڑے پر بنائے جا سکتے ہیں۔ کشیدہ کاری کے ذریعہ آپ
پنے گھر اپنے کپڑوں کو اور بھی خوبصورت بنا سکتی ہیں ـــــ
کشیدہ کاری سے آپ کو جو خوشی ہوگی وہ ہوگی مگر دوسرے
آپ کو کام کرتے دیکھ کر اور آپ کی ہنر مندی کو دیکھ کر اور بھی
زیادہ خوش ہوں گے۔
کسی پھول کو یا ڈیزائن کو کپڑے پر تارکشی کے ذریعہ
بنانے کے بہت سے طریقے ہیں۔ آپ کو میں پہلے ایک بہت
ہی آسان سا ٹانکا بتاتا ہوں۔ اس ٹانکے کو انگریزی میں
BACK STITCH اور اردو میں بخیہ کا ٹانکا کہتے ہیں۔
بخیہ کرنا تو آپ کو آتا ہی ہوگا۔ پھر بھی میں آپ کو اس کا طریقہ

شکل کے ذریعہ بتا دیتا ہوں



آپ یہ ضرور سوچیں گی کہ لو بھئی یہ بھی کوئی
ہوئی، یہ تو بخیہ کرنا ہوا۔ آپ نے ٹھیک سوچا لیکن آ
صبر کریں۔ پہلے ایک بہت آسان سا طریقہ سیکھ لیں
آجائے گا تو آپ کو دوسرے اور اچھے اچھے طریقے
جائیں گے۔ اس کے علاوہ بخیہ ٹانکے سے جو ڈیزائن
آپ کاڑھیں گی وہ خود آپ کو بھی بہت خوبصورت
لیکن اس کے لیے دو باتوں کو ذہن میں رکھیے۔
سب سے پہلی بات تو یہ کہ تارکشی کے لیے
ڈورا یا چھ تاری استعمال کریں۔ اور دوسری یہ کہ
ٹانکے باریک باریک رکھیں۔ یعنی کاڑھنے میں آپ
یسا معلوم ہو گویا کپڑے کے اوپر ڈورا لکھ دیا گیا
اگر آپ ان دو باتوں کو ذہن میں رکھیں
ہے کہ آپ کو یہ بہت آسان سا ٹانکا بھی بہت ا
معلوم ہوگا۔ ... ٹانکے کاڑھنے کے لیے
آپ کی آسانی کے لیے دیے جا رہے ہیں۔ ان



ایک ضروری بات اور رہ جاتی ہے اور وہ ہے
پڑے پر ڈیزائن یا نمونہ اتارنے کی بات۔ کپڑے پر کوئی بھی
یزائن کاربن پیپر سے نہیں اتارنا چاہیے۔ کاربن پیپر ،
پڑے پر دھبے ڈال دیتا ہے اور ڈیزائن پر پنسل پھیرنے سے
یزائن بھی خراب ہو جاتا ہے۔ یں ڈیزائن اتارنے کا سب
ے اچھا طریقہ بتاتا ہوں۔ اگر کپڑا باریک ہے جیسے ململ ،
ا زیب وغیرہ اور اس پر ڈیزائن اتارنا ہے تو کپڑے کو
ائن کے اوپر رکھ لیں۔ کپڑا چوں کہ باریک ہے اس وجہ سے
ائن چمکتا رہے گا اور آپ اس کو پنسل سے اتار لیں۔
ن اگر کپڑا موٹا اور گہرے رنگ کا ہو، اس کا طریقہ یہ ہے
پہلے ڈیزائن کو باریک کاغذ جسے ٹریسنگ پیپر کہتے ہیں،
ر لیا جائے اس کے بعد ٹریسنگ پیپر میں ڈیزائن کے اوپر
ئی سے باریک باریک سوراخ کر لیں۔ اب آپ کا ڈیزائن
ے پر اترنے کے لیے تیار ہے۔ ایک کپڑے کی پوٹلی
ئیں، اس پوٹلی میں آپ کاجل یا توے کی کالک بھر لیں۔
پوٹلی کو مٹی کے تیل میں بھگو کر ڈیزائن کے اوپر آہستہ
ستہ ملیں۔ توے کی کالک یا کاجل کاغذ کے چھیدوں میں
چھن کر نیچے کپڑے پر آجائے گا۔ اور اس طرح آپ کا
ائن کپڑے پر اتر جائے گا۔



جنابِ ناوک حمزہ پوری

قطعہ انتقالِ پُر ملال مولوی عتیق صاحب مرحوم

مولوی عتیق مجیبی — چل بسے دے کے داغ جدائی
بہر تعلیم لندن گئے تھے — آ سکے جیتے جی پھر نہ دلّی
دل کا دورہ ہوا جان لیوا — روح دارالبقا جا کے پہنچی
نعش لندن سے دہلی میں آئی — دی گئی جامعہ میں ہی مٹی
سوگوار ان کے غم میں ہیں آفاقؒ — چور صدمہ سے رضوانؒ باجی
جامعہ کی فضا بھی ہے سونی — غم میں ہے مدرسہ ابتدائی
دے خدا صبر کی سب کو توفیق — کر دے مرحوم کی مغفرت بھی
خدمت خلق تھا ان کا شیوہ — درس و تدریس میں عمر بیتی
تھے بہت مخلص و نیک سیرت — ان کی مشہور ہے نیک نامی
بجھ گئی اور اک شمعِ روشن — ہو گئی ختم اور اک کہانی

سال رحلت لکھا میں نے ناوک
مولوی عتیق بہشتی
۹۲ ۵ ۱۳

• عذرا پروین

کاہل لڑکا



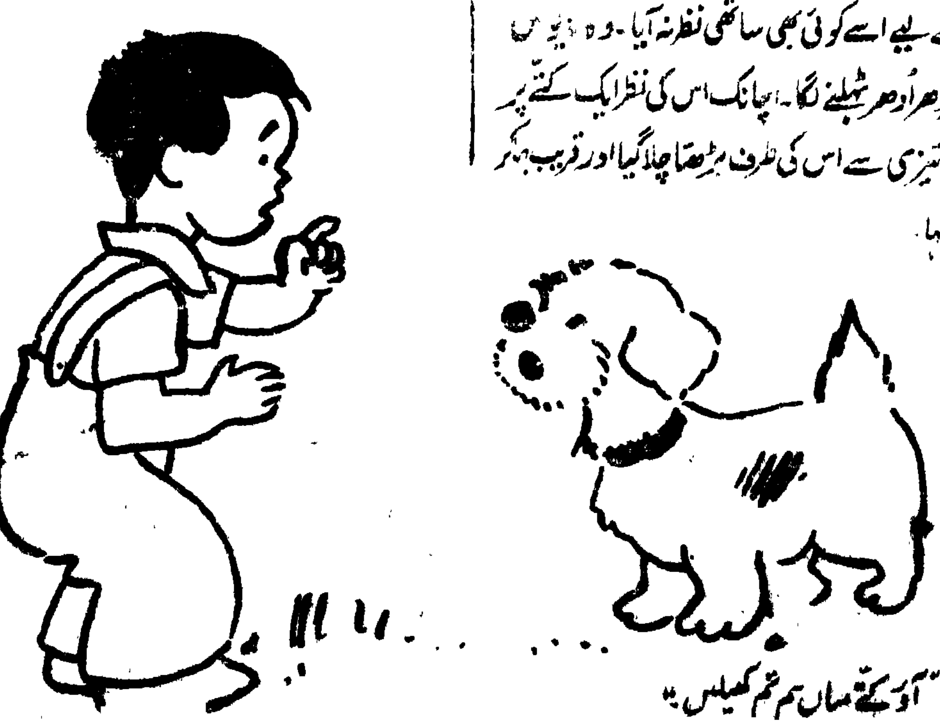
ایک تھا لڑکا حسن وہ بہت ہی سست تھا بے حد کاہل
کرنے پڑھنے اور لکھنے سے وہ ایسا ہی بھاگتا جیسے شیر
لر بھیڑ ۔ ماں باپ کی ڈانٹ ڈپٹ پر وہ مجبوراً
ں جاتا ۔

ایک دن وہ اسکول جانے کے لیے گھر سے صبح
ے نکلا مگر بجائے اسکول پہنچنے کے وہ ایک کھیت کی
نکل گیا اس نے سوچا اسکول کا سارا وقت یہیں گزار
ے اور خوب کھیلیں کودیں گے بڑا مزہ آئے گا ۔

حسن نے کھیت میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی ۔ وقت
کے لیے اسے کوئی بھی ساتھی نظر نہ آیا ۔ وہ
راِدھر اُدھر ٹہلنے لگا ۔ اچانک اس کی نظر ایک کتے پر
وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھتا چلا گیا اور قریب جا کر
ے کہا ۔

" جناب میں آپ کے ساتھ نہیں کھیل سکتا ۔ میرے
پاس کھیلنے کے لیے ذرا بھی وقت نہیں ہے اس وقت بھیڑ
بکریاں میرا انتظار کر رہی ہوں گی میں نے ان سے وعدہ
کر رکھا ہے کہ تمہاری چوروں اور بھیڑیوں سے حفاظت
کروں گا ۔ اس وجہ سے میں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھہر سکتا ...
اچھا خدا حافظ " اتنا کہہ کر کتا آگے بڑھ گیا ۔

کتے سے یہ کورا جواب سن کر حسن میاں آگے بڑھے
اور کھیت کے ایک ایسے حصے میں پہنچے جہاں پیڑ کی ایک شاخ
پر چڑیا بیٹھی تھی حسن میاں چڑیا کے نزدیک آکر بولے ۔



" آؤ کتے میاں ہم تم کھیلیں "



"ننھی چڑیا میرے
پاس آؤ اور اپنی میٹھی اور سریلی
آواز سے ایک خوبصورت اور رسیلا گیت سناؤ۔"

چڑیا نے سر ہلا کر انکار میں جواب دیا اور اپنی سریلی آواز میں بولی "میرے اچھے ساتھی! مجھے افسوس ہے کہ میں تمھیں گانا نہیں سنا سکتی میرے بچے میرا انتظار کر رہے ہوں گے اور میری وجہ سے پریشان ہوں گے۔ میں بالکل مجبور ہوں۔ یقین کرو مجھے تمھاری خواہش پوری نہ کرنے کا بے حد افسوس ہے۔" اتنا کہہ کر چڑیا پھر سے یہ جا وہ جا۔

حسن کو چڑیا کا یہ جواب بڑا گراں اور ناگوار گزرا وہ کھسیانا سا ہو گیا۔ اس کی تفریح کا سارا مزہ جاتا رہا وہ دل برداشتہ ہو کر آگے بڑھنے لگا۔ تھوڑی دور چلا تھا کہ اس کی مڈبھیڑ ایک مکھی سے ہو گئی وہ اس سے مخاطب ہوا۔

"آؤ بی شہد کی مکھی! تم میرے پاس بیٹھو ہم تم ایک کھیل کھیلیں۔"

شہد کی مکھی نے جواب دیا "معاف کرنا حسن میاں میں تمھارے پاس نہیں ٹھہر سکتی میرے پاس نہ کھیلنے کودنے کے لیے وقت ہے نہ آرام کے لیے۔ میں اس باغ میں پھولوں کا رس تلاش کرنے آئی ہوں اور مغرب سے پہلے مجھے رس چھتے میں رکھنا ہے۔" حسن کو جواب دے کر مکھی اپنے کام پر جٹ گئی۔

ب حسن کو احساس ہوا کہ بس ایک اس کی ذات ہی آرام طلب اور بے کار ہے نہ پڑھنے لکھنے سے رغبت نہ کام کرنے کا شوق۔ یہ سوچ کر اسے اپنے آپ سے شرم آنے لگی۔

اور اس نے دل میں تہیہ کر لیا کہ ا
کام بڑی مستقل مزاجی سے، تن دہی سے، خ
کیا کروں گا۔ اب اس کے قدم آپ ہی آپ ا
اٹھ رہے تھے۔
(ع

اس سرخ نشان کا مطلب ہے کہ ا
بعد آپ کی مدت خریداری ختم ہو چکی ہے۔
ہے کہ آپ اپنے پیارے پیام تعلیم کی سرپرستی
.... براہ کرم مبلغ ۶ چھ روپے کا منی آرڈر اس
تک بھیج دیجیے تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے۔
آپ کا خریداری نمبر .... ہے

بچوں کی کوششیں

بدلہ

ایک بندر اور گیدڑ میں بہت پکی دوستی تھی۔ جب دیکھو
ایک ساتھ دکھائی دیتے تھے اور موج اڑاتے پھرتے تھے۔
یہ صبح صبح بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ انھوں نے دیکھا
ے جنگل کی طرف آ رہے تھے ان کے پاس کیلوں کے
ھ کی ایک بالٹی گنّے اور طرح طرح کی چیزیں
دونوں تاڑ گئے کہ شادی کا سامان ہے۔ گیدڑ خوش
سے بولا کہ دیکھ رہے ہو کیا معاملہ ہے؟ اگر یہ چیزیں
جائیں تو مزا آجائے۔ کوئی ایسی ترکیب نکالو کہ کام
۔ کچھ دیر پر تم سڑک کے کنارے پیڑ کے نیچے چھپ جاؤ
ں چھپ جاتا ہوں جب یہ لوگ پاس آجائیں تو میں
ے ہوا ہوا بولوں گا اور تم اپنی جگہ سے کھو وا کھووا
۔ ایسی انہونی بات سن کر وہ ڈر جائیں گے اور اپنا
ڑ کر نو دو گیارہ ہو جائیں گے۔ اور پھر ہم لوگ موج
۔ ٹھیک ہے نا؟" دونوں اپنی جگہ بیٹھ کر گھات
۔ جب وہ آدمی شادی کا سامان لے کر پاس آئے
ا جنگل ہوا ہوا اور کھووا کھووا کی آوازوں سے
تھا۔ ایسی آواز کسی نے نہیں سنی تھی اس لیے سامان
ن چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ دیکھ کر گیدڑ اور بندر نے ہوا
کھووا اور تیز کر دیا۔ اب بندر نے گیدڑ سے کہا بھئی
ہو سکتا ہے کہ وہ لوٹ کر آئیں اور ہماری بُری گت بنائیں۔
اس لیے میں ساری چیزیں لے کر پیڑ پر چڑھ جاتا ہوں اور
تم ان کی آہٹ لیتے رہو۔ گیدڑ راضی ہو گیا اس نے باتھوں ہاتھ
ساری چیزیں تھما دیں اور بندر ساری چیزیں لے کر اوپر چڑھ
گیا۔ جب بندر ساری چیزیں اوپر لے کر جا چکا تھا تو پیڑ پر آرام
سے بیٹھ گیا اور ایک ایک کر کے چیزیں کھاتا رہا۔ گیدڑ نے نیچے
سے چلا کر کہا بھئی یہ کیا کر رہے ہو میرا حصہ کہاں ہے؟ اس پر
اس نے ایک کیلے کا چھلکا اس کے منہ پر دے مارا اور کہا دوست
یہ رہا تمھارا کیلا اسی طرح اس نے دودھ پی کر بالٹی نیچے پھینکی
اور کہا یہ رہا تمھارا حصہ۔ اسی طرح گنے کو چوس کر نیچے پھینکتے
ہوئے کہا یہ رہا گنا۔

گیدڑ غصے کے مارے آپے سے باہر ہو گیا اور پیڑ کے
تنے کو نوچنے لگا

ادھر بندر کھاتا اور ہنستا رہا۔ اس کے بعد کچھ دن
گزر گئے ایک دن بندر نے دیکھا کہ گیدڑ ایک شہد کے چھتے
کے پاس بیٹھا ہوا ہے۔ اس نے سوچا گیدڑ پچھلی ساری باتیں
بھول چکا ہوگا۔ اس نے کہا کہ دوست کیسے بیٹھے ہو؟" گیدڑ
بولا بھئی کیا کروں میں نے قسمت ہی ایسی پائی ہے راجا
نے مجھے اپنے دھولوں کا چوکیدار بنا دیا ہے ان کی رکھوالی

ڈر بہت ہوں سے ڈھول بجانے کو جی چاہ رہا ہے۔ گیدڑ بولا " نانا بھائی ایسا نہیں ہو سکتا۔ کہاں یہ باجا کہاں تم بندر۔ پر بندر نہیں مانا آخر خفا ہو کر گیدڑ نے کہا اچھا بھائی تم کسی طرح نہیں مانتے تو بجا لو۔ مگر میرے سے بجانا یہ باجا تمہارے مطلب کا نہیں ہے پر میں کیا کروں یہ کہہ کر وہاں سے کھسک گیا۔ بندر ڈھول بجانے کے موڈ میں تھا اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ شہد کے چھتے پر تھپکیاں مارنا شروع کر دیں۔ اب تو سینکڑوں شہد کی مکھیاں بندر کے اوپر چپٹ پڑیں بندر ہائے مرا ہائے مرا کہہ کر چلانے لگا۔ پھر گیدڑ کہنے لگا کہ دوست وہ دن یاد کرو کہ جب تم نے کیلے کھا کر چھلکے مارے تھے یہ اسی کا بدلہ ہے۔ اس پر بندر بولا دوست مجھے بچاؤ ہائے مرا ہائے مرا۔ گیدڑ بولا وہ دن یاد کرو جب تم نے دودھ پی کر بالٹی میرے اوپر دے ماری تھی۔ یہ اسی کا بدلہ ہے" بندر پھر بولا دوست مجھے بچاؤ! ہائے مرا ہائے مرا۔ پھر گیدڑ بولا وہ دن یاد کرو جب تم نے گنا چوس کر مجھ پر پھینکا تھا۔ یہ اسی کا بدلہ ہے۔

فیروز بخت

انوکھی شرارت

ایک لڑکا اپنی ماں کے قریب بیٹھا تھا۔ پاس ہی چولھے پر ہانڈی میں پانی اُبل رہا تھا۔ لڑکا پہلے تو اُس اُبلتے ہوئے پانی کو غور سے دیکھتا رہا پھر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور شرارت سے ہانڈی کے ڈھکن کو دبانے لگا مگر جیسے جیسے وہ دبانے کی کوشش کرتا بھاپ کی طاقت ہانڈی میں بڑھتی

بھلا بتایئے تو وہ شریر لڑکا کو انگریز جیمس واٹ تھا۔ اس نے اسی بھاپ کام لے کر کئی پمپ (۱۷۶۵ء) اور ریلوے اس کے تجربے سے فائدہ اٹھا کر لوہے کی پٹڑی چلانے کا کام سب سے پہلے جارج اسٹیفن بنائی ہوئی پہلی ریل گاڑی اسی بھاپ۔ گھنٹے میں بارہ میل کا سفر طے کرتی تھی۔ طرح کی ریلیں ایجاد ہوئیں۔

ہم نے دیکھا کس طرح ایک بچے نے سواری کی دنیا میں انقلاب پیدا کر دیا چھوٹی چھوٹی چیزوں پر غور کریں تو بہت کر کے دنیا میں نام پیدا کر سکتے ہیں۔

بدھ

کیا آپ جانتے ہیں؟

(۱) سب سے گھنی آبادی والا شہر

(۲) سب سے گھنی آبادی والا ضلع وشا

(۳) سب سے گھنی آبادی والا صوبہ اتر

(۴) سب سے بڑی ندی برہ

(۵) سب سے بڑی جھیل وولر جھیل

(۶) سب سے بڑا پل ہوڑے کا

(۷) سب سے بڑا جانوروں کا میلہ سونپور

(۸) سب سے بڑی گپھا والا مندر ایلورہ

(۹) سب سے بڑا ڈیلٹا سندربن

آدھی ملاقات

...... اچھا اب بتاتا ہے۔ سالنامے کے بارے میں اپنی رائے عرض کر رہا ہوں مختصر الفاظ میں۔ مواد کے لحاظ سے وقیع تر، کتابت و طباعت (لکھائی چھپائی) کے نقطۂ نظر سے دقیع۔ تفصیل مطلوب ہے تو عرض ہے کہ اس بار سالنامے کی خصوصیات میں ممتاز بات یہ ہے کہ چند نام نئے ہیں۔ اور یہ نام معیار کی ضمانت ہو سکتے ہیں...

.... بہرطور ان کی شمولیت باعثِ مسرت ہے۔

.... ایک بات سے مجھے خوشی ہے۔ اب پیامِ تعلیم کے لیے انتخاب کا معیار اور سانچے بدل رہے ہیں۔ خصوصاً اس ماہ کا حصہ نظم بہت جان دار رہا ہے۔ حالانکہ منتخبہ نظموں کا معیار کم عمر بچوں کی ذہنی سطح سے کافی بلند ہے۔ لیکن یہ نظمیں ہیں خوب۔ جتنے بھی مضامین ہیں وہ سب کے سب معلوماتی اور دلچسپ ہیں۔ ان میں نہ طوالت ہے نہ تکرار۔ اور ان کی زبان عام فہم ہے۔ کہانیوں کا حصہ مزید اور توجہ چاہتا ہے۔ ... اس ترقی پذیر اور جدت آفرین دور میں ...... نئی نئی کہانیاں تخلیق کرنا کچھ مشکل نہیں ہے کہانیاں تو اردگرد بکھری پڑی ہیں۔ بس جواہرات کو کنکروں سے علیحدہ کرنا ہے۔ یا فقط چمک دار پتھروں کے درمیان تمیز کرنا ہے۔

یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ اس بار "دوسری ماں" جیسی کہانی کو بھی منتخب کیا گیا ہے..... ایک بات عرض کروں۔ نیلم اور فرخ جتنی مزے دار کہانی ہے اس کے ساتھ دی جانے والی تصویروں سے اتنی ہی طبیعت مکدر ہو جاتی ہے۔ خواہ یہ تصویریں خود مصنف ہی کی بنائی ہوئی کیوں نہ ہوں۔ .. جہاں تک کتابت، طباعت اور رسالے کو مقصود بنانے کا تعلق ہے ان کا انحصار وسائل کی فراہمی اور اہتمام کیا ہے وہ نہ صرف قابلِ ستائش ہے بلکہ رسالے کو مستحکم بنانے کے لیے مدد کا طالب بھی ہے۔

لیکن وسائل کی کمی کی وجہ سے آپ جی نہ چھوڑیے گا۔ اپنے طور پر اعلیٰ مقاصد کی طرف قدم اٹھاتے رہیے تو انشاء اللہ محنت کا پھل اسی قدر میٹھا ہوگا جتنا صبر کا۔

خالد عرفان ایم ایس سی لکچرر

سالنامہ بے حد عمدہ، مضامین نظم و نثر سبھی میں تازگی، اور توانائی ملتی ہے۔ سائنسی اور معلوماتی مضامین، اخلاقی اور علمی تحریریں سبھی دامنِ دل می کشد کے مصداق اپنے میں گہرا تاثر رکھتے ہیں۔ آپ کی کوئی تحریر سالنامے میں نہیں ملی؟ رام لال، یوسف ناظم، اظہر افسر، مولانا مقبول احمد، خورشید احمد جامی، رضیہ سجاد ظہیر، قیصر سرمست، بزمی بھارتی، اکبر صدیقی، ڈاکٹر سبط حسن، مرزا شکور بیگ، اور غلام ربانی کے علاوہ مسلسل نیلم اور فرخ کی باتصویر کہانی اور خواجہ نصر الدین کے لطیفے کے علاوہ مولانا قدوائی اور ڈاکٹر کیول دھیر کے مضامین بہت خوب ہیں۔ باتصویر اور باسلیقہ دستاویزی سالنامہ کی اشاعت پر دلی مبارکباد قبول کیجیے۔ خدا آپ کو بچوں کے ادب کی فروغ و اشاعت کے لیے سلامت با کرامت رکھے۔ آمین۔

وقار خلیل حیدرآباد

سالنامہ آپ کی بزرگانہ شفقت اور پیرانہ سالی میں جوانوں سے زیادہ محنت و مشقت کی علامت بن کر آیا۔ خدا کی قسم اگر علامہ اقبال حیات ہوتے تو پیامِ تعلیم کے سالنامے کو دیکھ کر ایک مرتبہ سوچتے کہ جس قوم کے ضعیف العمر سال بہ سال خود اپنے قائم کردہ ریکارڈ توڑتے رہتے ہیں اس لیے نوجوانوں کے لیے کوئی جاندار اور فعّال نظم کہہ کر انھیں ایک مرتبہ اور پیغامِ بیداری دینا

سالنامہ بھی ملا اور مارچ کا پرچہ بھی سامنے ہے خوب صورت ٹائٹل، سرورق دیکھ کر ہی دل باغ باغ ہو اٹھا۔ پیام تعلیم کی تعریف کن الفاظ میں کی جائے۔ صرف اتنا کہوں گی کہ آب وتاب کا سہرا آپ لوگوں کے سر ہے۔ شاید یہ سن کر آپ لوگ بھی بنا خوش ہوئے نہ رہ سکیں گے کہ بچوں کی سرگرمیوں میں ہم اس سے مدد لیتے ہیں۔ پچھلے دنوں ہمارے اسکول کا پروگرام جو ۲۶ر جنوری کو کیا گیا نہایت کامیاب رہا۔ زلیخا بیگم صاحبہ ہیڈ مسٹریس بھی ہمارے ساتھ ہیں اور پیام تعلیم ہماری مدد کر رہا ہے۔ بچوں کا یہ پروگرام ہمارے اسکول میں پہلی بار کتنے بڑے ہجوم میں کیا گیا۔

نفیس جہاں نیازی ورودڈ

پیام تعلیم ہر مہینہ مل رہا ہے۔ ذرہ نوازی کا بے حد شکریہ۔ مارچ کا رسالہ پرسوں ملا۔ ایک ایک صفحہ سطر سطر پڑھی اور بچوں کو پڑھایا۔ دل بے حد مسرور ہوا۔ آپ کا رسالہ ہر ماہ ایک نیا پیام ایک نئی روشنی لے کر آتا ہے۔ بچوں کا رسالہ ہے زبان کی پاکیزگی پر دھیان دیجیے۔ "خطرناک گروہ" میں ایک جگہ لفظ 'حرامی' کا استعمال مجھے اچھا نہ لگا۔

جناب عتیق صاحب کے انتقال کی خبر سن کر افسوس ہوا۔ انا للہ الخ۔

ناوک حمزہ پوری ہیڈ ماسٹر

سالنامہ ملا۔ جوں ہی میں نے اسے لفافے سے کھینچا میرے بچوں میں ہل چل سی مچ گئی۔ جیسے ان کی نظر اچانک بادل سے نکلتے ہوئے چاند پر پڑ گئی ہو۔

بچوں میں ایسی ہماہمی ہے کہ میں ابھی پڑھ بھی نہیں سکا ہوں۔ محترم، سچ جانیے کہ سالنامہ دیکھ کر میرے منہ سے بے اختیار آپ کی تندرستی لو رسالے کی عمری کے لیے دعا نکلی اس دور میں

والوں سے مضمون کی فراہمی بڑے دل گردے کا کام۔ پیامیوں کی اس محفل کو خدا تابندہ تر اور پائندہ تر دلی مبارک باد قبول کیجیے۔

اسرار مندوی

میں نے اپنے اسکول میں پیام تعلیم بچیوں کے لیے کیا ہے۔ ہر ماہنامہ یوں تو بہت جلد ملتا رہا۔ لیکن ماہ فروری کا پرچہ ۱۲ر فروری کو موصول ہوا۔ انتظار بڑی بے صبری سے کیا جاتا رہا۔ موصول ہوتے ہی ہاتھوں ہاتھ ہو گیا۔

سالنامہ کی بھی ہر چیز قابلِ تعریف اور فروری کا بھی از حد پسند آیا۔ دعا ہے کہ بچوں کا یہ رسالہ دن دو چوگنی ترقی کرتا رہے آمین۔

اس سال ۲۶ر جنوری کے پروگرام اجتماعی طرح نیو انگلش ہائی اسکول میں منائے گئے۔ ہر مدرسے کے دو دو پروگرام رکھے گئے تھے۔ ان سب میں میرے اسکول کو نمایاں کامیابی حاصل ہوئی ہم نے دو پروگرام بچیوں سے کیے تھے۔ (۱) بچے کی دعا (۲) بھارت ماتا کی آدرش بیٹیاں۔ بھارت ماتا کی آدرش بیٹیاں بے حد مقبول ہوا مبارک باد بھی ہر جانب سے ملتی رہی۔

زلیخا بیگم۔ ہیڈ مسٹریس مدرسہ نسواں ورودڈ (امرا

"پیام تعلیم" مارچ کا شمارہ نظر نواز ہوا۔ میں نے کچھ پایا جس کی ایک اچھے رسالے سے امید کی جا سکتی۔ اس میں بہت سارے بہترین، معلوماتی اور سائنسی مضامین بھی ہیں۔

اس شمارے میں خاص کر محترمہ آصفہ مجیب افضل امام کا مضمون مجھے بہت پسند آیا۔

اِدھر اُدھر سے

ننھے آرٹسٹ مقابلے کے میدان میں

دنیا کے مشہور آرٹسٹ اور کارٹونسٹ شری شنکر کے
تمام ہیں۔ ۱ سال سے بچوں کا وقت کے وقت تصویریں بنانے
ہرسال مقابلہ ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت دلی میں سالانہ میلے
سی ہوگئی ہے۔ یہ میلا ۵ رمارچ کو اتوار کے دن ماڈرن اسکول
لے لان میں بڑی شان و شوکت سے ہوا مقابلے میں حصہ لینے
الے آرٹسٹوں کے ۴ گروپ بنائے گئے تھے۔ پانچ سال سے
عمر کے ننھے منّے (۲) پانچ سال اور پانچ سال سے آٹھ سال
کے بچے (۳) آٹھ سے بارہ سال کے لڑکے (۴) بارہ سے
سال تک کے لڑکے۔

اچھا بتائیے تو بھلا یہ تعداد میں کتنے ہوں گے؟ تین چار
؟ جی نہیں جناب! لگ بھگ بیس ہزار!! جی ہاں اتنے ہی! بچوں
بڑوں کے اس بیس ہزار کے مجمع کو قابو میں رکھنا شری شنکر اور
کے ساتھیوں کا کارنامہ ہے۔

ان آرٹسٹوں کی بھیڑ کی بھیڑ وقت سے پہلے ہی آنا شروع
تھی۔ ان کے لیے بہت خوب صورت شامیانوں کا انتظام کیا
۔ سب آرٹسٹ کلر بکس کریان (CRAYONS) برش
وغیرہ اپنے ساتھ لائے تھے۔

پانچ سال سے کم عمر کے بچوں میں ڈیڑھ سال کی ایک
ی اور ایک چار سال کا بچہ۔ ان میں سے اکثر تو بڑی شان
نے آرٹسٹوں کا سا لباس ہاتھ میں بریف کیس (CASE

BRIEF) بریف کیس میں ڈرائنگ کا سامان۔ بالکل جیسے
منجھے ہوئے آرٹسٹ۔

دوپہر ہوتے ہوتے ان ننھے آرٹسٹوں نے کاغذ پر
کم اور اپنے کپڑوں اور چہروں پر زیادہ نقش ونگار بنائے تھے۔
لیکن زیادہ تر بچے بڑے لڑکوں کی طرح بہت مستعدی اور
توجہ سے کام کر رہے تھے۔ جگہ جگہ نوٹس لگے ہوئے تھے کہ
بڑوں کا شامیانے میں داخل ہونا منع ہے۔ پھر بھی مائیں ،
استانیاں، آیائیں چاروں طرف منڈلا رہی تھیں۔ کسی بچے کے
آنسو پوچھ رہی تھیں کسی کی ہمت بڑھا رہی تھیں۔

ان چاروں گروپوں کے لیے عنوان بھی الگ الگ تھے
مثلاً پانچ سال سے آٹھ سال تک کے بچوں سے درخواست کی گئی
تھی کہ آئس کریم بیچنے والے کی تصویر بنائیں یا امی کو کام کرتے
دکھائیں۔ وغیرہ اس سے آگے کے گروپ کے لیے "باپ کام کرتے
وقت" یا "میں ہاکی یا فٹبال کھیلتا ہوں" وغیرہ۔ سب سے آخری
گروپ کے لیے "تانگا سوار" "برسات" "ناچ گانا" اکثر طلبا
نے دو بلکہ تین تین تصویریں بنائیں۔

تقریباً دو سو بچے دلی سے باہر کے بھی تھے۔ زیادہ تر
میرٹھ کے تھے یا پھر گوالیار یا کوٹہ کے۔ ہاں ایک بچہ ہاتھوں سے
معذور تھا وہ اپنی پیروں کی انگلیوں سے ہاتھ کا کام لے رہا تھا۔
شامیا[illegible]

یہ کھوئے ہوئے بچّوں کے بارے میں سرپرستوں کو اطلاع دے رہے تھے۔ باہر کچھ چاٹ والے، غباروں والے، آئس کریم والے گھوم پھر کر یا پھر ایک جگہ بیٹھ کر خوب پیسے کما رہے تھے۔ سچ مچ میلے کا سا سماں تھا۔ شری شنکر کے ایک بیان کے مطابق بیس دن کے بعد نتیجہ کا اعلان کر دیا جائے گا اور ڈھائی سو ۲۵۰ چاندی کے تمغے انعام میں رکھے جائیں گے۔ (اسٹیٹس مین ۹ مارچ ۱۹۷۰)

تیراکی میں دودھ پیتے بچّے کا عالمی ریکارڈ

ننھا آندرے آورخ نومبر ۱۹۶۸ء میں پیدا ہوا مگر ابھی سے یہ ایک عالمی ریکارڈ کا مالک ہے۔ دودھ پیتے بچّوں میں یہ سب سے زیادہ دیر تک تیر سکتا ہے یعنی پورے آٹھ منٹ اور ۴۵ سکنڈ تک۔ اگرچہ آندرے کو پانی سے قدرتی لگاؤ ہے مگر تیراکی کا یہ ریکارڈ اس نے اکیلے نہیں قائم کیا بلکہ، ہفتوں سے کر سال بھر کے دوسرے کئی بچّوں کے ساتھ مل کر یہ تیرتا ہے۔ کولونیہ میں جرمن اسپورٹس کالج کے تربیتی ادارے کے ورزش کے استاد ان ننھے منّے بچّوں کی خداداد قابلیتوں کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ جہاں بڑی عمروں کے بچّوں کو مشکل سے تیرنا آتا ہے وہاں دودھ پیتے بچّے خود بخود تیرنا سیکھ لیتے ہیں۔ اگر انھیں چپ چاپ پانی میں چھوڑ دیا جائے تو وہ خوشی خوشی ہاتھ پیر چلا کر تیرنا شروع کر دیتے ہیں اور بالکل غوطے نہیں کھاتے۔ تحقیقات کرنے والوں کا خیال ہے کہ نوزائیدہ بچّوں میں تیرنے کی صلاحیت فطری طور پر ہوتی ہے جو ۴ یا ۵ ماہ کے بعد غائب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ کولونیہ کے دانشور اب یہ جاننا چاہتے ہیں کہ [illegible] زندہ رکھا جا سکتا ہے یا نہیں۔ تاکہ وہ بڑے ہو کر بھی ا… کے مطابق جتنی دور تک ممکن ہو تیر لیا کریں۔ اگر یہ ممک… والدین کو چاہیے کہ وہ اپنے بچّوں کو چھ سے آٹھ ہفتے ک… تیراکی کی کوششوں کے لیے بھیجا کریں۔ جب تک کولونیہ کالج میں تیراکی کے تالاب میں یہ تحقیقات مکمل نہیں تب تک یہ بچّے روزانہ وہاں پہنچ کر اس تالاب میں تیرا کر… امید ہے کہ اندرے آورخ اپنی پہلی سالگرہ تک ایک عالمی ریکارڈ قائم کرنے میں کامیاب ہوگا۔ ہماری… آندرے کو اپنا پہلا عالمی ریکارڈ قائم کرتے ہوئے دیکھ… جس کے دوران ننھے منّے آندرے نے پورے آٹھ منٹ پینتالیس سیکنڈ تک تیراکی کا مظاہرہ کیا۔ ہماری دوسری… کی سب سے نزدیکی مقابل "گابی" نامی پانچ ما… پیش کرتی ہے۔ جو ابھی صرف ساڑھے پانچ منٹ تک منّے ہاتھوں اور پیروں سے تیراکی کا مظاہرہ کر سکتی۔

اورانگ اوٹانگ کے جڑواں بچّے

(اطلاع)

ان کی پیدائش بڑی حیرت میں ڈالنے وا… دونوں جڑواں بچے جرمنی کے شہر میونخ کے ہیلا برو… میں پیدا ہوئے۔ اس سے پہلے صرف ایک مرتبہ ریاستہائے امریکہ کے سینٹ لوئس چڑیا گھر میں جڑواں بچے پیدا ہوئے تھے مگر… بعد مر گئے۔ حیوانیات کے ماہر سمجھتے ہیں کہ یہ دونوں… اس لیے انھیں منظر عام سے بالکل الگ تھلگ رکھا گیا ہے… میں بالکل انسانی بچّوں کی طرح پوتڑے باندھ کر…

Payam - i - Taleem

NEW DELHI-25.

اِن کتابوں کو اپنی لائبریری کی زینت بنائیے

کوے دادا	۱/۷۵	دہلی	۱/۵۰
سمندر کے نیچے	۲/-	ہماری پارلیمنٹ	۱/۵۰
سمندر کے کنارے	۱/۱۲	برف کا گھر	۰/۸۷
میر انیس	۱/۲۵	برف کے تیرتے پہاڑ	۰/۳۷
میر تقی میر	۱/-	آستین کا سانپ	۰/۵۰
ابّو خاں کی بکری	۲/۵۰	اُلٹی دوا	۰/۵۰
انوکھا عجائب خانہ (مکمل)	۱/۸۰	بادشاہ کے کپڑے	۰/۵۰
تین اناڑی	۱/۴۰	زمین کی گردش	۰/۵۰
ستاروں کی سیر	۱/۷۵	سونے کی چڑیا	۱/-
خرگوش کا سپنا	۱/۷۵	چمپاوت کا آدم خور شیر	۰/۳۵
جن حسن عبد الرحمٰن (مکمل)	۴/-	ایک ٹانگ کا بادشاہ	۰/۳۰
آدمی کی کہانی	۱/۲۵	انوکھی ملاقات	۰/۳۵
بڑے دادا کی کہانی	۰/۵۶	جلو مرغابی	۱/-
چٹانوں کی کہانی	۱/۷۵	گلابو چوہیا	۰/۴۵
دادا نہرو	۱/۵۰	ظالم کسان	۰/۳۵

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳	جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵	اردو بازار، دہلی ۶

صرف نیشنل فائن پریس دہلی میں طبع ہوا

پیام تعلیم



میسور، مدھیہ پردیش، جموں وکشمیر و ہریانہ کے
تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

نئی دہلی
یامِ تعلیم
ماہنامہ

مئی ۱۹۷۰ء شمارہ ۵

ید حسین حسّان ندوی

تبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
تبہ جامعہ لمیٹڈ پرنس بلڈنگ بمبئی ۳
تبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی ۶
تبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

چہ ۶۰ پیسے زر سالانہ ۶ روپے

ید احمد ولی نے جمال پرنس میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ

فہرست

بچوں کے لئے معلوماتی کتابیں

نجومی آپا

اطہر پرویز

زہرہ آپا علی گڑھ سے ایم۔ایس، سی کا امتحان کیا دے کر کیا آئیں کہ لگیں اپنی قابلیت کا رعب جمانے۔ انجم کو شرارت جو سوجھی تو اس نے زہرہ آپا کا نام "نجومی آپا" رکھ دیا۔ لیکن ایک دن جب گھر کے سارے بچے اکٹھا تھے، نجومی آپا نے ایسی ایسی باتیں بتائیں، ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ سارے کے سارے دنگ رہ گئے۔ نجومی آپا سچ مچ کی نجومی نکلیں۔ تم بھی پڑھو اور مزے لو۔

قیمت: ۷۵ پیسے

باپ کے خط بیٹی کے نام

جواہر لعل نہرو۔ ترجمہ: عتیق صدیقی

چاچا نہرو نے اپنی بیٹی اندرا گاندھی کو جب وہ تمہاری طرح دس سال کی بچی تھیں، کچھ خطوط لکھے تھے۔ ایسے مزے دار خطوط کہ انھیں بار بار پڑھنے کو جی چاہے گا۔ پھر اس کے پڑھنے سے تم کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ "ہماری دنیا" "قوموں کا ایک گھرانا" ہے۔

قیمت عام ایڈیشن ۴/۵۰ مجلد ۸/-

ہمارا ذہن

از۔ دریجا اڈویا ترجمہ: اطہر پرویز

بات تو کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن امی جان مار بیٹھتی ہیں، ابا جان ڈانٹ پلاتے ہیں، بھائی بہن کوئی جھگڑا کھڑا کر دیتے ہیں اور دوست احباب ہاتھا پائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کیوں؟ وجہ اس کتاب میں پڑھو۔ اس کتاب کے پڑھنے سے تم نہ صرف اپنی نفسیات سے واقف ہو جاؤ گے۔ بلکہ کون کیا چاہتا ہے۔ یہ بھی تم کو معلوم ہو جائے گا۔ پھر نہ تو امی جان کی مار کا خطرہ رہے گا، اور نہ ابا جان کی ڈانٹ کا اور نہ ہی بھائی بہن اور دوستوں کے جھگڑے کا۔

قیمت: ایک روپیہ

انمول رتن

اطہر پرویز

فرخ سیر بادشاہ کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ ایک بار جب وہ کشمیر کی سیر کو گیا تو وہاں اس کی نظر فارسی اور سنسکرت کے ایک بہت بڑے عالم پر پڑی یہ تھے پنڈت راج کول۔ فرخ سیر پنڈت راج کول کو ہندوستان کے دل "دلی" میں لے آیا۔ اور ایک عالی شان کوٹھی نہر کے قریب رہنے کو دی۔ دلی والوں نے پنڈت جی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پیار سے "نہرو" کہنے لگے۔ تمہارے چاچا نہرو اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ چاچا نہرو "انمول رتن" کیسے بنے؟ یہ تمھیں اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوگا۔

قیمت ۱/۵۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال بمبئی ۸ بی آر

بچوں سے باتیں

…للہ ایک سال جیسے بات کہتے میں بیت گیا۔
…ہے، ہمارے ذاکر صاحب اسی کی تین تاریخ
…رئے تھے۔ بالکل ایسا لگ رہا ہے جیسے کل
…ر اسماں آنکھوں میں پھر رہا ہے ہم ان کی
…بچے مضمون لکھوانا چاہتے تھے۔ ان کے بعض
…اص طور سے درخواست کی گئی۔ افسوس ہے
…ں سکے۔ بہر حال اس سلسلے میں دو نظمیں شائع
…۔ اور خلیق انجم اشرفی کا مضمون۔ یہ مضمون
…ت محنت اور خلوص سے لکھا ہے۔

…ہ شاکرہ شکور کو آپ جانتے ہوں گے۔ آپ
…ں کہانیاں لکھتی ہیں۔ افسوس ہے مارچ کے
…ں ان کے والد پرنسپل عبدالشکور صاحب کا
…ہو گیا۔ مرحوم ذاکر صاحب کے ساتھیوں میں
…ے ادیب تھے۔ کئی کتابوں کے مصنف تھے۔
…ان پور، رام پور میں تعلیمی خدمات انجام دیں۔
…پرانے مخلصانہ اور برادرانہ تعلقات تھے۔
…رت فرمائے اور ان کے عزیزوں کو صبر کی

…اقبال متین صاحب پیام تعلیم کے خاص
…ہیں افسوس ہے کہ پچھلے مہینے انھیں بہت صدمہ

پہنچا۔ ان کی اہلیہ چھوٹے چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر اللہ کو پیاری ہو گئیں۔ خدا اقبال صاحب کو اور مرحومہ کے دوسرے عزیزوں کو صبر اور ان کے بچوں کو پروان چڑھانے کی کوئی اچھی سبیل پیدا کرے۔ آمین۔

افسوس ہے کہ پیام تعلیم کا پچھلا پرچہ بہت دیر سے نکلا۔ ہم نے تو وقت پر پریس میں بھیج دیا تھا۔ ہمارے کاغذی صاحب وقت پر کاغذ فراہم نہ کر سکے۔ اتفاق دیکھیے کہ کاغذ پریس میں پہنچا تو پریس کی بڑی مشین خراب ہو گئی۔ پیام تعلیم اسی مشین پر چھپتا تھا۔ رسالہ کی کاپیاں بڑی پلیٹوں پر جم گئی تھیں۔ مجبوراً چربوں کے ذریعے چھوٹی پلیٹوں پر جمائی گئیں۔ لکھائی کی خوب صورتی غارت ہوئی چھپائی میں بھدا پن آگیا۔

پچھلے سالنامے پر ابھی تک بہت سے اردو پرچوں نے تبصرہ نہیں کیا۔ باوجود یاد دہانی کے توجہ نہیں کی تاہم ہمیں ان کی نوازشوں کا انتظار ہے۔ اس سلسلے میں ہم ماہنامہ زیور (پٹنہ) ماہنامہ آب و تاب (مدراس) روزنامہ سالار بنگلور، روزنامہ آزاد بنگلور، روزنامہ اردو ٹائمز بمبئی، روزنامہ انقلاب بمبئی۔ آندھرا پنچ حیدر آباد۔ پندرہ روزہ منصف حیدرآباد، ہفتہ وار نشیمن بنگلور ہفتہ وار الجمعیۃ دہلی کے خاص طور پر ممنون ہیں انھوں

نے صحیح وقت پر سالنامے پر تبصرہ فرمایا۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ سالنامے کے مضمون اکثر پرچوں کے ایڈیٹر حضرات کو پسند آئے ہیں۔ اور وہ انھیں پرچوں میں نقل بھی کر رہے ہیں ہم ان کے بہت شکر گزار ہیں۔ اگر وہ ہر مضمون کے ساتھ پیام تعلیم کا حوالہ دے دیں تو ہم ان کے اور بھی احسان مند ہوں گے جن پرچوں نے حوالہ دیا ہے، ہم ان کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

اور ہاں بھئی ایک بات اور کچھ دنوں سے شکایتیں آ رہی ہیں کہ ہمارے کچھ مضمون نگار دوسروں کی چھپی ہوئی چیزیں پیام تعلیم میں اپنے نام سے چھپوا دیتے ہیں۔ یہ حرکت ماشاء اللہ "نئے فنکار" زیادہ کرتے ہیں۔ یہ "نئے فن کار" پرانی "تخلیقات" کو کتر بیونت کر اپنی "تخلیق" بنا لیتے ہیں۔ خدا ہمارے ان فن کاروں کو توفیق دے کہ خود لکھنے کی مشق کریں اور اپنی لکھی ہوئی چیزیں ہمیں بھیجیں۔

پچھلے پرچے میں ہم نے جوبلی نمبر شائع کرنے کا ذکر کیا تھا۔ اس سلسلے میں ہمارے پیامی اور مضمون نگار حضرات اپنے مشوروں سے ہمیں ممنون فرمائیں۔ انھی مشوروں کی روشنی میں ہم کوئی اسکیم بنانا چاہتے ہیں۔

اس پرچے میں آپ کے ایک اور اہم مضمون نگار قیصر زیدی صاحب ایم۔اے کا مضمون شائع ہو رہا ہے۔ محترم قیصر صاحب ہمارے پرانے، بہت ہی پرانے سرپرست ہیں۔ ان کے بہت معرکے کے مضمون پیام تعلیم میں چھپ چکے ہیں۔ آج کل علی گڑھ ٹریننگ کالج کے پرنسپل ہیں۔ بچوں کے ادب پر نظر بہت گہری ہے۔ خدا کرے ان کی نوازشوں کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ آمین۔

اپریل کے پہلے ہفتے میں ہمارے وائس چانسلر پروفیسر محمد مجیب دو مہینے کے لیے امریکہ اور کناڈا تشریف لے گئے ہیں۔ محترمہ بیگم مجیب بھی انقرہ تک ان کے ساتھ رہیں گی۔ انقرہ میں وہ کچھ دن اپنے صاحبزادے اور ان کے بچوں کے ساتھ گزاریں گی۔ ان کے مضمون "جب اور اب" کا سلسلہ جاری رہے گا۔ پیامی بچوں نے اس سلسلے کو خاص طور سے پسند کیا ہے۔ امید ہے کہ محترمہ ترکی سے نئی نئی معلومات ساتھ لائیں گی۔ اور پیام تعلیم کے ذریعے پیامیوں تک پہنچائیں گی۔

نیلم اور فرخ کی کہانی بچوں کو بے انتہا پسند آئی۔ اپریل میں اس کی آخری قسط شائع ہوئی تھی۔ اسی طرح کی ایک اور دل چسپ کہانی ہمیں ملی ہے۔ اس پرچے میں ہم اس کے لیے گنجایش نہ نکال سکے۔ اگلے پرچے سے سلسلہ شروع ہوگا۔

شکر ہے کہ پیام تعلیم کے خریدار برابر بڑھ رہے

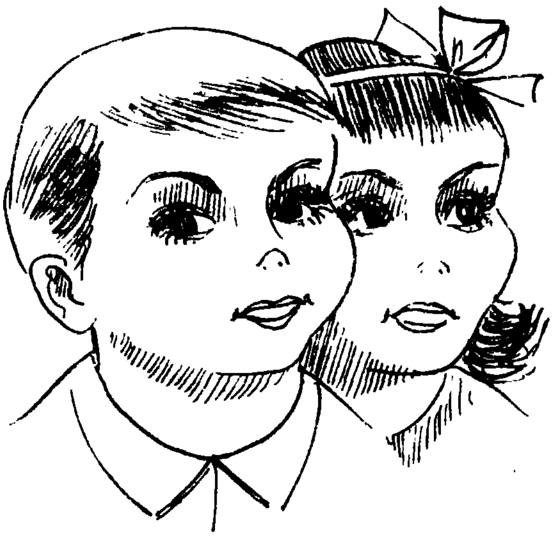
باقی صفحہ ۳۲۸

یسف پاپا - ام اس سی

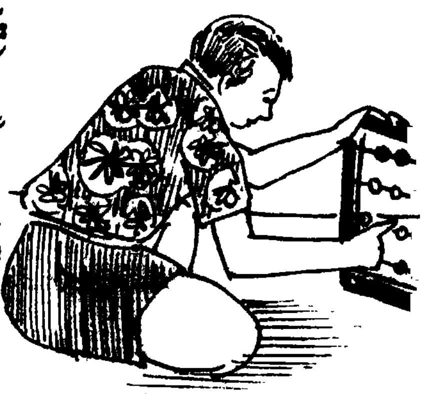
آجا بھیا

میوں کے لیے مزے مزے کے نرسری گیت

ن دیدی راجا بھیا
بھیا آجا بھیا
کو گیت سنا جا بھیا
من بہلا جا بھیا
دیدی آجا دیدی
کو گیت سنا جا دیدی
من بہلا جا دیدی
بی آئی بھیا آیا
ا ایک گویا آیا
ں مکھ اور گویا آیا
ہا ہا ہا
ہا ہا ہا ہا



ایک دو تین سینے کی مشین
چار اکیلا بولو دیدی پھاٹک کھولو
پانچ ۔ چھ ۔ سات دن اور رات
آٹھ، نو دس دادی اماں بس
گیارہ بارہ تیرہ کالا گھوڑا میرا
چودہ، پندرہ سولہ لڈ گری کا گولا
سترہ، اٹھارہ بس سنگترے کا رس



جناب قیصر حسین زیدی، ایم اے
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ



زمین گول ہے

برادرم حسین صاحب، السلام علیکم

پچھلے دنوں ایک کانفرنس میں شریک ہوا تھا۔ وہاں یہ ذکر آیا کہ جغرافیہ کے خشک مضامین کو کیوں کر دل چسپ بنایا جاسکتا ہے۔ ویسے ہی بیٹھے بیٹھے یہ چند صفحے لکھ ڈالے۔ کتابوں میں دنیا کے گول ہونے کے خشک ثبوت دیے جاتے ہیں جو بالکل درست بھی نہیں ہوتے۔ شاید یہ کوشش "پیام تعلیم" کے بچّوں کو پسند آئے۔

عرصہ سے آپ کی خدمت بھی نہیں کر سکا ہوں۔ اگر یہ پیشکش قبول فرمائیں تو پھر "پیام تعلیم" کے صفحات پر جگہ دے کر ممنون ہونے کا موقع عطا فرمائیں۔

نیاز مند قیصر زیدی

یہ بات تو تم بچپن سے سنتے آتے ہو، ہر پڑھا لکھا آدمی یہی کہتا ہے کہ زمین گول ہے، اس بات میں اب شک کی گنجایش نہیں رہ گئی ہے۔ جو خلا باز چاند پر گئے ہیں انھوں نے پلٹ کر جب زمین کی طرف دیکھا تو انھیں وہاں سے ایک چمکتا ہوا گولا ہی نظر آیا۔ بالکل چاند کی طرح کا گولا جیسا وہ ہمیں زمین سے نظر آتا ہے۔ وہ چاند سے اپنے ساتھ زمین کی تصویریں بھی کھینچ کر لائے ہیں۔ چاند سے ہماری دنیا بالکل چمکتے گولے کی طرح نظر آتی ہے۔

یہ تو تم جانتے ہو کہ ہماری دنیا میں یا چاند میں اپنی کوئی روشنی نہیں ہے، بلکہ سورج کی کرنیں جو ان کے گولوں پر پڑتی ہیں وہ لوٹ کر روشنی کی شکل میں ہماری آنکھوں تک پہنچتی ہیں۔ سورج سے ملی ہوئی اسی روشنی سے یہ گولے روشن معلوم ہوتے ہیں اور اسی سے سورج کے گرد گھومنے والے دوسرے سیارے بھی چمکتے ہیں۔

روس اور امریکہ نے خلا میں جو مصنوعی چاند

ان سے بھی ہمیں کائنات کی دوسری دنیاؤں
وم ہوتے ہیں۔ اور سیٹلائیٹ کے ذریعہ جو
ی چاند سے ہمیں ملی ہیں۔ ان میں سب
کی شکل کی نظر آتی ہیں، ان سے یہ معلوم
اری دنیا ہی نہیں بلکہ کائنات میں جتنی
ہیں، وہ سب کے سب گولے یا کرتے ہی ہیں۔
تصویروں یا خلاباز کی آنکھوں دیکھی بات
ہیں جاسکتا۔ مگر تم سوچتے ہوگے کہ ہمیں
کوئی گولائی نظر نہیں آتی، دور تک زمین
آتی ہے یا کہیں کہیں پہاڑوں کی اونچ
ولائی کہاں ہے؟

نے زمانے کے لوگ بھی یہی سوچتے تھے کہ
گول تھال کی طرح ہے، گولا نہیں ہے۔
پر زیادہ دور تک سفر کرتے ہوئے بھی ڈرتے
انہ ہو کہ سفر کرتے کرتے زمین کے تھال کے
پہنچ کر نیچے خلا میں گر پڑیں!

یوں تک عام انسان اسی غلط خیال سے
ں پندرھویں سولھویں صدی عیسوی
ں کی سوچ پھر جاگ اٹھی۔ دنیا کے دور
موج کی جانے لگی، اور کچھ بلند ہمت
زدالوں نے دنیا کے گرد پورا چکر لگا لیا۔
سے پہلے یہ سفر "میگلن" نے پورا کیا۔
، اسپین اور پرتگال دو بڑی طاقتیں تھیں
ز ہندوستان اور دور مشرق کے جزائر (انڈ

سے تجارت کرتے تھے اور وہاں سے مصالحہ، ریشم اور
قیمتی سامان لاکر یورپ میں بیچتے تھے۔ اور بہت نفع کماتے
تھے۔ ان دونوں ملکوں میں ایک سمجھوتا تھا کہ پرتگال کے
جہاز تو پورب کی سمت میں جاسکتے تھے لیکن اسپین کے
صرف پچھم کی طرف۔ اس لحاظ سے پرتگالی فائدہ میں تھے۔

میگلن نے بادشاہ کے سامنے ایک
تجویز پیش کی جس پر عمل کرکے اس معاہدہ کو توڑے بغیر
اسپین بڑا فائدہ حاصل کرسکتا تھا۔ میگلن کو یقین تھا کہ
زمین گول ہے۔ اس نے بادشاہ سے کہا: "میں پچھم ہی
پچھم سفر کروں گا۔ اور چوں کہ زمین گول ہے اس لیے پچھم
پچھم چلتے ہوئے بھی میں اسپین واپس لوٹ آؤں گا اور
بیچ میں "ملاکا" کے جزیرے اور دوسرے مصالحہ والے
جزیرے بھی پڑیں گے جہاں سے اپنے جہازوں میں مال
بھر لاؤں گا۔"

بادشاہ کو یہ تجویز پسند آئی اور اس نے تجارت
کے لیے مال سے بھرے ہوئے پانچ جہاز میگلن کے ساتھ
کردیے۔ ۲۰ ستمبر ۱۵۱۹ء کو یہ سفر شروع ہوا۔
راستے میں طوفان کا سامنا کرنا پڑا اور سفر کی مشکلوں سے
تنگ آکر جہاز کے عملے نے بغاوتیں بھی کیں۔ مگر میگلن نے
ہمت نہ ہاری اور وہ بحیرۂ اوقیانوس کو پار کرکے جنوبی
امریکہ کے ساحل کے ساتھ ہوتے ہوئے اس آبنائے
میں داخل ہوگیا جو جنوبی امریکہ کو اس کے جنوب میں واقع
جزیرے TIERRA DEL FUEGO سے جدا کرتی ہے
کیا تمھیں یہ بتانے کی ضرورت پڑے گی کہ

اس آبنائے کا نام "آبنائے میگلن" کیوں پڑ گیا ہے؟ اس آبنائے کو پار کرنے کے بعد بحرالکاہل کا لمبا سفر شروع ہوا۔ راستے میں سارا راشن ختم ہو گیا۔ میگلن اور اس کے ساتھیوں نے سوکھا چمڑا چبا چبا کر اور لکڑی کا برادہ کھا کر پیٹ کی آگ بجھائی۔ بہت سے آدمی پیٹ کی شدید بیماریوں میں مبتلا ہو کر مر گئے۔

تم سمجھ سکتے ہو کہ اس مایوسی کے عالم میں جب انھیں فلپائن کے جزیرے نظر آئے ہوں گے تو ان لوگوں کو کتنی خوشی ہوئی ہو گی۔ مگر میگلن کی خوشی زیادہ دیر قائم نہیں رہی۔ ان جزیروں کے باشندوں سے جہازیوں کی جھڑپ ہو گئی جس میں میگلن مارا گیا۔

پر میگلن اپنا کام پورا کر چکا تھا۔ اس نے یورپ سے ان جزیروں تک پہنچنے کا پچھمی راستہ دریافت کر لیا تھا۔ اب آگے کا راستہ جانا بوجھا تھا۔ چنانچہ میگلن کے ساتھی کالو نے کمان سنبھال لی اور پچھم کی جانب اپنا سفر جاری رکھا اور جنوبی افریقہ کے گرد چکر لگا کر تین سال بعد اسپین واپس پہنچ گیا مگر اس عالم میں کہ پانچ جہازوں میں صرف ایک جہاز باقی بچا۔ اور ۲۸۰ آدمیوں میں سے کل ۱۸ آدمی اپنی جان سلامت لے کر واپس آئے۔

مالی اور جانی نقصان تو بہت ہوا پر اس سے انسان کے علم میں بڑا اضافہ ہوا اور پوری طرح ثابت ہو گیا کہ زمین ایک کرہ کی طرح گول ہے۔ پچھم کو سفر کرو یا پورب کو آخر میں جہاں سے چلو گے وہیں واپس لوٹ آؤ گے۔

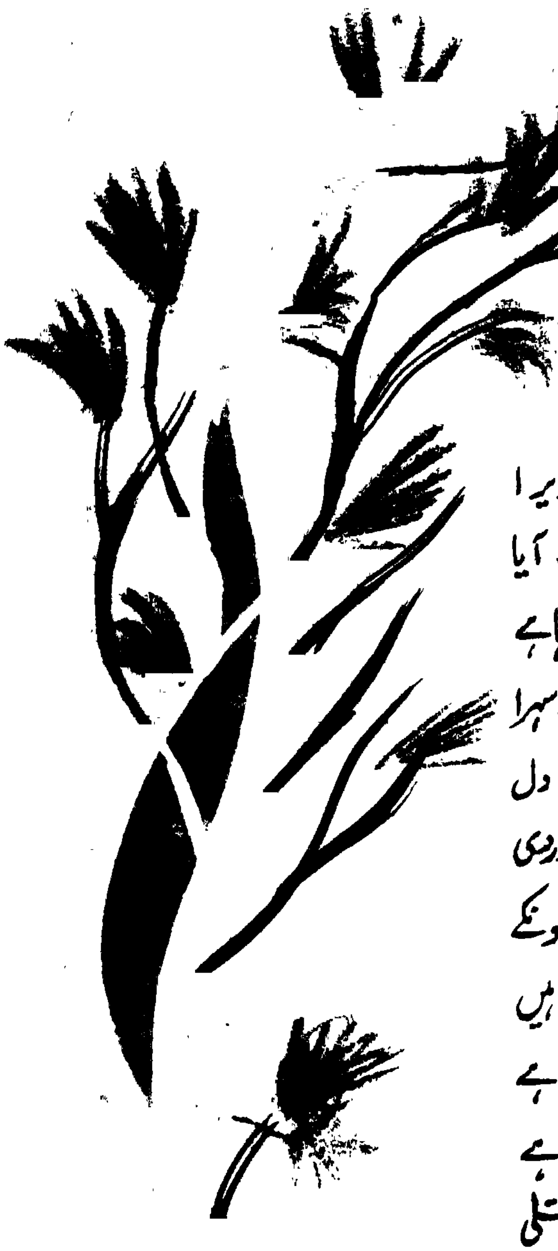
دنیا کا سفر کرنا تو سب کے بس کی بات نہیں ہے۔ مگر روزمرہ کے مشاہدے سے بھی تم کو یہ ثبوت مل سکتا ہے کہ زمین گول ہے۔ کیا عجب ہے کہ چاند گرہن کے وقت زمین کا جو سایہ چاند پر پڑتا ہے وہ ہمیشہ گول ہی نظر آتا ہے۔ اگر زمین ایک گول تھال کی طرح ہوتی تو کبھی گھومتے گھومتے اسکا سایا پورا گول نظر نہ آتا۔ بلکہ بیضوی سا ہوتا۔ اور یہ تم جان ہی چکے ہو کہ ہمارے کائنات میں جتنی بھی دنیائیں ہیں وہ سب کرہ کی شکل کی ہیں۔ آخر ہماری دنیا ان سے الگ کیوں ہو۔ یہ بھی تو اس نظام کا ایک حصہ ہے اس لیے یہ بھی ایک کرہ ہی ہو گی۔

اگر ہم سمندر کے کنارے کھڑے ہوں تو پہلے دھوئیں کے بادل اٹھتے دکھائی دیں گے۔ اور پھر ذرا انتظار کرنے کے بعد ہمیں جہاز کے مستول نظر آئیں گے پھر اس کے بعد جہاز کے اوپر کا فرش اور پھر پورا جہاز نظر آئے گا۔ یک لخت پورا جہاز نہیں دکھائی دیتا۔ اگر زمین سپاٹ ہوتی تو پھر ایک دم سارا جہاز پورا پورا نظر آنا چاہیے تھا۔ زمین کی گولائی کی وجہ سے پہلے سب سے اوپر کا حصہ سامنے آتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ نیچے کے حصے۔

انگلستان میں تو لوگوں نے ایک تجربہ کر کے یہ بات اور اچھی طرح ثابت کر دی۔ وہاں ایک نہر ہے "بیڈ فورڈ نہر"۔ اس نہر کی تہہ کا فرش بالکل مسطح اور ایک سطح میں ہے۔ اس نہر میں تین تین میل کے فاصلے سے بالکل برابر لمبائی کے کھمبے گاڑ دیے گئے اور پھر دور بین

عبداللہ شرقی

ہار کی صبح



لگا اندھیرا — ہونے لگا سویرا
کا وقت آیا — برکت کا وقت آیا
نکل رہا ہے — رنگ اب بدل رہا ہے
سا اس کا چہرا — کرنوں کا اس پہ سہرا
والے بادل — وہ کالے کالے بادل
ہے لاجوردی — کوئی لیے ہے زردی
ہوا کے جھونکے — ہیں کس بلا کے جھونکے
گدا رہے ہیں — گل کو ہنسا رہے ہیں
ل کی مہک ہے — کیا شاخ کی لچک ہے
ک رہا ہے — بلبل چہک رہا ہے
رہی ہے تیلی — کتنی بھلی ہے تتلی
یں گھومتی ہے — پھولوں کو چومتی ہے
بھر دسا کر کے — نکلے ہیں سب پھیرے
کا ہے نہ خطرا — سیلاب کا نہ کھٹکا
یہ ہمت ان کی — دیکھو یہ محنت ان کی



اٹھو اب جاگو سونے والو !
لطف سحر اٹھالو

ایلما اسپیر
ترجمہ جمشید اشرف



چوہے کا گھونسلا

پکسی نے ڈیوڈ سے وعدہ کیا تھا کہ اب کی مرتبہ جب تم آؤ گے تو ایسا گھونسلا دکھاؤں گا جو چاروں طرف سے بند ہوگا اس لیے جیسے ہی جون کا مہینہ آیا ڈیوڈ نے پکسی سے ملنے کی تیاری شروع کر دی۔ اس مرتبہ اس کو اپنے شہری دوستوں کو چھوڑتے ہوئے بہت دکھ ہو رہا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اب آخری مرتبہ وہ پکسی سے ملنے جا رہا تھا۔ اس کے بعد وہ اپنے گھر چلا جائے گا۔ اور پھر پکسی سے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ صرف پانچ مہینے کے لیے اپنے چچا کے گھر آیا تھا۔

جب شروع شروع میں وہ آیا تھا تو سوچ رہا تھا کہ یہ پانچ مہینے کیسے گزریں گے؟ مگر اب اس کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے آئے ہوئے پانچ مہینے کیا پانچ دن بھی نہیں ہوئے ہیں۔ خیر وہ خوب بن سنور کر پکسی سے ملنے گیا اور راستے بھر سوچتا رہا "آخر وہ کون سا گھونسلا ہوگا جو چاروں طرف سے بند ہوگا۔ اور جس کا کوئی دروازہ نہ ہوگا۔ مگر.... پھر اس گھونسلے کا فائدہ کیا ہوگا۔ جب سب طرف سے بند ہوگا تو پھر اس کے اندر جانور جاتا کس طرح ہوگا؟" اور یہی سب کچھ دیکھنے کے لیے وہ تیزی سے راستہ طے کر رہا تھا۔

"آؤ بھئی ڈیوڈ! میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔" پکسی نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

"ہاں بھئی میں آگیا۔ مگر اب اس کے بعد پھر شاید میں نہ آسکوں گا۔" ڈیوڈ نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔

"کیوں ۔۔؟" پکسی نے حیرت سے پوچھا۔

"پھر میں اپنے وطن چلا جاؤں گا۔"

"ارے! تو خیر۔ چلو۔ اپنا ہاتھ لاؤ۔" پکسی نے جادوئی الفاظ کہے اور ڈیوڈ انھیں دہرانے لگا۔

اب ڈیوڈ پکسی کے برابر ہو چکا تھا۔ اس نے پکسی سے کہا "چلو۔ کہاں چلنا ہوگا۔"

پکسی بولا "زیادہ دور نہیں۔ بس سامنے والے کھیت تک چلیں گے۔" دونوں چل پڑے۔

کھیت زیادہ دور نہیں تھا۔ جلد ہی دونوں پہنچ گئے۔ پکسی نے کہا "ڈیوڈ میاں ذرا اوپر تو دیکھو۔" اور اس نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر دیکھا۔ مگر اسے تو کچھ بھی نظر نہ آیا۔ اور یہی بات اس نے پکسی سے کہہ دی۔

"مجھے تو کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔"

تب پکسی بولا: "میں نے تم سے آسمان میں تارے تلاش کرنے کو تھوڑی کہا ہے۔ ارے میاں اوپر دیکھو۔ بالی کے اوپر۔ کچھ نظر آیا؟ یا آٹھ نمبر کا چشمہ لگانا پڑے گا۔" اور تب ڈیوڈ نے بالی کے اوپر دیکھا کہ ایک چھوٹا سا جانور بیٹھا ہوا تھا۔ اس کی لمبائی مشکل سے تین انچ ہوگی اور تقریباً دو انچ لمبی دم لٹک رہی ہے۔ اوپری رنگ بھورا تھا۔ پیٹ سفید تھا۔

پاؤں ہلکے گلابی رنگ کے تھے۔ بڑے مزے سے
ا سکوڑ کر ڈیوڈ اور پکسی کو دیکھ رہا تھا۔

ڈیوڈ بھی اس سے بڑا نہیں تھا اس لیے اور حیرت
رہا تھا۔ اس نے آج تک اتنا ذرا سا آدمی نہیں دیکھا تھا۔

ڈیوڈ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

"بھائی صاحب نیچے تشریف لائیے۔"

بس ڈیوڈ کا یہ کہنا ہی غضب ہو گیا۔ جیسے ہی
ے ڈیوڈ کی آواز سنی۔ کھٹ سے اپنی دم کو بالی میں لپیٹا
چھلانگ جو ماری تو۔ یہ جا وہ جا۔ اور نظروں سے

پکسی نے کہا "یہ فصلی چوہا ہے۔ اور کبھی کبھی نظر آتا ہے
قسمت ہو کہ یہ مل گیا۔ ویسے گرمیوں میں یہ مکا کے
یں ملتا ہے اور جاڑوں میں کھلیان میں ڈیرا جماتا
تا یہ ہے کہ کسان فصل کاٹتے ہیں تو کٹی ہوئی فصل
ی بڑے مزے سے چلا جاتا ہے۔"

"دیکھو۔ وہ جھانک رہا ہے۔ ابھی تم دیکھ ہی چکے
جلدی چھلانگ مار کر یہ غائب ہو گیا تھا۔ مگر بعض
یہ اتنی لمبی چھلانگ مارتا ہے کہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے۔
بات یہ ہے کہ کودتے وقت زمین پر تو گرتا ہی نہیں۔
قت تو اس کی چھلانگ دیکھنے کے قابل ہوتی ہے جب
شمن سے ڈر کر بھاگ رہا ہو۔"

"نیولے سے تو ایسا ڈرتا ہے کہ خدا کی پناہ —!
تیزی سے بھاگتا ہے۔ اور لطف یہ ہے کہ اپنے
ئی نشان نہیں چھوڑتا۔ حد یہ ہے کہ اس میں ایک



خاص بو ہوتی وہ بھی اس وقت ختم ہو جاتی ہے۔ مگر پھر بھی نہ جانے کس طرح نیولے کو اس کے بچوں کا اور گھونسلے کا پتہ چل ہی جاتا ہے۔"

"کیا کہا گھونسلے کا پتہ۔ کیا چوہا گھونسلے میں رہتا ہے؟"
ڈیوڈ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں اور کیا۔ اس میں حیرت کی کون سی بات ہے!
کیا اس سے پہلے تم نے خرگوش، تتلی، گلہری وغیرہ کے گھونسلے نہیں دیکھے تھے؟" پکسی نے کہا۔

"وہ تو ٹھیک ہے" ڈیوڈ نے کہا "مگر چوہا اور گھونسلا
تعجب! ہم تو صرف اس کا بل ہی سنتے آئے ہیں تم نے گھونسلا بھی بنا ڈالا۔"

"اچھا چلو میں ابھی تم کو دکھاتا ہوں۔ دیکھو وہ سامنے

چوہا آ رہا ہے ۔"

اور پھر جیسے ہی وہ ان کے قریب سے گزرا پکسی نے ایک زوردار سلام جھاڑ دیا۔ پکسی کی آواز سنتے ہی وہ چوہا اچھل پڑا۔ یہ شاید دوسرا چوہا تھا اور اسے پتہ بھی نہیں تھا کہ کوئی دوسرا بھی کھڑا ہے ۔ اس نے جلدی جلدی چاروں طرف بھاگنے کے لیے راستہ دیکھا۔ اور بھاگنا ہی چاہتا تھا کہ پکسی پھر بولا۔ "مسٹر مسٹر آپ گھبرائیے نہیں ہم آپ کے دوست ہیں۔ اور آپ ہی کے پاس آئے ہیں۔ یہ میرا دوست ڈیوڈ ہے ۔"

"عجیب آدمی ہے۔ اس کو اس بات کا یقین ہی نہیں آ رہا ہے کہ آپ گھونسلے میں رہتے ہیں۔ کہتا ہے کہ نہیں چوہے تو بل میں رہتے ہیں۔ اب آپ ہی سمجھائیے میں تو تنگ آ گیا ہوں میری بات تو ہنسی میں اڑا دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ اب میری عزت آپ کے ہی ہاتھوں میں ہے ۔" پکسی نے اچھی خاصی لچھے دار تقریر کر ڈالی ۔



" اچھا یہ بات ہے ۔ کیوں ڈیوڈ صاحب کیا آپ نے مجھے خانہ بدوش سمجھ رکھا ہے۔ جناب میں باقاعدہ گھونسلے میں رہتا ہوں۔ یہ گھونسلا بہت خوب صورت ہے ۔ اس میں آرام دہ کمرے ہوتے ہیں اور ضرورت کی ہر چیز ہوتی ہے ۔ اب آپ آئندہ سے ہمارے بارے میں ایسی غلط بات نہ کہیے گا۔ سمجھے ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا ۔"

ڈیوڈ کو بہت غصہ آیا کہ اتنا ذرا سا چوہا اور اکڑ تو دیکھو خدا کی پناہ ! مگر وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ تو خود چوہے سے چھوٹا تھا۔ اس لیے اس نے نرمی سے کہا۔

"معاف کیجیے مسٹر۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ باقاعدہ کوٹھی میں رہتے ہیں۔ آپ کے پاس عمدہ قسم کی موٹر کاریں ہیں۔ اور ہوائی جہاز تو آپ ہی ٹرانسپورٹ کرتے ہیں دنیا کو۔" وغیرہ وغیرہ ۔

"ارے ارے ذرہ نوازی ہے جناب کی۔ ورنہ ہم کیا ہیں۔ آئیے آئیے۔ آپ کھڑے کیسے ہیں۔ تشریف لائیے۔ ایک آپ ہی تو عقل مند آدمی ملے ہیں ۔"

اور پھر تینوں گھونسلے کے پاس آ گئے ۔

"دیکھیے یہی بندے کا غریب خانہ ہے ۔"

"اچھا تو یہی ہے آپ کی کوٹھی ۔" ڈیوڈ نے مذاق میں کہا۔

"اجی بس کوٹھی کیا ہے ایسی ہی معمولی سی جھونپڑی

علوم کرنا چاہتے ہیں ؟"

یہ بتائیے۔ یہ آپ ہی نے بنائی ہے ؟"

، جی ہاں .... مگر واہ .... میں کیوں بناتا۔
نے بنائی ہے "

نے بکسی کی طرف دیکھا اور بکسی نے چپکے سے
کہا۔ "چوہا گپّی معلوم دیتا ہے خیر سنتے رہو۔
م ہو ہی جائے گی۔ نوٹ کرتے رہنا "

سٹر چوہے۔ یہ راج مزدوروں نے کس
پ بتانے کی زحمت گوارہ کریں گے "

سٹر ڈیوڈ۔ چوہا کہہ کر میری انسلٹ نہ کیجیے۔
ہیں "

لطی ہوئی۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ ہاں تو مسٹر

:۔ سنیے پہلے گھانس اور کائی اکٹھا کی جاتی
ر چوہے کتر کتر کر باریک کرتے ہیں اور تب
تے ہیں۔ گیہوں کی دو ٹہنیوں پر ہم اپنا گھونسلا
، ہماری بنیاد ہوتے ہیں۔ گھاس کو اتنی
جاتا ہے کہ معلوم بھی نہیں ہوتا اور یہ چھپا
یہ صرف اسی وقت معلوم ہوتا ہے جب
ن لے جاتے ہیں "

کیا ہوتا ہے ؟" بکسی نے پوچھا۔ "ہوتا کیا"
ولا "زمین میں بل کھود کر گھس جاتے ہوں

"جی نہیں ہم عام چوہے نہیں ہیں۔ ہم کٹی ہوئی فصل میں بیٹھ کر کسان کے کھلیان میں چلے جاتے ہیں، اور پھر وہاں اپنا گھونسلا بنا لیتے ہیں "

"اچھا مسٹر چوچو، یہ تو بتائیے کہ آپ کے گھونسلے — اوہ — بلڈنگ میں جانے کے لیے تو کوئی راستہ ہے نہیں پھر آپ جاتے کس طرح ہیں ؟"

ابھی ڈیوڈ نے اپنا جملہ ختم کیا ہی تھا کہ گھونسلا ہلا اور ایک دوسرا چوہا نہ جانے کیسے باہر آگیا۔

"ارے یہ چوہا کہاں سے نکلا ؟" ڈیوڈ نے حیرت سے کہا۔

"یہ چوہا نہیں ہے۔ یہ مسز چوچو ہیں۔ آپ مجھے پڑھے لکھے نہیں معلوم ہوتے "

"خیر آپ چونکہ میرے مہمان ہیں اس لیے چھوڑے دیتا ہوں "

"اوہ پھر معاف کیجیے گا۔ ہاں تو یہ محترمہ کیسے باہر آئیں ؟"

"ابھی بتاتا ہوں" چوچو نے کہا اور کسی کو آواز دی۔ اور اسی وقت ایک چوہا اور کھٹ سے باہر آگیا۔

چوچو نے کہا "ایسے کیا سمجھے ؟" ڈیوڈ نے بکسی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا "کیا سمجھے ؟"

بکسی نے بڑی معصومیت سے کہا "کچھ نہیں"۔

تب چوہا بولا۔

"دونوں موٹی عقل کے معلوم ہوتے ہیں۔ ارے بھائی یہ گھونسلا الاسٹک کا بنا ہوا ہے۔ ہم جس چھید میں سے چاہیں

نکل سکتے ہیں۔"

ڈیوڈ اور پکسی دونوں حیرت زدہ رہ گئے "اچھا یہ بتایئے کہ آپ جاڑوں میں کیا کرتے ہیں، کیا آپ بھی گلہری کی طرح سوتے رہتے ہیں اور سورج نکلنے پر اٹھتے ہیں۔؟"

"نہیں ہم دوسرا گھر بنا لیتے ہیں۔ جو زمین سے تقریباً چھ انچ اونچا ہوتا ہے۔ اس میں ہم کھانے پینے کا سامان جمع کر لیتے ہیں اور مزے سے کھاتے رہتے ہیں۔ اور جب سورج نکل آتا ہے تو باہر نکل آتے ہیں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں بہت دیر ہو گئی۔ لوگ دعوت میں میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

اور چوہا یہ کہہ کر بھاگ گیا۔

ڈیوڈ نے پکسی سے پوچھا "کیا واقعی یہ دعوت میں گیا ہے!"

پکسی بولا۔ "ایک نمبر گپّی تھا، بھوک کے مارے کمبخت کا حال پتلا ہو رہا تھا۔ کوئی نہ کوئی بہانا تو بنانا تھا۔"

اچانک ڈیوڈ کا قد پھر بڑا ہو گیا اس نے پکسی کا ننّا سا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "اچھا دوست اب اجازت دو۔ میں تمھیں زندگی بھر یاد رکھوں گا۔ اور اپنے دوستوں کو بھی تمھارے بارے میں بتاؤں گا۔"



خدا حافظ۔

ذرا نیچے دیکھیے

○

ایک گول دائرہ سا بنا ہے۔ اس گول دائرے میں سرخ نشان ہے۔ اس سرخ نشان کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی خریداری کی مدّت اس مہینے ختم ہو رہی ہے۔

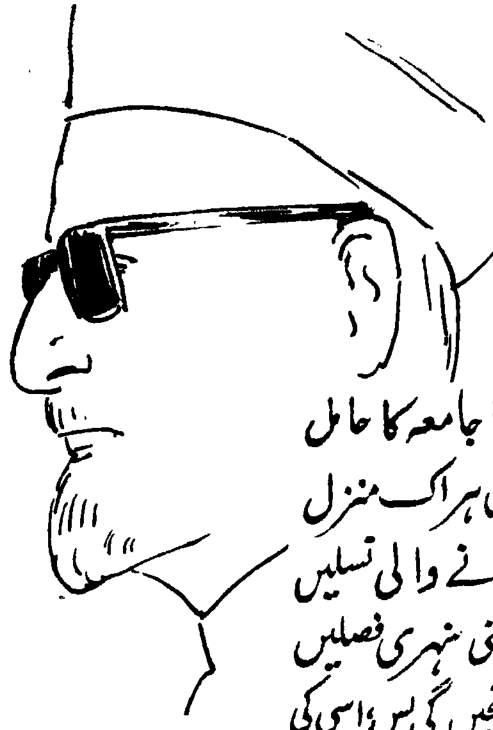
ہمیں یقین ہے کہ پیام تعلیم آپ کو پسند آیا ہوگا اور آپ اس کی سرپرستی جاری رکھیں گے۔

اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک مبلغ چھ روپے کا منی آرڈر بھیج دیجیے، اور ہاں منی آرڈر پر اپنا خریداری نمبر ضرور لکھیے گا۔ آپ کا خریداری نمبر...... ہے

"مینیجر"

...گوہر

ایک کردار



تھا بانی — وہی جو تھا جامعہ کا حامل
ب نہیں ہے — مگر یہاں کی ہر اک منزل
ہے رہیں گی — یہ زندگی، آنے والی نسلیں
، کا خون ہوگا — اگیں گی جتنی سنہری فصلیں
می شادیانے — صدائیں گونجیں گی بس، اسی کی
ن کو اپنا جانا — کہ قدر کی جس نے آدمی کی
گی اپنا — جسے غریبوں کا درد ہوگا
سے قبر اس کی — جو خاص ملت کا فرد ہوگا
نے سر تے دم تک — کرے گا انسان سے محبت
ملے گی بچو! — اسی کی ہوگی "وہاں" شفاعت
ب کے غم کو — جو علم سیکھے برائے خدمت
ے وطن کی خاطر — جسے ہو مرغوب آدمیت
کھ اٹھائے — اسی پہ قدرت کا ہاتھ ہوگا
کامیابی — زمانہ اس کے ہی ساتھ ہوگا
لم کی ہیں — تمام اوصاف ہیں اسی کے
، کے آگے — تمام تحفے ہیں علم ہی کے
میں ملے گی — تو سر جھکا دے گا ہر زمانا

جناب یو ایم اسری

ذاکر صاحب کی یادیں

یہ مئی کا مہینہ ہے، ایک سال پہلے اسی مہینے ہمارے ذاکر صاحب اچانک ہم سے رخصت ہو گئے تھے۔ مئی کی تین تاریخ تھی۔ ریڈیو نے کوئی بارہ ایک بجے ان کے انتقال کی خبر سنائی تھی۔ اور ایک دم دہلی میں، سارے ہندوستان میں، ساری دنیا میں کیسی ہل چل مچ گئی تھی۔ کیسا سناٹا چھا گیا تھا۔ دلی خصوصاً جامعہ ملیہ میں تو انتقال کے بعد تجہیز و تکفین تک اداسی کی کیسی فضا چھائی رہی۔ یہ سب باتیں دماغ میں تازہ ہیں۔ کتنی جلدی پورا ایک سال گذر گیا۔

وقت گزرنے پر بڑی بڑی باتیں بھولی بسری ہو جاتی ہیں۔ پرانی یادیں دھندلا جاتی ہیں۔ پر سچ جانیے ہمیں تو ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ سب کچھ کل کی بات ہو۔ راشٹرپتی بھون میں جنازے کی زیارت کے لیے لوگوں کی کتنی بھیڑ رہتی تھی۔ اور پھر جنازہ کس دھوم سے اُٹھا تھا۔ یہ سب باتیں آنکھوں تلے پھر رہی ہیں۔ رہ رہ کر یاد آ رہی ہیں ...

ذاکر صاحب میں بہت سی باتیں ایک ساتھ جمع ہو گئی تھیں، ان کی بات چیت میں بڑی مٹھاس تھی۔ نکھری ستھری زبان کا بہترین نمونہ۔ پھر بات چیت کے وقت ایسا لگتا تھا جیسے ہم ایک بہت ہی شفیق اور ہمدرد بزرگ کے سامنے کھڑے ہیں۔ اور وہ بہت اچھی اچھ باتیں بتا رہا ہے۔ اچھی اچھی نصیحتیں کر رہا ہے

ان میں قربانی کا جذبہ تھا۔ جامعہ کے کامو کو آگے بڑھانے میں انھوں نے اپنی تندرستی تک قربا کر دی۔ پھر ہمت تھی، استقلال تھا، کام کرنے کا حو تھا۔ جامعہ ملیہ کی عمارت بالکل کھنڈر بن چکی تھی ذاکر صاحب نے اپنی ہمت، حوصلے اور استقلال کے اسے مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر دیا۔ وہ اپنے ساتھ کا کرنے والوں کے بہترین ساتھی تھے۔ ان کے دُکھ در میں برابر کے شریک تھے۔ غرض ان میں ایک عجیب موہنی تھی، ایک عجیب کشش تھی۔ اس لیے ہم انھیں بھا چاہیں تو نہیں بھلا سکتے۔

"پیام تعلیم" نے اپنے دو خاص نمبروں میں ا مصنفوں نے اپنی کتابوں میں ان کی اچھی اچھی باتوں کا ذ کیا ہے۔ پھر بھی ان کی زندگی کے بہت سے پہلو سا نہیں آئے ہیں۔ ان کی بھلمنساہٹ، انسانیت، شرافت کے بہت سے واقعے ہیں۔ جو لوگوں کی زبانوں پر ہیں لکھے نہیں گئے ہیں۔ اسی طرح کے چند واقعے نیچے لکھے جا ہیں۔ یہ باتیں ہمیں محترمہ نجمہ باجی ہیڈ مسٹریس بالک سینٹر نے بتائی ہیں۔ محترمہ نجمہ باجی وہی شکریہ قبول

...کے راج بھون میں گورنر کی طرف سے دعوت
...یون لوگ بلائے گئے ہوں گے۔ اسمبلی کے
...نز لوگ جی ہاں یہ سبھی لوگ تھے لیکن ساتھ
...ں ایسے لوگ بھی تھے جنھیں لوگ اپنے نزدیک
...یں کرتے — جنھیں عرفِ عام میں مہتر یا
...ہے — تو اس میں خاص بات کیا ہوئی؟
...ں بھنگی۔ دھوبی۔ بہشتی۔ کمہار۔ غرض سارے
...کر کھلاتے ہیں وہاں بھی ایسا ہی ہوا ہوگا۔
...ا۔ دے لوگ باقاعدہ صاف ستھرے کپڑے پہنے
...مرے مہمانوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ ساتھ
...س کے بعد جب میزبان گورنر نے معزز
...ملا کر رخصت کیا تو ان سے بھی اسی طرح

...۔ بیوہ (شفیق الرحمٰن صاحب) کی یاد میں
...ٹیا محل میں ایک لائبریری قائم کرنے کی
...ں ہیڈ مسٹریس نجمہ باجی کو اس لائبریری
...ھا کرنے کی ذمّہ داری سونپی گئی۔ انھوں
...ذاکر صاحب کو ایک خط لکھا اور اس وقت
...خوشی کی انتہا نہ رہی جب ذاکر صاحب نے
...ت بھرے گھریلو انداز میں اس خط کا جواب
...پنے پرائیوٹ سکریٹری سے بھی لکھوا سکتے
...ار وہ جامعہ آئے تو حسبِ معمول پرانے
...ں کر ان کی خیریت دریافت کی پھر نجمہ باجی

اور مشیر آپا کی جانب آئے۔

لائبریری کا ذکر آیا تو فرمایا کہ اس وقت اگر نقد رقم چاہیں گی تو جیب میں مشکل سے پچیس تیس روپے نکلیں گے۔ ہاں میں بہار جاکر وہاں سے روانہ کر دوں گا — اور انھوں نے وعدہ نبھایا۔

۳۔ ذاکر صاحب کے پرانے ساتھی اختر فاروقی صاحب کی صاحبزادی محترمہ ممتی صاحبہ جامعہ میں پیدا ہوئیں، پلیں بڑھیں۔ ذاکر صاحب ان پر بہت شفقت فرماتے تھے۔ جب ذاکر صاحب علی گڑھ میں تھے تو ممتی باجی انھی کے یہاں ٹھہرتی تھیں۔ ایک بار ذاکر صاحب نے انھیں ڈبے میں بند مچھلی کھانے کو دی۔ ممتی باجی کھا نہ سکیں — انھیں ابکائی آگئی — ان کے دل کو دکھ نہ پہنچے یہ سوچ کر ذاکر صاحب نے اس وقت تو نہیں لیکن اس کے بعد باتوں باتوں میں کہا "آدمی کو ہر چیز کھانے کا عادی ہونا چاہیے۔"

لیکن کیا یہ نصیحت دوسروں کے لیے تھی؟ جی نہیں سنیے!

جامعہ کا وہ دور تھا جب کھانے پینے کی چیزیں بھی مشکل سے فراہم ہوتی تھیں۔ جامعہ کے کارکن اور استاد خلوص اور لگن سے طاقت حاصل کرتے تھے اور دن رات جامعہ کی خدمت اور بھلائی میں لگے رہتے تھے۔ آپا جان مرحومہ (جرمن خاتون مس فلپس بورن) نے ذاکر صاحب اور حامد صاحب کی صبح کے وقت دعوت کی اور کلیجی پکائی۔ مصروفیت کی وجہ سے ذاکر صاحب دن

کے وقت نہ پہنچ سکے۔ شام ہوتے ہوتے پہنچے۔ گرمی کے دن تھے۔ کلیجی خراب ہوچکی تھی۔ ذاکر صاحب کو چکھتے ہی اس کا پتہ چل گیا اور انھوں نے جلدی جلدی تعریف کرکے اور ہنس ہنس کے ساری کلیجی کھائی۔ حامد صاحب کو چکھنے تک نہ دی۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں حامد صاحب کی زبان سے یہ نہ نکل جائے کہ کلیجی خراب ہوگئی ہے۔ آپا جان کی دل شکنی ہوگی۔

بڑے ہوکر بھی ذاکر صاحب میں بڑائی کا احساس بالکل پیدا نہیں ہوا۔ جامعہ کے سابق رجسٹرار محترم ارشاد الحق صاحب کے صاحبزادے جنید صاحب۔ ذاکر صاحب کے شاگرد تھے۔ ذاکر صاحب کو جامعہ کے طلبا "ماس صاحب" کہتے تھے۔ صدر ہونے کے بعد جب وہ پہلی بار جامعہ آئے تو جامعہ کے کارکنوں کو ایک قطار میں کھڑا کرکے باری باری ان کا تعارف کرایا گیا۔ جنید صاحب نے سمجھا شاید "ماس صاحب" مجھے نہ پہچانیں۔ نمبر آیا تو بے صبری سے آگے بڑھ کر کہا۔ "ماس صاحب آپ نے مجھے پہچانا۔ میں جنید ہوں" مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "ہاں میں نے پہچان لیا" اور بڑی شفقت اور محبت سے پیٹھ تھپتھپائی۔ یہ اپنے طالب علموں سے ان کی محبت کا ادنیٰ نمونہ تھا۔

●

★ اردو لکھیے

★ اردو پڑھیے

★ اردو بولیے

جناب محسن نظامی

خراجِ عقیدت

جذبۂ انسانیت کے رہ نما ذاکر حسین
اک مدبّر اک مفکّر پیشوا ذاکر حسین

اک معلّم اک معزز رہنما ذاکر حسین
اہلِ عالم کے لیے درسِ وفا ذاکر حسین

اب کہاں ایسا تفکّر اب کہاں ایسا دماغ
ہند میں جمہور کے تھے پیشوا ذاکر حسین

غم میں اربابِ محبت کو تڑپتا چھوڑ کر
ہوگئے خود راہیِ ملکِ بقا ذاکر حسین

بادشاہِ کیف و نغمہ رہ نمائے علم و فن
کشتیِ فکر و سخن کے ناخدا ذاکر حسین

یک بیک بزمِ سیاست میں اندھیرا
جب ہوئے گم گشتۂ راہِ فنا ذاکر حسین

چل دیے احباب کی جانب سے نظریں پھیر کر
محفلِ علم و ادب کے رہ نما ذاکر حسین

باہزاراں اضطرابِ رنج و غم، باچشم
کہہ رہی ہے اہلِ عالم کی صدا ذاکر حسین

بچوں کی دل چسپ اور معلوماتی کتابیں

	دیداس گپتا	1/25	مصنوعی چاند	اطہر پرویز	1/50
	پ ہٹن میکر	-/75	مندر	وسنت نیل کنٹھ گدرے	-/75
	اطہر پرویز	1/50	نجومی آپا	اطہر پرویز	-/75
انی	سوامی مہامنے	-/90	نیا تیرتھ	راجیندر راؤ سکتی ترشت	1/-
لطیفے	اطہر پرویز	-/40	نہر وا مرہیں	فصاحت حسین خاں	1/-
	اطہر پرویز	-/75	ہولی اور چراغ	اطہر پرویز	1/62
	" "	-/50	ہماری کھیتی باڑی	سیما	1/-
ے	منوہن گاندھی	1/-	ہماری آباد دنیا	فصاحت حسین	1/-
رادیس	جاوید اقبال	1/25	ہندوستان ترقی کی شاہراہ پر	ادھیر موہن سیناپتی	1/-
ے (اوّل)	شکنتلا دیوی	-/75	ہمارے بن ہماری دولت	رام چندر تیواری	-/75
" دوم "	"	-/75	ہمارا ذہن	ویجا اڈوپا	1/-
	اطہر پرویز	1/25	ہماری سائنس	وزارت حسین	2/-
	شاہد علی خاں	-/75	ہمارا ہندوستان	اطہر پرویز	1/75
	اطہر پرویز	1/25	اچھا شہری	پبلیکیشنز ڈویژن	1/-
	یدوناتھ تھٹے	1/25	اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	"	-/75
	اطہر پرویز	1/25	بھارت کی لوک کہانیاں	" "	1/-
	جے بھگتو	-/75	پنڈت نہرو سے بات چیت	ٹیبر منڈی	2/-
شے	وزارت حسین	2/-	خوش حالی کے لیے منصوبہ بندی	پبلیکیشنز ڈویژن	-/75
یا	"	2/64	زنگا کے گیت	مترجم شمیم کرہانی	1/-
بہت دور تک ہے	اطہر پرویز	2/-	سائنس کے چند پہلو	سی وی رامن	1/25
	اے دی ایس راماراؤ	-/75	وویکانند	پبلیکیشنز ڈویژن	1/50
تے پر	سیما	-/90	ہمارا جھنڈا	" "	1/-
	نرویشو شرما	-/75	ہندوستان کی تاریخ	" "	2/75
	اطہر پرویز	-/56	ہندوستان کی نامور ہستیاں (اوّل)	" "	2/25
	محمد آفاق	1/-	ہندوستان کی " (دوم)	" "	2/50

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال بمبئی ۳

بچوں کی دلچسپ اور معلوماتی کتابیں

مذہب

آں حضرت — الیاس احمد مجیبی — ۱/۶۵
ارکانِ اسلام — مولانا اسلم جیراجپوری — ۱/۵۰
چار یار — الیاس احمد مجیبی — ۱/۳۰
خلفائے اربعہ — خواجہ عبدالحیٔ فاروقی — ۱/۵۰
رسولِ پاک — عبدالواحد سندھی — ۱/۸۰
سرکارِ دوعالمؐ — محمد حسین حسّان — ۲/۰
عقائدِ اسلام — مولانا اسلم جیراجپوری — ۵۰/-
مسلمان بیبیاں — اعجاز الحق قدوسی — ۷۵/-
نبیوں کے قصّے — خواجہ عبدالحیٔ فاروقی — ۱/۰
ہمارے رسول — ״ — ۱/۴۰
ہمارے نبی — سید اولاد علی رضوی — ۸۰/-

معلومات

آدمی کی کہانی — مشتاق احمد اعظمی — ۱/۲۵
(انوکھا عجائب خانہ) — محمد حسین حسّان — ۵۰/
״ ״ (دوم) — ۴۰/
״ ״ (سوم) — ۴۰/
״ ״ (چہارم) — ۵۰/
بجلی کی کہانی — علی احمد خان — ۵۰/
بجلی اور مقناطیس کے کھیل — ۷۵/-
تاریخ ہند کی کہانیاں (اوّل) — خجستہ سلطان — ۸۰/-
״ ״ (دوم) — ضیاء الرحمٰن
تاریخ ہند کی کہانیاں سوم — مشتاق احمد اعظمی — ۸۰/-
״ ״ چہارم — ۹۵/-
بڑدادا کی کہانی — پروفیسر عبدالغفور — ۵۶/
ٹیگور — صفدر حسین — ۱/۲۵
پٹھانوں کی کہانی — محمد امین — ۱/۷۵
خبررسانی کے طریقے — رفیعہ امین — ۸۵/-
دہلی — ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی — ۱/۵۰
دنیا کے بسنے والے — شبیر حسین زیدی — ۷۵/-
دنیا کے بچّے — محمد حسین حسّان — ۸۰/-
سمندر کے کنارے — سلطانہ آصف فیضی — ۱/۲۰
سمندر کے نیچے — ״ ״ — ۲/۰
سماجی زندگی اوّل — احمد الیس پٹیل اور غلام ابرار — ۵۶/-
״ ״ (دوم) — ۸۰/-
״ ״ سوم — ۸۱/-
״ ״ چہارم — ۸۱/-
قدرت کے کرشمے — ۶۲/-
مفید معلومات دوم — ۷۵/-
״ ״ سوم — ۱/۲۵
״ ״ چہارم — ۱/۵۰
معلومات کی پانچویں کتاب — ۱/۵۰
میراانیس — محمد حسین حسّان — ۶۵/
ہماری پارلیمنٹ — کیلاش چندر — ۵۰/

کہانیاں

الّو خاں کی بکری — ڈاکٹر ذاکر حسین — ۵۰/
اس نے کیا کرنا جانا — آصف مجیب — ۳۷/
پاک کہانیاں اوّل — مقبول احمد — ۲۰/
״ ״ دوم ״ — ۱۵/
تانبیل خاں — محمد حسین حسان — ۲/
ترکوں کی کہانیاں — ۱۵/
چقماق کی ڈبیا — برکت علی فراق — ۴۰/
چھوٹی لالٹین — مشتاق احمد اعظمی — ۳۱/
چنبیلی — محمد حسین حسّان — ۵۰/
چمپاوت کا آدم خور شیر — محمد معین — ۳۵/
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا — کوثر بانو — ۳۰/
شہزادی گلنار — پروفیسر عطاء اللہ — ۲۰/
شبدلا — پروفیسر محمد مجیب — ۵۰/
لال مرغی — عبدالواحد سندھی — ۱۰/
مزہ چکھائیں گے — ۲۵/
ننھا ٹوٹو — خورشید سلطانہ — ۲/

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

صفہ مجیب

اب اور تب

(مسلسل)

ولھا کے ساتھ ایک لڑکا شہ بالا بنتا بارات
می ہوتے تھے قریب جگہ شادی ہوتی تو اسی دن،
یک آدھ روز پہلے آجاتی۔ بری کے جوڑوں کے
چلے آتے رنگ برنگے، گوٹے لچکے اور کار چوبی جھلملاتے
ے ہوتے بھاری بھاری جوڑے سجے ہوتے۔
جوڑا زربفت کا بڑے پائنچوں کا جیسے سونے کا
ری بیل دار پوت کا، بنارسی سرخ رنگ، بنارسی
بی بیلیں، منقش کے آنچل۔ جھلمل جھلمل کرتے۔
ے اشرفی نما سونے کی بیل بنی ہوتی ہے۔ بہت
الوں کے یہاں اس میں سچے موتی، ہیرے،
ہوتے۔ یہ دوپٹے میں سر کی طرف تھوڑی دور
تی، سامنے دکھائی دیتی۔ سرخ دوشالہ، سہاگ
ے سرخ چمک دار سنہرے کاغذ کا پیکٹ سا ہوتا۔
ا اور مصالحہ ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ دلھن کے
ے سامان لگا ہوا۔ عطر، مہندی، کنگھی چوٹی۔
مباف چوٹی میں ڈالنے کا۔
پنچیوں میں رنگے ہوئے گھڑے آتے، منوں میوہ
۔ جس وقت بری آتی ایک پر ایک لوٹا پڑتا۔
پیر کا زیور ضروری تھا۔ سونے یا چاندی کا
یا شاہ ہو۔ توڑے۔ لچھے۔ چھاگل، پازیب

چھڑے۔ کڑے، چھانجھن کوئی چیز ہوتی۔ برات میں دولھا کی
طرف سے جو ڈومنیاں آتیں وہ اس وقت ناچنے لگتیں۔

بنا نبری کے لیے شبھ گھڑی آیا ری بنا

یہ مرا سہرا بالا بنا یہ مرا مرادوں پالا بنا

بنا نبری کے لیے شبھ گھڑی آیا ری بنا

ایک تو بنا بنا اور بنے کے باوا بنے

چل کر دیکھو ری سکھی سب میں سہانا ری بنا

بنا نبری کے لیے شبھ گھڑی آیا ری بنا

ایک تو بنا بنا اور بنے کے بھائی بنے

سجیں مخمل کی بچھیں تکیے مشجر کے لگے

بنا نبری کے لیے نت گھڑی آیا ری بنا

دور سے آیا ری بنا راج دلارا ری بنا

بنا نبری کے لیے نت گھڑی آیا ری بنا

دلھن کے ہاتھوں پیروں میں مہندی لگائی جاتی،
جلدی سے چھڑا دی جاتی کیوں کہ اتنا وقت کہاں ہوتا۔ اسے
شہانی مہندی کہتے۔ نکاح کے وقت باہر سے دلھن کے دو
عزیز اندر آتے وہ گواہ کہلاتے۔ اس وقت ان کا اندر آنا
ہی کمال ہوتا۔ بڑی مشکل پڑتی، بیویاں پردہ کرتیں۔ اور کوئی
ہٹتی بھی نہیں چیخ پکار سے کچھ نہ کچھ کسی نہ کسی طرح رسائی ہوتی۔
دلھن کے پاس اس وقت خالہ، ممانی، پھوپھی کوئی بیٹھ

جاتیں۔ گواہ لڑکی سے پوچھتے کہ فلاں لڑکے کے ساتھ تمھارا عقد ہو رہا ہے، منظور ہے؟ وہ کچھ نہ بولتی منہ چھپائے پڑی ہوتی۔ بہت کہنے سننے سے بس ذرا سی ہوں ہاں یا رونے کی آواز ہی منظوری سمجھی جاتی۔

تین مرتبہ اس طرح پوچھ کر گواہ چلے جاتے دلھن رونے لگتی اور سب کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ باہر قاضی نکاح پڑھاتے پھر چھوارے لٹائے جاتے۔ لڑکے بالے خوب لوٹتے کھاتے اور جیبوں میں بھر لیتے۔ پھر سینیوں میں اندر بھیج دیے جاتے جو عورتوں میں تقسیم ہوتے۔ ہر طرف سے مبارک، سلامت۔ کی صدائیں آنے لگتیں۔ سہرا پڑھا جاتا جو خاص اسی موقع کے لیے کہا جاتا تھا آپ کو معلوم ہے مرزا غالب نے شہزادے کی شادی میں وہ مشہور سہرا کہا تھا۔

باراتیوں اور سمدھنوں کو شربت پلایا جاتا۔ خوب خاطریں اور ہنسی مذاق ہوتا۔ بہت نفیس بڑھیا کھانا کھلایا جاتا۔ سمدھنوں کے آگے تھال چنا جاتا، زردہ اس پر زری لگا ہوا۔ آج کے دن دلھن، دلھن کی ماں اپنے ماں باپ یا بھائی کے لائے ہوئے کپڑے پہنے ہوتیں۔ بیویاں اور دلھن کو سنوارتیں سولہ سنگار ہوتے۔ اس میں گھنٹے لگ جاتے۔ سر گوندھ کر باریک باریک کاٹ کر افشاں چھڑکتیں، مانگ میں بہت سی لگا دیتیں۔ افشاں کی ایک لکیر سی بن جاتی۔ معلوم ہوتا تاروں بھری رات میں کہکشاں چمک رہی ہے۔ سہانا جوڑا پہنایا جاتا۔ اور سر سے پیر تک زیور سے سجاتیں۔ پھولوں کے ہار ڈالے جاتے، عطر خوب ملا ہوتا۔ دلھن کے پاس عطر اور پھولوں سے دماغ بس جاتے۔ فضا مہک اٹھتی۔ گھر کا کوئی بزرگ اپنے سر سے سہرا چھو کر دلھن کے باندھتا۔ کامدار چوبی سہرا بھی ہوتا جس میں بعض جگہ سونے کی پٹی لگی ہوتی بعد میں وہ دولھا کی بہنوں کو ملتا۔ پھر شور مچتا دولھا آرہا ہے، دولھا آرہا ہے" لڑکیاں سب ڈھل کر دروں میں پہنچ جاتیں۔ کیوں کہ دولھا کو دیکھنے کا بہت شوق ہوتا۔

دولھا سسرال کا جوڑا پہنے ہوتا۔ زربفت یا بھاری پوت کی شیروانی۔ ہونٹوں پر ریشمی رومال لگائے ہوئے۔ پھولوں کی بدھیاں گلے میں پڑی ہوتیں۔ سہرے کی لڑیاں گھٹنوں سے نیچے لٹکی ہوتیں۔ ایک دو ہم سن لڑکے ساتھ ہوتے۔ دولھا کی بہنیں اپنا زر نگار آنچل اس کے سر پر ڈال کر آہستہ آہستہ لاتیں۔ اس وقت بڑا ہنگامہ اٹھتا۔ بیویاں ایک پر ایک ٹوٹی پڑتیں۔ سب ہی دولھا کو دیکھنا چاہتیں۔ حالانکہ پردہ بھی کرتیں مگر اس وقت اس کا بھی خیال نہ رہتا دیکھ کون پاتا۔ دولھا کے آگے پیچھے ایک جھمگٹ لگا ہوتا۔ سالیاں پھولوں کی نازک نازک چھڑیاں لیے آگے بڑھتیں اور سات مرتبہ دولھا کے دھیرے دھیرے سے مارتیں۔ خوب ہنسی پڑتی۔ آرسی مصحف کی رسم ہوتی دولھا دلھن کو آمنے سامنے بٹھا کر بیچ میں آئینہ اور قرآن شریف کھول کر رکھ دیا جاتا۔ دلھن گھونگھٹ نکالے بیٹھی ہوتی۔ دونوں کے اوپر سرخ مہین دوپٹہ ڈال دیا جاتا۔ کہا جاتا۔ سورۃ اخلاص پڑھ کر آئینہ میں دلھن کا منھ دیکھے۔ کوئی بیوی کہتی کہو بیوی آنکھیں کھولیں تمھارا غلام۔ ڈومنیاں گیت گاتیں۔

میری ہریالی گھونگھٹ کھول　　راج دلاری گھونگھٹ کھول
گھونگھٹ کھولو، مکھ سے بول　　میری ہریالی گھونگھٹ کھول
باوا کی پیاری گھونگھٹ کھول　　اماں کی دلاری گھونگھٹ کھول

ھامنہ دیکھ بنے کا   بنا پایا انمول نوشہ پایا انمول

ھر سلام کرائی ہوتی دولھا کو ساس سُسر اور سب
سلامی میں دیتے گھڑی وغیرہ بھی ہوتی۔ دولھا باہر
سالیاں چپکے سے جوتا چرالیتیں۔ روپیوں کے لیے جھگڑا
نے نہیں لیں گے اور لاؤ "جب تک بہت سے روپے
ا جاتے جوتا نہیں دیتی تھیں، تنگ کر دیتیں۔

بیز باہر نکالا جاتا۔ خوب دل کھول کر دیتے کپڑوں
، علاوہ چاندی کے برتن۔ اُگال دان۔ پان دان۔
ن۔ خاص دان۔ چائے کا سٹ اور کئی چیزیں۔
ن پر چاندی چڑھی ہوتی۔ اس میں نقش بنے
ے پیتل کے مراد آبادی برتن۔ بڑی بڑی دیگیں اور
ن۔ تشت۔ آفتابہ۔ سلائی کی مشین۔ چینی کے
نے اور چائے کے سٹ۔ بڑی سے لے کر چھوٹی کوئی
ہوتی جو نہ دی جاتی۔

ھتی کا وقت بہت دردناک ہوتا۔ دلھن رخصت
سب ملتے۔ سارے عزیز سہیلیاں پٹا پٹا کر
ن کی، روتے روتے ہچکی بندھ جاتی۔ کھڑے بیٹھے
موں میں آنسو ہوتے۔

بل گائے جاتے جو رخصتی کے وقت کا خاص گیت
ت ڈولا اٹھایا جاتا باہر براتی بابل گاتے تو بوڑھے
ر و قطار روتے۔

بابل

ی بدیس سن بابل مورے
ہم تورے بابل پھاندے کی چڑیاں
رین بسے اڑ جائیں رے
سُن بابل مورے
ہم تورے بابل بیلے کی کلیاں گھر گھر مانگی جائیں رے
ہم تورے بابل جنگل کی گئیاں جدھر ہانکو ہنک جائیں رے
سُن بابل مورے
طاق بھری گڑیاں جو چھوڑیں تو چھوڑا سہیلی کا ساتھ رے
ننگے پیروں جو بابل دوڑا ڈولا تھام رے
سُن بابل مورے
بیٹوں کو دینا محل دو محلے ہم کو دیا بدیس رے
کوٹھے تلے سے پلکیا جو نکلی دان جہیز رے
سُن بابل مورے
نیم تلے سے ڈولا جو نکلا بھیّوں نے کھائی پچھاڑ رے
ڈولے کا پردہ اُٹھا کے جو دیکھا چھوٹا بابل کا دیس رے
سُن بابل مورے

دوسرا بابل

ہرے ہرے بانس کٹا مورے بابل
نیکا منڈھا چھواؤ رے بابل
پربت بانس منگا مورے بابل
پالنوں منڈھا چھواؤ رے بابل
ہرے ہرے بانس
منڈھے اوپر کلس براجے دیکھ راجہ راؤ رے
متنک ہاتھی سو بھا دینا بابل دل دریاؤ رے
ہرے ہرے بانس

سونا بھی دینا روپا بھی دینا دینا جاٹ جڑاؤ رے
ایک نہ دینی سر کو رے کنگھی میری ساس نند بولی سے
ہرے ہرے بانس

ڈرے پر سے دولھا کی طرف سے روپے نچھاور کیے جاتے۔ جو غریب لوگ لوٹ لیتے۔

لڑکی کو اور دوسروں کو اس وقت بڑا دکھ محسوس ہوتا کہ بچپن میں ماں باپ نے کس پیار محبت سے پالا خود ہر طرح کا دکھ اٹھا کر اسے ہر طرح کا سکھ دیا۔ ذرا سی پھانس چبھی تو بے چین ہو گئے، منہ سے بات نکلی اور پوری ہو گئی انھیں اور اپنے پیارے بھائی بہنوں سکھیوں کو جنکا اتنی عمر ساتھ رہا چھوڑ رہی ہے۔ وہ گھر جس میں پلی بڑھی اتنی بڑی ہوئی اب اس کا نہیں رہا۔ ایک نیا ہی جیون شروع ہو رہا ہے نئی ذمہ داریاں سونپی جا رہی ہیں تو اک زمانے کے حالات کو دیکھتے ہوئے اتنا غم اور اثر قدرتی تھا۔ لیکن دولھا کی طرف دیکھیے وہاں تو اس وقت بڑی خوشیاں منائی جاتیں کہ دلھن آ رہی ہے۔ ماں باپ کے دل میں کتنا ارمان ہوتا کہ بیٹا بہو بیاہ کر لائے۔ کتنی منتوں مرادوں کے بعد یہ دن آیا ہر طرف خوشی ہی خوشی چھائی ہوتی۔ گھر سجا ہوتا۔ رات ہوئی تو روشنی سے دن پھیلا ہوا۔ بجلی کے قمقمے جگمگاتے۔ مہمانوں کا جمگھٹا۔ کپڑوں کی جھم جھماہٹ جیسے پرستان کا گمان ہو۔ دلھن کے ساتھ دو چار عورتیں میکے سے آتیں وہ دائی کہلاتیں دو خاص رشتہ دار ایک کھلائی ایک نائین۔ جیسے ہی بہو کا ڈولا یا موٹر جو پھولوں سے سجا ہوتا آ کر رکتا تو دولھا کی بہنیں جو کب سے اس انتظار میں ہوتیں بھاگ کر سب پہنچتیں اور ماں باپ سے نیگ مانگتیں۔ جب منہ مانگا نیگ لے لیتیں تو اترنے دیتیں۔ اس وقت ان کی خوشی دیکھنے کے قابل ہوتی وہ نیگ بعد میں رشتہ ناطے کی سب بہنوں کو بانٹا جاتا چاہے کسی کے حصے میں چونی ہی آئے۔ حق تو حق ہے "مان کا پان بڑا" اپنی بہنوں کا حصہ کچھ زیادہ ہوتا تھا۔ دلھن کو کوئی بیوی گود میں اتار کر لاتی اور کارچوبی مسند پر بٹھایا جاتا۔ چاروں طرف سے گھیر لیتے۔ جیسے شمع کے گرد پروانوں کا ہجوم۔ کھیر چٹائی کی رسم ہوتی۔ دلھن کی ہتھیلی پر ذرا سی کھیر رکھ دی جاتی او دولھا سے کہا جاتا "چاٹو" جب وہ منہ ادھر لے جاتا تو کوئی ہٹا دیتا۔ خوب ہنسی پڑتی۔ کوئی فقرہ کستی "یہ کیسا ندیدہ دولھا ہے!" اور کوئی کہتی "کبھی کھیر نہیں چکھی" تھوڑی دیر یہ تماشا ہوتا رہتا پھر تشت اور لوٹے میں پانی آتا۔ دلھن کا ایک پیر باہر نکال کر دولھا سے کہا جاتا "پیر دھو" برائے نام پانی ڈال کر رسم ادا کی جاتی۔ پھر رونمائی ہوتی سب عزیز مہمان روپیہ زیور وغیرہ دلھن کو دیتے۔ میراثنیں ڈھولک بجاتیں اور لہرا لہرا کر گاتیں۔

آیا ری لاڈو تیرا بنا بن آیا   منہہ مقنع سر سہرا براجے
اچھی بنو گھر لایا   اللہ نبی کا سایا

سہرے والا ری بنا۔ مرادوں پایا ری بنا۔ باوا پیارا ری بنا
آیا ری لاڈو

نا جوڑی گھونگھٹ کھول

(باقی آئندہ)

...الزماں خاور

...بچے کی بہادری

...چرانے کی ہے یہ کہانی
...مار کھانے کی عادت کا قصہ
...مسکراؤ نہ سننے سے پہلے
...ے کرا ہے تم شرارت کا قصہ
...مام کر بیٹھ جاؤ ذرا تم
...، آج تم کو بھری انجمن میں
...ہوں اپنی شجاعت کا قصہ
...سمجھو اسے جھوٹ سچ کہہ رہا ہوں
...ن سے تعلق مری ذات کا ہے
...د اچھی طرح ہے یہ قصہ
...رے ہیں صرف اس کو چوبیس گھنٹے
...تا نہیں ہے یہ کل رات کا ہے
...نا مسہری پہ سویا ہوا تھا
...ہرے خوابوں میں کھویا ہوا تھا
...بخت نے آ کے مجھ کو جھنجھوڑا
...ے سارے سپنوں کے شیشوں کو توڑا

مجھے خواب سے پہلے اس نے جگایا
میری نیند کو پہلے اس نے اڑایا
بگل جنگ کا زور سے پھر بجایا

مرا خون پینے کا اعلان کر کے
لڑائی کا سو طرح سامان کر کے
مری سمت کم بخت آیا جھپٹ کر
لگا وار کرنے مسلسل پلٹ کر

رعونت سے وہ مجھ کو دھمکا رہا تھا
بڑا اپنی طاقت پہ اترا رہا تھا
مگر میں بہادر، نہ تھا ڈرنے والا
کھڑا ہو گیا میں بھی میدان میں ڈٹ کر

نہ بندوق تانی نہ گولی چلائی
مسہری کے نیچے تھی جوتی اٹھائی
وہیں میں نے بس اس کے سر پہ جمائی

پڑا ہاتھ ایسا کہ ٹھنڈا ہوا وہ
مجھے مارنے کے لئے آ گیا تھا
خدا کا مگر شکر ہے مر گیا وہ

یہ قصہ ہے میری شجاعت کا یارو
کہ کل رات میں نے مسہری سے اٹھ کر
بڑی شان کے ساتھ مارا ہے مچھر!

مینڈک کی ٹرٹر



بھگوان نے زمین پر مینہہ برسانا بند کر دیا۔ زمین پر ہرے بھرے پودے سوکھ گئے۔ یوں سمجھو جیسے ساری دنیا ریگستان ہوگئی۔ دریا خشک ہوگئے۔ ندی نالوں میں پانی نہ رہا۔ بڑے بڑے سمندر بھی چھوٹے چھوٹے تالاب سے نظر آنے لگے۔ زمین پر رہنے والے جانور کیا، چرند کیا پرند سب حیران، پریشان! خوب روتے دھوتے واویلا مچاتے مگر ان کی فریاد سننے والا کون تھا؟۔

بے چارا مینڈک سب سے زیادہ پریشان ہوا۔ سوچنے لگا کہ اس مصیبت سے کیسے چھٹکارا ہو؟ سوچتے سوچتے کئی دن یونہی گزر گئے۔ اچانک اسے خیال آیا کیوں نہ بھگوان کے ہاں جاکر فریاد کی جائے۔ بس یہ خیال آتے ہی وہ خوشی سے ناچنے لگا۔ اس کا مرجھایا ہوا چہرہ کھِل اٹھا۔ اور "اب تو پانی برسے گا" "اب تو پانی برسے گا" گاتا ہوا بھگوان سے ملنے چل پڑا۔

اچھلتا کودتا چلا جا رہا تھا کہ راستے میں شہد کی مکھیوں سے مڈبھیڑ ہوگئی ان روتی صورت شہد کی مکھیوں نے پوچھا "کیا بات ہے بھائی مینڈک، تم اتنے خوش کیوں ہو؟ یہاں تو یہ حال ہے کہ پانی نہیں برسا پودے سوکھ گئے۔ پھول نہیں کھِل رہے ہیں۔ اور ہم شہد کے لیے ترس رہے ہیں، مگر تم ہو کہ جیسے کسی چیز کی فکر ہی نہیں"

مینڈک خاموشی سے سب سنتا رہا پھر بولا "اری پگلیو! ابھی تو میں بھگوان کے یہاں فریاد کرنے جا رہا ہوں، اوپر والا ہماری ضرور سنے گا۔ ہماری حالت پر رحم کھائے گا اور پھر جلد ہی مینہہ برسائے گا۔ تب پھول کھِل اٹھیں گے۔ اور تم سب شہد جمع کر سکو گی"

مکھیاں اس عجیب سی تدبیر سے بڑی خوش ہوئیں ایک دوسرے سے صلاح مشورہ کیا۔ اور ایک مکھی بولی "ہم سب تمھارے ساتھ چلیں گے۔ بھگوان کے حضور میں التجا کریں گے۔ شاید بھگوان کو ہم پر رحم آجائے اور ہماری یہ درخواست منظور ہوجائے"

بس پھر کیا تھا۔ میاں مینڈک خوش ہوگئے۔ انھیں ساتھی سنگھی جو مل گئے تھے! آگے آگے میاں مینڈک ان کے پیچھے ناچتی گاتی مکھیوں کی ٹولیاں چلنے لگیں۔ کچھ دور آگے بڑھے تو میاں مینڈک نے دیکھا کہ میاں مرغ ایک دیوار پر بیٹھے اونگھ رہے ہیں مینڈک نے للکارا "ارے بھائی ککڑوں کوں مفت میں پریشان ہوتے ہو۔ تمھیں جلد ہی دانا پانی ملنے لگے گا۔ کیڑے مکوڑوں کی ریل پیل ہوجائے گی خوب مزے سے چن چن کر کھانا۔ ہم بھگوان کے پاس التجا کرنے جا رہے ہیں، دیکھو مینہہ ضرور برسے گا" مرغ نے پہلے ایک آنکھ کھولی پھر دوسری آنکھ کھولی۔ جھٹ سے مینڈک کے پاس آدھمکا۔ کہنے لگا "تم اوپر والے سے ملنے جا رہے ہو ہمیں بھی ساتھ لے لو۔ تمھاری طرح پانی کی ہمیں بھی ضرورت

ہم سب مل کر بھگوان سے فریاد کریں گے تو
ہی فریاد سُنے گا۔ مینڈک نے آنکھیں
رغ بھی قافلے میں شامل ہو گئے۔

بلا چل قافلہ ایک جنگل میں پہنچا۔ یہاں
شیر انھیں دیکھ کر غرّانے لگا بولا "یہ کیا
ری دنیا فاقہ کر رہی ہے۔ تم لوگ
اتے پھر رہے ہو؟" مینڈک میاں نے
" اے جنگل کے بادشاہ ہم لوگ سورگ
یں تاکہ بھگوان کو زمین والوں کی حالت
رش کے لیے درخواست کریں تاکہ سب کا
ھیں چمک اٹھیں" تب تو میں بھی
گا۔ بھگوان ہم سب کی ضرور سُنے گا"
نے کہا "تو اچھے کام میں دیر کس بات
ں"

مینڈک کے پیچھے مکھیاں۔ مکھیوں کے
کے پیچھے شیر۔ سب کئی دن اور رات
۔ تب کہیں وہ لوگ سورگ (جنت)
مشکل آ کھڑی ہوئی۔ محل کے چوکیدار نے
ت نہ دی۔ اور کہنے لگا "بھگوان بہت
سے کوئی بھی ان سے نہیں مل سکتا"
کی سننے والے تھے۔ چوکیدار دوسروں
وہ نظر بچا کر چپکے سے اندر گھس گئے۔
تک پہنچ ہی گئے جہاں بھگوان بیٹھے
[illegible]

اُچکے تو بھگوان کی رکابی میں! بھگوان کو بڑا تاؤ آیا۔
"یہ کیا بدتمیزی ہے"؟ مینڈک بولا "بھگوان زمین پر
کئی مہینوں سے پانی نہیں برسا۔ ہم سب فاقوں سے مرے
جارہے ہیں۔ میں آپ سے گذارش کرنے آیا ہوں کہ بارش ہو
اور ہم سب زندہ رہیں" پر بھگوان تھے کہ غصّے سے لال ہو رہے
تھے۔ بولے "مگر تم نے میرے کھانے کو خراب کیوں کیا"؟
اور دربان کو حکم دیا "اسے اٹھا کر زمین پر پھینک دو"
ایک دربان آگے بڑھا۔ مینڈک کو پکڑ لیا، اٹھا کر باہر لے
آیا۔ شہد کی مکھیوں نے مینڈک کا یہ حال دیکھا ان سے نہ
رہا گیا۔ سب نے مل کر دربان پر حملہ کر دیا۔ مکھیوں کے
ڈسنے سے دربان ڈر گیا۔ اور مینڈک کو وہیں چھوڑ کر اندر
بھاگ گیا۔ بھگوان نے دربان کا یہ حال دیکھا تو انھیں اور
بھی غصّہ آیا۔ مینڈک کو سزا دینے کے لیے آندھی کو اشارہ
کیا تاکہ مکھیاں گھبرا کر بھاگ جائیں۔ آندھی بڑے زور سے
چلنے لگی۔ بادل گرجنے لگے تب میاں مرغ کو خیال آیا کہ اب
یقینی بارش ہوگی۔ وہ زور زور سے ککڑوں کوں کرنے لگا۔
اس کا شور آندھی نے سُنا تو وہ ڈر کر محل میں بھاگ گئی۔
بھگوان نے آندھی کو بھاگتے دیکھا تو اپنے پالتو کتّے کو مینڈک
کی بوٹیاں نوچنے کے لیے چھوڑ دیا۔ بہادر کتّا باہر نکلا اور
بے چارے مینڈک پر لپکا۔ مگر بھوکے شیر نے ہمّت دکھائی۔
کتّے پر اچھلا۔ وہ ڈر کر بھوں بھوں کرتا ہوا اندر بھاگ گیا۔
بھگوان اب کھانا کھا چکے تھے۔ غصّہ بھی ختم ہو گیا تھا۔
انھوں نے مینڈک کو بلایا اس کی فریاد سنی اور وعدہ کیا
[illegible]

جناب محمد مسعود صدیقی

فلائنگ ڈاکٹر

ایک دن ہمارے جغرافیہ کے استاد اپنے ساتھ ایک مہمان کو لے کر آئے۔ شکل وصورت سے یہ انگریز اور مسافر معلوم ہوتے تھے۔ ہمارے استاد نے ان کا تعارف کرایا۔ "یہ ہیں مسٹر جون شا۔ سڈنی آسٹریلیا کے رہنے والے ہیں۔"

تمام بچوں نے کھڑے ہوکر ان کا استقبال کیا۔ مسٹر جون شا نے مسکرا کر اور ہاتھ ہلا کر بچوں کا شکریہ ادا کیا۔ بچوں کو آسٹریلیا کے بارے میں بہت سی باتیں بتائیں اور پھر پورے کلاس کو مخاطب کر کے کہا۔

"کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آسٹریلیا کس چیز کے لیے مشہور ہے؟"

ایک بچے نے فوراً کھڑے ہو کر جواب دیا۔ "کنگارو کے لیے۔"

مسٹر شا نے کہا "بہت خوب، بہت خوب اور کس چیز کے لیے؟"

ایک لڑکی نے جواب دیا۔ "سیب اور ناشپاتی کے لیے۔"

مسٹر شا نے کہا۔ "بالکل درست، بالکل ٹھیک اور؟"

ایک لڑکے نے جواب دیا۔ "بھیڑوں اور مویشیوں کے لیے۔"

مسٹر شا نے کہا: "شاباش، اور؟"

ایک بچے نے کہا "خالص شہد کے لیے، خالص مکھن کے لیے۔ کرکٹ کے کھلاڑیوں کے لیے۔" غرض مسٹر شا نے بہت سے سوال کیے، بچوں نے ان سب کے جواب ٹھیک ٹھیک دیے جو کچھ معلوم تھا سب بتا دیا۔ مگر کب تک آخر میں جو انھوں نے "اور؟" کہا تو کلاس کے لڑکے لڑکیاں سوچتے رہے۔ غور کرتے رہے۔ کبھی چھت کی طرف دیکھتے، کبھی خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف اشارے کرتے۔

مسٹر شا نے جب دیکھا کہ کوئی جواب نہیں دے رہے تو انھوں نے کہا: "میں آپ کو ایک ایسی بات بتانا چاہتا ہوں جس کے لیے آسٹریلیا مشہور تو ہے، لیکن عام طور پر جغرافیے کی کتابوں میں اس کا ذکر نہیں کیا جاتا۔ یہ بات آسٹریلیا کے فلائنگ ڈاکٹروں کے بارے میں ہے۔ آسٹریلیا کے زیادہ شہر، قصبے اور آبادیاں ساحل پر واقع ہیں خاص طور پر آسٹریلیا کے مغربی ساحل پر۔"

"بہت دنوں تک آسٹریلیا کا بہت بڑا علاقہ غیر آباد تھا، لیکن اس غیر آباد علاقے میں زبردست چراگاہیں تھیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ مویشی پالنے والے ان چراگاہوں آباد ہونے لگے۔ انھوں نے ان چراگاہوں میں مویشیوں کے لیے بڑے بڑے باڑے (رانچ) بنا لیے۔ ان باڑ

والوں کو رانچر کہتے ہیں۔ قدرتی بات یہ ہے کہ یہ
نے کنبوں کے ساتھ آباد ہو گئے اور ان علاقوں میں
یں۔ ان آبادیوں کے مقامات کو رانچ اسٹیشن کہتے
یا بہت بڑا ملک ہے۔ رانچ بہت لمبے چوڑے
پھیلے ہوئے ہیں۔ ایک رانچ اسٹیشن سے دوسرے
کا فاصلہ کئی سو میل کے قریب ہوتا ہے۔ ان کے
تے نہیں ہیں، ٹیلیفون لائنیں نہیں ہیں، ان کے
اور موٹریں بھی نہیں چلتیں۔ اس لیے رانچوں میں
بیماریوں سے بہت ڈرتے تھے۔ قریب ترین ڈاکٹر
کے فاصلے پر ہوتا تھا۔ شدید بیماری کی حالت میں
طور پر ختم ہو جاتا تھا۔"

آسٹریلیا کی حکومت نے محسوس کیا کہ ان بہادر
یے جو دور دراز علاقوں میں، چراگاہوں میں رہتے
کرنا چاہیے۔ ان چراگاہوں سے آسٹریلیا کو
دولت حاصل ہوتی ہے۔ ان کے مویشیوں سے حاصل
چیزیں تمام دنیا میں فروخت ہوتی ہیں۔ رانچ
میں پھیلے ہوئے ہیں اس لیے ان تک پہنچنے کا آسان
جہاز ہو سکتے ہیں۔"

تو بھی ان رانچوں کے درمیان ایک ہوائی سروس
۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دور دراز کے رانچ اسٹیشنوں
روں کو طبی سہولتیں پہنچائی جا سکیں، باوجود اس کے
ڈاکٹروں کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ ہر رانچ میں
ری کے علاج کے لیے پہنچ سکیں۔ ہر رانچ اسٹیشن پر
ایک صندوق موجود رہتا ہے۔ اس میں رکھی ہوئی
دواؤں پر بڑی احتیاط سے نمبر لکھے ہوتے ہیں۔ معمولی بیماری کی حالت میں رانچر ریڈیو کے ذریعے ڈاکٹر سے مشورہ کرتا ہے۔ بیماری کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرنے کے بعد ڈاکٹر رانچر کو بتاتا ہے کہ اسے کس نمبر کی دوا استعمال کرنا چاہیے۔ اس طرح ڈاکٹر ان مریضوں کو زیادہ سے زیادہ وقت دے سکتا ہے جن کی بیماری خطرناک ہوتی ہے اور وہ ان کے رانچوں میں پہنچ کر ان کا علاج کر سکتا ہے۔"

"فلائنگ ڈاکٹر سروس" کی وجہ سے آج آسٹریلیا کے رانچر اطمینان کے ساتھ دور دراز علاقوں میں زندگی گزار رہے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ ضرورت کے وقت چند گھنٹوں کے اندر اندر ان کے لیے طبی امداد پہنچ سکتی ہے۔"

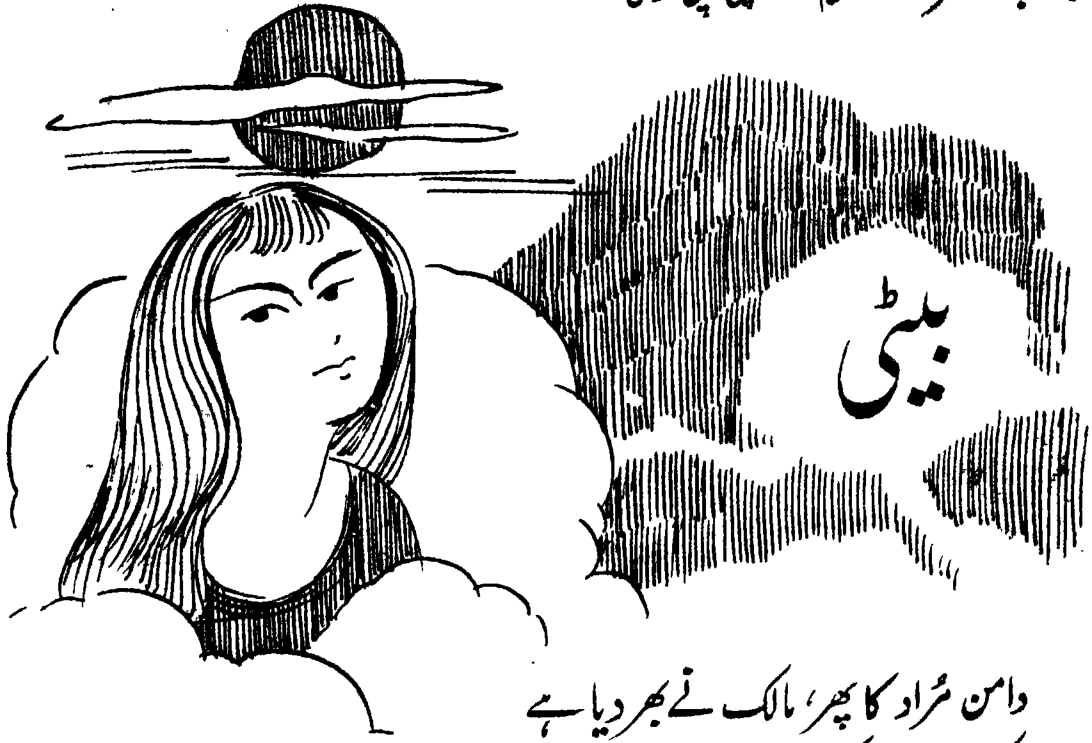
مسٹر شا اپنی گفتگو ختم کر چکے تھے۔ انھوں نے کلاس کے بچوں پر ایک نظر ڈالی اور کہا "کیا آپ کوئی سوال کرنا چاہتے ہیں؟"

تمام لڑکے اور لڑکیاں خاموش تھے۔ نجمہ اپنا سر کھجا رہی تھی۔ جغرافیہ کے استاد نجمہ کی عادت سے واقف تھے۔ انھوں نے کہا "ہاں نجمہ تم کیا پوچھنا چاہتی ہو؟"

نجمہ نے کہا: "جی نہیں میں تو صرف یہ سوچ رہی تھی کہ ان رانچوں میں رہنے والے بچے اسکول کیسے جاتے ہوں گے؟"

مسٹر شا نے کہا "بہت اچھا سوال ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ رانچوں میں رہنے والے بچے اسکول نہیں جاتے بلکہ اسکول ان کے رانچوں میں آتے ہیں۔" بھلا اسکول بچوں کے پاس آتے ہیں! پورا کلاس ایک دوسرے کو حیرت سے تک رہا تھا۔ مسٹر شا نے کہا "جی ہاں۔ اسکول بچوں کے پاس آتے ہیں،

جناب ڈاکٹر امانت ایم اے، پی ایچ ڈی



بیٹی

دامن مُراد کا پھر، مالک نے بھر دیا ہے
اک چاند سا کھِلونا، ہم کو عطا کیا ہے



صبحِ بہار آئی! صبحِ بہار آئی!!
روزِ نشاط لائی، دل کش پیام لائی

آنکھوں کا نور بیٹی، دل کا سرور بیٹی
وجہِ غرور بیٹی، جنت کی حُور بیٹی

اپنی انوکھی بولی، ہنس ہنس کے بولتی ہے
یا گود میں ہماری، موتی سے رولتی ہے

دِل سے نکل کے لب پر، آئی دعا امانت
"شمعِ مراد" اپنی، اللہ رکھے سلامت

چیتا

جناب عبداللطیف اعظمی



ابھی اندھیرا ہی تھا۔ پوری طرح اُجالا نہیں ہوا تھا
ـنے شور مچانا شروع کیا "جلدی اٹھو، ناشتہ کرکے
لد چڑیا گھر جانا ہے اور آج زیادہ سے زیادہ جانور
ہے۔" ہڑبڑا کر سبھی اٹھ بیٹھے۔ مگر جاوید کو اُٹھانا آسان
ں تھا۔ صبح کو دیر سے اُٹھنا ان کی سب سے بڑی کمزوری
، بے بچوں نے انھیں چھوڑا اور چڑیا گھر کے شوق
سیدھا ناشتہ کیا اور چل پڑے۔

اتفاق سے بس بھی تیار ملی اور ہم لوگ ایسے وقت
م پہنچ گئے جب بھیڑ بھاڑ کم تھی۔ خورشید رہنمائی کا
تھے، بار بار آ چکے ہیں، اور بہت سے لوگوں کو دکھلا

سب سے پہلے شیر ببر کی مصنوعی پہاڑی پڑی،
ے شیرنی اپنے بچوں کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ کچھ
لیے، مگر میں نے ان سے آگے بڑھنے کو کہا اور یاد دلایا
ب سے پہلے چیتا دیکھنا ہے، اور اس کا کٹہرا آ گئے
ہم لوگ وہاں پہنچے تو چیتے صاحب بڑی شان سے
ں فرما رہے تھے۔

چندروز پہلے اردو کے ایک روزانہ اخبار میں چیتے[1]
ن چھپا تھا، پروین اسے ساتھ لیتی آئی تھیں۔
انھوں نے جھٹ اخبار کھولا اور اس کی سرخی

پڑھنے لگیں۔ "چیتا چور بھی ہوتا ہے، خطرناک بھی اور خونخوار بھی۔" تزئین نے کہا "ابھی اپنے اخبار کو تہہ کرکے رکھ لیجیے۔ پہلے پھوپھا جان کو جو بتانا ہے وہ بتا لیں تو اخبار پڑھ کر سنا دیجیے گا۔ اور ہم لوگ بھی اطمینان سے سنیں گے۔ میں نے تزئین کی تائید کی اور بتانا شروع کیا۔ "ٹائگر اور شیر ببر کا حال سن چکے ہو، چیتے کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ تمام جانوروں میں سب سے زیادہ تیز دوڑتا ہے۔ ایکسپریس اور میل ٹرینیں عام طور پر چالیس میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتی ہیں۔"

"راجدھانی ایکسپریس تو سنا ہے کہ سَو میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتی ہے۔" خورشید نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ٹھیک ہے، ہندوستان اور پاکستان میں یہ پہلی ٹرین ہے جو اتنی تیز چلتی ہے۔" میں نے بتایا اور اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "اور کاریں عام طور پر ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلتی ہیں۔ مگر چیتا عام طور پر پچھتّر میل فی گھنٹے کی رفتار سے دوڑ سکتا ہے۔ پرانے زمانے میں ہندوستان کے بادشاہ ہرن کے شکار کے لیے چیتا پالتے تھے۔ اور شکار کے لیے انھیں خاص طور پر سدھاتے تھے۔ ایسے سدھائے ہوئے چیتے ایران، مصر اور پرانے یونان اور روم میں بڑے داموں پر بیچے جاتے تھے۔

---

[1] ـسے میں پیام تعلیم میں بھی کئی مضمون شائع ہو چکے ہیں

"چیتا زیادہ چالاک ہے یا ٹائیگر؟" نشاط نے دل چسپی لیتے ہوئے سوال کیا۔ "چیتا ٹائیگر کے مقابلے میں زیادہ ذہین اور چالاک ہے۔" میں نے جواب دیا "چیتے کی لمبائی چھ فٹ سے آٹھ فٹ تک ہوتی ہے۔ اور وزن تقریباً ۸۰ پونڈ۔ اس کا سر ٹائیگر سے چھوٹا ہوتا ہے، مگر ٹانگیں اس سے زیادہ لمبی اور پتلی ہوتی ہیں۔ اس چیتے کو دیکھو، براؤن رنگ پر کالی کالی چتیاں ہیں، مگر بعض لیپرڈ بالکل سیاہ ہوتے ہیں۔"

"لیپرڈ کیا چیز ہے؟" گڈو نے سوال کیا "اصل میں چیتے کی بہت سی قسمیں ہیں" میں نے جواب دیا۔ "لیپرڈ" انگریزی لفظ ہے ہندوستان میں اسے پینتھر کہتے ہیں۔ یہ بھی انگریزی لفظ ہے۔ ان دونوں کو اردو میں تیندوا کہتے ہیں۔ دراصل چیتے کی تمام قسمیں تیندوے ہی کے خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہاں تو میں لیپرڈ تیندوے کی بات کر رہا تھا۔ جو بالکل کالا ہوتا ہے۔ یہ ایران، جاوا اور افریقہ میں بھی پایا جاتا ہے۔"

"چیتا اپنے جسم کے لحاظ سے ایک بڑے کتے سے ملتا جلتا ہے۔ اس کے لمبے لمبے کان بھی کتے کے کانوں جیسے ہوتے ہیں، مگر چہرہ بڑی بلی کی طرح ہوتا ہے۔ اس کی دم بھی بڑی بلی کی دم کے مشابہ ہوتی ہے۔ گویا آدھا کتا آدھی بلی۔ مگر ہے بڑا خوب صورت۔ ہندوستان کے جنگلی جانوروں میں سب سے زیادہ خوب صورت ہے۔"

"چیتے کو بندروں کا گوشت بہت پسند ہے۔ اس لیے ان کو پکڑنے کی عجیب عجیب ترکیبیں کرتا ہے۔ ان ترکیبوں سے معلوم ہوتا ہے کہ چیتا بندروں کی عادت اور طبیعت سے خوب واقف ہے۔ کسی درخت پر بہت سے بندر رہتے ہوں تو ان پر کود کر حملہ کرتا ہے، وہ ڈر کر ادھر ادھر بھاگتے ہیں، اسی بھگدڑ میں ایک دو نیچے گر پڑتے ہیں اور وہ چیتے کے پیٹ میں پہنچ جاتے ہیں۔ یا وہ کسی جھاڑی میں اپنے آپ کو چھپا لیتا ہے۔ صرف دم باہر رکھتا ہے اور اس کو ادھر اُدھر ہلاتا ہے۔"

بندروں میں تجسس یا کھوج لگانے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ جب کوئی عجیب وغریب چیز دیکھیں گے تو قریب آکر اسے حیرت سے گھوریں گے، چیتا تاک میں رہتا ہے۔ جہاں اس کی دم دیکھ کر کوئی بندر قریب آیا، اور اس نے دبوچ لیا۔ تیسرا طریقہ اس سے بھی زیادہ دل چسپ ہے بندر کچھ بے وقوف بھی ہوتے ہیں۔ چیتا ان کی اس کمزوری سے بھی واقف ہوتا ہے۔ چنانچہ کسی کھلی جگہ پر چاروں ہاتھ اوپر کر کے اس طرح لیٹ جاتا ہے جیسے مر گیا ہو۔ بندروں کی اس پر نگاہ پڑے گی تو وہ ضرور قریب آئیں گے۔ جیسے ہی وہ قریب آئیں گے چیتا اُچھل کر ایک دو کو پکڑ لے گا۔"

"چیتے کے دو سے چار تک بچے ہوتے ہیں، جب یہ چار مہینے کے ہو جاتے ہیں تو ان کی ماں ان کو شکار کرنا سکھاتی ہے۔ کوئی بچہ جب اس کا حکم نہیں مانتا تو وہ اپنی دم سے ان کو سزا دیتی ہے۔"

"چیتا خطرے کے وقت بالکل نہیں گھبراتا۔ بڑی تیزی کے ساتھ گھاس میں چھپ جائے گا، یا کسی چٹان کی آڑ میں ہو جائے گا۔ کوئی درخت قریب ہو تو اس پر چڑھ

ے کے علاوہ ویسے بھی وہ اکثر درخت پر چھپ
۔ اگر کوئی جانور قریب پہنچ گیا تو وہ آسانی
ر کر لیتا ہے۔ اگر کوئی شکاری وہاں سے
ں کی چھپنے پر نظر نہ پڑے تو چیتا بھی اس سے
رے گا۔ لیکن اگر اس کی نگاہیں چار ہوئیں تو
ری سے اس پر جھپٹ پڑے گا"۔
ابھی چیتے کے متعلق ضروری باتیں معلوم
لو دوسرے جانور دیکھیں" میں نے کہا۔
ہار پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے، ورنہ ان کو
" نزہین نے یاد دلایا۔ "اچھا یاد دلایا میں
تھا" میں نے نزہین کی طرف دیکھ کر کہا۔
ارے اخبار میں کوئی اور بات ہے جو میں نے
(

پھوپھا جان!! اس میں لکھا ہے کہ" چیتے
راک کتے اور گدھوں کے بچے ہوتے ہیں"۔
ہ کر بتایا۔ "کتے کے شکار کے بارے میں لکھا
گاؤں کے نزدیک چھپ کر بیٹھ جاتا ہے۔
سے دیکھتا ہے تو بھونکنے لگتا ہے۔ چیتا سر
ی جگہ میں آجاتا ہے، اور سر جھکا کر بلی کی
ہے، اور وہیں رکا رہتا ہے، کتا کچھ حیران ہوتا
نا ہے اور جب اس کی زد میں آجاتا ہے تو
ا ہے اور کتے کو گردن سے دبوچ کر اسے
ہے"۔ یہ دلچسپ بات بھی لکھی ہے کہ
ے کتوں کا غول ہو تو چیتا ڈر کر بھاگ جاتا ہے"۔

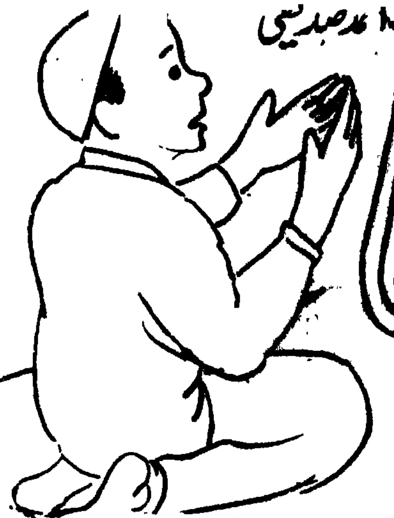
"اور کوئی نئی بات؟" میں نے پوچھا۔ "ہاں ایک
اور اس میں لکھا ہے کہ "اس کے پنجے زہریلے ہوتے ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ اگر چیتے کے پنجے سے کسی کے جسم پر معمولی خراش
بھی آجائے تو وہ عام طور پر مر جاتا ہے"۔

"ہاں بھئی تمہارے اخبار سے بہت سی نئی باتیں
معلوم ہوئیں، اچھا اب آگے بڑھو، ابھی بہت سے جانور
دیکھنے ہیں" میں نے اٹھتے ہوئے کہا اور تمام بچے میرے
ساتھ آگے بڑھے۔

(اگلے شمارے میں ریچھ کے بارے میں پڑھیے گا)



جناب سیف احمد صدیقی



دعا

سالانہ امتحاں پھر سر پر کھڑا ہے یارب
پھر مجھ کو پاس کردے تجھ سے دعا ہے یارب

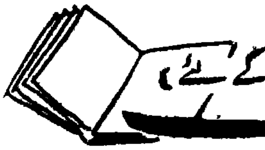
پہلے برس بھی تو نے مجھ پر کرم کیا تھا
بندے کو سال بھر کی محنت کا پھل دیا تھا
پھر کامیاب کردے یہ التجا ہے یارب

یوں تو ہے یاد مجھ کو ہر اک سبق زبانی
لیکن میں چاہتا ہوں اک تیری مہربانی
تیری عنایتوں کا ہی آسرا ہے یارب
سالانہ امتحاں پھر سر پر کھڑا ہے یارب

جس کام میں بھی تیری ہوتی نہیں ہے مرضی
پاتا نہیں ہے اس میں انسان کامیابی
ہر کام تیری مرضی ہی سے بنا ہے یارب

سالانہ امتحاں پھر سر پر کھڑا ہے یارب
پھر مجھ کو پاس کردے تجھ سے دعا ہے یارب

جناب حا[illegible]



کتاب

(بڑے پیارے بچوں کے لئے)

جگمگاتے علم کے موتی مرے دامن میں ہیں
رنگ جھلکاتے مہکتے گل مرے گلشن میں ہیں
علم کے انمول ہیروں کی دمکتی کان ہوں
اور ہر پروانۂ علم و ہنر کی جان ہوں
شمع ہے علم اور میں اس شمع کا فانوس ہوں
علم کا نغمہ جو گاتا ہو وہی ناقوس ہوں
مجھ میں ہیں محفوظ صدیوں کے پرانے واقعات
مجھ میں قصوں اور فسانوں کی بسی ہے کائنات
علم و حکمت کے خزانوں کا امیں ہے میرا دل
میں نہ ہوتی تو نہ ہوتا علم تم تک منتقل
مجھ میں ہیں لکھے ہوئے پیغام ربِ پاک کے
سچ جو پوچھو تو یہ ہیں انعام ربِّ پاک کے
جس سے باقی ہے نشانِ علم و فن ہے میری ذات
جس سے ہے شاداب حکمت کا چمن ہے میری ذات
میں ہوں تنہائی کی ساتھی میں ہوں انساں کی شفیق
میرے ہی دم سے تو پاتے ہیں سکوں میرے رفیق
چاہتے ہیں جو مجھے ہوتے ہیں وہ سب کامیاب
پیارے بچو! میں تمہاری ہوں وہی پیاری کتاب

مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

ں ہزار اشرفیاں۔ شمس الدین اندگانی حکیم اور
ما۔ بادشاہ کی تعریف میں ستائیس شعروں کا فارسی
پڑھا۔ بادشاہ نے ہر شعر کے عوض ہزار اشرفیاں
ور چٹکی بجاتے ہوئے ستائیس ہزار اشرفیاں بخش دیں۔

ہزار روپیہ شیراز کو

قاضی مجدالدین شیرازی
اس سے پہلے میں نے
ہے ان کے پاس دس ہزار روپے شیراز بھیج دیے۔

ں ہزار اشرفیاں

برہان الدین ایک سخی واعظ
تھا۔ جو کچھ پاس ہوتا بھوکوں
پتا۔ نہ ہوتا تو قرض لے کر سخاوت کرتا۔ بادشاہ نے
ذکر سنا تو چالیس ہزار اشرفیاں بھیجیں اور ہندوستان
کے لیے لکھا۔

برہان الدین نے اشرفیاں لے کر اس پر جتنا قرضہ
کر دیا۔ اور بادشاہ کو لکھ بھیجا کہ آپ اپنے سامنے علماء
رکھتے ہیں اس لیے میں آپ کے پاس نہیں آسکتا۔
ں طرف چلا گیا۔

ں خلفاء کی اولاد

ہم نے سمرقند کے حالات میں
ذکر کیا ہے کہ [illegible]
عنہ کے مرقد مبارک کا اہتمام سلطان [illegible]

کر رکھا ہے۔

امیر غیاث الدین نے بادشاہ ہند کی تعریفیں سنیں اور یہ سنا کہ شاہ ہند عباسیوں سے محبت رکھتا ہے تو محمد ہمدانی صوفی کو شاہ ہند کے پاس بھیجا۔ واعظ ترمذی سے بادشاہ نے پوچھا تو اس نے تصدیق کی کہ بے شک امیر غیاث الدین صحیح النسب عباسی ہے اور خلفاء عباس کی اولاد میں ہے۔ بادشاہ نے پانچ ہزار اشرفیاں قاصدوں کو دیں۔ اور غیاث الدین کو اپنے ہاتھ سے خط لکھا کہ ہندوستان آجائے۔ زادِ راہ کے نام سے تیس ہزار اشرفیاں بھیجیں۔

غیاث الدین کو خط ملا تو ہندوستان روانہ ہو گیا۔ سندھ پہنچا اور بادشاہ کو اخبار نویس نے امیر غیاث الدین کے آنے کی اطلاع دی تو بادشاہ نے دستور کے مطابق استقبال کے لیے آدمی بھیجے۔ امیر غیاث الدین سرسہ پہنچا تو۔ قاضی کمال الدین صدر جہاں کو حکم دیا کہ علماء کی جماعت ساتھ لے جا کر غیاث الدین کا استقبال کریں۔ مسعود آباد پہنچنے کی اطلاع ملی تو بادشاہ مع امیروں کے خود استقبال کو گیا۔ غیاث الدین بادشاہ کو دیکھ کر گھوڑے سے اترا تو بادشاہ بھی گھوڑے سے اتر گیا۔ اور جب دستور کے مطابق غیاث الدین نے زمین بوسی کی تو بادشاہ بھی زمین بوس ہوا۔

میں کپڑوں کے تھان بھی تھے۔

نذر پیش کی تو بادشاہ نے احتراماً ایک تھان کندھے پر ڈال لیا اور سلام کیا۔ گھوڑے آئے تو گھوڑا پکڑ کر غیاث الدین کے سامنے کھڑا ہو گیا اور قسم دے کر غیاث الدّین کو سوار کیا۔ اور خود رکاب تھام کر کھڑا ہو گیا۔ پھر شاہی چھتر دونوں کے لیے آئے۔ غیاثؔ الدین کو بادشاہ نے بہ نفس نفیس پان پیش کیا۔ اور یہ سب سے بڑھ کر تواضع تھی۔ شاہی خیمہ میں ٹھہرایا اور اپنا خیمہ الگ نصب کرایا۔ تین سو اشرفیاں روزینہ مقرر کیا۔ اور وہ محل جسے سلطان علاء الدین خلجی اور قطب الدین خلجی نے تیار کرایا تھا رہنے کے لیے دیا۔ پھر اس محل میں امیر کو لے کر پہنچ گیا۔ اور جس جس سامان کی محل میں کمی دیکھی گھڑی کی گھڑی میں مہیا کر دیا۔ سیری کا پورا شہر مکانات، باغ، زمین اور گودام جاگیر میں دیے۔ سو گاؤں اس کے علاوہ دیے۔

بتیس ۳۲ خچر، ساز و سامان سمیت بھیجے۔ جن کا دانا چارہ سرکاری گودام سے دیا جانا تجویز ہوا۔

سونے چاندی کے برتنوں کے علاوہ غسل کے لیے سونے کا ایک حمام بھی دیا۔ اور چار لاکھ اشرفیاں بھیج دیں۔ حکم دیا کہ امیر غیاث الدین محل میں آئے تو گھوڑے سے نہ اترے۔ سب کو حکم دیا کہ جس طرح بادشاہ کی تعظیم کرتے ہیں۔ امیر غیاث الدین کی تعظیم بھی کریں۔ اس سلسلے میں ایک حیرت انگیز واقعہ بھی سن لیجیے۔

ابھی ہم نے ذکر کیا ہے کہ سیری کا پورا شہر امیر غیاث الدّین کو دیا گیا تھا۔ حاکم غزنین جس کا نام بہرام تھا آیا تو بادشاہ نے اس کے قیام کے لیے سیری میں ایک محل تجویز کیا۔ حاکم غزنی سے امیر غیاث الدّین کی پہلے سے مخالفت تھی۔ غیاث الدّین نے جب یہ سنا تو گھوڑے پر سوار ہو کر شاہی محل میں پہنچا اور وزیروں کو بلا کر کہا "سلطان سے کہہ دو کہ اب تک جو کچھ آپ نے دیا ہے وہ سب میرے محل میں موجود ہے۔ ماشاء اللہ کچھ کم نہیں ہوا۔ اب میں یہاں رہنا نہیں چاہتا ہوں"۔ یہ کہہ کر محل سے چل دیا۔ وزیر نے سلطان کو خبر کر دی۔ سلطان گھبرا گیا۔ اور دس آدمی ساتھ لے کر غیاث الدّین کے محل پر پہنچا اور اجازت طلب کی۔ پھر غیاث الدین سے معافی مانگی، اور فقط معافی پر بس نہ کی بلکہ یہ کہا "جب تک آپ میری گردن پر پاؤں نہ رکھیں گے مجھے یقین نہ آئے گا کہ آپ نے مجھے معاف کر دیا ہے"۔ اور اپنے سر کی قسم دے کر مجبور کیا اور پھر زمین پر گردن ڈال کر لیٹ گیا۔ ملک قبولہ نے یہ رنگ دیکھا تو امیر غیاث الدّین کا پاؤں اٹھا کر بادشاہ کی گردن پر آہستہ سے رکھ دیا اور بادشاہ یہ کہتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا کہ "اب مجھے یقین ہو گیا کہ آپ خوش ہو گئے ہیں"۔

امیر غیاث الدین کی داستان کا عبرتناک حصہ یہ ہے کہ ہندوستان سے جانے کے بعد میں بغداد کے مدرسہ مستنصریہ کے دروازے پر بیٹھا تھا۔ میں نے ایک شکستہ حال نوجوان کو دیکھا کہ ایک آدمی کے پیچھے پیچھے جا رہا ہے۔ مدرسہ کے ایک طالب علم نے مجھ سے کہا کہ یہ امیر غیاث الدّین کا بیٹا ہے جو شاہِ ہند کا مقربِ خاص ہے۔ میں نے نوجوان کو آواز دی اور کہا "یہ ہندوستان سے آیا ہے" نوجوان

باپ کی خیریت کا خط آگیا ہے" اور پھر اسی
بھاگا۔ طالب علم نے بتایا کہ یہ نوجوان مسجد
ہے۔ اور روزانہ ایک درہم اسے ملتا ہے۔ جیل
سے ایک درہم کا تقاضہ کر رہا ہے۔ بے چارا

ں شخص کا بیٹا تھا کہ اگر وہ اسے اپنی خلعت
دیتا تو یہ مال دار ہو جاتا۔
ہ کی داد و دہش پر غیاث الدین کا یہ حال تھا
نے اسے دیکھا ننھا کھاتے دیکھا۔ میں نے
رخوان پر کسی کو شریک کیوں نہیں کرتے؟"
ں دیکھ سکتا کہ میرے دسترخوان پر بہت
جائیں۔"

ہمیں

امیر سیف الدین اسی خاندان سے
سی خلفا کی مدد کی تھی۔ عباسی خلفا ر
خاص عقیدت تھی۔ اس لیے جو بھی کوئی
متعلق اس کے ساتھ سلوک کرتا۔
یف الدین کے ساتھ سب سے بڑا سلوک
فیروزہ سے شادی کر دی۔
س بے چارے سیف الدین کا نہ کوئی عزیز
شادی کی تجویز کے ساتھ بادشاہ نے حکم دیا

گ سات سو برس پہلے ہندوستان میں رائج
اب" والے مضمون میں شادی کی رسموں کا

کہ اس کی ماں، پھوپی، خالہ بیگمات میں سے منتخب کی جائیں۔ جو شادی کی رسمیں اس طور پر انجام دیں کہ سیف الدین کو اپنی بے کسی محسوس نہ ہو۔ اور خوش و خرم تمام رسمیں پوری ہو جائیں۔

قدر افزائی یہ کی کہ اپنی سوتیلی ماں کو جو مبارک خاں کی حقیقی والدہ تھی۔ سیف الدین کی ماں بنایا اور دوسری شاہی بیگمات کو خالہ پھوپی تجویز کیا۔ اور اس طرح سے سیف الدین کا پورا خاندان بنا دیا۔ ماں پھوپی اور خالہ نے دولہا کو چوکی پر بٹھایا اور مہندی لگائی۔ بیگمات مہندی لگاتی رہیں اور گانے والیاں نغمے اور موسیقی کے کمال دکھاتی رہیں۔ مہندی لگ چکی تو دولہا اپنے دوستوں کے پاس باہر چلا گیا۔ اور بیگمات دلہن کے پاس محل سرائے میں چلی گئیں۔

مغرب بعد دولہا کا جوڑا آیا۔ اس پر جواہرات کا اتنا جڑاؤ تھا کہ کپڑا نظر نہ آتا تھا۔ کُلاہ (ٹوپی) بھی ایسی ہی جڑاؤ تھی۔

بادشاہ کا داماد عماد الدین سمنائی صدر جہاں کا بیٹا تھا۔ مگر اتنا قیمتی جوڑا اسے بھی نہیں ملا تھا۔ پھر سہرا آیا۔ سہرا تاج کے مشابہ تھا۔ چنبیلی رائے بیل کے پھولوں سے گندھا ہوا۔ سیف الدین نے سہرے کو دیکھ کر منہ بنایا مگر باندھنا پڑا۔ پھر اپنے ساتھیوں اور غلاموں کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر دلہن کے گھر کی طرف چلا۔ ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی، امیروں میں کچھ دلہن والوں کے ساتھی تھے اور کچھ دولہا والوں کے ، دولہا دلہن کے دروازے پر پہنچا تو دلہن والوں کی جماعت

والے انھیں روکیں۔ دولھا والے غالب آجاتے ہیں تو اندر چلے جاتے ہیں۔ مغلوب ہو جاتے ہیں تو (بطور جرمانہ) ہزاروں روپیہ خرچ کرنے پڑتے ہیں تب کہیں اندر جانے دیا جاتا ہے۔

دلھن والوں کے گھر پر سیف الدین پہنچا تو عربی طرز پر حملہ کیا۔ اور ایک ایک کو پچھاڑ کر بھگا دیا۔ بادشاہ کو یہ خبر پہنچی تو بہت خوش ہوا۔ پھر سیف الدین گھوڑے پر سوار محل میں چلا گیا اور کسی کو روکنے کی ہمت نہ ہوئی۔

صحن میں پہنچا تو وہاں دیبا سے منڈھا ہوا جواہرات سے آراستہ ممبر بچھا تھا جس پر دلھن کو لاکر بٹھا دیا گیا۔ گانے والی عورتیں گاتی اور ناچتی جاتی تھیں اور تکبیریں کہتی جاتی تھیں۔

سیف الدین ممبر تک گھوڑے پر آیا اور پھر گھوڑے سے اتر کر ممبر کی پہلی سیڑھی پر زمین بوس ہوا۔ دلھن کھڑی ہو گئی اور دولھا کو اپنے ہاتھ سے پان پیش کیا۔ ممبر کے جس درجہ پر دلھن بیٹھی تھی دولھا اس سے ایک درجہ نیچے بیٹھ گیا۔ پھر دولھا دلھن کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور دلھن اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگی، دولھا گھوڑے پر سوار ہوا اور دلھن کو ڈولے میں بٹھا دیا۔ بیگمات گھوڑ پر سوار ہوئیں۔ یہ جلوس چلا تو چاندی اور سونے کے سکوں کی بکھیر ہوتی جا رہی تھی۔ راستے میں کسی امیر کا گھر آجاتا تو امیر باہر آکر دولھا دلھن پر سونے یا چاندی کی بکھیر کرتا۔ دوسرے دن دلھن نے دولھا کے دوستوں کو قیمتی جوڑے اور ہر ایک جوڑے کے ساتھ نقدی بھی۔ اور بادشاہ کی طرف سے بھی ساز و سامان سمیت گ اور نقدی کی تھیلیاں آئیں کسی میں دو سو کسی زیادہ اور کچھ ایسی تھیں جن میں ہزار اشرفیاں تھیں ہر ایک کے مرتبے کے مطابق رقمیں تھیں۔ بیگمات لیے ریشمی جوڑے اور اشرفیوں کی تھیلیاں الگ آ اور شادی بخیر و خوبی انجام پا گئی۔ (باقی آئندہ)

بقیہ بچوں سے باتیں

ہیں۔ برادرم شاہد علی خاں صاحب (مکتبہ جامعہ بمبئ کی کوششوں سے اس مہینے لگ بھگ ۵۰ خریدار اور ہوئے ہیں۔ ہمارے چھوٹے پیامیوں میں بھی اپنے پرچ خریدار بڑھانے کا شوق پیدا ہو رہا ہے۔ محمد ضیاء الحس ہیڈ ماسٹر دھوہ ہائی اسکول کو عزیزی فیروز اعظم نے اسکول کے لیے پیام تعلیم کی خریداری کے لیے آمادہ ک اس مثال سے دوسرے پیامی بھی سبق لیں تو پیام ت اشاعت دیکھتے دیکھتے کہاں سے کہاں تک پہنچ جا

ان کے علاوہ منظور محمد خاں اور عرفان (دہرہ دون) اردو پرائمری اسکول ملادگی (میسور) الدین کنک (اڑیسہ) اسلامیہ ہائی اسکول میل وشا (تامل ناڈو) ہائی اسکول سورٹھیا (بہار) انجمن تربیت کنتھاریا (گجرات) خواتین دکن لائبریری (حیدرآباد) پرلشید ہائی اسکول کاغذ نگر (آندھرا پردیش) خود بنے ہیں۔



اگر آپ ”سینفورائزڈ“ لیبل کے پیچھے جھانک کر دیکھیں...

دیکھیں گے کہ کتنے ہی لوگ متعدد طریقوں سے تجربات اور آزمائش پیمائش کرنے اور رپورٹ مرتب کرنے میں مصروف ہیں۔ یہ ماہرین سینفورائزڈ کے نمائندے ہیں۔ جو اس چیز کا اطمینان کر لینا چاہتے ہیں کہ سکڑنے کے لیے اس ٹریڈ مارک کے مالکان کی عائد کی ہوئی شرائط کی پابندی ...ا ہے۔

اور دھونے کے ساتھ اس لیبل پر نظر ثانی ڈالیں تو یہ بار بار دھونے پر بھی کپڑا نہ سکڑنے کی قابلِ اعتماد ضمانت نظر آئے گا۔ یہ آپ کو یقین دلاتا ہے کہ آپ اپنے روپے کی پوری پوری قیمت وصول کر رہے ہیں اور آپ کے خریدے ہوئے کپڑے اپنی اصلی ناپ پر قائم رہیں گے۔

آئندہ جب بھی آپ سوتی یا سوت ملے ہوئے کپڑے خریدیں تو ہمیشہ سینفورائزڈ کا لیبل دیکھ کر خریدیئے۔ یہ ٹریڈ مارک قطعاً قابلِ اعتماد ہے۔

·SANFORIZED·
REGD TD MK

سینفورائزڈ کے مالکان کلوئٹ پی باڈی اینڈ کمپنی انکارپوریٹڈ (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو ایس اے میں قائم شدہ) ... صرف اس کپڑے پر ... کیا جاتا ہے ... کی اجازت دی جاتی ہے جو سکڑنے کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔

خطرناک گروہ

(اپریل سے سلسلہ ملائیے)

"آپ! آپ یہاں کیسے؟"

"ہاں میں ہی ہوں، اچھا تم لوگ باہر جاؤ..... دروازہ کھلا ہے۔ باہر کار کھڑی ہے۔ اس میں بیٹھ جاؤ۔ فکر کی بات نہیں۔ مجرم سارے گرفتار ہو چکے ہیں۔"

"کیسے مجرم، کون مجرم۔ آپ یہاں کیسے پہنچے؟"

"تم جاؤ" جاوید بھیّا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

زیدی، نعیم، سعید وغیرہ بھی کار میں بیٹھے تھے۔ انھوں نے بھی یہی بتایا کہ ایک دم جاوید بھائی نے اندر داخل ہو کر انھیں باہر جانے کا حکم دیا، ہم نے واقعات کی کڑیاں ملا کر کچھ نتیجہ نکالنا چاہا، لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

تھوڑی دیر بعد جاوید بھائی، کچھ سب انسپکٹر اور کانسٹبل بہت سے نقاب پوشوں کو لے کر باہر آئے۔ تہہ خانے کی نگرانی کے لیے دو تین کانسٹبل وہیں چھوڑ دیے گئے۔ نقاب پوشوں کو بند لاری میں بٹھا کر ہم سب شہر کی طرف روانہ ہوئے۔ شہر ہمارے گاؤں سے کوئی بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ جنگل سے بھی کچھ زیادہ دور نہ تھا، جاوید بھائی شہر ہی میں رہتے تھے۔

پولیس تو مجرموں کو لے کر تھانہ کے پاس رک گئی اور ہم کار لے کر سیدھے جاوید بھائی کے مکان کی طرف چل دیے۔ رات ہم نے جاوید بھائی کے گھر میں ہی بتائی۔ صبح عدالت میں ہم لوگوں کو بیان دینا تھا۔

عدالت سے واپسی پر ہم نے پولیس تھانے آ کر اپنے سامان کے بارے میں پوچھا تو معلوم ہوا کہ وہ جاوید بھائی کی تجویز پر سیدھا جنگل سے بیل گاڑی پر ہمارے گھر پہنچا دیا گیا ہے، کیوں کہ عدالت کی کارروائی کے بعد ملنے میں بہت تاخیر ہو جاتی۔

تھانے سے سیدھے ہم لوگ جاوید بھائی کے گھر آئے، وہ بھی عدالت میں بیان دے کر ابھی ابھی گھر آئے تھے۔ کھانے سے فارغ ہو کر ہم نے ان سے تمام حالات سنانے کا مطالبہ کیا۔ رات سے ہی ہم یہ جاننے کے لیے بے چینی سے منتظر تھے کہ جاوید بھائی ہم سے کس طرح الگ ہوئے اور آخر وہاں تک کیسے پہنچ گئے۔ انھوں نے اس پراسرار قصّہ کا اس طرح آغاز کیا۔

"کچھ دن پیشتر میں نے اخبار میں یہ پڑھا تھا کہ دو آدمی کچھ جعلی سکے اور جعلی نوٹ چلانے کے جرم میں پکڑے گئے ہیں۔ لاکھ پوچھ گچھ کرنے پر بھی انھوں نے کچھ نہیں بتایا۔ اور وہ اب تک قید میں ہیں۔ پرسوں کا واقعہ تو اور بھی حیرت انگیز ہے کہ شہر کے اسٹیٹ بنک کی تجوریوں کے معائنہ کے وقت دو لاکھ روپے کے جعلی نوٹ پائے گئے۔ اصلی سکّے اور نوٹ غائب کر کے اس کے بجائے جعلی سکّے

کئے تھے ۔متعلقہ آفیسر سے کافی پوچھ گچھ ہوئی
نکل لاعلمی ظاہر کی ۔ اسے بھی قید کر دیا گیا
ندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا گروہ کتنا منظم
آدمی بنکوں اور اسی قسم کے اداروں میں کام
ب ذرا موقعہ ملا، اصلی نوٹ غائب کر کے
رکھ دیتے تھے ۔ان لوگوں کی مشکل ہی
نی ۔ یہ نوٹ بنکوں سے نکل کر کافی دنوں
تے بھی تھے ۔لیکن جب یہ کسی ہوشیار آدمی کی
تھے تو ان کی قلعی کھل جاتی تھی ۔اس کے
زار میں جعلی نوٹ بھنانے کی کوشش کرنے
ں دنوں تک اس کارخانے کی کھوج لگانے
ہی، شہر کا کونا کونا چھان مارا اور اس کے
نے بھی گاؤں تھے ان کا بھی چپہ چپہ چھان
چلا، پولیس کافی پریشان تھی ۔ لوگ بھی
لئے تھے ۔تاجر اصلی نوٹوں کو لینے میں
ہے تھے لیکن پھر بھی جعلی نوٹوں کی اب تک بل پل
بھی کروڑوں کا خسارہ ہوا تھا ۔"
نیوں سے اخباروں میں یہ خبر بھی دیکھ رہے ہیں
ا جنگل سے ہزاروں روپیوں کی لکڑی
ا لیکن ابھی تک اس کا پتہ نہ چلا تھا کہ
لے جاتا ہے اور کہاں لے جاتا ہے میں
بار میں پڑھی تو ایک شبہ نے سر ابھارا
ہ وہ کرونا جنگل کے کسی حصہ میں رہتا ہو،
ں پہاڑیاں اور غار کچھ اس قسم کے واقع

ہوئے ہیں کہ وہاں کوئی عمارت تعمیر کر کے اس کام کو بخوبی انجام دیا جا سکتا ہے ۔"

" جب میں تمھارے گاؤں آیا تھا ۔" جاوید بھائی نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا ۔

" میں نے کرونا جنگل میں ان غاروں کا پتہ لگانے کی کوشش کی، لیکن میرے اتنے دنوں کی کوشش بے کار ہی گئی ۔"

" تو اسی لیے آپ رات کے بارہ بارہ بجے تک غائب رہتے تھے ۔" میں نے پوچھا ۔

" ہاں،" انھوں نے کہا ۔" اور جب ہم پکنک منانے کے بعد رات میں وہیں ٹھہر گئے تو میں نے ارادہ کیا تھا کہ لوگوں کے سو جانے کے بعد سامنے والی گھاٹی کا ایک دفعہ اور چکر لگا آؤں گا ، میں اٹھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ سامنے کچھ روشنی نظر آئی اور کچھ لوگوں کی آواز سنائی دینے لگی ۔ میں نے فوراً موٹر سیکل کنارے لے لی اور ایک درخت کی آڑ میں ہو گیا ۔ وہ لوگ سیدھے ادھر ہی آئے اور پھر جو کچھ ہوا میں بغور دیکھتا رہا ۔ اور جب نقاب پوش چٹان ہٹانے کی مشین کا چکر پھرا رہا تھا تو اس وقت میں تم لوگوں سے کچھ زیادہ دور نہ تھا، میں اس کے استعمال کا طریقہ بغور دیکھتا رہا ۔ تم لوگوں کے اندر داخل ہوتے ہی میں وہاں واپس آیا جہاں ہمارا سامان پڑا ہوا تھا، میں نے موٹر سائیکل سنبھالی اور سیدھا شہر کا رخ کیا ۔ جب میں نے دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ پولیس دلاور خاں سے جو اتفاق سے میرا دوست بھی ہے مل کر ساری تفصیلات بتائیں تو

وہ تھوڑی دیر فکر میں ڈوب گیا۔ اس نے متعلقہ کلرک کو بلواکر اسٹاک روم سے گذشتہ سال کے مفرور قیدیوں کی کی فائل نکلوائی۔ فائل کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نے شہر کے پولیس اسٹیشنوں کو فون کرکے انسپکٹروں کو مطلع کیا کہ وہ رات میں کرونا جنگل میں چھاپا مارنے کے لیے تیار رہیں۔"

"پولیس گاڑی ہم نے جنگل میں پہاڑیوں سے ایک میل آگے ہی چھوڑ دی اور خاموشی سے آگے بڑھتے ہوئے گھاٹی کے چاروں طرف گھیرا ڈال دیا۔ پولیس سے پہلے میں اور سپرنٹنڈنٹ زمین دوز عمارت کے اندر داخل ہوکر عمارت کے راستوں کا اندازہ کرنا چاہتے تھے۔ میں ہتھوڑا کر مشین کا چکر گھمانا ہی چاہ رہا تھا کہ ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ آواز آئی اور ایک نقاب پوش نے غار کے منہ سے سر باہر نکالا اور میں فوراً چٹان کی آڑ میں دبک گیا۔ تھوڑی دیر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد نقاب پوش نے قدم آگے بڑھایا۔ شاید اسے خطرے کا احساس ہوگیا تھا لیکن اسے دوسرا قدم اٹھانے کی مہلت ہی نہ ملی، میں نے پیچھے سے لات ہی ایسی جمائی تھی۔ وہ چاروں خانے چت ہوکر گر پڑا۔ اور دوسرے ہی لمحے سپرنٹنڈنٹ کنپٹیاں دبا کر اسے بے ہوش کر چکا تھا اور چند ہی منٹوں میں پولیس تہہ خانے میں داخل ہوکر سارے مجرموں کو گرفتار کر رہی تھی۔ اس گروہ کا سرغنہ جڈسن اندر سے بند کمرے میں چھپ گیا تھا، لیکن کمرہ جلا ڈالنے کی دھمکی کارآمد ہوئی اور اس نے باہر نکل کر خود کو قانون کے حوالے کر دیا۔"

"جاوید بھائی یہ جڈسن کون تھا؟" سلیم کا سوال

"جڈسن سکہ سازی کا ماہر ہے۔" جاوید بھائی نے جواب دیا۔ "وہ سکّے میں دھاتوں کے مقدار تناسب کا اچھی طرح علم رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ کرنسی نوٹ کے کاغذ کی پرکھ رکھنے کے علاوہ وہ کرنسی نوٹ کے بلاک بنانا بھی جانتا ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں بھی یہ وار بیفرو کا ایک ذمہ دار آفیسر تھا۔ جنگ عظیم کے موقع پر اس نا جائز طور پر کرنسی چھاپ کر لاکھوں روپے کمائے تھے جس کا حکومت کو کچھ علم نہ ہوسکا۔ انگریزوں کے چلے جا کے بعد بھی حکومت ہند نے اس کی خدمات حاصل کیں۔ لیک وہ جو کہتے ہیں نا کہ "عادت جو پرانی ہوتی ہے۔ وہ دور کہ کب ہوتی ہے۔" اس نے اپنا وہی طریقہ کار جاری ر لیکن آخر ایک دن حکومت کی کرنسی اور اس کی زاید چھاپی ہو کرنسی کے بڑے بڑے نوٹوں کے نمبروں میں یکسانیت کی وجہ سے اس کی حرکتوں کا پتہ چل گیا۔ اس کے علا جن ذرائع سے وہ کرنسی کے کاغذ امپورٹ کرتا تھا، ان کو اس کا بھی علم ہوگیا۔ غرض جب حکومت کو معلوم ہوا اس نے اس کا سارا ناجائز روپیہ ضبط کرکے اسے حبس کی سزا دی تھی۔ لیکن چند مہینے کے بعد وہ کسی طرح اپنے چ ساتھیوں کے ساتھ نکل بھاگا اور کرونا جنگل کی پہاڑ کو اس نے اپنی آماجگاہ بنایا اور جعلسازی کا کارخانہ شروع کردیا۔ لیکن جرم آخر کب تک پنپ سکتا ہے۔ آ یہاں بھی اسے ناکامی ہوئی۔"

"بھائی جان! یہ نقاب پوش کون تھے؟"

معبد کی باری تھی۔
کے ساتھ جو پانچ سات قیدی مفرور
ب کے سب مشہور ڈاکو اور قاتل تھے۔
ں نے ان سب کو فرار کروا دیا تھا۔ اور
کے کارخانے میں کام کرنے پر آمادہ کر لیا
سے اپنے کارخانے کے انتظامی کام لیا
ل رقم معاوضہ میں دیتا جو پُراسرار طریقے
چوں تک پہنچ جاتی، اس کے علاوہ یہ
ؤ د اس عمارت میں ایسی زندگی گزارتے
نواب یا جاگیردار گذارتے ہیں۔"
ر کام کرنے والوں کی نظروں سے بچے رہنے اور
ے دوسرے سے روشناس نہ ہونے کے
ن کو نقاب ڈالے رکھنے کا حکم دیا تھا۔
رے کے لیے اجنبی رہیں۔ اور خود جڈسن
سازش نہ کر سکیں۔
جان وہ ڈاکٹر کون تھا؟ جو لوگوں کو انجکشن
معبد نے پھر پوچھا۔
ر کا مشہور ڈاکٹر راجندر ہے" جاوید بھائی
ں نے اپنے ایک مریض کو زہر کا انجکشن
دیا تھا۔ مریض کے ایک وارث نے ڈاکٹر
ی رقم دی تھی۔ کیوں کہ اس مریض کے
ں لاکھ کی جائداد اور رقم ملنے والی تھی۔
ں کا علم ہو گیا اور ڈاکٹر اس قتل کے سلسلہ
ن جڈسن کے ساتھ وہ بھی بھاگ نکلا۔

اور چوں کہ وہ روپے کا لالچی تھا۔ اس لیے جڈسن
ساتھ رہ کر اس کی مدد کرنے لگا۔"
"لیکن ڈاکٹر کا وہاں کیا کام تھا، وہ کون لوگ
تھے جنھیں وہ انجکشن دے رہا تھا؟" سلیم نے پوچھا۔
"جڈسن نے عمارت بنانے کے لیے چند معماروں،
الکٹریشین اور اسی قسم کے چند ٹکنیکل لوگوں کا اغوا کروایا
اور ڈاکٹر راجندر سے ان کو انجکشن دلوا کر اور سیال دوا
پلوا کر ان کی برین پالش کروائی۔ یہ ایک نیا ٹریٹمنٹ ہے
جس سے آدمی ماضی کو حتیٰ کہ اپنے نام کو بھول جاتا ہے۔
لیکن اپنا ہنر اور فن نہیں بھولتا۔ اب اس سے جو کچھ کام
لیا جاتا ہے وہ بلا چوں و چرا انجام دے دیتا ہے۔
جڈسن نے زمین کے اندر ہی ایسی عمارت بنوائی اور جنریٹر
(GENERETOR) کے ذریعے روشنی کا انتظام کر لیا۔"
"جڈسن نے ان بے گناہوں سے جانوروں کی
طرح کام لیا لیکن ان کی اور ان کے بیوی بچوں کی زندگی
کے تباہ ہونے کا کوئی خیال نہیں کیا۔" جاوید بھائی
ایک دم جوش میں آ گئے اور ان کی آواز غمگین ہو گئی۔
"ان معماروں اور ٹیکنیشنوں کے علاوہ" جاوید
بھائی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "جڈسن
نے فٹ پاتھ سے کئی گداگروں کو اٹھوایا اور روپے کا لالچ
دے کر اس زمین دوز جیل میں محبوس کر دیا اور سب کئی
مہینوں سے آسمان نہیں دیکھنے پاتے۔ ان سے وہ مشینوں
پر کام لیتا تھا۔ جیسے کہ یہ بھی کوئی مشین ہیں اور ظالم
ڈاکٹر راجندر سر ہفتے ان کی برین پالش کر کے ان کے

ماضی کو بھلاتا جاتا تھا۔"

"لیکن بھائی جان! ہم لوگوں کو غار میں لے جانے سے جڈسن کا کیا مطلب تھا؟" سلیم نے پھر سوال کیا۔

"مقصد کیا ہوتا، جڈسن کو مفت میں اتنے سارے آدمی ہاتھ لگ گئے تھے، وہ تم سب کی بھی برین پالش کرواتا اور چند دنوں میں تم لوگ بھی اس قابل ہو جاتے کہ مشینوں پر کام کر کے نوٹ چھاپ سکو۔"

"اُف خدا ہم کس مصیبت میں پھنس گئے تھے" سعید کے منہ سے نکلا "خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہمیں اس مصیبت سے نجات دی۔"

"اور ہمارے ساتھ اللہ نے ان بے گناہ آدمیوں کو بھی مصیبت سے چھٹکارا دلایا۔" سلیم نے ہاں میں ہاں ملائی۔ "لیکن بھائی جان۔ آخر یہ آدمی پھر کسی طرح ٹھیک ہو جائیں گے؟"

"ہاں واقعی ایک المیہ ہے، ان برین پالشڈ لوگوں میں چند ایک بڑے اچھے دماغ کے مالک تھے۔ لیکن ان کا حافظہ اس بری طرح متاثر ہوا کہ انھوں نے اپنے بیوی بچوں تک کو نہیں پہچانا، شکر ہے کہ ڈاکٹر راجندر خودکشی کی کوشش میں ناکام ہو گیا، اور زندہ ہمارے ہاتھ لگا۔ اُسے مجبور کیا جائے گا وہ پھر برین سرجری کر کے ان لوگوں کی میموری (یادداشت) واپس دلا دے تاکہ ان کی سزا میں کچھ تخفیف کی جا سکے ورنہ پھانسی کا تختہ تو اس کا مقدر ہی ہے، بصورت دیگر دماغ کے کسی دوسرے ماہر ڈاکٹر کو تلاش کرنا پڑے گا۔"

"اچھا جڈسن اور نقاب پوشوں کا کیا حشر..."

"ان سب پر مقدمے چلائے جا رہے ہیں۔ شاید سب کو حبس دوام بامشقت کی سزا مل جائے اچھا اب تم بہت تھکے ہوئے ہو آرام کرو مجھے سپرنٹنڈ... کے یہاں ملنے جانا ہے۔"

جاوید بھائی نے اپنی موٹر سائیکل سنبھالی او... نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

باقی زمین گول ہے

...مدد سے ان کھمبوں کے اوپر کی سطح کو دیکھا گیا تو معلوم... کہ بیچ کا کھمبا چھ فٹ اُبھرا ہوا ہے حالاں کہ ان... کی لمبائی بالکل برابر تھی اور نہر کی تہہ بھی بالکل ... تھی۔ اس سے یہ بات بالکل ثابت ہو گئی کہ زمین کی سط... میں گولائی ہے جو ہمیں اتنی بڑی زمین پر تھوڑے ... فاصلے سے صاف نظر نہیں آتی غرض ان تجربوں سے ا... میں شک باقی نہیں رہتا کہ ہماری زمین ایک کرّ... کی طرح گول ہے۔

★

باقی فلائنگ ڈاکٹر

بچے ریڈیو کے ذریعے اپنا سبق پڑھتے ہیں اور ڈاک کے ذر... اپنا لکھا ہوا سبق اپنے اسکول کو بھیجتے ہیں۔" نجمہ نے بے... کہا: "واہ، واہ کیا عجیب و غریب طریقہ ہے۔"

مسٹر شا نے کہا "جی ہاں عجیب طریقہ ہے اور... خود آسٹریلیا بھی تو عجیب و غریب ملک ہے۔" جانے سے پ... مسٹر شا نے وعدہ کیا کہ وہ اسکول کے لیے فلائنگ ڈاکٹر... کی تصویریں بھیجیں گے بچوں نے تالیاں بجا کر انھیں رخص...

بچوں کی دل چسپ اور معلوماتی کتابیں

	۱/-	حضرت امام حسینؓ	-/٢٥	تین شہزادے	-/٢٠
ـنیاں	-/٣٠	حضرت امام حسنؓ	-/٢٥	جادو کا ہاتھ	-/٢٠
ـخلاقی کہانیاں	-/٣٠	حضرت رابعہ بصریؒ	-/٢٥	جادو کی بطخ	-/٢٠
ـب	۱/۵۰	حضرت سلمانؓ	-/٢٥	جادو کا گھوڑا	-/٣٠
	-/٤٠	حضرت بلالؓ	-/٢٥	جادو کا پھل	-/٣٠
ـا شہید	-/٣٠	حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ	-/٢٥	چڑیوں کی ملکہ	-/٢٠
ـنیا	-/٤٠	حضرت فاطمۃ الزہرا خاتونِ جنتؓ	-/٢٥	خوفناک جادوگر	-/٣٠
ـلطیفے	-/٣٠	ابھرتا سورج	-/٥٠	دیو پیکر درندہ	-/٢٠
ـہانیاں	-/٣٠	زمین کے تارے	-/٥٠	ڈاکٹر بوجھ بجھکڑ	-/٢٠
ـں	-/٣٠	چمکتے موتی	-/٥٠	رحم دل پریاں	-/٢٠
ـن سیرت و شخصیت	-/٣٥	تین قلندر	٢/-	رستم و سہراب	-/٢٠
ـر	-/٢٥	ایک تھی راجکماری	-/٢٠	شیش محل	-/٢٠
ـیا	-/٤٠	ایک تھی رانی	-/٢٠	شہزادی بدورا	-/٣٠
	-/٣٠	آدم خور زنگی	-/٣٠	شہزادی پری زاد	-/٣٠
ـام آزاد	-/٣٠	افراسیاب کی بیٹی	-/٣٠	عراق کی شہزادی	-/٢٠
ـانیاں	-/٣٠	بہادر راجکمار	-/٢٠	لنگڑا دیو	-/٣٠
ـلمؒ	-/٥٠	باغی شہزادہ	-/٣٠	مسٹر عقلمند	-/٢٠
ـا اکبرؓ	-/٢٥	بے وقوف پریاں	-/٢٠	مغرور شہزادی	-/٢٠
ـق اعظمؓ	-/٢٥	پریوں کے تحفے	-/٢٠	ہنس مکھ شہزادہ	-/٢٠
ـن ذی النورین	-/٢٥	پھول شہزادی	-/٢٠	ہیروں کا جزیرہ	-/٣٠
ـیر خداؓ	-/٢٥	تیسرا انعام	-/٢٠		

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال۔ بمبئی ٣ (بی آر)

جناب رفیق شاستری

پنچ تنتر کی کہانیاں

دولت کا چراغ

کسی شہر میں چار دوست رہتے تھے۔ چاروں میں گہری دوستی تھی۔ چاروں ہی غریب تھے۔ اسی لیے جب کبھی یہ ایک جگہ بیٹھتے تو مال دار بننے کی ترکیب سوچا کرتے۔ سب ہی رونا روتے تھے کہ غریب ہونے کی وجہ سے اپنے عزیزوں، رشتے داروں تک میں ان کی کوئی وقعت نہیں۔ اس سے تو اچھا ہے کہ شہر چھوڑ کر درندوں کے بیچ گھنے جنگل میں رہنے لگیں۔ جہاں اس طرح بے عزتی کی زندگی تو نہ گزارنی پڑے۔ سب اپنے اپنے تجربے بیان کیا کرتے کہ غریبی میں کس طرح اپنے پرائے ہو جاتے ہیں اور پیسہ ہو تو غیر بھی اپنائیت جتانے لگتے ہیں۔ پیسہ ہو تو لوگ بزدل کو سورما اور بے وقوف کو عالم مان لیتے ہیں۔

ایک دن ان چاروں نوجوان دوستوں میں اسی طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ ان میں سے ایک نے مشورہ دیا کہ کیوں نہ پردیس میں جا کر قسمت آزمائی جائے۔ یہ بات تمام دوستوں کے دل کو لگ گئی۔ اور سب پردیس جانے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔

چلتے چلتے وہ ایک ندی کے کنارے پہنچ گئے۔ ندی کے ٹھنڈے پانی میں نہا دھو کر چاروں نوجوان برہمنوں نے پوجا کی اور آگے بڑھے۔ ابھی وہ لوگ وہاں سے کچھ ہی آگے گئے ہوں گے کہ ان لوگوں کی ایک درویش سے ملاقات ہوئی۔ یہ ایک پہنچا ہوا درویش تھا۔ درویش نے ان چار نوجوانوں کو اس طرح جنگل میں بھٹکتا دیکھ کر خیریت دریافت کی۔ نوجوانوں نے درویش پر اپنا ارادہ ظاہر کیا اور کہا اب جب تک وہ خوب دولت نہیں کما لیتے ہیں اپنے دیس واپس نہیں جائیں گے۔ درویش نے سوچا ذرا ان نوجوانوں کے ہمت اور حوصلے کا امتحان لیا جائے۔

درویش نے پوچھا کہ "دولت کمانے کے لیے آپ لوگ دیس سے پردیس کیوں جا رہے ہیں۔ اس لیے کہ دولت کی کمائی قسمت کی بات ہوتی ہے۔ خدا جسے چاہتا ہے دولت سے نوازتا ہے۔"

نوجوانوں نے درویش کی اس بات کا جواب دیا اور بہت خوب جواب دیا۔ کہ "یہ سچ ہے کہ قسمت سے ہی آدمی دولت مند بنتا ہے۔ مگر ہمت مرداں مدد خدا بھی تو کوئی چیز ہے۔ کیا یہ سچ نہیں کہ باہمت مرد موقع کا فائدہ اٹھا کر اپنی قسمت بدل سکتے ہیں۔ انساں کی جواں مردی کبھی کبھی قسمت پر بھی حاوی

ہے ۔اس لیے اے درویش خدا رسیدہ! آپ
م لے کر ہم لوگوں کو پست ہمت نہ کریں۔ اب
نے دولت کمانے کا مصمم ارادہ کر لیا ہے۔ آپ
ہیں۔ خدا آپ پر مہربان ہے۔ آپ میں بے پناہ
آپ چاہیں تو ہماری مدد کر سکتے ہیں۔ ہمیں راستہ
ہیں۔

درویش نوجوانوں کی اس بات سے بہت
۔ وہ نوجوانوں کی بلند ہمت دیکھ کر ان پر مہربان
، نے نوجوانوں کو دولت حاصل کرنے کی ایک
ادی۔ اس نے کہا" ہاتھوں میں ایک ایک
ر ہمالیہ پہاڑ کی طرف نکل جاؤ۔ جاتے جاتے
ے ہاتھ سے چراغ گر پڑے، وہیں ٹھہر جاؤ۔
غ گر پڑے اس جگہ کو کھودو۔ تمھیں وہاں
لی۔ دولت بٹور کر واپس گھر چلے جاؤ۔"

اروں نوجوان ہاتھوں میں چراغ لے کر ہمالیہ
رف نکل کھڑے ہوئے۔ کچھ دور جانے کے بعد
تھ سے چراغ گر پڑا۔ وہاں زمین کھودی گئی
، ہی کھدائی کی گئی تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہ تانبے
ہے۔ جس کے ہاتھ سے چراغ چھوٹ گیا تھا ۔
بھئی بس خزانہ مل گیا۔ یہاں سے چاہے جتنا
اور گھر چلو۔" دوسرے ساتھی بولے۔ "احمق
مانبے سے غربت دور ہوتی ہے؟ آگے تو
، زیادہ قیمتی چیز ملے گی۔" پہلا دوست بولا۔
لوگ آگے جاؤ۔ میری قسمت میں تو یہی
تانبا تھا۔ میں تو یہیں رک رہا ہوں۔ خوب سا تانبا بٹور کر گھر لوٹ جاؤں گا۔"

تینوں دوست اور آگے بڑھے۔ کچھ دور آگے جانے کے بعد ان میں سے ایک کے ہاتھ کا چراغ زمین پر گر پڑا۔ اس نے زمین کھودی تو وہاں چاندی نکلی۔ وہ خوشی سے اچھل پڑا اور کہنے لگا۔ "دوستو! آگے کہاں جاتے ہو۔ یہیں رکو اور خوب ساری چاندی لے کر گھر چلو۔" مگر باقی دونوں جن کے ہاتھوں میں ابھی تک چراغ تھا اس پر راضی نہیں ہوئے۔ انھوں نے کہا" پہلے تانبا ملا۔ پھر چاندی ملی۔ اب یقیناً آگے سونا ملے گا۔ ہم تو آگے چلتے ہیں تم بھی چلو۔ خوب سارا سونا لے کر گھر لوٹیں گے۔" ان کا دوست بولا۔ "نہیں بھائی ہماری قسمت میں تو بس چاندی ہی تھی۔ آگے معلوم نہیں کیا ہو؟ تم لوگ بھی یہاں سے چاندی بٹور لو اور گھر واپس چلو۔" مگر اس کے دوست راضی نہیں ہوئے اور آگے بڑھ گئے۔

کچھ اور آگے بڑھنے پر ان دو میں سے ایک کے ہاتھ سے پھر چراغ گر گیا۔ اس نے زمین کھودی تو وہاں سونے کی کھان ملی۔ اس نے اپنے دوست سے کہا۔ "سونے سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہے۔ یہاں سے چاہے جتنا سونا بٹور لو اور گھر چلو۔ آگے بڑھنے کی اب ضرورت نہیں ہے۔" مگر چوتھا دوست نہ مانا۔ اس نے کہا" پہلے تانبے کی کھان ملی۔ پھر چاندی کی کھان ملی اس کا مطلب یہ ہے کہ آگے تو اس سے بھی کوئی قیمتی چیز ملنے والی ہے یقیناً آگے ہیرے جواہرات کی کھان ہوگی۔ میں تو اور آگے

جاتا ہوں۔ میں تو کہوں گا کہ تو بھی سونے کو چھوڑ اور آگے چل۔" مگر وہ نہ مانا اور بہت سارا سونا لے کر گھر لوٹ گیا۔

چوتھا دوست وہاں سے اور آگے بڑھا۔ جیسے جیسے آگے بڑھتا جاتا راستہ دشوار سے دشوار تر ہوتا جاتا تھا۔ کانٹوں سے اس کے پیر لہولہان ہو گئے۔ کہیں برف کے بڑے بڑے تودوں کو پار کرتے وقت اس کے پاؤں جم کر رہ جاتے۔ مگر دولت حاصل کرنے کی دھن میں وہ ہر طرح کی مشکل جھیلنے کے لیے تیار تھا۔ چراغ کو سنبھالے وہ دھیرے دھیرے آگے بڑھتا جاتا۔ دولت کی ہوس میں وہ بہت دور نکل گیا۔ چراغ اب بھی اس کے ہاتھ میں تھا۔ اسے وہ بہت مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔

کافی دور جانے کے بعد اسے ایک بوڑھا آدمی دکھائی دیا۔ یہ عجیب وغریب آدمی تھا۔ اس کے ماتھے پر ایک "چکر" بنا ہوا تھا۔ جو پھرکی کی طرح برابر ناچ رہا تھا۔ جب یہ چوتھا آدمی اس کے قریب پہنچا تو اس نے بوڑھے سے پوچھا کہ "آپ کون ہیں اور یہ کیسا چکر آپ کے ماتھے پر لگا ہوا ہے۔؟" مگر ابھی وہ لفظ "چکر" ہی کہہ پایا تھا کہ اس بوڑھے آدمی کے ماتھے کا "چکر" غائب ہو گیا۔ اور اس نوجوان کے ماتھے پر چپک گیا۔ بوڑھے کے ماتھے کا چکر اپنے ماتھے پر گھومتا دیکھ کر وہ نوجوان حیرت میں رہ گیا۔ "چکر" چلنے کی وجہ سے اسے تکلیف بھی ہونے لگی۔ چکر کی رفتار بڑھنے کے ساتھ اس کی تکلیف بھی بڑھنے لگی۔

وہ بہت پریشان ہو گیا اور اسی پریشانی کے عالم میں اس نے وہاں سے جاتے ہوئے اس بوڑھے آدمی سے پوچھا کہ "بابا! اتنا تو بتاتے جاؤ کہ تمھارے سر سے چکر چھوٹ کر میرے سر پر کیوں آلگا۔ اور اب اس سے کب اور کیسے نجات حاصل کی جائے؟"

بوڑھا بولا "میں تو اب چلا۔ میرے ماتھے پر بھی یہ "چکر" اسی طرح لگا تھا۔ جیسے یہ تمھارے ماتھے پر لگا ہے۔ یہ اب تمھارے ماتھے سے اسی وقت الگ ہوگا جب کوئی دولت کی ہوس کا مارا دولت کے لالچ میں یہاں تک پہنچے گا اور تم سے اس چکر کے بارے میں دریافت کرنے لگے گا۔"

نوجوان بولا "مگر بابا یہ کب ہوگا۔ کب تک میں اس عذاب میں مبتلا رہوں گا۔؟"

بوڑھا بولا "بھئی اس بارے میں تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرے سر پر بھی یہ "چکر" اسی طرح لگا تھا۔ بہت دنوں پہلے کی بات ہے کہ دولت حاصل کرنے کا چراغ لے کر یہاں تک آپہنچا تھا۔ ایک آدمی کو یہاں میں نے اسی "چکر" کے عذاب میں مبتلا دیکھا اور اس سے اس کی وجہ دریافت کی تھی اور اس وقت یہ "چکر" میرے ماتھے پر چپک گیا تھا۔ جس طرح اب یہ تمھارے ماتھے پر چپک گیا ہے۔ اس آدمی نے جاتے وقت مجھے صرف اتنا بتایا تھا کہ اب کسی اور آدمی کے یہاں آنے اور تم سے بات کرنے سے ہی یہ "چکر" چھوٹے گا۔ میں نہ معلوم کتنے برسوں سے اس میں مبتلا رہا ہوں۔ اب مجھے دن، مہینے

کے بارے میں بھی کوئی علم نہیں رہا۔"

وہ نوجوان بولا "برائے مہربانی اتنا تو بتا تے
اس ساری مدت میں کھانے پینے کا کیا انتظام رہا۔
ہت دنوں کا بھوکا پیاسا ہوں۔ دولت کی ہوس
نے کھانے پینے اور راستے کی دشواریوں کی پرواہ
، اور یہاں تک آ پہنچا، مگر اب پیاس کے مارے
ن نکلی جا رہی ہے۔"

وہ بوڑھا اس پر ہنسا اور بولا۔ "بھائی یہ "چکر"
'بہت زیادہ لالچ کرنے والوں کے لیے بنا ہے۔
"کے لگ جانے کے بعد آدمی کو بھوک پیاس ،
ا پرواہ نہیں رہ جاتی ہے۔ بس اس چکر کے
ی وجہ سے تکلیف ہوتی ہے اور وہی ایک تکلیف
'تی ہے۔"

یہ کہہ کر وہ بوڑھا آدمی وہاں سے چلا گیا۔ اور
جوان چکر کی مصیبت کو جھیلنے کے لیے وہاں تنہا
۔ اس نے سوچا کہ چلو وہاں چلیں جہاں تیسرے
ستا کو سونے کی کھان ملی تھی۔ خون میں لت پت وہ
ستے پر واپس لوٹا جدھر سے آیا تھا۔ بہت دور
کے بعد اسے وہ دوست ملا جو اس وقت سونے
یوں کو بٹور رہا تھا۔ اس نے دوست کو اپنی بپتا
ئی۔

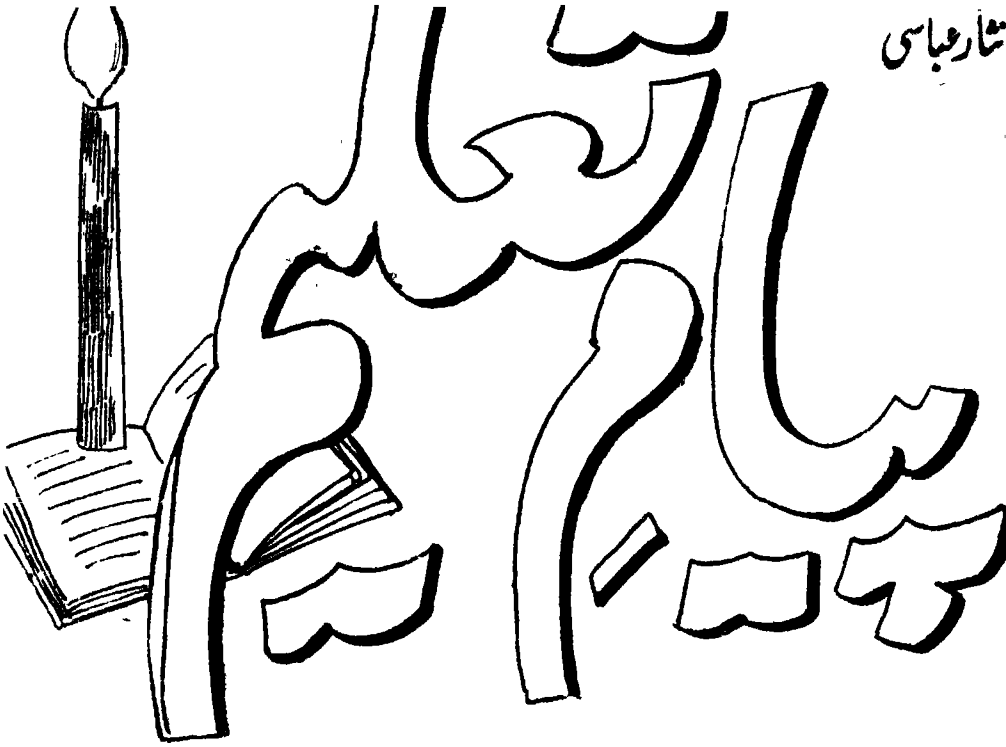
دوست نے کہا۔ "دیکھو میں نے تمہیں آگے جانے
روکا تھا۔ مگر زیادہ دولت حاصل کرنے کے لالچ
م ۔ نے میری بات نہ مانی۔ بات یہ ہے کہ ایک
پنڈت کے گھر پیدا ہونے کی وجہ سے تم
نے علم تو حاصل کر لیا ہے مگر بھلے بُرے کی تمیز کرنے
والی عقل تمہیں نہیں ملی۔ علم سے زیادہ عقل کی اہمیت
ہوتی ہے۔ علم ہوتے ہوئے بھی جن کے پاس عقل نہیں
ہوتی۔ وہ اپنے بھلے برے کے بارے میں بھی نہیں سوچ
پاتے۔ کیا تم نے چار دوستوں کی کہانی نہیں سنی ہے؟

چکر والے نوجوان نے کہا نہیں تو۔ ذرا مجھے بھی
تو سنا دو۔ پھر "سونے" والے دوست نے چار دوستوں
کی یہ کہانی سنائی

(باقی آئندہ)

بقیہ مینڈک کی ٹرٹر

اس طرح بھگوان سے وعدہ لے کر وہ قافلہ واپس
آیا۔ زمین پر آنے کے بعد کچھ دنوں مینہہ نہ برسا تو مینڈک پر
مصیبت آئی۔ سب اسے تنگ کرنے لگے۔ کسی نے دھوکے باز
کہا۔ کسی نے دغا باز۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ بے چارا
مینڈک کئی روز تک صبر کرتا رہا۔ مگر ایک دن جب بہت
پریشان ہوا تو رونے لگا۔ چیخنے چلانے لگا۔ بھگوان تک
یہ آواز پہنچی تو انہیں اپنے وعدے کا خیال آیا اور مینہہ
برسنے لگا۔ تب سب خوش ہوئے۔ جبھی تو آج بھی جب کبھی
مینڈک غل مچاتا ہے، زور زور سے ٹرٹر کی آواز نکالتا ہے
تو سب سمجھتے ہیں کہ بارش ہوگی۔



پیامِ تعلیم

جنابِ نثار عباسی

یہ رسالہ جسے کہتے ہیں "پیامِ تعلیم"
تربیت ذہن کی کرتا ہے بنامِ تعلیم

یوں تو ہیں اور رسالے بھی بنامِ تعلیم
کچھ مگر اس نے ہی سمجھا ہے مقامِ تعلیم

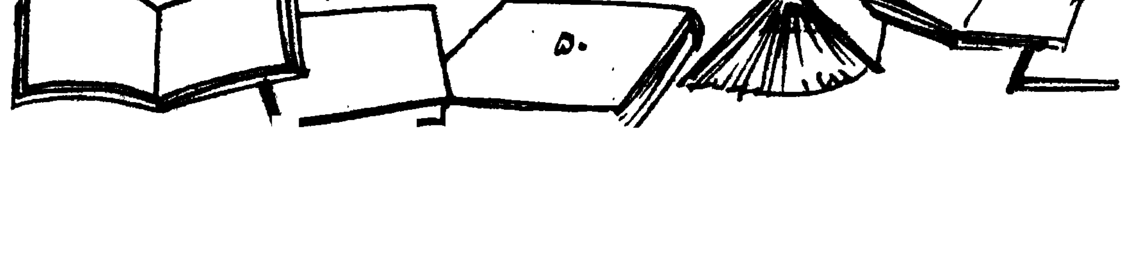
صاحبِ ذوق ہی کچھ فیض اٹھا لیتا ہے
دیتا رہتا ہے یہ بچوں کو پیامِ تعلیم

بادۂ علم سے مخمور ہے بچّہ بچّہ
تشنۂ علم نے پایا ہے جو جامِ تعلیم

تیز رو بنتا گیا بچوں کا بھی اسپِ خرد
اپنے ہاتھوں میں جو لی اس نے زمامِ تعلیم

"جامعہ" اس کا جو مسکن ہے تو اردو ہے مکیں
مخزنِ علم سے ملتا ہے "پیامِ تعلیم"

روشنی دیتا ہے بچوں کو یہ جا کر گھر گھر
ہے ضیا بار نثار اس کا نظامِ تعلیم



صف علی جامعی

ے کے کھیل



دٗ آج تمھیں جادو کے کچھ ایسے کھیل بتائیں جن سے
ں کو حیرت میں ڈال سکتے ہو۔

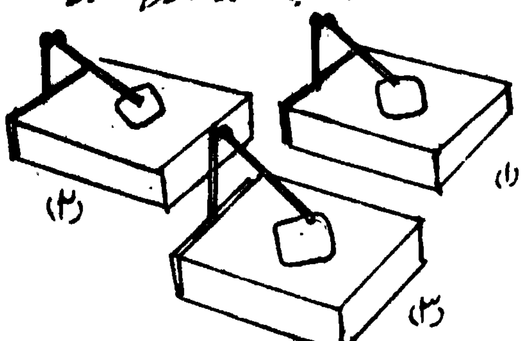
دو شیشے کے گلاسوں کو بغیر ہاتھ لگائے الگ کرنا۔



سب سے پہلے دو شیشے کے خالی گلاس لو اور انھیں
دیئے گئے طریقے سے ایک دوسرے میں فٹ کر دو۔
ب اپنے دوستوں سے کہو کہ وہ ان دونوں
ر ہاتھ لگائے الگ کر دیں۔
ب وہ ہار مان لیں تو تم انھیں دونوں گلاس بغیر
ک کرکے دکھا سکتے ہو۔
پر والے گلاس کے کنارے سے جہاں شکل نمبر ۲
لگا ہوا ہے دور سے پھونکو، دونوں گلاس ایک
سا ہو جائیں گے۔
ب تم اوپر والے گلاس کے کنارے سے پھونکو گے
اسوں کے بیچ کی جگہ سے داخل ہو کر گذرے گی
ہوں کے تلوں کے بیچ کی خالی جگہ میں بھر جائے
لے گلاس کے تلے کو دبائے گی جس سے وہ باہر

آجائے گا۔

(۲) ماچس کی تیلی کے نیچے سے تیلی کو بغیر ہلائے پیسہ نکالنا۔



ایک ماچس کی ڈبیا لو اور اس میں سے صرف تین تیلیاں نکال لو اور دو نئے پیسے کا ایک سکہ لے لو۔ اس سکے کو شکل نمبر ۱ میں دکھائے گئے طریقے سے ان تیلیوں کے نیچے رکھو (سکے کو ترچھی کھڑی ہوئی تیلی کے نیچے رکھو) اب اپنے دوستوں سے کہو کہ وہ سکے کو اس طریقے سے اس ترچھی تیلی کے نیچے سے نکالیں کہ تیلی نہ گرے۔ تمھارے دوست یہی کہیں گے کہ یہ ناممکن ہے۔
اس کے بعد تم سکے کو بغیر تیلی گرائے نکال کر بتاؤ گے وہ تمھارا لوہا مان لیں گے۔

طریقہ:۔ تیسری تیلی جو بچی تھی اس کو کسی دوسری ماچس کی ڈبیا سے رگڑ کر جلا لو اور اس کو دونوں تیلیوں کے پاس لے جاؤ۔ جیسا کہ شکل نمبر ۲ میں دکھایا گیا ہے۔ دونوں تیلیوں میں آگ لگ جائے گی، آگ لگتے ہی تم تیسری تیلی بجھا دو اور اس کو پیسے

ایک جادوگر کی کہانی

سمبرسک اور کوکوشکینو میں ایلیا نکولائیوچ اور
میریا الیگزینڈرروناالیانوف کے بچے چاہے گھر میں ہوں یا گھر
سے باہر طرح طرح کے کھیل کھیلتے ہیں۔

ننھے ولادیمیر (لینن) ان کے بھائی اور بہنیں سب
مل کر گھر میں ہوں تو آنکھ مچولی کھیلتے ہیں، پہیلیاں بوجھتے
ہیں، معمّے حل کرتے ہیں۔ شگافوں والی کشتی چلاتے ہیں،
جنگلوں میں چہل قدمی کرتے ہیں، پنجہ لڑاتے ہیں۔ ان کھیلوں
کی جن سے یہ بچّے واقف تھے یا جنھیں یہ بچّے ایجاد کرتے تھے
کوئی انتہا نہیں تھی اور خاص طور پر ولادیمیر (لینن) کے
کھیلوں کی۔ (جنھیں جاگتے میں خواب دیکھنے والا اور موجد
کہا جاتا تھا اور سب بچے انھیں مسرّت بانٹنے والا سمجھتے تھے)

ایک بار انھوں نے ایک بالکل نیا کھیل سوچا۔

یہ کھیل کچھ اس قسم کا تھا۔

شام کے وقت چراغ جلایا گیا جہاں تک بھی اس
کی روشنی جاتی تھی وہ جگہ بہت آرام دہ اور روشن نظر آنے
لگی جب کہ گھر سے باہر جہاں تک تاریکی تھی وہاں پُراسرار
اندھیرا چھا گیا۔

ماں اپنے معمول کے مطابق کبھی نہ ختم ہونے والے
گھریلو کام میں مصروف تھیں۔ اس دن شام کو وہ کچھ بُنائی
کررہی تھیں، باپ ہمیشہ کی طرح اپنے مطالعہ کے کمرے
میں کام کررہے تھے۔ سارے لڑکوں نے اپنا ہوم ورک
مکمّل کرلیا تھا اور اب ان کے پاس کوئی کام نہ تھا۔

سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ ہر ایک تندرست تھا
اور ولادیمیر خاص طور پر بہت مسرور اور مطمئن نظر آتے تھے۔

کھیل شروع ہوگیا ولادیمیر (لینن) اپنے کمرے
میں تھے۔ وہ ایک ساحر اور جادوگر تھے۔ ہر چیز ان کی
مرضی کے تابع تھی وہ کسی شخص کے ذہن میں آنے والے
خیالوں اور باتوں کو سمجھ سکتے تھے۔

دلودیا نے مانیا (ماریا) سے کہا کہ وہ الیگزینڈر
کے پاس جائے۔ بچے معلوم کرنا چاہتے تھے کہ الیگزینڈر
کے ذہن میں کیا ہے یہ بات کچھ حیرت انگیز بھی نہیں تھی
کیونکہ الیگزینڈر کو سب سے زیادہ قابل، سب سے ہوشیار
اور سب سے زیادہ منصف مزاج سمجھا جاتا تھا۔

مانیا الیگزینڈر کے پاس سے ایک سفید کاغذ
لے کر واپس آگئی۔ بہت غور سے دیکھنے پر بھی اس کاغذ
پر کچھ لکھا ہوا نہ ملا۔ نہ سیاہی تو سیاہی پنسل کا بھی کوئی نشان
نہیں تھا۔ اس کو کسی دوسرے کاغذ کے نیچے بھی نہیں
رکھا گیا تھا اور اس طرح اس پر کسی دوسرے کاغذ کی تحریر
کا کوئی نقش بھی نہیں ابھرا تھا، کاغذ بالکل صاف تھا
دلودیا نے اس کاغذ کو لے لیا، اسے سونگھا

شروع کیا۔

اس کے بعد انھوں نے کچھ ناقابل فہم اور
ہرانے شروع کر دیے۔

اش رو کے ہوئے انتظار کرتے رہے۔ کیا
رنا ہوگا؟ مانیا نے ایک اور کاغذ تھام رکھا
یڈر نے اپنے ذہن کی وہ بات لکھ دی تھی
نی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کاغذ ولودیا کو نہیں

بات ہے" یہ کہتے ہوئے ولودیا نے اس
سے لگایا اور پھر وہی سمجھ میں نہ آنے والے
اظ دُہراتے۔

کے بعد انھوں نے معزز "خواتین وحضرات"
ی کہ انھیں ایک منٹ کے لیے تنہا چھوڑ
۔ وہ اپنے کمرے کی اس خاموشی میں الیگزینڈر
ں کا پتہ لگا سکیں۔

کمرے سے چلے گئے۔

منٹ بعد ولودیا نے انھیں واپس بلایا اور
ساتھ اعلان کیا۔

سرار حل ہو جائے گا۔"

رت اور مسرت کی دبی ہوئی چیخیں اور آوازیں
۔ دوسرے کاغذ پر الیگزینڈر نے وہی بات
۔ ایک ایک لفظ وہی "اسرار حل ہو جائے گا"
ی نہیں جانتا تھا کہ ولودیا دوسرے آدمی
و کس طرح پڑھ سکتے ہیں۔ وہ الیگزینڈر کے
ساتھ سازش تو نہیں کر سکتے تھے۔ نہ مانیا نے ان سے کوئی سرگوشی کی تھی اور عام طور پر وہ ایک دوسرے کو دھوکا بھی نہیں دیتے تھے۔

ایک پیشہ ور بازی گر کی طرح ولودیا عین اس وقت جب کہ ان کے کارناموں کی تعریف و ستائش زوروں پر جاری تھی دائیں اور بائیں سر کو خم کرتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔

"خواتین وحضرات" فوراً الیگزینڈر کے پاس جا پہنچے۔ الیگزینڈر جو عموماً مغموم اور الگ تھلگ رہا کرتے تھے انھوں نے بھی ظاہر کیا کہ وہ بھی اتنے ہی حیران ہیں جتنے دوسرے بچے۔

"کیا؟ اس نے پہچان لیا؟ ایک ایک لفظ؟ ایک معجزہ؟ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہمارا ولودیا واقعی ساحر اور جادوگر ہے۔ کیا اس نے معمولی سی غلطی بھی نہیں کی؟"

"نہیں"

"ایک ایک لفظ" ساشا نے خوشی سے چلّا کر کہا۔

"ایک ایک لفظ۔ اسرار حل ہو جائے گا۔"

"ہاں" ساشا نے کہا "عجوبہ ہے عجوبہ"

ساشا سے کسی بات کا پتہ نہ چلنے پر "خواتین و حضرات" پھر ولادیا کے پاس جا پہنچے۔ ولودیا نے اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ میں کہہ سکتا ہوں۔ یہ ایک معجزہ تھا اور بس!

"کیا تم اس معجزے کو دہرا سکتے ہو؟" مانیا نے

اچانک پوچھا۔

"اگر آپ چاہیں تو"

اور ایک بار پھر ولودیا نے اس خیال کو جو ساشا نے لکھا تھا ایک ایک لفظ کر کے دوہرایا۔

کسی کی بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ آخر مانیا نے پوچھا۔

"کیا تم میرے ذہن کی بات پہچان سکتے ہو؟"

"تمھارے؟" ولودیا نے پوچھا۔

"ہاں میرے، ولودیا" مانیا نے جواب دیا۔

"میں جانتا ہوں تمھارے ذہن میں کیا ہے"

ولودیا نے وقار کے ساتھ کہا۔ "ہر ایک کو دیانت دار اور نیک ہونا چاہیے۔"

"یہ تو وہی بات ہے ولودیا جو تم بھی سوچتے ہو لیکن تم نہیں جانتے کہ اب میں کس چیز کے بارے میں سوچنے والی ہوں"

"یہ صحیح ہے" ولودیا نے اتفاق کیا۔

"کیا تم اس کا اندازہ لگانے کے لیے تیار ہو؟"

لیکن ولودیا نے اس راز کو کھول دینا ہی بہتر سمجھا۔

وہ "خواتین و حضرات" کو ساتھ لیے ساشا کے کمرے میں پہنچے۔ ساشا کے کمرے میں دودھ کا ایک پیالہ رکھا تھا۔ ولودیا نے ایک صاف قلم کو اس میں ڈبویا اور اس سے ایک کاغذ پر لکھا "میں ایک ساحر اور جادوگر ہوں،" دودھ خشک ہو گیا اور کاغذ پر اس کی کوئی نشانی بھی نہیں تھی۔ اس کے بعد انھوں نے کاغذ کو چراغ کے نزدیک پکڑ کر گرمی دکھائی اور اس پر الفاظ بتدریج ابھرنے لگے "میں ایک ساحر اور جادوگر ہوں"

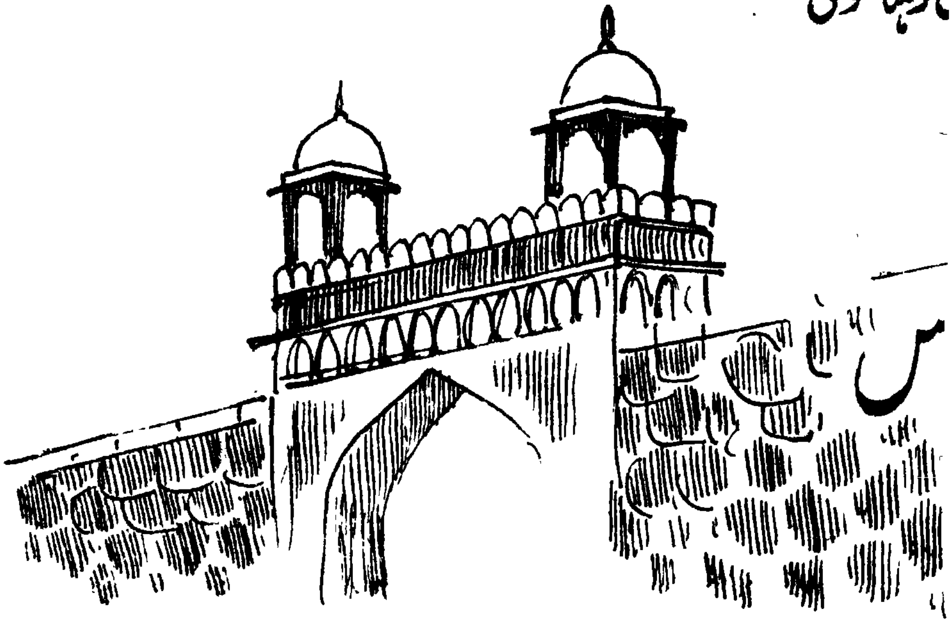
ولادیمیر ایلیچ الیانوف جب سینٹ پیٹرز برگ کی جیل میں تھے تو انھوں نے اپنے بچپن کے اس کھیل کو یاد کیا۔

انھوں نے روٹی کے ایک ٹکڑے سے دوات بنائی۔ اسے دودھ سے بھر لیا اور کتابوں میں سطروں کے درمیان لکھنے لگے۔ انھوں نے وارڈن کو اپنی نگرانی کرتے دیکھ لیا تو انھوں نے اس دوات کو کھا لیا۔ نظر نہ آنے والی تحریروں کی یہ کتابیں باقاعدہ کے ساتھ جیل سے باہر لے جائی جاتی تھیں — ان کاغذوں کو شعلہ دکھا کر گرم کیا جاتا تھا اور ۲۰ سال پہلے کی طرح ان پر نظر نہ آنے والی تحریریں ابھر آتی تھیں لیکن اس بار ان پر بچپن کے قصے کہانیاں نہیں بلکہ ہینڈ بل اور پمفلٹ ہوتے تھے جن میں مزدوروں سے اپیلیں اور پارٹی کے پہلے پروگرام کا ابتدائی خاکہ درج ہوتا تھا۔

ایک طالب علم کی کہانی

مدہولی صاحب کی تصانیف تعلیمی میدان میں ایک نایاب حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کی یہ کتاب دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی جس سے بچے اور بڑے سب ہی کچھ نہ کچھ سیکھ سکتے ہیں اس کتاب پر مرکزی سرکار سے انعام بھی مل چکا ہے۔ قیمت: -/۲

ر رہتاسوی



س

جنوری سنہ کے سالنامہ میں جناب
ب مضمون بعنوان "سہسرام" پڑھا ہوگا۔
مضمون ہے۔ یہ مضمون اس سلسلے کی
ہے۔

اس صوبہ بہار ضلع شاہ آباد میں سہسرام
میل اور اکبر پور نامی قصبہ سے پچھم کی طرف
ر وندھیاچل کے پہاڑی سلسلے کے
ہے۔

کے بارے میں پتہ نہ چل سکا کہ کب بنا ہے
ں خاندان کے ایک نامور راجہ ہرش چندر
کے بعد اس کا بیٹا راجہ روہت جانشین
لعہ میں اور محل بنوائے اور کیمور کی
پر ایک مندر بھی بنوایا یہ رہتاس مندر
پڑا۔ پھر تو لفظ رہتاس کو اتنی شہرت
تاس علاقہ کہا جانے لگا۔ مندر آج تک

موجود ہے۔ اس کی بناوٹ بتاتی ہے کہ دو ہزار سال سے بھی پہلے کا ہے۔

جب مغل بادشاہوں کا دور آیا تو انھوں نے رہتاس نام کا پرگنہ قائم کیا۔ جس کا صدر مقام یہیں تھا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس نام کی کوئی آبادی نہیں ہے۔ کیمور پہاڑ سے متصل اکبر پور نام کی ایک بستی ہے جسے علاقہ میں مرکزیت حاصل ہے۔

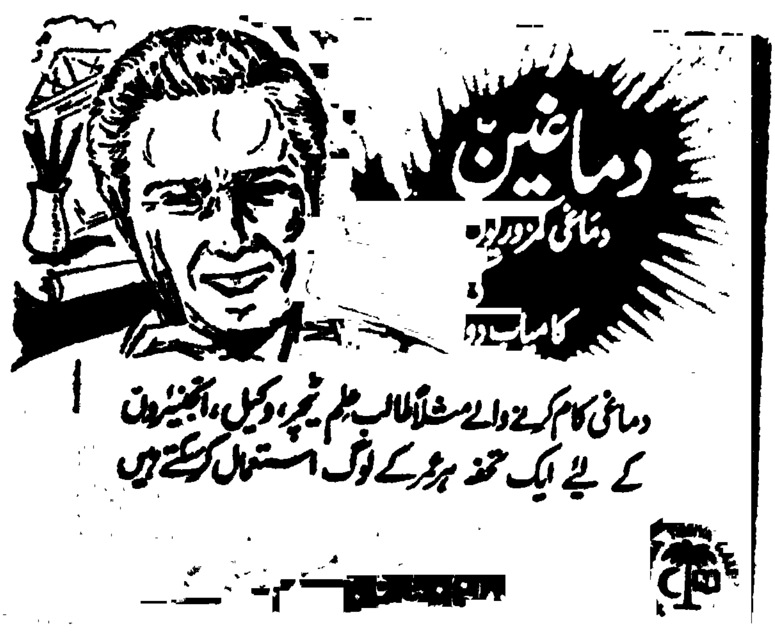
قلعہ بہت ہی پُر فضا مقام پر بنایا گیا ہے۔ زمین سے لگ بھگ ۴ ہزار فٹ اونچا ہے۔ چاروں طرف جنگلی جھاڑیاں اور درخت ہی درخت ہیں۔ برسات میں تو یہاں بڑی بہار ہو جاتی ہے۔ جھاڑیوں کی ہریالی اور چشموں اور نالوں کا بہنا یہ سب ایسا منظر ہے جسے دیکھ کر وہاں سے واپس آنے کو جی نہیں چاہتا۔

اس وقت کی عمارتوں میں سوائے رہتاس مندر کے اب کچھ موجود نہیں ہے۔ قلعہ کے موجودہ محلوں میں

سے اکثر مغل اعظم شہنشاہ اکبر اور شاہ جہاں کے عہد کے بنے ہوئے ہیں۔ وہاں لگے ہوئے فارسی کے ایک کتبہ سے یہی معلوم ہوتا ہے۔ یہ قلعہ تقریباً ۲۸ میل میں پھیلا ہوا ہے۔ جگہ جگہ پہاڑ کے کناروں پر دشمن سے حفاظت اور مقابلے کے لئے مورچہ بندی ہے۔

اس قلعہ کو سب سے پہلے ۱۵۳۹ء میں شیر شاہ نے راجہ ہرکشن سے چھین کر اپنے قبضہ میں لیا۔ اس کے بعد شہنشاہ اکبر کے عہد میں راجہ مان سنگھ ناظم بنگال و بہار نے ۱۵۹۶ء میں اس قلعہ کی زیب و زینت میں قابلِ قدر اضافہ کیا۔ ۱۶۲۴ء میں شہزادہ خرم یعنی شاہ جہاں نے اپنے والد جہانگیر سے بغاوت کی تھی تو اپنے کنبے کو اسی قلعہ میں رکھا تھا۔ پھر اخیر زمانہ میں قاسم علی ناظم بنگال و بہار نے بھی اپنی بیگمات اور بے شمار خزانوں کو انگریزوں کے وقت یہ چھپا یا تھا اور اسی کے عہد میں انگریزوں نے اس پر بھی کیا۔ یہاں قلعہ کی عمارت کے علاوہ شیر شاہی م حبش خاں کا روضہ، خواجہ سرا کی مسجد اور حضرت بہا کا مزار بھی دیکھنے کے قابل جگہیں ہیں۔ موجودہ دور میں عمارت کی دیکھ بھال محکمہ آثار قدیمہ کر رہا ہے۔ لیکن ج ہندوستان کے دوسرے کام بے توجہی کا شکار ہیں ا یہاں کی تاریخی عمارتیں بھی لاپرواہی کی نذر ہو ر اور دن بدن کھنڈر بن رہی ہیں۔

اس قلعہ تک پہنچنے کے لیے نیچے سے کئی ہیں مگر اکبر پور کے پاس سے جو راستہ جاتا ہے لوگ پھر اسی راستے سے زیادہ آتے جاتے ہیں





ب دو طرح سے دیکھے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ خواب
دیکھتے ہیں ان پر کسی کا اختیار نہیں، سوتے
دیکھتے ہیں ان میں ہم کبھی تو خود کو حلوہ کھاتا
کبھی ماسٹر صاحب کی چھڑیاں۔

ے خواب وہ ہیں جو ہم جاگتے ہوئے میں دیکھتے
ہیں جو چھوٹے بڑے، امیر غریب، سب ہی
آپ ہوائی قلعے کہہ لیجیے۔ کیوں کہ ایسے
نہ تو ٹکٹ خریدنے کی ضرورت اور نہ کہیں
جہاں اور جس وقت چاہا ایک اچھا سا خواب
ائی قلعہ بنا ڈالا۔

ں جاگتے میں خواب دیکھنے کی عادت تھی۔
زیدار خواب دیکھا کرتے تھے ہم، لیکن ان
مانہ پیر۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ ہم کلاس میں
کی دنیا میں نکل جاتے تھے اور واپسی اسی
ب ماسٹر صاحب کی گرجدار آواز ہمارے کانوں

ں کے دنوں میں خواب دیکھنے کی رفتار کچھ زیادہ
ں۔ مثلاً جغرافیہ پڑھتے پڑھتے ہم یہ خواب
ہم ہوائی جہاز پر سوار دنیا کی سیر کر رہے ہیں۔

کہ ہم بہت بڑے سائنس دان بن گئے ہیں اور راکٹ بنانے
میں مصروف ہیں ـــــ اچانک مچھر کاٹتا تو چونک پڑتے۔
گھڑی دیکھتے تو پتہ چلتا کہ آدھا گھنٹہ گزر چکا ہے۔ غرض ان
جاگتے ہوئے خوابوں کے دیکھنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم چھٹی کلاس
میں فیل ہو گئے۔

فیل ہونے کا ہمیں بڑا صدمہ ہوا۔ خواب تو اتنے
اچھے اچھے دیکھے تھے اور ہو گئے فیل ـــــ ہم نے کافی سوچنے
کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ خواب دیکھنا بیکار ہے۔

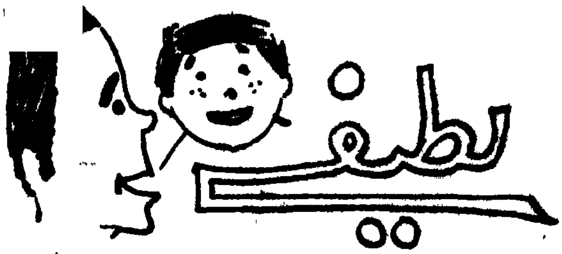
ہوگا وہی جو قسمت میں لکھا ہے۔

فیل ہو جانے کے بعد پڑھنے لکھنے میں ہمارا دل
نہیں لگا۔ کیوں کہ ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ہوگا وہی
جو قسمت میں لکھا ہے۔ چاہے پڑھیں یا نہ پڑھیں۔

تعلیم کی طرف سے لاپرواہی دیکھ کر ایک دن ہمارے
دادا جان نے ہمیں اپنے پاس بلایا اور بڑے پیار سے نہ پڑھنے
کی وجہ پوچھی۔ دادا جان کے پیار سے دل بھر آیا ہم نے سسکتے
ہوئے دل کی بات کہہ دی "پڑھیں یا نہ پڑھیں ہوگا وہی
جو ہماری قسمت میں لکھا ہے"

دادا جان نے کہا "نہیں بیٹے یہ بات نہیں ہے۔
ـــــ دیکھو نہ تم یہ سوچو کہ قسمت میں کیا لکھا ہے اور نہ کچھ
اور سوچو... بس دل لگا کر پڑھتے جاؤ... کامیابی خدا پر چھوڑ دو"

دادا جان کی بات ہمارے دل میں بیٹھ گئی۔ ہم نے
اس پر ایمان داری سے عمل کیا۔ خواب دیکھنا تو چھوڑ ہی
دیا تھا، نتیجہ یہ ہوا کہ ششماہی امتحان میں اچھے



اچھا بھئی چاہے آپ کو یقین آئے یا نہ آئے ہمارے
ماسٹر صاحب نے کبھی گھوڑے کی صورت ہی نہیں دیکھی۔
" ناممکن، بالکل ناممکن "
سچ جانو، میں گھوڑے کی تصویر بنا کر لے گیا اور
وہ پوچھنے لگے یہ کیا چیز ہے؟

کیوں بھئی! تم کیوں اس قدر چیخ چیخ کر رو رہی ہو؟
ممی نے کہا تھا موٹر گزر جائے تو سڑک پار کرنا۔
مگر اتنی دیر ہو گئی کوئی موٹر ہی نہیں گزری۔

استاد نے درجے میں کہا' خاموش ہو جاؤ۔
سوئی گرنے کی آواز بھی کانوں میں نہ آئے۔
بچے کچھ دیر تک تو خاموش رہے۔ پھر ایک چنچل
لڑکے سے ضبط نہ ہو سکا، گھبرا کر بولا " ماسٹر صاحب!
سوئی کب گرے گی؟"

ایک بات بتائیے۔ یہ کلاک کی چھوٹی سوئی بڑی
سوئی سے موٹی کیوں ہوتی ہے۔؟
اس لیے کہ وہ برائے نام حرکت کرتی ہے۔

ارے ننھو بھئی ایک بات میرے ذہن میں
آئی ہے۔ وہ یہ کہ ہمارے اسکول میں شیر پال لیا جائے
تو کیسا رہے؟
بھئی خوب سوچی پر اسے کھلاؤ گے کیا۔؟
ہونہہ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ وہ خود
شکار کرنے چلا جایا کرے گا۔"

استاد:۔ کیوں بھئی حامد تمھیں اپنے سر کے اوپر
کیا نظر آتا ہے۔؟
حامد:۔ آسمان۔
استاد:۔ اور جب مینہ برستا ہو؟
حامد:۔ چھتری۔
(اسپتنک ——)

بقیہ جادو کے کھیل

کے پاس لے جاؤ۔ جیسا شکل نمبر ۳ میں دکھایا گیا ہے۔ تم دیکھو گے کہ تھوڑی دیر میں ترچھی کھڑی ہوئی تیلی پیسے کے اوپر سے تھوڑا سا اوپر اٹھ جائے گی اور تم پیسے کو بجھتی ہوئی تیلی سے آہستہ سے سرکا سکتے ہو۔ یہ لو بھئی پیسہ بھی نکل گیا اور تیلیاں بھی نہیں گریں ہے نا حیرت کی بات؟

جب دونوں تیلیوں میں جو آپس میں جوڑ کر رکھی گئی ہیں۔ آگ لگتی ہے تو دونوں ایک دوسرے سے چپک جاتی ہیں اور جلنے کے دوران ایک تناؤ پیدا ہوتا ہے چونکہ کھڑی تیلی ماچس کی ڈبیا میں دبی رہتی ہے۔ ہل نہیں پاتی بلکہ ترچھی کھڑی ہوئی تیلی بالکل آزاد کھڑی ہوتی ہے اور تناؤ سے متاثر ہو کر ذرا سا اوپر اٹھ جاتی ہے۔ اور تم کو موقع مل جاتا ہے پیسے کو نکالنے کا۔

اسکولوں کی تعلیمی و تفریحی سرگرمیاں

ں کرنے کے لیے جذبہ اور دھن

علوم امدادیہ بمبئی میں حضرت مولانا قاری محمد
نے فرمایا کہ تحصیل علم (علم حاصل کرنے) میں
سب سے پہلے طالب علم میں جذبہ اور دھن
ہے" حضرت مولانا قاری صاحب نے
یرت افروز بنیادی باتیں بتائیں۔ آپ نے فرمایا
ں (مدرسہ امدادیہ) جیسے ہزاروں مدرسوں
"

من جانب اراکین دارالعلوم امدادیہ بمبئی ۱

ہائی اسکول میں تعلیمی نمایش

نیر الاسلام ہائی اسکول مدن پورہ کے اہتمام
نمایش کا انتظام کیا گیا۔
ایش کو نہ صرف آس پاس کے ہائی اسکولوں
ے اسکولوں کے بچوں نے دیکھ کر اپنی
ضافہ کیا۔ نمایش بڑی خوبصورتی سے
ور ہائی اسکول کے بچوں کی سلیقہ مندی
ی کا بہت اچھا نمونہ تھا۔ سائنس کلب
ننگ کے آئٹم بے حد پسند کیے گئے۔
کو پہلے محمد بیگ ہائی اسکول میں پہلا
ماں بھی بچوں اور مہمانوں کی توجہ کا مرکز
۳۱ مارچ تک رہی۔

احمد سیلر ہائی اسکول کے قدیم طلبہ کی انجمن

ہائی اسکول ہیڈ ماسٹر جناب مقادم صاحب کی اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کے قیام کی تجویز کے سلسلے میں اسکول کے ہال میں ایک خاص جلسہ ہوا جاوید اقبال صاحب صدر تھے۔ صدر نے فرمایا کہ پچھلے سابق طالب علموں نے کچھ وعدے کیے تھے۔ ان وعدوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے۔ ان طالب علموں سے رابطہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے، آپ کی تجویز پر ایک رابطہ کمیٹی بنائی گئی عرفان صاحب اور شیخ حسین صاحب اس کمیٹی کے انچارج بنائے گئے۔

ثانوی مدرسوں کے طالب علموں کو بھی۔ کھیل کود کے وظیفے ملیں گے

ہند سرکار نے ایک اسکیم منظور کی ہے اس اسکیم کے ماتحت ۷۰-۱۹۷۱ء میں کھیل کود کے مقابلوں میں امتیازی حیثیت حاصل کرنے والے طالب علموں کو یہ وظیفے دیے جائیں ان وظیفوں کی تعداد دو سو ہے۔ ایک وظیفہ پچاس روپے ماہوار کا ہے۔ اس کے علاوہ ریاستی یا صوبائی سطح پر بہترین صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے والے طلبا کو بھی وظیفے دیے جائیں گے۔ یہ چار سو وظیفے ہیں اور ایک وظیفہ ۲۵ روپے ماہوار کا ہے۔ ان۔ آئی۔ اس پٹیالہ کے ڈائرکٹر صاحب سے تفصیل معلوم کی جاسکتی ہے۔

اردو اسکول ملیان (دھانو روڈ) میں جشنِ اساتذہ

۵ ردسمبر کو اس اسکول میں یوم اساتذہ کے موقع پر اسکول کے بچوں کی انجمن کے ادارے "بزم اردو ادب" کے زیرِ اہتمام ایک مختصر مگر پُر تکلف تقریب منائی گئی۔

اس جلسہ کی خصوصیت یہ تھی کہ صدارت کا انتخاب تقریریں اور اناؤنسنگ یہ تمام چیزیں لڑکوں نے خود کیں اور اسقدر بہتر انتظام رہا کہ حاضرین (جو کافی تعداد میں تھے) بے حد لطف اندوز ہوئے۔

صدارت کے لیے جناب سردار کلدیپ سنگھ چڈھا صاحب کا نام طلبا نے پیش کیا۔ یہ مشہور بزنس مین ہیں اور سماجی کاموں میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔

صدر کے انتخاب کے بعد بزم اردو ادب کی سکریٹری مہرالنساء منیر خان نے مختصراً جلسے کی غرض و غایت بتائی اور اناؤنسنگ کے فرائض انجام دیے۔ طلبا کی تقریروں کو کافی پسند کیا گیا۔ آخر میں حاضرینِ جلسہ میں سے غلام حسین صاحب، مولوی مختار صاحب، اسمٰعیل ملتی صاحب، محبوب خان صاحب۔ ادموسیٰ بھا آدم جی نے تقریریں کیں۔

سردار کلدیپ سنگھ صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں اساتذہ کو خراجِ عقیدت پیش کیا اور طالب علموں کو اس تقریب کے منعقد کرنے پر مبارک باد دی۔

گلپوشی اور راشٹریہ گیت کے بعد جلسہ بحسن و خوبی ختم ہوا۔

کمال خاں نظام خان

صدر بزمِ اردو ادب

بچّوں کے لئے دلچسپ کہانیاں

منحوس محل	سجاد رحیم	/۲۵	بنارسیا شہزادی	محمد مجیب یوسفی	/۲۵
طلسمی دوربین	شکیلہ امین	/۲۵	جادو کی گڑیا	صبیحہ بیگم یوسفی	/۳۰
ضدی شہزادی	صدیقہ بیگم یوسفی	/۲۵	نیلا گلاب	" "	/۳۰
نیلم شہزادی	" "	/۲۵	چوری کا خزانہ	" "	/۲۵
لے پالک شہزادہ	" "	/۲۵	زمرد پری	عذرا بیگم یوسفی	/۵۰
قاتل بادشاہ	محمد مجیب یوسفی	/۵۰	گلفام کی انگوٹھی	عذرا بیگم یوسفی	/۳۰
بولتا پہاڑ	" "	/۳۰	انوکھا تحفہ	" "	/۲۵
سونے کی گائے	" "	/۳۰	پانچ بہادر دوست	" "	/۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال بمبئی ۳۔ بی۔ آر

بچوں کی کوششیں

...کرنے کے بعد سائنسداں کیوں بننا چاہتا ہوں؟

...اطفال خضر پور مسلم جونیر ہائی اسکول کے ایک ...لے میں پڑھا گیا اور اوّل انعام کا مستحق سمجھا گیا۔ ...پنی پوری تعلیم حاصل کرنے کے بعد ایک ...نا چاہتا ہوں۔ تاکہ اپنے سائنس کے علم سے ...فائدہ پہنچا سکوں۔ ایسی ایسی چیزیں ایجا... ...ے راز سربستہ کا انکشاف کرسکوں جن سے ...طرح فائدہ اٹھا سکیں جس طرح ایک ...نے سیفٹی لیمپ ایجاد کرکے لاکھوں کان ...ظیم کیا۔ ان کی جانیں بچنے لگیں۔

...ہ بھی وقت تھا کہ انگلینڈ کے کانوں میں ہر ...کن مر جاتے تھے۔ مگر جب سے سیفٹی لیمپ ...نوں کی جانیں بچنے لگیں۔ پھر ایک سائنس ...ذ کیا جس کی وجہ سے کروڑوں لوگ ...ہیں اور جب تک دنیا قائم رہے گی۔ اس ...سے فائدہ اٹھاتے رہیں گے۔

...ٹی لیمپ کا موجد روپے کا لالچی ہوتا تو وہ ...و پیٹنٹ کرکے لاکھوں روپیہ سالانہ حاصل ... انسانیت کی خاطر ایسا نہ کیا۔ حالاں کہ ...نے اسے پیٹنٹ بنانے کا مشورہ دیا تھا۔

لہٰذا میں بھی اسی طرح لوگوں کی خدمت کروں گا۔ اور لوگوں کو حتیٰ المقدور فائدہ پہنچانے کی کوشش کروں گا۔ یہ ذریعہ لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے بہت ہی اچھا اور مفید ہے۔ بڑے بڑے اور مخلص سائنسدانوں نے دنیا کے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچایا ہے۔

لہٰذا انھی بنیادوں کی وجہ سے میں ایک اچھا سائنسداں اپنی تعلیم کو مکمل کر لینے کے بعد بننا چاہتا ہوں۔ خدا اس نیک اور عظیم مقصد میں کامیابی عطا کرے۔ تاکہ میں بنی نوع انسان کی بھلائی کرسکوں۔ اور ان کو فائدہ پہنچا سکوں۔ وما توفیقی الاّ باللہ۔

سید شاہد جمیل درجہ ہشتم کلکتہ

لطیفے

(نئے ہوٹل کا مالک گاہک سے۔) آپ کو میرے ہوٹل کا کھانا کیسا لگا؟"

گاہک منھ بنا کر "کھانا تو اچھا لگا لیکن بل اچھا نہیں لگا۔

مالکن نوکرانی سے "تم اپنی تنخواہ سے زیادہ کے برتن توڑ دیتی ہو، تمھیں تنخواہ کیا دوں۔؟"

نوکرانی۔ "جی تنخواہ بڑھا دیجیے"

سڑک پر جاتے ہوئے ایک بھکاری نے بابو سے پوچھا "آپ کا بٹوا تو نہیں کھو گیا ؟"

بابو نے اپنی جیب ٹٹول کر کہا "نہیں تو"

"تو پھر خدا کی راہ میں ایک پیسہ دے دیجیے، بہت بھوکا ہوں"

ایک بھلے آدمی سڑک پر جا رہے تھے۔ ایک بھکاری نے آگے بڑھ کر ہاتھ پھیلا دیے۔ جیسے کچھ مانگتا ہو، بھلے آدمی نے اکنی دے دی اور پوچھا "تم گونگے کب سے ہو ؟"

"جنم سے بابو جی !" گونگے نے جواب دیا۔

دندان ساز مریض سے: "تھوڑا اور منھ کھولیے۔ اور۔ تھوڑا اور۔ اور !"

مریض گھبرا کر: "کیا آپ میرے منھ میں بیٹھ کر علاج کرنا چاہتے ہیں !"

جیلر (قیدی سے) "تمھارے رشتے دار، دوست احباب کبھی تمھیں خط نہیں لکھتے۔ ؟"

قیدی: "اس کی ضرورت ہی نہیں پڑتی !"

جیلر "کیوں ؟"

قیدی: "سب یہیں ہیں !"

نوشاد اسرار ندوی

اچھے بچے

چنو، منو اور عمران — یہ لو اپنا اپنا سامان،
اپنی اپنی جگہ پہ جاکر — بیٹھ جاؤ تم فوراً جاکر
جلدی جلدی کام کرو تم — سارے جہاں میں نام کرو تم
جو بچے محنت کرتے ہیں — دنیا میں شہرت پاتے ہیں
جو ہوتے ہیں سست اور کاہل — رہ جاتے ہیں ان پڑھ جاہل
برے کام جو ہیں اپناتے — مار وہ خوب ہیں کھاتے
کام میں جو ہیں جی کو لگاتے — برفی، پیڑا، لڈو کھاتے
کام سے جو ہے جی کو چراتا — کھانے میں صرف دال ہے پاتا
جو ہیں بڑوں کی عزت کرتے — کام ہیں خوب ہیں محنت کرتے
برے کاموں سے بچتے ہیں جو — کسی سے نہیں لڑتے ہیں جو
دنیا بھر میں نام ہیں پاتے — چاند پہ بھی وہ پہنچ ہیں جاتے
تم بھی بچو ہو جاؤ اچھے — کھاؤ پھر انگور کے گچھے
چڑھ جاؤ گے چاند کے اوپر — اس دنیا سے بہت ہی اوپر

محمد عرفان فاروقی

اچھی باتیں

علم حاصل کرنے میں ہرگز شرم نہ کرو۔ ثابت قدمی کامیابی کی دلیل ہے۔ اپنی سربلندی چاہتے ہو تو اپنی مادری زبان استعمال کرو۔ سچ بولو ہمیشہ سچ کی فتح ہوتی ہے۔ علم و ہنر سے آدمی کی عزت ہوتی ہے۔ اتحاد و اتفاق بڑے بڑے طوفانوں کو روک دیتا ہے۔ پڑوسی کو ستانے والا کبھی اطمینان سے نہیں رہ سکتا۔ قوم کے ساتھ غداری کرنے سے مر جانا بہتر ہے۔

عقیل

اِدھر اُدھر سے

...سال کی عمر میں انتقال ۔

...ا ر دن ۸ / اپریل ۔ الجزائر کا ایک کسان ادابن
...ے دودھ اور شمالی افریقہ کی مشہور خوراک "بربسیہ"
...شت اور غلّہ پکاتے ہیں) کھاتا تھا یہاں ۱۴۵
...ہیں چل بسا۔ اس کے ۲۲ بچّے پیدا ہوئے اور
...سے شادیاں کیں۔ اس کی سات بیویاں اور
...سے پہلے انتقال کر چکے ہیں ۔

...نا کا ٹکڑا نہیں :۔

...ریکہ کے خلاباز چاند کی مٹی زمین پر کیا لائے کہ
...ے بڑے خلاباز اس کی طرف جھک پڑے۔ اس
...ں لگ گئے۔ اس جانچ کے وقت انھوں نے
...ر کے پتھر ۳ر۲ اور ۴ر۶ ارب
...ہیں۔ ان کے مقابلے میں زمین کے پتھر تین ارب
...ہیں۔ اس سے سائنس والوں کے اس خیال
...دد پر تسدید ہوتی ہے کہ چاند زمین ہی کا ایک
...ہے ۔

...مرے چاند پر جو ملبا پایا جاتا ہے۔ وہ بڑے
...ں کے گرنے سے پیدا ہوا ہے۔ اسی طرح چاند
[illegible]

داغ دار بنا دیا ہے۔ بالکل جیسے کوئی چیچک کا مارا چہرہ۔
یہ گڑھے بھی جوالا مکھی یا آتش فشاں پہاڑی سلسلوں کے
لا متناہی دہانے نہیں بلکہ انھی ٹوٹے ہوئے ستاروں کے
ٹکراؤ سے پیدا ہوئے ہیں۔ (اطلاعات جرمنی سے ماخوذ)

دس برس کے بچے کو سانپ نے نگل لیا۔

یہ انڈونیشیا کے سماترا کے جزیرے کا واقعہ ہے۔
بچہ دھان کے کھیت میں سو رہا تھا کہ تیس فٹ لمبے سانپ
نے اس پر حملہ کر دیا اور اسے نگل گیا۔ بچے کے ماں باپ
جب تک پہنچیں پہنچیں سانپ بچے کو سارا کا سارا نگل چکا
تھا۔ صرف ٹانگیں باہر رہ گئیں تھیں۔ لوگوں نے اُسے
سانپ کے منہ سے نکال تو لیا، پر وہ مر چکا تھا۔

بلّی نے جان بچائی :۔

ننھے تھوماس کی عمر ابھی کل ۲۱ مہینے کی ہے۔
ابھی یہ بات وہ پوری طرح نہیں سمجھ پاتا کہ فوٹوگرافر اس
سے کیا چاہتے ہیں۔ پر اتنا سمجھتا ہے کہ اس کی بلّی "منکا"
نے اس کی جان بچائی۔ تھوماس مغربی جرمنی کے مشہور شہر
[illegible]

پڑوسی کے باغ میں کھیل رہا تھا۔ کھیلتے کھیلتے ایک ڈیڑھ گز گہری نالی میں گر گیا۔ یہ دیکھ کر منکا نے اس قدر زور سے میاؤں میاؤں کیا کہ تھوباس کی ماں گھبرا کر گھر سے نکل آئی اور ڈوبتے ہوئے تھوباس کو باہر نکال لیا۔ تھوباس کے دل پر ایک طرح کا ہول تو ضرور بیٹھ گیا۔ زکام بھی ہو گیا مگر کوئی اور تکلیف نہیں پہنچی (اطلاعات جرمنی)

(تصویر ٹائٹل کے دوسرے صفحے پر دیکھیے)

کیا گلاب کا پھول سونگھنے سے عمر بڑھتی ہے؟

جامعہ اسٹوٹ گارٹ کے ادارۂ نباتات کے ایک نوجوان لیکچرر نے ایک دلچسپ انکشاف کیا ہے۔ گلاب کے پھول کو برابر سونگھتے رہنے سے اور اسے اپنے پاس رکھنے سے انسان کی عمر بڑھتی ہے۔ اس کی خوشبودار خوشبو ماحول کو خوشگوار بناتی ہے۔ خون کے دباؤ کو معتدل رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ انسان کی توجہ کو دوسرے پریشان کرنے والے خیالات سے ہٹا کر اچھے خیالات کی طرف مائل کرتی ہے۔ پھولوں کا گلدستہ کمرے کو جراثیم سے پاک کرنے کا آسان ذریعہ ہے۔

جرمنی کے پچھلے چانسلر جناب کونراڈ اڈنے ناور کو گلاب کے پھولوں سے عشق تھا۔ انھوں نے ۹۱ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ کہتے ہیں کہ ان کی اس لمبی عمر کا غالباً راز یہی گلاب سے عشق تھا۔ ہندوستان کے محبوب رہنما آنجہانی پنڈت جواہر لال کی شیروانی میں گلاب کا پھول ضرور ہوتا تھا۔

معذور انسانوں کے اولمپک کھیل:۔

اور سنیے! وفاقی (مغربی) جرمنی میں دنیا بھر کے معذور لوگوں کے لیے اولمپک کھیلوں کا انتظام کیا گیا۔ کھیلوں کا انتظام کرنے والوں نے مقابلوں میں حصہ لینے والوں کے لیے سنہرے تمغوں کا انتظام کیا ہے۔ جرمنی کے ایک صاحب ہارٹموٹ کلاتن نے ان اولمپک کھیلوں میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ ان کے نیچے کے دھڑ پر فالج گرا ہے۔ وہ اپنی پہیوں والی کرسی پر بیٹھ کر ٹیبل ٹینس کھیلتے ہیں۔ انھیں گیند پر کڑی ضرب لگانا خوب آتا ہے۔ کھیلتے وقت انھیں اس کرسی پہ بیٹھے بیٹھے اِدھر سے اُدھر گھومنا پڑتا ہے۔ اور اس لیے اپنی ٹانگیں چلانا پڑتی ہیں۔ انھوں نے ٹیبل ٹینس کے علاوہ نیزے بازی، چکر اور تنگ پھینکنے کے اور گولوں سے نشانہ لگانے کے مقابلوں میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ انھیں یقین ہے کہ نہ ایک نہ ایک سنہری تمغہ جیتنے میں ضرور کامیاب ہوں گے

(تصویر سامنے والے صفحے پر) (اطلاعات جرمنی)

لینن کی کتابوں کا ترجمہ ۲۲۲ زبانوں میں:

یونسکو کی ایک رپورٹ کے مطابق لینن کی کتابوں کا ترجمہ دنیا کی ۲۲۲ زبانوں میں ہوا ہے۔ یوں سمجھیے کہ لینن کی کتابیں اس سلسلے میں سب سے اوّل ہیں اور دوسرے درجہ ایک فرانسیسی مصنف جارج سیمنن کا ہے۔ ان کی کتابوں کا ترجمہ دنیا کی ۱۴۳ زبانوں میں ہوا ہے۔ تیسرے نمبر پر انگلستان کا بچوں اور لڑکیوں کے لیے کتابیں لکھنے والی اینڈ بلائٹن ہے۔ اس کی کتابوں کا ترجمہ دنیا کی ۱۲۸ زبا

Payam - i - Taleem
NEW DELHI-25.

ان کتابوں کو اپنی لائبریری کی زینت بنائیے

پوتے دادا	۱/۷۵	[illegible]	۱/۵۰
سمندر کے نیچے	۲/-	ہماری پارلیمنٹ	۱/۵۰
سمندر کے کنارے	۱/۱۲	[illegible]	۱/۰۰
[illegible]	۱/۲۵	برف کے تیرتے پہاڑ	-/۳۰
[illegible]	۱/-	آستین کا سانپ	-/۵
[illegible] کی پری	۲/۵۰	[illegible]	-/۵
[illegible]	۱/۷۲	بادشاہ کے کپڑے	-/۵۰
[illegible]	۱/۳	[illegible] کی گردش	-/۵۰
ستاروں کی [illegible]	۱/۸۶	[illegible] کی پڑیا	۱/-
خرگوش کا سپنا	۱/۵۵	[illegible]	-/۲۵
[illegible]	۲/-	ایک [illegible] کا بادشاہ	-/۳۰
آدمی کی کہانی	۱/۲۵	[illegible] ملاقات	-/۳۵
[illegible] دادا کی کہانی	-/۵۹	[illegible]	۱/-
چٹانوں کی کہانی	۱/۷۵	[illegible]	۱/۲۵
دادا نہرو	۱/۵	ظالم کسان	-/۳۰

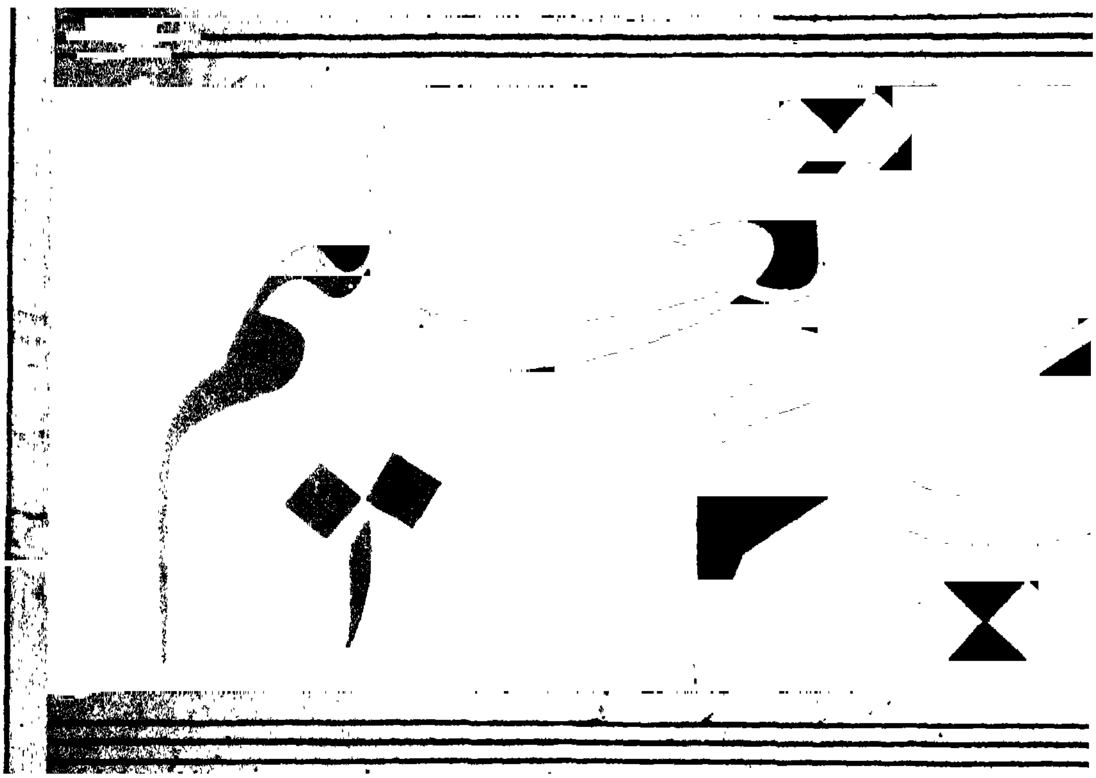
ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار دہلی ۶

[illegible]



فہرست

[illegible] اور اسعد کے لیے [illegible]

جون ۱۹۷۰ء شمارہ ۶

ایڈیٹر

[illegible]ین حسان ندوی

جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جامعہ لمیٹڈ اردو بازار دہلی ۶

جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

فی پرچہ ۔ [illegible] پیسے

[illegible] روپے

بچّوں کی معلوماتی کتابیں

نجومی آپا

اطہر پرویز

زہرہ آپا علی گڑھ سے ایم، ایس، سی کا امتحان کیا دے کر آئیں کہ لگیں اپنی قابلیت کا رعب جمانے۔ انجم کو شرارت جو سوجھی تو اس نے زہرہ آپا کا نام "نجومی آپا" رکھ دیا۔ لیکن ایک دن جب گھر کے سارے بچّے اکٹھا تھے۔ نجومی آپا نے ایسی ایسی باتیں بتائیں۔ ایسی ایسی باتیں بتائیں کے سارے کے سارے دنگ رہ گئے۔ نجومی آپا سچ مچ کی نجومی نکلیں تم بھی پڑھو اور مزے لو

قیمت: ۷۵ پیسے

باپ کے خط بیٹی کے نام

جواہر لعل نہرو: ترجمہ عتیق صدیقی

چاچا نہرو اندرا اپنی بیٹی اندرا گاندھی کو جب وہ تمہاری طرح دس سال کی بچّی تھیں، کچھ خطوط لکھے تھے۔ ایسے مزے دار خطوط کہ انھیں بار بار پڑھنے کو جی چاہے گا۔ پھر اس کے پڑھنے سے تم کو یہ بھی معلوم ہوگا کہ "ہماری دنیا" "قوموں کا ایک گھرانا" ہے۔

قیمت عام ایڈیشن ۴/۵۰ (مجلّد ۸/-)

ہمارا ذہن

از۔ ندیکا اڈھیا ترجمہ اطہر پرویز

بات کچھ بھی نہیں ہوتی لیکن امّی جان مار بیٹھتی ہیں، آبا جان ڈانٹ پلاتے ہیں، بھائی بہن کوئی جھگڑا کھڑا کر دیتے ہیں اور دوسرے احباب ہاتھا پائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کیوں؟ وجہ اس کتاب میں پڑھو۔ اس کتاب کو پڑھنے سے تم نہ صرف اپنی نفسیات سے واقف ہو جاؤ گے، بلکہ کون کیا چاہتا ہے۔ یہ بھی تم کو معلوم ہو جائے گا۔ پھر نہ تو امّی جان کی مار کھانے کا خطرہ رہے گا۔ اور نہ آبا جان کی ڈانٹ کا، اور نہ ہی بھائی بہن اور دوستوں کے جھگڑے کا۔

قیمت: ایک روپیہ

انمول رتن

اطہر پرویز

فرّخ سیر بادشاہ کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ ایک بار جب وہ کشمیر کی سیر کو گیا تو وہاں اس کی نظر فارسی اور سنسکرت کے ایک بہت بڑے عالم پر پڑی، یہ تھے پنڈت راج کول۔ فرّخ سیر پنڈت راج کول کو ہندوستان کے دل "دلّی" میں لے آیا اور ایک عالی شان کوٹھی نہر کے قریب رہنے کو دی۔ دلّی والوں نے پنڈت جی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پیار سے "نہرو" کہنے لگے تمہارے چاچا نہرو اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ چاچا نہرو "انمول رتن" کیسے بنے؟ یہ تمھیں اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوگا۔

قیمت ۱/۵۰

ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال، بمبئی ۳ (بی آر)

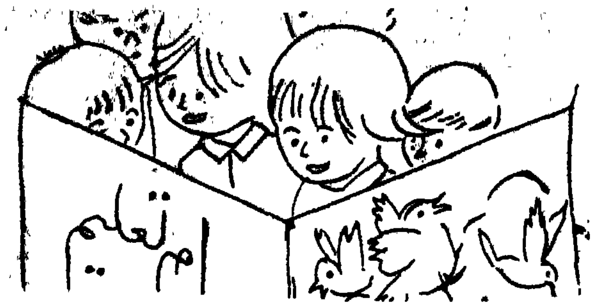
ل سے باتیں

یل کی آخری تاریخوں میں ٹیچرس کالج کی بی۔ایڈ
شاہدہ شفاعت اچانک بس کے حادثے کا
رحومہ بہت سادہ مزاج اور ہونہار طالبہ
اشرفی صاحب نے ان کے حالات مضمون کی
کر بھیجے ہیں۔ مضمون بہت دیر سے ملا نہیں
شامل ہوتا۔ ہمیں اس حادثے میں مرحومہ
ندمرے عزیزوں سے دلی ہمدردی ہے۔

‹..............›

اپریل کو بچوں اور بڑوں کے ادیب
تاج نے انتقال کیا۔ لاہور میں ایک ادارہ
ت پنجاب" مولانا سید ممتاز علی صاحب
ہلاتے تھے۔ اس ادارے نے بچوں کی بچیوں
بڑی خدمت کی ہے۔ اس کا ہفتہ وار پرچہ
لیے نکلتا تھا۔ اور بچوں میں بہت مقبول
علی کے انتقال کے بعد ان کے صاحبزادے
تاج نے باپ کے کام کو بڑے سلیقے سے
ول کے وہ مستقل ایڈیٹر تھے۔ بچوں کے لیے
خود لکھیں، دوسروں سے لکھوائیں۔ خدا
مرے اور ان کے عزیزوں کو صبر کی توفیق

‹..............›



پچھلی تیرہ مئی کو پیام تعلیم کے مستقل مضمون نگار اور شاعر سید منیر الحسن صاحب (استاد مدرسہ ابتدائی) کی والدہ نے اچانک انتقال فرمایا۔ مرحومہ دل کے عارضے میں مبتلا تھیں۔ دل کی یہی بیماری موت کا سبب بنی۔ مرحومہ بہت نیک، شریف اور مذہبی خاتون تھیں۔ ہمیں اس اچانک حادثے میں منیر صاحب ان کے دوسرے بہن بھائیوں اور منیر صاحب کے والد محترم سے دلی ہمدردی ہے۔

‹..............›

اس پرچے میں ذاکر صاحب مرحوم کی پہلی برسی کا مختصر حال شائع ہو رہا ہے۔ اس سلسلے میں ایک اہم خبر اور سن لیجیے۔ اس سال جامعہ میں ذاکر حسین میموریل ویلفیر سوسائٹی قائم ہوئی ہے۔ یہ سوسائٹی بچوں، جوانوں کی فلاح و بہبود کا کام کرے گی۔ فیملی ویلفیر کا کام کرے گی۔ بچوں کے لیے ایسا لٹریچر تیار کرے گی جو سوسائٹی کے مقصد کے مطابق ہوگا۔ شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) اس کے سرپرست۔ محترمہ پشپا ہدایت اللہ صدر محترمہ مسز شانتی کبیر، محترمہ کے کے شاہ۔ محترمہ مسز انیس قدوائی۔ محترمہ مسز منو بھائی شاہ۔ نائب صدر محترم بی۔ ایچ زیدی۔ خازن شمس الرحمٰن صاحب محسنی جنرل سیکرٹری محمد اسمٰعیل خاں صاحب سیکرٹری مقرر ہوئے ہیں۔

اس سوسائٹی کے قیام میں شمس الرحمن صاحب پرنسپل جامعہ اسکول آف سوشل ورک کی مخلصانہ کوششوں کو بہت دخل ہے۔ اور سوسائٹی کی سوشل سرگرمیوں کا مرکز ایک طرح سے یہ اسکول ہی ہوگا۔

....

پیامی خاص کر آپ جی یا شمالی ہندوستان کے پیامی تو اس وقت چھٹیوں کے مزے لے رہے ہوں گے۔ امتحان میں اچھے نمبروں سے پاس ہوئے ہوں گے تو اور بھی لطف آتا ہوگا۔ اپنے تفریحی مشغلوں کے ساتھ ساتھ کیا اچھا ہو کہ آپ کچھ کام بھی کر ڈالیں۔ اپنے پیام تعلیم کے کچھ خریدار بنالیں۔ یاد رکھیے۔ رسالے کے جتنے خریدار بڑھیں گے اتنا ہی اس کی مالی حالت مضبوط ہوگی۔ اور اتنا ہی یہ اچھا نکلےگا۔ آپ کی کوششوں سے بہت سے خریدار بڑھ گئے تو ہم انشاءاللہ جوبلی نمبر نکالیں گے کہ آپ دیکھتے رہ جائیں۔

....

پچھلے پرچے میں ہم نے نیلم اور فرخ کی کہانی جیسی ایک مزے دار کہانی کا ذکر کیا تھا۔ اس پرچے میں یہ کہانی شائع کی جا رہی ہے۔ بہت مزے دار ہے۔ آپ کو خوب لطف آئے گا اور پھر آموں کی دعوت پڑھیے۔ بھوت والا مضمون پڑھیے جنگلوں کی کہانی پڑھیے۔ گرمی پر نظمیں پڑھیے۔ یہ سب موسم کی مناسبت سے شائع کی جا رہی ہیں۔ خوب مزہ دیں گی۔

....

ابھی ابھی ہمارے ڈاکٹر مشیر الحق صاحب نے اپنے مضمون "کناڈا کے شہری آداب" کی دوسری قسط بھیجی ہے۔ ذرا پہلے مل جاتی تو ہم اسی پرچے میں شائع کر دیتے۔ بہت غیر معمولی چیز ہے۔ حیرت میں ڈالنے والی۔ اگلے پرچے میں پڑھیےگا۔

....

اس مہینے مکتبہ جامعہ کی بمبئی شاخ نے دو اور خریدار فراہم کیے۔ ایک خریدار مکتبہ جامعہ کی علی گڑھ شاخ نے دیا۔ بھیونڈی بدیع الزماں خاور صاحب نے اپنے اسکول کو خریدار بنایا۔ اور دو خریدار اور مرحمت فرمائے۔ ایک خریدار مرزا عزیز اللہ بیگ صاحب نے مرحمت فرمایا۔ مرزا صاحب ابھی تھوڑے دن ہوئے دس خریدار مرحمت فرما چکے ہیں۔

....

ان کے علاوہ شلد گنج اردو لائبریری (پٹنہ) مسیرہ بانو صاحبہ بڑا پچیدہ، جناب عبدالحمید صاحب وینلام باڑی۔ احمد رفیع صاحب بجنور۔ مس زرّین عالم بمبئی، جناب مسعود احمد صاحب حیدرآباد والی لسٹ لائبریری فیض پور جل گاؤں، جناب عقیل حسین صاحب گلاب گیلا فرید اطہر بازخفیہ بمبئی۔ محمد شبلی علی ظفر اندور، حاجی صالح بھائی بڑودہ، ذکی الدین جارد والا اندور، عزیز الرحمن صاحب بقائی دہلی۔ خود خریدار بنے ہیں۔

....



پریاں آئیں

(ننھے پیامیوں کے لیے ایک مزے کا گیت)

نیلی پریاں آئیں
منو کو بہلانے
اچھے اچھے کھیل کھلانے
سندر سندر گیت سنانے
چندا کے جھولے کو جھلانے
میٹھی میٹھی کھیر پکانے
نیلی پیلی پریاں آئیں
چنو منو کو بہلانے
سب کے پر ہیں پتلے پتلے
چوڑے چوڑے ہلکے پھلکے
جیسے ہوں آلو کے قتلے
سب کے رنگ ہیں نیلے پیلے
نیلی پیلی پریاں آئیں
چنو منو کو بہلانے
منی آؤ، کلو، آؤ
حامد آؤ، للو، آؤ
موہن آؤ۔ ببلو، آؤ
ڈیوڈ آؤ، بچو، آؤ
نیلی پیلی پریاں آئیں
چنو منو کو بہلانے

شہلا رشید صدیقی سیوہاروی

زمرّد ہفت رنگ



پرانے زمانے کی بات ہے۔

شہر ایران میں ایک بادشاہ تھا جس نے اپنی شادی ایک پری سے کر لی تھی۔

پری جب کبھی اپنے میکے میں جاتی، تازے تازے پھل لے کر آتی، اور ہیرے جواہرات تھیلوں میں بھر کر لاتی۔

پرستان کے جس شہر میں پری بیگم کا میکہ تھا وہاں بڑے بڑے موتی دریا کے کنارے پر بکھرے پڑے رہتے تھے۔ پکھراج، نیلم اور لعل کو کوئی پوچھتا بھی نہ تھا بس زمرّد اور یاقوت اور چمکدار ہیروں کی قیمت تھی جنھیں پرستان کے بادشاہوں کی بیٹیاں انھیں ہار بنا کر گلے میں ڈالتی تھیں۔

پرستان کی ہر چیز انوکھی تھی۔ پرستان کے درخت، پرستان کے پہاڑ، پرستان کے اونچے اونچے مکان، پرستان کے جانور سب ہی ایسے تھے کہ جنھیں اگر آدمی دیکھ لیں تو حیرت سے دنگ رہ جائیں۔ یہاں کے ہاتھی اتنے بڑے ہوتے تھے جیسے ایران کے سفید گدھے۔ اور گھوڑے ایسے ہوتے تھے جیسے ایران کے کتے۔ جنھیں چھوٹی چھوٹی گاڑیوں میں جوتا جاتا تھا۔ اور پریاں ان میں سوار ہو کر باغوں اور دریا کی سیر کرنے جاتی تھیں۔

ہاتھیوں پر جلانے کی لکڑیاں لاد کر لائی جاتی تھیں۔ اور کبھی پریوں کے جوان لڑکے سوار ہو کر شکار کے لیے چلے جاتے تھے۔

پرستان میں ہرن بھی ہوتے تھے مگر بلّی جیسے ہوتے تھے کہ بھاگ کر درختوں پر چڑھ جاتے تھے۔ اور پریوں کے لڑکے انھیں درختوں سے گردن پکڑ کر اتار لاتے تھے پھر ان کے کباب بناتے تھے۔

بارہ سنگھے اور پاڑھے بھی ہوتے تھے مگر انھیں کوئی شکار نہ کرتا تھا۔

پرستان کے جنگلوں میں شیر اور بھیڑیوں کا نام بھی نہ تھا۔ اور جنگل کے تمام جانور کھلے میدانوں گھومتے پھرا کرتے تھے۔

اڑنے والے جانوروں میں سبز رنگ کے طوطے اڑتے پھرتے تھے، کالے کوّے بالکل نہ تھے، کبوتر سے ذرا بڑے سفید جانور تھے جن پر سبز رنگ کے پھول اور دھاریاں ہوتی تھیں اور ان ہی کو پرستان والے کوّا کہتے تھے۔ یہ کوّے نہ کوئی چیز اٹھا کر بھاگتے تھے نہ برتنوں میں چونچیں ڈالتے تھے۔

پریاں اور پریوں کے لڑکے کھانے بیٹھتے تو ان کے سامنے کشمش کے دانے ڈال دیتے تھے اور یہ انھیں کھا کر ناچتے اور پروں کو پھلا کر گھومتے تھے

گھومتے وقت ایسی آوازیں نکلتیں جیسے کہیں ستار گت بج رہی ہو۔

پریوں کے بچے کہیں جاتے تو اڑتے چلے جاتے

پر بیٹھ جاتے ۔

یوں کے ملک میں ایک ایسا جانور بھی تھا جس کے
ون لال ہاتھ پاؤں برف جیسے سفید اور اُجلے تھے۔
ں کے غاروں میں رہتا تھا اور رات کے وقت نکلتا

ر جب یہ دس برس کا ہو جاتا تو اس کے پیٹ میں
ڈبا پیدا ہو جاتا تھا جس کا ڈھکنا زمرد کے رنگ
ے رنگ کی ہوتی تھی ۔ جانور کا نام بوطیقا تھا اور
ب آدمی اس کی رنگ رنگ کہانیاں سناتا تھا ۔
تھا جس نے اس جانور کو دیکھا ہو۔
ان کے لوگ کہتے تھے کہ اگر کسی کو بوطیقا کے پیٹ
ے تو اس میں سَو آدمیوں کی طاقت آجاتی ہے ۔
ہی رہتی ہے جتنا ایک آدمی کھاتا ہے ۔
ئی اس ڈبے کو لے کر گلے میں لٹکا لے اس کا ہاتھ
س لمبا ہو کر جو چیز لانا چاہے اٹھا کر لے آتا ہے ۔
اڑنے والا پری کا لڑکا کیوں نہ ہو اس تک نہیں
ے سے بڑا کمال یہ ہے کہ جسے یہ ڈبا مل جائے
بات مان جائے گا۔ امیر ہو یا وزیر بادشاہ ہو یا

خوار جانور بھی اس کے سامنے گردن جھکا دیتے

پا گنبد اا بھیڑیا ہو یا تیندوا جس کے پاس یہ
جانور اس کے ساتھ ساتھ پھرتے ہیں، اور
کان پکڑ کر اپنا کام لے سکتا ہے ۔

کچھ پری زاد ایسے بھی تھے جو اس جانور کو خیالی بتاتے تھے اور کہتے تھے کہ پرانے اور بڑے بوڑھے پرستان والوں نے یہ من گھڑت کہانی بنائی ہے ، بھلا ایسا جانور کہاں ہے ؟ اگر ہوتا تو کبھی تو کوئی دیکھتا ۔

ایران کے بادشاہ کی پرستان کی پری سے شادی کیسے ہو گئی ۔ یہ کہانی بڑی لمبی ہے ۔

اس وقت تو اس کی بیٹی کی کہانی سن لو جس کا نام زمرد ہفت رنگ تھا ۔ اور یہ انسان اور پری کے ملاپ سے پیدا ہوئی تھی تم پوچھو گے کہ ہفت رنگ کیا ہوتا ہے ۔

بات یہ تھی کہ اس کی شکل و صورت ہر ہفتہ بدل جاتی تھی ، اور ہر مرتبہ اس کے جسم کا رنگ بھی بدل جاتا تھا ۔

کبھی ایسا رنگ ہو جاتا جیسے تازہ گلاب ، کبھی چنبیلی جیسا ہو جاتا تھا جس میں سرخی جھلکتی ہو ۔ کبھی ارغوانی ، کبھی زرد جس میں سفیدی کی کرنیں ہوں کبھی سنہرا ۔

جس ہفتے سنہرا رنگ ہوتا اس کے بال سونے کے باریک لچھے بن جاتے جس سے رات میں ایسی روشنی چمکنے لگتی جیسے سورج کی کرنیں دریا کے پانی میں تیرتی ہوں ۔

مگر یہ رنگ روپ فقط اس کی ماں اور باپ ہی دیکھتے تھے ۔ دوسرے کی طاقت نہ تھی کہ دیکھے اور ہوش میں رہے ۔

لڑکی کیا تھی بس اپنی مثال آپ تھی ۔ اس کا چہرہ کیسا تھا ۔ اس کی آنکھیں کیسی تھیں ۔ اس کی گردن کیسی تھی ، رخسار کیسے تھے ؟ دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں تھی جس کی مثال دے کر سمجھایا جا سکے ۔ بس لاجواب تھی اور بے مثال ۔

اس کے چہرے پر نقاب پڑا رہتا تھا تاکہ اسے کو

دیکھ نے کیونکہ جو کوئی اسے دیکھتا تھا اس کا سانس رک جاتا تھا اور مرتا نہیں تھا تو بے ہوش ضرور ہو جاتا تھا۔ فقط پری بیگم اور بادشاہ ہوش میں رہ سکتے تھے۔

زمرد کو بچپن سے کہانیاں سننے کا شوق تھا اور اس کی ماں پری بیگم اپنے ملک پرستان کی کہانیاں سنایا کرتی تھی۔

پری بیگم جو کہانیاں بھی سناتی ایران کے بڑے بڑے اخباران کہانیوں کو چھاپ دیتے اور اس طرح یہ کہانیاں سارے جہان میں مشہور ہو گئیں کہانیوں میں بوطیقا جالند کا ذکر بھی ہوتا تھا۔

اب ایک مزے کی بات یہ سنیے کہ جس دن زمرد ہفت رنگ پیدا ہوئی تھی اسی رات کابل کے بادشاہ نیرنگ خاں کے گھر میں بھی ایک عجیب بچے کی ولادت ہوئی تھی جس کا نام مسعود رکھا گیا تھا۔

یہ ایسا نرالا لڑکا تھا کہ جب ہفتہ بھر کا تھا تو جو کوئی دیکھتا اُسے یہ ایک سال کی عمر کا لگتا۔

وہ ابھی دس برس کا بھی نہ ہوا تھا کہ گھوڑے پر اکڑوں بیٹھ جاتا اور مہینوں تک ہوا کی طرح اڑتا پھرتا۔ تلوار، علم، تیروں کا نشانہ، ہر کام میں ماہر ہو گیا تھا۔

دونڈ، کشتی کا فن تو اس کا غلام تھا۔ بڑے بڑے پہلوانوں کو ہاتھ ملاتے ہی دے مارتا — اور بے چارہ پہلوان حیران رہ جاتا کہ مسعود نے کس پیچ سے اسے گرایا ہے۔ دس برس کا ہوا تو فارسی، ترکی اور ایرانی زبانوں کو پڑھ کر ان کا مطلب سمجھ لیتا تھا۔ ایرانی اخبار کابل میں بھی آتے تھے۔ شہزادہ مسعود نے جب ایرانی اخباروں میں پرستان کی کہانیاں اور زمرد

ہفت رنگ کا انوکھا حال پڑھا اور یہ بھی کہ جو کوئی بھی اُسے دیکھتا ہے تو بے ہوش ہو جاتا ہے۔ تو خوب ہنسا کہ یہ بھی ایک اچھی گپ ہے، کیا وہ کوئی عجوبہ ہے یا دیوار قہقہہ جسے دیکھتے ہی آدمی قہقہے لگانے لگتا ہے۔ پھر بھی زمرد کو دیکھنے کی اس کے دل میں کوئی امنگ نہ پیدا ہوئی، ہاں پرستان کے بوطیقا جالند کو پکڑنے کا شوق ضرور ہو گیا۔

مسعود کو شکار کا شوق تھا کشتی کرنا، تلوار چلانا، بھاری بھاری گرز اُٹھانا پسند تھا۔ شیر کا شکار جس زمانے کا یہ ذکر ہے پیدل چل کر اور شیر کے آمنے سامنے ہو کر کیا جاتا تھا۔ مسعود نے اس میں بھی نام پیدا کر لیا تھا۔

وہ شیر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک دم جھپٹتا اور شیر کی ٹانگیں پکڑ کر اس طرح گھماتا جیسے چرخی گھومتی ہے اور پھر زمین پر دے مارتا۔ اور اگر شیر حملہ کرتا تو مسعود شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اس کے کلے چیر ڈالتا۔ سوتے شیر کو برچھے یا تلوار سے قتل کرنا اس کے نزدیک عیب کی بات تھی۔

ایک دفعہ اس نے بڑے شیر کو جسے ببر شیر کہتے ہیں سوتے دیکھا۔ تو اس کے کان میں پتلی سی لکڑی ڈال کر اسے جگایا اور پھر کشتی لڑ کر اس کی ٹانگیں چیر ڈالیں۔ مسعود فقط بہادر ہی نہ تھا بلکہ خوب صورت بھی ایسا تھا کہ جو کوئی اسے دیکھتا تکتا ہی رہ جاتا۔

پرستان کے بوطیقا جالند کے پکڑنے کا شوق مسعود کے دل میں اتنا بڑھا کہ اس نے اپنے باپ نیرنگ خاں اور اپنی ماں سے پرستان جانے کی اجازت مانگی۔

مسعود کی ماں جو بڑے جاہ و حشمت کی ملکہ

...نے اپنے بیٹے کا شوق دیکھا تو پیار میں آ کر مسعود
...یں جو مخمل کے بٹوہ میں سونے کے ورق میں
...اور کہا "بیٹے مسعود! اگر تم کسی لمبے سفر پر جانا
...پتہ نہ معلوم ہو کہ راستہ کدھر ہے تو ان چار
...گولی کا رنگ سفید ہے۔ اسے منہ میں ڈال لینا
...ود بخود سفر کی صحیح سمت میں دوڑنے لگیں گے
...پر چلے اور راستے تھکن نہیں ہوتی تم بھی اڑتے
...بغیر تھکے منزل پر پہنچ جاؤ گے۔ خواہ ہزار کوس
...۔ مگر جب بھی منزل پر پہنچ جاؤ گولی منہ

...گولی سرخ ہے اگر کسی سے مقابلہ ہو جائے
...لینا اور بے دھڑک آمنے سامنے ہو جانا۔
...ہاتھی ہو یا کوئی جانور بھی کیوں نہ ہو،
...سا ہو جائے گا جیسا مٹی کا جانور ہوتا ہے۔
...ئیں پچھاڑ دو گے۔
...یں کے پاس رہنا ہی ہر آفت سے تمھیں
...یہ گولیاں ایک کامل بزرگ نے مجھے عطا

...نے مجھ سے یہ بھی کہا تھا کہ تمھاری اولاد
ضرور ہوگا کہ جو ان گولیوں سے فائدہ

...ن گولیوں کے مل جانے سے بڑی خوشی
...رستان جانے کی پکی نیت کر لی مسعود
...

مگر جوں ہی سفید گولی منہ میں ڈالی خود بخود پاؤں اٹھنے لگے۔ اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ وہ اڑتا چلا جا رہا ہے۔

راستے میں ایک سے بڑھ کر ایک شہر نظر آیا مگر مسعود نے نظر بھر کر دیکھا بھی نہ تھا کہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

کہیں پھولوں کے باغ تھے کہیں اونچے اونچے مکان تھے۔ ایک شہر ایسا آیا جہاں کی دیواریں آئینوں سے بنی تھیں۔ چلتے پھرتے آدمی ایک دوسرے کو دیکھتے اور ہنستے ہوئے نکل جاتے تھے۔

پہاڑ بھی آئے دریا بھی آئے۔ مگر نہ کہیں مسعود کا قدم رکا۔ نہ کہیں پہاڑوں سے سر ٹکرایا۔ وہ تو ایک مقصد کے لیے دوڑا چلا جا رہا تھا۔

ایک شہر ایسا آیا جہاں ہر طرف سے گانے کی آوازیں آ رہی تھیں مگر گانے والا کوئی نظر نہ آتا تھا مسعود سمجھ گیا کہ یہی پرستان ہے اور پھر ایک خوف ناک جنگل کی طرف مسعود کے پاؤں اٹھ گئے۔ جہاں بڑے بڑے غار تھے۔

یہاں پہنچ کر مسعود کے قدم رک گئے۔ اور اسے محسوس ہوا کہ اسی جنگل میں بوطیقا کسی غار میں رہتا ہے اور اب اس کے باہر آنے کا وقت قریب آ گیا ہے۔

اتنے میں ایک دھماکا ہوا جس سے تمام جنگل لرز گیا اور مسعود نے سفید گولی منہ سے نکال کر سرخ گولی منہ میں ڈال لی۔

مسعود حیران ہو گیا جب اس نے غار میں سے کسی جانور کا سر ابھرتے دیکھا۔ جیسے ایک پہاڑ اٹھتا چلا آ رہا ہو

دھاری کہ انسان دیکھے تو کلیجہ پھٹ جائے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا سر آسمان سے لگ جائے گا۔ اس کی آنکھوں سے سرخ شعلے نکل رہے تھے۔

اور اب پورے جنگل میں ہر طرف یہی جانور نظر آرہا تھا۔ چاروں طرف ایسے ہی سیکڑوں جانور تھے جن کے جسم پر ہزاروں چراغ روشن تھے۔ بڑا جانور آگے بڑھتا تھا پھر پیچھے ہٹ جاتا تھا۔ جیسے حملہ کرنا چاہتا ہے۔ مگر کوئی اسے روک دیتا ہے۔

اس کے بڑھتے ہی تمام جانور حرکت میں آجاتے تھے۔ اور اگر رک جاتا تھا تو رک جاتے تھے۔

مسعود نے دیکھا کہ اس کے پیٹ میں ایک کھڑکی ہے۔ جس میں ایک ڈبا زمرد کے رنگ کا جگمگا رہا ہے۔

"آہا یہ تو وہی ڈبا ہے جس کا ذکر میں نے اخبار کی کہانیوں میں پڑھا تھا۔ بوطیقا یہی ہے، بوطیقا یہی ہے، بوطیقا یہی ہے!" بے ساختہ مسعود کی زبان سے یہ جملے نکلے۔

اور اس سے کشتی لڑنے کے لیے آگے بڑھا بوطیقا رک گیا اور مسعود کے سامنے مٹی کے جانور کی طرح گر پڑا۔ اور جنگل کے تمام جانور بھی سرنگوں ہو کر گر پڑے۔

مسعود نے تلوار پیٹ میں بھونک دی اور ڈبا زمین پر گر پڑا جسے مسعود نے اچک کر اٹھا لیا۔ یکایک تمام جنگل میں آگ لگ گئی اور بوطیقا اور تمام جانور پھونس اور گھاس کی طرح دھڑ دھڑ جلنے لگے۔ اور کچھ ہی دیر میں جنگل لاشوں سے صاف ہو گیا۔

ڈبہ مسعود کے ہاتھ میں تھا۔ اور اس میں سے سبز شعاعیں نکل رہی تھیں۔ اور تمام جنگل میں ایسی خوشبو مہک رہی تھی۔ جیسی خوشبو اس نے اپنے باپ کی راجدھانی میں بھی کبھی نہ سونگھی تھی۔

ایران میں زمرد اور زمرد کی ماں پری بیگم بے خبر سو رہی تھیں کہ یکایک دونوں چونک پڑیں۔ پری بیگم نے چلا کر کہا۔ "زمرد! پرستان کے سب سے بڑے تحفے اور نادر چیز کا خاتمہ ہو گیا۔ کسی شہزادے نے ایک کامل بزرگ کی قوت سے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ بوطیقا ختم ہو گیا۔ ڈبا پیٹ سے نکال لیا گیا۔ ابھی ابھی میں نے یہ خواب دیکھا ہے۔ اور میرا دل دھڑک رہا ہے۔"

زمرد نے کہا: "اماں میں نے بھی یہی خواب دیکھا ہے۔ یہ کون شہزادہ ہے؟ میں اسے دیکھوں گی۔ اور وہ مجھے دیکھے گا اور بے ہوش نہ ہو گا۔"

مسعود نے سرخ گولی منہ سے نکال لی اور سفید گولی منہ میں ڈال لی۔ اور اپنی راجدھانی کابل میں جانے کا ارادہ کیا۔

اب اس کی آنکھیں بند تھیں اور سفر خود بخود جاری تھا۔ کچھ ہی دیر میں مسعود نے دیکھا کہ وہ اپنی ماں کی مسہری کے قریب کھڑا ہے۔ "کیا یہ کوئی خواب تھا؟"

"مگر نہیں میرے ہاتھ میں تو وہ ڈبا موجود ہے جسے میں نے بوطیقا کے پیٹ سے حاصل کیا ہے۔ اور اب میں زمرد ہفت رنگ کو دیکھوں گا کہ وہ کیسی حسین اور خوب رو ہے۔"

(باقی)

ترجمہ مہر دلاوری

جب امریکہ سے برف آتی تھی

ہتے ہیں مغلوں کے زمانے میں برف کشمیر سے
برف بادشاہی محلوں میں استعمال ہوتی تھی۔
ے زمانے (انیسویں صدی) میں یہ برف یہیں
ں، اور کنٹرول سے تقسیم ہوا کرتی تھی۔ مقدار مقرر
کے افسروں اور دوسرے افسروں کے لیے برف
یا جاتا تھا۔ اپریل کی پہلی تاریخ سے اگست کی
ں تک ہر دو روز بعد بارہ۱۲ سیر کے حساب سے
برف دی جاتی تھی۔

رف تیار کرنے کے لئے سرکار نے ٹھیکیدار مقرر
ینٹ کی فراہمی اور تقسیم کی نگرانی کرتے تھے۔

۱۸۳۳ء میں برف کا نرخ اوسطاً ۲ آنے فی سیر تھا
ضروری چیزوں کی قیمتوں سے قدرے زیادہ
ں انگریز بھارت کے کونے کونے میں پھیلے گئے
رنے کا مسئلہ ان کے لیے پیچیدہ ہو گیا۔ انھوں نے
ل نکالا۔

پہلے انھوں نے سرد جگہ کے مقامات تلاش کیے۔
طرف ہری ہری گھاس والے میدانوں کی کھلی
نوائے۔ باغات بھی لگوائے جن سے انھیں
ملنے لگی۔

... تلاش کر سکی ہاتھ سے برف تیار کرنے کا آلہ

"تھرمانٹی ڈائمنشن" ایجاد کیا گیا۔ یہ آلہ سات فٹ اونچا تھا۔
اسے لکڑیوں پر نصب کیا جاتا تھا۔ البتہ اس میں لگے
ہوئے پنکھے ہاتھ سے گھمائے جاتے تھے جن سے سرد ہوا پیدا ہوتی
تھی۔ اس آلے کو چلانے کے لیے کئی آدمیوں کی ضرورت
پڑتی تھی۔ پھر بھی گرمی کے موسم میں پیاس بجھانے کے لیے
انگریز لوگ برف کی سخت ضرورت محسوس کرتے تھے۔

اس کے علاوہ طبی ضرورتوں کے لیے برف درکار
ہوتی تھی۔

ابھی آپ پڑھ چکے ہیں کہ انیسویں صدی میں
برف ہاتھ سے تیار کی جاتی تھی مگر یہ کام بڑی الجھن کا تھا۔
اور اس کا دار و مدار آب و ہوا پر تھا۔ ۲۰ جنوری سے ۲۰ فروری
گویا ایک مہینہ تک سخت سردی میں بھی برف تیار کی جاتی تھی۔
نومبر سے لوگ اس کام میں لگ جاتے تھے۔ سب سے زیادہ
گرمی کے سال ۱۸۴۶ء میں کا نپور کی برف تیار کی گئی۔
اس وقت درجہ حرارت ۳۶ ڈگری فارن ہیٹ تھا۔

برف کی حفاظت کا کام بھی بڑا مشکل تھا۔ جنگل
کے گہرے گڑھے کھودے جاتے ان میں گنے کے پتے بچھائے
جاتے تھے۔ برف ان گڑھوں میں رکھی جاتی تھی۔ ان
گڑھوں کے چاروں طرف چکنی مٹی کے گولے پانی سے
بھر کر رکھے جاتے تھے۔ برف کو محفوظ رکھنے کا بس یہی ایک طریقہ تھا۔

سنہ [illegible] میں شمالی ہندوستان میں برف کی مانگ زیادہ [illegible] تب کئی تاجروں نے امریکہ سے برف منگانے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹ نومبر سنہ ۱۸۳۳ء کو کلکتہ میں شائع کی ہوئی (رپورٹ) میں کلکتہ کے برف منگانے والے کئی تاجروں کا ذکر ہے۔

ہندوستان کو برف سپلائی کرنے والی ایک امریکن کمپنی تھی۔

سنہ ۱۸۰۰ء میں یہ کمپنی جنوبی امریکہ کے چند صوبوں، اور ویسٹ انڈیز کے جزیروں سے برف حاصل کرکے سپلائی کیا کرتی تھی۔ اس کے بعد ایشیائی ملکوں کو برف سپلائی کرنے کا منصوبہ اس کمپنی نے بنایا۔ جس میں ہندوستان کا نمبر پہلا رہا۔ کلکتہ میں بوسٹن سے برف آتی تھی جو بحری جہازوں میں لائی جاتی تھی جن میں ایک ایرکنڈیشن قسم کا کمرہ بنایا جاتا تھا۔

کلکتہ میں ایک ایرکنڈیشن اسٹور اسی مقصد سے بنایا گیا۔ لیکن اس پر کافی خرچ آیا۔ برف کی سپلائی اور اسے محفوظ رکھنے کے خرچ نے کمر توڑ دی۔ یہ خرچ فی من ایک روپیہ تھا۔ جو اس زمانے کی دوسری ضروری چیزوں کے مقابلہ میں زیادہ تھا۔

آج ہمیں برف بہت سستی اور بلا تکلیف کے حاصل ہوتی ہے۔ اس کے مقابلے میں اس وقت کافی خرچ کرنا پڑتا تھا۔ باوجود اس کے ضرورت کے مطابق اور ہر وقت برف ملنے کا امکان کم تھا۔

(مراٹھی ڈائجسٹ "امرت" سے ترجمہ)

جناب [illegible]

زمانہ آیا گرمی کا

قیامت کی گھڑی آئی ہے لُو چلنے کے دن آئے
زمانہ آیا گرمی کا لُو اب چلنے کے دن آئے
مگر اس سخت گرمی کے تو اچھے کام بھی ہوں گے
سجیں گے باغ آموں کے کٹھل بھی خوب پکیں گے
چڑھے گا رنگ لیچی پر ہنسیں گے سرخ خربوزے
مزے لے لے کے کھائیں گے جنہیں ہم تم بڑے چھوٹے
ہے اس گرمی سے تو اک اور بھی یہ فایدہ سُن لو
کرلے وقت کی چھٹی بھی دلاتی ہے یہ سمجھو !



اپنی اپنی



دِ
ی صاحب
نت جی

ن

ما وقت ہے ۔ پورب میں ابھی ہلکی ہلکی لالی آسمان
ہے ۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے ہلکے ہلکے
ت دھیرے دھیرے چل رہے ہیں ۔ گاؤں
ی ٹیڑھی میڑھی پگ ڈنڈی ابھی سنسان
۔ اس کے دونوں طرف اُگی ہوئی گھاس پر شبنم
وتی ہوا سے لرز رہے ہیں ۔ گھنے اور چھتنار
اں بڑی پیاری آوازیں چہچہا رہی ہیں ۔
ے ایک اونچے پیڑ کی پھنگی پر ایک فاختہ بیٹھی
آواز میں نغمہ الاپ رہی ہے ۔ دفعتاً
ایک مولوی صاحب ٹہلتے ہوئے نظر آتے
بدن ، سر پر گول ٹوپی ، چہرے پر لمبی داڑھی
نا ، ٹخنوں تک لمبا کرتا ، اونچا پائجامہ
ختہ کی آواز سن کر اس جگہ رُک جاتے
ی کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے)
للہ ، سبحان اللہ کیا اس کی قدرت ہے

کیسی کیسی چیزوں سے وہ اپنا نام کہلوا کر ہم سب کو خواب سے جگایا کرتا ہے ۔" بے اختیار مولوی صاحب کہہ اٹھے ۔ سبحان تیری قدرت ، سبحان تیری قدرت ، بالکل مست اور بے خود ہو کر ۔

اتنے میں ایک پنڈت جی اس راستے سے گذرتے ہیں ۔ ایک ہاتھ میں چھوٹی سی لٹیا جس میں پانی ہے ۔ گلے میں کنٹھی اور لٹکتا ہوا جنیؤ ، ماتھے پر چندن کا ٹیکا ، دوہرا اور ننگا بدن ، ننگے پاؤں ۔ مولوی صاحب کو ایک جگہ رُکے ہوئے دیکھ کر خود بھی ٹھہر گئے ۔)

پنڈت جی : نمستے مولوی صاحب ! سب کُشل تو ہے نا ۔ اس سمے (وقت) کیسے اس جگہ کھڑے ہوئے ہیں ؟

مولوی صاحب : آداب عرض پنڈت جی ! میں صبح صبح اس راستے روز ٹہلنے نکلتا ہوں ۔ آج جب ٹہلتا ہوا اس جگہ تک آیا تو اس سامنے والے پیڑ پر بیٹھی ہوئی فاختہ کی لہکدار آواز نے مجھے چونکا دیا ۔

کیا بتاؤں پنڈت جی کیا مزہ آیا ہے مجھے اس کی
بولی پر آپ بھی سنیے کیا خوب بول رہی ہے واہ
واہ "سبحان تیری قدرت، سبحان تیری قدرت،"

پنڈت جی :- مولوی صاحب آپ اس پکشی (پرند) کے بارے
میں پوری بات نہ جانتے ہوں گے اس کو ماں
سیتا جی نے بڑے پریم بھاؤ سے پالا تھا۔ ان کے
پاس رہ کر اس نے بہت ہی پریم بھاؤ سے
سہیوگ کیا تھا۔

مولوی صاحب :- پنڈت جی میں تو محض اس چڑیا کی بولی
کی بات کر رہا ہوں۔ کیا خوب بول رہی ہے ——
سبحان تیری قدرت، سبحان تیری قدرت،

پنڈت جی :- یہی بات تو آپ سمجھ نہیں پا رہے ہیں مولوی صاحب

مولوی صاحب :- کون سی بات ؟

پنڈت جی : اس پکشی کی بولی کی بات ۔

مولوی صاحب :- اس کی بولی ہی کی بات تو میں عرض کر رہا
ہوں، کیا خوب بول رہی ہے "سبحان تیری قدرت
سبحان تیری قدرت،"

پنڈت جی :- مولوی صاحب آپ بھول رہے ہیں ۔

مولوی صاحب :- آپ کون سی بھول کی بات کر رہے ہیں ؟

پنڈت جی :- ارے مولوی صاحب۔ یہ پکشی جانتے ہیں کیا
بول رہا ہے ؟

مولوی صاحب :- اچھا آپ ہی بتائیے ۔

پنڈت جی :- یہ پکشی کہہ رہا ہے
"رام لکشمن دسرت، رام لکشمن دسرت،"

مولوی صاحب :- آپ خود نہیں اچھی طرح سمجھ سکے ہیں
اس کی بولی۔ پنڈت جی۔ دیکھیے! سنیے کیا صاف
بول رہی ہے "سبحان تیری قدرت، سبحان تیری
قدرت "

پنڈت جی :- مولوی صاحب آپ ہٹ دھرمی کر رہے ہیں
ذرا دھیان سے سنئے "رام لکشمن دسرت
رام لکشمن دسرت،"

مولوی صاحب :- ضد تو پنڈت جی آپ ہی کر رہے ہیں
جب کہ فاختہ کی آواز بالکل صاف صاف کہہ
رہی ہے۔ ذرا کان لگائیے ۔
سبحان تیری قدرت، سبحان تیری قدرت ۔

(اتنے میں گاؤں کی طرف سے ایک بنیا
بیل پر کچھ لادے ہوئے اسی پگ ڈنڈی سے
گزرتا ہے۔ بدن پر میلا کچیلا شلوکا جس سے
لہسن اور ہینگ کی بو نکل رہی ہے۔ رانوں
تک آتی ہوئی گیرو کے دھبے لگی ہوئی
دھوتی۔ آگے کی طرف نکلی ہوئی تھلتھلی سی توند)

شاہ جی :- پاؤں لاگی پنڈت جی، آداب عرض ہے مولوی
صاحب۔ بھلا آپ دونوں اس جگہ کھڑے کیا
باتیں کر رہے ہیں ؟

مولوی صاحب :- شاہ جی میں تو روز بلا ناغہ اس راستے
سے بہت سویرے ٹہلتا ہوا گزرتا ہوں سویرے
ٹھنڈی ٹھنڈی تازہ ہوا تندرستی کے لیے
ہوتی ہے۔ بدن میں پھرتی اور تازگی آتی ہے

دن بھر کی تھکی اور رات بھر کی مندی ہوئی
ملعوں کو ہری ہری گھاس اور اس پر بکھرے
ے اوس کے موتیوں سے بڑی راحت ملتی ہے۔
آج سویرے میں ادھر سے نکل رہا تھا تو
سامنے والے درخت پر ایک فاختہ بیٹھی ہوئی
سریلا نغمہ 'سبحان تیری قدرت' سبحان
ی قدرت' الاپ رہی تھی۔
۔ دیکھئے شاہ جی! یہیں پر مولوی صاحب
ے دھرتی پر اتر آئے۔ واسطہ میں یہ پکشی بول
تھا 'رام لکشمن دسرت'، رام لکشمن دسرت
ں دیر سے اس بات کو مولوی صاحب کو سمجھا رہا
ں، مگر یہ اپنی بات پر اکڑے ہوئے ہیں۔ کوئی
ں سننے کے لیے تیار ہی نہیں۔
ب:۔ شاہ جی یہی تو شکایت مجھے بھی ہے۔
ت جی اپنی ضد کے سامنے اصلی بات سمجھنے پر
ہی نہیں ہوتے۔
دیکھو پکشی بول رہا ہے۔ آپ اس پر دھیان
نے کے لیے تیار ہی نہیں ہیں۔
دیکھئے سنئے شاہ جی پکشی بول رہا ہے۔
لکشمن دسرت، رام لکشمن دسرت،
مجھے تو ایسا جان پڑتا ہے کہ آپ دونوں آدمی
ح (غلطی) پر ہیں۔
ایں! وہ کیسے؟
۔۔ اچھا! کیسے؟

شاہ جی:۔ اس چڑیا کو ہمارے پرکھوں نے ہمالیہ کی چوٹی سے اتارا تھا۔ اور وہی لوگ اس کو یہاں لائے تھے۔ انھوں نے اس کی بڑی سیوا کی (خدمت کی) تب سے اس کی نسل یہاں رہ رہی ہے۔ اور جانتے ہیں یہ کیا کہہ رہی ہے۔

پنڈت جی:۔ کیا کہہ رہا ہے یہ پکشی؟

مولوی صاحب:۔ ہاں۔ آں۔ کیا بول رہی ہے بھلا یہ فاختہ؟

شاہ جی:۔ یہ چڑیا کہہ رہی ہے ذرا کان لگا کر سنیے، دیکھیے وہ خود بول رہی ہے۔
لون مرچا ادرک، لون مرچا ادرک،

پنڈت جی:۔ لون مرچا ادرک؟

مولوی صاحب:۔ لون مرچا ادرک؟

شاہ جی:۔ ہاں صاحب خوب دھیان دیجیے۔ کیسے نرم لہجے میں بول رہی ہے 'لون مرچا ادرک'، لون مرچا ادرک،

(پورب میں سورج دھیرے دھیرے بلند ہو رہا ہے۔ اس کی کرنیں ابھی اوپر کی طرف سیدھی چلی جا رہی ہیں۔ اتنے میں اسی راستے پر ایک اور شخص آ نکلتا ہے۔ لمبا چوڑا لال لنگوٹ باندھے، گھٹا ہوا چمکدار سر سامنے نکلا ہوا چوڑا چکلا سینہ۔ بھرے بھرے بازو، چھوٹی چھوٹی کتری ہوئی مونچھیں ننھی ننھی مگر تیز چمکدار آنکھیں، اور [illegible]

تیل کی چکناہٹ کی نظر پھسل جاتے) —

شاہ جی ۔ سلام پہلوان صاحب ۔

پنڈت جی ۔ نمستے پہلوان صاحب ۔

مولوی صاحب ۔ آداب عرض ہے پہلوان صاحب

پہلوان صاحب ۔ آداب ، آداب ! دوستو ! یہ آج کیسے صبح صبح آپ اکٹھے ہو کر یہاں باتیں کر رہے ہیں ؟

مولوی صاحب ۔ میں تو پہلوان صاحب صبح کو ٹھنڈی ہوا کا لطف لینے روزانہ ادھر آنکلتا ہوں ۔ آج جب ادھر سے گذر رہا تھا تو اس سامنے والے پیڑ پر بیٹھی ہوئی فاختہ کی سریلی آواز نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا اپنی لہک دار آواز میں دیکھیے اب بھی بول رہی ہے اور کیا خوب بول رہی ہے ۔ 'سبحان تیری قدرت ؛ سبحان تیری قدرت '

پنڈت جی ۔ دیکھیے پہلوان صاحب ! میں جب اس اور (طرف) سے نکلا تو مولوی صاحب یہاں استھت (تشریف رکھتے) تھے ۔ انھوں نے اس پکشی کی بات چلائی تو میں نے ان سے کہا کہ اس پکشی کو سیتا جی نے بن باس میں اپنے ساتھ رکھا تھا اور اس سمے سے یہ جب بھی بولتا اور جہاں بھی بولتا ہے تو یہی کہتا ہے 'رام لکشمن دسرت ۔ رام لکشمن دسرت '

شاہ جی ۔ پہلوان صاحب ! میں ہر روز اپنے بیل پر سامان لاد کر اس راستے سے دوسرے گاؤں کو جاتا ہوں اور روز ہی اس چڑیا کی بولی سنتا ہوں اس چڑیا کو ہمارے پرکھے ہمالیہ کی چوٹی سے سدھا کر لائے پھر اس کی نسل خوب پھیلی اور تمام جگہ ہو گئی ۔ اس لیے یہ جب بھی بولتی ہے یہی کہتی ہے —

پہلوان صاحب ۔ کیا کہتی ہے — جلدی کہو جی ! مجھے اتنی فرصت کہاں ہے کہ پوری داستان سنوں ۔

شاہ جی ۔ پہلوان صاحب — یہ کہتی ہے 'لون مرچا ادرک ، لون مرچا ادرک '

پہلوان صاحب ۔ غلط — بالکل غلط

شاہ جی ۔ وہ کیسے ؟

پنڈت جی ۔ ہاں — آں ۔ کیسے ؟

مولوی صاحب :۔ اچھا — وہ کس طرح ؟

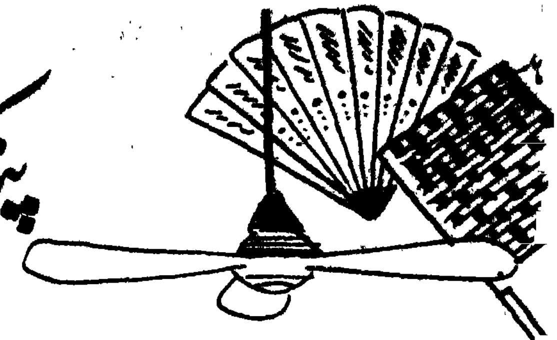
پہلوان صاحب :۔ تینوں آدمی کان کھول کر سنو — سن رہے ہو — نا

(سب ایک زبان ہو کر جی ہاں — جی ہاں)

پہلوان صاحب ۔ یہ چڑیا کہہ رہی ہے ۔ 'ڈنڈ مگدر کسرت ، ڈنڈ مگدر کسرت ' اور جس کی سمجھ میں نہ آئے تو (پہلوان نے اپنا بھاری بھرکم ہاتھ ہوا میں لہرایا) اس کے لیے اس کی چوٹ ہے ۔

(تینوں سر جھکائے ہوئے اپنے اپنے راستے پر چل دیتے ہیں اور پہلوان سینہ تانے اکڑتا ہوا ۔ [illegible] راستہ [illegible]

پنکھوں کی کہانی



یوں کا موسم آ گیا ہے۔ غریب ہو یا امیر پنکھے
کو محسوس ہوتی ہے۔ پنکھے کا رواج دنیا میں
ہانے سے ہے۔ شروع میں تو یہ ہاتھ ہی کے
تھے۔ سخت گرمیوں کے موسم میں انھیں جھلتے
ب جاتے تھے۔ پربنا جھلے چین بھی نہ آتا تھا۔
ے کسان بھائی ان سے اناج کو بھوسے
ا کام بھی لیتے ہیں۔ لوہار بھی دھونکنی میں
ے پنکھے کا استعمال کرتے ہیں۔

ں بھی جہاں بجلی نہیں ہے وہاں کمرے کو ٹھنڈا
و ہے یا لکڑی کے فریم میں کپڑا منڈھ کر پنکھا
ایک شخص رسّی کے ذریعے اسے کھینچتا ہے۔
ھنڈا ہو جاتا ہے۔

ن میں عورتیں کھجور کے پتّوں کا پنکھا بناتی
و طرح طرح کے رنگوں سے رنگ لیا جاتا ہے۔
ے موقعوں پر تاڑ کے پتّوں کے بڑے بڑے
تے تھے۔

ہیں جاپان میں ۶۷۰ عیسوی میں پنکھے کا
ردویں صدی عیسوی میں چین میں پنکھے کا
ہوا چھٹی صدی چھٹویں صدی عیسوی

کاریگروں سے قسم قسم کے پنکھے بنوائے۔

چین کے لوگوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے بھی پہلے ان کے ہاں پنکھوں کا رواج تھا۔ عورتیں اپنے مکٹ میں پرندوں کے پروں کے پنکھے لگواتی تھیں۔ جدھر بھی وہ جاتیں ہاتھوں میں پنکھے رکھتی تھیں۔ مرد ہاتھی دانت کے لکڑی کے پنکھے استعمال کرتے تھے۔ ۱۷ویں صدی میں پیکنگ کے شاہی محلوں میں ہاتھی دانت کے پنکھے بننے لگے تھے چین پنکھوں کی پیداوار کا مرکز بن گیا۔ پنکھوں پر نقاشی بھی ہونے لگی تھی۔ خوب صورت تصویریں بھی بننے لگی تھیں۔

بہت سے جاپانیوں کا تو خیال ہے کہ بہترین پنکھے بنانے والا مستری سیدھا جنّت میں جائے گا۔ جب کوئی جوان کسی کو پنکھا پیش کرتا ہے تو اس پنکھے سے عطر کی خوشبو آتی ہے۔ جب کوئی مجرم کسی کو پنکھا پیش کرتا ہے تو وہ بانس کا بنا ہوتا ہے۔ اسی طرح لڑائی کے زمانے میں لوہے کے پنکھے حفاظت کے طور پر استعمال کیے جاتے تھے۔

ساتویں صدی میں جاپان نے ایسے پنکھے ایجاد کیے جن میں خاندان کی پوری تاریخ لکھی جاتی تھی۔

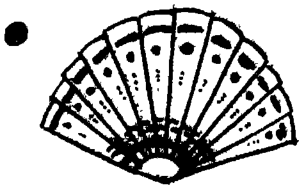
ایشیا اور بھارت میں پنکھے ٹھنڈک پہنچانے

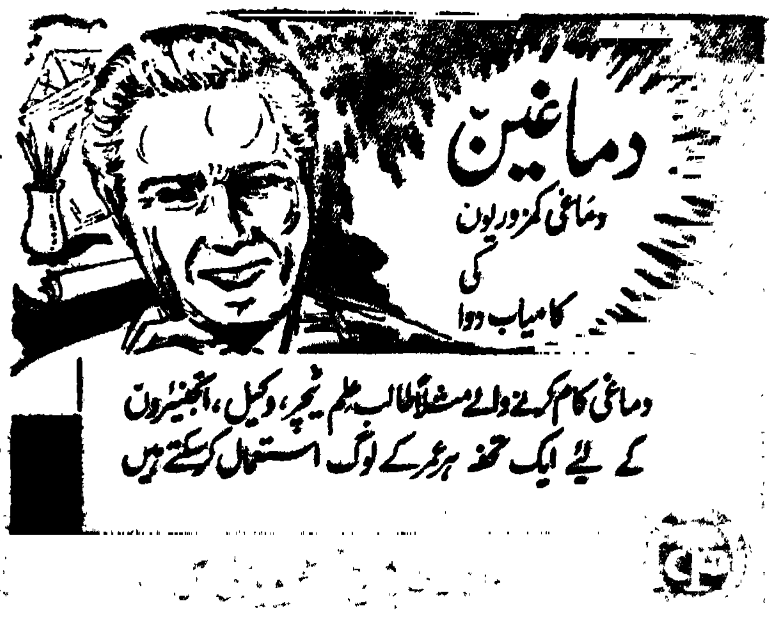
شان و شوکت کا نشان ہوتا تھا۔ بادشاہ جس پنکھے کو اپنے پاس رکھتا تھا اس پنکھے کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ یہ پنکھا جانوروں کے پروں سے بنایا جاتا تھا۔ یہ بے حد خوبصورت ہوتا تھا۔ اور بہت سے نوکر اس کی دیکھ بھال کے لیے مقرر ہوتے تھے۔

عیسائیوں نے مذہبی طور پر پنکھوں کو بڑی اہمیت دی ہے۔ یہ پنکھے چاندی کے ہوتے تھے۔ اور انھیں پادری لوگ اپنے ہاتھوں میں رکھتے تھے۔

سولھویں صدی میں بھارت اور مشرقی ملکوں میں ہاتھی دانت کے پنکھے ہوتے تھے۔ جن کی شکل جھنڈے جیسی ہوتی تھی۔ اس قسم کے پنکھے آج بھی نیویارک میوزیم میں موجود ہیں۔

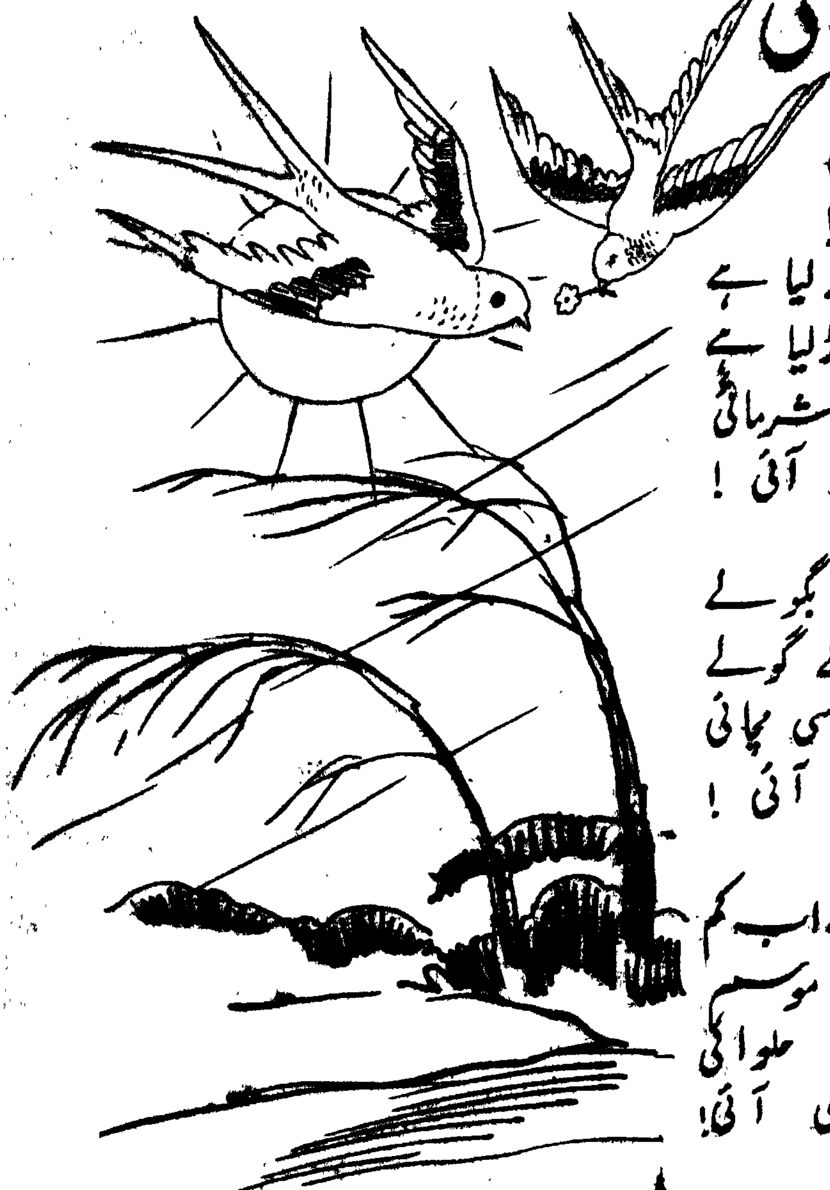
سترھویں صدی میں پیرس پنکھوں کا مرکز تھا۔ ۱۶۷۸ء میں وہاں پنکھوں کے کئی کارخانے قائم ہو گئے تھے۔ مگر وہ کافی مہنگے ہوتے تھے۔ ۱۸۷۰ء میں پیرس میں کم قیمت والے پنکھے بھی بننے لگے اور اسی زمانے میں یہاں پنکھوں کی بین الاقوامی نمائش بھی ہوئی تھی۔ بجلی کے پنکھے یورپ میں ایجاد ہوئے۔ مگر جاپان اس صنعت میں بہت جلد آگے بڑھ گیا۔ اب سے پچیس سال پہلے ہندوستان میں ہر طرف جاپانی پنکھے نظر آتے تھے۔ پر اب تو خود اپنے دیس میں بجلی کے اچھے سے اچھے پنکھے تیار ہونے لگے ہیں۔





نذر برنی

گرمی آئی



گرد، آندھی لائی
، گرمی آئی !
ی نے رُخ موڑ لیا ہے
سے رشتہ توڑ لیا ہے
ی سے سردی شرمائی
می آئی گرمی آئی !

ب، پچھم اُڑے بگولے
ہوں اینٹ کے گولے
ں طرف آفت سی مچائی
می آئی گرمی آئی !

ے کا پینا ہوا ہے اب کم
ہے لسی کا موسم
یہ شتو ملوائی
می آئی گرمی آئی!

ہوئے اسکول ہمارے
رکو گئے اب ٹیچر سارے
ہم نے چھٹی پائی
می آئی گرمی آئی !

غسل کریں گے شام سویرے
ہوا کریں گے باغ کے پھیرے
یاروں نے یہ بات سمجھائی
گرمی آئی گرمی آئی !

محترمہ اصغر مجیب

جب اور اب

(مسلسل)

گھونگھٹ میں تیرے چندا براج
لعل لگے انمول نا جڑی گھونگھٹ کھول
میاں پیاری گھونگھٹ کھول
باوا پیاری گھونگھٹ کھول
بنے مکھ دیکھ تیری بنی ہے سہاگ بھری
تاروں بھینی رات ہے رہو جیسے چندا کی کرن
بنے مکھ دیکھ۔

دوسرے دن دولہا کے یہاں ولیمہ کی شاندار دعوت ہوتی جس میں برادری کے علاوہ دور و نزدیک کے معزز مہمان شریک ہوتے۔ ایک سے بڑھ کر ایک خوش ذائقہ کھانے پکوائے جاتے شیرمال، کباب، مرغ، بریانی، بریانی قورمہ، متنجن، شاہی ٹکڑے، بالائی کے ٹکڑے۔

اس کے بعد چوتھی چالے ہوتے چوتھی کھیلی جاتی، دولہا والے۔ پھول۔ پھل ترکاریاں پھولوں کے گیند، ہار، گجرے لے جاتے خوانوں میں سجا کر لے جاتے۔ سمدھنیں چوتھی کھیلنے آتیں۔ سب ایک دوسرے پر چیزیں پھینکتے، دھما چوکڑی مچتی، خوب دل لگی ہوتی لیکن کبھی چوٹ بھی آجاتی اس وجہ سے بعد میں ہلکی پھلکی چیزوں کھیلوں وغیرہ سے چوتھی کھیلی جانے لگی۔ رسم ادا ہوجاتی سالیاں دولہا سے بڑا مذاق کرتیں۔ گڑیا بنائی جاتی وہ ایسے کہ دلھن کی جگہ کسی اور کو دلھن کے کپڑے پہنا کر بٹھا دیتیں اور اِدھر اُدھر کہیں چھپ جاتیں۔ دولہا پاس جاتا کچھ بولتا یا منہ کھولتا، دھوکے میں آجاتا تو قہقہوں کی آوازیں آتیں۔ سب ہنستی تالیاں بجاتی ہوئی آتیں اور وہ شرمندہ ہوجاتا۔ کبھی بغیر بُنا پلنگ بچھا کر اس پر چادر وغیرہ لگا دیتیں۔ اور دولہا کو ایسا چکمہ دیتیں کہ اس پر بیٹھے۔ وہ دھڑام سے اس کے اندر گر جاتا۔ خوب ہنسی پڑتی۔ کھانے کے بعد خاصدان دیتیں وہ کھولتا تو چڑیا پھر سے اڑ جاتی۔ کھانے پینے میں دھوکے بازی کرتیں نقلی چیزیں بنا کر رکھ دیتیں۔ کوئی فریب کھا جاتا کوئی سمجھ جاتا۔ دونوں طرف سے خوب فقرے کسے جاتے۔ دولہا تھوڑے ہی دن میں سب سے بے تکلف ہوجاتا اور ہنسی خوشی

ت، چھوٹے بچوں اور بچیوں کو تو دلھن سے اتنی
۔پاس سے ہٹنے کا نام ہی نہ لیتیں۔ کھیلتیں
میں بیٹھ جاتیں وہ بھی خوش ہوتی پیار سے
بوں طرح طرح کی دل چسپیوں اور دل لگیوں
مبارک تقریب حسن و خوبی سے ختم ہوتی شادی
باقی رہتے۔ وہ پرکیف نظارے وہ سہانی
یں سمائی اور دلوں میں بسی رہتیں۔

:۔ جب قریب قریب گھر ہوتے ان کا ایک
وں کے نام کسی مناسبت سے پڑ جاتے۔ املی
ۃ یتیم کنواں۔ ناکہ ہنڈولہ۔ جھاؤلال کا پل،
۔ گنج۔ ترہی۔ نخاس عیش باغ۔ دار الشفا،
رت گنج وغیرہ۔
رالے اپنے اپنے محلوں میں ایک دوسرے کی خیر
، بیماری شادی غمی میں سب شریک رہتے۔
رتے۔ جب اکثر پاس پاس گھروں میں ایک
ے میں جانے کے لیے کھڑکیاں بنی ہوتیں۔
سے جایا آیا کرتیں۔ اگر ذرا سا بیچ میں
ۃ بیٹھا ہوتا ہٹا دیا جاتا پردہ ہو جاتا تب
کا قاعدہ تھا کہ پاس پڑوس والوں کی ہر بات
ری، آنادی میں پہنچ جاتیں۔ دیکھ بھال اور
ساجاتیں۔ غریبوں، بیواؤں، یتیموں کی ضرورتیں
نا کر پوچھتی رہتیں۔ جو خود نہ کر سکتیں چپکے سے
سا کر پہنچا دیتیں۔ دینے والی خوشی سے ان کو

اس طرح دیتیں کہ اس میں ان کا نام بھی نہ ہوتا۔ جو نیک کام کرتا ہے اسے خود نمائش سے کوئی واسطہ نہ ہوتا۔ نیکی کر اور دریا میں ڈال۔

اور کچھ دولت مند بڑے دل والوں کا حال سناؤں۔ کاکوری کے منشی امتیاز علی صاحب بھوپال کے وزیر تھے۔ وہ میری والدہ صاحبہ معظمہ کے ماموں تھے۔ اس لیے بہت سی دیکھی سنی باتیں معلوم ہیں۔

وہ دونوں میاں بیوی بہت خیر خیرات اور حسن سلوک کرتے۔ جوہری ان کے پاس بہت آیا کرتے۔ وہ جواہرات خریدتے تو غریبوں کا بھی خیال رکھتے۔ سچے موتیوں کی لڑی غریبوں کی لڑکیوں کی نتھ کے لیے خریدا کرتے۔ ایسے موتی جو اب کسی قیمت پر نہیں مل سکتے۔ میری بہن محترمہ طاہرہ خاتون صاحبہ کو یاد ہے کہ بیگم صاحبہ قصبہ کی ہر غریب لڑکی کی شادی میں اس کو نتھ کے لیے دو موتی دیا کرتی تھیں۔ جب کسی لڑکی کی شادی ہوتی اس کی ماں آ کر لے جاتی۔ ایک صندوقچہ ان کے پاس رکھا رہتا تھا۔ ضرورت مند کو مٹھی میں روپیہ نکال کر اس طرح دیتیں کہ ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہوتی۔ ہر جمعرات کو دس روپے کی ریزگاری خیرات کر دیتیں۔

بعض بیویاں اپنے خاندان اور محلے میں اپنے کسی کام کی خصوصیت کی وجہ سے مشہور ہوتیں جیسے کوئی بیمار پڑا۔ اگر اس کا کوئی اس وقت پرسان حال اور تیماردار نہیں ہے۔ تو اس کا یقین ہوتا کہ ایسے وقت میں وہی کام آئیں گی۔ اور یہ سچ ہی ہوتا۔ خبر ملتے ہی ان کا مریض کے پاس پہنچنا

لازمی تھا۔ چاہے جتنے دن لگتے اپنے کو اس کی خدمت کے لیے وقف کر دیتیں۔ کہیں شادی بیاہ بھی کچھ بیویاں انتظام میں اتنی ہشیار ہیں کہ ان کے بنا کام ہی نہیں چلتا۔ ان کی پوچھ گچھ ہوتی۔ کچھ ایسی ہیں جو ہر جگہ تقریبوں میں کھانا نکالنے اور تقسیم کرنے میں جٹ جاتی ہیں۔ سردی ہو یا گرمی انہیں تن من کا ہوش نہیں وہ نہ کریں تو نہ بنے، انھی پر سب کچھ ڈال دیا جاتا وہی نپٹاتیں۔ کوئی کتر بیونت میں خاص ملکہ رکھتی ہیں۔ تھان کے تھان منہ میں ان کے سامنے ڈال دیے گئے۔ اب وہ ہیں کہ سوچ کر حساب لگا رہی ہیں۔ قینچی لیے بالشتوں سے ناپ ناپ کر کپڑا اس انداز سے کاٹ رہی ہیں کہ ضائع بھی نہ ہو اور چیز بھی صحیح صحیح اترے بیچ میں گپ شپ اور رائے زنی بھی ہوتی جا رہی ہے۔

کسی کو پڑھانے سے دلچسپی ہوتی۔ محلے کے بچوں کو شوق سے پڑھاتیں۔ ساتھ ساتھ ادب قاعدہ سکھاتیں عادتیں سنوارتیں۔ کیوں کہ اس زمانے میں نرسری اور بچوں کے لیے اتنے اسکول تو تھے نہیں۔ لڑکیاں ایک دوسرے کے گھر جا کر جسے جو ہنر آتا اس سے سیکھتی تھیں۔ کاڑھنا، بننا خاص خاص کھانوں کی ترکیبیں۔ ایک سے ایک اچھا کام، گن ڈھنگ آ جاتا۔

آج کل سوشل ورک کی بڑی دھوم ہے۔ فیشن سا ہو گیا ہے۔ غور کیا جائے تو جب بھی یہی کام زیادہ ٹھوس طریقے سے ہوتا تھا۔ اور بغیر معاوضہ کے۔ اس میں آپس کے میل جول۔ سماجی بھلائی اچھے اخلاقی اصول برتنے کے سوا اور کوئی ذاتی غرض شامل نہ ہوتی۔ اپنایت اور محبت برتتی اس سے خوشی بھی ہوتی۔ یہی اس کا انعام تھا جس کی بہت قدر و قیمت تھی۔

جن لوگوں کو خدا بہت دیتا ان کی وجہ سے ان کے پورے خاندان میں اجالا ہو جاتا۔ اپنے غریب عزیز بھی سر اٹھاتے۔ ان کے بچوں کی تعلیم اور لڑکیوں کی شادیاں اچھی طرح ہوتیں۔ خود اپنا اور اپنے بال بچوں ہی کا چین نہیں دیکھتے تھے۔ جیسے سورج اور چاند کی کرنیں صرف محلوں پر ہی نہیں جھونپڑوں پر بھی پڑتی ہیں ان کا فیض ایسا ہی ہوتا۔ سب نظر رہتی۔

ماں باپ کی خدمت کے علاوہ جو فرض سمجھی جاتی کوئی عزیز بیمار پڑ جاتا تو لگن سے اس کی خدمت کی جاتی صحت اور آرام کی فکر میں بھوک پیاس سب قربان ہوتی۔ لڑکیوں کی باریاں مقرر ہوتیں۔ وقت وقت پر دوا دیتیں اٹھاتیں بٹھاتیں۔ راتوں کو جاگنے سے سر بھاری۔ آنکھیں لال ہو جاتیں۔ مگر کوئی منع بھی کرے تو کہاں ماننے والی۔ بعض دفعہ ایسے موقعوں پر لوگ ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرتے کہ کس نے زیادہ خدمت کی۔ مریض کو صحت ہو جاتی تو سب کے دل باغ باغ ہوتے۔ صدقہ خیرات دی جاتی۔ میلاد شریف ہوتا۔

اکثر بڑی بوڑھیاں چھوٹے بچوں کا علاج خوب کرتیں۔ کھانسی، نزلہ، بخار، پیٹ کی خرابی، پسلی چلنا۔ آنکھیں دکھنا۔ اس قسم کی معمولی بیماریوں میں ان کی ذرا سی دوا کی چٹکی سے فائدہ ہو جاتا۔ حکیم ڈاکٹروں کے پاس جانے کی ضرورت نہ ہوتی۔ میری نانی مرحومہ کا اچھا خاصہ

عورتیں بچوں کو لاتیں۔ ان کو شفا ہوتی۔
ن چیزوں کے کھانے پینے سے نقصان
بیں حکیموں کے نسخے یاد تھے اور تجربہ بھی

یں بزرگوں کی مرضی اور خوشی کا بڑا
بیٹے بیٹیاں انھیں خوش رکھنا اپنی خوش
یں اور دعائیں لیتیں۔ اگر اختلاف
۔ اور جب تک وہ خوشی سے اجازت
نے۔ چھوٹی بڑی ایسی کتنی باتیں ہوا

پرانے خیال کے بزرگ تھے۔ وہ چاہتے
رہیں کیوں کہ یہ سہاگ کی نشانی سمجھی
ملونی۔ بہوؤں کو نتھ بالکل پسند نہیں تھی
اٹھ رہا تھا لیکن سسر کی مرضی بھی
یہ سے بچنے کے لیے انھوں نے یہ
ی بڑی سونے کی نتھنیاں
یں جب سسر کے اندر جانے کا وقت
لیتیں۔ ذرا دیر بعد وہ چلے جاتے تو پھر

رہا تھا نئے اور پرانے خیالات میں
تھی۔ بزرگوں کو انگریزوں کی تقلید بالکل
نسل اس پر مائل تھی، جس میں بڑی
من رہن سہن ہر چیز پر نئی روشنی

کے مردوں کو بے پردگی ایک آنکھ نہ بھاتی۔ اردو کے مشہور
شاعر اکبر کے یہ شعر آپ نے پڑھے ہوں گے، جو اس کیفیت کی
ترجمانی کرتے ہیں طنز کے ساتھ ؂

بے پردہ کل نظر آئیں جو چند بیبیاں
اکبرؔ زمیں میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا پردہ وہ کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

عورتوں کے لیے ایک رسالہ "پردہ نشین" نکلتا تھا۔
جس کے سرورق پر یہی اشعار لکھے ہوتے۔

مجیب صاحب نے اپنے بچپن کا ایک قصہ سنایا جب
وہ آٹھ برس کے تھے۔ اپنے رشتے کے بھائی محمود میاں کے
ساتھ حضرت گنج جا رہے تھے۔ راستہ میں لکھنؤ کے بیرسٹر
شاہد حسین قدوائی کی کوٹھی پڑی وہ اپنی بیگم صاحبہ کے ساتھ باغ
میں ٹہل رہے تھے مجیب صاحب نے محمود میاں سے پوچھا "وہ
کون ہیں؟" محمود میاں نے جواب دیا "ادھر نہ دیکھو" مطلب
یہ کہ کتنی بری بات ہے کہ سڑک کے سامنے آزادی سے بیوی
کے ساتھ ٹہل رہے ہیں، ادھر دیکھنا بھی برا ہے۔

بعض پرانے خاندانوں میں بیویاں اپنے شہر اور
دیہات میں پردہ کرتیں لیکن پہاڑ پر جا کر خوب آزادی سے
گھومتیں گھوڑے کی سواری کرتیں کیوں کہ وہاں کوئی بزرگ
دیکھنے والا نہ تھا۔

اور ترقی ہوئی تو اکثر عورتوں نے میموں کی تقلید
میں اپنے خوبصورت لمبے لمبے بال کٹوا کر پٹوں کی طرح چھوٹے کرا لیے

جناب کوثر اعظمی

ارے او آدم کی سنتان

بڑے پیامیوں کے لیے

وہ ہندو ہے، ہم ہیں مسلم، یہ سکھ، وہ عیسائی   ہر دم جھگڑا[1] ٹنٹا ہر دم، ان میں پھوٹ، لڑا
قوم جدا ہے اپنی لیکن ہیں تو سب انسان
پھر کیسی پیکار یہ باہم[2] او پاپی[3] نادان[4]؟
او پاپی نادان!
ارے او آدم کی سنتان[5]!

•

ہم ہندی، یہ پاکستانی، وہ چینی، جاپانی   ہم میں زور پہ کھینچا تانی اور ان میں من ما
ملک جدا ہیں اپنے لیکن ہیں تو سب انسان
پھر کیسی پیکار یہ باہم او پاپی نادان؟
او پاپی نادان!
ارے او آدم کی سنتان!

ہم بولیں اُردو، وہ ہندی، یہ ٹامل وہ کنڑی   ہم میں ختم ہے بھائی بندی، وہ آپس میں بیر
بولی جدا ہے اپنی لیکن ہیں تو سب انسان
پھر کیسی پیکار یہ باہم او پاپی نادان؟
او پاپی نادان!
ارے او آدم کی سنتان

---

[1] لڑائی جھگڑا [2] آپس میں [3] گنہگار [4] ناسمجھ، بے عقل [5] اولاد [6] دشمن۔

لے کالے، وہ گورے امریکی   اِن کو اپنی جان کے لالے، اُن کی چِتون تیکھی
رنگ جدا ہیں اپنے لیکن ہیں تو سب انسان
پھر کیسی پیکار یہ باہم او پاپی نادان
او پاپی نادان!
ارے او آدم کی سنتان

•

، باتیں، جھوٹی، یہ اتم وہ ہیٹے   ایک خدا کے بندے سارے، اک آدم کے بیٹے
قوم و وطن یا رنگ و زباں تو انساں کی پہچان
پھر کیسی پیکار یہ باہم او پاپی نادان ؟
او پاپی نادان!
ارے او آدم کی سنتان!!

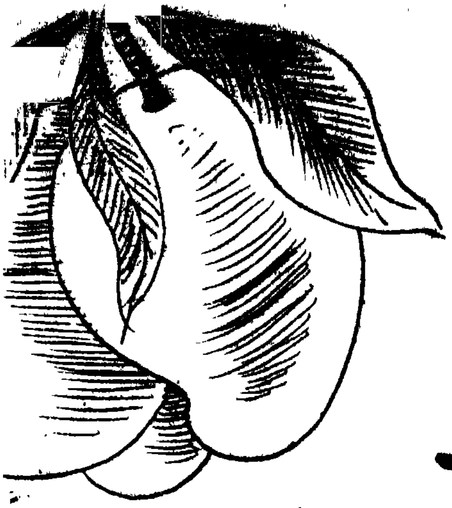
•

ہی جھوٹی ایک بڑا اک چھوٹا   لاکھ چمک اٹھو اس میں لیکن یہ سکہ ہے کھوٹا
مانو دھرم کی ایک سی شکشا، بھائی سب انسان
پھر کیسی پیکار یہ باہم او پاپی نادان ؟
او پاپی نادان
ارے او آدم کی سنتان!!

•

م کا ناتا ایک ہے او نادان   ایک ہے او نادان یہی کہ ہم تم سب انسان
ہم تم سب انسان ہیں تو پھر بن جائیں انسان
بن جائیں انسان
ارے او آدم کی سنتان!!

جناب سعادت صدیقی



آموں کی دعوت

احمد	۱۷ سال
رفیق	۱۶ سال
موہن	۱۶ سال
رام	۱۵ سال

(اسکول میں گرمیوں کی چھٹی ہوگئی ہے۔ احمد، رام، موہن اور رفیق چھٹیوں میں پکنک منانے کی سوچ رہے ہیں۔)

احمد :- (موہن سے) تمھارا گاؤں یہاں سے کتنی دور ہے؟

موہن :- واہ میاں واہ! اتنے دن ساتھ پڑھتے رہے اور ابھی تمھیں یہی نہیں معلوم کہ میرا گاؤں کتنی دور ہے؟ بس یہی سمجھ لو! امین آباد سے دو میل آگے۔

احمد :- اف فوہ! دو میل! اتنی دور کس سے پیدل چلا جائے گا۔ بھئی میں تو چل نہیں سکتا۔

رفیق :- آخر ہو نا پورے شہری — پورے مرزا پھویا۔ دو میل پیدل چلنے سے گھبراتے ہو؟

رام :- اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ جو اسکول بھی موٹر پر سوار ہو کر آتے، اس کے لیے دو میل تو کیا، دو فرلانگ بلکہ دو قدم بھی چلنا دشوار ہے

احمد :- بھیا سچی بات ہے میں تو پیدل نہیں چل سکتا۔ باہر جانے کا اللہ ہی ہے تو میں اپنی موٹر دے سکتا ہوں۔ اس میں بیٹھ کر ہم چاروں موہن کے گاؤں چلیں گے اور تھوڑی دیر سیر کر کے واپس آجائیں گے۔

موہن :- یہ نہیں ہو سکتا۔ ہم سب پیدل ہی جائیں گے اگر تم کو یہ شرط منظور نہیں ہے تو مت جاؤ۔

(احمد شش و پنج میں پڑ جاتا ہے۔ آخر موہن کی شرط منظور کر لیتا ہے)

رفیق :- ذرا یہ تو بتاؤ کہ کس دن چلنا چاہیئے؟ کسی لمبے دن چلنا اچھا ہوگا جب کچھ مزہ بھی آئے۔ میرے خیال میں تو آموں کے زمانے میں چلنا چاہیئے

موہن :- آموں کے تو بہت دن ہیں۔ اس زمانے میں دوبارہ چلے آنا۔

رام :- گاؤں گئے اور وہاں کی بہار نہ دیکھی تو لطف ہی کیا؟ آج کل وہاں کیا ہوگا؟ جس کو دیکھیں ہم سب وہاں چلیں۔ اچھا تو یہی ہے کہ رفیق کے مشورے پر عمل کیا جائے اور آموں کے زمانے میں ہم سب آپ کے گاؤں شریف! تشریف لے چلیں۔

رفیق :- موہن! تمھارے وہاں باغ واغ بھی ہیں؟ ایسا نہ ہو کہ ہم کو تو بلاؤ اور وہاں سوکھا منہ لٹکا کر کھڑے ہو جاؤ۔

:۔ یہ بلانے کے کیا معنی، ہم کوئی ایسے ویسے ہیں جو ان کے ہاں بلانے سے چلے جائیں۔ ابھی حضور ان کو یہاں آنا پڑے گا۔ اور ہمارے ساتھ چلنا پڑے گا۔ احمد سے تو انھوں نے صرف پیدل چلنے کا اقرار لے لیا۔ ان کو لینے یہ یہاں کبھی نہ آئیں گے۔ واہ! تم نے ایک ہی کہی۔

:۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔ میں ضرور لینے آؤں گا۔ کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ مجھے بلانا ایک بہانہ ہے۔ بات اصل میں یہ ہے کہ تم لوگ ٹھہرے شہری ڈرپوک۔ اکیلے جانے سے ڈرتے ہو کہ کہیں کوئی جنگلی جانور کتا، لومڑی، بلی وغیرہ نہ مل جائے۔ اور تمھیں جان چھپانے کی جگہ بھی نہ ملے۔

:۔ اچھا بھائی آپ تو بہادر ہیں۔ پر آپ کو آنا ضرور پڑے گا۔

:۔ ہاں، ہاں ان کے بغیر کیا لطف آئے گا۔۔۔ بے دولھا کی بارات میں کہیں مزہ آتا ہے؟

۔ اچھا یہ تو بتاؤ کھلاؤ گے کیا کیا؟

ہاں ہاں۔ یہ ابھی سے طے ہو جانا چاہیے۔

۔ کھانے دانے کی بات نہیں چلے گی پتہ نہیں راشن کا زمانہ ہے! اپنا اپنا کھانا باندھ کر ساتھ لیتے آنا۔ ورنہ بھوکے مرو گے۔ میرا کیا جائے گا؟ میں تو صرف اتنا کر سکتا ہوں کہ تم کو گڑ یا راب کا شربت اور اگر گائے کا دودھ ہو تو وہ بھی۔

رفیق :۔ بڑے کنجوس ہو کوئی ایسا لمکا سا جواب دیتا ہے۔ نہ کھلاتے تو حامی ہی بھر لیتے۔

موہن :۔ چلو ایسا ہی سہی۔ اب یہ بتاؤ کہ کس تاریخ کو میں آپ حضرات کو لینے کے لیے حاضر ہوں؟

احمد :۔ یہ بتاؤ کہ باغوں میں آم کھانے میں مزہ کب آئے گا؟

موہن :۔ یہ بھی نہیں معلوم۔ ارے میاں جب دو ایک بار پانی برس چکتا ہے اس کے بعد آم کھانے میں جو لطف آتا ہے وہ تم جیسے ڈرپوک اور نازک مزاج کیا جانیں جنھوں نے کبھی گھر سے باہر قدم نہ نکالا ہو۔

احمد :۔ اچھا اب نزاکت کو تو معاف ہی فرمائیے ورنہ ابھی چھٹی کا دودھ یاد آ جائے گا۔

رفیق :۔ ہاں ہاں مطلب کی بات کہو۔ ڈرو نہیں۔ ہم لوگ تمھارے آم یہاں نہیں لائیں گے۔ وہیں جو کچھ کھا سکیں گے کھا لیں گے۔

رام :۔ ہاں اور کیا۔ یہ تو بتاؤ کہ بارش کب شروع ہو گی؟

رفیق :۔ ایں! تم نے جغرافیہ نہیں پڑھا؟ دسویں میں کیسے آ گئے؟

رام :۔ میرا مضمون تاریخ ہے جغرافیہ نہیں۔ اور پچھلا یاد نہیں۔

رفیق :۔ اچھا تو یہ بات ہے۔ میں بتا سکتا ہوں لیکن ایک شرط پر۔

موہن شرط؟ کیا خوب! اچھا بتائیے کیا شرط ہے؟ شرط پوچھنے سے پہلے تم سب اقرار کرو کہ پوری کرو گے۔

موہن :- اگر پوری ہوسکی تو ضرور۔

رفیق :- بہت آسانی کے ساتھ۔

موہن رام: تو ضرور بتاؤ۔ ہم سب ضرور پوری کریں گے۔ کیوں احمد؟ تم کو منظور ہے؟

احمد :دل وجان سے۔ جب تم سب منظور کرتے ہو تو مجھے کیا عذر ہوسکتا ہے۔

رفیق :شرط یہ ہے کہ آپ تینوں صاحبان اپنے دستِ مبارک سے اپنے کانوں کو پکڑ کر دس مرتبہ اٹھیں بیٹھیں اور آئندہ سے اقرار کریں کہ پچھلا سبق ضرور یاد کریں گے۔

احمد :- مجھ سے تو یہ نہیں ہوسکتا کہ میں پچھلا سبق ضرور یاد رکھوں۔

(رام، احمد، اور موہن مجبور ہوکر کان پکڑ کر اٹھتے بیٹھتے ہیں اور وعدہ کرتے ہیں کہ ہم اپنا سبق ضرور یاد رکھیں گے)

رفیق :- اچھا تو سنو! ۱۵ر جون کے بعد بارش کا موسم شروع ہوجاتا ہے، اس لیے ہم کو ۱۵ر جون کے بعد ہی موہن کے گھر چلنا چاہیئے۔

موہن :- تاریخ وایخ کچھ نہیں۔ پہلے ڈونگرے کے بعد میں تم سب کو لینے چلا آؤں گا۔

احمد :- یہ ڈونگرا کیا بلا ہے؟ کیا یہ بھی دیہات میں ہوتا ہے؟

(موہن اور سب لڑکے ہنس دیتے ہیں)

موہن :- یہ ڈونگرا بلا نہیں ہوتا۔ دیہات میں بارش ہونے کو ڈونگرا کہتے ہیں۔ پہلی بارش کے بعد میں آؤں گا۔

(احمد، رام اور رفیق سب یہ بات منظور کر لیتے ہیں اور ایک دوسرے کو رخصت کرکے اپنے اپنے گھر چلے جاتے ہیں)

دوسرا سین

(پہلا پانی پڑ چکا ہے۔ آم پک گئے ہیں۔ اور بازار میں آنے لگے ہیں۔ بارش کے دوسرے دن احمد، رام اور رفیق جمع ہوتے ہیں اور موہن کا راستہ دیکھتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد موہن آجاتا ہے)

احمد :- اخاہ شری مان! لالہ موہن لال صاحب! آپ آ ہی گئے۔ ہم سب آپ ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ کہو سب خیریت ہے۔ آم وام پکنے بھی دیار یا نہیں؟ ٹپکے تو گرنے لگے ہوں گے؟

موہن : ہاں اس سال آم خوب آیا ہے۔ ٹپکے بھی گرنے لگے ہیں۔ تم سب چلنے کی تیاری کرو۔

رفیق :- میرے منہ میں تو ابھی سے پانی بھر آیا ہے۔ دیکھو موہن، میں خوب آم کھاؤں گا اور ساتھ بھی لاؤں گا۔ اگر تم نے منع کیا تو تمہاری خیریت نہیں۔

موہن :- ہاں ہاں ضرور۔ تمہارا جتنا جی چاہے لانا..... اب نخرے نہ کرو۔ جلدی چلو۔

رام :- ہم سب لوگ تیار بیٹھے ہیں۔ چلو چلتے ہیں۔

(سب لڑکے چل دیتے ہیں)

احمد :- بھئی موہن! اب تمہارا گاؤں کتنی دور ہے میں تو چلتے چلتے تھک گیا ہوں۔

:- ارے پیچھے! ابھی تو آدھی دور بھی نہیں آئے ہیں۔ تم ابھی سے تھک گئے۔ کوئی حرج

ہیں جب زیادہ تھک جاؤ گے تو موٹر منگا دیا جائے گا۔
ڑ سے کام نہیں چلے گا۔ میرے خیال میں تو نواب
حب کے لیے ہوائی جہاز منگا دیا جائے۔
ائی جہاز پر بیٹھتے ہی ان کا دم نکل جائے گا۔
پر بیٹھنے کے لیے دل گردے کی ضرورت ہے۔
لیا، جو دو میل پیدل نہیں چل سکتا وہ ہوائی جہاز
بیٹھے گا، اور پھر ان کا جسم تو دیکھو بالکل دھان
کبھی تم نے ان کو تندرست بھی دیکھا ہے۔
مزاج پوچھو گے یہی جواب ملے گا — "بھئی
حرارت ہو گئی تھی، آج سخت زکام ہے۔ سر
درد ہوتا ہی رہتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اتنی
یوں کے نام گنائیں گے کہ سننے والا گھبرا جائے۔
جانتے بھی ہو کہ یہ سب بلائیں یہ سب بیماریاں
ے پیچھے کیوں پڑی رہتی ہیں؟
ی کوئی معمّا ہے؟ جو لڑکا اتنے لاڈ پیار
ر و نعم میں پل رہا ہو وہ اگر بیمار نہ ہو تو اور
۔ یہ غلطی ان کی نہیں ہے ان کی تربیت کی
اگر اب بھی یہ روزانہ سویرے اٹھ کر
، پیدل چل لیا کریں تو ان کی بیماری، کاہلی
ن، ساری شکایتیں دیکھتے دیکھتے دور ہو جائیں۔
بھ سے سویرے نہیں اٹھا جاتا، اس وقت
ے کی نیند آتی ہے۔
ے اٹھنے کا مزہ تم کیا جانو؟ تمہیں کیا
۔ اس وقت سونے میں زیادہ مزہ آتا ہے

یا جاگتے ہیں۔ دو ایک روز سویرے اٹھ کر تو
دیکھو پھر تمہیں خود بخود اندازہ ہو جائے گا

احمد :۔ اچھا تو میں کل ہی صبح اٹھنا شروع کر دوں گا۔
اگر اس وقت صبح ہوتی تو ابھی اٹھ بیٹھتا۔

رفیق :۔ باتوں باتوں میں ہم لوگ موہن کے گاؤں کے
قریب آ گئے ہیں۔ وہ دیکھو سامنے نظر آ رہا ہے۔
کیوں موہن وہی ہے نا —؟

موہن :۔ ہاں۔ ہاں! ہم لوگ بہت اچھے وقت پر آ گئے
ہیں۔ آسمان کی طرف نظر اٹھا کر دیکھو کیسے بادل
گھر کر آتے ہیں۔ چلو جلدی چلو اگر پانی برسنے
لگا تو بھیگ کر چوہا ہو جاؤ گے۔

رفیق :۔ ہاں چلو ورنہ کہیں بھیگ گئے تو کپڑے بھی
نہ ملیں گے کہ بدل سکیں۔

رام :۔ جلدی کس بات کی۔ دیکھو کتنا اچھا سماں ہے
چاروں طرف باغ ہی باغ نظر آ رہے ہیں۔
یہاں آ کر اس موسم کا لطف نہ اٹھایا تو پھر کیا
فائدہ۔ زیادہ سے زیادہ بھیگ ہی تو جائیں گے۔

احمد :۔ نہیں صاحب۔ جلدی چلنا چاہیے۔ بھیگ
جائیں گے تو بڑی مصیبت ہو گی۔ کہیں بخار
وخار نہ آ جائے۔ یہ سیر تو واپسی میں بھی ہو سکتی ہے۔

موہن :۔ گھبراتے کیوں ہو۔ اب تو بالکل قریب آ گئے
ہیں۔ وہ دیکھو میرا باغ ہے۔ لیکن باغ سے
پہلے گھر چل کر ذرا سستا لیں پھر وہاں سے
باغ آئیں گے۔

رفیق :۔ گھر چل کر کیا کرو گے کچھ کھلاؤ گے نہیں؟ — سیدھے باغ ہی چلو۔

موہن :۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ پہلے گھر چلنا ہوگا۔

(سب لڑکے موہن کے گھر پہنچتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر وہ سب کو چوپال میں بٹھاتا ہے۔ اور اندر جا کر سب کے لیے گلاسوں میں دودھ لاتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ سب باغ کی طرف جاتے ہیں)

احمد :۔ تمھارا باغ کون سا ہے موہن؟ وہ جو سامنے ہے وہی ہے نا؟

موہن :۔ واہ اتنی جلدی بھول گئے۔ ابھی تو بتایا کہ اس کے پاس والا باغ میرا ہے۔

رام :۔ تمھارا باغ تو بہت خوب صورت معلوم ہوتا ہے۔

رفیق :۔ آم بھی ہوں گے اور ہم لوگ کھائیں گے بھی خوب۔

موہن :۔ یہ بار بار آپ کھانے کی دھمکی کیا دیتے ہیں۔ کہہ تو دیا کہ جتنا جی چاہے کھانا اور ساتھ بھی لے جانا چلو اس طرف سے چلیں قریب پڑے گا

رام :۔ نہیں۔ اسی طرف سے چلو قریب اور دور کا کیا سوال ہے؟

موہن :۔ اچھا۔

(احمد، رام، رفیق اور موہن باغ میں پہنچ جاتے ہیں)

احمد : (ایک درخت کی طرف اشارہ کرکے) اس درخت میں بڑے بڑے آم لگے ہیں۔ یہ کون سے آم ہیں۔؟

موہن :۔ یہ بنارس کا لنگڑا ہے کھا کر دیکھو کتنا مزیدار ہے۔

رام :۔ اس طرح نہیں۔ ہر قسم کا آم جمع کرکے ایک جگہ بیٹھ کر کھائیں گے۔

احمد :۔ ہاں۔ یہ رائے مناسب ہے کیوں نہ رفیق؟

رفیق :۔ ہے تو ٹھیک۔ لیکن اتنی دیر تک صبر بھی کر سکتے ہو؟

موہن :۔ میرے خیال میں رام کی رائے ٹھیک ہے۔ دیکھو وہ سامنے والا درخت ملیح آباد کے سفیدہ کا ہے

احمد :۔ اور یہ؟

رام :۔ رام یہ پیڑ دسہری کا ہے۔ ابھی ٹھیک سے نہیں پکا ہے۔

احمد :۔ تمھارے یہاں ثمر بہشت بھی ہے۔

موہن :۔ ثمر بہشت کے پیڑ تھے لیکن اب نہیں رہے قلمیں لگائی ہیں پار سال تک اس میں آم آجائیں گے۔

رفیق :۔ اور تخمی نہیں ہیں؟

موہن :۔ ہیں کیوں نہیں۔ چلو اسی طرف چلیں۔ میرے یہاں سرخا آم ہے۔

احمد :۔ یہ پیڑ تو سب سے بڑا ہے اور اونچا کتنا ہے

(احمد اتنا کہہ پایا تھا کہ اوپر سے ایک آم اس کے سر پر ٹپک پڑتا ہے۔ احمد اپنا سر سہلانے لگتا ہے سب لڑکے ہنس پڑتے ہیں

موہن :۔ اچھا چلو۔ اب یہاں بیٹھ کر آم کھائیں۔

(موہن ان لوگوں کو ایک جگہ بٹھا کر چلا جاتا ہے اور اپنے ساتھ کئی قسموں کے آم لے آتا ہے۔ سب آم کھانے میں مصروف ہو جاتے ہیں

رام :۔ مجھے تو ملیح آباد کا سفیدہ سب سے زیادہ پسند ہے۔

رفیق :۔ اور مجھے دسہری بہت اچھا لگتا ہے۔

. تمھیں زیادہ پسند ہیں ۔ اتنے شیریں آم میں
ابھی تک نہیں کھاتے تھے ۔
بھی اپنی اپنی پسند کے آم لے لو ۔۔ جی بھر کر
اؤ، میرے خیال میں ہر قسم کا آم چکھ کر دیکھو۔
یادہ پسند آئے اسے زیادہ کھاؤ اور گھر کے
ے رکھ لو ۔
ں ہاں، جلدی کا ہے کی ؟ ۔ اطمینان سے
تے ہیں ۔
ے بابا ۔ جیسا دل چاہے ویسا کرو ۔ یہاں
نے والا کون ؟
ں دوست آم کھانے میں مصروف ہیں اور باتیں کرتے
ہیں ۔ تھوڑی دیر کے بعد سب لوگ اپنے اپنے
ے آم لے کر چلنے کی تیاری کرتے ہیں ۔)
چلا جائے ۔ موہن تم بھی چلو ۔
واپس کیسے آؤں گا ؟
ی فکر نہ کرو ۔ اوّل تو آپ کو واپس کون آنے
' ۔ اور اگر واپس ہی ہونا پڑا تو موٹر موجود ہے ۔
موہن تم بھی چلو ۔ موٹر سے لوٹ آنا ۔
چلتے ہیں ۔ پہلے گھر پر اطلاع دے دیں ۔
آم کے بعد دودھ پینا ضروری ہے ۔
ہاں ضرور ۔
کے موہن کے گھر جاتے ہیں دودھ پیتے
ور موہن اجازت لے کر سب کے ساتھ چل
سا اپنے اپنے گھر کے لیے روانہ ہو جاتے ہیں ۔

بچّوں کے لیے مضمون نویسی کا کل ہند مقابلہ

" موجودہ زمانے کے سوویت یونین کی تعمیر میں لینن کا حصہ " کے عنوان سے اسکول میں تعلیم پانے والے ۱۳ سے سولہ ۱۶ سال کی عمر کے بچّوں کے لیے مضمون نویسی کے کل ہند مقابلے کا انتظام کیا گیا ہے ۔ یہ مقابلہ صد سالہ جشن لینن کے سلسلہ میں منعقد کیا جا رہا ہے ۔ مضمون زیادہ سے زیادہ ایک ہزار الفاظ پر مشتمل ہو گا ۔ اور سترہ ۱۷ زبانوں اور انگریزی میں سے کسی زبان میں لکھا جا سکتا ہے ۔ مضمون اسکول کے عہدہ داروں کے توسط سے ۱۷ / جون ۱۹۷۰ سے پہلے پیش کیا جانا چاہیے ۔۔ ان تمام زبانوں میں سے ہر زبان میں جو مضمون بہترین قرار دیا جائے گا اس کے مصنف کو گولڈ میڈل دیے جانے کی حکومت ہند کی طرف سے ڈاکٹر وی کے آر وی ۔ راؤ کی صدارت میں قائم کی ہوئی صد سالہ جشن لینن کمیٹی سے سفارش کی جائے گی گولڈ میڈل ہر زبان کے بہترین مضمون پر دیا جائے گا ۔ اس مقابلہ کی تفصیلات پر مشتمل بروچر ملک بھر میں ۳۰ ہزار مسلمہ اسکولوں کو بھیجے جا چکے ہیں ۔ نقد کا اعلان ستمبر ... کیا جائے گا ۔

بچوں کی مزے دار معلوماتی کتابیں

انوکھی مشین	دیپا داس گپتا	۱/۲۵
ایٹم کیا ہے	پ ٹکن میکر	/۷۵
انمول رتن	اطہر پرویز	۱/۵۰
ایک اچھوت کی کہانی	سوامی دہامنے	-/۹۰
اکبر اور بیربل کے لطیفے	اطہر پرویز	۴/۰
بچوں کے حالی	" "	-/۷۵
بچوں کے اقبال	" "	-/۵۰
باپو کے قدموں میں	منوبہن گاندھی	۱/-
بھارت دیس ہمارا دیس	جاوید اقبال	۱/۲۵
پنچ تنتر کی کہانیاں (اوّل)	شکنتلا دیوی	-/۷۵
" " (دوم)	" "	-/۷۵
بدن کی کہانی	اطہر پرویز	۱/۲۵
تیس مار خاں	شاہد علی خاں	-/۷۵
توانائی کا راز	اطہر پرویز	۱/۲۵
چار درویش	یدو ناتھ تھتے	۱/۲۵
خلا کا سفر	اطہر پرویز	۱/۲۵
روشنی کے مینار	جے بھکو	-/۷۵
سائنس کے کرشمے	وزارت حسین	۲/-
سائنس کی دنیا	" "	۲/۶۴
ستاروں کی دنیا بہت دور تک ہے	اطہر پرویز	۲/-
سورج کا گھرانا	اے وی ایس راما راؤ	-/۷۵
سائنس کے راستے پر	سیما	-/۹۰
شہر اور گاؤں	نرو شیو شرما	-/۷۵
شرالی	اطہر پرویز	-/۵۶
کاغذ کی کہانی	محمد آفاق	۱/-
مصنوعی چاند	اطہر پرویز	/۵۰
سمندر	وسنت نیل کنٹھ گدرے	/۷۵
نجومی آیا	اطہر پرویز	/۷۵
نیا تیرتھ	راجیندر راؤ تھی ترشنت	/-
نہرو امر ہیں	فصاحت حسین خاں	/-
ہولی اور چراغ	اطہر پرویز	/۶۲
ہماری کھیتی باڑی	سیما	/-
ہماری آباد دنیا	فصاحت حسین	/-
ہندوستان ترقی کی شاہراہ پر	ادھیر موہن سیناپتی	/-
ہمارے بن ہماری دولت	رام چندر تیواری	/۷۵
ہمارا ذہن	دریکا لڈوپا	/-
ہماری سائنس	وزارت حسین	/-
ہمارا ہندوستان	اطہر پرویز	/۷۵
اچھا شہری	پبلیکیشنز ڈویژن	/-
اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	" "	/۷۵
بھارت کی لوک کہانیاں	" "	/-
پنڈت نہرو سے بات چیت	ٹیبر منڈی	/-
خوش حالی کے لیے منصوبہ بندی	پبلیکیشنز ڈویژن	/۷۵
زنگا کے گیت	مترجم شمیم کرہانی	/-
سائنس کے چند پہلو	سی وی رامن	/۲۵
وویکانند	پبلیکیشنز ڈویژن	/۵۰
ہمارا جھنڈا	" "	/-
ہندوستان کی تاریخ	" "	/۷۵
ہندوستان کی نامور ہستیاں (اوّل)	" "	/۲۵
ہندوستان کی " " (دوم)	" "	/۵۰

ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال بمبئی ۳ (بی۔آر)

جناب عبداللطیف اعظمی



بھالو

...بعد ریچھ دیکھنے کا ارادہ تھا۔ اس لیے بچوں
...کے کٹہرے کی طرف چلی۔ سامنے ہیں بہت سے
...ح کی چڑیاں نظر آئیں، مگر ان سب
...لو زبردستی دھکیلتے
...لے پہنچ گئے۔ جہاں
...ائیں بہت سے

...ما جانور
...رگادوں
...بلبار دیکھا
...ؤں مداری
...لیے گھومتے
...ح طرح کے
...ھلاتے ہیں۔
...بیل پر سواری
...ال جاتا ہے۔
...ں کا خیال
...اری کریں
...تو چھوڑے
...ہنتے ہیں۔

...ے لیے پھرتے ہیں وہ سب ایک ہی طرح کے
...کے بڑے بڑے بال ہوتے ہیں۔ اسی لیے
...یں طرح طرح کے ریچھ دیکھ کر بچے دنگ
...کی طرح طرح کی حرکتیں دیکھ کر بہت

بچّوں نے تمام ریچھوں کو دیکھ لیا، تو انھوں نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا، مطلب یہ تھا اب میں ان کو کچھ بتاؤں۔

"ریچھ یا تو گھنے جنگلوں میں رہتے ہیں یا پہاڑوں کے غاروں میں" میں نے بچّوں کا مطلب سمجھتے ہوئے کہا۔ "ان کے بڑے بڑے بال انھیں سردی اور ٹھنڈ سے بچاتے ہیں۔ ریچھ بہت طاقتور ہوتا ہے۔ محض ایک مرتبہ پنجہ مار کر بارہ سنگھے کا سر اس کی گردن سے الگ کر دیتا ہے۔ خطرناک سے خطرناک جنگلی سور کو مار ڈالتا ہے۔ اور ایک میل سے زیادہ دور تک اٹھا لے جاتا ہے۔"

"بھلا ایک سور کا وزن کتنا ہوتا ہوگا؟" نشاط نے سوال کیا۔ "یہی کوئی ۱۶۰ پونڈ" میں نے جواب دیا۔ "اس کی طاقت کا اندازہ تم اس سے کر سکتے ہو کہ ایک مرتبہ ایک شکاری نے ایک ریچھ کو ایک لکڑی سے باندھ دیا۔ لکڑی کا وزن تین ۳۰۰ سو پونڈ تھا۔ مگر ریچھ اتنی وزنی لکڑی کو گھسیٹتے ہوئے جنگل میں بھاگ گیا۔"

بھلا ریچھ میں اتنی طاقت ہوتی ہے؟" گڈّو نے تعجب سے پوچھا۔ "اور وہ کھاتا کیا ہے؟" گڈّو نے پھر سوال کیا۔

"پھل، چھوٹے چھوٹے پودوں کی نرم نرم جڑیں۔ مونگ پھلی اور اسی قسم کی دوسری پھلیاں، کیڑے مکوڑے اور مچھلی۔ مگر اس کو سب سے زیادہ شہد پسند ہے۔"

"شہد؟!" تزئین، پروین، گڈّو اور نشاط سب ایک ساتھ بول پڑے۔ "محض گپ" ہما نے جواب تک بے تعلق سی ایک طرف بیٹھی تھی، میری بات پر یقین نہ کرتے ہوئے کہا۔ "شہد انھیں ملے گا کہاں سے؟ کیا گاندھی آشرم سے پھوپھا جان! اگر آپ تو کہتے ہیں کہ اب گاندھی آشرم میں بھی نہیں ملتا۔" "تمھارے گجرورا فارم سے" میں نے بھی اسی طرح جواب دیا جس طرح ہما نے سوال کیا تھا۔ اصل میں مجھے شہد بہت پسند ہے۔ اور اصلی شہد کی تلاش میں رہتا ہوں، کسی زمانے میں ہما کے گجرورا فارم میں بھی شہد کی مکھیوں کے بکس رکھّے گئے تھے۔ مگر چونکہ اس فارم پر اچھے پھول نہیں تھے۔ اس لیے شہد اگرچہ اصلی تھا، مگر مجھے پسند نہیں آیا۔ "خیر مذاق چھوڑو اور سنجیدگی سے سنو" میں نے کہا۔ "جنگلوں میں شہد کے بڑے بڑے چھتّے ہوتے ہیں۔ یہ تو شاید تم جانتے ہی ہو گے کہ ریچھ آسانی سے درختوں پر چڑھ جاتے ہیں۔ یہ بھی جانتے ہو گے کہ جہاں شہد کے چھتّے ہوں گے وہاں مکھیوں کا شور بھی ہوگا۔ بس یہی شور سن کر ریچھ شہد کے چھتّے ڈھونڈھ لیتے ہیں اور انھیں توڑ کر شہد نچوڑ لیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح انسان نچوڑتے ہیں۔"

"شہد کی مکھیوں کی بھنبھناہٹ پر ایک لطیفہ سنو" میں نے کہا۔ "کسی جنگل میں ٹیلیفون کے کھمبے گڑ رہے تھے۔ ایک ریچھ کا وہاں سے گذر ہوا۔ ٹیلیفون کے کھمبوں کی آواز سن کر وہ سمجھا کہ اس پر شہد کا چھتّا ہوگا۔ بس پھر کیا تھا، جھٹ سے کھمبے پر چڑھ گیا۔ مگر جب اوپر پہنچ کر شہد کا چھتّا نہیں ملا تو غصّے میں ٹیلیفون کے تار اور چینی کی پیالیاں وغیرہ توڑ ڈالیں۔ اصل میں ریچھ کو غصّہ بہت

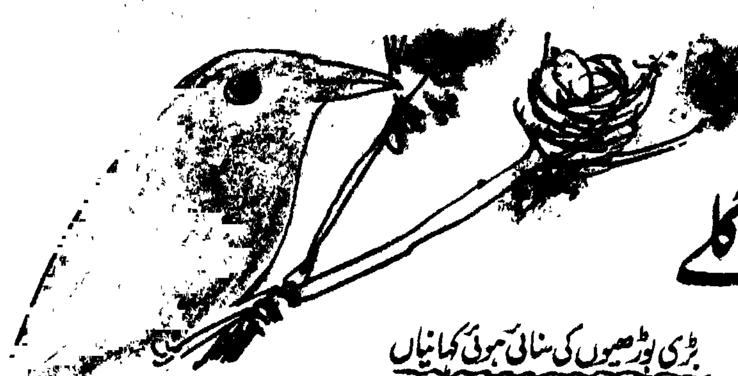


ر بہت سخت آتا ہے۔"

یل بڑے ریچھ کا وزن عام طور پر ۴۰۰ پونڈ ہوتا
لمبائی ۶ فٹ سے زیادہ ہوتی ہے۔ یوں دیکھنے
سست معلوم ہوتا ہے۔ مگر بہت تیز دوڑتا ہے۔
بل فی گھنٹہ کی رفتار ہے۔ رنگ عام طور پر
۔ بھورا بھی۔ لیکن ایک قسم ایسی بھی ہے جو بالکل
ہے۔ سفید ریچھ انتہائی برفیلی جگہوں پر پائے جاتے
بارے میں بعد میں بتاؤں گا۔"

ھ کے بچے سردیوں میں ہوتے ہیں۔ اس وقت
زن ایک پونڈ ہوتا ہے۔ ان کی آنکھیں بند ہوتی
ے تک دن رات بس سوتے ہی رہتے ہیں۔
ر پینے کے لیے جاگتے ہیں۔ پی کر پھر سو جاتے
بڑے ہوتے ہیں تو بہت بھلے لگتے ہیں۔ خصوصاً
چڑھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گرتے ہیں۔
ب پھر گرتے ہیں۔

(اگلے شمارے میں ریچھ کے بارے میں پڑھئے گا)



جناب سید حسن قہر

کھائیں چڑی کے چوگلے

بڑی بوڑھیوں کی سنائی ہوئی کہانیاں

چھوٹی بُوا خدا بخشے جب بھی کبھی کہانیاں سنانے پر اتر آتیں گھر بھر کے سب بچے انہیں گھیر لیتے اور بڑے انہماک کے ساتھ رات گئے تک کہانیاں سننے میں لگ جاتے ننھی سیما کو اپنی گود میں بٹھا کر وہ اپنی کہانی سنانے میں لگ جاتیں "جگ بیتے صدیاں گزریں کسی زمانے میں ایک ٹوٹے پھوٹے کنوئیں کے کنارے ایک برگد کا پیڑ تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا۔ کسی چڑیا نے برگد کے پیڑ پر گھونسلا بنا لیا۔ انڈے دیے ان کو سیا تب جا کر دو ننھے منے بچے انڈے توڑ کر باہر نکلے چڑیا خوشی کے مارے پھولی نہ سما رہی تھی۔ اس نے جھٹ بچوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپا لیا۔ گرمی پا کر چھوٹے چھوٹے بچے سو گئے۔

برگد کے پاس ہی ایک نیم کا پیڑ تھا اس پر ایک "کاگ داس" نام کا کوا رہتا تھا۔ کاگ داس بڑا ہی سیانا کوا تھا۔ جب چڑیا نے انڈے دیے تب سے وہ صبر کیے بیٹھا رہا خالی وقت میں وہ گھونسلے میں پڑے انڈوں کو تکتا رہتا اور جی پر صبر کر لیتا کہ جب انڈوں سے بچے نکلیں گے تب ان کا ناشتہ کروں گا۔ سو کمبخت آج بھی انڈوں کو تک رہا تھا۔ جیسے ہی اس نے دیکھا کہ ایک بچہ انڈا توڑ کر باہر نکلا وہ کود کر برگد کے پیڑ کی ٹہنی پر آ بیٹھا۔ پھر جب دوسرا نکلا تو وہاں سے پھدک کر کمبخت مارا گھونسلے کے برابر میں آ بیٹھا۔ چڑیا "کاگ داس" کو دیکھ کر سہم گئی [illegible]

جھاڑو پھرا جھٹ بولا "ناشتہ کروں گا" چڑیا اور بھی سہم گئی لگی کاگ داس کی منت سماجت کرنے۔ مگر جھاڑو پھرا نہ مانا سر ہلا کر بولا "آج تو ضرور ناشتہ کروں گا۔ سولہ دن سے صبر کر رہا ہوں"

چڑیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے بولی: "کاگ داس ابھی نہیں جب یہ بچے اڑنے لگیں تب ضرور ناشتہ کر لینا۔"

کاگ داس بگڑ گیا۔ بپھر کر بولا: "تو مجھے بے وقوف سمجھتی ہے کیا؟ ارے جب یہ اڑنے لگیں گے تو پھر ہاتھ ہی کب آئیں گے"

"چڑیا ڈر کر بولی" کاگ داس اچھا دس بارہ دن بعد ناشتہ کر لینا"

کاگ داس اور بھی بگڑ کر بولا "معلوم ہوتا ہے کہ تو اس بھلاوے میں ہے کہ میں دس بارہ دن صبر کر لوں اور جب یہ ذرا ذرا اڑنے لگیں تو ان کو لے کر اڑ جا۔ میں تو ابھی کھاؤں گا" چڑیا تھی عقل مند بولی: "کاگ داس بغیر منہ دھوئے ناشتہ کرو گے؟" کاگ داس بولا: "صبح ہی تو منہ دھویا ہے لا جلدی سے بچوں کو نکال دیر کیوں کر رہی ہے"

چڑیا تڑخ کر بولی "جھوٹے ہو ساری چونچ تو میلی ہو رہی ہے کہہ رہے ہو صبح ہی تو منہ دھویا ہے۔ جاؤ جلدی سے منہ دھو کر آؤ" [illegible] اچھا تو میرا انتظار کر

اگ داس کنوئیں کے مَن پر جاکر بولا ۔
ر تم کنوَر داس ہم کاگ داس
ھلے چنپلا کھائیں چڑی کے
کائیں کلا ۔"
ا " کاگ داس ڈول لے کر آؤ یا گھڑا لے کر
بانی) دوں گا " کاگ داس اڑ کر کمہار کے

ے کمہر داس ہم کاگ داس ۔
ا بھرے پنلا دھلے چنپلا کھائیں
کے چو گلے مٹکائیں کلا ۔"
ا" کاگ داس مٹی لے کر آو اس سے گھڑا
اس لہار کے پاس پہنچا اور بولا ۔
لہر داس ہم کاگ داس
کھدے مٹلا بنے گھڑا لا
دھلے چنپلا کھائیں چڑی کے چو گلے
مٹکائیں کلا "
" ابے کاگ داس جا سینگ لے کر آ میں
ہ لگاتا ہوں " کاگ داس بارہ سنگھے اور
اور بولے ۔
ن تم ہرن داس ہم کاگ داس
ا بنے کھرپا کھدے مٹلا
لا بھرے پنلا دھلے چنپلا
ڑی کے چو گلے مٹکائیں کلا "
[illegible]

داس .... پہلے ہمیں وہاں لے چل جہاں اچھی گھاس ہو ۔ گھاس کھا کر ہم دونوں آپس میں لڑیں گے ۔ اور جس کا سینگ ٹوٹ جائے گا وہ تمہیں دے دے گا ۔ کاگ داس بولا "چلو چلو لالہ بھگین مل کے باغ میں چلو وہاں بہت عمدہ گھاس ہے ۔ خوب ڈٹ کر کھایا کرنا ۔ پہلے اپنا سینگ توڑ کر دے دو پھر خوب جی بھر کر گھاس کھانا ۔"

ہرن بولا " اچھی رہی میاں کاگ داس ..... بغیر گھاس کھائے کیسے لڑیں ۔ جب آدمی گھاس کھا جاتا ہے تو ہی بے عقلی کی باتیں کرتا ہے ۔ ہم بھی جب گھاس کھا جائیں گے تبھی لڑیں گے ۔"

کاگ داس بولا " چلو ہرن داس جیوں لو چلو " اتنا کہہ کر کاگ داس اڑتا ہوا لالہ بھگین مل کے باغ میں پہنچا وہاں پر ہرن نے ڈٹ کر گھاس کھائی تب کاگ داس بولا " اب وعدہ پورا کرو تم خوب چھک گئے ۔ (ڈٹ کر کھا گئے) ہم ابھی بھوکے ہی ہیں " ہرن بولا " ابھی لو " اور دونوں نے لڑ کر اپنا سینگ کاگ داس کو دے دیا ۔ کاگ داس سینگ لے کر لوہار کے پاس پہنچا ۔ لوہار نے لوہے کو خوب گرم کر کے کھرپا بنایا اور اس میں سینگ کا دستہ لگا کر رکھ دیا ۔ کاگ داس بولا " لہر و داس کھرپا لاؤ " لوہار بولا " ارے ابھی کھرپا گرم ہے دیکھو لال ہو رہا ہے تم کہتے ہو تو لے جاؤ بتاؤ کیسے لے جاؤ گے " کاگ داس بولا " میری پیٹھ پر رکھ دو " لوہار بولا " جل جاؤ گے " کاگ داس بولا " فکر نہ کرو تم رکھ دو میں نہیں جل سکوں گا میرے پر مجھے جلنے سے روک دیں گے " لوہار بولا " جیسی مرضی " اور کھرپا
[illegible]

بچوں کے لیے دل چسپ معلوماتی کتابیں

مذہب

آں حضرت — الیاس احمد مجیبی — ‎-/65

ارکان اسلام — مولانا اسلم جیراجپوری — ‎-/50

چار یار — الیاس احمد مجیبی — ‎1/30

خلفائے اربعہ — خواجہ عبدالحیٔ فاروقی — ‎1/50

رسول پاک — عبدالواحد سندھی — ‎1/80

سرکار دو عالم — محمد حسین حسان — ‎2/-

عقائد اسلام — مولانا اسلم جیراجپوری — ‎-/50

مسلمان بیبیاں — اعجاز الحق قدوسی — ‎-/75

نبیوں کے قصے — خواجہ عبدالحیٔ فاروقی — ‎1/-

ہمارے رسول — ” ” — ‎1/40

ہمارے نبی — سید نواب علی رضوی — ‎-/60

معلومات

آدمی کی کہانی — مشتاق احمد اعظمی — ‎1/25

(انوکھا عجائب خانہ) — محمد حسین حسان — ‎-/50

” ” (دوم) — ‎-/40

” ” (سوم) — ‎-/40

” ” (چہارم) — ‎-/50

بجلی کی کہانی — علی احمد خان — ‎-/50

بجلی اور مقناطیس کے کھیل — ‎-/75

تاریخ ہند کی کہانیاں (اوّل) نجمہ سلطان — ‎-/80

” ” دوم — ضیاء الرحمٰن

تاریخ ہند کی کہانیاں (سوم) — مشتاق احمد اعظمی — ‎-/80

” ” (چہارم) — ‎-/95

بڑدادا کی کہانی — پروفیسر عبدالغفور — ‎-/56

ٹیگور — صفدر حسین — ‎1/25

چٹانوں کی کہانی — محمد امین — ‎1/75

خبر رسانی کے طریقے — رفیعہ امین — ‎-/85

دہلی — ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی — ‎1/50

دنیا کے بننے والے — بشیر حسین زیدی — ‎-/75

دنیا کے عجوبے — محمد حسین حسان — ‎-/80

سمندر کے کنارے — سلطانہ آصف فیضی — ‎1/40

سماجی زندگی اول — احمد ایس پٹیل اور غلام ابرار — ‎-/56

” ” دوم — ‎-/80

” ” سوم — ‎-/81

” ” چہارم — ‎-/81

قدرت کے کرشمے — ‎-/62

مفید معلومات دوم — ‎-/75

” ” سوم — ‎1/25

” ” چہارم — ‎1/50

معلومات کی پانچویں کتاب — ‎1/50

سمندر کے نیچے — سلطانہ آصف فیضی — ‎2/-

میر انیس — محمد حسین حسان — ‎-/25

ہماری پارلیمنٹ — کیلاش چندر — ‎-/10

کہانیاں

ابو خاں کی بکری — ڈاکٹر ذاکر حسین — ‎-/50

اس نے کیا کرنا چاہا — آصفہ مجیب — ‎-/37

پاک کہانیاں (اوّل) — مقبول احمد — ‎-/20

” ” (دوم) — 15

تانبیل خاں — محمد حسین حسان — ‎-/30

ترکوں کی کہانیاں — ‎-/15

چقماق کی ڈبیا — برکت علی فراق — ‎-/40

چھوٹی لالٹین — مشتاق احمد اعظمی — ‎-/21

چنبیلی — محمد حسین حسان — ‎-/50

چیادت کا آدم خور شیر — محمد معین — ‎-/35

خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا — کوثر بانو — ‎-/30

شہزادی گلنار — پروفیسر عطاء اللہ — ‎-/40

شیدلا — پروفیسر محمد مجیب — ‎-/50

لال مرغی — عبدالواحد سندھی — ‎-/50

مزہ چکھائیں گے — ‎-/35

ننھا ٹٹو — خورشید سلطانہ — ‎-/30

ملنے کا پتہ

مکتبہ … ۲۰، ۲۸ [illegible]

گرونانک

(بڑے پیامیوں کے لیے)

ایں یوں تو ہر رنگ کے غنچے چٹکے تھے
کو مہکادیں ہاں ایسے بھی گل مہکے تھے
پنجاب کے گلشن میں اک دن ایسا بھی نرالا گل مہکا
سج دھج ہی نرالی تھی جس کی اور روپ انوکھا تھا جس کا
ے مذاہب کی ایک روح اتر ہی آئی تھی
ومروت کی تصویر ابھر ہی آئی تھی
اس پھول نے اپنی حکمت سے پتھر کے خدا کو توڑ دیا
اوبھولے بھٹکے انساں کا توحید سے ناتا جوڑ دیا
ے کر عالم میں خوشبوئے صداقت پھیلائی
کر بھارت میں تنویر محبت پھیلائی
جو دردو الم سے بے کل تھے اس گل نے انھیں راحت بخشی
جو رنج و الم سے مضطر تھے اس گل نے انھیں فرحت بخشی
ن طاقت کا دنیا سے لوہا منوایا
اپنی عظمت کا بھارت میں ڈنکا بجوایا
پنجاب کے گلشن کا یہ گل ہم جس کو نانک کہتے ہیں
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب اس سے محبت کرتے ہیں۔



جناب مناظر عاشق ہرگانوی

ڈر کی تلاش

چھوٹا ناگپور کی لوک کہانی

ایک کسان کے دو لڑکے تھے۔ بڑا لڑکا بہت سمجھدار اور عقلمند تھا۔ گھر کا سب کام کاج وہی کرتا تھا۔ اسی لیے باپ بھی اس سے خوش رہتا تھا۔ چھوٹا لڑکا سیدھا سادہ تھا اک ذرا اُجڈ بھی تھا، کسی سے ڈرتا بھی نہ تھا۔

ایک دن کسان نے چھوٹے لڑکے سے کہا۔ "بیٹا تم کچھ سیکھو، نہیں تو تمہاری گزر بسر کیسے ہوگی۔"

بہت دیر سوچنے کے بعد اس نے جواب دیا۔ "ڈر کیا چیز ہے، میں یہی سیکھنا چاہتا ہوں۔" اور یہ بات اس کے دل میں بیٹھ گئی۔

باپ نے لاکھ سمجھایا کہ یہ بھی بھلا کوئی سیکھنے کی چیز ہے، پھر اس کے سیکھنے سے گزر بسر تھوڑی ہو سکے گی۔ مگر لڑکے نے دوسرا کوئی کام سیکھنے سے انکار کر دیا۔ بس یہی رٹ لگ گئی "ڈر کیا چیز ہے میں یہی سیکھوں گا۔"

ایک دن کسان کے گھر پروہت جی آئے۔ کسان نے اپنے چھوٹے بیٹے کے اجڈپن کا سارا حال ان سے کہہ سنایا۔ پروہت جی نے کہا۔ "اچھا اسے میرے ساتھ کر دو میں اسے بتا دوں گا کہ ڈر کیا چیز ہے۔" کسان نے اسے پروہت جی کے ساتھ کر دیا۔

پروہت جی اسے لے کر اپنے گھر پہنچے۔ ان ۔ گھر کے سامنے مندر تھا۔ انھوں نے مندر کی صفائی کا ک اس کے ذمّے کر دیا۔ ایک دن آدھی رات کو پروہت نے لڑکے سے کہا۔ "ذرا مندر میں جاؤ۔ میں اپنی م وہاں بھول آیا ہوں۔ اسے لے آؤ۔"

لڑکا چل پڑا۔ اور مالا لے کر مندر سے باہر آیا ا نے دیکھا کہ کوئی کالی چیز باہر کھڑی ہے۔ اس نے "کون ہے"، کوئی جواب نہیں ملا۔ اس نے پھر پوچھا: کیوں نہیں، تو کون ہے"؟ پھر بھی خاموشی رہی، تیسری با ڈپٹ کر بولا مگر پھر بھی کوئی جواب نہ ملا۔ تب اس نے "اچھا تم کوئی بھی ہو جب بولتے ہی نہیں تو یہ لو" یہ کہتے ہ اس نے اس زور کا دھکّا دیا کہ وہ کالی چیز پاس گڑھے میں گر پڑی۔

وہ سیدھا پروہت جی کے گھر لوٹ آیا اور کے بستر پر مالا رکھ کر سو گیا۔

صبح ہوئی تو دیکھا گیا کہ پروہت جی کی ٹانگ ہوئی تھی ہاتھ میں بھی کچھ چوٹ آئی تھی۔ رات کی کال وہ خود ہی تھے۔ انھوں نے اس لڑکے کو کسان پاس واپس بھیج دیا۔

ن نے اس لڑکے کو گھر سے نکال دیا۔ اور لڑکا
ے چل پڑا۔ راستے میں وہ سب سے پوچھتا جاتا

آدمی نے اس سے کہا" چلو آج جان جاؤ گے"
وہ دونوں ایک شہر میں پہنچے۔ اس دن اس
ے سات آدمیوں کو پھانسی دلوائی تھی۔ سب کی
ی تھیں۔ اس آدمی نے لڑکے سے کہا۔
ات بھر یہیں رہو ضرور جان جاؤ گے کہ ڈر
کہہ کر وہ آدمی اپنے گھر چلا گیا۔
رات ٹھنڈ بہت زیادہ تھی ہوا بھی زور سے
کچھ لکڑیاں جلا کر وہیں بیٹھ گیا۔ ہوا کے
سی پر لٹکی ہوئی لاشیں آپس میں ٹکرا رہی
ے پھڑ پھڑ کر رہے تھے اس نے کہا" شاید
لگ رہی ہے، اچھا ٹھہرو میں اس کا انتظام
اس نے ان سب کو اتار کر آگ کے چاروں
ڑی دیر بعد اچانک ایک لاش کے کپڑوں
س نے کہا۔
حفاظت کروں میں تمھارے لیے اور زیادہ
ے سنبھالو"
مردے بھی منع کرتے ہیں۔ ؟
س ہو کر اس نے کپڑے میں لگی ہوئی
سب کو جیوں کا تیوں لٹکا دیا۔
یرے وہ آدمی آیا اور اس نے پوچھا:

لڑکے نے رات کی ساری کہانی کہہ سنائی۔ تب اس آدمی نے کہا۔

" بھائی تمھیں کوئی بھی نہیں بتا سکتا کہ ڈر کیا چیز ہے"۔

وہ لڑکا وہاں سے بھی آگے بڑھ گیا۔

شام کے وقت وہ ایک دوسرے شہر میں پہنچا جہاں اس نے سنا کہ راجا کا ایک قلعہ ہے اس قلعے میں جو کوئی تین رات رہے گا اس سے راجا اپنی لڑکی کی شادی کر دے گا بہت سے لوگوں نے کوشش کی مگر کوئی بھی زندہ نہ لوٹا۔ ڈر کے مارے اس میں اب کوئی جاتا ہی نہ تھا۔

لڑکے نے سوچا" ڈر کیا چیز ہے چلوں ذرا دیکھوں تو" وہ راجا کے پاس گیا اور اس سے اپنی خواہش ظاہر کی۔ راجا نے کہا اچھا جاؤ تمھیں جو چیز چاہیے لے لو۔ لڑکے نے تین چیزیں مانگیں۔ ایک چارپائی، ایک لاٹھی اور آگ۔ اسے سب چیزیں مل گئیں اور وہ قلعے میں سو گیا۔

آدھی رات کے وقت" میاؤں میاؤں" کی آواز سن کر اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا مگر کوئی چیز نظر نہ آئی، ہاں آواز برابر آرہی تھی۔ اس نے اور غور سے دیکھا تو دو کالی بلیاں ایک کونے میں نظر آئیں۔ اس نے کہا" اگر تمھیں جاڑا معلوم ہوتا ہے تو آؤ آگ کے پاس بیٹھو" وہ سچ مچ چلی آئیں۔ تھوڑی دیر بعد ان بلیوں نے کہا" چلو ہم کچھ کھیلیں"۔ لڑکے نے کہا" میں تیار ہوں، لیکن کیا کھیلیں گے" ان بلیوں نے کہا" تاش" لڑکے نے کہا" ذرا اپنے پنجے دکھاؤ" انھوں نے دکھا دیے۔

چاقو نکالا اور ان کے پنجے کاٹ دیے۔ وہ چلانے لگیں۔ اس نے کہا: "نہ تو سوتی ہو، نہ کھیلتی ہو، ناحق دق کیوں کرتی ہو۔" مگر بلیاں مارے درد کے چلاتی ہی رہیں۔ آخر اس نے انھیں جان سے مار دیا اور قلعے کے نیچے بہنے والی ندی میں پھینک دیا۔

ابھی وہ بلیوں کو پھینک کر لوٹا ہی تھا کہ قلعے کے چاروں کونوں سے بہت سے کتے دوڑے آئے اور بہت سی بلیاں بھی آگئیں۔ ان میں سے کچھ رو رہی تھیں کچھ چلا رہی تھیں۔ انھوں نے آگ بھی اِدھر اُدھر بکھیر دی۔ کچھ دیر تک تو وہ چپ چاپ تماشا دیکھتا رہا پھر لاٹھی گھما گھما کر انھیں مارنا شروع کیا۔ کئی کتے چوٹ کھا کر وہیں ڈھیر ہو گئے۔ کچھ بھاگ پڑے۔ بلیاں بھی بھاگ پڑیں تب وہ مطمئن ہو کر سو رہا۔

سویرے لوگ اُسے دیکھنے آئے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ بھوتوں نے اسے مار ڈالا ہوگا مگر وہ زندہ نکلا۔

دوسری رات وہ پھر اس قلعے میں گیا اور آگ جلا کر چارپائی پر سو رہا۔ آدھی رات کو اس کی آنکھ کھلی تو اس نے دیکھا کہ ایک عجیب و غریب ڈراؤنا آدمی اس کی چارپائی پر بیٹھا ہوا ہے۔ لڑکے نے اسے دھکیلتے ہوئے کہا

"چارپائی تمھارے لیے نہیں ہے۔"

وہ آدمی لڑنے کو تیار ہو گیا اور دونوں میں کافی دیر تک دھینگا مشتی ہوتی رہی آخر لڑکے نے اسے دے ملا اور چارپائی اس پر رکھ کر لیٹ گیا۔ مگر چارپائی زمین سے دوڑنے لگی۔ لڑکے نے کہا: "اگر دوڑتی ہے تو اور تیزی سے دوڑ۔" فوراً چارپائی جیوں کی تیوں ہو گئی۔

پھر قلعے کے آنگن میں اس نے دیکھا کہ کچھ عجیب غریب آدمی گیند کھیل رہے ہیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ لگا۔ اس نے کہا "تمھاری گیند ٹھیک نہیں ہے لاؤ میں کر دوں۔" دراصل وہ گیند نہیں آدمی کی کھوپڑی تھی۔ نے لاٹھی سے پیٹ کر اسے چور چور کر دیا۔ وہ سب زور سے ہنسنے لگے۔ اور غائب ہو گئے۔ لڑکا بھی جا کر چ چاپ سو گیا۔

جب سویرے لوگ آئے تو انھوں نے اسے پایا۔ لوگوں کو بہت تعجب ہوا۔

تیسری رات کو بھی وہ قلعے میں گیا اور جاکر آدھی رات کے وقت خود بخود اس کی آنکھ کھل گئی تھی ا لیٹا ہوا کچھ سوچ رہا تھا کہ چار آدمی ایک چارپائی لیے آئے اور اس کے پاس چھوڑ کر چلے گئے۔ اس نے ایک بہت ہی دبلا پتلا آدمی جس کی آنکھیں نکلی ہوئی تھ کبھی سو جاتا کبھی جاگ پڑتا۔ لڑکا اپنی چارپائی سے اٹھا اسے پکڑ کر بولا۔

"شاید تمھیں سردی لگ گئی ہے اسی وجہ سے اُ نہیں سکتے۔" پھر وہ اسے سینکنے لگا مگر کچھ فائدہ نہیں اس نے چند لمحے سوچا پھر اس آدمی کو اپنے ساتھ سو گیا کہ شاید گرما جائے۔ تھوڑی دیر بعد وہ آدمی اُٹھ لڑکے کو ٹٹول کر جب اندازہ لگا لیا کہ وہ سو گیا ہوا ہے تو لڑکے کا گلا دبانے لگا۔ لیکن لڑکا جاگ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں نے تمھارے ساتھ بھلائی کی لیکن تم

ہے ہو"؟ مگر اس نے کوئی جواب نہیں دیا
آدمی کو اتنے زور سے دھکا دیا کہ وہ چارپائی
پھر اٹھنے کی مہلت نہیں دی اور پکڑ کر باندھ
یہ بعد چار آدمی آئے اور اسے اٹھالے گئے۔
کے بعد چاروں طرف اندھیرا چھا گیا پھر قلعہ
نے کی آوازیں آنے لگیں لیکن لڑکا چپ
دیک بیٹھا رہا۔ گھنٹے بھر بعد ایک بڈھا
مفید داڑھی زمین کو چھو رہی تھی۔ اس کو
بگڑ اٹھا۔
تم ہی یہ سب شرارت کر رہے تھے"!
آنکھ نہ دکھاؤ، نہیں تو میں تمہاری آنکھ پھوڑ

نے ڈپٹ کر کہا "بڈھے چپ رہ نہیں تو میں
گا، میں تجھ سے زیادہ طاقت ور ہوں"
نے کہا "اچھا آؤ امتحان ہو جائے کہ کون
"
کے ساتھ ساتھ لڑکا چل پڑا۔ راستہ بھیانک
اندھیری تھی۔ بڈھا لڑکے کو لے کر ایک کوٹھری
میں دو ہتھوڑے اور دو کیلیں رکھی تھیں
سے کہا "دیکھیں ان کیلوں کو کون زمین
سکتا ہے"
ڈھے نے کوشش کی۔ وہ کامیاب رہا پھر لڑکے
وہ بھی کامیاب رہا۔ اب لڑکے نے بڈھے
لی بڈھا چلانے لگا اور اس نے اُسے

چھوڑ دینے کی التجا کی۔ لڑکے نے داڑھی چھوڑ دی۔
اس کے بعد بڈھا لڑکے کو ایک دوسری کوٹھری
میں لے گیا اور بولا۔
"لڑکے میں تمہاری بہادری سے خوش ہو کر تمہیں
یہ راز بتا رہا ہوں۔ یہاں تین صندوق ہیں ان میں اشرفیاں
بھری ہوئی ہیں۔ ان میں سے ایک صندوق غریبوں کو دینا
ایک راجا کی نذر کرنا اور ایک اپنے لیے رکھ لینا" اتنا کہہ کر
بڈھا غائب ہو گیا۔
صبح سویرے راجا اور بہت سے لوگ لڑکے کو
دیکھنے آئے۔ سبھی کو یقین تھا کہ لڑکا مر گیا ہوگا۔ مگر وہ زندہ
نکلا۔ راجا نے پوچھا۔
"ڈر کیا چیز ہے کچھ معلوم ہوا؟"
لڑکے نے کہا "نہیں" اور اس نے رات کی کہانی
سب کو سنا دی۔
راجا اپنے محل میں آیا اور اپنی لڑکی سے اس کی
شادی کر دی۔ لڑکا راجکماری کے ساتھ آرام و اطمینان
سے رہنے لگا۔ مگر اسے ڈر کی تلاش اب بھی ہے —

بچوں اور بڑوں کے لیے بہترین تفریح
دوماہی **غنچہ** کلکتہ
ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ آپ پہلی ہی نظر میں اس خوبصورت
باتصویر رسالہ پر عاشق ہو جائیں گے آج ہی صرف زر سالانہ پچاس پیسے
(مع سالنامہ) نمونہ کے لیے ۲۰ پیسے کے ڈاک ٹکٹ روانہ کریں!
ہر شہر میں دیانتدار ایجنٹوں کی ضرورت ہے
منیجر "غنچہ" ۱۴ چاندنی چوک اسٹریٹ۔ کلکتہ ۱۳

بچوں کی دل چسپ کتابیں

چاچا نہرو	-/۱	حضرت امام حسینؓ	-/۲۵	تین شہزادے	۲۰
اصلاحی کہانیاں	-/۳۲	حضرت امام حسنؓ	-/۲۵	جادو کا ہاتھ	۲۰
بچوں کی اخلاقی کہانیاں	-/۳۲	حضرت رابعہ بصریؒ	-/۲۵	جادو کی بطخ	۲۰
بچوں کا ادب	۱/۵۰	حضرت سلمانؓ	-/۲۵	جادو کا گھوڑا	۳۰
بہادر لڑکا	-/۴۰	حضرت بلالؓ	-/۲۵	جادو کا پھل	۳۰
ٹیپو سلطان شہید	-/۳۰	حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ	-/۲۵	چڑیوں کی ملکہ	:
جنگل کی دنیا	-/۴۰	حضرت فاطمۃ الزہرا خاتونِ جنتؓ	-/۲۵	خوفناک جادوگر	۳۰
دل چسپ لطیفے	-/۳۰	ابھرتا سورج	-/۵۰	دیوپیکر درندہ	۲۰
دل چسپ کہانیاں	-/۳۰	زمین کے تارے	-/۵۰	ڈاکٹر بوجھ بجھکڑ	۲۰
ڈاکٹر اقبال	-/۳۰	چمکتے موتی	-/۵۰	رحم دل پریاں	۲۰
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت	-/۳۵	نین قلندر	-/۲۰	رستم و سہراب	:
ریل کا سفر	-/۲۵	ایک ننھی راجکماری	-/۳۰	شیش محل	۲۰
سنہری چڑیا	-/۴۰	ایک ننھی رانی	-/۲۰	شہزادی بغداد	۳۰
کبڑا گھوڑا	-/۳۶	آدم خور بگھی	-/۳۰	شہزادی پری زاد	۳۰
مولانا ابوالکلام آزاد	-/۳۰	افراسیاب کی بیٹی	-/۳۰	عراق کی شہزادی	۲۰
ننھی منی کہانیاں	-/۳۰	بہادر راجکمار	-/۲۰	لنگڑا دیو	۳۰
سرورِ دو عالمؐ	-/۵۰	باغی شہزادہ	-/۳۰	مسٹر عقلمند	۲۰
حضرت صدیق اکبرؓ	-/۲۵	بے وقوف پریاں	-/۲۰	مغرور شہزادی	۲۰
حضرت فاروق اعظمؓ	-/۲۵	پریوں کے تحفے	-/۲۰	ہنس مکھ شہزادہ	۲۰
حضرت عثمان ذی النورین	-/۲۵	پھول شہزادی	-/۲۰	ہیروں کا جزیرہ	۳۰
حضرت علی شیر خداؓ	-/۲۵	تیسرا انعام	-/۲۰		

ملنے کا پتہ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال بمبئی ۳ (بی۔ آر۔)

سفرنامہ ابن بطوطہ

دیو بادی

ن محمد تغلق کا یہ روشن رخ ہے جسے
ہے۔ جب اس کا تاریک رخ اور خون ریزی
ھیں گے تو حیرت میں رہ جائیں گے کہ ایسا
ہمدرد آدمی کتنا ظالم، سفاک اور بے رحم تھا۔
ے جنون میں نہ بھائی کی الفت رہتی تھی نہ
دل اور درویشوں کی عظمت رہتی تھی بلکہ
تی اور پاگل بن کر ایسے مظالم کرتا تھا جن
رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں ظلم پر ظلم یہ تھا
لگایا جاتا تھا اگر وہ صفائی پیش کرتا تو ایسا
وہ عذاب کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دیتا

مسعود خاں اس کا بھائی تھا۔ اس
علاء الدین کی بیٹی تھی، ایسا خوب صورت تھا
فی۔ الزام یہ لگایا کہ مسعود خاں بغاوت

ان نے بلا کر پوچھا تو اس نے بے دھڑک
ں لیے کہ قتل ہو جانا ان تکلیفوں کے مقابلے
رہ ری جائیں ہزار درجہ بہتر سمجھا چنانچہ

لاش بھی نہ اٹھائی۔

عفیف الدین کاشانی

عفیف الدین کاشانی عالم اور فقیہ تھا۔ کسی سے باتوں باتوں میں بادشاہ کی ایک تجویز کو غلط بتایا۔ اس پر سلطان نے اسے قید کر دیا۔ کچھ دن بعد چھوٹ کر گھر جا رہا تھا۔ راستہ میں اس کے دوست ملے اور انھوں نے مبارک باد دی۔ سیف الدین نے کہا خدا کا شکر ہے کہ ظالم کے ہاتھ سے نجات ملی۔ یہ خبر بادشاہ کو پہنچی حکم ملا کہ عفیف الدین کے دو ٹکڑے کر دیے جائیں۔ اور جن دونوں دوستوں نے عفیف الدین کو مبارک باد دی تھی ان کی گردن اڑا دی جاتے۔ اور جب انھوں نے کہا کہ عفیف الدین نے تو آپ کو ظالم کہا۔ ہمارا کیا قصور کہ گردن ماری جاتی ہے تو جواب دیا کہ تم نے اسے جھٹلایا کیوں نہیں؟ تم بھی مجھے ظالم سمجھتے ہو!

تاج العارفین کا قتل

یہ بزرگ کوئل (علی گڑھ) میں رہتے تھے۔ عبادت گزار اور تارک الدنیا تھے۔ بادشاہ کوئل گیا۔ انہیں بلایا تو آتے نہیں اور جب بادشاہ ان کے گھر گیا تو کہیں چلے گئے۔

کے خبر کی کہ تاج العارفین اپنی مجلس میں باغی امیر کی تعریف
کر رہے تھے۔ بادشاہ نے حکم دیا تاج العارفین کو گرفتار کیا جائے۔
پکڑنے والے نے تاج العارفین کو اس کے بیٹوں کو قاضی
اور محتسب کو بھی ساتھ میں پکڑ لیا کہ قاضی اور محتسب بھی اس
مجلس میں تھے جس میں باغی امیر کی تعریف کی گئی تھی۔ بادشاہ
نے قاضی اور محتسب کی آنکھوں میں نیل کی سلائی پھروادی
جس سے وہ اندھے ہوگئے۔ تاج العارفین اور ان کے بیٹوں
کو قید کر دیا۔ دونوں اندھوں کو روز قید خانے سے باہر کر دیا
جاتا تھا کہ جائیں اور بھیک مانگ کر لائیں۔ تاج العارفین مرگئے
تو کسی نے خبر دی کہ تاج العارفین کے بیٹے ہندوؤں سے
ساز باز رکھتے ہیں۔ بادشاہ نے انھیں قید خانے سے نکال کر
نصیحت کی کہ آئندہ ایسا نہ کرنا۔ اور جب انھوں نے کہا
کہ ہم نے تو ایسا کبھی نہیں کیا۔ تو بادشاہ نے ان کو قتل کر دیا۔
پھر قاضی سے کہا ان سب ہندوؤں کے نام بتاؤ
جن سے تاج الدین کے بیٹوں کا ساز باز تھا۔ قاضی نے
فہرست پیش کی تو بادشاہ نے ڈانٹ کر کہا کہ تو میری رعیت
کو اجاڑنا چاہتا ہے۔ اور قاضی کی گردن مارنے کا حکم دیا۔

فرغانہ کے رئیسوں کا قتل

طوغان اور اس کے
بھائی فرغانہ کے رئیس تھے۔ وہ اکثر بادشاہ کے پاس
آتے تھے اور بادشاہ ان سے سلوک بھی کیا کرتا۔ ایک دفعہ جب
زیادہ مدت گزر گئی اور سلطان سے وطن جانے کی اجازت نہ
ملی تو بے چارے چھپ کر وطن جانے لگے۔ بادشاہ کو خبر لگی تو
ان سب کو قتل کرادیا۔ اور ان کا مال و متاع مخبر کو دے دیا۔

دہلی ویران کر دی

اس کا سب سے بڑا ظلم یہ ہے
کہ ذرا سی بات پر غصہ ہو کر راتوں رات دلی کو ویران کر دیا۔
کچھ غنڈوں نے سازش کی۔ یہ لوگ بادشاہ کے نا
پرچے لکھتے اور ہر روز رات میں دیوان خانے میں ڈال جاتے
جن پر قسم لکھی ہوتی کہ ان پرچوں کو سوائے بادشاہ کے کوئی
نہ کھولے۔ بادشاہ پڑھتا تو ان میں گندی گندی گالیاں ہو
تھیں۔ بادشاہ نے غصہ میں آکر حکم دیا کہ تین دن کے اندر
اندر دلی خالی کر دی جائے۔ مرد عورت جوان بوڑھے سب
اپنا اپنا سامان لے کر دولت آباد چلے جائیں۔
تیسرے دن مخبروں کو بھیجا کہ بتائیں دلی میں کو
باقی ہے یا نہیں؟ مخبروں نے ایک اندھے اور اپاہج کو پیش
کہ یہ دونوں گلی میں پھر رہے تھے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اند
کو تو توپ سے اڑا دیا جائے اور اپاہج کو ٹانگ پکڑ کر گھ
ہوئے دولت آباد تک لے جائیں۔
حکم کی تعمیل ہوئی تو دولت آباد تک جو دلی سے
چالیس دن کا راستہ تھا۔ پہنچتے پہنچتے اپاہج کی صرف ایک
ٹانگ رہ گئی تھی۔ خدا کی پناہ! رات کو محل کی چھت پر
کر بادشاہ نے تمام دہلی میں اندھیرا دیکھا اور کہیں روشنی
دھواں نظر نہ آیا تو کہا اب میرا جی خوش ہوا ہے۔
ان حالات کو دیکھ کر اندازہ لگانا چاہیے
کہ ابن بطوطہ کا ہندوستان میں داخلہ
کس فضا میں ہوا تھا۔ اور اس نے اپنی
زندگی تلوار کی دھار پر کیسے گزاری ہوگی۔

آگے جن واقعات کا بیان کیا جا رہا
ہے ان سے آپ اندازہ کر سکیں گے کہ
...ہ دوش اور سخاوت کے ساتھ مشکلات
مصائب بھی بے پناہ تھے۔ (مقبول)
...سب باتیں میں نے اس لیے لکھی ہیں کہ آپ
...ے جو ہمارے پہنچنے کے وقت تھی آگاہ ہو جائیں۔
...لات لکھے جاتے ہیں۔ یاد ہوگا کہ ہم نے اپنے
...مسعود آباد تک لکھا تھا کہ بادشاہ قنوج گیا
...ں والدہ مخدومہ جہاں اور احمد بن ایاز خواجہ
...تھے،

...ہم دلی کی راجدھانی میں داخل ہوئے تو شاہی
...لے۔ پہلے دوسرے دروازہ سے گذر کر تیسرے
...ہنچے تو جو نقیب دروازہ میں تھے، ہمیں ایک
...ے گئے۔ جہاں خواجہ جہاں وزیر انتظار کر رہا تھا۔
...رتیب یہ تھی۔ آگے ضیاء الدین پھر قوام الدین
...عماد الدین کے بعد میں (ابن بطوطہ) میرے
...ین پھر امیر مبارک سمرقندی وغیرہ۔
...ے دالان میں ایک بڑا دیوان خانہ تھا جسے
کہتے ہیں۔ اس قصر میں بادشاہ کا دربار عام
...ں پہنچ کر وزیر اعظم اتنا جھکا کہ سر زمین پر
جھکے نگرا تنے نہیں!! یہ بادشاہ کے خاص
۔ چوبدار نے "بسم اللہ" کہا اور
...ئے۔

بادشاہ کی والدہ کا محل

بادشاہ کی ماں کو مخدومہ جہاں کہتے ہیں۔ نہایت بزرگ عورت ہے، خیرات بہت کرتی ہے۔ اس نے خانقاہیں بھی تیار کرائی ہیں جن میں مسافروں کو کھانا دیا جاتا ہے۔ بادشاہ اپنی ماں کی بے حد تعظیم کرتا ہے، سنا ہے کہ مخدومہ جہاں کسی سفر سے آئیں تو بادشاہ نے دلی سے باہر جا کر استقبال کیا، پالکی سامنے آئی تو گھوڑے سے اتر پڑا اور ماں کے قدموں کو بوسہ دیا۔

بادشاہ کے محل سے واپس ہو کر ہم حرم سرا کے دروازے کی طرف گئے جہاں مخدومہ جہاں رہتی ہے۔

خواجہ جہاں کے سوا ہم سب کے پاس کچھ نہ کچھ تحفے تھے۔

قاضی القضاۃ کمال الدین ہم سب کے ساتھ تھے۔ وزیر نے اور قاضی صاحب نے مخدومہ جہاں کے دروازے پر پہنچ کر تعظیم دی اور ہم نے بھی تعظیم دی۔ ایک منشی نے ہمارے تحفے رجسٹر میں لکھ لیے پھر کچھ لڑکے نکلے، ایک نے وزیر سے چپکے سے کچھ بات کی، اندر محل میں چلا گیا۔ پھر دو غلام وزیر کے پاس آئے اور کچھ بات کر کے چلے گئے۔ اور ہمیں دالان میں بٹھا دیا گیا۔ اس کے بعد کھانا آیا۔ پہلے سونے کے مٹکے آئے جن کی گھڑونچیاں بھی سونے کی تھیں۔ پھر پیالے، رکابیاں اور لوٹے لائے۔ یہ سب سامان بھی سونے کا تھا۔ پھر دستر خوان بچھا، ہر ایک دستر خوان پر دونوں طرف مہمانوں کو بٹھا دیا گیا۔ کھانے کے لیے ہم دستر خوان پر گئے تو حاجبوں اور نقیبوں نے تعظیم کی اور ہم نے بھی تعظیم کی۔ پہلے شربت

ہوگیا۔ کھانا کھانے کے بعد پان لائے گئے۔ اور حاجیوں نے
بسم اللہ کہا گویا کھانا ختم ہوگیا۔ پھر ہمیں دوسری جگہ لے گئے
اور زربفت کے خلعت دیے گئے۔ خلعت پہن کر محل کے
دروازہ پر آئے۔ محل میں سے ریشم کتان اور اونی تھان لائے
گئے۔ وزیر نے ایک ہاتھ میں سینی کو رکھا اور دوسرے ہاتھ
سے زمین کو چھوا۔ اور اس طرح یہ طریقہ ہمیں بھی سکھا دیا۔
یہاں سے ہم اپنی قیام گاہ پر چلے گئے۔ ہماری قیام گاہ پالم
دروازے کے قریب ہے۔ ہماری قیام گاہ کا مکان ہر
ایک سامان سے آراستہ تھا۔ فرش، برتن، چارپائیاں
بچھونے، سب چیزیں تھیں۔

ہندوستان میں ہلکی چارپائیوں کا رواج ہے۔
چارپائیوں اور بستروں کو ساتھ بھی رکھا جا سکتا ہے۔
چارپائیاں ریشم یا سوت کی سیتوں سے بنتے ہیں۔ ان
چارپائیوں کو بھگونے کی ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ یہ خود
ہی ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ ہر ایک چارپائی کے ساتھ دو
گدّے، دو تکیے اور ایک لحاف ہوتا ہے۔ یہ سب سامان
ریشمی کپڑے کا ہوتا ہے۔ یہ بھی دستور ہے کہ گدّوں پر
کتان یا سوتی کپڑا چڑھا دیا جاتا ہے۔ اس سے بستر میلا
نہیں ہوتا ہے اور اوپر کا کپڑا دھل جاتا ہے۔ پھر ہمارے
پاس آٹے والا اور گوشت والا آیا۔ اور مخدومہ جہاں کی
طرف سے کھانے کا سامان دیا گیا۔

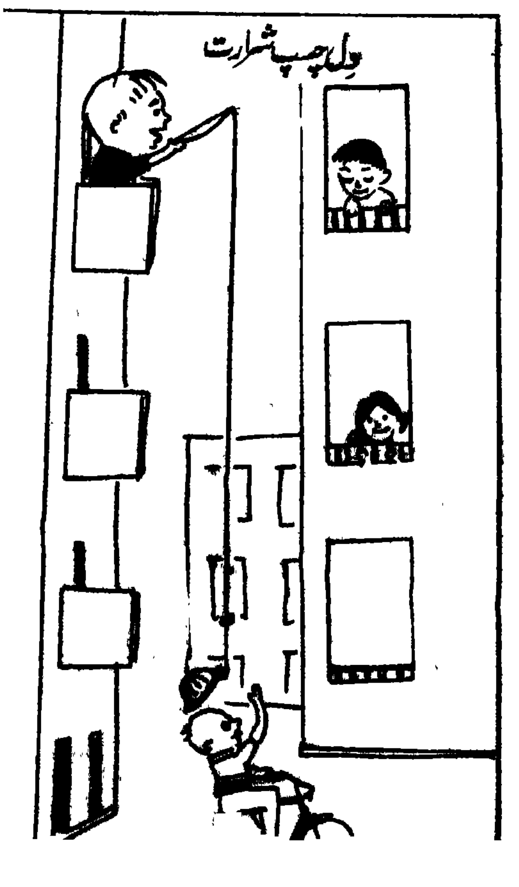
دوسرے دن محل شاہی میں گئے جہاں وزیر
نے مجھے ہزار ہزار اشرفیوں کی دو تھیلیاں دیں اور خلعت
[illegible] انھوں [illegible] کے نام لکھ کر [illegible]

تنکہ۔ درجہ دوم والوں کو ڈیڑھ تنکہ اور درجہ سوم والوں کو
تنکہ اشرفیاں دیں۔ درجہ چہارم والوں کو پچھتر پچھتر۔
ایک ہزار رطل آٹا اور برابر کا گوشت تھا۔ میرے
ساتھ چالیس آدمی تھے اور ان سب کو چار ہزار اشرفیاں
مل گئیں۔

حادثہ

ابھی مجھے آتے ڈیڑھ مہینہ ہوا تھا
کہ میری بیٹی جس کی عمر ڈیڑھ سال کی تھی مر گئی۔ وزیر نے
حکم دیا کہ اسے ابراہیم غزنوی کی خانقاہ کے پاس پالم
دروازہ کے سامنے دفن کر دیا جائے۔ تیسرے دن نتیجہ
ہوا۔

(باقی آئندہ)

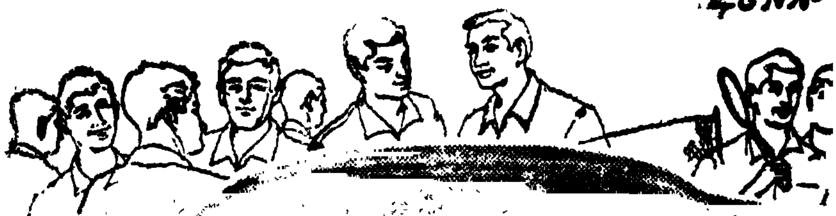


دعوے کے ساتھ کہئے... اگر آپ کی قمیص پر
"سینفورائزڈ" کا لیبل لگا ہے

SANFORIZED

کی قمیصوں سے بازار بھرا پڑا ہے۔ دھاریوں والی یا سادی۔ بندی یا چارخانہ یا پھر چمکیلے بھڑکیلے ڈیزائن والی
ان میں سے اکثر اچھی فٹنگ والی قمیصیں بھی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ متعدد بار دھلنے کے بعد بھی کیا یہ اپنی اصلی
قائم رہیں گی؟ جی ہاں اگر ان قمیصوں پر "سینفورائزڈ" کا لیبل لگا ہوا ہے۔ جب بھی قمیص خریدیں تو
ورائزڈ" کا لیبل دیکھ کر خرید لیجئے۔ آپ دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ قمیص کبھی سکڑ کر تنگ نہ ہوگی

سوتی سلے سلائے کپڑے خریدیئے تو "سینفورائزڈ" کا لیبل دیکھنا ہرگز نہ بھولئے۔ یہ کپڑا نہ سکڑنے کی
عتماد گارنٹی ہے۔



مارک سینفورائزڈ کے مالکان کلیوٹ پی باڈی اینڈ کمپنی انکارپوریٹڈ (محدود ذمہ داری کے ساتھ یو۔ ایس۔ اے میں
ہ شائع کیا۔ صرف اسی کپڑے سے متعلق اس ٹریڈ مارک کا استعمال کیا جاتا ہے جو کہ ... کی اجازت دی جاتی ہے
مری سکڑاؤ پر پورا اترتا ہے

[illegible]. SAN. [illegible]. UR.



علی احمد انجم شیرکوٹی

لکڑی کی ہتھوڑی

بہت دن ہوئے کسی گاؤں میں ایک کسان اس کی بیوی اور ان کی بیٹی نیلم رہتے تھے۔ ایک دن نیلم کوٹھری میں سے کچھ سامان نکالنے گئی۔ چھت کی ایک کڑی میں ایک کڑے کے سہارے ایک لکڑی کی ہتھوڑی لٹک رہی تھی۔ ہتھوڑی دیکھ کر وہ سوچنے لگی: "یہ ہتھوڑی کتنی خطرناک جگہ رکھی ہے۔ اگر کل میرا بیاہ ہو جائے اور میرے چاند سا بیٹا ہو، یہ چاند سا بیٹا بڑا ہو کر کوٹھری میں آئے اور یہ ہتھوڑی اس کے سر پر گر پڑے اور وہ مر جائے تو ہے ہے میں کیا کروں گی، اوئی اللہ میں کیا کروں گی!"

یہ بات سوچتے ہی وہ لگی زور زور سے رونے۔

رونے کی آواز سن کر ماں کوٹھری میں پہنچی اور رونے کا سبب پوچھا بیٹی نے روتے ہوئے کہا: "ذرا اس ہتھوڑی کو تو دیکھو! اگر میرا بیاہ ہو جائے اور میرے چاند سا بیٹا ہو، یہ بڑا ہو کر اس کوٹھری میں آئے اور یہ ہتھوڑی اس کے سر پر گر پڑے اور وہ مر جائے ہے ہے میں کیا کروں گی۔ ہائے میرا پیارا بچّہ!"

"سچ ہے بیٹی" ماں نے چیخ ماری اور بیٹی کے پاس بیٹھ کر لگی وہ بھی رونے۔

ماں بیٹی دونوں زور زور سے رونے لگے تو کسان دوڑا دوڑا آیا اور رونے کا سبب پوچھا۔ ماں نے روتے ہوئے کہا۔ "ارے اس ہتھوڑی کو دیکھو۔ اگر کل ہماری بیٹی کی شادی ہو جائے اور اس کے چاند سا بیٹا ہو اور وہ بڑا ہو کر اس کوٹھری میں آئے اور یہ ہتھوڑی اس کے سر پر گر پڑے اور وہ مر جائے تو۔ ہائے مرا ننھا منا نوا

"ارے یہ تو بڑا حادثہ ہوگا" یہ کہہ کر باپ بھی ماں بیٹی کے ساتھ بیٹھ کر رونے لگا۔

اتفاق سے ان کا ہونے والا داماد ملنے آیا ہو جب اس نے دیکھا کہ تینوں زار و قطار رو رہے ہیں تو ا کی خبر لینے وہ بھی کوٹھری میں گیا۔ وہاں تینوں کو رو دیکھ کر اسے بہت تعجب ہوا اور بولا: "ایسی کیا بات ہو جو تم سب رو رہے ہو؟" ماں نے روتے ہوئے و الفاظ دہرائے جو اس نے نیلم کے باپ سے کہے تھے۔ او پھر تینوں۔ ماں، بیٹی اور باپ ایک ساتھ رونے لگے

داماد ہنسا اور ہاتھ بڑھا کر ہتھوڑی اتار لی اسے ایک طرف پھینکا اور بولا "میں نے دیش ودیش ک سیر کی لیکن آپ جیسے بے وقوف نہیں دیکھے۔ اب میں گھومنے نکلا ہوں۔ اگر مجھے آپ سے بھی زیادہ بے وقو آدمی ملے تو میں لوٹ آؤں گا اور آپ کی بیٹی سے شاد کر لوں گا۔"

اتنا کہہ کر وہ چلا ...۔

ب گاؤں سے ہو کر گزر رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ
ے گائے کو سیڑھی کے ذریعے چھت پر چڑھانے
ہی ہیں۔ یہ دیکھ کر وہ بڑھیا کے پاس گیا اور کہا
سیڑھی پر چڑھتی ہے؟" بڑی بی نے جواب
ست پر لمبی لمبی گھاس کھڑی ہے۔ گائے کو
دں گی وہ آرام سے چرتی رہے گی۔"
اکی بے وقوفی دیکھ کر وہ بولا "ارے بڑی بی
اٹ لیجیے اور گائے کے آگے ڈال دیجیے گائے
چڑھ سکتی۔" بڑی بی ایک نہ مانیں وہ سمجھتی
ہکڑ نیچے لانے سے، گائے کو اوپر چڑھانا آسان
ن کی بے وقوفی دیکھ کر ہنسا اور آگے بڑھ گیا۔
دوسرے گاؤں میں پہنچا۔ وہاں اُ سے
دوست کے پاس ٹھہر گیا۔ صبح جب آنکھ کھلی
دوست کھونٹی پر ٹنگی پتلون پر اچھل کود رہا
ے ایک کونے سے دوڑ کر آتے اور پتلون پر اچھلتے
یران ہوا۔ اب وہ دوست تھک ہار کر بیٹھ
نے "یہ پتلون بھی عجیب پہناوا ہے۔ نہ جانے
نے اسے ایجاد کیا ہے۔ ہر روز پتلون پہننے
، جاتے ہیں" اور پھر اپنے ساتھی سے کہا "آپ
یقہ بتا دیں۔ ہر روز کی زحمت سے بچ جاؤں
زور سے ہنسا اور اسے آسان طریقہ بتا دیا۔
بہت تعجب ہوا اور بولا "ارے اتنا آسان
ے گمان میں بھی نہیں آیا تھا۔

میں پہنچا۔ گاؤں سے باہر تالاب کے کنارے گاؤں والوں کا جمگھٹ لگا تھا اور کچھ لوگ ہاتھوں میں بانس جھاڑو، لاٹھی ٹوکرے لے کر تالاب میں گھسے ہوتے تھے۔ اس نے پوچھا "یہ آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟" ایک نے جواب دیا۔ "ارے دیکھتے نہیں تالاب میں چاند گر پڑا ہے، اور اب ہم سے یہ نکلتا ہی نہیں۔"

یہ سن کر وہ ہنس پڑا اور بولا — "ارے بھلے مانسو اوپر آسمان پر دیکھو یہ تو چاند کی پرچھائی پانی میں دکھائی دے رہی ہے۔" یہ سنتے ہی وہ گاؤں والے بھڑک اٹھے اور اسے مارنے کے لیے اس کے پیچھے دوڑے۔ بہت مشکل سے بے چارا جان بچا کر بھاگا۔

آخر اُسے یقین ہو گیا کہ اس دنیا میں کسان کے خاندان سے بڑھ کر اور بھی بے وقوف بھرے پڑے ہیں۔ یہ سوچ کر وہ وہیں سے لوٹ پڑا اور اس نے اس کسان کی بیٹی سے شادی کر لی۔ (ایک انگریزی لوک کہانی سے ماخوذ)

ذرا نیچے دیکھیے



ایک گول دائرہ سا بنا ہے۔ اس دائرے میں سرخ نشان ہے۔ اس سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی خریداری کی مدّت اس مہینے ختم ہو رہی ہے

ہمیں یقین ہے کہ آپ اس کی سرپرستی جاری رکھیں گے اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک مبلغ چھ روپے کا منی آرڈر بھیج

جناب سید منیر الحسن منیر

منزل کی طرف

(۱)

قدرت نے جو چیز بنائی
اس میں نہیں ہے کوئی برائی
دل سے بُری ہر بات نکالو
خود کو اونچا اور اٹھالو
اپنے کو کچھ اور سنبھالو
اچھے نقشے دل میں جما لو
اچھے ارادے تم کو اٹھائیں
راہِ[1] منزل تم کو دکھائیں

(۲)

تم نہ کسی کے دل کو دکھانا
دشمن کو بھی دوست بنانا
دونوں کی ہے اس میں بھلائی
جس نے طبیعت ایسی پائی
اس سے ہوائی مانوس خدائی
حاصل کرلی اس نے بڑائی
اچھے ارادے تم کو اٹھائیں
راہِ منزل تم کو دکھائیں

(۳)

جو سچا ہے خوش رہتا ہے
جو جھوٹا ہے غم سہتا ہے
دیکھو بُرے کی قدر کہیں ہے؟



کیونکہ بُرائی فتنے اٹھائے
جھگڑوں کا آغاز کرائے
سانچ کو دیکھو آنچ نہیں
اچھے ارادے تم کو اٹھائیں
راہِ منزل تم کو دکھائیں

(۴)

کام آئے گی شیریں بیانی
کیونکہ شرافت کی ہے نشانی
اچھی ہی تصویر ہے ا

[1] راستہ

نیق شاستری

پنچ تنتر کی کہانیاں



کسی شہر میں چار دوست رہا کرتے تھے۔ تین
ن پڑھے لکھے تھے ایک ان پڑھ تھا، پر جو پڑھے
ہ بے عقل تھے۔ ان کے مقابلے میں ان پڑھ عقل کا
روں دوست دولت کمانے کے لیے پردیس کو نکلے
چھ دور جا کر ان میں یہ بحث چھڑ گئی کہ دولت کمانے
کی ہی نہیں، علم کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ سب
دوست کا کہنا تھا کہ علم کی بدولت ہی ہم دولت مند
ام کر سکتے ہیں۔ اس لیے ہم پردیس میں جو کچھ
اس میں سے ان پڑھ دوست کو کچھ بھی نہ دیں گے۔
لت چاہے تو ابھی گھر واپس جا سکتا ہے۔
سرے دوست نے بھی ہاں میں ہاں ملائی۔
ت اس پر راضی نہ ہوا۔ اس نے کہا: "ہم لوگ
لت ہیں گھر سے ایک ساتھ دولت کمانے نکلے
یں گے اس میں اس کا بھی حصہ ہے گا۔ اپنوں سے غیریت
نگ دلی کی علامت ہے۔ سچے اور دل والے
یلا کو بھی اپنا سمجھتے ہیں۔ ہمیں بھی فیاضی
...

ہی دور آگے آئے ہوں گے کہ انھیں ایک مرے ہوئے شیر
کی لاش ملی۔ پڑھے لکھے دوستوں کو تو اپنے علم و دانش پر بڑا
گھمنڈ تھا۔ کہنے لگے کہ "سائنس کی کرامات سے ہم اس شیر
کے اندر جان ڈال سکتے ہیں۔"

ایک دوست بولا: "تو پھر کیوں نہ اپنے سائنس کے
علم کو آزمایا جائے اور اس مردہ شیر کو پھر سے زندہ کر دیا
جائے۔" بس پھر کیا تھا شیر کو زندہ کرنے کی بات طے ہو گئی۔
تینوں عالم فاضل دوست شیر کو زندہ کرنے کے عمل میں
جٹ گئے۔ ان پڑھ دوست یہ سارا تماشہ دیکھ رہا تھا۔
اس نے سائنس نہیں پڑھی تھی مگر وہ تھا عقل مند۔ اس
نے تینوں دوستوں سے کہا کہ "جو کام تم لوگوں نے کرنے
کی ٹھانی ہے اس کے انجام کے بارے میں بھی کچھ سوچا
ہے؟"

اپنے آپ کو سب سے بڑا سائنس داں سمجھنے
والا دوست بولا: "آئیں، یہ کیا کہا تم نے۔ ہم شیر کو زندہ
کرنے جا رہے ہیں۔ اور ہم اس میں یقیناً کامیاب ہوں
گے۔ یہ انجام کی کیا بات تم نے کہی۔"

کہ کہیں یہ شیر سچ مچ زندہ ہو گیا تو؟ کیا وہ زندہ ہوتے
ہی ہم لوگوں کو کھا نہ جاتے گا۔؟"

گھمنڈی سائنس داں دوستوں نے اس کی بات
ان سنی کر دی تو وہ بولا " اچھا بھائی تم لوگ شیر کو زندہ
کرو میں تو پیڑ پر چڑھ جاتا ہوں۔ وہیں سے سارا تماشہ
دیکھوں گا۔"

عقل کے پورے ان سائنس دانوں نے شیر کو
زندہ کر ڈالا۔ شیر انگڑائی لے کر اٹھا اور تینوں کو ایک
ایک کر کے کھا گیا۔ ان پڑھ دوست پیڑ کے اوپر سے سارا
تماشہ دیکھتا رہا۔

~~~ • ~~~

یہ کہانی سن کر سونے والے دوست نے کہا کہ
"صرف علم حاصل کر لینا ہی کافی نہیں معاملات کو سمجھنا
اور اس کے مطابق عمل کرنا بھی ضروری ہوتا ہے نہیں تو وہ
بھی بے وقوف پنڈتوں کی طرح لوگوں کی ہنسی کا نشانہ
بنتے ہیں۔"

چکر والے نوجوان نے پوچھا "کن پنڈتوں کی طرح؟"
"سونے" والے دوست نے تب بے وقوف پنڈتوں کی یہ
کہانی سنائی۔

کسی شہر میں چار برہمن
رہا کرتے تھے۔ وہ شاستروں کا گیان حاصل کرنے کاشی
گئے۔ بارہ سال پڑھنے کے بعد انہیں سارے شاستروں
کا گیان ہو گیا اور وہ پورے پنڈت بن کر شہر واپس آنے
لگے۔

کچھ دور چلنے کے بعد راستہ دو طرف کو مڑتا تھا۔
ان لوگوں کو یہ پتہ نہیں تھا کہ کون سا راستہ ان کے نگر
کی طرف جاتا ہے۔ بہت دیر تک سوچنے کے بعد جب وہ
کوئی فیصلہ نہ کر سکے تو وہ وہیں بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد
وہاں سے بنیے کے لڑکے کی ارتھی نکلی۔ ارتھی کے ساتھ بہت
سے مہاجن بھی تھے۔ لفظ "مہاجن" پر ان میں سے ایک
دوست چونک پڑا۔ اس نے اپنی پوتھی نکالی۔ پوتھی میں لکھا
تھا: "جس راستے 'مہاجن' جائے وہی راستہ ٹھیک ہوتا"
کتاب کی اس بات کا ٹھیک مطلب نہ سمجھنے کی وجہ سے
وہ چاروں دوست بھی ارتھی کے پیچھے پیچھے شمشان کی
طرف چل پڑے۔ عقل کے مارے ان پنڈتوں کو یہ پتہ نہیں
تھا کہ کتاب میں جس جگہ لفظ 'مہاجن' لکھا تھا وہاں اس
کا مطلب ہے "اچھا آدمی" اور اچھا آدمی جدھر سے گزرتا
ہے وہ راستہ بھی ٹھیک ہوتا ہے۔ انھوں نے تو بس اس
سے یہ مطلب نکالا کہ بنیا یا مہاجن جدھر سے جائے وہی ان
کے شہر کا راستہ ہے۔ اور وہ ارتھی کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔

شمشان کے پاس پہنچے ہی تھے کہ انھیں ایک
گدھا کھڑا مل گیا۔ ان میں سے ایک پنڈت کو پوتھی میں
لکھی ہوئی ایک بات اور یاد آگئی۔ پوتھی کھول کر دیکھی تو
اس میں لکھا تھا کہ راج دربار اور شمشان میں جو کھڑا ہو
وہ اپنا ہمدرد بھائی ہوتا ہے۔ پھر کیا تھا ان چاروں
نے شمشان ہی میں کھڑے ہوئے گدھے کو اپنا بھائی بنا لیا
کوئی اس کے گلے سے لپٹ گیا تو کوئی اس کے ہاتھ
~~~

ا دھر سے ایک اونٹ گذرا۔ ان لوگوں
ین دیکھا تھا۔ سب سوچنے لگے کہ آخر یہ
ہنے لیے اپنے دماغ پر زور ڈالا۔ بارہ
الا میں رہ کر انھوں نے سوائے کتاب چاٹنے کے
ا۔ کتاب کے بعد دنیا میں اور کیا ہے ؟
یں تھا۔ انھوں نے کتاب میں پڑھی ہوئی
لہ کیا کہ یہ اونٹ دھرم راج ہے۔ پھر
ھرم راج کے گلے میں اگر اپنے ہمسدو
یا جائے تو اس سے بھگوان خوش ہوگا۔
نے کھینچ کھانچ کر گدھے کو اونٹ کے

بے وقوف پنڈت تھوڑی دور آ گئے
ایک ندی ملی۔ ندی کے تیز بہاؤ
کیلے کا پتا تیرتا ہوا آ رہا تھا۔ پتے کو
پنڈت کو کتاب میں لکھا ہوا کوئی شعر
طلب تھا" دنیا کی بھیانک ندی میں ایک
ات دلائے گا۔" بس کیا تھا وہ پنڈت
لیٹ گیے۔ پتے پر لیٹتے ہی وہ ڈوبنے
ت جی بھی لگے ڈبکیاں کھانے۔ ان کا
پہنچ گیا۔ صرف سر کے اوپر کی چٹیا
تھی۔ اسے ڈوبتا دیکھ کر دوسرے
بھی ایک اور بات یاد آگئی۔ اس کا
[illegible]

اسے بچانے کی فکر کرنی چاہیے۔ بس کیا تھا انھوں نے ڈوبتے ہوئے آدمی کو چٹیا سے پکڑ کر اس کا سر کاٹ کر رکھ لیا۔ اب چار کی جگہ وہ تین ہی رہ گئے اور ایک گاؤں میں پہنچے جہاں اپنی بے وقوفی اور حماقت کی وجہ سے لوگوں نے ان کا خوب خوب مذاق اڑایا۔

~~~~~~~~~~

یہ کہانی سنانے کے بعد سونے والے دوست نے کہا کہ معاملہ فہمی کے بغیر عالم بھی نرے احمق رہتے ہیں۔ معاملات کو سمجھنا بہت بڑی بات ہوتی ہے۔ جس کے پاس جتنی زیادہ عقل ہوتی ہے اس کے دل میں شک اور شبہے بھی اتنے ہی زیادہ ہوتے ہیں۔ تم نے ہزار عقل اور لاکھ عقل مچھلی اور ایک عقل مینڈک کی کہانی سنی ہے یا نہیں "ایک عقل مینڈک کس طرح بچ نکلا تھا اور مچھلیاں ماری گیئں تھیں۔"

چکر والے نوجوان نے کہا۔ ذرا ہمیں بھی تو یہ کہانی سناؤ۔"

سونے والے دوست نے تب یہ کہانی سنائی۔

(یہ دلچسپ کہانی اگلے پرچے میں پڑھیے)

~~~~~~~~~~

کبھی حالات ان انسانوں کو ٹھیک کام کرنے پر مجبور نہیں کرتے جو حالات کے ناموافق ہونے کے زمانے میں ٹھیک کام نہیں کرتے۔ (سی کسنا من)

اصلی عقل مندی مضبوط ارادہ ہے۔

[illegible]

موتیوں کا سوداگر

یوسف نصرانی بڑی پھٹی پھٹی نظروں سے سوداگروں کو دیکھا کرتا تھا۔ یہ سوداگر بڑے بڑے بادبانی جہازوں سے اُتر کر اس کے چھوٹے سے خوبصورت وطن میں آتے رہتے تھے۔ ان سوداگروں کا لباس بہت ہی خوبصورت، قیمتی اور خوش رنگ ہوتا تھا۔ ان کے سروں پر قیمتی ٹوپی ہوتی تھی۔ بادشاہوں کے تاج جیسی۔ گلے میں ہیرے اور موتیوں کے جگمگاتے ہوئے ہار۔ وہ سوداگر راستوں سے گذرتے تو لوگ انھیں جھک جھک کر سلام کرتے۔

یوسف سمندر کے کنارے کھڑا کھڑا، اپنے پھٹے پرانے کپڑوں پر نظر ڈالتا اور اکثر سوچا کرتا۔

"کیا میں بھی کبھی ان سوداگروں کی طرح شان وشوکت سے زندگی گزار سکوں گا؟"

یہ خیال اس کے ذہن میں ہر روز اُبھرتا مگر اس کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ کسی سے پوچھے۔ آخر ایک دن اس نے ہمت کر کے اپنے ماہی گیر باپ سے پوچھ ہی لیا۔

"بابا، کیا میں سوداگر نہیں بن سکتا ــــــ؟"

اس کے بوڑھے باپ نے اس کے اس سوال پر بڑی حیرت آمیز نظروں سے اس کے چہرے کو دیکھا پھر مسکرا کر بولا۔

"بیٹا انسان کیا نہیں بن سکتا ــــــ؟ شرط بس ایک ہے وہ اپنا کام پوری لگن، محنت اور ایمان داری سے کرے۔"

"سچ بابا ــــــ؟" یوسف نصرانی اپنے باپ کے اس جواب پر خوشی سے اچھل پڑا۔

"ہاں بیٹا" بوڑھے باپ نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

یوسف کے ذہن میں اس کے ماہی گیر باپ کی اس بات نے امید اور حوصلے کی ایک مشعل سی جلا دی۔ اب وہ سوچ رہا تھا کہ اسے کیا کرنا چاہیئے۔؟

وہ کئی دن تک سمندر کے کنارے کھڑا یہ بات سوچتا رہا۔

اس کا وطن ایک چھوٹا سا جزیرہ تھا۔ یہ دنیا بھر میں "موتیوں کا جزیرہ" کہلاتا تھا۔ جزیرے کے کنارے بڑے بڑے عظیم الشان بادبانی جہاز آکر لنگر ڈالتے تھے۔ جزیرے کے چاروں طرف کنارے کنارے درجنوں طاقتور نوجوان غوطہ خور سمندر کی اتھاہ گہرائیوں سے اپنے دونوں ہاتھوں میں موتیوں بھرے سیپ لے کر آتے تھے۔ اسے یہ کام بہت اچھا لگا۔ اس نے دل میں ٹھان لیا کہ وہ ایک غوطہ خور بنے گا ــــــ

یوسف کے دل میں سچی لگن تھی اس لیے وہ چند ہی سالوں میں ایک ماہر غوطہ خور بن گیا۔ سمندر کی طوفانی لہروں میں وہ کود جاتا۔ تہہ تک پہنچ کر اپنے دونوں ہاتھوں میں سیپیاں بھر لیتا اور پھر ساحل پر واپس آجاتا۔ دھیرے دھیرے اس کے پاس دولت جمع ہو رہی تھی۔ اپنے بوڑھے ماہی گیر

شورے کرتا رہتا تھا اور اس کا بوڑھا باپ اسے
تلے اور تجربے سے بھرے مشورے دیا کرتا تھا۔
نف نے اب اپنی چھوٹی سی پرانی جھونپڑی کی جگہ
بصورت مکان بھی بنوالیا تھا۔ اس کے بدن پر
پھٹے پرانے کپڑے بھی نہیں رہتے تھے۔ وہ دن
ہا تھا۔ سخت سے سخت محنت سے بھی وہ کبھی

مرے غوطے خور اس سے زیادہ ماہر اور تجربے کار
طوں کے بعد ہمت ہار جاتے تھے لیکن یوسف
سے زیادہ غوطے مارنے کی کوشش کرتا تھا۔
زیادہ دولت جمع ہو سکے۔ جن سوداگروں کے
مدر کی گہرائیوں سے موتی نکالتا تھا وہ یوسف
تھے۔ اس کی محنت اور لگن دیکھ کر وہ اُسے
خوروں سے زیادہ معاوضہ دیا کرتے تھے۔
ہی دیکھتے دیکھتے کئی سال بیت گئے۔ یوسف
خوب رو اور قوی نوجوان بن چکا تھا۔ اس کے
دولت تھی۔ اسے بڑے بڑے سوداگروں کا قرب
تیوں کی سوداگری اور پانی کے جہازوں کے
بہت کچھ جان کاری ہو گئی تھی۔ سوداگروں کی
روبار کے سارے داؤ پیچ سکھا دیے تھے۔
رہا تھا کہ یہ غوطے خوری کا پیشہ چھوڑ کر موتیوں
کر دے۔ مگر ابھی اس کے پاس روپیوں کی
نے سوچ بچار کے بعد ایک دوسرے سوداگر
تیوں کی تجارت شروع کر دی۔

چند ہی سالوں میں محنت سوجھ بوجھ اور ایمانداری
کی بدولت اس کی تجارت کہیں سے کہیں پہنچ گئی اور دیکھتے دیکھتے
وہ جزیرے کا سب سے بڑا "موتیوں کا سوداگر" بن گیا۔
اب یوسف نصرانی کا نام بڑے بڑے ملکوں میں مشہور ہو گیا
تھا۔ اس کی بے اندازہ دولت کے جگہ جگہ چرچے تھے۔ اور
اس کی محنت، لگن اور ایمان داری لوگوں کے لیے مثال بن
گئی تھی۔

بقیہ صفحہ ۳۴ کا

کاگ داس کی پیٹھ پر رکھا۔ کاگ داس جل بھن کر راکھ ہو گیا۔
اور چڑیا کے بچے بچ گئے۔ چھوٹی بوا نے کہانی ختم کرتے
ہوئے کہا "ارے سیما سو گئی"۔

"اچھا ہوا مر گیا کمبخت" سلمیٰ نے منہ بناتے ہوئے
کہا "دیکھو تو کہتا تھا۔ کھاؤں چڑیا کے چونگلے مٹکائیں کلا"

"اچھا ہوا۔ بہت اچھا ہوا" سب بچے مل کر بولے۔
اتنے میں ہی امی نے آواز دی "بوا ختم ہو گئی کہانی"۔
"ہاں دلہن" چھوٹی بوا نے سیما کو پلنگ پر لٹاتے
ہوئے کہا۔ اور سب بچے لحافوں میں دبک گئے۔



کتابیں

جناب کیف احمد صدیقی



ہوں ادبی رسالے کہ درسی کتابیں
مجھے سب سے پیاری ہیں اپنی کتابیں

نہیں ان سے بہتر کوئی اور ہم دم
انہیں میں ہے تاریخ تہذیب عالم
انہیں سے سنورتی ہے تقدیر آدم
مجھے سب سے پیاری ہیں اپنی کتابیں

انہیں میں ہے علم و ادب کا خزینہ
ورق در ورق زندگی کا قرینہ
یہی تو ہیں اپنی ترقی کا زینہ
مجھے سب سے پیاری ہیں اپنی کتابیں

انہیں سے مٹی آدمی کی جہالت
ہوئی ذہنِ انسان کی اتنی رفعت
بڑھی چاند تک نسلِ آدم کی عظمت
مجھے سب سے پیاری ہیں اپنی کتابیں

انہیں پڑھ کے انسان بنتا ہے قابل
انہیں سے ہے ملتی مرادوں کی منزل
یہی تو ہیں سارے زمانے کا حاصل
مجھے سب سے پیاری ہیں اپنی کتابیں

یہی تو ہیں علمی بہاروں کا مسکن
انہیں سے کھلے آرزوؤں کے گلشن
انہیں سے بھرا ہر تمنا کا دامن
مجھے سب سے پیاری ہیں اپنی کتابیں

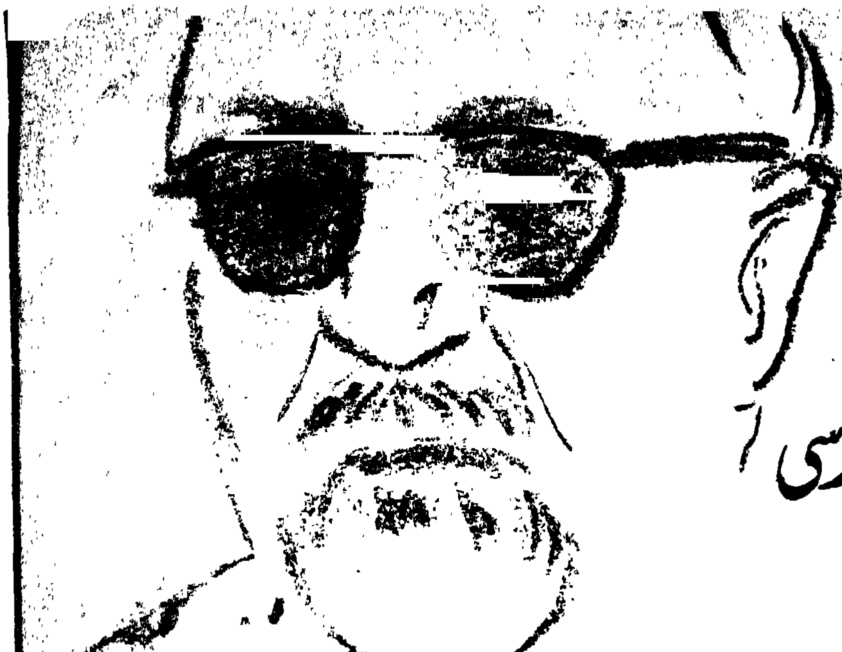
انہیں سے ہوا علم کا بول بالا
انہیں سے ہے سارے جہاں میں اجالا
انہیں سے ہوا منہ جہالت کا کالا
مجھے سب سے پیاری ہیں اپنی کتابیں

بہت ہی ادب سے میں پڑھتا ہوں ان کو
بڑے غور سے میں سمجھتا ہوں ان کو
نہایت سلیقے سے رکھتا ہوں ان کو
مجھے سب سے پیاری ہیں اپنی کتابیں

ہوئے جو بھی علمی کتابوں کے طالب
بنے شیکسپیئر، میر و ٹیگور و غالب
ہیں سمجھے وہی زندگی کے مطالب
مجھے سب سے پیاری ہیں اپنی کتابیں

ہوں ادبی رسالے کہ درسی کتابیں
مجھے سب سے پیاری ہیں اپنی کتابیں

عليم عظمی



...ماحبؒ کی پہلی برسی

...ری مئی کو ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کے انتقال کو ...حکومت اور جامعہ نے ان کی پہلی برسی کو بڑے

.

...مئی کی صبح کے وقت ہندوستان کے نائب صدر ...روپ پاٹھک نے ان کی قبر پر پھول چڑھائے ...سمندری فوج کے ڈیڑھ سو جوانوں نے سلامی ...بعد اپنی بندوقیں الٹ کر اور سر جھکا کر اس ...ے رہے، جب تک دوسری کاروائیاں ختم

...ہا کے بعد ۱۲ جوانوں نے ماتمی بگل بجائے۔ ...منٹ تک خاموشی رہی، ہر شخص بالکل خاموش کھڑا تھا۔ دو منٹ کی خاموشی کے بعد پھر ...یا۔

...موقع پر دلی کے سبھی بڑے بڑے لوگ موجود ...مسز اندرا گاندھی، دوسرے وزیر، دوسرے ...

کے خاندان کے لوگ، جامعہ کے لوگ، ذاکر صاحب کی بیگم صاحبہ۔

یہ تو شاید آپ جانتے ہی ہوں گے کہ بیگم صاحبہ نئی دہلی میں رہتی ہیں۔ حکومت نے ان کے لیے مکان وغیرہ کا انتظام کیا ہے۔ ان کی بڑی صاحبزادی سعیدہ بھی ان کے ساتھ ہی رہتی ہیں، اور ان کے (سعیدہ کے) میاں خورشید عالم صاحب بھی۔ دوسری صاحبزادی صفیہ علی گڑھ میں رہتی ہیں وہ بھی آئی تھیں۔

ذاکر صاحب کے مکان پر، جو جامعہ میں ہے جسے ذاکر صاحب نے اپنے رہنے کے لیے بنوایا تھا، عورتوں کے لیے قرآن خوانی کا انتظام تھا۔ اور مردوں کے لیے محمد علی ہال میں۔ وزیر اعظم اندرا گاندھی تھوڑی دیر کے لیے ذاکر صاحب کے مکان پر بھی آئیں اور بیگم صاحبہ سے ملاقات کی۔

۴ رمئی کی شام کو جامعہ میں ایک جلسہ ہوا، اس کی صدارت ذاکر صاحب کے ایک ساتھی ڈاکٹر سید عابد صاحب ...

پہلے وزیر تعلیم ڈاکٹر راؤ نے ذاکر صاحب کی بڑائی اور ان کی خوبیاں بیان کرنے کے بعد بتایا کہ حکومت ذاکر صاحب کی یادگار قائم کرنے کے لیے بہت سے کام کرنا چاہتی ہے۔ انھوں نے جو بہت سے کام گنائے وہ زیادہ تر بڑوں کے لیے ہیں۔ مگر انھوں نے ایک کام ایسا بھی بتایا جو بچّوں کے لیے ہے۔ یعنی "نیشنل بک ٹرسٹ" بچّوں کے لیے کچھ کہانیاں بھی شائع کرے گا۔ پہلی برسی کے موقع پر ذاکر صاحب کی آخری کتاب "کچھوا اور خرگوش" بھی شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کا نام تو کچھوا اور خرگوش ہے، مگر ہے بڑوں کے لیے۔

جامعہ کے اس جلسے میں ذاکر صاحب کے چھوٹے بھائی ڈاکٹر محمد یوسف صاحب نے بھی تقریر کی۔ اور دلّی کے ایک مشہور بزرگ پنڈت ہردے ناتھ کنسرو صاحب نے بھی تقریر کی، آخر میں جلسے کے صدر ذاکر صاحب کے ساتھی، ڈاکٹر عابد صاحب نے کی۔ جامعہ کے وائس چانسلر اور ذاکر صاحب کے گہرے دوست اور ساتھی پروفیسر محمد مجیب آج کل امریکہ میں ہیں۔ ان کی کمی ہر ایک نے محسوس کی۔

ان بڑے بڑے لوگوں کے ساتھ ایک چھوٹے طالب علم نے بھی تقریر کی۔ مدرسہ ثانوی جامعہ کے آٹھویں جماعت کے ایک طالب علم خورشید لطیف نے ایک مضمون پڑھا۔ جس کا عنوان ہے "بچّوں کے ذاکر صاحب" خورشید میاں نے اپنے مضمون میں بتایا کہ ذاکر صاحب نے اپنی عمر کا بڑا اور بہترین حصہ بچّوں کی خدمت میں صرف کیا۔ انھوں نے بچّوں کے لیے اچھی اچھی [illegible]

چھپوائیں۔ ان کے لیے ایک بہت اچھا رسالہ "پیام تعلیم" اس وقت جاری کیا جب ملک میں اردو میں بچّوں کے لیے کوئی اچھا پرچہ نہیں تھا۔ اسی طرح سب سے پہلے ذاکر صاحب نے بچّوں کی تعلیم و تربیت کے لیے ایک بہت ہی اونچا اور خوبصورت مدرسہ قائم کیا۔ ویسے تو ملک میں بچّوں کے لیے بہت سے اسکول تھے مگر وہ سب کے سب مالدار گھرانوں کے بچّوں کے لیے انگریزی کے مدرسے تھے۔ اردو میں جامعہ کا مدرسہ ابتدائی پہلا اسکول تھا جس میں غریب گھرانے کے بچّے پڑھ سکتے تھے اور جو اپنی صفائی ستھرائی اور تعلیمی معیار کے لحاظ سے انگریزی مدرسوں سے کم نہیں تھا۔

"یہ پہلا مدرسہ ہے جس کی بنیاد جامعہ ہی کے ایک چھوٹے بچّے نے رکھی تھی" خورشید لطیف نے اپنے مختصر مضمون میں یہ بھی بتایا کہ ذاکر صاحب کو بچّوں سے بڑی محبّت تھی، بڑا پیار تھا۔ اور صرف جامعہ میں رہ کر ہی نہیں بعد میں بھی جب وہ بڑے عہدوں پر تھے تب بھی انھوں نے بچّوں کے لیے بہت سے کام کیے ہیں۔

چار چیزیں بڑی مشکل سے ملتی ہیں۔
۱۔ تندرستی ۲۔ راستی ۳۔ خوشی ۴۔ مخلص دوست
(احمد اللہ متھونی)

دنیا میں اس کے لیے کوئی بات ناممکن نہیں کوشش کرے۔ (سکندر اعظم)

...کی
...شیں



...کوٹ

۔۔۔دن اتنا برسا پانی
...بلی مٹی ، بھیگی نانی
... مجھ کو برساتی لادو
...دیکھوں ہے کتنا پانی
...سا ایک دن ایسا منظر
... رین کوٹ بھیگا پانی
... جادو بیں نے پھونکا
...کی خالہ ، ہوگئی نانی
۔۔۔دن اتنا برسا پانی
...مٹی ، بھیگی نانی

ایم. وائی انصاری مالیگاؤں

...دفعہ ایک کسان بوجھوں سے لدی ہوئی ... جا رہا تھا۔ اتفاقاً راستہ میں ایک جگہ ... دلدل پھنس گئی۔ بے چارے نے بہت ... اس کی گاڑی ایک انچ بھی آگے نہ ... آخر تھک کر بیٹھ گیا اور اپنی مصیبت پر ... لگا۔ اسی دوران میں شام ہوگئی۔ یہ جگہ ... سنسان علاقہ تھا۔ شام کی بڑھتی

ہوئی تاریکی نے کسان کی پریشانی میں اور بھی اضافہ کر دیا۔

خدا کی قدرت، اسی ضلع کے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ جو صبح دیہاتی علاقوں کے دورہ پر گئے تھے۔ وہ شام کو اپنے صدر مقام (شہر) کو واپس جا رہے تھے انھوں نے دیکھا کہ سڑک کے نچلے حصّہ کی دلدل میں کسان کی گاڑی پھنسی ہوئی ہے۔ اور وہ پریشانی کے عالم میں ہے۔ وہ فوراً اپنی موٹر سے باہر آئے اور کسان کو دلاسا دیا کہ تم گاڑی ہانکو میں پیچھے سے زور لگاؤں گا۔ کچھ ہی دیر کی محنت کے بعد گاڑی دلدل سے پار ہوگئی۔ کسان بہت خوش ہوا۔

کسان کو بہت تعجب ہوا کہ موٹر والے بابو نے کس طرح اس کی مدد کی۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کے چپراسی کو دیکھ کر اسے یقین ہوا کہ یہ کوئی بڑا افسر ہے۔

گاڑی دلدل سے باہر نکالنے میں ضلع افسر کے کپڑے بالکل خراب ہوگئے تھے لیکن ان کے چہرے پر ذرا بھی رنج و ملال نہ تھا۔ وہ کسان کی مدد کر کے بہت خوش ہوئے تھے۔

کسان ضلع افسر سے معافی مانگنے لگا۔ اور ...

ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کی مصیبت میں کام آئے۔ میں نے صرف اپنا فرض ادا کیا ہے اور تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔"

بالکل اندھیرا ہو چلا تھا اس لیے کسان خوشی خوشی اپنے گھر کی طرف روانہ ہو گیا اور افسر صاحب شہر کی طرف۔

منی باجی

بدحواسیاں

ابا جان کو خط لکھا کہ میری طبیعت خراب ہے ڈاکٹر کا بل ادا کرنا ہے ۱۵ روپے منی آرڈر سے روانہ فرمائیں۔ دوسرا خط اپنے دوست کو لکھا کہ میں نے پیسوں کا انتظام کر لیا ہے۔ ابا جان سے بیماری کے بہانے ۱۵ روپے کا منی آرڈر منگوایا ہے۔ اب ہم بمبئی کی سیر کو چلیں گے۔

مگر ہوا یہ کہ ابا جان کے خط پر دوست کا پتہ اور دوست کے خط پر ابا جان کا پتہ لکھ دیا۔ ابا جان کا خط آیا کہ بیٹا طبیعت خراب ہے تو نینی تال چلے جاؤ، بمبئی میں طبیعت اور زیادہ خراب ہو جائے گی اور ۱۵ روپے منی آرڈر نے بھیج دیے میں بہت شرمندہ ہوا۔

• رات گئے ہمارے یہاں کچھ مہمان آگئے۔ سب لوگ کھانا کھا چکے تھے۔ امی نے کہا منڈی سے دوڑ کر سبزی لے آؤ اور ڈیری سے دودھ بھی لیتے آنا۔ میں نے سبزی خریدی اور دودھ کا گلاس آگے بڑھا دیا۔ سبزی فروش نے کہا یہ کیا؟ "میں نے کہا" اسی جھولے میں سبزی ڈال دو" اس نے کہا "کیسا جھولا؟" جو میں نے نظر دوڑائی تو کھسیا کر رہ گیا۔ وہ تو میں گلاس دے رہا تھا۔ سبزی فروش بھی ہنسنے لگا۔

• شبرات کا حلوا امی جان نے میرے ہاتھوں خالہ جان کے گھر بھجوایا اور کہا برتن ساتھ لیتے آنا۔ یہ خالہ جان کے گھر پہنچا اور کہا یہ برتن رکھ لیجیے اور حلوہ واپس کر دیجیے۔" خالہ جان نے مسکرا کر کہا "پھر تم حلوہ کس لیے لائے تھے؟" میں نے کہا معاف کیجیے حلوہ نہیں برتن واپس کیجیے۔

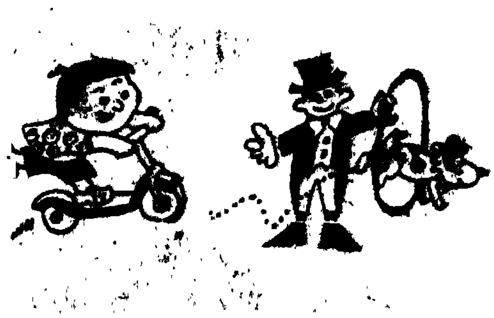
(اقبال احمد کاسودہ جلگاؤں)

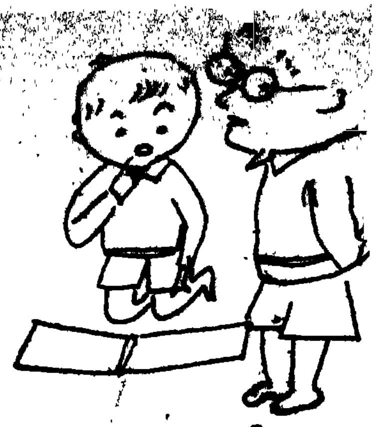
ملکوں کے نام بتائیے

۱. نقشہ میں دیکھو فرانستان کوئی جگہ نہیں ہے۔
۲. حامد تمہارا پیر سرک رہا ہے۔
۳. گاجر تنا کھا رہا ہے۔
۴. سریش نے کہا اس کو کاٹو کیول بیچ ہے۔
۵. مریض کو روکنا ڈاکٹر کے بس کی بات ہے۔
۶. امر کا مطلب ہے ہمیشہ جینے والا۔
۷. آپا کس تانگے میں آرہی ہیں۔

جواب: ۱. فرانس ۲. پیرس ۳. جرمن ۴. ٹوکیو ۵. کناڈا ۶. جنیوا ۷. پاکستان۔

(سید ذوالفقار احمد اودےپور





اِدھر اُدھر سے

…سو سالہ جشن کے سلسلہ میں ٹکٹوں کی نمائش

…الہ جشن لینن کے سلسلے میں ڈاک کے ٹکٹوں
…ی نمائش کا انتظام کیا گیا ہے۔ یہ نمائش
…فوج کے مرکزی ایوان کے بالوں میں منعقد
…یت راجا۔ ھانی کی ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے
…ں نے اپنے جمع کئے ہوئے ٹکٹوں کا ذخیرہ
…ھا ہے نمائش میں ۱۶۳ اسٹینڈ ہیں۔
… کے تختے رکھے گئے ہیں۔ ان تختوں پر
…ے اور ان چہروں کے نشان چسپاں ہیں۔
…ں پر لگائی جاتی ہیں۔ صرف سوویت
…ئد انقلاب کی زندگی اور سرگرمیوں سے
…ئی سو ڈاک ٹکٹ جاری کئے گئے ہیں۔
…ے کے وہ ٹکٹ بھی نمائش میں رکھے گئے
…یٹے، ہنگری، چیکوسلوواکیہ، مشرقی جرمنی
…ا میں جاری کئے گئے ہیں۔

ننھی منی کتابیں

جس کسی کے گھر میں کتابوں کی الماریوں کے لیے جگہ نہ ہو، اسے ننھی منی کتابیں خریدنی چاہئیں۔ اس طرح وہ سارا کتب خانہ اپنی جھولی میں بھر سکتا ہے۔ یورپ کی سب سے ننھی منی کتابیں مغربی جرمنی کے شہر ماینس کے گوٹن برگ میوزیم نے شائع کی ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی ۵۶ء۵ سینٹی میٹر سے زیادہ بڑی نہیں۔ ان کتابوں کو آدمی صرف خوردبین کی مدد سے پڑھ سکتا ہے۔ اکثر یہ ننھی منی کتابیں پلیکسی گلاس کی ڈبیا میں بند ملتی ہیں جن کا ڈھکنا خوردبین کے شیشے کی مانند حروف کو بڑا کر کے دکھاتا ہے۔ بعض دوسرے ملکوں میں بھی ننھی منی کتابیں چھپی ہیں چیکوسلواکیہ میں ۵ ۲۶ × ۳۶۵ سینٹی میٹر سائز کے دو ہزار صفحوں پر قرآن مجید چھاپا گیا ہے۔

(اطلاعات جرمنی)

۱۵ویں صدی کے سکّے

دیا چیسلاف لیوردوسکی جو سلونم ضلع کے (سوویت) سوشلسٹ جمہوریہ بیلوروس) ثانوی اسکول کا طالب علم ہے ترکاریوں کے باغ میں کام کر رہا تھا اسے ایک زنگ آلود برتن ملا۔ یہ زمین کے بالائی حصّہ میں دفن تھا۔ لڑکے نے اس پر سے مٹی جھاڑی اور اُسے کھولا۔ اس برتن میں چاندی کے ۱۵۷ سکّے ملے جن کا وزن کُل ملا کر تقریباً ۳ کلوگرام تھا۔ یہ سکّے ٹکسال میں پندرھویں سترھویں

وفاقی جمہوریہ جرمنی میں مسلمانوں کی عبادت گاہیں

وفاقی جمہوریہ جرمنی میں اس وقت سات مسجدیں ہیں۔ پہلی مسجد لگ بھگ دو سو سال ہوئے ہائیڈل برگ کے نزدیک شوئٹ زنگن میں بنی تھی۔ مسلمان اس میں جمعہ کی اور دونوں عیدوں کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں برلن کی جامع مسجد بنی۔ (اس کی تصویر ٹائٹل کے دوسرے صفحے پر دیکھیے)

دوسری بڑی لڑائی کے بعد ہمبورگ میں دو مسجدیں بنیں۔ ایک مسجد فرانک فورٹ میں بنی۔ پھر آخن میں ٹکنکل کالج کے طالب علموں نے بنوائی۔ سب سے نئی اور غالباً سب سے خوب صورت مسجد آج کل میونخ میں بن رہی ہے۔ اس کی بنیاد ۱۹۶۷ء میں رکھی گئی تھی۔

(اطلاعات جرمنی)

ہر موسم میں پیراکی کے قابل تالاب

وفاقی جمہوریہ جرمنی کے ایک چھوٹے سے قصبے "وانفے" میں ابھی چند دن ہوئے یہ عجیب و غریب تالاب بن کر تیار ہوا ہے۔ اور اس بستی کے تیراک ہر موسم میں اس تالاب میں نہاکر اور تیر کر لطف حاصل کریں گے۔ اس تالاب پر ساٹھ میٹر لمبی اور اور آٹھ میٹر اونچی پلاسٹک کی چھت ہے۔ یہ ہلکی پھلکی، صاف شفاف چھت اس تالاب کو موسمی اثر سے محفوظ ہے۔ ہوا کا دباؤ اس غبارہ نما چھت کو متوازن ہے۔ اور خود کار آلے اس کے اندر کی گرمی ا حرارت کو تیرنے والوں کے لیے اعتدال پر رکھتے آپ کو یہ پڑھ کر تعجب ہوگا کہ یہ بظاہر ہلکی چھت ساڑھے سات ہزار ٹن وزنی ہے۔ ۷۲ میں پیراکی کے بین الاقوامی مقابلے یہیں ہوں (تصویر سامنے والے صفحے پر دیکھیے)

(اطلاعات جرمنی)

دو برّاعظموں کو ملانے والا پل

ایشیا اور یورپ دو برّاعظموں کو ملانے یہ پل بننا شروع ہو گیا ہے۔ یہ ترکی میں خل قسطنطنیہ یا باسفورس پر بن رہا ہے۔ یہ پل یور سب سے لمبا ہوگا۔ اور دنیا کے لمبے پلوں میں نمبر چوتھا ہوگا۔ یہ پل اور اس کے دو دریہ ۶۴ میٹر اونچے ہوں گے تاکہ بڑے سے بڑ جہاز بھی سہولت کے ساتھ اس کے نیچے سے گز جائیں۔ یہ پل ۱۹۷۳ء تک بن جائے گا۔ او ہے کہ ۲۲ ہزار کاریں روزانہ اس پر سے گزرا (تصویر سامنے دیکھیے۔)

(اطلاعات

پرنٹر پبلشر سید احمد ولی نے جمال پریس میں مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی د سے شائع کیا۔

ان کتابوں کو اپنی لائبریری کی زینت بنائیے

[illegible] دادا	1/75	دلی	1/50
سمندر کے نیچے	2/-	ہماری پارلیمنٹ	1/50
سمندر کے کنارے	1/12	برف کا گھر	0/80
ہمارا جسم	1/25	برف کے تیرتے پہاڑ	0/37
[illegible] کی سیر	1/-	آستین کا سانپ	0/50
[illegible] کی بکری	2/50	الٹی دعا	0/50
[illegible]	1/12	بادشاہ کے کپڑے	[illegible]
[illegible] آدمی	1/30	زمین کی گردش	[illegible]
[illegible] کی سیر	1/25	سونے کی چڑیا	1/-
[illegible] کا سپنا	1/75	چمپاوت کا آدم خور شیر	0/35
[illegible]	2/-	ایک ٹانگ کا بادشاہ	0/30
[illegible] کی کہانی	1/25	[illegible] کی ملاقات	0/35
[illegible] کی کہانی	0/56	[illegible]	1/-
پھولوں کی کہانی	1/75	[illegible]	0/35
دادا نہرو	1/50	ننھا کسان	0/35

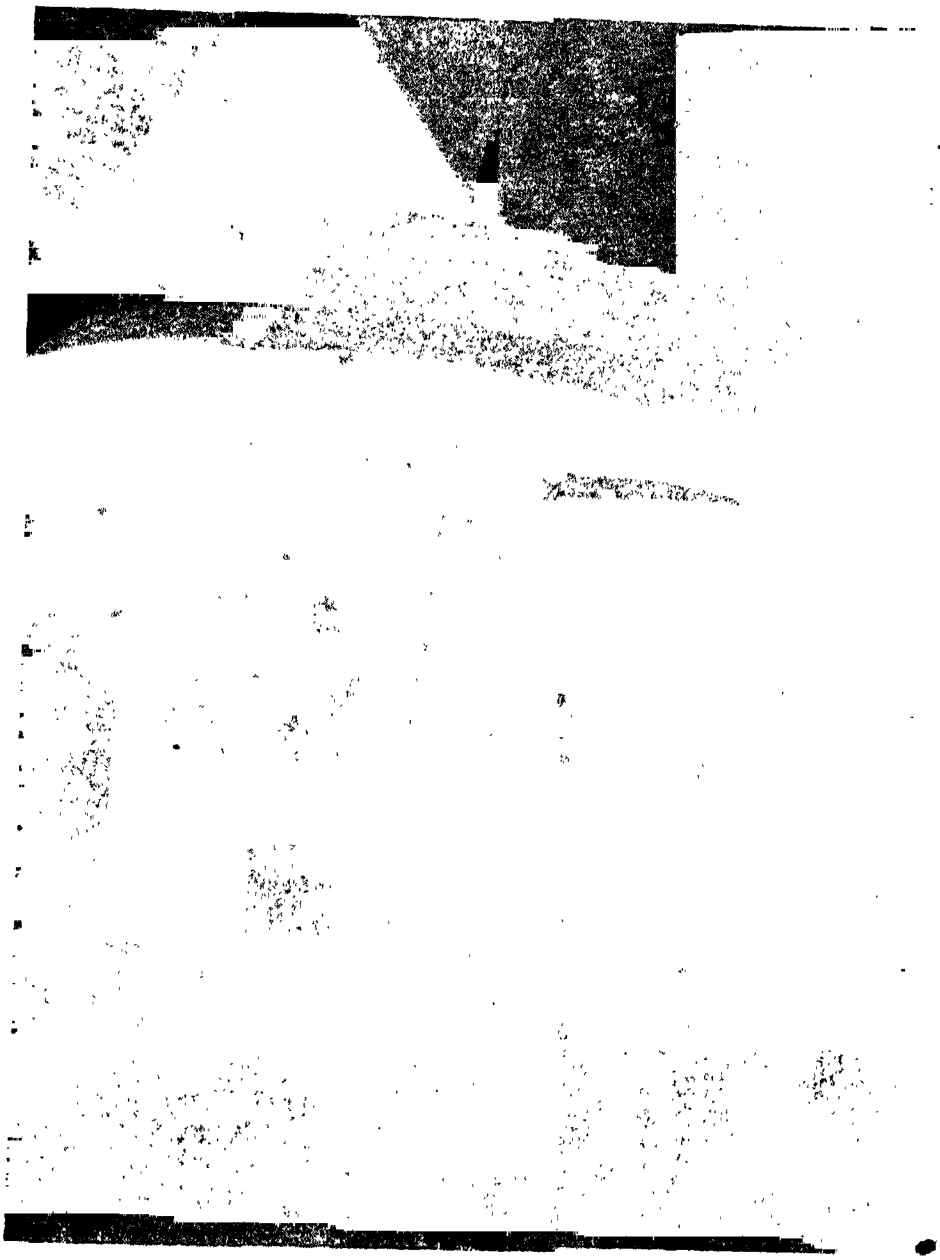
ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ بمبئی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار دہلی ۶

[illegible]



(مدھیہ پردیش، جموں کشمیر و ہریانہ کے تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ)

پیامِ تعلیم

نئی دہلی

جولائی ۱۹۷۶ء شمارہ ۷

ایڈیٹر
محمد حسین حسّان ندوی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار، جامع مسجد دہلی ۶
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

پرچہ ۶۰ پیسے زرسالانہ ۶ روپے

ناشر سید احمد ذکی نے جمال پریس دہلی میں چھپوا کر

فہرست

بچّوں کے لئے معلوماتی کتابیں

ڈاکو کی بیٹی — عابد زاہدی

ایک نہایت دل چسپ اور پُر مقصد کہانی جو بچّوں کی نفسیات کو مدِّ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے جس سے بچّوں کو اتحاد و اتفاق کا سبق ملتا ہے۔ دوستی، باہمی محبت، فرقہ پرستی کے خلاف جد و جہد، وطن کے لئے ایثار و قربانی اور ملک کی ترقی و تعمیر کے لئے اعلیٰ اخلاق اور تعلیم و تربیت اور مل جل کر آگے بڑھنے کی روشنی ملتی ہے۔ خوبصورت ٹائٹل اچھی کتاب۔ قیمت ۴۰ پیسے

نجومی آپا — اطہر پرویز

زہرہ آپا علی گڑھ سے ایم۔ایس۔سی کا امتحان دے کر کیا آئیں کہ لگیں اپنی قابلیت کا رعب جمانے۔ انجم کو شرارت جو سوجھی تو اس نے زہرہ آپا کا نام نجومی آپا رکھ دیا۔ لیکن ایک دن جب گھر کے سارے بچّے اکٹھا تھے۔ نجومی آپا نے ایسی ایسی باتیں بتائیں، ایسی باتیں بتائیں کہ سب کے سب دنگ رہ گئے۔ نجومی آپا تو سچ مچ کی نجومی نکلیں۔ تم بھی پڑھو اور مزے لو۔

قیمت: ۷۵ پیسے

ہمارا ذہن — از وریجا اڈوریا — ترجمہ: اطہر پرویز

بات تو کچھ بھی نہیں ہوتی، لیکن امّی جان مار بیٹھتی ہیں، ابّا جان ڈانٹ پلاتے ہیں۔ بھائی بہن کوئی جھگڑا کھڑا کر دیتے ہیں اور دوست احباب ہاتھا پائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کیوں؟ وجہ اس کتاب میں پڑھو۔ اس کتاب کے پڑھنے سے تم نہ صرف اپنی نفسیات سے واقف ہو جاؤ گے، بلکہ کون کیا چاہتا ہے، یہ بھی تم کو معلوم ہو جائے گا۔ پھر نہ تو امّی جان کی مار کا خطرہ رہے گا اور نہ ابّا جان کی ڈانٹ کا۔ اور نہ ہی بھائی بہن اور دوستوں کے جھگڑے کا۔

قیمت: ایک روپیہ

انمول رتن — اطہر پرویز

فرخ سیر بادشاہ کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ ایک بار جب وہ کشمیر کی سیر کو گیا تو وہاں اس کی نظر فارسی اور سنسکرت کے ایک بہت بڑے عالم پر پڑی۔ یہ تھے پنڈت راج کول۔ فرخ سیر پنڈت راج کول کو ہندوستان کے دل "دلّی" میں لے آیا۔ اور ایک عالی شان کوٹھی نہر کے قریب رہنے کو دی۔ دلّی والوں نے پنڈت جی کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور پیار سے نہرو کہنے لگے۔ ہمارے چاچا نہرو، اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ چاچا نہرو "انمول رتن" کیسے بنے؟ وہ تمھیں اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوگا۔

قیمت: ۱/۵۰

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳

بچوں سے باتیں

ملے پرچے میں ہم نے سید امتیاز علی تاج
ذکر کیا تھا۔ پچھلے دنوں اردو کے ایک
ت شکیل بدایونی اللہ کو پیارے ہوئے۔
کے شاعر تھے۔ بہت دنوں سے بمبئی میں
ی فلم بنانے والے اداروں سے تعلق تھا۔
و گیت لکھتے تھے۔ یہ گیت بہت مقبول
صاحب کے وطن میں ان کے گھر سے
سڑک کا نام ان کی یاد میں 'شکیل روڈ'
دیا گیا تھا۔

ز ابھی چند دنوں کی بات ہے لکھنؤ کے
حضرت بشیشور پرشاد منور لکھنوی نے
ں انتقال کیا۔ شاعری انھیں وراثت میں
کے والد حضرت آفق لکھنوی بھی اردو
ے شاعر تھے۔ حضرت منور لکھنوی نے
ل حاصل کیا اور سنسکرت وغیرہ دوسری
تابوں کا اردو نظم میں بہت کامیابی سے
مرحوم سے مکتبہ جامعہ کا ایک اور تعلق بھی
جامعہ کا لبرٹی آرٹ پریس انھی کے مکان
ی منزلہ، م، ہے۔

انگلستان میں مشہور فلسفی برٹرانڈ رسل کے
بعد دنیا کے مشہور ناول نگار ای ام فوسٹر نے انتقال
کیا۔ یہ دونوں ہندوستان کے ہمدردوں میں سے تھے۔
فوسٹر صاحب تو ہندوستان بھی آئے تھے۔ یہاں
کے پڑھے لکھے طبقے سے ان کے بہت اچھے تعلقات
تھے۔ انھوں نے اپنی ایک کتاب کا انتساب سر سید کے
پوتے سر راس مسعود کے نام پر کیا تھا۔ انھی تعلقات
کی بنا پر انھیں اردو زبان سے دلچسپی ہو گئی تھی۔
اور انھوں نے انجمن ترقی کو اچھی خاصی رقم مرحمت فرمائی تھی۔

پچھلے مہینے (جون میں) اسکولوں کے بورڈ کے
امتحانوں کے نتیجے اخباروں میں شائع ہو گئے ہیں۔
کامیاب ہونے والوں میں ہمارے بہت سے پیامی
بھی ہوں گے۔ اس وقت مہاراشٹر ایس ایس سی کا
نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ بہت لمبی چوڑی فہرست ہے
مختصراً۔ اردو میں سب سے زیادہ نمبر اسماعیل بیگ
محمد ہائی اسکول بمبئی کے طالب علم عبدالغفار شجاع الدین
کے آئے ہیں۔ (انعام سو روپیہ) دوسرا نمبر شیخ عبدالرشید
(بنگلو اردو ہائی اسکول ضلع پیٹھ جلگاؤں) کا ہے۔
(انعام پچاس روپیہ) اردو اختیاری مضمون میں محمد

مشیر احمد (انجمن اسلام پنچ گنی ہائی اسکول) کے نمبر سب سے زیادہ آئے ہیں (سو روپیہ انعام)

عربی میں سب سے زیادہ نمبر معین الدین نظام الدین (اردو نیشنل ہائی اسکول کلیان) کو ملے ہیں۔ (انعام سو روپے) فارسی میں پہلا نمبر انصاری رضیہ بانو عثمان غنی (سو روپے انعام) اور دوسرا نمبر عبداللطیف بقر عیدی کا ہے (۵۰ روپے انعام) یہ دونوں جلگاؤں کے ہیں۔

اس کے علاوہ فارسی میں جعفر قاسم موسیٰ گولڈ میڈل انصاری رضیہ بانو عثمان غنی کو ملا ہے۔ جیرلز بھائی پیر بھائی اسکالرشپ، کھانی فرید عبدالکریم (سینٹ جوزف ہائی اسکول عمر کھاڑی) کو ملا ہے۔ امام خوجہ ٹیسٹی مونیل اسکالرشپ، اس اسکول کے طالب علم سونا والا عزیز بدر الدین کو ملا ہے۔ اے وائی عبدالحسین سنگاپور والا اردو اسکالرشپ عبدالغفار شجاع الدین کو ملا ہے۔ فارسی کا سر فرینک ساوڈرا اسکالرشپ اکانی سلیم نور علی کو ملا ہے۔ فارسی کا ایلس پرائز انصاری رضیہ بانو عثمان غنی کو ملا ہے۔ ہم ان سب انعام پانے والوں کو دلی مبارک باد دیتے ہیں۔

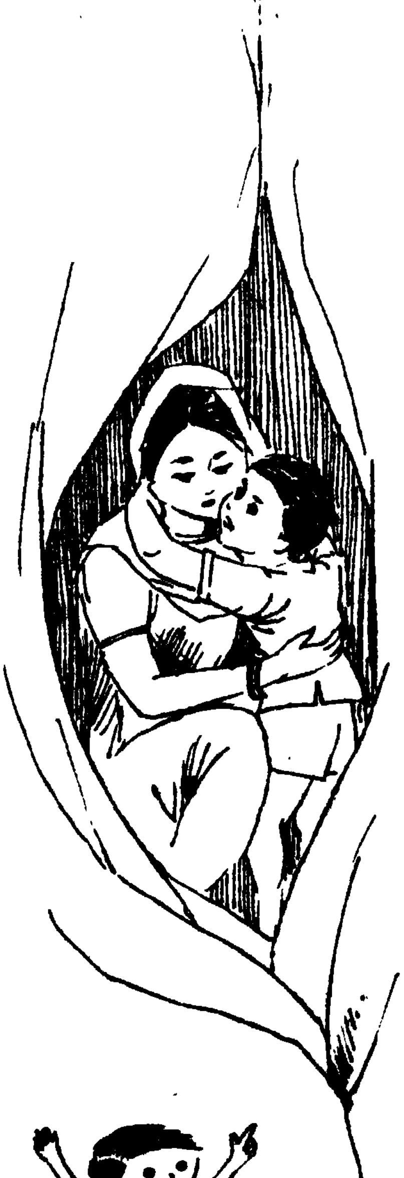
"زمرد ہفت رنگ" والی کہانی بچوں نے بہت پسند کی۔ جیسی ہمیں امید تھی۔ اس کی دوسری اور آخری قسط اس پرچے میں پڑھیے۔ سلمیٰ جاوید کی کہانی سمجھ اپنی اپنی "بہت دلچسپی سے پڑھی گئی۔ "آموں کی دعوت" وقت کا تحفہ تھا مزہ دے گیا۔ وقت کی مناسبت سے "پنکھوں کی کہانی" "جب برف امریکہ سے آتی تھی" اور گرمی والی نظمیں بھی پیامیوں کو بہت بھائیں۔ کوثر اعظمی کی نظم "ارے او آدم کی سنتان" چھوٹے بڑے سبھی پیامیوں کو خاص طور سے اچھی لگی۔

اس پرچے میں "کناڈا میں شہریت کے آداب" کی دوسری قسط پڑھیے۔ یہ بھی عجیب وغریب چیز ہے۔ محترم غلام ربانی صاحب کا مضمون "بچوں کی دنیا" بھی آپ کو اچھا لگے گا۔ اس میں انھوں نے آپ ہی کا خاکہ کھینچا ہے۔ ہمارے پرانے ساتھی فرحت قمر صاحب نے اس مرتبہ خلا کے پھیلاؤ یا وسعت اور ستاروں کا حال لکھا ہے، دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔ مسعود حسین صدیقی صاحب نے ڈزنی لینڈ کی سیر کرائی ہے۔ لطیف اعظمی صاحب نے اپنے خاص انداز میں سفید ریچھ کا حال لکھا ہے۔ پھر اچھی اچھی نظمیں ہیں۔ اور ایک مزے دار کارٹونی کہانی ہے۔ غرض اس پرچے کو پڑھنے میں آپ کو خاص لطف آئے گا

اور اگلا پیام تعلیم انشاء اللہ اور بھی دلچسپ اور مزے دار ہوگا۔ اس میں احسان الحق صاحب کا ایک فیچر "زہرہ" آپ کو خاص طور سے پسند آئے گا۔ پھر

ہم ہیں اچھے بچے

ننھے پیامیوں کے لیے نرسری گیت



ہم ہیں اچھے بچے، ہم کو گیت سناؤ
سورج کے اُگنے سے پہلے ممی ہمیں جگاتی ہیں
اپنے ہاتھوں منہ دھوتی ہیں پھر ہم کو نہلاتی ہیں
اُجلے کپڑے پہناتی ہیں، نانی ہمیں کھلاتی ہیں
پھر کہتی ہیں "ننھے بیٹے اب اسکول کو جاؤ"
ہم ہیں اچھے بچے، ہم کو گیت سناؤ

ہم اسکول میں جب آتے ہیں ہنستے ہیں مسکاتے ہیں
لکڑی کے گھوڑے پر چڑھتے موٹر خوب چلاتے ہیں
کود کود کر، اُچھل اُچھل کر، ہم سب ریت اُڑاتے ہیں
ہم آتے ہیں، جب کہتی ہیں آپ، "اِدھر آجاؤ"
ہم ہیں اچھے بچے، ہم کو گیت سناؤ



جناب غلام ربانی

بچوں کی دُنیا



چھوٹے لڑکوں کی دنیا بھی عجیب دنیا ہے۔
اس میں ایک سے ایک بے فکرا۔ ایک سے ایک آزاد اور بے پروا ہوتا ہے۔ ان کے راج میں کوئی سخت قانون نہیں۔ ان کے سماج میں کوئی پابندی نہیں۔ اٹھنے، بیٹھنے چلنے، پھرنے، کھانے پینے اور رہن سہن کے طریقوں پر کوئی روک ٹوک نہیں۔ یہاں نہ کوئی امیر ہے نہ غریب، نہ کوئی طاقت ور ہے نہ کمزور، چھوٹے بڑے سب برابر ہیں۔ ہر طرف مساوات ہی مساوات ہے۔

ان کے ہاں زندگی کے اصول کوئی چیز نہیں۔ کہاوتیں جو ہزاروں برس کے تجربے اور مشاہدے پر بنی ہیں۔ ان کے نزدیک کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ اس دنیا میں ڈر یا اندیشہ بھی نہیں ہے۔ موت کا خیال کبھی کسی کو نہیں آتا۔ شہر میں ہیضہ پھوٹ پڑے

یا کوئی وبا پھیل جائے تو ان کو پریشان نہیں کر سک
یہ سب اپنے آپ کو امر سمجھتے ہیں۔

ان کی دنیا آنی جانی نہیں، ان کا زما
رنگ نہیں بدلتا۔ ہمیشہ ایک حال پر قائم رہتا
دولت اور خوبصورتی کو کبھی زوال نہیں۔ ان کے
خیال میں بوڑھے اور کمزور ہمیشہ سے بوڑھے او
کمزور تھے۔ جوان اور خوب صورت ہمیشہ جوان او
خوب صورت رہیں گے۔

ان میں ایک بات یہ بھی ہے کہ اپنے با
کو عقل مند، طاقتور، اور دولت مند سمجھتے ہیں
کے ۱۱ ر، سہ پیسہ کے لالچ سے پاک ہوتے ہیں

تی ہے تو ان کے لیے جلن نہیں، اور اگر
ہ نکل جاتے تو ان کی بلا سے۔
ں کی دوستی بے لوث ہوتی ہے۔ محبت
تی ہے۔ ان کے دل بھی پاک ہوتے ہیں
نہیں ہوتا۔ یہ فرشتے ہوتے ہیں۔ شاید
فرشتوں کی شکل بچوں کی سی بنائی گئی
ں یہ دُکھ بھری دنیا ان کے لیے جنت
بہت بھولے ہوتے ہیں۔ دھوکا دینا
۔ یہ بھلانا بھی جانتے ہیں۔ کوئی شخص
نت بات کہے تو اس کو بھلا دیتے ہیں
ں رکھتے۔ یہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح ہم
ہیں۔ مگر ان کو معلوم نہیں کہ بچپن ایک
ڑے ہونے پر ان سے چھن جائے گی۔
ی دنیا چھوٹی سی ہے۔ اور یہ اپنی ننھی
مگن رہتے ہیں۔ اس میں ہر طرف
ی ہے۔ آزادی ہی آزادی ہے۔
یل ہے۔ ان کے بھول پن پر سینکڑوں
ربان ہیں۔ حالی نے خوب کہا ہے ؎
اپے کی دانائی لے کر کوئی
دے وہ بچپن کی نادانیاں



ابھرتے فنکاروں کے لئے عظیم الشان

کل ہند مضمون نگاری کا مقابلہ

ادارہ بیدار حیدرآباد کی جانب سے نوجوانوں میں علم و ادب کی شمع کو درخشاں کرنے کے لیے اور ان میں اخلاقی اور مذہبی ذوق کو ابھارنے کے لیے کل ہند پیمانے پر مضمون نگاری کا مقابلہ منعقد کیا جا رہا ہے جس میں بارہ سال سے بیس سال تک کے عمر والے لڑکے اور لڑکیاں حصہ لے سکیں گی۔ چوں کہ یہ مقابلے نئے فن کاروں کو ابھارنے اور ان کی ہمت افزائی کے لیے منعقد کیا جا رہا ہے۔ اس لیے کوئی عنوان مقرر نہیں کیا گیا۔ فنکار اپنی مرضی کے مطابق کسی بھی عنوان پر کہانیاں، افسانے، مضامین، مقالے، انشا ئیے یا دیگر ادبی تحقیقات روانہ کر سکتے ہیں۔ جن کا پاکیزہ اور سبق آموز ہونا ضروری ہے۔

انعام اوّل پچاس روپے، انعام دوم تیس روپے انعام سوم پندرہ روپے نقد دیئے جائیں گے۔ ان کے علاوہ دس ترغیبی انعامات کتابی شکل میں دیئے جائیں گے انعام یافتہ تمام مضامین کو مضمون نگار کی فوٹو کے ساتھ ادارہ کے ساوینیر میں شائع کیا جائے گا۔۔

مضامین داخل کرنے کی آخری تاریخ ۳۱ جولائی ۱۹۷۰ء مقرر کی گئی ہے۔ شرکت فیس صرف ایک روپیہ مقرر کی گئی ہے۔
دیگر تفصیلات شرائط شرکت اور داخلہ فارم کے لیے ۲۰ پیسوں کے ڈاک ٹکٹ بھیج کر ادارہ بیدار، ۲۲ ہری باؤلی حیدرآباد ۲ سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔
جاری کردہ شعبۂ نشر و اشاعت ادارہ بیدار۔ حیدرآباد ۲

بچوں کی دلچسپ معلوماتی کتابیں

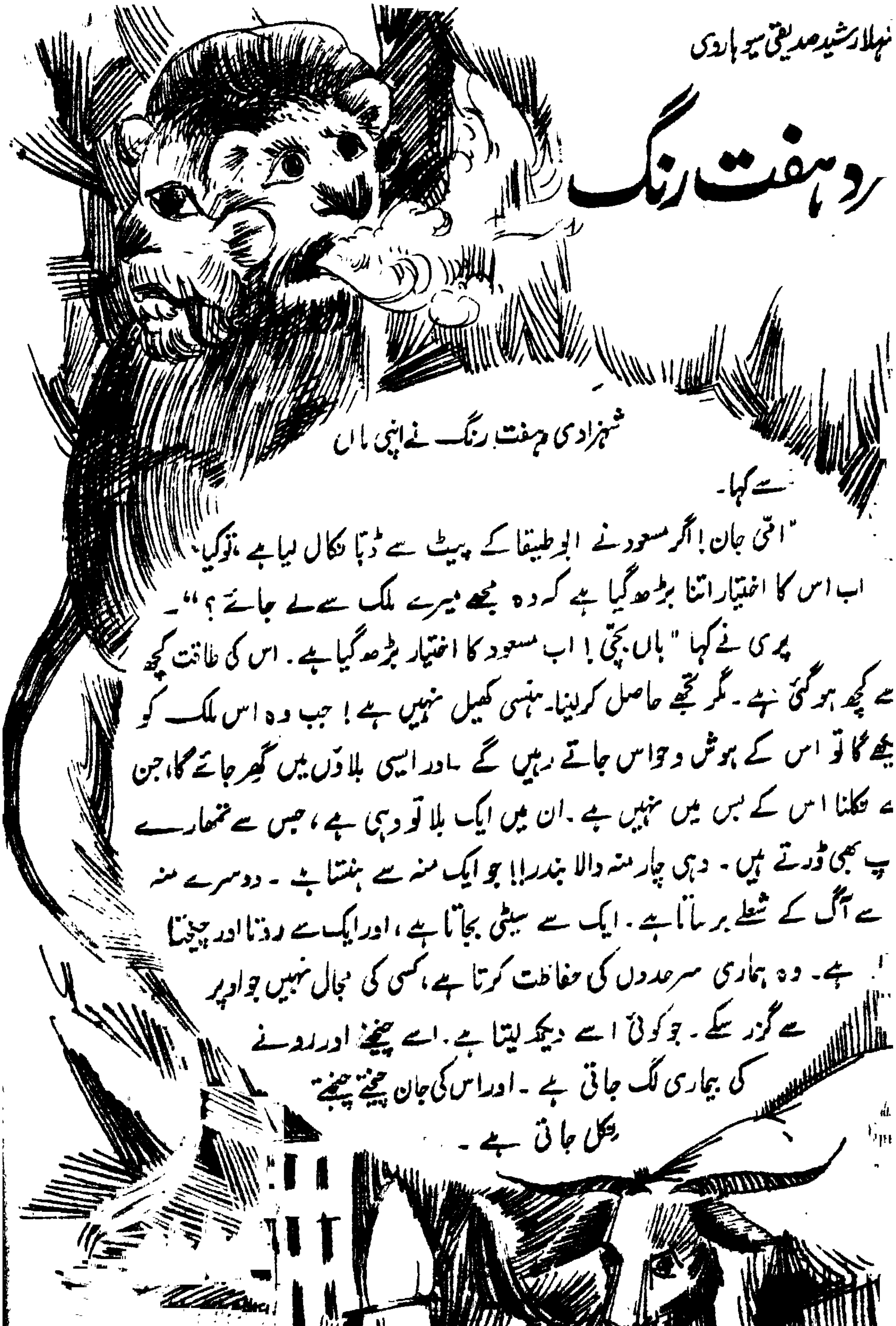
کتاب	قیمت
چاچا نہرو	۱/-
اصلاحی کہانیاں	-/۳۰
بچوں کی اخلاقی کہانیاں	-/۴۰
بچوں کا ادب	۱/۵۰
بہادر لڑکا	-/۴۰
سلطان ٹیپو شہید	-/۳۰
جنگل کی دنیا	-/۴۰
دل چسپ لطیفے	-/۴۰
دل چسپ کہانیاں	-/۳۰
ڈاکٹر اقبال	-/۳۰
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت شخصیت	-/۳۵
ریل کا سفر	-/۲۵
سنہری چڑیا	-/۴۰
کبڑا گھوڑا	-/۳۰
مولانا ابوالکلام آزاد	-/۳۰
ننھی منی کہانیاں	-/۳۰
سرور دو عالم	-/۵۰
حضرت صدیق اکبر رض	-/۲۵
حضرت فاروق اعظم رض	-/۲۵
حضرت عثمان ذی النورین رض	-/۲۵
حضرت علی شیر خدا رض	-/۲۵
حضرت امام حسین رض	-/۲۵
حضرت امام حسن رض	-/۲۵
حضرت رابعہ بصری رح	-/۲۵
حضرت سلمان رض	-/۲۵
حضرت بلال رض	-/۲۵

کتاب	قیمت
حضرت خدیجۃ الکبریٰ رض	-/۲۵
حضرت فاطمۃ الزہرا خاتون جنت رض	-/۲۵
ابھرتا سورج	-/۵۰
زمین کے تارے	-/۵۰
چمکتے موتی	-/۵۰
تین قلندر	۲/-
ایک تھی راجکماری	-/۲۰
ایک تھی رانی	-/۲۰
آدم خور زنگی	-/۳۰
افراسیاب کی بیٹی	-/۳۰



بہادر راجکمار
باغی شہزادہ
بے وقوف پریاں
پریوں کے تحفے
بھولی شہزادی
تیسرا انعام
تین شہزادے
جادو کی بطخ
جادو کا گھوڑا
جادو کا پھل
چڑیوں کی ملکہ
خوفناک جادوگر
دیو بیکہ و بندہ
ڈاکٹر بوجھ بجھکڑ
رحم دل پریاں
رستم و سہراب
شیش محل
شہزادی بدورا
شہزادی پری زاد
عراق کی شہزادی
لنگڑا دیو
مسٹر عقلمند
مغرور شہزادی
ہنس مکھ شہزادہ
ہیروں کا جزیرہ
چاند کا ہاتھ

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال بمبئی ۳ بی آر



نہلا رشید صدیقی سیوہاروی

ہفت رنگ

شہزادی ہفت رنگ نے اپنی ماں
سے کہا۔

"امّی جان! اگر مسعود نے ابو طیفا کے پیٹ سے ڈبا نکال لیا ہے، تو کیا
اب اس کا اختیار اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ مجھے میرے ملک سے لے جائے؟"۔

پری نے کہا "ہاں بچی! اب مسعود کا اختیار بڑھ گیا ہے۔ اس کی طاقت کچھ
سے کچھ ہو گئی ہے۔ مگر تجھے حاصل کر لینا ہنسی کھیل نہیں ہے! جب وہ اس ملک کو
پہنچے گا تو اس کے ہوش و حواس جاتے رہیں گے۔ اور ایسی بلاؤں میں گھر جائے گا، جن
سے نکلنا اس کے بس میں نہیں ہے۔ ان میں ایک بلا تو وہی ہے، جس سے تمہارے
باپ بھی ڈرتے ہیں۔ وہی چار منہ والا بندر!! جو ایک منہ سے ہنستا ہے۔ دوسرے منہ
سے آگ کے شعلے برساتا ہے۔ ایک سے سیٹی بجاتا ہے، اور ایک سے روتا اور چیختا
ہے۔ وہ ہماری سرحدوں کی حفاظت کرتا ہے، کسی کی مجال نہیں جو اوپر
سے گزر سکے۔ جو کوئی اسے دیکھ لیتا ہے۔ اسے چیخنے اور رونے
کی بیماری لگ جاتی ہے۔ اور اس کی جان چیختے چیختے
نکل جاتی ہے۔

اور اگر اس کے دیکھے بغیر کوئی کسی تدبیر سے نکل بھی جائے، تو وہ گائے ہے جس کی رنگت زرد ہے۔ منہ لال ہے۔ زبان باہر لٹکتی ہے۔ اور سینگ نیلے ہیں۔"

"یہ گائے ہر وقت ایک اونچی چوکی پر کھڑی رہتی ہے اور ہر ایک آنے والے پر حملہ کرتی ہے۔" "اس کے سینگ اتنے تیز اور نوک دار ہیں، کہ کسی کے بھی مار دے تو دو ٹکڑے کر دے،"

"بیٹی زمرد ہفت رنگ! مسعود ایسا کہاں کا رستم ہے جو ہماری فوجوں سے لڑے گا۔ جس میں ہر سپاہی دیو کی طاقت رکھتا ہے۔" شہزادی زمرد ہفت رنگ نے جواب دیا۔" مگر وہ انجانی طاقتیں جو ابوطیقا کے ڈبے سے مسعود کو حاصل ہوگئی ہیں ان کا علاج ہمارے پاس کیا ہے۔؟

"یہ فوجیں، یہ بندر، یہ گائے سب اس کے غلام بن جائیں گے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ مجھے تسلی دے رہی ہیں؛

"آپ ہی نے کہا تھا کہ جس کسی کو ابوطیقا کا ڈبا مل جائے اس کی طاقت بے پناہ ہو جاتی ہے۔"

پری بولی:" زمرد ہفت رنگ تو گھبراتی کیوں ہے؟ مسعود کو کیا غرض پڑی کہ دریاؤں سے گزر کر، کانٹوں کے جنگلوں میں الجھ کر، بندر اور گائے سے ٹکرا کر ایران آئے اور تجھے لے جائے۔ میں پرستان سے ایسی فوجیں بلاؤں گی، جو کسی کو نظر نہ آئیں، اور ہوا میں اڑتی ہوئی طاقت ور سے طاقت ور انسان کو کاٹ کاٹ کر قیمہ قیمہ کر دیں"

٠٠٠٠٠٠٠٠٠٠٠٠٠٠٠٠٠٠٠

اِدھر مسعود نے اپنی ماں سے کہا۔"کیا آپ مجھے اجازت دیتی ہیں کہ ہفت رنگ کے ملک ایران میں جاؤں اور اسے دیکھوں۔؟

"اماں! میں نے اخباروں میں پڑھا ہے کہ وہ اپنے منھ پر نقاب ڈالے رہتی ہے۔ اور اس کے ماں باپ کے سوا کوئی اسے دیکھ نہیں سکتا،"

ماں نے کہا:" بیٹا مسعود ہفت رنگ کے ملک میں جانے کے لیے تم اپنے باپ سے اجازت لو۔ میں نے سنا ہے کہ اس کے ملک ایران میں بڑی بڑی بلائیں ہیں اور ان بلاؤں سے بچنا مشکل ہے۔ اگرچہ تمھارے پاس پرستان کا وہ ڈبا ہے جس سے انسانی طاقتیں ہزار گنا ہو جاتی ہیں، مگر پھر بھی اپنے باپ کی مدد اور مشورے کے بغیر یہ مرحلہ پورا نہیں ہوگا۔ تمھارے باپ کے پاس ایک ایسا آئینہ ہے کہ اگر وہ آئینہ تمھیں مل جائے اور اس سے کام لینے کا ڈھنگ تمھیں بتا دیا جائے تو ہفت رنگ کے ملک پر جانا آسان ہو جائے گا اور تمھارے کام کے پورا ہونے میں کوئی شبہ نہ رہے گا؛

وہاں کی فوجیں، وہاں کی بلائیں اور آفتیں ایسی ہو جائیں گی جیسے گرمیوں کی [illegible]

بے بادل چھا جاتے ہیں اور مسافر کی تھکن مٹ

مسعود اپنے باپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور
ب سے بولا۔
"ابا جان! میرا ارادہ ایران جانے کا ہے۔
بادشاہ نے پرستان میں شادی کی ہے
س کی ایک بیٹی ہے جسے ہفت رنگ کہتے ہیں
جازت ہو تو جاؤں، امی نے اجازت دے دی

ابا جان!! امی نے مجھے بتایا ہے کہ آپ کو کسی
کبھی ایک ایسا آئینہ دیا تھا۔ جس میں سینکڑوں
رتاثیریں ہیں۔ یہ آئینہ جس کے پاس ہوتا
بلا اُسے نہیں ستاتی، کوئی تکلیف اور
اسے نہیں ہوتا۔ آئینہ ہر چیز اسے دکھا دیتا
دئی اپنی شکل بھی بدل کر آتا ہے، تو
س کی اصلی شکل جھلکنے لگتی ہے۔"
پ نے کہا "بیٹے مسعود یہ سچ ہے، مجھے
اللہ والے بزرگ نے یہ آئینہ مجھے دیا
ہس میں ہزاروں برکتیں ہیں۔
ل اس کا مالک سمندروں پر، ہواؤں پر
لتا ہے۔ پانی اور آگ پر چل سکتا ہے۔
نقصان نہیں پہنچا سکتی۔
لئے لے جاؤ اور ایران کے ملک میں جاؤ

کردے تو تم اس آئینہ سے کوئی کام نہ لینا۔ ورنہ جہاں اس کی ان گنت تاثیریں ہیں ایک ایسی تاثیر بھی ہے۔ جس کا وہم بھی تمہارے ذہن میں نہیں آسکتا۔ اور یہ تاثیر وہاں پہنچ کر ظاہر ہوگی۔

اس کی یہ خاصیت بھی ہے کہ جس چیز پر اس کا عکس پڑ جائے وہ جانور ہو یا شہر، پانی ہو یا ریت کا ٹیلہ گھڑی کی گھڑی میں ایسا ہو جائے گا جیسے کبھی اس کا وجود نہ تھا۔ اس آئینہ کی طاقت سے لاکھوں فوجیں جل کر راکھ ہو جاتی ہیں۔ شہروں اور مکانوں پر اس کی پرچھائیں پڑ جاتی ہے تو آن کی آن میں نابود ہو جاتے ہیں۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بچوں کی طرح جگہ جگہ اس کا عکس اور پرچھائیں ڈالتے پھرو۔"

یہ کہہ کر مسعود کے باپ نے آبنوس کا ایک صندوقچہ نکالا۔ جس پر سونے کے پتر چڑھے ہوئے تھے، اور صندوقچہ کھول کر ایک لفافہ نکالا لفافہ میں ایک اور لفافہ تھا جس میں آئینہ بند تھا۔ آئینہ کھولتے ہی تمام محل روشنی سے جگمگانے لگا۔ مسعود کے باپ نے فوراً اسے لفافہ میں بند کر دیا اور کہا۔

"بیٹے مسعود! جب کوئی تدبیر بن نہ پڑے تو آئینہ نکال کر عکس ڈال دینا۔ اور پھر قدرت الٰہی کا تماشہ دیکھنا۔"

"جان دار بلا ہوگی تو جل کر راکھ ہو جائے گی۔
پہاڑ ہوگا تو ریزہ ریزہ ہو جائے گا۔ سمندر ... اور ... اندھا ...

نوکر چاکر کی طرح تمھارا تابعدار بن جائے گا۔ اپنی امّی کی قدم بوسی کرنا اور ان سے ایک تعویذ بھی لے لینا جس میں اسمِ اعظم ہے۔

"خدا کے نام کی برکت سے ساری بلائیں آفتیں اور مصیبتیں آن کی آن میں ٹل جائیں گی۔

"اچھا اللہ کی امان۔ خدا حافظ"

اب مسعود کا دل مضبوط ہوگیا اور اس نے وہی گولی جس سے راستہ آسان ہوجاتا تھا۔ منھ میں ڈال لی۔

مسعود اڑتا چلا جارہا تھا۔ اسے ایسا لگ رہا ہے جیسے میرے پاؤں زمین سے اوپر ہیں اور میں ہوا میں اڑا جارہا ہوں۔ دریا۔ پہاڑ اور جنگل سب ایسے گذرتے چلے جارہے ہیں جیسے اندھیرے میں بجلی چمکے اور سب چیزیں سامنے آجائیں:

لیجیے سرحد آگئی۔ یہ ایران کی سرحد ہے۔

چار منھ کا اژدر قلقاریاں مار رہا ہے۔ مگر جونہی اس نے مسعود کو دیکھا۔ نہ سیٹی بجا سکا نہ چیخ سکا۔ نہ رو سکا منھ کے بل گر پڑا اور مر کر رہ گیا۔ مسعود ہنسنے لگا۔ بھلا ان شعبدوں سے کیا ہوتا ہے۔ خدا کے نام کے سامنے کبھی شعبدے ٹھہر سکتے ہیں۔

سامنے گائے چوکی پر تنیا۔ کھڑی تھی مسعود نے آئینہ نکالا۔ جونہی گائے پر عکس پڑا گائے چوکی سے گر پڑی اور مٹی کا کھلونا بن کر رہ گئی۔

ایران کے اونچے اونچے مکانات اور شاہی محلات نظر آنے لگے۔

شہزادی ہفت رنگ سوتے سوتے چونک پڑی اور چیخ کر بولی: میں شہزادہ مسعود کے پاس جاؤں گی وہ مجھے لینے آیا ہے۔ وہ بڑا اچھا ہے۔ اب میں ایران میں نہ رہوں گی۔ اب میں نقاب نہ ڈالوں گی۔ شہزادہ مسعود کو کوئی نہیں روک سکتا کیوں کہ اسے خدا کی طاقت حاصل ہے۔ اور جسے خدا کی طاقت اور توانائی حاصل ہو جاتی ہے۔ اسے نہ کوئی بلا ستا سکتی ہے نہ کوئی انسان اسے تکلیف دے سکتا ہے۔

ختم

باقی بچوں سے باتیں

حرمت الاکرام صاحب کی نظم اور دوسرے مضمون۔ کہانیاں وغیرہ۔

محترم شاہد علی خاں صاحب (شاخ مکتبہ بمبئی) نے اس مہینے چار خریدار مرحمت فرمائے۔ ایک خریدار جناب سیف سہرامی صاحب نے مرحمت فرمایا۔ محترمہ سلطانہ صاحبہ (جھنجھانہ) احمد حسن حکیم عبداللہ صاحب (بڑودہ) عبدالقاسم صاحب فیض آباد خود خریدار بنے

اگر آپ کو اردو سے محبت ہے تو
اردو لکھیے ★ اردو پڑھیے ★ اردو بولیے

ب — حافظ باقوی

تمنّا



رہوں سب کو بھاتا رہوں
کر سدا جگ مگاتا رہوں

رب! تری بندگی ہو مری زندگی
تیرے آگے سدا سر جھکاتا رہوں

ت کا ہو یا مصیبت کا ہو
ں اے خدا مسکراتا رہوں

ہوں ارادے جواں اور ہمت جواں
مشکلوں پر بھی میں جیت پاتا رہوں

برے قدم کامیابی سدا
س کا منھ چڑاتا رہوں

زندگی میں اگر دکھ اٹھانا پڑیں
دکھ کے ماروں کا دکھ درد کھاتا رہوں

خوش رہوں سب کا دل خوش کروں
ت بھرے گیت گاتا رہوں

زندگی ہو میری خوب پھولی پھلی
عشرت و عیش کے گل کھلاتا رہوں

ساتھ میرے خوشی رقص کرتی رہے
شعر حافظ کے میں گنگناتا رہوں

جناب ڈاکٹر مشیر الحق، ام اے پی ایچ ڈی

کناڈا میں شہریت کے آداب



ابھی پچھلے دنوں اردو کے اخبارات میں لندن کا ایک واقعہ پڑھنے میں آیا، کوئی صاحب ڈاک خانے میں اپنا ایک خط ڈالنے جا رہے تھے، راستہ میں خط ان کی جیب سے کہیں گر گیا، اور کسی پولیس والے کو ملا، اس نے اس کو ضائع کرنے کی بجائے قریبی لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ اس طرح وہ خط اپنی منزل پر پہنچ گیا۔ دیکھا جائے تو اس واقعہ میں کوئی خاص بات نہیں ہے لیکن اتنی معمولی بات بھی ہمارے ملک کی نوکرشاہی کو دیکھتے ہوئے لوگوں کو اتنی حیرت انگیز معلوم ہوتی کہ اس کو نمایاں طور سے اخباروں میں شائع کرنا ضروری سمجھا گیا۔

اس خبر کو پڑھنے کے بعد مجھے مانٹریال کے قیام کے دوران میں محکمہ ڈاک کی فرض شناسی اور احساس ذمہ داری کے جو تجربے ہوئے تھے وہ سینما کی تصویروں کی طرح نظروں کے سامنے گھومنے لگے۔ اور یہ خیال آیا کہ اگر ان واقعات کو میں دوسروں کو سناؤں تو ہمارے اپنے ملک میں محکمہ ڈاک

ہے اس کو دیکھتے ہوئے بہت سے لوگ بھلا کیا
یہ سمجھیں گے کہ میں انھیں الف لیلہ کی کہانیاں
۔ لیکن اگر آپ کو انگریزی کی ایک مشہور مثل معلوم
ی سچائی بالکل خلافِ عقل معلوم ہوتی ہے" تو
میرے بارے میں یہ گمان نہ کریں گے کہ میں
ت کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا ہوں۔ بہرحال چند
یاد ہیں وہ میں آپ کو سنا رہا ہوں۔ یقین کرنا
کام ہے۔

ریال میں میرے قیام کا پہلا سال تھا۔ میرے
ندوستان سے مجھے ایک خط بھیجا۔ اس پر میرے
نھوں نے صرف مکگل یونیورسٹی کناڈا لکھنا
آپ جانتے ہیں کسی شہر کا نام نہیں ہے۔
ہے۔ یہ بات ایسی ہے جیسے کوئی "جامعہ
" لکھے۔ بہرحال جب خط کناڈا پہنچ گیا تو
رں کو یہ پتہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں
رسٹی کس شہر میں ہو سکتی ہے۔ اس طرح
ریال پہنچ گیا اور رجسٹرار آفس میں اس نوٹ
انے نے خط بھیج دیا کہ رجسٹر سے طالب علم
ط اس کے پاس پہنچا دیا جائے۔" رجسٹرار
ن میری قیام گاہ کا پورا پتہ اس لفافے
میں ڈال دیا اور دوسرے دن وہ خط
رح خط کو مجھ تک پہنچنے میں صرف ایک

اپنے ایک عزیز کو ہوائی ڈاک سے خط
بھیجا۔ تیسرے دن میرے پاس ڈاک خانے کی طرف
سے ایک چھپا ہوا خط پہنچا جس پر لکھا ہوا تھا "فلاں فلاں
پتہ پر آپ نے جو خط بھیجا ہے اس پر وزن کے حساب سے
۱۰ سنٹ کا ٹکٹ کم تھا۔ اس وجہ سے وہ خط اصولاً ہوائی
ڈاک سے نہیں بھیجا جا سکتا تھا لیکن اس خیال کے پیش نظر
کہ خط اہم ہوگا، اور اسے جلد سے جلد مکتوب الیہ تک
پہنچ جانا چاہیے، ہم نے اپنی طرف سے دس سنٹ کے
ٹکٹ اس پر لگا دیے ہیں۔ اب آپ وہ ۱۰ سنٹ مہربانی
کر کے ہمیں ادا کر دیجیے۔ چونکہ ہمیں احساس ہے کہ آپ
مصروف آدمی ہیں اور آپ کے پاس اتنا فالتو وقت نہیں
ہوگا کہ رقم جمع کرنے کے لیے ہمارے آفس میں آ سکیں گے
اس لیے آپ اسی کارڈ پر دس سنٹ کا ٹکٹ چسپاں کر کے
کسی بھی لیٹر بکس میں ڈال دیجیے۔"

اس کے برخلاف ایک دوسرا واقعہ ہمارے ملک
کا بھی سن لیجیے۔ اعظم گڑھ سے میرے ایک عزیز نے
ہوائی ڈاک سے ایک لفافہ میرے پاس بھیجا جس پر انھوں نے
معینہ رقم سے پانچ پیسے کے ٹکٹ کم لگائے۔ وہ خط جب
بمبئی غیر ملک بھیجے جانے والے خطوں کے ڈاک خانے میں
پہنچا تو کسی کلرک کی نظر ٹکٹوں پر پڑی، چونکہ پانچ پیسے کے
ٹکٹ کم تھے اس لیے انھوں نے ایک مہر اس لفافے پر
اس مضمون کی لگا دی "ٹکٹ کم ہونے کی وجہ سے خط سمندری
ڈاک سے بھیجا جا رہا ہے۔" یہ مہر لگا کر وہ حضرت اپنے
فرض سے سبکدوش ہو گئے۔ اس طرح جو خط مجھے
پانچویں دن مل جانا چاہیے تھا، وہ کہیں ڈھائی تین ماہ بعد ملا۔

۳۔ مانٹریال میں ہندوستانی اور پاکستانی بہت آباد ہیں، کچھ لوگ پڑھنے کی غرض سے اور کچھ ملازمت کی خاطر۔ مانٹریال میں کوئی مسجد نہیں ہے۔ (اب سننے میں آیا ہے کہ ایک مسجد بن رہی ہے، یا بننے والی ہے۔ بہرحال جب تک میں وہاں تھا کوئی مسجد نہیں تھی) روزمرّہ کی نمازیں پڑھنے والے لوگ اپنے گھر پر پڑھ لیتے تھے ۔ جمعہ کی نماز کے لیے میرے انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر، پروفیسر ولفرڈ کانٹول اسمتھ نے انسٹی ٹیوٹ کا ہال دے رکھا تھا جس میں طالب علم اور ملازمت پیشہ مسلمان اکٹھا ہو کر جمعہ کے دن نماز پڑھا کرتے تھے ۔

انھیں ملازمت پیشہ پاکستانی مسلمانوں میں سے ایک صاحب پنجاب کے کسی گاؤں کے رہنے والے تھے، ان کے گھر والوں نے ایک خط ان کے نام بھیجا ۔ بے چارے گاؤں والے شاید یہ سمجھتے تھے کہ اردو تمام دنیا میں پڑھی جاتی ہے اس لیے لفافے پر پورا پتہ انھوں نے اردو میں لکھا۔ پاکستان کے محکمہ ڈاک نے اتنی مہربانی کی کہ اس پر صرف مانٹریال انگریزی میں لکھدیا اس طرح وہ خط مانٹریال تک تو آسانی سے پہنچ گیا۔ اس کے بعد مانٹریال کا محکمہ ڈاک یہ نہ سمجھ پایا کہ پتہ کس زبان میں لکھا ہوا ہے ۔ لیکن چونکہ ٹکٹ پاکستان کا لگا ہوا تھا۔ اس لیے وہ لوگ اتنا سمجھ گئے کہ ہو نہ ہو یہ کوئی اسلامی زبان ہوگی ۔ پوسٹ ماسٹر جنرل کی طرف سے وہ خط مکگل کے رجسٹرار کے پاس اس درخواست کے ساتھ بھیجا گیا کہ چونکہ ان کی یونیورسٹی میں اسلامی ملکوں کے بہت سے طالب علم ہیں اس لیے کسی سے پتہ پڑھوا کر انگریزی میں لکھوا دیا جائے۔ چونکہ بات "اسلامی" تھی اس لیے وہ خط انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے ڈائرکٹر کے پاس بھیجا گیا کہ وہ اس سلسلے میں ڈاک خانے کی مدد کریں۔ جس وقت وہ خط ان کے پاس پہنچا، میں اتفاق سے ان کے دفتر ہی میں بیٹھا ہوا تھا۔ انھوں نے وہ خط میرے سپرد کیا کہ میں مکتوب الیہ کا پتہ چلاؤں ۔ دوسرے دن جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز کے موقع پر وہ خط میں نے نمازیوں کو دکھایا کہ جس کا ہو وہ لے ۔ اتفاق سے ان صاحب کے ایک دوست وہاں موجود تھے۔ انھوں نے وہ خط لے لیا۔ اور اس طرح اگرچہ خط کے پہنچنے میں ۴، ۵ دن کی زیادہ مدّت لگ گئی لیکن اردو میں پتہ لکھا ہوا خط بھی منزل تک پہنچ ہی گیا۔

۴۔ اکثر و بیشتر بیرنگ خط پہنچ جاتے ہیں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ مکان نہ ہونے کی وجہ سے پوسٹ مین خط کو لے کر واپس چلا گیا ہو۔ وہ اس خط پر ایک سلپ چپکا دیتا کہ کتنے سنٹ کا بیرنگ خط ہے ۔ اور خط پانے والے پر یہ اخلاقی فرض ہوتا تھا کہ وہ اتنے سنٹ کا ٹکٹ سلپ پر چپکا کر لیٹر بکس میں ڈال دے ۔ ٹکٹ خریدنے کے لیے اسے ڈاک خانے کی کھڑکی پر قطار لگانے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی، کیوں کہ قریب قریب ہر دکان اور اہم چوراہے پر ایک بکس لگا ہوتا ہے، اس میں آپ ۲۵ سنٹ ڈال کر بٹن دبا دیجیے ۵، ۵ سنٹ کے ۵ ٹکٹوں کی ایک کاپی خود نکل آئے گی ۔ اس طرح نیت اگر درست ہو تو چند سکنڈ میں انسان فرض سے سبک دوش ہو سکتا ہے ۔

۵۔ ۱۹۶۳ء یا ۱۹۶۴ء کے جاڑوں کی بات ہے ایران کا ایک ہوائی جہاز سوئزرلینڈ کی پہاڑیوں میں گر کر تباہ

ی جہاز میں ہندوستان کے مشہور ... سافر
سفر کر رہے تھے، اور اسی میں ان کا انتقال ہوا
میں مسافروں کے علاوہ ہندوستان سے یورپ
والی ڈاک بھی تھی۔ وہ سب بھی تباہ ہو گئی
ہونے والے ڈاک کے تھیلے میں ایک خط میرے
ری بچیوں نے دلی سے مجھے بھیجا تھا۔ آپ پوچھیں گے
علوم ہوا کہ ڈاک کے اس تھیلے میں میرا کوئی خط تھا
۔ اس بات کا پتہ نہ چلتا اگر اٹلی کے محکمہ ڈاک
ادا نہ کیا ہوتا۔ جہاز کے تباہ ہونے کے تقریباً
مجھے اٹلی کے پوسٹ ماسٹر جنرل کی طرف سے
ل ہوا، اس میں دہلی والا خط اور پوسٹ ماسٹر
خط تھا۔ جس کو پڑھ کر معلوم ہوا کہ سوئزرلینڈ کی
ہونے والے جہاز کا کچھ ملبہ اور خطوط اور پارسل
رستے اڑتے ہوئے پڑوسی ملک اٹلی تک
اٹلی کی حکومت بھی سامان اور لاشوں کی
سوئزرلینڈ کی مدد کر رہی تھی اس لیے ان
چیزیں جمع کیں جو ان کے ہاتھ لگیں۔ انھی
بھی تھا جو برف پر پڑے رہنے کی وجہ سے
تھا۔ روشنائی مدھم پڑ چکی تھی اور پتہ صاف
جا سکتا تھا لیکن انھوں نے کسی نہ کسی طرح
معذرت کے ساتھ میرے پاس بھیج دیا
تک جب ... ہوں تو لندن کے سپاہی کی خبر
م ہوتی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ آج صبح میں نے
کھانا کھایا تھا لیکن جب اپنے ... پر نظر

ڈالتا ہوں تو پھر خیال آتا ہے کہ اس سپاہی نے سچ مچ ایک حیرت انگیز بات کر دکھائی ہے۔ •

ماہنامہ **کتاب نما** نئی دہلی ۲۵

ارباب ذوق کے لیے مکتبہ جامعہ کا یہ ماہوار رسالہ نہایت ضروری چیز ہے۔ اردو کی تمام نئی کتابوں کی اطلاع آپ کو اس رسالے میں مل سکتی ہے۔ کسی قابل ذکر دارالاشاعت کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہوتی جس کا اشتہار ہم فوراً کتاب نما میں شائع نہ کرتے ہوں آپ کتاب منگائیں یا نہ منگائیں اردو ادب کی ترقی سے واقف رہیں گے۔

یہ رسالہ علاوہ عام باذاق حضرات کے لیے مفید ہونے کے خاص طور لائبریریوں اور انجمنوں کے لیے ضروری ہے۔ کوئی کتب خانہ بغیر اس رسالے کی مدد کے نئی کتابوں کا صحیح انتخاب نہیں کر سکتا۔

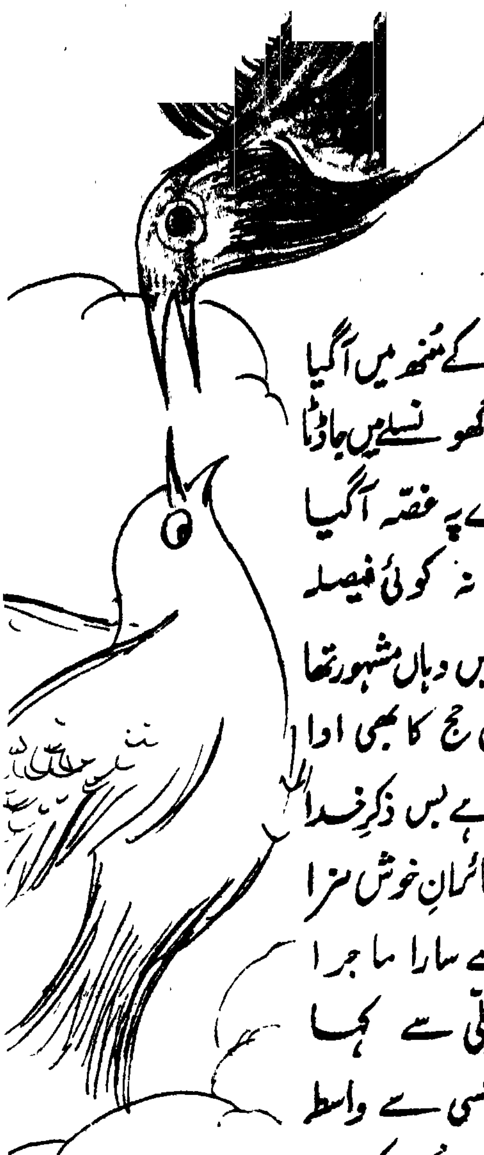
نمونہ مفت ——— قیمت سالانہ دو روپے

پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جناب سیف سہسرامی

فیصلہ



دیکھ کر اک فاختہ کا گھونسلا ۔ پانی اک کوے کے منہ میں آگیا
اس قدر لالچ نے اندھا کر دیا ۔ بے دھڑک وہ گھونسلے میں جا ڈٹا
فاختہ نے جب یہ دیکھا ماجرا ۔ اس کو بس کوے پہ غصہ آگیا
خوب دونوں میں لڑائی ہوگئی ۔ ہو سکا پھر بھی نہ کوئی فیصلہ
تھی قریب اک بڑھیا بلی بھی وہیں ۔ جس کے بارے میں وہاں مشہور تھا
نو سو چوہے کھا کے خالہ شیر کی ۔ کر چکی ہے فرض حج کا بھی ادا
اب کسی کا گوشت وہ کھاتی نہیں ۔ رات دن کرتی ہے بس ذکرِ خدا
کوئی اس کے جی کو اب بھاتا نہیں ۔ چوہے ہوں کہ طائرانِ خوش نوا
بس یہی دونوں نے سوچا اب چلیں ۔ اور کہیں بلی سے سارا ماجرا
ہو کے دونوں بے خطر پہنچے وہاں ۔ اور سارا حال بلی سے کہا
بولی بلی کس لئے آئے ہو تم ۔ میں نہیں رکھتی کسی سے واسطہ
ڈالتے ہو کیوں عبادت میں خلل ۔ جاؤ کرنے دو مجھے ذکرِ خدا
بولے دونوں آپ ہیں بیشک بزرگ ۔ کیجئے بہرِ خدا کچھ فیصلہ
سوچ کے کچھ اس نے دونوں کی طرف ۔ ادھ کھلی آنکھوں سے دیکھا اور کہا
کہنا ہو جو کان میں آکر کہو ۔ آج کل سنتی ہوں میں اونچا ذرا
بے دھڑک پہنچے وہ بلی کے قریب ۔ عقل بھی آئی نہ دونوں کو ذرا
دشمنِ جاں کو سمجھ بیٹھے وہ دوست ۔ دشمنی نے اتنا اندھا کر دیا
پھر نہ پوچھو کیا ہوا انجام بس ۔ ایک جھپٹے میں ہوا سب فیصلہ



مسعود صدیقی

ڈزنی لینڈ پارک



(ایک سرسری اور مختصر خاکہ)

نٹہ بج چکا تھا۔ سارے لڑکے کلاس میں
مانیٹر تیزی سے کلاس میں داخل ہوا اور
ں کو مخاطب کرکے کہا" خاموش خاموش!
استاد آرہے ہیں، ان کے ساتھ کوئی مہمان
ئی لمبا تڑنگا انگریز معلوم ہوتا ہے۔ شاید
نائے گا"

رہی کلاس خاموش ہوگئی۔ اور مہمان کا
ں۔ کلاس کے تمام لڑکے جانتے تھے کہ
نے والے ہر مہمان کو جغرافیہ کے استاد
اپنی کلاسوں میں لے جاتے ہیں۔ اور
کے لیے معلوماتی تقریریں کرواتے ہیں
ناد جانتے تھے کہ ان کی کلاسوں کے لڑکے
کی تقریروں کو غور سے سنتے ہیں، اور
اٹھاتے ہیں۔ اسکول کے ہیڈ ماسٹر صاحب
ے استاد کی ہمت افزائی کرتے تھے۔

پیروں کی آہٹ سنائی دی۔ مانیٹر نے پھر کہا" خاموش! وہ لوگ آرہے ہیں"

تھوڑی دیر بعد جغرافیہ کے استاد ایک لمبے تڑنگے آدمی کے ساتھ داخل ہوئے۔ استاد کا قد ذرا چھوٹا تھا۔ ان کے سامنے مہمان دیو کا دیو معلوم ہو رہا تھا۔

کلاس نے کھڑے ہوکر مہمان کا استقبال کیا۔ استاد نے لڑکوں سے بیٹھنے کو کہا اور مہمان کا تعارف کرایا۔

" ہماری خوش قسمتی ہے کہ آج جیمس پاور صاحب نے ہمیں عزت بخشی ہے، یہ حال ہی میں امریکہ سے آئے ہیں۔ یہاں چند ہی دنوں کے لیے آئے ہیں۔ بہت مصروف ہیں، پھر بھی یہاں آکر تقریر کرنے کی درخواست قبول کرلی ہے۔ یقین ہے تم سب ان کی تقریر سننے کے لیے بے چین ہوگے۔ میں جیمس پاور صاحب سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ بچوں کو کچھ اچھی باتیں بتائیں"

لمبا امریکی کرسی سے اٹھا۔ اس نے استاد کا

شکریہ ادا کیا اور بولا: "مجھے اسکول کے بچوں سے مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ میرا پیشہ ہی کچھ ایسا ہے کہ کام کے وقت بچوں ہی سے واسطہ پڑتا ہے۔ میں ڈزنی لینڈ میں گائیڈ کی حیثیت سے کام کرتا ہوں" اس نے کلاس کو مخاطب کرکے پوچھا۔ "کیا آپ میں سے کسی نے امریکہ کے مشہور ڈزنی لینڈ پارک کا نام سنا ہے؟" کئی ہاتھ اوپر اٹھ گئے۔ امریکی مہمان بہت خوش ہوا جن لڑکوں نے ہاتھ اوپر اٹھائے تھے انھوں نے بتایا کہ کچھ عرصہ پہلے انھوں نے ڈزنی لینڈ پارک کے بارے میں ایک فلم دیکھی تھی۔

مہمان نے اب ایک بہت بڑی تصویر کھولی اور اسے بلیک بورڈ پر لگا دیا۔ یہ تصویر ڈزنی لینڈ کی تھی۔ سارے کلاس میں خوشی اور جوش کی لہر دوڑ گئی۔ مہمان نے کہنا شروع کیا: "اس تصویر سے آپ ڈزنی لینڈ کے بارے میں کچھ نہ کچھ اندازہ کر سکتے ہیں غالباً یہ دنیا کا سب سے بڑا پارک ہے۔ جو بچوں کی تفریح کے لیے بنایا گیا ہے۔ اس پارک کو دیکھنے کے لیے آپ کو کئی گھنٹے صرف کرنا پڑیں گے۔ اگر آپ کشتی پر سوار ہونا، یا موٹر پر بیٹھنا چاہیں گے تو آپ کو پورا ایک دن اس پارک میں گزارنا پڑے گا!"

حقیقت میں ڈزنی لینڈ میں چار الگ الگ پارک ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ "۱۔ پریوں کی دنیا۔ ۲۔ مہموں کی دنیا۔ ۳۔ سرحد کی دنیا اور ۴۔ آنے [illegible] دنیا ان بچوں کے لیے ہے جو پریوں کے بارے میں خیالی کہانیاں سننا پسند کرتے ہیں۔ اس دنیا میں سوئے ہوئے حسن، سفید برف، جوتے میں رہنے والی عورت۔ اور دوسرے بے شمار مکانات ہیں"

"پریوں کی دنیا میں آپ ایلس کے ساتھ چائے پارٹی میں شریک ہو سکتے ہیں۔ یہاں آپ کو بڑے بڑے کپ اور ساسر نظر آئیں گے۔ یا آپ چوری چوری اس قلعہ میں جا سکتے ہیں جہاں جانے کی ممانعت ہے۔ اور وہاں جاکر آپ سوئی ہوئی خوب صورت لڑکی کو دیکھ سکتے ہیں۔ مہموں کی دنیا کی سیر کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ کشتی میں بیٹھ کر دریا کی سیر کریں۔ اس دریا میں بے شمار گرمچھ ہیں۔ آپ اس دریائی سفر کو کبھی نہیں بھولیں گے۔ سرحدوں کی دنیا میں کاؤ بوائے (COWBOYS) اور ریڈ انڈینس کی زندگی دکھائی گئی ہے۔ سرحدی پارک بالکل ایسا ہی بنایا گیا ہے جیسا آپ فلموں میں سرحدی شہر دیکھتے ہیں۔ جو لوگ سرحدوں کی دنیا میں کام کرتے ہیں ان کا لباس بھی کاؤ بوائز جیسا ہی ہوتا ہے۔ ان کے پاس بندوقیں بھی ہوتی ہیں لیکن یہ سب بچوں کو خوش کرنے کے لیے ہوتا ہے بلکہ لکڑی کی بنی ہوئی مصنوعی بندوقوں سے گولیاں چلنے لگتی ہیں۔ کاؤ بوائز آپس میں لڑ پڑتے ہیں۔ ایک دوسرے پر حملہ کر دیتے ہیں۔ کاؤ بوائز کے پرستار ایسی لڑائیاں دیکھنا پسند کرتے ہیں۔

یہ لڑائیاں مصنوعی ہوتی ہیں۔ اور بچوں کو خوش
کے لیے لڑی جاتی ہیں۔"
"تھوڑے سے پیسے خرچ کرکے آپ خچر پر سوار
۔نے کی تلاش شروع کرسکتے ہیں جیسا کہ پرانے
ہیں لوگ کرتے تھے۔ اس قدیم زمانے سے ہم نئے
ن طرف جاتے ہیں۔ خلار کے زمانے کی طرف
ے "کل" کی طرف۔ اس دنیا میں آپ ایک
۔ راکٹ میں سوار ہو کر چاند پر جا سکتے ہیں۔
سفر میں آپ زمین سے دور نہیں ہوتے،
جیسے ہی آپ راکٹ میں سوار ہوتے ہیں کچھ
لو نہایت چالاکی سے حرکت دی جاتی ہے
سوس کرنے لگتے ہیں کہ آپ خلا میں سفر

لر آپ پانی کے نیچے سفر کرنا پسند کرتے ہیں
ب میرین میں سوار ہو سکتے ہیں۔ اور
بتا ہوا شہر۔ جل پریوں کی دنیا۔ اور
د غریب جانور دیکھ سکتے ہیں جن کا ذکر
مرف کتابوں ہی میں ہے۔
، کی دنیا کے پارک میں آپ پرانے
لوگوں کی طرح ریلوں اور بسوں میں سفر
گے۔ آپ یہاں مونوریل سے سفر کریں
ن تیز رفتار آرام دہ اور محفوظ ہوتی ہے
نی لینڈ کے بارے میں چند باتیں۔ جو
ٹانا چاہتا تھا۔ ان کے علاوہ بھی وہاں

ہزاروں چیزیں ہیں جن پر یقین کرنے کے لیے
ضروری ہے کہ آپ انھیں جو دیکھیں۔"
امریکی مہمان نے اپنی تقریر ختم کی تو بہت
سے لڑکوں کو محسوس ہوا کہ وہ خواب کی دنیا سے
ہو کر آتے ہیں۔ جانے سے پہلے جیمس پاور نے
ڈزنی لینڈ کی تصویر ہماری کلاس کو تحفہ کے طور
پر دی۔ کلاس کے تمام لڑکوں نے نہایت دلچسپی
کے ساتھ ان کی باتیں سنی تھیں۔ یہ تصویر گویا
اس کا انعام تھی۔

بچوں کی کتابیں

چوہوں کی کانفرنس		۴۵/-
پاک کہانیاں	اول	1/20
"	دوم	1/15
پھندوں کا ایکا		۴۰/-
پوری جو کڑاہی سے نکل بھاگی		۳۵/-
تابیل جان		۳۰/-
ترکوں کی کہانیاں		۵۰/-
جنگل کی بلی		۲۵/-
چقماق کی ڈبیا		۳۰/-
چھوٹی لالٹین		۳۱/-

سلسلہ

اور

محترمہ آصفہ مجیب

مجیب صاحب کے والد جناب محمد نسیم صاحب رئیشن
ن تھے۔ ان کے تینوں بیٹے وسیم صاحب حبیب صاحب مجیب
حب۔ کیمبرج اور آکسفورڈ سے تعلیم پاکر لوٹے تو پرانے
یقوں میں ردو بدل شروع ہوگئی۔ نئی روشنی پھیلی بیویوں
پردہ چھوڑا۔ محترم نسیم صاحب کے کوئی اختلاف نہیں کیا۔
یلن حد سے زیادہ آزادی کبھی پسند نہیں تھی۔ انھوں نے
نی بیٹیوں کو سختی سے منع کیا کہ کھلی آستینوں کا بلاوز پہن کر
باہر نہ نکلنا۔ وہ باہر جاتیں تو
ساری پر ریشمی کوٹ، سردی
میں گرم کوٹ پہنتیں۔ اسی
طرح میں بھی لکھنؤ میں اور
دلی میں کپڑوں پر کوٹ یا
کلوک پہن کر۔ سر پر ریشمی یا
ململ کا رومال ڈال کر باہر
نکلتی۔ شروع میں ہمارے
خاندان میں جن بیویوں نے
پردہ چھوڑا۔ وہ اسی طرح جاتیں
لیکن سندیلہ میں، میں گہرا پردہ
کرتی تھی۔ میرے بزرگوں میں میرے بہت شفیق چچا محترم
چودھری عبدالباسط صاحب رئیس سندیلہ پرانے خیال اور
وضع کے تھے۔ جب وہاں جاتی حسب دستور اسٹیشن پر فینس آتی
ریل کے ڈبے کے پاس لگائی جاتی۔ دو آدمی جلدی سے
دونوں طرف پردہ تانتے جب میں اتر کر فینس میں بیٹھ جاتی۔
وہاں وہی پرانا رواج تھا۔

بات میں بات نکلتی ہے جی چاہتا ہے اس سلسلے میں
آپ کو ایک پرانا واقعہ سنا دوں۔ ۱۹۳۳ء میں قرول باغ میں
طبیہ کالج کے ایک طرف میدان پڑا تھا۔ اس سے ذرا ہٹ کر
ہمارا مکان تھا۔ اور کئی مکان پاس پاس پر بنے تھے ایک سڑک
سامنے سے نکل کر طبیہ کالج کی طرف مڑ جاتی تھی ہمارے
مکان میں گولائی لیے کمروں کے آگے اچھا سا برآمدہ تھا۔
سامنے چھوٹا سا کمپاونڈ، جس میں ایک طرف مجیب صاحب
جب ذرا فرصت ملتی باغبانی
کرتے گلاب لگاتے۔ انھیں
باغبانی اور گلابوں کا ہمیشہ
سے شوق رہا ہے۔ کچھ ترکاری
بوتے۔ مکان میں دو پھاٹک
تھے۔ سامنے والے پھاٹک کے
دونوں طرف انھوں نے
ہارسنگار کے دو پیڑ لگائے
تھے جب پھول لیتے تو بھینی
بھینی خوشبو پھیلتی اور بہار
آجاتی۔ دوسرے پھاٹک کے
پاس نہ معلوم کب سے پیپل کا پیڑ لگا تھا۔ صبح تڑکے اکثر عورتیں
لٹیا میں جل لے کر آتیں اور پیڑ جاتیں کمپاونڈ کی دیوار تو اونچی
تھی مگر پھاٹک میں سلاخیں تھیں جس سے سڑک نظر آتی۔۔۔۔
میں گرمی، برسات میں یا سردی میں دھوپ کی وجہ سے برآمدے
میں نماز اور قرآن شریف پڑھتی۔ ایک دن صاحب کے ایک
دوست ملنے آئے انھوں نے مجیب صاحب سے کہا کہ ابھی

سب (جن سے ہم واقف نہیں تھے) ملے، وہ مجھ سے

.....

"صاحب یہ مجیب صاحب کی بیوی پردہ بھی نہیں کرتیں،
قرآن شریف بھی پڑھتی ہیں بہت تعجب ہے"...
نے پھاٹک کی طرف سے یا سامنے والے کسی گھر میں
کہہ نہیں سکتی کہیں سے مجھے پڑھتے دیکھا ہوگا۔ ان کا
تھا، وہ خود ہی مذہب کو نہیں سمجھے، پردہ چھوڑنے
نہیں ختم ہوجاتا۔ وہ پردہ جو ایک رواج بن گیا تھا،
ہیں۔ اسلام میں منھ اور ہاتھ پاؤں کا پردہ نہیں
مائش اور زیبائش نہ ہو بس یہی حکم ہے۔ یہ
تھا کہ میں شریعت کی حد سے آگے نہیں ہوں۔

ہاں بھئی اس زمانے میں دوستی بڑی پکی اور
۔ چاہے مذہب جدا جدا ہوں، ایک مسلمان ہو دوسرا
سائی کوئی ہو۔ ایک امیر ہو دوسرا غریب جس سے
ہ قائم ہوجاتا بہت مضبوط ہوتا۔ بڑے گہرے
تے پشتوں تک چلتے۔ عزیزوں کی طرح وہ
رکن ہوجاتے۔ دکھ سکھ کے ساتھی۔ مددگار
لیا کہ چاہے کسی کی بات دل کو نہ لگے......
بہرحال کہوتہ مانیں دوست جو کہہ دے دل میں
ول کا مزاج اور طبیعتیں ایک سی نہ ہوں جب بھی
سے کوئی فرق نہ پڑتا۔ یہ کچھ چیز ہی اور ہے۔
ہوتا کبھی ایک گرم، خوب نبھ گئی دونوں میں۔
م نسیم صاحب گرم مزاج کے تھے۔ ان کے ایک

بہت گہرے دوست امتیاز علی صاحب ٹھنڈے مزاج کے۔ نسیم
صاحب کو اکثر اپنے بیٹوں پر جب ان کے خلاف کوئی اکثر کچھ لگا
دیتا بہت غصہ آتا چاہے کوئی کتنا ہی سمجھائے۔ اترتا ہی
نہیں تھا۔ سب پریشان ہوجاتے۔ لیکن اگر امتیاز علی صاحب
آجاتے، ان کی یہ کیفیت دیکھتے۔ بپھرے ہوئے شیر کی طرح
ٹہل ٹہل کر یا کھڑے بیٹھے دل میں جو کچھ ہوتا جب سب بھڑاس
نکال لیتے اور وہ سر جھکائے سنتے رہتے۔ پھر ٹھنڈے ٹھنڈے
لڑکوں کی حمایت اور طرف داری میں کوئی ایسی بات دل
لگتی کہہ دیتے کہ ایک مرتبہ نظریں اٹھا کر وہ دوست کا چہرہ
دیکھتے جس پر محبت شفقت خلوص کی شعاعیں سی چمکتی ہوتیں
سارا غصہ ایک دم ہوا ہوجاتا۔ بادل چھٹ جاتے۔ محبت اور
پیار ٹپکنے لگتا۔ چپکے سے کہتے۔ "کہتے تو سچ ہو"
لڑکے ان کے بڑے احسان مند تھے۔ بہت سے
معاملات وہ سلجھا دیا کرتے۔ وہ فرشتۂ رحمت معلوم ہوتے۔
میرے والد صاحب، چچا صاحب وغیرہ کے کتنے ایسے ہی
دوستوں کی مثالیں ہیں۔
جب دو دوست آپس میں مل کر بیٹھتے یہی ان کی عادت
ہوتی۔
اکثر رئیسوں کے یہاں ایک کوئی ایسا بھی ہوتا جس کا
سب مل کر مذاق اڑایا کرتے۔ شام کو قاعدہ تھا کہ سب دوستوں
کی بیٹھک ہوتی۔ پھر چھیڑ شروع ہوتی۔ اس پر سب فقرے
کستے ہر طرف سے بوچھار ہوتی۔ پانی سر سے اونچا ہوجاتا، اور
اسے اتنا جوش آتا کہ بہت ہی بے تکی بھاڑنے لگتا۔ گالیاں
بکتا۔ ساری محفل ہنستے ہنستے لوٹ جاتی پیٹ میں بل پڑ جاتے

[illegible] بہت بھلے قاعدے اور اصول تھے۔
[illegible] تعلیم [illegible] اور بناوٹ تھا۔ مروت وضع داری
[illegible] اس چھوٹے بڑے اور برابر والوں سے میل جول کے
[illegible] یہاں تک کہ القاب بھی مقرر تھے۔ بیٹے کو "نور چشم"
[illegible] باپ کو" مد ظلہ العالی (ہمیشہ آپ کا سایہ رہے)
[illegible] سے نکلتے تھے ان کی طبیعت کے آئینہ دار ہیں۔
[illegible] تہذیب کی جھلک ملتی ہے۔ جو لکھا پڑھا ہوگا۔ اس
[illegible] پڑھتا ہوگا۔

[illegible] ستاد کا بہت بڑا مرتبہ مانا جاتا۔ ان کی قدر دلوں
[illegible] ہوتی۔ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے پھر استاد
[illegible] چاہتے تھے۔ اتنا کہ بس چلے تو علم گھول ہی کر شاگرد
[illegible]

[illegible] ماں باپ اور استادوں سے جو اپنی کوششوں اور
[illegible] پھر اچھی اچھی باتیں سیکھتے ان سے جو فیض روشنی حاصل
[illegible] ان کی سیرت اور کاموں میں سورج کی کرن کی
[illegible] اور پھولوں کی خوشبو کی طرح مہکتی۔ ہیرا موتی اور
[illegible] چاند تارے بن جاتے اور ان سے بھی اچھے۔

پھول کھلے ہیں گلشن گلشن
لیکن اپنا اپنا دامن،

[illegible] اور بھی ہیں مگر عید کی بات ہی نرالی ہے۔
[illegible] کی بات ہوتی تو عید سے تشبیہ دیتے ہیں۔

بہت سے لوگ بیٹھے ہوتے ہیں۔ "آہا آج عید کا چاند دکھ گیا"
عید مبارک" "عید ملنا" ایسے الفاظ بہت خوشی کے موقعوں میں
بولے جاتے ہیں۔ لکھے جاتے ہیں۔ رمضان شریف کی بہت
سی رحمتوں کے ساتھ یہ قدرت کا بڑا انعام اور اس کی دین
ہے۔ عید کا چاند خوشیوں کا پیغام لے کر آتا ہے۔ جس کی
ایک جھلک دیکھنے کے لیے ہزاروں آنکھیں آسمان کی ایک سمت
ایک ساتھ ٹکٹکی باندھے لگی ہوتی ہیں۔ اس باریک کمان سے
ہلال (چاند) میں نہ معلوم کتنے جلوے اور مسرتیں چھپی ہیں۔
دلوں کی کتنی دھڑکنیں اس کے استقبال اور پیشوائی کی منتظر
جہاں دکھائی دیا خوشی کی ایک لہر بجلی کی سی تیزی سے
ادھر سے ادھر دوڑ جاتی ہے۔ کئی لحاظ سے اس کی بڑی قدر
ہے۔ روزہ داروں کے دل سے اس دن کی سچی خوشی پوچھیے۔
جو انسان کو کوئی بڑا فرض انجام دے کر ملتی ہے۔ پھر اسے
بوڑھے بچے جوان، امیر غریب سب مل کر مناتے ہیں صف بہ
صف، شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر لاکھوں آدمی خدا کی عبادت
کرتے ہیں۔ خدا ہی کے سامنے سر جھکاتے ہیں۔ اس کے بعد
آپس میں گلے ملتے ہیں۔ اس وقت امیر غریب کا فرق مٹ
جاتا ہے۔ "ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز۔ نہ کوئی
بندہ رہا نہ کوئی بندہ نواز" اسلام نے جو تعلیم دی ہے کہ
انسان انسان سب برابر ہیں اسی کا روشن نمونہ سامنے آتا ہے
محبت اور یک جہتی کا سبق ملتا ہے۔ اور [illegible]
[illegible]
[illegible]

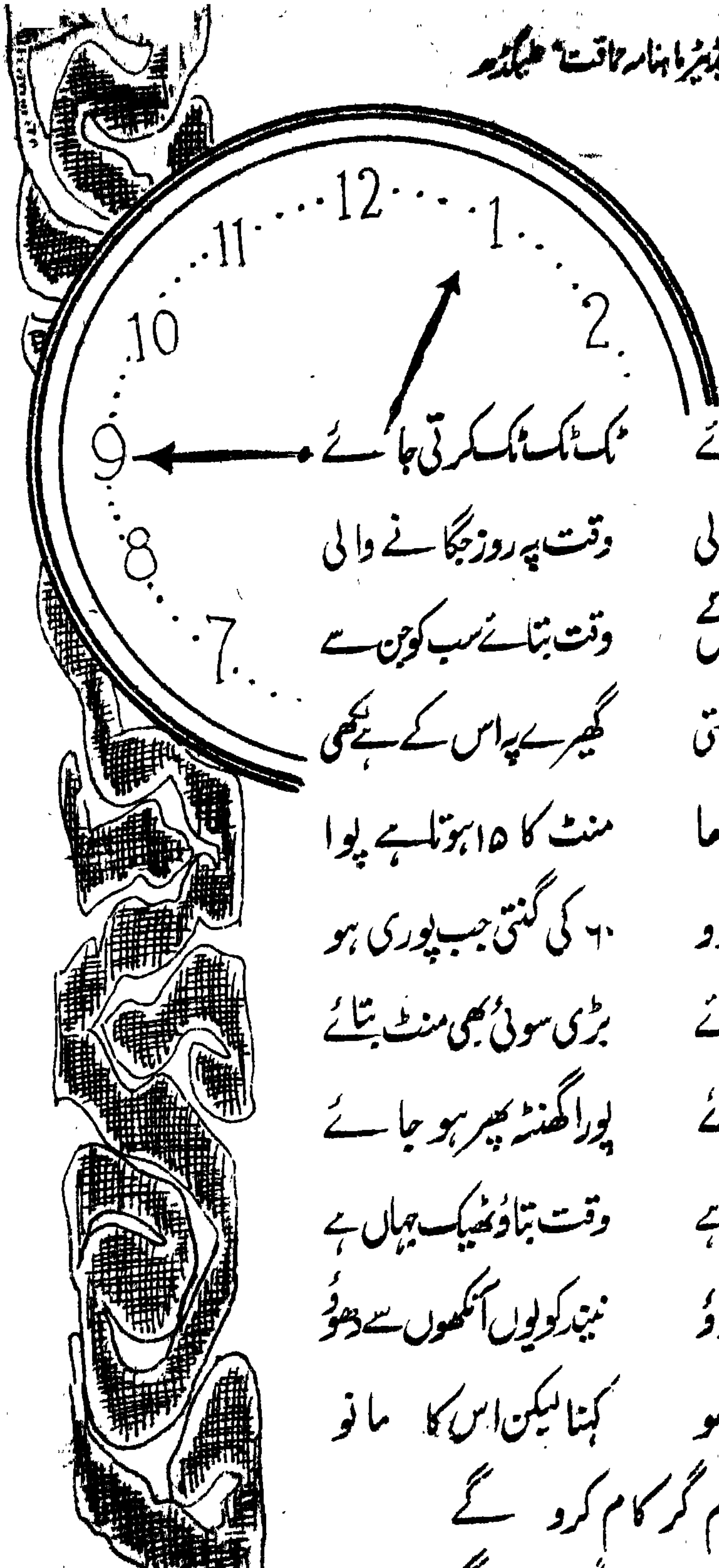
تھرے کپڑے پہنتے ہیں عیدی کیسا کھلونے وغیرہ
۔ آئیے اب ذرا دیکھیں پرانے دنوں میں کیا کیا ہوتا تھا۔
وہ رونق نظر آتی ۔ اور بہت اہتمام ہوتا تھا ۔ پورا
طرح گزرتا کہ افطاریاں پک رہی ہیں غریبوں کو دی
۔ مسجدوں میں بھیجی جاتیں۔ خاص خاص دوستوں
کو کشتیوں میں لگا کر بھیجی جاتیں۔ افطار کی دعوتیں اور
روزہ کشائی ہوتی ۔ بعض گھروں میں تراویح ہوتی
کے والد صاحب کے یہاں ان کے کمرے میں گھر
ملازم سب جمع ہو کر تراویح پڑھتے ۔ پاس ہی پردہ
خواتین جماعت میں شریک ہوتیں ۔ رمضان سے
کی تیاریاں شروع ہو جاتیں ۔ جتنے دن قریب آتے
زور سے ہونے لگتیں ۔ کپڑے سلتے ۔ غریبوں اور نوکروں
دیے جاتے ۔ کچھ عورتیں اپنے گھروں میں سویاں بٹتی
یا تخت پر لکڑی کا تختہ رکھ لیتیں ۔ اس پر میدے کی
دونوں ہاتھوں سے بٹتیں ۔ نیچے دونوں طرف برتن میں
لچھے بنتے چلے جاتے ۔ بعض تو خوب مہین مہین بٹتی
بازار میں ملتی ہیں ۔ بیٹے بہوئیں جو کہیں دور رہتے
کر دو ایک دن پہلے عید منانے بزرگوں کے پاس
مہندی لے کر آتی اسے انعام دیا جاتا ۔ نائنیں
مہندی پیس کر رکھ دیتیں ۔ بہو بیٹیاں لگاتیں ۔ منہارن
چوڑیوں کا ٹوکرا بھر کر لاتیں سب رنگ برنگی
تیں ۔ پہلے منہاریاں ان کو سلام کرتیں ۔ وہ بہو بیٹی
منہارنوں سے کہتیں اپنی پسند
کے چوڑیوں کا مول نہیں ہوتا تھا ۔ منہارن

منہ مانگے دام پاتی کیونکہ سہاگ کی چیز میں مول تول کو
اچھا نہ سمجھا جاتا تھا ۔ وہ بھی نہایت مناسب قیمت بتاتی کہ
زیادہ ملتی تو خوشی سے لے لیتی ۔ اس کا انعام ہوتا ۔ عید کا چاند
ہو جاتا تو بال بچے، بہو بیٹے بیٹیاں بزرگوں کو سلام کرتیں ۔ وہ
لوگ خوش ہو کر دعائیں دیتے ۔ ملازم سلام کو حاضر ہوتے
مبارک باد اور دعائیں دیتے ۔ بعض جگہ منہارن اور نائنیں
بیویوں کو آئینہ دکھاتیں ۔ اس کا خوشنمائی سے یہ مطلب نکلتا کہ
"کل آپ سے انعام لیں گے" کپڑوں کی تیاری تو پہلے سے
ہوتی مگر کچھ نہ کچھ کسر رہ جاتی ۔ کسی کے دوپٹے میں کرن نہیں
لگی ہے پاجامے میں بیل بہت نہیں ٹکی ۔ کسی کی قمیص میں
ابھی تک بٹن ہی نہیں لگے ۔ آدھی رات تک سلائی ٹکائی ہوتی
رہتی ۔ صبح تڑکے عید کی نماز میں جانے کی تیاریاں ہوتیں ۔
مرد نہا کر نئے کپڑے پہنے عطر لگاتے بچے بھی جلدی جلدی تیار
کر دیے جاتے ۔ سب سویاں کھا کر عید گاہ جاتے ۔ جانے سے
پہلے غریبوں محتاجوں کو گیہوں پیسے وغیرہ دیے جاتے ۔ نماز
کے بعد میل ملاقات کا سلسلہ چلتا ۔

(باقی آئندہ)



جناب غازی ادیب۔ ایڈیٹر ماہنامہ حاذق، علیگڑھ



گھڑی

ٹن ٹن ٹن گھنٹہ بجائے — ٹک ٹک ٹک کرتی جائے
وقت کا ساز بجانے والی — وقت پہ روز جگانے والی
چھوٹے بڑے دو ہاتھ ہیں اس کے — وقت بتائے سب کو جن سے
ایک سے بارہ تک ہے گنتی — گھیرے پہ اس کے ہے لکھی
۶۰ کا گھنٹہ ۳۰ کا آدھا — منٹ کا ۱۵ ہوتا ہے پوا
۵ دفعہ جب ۱۲ کو جوڑو — ۶۰ کی گنتی جب پوری ہو
چھوٹی سوئی گھنٹہ سمجھائے — بڑی سوئی بھی منٹ بتائے
بڑی سوئی جب بارہ بجائے — پورا گھنٹہ پھر ہو جائے
چھوٹی سوئی دیکھو کہاں ہے — وقت بتاؤ ٹھیک یہاں ہے
کہتی ہے اپنا وقت نہ کھوؤ — نیند کو لوں آنکھوں سے دھوؤ
میز پہ رکھو ہاتھ پہ باندھو — کہنا لیکن اس کا مانو

وقت پہ تم گر کام کرو گے
دنیا بھر میں نام کرو گے

....

ربی اے



اء کا پھیلاؤ اور ستارے

صاف راتوں میں اکثر آپ نے ستاروں کو دیکھ کر کیا ہوگا۔ آپ سے پہلے بھی ہزاروں بچوں نے ستاروں میں سوچا ہوگا۔ ہر زمانے کے بڑوں نے بھی ستاروں تعجب کیا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا تو چاند سورج ستاروں روپ دے دیا۔

آج کے زمانے کے بڑے بھی ستاروں کے بارے کچھ سوچتے رہتے ہیں۔ مگر پہلے زمانے کے مقابلے ی بات ہوگئی۔ اب ان کا یہ سوچنا سائنس کی بنیادوں ائنس کے اصولوں پر ہے۔ اس لیے وہ بہت کچھ ہیں اور کرتے جا رہے ہیں۔

آج ستاروں کی تلاش میں امریکہ کے ماؤنٹ پلومر دوربین جیسی اور کئی دوربینیں ہر وقت آسمان کی لئے تاکتی رہتی ہیں۔ ماؤنٹ پلومر کی دوربین کے دو سو انچ ہے۔ ایک صاف رات کو آسمان پر آپ تقریباً چار ہزار ستاروں کو دیکھ پاتے ہیں۔ اس دوربین سے زیادہ تارے بیک وقت دیکھے جاسکتے نظر محدود ہے۔ اور یہ دوربین کھربوں میل تک اک لیتی ہے۔

نیا کے مختلف ملکوں کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر یا رصدگاہیں بن گئی ہیں۔ سینکڑوں سائنسداں

رات کے اندھیروں میں یہاں دوربینوں، لیزر شعاعوں LEASER اور ریڈیو کے آلوں کی مدد سے ستاروں کی دنیا کی "سیر" کرتے رہتے ہیں۔ ستاروں کا نظارہ بے شک دلچسپ ہوتا ہے۔ لیکن راتوں کی نیند قربان کر کے لگاتار آسمان کو دیکھتے رہنا کافی صبر چاہتا ہے۔ سچا شوق اور دلی لگن رکھنے والے ہی اسی امتحان میں پورے اترتے ہیں۔ اور انھی کے طفیل میں ہمارا علم آگے بڑھتا ہے اور ترقی کرتا ہے۔

تارے کتنی دور تک پھیلے ہوئے ہیں؟

اس کا آخری جواب ابھی تک کوئی نہیں دے سکا۔ (شاید کبھی نہ دے سکے) کیوں کہ کائنات کی وسعت، کائنات کا پھیلاؤ اتنا زیادہ ہے، اتنا زیادہ ہے کہ اس کے بارے میں معلوم کر کے آپ کا دماغ چکرانے لگے گا۔ اچھا بتائیے روشنی کی رفتار فی سیکنڈ بھلا کیا ہوگی؟ ارے آپ تو چپ ہیں۔ تو سنیے جناب روشنی کی رفتار ایک سیکنڈ میں ہے۔ ۱،۸۶،۲۶۴ میل۔ یاد رکھیے یہ ایک سیکنڈ کی بات ہے۔ اس رفتار سے روشنی چلتی ہے تو ۶۰ سیکنڈ یعنی ایک منٹ، پھر ایک گھنٹے، ایک دن، ایک ماہ اور پھر پورے ایک سال میں کتنی دور چلے گی؟ حساب نہیں لگا سکتے نا! پر کچھ سرپھروں نے حساب لگایا ہے۔ سال بھر میں روشنی جو فاصلہ طے کرے گی وہ ہوگا ۔ ۶،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰،۰۰۰ میل۔ خلا کا پھیلاؤ

آسمان کی وسعتوں کو ناپنے کے یہ اتنا فاصلہ ایک اکائی مان لیا گیا ہے۔ اتنے فاصلے کو ایک نوری سال (LIGHT YEAR) کی دوری کہتے ہیں۔

اچھا تو اس بات کو ذہن میں رکھیے اور پھر سوچیے کہ روس کے پروفیسر روڈلف منکووسکی نے ایک ایسی کہکشاں (اربوں ستاروں کا مجموعہ) کا فوٹو کھینچا ہے جو زمین سے ...... ۶ نوری سالوں کی دوری پر ہے۔ ستاروں کے مشاہدے ہیں سائنسداں اب اس فاصلے سے بھی آگے بڑھ چکے ہیں۔ سچ مچ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اور سوچنے سمجھنے کی طاقت جواب دے جاتی ہے۔ اسی پر بس نہیں اس کے آگے ابھی بہت کچھ ہے۔ فرٹیڈ ہوئل کا کہنا ہے۔ "ستاروں کے بارے میں جتنا علم ہم کو ہونا چاہیے۔ شاید یہ اس کا دو فیصدی ہے۔"

کیا یہ سارا کارخانہ ہمارے سورج کے گرد پھیلا ہے؟

جی نہیں! گو ہمارا سورج ایک بہت بڑی چیز ہے اس کے ....۳۳۹۳ میل کے رقبے میں ہماری پوری زمین جتنی تقریباً ۱۳ لاکھ دنیائیں سما سکتی ہیں۔ لیکن یہ سورج پوری کائنات میں ریت کے ایک ذرہ سے زیادہ کچھ نہیں۔ پوری کائنات میں ایسے اور اس سے بڑے اربوں سورج اور ہیں جن کے گرد سیارے گھومتے رہتے ہیں۔ تو گویا اس طرح کائنات میں ہمارے نظام شمسی جیسے ستاروں کے اربوں مجموعے پھیلے ہیں۔

ہمارے سورج کے گرد گھومنے والے تو صرف چالیس سیارے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ شہاب ثاقب (ٹوٹنے والے تارے) اور کچھ پچھل تارے ہیں۔ اگر قطب شمالی پر سے چاند تاروں کی رفتار کا مشاہدہ کیا جائے تو ہمارا سورج اور بھی ستارے گھڑی کی سوئیوں کی رفتار سے مخالف سمت میں گھومتے نظر آئیں گے۔ ہمارے نظام شمسی کا مرکز ہمارا سورج ہے۔ سورج خود اپنی کیلی پر اسی سمت میں گھومتا رہتا ہے اور باقی تمام سیارے (ہماری زمین سمیت) اسی سمت میں اپنی کیلی پر لٹو کی طرح گھومتے ہوئے سورج کے چاروں طرف بیضوی دائرے میں اسی سمت میں گھومتے ہیں۔ یوں تو ہمارے نظام شمسی کی حدیں بھی اربوں میل تک پھیلی ہیں لیکن پوری کائنات میں یہ بالکل ایسی ہی ہے جیسے جہاز بنانے کے عظیم کارخانے میں جہاز کا ایک پرزہ بنانے والی فیکٹری

ہمارے نظام شمسی میں سورج کے گرد گھومنے والے نو سیارے ہیں اور ان کے نام ہیں (۱) مریخ (منگل یا MARS) ۲ مشتری (برہسپتی یا JUPITER) ۳۔ زحل (شنی یا SATURN) ۴۔ عطارد (بدھ یا MERCURY) ۵۔ زہرہ (شکر یا VENUS) ۶۔ نیپچون (NEPTUNE) ۷۔ پلوٹو (PLUTO) ۸۔ یورینس (URANUS) اور ۹۔ ہماری زمین یعنی دنیا۔

عطارد سورج سے سب سے نزدیک ہے۔ یہ سورج سے ۵۰،۶ لاکھ کلومیٹر دور ۴۸ کلومیٹر فی سیکنڈ کی رفتار سے بیضوی دائرے میں یہ سورج کے گرد اتنی سست رفتار سے گھومتا ہے کہ وہاں کا ایک دن ہماری دنیا کے ۸۸ دنوں کے برابر ہوتا ہے۔ اتنی ہی دیر میں یہ

ںا ایک چکر پورا کر لیتا ہے ۔ زہرہ زمین کا پڑوسی
ے سے اپنی جسامت اور شکل میں بہت حد تک
زمین کے برابر ہی وہاں رات دن ہوتے ہیں ۔
ے ایک چکر میں اس کو ۲۲۵ دن لگتے ہیں ۔ یہ بہت
ارہ ہے ۔ زمین ۱۲۷۵۰ کلومیٹر قطر کا ایک گولا
ج سے ۹ کروڑ میل کی دوری پر ۱۸ میل فی سیکنڈ
تو بیس گھنٹے میں اپنی کیلی پر اور ۳۶۵ دن میں
د ایک بار گھومتا ہے ۔ مریخ زمین کا دوسرا
س کا قطر ۶۸۲۸ کلومیٹر اور سورج سے
۲۲۷۹۸۰ کلومیٹر ہے ۔ ۶۸۷ دن میں یہ
ا چکر لگاتا ہے ۔ زمین کا ایک سیارہ چاند ہے ۔
ریخ کے دو سیارے (چاند) فوبوس اور
ان سیاروں کی روشنی سرخ سی ہوتی ہے ۔
ی فضا بھی ہے اور اسی وجہ سے وہاں کسی نہ
ی کی توقع ہے مشتری کا قطر ۱۴۲۸۰۰ کلومیٹر
ایک سال (سورج کے گرد ایک چکر) زمین
؛ سال کے برابر ہے ۔ زحل مشتری سے چھوٹا
ہی باتوں میں مشابہ ہے ۔ اس کا قطر
ہے ۔ سورج سے کافی دور ہونے کی وجہ سے
ٹھنڈا ہے ۔ اس کے گرد گیس کے بادلوں اور
ھیرا بنا رہتا ہے ۔ جو دس میل کے قریب موٹا
) چوڑا ہے ۔ یورینس نیپچون اور پلوٹو ہمارے
آخری سرے پر بہت دور واقع ہیں ۔ ۔ ۔
ے ان کی چمک بھی بہت کم ہے ۔ یورینس سورج سے

۲۶۶۶ کلومیٹر ، نیپچون ۴۴۹۶۰۰۰ کلو
میٹر اور پلوٹو ۵۹۰۰۰۰۰ کلومیٹر دور ہے ۔ بغیر دوربین
کے پلوٹو دیکھا نہیں جاسکتا ۔ اسی لیے اس کا پتہ ۱۹۳۰ء میں
لگ سکا ۔ جس طرح زمین کے گرد چاند ایک سیارہ ہے اسی
طرح باقی آٹھ سیاروں کے تیس سیارے ہیں ۔

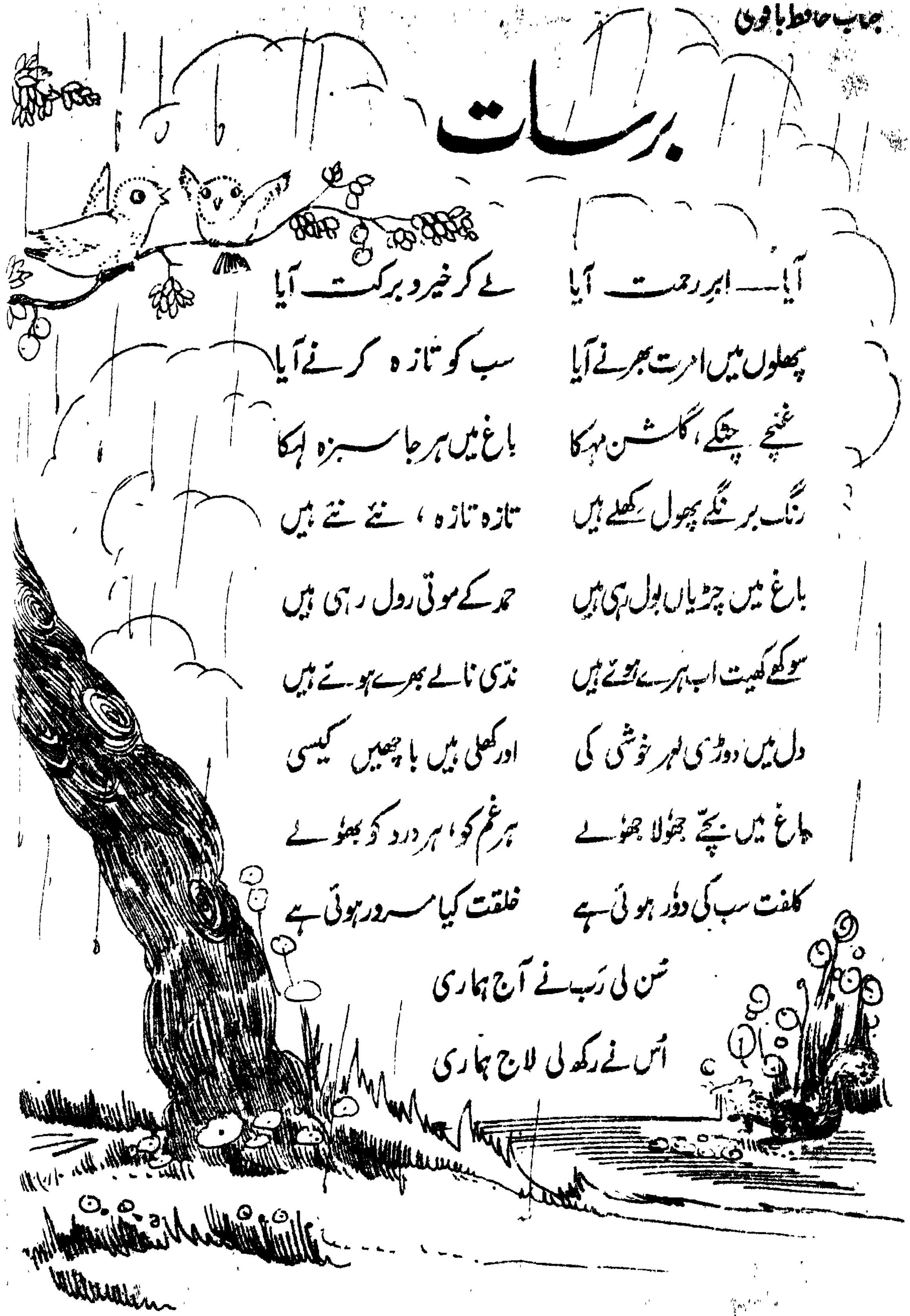
یہ سب اور کائنات کے باقی ستارے اور سیارے
ایک ہی مادہ سے بنے ہیں ۔ یوں تو یہ سب ہی سیارے ہیں (زمین
بھی ایک سیارہ ہے) مگر چھوٹے بڑے ہونے کی وجہ سے ،
کسی بڑے سیارے کے گرد گھومنے کی وجہ سے ہم ان کو چاند ،
سورج اور سیاروں کے مختلف نام دے دیتے ہیں ۔ ہمارے
نظام شمسی میں ان نو ستاروں اور اکتیس سیاروں کے علاوہ
۱۸ دم دار تارے ۔ لاکھوں شہاب ثاقب اور چھوٹے چھوٹے
ستاروں کے چھوٹے بڑے گروہ اور بھی ہیں ۔ شہاب ثاقب
سٹر کے ذرات سے لے کر ایک درمیانی چٹان تک کے سائز
کے ہوتے ہیں اور چھوٹے تاروں میں زیادہ سے زیادہ بڑا ملدا
صرف ۴۹۰ میل کے قطر کا ہے) ان کو ہم اپنے نظام شمسی میں
اس لیے گنتے ہیں کہ ان سب کا مرکز ہمارا سورج ہے ۔
اور یہ ہمارے نظام شمسی کے اصولوں کے مطابق گردش میں
ہے ۔ (بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

ایک طالب علم کی کہانی

مدعولی صاحب کی یہ کتاب دل چسپ بھی ہے اور
سبق آموز بھی جس سے بچے اور بڑے سبھی کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں
اس کتاب پر مرکزی سرکار سے انعام بھی مل چکا ہے ۔ قیمت ۲/-

جناب حافظ باقی

برسات



آیا — ابرِ رحمت آیا	لے کر خیر و برکت آیا
پھلوں میں امرت بھرنے آیا	سب کو تازہ کرنے آیا
غنچے چٹکے، گلشن مہکا	باغ میں ہر جا سبزہ لہکا
رنگ برنگے پھول کھلے ہیں	تازہ تازہ، نئے نئے ہیں
باغ میں چڑیاں بول رہی ہیں	حمد کے موتی رول رہی ہیں
سوکھے کھیت اب ہرے ہوئے ہیں	ندی نالے بھرے ہوئے ہیں
دل میں دوڑی لہر خوشی کی	اور کھلی ہیں باچھیں کیسی
باغ میں بچے جھولا جھولے	ہر غم کو، ہر درد کو بھولے
کلفت سب کی دور ہوئی ہے	خلقت کیا مسرور ہوئی ہے

سن لی رب نے آج ہماری
اس نے رکھ لی لاج ہماری

جناب منوہر پرشاد ماتھر ایڈووکیٹ

کبوتر کا گھونسلا



لی چڑیا جب کبھی کوئل سے ملتیں تو یہی رٹ لگاتیں
آپا دیکھو تو بئے کا گھونسلا کتنا خوب صورت ہے۔ کاش
م بھی ایسا گھونسلا بنا سکتے۔" کوئل تسلّی دیتی۔ "ہاں، ہاں بہن
بھی بات ہے، ہم بھی اپنا گھونسلا بئے جیسا بنانے کی کوشش
ریں گے۔" مگر دونوں میں سے کوئی بھی اتنا خوب صورت
ر آرام دینے والا گھونسلا نہ بنا سکا۔

ایک دن دونوں اسی قسم کی باتیں کر رہے تھے
نے میں کبوتر بھی آپہنچا۔ باتوں باتوں میں پھر یہی گھونسلے
ی بات چل نکلی۔ کبوتر نے کہا۔ "اجی خالہ بئے جیسا گھونسلا
یں بھی بنانا چاہتا ہوں۔ سنا ہے یہ گرم بھی رہتا ہے۔"

کوئل نے پوچھا۔ "تو پھر تم بناتے کیوں نہیں؟"
کبوتر روتی آواز میں بولا "کیا کروں مجھے تو بنانا
ں آتا۔"

چڑیا بولی "چلو تو ہم سب چچی بئے کے پاس چلتے ہیں۔ ان
یں گے کہ ہمیں گھونسلا بنانا سکھا دیں۔"

کوئل نے اپنی سریلی آواز میں جواب دیا "اس سے
چھا اور کیا ہوگا۔ چلو چلیں۔" اور تینوں چچی بئے کے پاس
ہنچ گئے۔ چچی ایک ٹہنی پر بیٹھی تھیں۔ تینوں نے سلام
یا تو چچی نے عمر و اقبال کی دعائیں دی۔ "جیتے رہو میرے
و کہو کیسے آنا ہوا؟"

چڑیا کچھ بولنے کو منہ کھول ہی رہی تھی کہ کبوتر میاں
بول پڑے۔ "چچی جان ہمیں آپ کا گھونسلا بہت اچھا لگتا
ہے، میری اچھی چچی جان! ہم سب کو ایسا گھونسلا بنانا سکھا
دو۔" چڑیا نے بھی ہاں میں ہاں ملائی کوئل نے بھی خوشامد
کی۔

چچی جان بھی ان کا شوق دیکھ کر راضی ہو گئیں۔
اپنی سونے کی عینک ٹھیک کر کے بولیں "اچھی بات ہے میرے
بچّو یہ کون سا مشکل کام ہے۔ ابھی سکھا دیتی ہوں۔"

یہ سن کر سب خوش ہو گئے۔ چڑیا نے کوئل کو دیکھا۔
کوئل نے کبوتر کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ چچی بیا بولیں۔
"پہلے دو تنکے لو۔ اور انھیں ایک کے اوپر ایک اس طرح
جماؤ۔ (یہ کہہ کر انھوں نے دونوں تنکوں کو جمایا) کبوتر بولا
"یہ تو بہت آسان ہے۔ یہ تو ہم بھی جانتے ہیں۔" چچی بیا
کی آواز گونجی "خاموشی سے سنو" اور چڑیا نے کبوتر کو ڈانٹ
کر خاموش کر دیا۔ چچی نے اپنی بات جاری رکھی "اور ان پر
اس طرح اور تنکے جماتے جاؤ (انھوں نے تنکے جماتے ہوئے
سمجھایا)

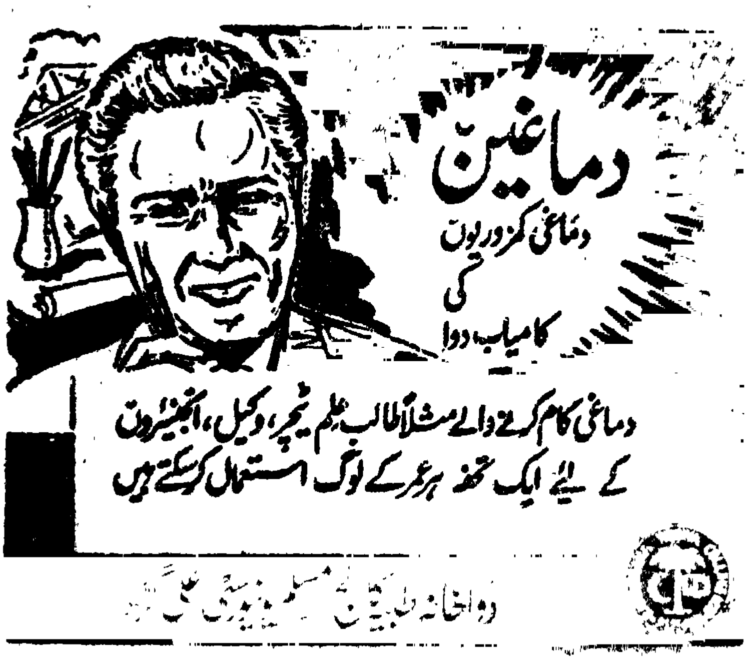
مگر کبوتر کہاں خاموش بیٹھنے والا تھا۔ "بھلا یہ کیا
مذاق ہے ارے چچی جان یہ سب تو ہم [illegible] طرح جانتے ہیں۔"
[illegible]

کوئل نے بھی کبوتر کو للکارا مگر اس نے سنی ان سنی کردی۔ اور بولا "چچی جان اپنے خاص گر سکھاؤ۔ یہ سب ہم جانتے ہیں"

کوئل نے کہا: "میاں کبوتر اگر تم کوئی چیز سیکھنا چاہتے ہو تو شروع سے سیکھنا چاہیئے۔ جلدی نہ کرو۔ جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔" غرض کبوتر میاں بڑی مشکل سے خاموش ہوئے۔ چچی بیا نے کوئل اور چڑیا کی طرف دیکھ کر کہا "تو میں کہہ رہی تھی کہ تنکوں کو اس طرح اکٹھا کرتے جاؤ۔" "اے لیجیے! کبوتر صاحب پھر بول پڑے۔ "میں بتاؤں اس کے بعد کیا کرنا ہوتا ہے چچی جان۔"

چچی کو غصہ آگیا بولیں "میاں کبوتر تم سب کچھ جانتے ہو تو میرے ہاں کیوں آئے ہو، جب مجھ سے زیادہ جانتے ہو تو ان بے چاروں کو سکھا کیوں نہیں دیتے؟"

اتنا کہہ کر وہ اڑ گئیں۔ کوئل اور چڑیا نے کبوتر کو ڈرایا دھمکایا۔ مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ "ارے وہ کوئی نئی بات تو سکھاتی ہی نہیں۔" مگر کوئل اور چڑیا چچی کے پیچھے پیچھے بھاگے گئے۔ چچی جان سے معافی چاہی۔ تب چچی جان نے دیکھا کہ کبوتر تو ان کے ساتھ نہیں ہے ان بچوں کو سکھا دینے میں کوئی نقصان نہیں۔ اس نے کچھ سکھا بھی دیا۔ تب سے کبوتر کو گھونسلا بنانا آج تک نہیں آیا۔ آج بھی کبوتر کے گھونسلے میں بس کچھ تنکے ہی ادھر ادھر پڑے ملتے ہیں۔ اور جب سردی کے دن آتے ہیں تو وہ چیختا چلاتا رہتا ہے۔ "ہائے میں نے گھونسلا بنانا کیوں نہیں سیکھا؟"



بچوں کی دلچسپ معلوماتی کتابیں

مذہب

آں حضرت الیاس احمد مجیبی ‎/۶۵ تاریخ ہند کی کہانیاں (سوم) مشتاق احمد اعظمی ‎/۸۰ میر انیس محمد حسین حسان ‎۱/۲۵

ارکانِ اسلام مولانا اسلم جیراجپوری ‎/۵۰ " " (چہارم) ‎/۹۵ ہماری پارلیمنٹ کیلاش چند ‎۱/۵۰

چار یار الیاس احمد مجیبی ‎۱/۴۰ بڑے دادا کی کہانی پروفیسر عبدالغفور ‎/۵۶ کہانیاں

خلفائے اربعہ خواجہ عبدالحیٔ فاروقی ‎۱/۵۰ ٹیگور صفدر حسین ‎۱/۲۵ ابوخاں کی بکری ڈاکٹر ذاکر حسین ‎۲/۵۰

رسول پاک عبدالواحد سندھی ‎۱/۸۰ چٹانوں کی کہانی محمد امین ‎۱/۷۵ اس نے کیا کرنا چاہا۔ آصف مجیب ‎/۴۲

سرکار دو عالم محمد حسین حسان ‎/۲ خبر رسانی کے طریقے رفیعہ امین ‎/۸۵ پاک کہانیاں (اول) مقبول احمد ‎۱/۴۰

عقائد اسلام مولانا اسلم جیراجپوری ‎/۵۰ دہلی ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی ‎۱/۵۰ " " (دوم) ‎۱/۱۰

مسلمان بیبیاں اعجاز الحق قدوسی ‎/۷۵ دنیا کے بسنے والے بشیر حسین زیدی ‎/۷۵ تانتیا خاں محمد حسین حسان ‎/۴۰

نبیوں کے قصے خواجہ عبدالحیٔ فاروقی ‎/۱ سمندر کے کنارے سلطانہ آصف فیضی ‎۱/۴۰ ترکوں کی کہانیاں ‎/۶۰

اے رسول " ‎۱/۴۰ دنیا کے بچے محمد حسین حسان ‎/۸۰ چقماق کی ڈبیا برکت علی فراق ‎/۴۰

ارے نبی سید نواب علی رضوی ‎/۶۰ سماجی زندگی اوّل احمد الیس پٹیل اور چھوٹی لالٹین مشتاق احمد اعظمی ‎/۳۱

معلومات

غلام ابرار ‎/۵۶ چنبیلی محمد حسین حسان ‎/۵۰

بی کی کہانی مشتاق احمد اعظمی ‎۱/۲۵ " " دوم ‎/۸۰ چمپاوت کا آدم خور شیر محمد معین ‎/۳۵

طلسمِ عجائب خانہ) محمد حسین حسان ‎/۵۰ سوم ‎/۸۱ خرگوشِ شہزادے کا سر بن گیا کوشلیا ‎/۴۰

" (دوم) ‎/۴۰ چہارم ‎/۸۱ شہزادی گلنار پروفیسر عطاراللہ ‎/۴۰

" (سوم) ‎/۴۰ قدرت کے کرشمے ‎/۶۲ شیدا پروفیسر محمد مجیب ‎/۵۰

" (چہارم) ‎/۵۰ مفید معلومات دوم ‎/۷۵ لال مرغی عبدالواحد سندھی ‎/۵۰

ی کہانی علی احمد خاں ‎/۵۰ " " سوم ‎۱/۲۵ مزہ چکھائیں گے ‎/۳۵

اور مقناطیس کے کھیل ‎/۷۵ " " چہارم ‎۱/۵۰ ننھا منّو خورشید سلطانہ ‎/۳۰

ہندکی کہانیاں (اوّل) خجستہ سلطان ‎/۸۰ معلومات کی پانچویں کتاب ‎۱/۵۰

" (دوم) ضیاء الرحمٰن سمندر کے نیچے سلطان آصف فیضی ‎/۲

ملنے کا پتہ۔ مکتبہ جامعہ ملیہ۔ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵

سفید ریچھ

جناب عبداللطیف اعظمی



بھالوؤں کو دیکھ کر ہم لوگ آگے بڑھنے والے تھے، کہ نشاط نے روک کر کہا۔ ادھر دیکھیے کون لوگ آرہے ہیں؟ دیکھا تو انور، شبو، اور ساجدہ قدم بڑھاتے چلے آرہے تھے۔ اصل میں یہ لوگ آج ہی دہلی آئے تھے چونکہ تھکے ہوئے تھے۔ شاید ریل گاڑی میں سونے کا موقع بھی نہیں ملا تھا۔ اس لیے آتے ہی سو گئے تھے۔ اور ہم لوگ ان کو سوتا چھوڑ کر چلے آئے تھے۔ ان لوگوں نے آتے ہی شکایت کی۔ آپ ہمیں چھوڑ آئے جگالیا ہوتا پھر پوچھا کیا کیا دیکھ لیا ہے ہمیں بھی دکھایئے۔ میں نے کہا کہ ابھی ابھی ہم لوگ مختلف قسم کے بھالو دیکھ رہے تھے، چاہو تو ان کو ایک نظر دیکھ لو۔ ان میں کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اب میں سفید ریچھ کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔ تم لوگ اچھے موقع پر آگئے۔" آپ بتانا چاہتے تھے خالو جان! یا دکھانا چاہتے تھے؟" شبو نے سوال کیا۔" بھئی! دکھانا نہیں بتانا چاہتا تھا۔" میں نے جواب دیا۔" اصل میں سفید ریچھ برفانی علاقوں میں رہتا ہے۔ ہندوستان میں اتنی گرمی پڑتی ہے کہ وہ یہاں زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لیے ہندوستان کے کسی چڑیا گھر (زو) میں نہیں ہے۔"

" برف کے علاقوں میں، سنا ہے کہ کچھ ہو ہی نہیں پھر سفید ریچھ کھاتا کیا ہوگا پھوپھا جان" واجدہ نے سوال کیا۔

" گرمی اور بہار کے زمانے میں جب برف پگھلتی ہے تو اس کے پانی میں جنگلی بطخیں، مچھلیاں اور دریائی بچھڑے بہت ہوتے ہیں۔ سفید ریچھ کو پانی میں تیرنا خوب آتا ہے۔ اس لیے وہ آسانی شکار کر کے اپنا پیٹ بھر لیتا ہے۔ جب وہ پانی میں تیرتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی برف کا تودا ہے۔ مزے کی بات یہ کہ بطخیں، مچھلیاں اور دریائی بچھڑے دھوکے میں آجاتے ہیں اور آسانی سے اس کا شکار ہو جاتے ہیں۔ سفید ریچھ

پنجے بہت لمبے اور ناخن بہت تیز ہوتے ہیں۔ وہ جھپٹ کر جس چیز کو پکڑ لیتا ہے، وہ اس کی پکڑ سے نکل نہیں سکتی۔

"سفید ریچھ کا پورا جسم سفید ہوتا ہے، بس ناک کالی ہوتی ہے۔ اتنا چالاک اور ذہین ہے کہ شکار کے لیے نکلتا ہے تو شکار کو دھوکا دینے کے لیے اپنے پنجے سے ناک چھپا لیتا ہے۔ اس کی ناک اتنی تیز ہوتی ہے کہ وہ اپنے شکار کی بو کوئی بیس میل کی دوری سے سونگھ لیتا ہے۔"

"سفید ریچھ زیادہ بڑا اور مضبوط ہوتا ہے یا کالا ریچھ؟" گڈو نے سوال کیا۔

"سفید ریچھ زیادہ بڑا اور مضبوط ہوتا ہے" میں نے بتایا۔ کوئی دس فٹ لمبا ہوتا ہے اور اس کا وزن قریب قریب سولہ سو (۱۶۰۰) پونڈ ہوتا ہے قد اس کا چھوٹا ہوتا ہے۔ گر گردن لمبی ہوتی ہے۔ اتنے وزن کے باوجود بہت تیز دوڑتا ہے۔

"برف پر ایک گھنٹے میں ۲۵ میل پورا کر لیتا ہے۔ اور پانی میں ایک گھنٹے میں آسانی سے چھ میل تیر لیتا ہے۔"

"کتنے عرصے تک زندہ رہتا ہے۔ ابو جان؟" نشاط نے سوال کیا۔

"یہی کوئی ۲۵ سال تک، سوائے اس کے کہ اس سے پہلے کسی بڑی وہیل مچھلی، یا دریائی گھوڑے کا یہ خود شکار ہو جائے۔"

"کچھ ان کے بچوں کے بارے میں بھی بتائیے" پروین نے جیسے نیند سے جاگتے ہوئے پوچھا۔

"جب مادہ ریچھ پانچ سال کی ہو جاتی ہے تو جنوری کے مہینے میں ایک بچہ دیتی ہے۔"

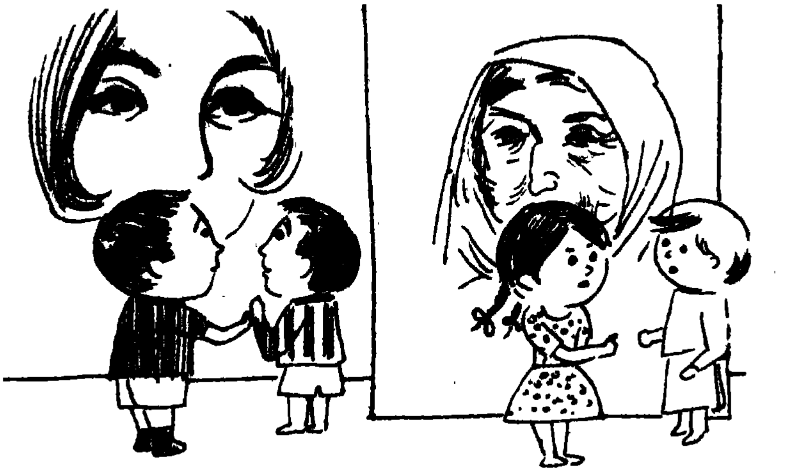
"جب بچہ دینے کا وقت آتا ہے تو وہ مضبوط برف کے اندر ایک محفوظ گھر بناتی ہے اور اپریل تک اپنے دودھ پر رکھتی ہے۔ اس کے بعد جب برف پگھلتی ہے تو اس وقت تک بچہ اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ پانی میں تیر سکے۔ اس کے بعد دو سال تک وہ اپنی ماں کے ساتھ رہتا ہے۔ اور شکار کرنا سیکھتا ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی ماں سے الگ ہو جاتا ہے۔ اور اکیلا رہنے لگتا ہے۔ اور ماں کی مدد کے بغیر شکار کرنے لگتا ہے۔"

"اچھا بھئی باتیں ہو چکیں اب کچھ دیکھا بھی جائے"

"اب کیا دیکھیں گے پھوپھا جان؟" گڈو نے سوال کیا۔

"دیکھو سامنے ہاتھی نظر آ رہا ہے۔ تم لوگوں نے ہاتھی بہت دیکھے ہوں گے۔ چلو اسے بھی دیکھتے چلیں" (ہاتھی کے بارے میں اگلے ماہ پڑھیے گا)

منی آرڈر کوپن پر
اپنا خریداری نمبر کا
حوالہ
ضرور دیں



طولانی تومو
ترجمہ جناب مختار بارہ بنکوی

نانی دین

ایک دن ناشتے سے فارغ ہو کر بچے اپنی اپنی میزوں پر جا بیٹھے اور پھولوں کی تصویریں بنانے میں مشغول ہو گئے۔ استانی نینا ایواتو انے کہا۔

"ہاں تو بچو! تم میں سے کون بتائے گا کہ وہ کون سا تیوہار ہے جو بہت جلد آنے والا ہے" "آٹھ مارچ کا تیوہار جو ہمارا 'ماؤں کا دن' ہے" سونیا کروگلوا نے چلا کر جواب دیا۔ آٹھ مارچ، آٹھ مارچ۔ ماؤں کا دن"

سبھی بچے اپنی اپنی کرسیوں سے اچھل کر کھڑے ہو گئے، اور ننھے منے ہاتھوں سے تالیاں بجاتے ہوئے اچھلنے کودنے لگے۔

"ہاں ہاں ٹھیک ہے" بچوں کو خاموش کرنے کی کوشش کرتے ہوئے استانی ایواتوا نے کہا "میں سمجھ گئی۔ تم سبھی کو معلوم ہے، اچھا آؤ اب یہ سوچیں کہ ہم اس کو کس طرح منائیں گے؟ میری ذاتی رائے ہے کہ ہم ایک نمائش کا انتظام کریں۔ اور تم میں سے ہر ایک اپنی ماں کا فوٹو لائے۔ ہم سب کے فریم تیار کریں گے۔ اور انھیں دیواروں پر ٹانگ دیں گے۔ بس یہی ہماری نمائش ہوگی"

سبھی ماؤں نے اپنے اپنے فوٹو دے دیے تب ہر ایک بچے نے ایک بہت بڑے سرخ کاغذ پر سفید پتیوں والے پیلے پودوں کی تصویریں بنائیں۔ اس طرح فریم تیار ہو گئے ان فریموں پر ماؤں کی تصاویر چپکا کر انھیں دیوار پر دو قطاروں میں لٹکا دیا گیا۔

تمام بچے کرسیوں پر ایک قطار میں خاموشی بیٹھے ہوئے اپنی سجائی ہوئی نمائش کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ اتنے میں نتاشا اچانک سونیا سے کہنے "سنو سونیا! تمھاری ماں بہت خوبصورت ہے، مگر میری ماں، تمھاری ماں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے" سونیا نے انتہائی بلند آواز میں ہنستے ہوئے کہا "ہا، ہا، ہا اگر تم جاننا ہی چاہتی ہو تو سن لو کہ میری ماں تمھاری ماں سے سو گنا، ہزار گنا، بلکہ لاکھ گنا خوبصورت ہے۔ چاہے تم اس ننھے منے پاب لک سے پوچھ لو۔ ہاں پوچھ لو"

لیکن ننھے پاب لک نے ماؤں کی تصاویر بغور انتہائی سنجیدگی سے دیکھنے کے بعد کہا "تمھاری ماں بھی خوبصورت ہے اور تمھاری بھی یعنی تم دونوں کی مائیں" خوبصورت ہیں لیکن میری ماں تم دونوں

، ماؤں سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔"

سوینا نے انتہائی خفگی کے لہجے میں کہا: "اس سے بات کرنا ہی بیکار ہے کیوں نہ ہم تولیکا سے پوچھیں اور ، کی طرف مخاطب ہو کر بولا: "تم بتاؤ تولیکا کس کی ماں زیادہ بصورت ہے۔" تولیکا کرسی سے اُٹھا اس دیوار کے پاس گیا ہاں تصویریں لٹک رہی تھیں اور انگلی سے اپنی ماں کی ویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "میری ماں تم سب ، ماؤں سے زیادہ خوبصورت ہے۔"

"کیا؟" نتاشا اور سوینا اور ان کے ساتھ ہی بلیکا بھی چلّا اٹھا: "یہ سب سے زیادہ خوب صورت ہے؟ ہیں بلکہ میری ماں۔"

وہ تینوں اپنی جگہ سے اٹھے اور تصاویر کی طرف بڑھے اور اپنی اپنی ماؤں کی طرف اشارہ کرنے لگے۔ ، بچوں نے بھی جو کرسیوں پر بیٹھے تھے ادھر ادھر بھاگنا روع کر دیا اور انتہائی شور و غل مچ گیا۔

شور و غل سن کر ان کی استانی بھی تیزی سے بچوں پاس پہنچ گئیں اور وجہ دریافت کرنے کے بعد سب کو رسوں بیٹھنے کے لیے کہا۔

اسی وقت نینا ایا نوینا کا دھیان اس لڑکے کی طرف جو بالکل خاموش تھا۔ اس کا نام سلاوک تھا نینا ایا نوینا اس کی بے حد تعریف کی کیوں کہ وہ انتہائی سکون سے تھا۔ باقی بچوں کو مخاطب کر کے کہا: "ارے میرے بھولے لے بچو! کیا یہ ممکن ہے کہ سبھی مائیں خوبصورت ہوں؟ ذرا وک کی طرف تو دیکھو وہ تم میں سب سے چھوٹا لیکن سب سے سمجھ دار ہے۔ وہ نہ تو شور مچا رہا ہے اور نہ تصویر کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔" کالی آنکھوں والی ابرا نے کہا۔

"یہ اس لیے خاموش ہے کہ وہ ابھی چند دن ہی ہوئے یہاں آیا ہے۔"

"نہیں یہ بات نہیں ہے۔" نینا ایا نوینا نے احتجاجاً کہا: "کیوں کہ وہ سمجھتا ہے کہ سب سے زیادہ خوب صورت ایک ہی شخص ہو سکتا ہے۔" یہ سن کر سب بچے کچھ خاموش ہو گئے، اور اپنی اپنی کرسیوں پر جا بیٹھے۔ تب نینا ایا نووا نے بچوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ "کچھ ملکوں میں ایک رسم جاری ہے اور وہاں ہر سال ایک عورت جو سب سے زیادہ خوب صورت ہوتی ہے ملکۂ حُسن منتخب کی جاتی ہے۔ اسے تحفے تحائف دیئے جاتے ہیں۔ کیوں نہ ہم بھی ایسا ہی کریں جو سب سے زیادہ خوبصورت ماں ہو اسے چن کر چھوٹی موٹی کا یہ خوب صورت گلدان تحفہ میں پیش کریں۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" سبھی بچے چلّا اٹھے۔

"لیکن چناؤ کون کرے گا؟" سوینا نے دہرایا۔ "اگر ہم چناؤ کرتے ہیں تو سبھی اپنی ماں کو ایک دوسرے سے خوب صورتی میں فوقیت دیں گے۔"

نینا ایا نووا نے کہا۔ "نہیں ایسا نہیں ہوگا۔ اس کا انتخاب سلاوک کرے گا۔"

"ٹھیک، بالکل درست۔" سبھی بچے چلّا اٹھے کیوں کہ یہ نہ تو دیوار کی طرف دوڑا اور نہ شور و غل ہی مچا رہا تھا۔ یہ ضرور سچ کہے گا۔" نینا ایا نووا نے سلاوک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "دیوار کی طرف جا کر تم

یہ بتاؤ کہ کس کی ماں سب سے زیادہ خوب صورت ہے؟"
سلاوک اٹھا اور دھیرے دھیرے نمائش کی طرف بڑھا۔ اور اس نے روئی دار مرزئی پہنے ہوئے اور سر پر کالا رومال باندھے ایک ضعیف عورت کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہی سب سے زیادہ خوبصورت عورت ہے۔"

بس اب کیا تھا شور وغل برپا ہو گیا اور سب ایک زبان ہو کر کہنے لگے "اس نے سچ نہیں کہا ہے۔" سلاوک نے کہا "وجہ یہ ہے کہ اس کا فوٹو بھدّے لباس میں کھینچا گیا ہے۔ چچا وسیلی نے کارخانے کے لباس میں اس کا فوٹو کھینچا ہے۔ لیکن جب وہ کسی تیوہار کے موقع پر خوب صورت لباس میں ہوتی ہے تو اس کو پہچاننا مشکل ہو جاتا ہے۔" سب بچوں نے ایک زبان ہو کر کہا کہ یہ جان بوجھ کر ایسا کہہ رہا ہے تاکہ اس کی ماں کو گلدستہ مل جائے۔ لیکن سلاوک نے تعجب کے لہجہ میں جواب دیا کہ "یہ میری ماں ہرگز نہیں ہے، یہ تو نانی دین ہے۔ میری ماں تو نانی دین سے کہیں زیادہ خوبصورت ہے۔" "اچھا یہ بتاؤ نانی دین کون ہے؟" سلاوک نے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ میرا مطلب نانی دین سے ہے۔ جب میں چھوٹا تھا تو دیتیا نہیں کہہ سکتا تھا بلکہ دین کہتا تھا۔ اسی وقت سے نانی دیتیا نانی دین ہو گئیں۔ میرے والدین مجھے نانی دین کی سرپرستی میں دے گئے تھے۔ انھی کے پاس رہتا ہوں، وہ بہت ہی نیک اور فیاض ہیں۔ ہمیشہ میرے ساتھ کھیلتی رہتی ہیں۔"

نینا اولوا نے بچوں سے کہنا شروع کیا: "اے میرے ننھے منے بچو! تم سب کو اپنی ہی ماں زیادہ خو معلوم ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ تم سبھی اپنی محبت کرتے ہو۔ پیار کرتے ہو۔ اس کا مطلب یہ ہے یہی وہی شخص سب سے زیادہ خوب صورت ہوتا۔ کو ہم دنیا میں سب سے زیادہ پیار کرتے ہیں۔ اور ا سے کوئی فرق نہیں ہوتا کہ وہ شخص بچہ، جوان، یا ب اگر یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ سبھی خوبصورت ہیں تو پھر گلـ کسے دیں؟" نتاشا نے دریافت کیا۔

نینا ایالوا نے جواب دیا "بچو! آؤ یہ گلدستہ کو پیش کر دیں کیوں کہ ہمارے محلے میں مائیں تو آئیں گی مگر نانی دین تنہا ہوں گی۔ اور ہم یہ پھولو گلدستہ اس لیے انھیں پیش کریں گے کہ ادوں میں سے زیادہ بزرگ ہیں۔ کیا تم لوگ میری رائے سے سبھی بچوں نے اس رائے سے اتفاق کیا اور کیا۔

نانی دین نے بچوں کی جانب پیار اور شفقت انداز سے نگاہ ڈالی اور سب کا شکریہ ادا کیا۔ پھولو سب بچوں میں تقسیم کر دیا۔ بچے پھول کی مانند پھو سبھی نے نانی دین کی تعریف کی (ایک روسی ک

خدا کے نیک بندوں کا وجود رحمت باری ہے۔ انسان کی سلامتی زبان کی حفاظت میں ہے زبان کی چوٹ نیزہ کے زخم سے بھی تیز ہوتی ہے

(حضرت علیؑ)

برسات کی بہار

ب — ابن رضوی



(۱)

ے بادل آرے آ
ڈا ٹھنڈا جل برسا
ں تو پورب سے آ
ل تو پچھم سے آ
ل تو اُتّر سے آ
ں تو دکھن سے آ
رتی پر تو دیا دکھا
ڈی ٹھنڈی ہوا چلا

ے بادل آرے آ
ڈا ٹھنڈا جل برسا

(۲)

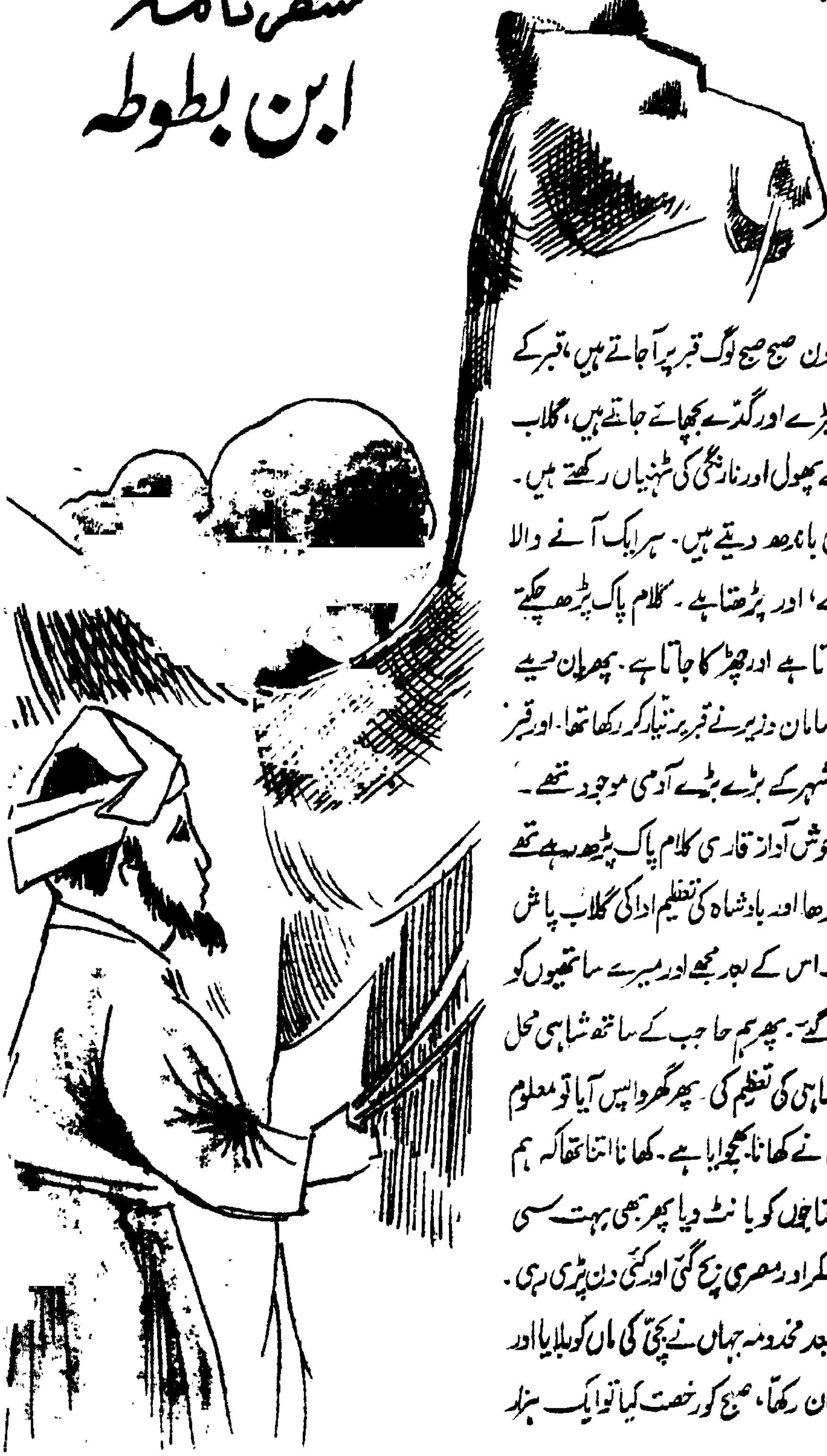
سورج آگ اُگلتا ہے
سارا جگ یہ جلتا ہے
اُمڈ اُمڈ کر تو چھا جا
مینہ برسا، بجلی چمکا
اوپر سے دھرتی پر آ
رِم جھم رِم جھم جل برسا
ندی نالوں کو بھر جا
جیووں کو اب مت ترسا

آرے بادل آرے آ
ٹھنڈا ٹھنڈا جل برسا

(ہندی نظم کا ترجمہ)

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ



تیجہ :

تیجے کے دن صبح صبح لوگ قبر پر آجاتے ہیں، قبر کے چاروں طرف ریشمی کپڑے اور گدّے بچھائے جاتے ہیں، گلاب چمپا، چنبلی، گل شبّو کے پھول اور نارنگی کی ٹہنیاں رکھتے ہیں۔ اور میوے ٹہنیوں میں باندھ دیتے ہیں۔ ہر ایک آنے والا قرآن ساتھ لاتا ہے، اور پڑھتا ہے۔ کلام پاک پڑھ چکتے ہیں تو گلاب پلایا جاتا ہے اور چھڑکا جاتا ہے۔ پھر پان دیے جاتے ہیں۔ یہ تمام سامان وزیر نے قبر پر تیار کر رکھا تھا۔ اور قبر پر خیمہ لگا ہوا تھا۔ شہر کے بڑے بڑے آدمی موجود تھے۔

نہایت خوش آواز قاری کلام پاک پڑھ رہے تھے پھر قاضی نے مرثیہ پڑھا اور بادشاہ کی تعظیم ادا کی گلاب پاش سے گلاب چھڑکا گیا۔ اس کے بعد مجھے اور میرے ساتھیوں کو گیارہ خلعت دیے گئے۔ پھر ہم حاجب کے ساتھ شاہی محل میں گئے اور تخت شاہی کی تعظیم کی۔ پھر گھر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ مخدومہ جہاں نے کھانا بھجوایا ہے۔ کھانا اتنا تھا کہ ہم سب نے کھایا اور محتاجوں کو بانٹ دیا پھر بھی بہت سی روٹیاں اور حلوا، شکر اور مصری بچ گئی اور کئی دن پڑی رہی۔

کچھ دن بعد مخدومہ جہاں نے بچّی کی ماں کو بلایا اور رات بھر محل میں مہمان رکھا، صبح کو رخصت کیا تو ایک ہزار

دپے کے سونے کے کپڑے، سونے کا جڑاؤ ہار، زردکتاں کی قمیص
ر دوزی کتاں کا خلعت اور کئی تھان کپڑے کے دیئے۔

ڈولے

عورتیں اس ملک میں ڈولے میں چلتی
ں. ڈولا چارپائی جیسا ہوتا ہے۔ ریشم یا سوت کی رسیوں سے
ا جاتا ہے جس پر ایک بڑی لکڑی بندھی ہوتی ہے۔
لہ کو آٹھ آدمی جنھیں "کہار" کہتے ہیں اٹھاتے ہیں۔ چار
ٹھاتے ہیں اور چار آرام لیتے ہیں ہندوستان میں ڈولے وہی کام
یتے ہیں جو مصر میں گدھے کام دیتے ہیں۔

بہت سے لوگ ڈولا اٹھاکر ہی گذارہ کرتے ہیں۔
ن کے غلام ہوں تو ڈولہ غلام اٹھاتے ہیں۔ ورنہ کرائے کے
دمی مل جاتے ہیں۔ کرائے کے آدمی اکثر شاہی محل کے آس
س یا امیروں کے گھر کے قریب مل جاتے ہیں۔ ڈولوں پر
یشم کے پردے پڑے رہتے ہیں۔

مخدومہ جہاں نے ایسے ہی ایک ڈولے میں لڑکی کی
ں کو بلوایا تھا اور بھیجا تھا جسے مخدومہ کے غلام اٹھا کر
ئے تھے۔

مخدومہ جہاں نے جو کچھ لڑکی کی ماں کو دیا میں نے
دوستوں اور قرض خواہوں کو دے دیا۔

مخبر بادشاہ کو رتی رتی کی خبر پہنچاتے تھے۔ بادشاہ
ب معلوم ہوا کہ ماتمی جوڑا اور زیور میں نے قرض خواہوں کو
ے دیا ہے تو حکم ہوا کہ مجھے کچھ گاؤں دے دیے جائیں جن
مدنی سالانہ پانچ ہزار اشرفی سے کم نہ ہو۔ وزیر اور
دیوان نے ایک گاؤں جس کا نام بستی تھا، ایک بادلی

اور آدھا گاؤں بانٹا تجویز کیا۔ یہ سب گاؤں دلی سے
سولہ کوس پر تھے۔

عید آگئی

عید آگئی مگر بادشاہ دلی میں نہیں ہے۔
عید کا دن آیا تو خطیب ہاتھی پر سوار ہوا۔
خطیب سیاہ عمامہ، سیاہ عبا پہن رہا تھا۔ یہ
عباسی حکومت کا سرکاری لباس تھا جسے بغداد کے خلفاء
کی عقیدت کے سبب بادشاہ پسند کرتا تھا جس ہاتھی پر
خطیب سوار تھا، اس کی عماری کے چاروں کونوں پر چار
جھنڈے تھے۔ موذن بھی ہاتھی پر سوار تھے۔ اور آگے آگے
تکبیر پڑھتے جاتے تھے۔ شہر کے مولوی اور قاضی بھی سوار
تھے۔ اور عید کا صدقۂ فطر تقسیم کرتے جاتے تھے۔ عیدگاہ میں
سائبان تھا اور فرش بچھا ہوا تھا۔ نمازی جمع ہوگئے تو نماز
پڑھائی گئی۔ اور سب لوگ اپنے اپنے گھر چلے گئے۔ ہم لوگ
بادشاہ کے محل میں گئے جہاں حسب دستور امیروں اور پردیسیوں
کی عید کی دعوت تھی۔

بادشاہ کا استقبال

عید کے چار روز بعد خبر ملی کہ
بادشاہ شہر سے سات کوس پر اپنے محل میں جس کا نام تلپت
ہے مقیم ہے۔ وزیر نے حکم دیا کہ بادشاہ کا استقبال کیا جائے
ہم سب استقبال کے لیے باہر گئے۔ ہر ایک کے ساتھ
نذر کے گھوڑے، اونٹ، خراسانی میوے، مصری تلواریں،
غلام اور ترکستانی دنبے تھے۔ محل کے دروازے پر پہنچے تو
اپنے اپنے مرتبوں کے موافق داخلہ ہوا۔ اور ہر ایک کو

زرد رنگ کی کتان کا خلعت ملا۔ میری باری آئی تو بادشاہ کرسی پر بیٹھا تھا اور ناصر الدّین کافی سبروی کھڑا تھا۔ حاجب نے تعظیم کی اور میں نے بھی تعظیم کی۔ امیر حاجب نے جس کا نام فیروز تھا مجھے خوش آمدید کہا۔ اور میں نے دوسری مرتبہ تعظیم کی ناصر الدین نے کہا بسم اللہ مولانا بدر الدّین!!

ہندوستان میں سب مجھے بدر الدّین کہتے ہیں اور ہر ایک عرب کو مولانا کہہ کر پکارتے ہیں۔ بادشاہ نے میرا ہاتھ پکڑ کر مصافحہ کیا۔ اور دیر تک ہاتھ پکڑے رہا۔ پھر کہا آپ کا آنا مبارک ہو۔ میں تم پر مہربانی کروں گا اور اتنا انعام دوں گا کہ دوسرے عرب سن کر تمھارے پاس آئیں گے۔ پھر میرا ملک پوچھا۔ میں نے بتایا مغرب (طنجہ)

بادشاہ نے کہا۔ امیر المومنین کا ملک؟ میں نے کہا جی ہاں! پھر مجھے بادشاہ نے خلعت دیا اور کھانا آیا۔ اس وقت جن لوگوں کو خلعت دیے گئے ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) خداوند زادہ قوام الدّین۔ (۲) اس کا بھائی ضیاء الدّین (۳) عماد الدّین (۴) اور برہان الدّین (۵) امیر بخت بن سیّد تاج الدّین جس کا دادا وجیہہ الدّین خراسان کا وزیر تھا۔ (۶) ہبۃ اللہ ابن الفلکی تبریزی (۷) ملک کرائی کو جو بہرام چوبیں مصاحب نوشیرواں کی اولاد تھا۔ یہ بدخشاں کا رہنے والا تھا جہاں سے لعل بدخشانی اور لاجورد آتا ہے۔ (۸) امیر مبارک سمرقندی (۹) ملک زادہ ترمذی (۱۰) شہاب الدّین گازرونی سوداگر کو جو تبریز سے بادشاہ کے لیے تحفے اور نذر لایا تھا۔ اور راستے میں لیٹروں نے اسے لوٹ لیا تھا۔

دوسرے دن بادشاہ نے ہر ایک کو اپنے خاص گھوڑوں میں سے ایک ایک گھوڑا جس پر سونے چاندی کی لگام تھی اور مرصع زین تھی عطا کیا۔

بادشاہ دہلی میں داخل ہوا تو آگے آگے سولہ[٦] ہاتھی تھے، جھنڈے لگے تھے۔ اور ہر ایک ہاتھی پر جواہر نگار ریشم کا چھتر لگا ہوا تھا۔ بعض ہاتھیوں پر چھوٹی چھوٹی توپیں تھیں جن سے روپیہ اشرفیاں بھر بھر کر پھینکی جا رہی تھیں۔ آگے ہزاروں آدمی لوٹتے چلے جا رہے تھے۔ جب تک سواری محل میں پہنچی روپیہ اشرفیوں کی بکھیر ہوتی رہی۔ جگہ جگہ کپڑوں سے منڈھے ہوئے برج تھے جن میں گانے والیاں بیٹھی تھیں۔ اور موسیقی کا سماں پیدا کر رہی تھیں۔

دوسرے دن جمعہ تھا۔ ہم دیوان خانے میں صحن چبوں میں بیٹھ گئے۔ ابھی داخلے کی اجازت نہ آئی اتنے میں شمس الدّین حاجب آیا اور متصدیوں کو حکم دیا کہ سب کے نام لکھ لو انھیں اندر آنے کی اجازت ہے۔ ساتھ آٹھ آدمیوں کو اندر جانے کی اجازت ملی۔ پھر اور ترازو آئی۔ قاضی اور متصدی بیٹھ گئے۔ پردیسیوں کو بلاتے جاتے تھے اور اشرفیاں تول تول کر دیتے جاتے تھے۔ میرے حصے میں پانچ ہزار اشرفیاں آئیں۔ یہ رقم مخدومہ جہاں نے بیٹے کے بخیر و عافیت آنے پر بطور صدقہ بھیجی تھی۔ کل ایک لاکھ تھی

ایک دفعہ بادشاہ مجھ سے کہنے لگا: تم جو میرے ملک میں آئے ہو، نہ میں اس کا شکریہ ادا کر سکتا ہوں۔ نہ کافی بدلہ دے سکتا ہوں۔ پھر بھی اتنا کہتا ہوں کہ تم میں کا ہر ایک میرے باپ کی طرح ہے، برابر والا بھائی ہے۔ تھوڑے

اولاد کی جگہ ہے ۔ میرے تمام ملکوں میں یہ شہر بہت بڑا
۔ اور یہ تمھارا ہے ۔"

ہم نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا اور دعا کی ۔ پھر ہم سب
نخواہیں اور عہدے مقرر ہوئے ، میری تنخواہ سالانہ بارہ
ر اشرفیاں مقرر ہوئی ۔ پہلی جاگیر میں ڈھائی گاؤں تھے
کا اضافہ اور کیا گیا ۔ جوڑا اور ملک تورا

ایک دن خداوند زادہ غیاث الدین اور قطب الملک
ہ سندھ ہمارے پاس آیا اور بادشاہ کا پیغام سنایا کہ تم
ے جسے جس کام کی استعداد اور رغبت ہو وہ کام
کے سپرد کر دیا جائے ۔ وزارت چاہے تو وزارت ۔ امیر
چاہے تو امارت اور شیخ بننا چاہے تو خانقاہ ۔

سید تاج الدین نے کہا میرے بزرگ وزیر تھے
ں کاتب ہوں ۔ بس یہی میرے خاندانی کام ہیں ۔ ....
ند زادہ نے مجھ سے پوچھا آپ کیا بننا چاہتے ہیں ۔ میں نے
یرے باپ دادا قاضی تھے اور فوج کے افسر تھے سپہ گری
شمشیر زنی میرا پیشہ ہے ، میری بات سن کر بادشاہ خوش ہوا
اہ اس وقت قصر ہزار ستون میں کھانا کھا رہا تھا ۔ ہمیں
یا اور اپنے ساتھ کھانا کھلایا ۔ رات کو پھر یاد کیا خداوند زادہ
الدین کو میر داد مقرر کیا ۔ میر داد قاضی کے پاس بیٹھتا ہے ۔

جب کسی امیر یا بڑے آدمی پر دعویٰ کیا جاتا ہے تو
[illegible] کو قاضی کے سامنے حاضر کرتا ہے ۔ سالانہ پچاس
نخواہ مقرر ہوئی اور پچاس ہزار سالانہ کی جاگیر ملی ۔
خلعت پہنائی گئی ۔ اول درجہ کا ایک گھوڑا دیا گیا ۔
ن کا نام شیر صورت تھا ۔



شیر صورت کی پشت پر اور سینہ پر شیر کی تصویر
ہوتی ہے اور خلعت میں لکھا ہوا ایک پرچہ ہوتا ہے کہ اس
خلعت میں سونے کی اتنی مقدار ہے ۔ ضیاء الدین کے بعد
امیر بخت اندر گیا ۔ حکم ہوا وزیر کے ساتھ مسند پر بیٹھا کرے
اور جو لوگ دیوان میں ان کے حساب کی جانچ پڑتال کرے ۔
چالیس ہزار اشرفیاں سالانہ ، چالیس ہزار کی جاگیر خلعت اور
گھوڑا ، شرف الملک کا خطاب دیا گیا چالیس ہزار اشرفیاں
اسی وقت دی گئیں ۔

●

ربانی آصفی

جناب خلیق انجم اشرفی



اسکاٹس کے لطیفے

اسکاٹس کی کنجوسی کے واقعات بڑے دلچسپ ہوتے ہیں ۔ ان کا دماغ پیسے بچانے کی ایسی ایسی ترکیبیں سوچ لیتا ہے کہ ہم آپ اس کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے ۔

ایک اسکاٹ نے ایک امریکی بینک کو درخواست دی کہ اسے ایک ڈالر اُدھار چاہیے ۔ اسے بتایا گیا کہ اسے اس پر چار فیصدی سود دینا ہوگا ۔

"یعنی چار سنٹ نا" اسکاٹ نے سوال کیا ۔

"ہاں" بینکر نے جواب دیا اور پھر پوچھا ۔ "لیکن ضمانت کیا ہوگی ؟"

"پچاس ہزار ڈالر کی مالیت کے امریکی بونڈ" اسکاٹ کا جواب تھا ۔

بینکر نے وہ بانڈ قبول کر لیے اور اسے ایک ڈالر دے دیا ۔ سال کے آخر میں اسکاٹ ایک ڈالر اور چار سنٹ لے کر آیا اور قرض ادا کر کے اپنے بانڈ واپس مانگے ۔ بینکر نے بانڈ واپس کرتے ہوئے پوچھا ۔ "میں آپ کے ذاتی معاملات میں دخل انداز نہیں ہونا چاہتا لیکن جب آپ کے پاس اتنی مالیت کے بونڈ تھے تو آپ کو ایک ڈالر قرض لینے کی ضرورت کیا پڑی ؟"

"اچھا" اسکاٹ نے گویا اس کی "بے وقو
سمجھتے ہوئے کہا ۔ "تو کیا آپ کی نظر میں کوئی دو
ایسا تھا جس سے مجھے اپنے ان بانڈوں کو سال بھ
رکھنے کے لیے سیف ڈپازٹ صرف چار سنٹ خرچ
دستیاب ہو جاتا ؟"

ایک قرض خواہ نے اپنے تمام قرض دار و
بڑی شائستہ زبان میں ایک خط بھیجا جس میں بڑ
سے قرض کی ادائگی کی درخواست کی گئی تھی ۔ چنا
بعد اُسے اپنے ایک اسکاٹ قرض دار کی طرف سے
ذیل خط موصول ہوا ۔

محترم !

آپ کا خط ملا شکریہ

میں نے اپنے قرض خواہوں کو مندرجہ ذ
خانوں میں تقسیم کر رکھا ہے ۔

۱ ۔ وہ لوگ جن کا قرض بہت جلد ادا کرنا ہے ۔
۲ ۔ وہ لوگ جن کا قرض کچھ عرصہ بعد ادا کرنا ہے
۳ ۔ وہ لوگ جن کا قرض کبھی نہیں ادا کرنا ہے ۔

آپ کے خط کی شائستہ زبان سے متاثر

ں نے آپ کا نام تیسرے خانے سے کاٹ کر دوسرے خانہ
ں لکھ دیا ہے۔ امید ہے کہ یہ آپ کے لیے ایک بڑی خوش
خبری ثابت ہوگی۔"

نقطہ ایکس۔ وائی زیڈ

ایک شخص ایک اسکاٹ کے ہوٹل میں داخل ہوا
ر چوزہ کا شوربہ منگایا۔ ابھی اس نے ایک ہی چمچہ شوربہ
یا تھا کہ اس کا منہ بن گیا۔ اس نے چیخ کر اسکاٹ ویٹر
بلایا اور بگڑ کر بولا "یہ شوربہ کس چیز کا ہے؟ مجھے
یقین ہے کہ یہ کم از کم چوزے کا تو ہو نہیں سکتا۔"

"نہیں جناب" ویٹر نے بڑے سکون سے کہنا
شروع کیا: "شوربہ تو یہ چوزہ ہی کا ہے لیکن یہ اس
وقت کے چوزہ کا شوربہ ہے جب وہ پیدا بھی نہ ہوا تھا۔
اس پانی سے بنایا گیا ہے جس میں انڈے اُبالے گئے تھے
یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ چوزہ انڈے ہی سے نکلتا ہے"

ایک انگریز ایک اسکاٹ کے ہوٹل میں داخل ہوا
ر کھانا کھانے کے بعد ویٹر سے خلال لانے کو کہا۔

"مجھے افسوس ہے جناب، ہم گاہکوں کو خلال نہیں
دیتے۔" اسکاٹ ویٹر نے کہا۔

"یہ کیوں؟" انگریز گاہک نے بڑے تعجب سے
کہا۔

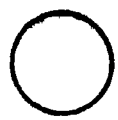
"گاہک اسے لے کر گھر چلے جاتے ہیں" ویٹر کا
جواب تھا۔

میک (اپنے اسکاٹ دوست پیڈی سے) "بھئی
تم نے پولیس کی نوکری کیوں کر لی پیڈی؟"

پیڈی:۔ ڈاکٹر نے مجھ سے ورزش کے لیے کہا تھا۔

میک (حیران ہو کر):۔ کیوں ورزش کا ایک پولیس
مین ہونے سے کیا تعلق؟"

پیڈی:۔ واہ ہے کیوں نہیں! دن بھر ورزش
ہوتی رہتی ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ اس ورزش کا
معاوضہ بھی ملتا ہے۔ پھر مجھے کیا ضرورت ہے کہ میں اپنا
وقت ورزش کرنے کے لیے ٹہلتے اور گھومتے ہوئے گزاروں



اس سرخ نشان کا مطلب ہے کہ آپ کی
مدت خریداری ختم ہو چکی ہے ..... ہمیں امید ہے
کہ آپ اپنے پیارے پیام تعلیم کی سرپرستی جاری رکھیں
گے ...... براہِ کرم مبلغ چھ روپے کا منی آرڈر
اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک بھیجیے تاکہ یہ سلسلہ قائم
رہے۔

آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ ملی تو ہم
سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا اور افسوس
کے ساتھ بند کر دیں گے۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا
نہ بھولیے۔

آپ کا خریداری نمبر .... ہے۔

"منیجر"

زندگی

جناب نسیم شاہجہان پوری

(بڑے لڑکوں کے لیے)

زندگی ظلمت بھی ہے تنویر بھی — زندگی تخریب بھی، تعمیر بھی
زندگی کے مختلف مفہوم ہیں — زندگی ہے خواب بھی تعبیر بھی

زندگی تقویٰ بھی ہے تقصیر بھی — زندگی توقیر بھی، تحقیر بھی
زندگی انعامِ فطرت ہی نہیں — زندگی ہے مستقل تعزیر بھی

زندگی ہے صبح بھی اور شام بھی — زندگی آغاز بھی، انجام بھی
زندگی سے مطمئن کیوں ہے بشر — زندگی ہے موت کا پیغام بھی

زندگی ظالم بھی ہے، مظلوم بھی — زندگی حاکم بھی ہے محکوم بھی
زندگی ہر رنگ میں ہے جلوہ گر — زندگی فتنہ بھی ہے، معصوم بھی

زندگی ہے لطف بھی، بیداد بھی — زندگی پابند بھی، آزاد بھی
زندگی پرکیف نغمہ ہی نہیں — زندگی ہے بے اثر فریاد بھی

زندگی ہے ظلم بھی، احسان بھی — زندگی ساحل بھی ہے طوفان بھی
زندگی ہر قید سے آزاد ہے — زندگی ہے کفر بھی ایمان بھی

زندگی مسرور بھی، غمگین بھی — زندگی دیندار بھی، بے دین بھی
زندگی ہے نیک و بد کا امتزاج — زندگی سادہ بھی ہے رنگین بھی

زندگی خوش رنگ بھی، بے رنگ بھی — زندگی اک نام بھی ہے ننگ بھی
زندگی کی مختلف ہیں صورتیں — زندگی آئینہ بھی ہے سنگ بھی

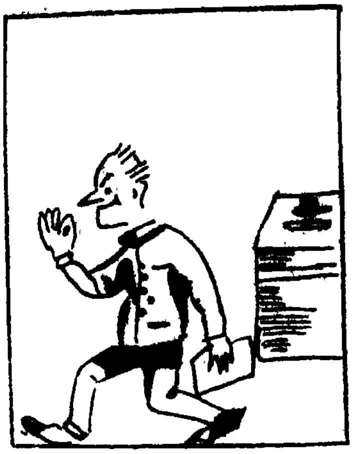
مسٹر گوپچی

اور ایک اخباری نامہ نگار

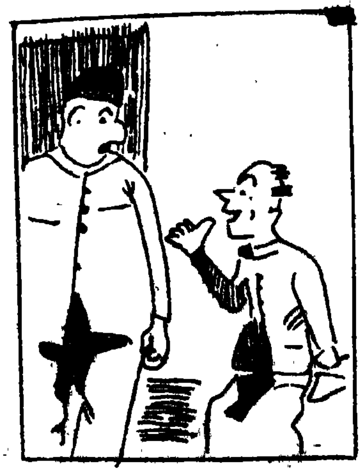
سیّد آفتاب امین چشتی



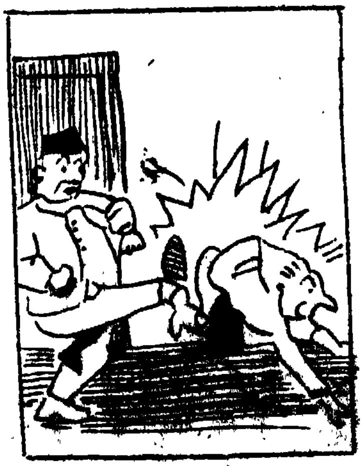
شہر میں باکسنگ (مکّے بازی) کا ایک زبردست مقابلہ ہونے والا تھا۔ ایک نوجوان امیدوار اخبار کے دفتر میں نوکری کے لیے آیا تو ایڈیٹر صاحب نے کہا "تم اس مقابلے کی خبر تیار کر کے لاؤ" تاکہ تمھاری ملازمت کا فیصلہ کیا جائے۔



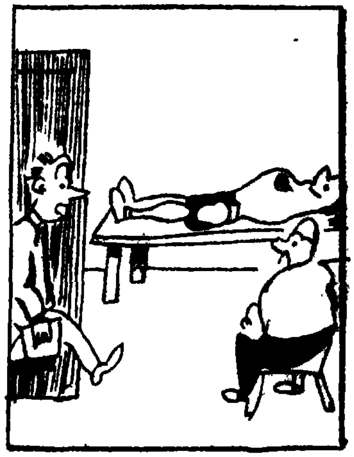
(۲) نوجوان بہت خوش ہوا۔ اس نے سوچا کہ میں ایسی باتیں لکھ کرلے جاؤں گا جس کا علم ہزاروں تماشائیوں کو بھی نہیں ہوگا۔ اس لیے نوجوان مشہور باکسر (مکّے باز) مسٹر توپچی سے ملاقات کرنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔



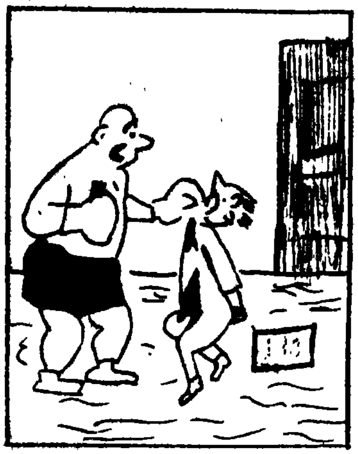
مسٹر توپچی کے محافظ نے اس نوجوان کو دروازے پر روک لیا۔ نوجوان نے ذرا چالاکی سے کام لیا اور کہا۔ دروازے پر دستک ہو رہی ہے۔ فوراً اندر جائیے



(۴) محافظ پچھلے دروازے کی طرف دوڑا۔ نوجوان نے اندر گھسنے کے لیے جھٹ دربوازہ کھولا لیکن محافظ بھی ایک چالاک آدمی تھا۔ وہ پچھلے دربوازے سے ہو کر جھٹ پہلے دروازے



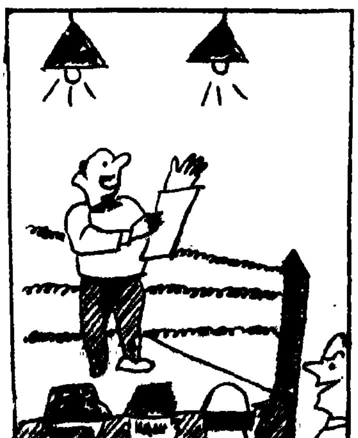
(۵) نوجوان کو اپنی چالاکی کی خاصی سزا مل گئی تھی۔ اس لیے منیجر نے اسے اندر آنے کی اجازت دے دی۔ جہاں مسٹر توپچی تخت پر آرام کر رہے تھے۔ منیجر نے کہا "جلدی سے دو ایک باتیں پوچھ لیجیے اور کھسک جائیے۔"



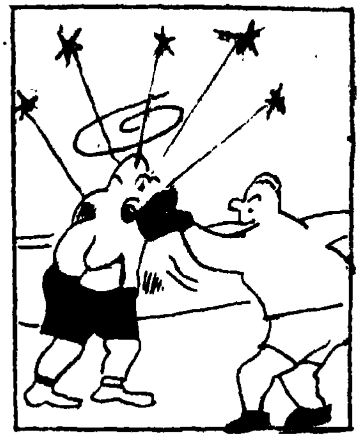
(۶) نوجوان نے کہا: "مسٹر توپچی میں ہوں ڈیلی فونو گراف نمائندہ، یہ کیا بات ہے کہ آپ مقابلے سے پہلے لیٹ گئے" "مسٹر توپچی کا خون کھول گیا۔ انھوں نے نوجوان کو گریبان سے پکڑ لیا۔



(۷) لیکن منیجر نے ایک بار پھر نوجوان کی جان بچائی۔ اب کے نوجوان نے دوسرا سوال کر ڈالا۔ "آپ نے کتنی بار مار کھائی ہے؟" اس سوال پر تو مسٹر توپچی کا سر چکرا گیا۔ اور وہ دوبارہ مارنے کے لیے لپکے۔



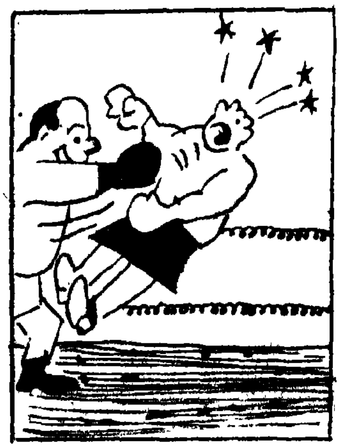
(۸) نوجوان کی جان ایک بار پھر بچائی گئی۔ لیکن مسٹر توپچی کا موڈ بہت خراب ہو گیا تھا۔ اور یقین تھا کہ آج اس پٹائی ہو جائے گی۔ اتنی دیر میں باکسنگ کے رنگ مقابلے کا اعلان ہوا۔



(۹) مقابلہ شروع ہوا تو ہر ایک کو معلوم تھا کہ مسٹر توپچی بڑے غصّہ میں ہیں۔ ان کے مقابلے میں مسٹر گوپچی تھے۔ گوپچی نے توپچی کی ایسی پٹائی کی کہ انھیں دن میں تارے نظر آنے لگے۔



(۱۰) نوجوان بہت خوش، وہ اپنا ٹائپ رائٹر سامنے رکھا کھٹا کھٹ اپنی رپورٹ ٹائپ کر رہا تھا۔ اس نے لکھ "اس وقت ہزاروں تماشائیوں کا ہجوم ہے، اور ہر کو تالی پیٹ رہا ہے۔"



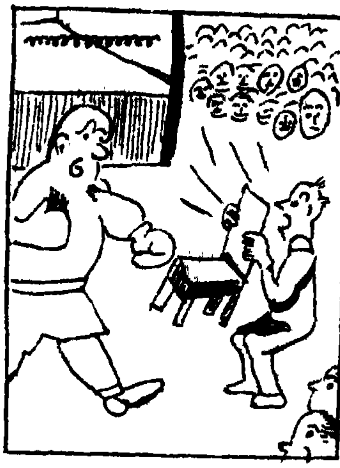
(۱۱) آسمان روشن ہے اور مسٹر توپچی کو دن میں تارے دکھائی دے رہے ہیں۔ مسٹر گوپچی نے مکّے مار مار کر ان کا حلیہ بگاڑ رہا ہے۔ توپچی کی توپ بالکل خاموش ہو گئی ہے اور گوپچی گولہ برابر برس رہا ہے۔"



(۱۲) نوجوان نے اپنی رپورٹ یہیں تک ٹائپ کی تھی کہ مسٹر توپچی ایک مُکّہ کھا کر لڑھکتے ہوئے ٹائپ رائٹر کے اوپر اور وہاں سے نوجوان کی گود میں آکر گرے۔ ان کا حال بہت خراب ہو رہا تھا۔



(۱۳) مسٹر توپچی اپنی پٹائی پر پہلے ہی جھلائے ہوتے تھے۔ لیکن جب ان کی نظر ٹائپ رائٹر کے مسودے پر پڑی تو شیر کی طرح گرجنے لگے۔ پہلے تو ان کے جی میں آئی کہ ٹائپ رائٹر کو اٹھا کر چبا ڈالیں۔



(۱۴) لیکن اس میں ٹائپ رائٹر کی کیا غلطی تھی۔ لہٰذا انھوں نے مکّا تان کر نوجوان کو للکارا کہ ٹھہر تو ذرا میں تجھے تارے دکھاتا ہوں۔ نوجوان نے اپنے بچاؤ کے لیے کرسی اٹھائی اور بھاگنا چاہا۔



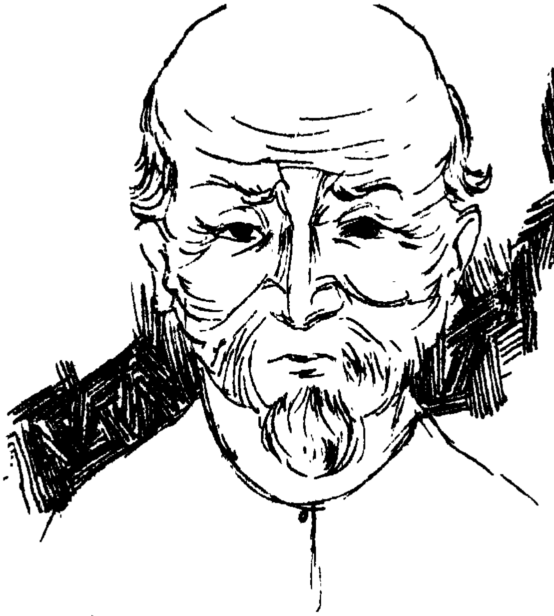
(۱۵) مسٹر توپچی نے ایک ہاتھ مارا تو کرسی، نوجوان کے ہاتھ سے نکل کر تتلی کی طرح اڑ گئی۔ انھوں نے دوسرا ہاتھ مارا تو ٹائپ رائٹر نوجوان کے گلے میں ڈھول کی طرح لٹک گیا اور وہ اسی شان سے واپس ہوتے۔



(۱۶) ایڈیٹر کے کمرے کے باہر سے انھوں نے آواز دی "میری رپورٹ باکسنگ رنگ میں رہ گئی ہے۔ ٹائپ رائٹر میرے گلے میں ہے۔ کچھ تارے میری آنکھوں میں ناچ رہے ہیں اور اب میں واپس جا رہا ہوں"

از: پی دانیوف

یہ لمبی عمر کے لوگ



سوویت یونین میں ابھی پچھلے دنوں مردم شماری ہوئی تھی۔ مردم شماری کے وقت ایک دل چسپ حقیقت کا انکشاف ہوا۔ پتہ چلا کہ آذربائیجان میں ۵۰ ہزار سے زیادہ لوگ ۸۰ برس یا اس سے زیادہ عمر کے ہیں۔ یہی نہیں آذربائی جان کے ایک لاکھ افراد میں ۸۴ شہری ۱۰۰ یا اس سے زیادہ عمر کے ہیں۔ یہ اوسط دنیا میں سب سے اونچا ہے۔ تو بھلا سو برس یا اس سے زیادہ کی عمر والے یہ لوگ کون ہیں؟

آذربائی جان کی اکادمی میں فزیالوجی کا بھی ایک شعبہ ہے۔ اس شعبے میں مجھے ایک غیر معمولی نقشہ نظر آیا۔ اس میں ہلکے سبز، ہلکے بادامی اور ملواں بھورے رنگ تھے۔ اس نقشہ میں اعداد و شمار بھی تھے۔ اور جیسے جیسے آپ تصوّر میں پہاڑوں کی طرف بڑھیں "سبز علاقوں" سے "بھورے خطّے" پر نظر ڈالیں تو اعداد و شمار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اس حصّہ میں جہاں "ناگورنی کاریاخ" لکھا تھا۔ یہ عدد سب سے زیادہ تھے ۳۲ء۳۔ اور یہ عدد اس نیشنی قفقازی سلسلے میں ۱۰۰ برس سے زیادہ کی عمر والے لوگوں کا فیصد تھا۔ ۱۰۰ برس سے زیادہ کی عمر والے لوگوں کی زندگی اور طور طریقوں کا مطالعہ کرنے والے ڈاکٹر ہوربن لوذین نے مجھے بتایا کہ "نگورنو کاراباخ" خود مختار علاقے میں ہر ایک لاکھ افراد میں سے اوسطاً ۱۴۷ افراد ایسے ہیں جن کی عمر سَو برس یا اس سے زیادہ ہے۔ یہ بات بھی بڑی دل چسپ ہے کہ اس علاقے کے ۱۰۰ برس سے زیادہ عمر والوں میں سے ۶۷ فیصد ایسی عورتیں ہیں جن کی اولاد ۷ سے ۱۹ تک ہے۔ یہ عورتیں کھیتوں میں، مویشی گاہوں میں کام کرتی ہیں اور اپنے خانہ باغ یا پائیں میں مویشیوں کی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ "گیولی قلبیوا" کے ۱۹ اور من بابایان کے ۱۴ بچّے ہیں۔

بہترین دوا جسمانی محنت

نقشے کی سیر کرتے ہوئے ہم برزاوہ دیہات (ضلع لیرکسکی) پہنچے۔ یہ سطح سمندر سے دو ہزار میٹر اونچائی پر ہے۔ اور ہمارے ملک کے سب سے زیادہ لمبی عمر والے بزرگ شیر علی مسلوف (۱۶۵ سال) اور ان کی بیوی خاتوم خانم کا وطن ہے۔

اگر آپ اس دیہات میں صبح ہی صبح پہنچیں تو شبیر علی بابا کسی پھلوں کے باغ میں ملیں گے۔ یہاں وہ سورج نکلتے وقت کچھ جسمانی محنت کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ پہاڑی بابا جسمانی محنت کے بغیر زندگی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ وہ کوئی نشہ آور چیز استعمال نہیں کرتے، تمباکو بالکل نہیں پیتے۔ ان کے روز کے کھانے میں دودھ کی بنی ہوئی چیزیں، سبزیاں اور پھل شامل ہیں شہد بھی۔

وہ اب بھی چاق چوبند اور مضبوط ہیں۔ اپنی بھیڑوں کی گلہ بانی کرتے ہیں۔ اپنی پرانی چھڑی لے کر چہل قدمی کرتے ہیں۔ اس چھڑی کو وہ سہارے کے لیے بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ کبھی کبھی انھیں اپنا پرانا شغل یاد آتا ہے۔ وہ گھوڑ سواری کرتے تھے۔ اپنی نوجوانی میں انھیں گاؤں کا بہترین گھوڑ سوار سمجھا جاتا تھا۔

ایک بار باکو سے ایک اخبار کا فوٹو گرافر اس پہاڑی گاؤں میں پہنچا اور شبیر علی بابا سے درخواست کی کہ وہ گروپ فوٹو کے لیے اپنے قریبی رشتہ داروں کو جمع کریں تو کیمرہ کے سامنے تقریباً سارا گاؤں جمع ہو گیا۔ بابا شبیر علی کے کنبے میں ۲۲۰ افراد ہیں۔

اپنی اس طویل زندگی میں شبیر علی بابا صرف دو بار (۱۹۶۵ء اور ۱۹۶۶ء) پہاڑوں سے نیچے اترے تاکہ کام کاج کے لیے باکو جائیں۔ باکو پہنچنے پر ان کا طبی معائنہ کیا گیا۔ نبض کی رفتار: ۷۰ تا ۷۲ ہے۔ اے پی: ۸۵×۱۲۵ تھی۔

سیدھی سادی عادتیں: اس ادارے کے سائنس داں اکثر آذربائیجان کے مختلف علاقوں میں جاتے رہتے ہیں۔ ان سائنسدانوں نے حال ہی میں ایک پہاڑی گاؤں "ویکابند" کا دورہ کیا اور وہاں مجید آغائیف سے ملاقات کی، یہ ۱۳۲ برس کے ہیں۔ شاید مجید دنیا کے معمّر ترین گلّہ بان ہیں۔ اپنی عمر کے باوجود مجید بابا اب بھی عزیز بیگ اجتماعی کھیت میں بھیڑوں کی گلّہ بانی کرتے ہیں۔ اور روزانہ پہاڑی راستوں پر ۱۰ سے ۱۲ کلومیٹر تک پیدل چلتے ہیں۔ ان کے کھانے کا معمول اوسط درجہ کا ہے۔ وہ روزانہ چار وقت کم مقدار میں کھاتے ہیں۔ ان کے کھانے میں دودھ کی بنی ہوئی چیزیں، شہد، پنیر اور سبزیاں شامل ہیں۔ چائے بالکل نہیں پیتے۔ ہاں چشمے کا ٹھنڈا پانی بہت پسند کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی شراب نہیں چکھی۔ لیکن اپنے خاص کھیت کی تیار کردہ تمباکو۔ "موزکا" ضرور پیتے ہیں۔

آذربائی جان کے استیپی علاقوں میں بھی ۱۰۰ برس یا اس سے زیادہ عمر کے لوگ کافی تعداد میں ہیں۔ "کاؤسکی" ضلع کے "کوئیار" دیہات میں محمد علی پیروف رہتے ہیں۔ ان کی عمر ۱۰۲ برس ہے ان کے ۱۹ بچے ہیں۔ ان کے لڑکوں اور لڑکیوں

ی کھیتی باڑی کے ماہر، آئل انجینیئر، مشین آپریٹر، ٹر، تجارتی کارکن اور استاد ہیں۔

میلیسکی اسٹیپی کے دیہات میں شیرین حسن اوف تے ہیں۔ انھیں مسلوف کا چھوٹا بھائی کہا جاتا ہے۔ اوف کی عمر ۱۵۲ برس ہے۔ سو برس سے زیادہ ل وہ گلہ بانی کرتے رہے اور اپنی زندگی کا ز وقت کھلے میدانوں میں گذارا۔ یہ بڑے میاں بھی اپنی زندگی کا انداز بدلنا نہیں چاہتے۔ سال پنے مکان کے کھلے برآمدے میں، لکڑی کے تخت پر سوتے ہیں۔ جس پر صرف ایک ہلکا ن بچھا رہتا ہے۔

حسن اوف کبھی بیمار نہیں پڑے۔ اور جب ڈاکٹروں نے ان کا معائنہ کیا انھیں کسی مرض ی نشان نہیں ملا۔ وہ اپنے گاؤں سے کبھی باہر گئے۔ نہ کبھی شراب چکھی۔

یہ بڑے میاں ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے یہ اکثر اجتماعی کھیت کے احاطے میں اور مویشی گھر نظر آتے ہیں۔ سماجی کام کرتے ہیں۔ "جبریئیلسکی" کے "چیربکنسکی" دیہی سوویت کے رکن منتخب ہیں۔ زراعت کی مجلس قائمہ کے رکن ہیں۔

شیرین بابا نے بھی، اپنے "بڑے بھائی" ن کی طرح، تیسری بار شادی کی ہے۔ ، بیگم شہان عجلہ اپنے شوہر سے ۷۰ برس چھوٹی

مثالی جوڑا:۔ میاں اور بیوی ناصر اور قائموف ہم عمر ہیں۔ وہ دونوں ۱۲۵ برس کے ہیں۔ ان دونوں نے شاندار ریکارڈ قائم کیا ہے کہ ایک صدی سے بھی زیادہ عرصہ سے وہ ایک ساتھ ہیں۔ کبھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔

ایک سو برس سے زیادہ عمر کے تمام لوگوں نے اس سوال کا کہ اتنی طویل عمر تک وہ کس طرح زندہ ہیں؟" یہی جواب دیا۔ "جسمانی محنت انسان کو جوان رکھتی ہے۔" اور "ناگورنی کاراباغ" کے رہنے والے "سرکیس ارستم یان" (عمر ۱۳۳ برس) نے بتایا کہ "آپ کا پسندیدہ کام تمام بیماریوں کی بہترین دوا ہے۔"

تعلیمی تاش

چھوٹے اور بڑے سب ہی کے لیے ایک بہترین کھیل ہے، اس کے کھیلنے سے وقت ضائع نہیں ہوتا بلکہ قابلیت بڑھتی ہے

تعلیمی تاش اردو	1/40
،، ،، انگریزی	1/90
،، ،، ہندی	1/90
،، صرف ہندی	1/90
،، ،، انگریزی	1/50

جناب رفیق شاستری

پنچ تنتر کی کہانیاں





لاکھ عقل مچھلی ایک عقل بینڈک

ایک تالاب میں بہت سی مچھلیاں رہتی تھیں۔ ان میں دو مچھلیاں سب سے زیادہ ہوشیار تھیں۔ ایک تھی ہزار عقل مچھلی، اور دوسری لاکھ عقل مچھلی۔ ان دونوں مچھلیوں کی دوستی ایک مینڈک سے تھی اس کا نام تھا ایک عقل مینڈک۔ مچھلیاں ہزار عقل اور لاکھ عقل والی تھیں، اس لیے انھیں اپنی عقل پر بہت ناز تھا۔ بینڈک بے چارے کی بس ایک عقل تھی۔ اس لیے وہ اپنی عقل پر ناز نہیں کرتا تھا۔ تینوں میں گہری دوستی تھی۔

ایک دن شام کے وقت تینوں تالاب کے کنارے بات چیت میں مصروف تھے۔ ادھر اُدھر کی گپ ہانک رہے تھے کہ مینڈک نے دیکھا کہ دو مچھیرے چلے آرہے ہیں۔ ان مچھیروں کے جال میں کافی مچھلیاں بھی ہیں۔ بینڈک نے بات چیت بند کی اور ان دونوں مچھلیوں کو مچھیروں کے آنے کا اشارہ کیا۔

تالاب کی اور مچھلیاں بھی وہاں آگئیں۔ اور سب چھپ کر مچھیروں کی باتیں سننے لگے۔ ایک مچھیرا کہہ رہا تھا" اس تالاب میں کافی مچھلیاں ہیں۔ کل یہیں مچھلیاں پکڑنے آئیں گے۔" دوسرے مچھیرے نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اور کہنے لگا" کل یہیں سب جال لے کر آجائیں، یہاں کافی مچھلیاں معلوم ہوتی ہیں۔"

یہ کہہ کر مچھیرے واپس چلے گئے۔ مچھیروں کی باتیں سن کر مچھلیاں بہت گھبرائیں، اور انھوں نے فوراً اپنا اجلاس طلب کیا۔ سبھی اس فکر میں تھے کہ اس آفت سے کیسے نجات حاصل کی جائے۔ مگر لاکھ عقل مچھلی کا اس پر کوئی اثر نہیں تھا۔ وہ الٹے دوسری مچھلیوں کا مذاق اڑا رہی تھی کہ یہ خواہ مخواہ کی فکر کر رہی ہیں۔ میں جانتی ہوں کہ وہ نہیں آئیں گے، ڈرنے سے کوئی فائدہ نہیں، بدنیت آدمیوں کی ساری باتیں پوری نہیں ہوتیں۔ اگر ان کی سبھی باتیں پوری ہونے لگیں تو دنیا میں کسی کے لیے زندہ رہنا مشکل ہو جاتا۔ کسی کی بات سن کر ڈرنے لگنا بزدلی کی بات ہے۔ میں جانتی ہوں وہ یہاں آنے سے رہے، اور اگر بالفرض آ بھی گئے، تو میں اپنی لاکھ عقل سے تم سب کو بچا لوں گی۔"

ہزار عقل نے لاکھ عقل مچھلی کی ہاں میں ہاں ملائی اور کہنے لگی تم لوگوں کو ہماری عقل کا اندازہ نہیں ہے۔ جہاں سورج کی روشنی اور ہوا نہیں پہنچ پاتی ہے، وہاں ہماری عقل پہنچ جاتی ہے۔ گھبراؤ نہیں اگر وہ آ بھی گئے تو ہم اپنے علم کے سہارے ان کے سبھی داؤں کو بے کار کر دیں گے۔"

تالاب کی مچھلیوں نے تو ان کی باتوں پر یقین کر لیا۔ مگر مینڈک نے کہا کہ" دوستو! میرے پاس تو ایک ہی عقل ہے، وہ عقل کہتی ہے کہ میں راتوں رات اپنے بال بچوں سمیت یہاں سے کہیں چلا جاؤں میرا تو دل کہتا ہے کہ یہ مچھیرے کل ضرور آئیں گے اور اپنا جال پھیلا کر سبھی کو پکڑ لے جائیں گے۔۔۔ دوستو! میں تو چلا! یہ کہہ کر مینڈک، مینڈکی اور اس کے بال بچے اس تالاب سے چلے گئے۔

دوسرے دن صبح ہی صبح مچھیرے اپنا جال لے کر تالاب پر آگئے۔ لاکھ عقل اور ہزار عقل مچھلیوں کی ایک نہ چلی اور ساری مچھلیاں جال میں پھنس گئیں۔ شام کو مچھیرے مچھلیوں کو لے کر جس راستے سے گزر رہے تھے اس کے پاس ایک گڑھے میں "ایک عقل مینڈک" چلا آیا تھا۔ جب اس نے مچھلیوں کو جال میں پھنسا ہوا دیکھا تو اپنی مینڈکی سے کہنے لگا۔" بی مینڈکی! علم سے عقل کا درجہ بڑا ہوتا ہے، اور لاکھ عقل سے ایک عقل ہونا بہتر ہے۔"

یہ کہانی سننے کے بعد چکر والے نوجوان نے پوچھا" تو کیا ہمیشہ دوست کی صلاح ماننی چاہیے" سونے والے دوست نے جواب دیا کہ۔

"دوستوں کی باتوں کی پرواہ نہ کرنا اچھا نہیں ہے جو آدمی اپنے علم اور عقل کے غرّے میں یا کسی لالچ میں پڑ کر دوست کی باتیں ان سنی کر دیتے ہیں، وہ پچھتاتے ہیں۔ جیسے کہ اپنے دوست گیدڑ کی بات نہ مان کر گدھے کو پچھتانا پڑا تھا۔

چکّر والے نوجوان نے پوچھا "وہ کیسے؟"

تب سونے والے دوست نے یہ کہانی سنائی۔

....

ایک گاؤں میں منگت نام کا ایک دھوبی رہتا تھا۔ اس کے پاس کپڑے لانے لے جانے کے لیے ایک گدھا تھا۔ گدھا دن بھر دھوبی کا کام کرتا اور رات کو آزادی سے کھیتوں میں گھومتا پھرتا تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ گھر واپس آجاتا۔

رات میں کھیتوں کی سیر کے لیے آتے جاتے ایک گیدڑ کے ساتھ اس کی جان پہچان ہو گئی۔ آپ جانتے ہیں کہ گیدڑ دوستی کرنے میں بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ گدھے کے ساتھ گیدڑ میاں بھی کھیتوں میں جانے لگے۔ دونوں رات بھر کھیت کو چرتے اور صبح ہونے سے پہلے گھر واپس آجاتے۔

اب ایک دن کا ماجرا سنو۔ چاندنی رات پھیلی ہوئی تھی۔ چاندنی رات میں دور تک لہلہاتے ہوئے کھیت عجیب بہار دکھا رہے تھے۔ گدھے کے دل میں امنگ پیدا ہوئی اور وہ گیدڑ سے بولے "بھئی آج کتنی اچھی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ آج تو خوب جی بھر کر گانا گانے کو جی چاہتا ہے۔ مجھے ساری راگنیاں یاد ہیں، تمھیں جو پسند ہیں وہی سناؤں!"

گیدڑ نے چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا: "ارے ایسا غضب نہ کرنا۔ اپنی مصیبت کو دعوت مت دو۔ تمھیں یہ یاد نہیں کہ ہم لوگ چوری سے یہاں ککڑیاں کھانے آتے ہیں۔ چور کے لیے بولنا تو دور کی بات، کھانسنا بھی منع ہے۔ پھر تم نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ تمھاری آواز باریک نہیں ہے۔ کافی تیز اور بھاری ہے۔ ان کھیتوں کے باہر کھیت والے سو رہے ہیں۔ تمھاری بے وقت کی راگنی سن کر وہ جاگ جائیں گے اور پھر ہم دونوں کی خیریت نہیں۔ چپ چاپ ان ککڑیوں کو مزے لے لے کر کھاؤ اور راگ رنگ کی امنگ کو بھول جاؤ"

گیدڑ کی یہ نصیحت گدھے میاں کو کچھ اچھی نہیں لگی کہنے لگے۔ "تم جنگل کے باسی ٹھہرے، تمھیں کیا معلوم کہ راگ رنگ میں کیا مزا ہے۔ اسی لیے تو تم ایسی باتیں کر رہے ہو۔"

گیدڑ تھا ہوشیار اس نے ایک بار پھر گدھے کو گانے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کہا کہ۔ "ہاں بھئی، ہم تو راگ رنگ نہیں جانتے، مگر تمھاری آواز بھی گانے کے لیے موزوں نہیں ہے۔ بھلا ڈھیچوں ڈھیچوں کی آواز میں کون سی دھن نکل سکتی ہے۔ اس لیے تمھاری الاپ سن کر کھیت والے ہم دونوں پر پل پڑیں گے۔"

گدھے کو گیدڑ کی اس بات سے اور بھی غصہ آیا، مگر غصہ کو ضبط کرتے ہوئے بولا۔ "دوست تمھیں کیا معلوم کہ مجھے راگنیاں آتی ہیں یا نہیں۔ میں نے تمھیں بتایا ہی نہیں کہ میں ساری راگنیوں میں استاد ہوں۔ میرے گلے سے ایسا نغمہ پھوٹتا ہے کہ سننے والے مدہوش ہو جاتے ہیں، اور تمھیں یہ ساری باتیں بتانے سے فائدہ بھی کیا تھا۔ تم تو سرے سے جانتے ہی نہیں، کہ راگ راگنی بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔"

گیدڑ نے جب دیکھا کہ گدھا کسی قیمت پر نہیں مانے گا تو اس نے کہا۔ "اچھا صاحب! آپ شوق سے راگنی چھیڑیں میں باہر چوکیداری کرتا ہوں۔"

گیدڑ کے چلے جانے کے بعد گدھے نے اپنی بے وقت کی راگنی چھیڑ دی۔ گدھے جی پوں جی پوں کی آواز سنتے ہی کھیت والے دوڑے آئے اور لاٹھیوں سے گدھے کی مرمت کر ڈالی۔

...... × ......

یہ کہانی سنا کر چکّر والے نوجوان نے کہا کہ دوست بات تمھاری ٹھیک ہے، جس کے پاس عقل نہ ہو اور دوست کی بات بھی نہ مانے تو وہ متحرک جولا ہے کی طرح تباہ ہو جاتا ہے۔"

سونے والے دوست نے پوچھا کس جولا ہے کی طرح؟ چکّر والے نوجوان نے تب متحرک جولا ہے کی یہ کہانی سنائی۔

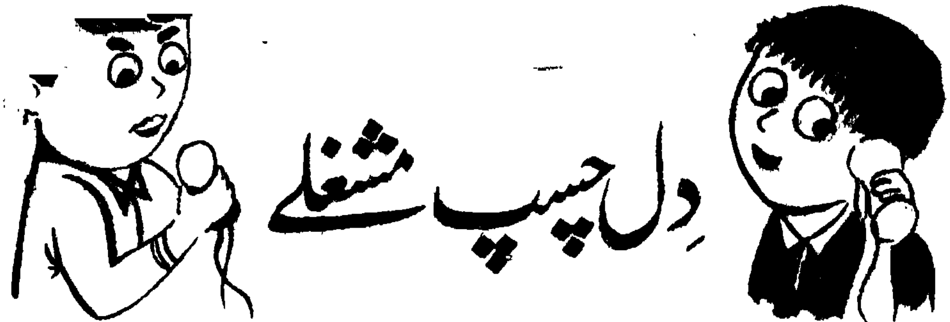
(باقی آئندہ)

جناب کوثر نیازی رہتاسوی

برسات

دیکھو بادل نیلے نیلے
نیلے نیلے، پیلے پیلے
رِم جھم رِم جھم پانی برسے
نکلو بچو اپنے گھر سے
لوگ چلے کھیتوں کو اپنے
بجلی کڑکے، پانی برسے
کیچڑ سے وہ لت پت ہوں گے
کھیتوں میں جب کام کریں گے
کتنی محنت یہ کرتے ہیں
غلے سے جھولے بھرتے ہیں
ان کے بچوں کو بھی لاؤ
گیت خوشی کے مل کر گاؤ
کتنا اچھا رب ہے ہمارا
جس نے پانی یہ برسایا
شام ہوئی اب کھیت سے آؤ
کوثر اپنے گھر کو جاؤ

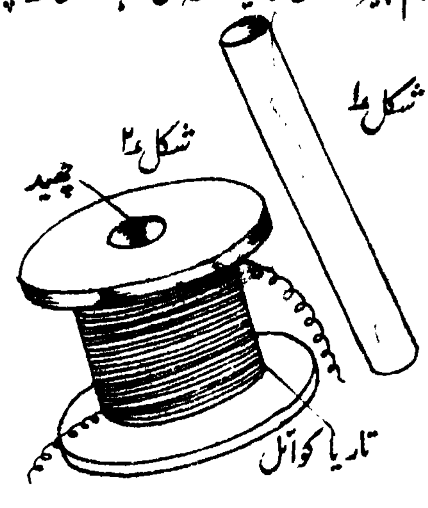
جناب سید حسن قہر

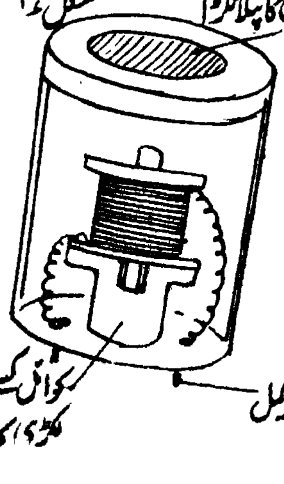


دِل چسپ مشغلے

محمود میاں نے ایک دفعہ ایک بغیر سیل کے چلنے والا ٹیلیفون بنایا تھا۔ سب نے ان کو بڑی شاباشی دی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ "بھیا! یہ تم نے کس طرح بنا لیا؟" تو محمود میاں نے مجھے اس کے بنانے کی ترکیب بتائی تھی۔ جس کی مدد سے میں نے بھی ایک چھوٹا سا ٹیلیفون کا سٹ بنایا تھا۔ اب وہی ترکیب میں آپ کو بھی بتاتا ہوں۔ اپنے ہاتھ سے ٹیلیفون کا سٹ بنا کر شاباشی حاصل کریں۔

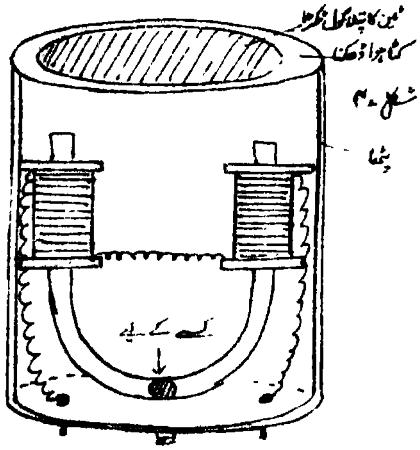
ٹیلیفون میں دو چیزیں بڑی اہم ہوتی ہیں ایک وہ آلہ جس کی مدد سے پیغام بھیجا جاسکے اس آلے کو ٹرانسمیٹر کہتے ہیں۔ دوسرا وہ آلہ جس کی مدد سے ہم دوسری طرف سے بھیجا ہوا پیغام سن سکتے ہیں۔ یہ ریسیور کہلاتا ہے۔ اگر ہم مکمل سٹ بنانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے ہمیں دو ٹرانسمیٹر اور دو ریسیور بنانے پڑیں گے۔ ایک ٹرانسمیٹر اور ایک ریسیور ایک ٹیلیفون ہوگیا۔ اس طرح دو ٹیلیفون بنے اور دونوں کو ملا کر ہم سیٹ کہیں گے۔ جس کی مدد سے سو گز دور بیٹھے ہوئے آدمی سے بات چیت کر سکتے ہیں۔ لیجیے اب بنانے کی ترکیب سنیے۔ ٹرانسمیٹر بنانے کے لیے سب سے پہلے ہمیں ایک ڈبیا چاہیے ہے۔ اگر گول ہو تو بہتر ہے۔ دوسری چیز ایک بیلن نما لمبا مقناطیس (جس کی شکل تصویر نمبر ۱ میں دیکھ سکتے ہیں) تیسری اہم چیز تاروں کا ایک کوائل ہے، اس کو آپ اپنے





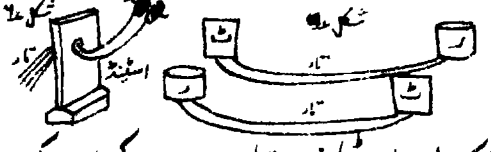
ہاتھ سے بنا سکتے ہیں۔ اس کے لیے لکڑی کا ایک گٹّو لیجیے (جس کو شکل نمبر۲ میں دکھایا گیا ہے) اس پر شکل میں دی ہوئی طرح سے تار چڑھا دیجیے۔ بس آپ کا کوائل تیار ہے۔ اب کوائل کے بیچ میں سے ہو کر جو چھید جاتا ہے اس میں اس طرح سے مقناطیس ڈال دیجیے کہ دونوں طرف سرے برابر نکلے رہیں۔ اب ڈبیا لیجیے اس کے ڈھکنے کو شکل ۳ کی طرح سے کاٹ لیجیے اب کسی پتلے ٹین کا گول ٹکڑا لیجیے ٹکڑا اتنا پتلا ہونا چاہیے کہ پھونک مارنے سے اس میں کچھ لرزش پیدا ہو جائے۔ اب ڈبیا میں کوائل رکھیے اور دی ہوئی شکل تین کی طرح سے فٹ کر لیجیے۔ یعنی کوائل کے دونوں تار ڈبیا کے نیچے چھید کر کے دو کیلوں میں پھنسا دیجیے۔ پھر کوائل کو اتنا اونچا اٹھا یئے کہ ڈبیا کے منھ سے آدھا انچ رہ جائے۔ پھر ٹین کا وہ ٹکڑا کاٹے ہوئے ڈھکن میں وہیں فٹ کر دیجیے۔ خیال رہے کہ کوائل اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔ پھر ڈھکن فٹ کر دیجیے۔ بس ٹرانسمیٹر تیار ہے۔ اب رسیور بنایئے اس کے بنانے کے لیے بھی ایک ڈبیا اور ایک نعل کی صورت کا ملائم لوہے (SOFT IRON) کا ٹکڑا لیجیے اور اب کے دو کوائل بنا کر ٹکڑے کے دونوں سروں پر شکل نمبر۴ کی طرح فٹ کر لیجیے اور پہلے ہی کی طرح ڈبیا کا ڈھکنا کاٹ کر ٹین کا پہلے ہی جیسا ٹکڑا لے لیجیے اور اس کو ڈھکن میں فٹ

وہ ٹکڑا اس طرح رکھیے کہ اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔



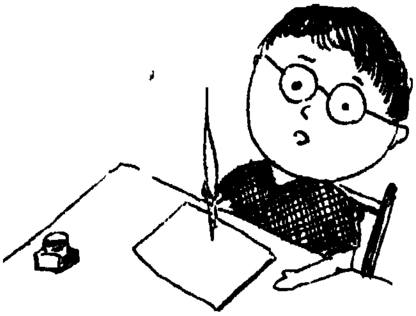
شکل ۴

اب ڈھکن کس دیجیے اور پہلے کی طرح دو تار کوائلوں کے باہر ڈبیا سے نکال لیجیے اور اب دونوں تاروں کو جو ٹرانسمیٹر اور رسیور سے نکلے ہیں شکل نمبر۵ دیکھ کر



فٹ کر لیجیے بس ٹیلیفون تیار ہے۔ مزے کی بات یہ کہ نہ سیل نہ بیٹری۔ کچھ بھی نہیں مگر پھر بھی ٹیلیفون ہے۔ آپ ہی آپ چلتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ٹین کا وہ پردہ جو ٹرانسمیٹر میں لگا ہے، ہمارے بولنے پر کپکپاتا ہے اور اس کپکپاہٹ کی وجہ سے مقناطیس کی مدد پاکر کوائل میں خود ہی بجلی پیدا ہو جاتی ہے، جو ٹیلیفون کو چلاتی ہے۔ بس اب آپ اپنے ہاتھ سے بنا ہی لیجیے اس ٹیلیفون کو! ہاں اتنا اور کر لیجیے ڈبیوں کے پیندے اور دیواروں پر نرم گتا اور لگا دیجیے تاکہ تار ڈبیا کی دیواروں کو نہ چھوئیں۔ ورنہ ٹیلیفون بالکل کام نہیں

بچوں کی کوششیں





میں شہید ہوں

نپولین اعظم نے RATISBON نامی شہر پر
چڑھائی کی۔ وہ خود شہر کے باہر میل ڈیڑھ میل کے
فاصلے پر رک گیا۔ اور فوجوں کو LANNES کی
سرکردگی میں آگے روانہ کیا۔ مگر ہر لحظہ اس کو نتیجے
کی فکر تھی۔ اس ٹیلے پر پشت پر ہاتھ باندھے گردن کو
آگے نکالے کھڑا سوچ رہا تھا کہ اگر LANNES ذرا بھی
چوک گیا تو میری تمام آرزوئیں خاک میں مل جائیں گی
اس جنگ کی فتح پر اس کے آئندہ ارادوں کا دارومدار
تھا۔ اتنے میں اس نے دیکھا کہ توپوں کے دھوئیں میں ایک
سوار تیر کی طرح تیزی سے اس کی طرف بڑھتا چلا آرہا
ہے۔ یہ سوار ایک لڑکا تھا۔ اس کے ہونٹ آپس میں
بھنچے ہوئے تھے۔ غور سے دیکھنے پر پتہ چلا کہ اس کے سینے
میں کاری زخم لگا ہے۔ ہونٹ اس نے اس لیے بند
کر رکھے تھے کہ پہنچنے اور فتح کی خبر سنانے سے پہلے کہیں
زیادہ خون نکل جانے سے وہ راستے میں ختم نہ ہو جائے
اس نے شہنشاہ سے کہا: "اے آقا! مبارک ہو۔ آپ
کی فوجوں کو فتح ہوئی LANNES اس وقت صدر بازار
میں فوج کی کمان کر رہا ہے۔ اور خود میں نے اپنی آنکھوں
سے آپ کے جھنڈے کو لہراتا دیکھا ہے۔ اب
اس کو جلد اپنی آنکھوں سے لہراتا دیکھیں گے۔"
یہ سن کر نپولین کی آنکھوں میں خوشی
لہر دوڑ گئی۔ مگر دوسرے ہی لمحے اس کی آنکھیں
ہو گئیں۔ بالکل اسی طرح جیسے عقاب اپنے زخمی
کو دیکھ کر غمگین ہو جائے۔ شاہ نے سپاہی سے
کہا "تم بہت زخمی ہو گئے ہو"۔ سپاہی نے
فخر سے کہا۔ "نہیں جناب! میں شہید ہو چکا ہوں"
کہہ کر وہ زمین پر گر گیا اس کے ہونٹوں پر شہید
کی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

سید ذوالفقار احمد اد

لطیفے

ایک شخص کو جیب کاٹنے کے جرم میں عدالت
میں پیش کیا گیا۔

جج: (جیب کترے سے) تم نے جیب کیسے کاٹی

جیب کترہ: (ٹھنڈی سانس بھر کر) حضور آپ سیکھ کر کیا
کریں گے۔"

ایک شاعر نے ڈاکٹر کو فون کیا کہ وہ جلدی ان کے گھر آئیں۔ ان کے چھوٹے بچّے نے ان کا قلم نگل لیا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا: "میں فوراً آرہا ہوں۔ مگر میرے آنے تک آپ کیا کریں گے؟"

"کرنا کیا ہے۔ تب تک میں پنسل سے کام چلا لوں گا۔" شاعر نے جواب دیا۔

ایک منیجر صاحب ذرا اونچا سنتے تھے۔ اس لیے فون کی گھنٹی اکثر بجتی ہی رہ جاتی۔ کانوں کے علاج کے لیے انھوں نے آپریشن کروایا۔ ایک روز فون پر ایک شخص نے دریافت کیا۔ "کہیے آپریشن سے کچھ فائدہ ہوا؟"

منیجر صاحب نے کہا۔ "پہلے گھنٹی بجتی رہتی تھی فون کا جواب نہ دے سکتا تھا۔ لیکن اب گھنٹی بجے نہ بجے میں فون کا جواب دے دیا کرتا ہوں۔"

...... افضل امام کلکتہ

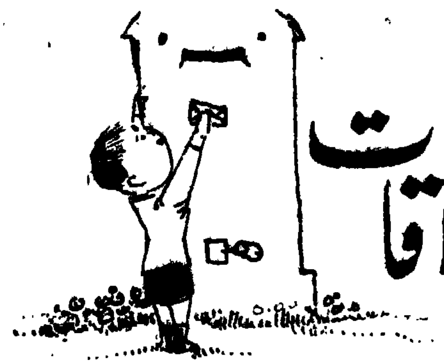
بلّی خالہ

دیکھو یہ ہے بلّی رانی
جو ہے ہمارے گھر کی باسی
میاؤں میاؤں کرتی ہے
آہا، آہا، بلّی خالہ
کہتے ہیں سب بچّے پوسی پوسی
پوسی پوسی خالہ خالہ
چوہے ڈر کر بھاگے اس سے
شیر کی بھی یہ خالہ ہے
آہا آہا بلّی خالہ
اس کی صورت بھولی بھالی
اس کی رنگت پیاری پیاری
آہا آہا بلّی خالہ

رضوانہ پروین مدرسہ ابتدائی جامعہ

ایک سوداگر اور گدھا

ایک سوداگر نے سنا کہ سمندر کے نزدیک نمک بہت ہی سستا ملتا ہے۔ وہ اپنے گدھے کو لے کر وہاں گیا اور اس پر لاد کر گھر کی راہ لی۔ راستے میں گدھا ایک ٹیلے پر سے پھسل کر ندی میں گر پڑا سارا نمک پانی میں مل کر گھل گیا۔ وہ گدھا کنارے پر پہنچا تو دیکھا کہ بوجھ بہت کم ہو گیا ہے۔ تھوڑے دنوں کے بعد سوداگر پھر وہاں گیا اور اس پر نمک لاد کر گھر کی طرف چلا۔ گدھا جب ندی کے نزدیک پہنچا تو اس کو پرانی بات یاد آئی۔ وہ جان بوجھ کر ندی میں بیٹھ گیا۔ اور اس کا سارا نمک پانی میں گھل گیا۔ اور بوجھ ہلکا ہو گیا۔ سوداگر نے گدھے کی چالاکی سمجھ لی۔ تیسری بار وہ گدھے کو لے کر وہاں گیا اور روئی خرید لی۔ جب وہ ندی پر واپس آیا تو اس نے وہی چالاکی چلی۔ لیکن روئی نے پانی چوس لیا اور زیادہ بھاری ہو گئی۔ جب وہ کنارے پر پہنچ گیا تو دیکھا کہ بوجھ دگنا ہو گیا ہے۔



آدھی مُلاقات

"پیام تعلیم" کا ایک خاص انداز جو بچوں کے لیے دل چسپ معلوماتی اور اصلاحی ہے مجھے بہت پسند ہے ۔ خدا آپ کے حوصلوں کو بلند رکھے ۔ آمین !

آپ کا

شوکت حیات

مکرمی تسلیم !

نظم کی پسندیدگی کا شکریہ ! پیام تعلیم کا تازہ شمارہ بھی موصول ہوا ۔ یوں پیام تعلیم میں میری کہانیوں کے اشتہارات برابر چھپتے رہتے ہیں لیکن مجھے اعتراف کر لینے دیجیے کہ میں نے پہلے کبھی اس کا غائر مطالعہ نہیں کیا ۔ لیکن جون کے شمارے کے مطالعے کے بعد مجھے افسوس ہوا کہ میں غلطی پر تھا ۔ آپ بچوں کے لیے ایک اچھا صحت مند ادب پیش کر رہے ہیں ۔ پیام تعلیم کی پوری فضا میں کہیں پر اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا ۔ آپ کا مشن بڑا نیک ہے ۔ خدا آپ کو اس میں کامیاب رکھے ۔ اور ستھری تعلیم کا تعلیم ہر جگہ پہنچے

آمین عبداللہ کمال

میں آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ پیام تعلیم میں معمّہ کا سلسلہ شروع کر دیں ، تو یہ رسالہ بہت ترقی کر سکے گا ۔ میں بھی ایک پیامی ہوں اس لیے کہہ رہا ہوں ۔ امید ہے کہ آ [illegible]

پیام تعلیم کا پیامی

ظفرالحسن ہا[illegible]

پیام تعلیم ماہ جون کے شمارے میں " اسے کی سنتان " نظم جناب کوثر اعظمی کی تحریر کردہ اور " تلاش " جناب مناظر عاشق ہرگانوی صاحب کی لکھ[illegible] بے حد پسند آئیں ۔ آپ کی نظر انتخاب کی داد دیتا [illegible] اور امید کرتا ہوں کہ پرچہ کا مستقبل شاندار رہے گا ۔

این ۔ اے ۔ انصاری وا[illegible]

پیام تعلیم میں کہانیوں کا حصہ پسند آیا ۔ پہلے آخری جز کی چھپائی کچھ اڑی اڑی سی ہے ۔ ہاں ٹا[illegible] اب بہت پٹ گیا ہے ۔ بدل دیجیے تو اچھا ہے ۔

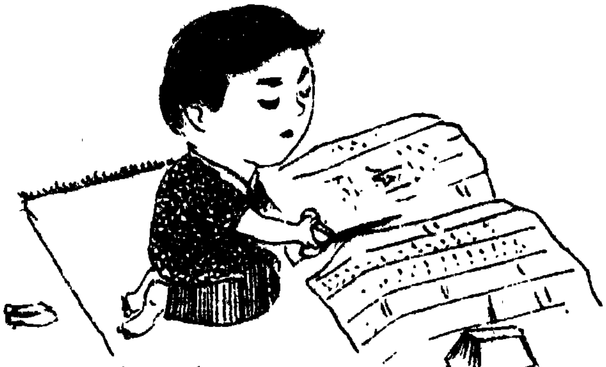
آدھی ملاقات کے صفحات نہ دیکھ کر [illegible] ہوئی ۔ اسے ضرور دیا کیجیے ۔ خواہ کوئی اور مضمون روکنا پڑے ۔

جوبلی نمبر کے لیے اگر آپ ہر مضمون [illegible] عنوانات الاٹ کر دیں تو بہتر ہے ۔

ولی صاحب کی خدمت میں سلام عرض[illegible] والد صاحب سلام عرض کرتے ہیں ۔ آپ کا خا[illegible]

[illegible]

صحافی



اِدھر اُدھر

پیرو میں زلزلہ

پچھلے مہینے کی آخری تاریخوں میں، جنوبی امریکہ کی ایک ریاست پیرو میں بڑا زبردست زلزلہ آیا... منٹوں سکنڈوں میں شہر، قصبے، گاؤں کھنڈر بن گئے۔ آس پاس کے پہاڑوں پر برف کے پہاڑ تھے۔ زلزلے کے اثر سے برف میں دراڑیں پڑ گئیں۔ ان دراڑوں میں سے پانی سیلاب کی صورت میں نیچے آیا۔ اس نے رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اندازہ ہے کہ پچاس ہزار آدمی اس زلزلے کی نذر ہو گئے۔ کچھ لوگوں کا تو خیال ہے کہ لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ آدمی مرے۔ خدا کی پناہ! آسٹریلیا کے سائنسدانوں کا خیال ہے کہ فرانس نے ایٹم بموں کے جو تجربے کئے تھے، انھی تجربوں کی وجہ سے پیرو میں زلزلہ آیا ہے۔

یہ مصیبت بے سان گمان آتی ہے۔ اس طرح آتی ہے کہ انسان کو اپنے کو بچانے کی بھی مہلت نہیں ملتی۔ ہماری سائنس نے کیسی کچھ ترقی کر لی ہے۔ پر ابھی تک کوئی ایسا طریقہ معلوم نہیں ہوا کہ زلزلے کے آنے سے پہلے اس کا پتہ لوگوں کو لگ جائے۔

ویسے روس، امریکہ اور یورپ کے سائنسداں برابر اس کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔ پچھمی جرمنی میں زمینی علم (ماہر طبقات الارض) کے ماہر ڈاکٹر ورنو ایرنسٹ نے زلزلوں کے بارے میں پیش گوئی کا ایک نیا طریقہ معلوم کیا ہے۔ انھوں نے ابھی پچھلے دونوں بہار کے موسم میں جرمنی میں زلزلے کے ایک چھوٹے سے زلزلے کی پیش گوئی چار گھنٹے پہلے کی تھی۔ اور یہ پیش گوئی صحیح ثابت ہوئی۔ ان کا یہ طریقہ اس مشاہدے پر مبنی ہے کہ زمین کے اندر جو بخارات جمع ہیں زلزلہ آنے سے چند گھنٹے پہلے ان میں غیر معمولی تبدیلیاں ہونے لگتی ہیں۔ غالباً لاوے کے ملنے کی وجہ سے زمین کی اتاہ گہرائیوں میں ایسی دراڑیں پڑ جاتی ہیں جن کے راستے زمینی گیسیں اوپر اٹھنے لگتی ہیں۔ اور اس سے اوپر کی سطح میں جو بخارات ہیں ان کی نوعیت اور مقدار میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اگر یہ نیا طریقہ ہر قسم کے زلزلوں کا پتہ لگانے میں کامیاب ثابت ہوا تو شاید زمین کے اندر کے بخارات کی مسلسل چھان بین کے ذریعے زلزلوں پر قابو پانے کا آسان طریقہ اختیار کیا جا سکے۔

(اطلاعات جرمنی)

دو ارب سال پرانا جوالا مکھی:

روسی ماہرین ارضیات (زمین کے علم کے ماہروں) نے چیکاسی شہر کے پاس ایک کوہ آتش فشاں یا جوالا مکھی پہاڑ دریافت کیا ہے۔ یہ اندازاً دو ارب سال پرانا ہے اور اس وقت بجھ گیا تھا جب زمین پر دھیرے دھیرے زندگی شروع

ہو رہی تھی۔ اس جوالا مکھی پہاڑ کے گڑھے میں جھیل بن گئی۔ اس جھیل میں لاکھوں کروڑوں سال تک طرح طرح کی کائیاں پیدا ہوتی رہیں اور مرتی رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ چرکاسی کے نزدیک آگ سے جل اٹھنے والے اعلیٰ درجے کے سلیٹی رنگ کے نرم پتھروں کے بڑے بڑے ذخیرے بن گئے یہ ذخیرے ایک ارب ٹن کے برابر ہیں۔

(سوویت خبر نامہ)

گھریلو موسیقی سے ذہنی بیماریوں کا علاج

عموماً بچے ذہنی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں... باتوں کو سمجھنے کی انھیں یاد رکھنے کی صلاحیت ان میں کم ہو جاتی ہے۔ آرتھر کوبرگر مغربی جرمنی کے ایک ترقی پسند اسکول کے استاد ہیں۔ انھوں نے ان ذہنی بیماریوں کا ایک دل چسپ علاج تجویز کیا ہے:۔ گھریلو موسیقی۔ اس موسیقی میں اعضا کو اور تنفس کو موسیقی کی دھن سے ہم آہنگ رکھا جاتا ہے۔ بیمار کا پورا دھیان موسیقی کی طرف رہتا ہے۔ پھر بھی اس کا دل و دماغ پورے طور پر سکون پر آجاتا ہے۔ ماسٹر صاحب کو اس علاج میں قابل ذکر کامیابی ہوئی ہے۔ تصویر سامنے کے صفحے پر)

گتے کی عینکوں سے نظر کا علاج

مغربی جرمنی میں عینک بنانے والوں نے گتے کی بنی ہوئی ۱۵۶ سوراخوں والی عینکیں سارے ملک میں تقسیم کی ہیں۔ ساتھ ہی ایک ہدایت بھی ہے۔ جو کوئی اس عارضی عینک سے ننگی آنکھ کی بہ نسبت بہتر دیکھ سکتا ہے اسے فوراً اپنی آنکھوں کی بینائی کا امتحان کرا[نا چاہیے]۔ بینائی کے اس مفت معائنے سے خاص آنکھوں کی بہت سی چھپی ہوئی بیماریوں کا [پتہ چلتا ہے]

(اطلاع)

خوب ہنسیے، ہنسنے سے عمر بڑھتی [ہے]

مغربی جرمنی کے مشہور ثقافتی مرکز جبڑوں اور مسوڑھوں کی تحقیقاتی انجمن دل چسپ دریافت کا اعلان کیا ہے: ہنسنے ... ہے۔ اس کی وجہ انھوں نے یہ بتائی کہ ہنسنے میں داخل ہونے والی آکسیجن کی مقدار بڑھ جاتی ..... اپنے دعوے کے ثبوت میں انھوں نے اعداد و شمار کے مطابق عورتیں مردوں سے ز[یادہ ہنستی ہیں] اور ان کی عمر بھی مردوں سے زیادہ ہوتی ہے

(اطلاعات)

قلمی دوستی اور صدر جمہوریہ ہند

صدر جمہوریہ ہند ہیل سنکی کی ایک چودہ [سالہ لڑکی] ایکالی کے لیے بطور تحفہ کچھ گڑیاں، ایک کرتا۔ پاجامہ۔ اور ایک دوپٹہ لائے ہیں۔ مسٹر گری [نے روانگی] سے قبل بمبئی سے راجندر بیر سنگھ نے صدر جمہوریہ [کو] دتی خط لکھا تھا کہ محصول کی زیادتی کے سبب میں یہ اپنی قلمی دوست کو ہیل سنکی نہیں بھیج سکتا۔ اگر آپ [لے جا] سکیں تو بہتر ہوگا۔ صدر جمہوریہ نے یہ زحمت کرلی۔

(الجمعیۃ)

. D. 1467 JULY 1970

Payam - i - Taleem

NEW DELHI-25.



صدر ت نا نیشنل فائن پریس دہلی میں طبع ہوا

ریاستہائے میسور، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، جموں کشمیر و ہریانہ کے
تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ پیامِ تعلیم نئی دہلی

جلد ۷ اگست ۱۹۷۰ء شمارہ ۸

ایڈیٹر
محمد حسین حسّان ندوی

صدر دفتر۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
شاخ، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اردو بازار۔ دہلی ۶
شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳
شاخ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے قیمت سالانہ ۶ روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد زکی نے جمال پریس دہلی میں

فہرست

بچّوں کی معلوماتی کتابیں

ڈاکو کی بیٹی
عابد زاہدی

ایک نہایت دل چسپ اور پُر مقصد کہانی جو بچّوں کی نفسیات کو مدِّ نظر رکھ کر لکھی گئی ہے۔ جس سے بچّوں کو اتحا
کا سبق ملتا ہے۔ دوستی، باہمی محبت، فرقہ پرستی کے خلاف جدوجہد، وطن کے لیے ایثار و قربانی۔ اور ملک کی ترقی
کے لیے اعلیٰ اخلاق اور تعلیم و تربیت۔ اور مل جل کر آگے بڑھنے کی روشنی ملتی ہے۔ خوبصورت ٹائیٹل۔ اچھی کتابت۔ قیمت ۴

نجومی آپا
اطہر پرویز

زہرہ آپا علی گڑھ سے ایم۔ ایس سی کا امتحان کیا دے کر آئیں کہ لگیں اپنی قابلیت کا رعب جمانے۔ انجم کو
جو سوجھی تو اس نے زہرہ آپا کا نام نجومی آپا رکھ دیا۔ لیکن ایک دن جب گھر کے سارے بچّے جمع تھے۔ نجومی آپا نے ایسی ایس
بتائیں، ایسی ایسی باتیں بتائیں کہ سارے کے سارے دنگ رہ گئے۔ نجومی آپا سچ مچ کی نجومی نکلیں۔ تم بھی پڑھو اور

قیمت ۵

ہمارا ذہن
از۔ دریکا اڈیپا۔ ترجمہ: اطہر پرویز

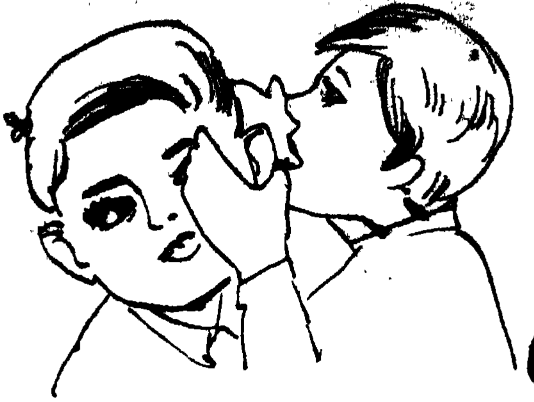
بات تو کچھ بھی نہیں ہوتی، مگر امّی جان مار بیٹھتی ہیں۔ ابّا جان ڈانٹ پلاتے ہیں، بھائی بہن کوئی جھگڑا کھڑا کر
ہیں اور دوست احباب ہاتھا پائی پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔ کیوں؟ وجہ اس کتاب میں پڑھو۔ اس کتاب کو پڑھنے سے نہ
اپنی نفسیات سے واقف ہو جاؤ گے۔ بلکہ کون کیا چاہتا ہے، یہ بھی تم کو معلوم ہو جائے گا۔ پھر نہ تو امّی جان کی مار
کا خطرہ رہے گا، نہ ابّا جان کی ڈانٹ کا، اور نہ بھائی بہن اور دوستوں کے جھگڑے کا۔

قیمت ایک

انمول رتن
اطہر پرویز

فرخ سیر بادشاہ کا نام تو تم نے سنا ہی ہوگا۔ ایک بار جب وہ کشمیر کی سیر کو گیا تو وہاں اس کی نظر فارسی اور سنسکرت
ایک بہت بڑے عالم پر پڑی۔ یہ تھے پنڈت راج کول۔ فرخ سیر راج کول کو ہندوستان کے دل "دلی" میں لے آیا اور ایک عالی شا
نہر کے قریب رہنے کو دی۔ دلّی والوں نے پنڈت جی کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور پیار سے "نہرو" کہنے لگے۔ تمھارے چاچا نہرو" اسی خاند
چشم و چراغ تھے۔ چاچا نہرو "انمول رتن" کیسے بنے؟ یہ تمھیں اس کتاب کے پڑھنے سے معلوم ہوگا۔ قیمت ۱/۵۰

ملنے کا پتہ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ، بمبئی ۳



بچّوں سے باتیں

دہلی میں اور دہلی سے باہر دوسری جگہوں پرہ
رمیوں کی لمبی چھٹیوں کے بعد اسکول اور کالج کھل گئے
ہیں۔ پُرانے ساتھی گلے مِل رہے ہیں۔ اور نئے ساتھیو
سے میل ملاپ ہو رہا ہے۔ یہ نئے ساتھی کچھ دنوں میں
پس میں گھل مِل جائیں گے، پھر سال بھر تک خوب
ں لگا کے پڑھیں گے، کھیلیں گے، کودیں گے پُھلیں
ریں گے۔ ہماری جامعہ میں تو آج کل خوب
ہل پہل ہے۔

یہ اگست کا مہینہ ہے۔ آج سے ۲۳ سال
ہلے ۱۹۴۷ء کی ۱۵ اگست کو ہم آزاد ہوئے تھے۔
ا اگست کی حیثیت ہمارے لیے تاریخی ہوگئی ہے۔
سارے دیس میں خوشی منائی جاتی ہے۔ جھنڈے
رائے جاتے ہیں۔ دیس کا وزیرِ اعظم دلّی کے لال قلعے
سے جنتا کے سامنے تقریر کرتا ہے۔ یہ تقریر بہت اہم
وتی ہے۔

ان ۲۳ سالوں میں ہم کہاں سے کہاں
پہنچ گئے ہیں۔ پہلے ہم سوئی تک نہ بنا پاتے تھے۔
اب ہمارے دیس کا سامان باہر ملکوں میں جاتا ہے۔
جگہ جگہ کارخانے کھل گئے ہیں۔ کھیتی باڑی کے لیے
نہریں جاری ہوگئی ہیں۔ ڈام یا بند بن گئے ہیں۔
بجلی گاؤں گاؤں پہنچ رہی ہے۔ گاؤں گاؤں میں
اسکول کھل رہے ہیں۔ پر ابھی کچھ پرانی بیماریوں
کا اثر باقی ہے۔ غلامی کے زمانے کی بیماریوں کا۔
اگر ہم ان بیماریوں: تعصب، تنگ نظری، فرقہ پرستی،
وغیرہ سے نجات پا جائیں اور آپس میں مِل جُل کر
دیس کو آگے بڑھانے کی سوچیں تو ہمارا دیس سچ مچ
جنّت کا نمونہ بن جائے۔

ابھی پچھلے دنوں ایک بڑی پیاری کتاب
ہمیں ملی ہے۔ "ہیم کماری" محترمہ صالحہ عابد حسین
صاحبہ نے لکھی ہے۔ یہ ایک برفپارے کی آپ بیتی
ہے۔ کس طرح برفباری کے وقت وہ پہاڑوں
پر آیا اور پھر پہاڑوں پر سے سمندر تک آتے اس پر
کیا بیتی۔ محترمہ نے خیال انگریزی سے لیا ہے اور

بڑی خوبصورتی سے اسے اپنے انداز میں ڈھالا ہے۔
زبان بہت میٹھی ہے۔ انداز بیان انوکھا ہے۔ ظاہری
ترتیب و زینت یعنی لکھائی چھپائی وغیرہ پر بھی پوری
توجہ کی گئی ہے۔ ہمارے بڑے پیامیوں کے لیے خاص
طور پر پسندیدہ چیز ہے۔

جولائی کے پرچے میں ایک نظم "برسات"
جناب حافظ باقوی کے نام سے چھپ گئی ہے۔ یہ
جناب عبداللہ شرقی صاحب کی نظم ہے۔ رسالہ
چھپنے کے بعد اس غلطی کا احساس ہوا۔ پیامی،
اپنے پرچوں میں ٹھیک کر لیں۔ عبداللہ شرقی صاحب
نے برسات پر ایک اور نظم ابھی ابھی بھیجی ہے، یہ
اب اگلے پرچے میں چھپے گی۔

ایک غلطی اور ہو گئی۔ پچھلے مہینے انھی صفحوں
میں مہاراشٹر کے ہائی اسکول میں اردو عربی اور
فارسی میں اوّل اور دوم آنے والوں کے نام چھپے تھے۔
ان میں رضیہ عثمان غنی، اور عبداللطیف بقر عیدی کو غلطی
سے جلگاؤں ہائی اسکول کا طالب علم لکھ دیا ہے۔
ان دونوں کا تعلق جلگاؤں سے نہیں مالیگاؤں ہائی
اسکول سے ہے اس ہائی سکول کی پرنسپل محترمہ عائشہ
حکیم صاحبہ نے اس طرف توجہ دلائی۔ ہم ان کے
احسان مند ہیں اور معذرت خواہ بھی۔

خورشید احمد جامی صاحب کے انتقال
اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ مرحوم آخر دم تک پیا
کی سرپرستی فرماتے رہے۔ اب ان کے مخلص د
اور ساتھیوں نے ان کی یاد میں ان کی آخری
"برگ آوارہ" کے نام پر پندرہ روزہ پرچہ نک
شروع کیا ہے۔ اس کی رسم افتتاح بہت اہتمام
منائی گئی۔ ہماری نظر سے بھی یہ پہلا پرچہ گذ
بہت صاف ستھرا پرچہ ہے۔ مضامین بھی بہت
ہیں محمود خاور صاحب اس کے ایڈیٹر ہیں۔

اس پرچے میں "جب اور اب" کی آخری
شائع ہو رہی ہے۔ پیامی بچوں اور بچیوں اور ا
بزرگوں غرض سبھی نے اس مضمون کو پسند کیا۔
محترمہ آصفہ مجیب نے بہت ہی س
لیکن پیاری زبان میں ہمارے پرانے رہن سہ
اور تہذیب و تمدن کا خاکہ کھینچا ہے۔ انداز
دل چسپ ہے کہ بالکل آپ بیتی کا سا لطف
بہت سے پیامیوں کا اصرار ہے کہ کتابی شکل
شائع ہو۔ محترمہ آصفہ صاحبہ بھی کچھ کچھ راضی ہو
ہیں۔

پچھلے دنوں وہ انقرہ تشریف لے
تھیں۔ لوٹتے وقت کچھ دنوں کے لیے ایران میں
ٹھہریں وہاں سے وہ آپ کے لیے ایک اچھا

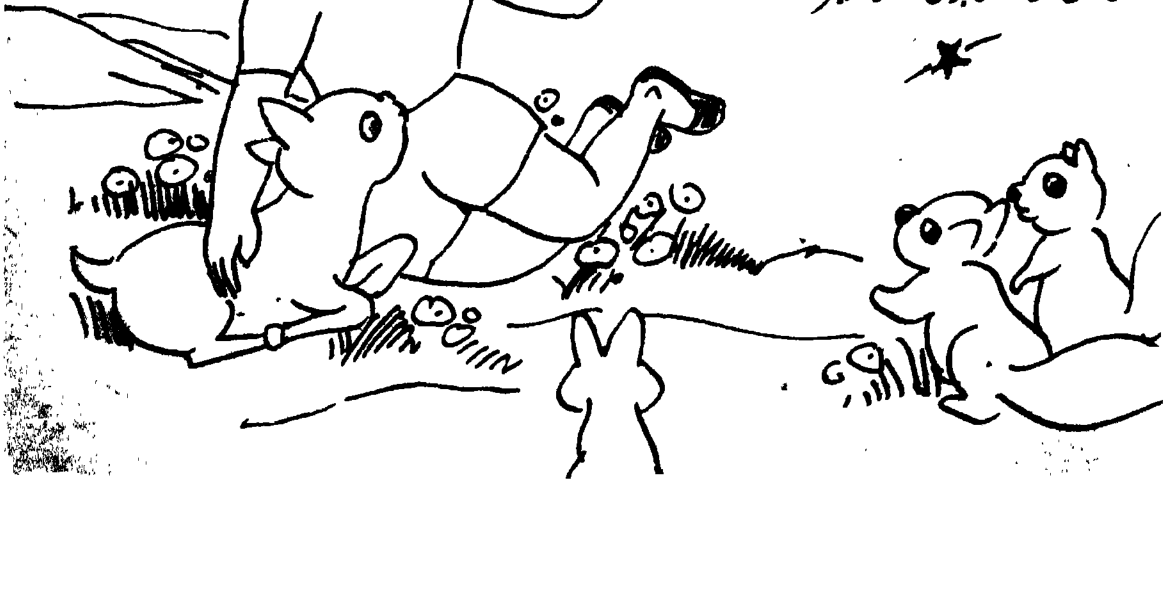
جناب محمد یوسف پاپا - ام اس سی

جیسے میں نے بٹن دبایا

(ننھے پیامیوں کے لیے ایک مزیدار گیت)



جیسے میں نے بٹن دبایا - بولا ٹاپا ٹاپا
ٹن ٹن ٹن ٹن گھنٹی بولی نکلے میرے ٹاپا
جیسے میں نے بٹن دبایا بولا ٹمی ٹمی
ٹن ٹن ٹن ٹن گھنٹی بولی نکلیں میری ممی
جیسے میں نے بٹن دبایا بولا ٹنکل ٹنکل
ٹن ٹن ٹن ٹن گھنٹی بولی نکلے میرے انکل
جیسے میں نے بٹن دبایا بولا ٹائی ٹائی
ٹن ٹن ٹن ٹن گھنٹی بولی نکلے میرے بھائی
جیسے میں نے بٹن دبایا بولا ٹنا ٹنا
ن ٹن ٹن ٹن گھنٹی بولی نکلا میرا منا



قلمی دوستی



تم نے ابراہیم لنکن کا نام ضرور سنا ہو گا۔ ان کا نام آتے ہی داڑھی والے دبلے پتلے چہرے کی یاد آتی ہے۔ مگر یہ بات تو میں اس وقت کی کر رہا ہوں جب انھوں نے داڑھی نہیں رکھی تھی۔

وہ امریکہ کے بہت بڑے لیڈر تھے۔ اور وہاں کے صدر بھی رہے۔ صدارت کے انتخاب کی تیاریاں امریکہ میں بھی ایسی ہی ہوتی ہیں، جیسی تم نے اپنے دیس میں الیکشن کی تیاریاں دیکھی ہوں گی۔ گلی کوچوں میں جلوس نکلتے ہیں کہ اِن صاحب کو ووٹ دیجیے۔ اُس نشان پر مہر لگائیے۔ اپنے یہاں بھی خوب ہنگامہ رہتا ہے۔ لیڈر دھواں دھار تقریریں کرتے ہیں۔ الیکشن میں کھڑے ہونے والے لوگ گھر گھر جا کر لوگوں سے ملتے ہیں۔ اپنے حلقے کا دورہ کرتے ہیں۔

تو جب ابراہیم لنکن امریکہ کی صدارت کے لیے چناؤ لڑنے کھڑے ہوتے، تب بھی ایسی ہی تیاریاں ہوئیں۔ یہ تیاریاں پورے زور پر تھیں کہ

ایک دن ابراہیم لنکن کے دفتر میں ایک
یہ خط ایک ننھی بچی کا تھا۔ لنکن کے خط و کتابت
انچارج "جان نکولے" اور "جان ہے" نے
کھولا۔ پڑھا۔ ایک دوسرے کو سنایا اور مذاق ا
پہلے وہ خط سن لو۔

جناب اعجاز اختر

ویسٹ فیلڈ

جیکٹوا کمپنی

نیو یارک

۱۵ اکتوبر ۱۸۶۰ء

محترمی ابراہیم لنکن!

"میں گیارہ سال کی ایک چھوٹی سی لڑکی ہوں مگر میری خواہش ہے کہ آپ امریکہ کے صدر چنے جائیں۔ مجھے امید ہے کہ آپ اسے برا نہ سمجھیں گے کہ میں آپ جیسے بڑے آدمی کو خط لکھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔

اگر آپ کی کوئی بیٹی میری ہم عمر ہو تو، اسے میرا پیار کہیے گا۔ اگر آپ خود خط نہ لکھ سکیں تو اس سے جواب دلوا دیجیے۔

میرے چار بھائی ہیں۔ ان میں سے کچھ تو آپ ہی کو ووٹ دیں گے، لیکن اگر آپ اپنی داڑھی بڑھالیں تو میں اپنے دوسرے بھائیوں کے ووٹ بھی آپ کو دلوانے کی کوشش کروں گی۔ آپ کا چہرہ دُبلا پتلا ہے، اس لیے داڑھی میں آپ زیادہ اچھے لگیں گے (زیادہ جچیں گے) داڑھی اکثر عورتوں کو اچھی لگتی ہے۔ اگر آپ داڑھی رکھ لیں تو، عورتیں اپنے شوہروں کے پیچھے پڑ جائیں گی کہ وہ آپ ہی کو ووٹ دیں۔ اس طرح آپ آسانی سے صدر بن جائیں گے۔"

جان نکولے نے اس خط کا خوب مذاق اڑایا۔ خاص کر اس بات پر کہ صاحبزادی لنکن کو داڑھی بڑھانے کا مشورہ دے رہی ہیں۔

"دیکھو تو! اتنی سی بچی لنکن صاحب کو الیکشن جیتنے کے گُر بتا رہی ہے۔" نکولے نے اس خط کو ردی کی ٹوکری میں ڈالنے کی تیاری کرتے ہوئے کہا۔ مگر 'ہے' نے اسے روک دیا۔ اس نے کہا: "لنکن صاحب بچوں سے بہت پیار کرتے ہیں، وہ یہ خط پڑھ کر بہت خوش ہوں گے۔"

اتفاق سے اس وقت امریکہ کی ریاست پینی سلی وینیا (PENNSYLVANIA) کے گورنر کا بھی خط آیا تھا۔ نکولے نے کہا۔

"اس سے بہتر ہے کہ پینی سلی وینیا کے خط کا جواب دیا جائے۔"

اتفاق سے لنکن پاس والے کمرے میں بیٹھے ہوئے یہ سب باتیں سن رہے تھے، وہ اچانک اس کمرے میں داخل ہوئے اور کہنے لگے۔

"گورنر بڑی عمر کا ہے۔ وہ جواب کا انتظار کر سکتا ہے بچے انتظار نہیں کر سکتے۔" یہ کہہ کر انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے گریس کے خط کا جواب لکھنا شروع کیا۔ اس خط کے اوپر انھوں نے لیبل لگا دیا "ذاتی"، یعنی وہ اس ننھی بچی سے دوستی کے خواہش مند تھے۔

الینائس

۱۹ر اکتوبر ۱۸۶۰ء

مس گریس بیڈل

ویسٹ فیلڈ نیویارک

میری پیاری ننھی منّی -!

تمھارا ۱۵ر تاریخ کا پیارا سا خط ملا ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے دُکھ ہو رہا ہے کہ میری کوئی بیٹی نہیں ہے۔ میرے تین بیٹے ہیں ایک سترہ سال کا۔ دوسرا نو سال کا اور تیسرا سات سال کا۔۔۔ اور پھر ان کی ماں۔ بس یہی میرا کل خاندان ہے۔

جہاں تک داڑھی کا سوال ہے ۔۔ میں نے ابھی تک داڑھی نہیں رکھی ہے۔ کیا تمھیں ایسا نہیں لگتا کہ اگر میں داڑھی رکھ لوں تو لوگ اسے میری سنک سمجھیں گے۔"

تمھارا اپنا

ابراہیم لنکن

کتنا پیارا خط تھا۔ سوچو ــ گریس کتنی خوش ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد انتخاب ہوا اور ابراہیم لنکن کامیاب ہو گئے۔ صدارت کا حلف اٹھانے کے بعد انھوں نے شہروں کا دورہ کیا۔ ۱۶ فروری ۱۸۶۱ء کو وہ ویسٹ فیلڈ بھی گئے۔ گریس کے شہر ریلوے اسٹیشن پر بہت بھیڑ تھی۔ لوگ اپنے نئے صدر

بڑی بے چینی سے ریل کا انتظار کر رہی تھی
اس کے قلمی دوست لنکن آرہے تھے۔

گریس کے ابّو نے اسے لنکن کی تصو
تھی۔ اس لیے وہ سوچ رہی تھی کہ وہ آسانی
کو پہچان لے گی۔

ٹرین آئی۔ ایک ڈبّے کا دروازہ
داڑھی والا۔ دبلے پتلے چہرے والا شخص با
ابراہیم لنکن تھے۔ لوگوں نے زندہ باد کے نعر
لیکن گریس کو بہت حیرت ہوئی۔ وہ لنکن ک
پائی۔ اس کے ابّو نے جو تصویریں لادی تھیں
ان کی داڑھی نہیں تھی۔ کیا لنکن نے اس ک
لی تھی۔ یہ سوچ کر گریس خوشی کی وجہ سے بے قرا
لنکن کا شاندار استقبال کیا گیا۔ ا
تقریر کی درخواست کی گئی۔ انھوں نے صرف ا
" میں تقریر کرنے نہیں آیا ہوں۔ مجھ
صرف ایک سوال پوچھنا ہے کہ جس طرح میر
جھنڈے کے نیچے کھڑا ہوں کیا آپ بھی اسی
ساتھ کھڑے رہیں گے۔"

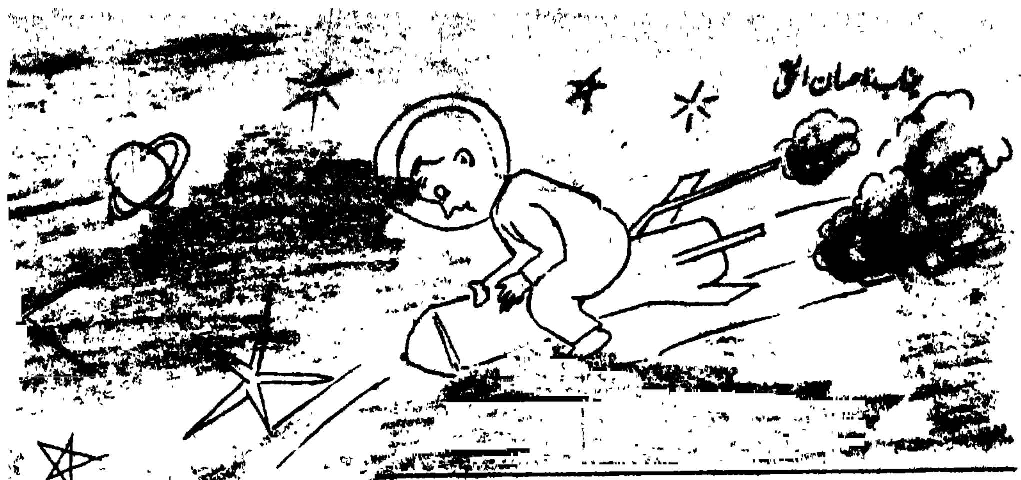
"ہاں ہاں" اور "جی ہاں" کی گئی
اور پھر لنکن نے اپنی تقریر ختم کر دی۔ پھر کہا۔
" اس شہر میں ایک چھوٹی سی بچی ـ
میری خط و کتابت ہے۔ میرے چہرے پر
یہی ذمہ دار ہے۔ میں اس سے ملنا چاہتا

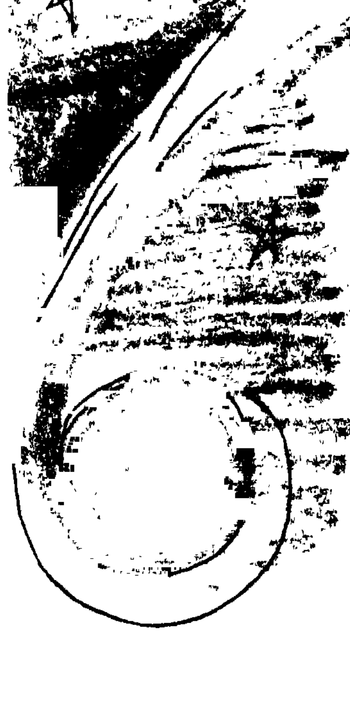
جناب متین سروش

برسات

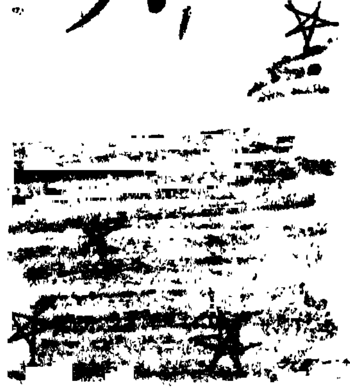


برسات کا یہ موسم آیا ہے کیا سہانا
دل کو لبھا رہا ہے کھیتوں کا لہلہانا
جب آسماں سے بوندیں آتی ہیں گنگناتی
شہروں میں، وادیوں میں اک دھوم ہیں مچاتی
ہر تال پوکھرے میں پانی بھرا ہوا ہے
موجیں مچل رہی ہیں پانی چمک رہا ہے
ٹھنڈی ہوا کے جھونکے دل کو لبھا رہے ہیں
باغِ جہاں میں ہر دم خوشیاں لٹا رہے ہیں
سبزہ ہرا بھرا جو ہر دم لہک رہا ہے
اپنا بھی دل خوشی میں گویا بہک رہا ہے
مینا چہک رہی ہے کوئل بھی کوکتی ہے
آوازِ پی کہاں کی ہر لحظہ آ رہی ہے
جنگل میں مل کے چڑیاں منگل منا رہی ہیں
الفت کا اک سندیسہ سب کو سنا رہی ہیں
چڑیوں کا گیت سن کر دل اپنا جاگ اٹھے
آپس میں مل کے گائیں ہم بھی خوشی کے گانے
پیغام دیں جہاں کو پھر صلح و آشتی کا
فردوس ہم بنادیں یہ باغِ زندگی کا
دنیا کا غم مٹائیں برسات کی بہاریں
ہر آدمی پہ چھائیں برسات کی بہاریں





زہرہ



اس دن ہم اپنے کام کاج سے تھکے ہوئے گھر لوٹے۔ آرام کرنے کے لیے کرسی پر بیٹھے ہی تھے کہ بیگم صاحبہ نے پوچھا۔ "سب خیریت ہے؟" میں نے دل میں سوچا۔ "یہ بھی خوب رہی۔ خیریت تو گھر والوں کی، بال بچّوں کی پوچھی جاتی ہے، خوب صاحب عجیب سا سوال ہے۔؟"

"ہاں بھئی سب خیریت ہے۔" میں نے چھوٹا سا جواب دیا۔ اب بیگم صاحبہ کو کون بتائے کہ ہمارے بوسٹر راکٹ کے پریشر میں ایک رتی برابر فرق آگیا ہے۔ اس لیے سارے لوگ دن رات ایک کیے ہوئے ہیں۔ جس کام پر ملک کے سارے بڑے سے بڑے دماغ لگے ہوں، ظاہر ہے اس کام کی چھوٹی سے چھوٹی خرابی بھی، ایک بڑی مصیبت بن جائے گی۔"

خیر صاحب! تو چائے وغیرہ پینے کے بعد ہم نے اپنی بیوی کو بتایا کہ "منگل کے دن ہم زہرہ سے ملنے جا رہے ہیں۔" وہ کچھ بولیں نہیں۔ بھونچکا سی ہو گئیں۔ اور پھر منہ بنا کر باورچی خانے میں غائب ہو گئیں۔ تھوڑی دیر بعد پھر آئیں۔ "یہ یکبارگی زہرہ آپا کیوں یاد آگئیں؟"

"بھئی یاد پر کس کا بس چلا ہے۔ ان کی محبّت سوار ہوئی، تو ہم نے منگل کا پروگرام بنا لیا ——" بیچ کے دن آہستہ آہستہ گزر گئے۔ منگل آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ ناشتہ دان مانجھا دھویا۔ لبالب بھر رکھا ہے۔ کباب پراٹھے، گاجر کا حلوہ اور طرح طرح کی چیزیں سفر کے لیے تیار ہیں۔ اور جب میری نظر ان کی پُڑیا پر گئی تو بے اختیار ہنسی آگئی۔ پھر مجبوراً مجھے کہنا پڑا۔ "بیگم

میں تمھاری بہن زہرہ آپا سے ملنے نہیں جا رہا ہوں، بلکہ سورج کے نیچے اور زمین کے اوپر جو ایک صبح کا ستارہ ہے اس پر جا رہا ہوں۔ اور وہاں ناشتہ دان میں کھانا نہیں جاتا۔ بلکہ جیسے دانت مانجھنے والا ٹوتھ پیسٹ ہوتا ہے نا، ویسے ہی ٹیوب میں، یا پھر اسپرو کی ٹکیوں کی شکل میں کھانا جاتا ہے۔

تو بھئی یہ تو تھا گھر کے اندر کا حال۔ باہر راکٹ چھوڑے جانے کا حال تو ناقابلِ بیان ہے۔ لاکھوں لوگ، ہزاروں موٹریں، کیمرہ مین، منتظمین، ٹیلی ویژن، ریڈیو، بچے، عورتیں، جوان بوڑھے، اخبار کے رپورٹر، ایک طوفان تھا۔

ایک بڑے سے میدان میں راکٹ، قطب مینار کی شان لیے ہوئے۔ سینہ تانے کھڑا تھا۔ میں آہستہ آہستہ دھڑکتے دل کے ساتھ، عجیب و غریب لباس پہنے سیڑھیوں سے اترا اور سارا ماحول تالیوں سے گونج اٹھا۔ مجھے ایک موٹر میں بٹھا کر ٹھیک راکٹ کے نیچے پہنچا دیا گیا۔ میں نے لفٹ میں قدم رکھا اور لفٹ بٹن دباتے ہی ایک سناٹے سے جانے کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ میں لفٹ سے باہر نکلا تو اپنے راکٹ کے کیبن میں تھا۔

اندر لگے ہوئے ریڈیو سے، گنتی کی آواز آ رہی تھی۔ لیکن یہ گنتی بھی خوب تھی۔ اوپر سے نیچے کی طرف آ رہی تھی۔ یعنی ۵۰، ۴۹، ۴۸، ۴۷، ۴۶، ۴۵، ۴۴، ۴۳، ۴۲، ۴۱، ۴۰۔

میں نے اپنے بدن میں سنسنی محسوس کی۔ یہ گنتی جوں جوں ایک کی طرف بڑھ رہی تھی، میرے دل کی حرکت تیز ہوتی جا رہی تھی۔ لو اب وہ ۱۵، ۱۴، ۱۳، ۱۲، تک آ گئی [illegible]

۴، ۳، ۲، ایک۔

ایک زور کا دھماکا ہوا۔ میرے راکٹ کو آگ کے شعلوں نے پیٹ میں لے لیا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر میں یہ آگ کے شعلے نیچے رہ گئے اور میرا سفر شروع ہو گیا۔

میرا یہ سفر لاکھوں میل کا ہے۔ میں زمین سے اوپر اٹھتا چلا جا رہا ہوں۔ زمین سے آسمان کی طرف نظر اٹھا کر آپ نے اکثر دیکھا ہوگا، آسمان کی چادر کیسے کیسے عجائبات سے بھری ہوئی ہے کروڑوں تارے آسمان کی چادر پر بکھرے ہوئے ہیں۔ بظاہر ایک دوسرے سے کندھے سے کندھا ملائے ہوئے، لیکن ان کے اصلی فاصلے اُف معاذاللہ۔ کہاں سے پیمانہ آئے جو ان کے فاصلوں کو ناپا جائے؟

اتنے ٹھوس ستارے کہ ایک چمچہ مٹی نکال کر تولیے تو زمین کی ایک ٹن مٹی کے برابر وزن ہو۔ ایک طرف MERCURY ہے۔ جہاں ایک لمحے میں آدمی جل بھن کر ہوا میں غائب ہو جائے۔ دوسری طرف PLUTO ہے جہاں ٹھنڈ سے جم کر برف کا ٹکڑا بن جائے، ایسا ٹکڑا جو پتھر سے زیادہ سخت ہو

اور پھر یہ ستارے انھیں اپنی زمین سے دیکھیے تو، ٹھہرے ہوئے، جامد، ساکت نظر آتے ہیں۔ دراصل کس قدر تیزی سے گھوم رہے ہیں۔ بہت تیز رفتاری بھی تو چیز کو ساکن سا بنا دیتی ہے۔ آپ جب لٹو کو زور سے نچاتے ہیں تو وہ بھی تو اوپر سے ٹھہرا ہوا نظر آتا ہے۔

میرا راکٹ اوپر اٹھتا جا رہا ہے۔ زمین کی اب کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی ہے میرے سامنے کئی [illegible]

جہاں میں زمین کی کشش سے باہر نکل جاؤں گا۔

اب میں اپنے راکٹ کی رفتار چیک کرتا ہوں۔ زمین
کی کشش سے نکلنے کے لیے ضروری ہے کہ راکٹ کی رفتار ۲۵
ہزار میل فی گھنٹہ ہو۔ میں نے ایک پرزے پر ہاتھ رکھا۔ راکٹ
کی رفتار اور بڑھی، ۱۵ ہزار ہو گئی۔ ۱۷ ہزار ہو گئی ۱۸ ہزار
ہو گئی ۱۹ ہزار ۲۰ ہزار میل فی گھنٹہ ہو گئی۔ اور دباؤ زیادہ ہوا ہے
۲۱ ہزار، ۲۲ ہزار، ۲۳ ہزار، ۲۴ ہزار، ۲۵ ہزار۔

لیجیے اب میں زمین کی کشش سے نکل آیا ہوں۔ میں
اپنے آپ کو کتنا ہلکا محسوس کر رہا ہوں۔ ہر چیز اپنا وزن کھو چکی ہے
مجھے اپنے کیبن میں بیٹھے بیٹھے ایک دم نیوٹن یاد آ گیا۔
اسی نے تو زمین کی کشش کے اصول کو دریافت کیا تھا۔ میں
ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کرتا ہوں۔ دیکھتا کیا ہوں کہ نیوٹن
ایک سیب کے درخت کے نیچے بیٹھا ہے۔ ایک سیب ٹپکتا ہے۔
ٹپ سے آواز آتی ہے۔ اور وہ سوچنے لگتا ہے کہ اس سیب کو
زمین نے اپنی طرف کھینچا ہے۔ اپنے اسی خیال کی بنیاد پر وہ
تجربے کرتا ہے۔ اور پھر لوگوں کو بتاتا ہے کہ زمین ہر چیز کو اپنی
طرف کھینچتی ہے۔ لیکن آپ زمین سے جوں جوں اوپر اٹھتے
جائیے آپ کا وزن کم ہوتا جائے گا۔ یعنی اگر آپ ایک ہزار
من کے بکس کو اوپر اٹھانا شروع کر دیں اور اوپر لے جائیں
اور اوپر، اور اوپر۔ تو ایک وقت ایسا آئے گا جہاں یہ ہزار
من کا بکس صرف ایک من کا یا اس سے بھی کم وزن کا
رہ جائے گا۔

اور اس وقت میرا بھی کچھ یہی حال ہے۔ میرے
کیبن میں رکھی ہوئی ہر چیز بے وزن ہے۔ خود میرا کوئی وزن

نہیں ہے۔ قدم اٹھاتا کہیں ہوں، پڑتا کہیں ہے
کی سوئی بتا رہی ہے کہ میں اس وقت زمین کے
دو ہزار میل اوپر ہوں
میں کیبن کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھ
ایک گولے کی طرح نظر آ رہی ہے۔ جیسے کوئی
میں اچھال دی گئی ہو۔ یہ وہی زمین ہے جس کا
میل کا ہے۔ اس زمین کا بڑے سے بڑا پہاڑ
ہے لیکن میں اس وقت جہاں ہوں، وہاں سے یہ
ایسے لگتے ہیں جیسے کسی کے گال پر دانہ نکل آیا ہو
میں جوں جوں اوپر جا رہا ہوں۔ زمین
ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اب زمین مجھے ستارے کی طرح
ہے۔ لیکن اب زمین کی طرف دیکھنے سے کیا حاصل
منزل تو سامنے ہے۔ زہرہ۔

زہرہ، جو سورج اور چاند کے بعد سب
روشن چیز آسمان پر نظر آتی ہے۔ زہرہ جس کے
کا ہالہ ہے۔ زہرہ جس کے گرد بادلوں کا ایک
چڑھا ہوا ہے۔ زہرہ جس کے بارے میں کہتے ہیں
ماحول زمین کی طرح ہے۔ اور ممکن ہے وہاں
بستے ہوں۔

اب میں ایک عجیب و غریب تبدیلی محسوس
ہوں۔ میرے کیبن میں رکھی ہوئی چیزیں پھر وزنی
ہیں۔ میرے قدم جمے ہوئے اٹھ رہے ہیں۔ اس
یہ ہوا کہ اب میرا راکٹ کسی اور PLANET کے
پہنچ رہا ہے۔ کسی اور PLANET کی کشش غالب

"زہرہ" میری بیوی کی زہرہ آپا نہیں بلکہ وہ زہرہ جس کو انگریزی میں VENUS کہتے ہیں۔ اب میری نظروں کے سامنے ہے۔ اس کا قطر زمین سے تھوڑا کم، یعنی سات ہزار چھ سو میل ہے۔ لیکن یہ زمین کے مقابلے میں سورج سے زیادہ قریب ہے۔ شاید اسی لیے یہاں گرمی نسبتاً زیادہ ہے۔

زہرہ کو میں اکثر، اپنے گھر کے صحن میں کھڑے ہو کر، دن کے وقت دیکھا ہے۔ رات کو اپنی کھڑکی سے جھانک کر اسے آسمان پر روشن دیکھا ہے۔ لیکن اس وقت تو میرا راکٹ اس کے گرد چکر لگا رہا ہے۔ ہائے رے میری بدقسمتی کہ میں اس کے پاس نہیں جا سکتا۔ نہ تو میرے راکٹ میں اتنی طاقت ہے، اور نہ میرے کیبن کے کل پرزے ایسے ہیں جو وہاں کے ان دیکھے خطروں کا مقابلہ کر سکیں۔

بادلوں نے موٹا سا غلاف اس کے گرد چڑھا دیا ہے
یہ غلاف جانے کن رازوں کو اپنے اندر چھپائے ہوتے ہے۔
یہ بادل وہی تو ہیں جو پانی کے ابخرات سے پیدا ہوتے ہیں
تو کہیں ایسا تو نہیں کہ ان بادلوں کے پیچھے ہمارے جیسے
انسانوں کی آبادی ہو۔!

لیکن اس وقت میں جہاں ہوں، وہاں سے یہ زہرہ کس قدر خوبصورت چیز معلوم ہوتی ہے۔ اس کا یہی حسن ہے جس کی وجہ سے ہمارے جوتشی زہرہ کے اثر میں پیدا ہونے والے بچوں کے لیے کہتے ہیں کہ یہ بڑا ہو کر آرٹسٹ بنے گا، یا آرٹ کی دنیا میں کوئی بڑا کام کرے گا۔ وہ سچ ہی کہتے ہوں گے۔ زہرہ کے سائے میں پیدا ہونے والے بچوں کو یقیناً [illegible]

تو قریب سے اس سے کہیں زیادہ دل موہ لینے والا لگتا ہے جتنا زمین سے لگتا تھا۔

ارے یہ کیا؟ میرے راکٹ کی ایک الارم گھڑی بج رہی ہے۔ میرے طرف کی لال بتی جل بجھ رہی ہے۔ BLIK, BLIK, BLIK, کر رہی ہے۔ اس کا مطلب جانتے ہو کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اب میرے سفر کے ختم ہونے کا وقت آ گیا ہے۔

میں اپنی زمین سے لاکھوں میل دور ہوں، لیکن اس راکٹ کے سارے پرزے زمین پر "کنٹرول روم" میں بیٹھے ہوئے ماہرین کے قابو میں ہیں۔

ایسی دلکش، دل فریب جگہ سے واپس جانے کو کس کا جی چاہے گا۔ لیکن ابھی انسان میں وہ طاقت نہیں پیدا ہوئی ہے جو اسے "زہرہ" کی سطح پر اتار دے۔ اس لیے خدا حافظ زہرہ!

یونانیوں نے تیرا نام VENUS رکھا ہے۔
جو ان کے حسن اور محبت کی دیوی کا نام ہے۔
تو اے حسن کی دیوی VENUS خدا حافظ
اے محبت کی دیوی زہرہ خدا حافظ
لیکن اے دیوی یاد رکھ! انسان تجھ سے ملے بغیر
چین نہ لے گا، میں نہیں تو میرا کوئی دوسرا بھائی ایک نہ
ایک دن تیری سرکار میں ضرور حاضری دے گا •

خط و کتابت کرتے وقت اپنے
خریداری نمبر کا حوالہ ضرور

محترمہ آصفہ مجیب

عید اور آداب



(مسلسل)

بڑے اپنے چھوٹوں کو عیدی دیتے۔ بہوئیں خاصدان میں پان بناکر ساس سسر کو پیش کرتیں۔ وہ اس میں گنّی ڈال دیتے۔ بچّوں کو خوب سی عیدی ملتی۔ ادھر ملازمین وصول کرتے۔ چھنا چھن روپے برستے گنّی اور اشرفیاں نکلتیں دیور نندوئی، بھاوجوں اور بھیجو ں سے جھگڑ کر وصول کرتے۔ نوک جھونک ہنسی دل لگی رہتی۔ اگر کوئی نئی بہو ہوتی جس کی پہلی عید پڑتی تو اس کی شیر پلائی کی رسم ہوتی۔ مہمان بیویاں جمع ہوتیں۔ بہو کو نیا بھاری دلھن بناکر بٹھاتے۔ نندیں چاندی کے کٹورے میں لائیں اور چاندی کے چمچے سے بھاوج کو کھلائیں اور چمچہ انھیں نیگ میں ملتا۔ میراثنیں مبارک باد ۔ مہانوں کی دعوت ہوتی۔ دور کے عزیز رشتہ دار سال بھر نہ آتے، عید کے دن ضرور پہنچتے۔ غر تقسیم کیا جاتا۔ سویاں کئی قسم کی پکتیں۔ شیر خرما، طرح طرح کی، چوگنی پچگنی شکر کی اتنی میٹھی کہ بس ایک ہی سیر ہو جائے۔ باریک باریک میوہ اوپر سے چاندی

اس کے ساتھ نفلیں بالائی۔ تحفے کے طور پر ایک دوسرے کو بھیجی جاتی۔ دو تین دن عید کی تقریب کا سلسلہ چلتا۔ بقرعید بھی تقریباً اسی انداز سے منائی جاتی۔ ہندو دوست ان تقریبوں میں شریک ہوتے مسلمان بھائیوں کو مبارک باد دینے آتے۔ شبرات میں حلوے پر نیاز ہوتی۔ غریبوں محتاجوں کو کھانا بٹتا۔۔ بچّوں کے لیے ڈھیروں آتش بازی آتی۔ ملازم چھڑا کر تماشے دکھاتے۔ بڑی احتیاط کی جاتی ان کو ذرا دور کھڑا کرکے کسی کھلی جگہ اناردانوں کی جن میں بارود بھری ہوتی قطار لگا دیتے۔ ایک دم سے آگ لگاتے تو ان سے چھوٹ جاتے۔ خوب اونچے جاتے، ان کی پھلجھڑیاں نیچے گرنے لگتیں۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں بچّوں کے ہاتھ میں دے دی جاتیں وہ چھڑاتے۔ لگن میں پانی بھر کر رکھتے مہتابی پچھڑا دیتے۔ نیلا شعلہ نکل کر پانی میں ٹپ ٹپ گرتا، اور بجھ جاتا۔ پھل جھڑی بچے اُڑاتے۔ پھر پھر پھول سے جھڑنے لگتے۔ بچے بڑے خوش ہوتے اور بڑے بھی ان کے ساتھ تماشہ دیکھتے۔ کچھ لوگ اس رات کو جاگ کر عبادت کرتے نمازیں پڑھتے، کیونکہ اسے شب قدر کہتے ہیں۔

محرّم بڑے زور وں میں منایا جاتا۔ تعزیوں کے ساتھ سیکڑوں ہاتھی ہوتے بہت سے علَم بیرق کی شکل میں باجے بجاتے نکلتے۔ اور زور زور سے سوز پڑھتے جاتے اتنا ہجوم ہوتا کہ کھوے سے کھوا [illegible]

جگہ جگہ مجلسیں ہوتیں سوز (مرثیے) سننے کے لیے بھیڑ لگ جاتی۔ لکھنؤ میں بیگم اختر کی سوز خوانی مشہور تھی۔ بڑے شوق سے لوگ سننے آتے۔ لنگر بٹتا تھا شربت پلایا جاتا۔ ہندو مسلمان ایک دوسرے کے تہواروں کا احترام کرتے، اور برابر شریک ہوتے۔ ہولی دیوالی میں مسلمان اپنے ہندو دوستوں کے یہاں مبارک باد دینے جاتے۔ بعض مسلمان دیوالی میں چراغاں کرتے۔ بچّے ہولی دیوالی اپنے دوستوں کے ساتھ مناتے ہولی کھیلتے۔ اس سے آپس میں میل ملاپ کا پتہ چلتا۔ اور رونق رہتی۔ میلوں میں اور بزرگان دین کے عرس میں یہی نقشہ نظر آتا۔۔ رکشا بندھن تہوار میں کوئی ہندو عورت بہن بن کر مسلمان بھائی کے راکھی باندھتی تو کتنا اچھا لگتا۔ بھائی بہن کا رشتہ ہو جاتا اس کا بڑا مان ہوتا تھا۔ بھائی تحفہ دیتے۔ اب بھی ایسا ہوتا ہے تین چار سال ہوئے ایک ہندو طالب علم لڑکی نے بڑی عقیدت سے مجیب صاحب کے راکھی باندھی۔

راکھی کا پرانا ایک تاریخی واقعہ ہے۔ ۱۵۳۵ء میں بہادر شاہ گجراتی نے ریاست میواڑ پر حملہ کیا۔ اور چتوڑ کا محاصرہ کر لیا۔ چتوڑ کے راجہ میں مقابلے کی طاقت نہیں تھی۔ رانی نے ہمایوں بادشاہ کو راکھی بھیجی اور اسے اپنا بھائی بنا کر مدد مانگی۔ ہمایوں فوج لے کر چتوڑ کی طرف بڑھا لیکن [illegible]

ہمایوں کی شیر شاہ گجراتی سے لڑائی ہوئی اور، ہمایوں نے اسے شکست دی۔

تہواروں کا مذہبی رسم کے ساتھ ایک اخلاقی مقصد بھی ہوتا ہے کہ اس سے آپس میں میل محبت بڑھے۔ کیا غضب ہے کہ مذہب کے نام پر بعض لوگ جھگڑے فساد کھڑے کر دیتے ہیں۔ مذہب تو دلوں کو ملانے اور جوڑنے کے لیے آیا ہے۔ سب مذہبوں کی یہی تعلیم ہے۔ ہمارے نبی پیشوا، بزرگ عالم رہنما جو گذرے ہیں سب نے یہی کوشش کی، اور یہی بتایا۔ زندگی کا مزہ اسی میں ہے کہ مل جل کر رہیں۔ اسی میں قوم و ملک کی بھلائی بھی ہے۔

ہے رنگ لالہ و گل و نسریں جدا جدا
ہر رنگ میں بہار کا اثبات چاہیے

بقیہ قلمی دوستی

گریس بے چینی سے اپنے ابّو کے ساتھ آگے بڑھتی گئی۔ جیسے ہی وہ لنکن کے پاس پہنچی... لنکن نے اسے گود میں اٹھالیا۔

"دیکھو میں نے تمھارے ہی کہنے پر داڑھی بڑھائی ہے"

انھوں نے گریس کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

"میری ننھی دوست" لنکن نے اسے گود سے اتارتے ہوئے کہا۔

اور شاید یہ لمحے گریس کی زندگی کے یادگار

بقیہ بچوں سے باتیں

لائی ہیں۔ النزہ اور ایران کا دلچسپ حال میں پڑھیے گا۔

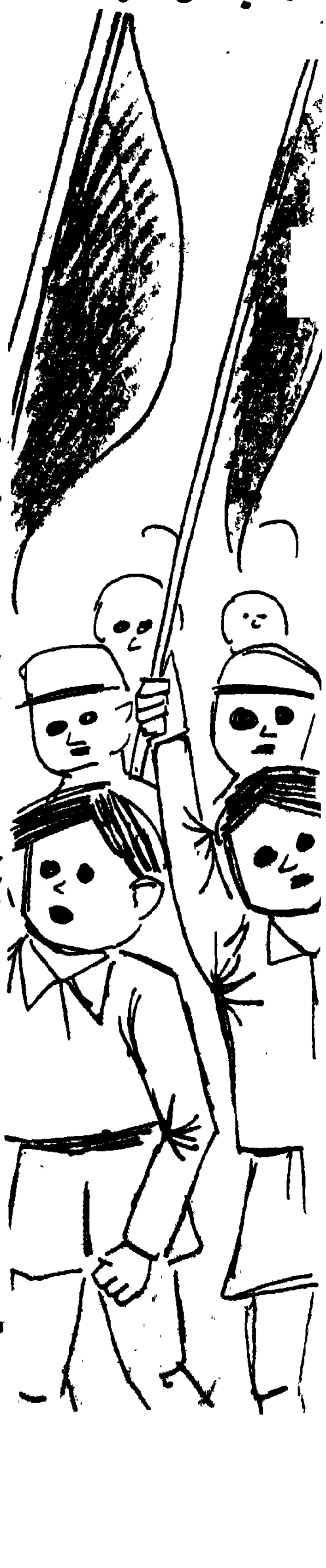
"پچھلے پرچے کے سبھی مضمون پیامیوں کے۔ ٹائیٹل تو سبھی کو اچھا لگا۔ اس پرچے کے بھی یقین ہے کہ آپ کو اچھے لگیں گے۔ خصوص (ایک پیچر) قلمی دوستی، سنہری مچھلی، چاتے، د ملاجی کی، جب اور اب وغیرہ۔ نظموں میں ہما کرم فرما جناب نتین سروش کی نظم برسات۔ با خادر صاحب کی قوالی، سیف صاحب کی گڑیا د کوڑی صاحب کی آزادی کا دن خوب مزے پڑھیے۔

اس مہینے برادرم شاہد صاحب (شاہ گنج) نے چار خریدار مرحمت فرمائے، دو خریدار مصطفےٰ ندوی صاحب نے اور ایک ایک خریدار عبد صاحب اور حافظ باقوی نے مرحمت فرمایا۔ ج کمال صاحب بمبئی، نجمی صاحبہ فرخ آباد، نزہت صاحبہ اندور، سید حسن کشن گنج خود خریدار بنے

چندہ ہمیشہ منی آرڈر سے

جناب مفتوں کوٹوی

آزادی کا دِن



مسرت خیز ہیں بچوں کے گانے
۱۵ اگست

پھر آزادی کا دن بخشا خدا نے   دلوں میں ہے خوشی لب پر ترانے
مسرت خیز ہیں بچوں کے گانے   سرور و کیف برسائے فضا نے
جدھر دیکھو اُدھر پرچم ہی پرچم
نظر ڈالو جہاں خوشیاں ہیں باہم
سہانی رت ہے موسم ہے سہانا   گھٹا تانے ہوئے ہے شامیانہ
سروں پر ابرِ باراں کا یہ چھانا   لٹاتا ہے فلک اپنا خزانہ
خوشی کے روپ فطرت بھر رہی ہے
گہر ہم پر نچھاور کر رہی ہے
چراغاں کیجئے ایسا نرالا   [illegible] ہو ہر اک دل کا شوالا
ہم بے گانگی کو جب نکالا   [illegible] اپنی عظمت کو سنبھالا
الگ ہے رنگ و نسل [illegible]
وطن ہے ایک یہ رشتہ بر[illegible]
وطن کی ہم پہ لازم ہے حفاظت   نہ بھولیں ہم [illegible] اخوت
رکھیں قایم بہم ربط و محبت   اسی سے باغ الف[illegible]ت
کریں پھر سے عطا تزئین چمن کا
حلف لیں آج تعمیر وطن کا
ہمیں سب کو یہ تابانی مبارک   طرب ناکی و درخشانی مبارک
ضیائے رنگ قربانی مبارک   خدا کی شان رحمانی مبارک
حسین تر اور گلزار وطن ہو

جناب غلام حیدر ایم۔اے (ریاضی)

سنہری مچھلی



یہ قصہ بہت پرانے زمانے کا ہے۔ پر ہے
بہت مزے کا۔

سمندر کے کنارے ایک بہت چھوٹی سی، ٹوٹی
پھوٹی چھوٹی جھونپڑی تھی اس جھونپڑی میں ایک مچھیرا
رہتا تھا۔ بڑا غریب تھا۔ میاں بیوی کے تن پر کپڑے تک
سلامت نہیں تھے۔ بالکل پھٹے پرانے۔ گھر میں ضرورت
معمولی سامان بھی بس یوں ہی سا تھا۔

پھر ایک دن کیا ہوا۔ اس نے سمندر میں مچھلی پکڑنے
کے لیے اپنا جال ڈال کر باہر نکالا۔ اس جال میں بس ایک
ٹی سی مچھلی نظر آئی۔ مگر ایسی مچھلی تو اس نے اس سے
پہلے کبھی نہ دیکھی تھی! مچھلی کی کھال بالکل سنہری تھی۔
ری مچھلی کچھ ایسی تھی جیسے کسی سنار نے گھڑی ہو۔
س سے بھی زیادہ حیرت کی بات! وہ بالکل انسانوں کی
طرح بول بھی سکتی تھی۔

"اچھے مچھیرے!" مچھلی نے کہا: "تم
پانی میں پھینک دو۔ اگر تم نے میری بات مان
تمہیں اس کا انعام دوں گی۔ میں تمہیں دنیا کی ہر
ہوں۔ بس صرف یہ طاقت نہیں دے سکتی جو مجھ

مچھیرے کو اس پر رحم آگیا اس نے کہ
اتنی پیاری مچھلی ہو، پھر اتنی چھوٹی سی ہو کہ تمہیں
نہیں جا سکتا۔ اچھا، جاؤ تم اپنے گھر جاؤ۔" یہ کہہ
اسے پانی میں اچھال دیا اور گھر لوٹ آیا۔

گھر پہنچتے ہی اس کی بیوی نے سوال کیا
آج تم بالکل خالی ہاتھ آرہے ہو۔ کیا آج ایک
ہاتھ نہ آئی ... ؟"

"نہیں ... ایک مچھلی ... تو تھی،

سونے کی تھی۔ اور پھر اتنی چھوٹی تھی کہ اسے پکایا بھی نہیں جاسکتا تھا۔ پھر وہ بولتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر میں اسے واپس پانی میں پھینک دوں تو وہ مجھے انعام دے گی۔ میں جو کچھ اس سے مانگوں گا مل جائے گا۔ بس مجھے رحم آگیا اس کی باتوں پر اور میں نے اسے چھوڑ دیا۔"

"اور تم نے اس سے مانگا کچھ نہیں؟" اس کی بیوی نے جلدی سے پوچھا۔

"نہیں، اتنی سی مچھلی بھلا مجھے کیا دے دیتی!" مچھیرے نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اونھ۔ بالکل بے وقوف ہو تم!" اس کی بیوی نے جھڑک کر کہا: "جاؤ ابھی جاؤ، اس سے کہو کہ ہمیں روٹی دے۔ آج گھر میں روٹی کا ایک نوالہ بھی نہیں ہے۔"

مچھیرا اس چٹان پر پہنچا جہاں سے اس نے مچھلی کو پانی میں چھوڑا تھا۔ اس نے جھک کر پانی کے پاس منہ کر کے زور سے کہا۔

مچھلی جل کی رانی   چھوڑو نیلا پانی
میرے پاس آؤ   میری بات سن جاؤ

فوراً مچھلی نے اپنا سر پانی سے نکالا: "کیا بات ہے میرے دوست؟"

"میری بیوی چاہتی ہے کہ تم ہمیں روٹی دو۔"

"اچھا گھر جاؤ۔ تمھیں روٹی مل جائے گی۔" مچھلی نے کہا اور پانی میں غائب ہو گئی۔

مچھیرا گھر پہنچا تو جھونپڑی کے دروازے پر بہت سی پکی پکائی روٹیاں رکھی تھیں۔ وہ انھیں اٹھا کر اندر لے گیا اور بیوی سے کہا: "لو دیکھو، میں کتنی بہت سی روٹیاں لے آیا ہوں۔"

"خیر روٹی تو آگئی، مگر تم نے یہ نہیں دیکھا کہ میں کتنے پھٹے ہوئے کپڑے پہنے ہوں۔ تم ابھی پھر جاؤ اور مچھلی سے میرے لیے نئے کپڑے اور مانگو۔" بیوی نے تیز ہو کر کہا۔

مچھیرا ایک بار پھر اسی چٹان پر پہنچا۔ اور پانی کے پاس منہ لے جا کر اس نے آواز دی۔

مچھلی جل کی رانی   چھوڑو نیلا پانی
میرے پاس آؤ   میری بات سن جاؤ

مچھلی نے پانی سے اپنا سر باہر نکالا: "کیا بات ہے میرے دوست؟"

"میری بیوی بہت پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ اور اس نے مجھے تمہارے پاس نئے کپڑوں کے لیے بھیجا ہے۔"

"اچھا گھر جاؤ۔ تمھیں نئے کپڑے مل جائیں گے۔" مچھلی نے جواب دیا اور پانی میں غائب ہو گئی۔

مچھیرا جب گھر پہنچا تو دیکھا کہ دروازے پر ایک بڑا سا بنڈل رکھا ہے۔ گھر میں لاکر جب اس نے اسے کھولا تو دیکھا کہ اس میں اس کی بیوی کے لیے ایک جوڑا کپڑا رکھا ہوا ہے۔ بیوی اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور اسے پہن کر بولی۔

"میں ان کپڑوں میں اچھی تو لگتی ہوں، مگر ایسے اچھے کپڑوں سے کیا فائدہ، جب میں اتنے خراب گھر میں

رہتی ہوں۔ اس کی کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی ہیں۔ چھت ٹپکتی ہے۔ اور چھت میں سوراخ ہیں۔ جاؤ اور مچھلی سے نیا گھر مانگو۔"

"نہیں . . . یہ تو بہت بری بات ہے۔ بار بار مانگتے رہنا۔" مچھیرے نے جواب دیا۔

"نہیں۔ تمھیں جانا پڑے گا۔ جیسا میں کہہ رہی ہوں ویسا تم کو کرنا پڑے گا۔" عورت نے سختی سے کہا۔

بے چارا مچھیرا پھر اسی چٹان پر پہنچا، اور پانی کے پاس منہ کرکے کہا

مچھلی جل کی رانی چھوڑ دو نیلا پانی
میرے پاس آؤ بات میری سن جاؤ

سنہری مچھلی نے اپنا منہ پانی سے نکالا۔ "اب کیا چاہتے ہو؟"

"مجھے افسوس ہے کہ میں تمھیں پھر تکلیف دے رہا ہوں۔" مچھیرے نے شرماتے ہوئے کہا۔ "مگر میری بیوی ایک اچھا سا گھر چاہتی ہے۔"

"بہت اچھا تم گھر جاؤ۔" مچھلی نے کہا اور نیلے نیلے پانی میں پھر غائب ہو گئی۔

مچھیرا جب اپنے گھر کے پاس پہنچا تو اس کی حیرت کی حد نہ رہی۔ اس نے وہاں اپنی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کی بجائے ایک خوبصورت گھر دیکھا جس میں نہ کوئی ٹوٹی کھڑکی تھی نہ ٹپکنے والی چھت۔ وہ دور سے بہت ہی خوب صورت لگ رہا تھا۔

اس نے اندر جا کر بیوی سے کہا۔ "کہو اب تو تم خوش ہو؟"

"نہیں . . . ابھی میں خوش نہیں ہو[ں]" لالچی بیوی نے جواب دیا۔

"اب تمھیں اور کیا چاہیئے؟" مچھیر[ے نے حیران] ہو کر پوچھا۔

"میں چاہتی ہوں کہ میں ایک بہت ا[میر عورت] بن جاؤں، یہاں نوکر چاکر ہوں، گھوڑا گاڑ[ی ہو،] میرے پاس بہت سا روپیہ ہو اور اس سے کو[ئی ...] ہو۔ جاؤ اور جو کچھ میں چاہتی ہوں مچھلی سے لے [آؤ۔]"

"نہیں نہیں، تم بہت لالچی ہو۔" بے[چارے مچھیرے] نے انکار کیا۔ اسے بار بار مانگتے ہوئے شرم آ ر[ہی تھی۔]

"تم بالکل بدھو ہو۔" اس کی بیوی نے [کہا۔ "تمھیں] ابھی جانا پڑے گا۔"

بے چارا مچھیرا ایک بار پھر اسی چٹان پر آ[یا اور] پانی سے منہ لگا کر کہنے لگا۔

مچھلی، جل کی رانی چھوڑ دو نیلا پانی
میرے پاس آؤ میری بات سن جاؤ

مچھلی نے پانی سے منہ نکالا۔ "اب تمھی[ں کیا] چاہیئے؟"

"مجھے بہت افسوس ہے۔" مچھیرے نے ش[رمندگی] کے ساتھ کہا۔ "میری بیوی اب بھی خوش نہیں [ہے۔] وہ بہت امیر عورت بننا چاہتی ہے، جس کے پ[اس بہت] سے نوکر چاکر ہوں، گھوڑا گاڑی ہو۔ بہت [سے] پیسے ہوں۔ اور بہت بڑا سا گھر ہو۔"

"اچھا! تم گھر جاؤ۔ جو وہ چاہتی ہے۔"

مچھیرا گھر پہنچا تو دیکھا کہ جہاں اس کا چھوٹا سا گھر تھا وہاں ایک بہت بڑا گھر کھڑا ہے۔ باہر بہت خوب صورت دو گھوڑوں والی بگھی کھڑی ہے۔ جب وہ دروازے پر پہنچا تو اندر سے ایک نوکر نکلا۔ اور غریب مچھیرے سے پوچھا کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے؟

"یہ تو میرا گھر ہے!" غریب مچھیرے نے گھبرا کر جواب دیا۔

نوکر ہنستا ہوا اندر چلا گیا اور وہاں جا کر گھر کی مالکن کو بتایا کہ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے ایک مچھیرا گھر میں آنا چاہتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ گھر اسی کا ہے۔"

مگر اب مچھیرے کی بیوی امیر عورت ہو چکی تھی۔ اب اسے اس بات سے شرم آئی کہ وہ ایسے پھٹے حالوں والے آدمی کو اپنا شوہر بتائے۔ اس نے ملازم سے کہا۔

"یہ ایک پاگل سا آدمی ہے، تم اسے کوئی معمولی کام دے دو.... اچھا دیکھو! اسے ادھر ملازموں والے کمرے میں بھیج دو، اور کہہ دو کہ وہ جوتوں پر پالش کیا کرے۔"

کچھ دن تک تو مچھیرے کی بیوی بہت خوش رہی۔ مگر چند ہی دنوں بعد اس کے دل میں لالچ نے پھر سر اٹھایا۔ اس نے ایک بار پھر شوہر کو بلایا اور کہا۔

"تم فوراً اپنی مچھلی کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ میں ایک رانی بننا چاہتی ہوں۔ وہ مجھے رانی بنا دے۔" مچھیرا اب بہت دکھی ہو چکا تھا۔ اسے دن بھر جوتوں پر پالش کرتے رہنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ سارے نوکر چاکر اسے برا بھلا کہتے رہتے۔ اس لیے اسے اور تکلیف ہوتی تھی۔ وہ ایک بار پھر اسی چٹان پر گیا اور پانی کے پاس منہ لگا کر زور سے چیخا۔

مچھلی، جل کی رانی   چھوڑ نیلا پانی
میرے پاس آؤ   بات میری سن جاؤ

مچھلی باہر نکلی اور پوچھا: "میرے دوست اب تمھیں کیا چاہیے؟"

"میری بیوی اب بھی خوش نہیں ہے۔ اور اب میں بھی تکلیف میں ہوں۔" مچھیرے نے کہا۔ "اب یا تو تم اپنی یہ طاقت دے دو کہ میں خود جو کچھ چاہوں کر سکوں کیوں کہ مجھے تمھیں بار بار تنگ کرتے ہوئے بڑی شرم آتی ہے۔ اور اگر تم مجھے یہ طاقت نہیں دے سکتیں تو مجھے میری پرانی حالت پر لوٹا دو۔ پھر تم کبھی پانی سے باہر مت آنا۔ میں بہت تنگ ہو چکا ہوں۔"

مچھیرے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

"بہت اچھا" مچھلی نے کہا۔ اور وہ ہمیشہ کے لیے نیلے نیلے پانی میں غائب ہو گئی۔

مچھیرا گھر واپس لوٹا تو دیکھا کہ اب وہاں وہ بڑا سا گھر نہیں ہے۔ اور اس کی جگہ اسکی وہی پرانی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑی کھڑی ہے۔ دروازے پر اس کی بیوی اپنے پرانے گندے کپڑے پہنے اس کا انتظار کر رہی ہے۔

"تم نے آج کوئی مچھلی پکڑی؟"

"نہیں آج تو کوئی نہیں پکڑی!"

"اچھا چلو کوئی بات نہیں، اگلی بار آ جائے گی۔"

آؤ چلو، اندر چلو تو میں تمھیں بتاؤں کہ میں نے کتنا عجیب خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ جیسے میں ایک بہت امیر عورت ہو گئی ہوں۔ یہاں ایک بہت بڑا سا گھر ہے، نوکر چاکر ہیں، گھوڑا گاڑی ہے۔ اور نہ معلوم کیا کیا کچھ ہے۔ مگر میں خوش نہیں ہوں۔ جب میری آنکھ کھلی تو مجھے خوشی ہوئی کہ یہ سب کچھ خواب ہی تھا۔"

مچھیرا سب کچھ سنتا رہا، اور مسکراتا رہا۔ مگر اسے اپنی بیوی کی باتیں سن کر خوشی ضرور ہوئی۔ اسی وقت اس نے اپنا جال کندھے پر اٹھایا اور پھر سمندر کی طرف چل پڑا۔ اس دن اس نے بہت دنوں بعد، سمندر سے خوب بڑی بڑی مچھلیاں پکڑیں۔ اور جب وہ انھیں اپنے گھر لے کر پہنچا تو اس کی بیوی بولی۔

"تمھیں دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔"

"تم سے زیادہ آج میں خوش ہوں۔" مچھیرے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اور پھر دونوں خوشی خوشی دن گذارنے لگے۔

(خیال انگریزی سے لیا گیا)

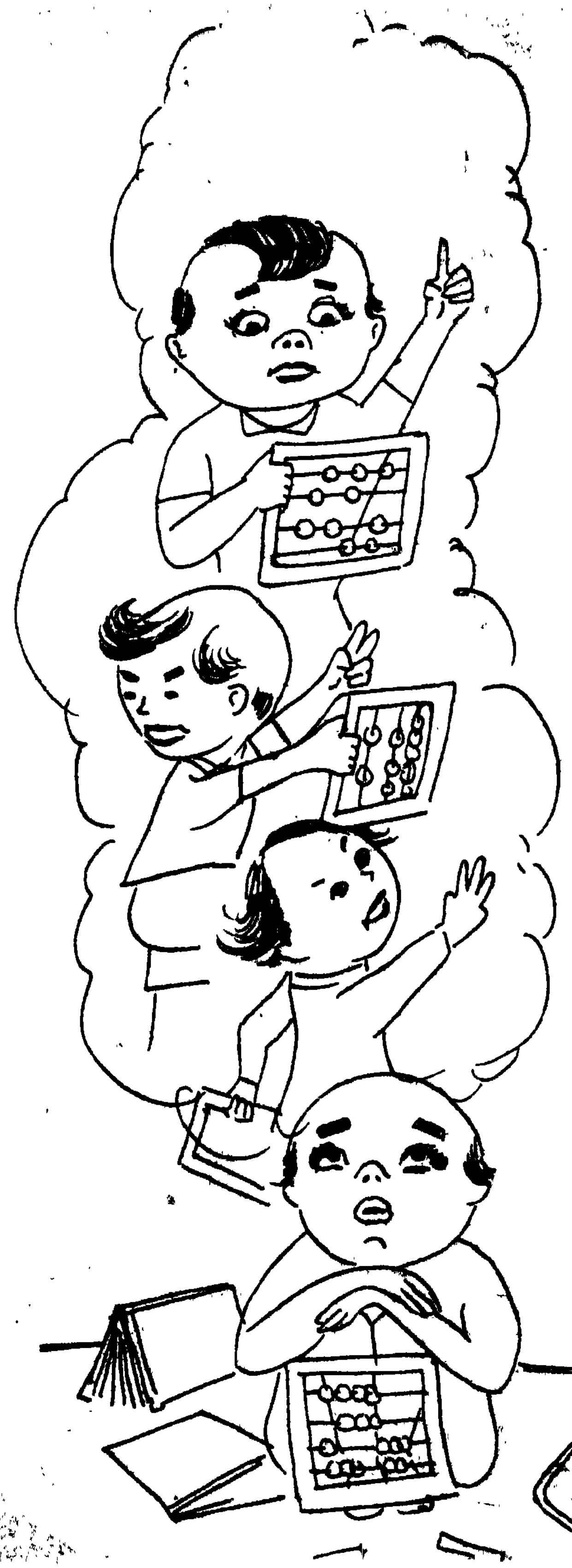
ایک طالب علم کی کہانی

مدعولی صاحب کی یہ کتاب دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی جس سے بچے اور بڑے سبھی کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں۔ اس کتاب پر مرکزی سرکار سے انعام بھی مل چکا ہے۔ قیمت ۲/-

ان کتابوں کو اپنی لائبریری کی زینت

کوے والا	۱/۷۵
برف کا گھر	-/۸۷
برف کے تیرتے پہاڑ	-/۳۷
آستین کا سانپ	-/۵۰
الٹی دوا	-/۵۰
بادشاہ کے کپڑے	-/۵۰
ایک ٹانگ کا بادشاہ	-/۳۲
زمین کی گردش	-/۵۰
انوکھی ملاقات	-/۴۵
جلتو مرغابی	۱/-
دادا نہرو	۱/۵۰
تین اناڑی	۱/۴۰
ستاروں کی سیر	۱/۷۵
جن حسن عبدالرحمٰن (مکمل)	۴/-
ظالم کسان	-/۳۵
میر تقی میر	۱/-
سونے کی چڑیا	۱/-
گلابو چڑیا	-/۴۵
آدمی کی کہانی	۱/۲۵
ابّو خاں کی بکری	۱/۵۰

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، جامعہ نگر، نئی دہلی



جناب حشمت کمال پاشا - بی کام

گنتی سیکھو

پہلے بولو ایک
ہم سب بچے نیک
دو یعنی ہم تم
کھیل میں ہو ہیں نہ گم
ہند، امریکہ چین
ہوئے ہیں مل کے تین
اس کے بعد ہے چار
بڑوں میں کھوٹ ہے یار
مل کے رہیں گر پانچ
آئے نہ ہرگز آنچ
چھ کی ہے یہ پہچان
دو کا الٹا جان
چھ اور ایک ہیں سات
کہو نہ گندی بات
آیا بعد میں آٹھ
علم سے ہے سب ٹھاٹھ
بجتے ہیں ــــ آؤ
اب پڑھنے کو جاؤ
رہ گیا اب اک دس
بس بھئی پاشا بس

اگر میں جادوگر ہوتا



اسکول کی استانی تمارا کانستنیتنووناء نے اپنے درجے کے بچّوں سے "اگر میں جادوگر ہوتا تو" کے موضوع پر مضمون لکھنے کے لیے کہا۔

مضمون جلد ہی لکھ دیے گئے۔ اور اسکول کی استانی کے حوالے کر دیے گئے۔ آٹھ سال کے بچّوں نے حیرت انگیز کام کر دکھایا۔ ایسی کون سی بات ہے، جو ان مضمونوں میں نہیں ہے؟ خلائی جہاز، آن جانے سیّارے تک پرواز کرتے ہیں اور خلا باز ان کی تصویریں اتارتے ہیں۔ کاریں آواز کی رفتار سے بھی تیز چلتی ہیں "ببر شیروں کو لق و دق میدانوں میں سدھایا جاتا ہے" ہمارے کرّۂ ارض پر کوئی جنگ نہیں ہوتی۔

یہ کسی بچّے نے نہ لکھا کہ وہ اکیلا ایک سو، آئس کریم کھانا چاہتا ہے، یا دنیا بھر کے تمام کھلونے خریدنا چاہتا ہے۔ لیکن قریب قریب سب بچّے یہ چاہتے تھے کہ "ہر کوئی اچھی زندگی بسر کرے، اور دوستی کے ساتھ رہے" "تمام لوگ خوش رہیں" "ہر خاندان، خوش پوش ہو" اور "کوئی بھی نہ مرے" قریب قریب ہر مضمون، محنت اور پیار کی جھلک تھی۔ جو کہ خصوصاً

ان لوگوں کے ساتھ جو زیادہ قریبی اور عزیز

اگر ان نوعمر جادوگروں کے خواب حقیقة

پہن لیں تو لوگوں، حیوانوں اور پرندوں کی زند

دل آویز ہو جائے!

نوعمر جادوگروں کے لکھے ہوتے چند مض

کے جستہ جستہ ٹکڑے آپ بھی پڑھیے۔

"اگر میں جادوگر ہوتا تو اس بات کا خی

کہ ہر شخص اچھی زندگی بسر کرے، اور دوستی

رہے۔ ہر جگہ سبزہ زار ہوں۔ کاریں اور مکان

سے چمکتے نظر آئیں۔ سورج ہمیشہ چمکتا رہے

اس کی چمک دمک ختم نہ ہو۔ زمین پر کوئی لڑائی

اور میں ایک ایسی فیکٹری میں کام کروں جہاں

جہاز بناتے ہیں جو ہوا میں اڑتے ہیں۔ اور

کو ایک ملک سے دوسرے ملک میں لے جاتے ہیں۔" اور

"میں اس بات کو یقینی بنا دوں گا کہ کوئی ماں مرنے نہ پائے۔ لینن زندہ ہوں، اور ویت نام میں کوئی جنگ نہ ہو۔ ہر آدمی اپنے ملک سے محبت کرے۔ ہر آدمی اپنی ماں کی مدد کرے اور تمام لوگ خوش رہیں، اور میں چاہتا ہوں کہ ہر کوئی پڑھے، پڑھے اور پڑھے۔"

میشا الین

"اگر میں جادوگر ہوتا تو میں اپنی ماں کو کپڑے دھونے کی ایک مشین دیتا کیوں کہ وہ لگاتار سارا دن کپڑے دھوتی رہتی ہیں، اور تھک جاتی ہیں۔ میں ایک اچھا طالب علم ہوتا اور سب سے زیادہ نمبر لیتا۔ اور میرا بھائی ایک اچھا طالب علم ہوتا۔"

سرلوزا اتذ فانوف

"میں شکار کے لیے محفوظ جانوروں کے ذخیرے میں جاتا۔ جانوروں کی دیکھ بھال کرتا۔ پرندوں کی آوازوں کے ریکارڈ تیار کرتا۔ اور جانوروں اور پرندوں کی تصویریں اتارتا۔ میں جانوروں سے بڑی محبت کرتا ہوں۔ میں جانوروں کو یہ سکھاتا کہ لوگوں سے ڈرنا نہیں چاہئے۔"

الیوشا شمیکوت

"میں جادوگر ہوتا تو کبھی لڑائی نہ ہوتی۔ کیوں کہ مجھے پُرامن زندگی عزیز ہے۔ اور بری زندگی مجھے پسند نہیں ہے میں چاہتا ہوں کہ میرا ملک ہمیشہ آزاد رہے۔"

الیوشا سازونوف

"میں اپنی امّاں کو ۲۰ برس کی اور اپنی دادی امّاں کو ۲۵ برس کا بنا دیتی تاکہ وہ کبھی بوڑھی نہ ہونے پائیں اور مرنے نہ پائیں۔ کیوں کہ مجھے ان سے محبت ہے۔ میں ہرگز ہرگز یہ نہیں چاہتی کہ کوئی مرجائے اور میں چاہتی ہوں کہ ہمیشہ موسم گرما رہے۔ سورج چمکتا رہے اور فوراً ہی نیا سال آجائے۔"

ایرلکنز تنیوا

"میں ایک اچھا طالب علم ہوتا۔ مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔ صرف بہترین اور اچھے نمبر چاہئیں۔ اور میں اس قابل ہوتا کہ بہت اچھا لکھ سکتا۔ پھر میں بڑا ہوکر، آزمائشی ہوا باز ہوتا۔ میں ہوا باز کیوں بننا چاہتا ہوں؟ تاکہ اپنے آسمان کی حفاظت کرسکوں۔ میں اپنے ملک کی حفاظت کروں گا۔"

سلاوا زنامینسکی

"اگر میں جادوگر ہوتا تو میں اپنے لیے پر بناتا۔ اور ساری دنیا کے اوپر پرواز کرتا۔ میں ہاتھیوں پر چڑھتا میں افریقہ کے اردگرد سمندروں میں تیرتا۔ میں جھینگا مچھلیاں کھاتا۔ دھوپ میں اپنے بدن کا رنگ سانولا بناتا۔ میں یہ دیکھتا کہ وہاں ان کے پاس کتنے چڑیا گھر ہیں۔ میں یہ دیکھتا کہ ہاتھی کیسے کام کرتے ہیں۔ پھر میں دنیا کے اردگرد پرواز کرتا۔ اور ایک دفعہ پھر ماسکو واپس آجاتا۔"

شاسا لاپکن

"اگر میں جادوگرنی ہوتی تو تمام لوگ اچھی زندگی بسر کرتے۔ ہر خاندان کے پاس ضرورت کی ہر چیز ہوتی ہر خاندان خوش و خرم رہتا۔ اور دنیا کے تمام لوگ دوستی سے رہتے۔"

نیلی گینوا

جناب خلیق انجم اشرفی

منّی باجی

آج ہم تمھیں تمھاری منّی باجی کی کہانی سنائیں گے۔ ہے تو یہ سچا واقعہ پر ہم کہانی اس لیے کہہ رہے ہیں کہ تمھاری منّی باجی اب اس دنیا میں رہیں نہیں۔ وہ جامعہ میں پڑھتی تھیں۔ تمھارے جیسے پیارے پیارے بچوں کو پڑھانے کے لیے۔ وہ بی۔ ایڈ کر رہی تھیں۔

ان کا اصل نام تو شاہدہ صفات تھا۔ گھر والے پیار سے 'منّی' کہتے تھے۔ ہم تمھیں ان کی کہانی اس لیے سنانا چاہتے ہیں کہ اوّل تو اس سے ہمارے دل کا بوجھ ہلکا ہوگا دوسرے ان کی کہانی میں بہت سی ایسی باتیں ہیں، جو تمھارے کام کی ہیں۔

منّی باجی کی زندگی کے سارے واقعات تو ہمیں معلوم نہیں۔ کچھ باتیں ضرور معلوم ہیں۔ اب جیسے ایک واقعہ سنو۔!

تمھیں یہ تو معلوم ہی ہوگا کہ جامعہ میں بی ایڈ میں داخلہ سے پہلے ایک ٹسٹ لیا جاتا ہے۔ اس میں کامیاب ہونے کے بعد انٹرویو دینا پڑتا ہے۔ اصل میں جامعہ والے یہ دیکھتے ہیں کہ بی ایڈ میں داخلہ لینے والے۔ تم ننھے منّے پھول جیسے بچوں کو تعلیم دینے، ان کی تربیت کرنے کے لیے مناسب بھی ہیں یا نہیں۔ منّی نے ٹسٹ پاس کرلیا۔ ...کے لیے بلائی گئیں۔ ان کا نام پکارا گیا۔ سر پر اچھی طر... اوڑھے، ڈرتی جھجکتی، چھوٹے چھوٹے قدموں سے ... داخل ہوئیں تو پہلا سوال انٹرویو بورڈ کے ایک م... کیا۔

"کیوں خاتون! آج کل جب دوپٹّہ گلے میں... کا رواج عام ہے۔ آپ نے یہ بڑی بوڑھیوں کی طر... سے سر کیوں ڈھک رکھا ہے؟"

منّی نے فوراً جواب دیا۔ "یہ بتائیے کہ جب شیروانی اور ٹوپی کا رواج تقریباً ختم ہوچکا ہے۔ آپ ... لباس کیوں پہن رکھا ہے؟ یہ تو اپنے اپنے مذاق اور ... بات ہے۔"

تمھاری منّی باجی کا جنم آج سے بیس برس ... بنارس میں ہوا، شروع میں ایک مکتب میں پڑھا۔ بار... کی عمر میں دہلی آگئیں۔ آٹھویں تک پڑھ کر واپس اپنے ... زمانیہ لوٹ گئیں۔ ان کے ابّا جان اس وقت وہیں ا... کالج کے پرنسپل تھے۔ انھوں نے منّی کو پڑھایا۔ انھوں نے گھر پر پڑھ کر ہائی اسکول۔ انٹر اور بی...

کے امتحان اچھے نمبروں سے پاس کیے، اور اس کے بعد بی ایڈ کرنے دلی آئیں۔

اب ان کے بچپن کا ایک مزیدار واقعہ سنو۔ وہ اس وقت ننھی ہوں گی کوئی چھ سات سال کی۔ ان کے بڑے بھائی نے جو خود بھی تیرہ سال کے تھے، گھر کا پلا ہوا ایک مرغ ذبح کرنا چاہا۔ ابھی مرغے کی گردن ذرا ہی سی کٹ پائی تھی کہ وہ اٹھ کر بھاگنے لگا۔ بڑی بھاگ دوڑ کے بعد بڑے بھائی نے اسے پکڑ کر ذبح کر دیا۔ منّی نے یہ سارا تماشہ دیکھا اور اس دن سے انھیں گوشت سے ایسی نفرت ہوئی کہ پورے دس سال تک اسے ہاتھ نہ لگایا۔

تم لوگ یہ تو جانتے ہی ہو کہ تعلیم کا اصل مقصد تہذیب حاصل کرنا ہے، انسان بننا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں اچھے لوگوں کی طرح سب کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنا ہے۔ لیکن آج کے زمانے میں یہ اصل مقصد کچھ ختم سا ہو گیا ہے۔ اب تو تعلیم روٹی حاصل کرنے کا ذریعہ بن گئی ہے۔ پھر بھی گنتی کے چند لوگ تعلیم صرف تعلیم ہی کے لیے حاصل کرنے کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں میں یہ منّی باجی بھی تھیں۔ انھیں آگے اور آگے پڑھنے کی تمنا تھی۔ وہ بی ایڈ کرنے کی بجائے ایم اے کرنا چاہتی تھیں۔ مگر ان کے بھائی چاہتے تھے کہ وہ بی ایڈ کریں۔ جو کام آدمی نہیں کرنا چاہتا اسے بیگار کی طرح ٹالتا ہے۔ سوچتا ہے کہ اس سے پیچھا چھوٹ جائے تو بہتر ہے۔ لیکن منّی نے بھائیوں کی خواہش کو اپنی تمنا سے بڑھ کر سمجھا۔ بڑوں کا احترام ہر چھوٹے پر فرض ہے۔ [illegible] بی ایڈ میں داخلہ حاصل کرنے کی کوشش کی۔ کامیاب رہیں۔ اور تھوڑے ہی دنوں میں استادوں پر ایسا اثر ڈالا کہ ایک استاد ڈاکٹر سلامت اللہ صاحب نے فرمایا کہ: "پچھلے دس بارہ برس میں جامعہ ٹریننگ کالج میں ایسی ہونہار طالبہ نہیں آئی"۔

ان کے بی ایڈ کے زمانے کے دو دلچسپ اور سبق آموز واقعات اور سنو۔ خان بابا (خان عبدالغفار خان) جامعہ آئے تو انھیں گرلز ہاسٹل لے جانے کے لیے جو لڑکیاں آئیں ان میں منّی بھی تھیں۔ شیخ الجامعہ نے انھیں خان بابا کے برابر بٹھا دیا۔ کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ خان بابا نے پوچھا: "اے لڑکی تو کیوں ہنستا ہے" بولیں: "میں یہ دیکھ کر ہنسی کہ آپ تو اتنے بڑے ہیں میں اتنی سی۔ کتنی عجیب سی بات ہے؟" بعد میں شیخ الجامعہ نے ہنسنے کی اصل وجہ دریافت کی تو بچوں کی طرح بڑی سادگی سے بولیں: "اصل میں مجھے خان بابا کی بڑی سی سرخ ناک دیکھ کر ہنسی آگئی تھی"

ان کے ایک استاد ایک دن باتوں ہی باتوں میں سبھی طالب علموں سے ان کی پیدائش کی جگہ اور ذات وغیرہ کے بارے میں سوالات کر رہے تھے۔ جب منّی کا نمبر آیا اور ان کی ذات پوچھی تو بھلا انھوں نے کیا جواب دیا؟ وہ بڑی سنجیدگی سے اٹھ کر بولیں "آدمی"

آدمی مروت میں دوسرے کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے چاہے دوسرا غلط ہی بات کیوں نہ کہہ رہا ہو اور دل میں اس پر نکتہ چینی کرتا ہے لیکن منّی جو بات غلط سمجھتیں

جھٹ منہ پر کہہ دیتیں۔ لیکن یہ سوچ کر کہ کسی کو کہیں برا نہ لگے۔ اس کا دل نہ دکھے، وہ بات اس طرح کہتیں جیسے کونین کی گولی شکر میں لپیٹ کر دی جاتی۔

انھیں بچّوں سے بڑی محبت تھی۔ جب فرصت ملتی تو محترم دلی صاحب (منیجر پیام تعلیم) کے چھوٹے صاحبزادے کو پڑھانے چلی جاتیں۔ اس سے خوب کھیلتیں۔ باتیں کرتیں۔ دونوں بہت اچھے دوست بن گئے تھے۔

میری چھوٹی بہن شائستہ سے ایک بار ایک گھنٹے کے لیے ملیں۔ اور دونوں اتنی ہی دیر میں گہری دوست بن گئیں۔ بڑے پیار سے انھوں نے شائستہ کے بال سنوارے منہ دھلایا، کپڑے پہنائے، اور نرسری جانے کے لیے تیار کر دیا۔

چھوٹے بڑوں کا احترام کرتے ہیں کوئی عجیب بات نہیں لیکن اگر بڑے کسی چھوٹے کی عزت کریں تو کچھ عجیب سی بات ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے ناکہ اس چھوٹے میں کوئی خاص بات ہے۔ منی مجھ سے چھوٹی تھیں مجھے انجم بھائی کہتی تھیں۔ لیکن میں ہمیشہ انھیں، "آپ" کہہ کر مخاطب کرتا۔ ان کی شخصیت میں یہ عجیب سی بات تھی، کہ بڑے بھی احترام کرتے۔ عزت کرتے۔

شور اور ہنگامہ بالکل پسند نہ تھا۔ بچّوں سے محبت تھی، لیکن ان کے شور سے بہت گھبراتی تھیں۔

جامعہ سے بڑی محبت تھی بڑا لگاؤ تھا اور اس کی ایک بڑی وجہ وہاں کا پیارا پیارا پرسکون ماحول بھی تھا۔ ان کا ارادہ ملازمت کے بعد جامعہ ہی میں مستقل رہنے' اللہ میاں نے ان کی یہ خواہش پوری کر دی۔ لیکن افسوس، کیسے عجیب طریقے سے تھے۔

تمھارے ثانوی اسکول کی عمارت کے" چھوٹا سا قبرستان ہے۔ تمھاری منی باجی آج وہ ہنگامے اور شور سے دور، بڑے سکون کی نیند سو رہی ہیں۔

دیوزاد گوریلے

جناب افضل ا

افریقہ کے بعض جنگلوں میں اب بھی ایسے' پائے جاتے ہیں جن کے ہاتھ پیر اور جسم انسانوں سے ملتے جلتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ ہمارے بدن پر بال نہ اور ان کے سارے جسم پر بال ہی بال ہوتے ہیں۔ یہ گو درختوں پر بسیرا کرتے ہیں۔

تعلیمی تاش

چھوٹے اور بڑے سب ہی کے لیے ایک کھیل ہے۔ اس کے کھیلنے سے وقت ضائع نہیں ہو قابلیت بڑھتی ہے۔

تعلیمی تاش اردو
تعلیمی تاش انگریزی
تعلیمی تاش ہندی
تعلیمی تاش صرف ہندی
تعلیمی تاش، انگریزی

بچوں کی مزے دار، دلچسپ کہانیوں کی کتابیں

...یہب

...ں حضرت	الیاس احمد مجیبی	-/۵۶
...ن اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	-/۵۰
...یار	الیاس احمد مجیبی	۱/۳۲
...ائے اربعہ	خواجہ عبدالحیّ فاروقی	۱/۵۰
...ل پاک	عبدالواحد سندھی	۱/۸۰
...رکار دوعالم	محمد حسین حسان	۲/۰
...ید اسلام	مولانا اسلم جیراجپوری	-/۵۰
...ان بیبیاں	اعجاز الحق قدوسی	-/۷۵
...ں کے قصے	خواجہ عبدالحیّ فاروقی	۱/-
...ے رسول	"	۱/۴۴
...ے نبی	سید نواب علی رضوی	-/۶۰

...لومات

...ں کی کہانی	مشتاق احمد اعظمی	۱/۲۵
...ا عجائب خانہ (اوّل)	محمد حسین حسان	-/۵۰
" (دوم)	" "	-/۴۴
" سوم	" "	-/۴۴
" چہارم	" "	-/۵۰
...ی کہانی	علی احمد خاں	-/۵۰
...مقناطیس کے کھیل		-/۷۵
...ی کہانیاں (اوّل)	نجمہ سلطانہ	-/۸۰
" (دوم)	ضیاء الرحمٰن	

تاریخ ہند کی کہانیاں (سوم)	مشتاق احمد اعظمی	-/۸۰
" (چہارم)	"	-/۹۵
بڑدادا کی کہانی	پروفیسر عبدالغفور	-/۵۶
ٹیگور	صفدر حسین	۱/۲۵
چٹانوں کی کہانی	محمد امین	۱/۷۵
خبر رسانی کے طریقے	رفیعہ امین	-/۸۵
دہلی	ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی	۱/۵۰
دنیا کے بسنے والے	بشیر حسین زیدی	-/۷۵
دنیا کے بچے	محمد حسین حسان	-/۸۰
سمندر کے کنارے	سلطان آصف فیضی	۱/۳۲
سماجی زندگی اوّل	احمد ایس پٹیل اور غلام ابرار	-/۵۶
" دوم	"	-/۸۰
" سوم	"	-/۸۱
" چہارم	"	-/۸۱
قدرت کے کرشمے		-/۶۲
مفید معلومات دوم		۱/۷۵
" سوم		۱/۴۵
" چہارم		۱/۵۰
معلومات کی پانچویں کتاب		۱/۵۰
سمندر کے نیچے	سلطانہ آصف فیضی	۲/۰

میرانیس	محمد حسین حسان	۱/۲۵
ہماری پارلیمنٹ	کیلاش چندر	۱/۵۰

کہانیاں

ابو خاں کی بکری	ڈاکٹر ذاکر حسین	۲/۵۰
اس نے کیا کرنا چاہا	آصفہ مجیب	-/۳۷
پاک کہانیاں (اوّل)	مقبول احمد	۱/۲۰
" (دوم)	"	۱/۱۵
تانبیل خان	محمد حسین حسان	-/۴۰
ترکوں کی کہانیاں		-/۵۵
چقماق کی ڈبیا	برکت علی فراق	-/۴۴
چھوٹی لالٹین	مشتاق احمد اعظمی	-/۳۱
چنبیلی	محمد حسین حسان	-/۵۰
چمپاوت کا آدم خور شیر	محمد معین	-/۳۵
خربوزہ شہزادے کا سر بن گیا	کوثر بانو	-/۳۰
شہزادی گلنار	پروفیسر عطاء اللہ	-/۴۰
شہلا	پروفیسر محمد مجیب	-/۵۰
لال مرغی	عبدالواحد سندھی	-/۵۰
مزہ چکھائیں گے		-/۳۵
ننھا ٹیڈو	خورشید سلطانہ	-/۳۵

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ

جناب بدیع الزماں خاور

قوالی



لڑکے :۔

مدرسہ آہ ایک آفت ہے

لڑکیاں

مدرسہ واہ ایک رحمت ہے

...

لڑکے :۔

تاج ماتھے پہ ہے جہالت کا
طوق گردن میں ہے حماقت کا
ہاتھ میں ہے علَم شرارت کا
لب پہ اعلان ہے بغاوت کا

....

آج تعلیم سے محبت کا
صاف انکار کر رہے ہیں ہم
کھل کے اظہار کر رہے ہیں ہم
علم سے آج ہم کو نفرت ہے
مدرسہ آہ ایک آفت ہے

...

لڑکیاں :۔ (۱)

علم سے روشنی ہے دنیا میں
علم سے تازگی ہے دنیا میں
علم سے دل کشی ہے دنیا میں
علم سے زندگی ہے دنیا میں

...

علم سے آدمی ہے دنیا میں
جب سے جانا ہے اس حقیقت کو
چھوڑ بیٹھے ہیں ہم جہالت کو

علم سے آج ہم کو الفت ہے
مدرسہ واہ ایک رحمت ہے

(۲)

احمقوں کو شعور دیتا ہے
بزدلوں کو غرور دیتا ہے
غم زدوں کو سرور دیتا ہے
علم اندھوں کو نور دیتا ہے

......

کام لیتے نہیں حماقت سے
لو لگاتے نہیں شرارت سے
صلح کرتے نہیں جہالت سے
مات کھاتے نہیں وہ ظلمت سے
آشنا ہیں جو اس حقیقت سے

....

علم و فن کی پناہ میں آؤ
عقل کی جلوہ گاہ میں آؤ
پڑھنا لکھنا بھی اک عبادت ہے
مدرسہ واہ ایک رحمت ہے

لڑکے:-

تم نے بہنو، جگا کے غفلت سے
آشنا کر دیا حقیقت سے
ورنہ تھے بے خبر صداقت سے
ہم تھے گمراہ ایک مدت سے

ہم کو افسوس ہے حماقت کا
رنج ہے علم سے بغاوت کا
اب اٹھا کر عَلَم شرارت کا
دم بھریں گے نہ پھر جہالت کا

....

اپنے اسکول سے محبت کا
آج اقرار کر رہے ہیں ہم
دل سے اظہار کر رہے ہیں ہم
علم سے ہم کو آج الفت ہے
مدرسہ واہ ایک رحمت ہے

لڑکے اور لڑکیاں (ایک ساتھ)

علم سے روشنی ہے دنیا میں
علم سے تازگی ہے دنیا میں
علم سے زندگی ہے دنیا میں
علم سے آدمی ہے دنیا میں

...

لڑکے:-

آج سمجھے ہم اس حقیقت کو
ہے سلام آج سے جہالت کو
علم سے آج ہم کو الفت ہے
مدرسہ واہ ایک رحمت ہے

اپنے دیس میں ہاتھی بہت عام ہیں، شاید ہی کوئی بچّہ ہو، جس نے ہاتھی نہ دیکھا ہو، بہت سے بچّوں کو کبھی نہ کبھی ان پر بیٹھنے کا موقع بھی ملا ہوگا۔ دلّی کے چڑیا گھر میں اکثر اس کا بھی انتظام ہوتا ہے کہ جو بچّے ہاتھی پر بیٹھ کر گھومنا چاہیں، تو گھوم سکتے ہیں۔ مگر اس کے لیے پیسے دینے پڑتے ہیں۔

میرے ساتھ جو بچّے تھے وہ سب کے سب بار بار ہاتھی دیکھ چکے تھے، اسی لیے وہ جانور دیکھنا چاہتے تھے جنھیں دیکھنے کا کبھی موقع نہیں ملا ہے، یا بہت کم ملا ہے۔ مگر مجھے تو ہاتھی کے متعلق کچھ بتانا تھا، اس لیے انھیں ہاتھیوں کے قریب کچھ دیر کے لیے روکنا چاہتا تھا۔

اتفاق سے اس کا ایک اچھا موقع ہاتھ آگیا۔ ان ہاتھیوں میں ایک ننھا منّا بچّہ بھی تھا۔ ان بچّوں میں سے ہاتھی کا بچّہ کسی نے نہ دیکھا تھا۔ نشاط کی نظر بچے پر پڑی تو خوشی سے اچھل پڑی اور ا… اور افشاں کو پکڑ کر ادھر متوجہ کیا۔

بس پھر کیا تھا، ہاتھی کے ننھے … دیکھنا تھا کہ سب ہی دوڑ کر ہاتھیوں کے ق… گئے اور بڑی دل چسپی کے ساتھ دیکھنے…

بچّوں کی دل چسپی سے فائدہ اٹھ… میں نے کچھ بتانے کی کوشش کی۔ "یہ تو شا… جانتے ہی ہوگے کہ جانوروں میں سب سے ب… ہاتھی ہے۔ مگر شاید تمھیں یہ نہ معلوم ہو ک… عمر بھی بہت ہوتی ہے۔ انسانوں کی طر… ستّر سال تک زندہ رہتا ہے۔"



"ایک ہاتھی کا وزن بھلا کتنا ہوگا! پھوپھا جان؟" جدہ نے سوال کیا۔

"کوئی ساڑھے تین ٹن!" میں نے جواب دیا۔ "یون شبو! جانتی ہو ایک ٹن کتنا ہوتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

شبو کو خاموش دیکھ کر ثمانے جواب دیا۔ "دو ہزار دو سو چالیس (۲۲۴۰) پونڈ۔"

"تم نے انگریزی اسکول میں پڑھا ہے، اسی لیے پونڈ میں بتا رہی ہو۔ من میں بتاؤ؟" میں نے کہا۔

ثما شاید حساب لگانے لگی، جاوید بولے۔ "۲۷ اور ۲۸ من کے درمیان۔"

"اسی سے اندازہ کرو کہ ایک ہاتھی کا کتنا وزن ہوگا؟" میں نے کہا۔ "یعنی تقریباً ستّر من۔"

"کھاتا کتنا ہوگا۔ پھوپھا جان!" پروین نے سوال کیا۔

"روزانہ کھانے کے لیے کئی من گھاس چاہیے۔ اور پینے کے لیے لگ بھگ ایک من پانی چاہیے۔" میں نے بتایا۔

"ہم نے کہیں ایک دل چسپ قصہ پڑھا تھا کہ کسی درزی نے ایک ہاتھی کی سونڈ میں سوئی چبھوئی تھی۔ جہاں سے دوبارہ ہاتھی گذرا تو اپنی سونڈ میں کیچڑ بھر کر لیتا آیا اور درزی پر چھڑک دی۔ بیچارے [illegible]

بیان کیا۔

"ہاں ہاتھی کی یادداشت بہت اچھی ہوتی ہے" میں نے کہا۔ "کوئی شخص اس کے ساتھ برا سلوک کرے یا اچھا یہ بہت دنوں تک یاد رکھتا ہے۔ ایک اور قصہ مشہور ہے کہ: ایک ہاتھی کا پیر زخمی ہوگیا۔ جس کی وجہ سے اس کو بڑی تکلیف تھی۔ ایک دیہاتی نے چند روز دوا وغیرہ لگائی اور وہ اچھا ہوگیا۔ کئی سال بعد اس جگہ سے اس ہاتھی کا پھر گذر ہوا۔ اور اس آدمی کو دیکھتے ہی جس نے اس کا علاج کیا تھا۔ فوراً اس کی طرف پیر بڑھا کر اسی طرح کھڑا ہوگیا۔ جس طرح دوا لگوانے کے لیے پیر بڑھا کر کھڑا ہوتا تھا۔"

"اتنے بڑے دانتوں سے جو باہر نکلے ہوتے ہیں، ہاتھی کھاتا کیسے ہوگا؟" افشاں نے بڑی سادگی سے سوال کیا۔

ترنّم فوراً بولیں: "ارے وہ مثل نہیں سنی ہے "ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔" وہ دانت جن سے ہاتھی کھاتا ہے، منہ میں بالکل اندر ہوتے ہیں، دکھائی نہیں دیتے۔ یہ دونوں باہر نکلے ہوئے دانت محض دکھانے کے ہیں۔"

"دکھانے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ محض بے کار ہیں۔" میں نے کہا۔ "یہ دانت بہت قیمتی ہوتے ہیں۔ ان سے بہت سی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ یہ بہت داموں میں بکتی ہیں۔ ان دانتوں کی لمبائی عام طور پر چھ فٹ [illegible] کا وزن [illegible]

ہوتا ہے۔ یہ دانت ذرا نازک ہوتے ہیں۔ ہاتھی کے جسم میں سب سے کمزور چیز اس کے یہی دانت ہوتے ہیں۔ مگر پھر بھی ان سے وہ تھوڑا بہت کام بھی لیتا ہے۔ مثلاً ناریل سے گودا نکالنا ہو تو اوپری سخت چھلکا پیر سے توڑ کر دانتوں کی مدد سے گودا نکال لیتا ہے یا زمین کھود کر آلو نکالنے ہوں تب بھی انھی دانتوں کی مدد لیتا ہے۔"

"اور اتنی بڑی سونڈ کس لیے ہے پھوپھا جان؟" گڈو نے سوال کیا۔

"تمھیں پکڑنے کے لیے۔" ہما نے مذاق کیا۔

"یہی بہت مفید ہے اور ہاتھی کے بہت کام آتی ہے۔" میں نے اس مذاق کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "تم لوگ دیکھ رہے ہو ناکہ ہاتھی اسی کی مدد سے کھا رہا ہے، اسی سے، پالتو ہاتھی انسان کی بہت بڑی خدمت انجام دیتا ہے۔ مثلاً اگر بہت وزنی لکڑیاں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانی ہوں یا کہیں رکھنی ہوں تو وہ اپنی سونڈ ان میں لپیٹ کر اٹھا لیتا ہے۔ یہ کام وہ بڑی خوبی سے کرتا ہے۔ دیکھو اس کی آنکھیں بہت چھوٹی ہیں۔ اس لیے وہ چلنے میں بھی اس سے مدد لیتا ہے۔ میں نے اندھے ہاتھیوں کو دیکھا ہے کہ وہ اپنی سونڈ کی مدد سے اتنی تیزی سے چلتے ہیں کہ کوئی شخص یہ نہیں سمجھ سکتا کہ وہ اندھا ہے۔ یہی سونڈ اس کی ناک بھی ہے۔ اس کی مدد سے وہ خطرے کی بو بہت دور سے سونگھ لیتا ہے۔"

"کچھ ان کے بچوں کے بارے میں ابو جان؟" نشاط نے سوال کیا۔

"کوئی اکیس مہینے میں ایک بچہ ہوتا پیدا ہونے کے بعد اس کا وزن کوئی ڈھ ہے۔ ہاتھی اپنے بچوں سے بڑی محبت کر اگر کبھی ان کو کسی قسم کا خطرہ ہو تو ہاتھی گھیرے میں لے لیتے ہیں۔" میں نے یہ کہہ آگے بڑھایا کہ ابھی بہت سے جانور دیکھ

اس سرخ نشان کا مطلب ہے مدت خریداری ختم ہو چکی ہے ..... ہم کہ آپ اپنے پیارے پیامِ تعلیم کی سرپرستی گے ...... براہِ کرم مبلغ چھ روپے کا اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک بھیجیے تاکہ یہ رہے۔

آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہ سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا ا کے ساتھ بند کر دیں گے۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نہ بھولیے۔

آپ کا خریداری نمبر......

منیجر

ب وقار خلیل

چندا ماما

۲۶ اپریل ۱۹۷۰ء کو حیدرآباد کے "جواہر بال بھون" میں بچوں کے ممتاز شاعر اور ادیب مولوی شفیع الدین نیر کا پُرتپاک خیر مقدم کیا گیا۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ صدر شعبۂ اُردو جامعہ عثمانیہ نے اس جلسہ کی صدارت کی۔ بچوں کے ادیب اظہر افسر اور شاہد عظیم صاحب نے ادبِ اطفال پر روشنی ڈالی۔ محمود انصاری صاحب نے نیر صاحب کا تعارف کرایا۔ "جواہر بال بھون" کی طرف سے اس کی ڈائرکٹر مسز شاردا دیوی نے نیر صاحب کی جناب میں بیدری صنعت دستکاری کی ایک خوب صورت ٹرے نذر کی اور موصوف کی گل پوشی بھی کی گئی۔ اس ٹرے پر راقم الحروف کا قطعہ کندہ کیا گیا تھا جو یہ ہے ؎

اے میرے عہدِ تمنا کے نیر رخشاں — تیرے سخن نے کھلائے ہیں پھول بَن کتنے
ترے قلم نے تراشے ہیں آرزو کے کنول — مہک رہے ہیں شگوفے چمن چمن کتنے

حیدرآباد کے طلبا و طالبات کی کثیر تعداد کے علاوہ ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور اردو کے استادوں نے اس تقریب تہنیت میں شرکت کی اور اسے کامیاب بنایا۔ نیر صاحب نے تقریر کی اور نظمیں بھی سنائیں۔ اس موقع کے لئے لکھی گئی نظم "پہنیوں" کی نذر کی جاتی ہے۔ (و، خ)

روشعر کے چندا ماما!
بھون" کے سارے بچے
سے مل کر
کو سن کر
لگتا ہے ایسے خوش ہیں
نیل گگن سے چندا
بھون" کے باغیچے میں
کے سنگ کھیل رہا ہو
ردو میں بول رہا ہو
کے نغمے گھول رہا ہو

اُردو شعر کے چندا ماما!
سب کے پیارے نیر صاحب
بچوں کی پھلواری میں تم
کتنے من موہن لگتے ہو
تم سے مل کر، تم کو سن کر
یوں لگتا ہے!
جیسے چندا نیل گگن سے
"بال بھون" کے باغیچے میں
بچوں کے سنگ کھیل رہا ہو

*

مولانا مقبول احمد

سفرنامہ ابن بطوطہ



مجھے قاضی بنایا گیا

پھر ہبتہ اللہ فلکی کو بلایا اور اسے رسول دار کرنا مقرر کیا۔ چوبیس ہزار سالانہ تنخواہ، چوبیس ہزار کی جا چوبیس ہزار نقد دے دیا گیا۔ بہار الملک کا خطاب ملا۔ بادشاہ محل کی چھت پر تکیہ لگائے بیٹھا تھا۔ خواجہ سامنے تھا اور ملک قبولہ کھڑا تھا۔

میں نے سلام کیا تو ملک قبولہ نے کہا تعظیم کر، نے تجھے دارالسلطنت کا قاضی مقرر کر دیا ہے۔ بارہ ہ بارہ ہزار کی جاگیر۔ ایک گھوڑا مع زین ولگام اور ایک تیرے لیے تجویز فرمایا ہے۔ محرابی خلعت پر محراب کی نق ہے۔ میں تعظیم بجا لایا۔ اور ملک کبیر میرا ہاتھ پکڑ کر سامنے لے گیا۔ بادشاہ نے کہا: دہلی کی قضا کا عہدہ ہے ہم اسے بڑا عہدہ سمجھتے ہیں۔ میں نے کہا: مگر امام مالک کا مسلک رکھتا ہوں اور دلی والے حنفی ہیں نے جواب دیا: میں نے بہار الدین ملتانی اور کمال الدین کو تیرا نائب مقرر کر دیا ہے۔ یہ دونوں تجھ سے مشورہ اور کوئی کاغذ بغیر تیری مہر کے مکمل نہ سمجھا جائے گا۔

"میں تجھے اپنے بیٹے کی مانند سمجھتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "میں تو غلام اور خادم ہوں۔" بادشاہ نے عربی میں کہا۔ "انت سیدنا و مخدومنا" (تم میرے سردار اور مخدوم ہو۔) پھر شرف الملک سے کہا۔ "یہ خرچیلا آدمی ہے، تنخواہ کافی نہ ہوگی۔ اگر یہ فقیروں کی خیر گیری کرسکے تو ایک خانقاہ بھی اس کے سپرد کردینی چاہیے۔"

رات زیادہ گذر چکی تھی اور نوبت بج رہی تھی۔ شہر کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ وزیر کے ساتھ ہم محل سے باہر آئے اور سیّد ابوالحسن عبادی کے مکان پر سو گئے۔

جس وقت بادشاہ خانقاہ سپرد کردینے کے بارے میں کہہ رہا تھا۔ یہ لطیفہ لکھنا میں بھول گیا کہ بادشاہ نے شرف الملک سے کہا کہ مجھے عربی زبان میں سمجھائے۔ اور میرا عندیہ معلوم کرے۔ شرف الملک چپ ہوگیا تو بادشاہ سمجھا کہ شرف الملک عربی بولنے میں کچا ہے اور فارسی میں کہا۔

بروید جا بخسپی و آں حکایت بروبگوئی
وتفہیم کنی تا فردا انشاء اللہ پیش من بیائی
وجواب او بگوئی۔"

رات کو ایک جگہ سو جاؤ اور اسے سمجھا کر کل مجھے رپورٹ دو۔ سیّد ابوالحسن عبادی جن کے مکان پر ہم رات کو سوئے بادشاہ کے روپے سے تجارت کرتا ہے۔ اس کا خصوصی تجارتی پیشہ یہ ہے کہ بادشاہ کے لیے عراق و خراسان سے سامان جنگ لاتا ہے۔

دوسرے دن ہم سب کو بلایا گیا۔ نقدی، گھوڑے اور خلعت لائے گئے۔ ہم سب نے خلعت کندھے پر رکھے۔ اور اسی طرح بادشاہ کے حضور میں پہنچ کر، تعظیم بجا لائے۔ تعظیم کا یہ طریقہ ہے کہ گھوڑے کے سموں پر کپڑا ڈال دیتے ہیں اور کپڑے کو بوسہ دیتے ہیں۔

بادشاہ نے میرے ہمراہیوں کو دو ہزار اشرفیاں اور دس خلعت دیئے۔ قاضی ہونے کے بہت دن بعد کا ذکر ہے کہ میں دیوان خانہ میں بیٹھا تھا۔

ناصرالدین ترمذی میرے پاس بیٹھے تھے۔ اتنے میں ناصرالدین کی طلبی ہوئی۔ اور بادشاہ نے انھیں ایک کلام مجید جس پر موتی جڑے ہوئے تھے اور ایک خلعت دیا۔ ناصرالدین نے مجھ سے کہا: کچھ دلواؤ تو خط خورد لاکر دوں۔ تمہارے لیے بارہ ہزار کے انعام کا حکم ہوا ہے۔ میں سمجھا ہنسی کر رہا ہے اور اس ترکیب سے کچھ وصول کرنا چاہتا ہے۔ مگر میرے ایک دوست نے دو اشرفیاں دینے کا وعدہ کرلیا۔ اور وہ خط خورد لے کر آگیا۔

خط خورد

خطِ خورد ایک چِٹھی کا نام ہے جس پر لکھا ہوتا ہے کہ خداوند عالم کا یہ حکم ہے کہ فلاں صاحب کی شناخت پر اتنا روپیہ خزانہ سے دے دیا جائے۔

چِٹھی پر پہلے صاحب کی شناخت کے دستخط ہوتے ہیں۔ پھر خان اعظم معظم خریطہ دار کے جس کے پاس بادشاہ

کا قلم دان ہے۔ اور امیر محبہ کے ان سب دستخطوں کے بعد دیوان وزارت کے پاس لے جاتے ہیں متصدی نقل کرتے ہیں پھر دیوان اشرف میں نقل ہوتی ہے، اور دیوان النظر میں پروانہ تیار ہوتا ہے۔ پھر وزیر خزانچی کو حکم دیتا ہے کہ روپیہ دیا جائے۔ خزانچی رجسٹر میں لکھ لیتا ہے۔ اور ہر روز کے پروانوں کا چٹھا بادشاہ کے حضور میں پیش کرتا ہے جنھیں فوراً دینے کا حکم ہوتا ہے۔ اسی وقت دے دیا جاتا ہے اور جس پر لکھ دیا جاتا ہے۔ "دیر کی جا سکتی ہے" اسے دیر میں ملتا ہے، مگر ملتا ضرور ہے۔

دیر والوں کو کہیں مہینوں میں ملتا ہے۔ جس قدر انعام ملتا ہے، دسواں حصہ کاٹ لیا جاتا ہے۔

جب مجھ پر قرضہ زیادہ ہو گیا تو میں نے ایک قصیدہ لکھا۔ اور بادشاہ کے حضور میں پیش کیا۔

بادشاہ نے میرا قصیدہ زانو پر رکھ لیا، اور دوسرا کنارہ میرے ہاتھ میں رہا۔ میں قصیدہ کے شعر پڑھتا جاتا تھا اور قاضی کمال الدین فارسی میں سمجھاتا جاتا تھا۔ ساتواں شعر پڑھا تو بادشاہ نے کہا "مرحمت" حاجب مجھے میری جگہ لے گیا کہ میں تعظیم کروں، مگر بادشاہ نے کہا "چھوڑ دو اور قصیدہ پورا کرنے دو۔" آخر قصیدہ پورا پڑھ کر تعظیم بجا لایا۔ لوگوں نے مبارک باد دی۔ مگر مجھے مدت تک کچھ پتہ نہ لگا۔ آخر پھر ایک عرض داشت لکھی جسے قطب ملک حاکم سندھ نے پیش کیا۔ بادشاہ نے کہا خواجہ جہاں سے کہو قرضہ ادا کر دے۔ خواجہ جہاں نے اچھا تو کہہ دیا مگر نتیجہ کچھ نہ۔

عجیب دستور

دستور یہ ہے کہ اگر کسی بڑے آدمی پر قرض ہو اور وہ ادا نہ کر سکے تو قرض خواہ شاہی دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور جوں ہی مقروض شاہی محل جانا چاہتا ہے بادشاہ کے سر کی قسم دے کر کہتے جب تک قرضہ ادا نہ کر دے محل میں نہ جائے، بادشاہ کی دہائی دیتے ہیں۔

ایک دن جب کہ بادشاہ اپنے باپ کی [قبر پر] گیا تھا۔ اور محل میں ٹھہر گیا تھا تو میں نے اپنے قرض [خواہوں] کو سمجھا دیا کہ یہ موقع اچھا ہے۔

جوں ہی میں محل میں جانے لگا، قرض خو[اہ] دہائی دینے لگے۔ متصدیوں نے فوراً بادشاہ کو [خبر دی]۔ شمس الدین فقیہ باہر نکلا اور ان لوگوں سے پوچھا تمہارا قرضہ کتنا ہے؟ اور جب انھوں نے بتایا تو فقیہ نے بادشاہ سے عرض کر دیا۔ اور پھر آکر کہا بادشاہ کا فرمان ہے کہ اس کا قرضہ ہم چکا دیں۔ اسے روکو نہیں۔ پھر عماد الدین سمنانی اور غیاث الد[ین] کو حکم دیا کہ قصر ہزار ستون میں بیٹھ کر دستاویزات معائنہ کریں۔ جب انھوں نے رپورٹ دی کہ دستاو[یزات] درست ہیں تو بادشاہ ہنس کر بولا "آخر تو قاضی [ہے، دل میں] کسر کیوں رکھتا؟" اور حکم دیا کہ قرضہ خزانہ سے [ادا] کر دیا جائے۔

خداوندزادہ نے خط جلد جلد لکھنے میں دیر کی اور
رشوت مانگنے لگا۔ میں نے بادشاہ تک شکایت پہنچادی۔
اور خداوندزادہ کو قید کر دیا گیا اور اس دفعہ قرضہ
کی ادائیگی میں پھر دیر ہو گئی۔

شکار

ایک دفعہ بادشاہ دارالخلافہ سے باہر شکار
کو گیا تو میں بھی ساتھ میں گیا۔ اور سفر کے لیے ایک
خیمہ خرید لیا۔ یہاں خیمہ ہر ایک رکھ سکتا ہے خصوصاً
امیروں کے لیے خیمہ رکھنا ضروری ہے۔ بادشاہ کا
خیمہ سرخ ہوتا ہے، اور امیروں کے خیمے سفید ہوتے
ہیں جن پر دھاریاں بنی ہوتی ہیں۔

خیمہ کا سائبان بھی ہوتا ہے۔ جسے سایہ کے
لیے بانسوں پر تان لیا جاتا ہے بانس اٹھانے والے
جنھیں کیوانی کہتے ہیں اور گھسیارے میرے ساتھ تھے۔
جنھیں روز کی مزدوری پر میں نے رکھ لیا تھا۔ باورچی
خانے کے برتن اٹھانے کا کام کہار کرتے ہیں۔ ڈولہ
اٹھانے والے ڈولہ اٹھاتے ہیں، فرش بچھاتے ہیں۔
اور اسباب اونٹوں پر لادتے ہیں وہ آمرودی آگے آگے
دوڑتے ہیں اور رات کو مشعلیں لے کر چلتے ہیں۔

جس دن بادشاہ کی سواری نکلی میں بھی شہر
سے باہر نکل آیا۔

شام کو بادشاہ یہ دیکھنے کے لیے آیا کہ کون
آیا ہے اور کون اب تک نہیں آیا۔ اس وقت بادشاہ
خیمہ سے باہر بیٹھا تھا۔ میں نے سلام کیا اور دائیں طرف
اپنی جگہ کھڑا ہو گیا۔ ملک قبولہ نے مجھ سے کہا بیٹھ جاؤ۔
بادشاہ کی اجازت ہے۔ اتنے میں ہاتھی آگیا اور بادشاہ
سیڑھی لگا کر ہاتھی پر چڑھ گیا۔ بادشاہ کے سوار ہوتے
ہی ہر ایک امیر ماہی مراتب کے ساتھ سوار ہو گیا۔

ماہی مراتب

ماہی مراتب میں فوج، جھنڈے، طبل و نفیری،
قرنا ہوتے ہیں۔ بادشاہ کے آگے حاجب طوائفیں اور
طبلچی چلتے ہیں، جن کے گلے میں طبلے لٹکے ہوتے ہیں۔
پندرہ آدمی دائیں پندرہ آدمی بائیں ہوتے ہیں۔ جن میں
وزیر بڑے بڑے امیر اور پردیسی شرفاء ہوتے ہیں۔
سب کے آگے پیادے اور راستہ بتانے
والے پیچھے پیچھے دورنگ دین، جھنڈیاں۔ پھر اونٹوں پر
طبل بجتے ہوتے، پھر شاہی غلام اور خادم۔ پھر امیر پھر
عام لوگ۔

پڑاؤ اکثر ایسی جگہ ہوتا ہے جہاں نہر ہو اور
درختوں کا سایہ ہو۔ سب سے پہلے بادشاہ کا خیمہ نصب
ہوتا ہے۔ پھر ناظر آکر ہر ایک کو جگہ بتادیتا ہے، اور
خیمے لگ جاتے ہیں۔

شاہی خیمہ سب سے بیچ میں رہتا ہے۔ مچھلی
کا گوشت۔ عمدہ اور تیار مرغیاں پہلے سے آجاتی ہیں۔

(باقی آئندہ پڑھیے)

بچوں کے لیے دلچسپ معلوماتی کتابیں

انوکھی مشین	دیبداس گپتا	1/25	سنتوش چاند	اطہر پرویز
ایٹم کیا ہے	چارلٹن میکر	-/75	سمندر	وسنت تیل کنڈلکر
انمول رتن	اطہر پرویز	1/50	بجو می آپا	اطہر پرویز
ایک اچھوت کی کہانی	سوامی دھامنے	-/90	سنہا تیرتھ	راجندر راؤ کمی ترشنہ
اکبر اور بیربل کے لطیفے	اطہر پرویز	-/40	نہرو امر ہیں	فصاحت حسین خاں
بچوں کے حالی	" "	-/75	جولی دامن چراغ	اطہر پرویز
بچوں کے اقبال	" "	-/50	ہماری کھیتی باڑی	سیما
باپو کے قدموں میں	منو بہن گاندھی	1/-	ہماری آباد دنیا	فصاحت حسین
بھارت دیس ہمارا دیس	جاوید اقبال	1/25	ہندوستان ترقی کی شاہراہ پر	ادھیر موہن سیناپتی
پنچ تنتر کی کہانیاں (اول)	شکنتلا دیوی	-/75	ہمارے بن ہماری دولت	رام چندر تیواری
" (دوم)	"	-/45	ہمارا ذہن	ودیا اندرپا
بدن کی کہانی	اطہر پرویز	1/25	ہماری سائنس	وزارت حسین
تیس مار خاں	شاہد علی خاں	-/75	اچھا شہری	پبلیکیشنز ڈویژن
توانائی کا راز	اطہر پرویز	1/25	ہمارا ہندوستان	اطہر پرویز
چار درویش	بیدناتھ جھنڈے	1/25	اپنے گھر کو آگ سے بچائیں	پبلیکیشنز ڈویژن
خلا کا سفر	اطہر پرویز	1/25	بھارت کی لوک کہانیاں	"
روشنی کے مینار	سیے جھکو	-/75	پنڈت نہرو سے بات چیت	ٹیپر منڈی
سائنس کے کرشمے	وزارت حسین	2/-	خوش حالی کے لیے منصوبہ بندی	پبلیکیشنز ڈویژن
سائنس کی دنیا	"	2/44	رنگا کے گیت	مترجم شمیم کرہانی
ستاروں کی دنیا بہت دور تک ہے	اطہر پرویز	2/-	سائنس کے چند پہلو	سی وی رامن
سورج کا گھرانا	اے وی ایس راما راؤ	-/75	دودیکا ستار	پبلیکیشنز ڈویژن
سائنس کے راستے پر	سیما	-/40	ہمارا جھنڈا	"
شہر اور گاؤں	ترویشنو شرما	-/75	ہندوستان کی تاریخ	"
شراب	اطہر پرویز	-/56	ہندوستان کی نامور ہستیاں (اول)	"
کاغذ کی کہانی	محمد آفاق	1/-	ہندوستان کی " (دوم)	"

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال بمبئی ۳

ـاب سیف سہسرامی

گڈّو میاں



ب تھے گڈو ایک تھی گڈی — دونوں میں جب ہوئی لڑائی
ڈو نے گڈی کو پیٹا — گڈی چیخی اور چلائی
ڈی کی جب چیخ سنی تو — عرشی دوڑی دوڑی آئی
شی اور گڈی نے مل کر — گڈو کی، کی خوب پٹائی
ٹ کر گڈو گھر میں بھاگے — اور امی سے خوب لگائی
شی اور گڈی نے مل کر — کی ہے میری آج پٹائی
! میرا توڑ دیا ہے — چھین لی میری ساری مٹھائی
ا نے عرشی کو ڈانٹا — گڈی کو بھی آنکھ دکھائی
رگڈو کو پاس بلا کر — چمکارا اور بات بنائی

بولیں بیٹے تم اچھے ہو
کیوں آپس میں کرو لڑائی



دعوت ملّا جی کی؟

یا اُن کے چُغے کی؟



اب سے بہت دنوں پہلے کی بات ہے۔ ترکی کے ایک گاؤں میں ایک صاحب رہتے تھے۔ ملّا نصرالدّین، مسجد میں امامت کرتے تھے۔ اور گاؤں کے بچّوں کو پڑھاتے تھے۔ غریب تھے، پر گاؤں کے لوگ ان کی عزّت کرتے تھے۔

یوں بھی بہت چونچال تھے۔ زندہ دل، منسوڑ تھے۔ خوب ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔ ایسے مزے مزے کے لطیفے سناتے تھے کہ لوگ مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔

ان کے پاس ایک انگور کا چھوٹا سا کھیت بھی تھا۔ مسجد کی امامت اور بچّوں کو پڑھانے کے بعد وقت بچتا تو، اپنے اس چھوٹے سے کھیت میں خوب لگن سے کام کرتے

ایک دن شام کو ملّا نصرالدّین گدھے پر سوار ٹخ ٹخ کرتے گھر کی طرف آ رہے تھے۔ دن بھر کھیت میں کام کیا تھا۔ تھکے ہوئے تھے پھر بھی خوش و خرّم

راستے میں ایک پڑوسی سے مڈبھیڑ ہوئی۔ خوب ستھرے کپڑے پہنے لپکتا چھپکتا ایک طرف کو جا۔ ملّا نے اسے دیکھتے ہی سلام داغا۔ "السلام علیکم! ا ایسے بھڑک دار کپڑے پہنے۔ بنے ٹھنے کہاں جا ر کہیں شادی بیاہ ہے کیا؟"

پڑوسی ایک ذرا کے ذرا ٹھٹکا۔ اور کہا "ارے ملّا جی شاید آپ بھول گئے! آج خلیل سو یہاں دعوت ہے نا! آپ کو بھی تو بلایا ہے۔ د سورج کتنا ڈھل چکا ہے۔ مجھے بھی دیر ہو گئی۔ لیے تیز تیز قدم اٹھا رہا ہوں!"

"خدا معاف کرے، میں سچ مچ بھول گیا اچھا تو چلو اب زیادہ دیر نہ ہونی چاہیئے۔ میں بھی



طرف چلتا ہوں دونوں ساتھ ساتھ چلیں۔ ملاجی نے گدھے کا رخ دوسری طرف پھیر دیا اور اپنے انہیں پھٹے پرانے کسانی کپڑوں میں ٹخ ٹخ کرتے پڑوسی کے ساتھ ہو لیے اور خلیل سوداگر کے گھر پہنچ گئے۔

دونوں خوشی خوشی سوداگر کے گھر میں داخل ہوئے۔ اور مہمانوں کے ساتھ گھل مل گئے۔ ملاجی مسکرا مسکرا کے مزے مزے کی باتیں کرنے لگے۔ پر بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے کوئی بھی ملاجی کو منہ نہیں لگا رہا ہے۔ جیسے کوئی بھی ان کی بات دھیان سے نہیں سن رہا ہے۔ اور تو اور خود میزبان نے بھی ملاجی کو گھانس نہ ڈالی، ان کی طرف ذرا دھیان نہ دیا۔ دسترخوان پر کھانا چن دیا گیا خلیل سوداگر نے سب مہمانوں کو عزت کے ساتھ دسترخوان پر بٹھا دیا۔ ملاجی کی بات تک نہ پوچھی۔ اب ملاجی بڑے حیران پریشان۔ پر وہ بد دل نہیں ہوتے۔ دیوار کے سہارے کھڑے یہ شاندار تماشا دیکھتے رہے۔ اور جب خلیل سوداگر سامنے آیا تو ملاجی نے آگے بڑھ کر کہا۔" خلیل صاحب آج کی رات تو آپ نے بہت شاندار دعوت کی ہے۔ خدا آپ کو اس مہمان نوازی کی جزا دے۔" مگر میزبان پر اس تعریف کا جو ذرا بھی اثر ہوا ہو۔ اس نے جیسے یہ بات سنی ان سنی کر دی۔ اور اپنا دھیان انہی مہمانوں کی طرف رکھا جو خوب صاف ستھرے کپڑے پہنے دعوت میں شریک تھے۔

اب تو [illegible] بے چارے ملاجی کا دل بیٹھ گیا۔ چہرہ اتر گیا۔ ساری مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اچانک ان کا دھیان اپنے میلے کچیلے چوغے کی طرف گیا۔ اس میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ پاجامے کا حال اس سے بدتر تھا۔ جوتوں پر خاک اٹی ہوئی تھی۔ ان کے تلووں پر کھیت کی مٹی جمی ہوئی تھی۔ گندے سندے ہاتھ تھے۔ اور بھی پھر تو ملاجی چپکے سے وہاں سے کھسک آئے۔ باہر آکر گدھے کی رسی کھول اور اس پر سوار ہو! ٹخ ٹخ کرتے سیدھے اپنے گھر کو سدھارے۔

ادھر ملاجی کی بیوی بہت بے چینی سے ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہیں دعوت کی بات یاد تھی۔ انھوں نے ملاجی کے بہترین کپڑے نکال رکھے تھے۔ یہ کپڑے وہ کبھی کبھار شاید عید بقرعید کو پہنتے ہوں پھر گرم پانی، صابن، تولیا غرض سب کچھ تیار تھا۔ جوں جوں شام کا دھندلکا بڑھ رہا تھا۔ بیوی کی پریشانی بڑھ رہی تھی نہ جانے کیا بات ہو گئی کہ اب تک نہیں لوٹے۔!

اور اب جو اچانک ملاجی گھر میں گھسے، تو بیوی کی جان میں جان آئی۔ دیر سے سہی آ تو گئے۔ اور ملاجی کی صورت پر بھی ہمیشہ کی طرح مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ہمیشہ کی طرح خوش و خرم تھے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔

غرض سب سامان تیار تھا۔ ملاجی نے اچھی طرح سے منہ دھویا، ہاتھ [illegible]

کیے ۔ داڑھی اور سر میں اتنا کنگھا کیا ۔ اتنا کنگھا کیا کہ بال چمکنے لگے ۔

اور پھر ملّا جی نے اپنا بہترین کوٹ یا چوغہ زیب تن کیا۔ بہترین پگڑی باندھی، بہترین جوتہ پیروں میں ڈالا ۔ ان کی بیوی بھی لباس پہنانے میں ان کی مدد کر رہی تھیں ۔ بیچ بیچ میں تعریف بھی کرتی جاتی تھیں ۔ ملّا جی اب سچ مچ بالکل بدل گئے تھے ۔ بہت شان دار لگ رہے تھے ۔ انھیں خود بھی اس کا احساس تھا ۔ کپڑے پہن کر اکڑتے ہوئے گھر سے نکلے اور پیدل ہی خلیل سوداگر کے گھر کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ ایسا شاہانہ انداز تھا کہ راستے میں جو بھی دیکھتا۔ بس دیکھتا رہ جاتا ۔

خلیل سوداگر کے گھر پہنچ کر ملا نصرالدین نے دروازہ کھٹکھٹایا اور باہر کھڑے انتظار کرتے رہے ۔ تھوڑی دیر میں دربان نے دروازہ کھولا ۔ انھیں دیکھتے ہی جھک کر سلام کیا۔ بہت عزت کے ساتھ دعوت والے کمرے میں لے گیا۔ خلیل سوداگر انھیں دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا ۔ ۔ اور دستر خوان پر عزت کی جگہ بٹھا دیا ۔

اب ملّا جی دوسرے مہمانوں سے مسکرا مسکرا کر باتیں کر رہے تھے ۔ اور مہمان بھی مسکرا مسکرا کر جواب دے رہے تھے۔ خلیل سوداگر نے ان کے لیے خاص طور سے تازہ تازہ کھانا منگوایا۔ ان کے سامنے رکھا۔ بہت شائستہ انداز میں انتظار کرنے لگا۔ ادھر جوں جوں شام کی فضا میں خوش گواری بڑھتی جا رہی تھی ۔ زندہ دلی بھی بڑھتی جا رہی تھی ۔ خوب چہک ر آس پاس کے سبھی لوگ ان کی طرف متوجہ تھے کی باتوں کے مزے لے رہے تھے ۔



آخر جب ملّا جی نے دیکھا کہ سب لوگ متوجہ ہیں تو انھوں نے اپنی پلیٹ میں سے ایک اٹھایا اور بجائے منہ میں لے جانے کے اپنے چ کی جیب میں ڈال دیا ۔ "ارے بھئی چغے صاحب آپ کا کھانا" اب لوگ اچنبھے میں کہ اچانک کو یہ کیا ہو گیا۔ مگر ملّا جی اپنی دھن میں مس اپنے چغے کو برابر کھانا کھلا رہے تھے ۔ "ہاں تو کھاؤ گے پلاؤ نا، پلاؤ" اور ملّا جی نے پلاؤ ہوا چمچہ چغے کی دوسری جیب میں ٹھونس دیا۔ بھئی اور کیا کھاؤ گے ؟ کباب؟ اچار؟ انجیر ملّا جی پوچھتے جاتے اور ایک ایک چیز جلد ر ...

جاتے۔ اپنے اس مذاق سے آپ ہی آپ لطف لے رہے تھے۔ اور لوگوں کی حیرانی پر دل ہی دل میں ہنس رہے تھے۔

خلیل سوداگر کو بڑی پریشانی ہوئی۔ ملا نصر الدین سے پرانی دوستی تھی۔ انھوں نے جی میں کہا کہ کہیں ملا جی کے دماغ میں فتور تو نہیں آگیا ہے؟ آخر نہ رہا گیا تو بولے: "بھئی ملا جی! بتاؤ تو یہ ماجرا کیا ہے؟ بھلا کسی نے کسی سمجھدار آدمی کو، کوٹ کو بھی کھانا کھلاتے دیکھا ہے یا، سنا ہے؟"

ملا جی نے بہت ہی بھولے پن سے خلیل سوداگر کی طرف دیکھا۔ پھر بڑی سادگی سے بولے: "یہ تو آپ ہی ہیں جو چغے کو کھانا کھلانا چاہتے ہیں۔ ٹھیک ہے نا میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟ دیکھیے نا، پہلے میں آپ کے پاس آیا تھا۔ اپنے کسانی کپڑوں میں آیا تھا، اس وقت بات کرنا تو درکنار آپ نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ دستر خوان بچھ گیا تھا، مگر آپ نے پوچھا تک نہیں۔"

"اور اب میں اپنے بہترین کپڑے پہن کر آیا تو آپ نے ہاتھوں ہاتھ لیا، عزت کی جگہ بٹھایا۔ آپ کے نوکروں کے انداز بھی بالکل بدل گئے۔ آپ کے یہاں بھی مجھ سے باتیں کرنے کے لیے جھک پڑے تو اس سے میں کیا نتیجہ نکالوں؟ یہی نا کہ آپ دعوت میرے بہترین چوغے کی کرنا چاہتے ہیں۔ اس کی نہیں جو اس چغے کے اندر ہے"

(انگریزی سے)

جناب مولانا بدر الدین

شکار کی تقسیم
(ایک عربی لوک کہانی)

یہ بہت دنوں کی بات ہے ایک شیر ایک لومڑی اور ایک بھیڑیا تینوں شکار کی تلاش میں نکلے۔ تھوڑی دیر جنگل میں گھومنے پھرنے کے بعد انھوں نے ایک گدھے، ایک ہرن اور ایک خرگوش کا شکار کیا۔ شکار ہاتھ آنے کے بعد شیر نے بھیڑیئے سے کہا "لو بھئی یہ تینوں جانور ہم تینوں میں تقسیم کر دو۔"

بھیڑیئے نے کہا: جناب! گدھا تو آپ کے لیے مناسب ہے، اور خرگوش لومڑی کے لیے ٹھیک ہے۔ اور رہا ہرن یہ میں کھا لوں گا۔" شیر کو اس تقسیم پر بڑا غصہ آیا اور جھپٹ کر بھیڑیئے کی آنکھ نکال لی۔

لومڑی نے جو یہ حال دیکھا تو بولی۔ "ارے کمبخت بھیڑیے کس قدر ناسمجھی اور جہالت سے تو نے شکار تقسیم کیا۔" شیر نے لومڑی کی بات سنی تو بولا: "اچھا تو آگے آؤ دیکھیں تم کس طرح تقسیم کرتی ہو۔" لومڑی نے کہا:۔ "اجی سرکار! یہ بات تو بالکل کھلی کھلی ہے۔ گدھا تو آپ کے صبح کے ناشتے کے لیے مناسب ہے۔ اور ہرن رات کے کھانے کے لیے ٹھیک رہے گا۔ رہا خرگوش یہ تو آپ کے دانتوں کا خلال ہے چاہے جب دبا لیجیے گا۔" شیر اس تقسیم پر بہت خوش ہوا اور بولا "بھئی واہ کیا خوب شکار تقسیم کیا ہے ذرا یہ تو بتاؤ بی لومڑی کہ سوجھ بوجھ تم میں کہاں سے آئی؟"

لومڑی:۔ "سرکار یہ سوجھ بوجھ میں نے بھیڑیئے کی آنکھ سے حاصل کی ہے۔"

جناب ابراہیم عمادی ندوی

حضرت شیخ علی فقیہ

شہر بمبئی کئی حیثیتوں سے مشہور ہے۔ یہاں دولت کی ریل پیل ہے بمبئی شہر خوش نمائی، خوبصورتی اور صفائی میں اپنی مثال آپ ہے۔ بین الاقوامی حیثیت رکھتا ہے۔ اور ایک بڑی خصوصیت شہر کی یہ ہے کہ کئی مشہور بزرگوں نے یہاں کے لوگوں کو اخلاقی اور روحانی فیض پہنچایا ہے۔

عرب علاقے سے قریب ہونے کے سبب اسلام کی روشنی یہاں جلد پہنچی اور ہندوستان کا یہ ساحلی علاقہ اسلام کے نور سے جلد روشن ہو گیا۔ عربوں کی آمدورفت بڑھی، تجارت کو ترقی ہوئی تو اکثر عرب خاندان ان ساحلی علاقوں میں آکر آباد ہو گئے۔

عرب سیاحوں اور جغرافیہ دانوں نے تھمی اور بمبئی کے قریب تھانہ، سوپارہ اور کلیان کا ذکر اپنی کتابوں میں کیا ہے اور یہاں کے حالات لکھے ہیں۔

آج آپ حضرت شیخ علی فقیہ ابن شیخ احمد مخدوم مہایمی کا مختصر حال سنیے۔

مہایم یا ماہم بمبئی شہر کا ایک حصہ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ راجہ دیوگری کے خاندان کا راجہ بھیم دیو، اس مقام پر آیا اور اس جگہ کو محفوظ سمجھ کر یہاں مقیم ہو گیا۔ اس وقت دکن سلطان علاء الدین خلجی کے تھا۔ راجا بھیم دیو نے اس جگہ شاندار عمارتیں تعمیر کرائے۔ ان کے نشان آج بھی کہیں کہیں جاتے ہیں۔

مسلمانوں کی حکومت کے زمانے میں یہ سب سے پہلے ۱۲۹۸ء میں قطب الدین مبارک بادشاہ دہلی کے قبضے میں آئے۔ تبھی اس علا شروع ہوئی۔ ایک مدت کے بعد ۱۵۳۴ء میں سلطان گجرات کے قبضے میں تھا۔

حضرت شیخ علی فقیہ مخدوم مہایمی کے بصرہ (عراق) سے تشریف لائے۔ اس وقت عر اموی خلیفہ حکومت کرتے تھے۔ یہ قافلہ مہایم میں اس کے پانچ سو سال کے بعد حضرت شیخ علی فقیہ ماہم میں پیدا ہوئے۔

آپ بچپن ہی سے بہت نیک اور ماں فرماں بردار تھے۔ جھوٹ سے آپ کو سخت نفرت خراب لڑکوں کے ساتھ نہیں کھیلتے تھے۔ بہت جفاکش تھے۔ علم کا شوق بچپن ہی سے تھا۔

حضرت مخدوم کی فرماں برداری اور سعادت مندی کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔ آپ کی والدہ ماجدہ نے ایک رات پانی مانگا۔ آپ فوراً اٹھے گلاس دھوکر صاف پانی بھرا، ماں کے پاس آئے اور رہا تھذ میں گلاس لیے کھڑے ہوگئے۔

لیکن آپ کی والدہ ماجدہ کو نیند آگئی تھی۔ حضرت مخدوم پانی کا گلاس لیے رات بھر اسی طرح کھڑے رہے۔

کچھ بڑے ہوئے تو تعلیم حاصل کرنے کے لیے اپنے وطن سے نکلے۔ دور دور کا سفر کیا۔ بڑے بڑے عالموں سے علم حاصل کیا۔ اور فارغ ہونے کے بعد وطن واپس آئے۔ گجرات کے بادشاہ نے آپ کو قاضی کا عہدہ پیش کیا۔

دین کے علم سے آپ کو بڑا لگاؤ تھا۔ آپ نے قران پاک کی ایک تفسیر لکھی جس کا نام "تبصیر الرحمٰن" ہے۔ یہ تفسیر کئی جلدوں میں ہے۔ اس میں قرآن پاک کے معنی اور مطالب بہت اچھے اور انوکھے انداز میں بیان کیے ہیں۔ یہ تفسیر عربی میں ہے اور ملک مصر میں چھپی ہے۔

آپ علم دوست فقیر اور صوفی تھے۔ بہت نیک دل اور شریف تھے۔ سب سے محبت اور مروت سے پیش آتے تھے۔ دن رات مخلوق کی خدمت میں مصروف رہتے تھے۔ متقی، پرہیزگار اور خدمت گزار ہونے کے سبب لوگوں کو آپ سے بہت محبت اور عقیدت ہوگئی تھی۔

حضرت مخدوم مہائمی نے ۸۳۵ھ / ۱۴۳۱ء میں انتقال فرمایا، اور اسی جگہ آپ دفن کیے گئے۔ اسی سال مزار کی تعمیر ہوئی۔ اور ایک خوبصورت مسجد بھی بنائی گئی۔

آپ کا مزار ساحل سے ایک سو پچاس گز کے فاصلے پر ہے۔ قدیم اسلامی طرز تعمیر کی نہایت خوش نما عمارت ہے۔ ۱۹۱۱ء میں اس کی توسیع ہوئی۔ یہ جگہ بھی ناکافی ثابت ہوئی تو ۱۹۳۸ء میں مرمت اور مزید توسیع کی گئی۔

آپ کا عرس ۱۳ شوال سے شروع ہوتا ہے۔ اور آٹھ دن تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ ایک بڑا میلہ بھی لگتا ہے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں سے زائرین آتے ہیں۔ قوالیاں ہوتی ہیں۔

صندل دھوم دھام سے چڑھایا جاتا ہے۔ بمبئی شہر کی پولیس کی طرف سے بھی صندل چڑھتا ہے۔ اور نواب جنجیرہ بھی صندل چڑھاتے ہیں۔ دس روز تک یہ رونق رہتی ہے۔

حضرت مخدوم کی درگاہ کا انتظام ایک ٹرسٹ کے سپرد ہے۔ فاتحہ فتوح کے بعد بچی ہوئی آمدنی سے عام مسلمانوں کی مدد کی جاتی ہے۔ اور طالب علموں کو وظیفے دیے جاتے ہیں۔

* * * * * * * * *

اگر آپ کو اردو سے محبت ہے تو!
اردو بولیے اردو لکھیے اردو پڑھیے

جناب رفیق شاستری

پنچ تنتر کی کہانیاں



دوسرا اور چار ہاتھ پاؤں کا آدمی

ایک جُلاہا تھا۔ دن بھر کپڑے بنتا اور شام کو
انھیں بازار میں بیچ آتا۔ ایک دن کام کرتے کرتے اس کا
کرگھا ٹوٹ گیا۔ بہت محنت کی پر ٹھیک نہ ہوا۔ اس نے
سوچا اب نیا کرگھا بنانا چاہیے۔ نیا کرگھا بنانے کے لیے
وہ جنگل میں کسی بڑے اور خوب موٹے پیڑ کی تلاش میں
چلا۔ جنگل میں کچھ دور جاکر اسے اپنے مطلب کا ایک پیڑ مل
گیا۔ اس پیڑ کو کاٹنے کے لیے جیسے ہی اس نے اپنی
کلہاڑی ماری۔ اچانک کسی نے اسے ٹوک دیا۔ جلاہے
نے چاروں طرف نظر دوڑائی مگر کوئی نظر نہ آیا۔ اس بات
کو وہم سمجھ کر اس نے دوبارہ پیڑ پر کلہاڑی ماری۔۔
اب کی بار پھر کسی نے ٹوک دیا۔ یہ پہلے سے زیادہ زوردار
آواز تھی۔ جولاہے نے پیڑ کے اوپر نظر دوڑائی۔ کیا
دیکھتا ہے کہ ایک عجیب الخلقت انسان اس کے اوپر
بیٹھا آرام کر رہا ہے۔ خوب لمبا تڑنگا۔ سر پر بڑے بڑے
سینگ۔ جلاہے میاں پہلے تو ڈر گئے پھر انھوں نے
سوچا:۔ اس جنگل بیابان میں ڈرنے سے کوئی فائدہ
نہیں ہوگا۔ انھوں نے ہمت سے کام لے کر اس آدمی
سے پوچھا۔

"کون ہو بھائی۔ یہاں کیوں بیٹھے ہو؟"

وہ عجیب الخلقت آدمی بولا: "میں اس جنگل کا دیو
ہوں۔ یہ پیڑ میرا ٹھکانا ہے۔ تم اپنے لیے کوئی اور پیڑ
چن لو۔ مجھے آرام سے پڑا رہنے دو۔"

جلاہے میاں نے ذرا بہادری دکھاتے ہوئے
کہا: "مگر میرے کام کا تو اس جنگل میں بس یہی ایک

یڑ ہے۔ جس پر تم قبضہ جمائے بیٹھے ہو۔ تم کسی اور پیڑ
۔ اپنا ٹھکانا بنالو میں تو اسی کو کاٹوں گا" اور اتنا کہہ کر
نھوں نے پیڑ پر ایک کلہاڑی اور جما دی۔

دیو نے دیکھا کہ یہ آدمی تو غیر معمولی طریقے پر
بہادری دکھا رہا ہے۔ نہ مجھ سے ڈر رہا ہے۔ نہ میری،
پرواہ کر رہا ہے۔ جلاہے کی اس بہادری پر دیو کافی
خوش ہوا۔ اس نے کہا: "بھائی تم جو مانگو دیا جائے
، مگر اس پیڑ کو کاٹنے کا خیال چھوڑ دو۔"

جلاہے نے کہا: "جو بھی چیز ہم مانگیں گے،
ہمیں دو گے"؟

دیو نے کہا: "ہاں، کوئی بھی چیز جو تم مانگو
تمھیں دی جائے گی۔"

جلاہے میاں دیو کی بات سن کر اُدھیڑ بُن میں
لئے۔ سوچنے لگے کہ کون سی ایک چیز مانگوں کہ بیڑا
ہو جائے۔ کبھی سوچنے لگے کہ نیا کرگھا مانگ لوں تو
، سوچتے کہ کیوں نہ دھن دولت مانگ لوں، کبھی
تے کہ دیو سے کسی ملک کی حکومت ہی کیوں نہ مانگ
اتے۔ غرض کچھ دیر اسی طرح سوچنے کے بعد ان
ماغ میں ایک بات آئی، گاؤں جا کر اپنے دوست
ور اپنی گھر والی سے بھی مشورہ کر لیا جائے۔ جو
کی رائے ہو وہی مانگا جائے۔

جلاہے میاں نے دیو سے تھوڑی مہلت مانگ
اپنے گاؤں کی طرف [illegible]

سے ہو گئی۔ جلاہے میاں نے سوچا کہ حجام کا آنا جانا
ہر گھر میں ہے۔ ہر طرح کے آدمی سے اس کی بات چیت
ہوتی ہے۔ اس سے یقیناً کوئی اچھا مشورہ مل جائے گا۔
اور انھوں نے حجام سے ساری باتیں بتادیں۔

حجام نے تمام باتیں سن کر کہا: "اگر ایک ہی
چیز مانگنی ہے تو کوئی سلطنت مانگ لو۔ ٹھاٹھ رہیں
گے۔ تم راجا ہوگے تو مجھے وزیر ضرور بنالوگے۔"

جلاہے میاں کو یہ بات اچھی لگی۔ مگر انھوں نے اسی
کے ساتھ حجام سے کہا "بات تو تم نے بڑے پتے
کی بتائی ہے مگر ذرا گھر جا کر بیوی سے بھی تو مشورہ
کر لوں"۔ حجام نے بیوی سے مشورہ کرنے کی سخت
مخالفت کی اور کہا: "یہ عورتیں عقل کی پوری ہوتی ہیں۔
دور اندیشی تو انھیں چھو کر بھی نہیں گئی۔ تم اس سلسلے میں
اپنی بیوی سے ہرگز مشورہ نہ کرو۔ اور میری مانو تو
سیدھے دیو کے پاس جا کر کوئی سلطنت مانگ لو"۔
مگر جلاہے میاں کب یہ ماننے والے تھے۔ اور وہ
بیوی سے مشورہ کرنے گھر کی طرف بڑھ گئے۔

جلاہے کی بیوی نے ساری باتیں سننے کے
بعد حجام کے مشورے کی سختی سے مخالفت کی اور کہا: "راجہ
کی زندگی کوئی زندگی ہوتی ہے۔ رات دن حکومت
کی فکر میں گھلنا۔ سیکڑوں لڑائی جھگڑے الگ، مہینوں
بال بچوں کی شکل دیکھنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔"
[illegible]

جلاہے کی بیوی نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا کہ تم دو ہاتھ پاؤں سے جتنا کپڑا بنتے ہو، وہ ہم لوگوں کی گذر بسر کے لیے کافی رہتا ہے۔ مگر کیوں نہ دیو سے دو ہاتھ اور ایک سر فاضل مانگ لو، پھر تو تم دگنا کپڑا بن سکو گے اور سارے بال بچے سکھ سے زندگی بسر کر سکیں گے۔" جلاہے کی بیوی نے جاتے جاتے تاکید کردی کہ دیو سے اور کچھ نہیں بس اپنے لیے چار ہاتھ پاؤں اور دو سر مانگ لینا۔

جلاہے میاں جنگل میں دیو کے پاس پہنچے اور اس سے چار ہاتھ پاؤں اور دو سر کی مراد مانگ لی۔ جلاہے میاں ابھی اپنی مراد پوری کہہ بھی نہ پائے تھے کہ ان کی گردن کے اوپر ایک سر اور جڑ گیا۔ اور دو دو ہاتھ پاؤں فاضل نکل آئے۔

اب یہ چار ہاتھ پاؤں والا آدمی جب جنگل سے گاؤں کی طرف آیا تو لوگ اس سے بہت ڈرے اور سمجھے کہ یہ کوئی شیطان ہے۔ گاؤں والوں نے مل کر ان پر خوب پتھراؤ کیا۔ اتنے پتھر مارے، اتنے پتھر مارے کہ جولاہے میاں ٹیں بول گئے۔

~~~~~~~~

یہ کہانی سنانے کے بعد چکر والے نوجوان نے کہا کہ اکثر لوگ امیدوں کے سہارے بڑے بڑے محل تعمیر کرتے ہیں اور بعد میں خود ہی شرمندگی اٹھاتے ہیں جیسا کہ سوم شرما کے باپ کو اٹھانی پڑی تھی۔ ہونے والے

منیر سہسرامی

برسات



برسات کا موسم آیا ہے
رم جھم کے ترانے لایا ہے
گھنگھور گھٹا یہ ٹھنڈی ہوا
اور جی کو بھاتی پی کی صدا
دھرتی پہ مخمل سا ہے بچھا
آکاش پہ ہے متوالی گھٹا
چڑیوں کی چہک شاخوں کی لچک
بادل کی گرج بجلی کی چمک
ہر پھول ہے اپنا منہ کھولے
ہر [illegible] بھنورا ڈولے
~~~~~~~~

جناب سید آفتاب امین چشتی

پرانے سکے جمع کرنا



پرانے سکے جمع کرنے کا شوق یا مشغلہ بہت
۔انا ہے۔ اور بھی سچ تو یہ ہے کہ بہت اچھا شوق
ہے۔ اس کے باعث ہماری معلومات میں عجیب وغریب
مافہ ہوتا ہے۔ پچھلے زمانے میں تاریخ لکھنے کا رواج
تھا نہیں۔ لے دے کے انھی سکوں کی بدولت اس
مانے کے تاریخی حالات پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ
لے مختلف جگہوں پر زمین میں دبے ہوئے ملے ہیں۔
ن میں سے بعض پر بتوں کی تصویریں بنی ہیں۔ بعض
کور ہیں۔ بعض گول ہیں، اور بعض پر صرف حروف
ندہ ہیں۔ ان کی شکل وصورت ٹھیکروں سے بہتر نہیں۔
اب ان سکوں سے مختلف زمانوں کے حالات
معلوم ہوتے ہیں۔ وہ کیسے؟ مثلاً! جو بے تکے اور بے شکل
ہیں۔ وہ اس بات کو ظاہر کرتے ہیں کہ اس وقت کے
لوگ کسی خاص نظم ونسق کے پابند نہ تھے۔ چوکور اور
اچھی شکل کے سکے اس دور کے لوگوں کی کچھ کچھ باقاعدگی
اور نفاست کو ظاہر کرتے ہیں۔

پرانے سکے جمع کرنے کا شغل ہر ایک کے بس
کی بات بھی نہیں۔ عام طور پر کھاتے پیتے گھروں کے
لڑکے یہ شوق کرتے ہیں۔ ان کے لیے بڑی محنت کرنی
پڑتی ہے۔ ملک ملک اور وقت وقت کے سکے حاصل کرنے
کے لیے دولت بھی چاہیے۔ وقت بھی چاہیے۔

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بعض خوش نصیب

لڑکوں کو ان کے باپ دادا اس قسم کے ذخیرے سونپ جاتے ہیں۔ اچھے لڑکے ان ذخیروں کو بڑھاتے ہیں۔ اور ان میں ہر زمانے اور ہر ملک کے نئے سکّوں کا اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ کہیں کہیں پرانے سکّوں کے بیچنے کا کام بھی ہوتا ہے۔

پرانے سکّوں کے ذخیرے بڑھاتے وقت یا اس کام کو شروع کرتے وقت چند باتیں دھیان میں رکھنے کی ہیں۔ سب سے پہلے جو بھی پرانے سکّے جمع کیے جائیں ایک تو ان کے سَن یا وقت کا لحاظ رکھا جائے۔ دوسرے وہ اہم وقتوں اور مشہور بادشاہوں کے ہوں۔ نیز ان سکّوں کے سائز بھی تقریباً ایک ہوں۔ اور سکّے چمکیلے اور عمدہ ہوں۔

جو لڑکے سکّے جمع کرنا چاہیں انھیں آج سے تقریباً ایک سو سال پہلے کے سکّوں سے ابتدا کرنی چاہیے۔ پہلے اپنے ملک کے مختلف سکّے جمع کیے جائیں، پھر ایسے سکّے جو پڑوسی ملکوں کے ہوں اور اگر ممکن ہو تو دور دراز ملکوں کے سکّے بھی جمع کیے جائیں۔ جوں جوں ذخیرہ بڑھتا جائے گا، توں توں شوق بھی بڑھتا جائے گا۔ اور ہر ایک جمع کرنے والے کی کوشش یہی ہوگی کہ وہ زیادہ سے زیادہ پرانے سکّے جمع کر سکے۔

پرانے سکّے رکھنے کے لیے لکڑی کے فریم استعمال کیجیے۔ ان کے دونوں طرف شیشے کے ڈھکنے لگے ہوں۔ بازاروں میں تصویروں کے فریم بہت ملتے ہیں۔ ایسے بنے بنائے فریم بازار سے خرید لیجیے۔ اور ان دونوں کی پشتوں کو لوہے یا پیتل کے چھوٹے چھوٹے جوڑ دیجیے۔ پلائی وڈ کا ایک ٹکڑا فریم کے لیجیے۔ اور ان پر سارے سکّے برابر برابر جوڑ نشان لگا لیجیے۔ ان نشانوں کے برابر سوراخ سوراخ کرنے کے بعد پلائی وڈ پر رنگ اور ان کے کناروں کو کسی چیز سے گھس کرا کہ وہ فریم میں اچھی طرح جوڑے جا سکیں۔ استعمال کرنے سے پہلے فریم کی نچلی سطح پر ش اور پلائی وڈ پر سارے سکّے رکھنے کے بعد دوسر فریم پر شیشہ لگا دیجیے۔ جب شیشہ جڑ جا۔ کے ڈھکنوں کو حسبِ ضرورت کھولنے اور بند لیے اس میں ہُک لگا دیجیے۔

بچّوں کی کتابیں

چوہوں کی کانفرنس		-/۴۵
پاک کہانیاں	(اوّل)	۱/۴
"	(دوم)	۱/۱۵
پرندوں کا ایکا		-/۴
پھدی جو کڑھائی سے نکل بھاگی		-/۳۵
تانبیل خاں		-/۳
ترکوں کی کہانیاں		-/۵۵
جگو کی بلّی		-/۲۵
چقماق کی ڈبیا		-/۳



قسمت کی لکیر

جناب صابر انجم رمضان پوری

(انڈونیشیا کی ایک لوک کہانی)

انڈونیشیا میں ایک راجکمار تھا۔ وہ پامسٹری میں یعنی ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر غیب کی باتیں بتانے میں ماہر تھا۔

ایک دن اس کی نظر اپنے پہرے دار پر پڑی۔ اس نے دیکھا، مصیبت، اور غریبی کی ساری لکیریں اس کے ہاتھوں میں ایک جگہ آکر جمع ہو گئی ہیں۔ اس نے سوچا۔ کیا میں ان لکیروں کو مٹا سکتا ہوں؟

پہرے دار کا نام سوتیرڈو تھا۔ وہ ذرا لنگڑا کر چلتا تھا۔

"سوتیرڈو ادھر آؤ" راجکمار نے بلایا اور اس کے ہاتھ میں ایک خط دے کر کہا: "فوراً گڈو بانگ چلے جاؤ! یہ خط وہاں کے زمیندار گیڈانگ رنگ، کو دے دینا۔ یہ روپے لو، سفر کے دوران کام آئیں گے۔"

سوتیرڈو کا کام چور تھا۔ دھیمی آواز میں بولا۔ "حضور کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں ابھی جاتا ہوں۔"

سوتیرڈو جب محل سے باہر نکلا تو آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔ "بھلا اتنی دور بھیجنے کے لیے صرف میں لنگڑا ہی رہ گیا تھا۔" لیکن کرتا کیا؟ راجکمار کا حکم تھا۔ سامان ٹھیک کیا اور چل کھڑا ہوا۔

چلتے چلتے شام ہو گئی۔ سوتیرڈو ایک گاؤں میں

ٹھہر گیا۔ راستے میں اس کا دوست ردسو مل گیا۔ اس نے پوچھا "کہو بھئی، خیریت تو ہے ؟!"

سوئیٹرو نے جھلا کر کہا۔ "بڑی مصیبت میں گرفتار ہوں، راجکمار کا ایک خط پہنچانے مجھے گدھانگ تک جانا ہے"

"ارے یار" ردسو نے تعجب سے کہا "تم اسے مصیبت سمجھتے ہو۔ یہ تو بڑے فخر کی بات ہے"

"ایسی کی تیسی، فخر کی۔ نہ میرے پاس افیم ہے نہ سگریٹ۔ اگر تم یہ کام قابل فخر سمجھتے ہو، تو مہربانی کرکے تم ہی انجام دے دو۔ یہ جو روپے ہیں آدھے آدھے بانٹ لو"

ردسو فوراً تیار ہوگیا۔ اور گدھانگ کے لیے روانہ ہوگیا۔ اور سوئیٹرو نے افیم کی دکان کا رخ کیا۔ وہ بڑا افیمی تھا!

ردسو نے گدھانگ کے قریب پہنچتے ہی اپنے کپڑے ٹھیک ٹھاک کیے اور بڑی شان بے نیازی سے شہر کے اندر گھستا چلا گیا۔

ردسو کو گڈانگ رنگ کو ڈھونڈنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ وہ شہر کے سب سے بڑے زمیندار تھے۔

محل کے پھاٹک پر پہنچتے ہی ردسو نے اطلاع بھجوائی۔۔ "راجدھانی سے گڈانگ رنگ کے لیے راجکمار کا پیغام لایا ہوں۔ ردسو کو گڈانگ رنگ نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ردسو نے راجکمار کا خط گڈانگ رنگ کو دے دیا ــــ خط پڑھ کر وہ مسکرا اٹھے اور بولے "تمھیں معلوم ہے اس خط میں کیا لکھا ہے ؟"

"نہیں !" ردسو نے کہا۔

گڈانگ رنگ نے خط پڑھ کر سنایا۔ لکھا
شاہی حکم ہے کہ اس شخص (خط لانے والے) کی
سب سے چھوٹی لڑکی کے ساتھ کردی جائے۔ شادی
اور جاگیریں دی جائیں گی"

گڈانگ رنگ نے پوچھا "تمھیں یہ رشـ

ردسو اپنی اس خوش قسمتی پر پھولا نہ
بولا۔ "سوال میرا نہیں بلکہ آپ کی پسند کا ہے"

گڈانگ رنگ فوراً بولا "راجکمار اگر ایک
سے بھی میری بیٹی کی شادی کرنے کا حکم فرمائے،
انکار نہیں کرسکتا۔ اور پھر تم تو ماشاءاللہ ایک با
اور خوب صورت نوجوان ہو!"

بڑی دھوم دھام سے ردسو کی شادی

راج کمار نے دوسرے دن کھڑکی سے با
سوئیٹرو پر اس کی نظر پڑ گئی۔ وہ حسب معمول پہ
رہا تھا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اس نے سوئیٹر
کیفیت پوچھی۔ سوئیٹرو نے بتایا کہ اس نے خط گدھ
بھجوا دیا ہے۔ راجکمار ایک ٹھنڈی سانس بھر کر ر
لیکن وہ ابھی ناامید نہیں ہوا تھا۔ اس نے ایک
دیا۔ ایک تربوز منگوایا اور تھوڑا سا کاٹ کر اس
کا گودا نکال لیا۔ اس کی جگہ زیور اور جواہرات
تربوز کے چھلکے کو اپنی جگہ لگا دیا اور سوئیٹرو کو
"مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ یہ تربوز اپنے گھر لے جاؤ"

سوتیرڈو تربوز لے کر گھر کی جانب چل پڑا۔ اسے بہت غصہ آرہا تھا: "ہونہہ یہی ہمدردی ہے راجکمار کی؟ ایک تربوز! کچھ دھن دولت دیتے اور نہیں تو دو چار تولے افیم ہی دے دیتے۔ بھلا اس تربوز کا میں کیا کروں گا!"

راستے میں ایک شخص مل گیا اور بولا: "بھئی بہت ہی عمدہ تربوز ہے۔"

"عمدہ ہے؟" سوتیرڈو نے پوچھا۔ "بولو اس کی کیا قیمت دو گے؟"

آخر مول تول کے بعد سوتیرڈو نے تربوز اس کے ہاتھ بیچ دیا۔

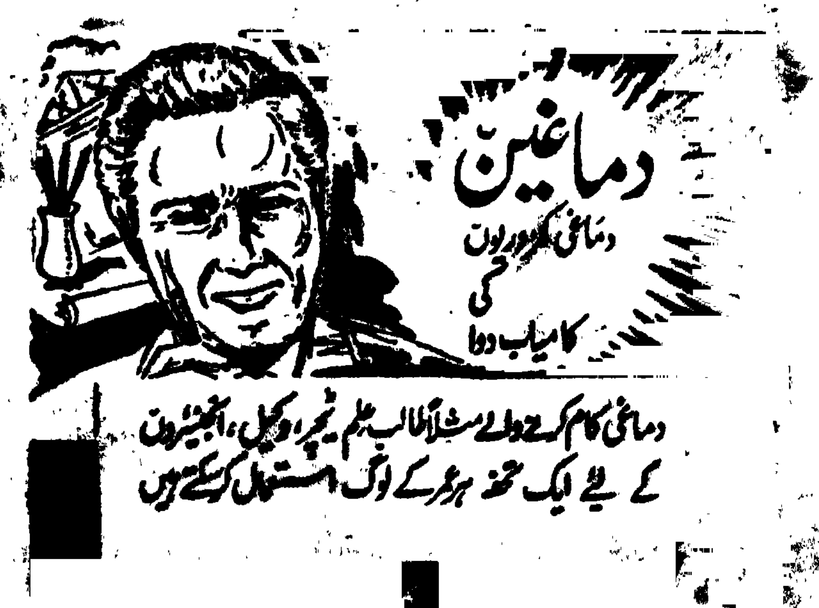
کچھ ہی دنوں میں سوتیرڈو نے دیکھا کہ وہ شخص امیر بن گیا۔ جب اسے پتہ چلا کہ یہ سب کچھ تربوز کی دین ہے تو اس نے سر پیٹ لیا۔ آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔

تھوڑے ہی دنوں بعد ایک دن راجکمار نے سوتیرڈو کو بلا کر ایک خط دیا۔ یہ خط شہر کے کوتوال کے پاس پہنچانا تھا۔ اس بار سوتیرڈو بہت خوش تھا۔ اور خوشی میں جھومتا اور سوچتا ہوا چلا جا رہا کہ شہر کے کوتوال کی لڑکی سے شادی ہونا بھی کوئی برا نہیں دولت خوب ہاتھ آئے گی۔

کوتوال نے خط کھولا تو اس میں لکھا تھا: "اس شخص کو گرفتار کرکے جیل میں بند کر دو، اس نے دو بار حکم عدولی کی ہے۔"

اس کے بعد راجکمار نے اپنے محل کے باہر پھاٹک پر ایک تختے پر لکھ کر یہ لٹکا دیا۔

"جو شخص اپنا فرض نہیں نبھاتا۔ مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ اور اس مصیبت کو کوئی ٹال نہیں سکتا۔"



جناب عالیجاہ الٰہی خاں امروہوی

دِل چسپ اور عجیب



آیئے آج ہم کچھ دل چسپ انوکھی اور عجیب و غریب باتیں بتائیں۔

انڈو چائنا کا ایک بادشاہ تھائی تھا۔ اس کے یہاں سب ایک ٹانگ کے تھے۔ ایک بار اس نے اپنی دیوی کو خواب میں ایک ٹانگ کا دیکھ کر نہ صرف اپنی ایک ٹانگ کاٹ دی بلکہ ایک ہی ٹانگ کی عورت سے شادی کر کے اسے رانی بنایا۔ اور ایک ہی ٹانگ کے درباریوں کو دربار میں رکھا۔

برٹن کا ڈینیل ہمبرٹ کو دنیا کا آٹھواں عجوبہ کہتے ہیں بچپن سے ہی اس کا جسم بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ وہ جو واسکٹ پہنتا تھا وہ دنیا میں سب سے بڑی تھی۔ جس کا وزن ۹ من تھا۔ اس کی بیٹھنے کی کرسی اور واسکٹ وغیرہ آج بھی میوزیم میں محفوظ ہیں۔

ٹے منے (TEMNE) قبیلے کے سردار جانتے ہیں کہ کس سال کے کونسے مہینہ کی کونسی تاریخ کو انھیں مرنا ہے۔ یہ اپنے چھوٹے سے قبیلے کے ایک طرح کے راجہ ہیں۔ ان کی تاج پوشی کی رسم بڑی دھوم دھام سے منائی

لے جایا جاتا ہے۔ آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی اور کہا جاتا ہے کہ اپنی مٹھی کو زیادہ سے زیادہ پھیلا ایک ہی بار میں زیادہ سے زیادہ کنکر بھر لو۔ بس ا کنکروں کی تعداد ان کی زندگی کے دنوں کی تعداد۔ آخری دن اسی ٹھاٹ باٹ سے ان کی زندگی ختم جاتی ہے۔ ایک زہر کا پیالہ پیش کیا جاتا ہے اور محل باہر چار کہار ایک تابوت لیے کھڑے رہتے ہیں۔ جب ان کے مردہ جسم کو رکھ کر قبرستان میں لے جایا جاتا

ایشیا کا شہری کرال آٹھ فٹ نو انچ لمبا اس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ سڑک کے لیمپ اپنا پائپ جلایا کرتا تھا۔ دنیا کا سب سے لمبا آدمی آئر کا شہری ویکلے مائر تھا۔ وہ نو فٹ چار انچ لمبا

روس کے ایک آدمی "ٹچ لیکن" نے سونے ریکارڈ توڑ دیا تھا۔ کہتے ہیں وہ ۱۸۹۸ء میں سو گیا تھا بیس سال بعد ۱۹۱۸ء میں جاگا۔ دنیا کی بہت سی باتیں۔ پہلی جنگ عظیم۔ اور روس کی جنگ وغیرہ سونے کی حالت میں ہو گئیں۔

فرینچ کروڑپتی ہیوز جیکوٹن (HUGHES JACQSC TON) اس صدمے سے مرگیا کہ وہ اپنے
بھتیجے کے لیے صرف تین لاکھ روپیہ چھوڑ سکےگا۔ اور بھتیجا
جس نے زندگی بھر شاید سو روپے بھی نہیں دیکھے تھے)
س خوشی میں مرگیا کہ چچا کے مرنے کے بعد اسے تین لاکھ
روپیہ ملےگا۔

ایک فرانسیسی ۸۴ سال کا ہوا تو اسے یقین ہوگیا
کہ اب وہ زیادہ دن نہ جیےگا۔ اس نے قبر پر لگانے کے
لیے ایک پتھر خریدا۔ پتھر پر اس نے یہ الفاظ لکھوائے۔
مسٹر گیڈ نے جو ۱۸۸۰ء میں انتقال کر گئے" اس نے
ن کا آخری ہندسہ نہ لکھوایا۔ گھر والوں کو ہدایت کر دی
کہ جب وہ مر جائے تو سن کا آخری ہندسہ مکمل کروانے
کے بعد پتھر قبر پر لگوا دینا۔ مگر ۱۸۹۰ء آگیا پھر بھی وہ زندہ رہا
اس لیے اس نے ایک اور پتھر لے کر وہی عبارت لکھوائی۔
ن کی جگہ ۱۸۹ ء لکھا دیا تاکہ مرنے کے بعد گھر والے
آخری ہندسہ لکھوا کر لگا دیں۔ مگر دس سال اسی طرح
گزر گئے۔ تو اس نے تیسرا پتھر لے کر تعمیر کرایا۔ اس پر
ن کی جگہ ۱۹۰ء لکھوایا۔ یہ بھی کام نہ آیا۔ ۱۹۱۱ء میں
جب اس کی عمر ۱۰۵ سال کی تھی اس نے چوتھا پتھر تیار
کرایا۔ اس پر سن کے تین ہندسوں کے بجائے صرف دو
ہندسے لکھوائے تاکہ پتھر ضائع نہ ہو۔ اس نے اس پر
صرف ۱۹ء لکھوایا اور اس کے بعد وہ جلد ہی مرگیا۔

جناب افضل امام

دیوزاد گرمچھ

پچھلے دنوں افریقہ کے ایک شکاری مسٹر یو بی
ویلموٹ نے ایک بڑے گرمچھ کو بندوق کا نشانہ بنایا۔
اس گرمچھ کا پیٹ چیرا گیا تو اس میں سے ایک جنگلی بھینس
نکلی، ایک گھوڑا نکلا، دو بکریاں نکلیں، کئی بندر نکلے۔
اور جناب دو افریقی عورتیں نکلیں! یہ گرمچھ تقریباً چالیس
فٹ لمبا تھا۔ وزن ڈیڑھ ٹن (تقریباً چالیس من) تھا۔
مسٹر ویلموٹ کا کہنا ہے کہ ایسے گرمچھ زیادہ گہرائی والے
سمندر میں پائے جاتے ہیں۔ مسٹر ویلموٹ اب تک
ان گنت گرمچھ شکار کر چکے ہیں، لیکن ایسا دیوزاد گرمچھ
پہلی بار ہاتھ لگا۔

بائیں ہاتھ سے کام کرنے والے

شاید یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہو کہ مشہور
شہنشاہ سکندر بائیں ہاتھ سے کام کرتا تھا۔ امریکہ کے
پچھلے صدر ٹرومین بھی بینتے تھے۔ انگلستان کے مشہور
بادشاہ جارج ششم داہنے ہاتھ کا کام بائیں ہاتھ سے لیتا تھا۔
اسی طرح مائیکل انجلو اور لیونارڈو ڈاونچی جیسے بڑے مصوروں
کے شاہکار بھی ان کے بائیں ہاتھ کا کارنامہ ہیں۔



کتابوں کی باتیں

گاندھی جی

لکھنے والے

حضرت خورشید احمد جامی (مرحوم)

گاندھی جی کی اچھی اچھی باتوں پر ان کی زندگی کے حالات پر ایک اردو کیا، دنیا کی قریب قریب سبھی بڑی بڑی زبانوں میں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں، لکھی جا رہی ہیں۔ لیکن یہ سب زیادہ تر بڑوں کے لیے ہیں یہی باتیں بچوں کے لیے شعر کی زبان میں لکھی جائیں۔ آسان زبان میں لکھی جائیں تو بچے ان شعروں کو مزے لے کر پڑھتے ہیں۔ پورا لطف اٹھاتے ہیں اور یوں دھیرے دھیرے یہ اچھی اچھی باتیں، یہ نصیحت کے ان مول موتی۔ آپ ہی آپ ان کے دل و دماغ میں بس جاتے ہیں۔ خورشید احمد جامی صاحب نے یہی کارنامہ انجام دیا ہے۔ اس کتاب میں تین بڑی بڑی نظمیں (۱) دیس کا سب سے بڑا رہنما (۲) گاندھی جی کا پیغام قوم کے نام (۳) گاندھی جی کے دیس میں۔

جناب خورشید احمد جامی ہندوستان خصوصاً دکنی ہندوستان کے مشہور شاعر ہیں۔ بڑے شاعروں کے لیے بچوں کے لیے کچھ لکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اپنے اونچے معیار سے نیچے اترنا پڑتا ہے۔ جبھی تو اور اچنبھا ہوتا ہے کہ ایسی پیاری پیاری نظمیں۔ اتنی صاف ستھری، دل پر اثر ڈالنے والی زبان میں وہ کیسے لکھ سکے۔ ان نظموں میں سچ مچ انھوں نے جادو جگایا ہے۔

گاندھی جی کو پیدا ہوئے سو سال گزر چکے ہی

کل ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر قریب قر

ملکوں میں ان کی سو سالہ سالگرہ بہت جوش و خروش

منائی جا رہی ہے۔ ان کی اچھی اچھی باتوں کا طرح

چرچا کیا جا رہا ہے۔ ایسے میں اس ننھی منی کتاب کی اہ

یقیناً ایک یادگار تحفہ ہے۔ اس کتاب کی لکھائی چھپائ

خاص اہتمام سے کام لیا گیا ہے۔ کاغذ بھی اچھا لگا

سرورق یا ٹائٹل پر گاندھی جی کی قدآدم تصویر ہے

پیسوں میں ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآ

سے ملے گی۔ (شکریہ آل انڈ

اشوک اعظم

لکھنے والی

محترمہ سیدہ جہاں جی

اشوک اعظم حضرت مسیح سے ڈھائی سو

پیدا ہوا تھا یوں سمجھو کہ اب سے ۲۲۳۰ برس پہلے

دادا چندر گپت موریا قبیلے کا سردار تھا۔ اس نے

پنجاب پر قبضہ کیا پھر آہستہ آہستہ دیس کا بہت

اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ پورے دیس میں

کا سب سے طاقت ور راجا گنا جانے لگا۔ اس

پر اس کا بیٹا بندوسار گدی پر بیٹھا۔ اشوک اع

ندوسار کا لڑکا ہے ۔ باپ کے مرنے پر اس نے راج کاج سنبھالا ۔ بہت بڑا راج تھا ۔ یوں سمجھو کہ ایک طرف تو میسور سے کشمیر تک، دوسری طرف خلیج بنگال سے عرب ساگر کے کنارے تک اس کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی ۔ نیپال بھی اس کی حکومت میں شامل تھا ۔ اتنی بڑی سلطنت کے انتظام کو اچھے ڈھنگ سے چلانا اپنی جگہ خود ایک کارنامہ ہے ۔ خاص کر اب سے بائیس سو برس پہلے

شروع شروع میں تو دوسرے راجاؤں اور بادشاہوں کی طرح اشوک بھی شکار میں یا اپنی سلطنت بڑھانے میں لگا رہتا تھا ۔ اپنی حکومت کے نویں سال اس نے کلنگ کے راجا پر چڑھائی کی ۔ وہ بھی بہت بڑا راجا تھا ۔ گھمسان کا رن پڑا لاکھوں مرے لاکھوں زخمی ہوئے ۔ ہزاروں گھر برباد ہوئے ، بے شمار بستیاں اجڑ گئیں ۔ اشوک جیت گیا پر لوگوں کی اس تباہی و بربادی کا اس کے دل پر بہت اثر ہوا ۔ اتنا اثر ہوا کہ لڑائی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توبہ کر لی ۔ اس وقت دیس میں بودھ مذہب پھیلا ہوا تھا ۔ اشوک بھی اس مذہب پر چلنے لگا ۔ اس مذہب کی اچھی اچھی باتوں کو پھیلانے میں اس نے اپنی ساری عمر لگا دی ۔ بودھ مذہب میں اونچ نیچ نہیں ہے ۔ وہ دوسرے مذہبوں سے رواداری برتنا سکھاتا ہے ۔ اہنسا یا عدم تشدد کی تعلیم دیتا ہے ۔ اشوک نے اپنی ساری سلطنت میں یہ اچھی باتیں جگہ جگہ میناروں پر کھدوا کر لگا دیں ۔ اس طرح اس کا زمانہ نیکی کا اور شرافت کا اور پرجا کے لیے جنت کا نمونہ بن گیا ۔

محترمہ س ۔ [illegible] نے کتاب بچوں کے لیے لکھی ہے ۔ اشوک اعظم کے زمانے کی اہم اہم باتوں کو بڑے سلیقے سے سمیٹنے کی کوشش کی ہے زبان آسان اور انداز بیان دل چسپ ہے ۔ ۵۲ صفحے کی کتاب ہے اور قیمت کل ۵۷ پیسے ہے ادارہ ادبیات اردو خیریت آباد حیدرآباد سے مل سکتی ہے ۔ (بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

●●

ماہ نامہ **کتاب نما** نئی دہلی

ارباب ذوق کے لیے مکتبہ جامعہ کا یہ باتصویر رسالہ نہایت ضروری چیز ہے ۔ اردو کی تمام نئی کتابوں کی اطلاع آپ کو اس رسالے میں مل سکتی ہے ۔ کسی قابل ذکر دارالاشاعت کی کوئی کتاب ایسی نہیں ہوتی جس کا اشتہار ہم فوراً کتاب نما میں شائع نہ کرتے ہوں ۔ آپ کتاب منگائیں یا نہ منگائیں اردو ادب کی ترقی سے واقف رہیں گے ۔

یہ رسالہ علاوہ عام با مذاق حضرات کے لیے مفید ہونے کے، خاص طور پر لائبریریوں اور انجمنوں کے لیے ضروری ہے ۔ کوئی کتب خانہ اس رسالے کی مدد کے نئی کتابوں کا صحیح انتخاب نہیں کر سکتا ۔

نمونہ مفت ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ قیمت سالانہ دو روپے

پتہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵



بچوں کی کوششیں

دونوں ایک جیسے

اشخاص ڈراما:-

سکندرِ اعظم۔ درباری لوگ۔ فوجی افسر۔ تھریس کا ایک ڈاکو۔

سین:-

(سکندرِ اعظم کے دارالسلطنت مقدونیہ میں، سکندر تختِ شاہی پر بیٹھا ہے۔ اور اس کے، چاروں طرف فوجی افسر بیٹھے ہیں۔ ایک فوجی افسر ... یونان کے مشہور ڈاکو کو حراست میں لا کر پیش کرتا ہے)

سکندر :- کیا تو ہی وہ ظالم ڈاکو ہے جس سے ساری رعایا پریشان ہے؟

ڈاکو :- میں ... یونان کا ایک باشندہ ہوں اور ایک بہادر سپاہی ہوں!

سکندر :- (غصہ سے) خوب، تو اپنے کو سپاہی سمجھتا ہے، ذلیل!

ڈاکو :- حضور میں نے کیا قصور کیا ہے، جو آپ اس قدر بے زار نظر آرہے ہیں!!

سکندر :- کیا تو نے ہزاروں کو قتل نہیں کیا۔ ہزاروں کے گھر تباہ نہیں کیے؟

ڈاکو :- اگر اجازت دیں تو اس کا جواب دوں!

سکندر :- ہاں جواب دے!

ڈاکو :- آپ نے اپنی زندگی کس طرح بسر کی؟

سکندر :- بہادروں کی طرح۔ سب سے زیادہ مشہور اور طاقت ور بادشاہوں میں میرا شمار ہے۔

ڈاکو :- جناب عالی، کیا میری شہرت نہیں ہے؟ کیا، مجھ سے زیادہ بہادر کوئی سردار ہے؟

سکندر :- لیکن تو کمینہ ہے۔ بدمعاش ہے لالچی ہے۔

ڈاکو :- کیا جناب عالی نے محض لالچ میں آکر ہزاروں کی جانیں نہیں لیں؟ کیا حضور نے بڑے بڑے شہروں کو ویران نہیں کیا؟

سکندر :- ہاں کیا ہے! لیکن پھر میں نے اس سے زیادہ خوب صورت شہر بسائے بھی ہیں۔ ہزاروں کی جانیں لی ہیں تو ہزاروں کو پالا بھی ہے۔

ڈاکو :- میں نے بھی امیروں سے لیا ہے تو غریبوں میں بانٹا ہے۔ میں نے بھی قوم کو جنگ جو اور بہادر بنایا ہے۔ ہزاروں لوگ میرے ٹکڑوں پر پلے ہیں۔ لیکن سچ ہے جو تباہی حضور نے اور میں نے مچائی ہے۔ جتنی جانیں ہم لوگوں نے ضائع کی ہیں۔ اس کی تلافی نہ میں کرسکتا ہوں نہ حضور کر سکتے ہیں!

سکندر :۔ ہٹ جاؤ! ہٹ جاؤ! دربار برخاست! مجھے تنہائی میں سوچنے دو۔ اس ڈاکو کی زنجیر کھول دو۔

کیا سچ مچ ہم دونوں ایک جیسے ہیں؟
"ایک ڈاکو اور سکندر اعظم"!

(پردہ گرتا ہے)

بدر وفا سہسرامی

قاضی کی عقل مندی

ملک ایران میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ وہ بہت مال دار تھا۔ اس کے گھر میں بہت نوکر چاکر تھے، یہ اس کے مختلف کام کرتے تھے۔ وہ بہت مدت سے کام کر رہے تھے، اس لیے انھیں یہ معلوم تھا کہ سوداگر اپنا مال و دولت کہاں رکھتا ہے۔

ایک مرتبہ رات کے وقت سوداگر کے یہاں چوری ہو گئی۔ سوداگر کو بہت رنج ہوا لیکن وہ قاضی کے پاس نہ گیا۔ اس نے سوچا چوری میری لاپرواہی سے ہوئی ہے۔ بات آئی گئی ہو گئی۔

لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد سوداگر کے یہاں دوبارہ چوری ہوئی۔ اس مرتبہ بہت زیادہ نقصان ہوا۔ اب تو سوداگر بہت گھبرایا۔ اس نے سوچا تجوری کا علم مجھے یا میرے نوکروں ہی کو ہے۔ ہو نہ ہو یہ کام میرے نوکروں ہی کا ہے۔ اب وہ چپکے سے قاضی کے پاس پہنچا۔ سارا واقعہ تفصیل سے ان کو سنایا۔ اور

قاضی نے سارے نوکروں کو طلب کیا۔ اور کہا "دیکھو تم میں سے کوئی ایک چور ہے۔ میں تم سب کو ایک ایک چھڑی دیتا ہوں، ان میں سے ہر ایک چھڑی بارہ انچ لمبی ہے، جو چور ہوگا، اس کی چھڑی تیرہ انچ کی ہو جائے گی۔ اب تم لوگ اپنی اپنی چھڑی لے جاؤ اور کل ان کو واپس لے کر آنا۔" نوکر تعداد میں بہت سے تھے چناں چہ وہ سب اپنی اپنی چھڑی لے کر چلے گئے۔

اب جو چور تھا وہ بہت گھبرایا اور اپنی بیوی سے کہنے لگا کہ کوئی ترکیب بتاؤ کہ چھڑی لمبی نہ ہو۔" بیوی فوراً چاقو لے کر آئی اور چھڑی کو ایک انچ کاٹ دیا اور کہا کہ "جب یہ چھڑی ایک انچ لمبی ہو گی تو پہلے جیسی ہو جائے گی۔"

"اس طرح ہمارا چوری کا بھید کسی پر ظاہر نہ ہوگا۔" دوسرے دن سارے نوکر قاضی کے پاس گئے۔ قاضی نے سب کی چھڑیاں دیکھیں اور چور کو پہچان لیا۔ چور نے فوراً جرم کا اقرار کر لیا اور سارا سامان سوداگر کو لاکر دے دیا۔

قاضی نے چور کو سزا دی۔ سوداگر قاضی کی عقل مندی پر حیران رہ گیا۔ اس نے انصاف کی تعریف کی اور شکریہ ادا کیا۔

حامد حسن ابتدائی پنجم

چندہ ہمیشہ منی آرڈر سے

آدھی ملاقات

"پیام تعلیم" بچوں کا ایک پیارا پرچہ تو ہے ہی، لیکن اس کی ایک حیثیت اور بھی ہے یہ اردو کا نمائندہ بھی تو ہے؟ چنانچہ "پیام تعلیم کی مدد" (کسی بھی شکل میں) اردو کی مدد ہے۔ وہ بھی اِن دنوں جبکہ اردو دشمن عناصر اس کی جڑیں کھودنے کے درپے ہیں، اسے اس کا جائز حق کیا دلائیں گے؟ اس کا رسم الخط ہی بدل ڈالنا چاہتے ہیں...... اردو کی بقا کے لیے جو کچھ بھی کیا جائے کم ہے۔ اردو کی زندگی کے لیے اردو کے اخبار و رسائل کی زندگی ضروری ہے۔

سرپرست میری چھوٹی بہن فریدہ بانو کو پیام تعلیم کا خریدار بنا لیجیے۔ انشاء اللہ یہ کوشش میں مسلسل جاری رکھوں گا۔

عبداللہ کمال

"پیام تعلیم" [illegible] مجھے افسوس ہے کہ چند ایسے نام جو آجکل پیام تعلیم میں نظر آرہے ہیں۔ بُری طرح چوری ڈکیتی پر تلے ہوئے ہیں۔ اس طرف دھیان دیجیے۔ ان کی ہمت افزائی رسالے کے لیے اور خود ان لکھنے والے بچوں کے لیے نقصان کا باعث ہے۔ میری رائے ہے کہ بچوں کی تخلیقات پر کسی ذمہ دار ادیب یا شاعر یا معلم کی سفارش کے بغیر انھیں شائع نہ کریں، تو اس بدعنوانی پر کسی حد تک قابو پاسکیں گے۔ یا یہ لوگ جس شہر یا گاؤں سے اپنی "تخلیقات" روانہ کریں اگر ممکن ہو تو وہاں کے یا اس حلقے کے کسی ذمہ دار ادیب و شاعر سے ان کے متعلق کچھ چھان بین ضرور کر لیں حالانکہ یہ کام بڑا مشکل ہے لیکن یہ "اسمگلنگ" اسی طرح بند کی جاسکتی ہے۔ چند بچے اپنے خطوط یا تحریر سے اپنے آپ کو بڑوں کی صف میں ملا کر آپ کو دھوکا دیتے ہیں مجھے اس کا اندازہ بھی ہوا۔ آپ کی مجبوریاں اور مشغولیات اگرچہ اس دھر پکڑ میں رکاوٹیں ڈالیں گی۔ لیکن پھر بھی کچھ نہ کچھ تو ضرور کرنا ہے۔ میرا تعاون آپ کے ساتھ ہے۔

ماہنامہ جون میں زمرد ہفت رنگ" "ڈر کی تلاش" "موتیوں کا سوداگر" "لکڑی کی ہتھوڑی" کہانیاں بے حد پسند آئیں۔ نظمیں بھی بہت خوب ہیں۔ ماہنامہ ایک کامیاب دلچسپ معلوماتی رسالہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ پیام تعلیم روز بروز ترقی کرے۔ آمین!

زلیخا بیگم

رسالہ واقعی بہت خوبصورت، اور معلوماتی ہوتا جارہا ہے خدا سے میری یہی دعا ہے کہ میرے پیارے رسالے "پیام تعلیم" کو دن دونی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے تاکہ یہ ہندوستان کا منفرد معلوماتی اور ادبی دلچسپیوں کا مجموعہ ہو۔ اب "پیام تعلیم" بہت جلدی گھر بیٹھے مل جاتا ہے، ورنہ پہلے اردو بازار بار بار جانا پڑتا تھا، تب کہیں جاکر دستیاب ہوتا تھا۔۔ امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

آپ کا

عبدالرشید علی

میں جماعت اوّل میں پاس ہو گیا ہوں۔ مئی ۱۹۷۰ء کے پرچے میں جو گیت "آجا بھیا" آپ کا شمیم ہاشمی ہے مجھے بہت پسند آیا۔ میرا یہ خط "پیام تعلیم" میں چھاپ دیجیے میں آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تنویر علی - جماعت دوم

اِدھر اُدھر سے



دنیا کی سب سے قیمتی کتاب

کہتے ہیں" ایپوکسلی پس" دنیا کی سب سے قیمتی کتاب ہے۔ اس کا بیمہ لگ بھگ ستر ہزار روپیہ میں کیا گیا ہے۔ کتاب میں موجودہ زمانے کے مشہور ادیبوں اور اخبار نویسوں کے مضمون ہیں۔ کتاب کی جلد کانسے کی ہے۔ اور اس میں سونا اور قیمتی پتھر جڑے ہیں۔ اس کی تصویریں اور عبارتیں دونوں خالص سونے سے تیار کی گئی ہیں۔ یہ کتاب سب سے پہلے ۱۹۶۱ء میں پیرس کے عجائب گھر میں رکھی گئی تھی۔ اس کے بعد فرانس کے بڑے بڑے قصبوں اور یورپ کے دوسرے مقامات پر اس کی نمائش کی گئی۔

(سیاست حیدرآباد)

کتے نما مینڈک

برازیل میں مینڈک کی ایک انوکھی قسم پائی گئی ہے۔ اس کی آنکھوں پر دو چھوٹے چھوٹے سینگ ہوتے ہیں۔ اور کتے کی طرح بھونکتا ہے۔ دانت بہت زہریلے ہوتے ہیں۔ گھوڑے کو کاٹ لے تو وہ فوراً مر جاتا ہے۔

بجلی نے ہاتھی کو پچھاڑ دیا

خبر ہے کہ بدایوں کے ضلع میں چار آدمی ہاتھی پر بیٹھے بارات میں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک جگہ بجلی کا تار ٹوٹ کر زمین پر گر گیا تھا۔ اتفاق سے ہاتھی کا پیر اس تار پر پڑ گیا۔ ہاتھی نے لاکھ چھڑانے کی کوشش کی لیکن کامیابی نہ ہوئی، آخر پچھاڑ کھا کر گر گیا اور مر گیا۔ ان چار سواریوں میں سے دو تو وہیں ختم ہو گئیں، دو ہسپتال جا کر چل بسیں۔ ہاتھی کے پیچھے ایک گھوڑا آ رہا تھا وہ بھی اس لپیٹ میں آ گیا اور گر کر ختم ہو گیا۔ برسات میں تو بجلی کے کھمبے یوں بھی خطرناک ہو جاتے ہیں۔ ان میں بجلی اُتر آتی ہے۔ ان سے دور ہی دور رہنا چاہیئے۔ آسمانی بجلی بھی اتنی ہی خطرناک ہے۔ اتفاق سے بارش آ جائے بجلی بھی کوند رہی ہو تو پیڑ کے نیچے ہرگز پناہ نہ لیجیے۔ یہ بجلی اکثر درختوں پر گر جاتی ہے۔

پتھر کے زمانے کی بانسری

جرمنی کے ایک شہر (ہڈسن ہائم) کے کنارے جھیل ہے۔ پچھلے دنوں اس جھیل کے کناروں کی مرمت ہو رہی تھی۔ کھودتے وقت زمین میں سے پتھر کے زمانے کی سو" سے زیادہ نادر چیزیں ملیں۔ سب سے زیادہ نادر چیز تو ایک بانسری ہے۔ یہ کسی گھوڑے دار ہڈی سے بنائی گئی ہے۔ ۱۷٫۵ سینٹی میٹر لمبی ہے۔ اور اب تک اتنی اچھی حالت میں ہے کہ آپ اسے بجا سکتے ہیں۔

ایک اور نایاب چیز ہرن کے سینگ کی چھری ہے۔ یہ سب چیزیں تین ہزار سال یا کم سے کم دو ہزار سال پرانی ہیں۔
(اطلاعات جرمنی)

وفاقی جمہوریہ جرمنی کی مشہور بندرگاہ بریمن کے چڑیا گھر میں سائبیریا کی ایک شیرنی ہے۔ پچھلے دنوں اس نے تین بچے دیئے۔ شیرنی تو جلد ٹھیک ہو گئی مگر دو بچے جلد ہی مر گئے۔ تیسرے کا حال بھی کچھ اچھا نہ تھا۔ اس نے بد دل ہو کر اسے چھوڑ دیا۔ یہ دیکھ کر چڑیا گھر کے ڈائرکٹر کی بیوی کو اس بے چارے پر رحم آگیا اور اسے اپنی نگرانی میں لے لیا۔ خاص ترکیب سے تیار کیا ہوا دودھ بوتل سے سے پلا کر زندہ رکھا۔ بچے کی طاقت دن بدن بڑھتی گئی۔ دو ہفتے بعد اس کی آنکھیں معمول کے مطابق کھل گئیں۔ اور اب وہ اپنے پالنے والی سے اتنا ہل مل گیا ہے کہ ماں کی کمی کو محسوس نہیں کرتا۔ چڑیا گھر کے ڈائرکٹر اور ان کی بیوی دونوں ہندوستانی ہیں۔ (تصویر ٹائیٹل کے دوسرے صفحہ پر) (اطلاعات جرمنی)

دنیا کا سب سے بڑا پل

دنیا کا یہ سب سے بڑا اوپر اٹھ جانے والا پل اسپین کے جنوبی گوشے میں خلیج قاس پر بنا ہے۔ وفاقی جمہوریہ جرمنی کے مشہور صنعتی مرکز ڈورٹمنڈ کے ایک فولاد ساز کارخانے نے چند اسپینی کمپنیوں کی مدد سے یہ پل بنایا ہے۔ اس کے بنانے میں لگ بھگ آٹھ سو ٹن فولاد لگا ہے۔ جرمنی نے ۱۹۶۵ء میں کیوبک کے پاس دریائے ٹراد پر اٹھنے والا بڑا پل بنایا تھا۔ یہ اسی کا نمونہ ہے۔ اس کے ۷۸ میٹر لمبے پاٹ تین منٹ کے اندر کھل جاتے ہیں۔ اور بڑے بڑے سمندری جہاز بیچ کی نوّے میٹر لمبی کھلی راہ پر آسانی سے گذر جاتے ہیں۔ کھلنے کے بعد دونوں حصّوں کے پاٹوں کی اونچائی بیس منزلہ عمارت کے برابر ہوتی ہے۔ ویسے بچھے ہوئے پل کے نیچے سے ۴۳ میٹر تک اونچے جہاز آسانی سے گذر جاتے ہیں۔ یہ پل ابھی تھوڑے دنوں ہوئے آمدورفت کے لیے کھول دیا گیا ہے (تصویر سامنے کے صفحہ پر) (اطلاعات جرمنی)

ہاوڑے (کلکتہ) کے پاس دریائے ہگلی پر بھی ایسا ہی پل تھا۔ موجودہ پل اسی کو توڑ کر بنایا گیا ہے۔

بچوں کا پہلا انٹرنیشنل (بین الاقوامی) کیمپ

آندھرا پردیش میں ایک مقام ہے ناگر جونا ساگر یہاں اگلے دسمبر میں بچوں کا انٹرنیشنل دیہی کیمپ لگایا جائے گا۔ اس کا انتظام بچوں کی بہبود کی ہندوستانی کونسل (دی انڈین کونسل فار چائلڈ ویلفیر) کرے گی۔

یہی کونسل مدراس میں ایک سمینار بھی کرے گی۔ یہ ان بچوں کے سلسلے میں ہوگا جو ابھی اسکول جانے کی عمر کو نہیں پہنچے ہیں۔ کونسل کے چیرمین نے یہ بھی بتایا کہ بچوں کو مل جل کر رہنے (کمیونٹی لِوِنگ) کی تربیت دینے کا پروگرام بھی اس سال سے چلایا جائے گا۔ یہ قومی اور ریاستی سطح پر ہوگا۔ دہلی میں یہ ۱۴ نومبر سے ۱۹ نومبر تک چلایا جائے گا۔ (اسٹیٹس مین)

AUGUST 1970

Payam - i - Taleem

NEW DELHI-25.



[illegible] فائن پریس دہلی میں طبع ہوا

ئے میسور، مدھیہ پردیش، اڑیسہ، جموں کشمیر
و ہریانہ کے تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

پیامِ تعلیم
نئی دہلی

ستمبر ۱۹۷۰ء شمارہ ۹

ایڈیٹر
محمد حسین حسّان ندوی

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ اُردو بازار، جامع مسجد دہلی ٦
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ۔ بمبئی ۳
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ شمشاد مارکیٹ۔ علی گڑھ

فی پرچہ ٦۰ پیسے — سالانہ چندہ ٦ روپے

سید احمد وقی نے مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جمال پریس
چھپواکر جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵ سے شائع کیا

فہرست

بچوں کی دلچسپ کتابیں

ارشادات نبوی	۔/۴۰	حضرت امیر معاویہ رض	۱/۰	قاتل بادشاہ	۔/۵۰	سنہری چڑیا	۰۔
اسلامی مہینے	۔/۴۰	دین کی پہلی مسلمان عورت	۔/۵۰	کوہ زمرد کی شہزادی	۔/۲۵	کبڑا گھوڑا	۔۔
آداب المعاشرت	۔/۴۰	شیخ عبدالقادر جیلانی رح	۱/۲۵	گلفام کی انگوٹھی	۔/۳۰	مولانا ابوالکلام آزاد	۳۰
پیغمبر انسانیت	۔/۴۰	شہادت امام حسین رض	۔/۴۰	لالچ کی سزا	۔/۲۵	ننھی منی کہانیاں	۳۰
تلاوت قرآن کی فضیلت	۔/۳۰	شرعی پردہ	۔/۲۵	طلسمی دوربین	۔/۲۵	سرور دو عالم	۶۰
تہذیب کیا ہے	۱/۵۰	صدیق اعظم رض	۔/۹۰	لے پالک شہزادہ	۔/۲۵	حضرت صدیق اکبر رض	۲۵
جنت اور دوزخ	۱/۲۵	عورت کی جنت	۱/۰	منحوس محل	۔/۲۵	حضرت فاروق اعظم رض	۲۵
جانوروں کے حقوق	۔/۴۰	فاتحہ کا صحیح طریقہ	۱/۰	نیلم شہزادی	۔/۲۵	حضرت عثمان ذی النورین رض	۲۵
حضرت عائشہ صدیقہ	۱/۰	کیا پڑوسی ملک کی ترقی میں رکاوٹ ہے	۔/۳۰	نیلا گلاب	۔/۳۰	حضرت علی شیر خدا رض	۲۵
حضرت رابعہ بصری	۱/۲۵	مسلمان بہادر لڑکے	۔/۷۵	چاچا نہرو	۱/۰	حضرت امام حسین رض	۲۵
حضرت سکینہ بنت حسین رض	۔/۶۰	مومن کی زندگی قرآن کی روشنی میں	۱/۰	اصلاحی کہانیاں	۔/۳۰	حضرت امام حسن رض	۲۵
حیات سلمان فارسی رض	۔/۶۰	نجات المسلمین	۔/۴۰	بچوں کی اخلاقی کہانیاں	۔/۳۰	حضرت رابعہ بصری رح	۲۵
حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رض	۔/۶۵	انوکھا تحفہ	۔/۲۵	بچوں کا ادب	۱/۵۰	حضرت سلمان رض	۲۵
حضرت ابوبکر صدیق رض	۔/۲۰	ہندیا شہزادی	۔/۲۵	بہادر لڑکا	۔/۴۰	حضرت بلال رض	۔/۲۵
حضرت فاروق اعظم رض	۔/۴۰	بولتا پہاڑ	۔/۲۰	ٹیپو سلطان شہید	۔/۳۰	حضرت خدیجۃ الکبریٰ رض	۔/۲۵
حضرت عثمان غنی رض	۔/۵۰	پانچ بہادر دوست	۔/۲۵	جنگل کی دنیا	۔/۴۰	حضرت فاطمۃ الزہرا خاتون جنت رض	۔/۲۵
حضرت علی المرتضیٰ رض	۔/۵۰	جادوگر کی گڑیا	۔/۳۰	دلچسپ لطیفے	۔/۳۰	الجبر تا سورج	۔/۵۰
حضرت امام حسین رض	۔/۶۵	چوری کا خزانہ	۔/۲۵	دلچسپ کہانیاں	۔/۳۰	زمین کے تارے	۔/۵۰
حضرت عمر بن عبدالعزیز رح	۔/۷۵	زمرد پری	۔/۵۰	ڈاکٹر اقبال	۔/۳۰	چمکتے موتی	۔/۵۰
حضرت خدیجہ رض	۔/۴۰	سونے کی گائے	۔/۳۰	ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت	۔/۳۵	تین قلندر	۲/۰
حضرت ابو عبیدہ بن الجراح رض	۔/۴۰	صندلی شہزادی	۔/۲۵	ریل کا سفر	۔/۲۵		

ملنے کا پتہ

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ، نزد جے جے ہسپتال، بمبئی ۳ بی-آر

بچوں سے باتیں



پچھلے دنوں مکتبہ جامعہ کے انتظام میں کچھ
..تی ہے ہمارے محترم جنرل منیجر جناب غلام ربانی
..حب بہت عرصے تک اپنے اچھے انتظام
..د چلاتے رہے، بہت خوش اسلوبی سے چلاتے
..ں کے زمانے میں مکتبہ نے بہت ترقی کی۔
..ہے کہ مکتبہ اب ان کی رہنمائی سے محروم ہوگیا۔

آپ کے پیام تعلیم کو دوبارہ جاری کرنے
..تاباں صاحب کی خواہش کو بڑا دخل ہے۔
..ڑی بات یہ کہ انھوں نے کارکنوں کا ہر
..لہ بڑھایا۔ انھیں اچھے اچھے مشورے دیے۔
..رے بہت سے اچھے اچھے لکھنے والوں نے
..ں طرف توجہ کی۔ پیام تعلیم پر خرچ کے معاملے
..لی فراخ دلی سے کام لیا۔ پیام تعلیم سے
..یں دلچسپی ہے اور اس کی ترقی سے جو

خوشی انھیں ہوگی۔ شاید ہی کسی کو ہو۔ آپ کے پیام تعلیم کی ان شاء اللہ وہ ہمیشہ مدد کرتے رہیں گے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی گولڈن جوبلی کی تاریخیں مقرر ہوگئی ہیں ۲۸ راکتوبر تا یکم نومبر کو منائی جائے گی۔ ہم نے انھی صفحوں میں کئی بار جوبلی نمبر نکالنے کا خیال ظاہر کیا تھا پر اب ہمارے لیے پریشانی کی بات یہ ہے کہ وقت بہت کم رہ گیا ہے۔ پرچے کو ٹھیک وقت پر نکالنا بھی ضروری ہے۔ اس مجبوری کی وجہ سے یہ طے کیا گیا ہے کہ اس تھوڑی سی مدت میں جتنے بھی مضمون مل جائیں۔ جوبلی نمبر میں شائع کردیے جائیں باقی سالنامے میں شائع کیے جائیں۔ سالنامے میں ہی گولڈن جوبلی کے دلچسپ حالات شائع ہوں۔

ویسے جوبلی نمبر کے لیے مضمون آنے شروع

ہو رہے ہیں ہمارے پرانے جامعی اور محترم بھائی سید ٹونکی صاحب نے پہل فرمائی ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی قدوائی جامعی، برادرم شمس الرحمٰن محسنی۔ مرزا سلمان بیگ، مجیب احمد خاں صاحب، مولٰینا اعتبار ندوی جناب لطیف اعظمی۔ جناب جمیل قریشی، جناب عبدالحق خاں صاحب۔ جناب مولانا حفظ الدین صاحب، اور دوسرے حضرات مضمون لکھ رہے ہیں۔ امید تو ہے کہ یہ مضمون ہمیں وقت پر مل جائیں گے۔

جوبلی نمبر کے علاوہ ہمیں سالنامہ بھی نکالنا ہے۔ اس کے لیے ابھی سے تیاری شروع ہو گئی ہے۔ اپنے نئے پرانے مضمون نگاروں اور شاعروں کو خط لکھے جا رہے ہیں۔ دعا کیجیے کہ یہ دونوں نمبر کامیابی سے نکال سکیں۔

محترمہ آصفہ مجیب کا مضمون "جب اور اب" پچھلے مہینے ختم ہو گیا۔ پیامی بچوں اور بچیوں نے اسے اتنا پسند کیا اتنا پسند کیا کہ اسے کتابی صورت میں چھاپنے کی فرمائشیں برابر آ رہی ہیں۔ ہمارا بھی یہی ارادہ تھا۔ آپ کے خطوں سے اس ارادے کو تقویت ملی۔ پر ابھی نظرثانی کرنا باقی ہے۔ ضرورت ہوئی تو کوئی دل چسپ چیز بڑھانا ہے۔ اس لیے ابھی ذرا وقت لگے گا۔

آپ کو یاد ہوگا۔ پچھلے سال محترمہ آصفہ مجیب اپنے بچے محمد ابن سلمہ کے پاس انقرہ تشریف لے گئی تھیں اور اپنے سفر کا دل چسپ حال ہمیں مرحمت فرمایا تھا۔ یہ دو قسطوں میں چھپا تھا اور آپ نے بہت پسند کیا تھا۔

خوش قسمتی سے اس سال بھی آپ کو انقرہ جانے کا موقع ملا۔ اب کے وہاں ٹھہرنے کا وہاں کے لوگوں سے ملنے جلنے کا۔ اِدھر اُدھر گھومنے کا زیادہ وقت ملا۔ انقرہ سے لوٹتے وقت کچھ دنوں ایران میں بھی ٹھہریں۔ بہت کچھ دیکھا بھالا۔

یہ پیامِ تعلیم کی خوش قسمتی ہے کہ اس تمام سفر میں محترمہ آپ کو نہ بھولیں۔ آپ کے پیامِ تعلیم کو نہ بھولیں۔ دل چسپ باتوں کو لکھتی رہیں اور واپسی پر یہ تحفہ ہمیں مرحمت فرمایا۔ یہ مضمون پہلے مضمون سے بھی دل چسپ ہے۔ کافی لمبا ہے۔ شاید تین چار قسطوں میں آئے گا۔ اس پرچے میں پہلی قسط پڑھیے مضمون کا اگلا حصّہ غیر معمولی طور پر مزے دار ہے۔ یہ اکتوبر میں چھپے گا۔

اس پرچے میں اس مضمون کے علاوہ اور بھی اچھے مضمون پڑھیے گا۔ مرزا سلمان کا مضمون کتنا مزے دار ہے۔ ایک خشک اور معلوماتی چیز کو کس انوکھے انداز میں لکھا ہے۔ سلمان سلمہ میں لکھنے کی بڑی صلاحیت ہے۔ انجینیرنگ کالج علی گڑھ میں ریڈر ہیں۔ بہت مصروف رہتے ہیں۔ لکھنے کے لیے بڑی مشکل سے وقت نکال پاتے ہیں۔

باقی صفحہ ۱۶ پر دیکھیے

بشری

برسات

آیا ابرِ رحمت آیا　　لے کر خیر و برکت آیا
پھلوں میں امرت بھرنے آیا　　سب کو تازہ کرنے آیا
غنچے چٹکے، گلشن مہکا　　باغ میں ہر جا سبزہ لہکا
رنگ برنگے پھول کھلے ہیں　　تازہ تازہ نئے نئے ہیں
باغ میں چڑیاں بول رہی ہیں　　حمد کے موتی رول رہی ہیں
سوکھے کھیت اب ہرے ہوئے ہیں　　ندی نالے بھرے ہوئے ہیں
دل میں دوڑی لہر خوشی کی　　اور کھلی ہیں باچھیں کیسی
باغ میں بچے جھولا جھولیں　　ہر غم کو، ہر درد کو بھولیں
کلفت سب کی دور ہوئی ہے　　خلقت کیا مسرور ہوئی ہے

سن لی رب نے آج ہماری
اس نے رکھ لی لاج ہماری

جھاڑو

اللہ سلامت رکھے ہماری موٹی اماں کو۔

ان کے ہوتے محلے میں نہ کسی کو اخبار کی ضرورت، نہ ریڈیو کی حاجت۔ چلتا پھرتا ریڈیو ہیں۔ محلے کے تمام بڑے ان کو بھابھی اور چھوٹے "موٹی اماں" کہتے ہیں۔ اور مانتے ہیں۔ اور وہ خود ہر عورت کو آپا اور ہر مرد کو بھائی اور چھوٹے تو سب ان کے بھانجے، بھانجی اور بھتیجے بھتیجی ہیں ہی۔

گھر پر میاں اور بیوی لے دے کر بس دو نفر ہیں۔ موٹی اماں منہ اندھیرے اٹھتی ہیں۔ سویرے سویرے کھانے پکانے سے فرصت پا جاتی ہیں۔ اور پھر دوپہر تک اپنا بھاری بھرکم جسم لیے، خود آگے آگے اور سر سے اٹکا ہوا سفید برقعہ پیچھے، ہانپتی کانپتی اس گھر سے اس گھر اور اس گھر سے اس گھر۔

جہاں جاتی ہیں کیا مقامی اور کیا بین الاقوامی ہر طرح کی خبروں کے انبار لگا دیتی ہیں۔ تازہ بہ تازہ، نو بہ نو۔ فلاں کے یہاں لڑکا ہوا ہے۔ فلاں کی بہو آج میکے چلی گئی ہے، اس کو نوکری مل گئی۔ اس کی طبیعت خراب ہے . . . "

اور یہی نہیں ماشاءاللہ بین الاقوامی سیاست پر خاصی نظر رکھتی ہیں۔ "ارے آپا! میں کہوں یہ دنیا نامراد کہاں جا رہی ہے "۔

کسی نے پوچھا "کہو بھابھی کیا بات ہو گئی"؟ تو مفصل خبر بیان ہوتی ہے :

"ارے آپا۔ ہندوستان میں دیکھو عورت کی بکومت (حکومت)، انگلستان میں دیکھو تو عورت کا سکہ۔ اللہ مارے یہودیوں کی سردار تو ایک کٹنی ہی ہے اور اب سنا ہے کہ لنکا میں بھی عورت کا راج ہو گیا ہے۔ ایسا لگے ہے کہ دنیا کے سارے مردوں کی عقل تو چرنے چلی گئی ہے . . . . . . " یہ اور ایسی نہ جانے کیا کیا، جب آتی ہیں اور جب تک چلی نہیں جاتیں کہتی ہی رہتی ہیں۔ ان کے منہ میں جیسے بولنے کی مشین فٹ ہے۔

پر ابھی دو چار دن کا قصہ ہے کہ ہمارے ہاں آئیں اور سلام دعا کے بعد ایسی چپ چاپ بیٹھ

یسے کوئی بڑا صدمہ پہنچ گیا ہو۔ بس منہ ہی منہ بدبدائے جا رہی تھیں۔ موٹی اماں اور ! گھر کے بچوں کو ایسا لگا جیسے سورج چھپ ہو۔ ڈیٹو نے حسان کو ٹہوکا دیا: "ابے یار اماں کو کیا ہو گیا؟" دونوں نے حیرت سے ے کو دیکھا۔ ضبط نے یارانہ کیا تو ڈیٹو اچک ماں کے منہ کے پاس پہنچے اور گھور گھور کر ب وہ بول پڑیں "اے بیٹا! ایسے کیا دیکھ "

یٹو میاں نہایت سنجیدگی سے بولے "موٹی آپ کی زبان دیکھوں" بڑی بی جھنجھلا کر ل پرے ہٹ لڑکے یہاں جان پر بن رہی آیا ہے مذاق کرنے"

ممی کو جواب تک انگیٹھی پر رکھے دودھ کی ہمتن گوش" متوجہ تھیں، معاملے کی سنجیدگی س ہوا، پتیلی اتار کر رکھتے ہوئے آکر موٹی اس بیٹھ گئیں اور بولیں "کیوں بھابھی! بات ہو گئی، کا ہے کو زندگی سے بیزار ہو رہی ے ٹھنڈی سانس لے کر موٹی اماں یوں گویا ے آپا! کیا کہوں۔ سویرے سے توبہ توبہ ہی ں" اور پھر نہایت الحاح وزاری سے طرف ہاتھ اٹھا کر دعا میں مشغول ہو گئیں۔ ے مولا ہمارے گناہوں کو بخش دیجیو! ہمیں

امی نے ان کو پھر جھنجھوڑا۔ "بھابھی! آخر بات کیا ہو گئی؟" موٹی اماں بولیں۔ "آپا! آج سویرے اٹھتے ہی آسمان کی طرف جو نظر گئی تو وہاں موئی جھاڑو نظر آ گئی۔ نہ ملنے اللہ ماری کون سی آفت لے کر آئی ہے!"

ڈیٹو اور حسان کو ذرا تجسس ہوا کہ بھلا آسمان پر کون سی جھاڑو نظر آ سکتی ہے۔ تو موٹی اماں نے سمجھایا۔ "اے بیٹا! ایک تارا ہووے ہے جھاڑو کی شکل کا۔ کبھی کبھی برسوں میں نظر آوے ہے اور موا جب دکھتا (دکھائی دیتا) ہے، کوئی آفت ضرور آوے ہے۔"

عمران بھائی برابر کے کمرے میں بیٹھے اپنی کتابوں میں غرق تھے۔ ان کے کان میں جو یہ الفاظ پڑے تو کود کر باہر آئے۔ "موٹی اماں موٹی اماں! دم دار ستارہ؟"

"ہاں ہاں بیٹا! پڑھے لکھے دم دار ستارہ کہیں (کہتے) ہیں۔ ہم جاہل تو جھاڑو پھیرے کو جھاڑو ہی کہیں ہیں۔"

سیاروں اور ستاروں کے بارے میں عمران بھائی کی معلومات اچھی خاصی ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ ان کے ابتدائی کے استاد، خدا انھیں غریق رحمت کرے، عتیق صاحب کا دلایا ہوا شوق ہے۔ مرحوم نقشے بنا بنا کر اپنے شاگردوں کو سیاروں کے بارے میں بتایا کرتے تھے۔ ماڈل بنا بنا کر سمجھایا کرتے تھے اور سال میں جب ایک بار کھلی ہوا کا مدرسہ ہوتا

کرتے تھے۔

موٹی اماں کی یہ بے سر پیر کی باتیں بھلا ان کو کیا جاتیں قہقہہ لگا کر بولے : "موٹی اماں! پڑھے لکھے اور جاہل کی بات نہیں۔ رواج کی بات ہے۔ اور جاپان میں تو اسے جھاڑو ہی کہتے ہیں۔ کیوں کہ اس کی شکل جھاڑو جیسی ہوتی ہے۔ انگریزی میں سے "کامیٹ" کہتے ہیں جو یونانی کے "زلفوں" کے ہم معنی لفظ سے بنا ہے۔ کیوں کہ اس کی شکل ایسی بھی لگتی ہے جیسے کوئی بال کھولے کھڑا ہو اور بال ہوا سے اڑ رہے ہوں۔"

موٹی اماں چھوٹا سا مخصوص قہقہہ لگا کر بولیں۔ "اے بڑے ہٹ لڑکے۔ اب تو بوڑھی ڈھنڈو کو انگریزی پڑھاوے گا۔ کچھ بھی کہتے ہوں ہم تو یہ جانیں (جانتے) ہیں کہ کم بخت ہوتا منحوس ہے۔"

عمران بھائی کب اتنی آسانی سے پنڈ چھوڑنے والے تھے۔ بولے : "موٹی اماں یہ بھی سب لوگوں کا وہم ہے۔ پرانے زمانے میں جب جب یہ تارا دکھائی دیتا، لوگ کوئی نہ کوئی خاص واقعہ اس سے منسوب کر دیتے۔ ہوتے ہوتے یہ بے چارا منحوس ہی مشہور ہو گیا۔ اس سے اور کچھ نقصان ہوا ہو یا فائدہ، پر اتنا ضرور ہوا کہ ہیئت کے ماہرین کو اس کی تاریخ معلوم کرنے میں بڑی مدد ملی۔"

موٹی اماں نے تو ایک زور کی "اونہہ" کی گویا یہ سب کسی نادان کی بکواس ہو اور اسی سے کسی اور گفتگو میں مشغول ہو گئیں پر حسان اور ڈبّو پیچھے جھاڑ کر عمران بھائی کے پیچھے پڑ گئے۔ "عمران بھائی آخر یہ ہوتا کیا ہے؟ کیسا ہوتا ہے؟ کتنے دنوں میں کیوں نکلتا ہے؟......" اور ایسے ایسے سوالوں کی بوچھار کر دی۔ عمران بھائی نے کہا : "بھئی دیکھو کل صبح صبح سو کر اٹھو۔ دم دار ستارہ دیکھیں گے بھی اور اس کے بارے میں بتائیں گے بھی۔"

جیسے تیسے حسان اور ڈبّو نے رات کی، اور پھر الارم لگا کر سو گئے۔ صبح چار بجے گھڑی نے صدا دی۔ حسان ذرا نیند کے کچے ہیں فوراً اٹھ کر بیٹھ گئے۔ ڈبّو کو جھنجھوڑا، عمران بھائی کو اٹھایا۔ آسمان پر دم دار ستارے کی تلاش شروع ہو گئی۔ "وہ رہا وہ رہا!" ڈبّو میاں نے نعرہ لگایا۔ پورب کی طرف موٹی اماں کی "جھاڑو پھری جھاڑو" موجود تھی۔

ڈبّو تھوڑی دیر تو اسے غور سے دیکھتے رہے۔ پھر حسان اور ڈبّو نے عمران بھائی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو وہ بتانے لگے۔

"ہمارے نظامِ شمسی میں ایسے دم دار تارے ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں موجود ہیں جو سب سورج کے گرد چکر لگاتے رہتے ہیں۔ چکر پورا کرنے کی یہ میعاد مختلف تاروں کے لیے مختلف ہوتی ہے۔ اب تک کی معلومات اور حساب کے مطابق کم سے کم یہ میعاد تین سال چار مہینے اور زیادہ سے زیادہ لاکھوں برس ہوتی ہے۔ جب کبھی چکر کاٹتے ہوئے یہ ہماری زمین کے قریب آ جاتے ہیں تو ہمیں نظر آنے لگتے ہیں اور ایسا بس کبھی کبھی ہوتا ہے۔"

ذرا کچھ سوچ کر بولے ۔" آج کل یہ تارہ
ے قریب آگیا ہے امریکہ والوں کو چاہیئے کہ
، کی دم پر فوراً اتر جائیں ۔"
میاں ایسا سوچنا بھی مت ۔ اس کی دُم
، ہوتی ہے ۔ وہ دیکھو وہ جو سب سے
ماڑو کی مٹھیا کی طرح وہ ہے اصل تارا ۔
سا بڑی سی چٹان ہوگی یا چھوٹی چھوٹی
ں ہوں گی ۔ اور وہ بھی ہماری زمین یا
ن سے بہت ہلکی ۔"
چٹانوں میں مسلسل دھماکے ہوتے رہتے
ہ سے اس میں سے گیسوں کے فوارے
، ساتھ ہی ساتھ چٹانوں کے چھوٹے
ی اُڑتے رہتے ہیں ۔ بھاگتے ہوئے تارے
ے گیس اسی طرح دم کی شکل اختیار کرلیتی
ے پیچھے سے نکلتا ہوا دھواں ۔ ۔"
دھما کا بہت زور کا ہوتا ہے کوئی بہت
ذرا غور سے دیکھو دم چھوٹی بڑی ہوتی

اور حسان نے ذرا غور سے دیکھا اور پھر
ٹھے ۔" ہاں ہاں بالکل ایسا ہی ہے ۔"
ذراً ہی حسان کے ذہن میں ایک سوال
پوچھا ۔" آخر اتنی دور سے پتہ کیسے چلا
ہیں ہے ؟"
بھائی نے بتایا ۔" ایسا ہے کہ ایک ۔۔

دفعہ ۱۷۰۷ء اور پھر ۱۸۸۶ء میں ایک دم دار تارے کی دم کی لپیٹ میں زحل اور اس کے چاند آگئے تھے ۔ لیکن ایسا ہونے پر بھی وہ سب اپنی اپنی جگہ پر رہے ۔ اگر دم ٹھوس ہوتی تو خوب زور کی ٹکر ہوتی اور سارا نظام درہم برہم ہوگیا ہوتا ۔ اور ایسا بھی اکثر دیکھا گیا ہے کہ دم کی آڑ میں اگر کوئی روشن سا تارہ آجائے تو وہ صاف دکھائی دیتا رہتا ہے ۔ ان سب باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ دم ٹھوس نہیں ہے بلکہ گیس کی ہوتی ہے ۔"

اب ڈیوڈ نے پوچھا : اچھا عمران بھائی ! اگر دھماکوں کے ساتھ اصل تارے کے ریزے اڑتے رہتے ہیں تو کچھ دنوں میں تو بس دم ہی دم رہ جائے گی اصل تارا تو ختم ہو جائے گا ؟"

عمران بھائی نے سر ہلاتے ہوئے ڈیوڈ کو بتایا کہ ان کا خیال بالکل صحیح ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ کچھ عرصے میں تو یہ دم بھی غائب ہو جاتی ہے ۔ ہوتا یوں ہے کہ جب کسی کامیٹ کی دم کسی اور دوسرے سیارے یا سورج کے قریب سے گزرتی ہے تو اس کے چھوٹے چھوٹے ریزے اور ہلکی ہلکی گیس اس کی طرف کھنچ جاتی ہے اور کامیٹ دم کٹا ہو جاتا ہے ۔ اس طرح دھیرے دھیرے ہر کامیٹ دم کٹا بنتا رہتا ہے اور ممکن ہے یہ دم کٹی رہے ۔ اس صورت میں کچھ عرصے بعد کامیٹ غائب ہی ہو جاتا ہے ۔ کئی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ کوئی کامیٹ ایک دفعہ دکھائی دیا اور پھر چند برسوں بعد اس کا

ساحر بھوپالی

قوّالی

باندھ کر سر سے نکلو کفن ساتھیو
وقت پھر آپڑا ہے کٹھن ساتھیو
کردو اس پر فدا جان تن ساتھیو
دیکھو اُجڑے نہ اپنا وطن ساتھیو

پھر اٹھایا ہے فرقہ پرستی نے سر
پھر فضا ہند کی آج ہے پُر خطر
اس کی ہستی مٹا دو کہ مٹ جائے ڈر
پھر خزاں کی ہے زد میں چمن ساتھیو

دیکھو انسان بنو اب خدا کے لیے
سینہ کردو سپر ہر جفا کے لیے
جان کر دو فدا ایکتا کے لیے
ہے یہی قوم کا بانکپن ساتھیو

ہیں فسادی یہ جتنے بھی عیار ہیں
ان سے ہشیار رہنا یہ مکار ہیں
یہ تو بھارت کے دشمن ہیں، غدار ہیں
ان کو پہنا دو اپنا کفن ساتھیو

ہاتھ میں ہاتھ ہم اپنا ڈالے رہیں
اور قدم سے قدم کو ملا کر چلیں
حق کی خاطر جئیں، حق کی خاطر مریں
دل میں سب کے ہو بس یہ لگن ساتھیو

بھائی پر بھائی کا ہاتھ اٹھنے نہ دو
ایکتا کی بہاروں کو لٹنے نہ دو
دم تمناؤں کا دل میں گھٹنے نہ دو
یاد رکھو وفا کا چلن ساتھیو

کوئی پیاری سی دھن چھیڑیں پھر ساز پر
جس سے نفرت کی دنیا ہو زیر و زبر
گائیں ساحر کے گیتوں کو سب جھوم کر
پھر سجے پیار کی انجمن ساتھیو

ترجمہ آصفہ مجیب

انقرہ

بارسال جون میں انقرہ گئی تو کچھ وہاں کا،
مین میاں کے بچوّں : رخسانہ اور نسیم ارسلان
پ کو سنایا تھا۔ یاد ہوگا نا!!
س سال پھر خوش نصیبی سے وہاں جانے کا
یا۔ وہ ایسے کہ امریکہ کی ایشیائی سوسائٹی
ماحب کو اپریل میں غالب کی سو سالہ برسی کے
لب اور ہندوستانی مسلمانوں پر تقریریں کرنے
دی۔ وہاں کی کئی یونیورسٹیوں میں جلسوں،
، شعر خوانی وغیرہ کا پروگرام بنایا گیا تھا۔
باہر سے لوگ بلائے گئے تھے۔

اب میرے انقرہ جانے کا سوال درمیان میں
ب صاحب نے کہا: یہ ہو سکتا ہے کہ مجھے
اکر وہ امریکہ جائیں ایک مہینہ رہ کر انقرہ
ں اور چھٹیوں کے کچھ دن وہاں گذاریں۔ اندھا
، دو آنکھیں۔ میں تو سب کو دیکھنے کے تصوّر ہی
می۔ تجویز سن کر کہا۔ "نیکی اور پوچھ پوچھ" ضرور
" طبیعت کچھ اچھی نہیں تھی۔ تھوڑے دن میں
گئی۔

اِدھر محمد امین اور بچوّں کو یہ خبر ملی کہ ہم آ رہے
ہیں۔ پھر کیا تھا۔ دن رات وہاں یہی تذکرے ہوتے۔
دونوں بچوں کو دادا اور دادی کی رٹ لگ گئی۔ ہماری
الٹی سیدھی تصویریں بنانا شروع کیں۔ وہاں سے جو
خط آتے ان میں کبھی ہمارا نقشہ کھنچا ہوتا۔ کیا صورتیں
ہوتیں سبحان اللہ! سر عجیب بے ہنگم سا۔ پیر کہیں
چلے جا رہے ہیں۔ ہاتھوں کی پانچوں انگلیاں گویا شمعدان
میں شمعیں جل رہی ہیں دھڑ مٹکے نما۔ صرف تپائی کی کمی
تھی۔ آنکھیں گول گول۔ دو نقطے بیچ میں بہت روشن۔
کان کسی طرف کو لٹکے ہوئے۔ جیسے پنکھے ہوں۔ منہ کا نشان
کیا شان!۔ اور ناک؟ جسے بقول سید جعفری صاحب
(شاعر) کے خطرناک کہہ سکتے ہیں۔ آپ یہ تصویریں ایبس
ٹریکٹ آرٹ میں شمار کر لیجئے۔
مگر بٹیا کی بنائی ہوئی کچھ تصویریں وہاں جا کر
میں نے دیکھیں ان سے ان میں ان کی صلاحیت کا پتہ
چلتا ہے۔ رنگوں کی آمیزش (ملان) بہت اچھی ہے۔
لائنیں خوب ہیں جا بہ جا دیواروں اور ان کے کمرے کو
زینت بنا رہی ہیں۔

دس اپریل کو رات ڈھلے ہیں امریکن جہاز
سے چلے۔ صبح کو پہاڑوں کا منظر بہت دل کش تھا معلوم
ہوتا تھا کہ چاندی کا گہنا پہنے ہیں کہیں برف کی
لکیریں بس ہاروں کی طرح لپٹی ہوئی میرے دامن تک
آرہی ہیں۔

دہلی میں گرمی پڑنے لگی تھی اور انقرہ میں
خوب جاڑا تھا ابھی تک ہم پہنچے تو ابھی اسباب ہی کے
پاس کھڑے تھے وہاں باہر سے کسی کو آنے کی اجازت
نہیں تھی، مگر بٹیا اور بھیا دروازے کی درار سے جھانک
کر نکل پڑے اور دوڑ کر ہمارے پاس آگئے۔

سب سے پہلے بھیا نے بھوؤں پر انگلی رکھ کر
اپنی چوٹ دکھائی جس پر پٹی چپکی ہوئی تھی۔ بھیا کی
شکایت کی کہ ٹرائیکل کو زور سے دھکا دیا جو دروازے
سے ٹکرائی۔ بہت خون نکلا۔ بھیا نے اپنے جرم کا
اقبال کیا۔

مکان وہی ہے، مالک مکان اور ان کی بیگم
صاحبہ انہماک سے باغبانی میں مصروف نظر آئیں۔
بہار کی آمد آمد تھی۔ برف باری میں پھول پتیاں گھاس
سب ختم ہو جاتی ہیں نئے سرے سے اس زمانہ میں سب
چیزیں لگانا پڑتی ہیں۔ پھولوں اور ترکاریوں کے لیے
گڑائی وغیرہ کر کے زمین تیار کر رہی تھیں، اور کیاریاں
بنا رہی تھیں۔ سیب اور ناسپاتی کے پیڑوں میں
نئے نئے شگوفے پھوٹ رہے تھے۔ لان میں نئی گھاس
لگی تھی۔ آج کل پانی برستا تو سردی اور چمکتی اور کرنوں

ہیں ہیٹنگ کی جاتی۔

رات کو بجلی کی روشنی میں انقرہ پر عجیب بہار
آجاتی۔ جیسے دلھن بنی سنوری بیٹھی ہو۔

اب کی یہ اچھا ہوا کہ بھیا بھی اردو بولنے لگا
اور تھوڑی بہت انگریزی بھی اس نے سیکھ لی۔ مزے
مزے کی باتیں کرتا۔ بٹیا نے بہت ترقی کی۔ ترکی اچھی
بولنے لگی ایلن اور سوزانہ نے کہا کہ یہ ہم سے اچھی ترکی
بولتی ہے۔ پہلے کی طرح مالکہ مکان کی بڑی چہیتی ہیں۔
ان سے اور ان کے خاندان سے گھلی ملی رہتی ہیں۔ ان کے
ساتھ باغبانی کرتی ہیں۔ گڑائی کرتی ہیں۔ مٹی ڈھوتی
ہیں۔ مٹی ڈھونے کی چھوٹی سی گاڑی کدال وغیرہ بھی
ان کے پاس ہے۔ ساتھ ساتھ ترکی میں فراٹے بھرتی
جاتی ہیں۔ مالکہ مکان کبھی ہنستی ہیں، کبھی سر ہلا کر کچھ کہتی
ہیں یہ باتیں کرتی ہیں۔ کبھی ان کے پاس لان میں بیٹھ کر
کاغذ اور کلر بکس اور رنگین پنسلوں سے تصویریں بناتی
ہیں اور تصویروں میں رنگ بھرتی ہیں۔

دونوں بچے ترکی جرمن انگریزی اور اردو
موقع موقع سے خوب چھانٹتے ہیں۔ ۱۵ اپریل کو مجیب
صاحب امریکہ سدھارے۔ نیویارک سے ان کا خط آیا تو
اس کے خوشنما ٹکٹ دیکھ کر بھیا کو ٹکٹ لینے کی فکر
پڑی۔ میں نے ٹکٹ چھڑا کر ان کو دے دیے۔ کچھ دیر
بعد بھیا صاحب میرے کمرے میں تشریف لائے اور
ادھر ادھر دیکھ کر پوچھا کہ دادا جان کہاں ہیں؟" وہ
شاید سمجھے کہ خط آیا ہے تو اب دادا جان بھی آگئے

ے ۔ میں نے کہا " امریکہ میں ہیں " سر ہلا کر بولے
ہلے گئے ہیں تھوڑے دن میں ہوائی جہاز (ہوائی
بیٹھ کر آ جائیں گے ہم تم چل کرے آئیں گے،
ں کو ۔ دیکھو ایسے آئیں گے ہوائی جہاز سے " یہ
انگلیاں سکوڑ کر ہاتھ اوپر نیچے ہوا میں لہرایا
زور سے " سوں " کی آواز نکالی ۔ اپنے خیال میں
ر رہے تھے ۔

اکثر یہی تماشہ کرتا ۔ ہوائی جہاز سے اس کو
دلچسپی ہے ۔ اب جہاز اور دادا جان میں ایک
ستہ پیدا ہو گیا تھا ۔ جہاز کی آواز سنی اور باہر
" دادا جان آ گئے " کبھی کہتے آئے تھے پھر
۔ یہاں تک کہ کسی بات پر بگڑ رہے ہیں رو دھو
ں جہاں کہا " اچھا بھیا ہاں سنو دادا جان آئیں
ائی جہاز سے ہم تم ابو امی بیٹیا سب لینے چلیں گے "
ب بھول کر خوش ہو جاتے ۔ اپنے خیال میں مگن
سے کہیں پہنچ جاتے ۔

اسے بہلانے کی یہ ترکیب اچھی میرے ہاتھ
ئی بار آزمایا بہت کامیاب رہی ۔ کیوں کہ بعض
ں باپ گھر میں نہ ہوتے تو خوش رکھنے بہلانے کی
ری مجھ ہی پر آ جاتی ۔ صبح کو دونوں نرسری جاتے
ے واپس آتے ۔ مگر بھیا کا جانا گنڈے دار تھا ۔
میں ناغہ ۔ میرے پاس گھسا رہتا " ہم تمہارے
ہیں گے " پھر نزلہ ہوا تو روک لیا گیا ۔

ایک دن دونوں نے جان غضب میں ڈالی

میرے پیچھے پڑے کہ امی کی الماری کھول کر مٹھائی نکالو اب میں بڑی حیران کسی کی غیر موجوگی میں اس کی کوئی چیز کھولنا ٹٹولنا کچھ نکالنا ٹھیک نہیں ہے ۔ پھر یہ بھی نہیں معلوم کہ کیسی مٹھائی ہے انہیں دینا چاہیئے یا نہیں ۔ بہت ٹالنا چاہا سمجھایا بجھایا مگر " مرغ کی وہی ایک ٹانگ " دونوں نے خوب چیخ چیخ کر رونا شروع کیا ۔

آخر تھک ہار کر ان کے ساتھ کمرے میں آئی ۔ تہہ در تہہ بر جان در وش الماری کھولی ۔ بچوں کے کمرے میں بڑی سی الماری بنی ہے ۔ کنجی کھٹکے میں لگی ہوئی ہے ۔ اوپر کے تختوں پر کپڑے رکھے تھے ۔ نیچے کچھ ڈبے سے تھے ان میں الم غلم بھرا تھا ۔ انھی میں سے ایک میں جھٹ بٹیا نے ہاتھ ڈالا اور عمر عیار کی زنبیل کی طرح ایک جھولے سے مٹھائی کی لڑی نکلنا شروع ہوئی ۔ بہت لمبی زنجیر تھی ۔ لیمن ڈراپ کی رنگ برنگی ٹکیاں ۔ خوش رنگ کاغذوں میں لپٹی ہوئی نکلیں ۔ میں نے قینچی سے ایک ایک کاٹ دی ۔ مگر ابھی بس کہاں ہوئی ، جس رنگ کی ایک کے پاس ہے ۔ ویسی ہی دوسرے کو بھی چاہیئے ۔

دیر تک یہ سلسلہ چلتا رہا ۔ اور جھگڑا کھڑا ہو گیا ۔ میں نے ڈانٹ ڈپٹ کر کسی نہ کسی طرح لڑائی چھڑائی اور کنجی کھینچ الماری میں بند کر دی ۔ بعد کو جب سوزانہ کو یہ داستان سنائی تو وہ ہنس کر بولیں ۔ " ارے امی جان انھیں کسی چیز کا پتہ لگ جائے تو بھی

کرتے ہیں۔"

پیچھے دوبارہ پھر اسی طرح کا ایک واقعہ پیش آیا۔ ہوا یہ کہ امین نے بھیّا کا ایک نئی قسم کا کھلونا (جو بھیّا کو بہت پسند ہے) جو مجیب صاحب امریکہ سے لائے تھے۔ یہ کہہ کر الماری میں چھپا دیا کہ "ابھی نہیں دیں گے ذرا یہ اور بڑا ہو جائے تب دینا چاہیئے۔" بھیّا کو کچھ گن سن مل گئی کسی کو اس کا پتہ نہیں تھا کہ کہاں رکھا ہے مگر بھیّا کو پتہ تھا۔ شاید رکھتے دیکھ لیا ہو یا الماری میں جھلک دیکھ پائی۔

گھر میں ہم دونوں تھے۔ بس میرے سر ہوا کہ "امّی کی الماری میں ابّو نے ہمارا موٹر رکھا ہے نکال کر دو۔" پتہ نشان سب بتایا۔ میں نے تو بہت ٹلا مچائی "واہ وا بھیا بھلا میں کیسے نکالوں۔ ابّو نے رکھا ہے وہی نکالیں گے بھیا کو چلا کر دکھائیں گے آنے دو۔" مگر کون سنتا ہے۔ الماری کے پاس کھڑا ہو گیا حسرت سے اوپر دیکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کیا۔ میرا جی دُکھا۔ کنجی حسب دستور سامنے لگی تھی پٹ کھولا۔ اوپر کے تختے میں کونے پر موٹر کی ذرا سی جھلک دکھائی دی تھی۔ اتار کر پکڑا دیا۔ بہت خوش ہوا، اطمینان کی سانس لی۔ بڑے شوق سے دیکھنے لگا۔ پھر میں نے سمجھایا: "اچھا اب لاؤ رکھ دیں تم سے ٹوٹ جائے گا اچھا اچھا موٹر ابّو آکر چلائیں گے۔" بات سمجھ میں آ گئی خوشی بھی پوری ہو گئی تھی۔ اپنی ملکیت ہاتھ میں آ گئی تھی۔ خوشی سے دے دیا۔ "ہاں ہاں رکھ دو ابّو چلائیں گے۔"

ایک دن جب پھر وہی دھن سوار ہوئی موٹر لاؤ تو میں نے یہ چال چلی کہ چکمہ دے کر اسے ذرا دیر کے لیے ہٹا دیا اور الماری کی کنجی چھپا دی۔ جب دونوں آتے کھولنے تو کنجی ندارد

میں نے کہا: "لو بھیّا۔ بھلا کیسے کھولوں کنجی نہیں ہے۔" بے چارا چپ ہو گیا کیا کرتا۔ یہی تماشے ہوا کرتے۔ صبح صبح آنکھ کھلتے ہی دونوں میرے پاس آ جاتے اور دلچسپ باتیں اور حرکتیں کرتے۔

بٹیا کو کہانی سننے کا بے حد شوق ہے۔ بڑے دھیان سے سنتی ہے ایک سن لے تو پھر دوسری کی فرمائش "دوسری کہانی سناؤ۔ اچھا اب شیر اور چوہے کی سناؤ۔ اب چڑیا چڑے کی سناؤ۔ ابو خاں کی بکری کی (ذاکر صاحب کی لکھی ہوئی) کہانی اتنی پسند ہے کہ بار بار تقاضا ہوتا اچھا ہم کو اب بکلی (بکری) کی کہانی سناؤ۔ میں مختصر کر کے سناتی۔ بہت غور سے سنتی اور بیچ بیچ میں سوال کرتی جاتی "پھر بکلی نے کیا کہا؟ کیوں جنگل میں بھاگ گئی؟ آدمی نے بکلی سے کیا کہا؟ بھیلیا (بھیڑیا) بکلی پر جھپٹا اور لڑائی ہوئی۔ اچھا پھر بھیڑیا اس کو کھا گیا؟"

کبھی میں کہتی "اچھا بھیا تم مجھے کہانی سناؤ؟" اوٹ پٹانگ خود بھی سنانے لگتی۔ کچھ ادھر سے کچھ ادھر سے۔

اردو کا قاعدہ شروع کرایا۔ کہیں ذرا دیر بیٹھی پھر اچک کر بھاگ گئی۔ کسی وقت بچوں کی ایک

ملحاق ۔نرسری کا یہ گیت پسند آگیا اور ذرا
ی ہو گیا۔
ہم نے جو کھولا ؛ اس میں بھرے تھے پیارے کھلونے
پیا سونے کی چڑیا ؛ موٹی سی مرغی چھوٹی سی بکری
بیلا سا گیدڑ ؛ چھوٹی سی موٹر ننھا سا شوفر
پپو کا جھولا ہم نے جو کھولا

یک دن بچوں کے پارک میں گئے۔ بہت بڑا
ے پارک ہے ۔صاف شفاف چشمہ ہے ۔اس میں
رہی تھیں ۔ بچے کھیل رہے تھے۔ پھسل
پسل رہے تھے ۔قطار لگی تھی ۔پھر پھسل کر قطار
ہو جاتے ۔ طرح طرح کے پھول کھلے تھے۔
ے گاڑیوں پر تھے ۔ مائیں چلا رہی تھیں۔ کچھ
ں پر بیٹھی اپنے اپنے بچوں کی دیکھ بھال کر رہی
ں بیٹھنے کے لیے بڑھی تو انھوں نے مسکرا کر
جگہ دی ۔ بھیا اور بٹیا پھسل بنڈے کی
گے ۔ بٹیا تو ٹھیک طرح سے پھسلی ۔ بھیا
پھسلا تو چاروں خانے چت ۔ ماں نے دوڑ
ابین نے کہا ۔" پھسلنے دو ایسے ہی پھسلنا
دوبارہ سنبھل کر آیا۔
اپنچے والے اور سودا بیچنے والے جو آواز لگاتے
انداز ایسا ہی ہوتا ہے جیسے ہمارے یہاں
ازیں لگاتے نکلتے ہیں ۔ ایک غبارے والا
رنگ برنگے بڑے بڑے غبارے پیٹھ کی طرف
لٹکا ہوا اور زور زور سے " بلوم بلوم " کہتا

ہوا نکلتا (غبارے کو بلوم کہتے ہیں) اس وقت بچے
مالکہ مکان کے پاس ہوتے تو وہ غبارے خرید کر ان کو
دیتیں ۔ خوب اچھالتے ۔ اس کے پیچھے بھاگتے دوڑتے
وہ بھی بلوم ہی کہتے ۔ کھیلتے ہوئے میرے پاس پہنچتے۔

یہاں کا سب سے بڑا بازار " اتا ترک
بول وارڈ " کہلاتا ہے ۔ بہت بارونق ہے ۔ سب سے
چوڑی سڑک ہے ۔ بیچ میں اتا ترک کا مجسمہ نصب ہے
کنارے کنارے خوبصورت پیڑ لگے ہیں ۔ شام کو چڑیاں
بسیرا لینے آتی ہیں اور خوب شور مچاتی ہیں ۔ دکانیں خوب
آراستہ صاف ستھری جھل مل جھل مل ہوتی ہیں ۔ دو
ایک مرتبہ جانے کا اتفاق ہوا ۔ دکاندار خوش مزاج ہیں
خندہ پیشانی سے بات کرتے ہیں اور چیزیں نکال نکال
کر دکھاتے ہیں کہ جو پسند آئے لیں ۔

اور شام کو راشٹرپتی بھون (جمہوریہ ترکی کے
محل) کے سامنے فوجی پریڈ ہوتی ہے ۔ باغ اور سڑک
کے کنارے پریڈ دیکھنے کے لیے تماشائیوں کا ہجوم ہوتا
ہے ۔ اتنی بھیڑ کہ معلوم ہوتا ہے اچھا خاصا میلا لگا ہے۔
سودے والے بھی کھانے پینے کی چیزیں لے کر جمع ہو جاتے
ہیں ۔

ساڑھے پانچ کے قریب ہم گئے ۔ باغ کا پھاٹک
بند تھا ۔ ہم اس کے پاس والی سڑک پر آگئے ۔ سڑک
کی ریلنگ کے کنارے اور بہت سے لوگ کھڑے اور کچھ
بنچوں پر بیٹھے تھے ۔ ہم تھوڑی دیر ٹہلے باغ کا منظر
دیکھا ۔ اتنے میں بینڈ کی آواز سنائی دی ۔ سو کے

قریب فوجی مارچ کرتے ہوئے آئے اور بڑی سڑک سے
ہوتے ہوئے راشٹرپتی بھون کی طرف مڑ گئے۔ عمارت
اونچائی پر ہے سڑک چکر کھاتی وہاں تک پہنچتی ہے۔
درختوں کے پیچھے سے یہ منظر دکھائی دے رہا تھا۔
قومی ترانہ بجایا گیا۔ بھیا اور بٹیا کی نظر فوجیوں
کی ہر حرکت پر تھی اور بڑے غور اور شوق سے یہ تماشہ
دیکھنے میں محو تھے۔ اب باغ کا پھاٹک کھول دیا گیا
یہ واپسی کا راستہ تھا۔ اب کی فوجی بالکل ہمارے
سامنے سے گذرے۔ بھیا کے پیر اسی طرح چلنے لگے
جیسے فوجیوں کے۔ ایک مرتبہ ان سب نے ایک ساتھ
ٹانگ اچھالی تو بھیا نے بھی فوراً اپنی ٹانگ اچھال
دی۔ یہ ایک دوسرا تماشہ تھا۔ (باقی آئندہ)

بقیہ بچوں سے باتیں

اس کے علاوہ کہانیاں پڑھیے۔ ایک مزیدار
ڈرامہ پڑھیے۔ چڑیا گھر کی سیر کیجیے "زرافہ" کا حال
پڑھیے۔ اگلے مہینے خواجہ اجمیری کا عرس ہونے
والا ہے۔ اس تقریب میں ان کے مختصر حالات
پڑھیے۔

....

نظموں میں حضرت ساحر بھوپالی کی قوالی جناب
عبداللہ شرقی کی برسات یقین نیازی کی چاٹے۔ اور اس کے
ساتھ شفیق صاحب کا مضمون پڑھیے اور دوگونہ لطف
حاصل کیجیے۔ حرمت الاکرام صاحب کی نظم بوندوں کی ٹولی
بھی مزے کی ہے پیام تعلیم کا اگلا پرچہ بھی انشاء اللہ
بہت اچھا اور معلوماتی ہوگا۔

....

اس مہینے مولانا بدرالدین استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ
اور برادرم شاہد صاحب (شاخ مکتبہ بمبئی) نے تین تین خریدار
مرحمت فرمائے۔ دو خریدار جمیل قریشی صاحب نے اور جناب
حافظ باقوی مدراس ڈاکٹر سید حسن کشن گنج پورنیہ۔ جناب ہیڈ
مولوی راون شاگرلس اسکول کٹک، جناب ہیڈ ماسٹر
صاحب اردو ماڈل اسکول کالج گریبیٹھ (میسور) جناب
ہیڈ ماسٹر ابوالکلام آزاد ہائی اسکول گوگک۔ جناب
سیف سہسرامی۔ جناب مسعود عالم۔ چترا۔ ہزاری باغ۔
جناب شاہد صاحب بمبئی جناب سکندر جلال الدین قادری
ساگورے رتناگری۔ اور سید شاہد علی صاحب بھلول
بارہ بنکوی نے ایک ایک خریدار مرحمت فرمایا۔ سیما
قبول کوچہ پنڈت دہلی اور محمد ہارون خاں صاحب
شکراوہ گوڑگاواں اور شہناز بانو جامعہ نگر خود
خریدار بنے ہیں۔

خاموشی غصے کا بہترین علاج ہے

حضرت عثمان رض

: پرشاد ماتھر بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی۔ ایڈوکیٹ حیدرآباد

عقل بڑی یا بھینس



یہ سنسار، یہ دنیا بھگوان نے تو بسائی ہے۔
رسے بھگوان نے جب یہ دنیا بسائی۔ اور اس میں
رندوں کو اچھلتے کودتے دیکھتے۔ قسم قسم کے
ں مدھر بولیاں سنتے تو بہت خوش ہوتے
ب، اسی دھرتی پر آدمی بھی تو بستے تھے ۔ وہ
گاتے خوشی خوشی رہتے کسی کو بھوک لگتی
ایک دن بھگوان نے انھیں کھانا کھانا بھی
ہوتے ہوتے لوگ اپنا کھانا خود فراہم کرنے
سکار کر لینا، کبھی پھل پھول کھا لینا، کبھی پتے
لینا۔ اور پھر اکثر لوگ اپنی من بھاتی ترکاری
نے لگے۔ اور ترقی کی تو کھیتوں میں ہل چلا کر
ں کے لیے اناج بھی اگانے لگے۔ اس طرح
ان کا گذر بسر ہونے لگا۔

مگر ایک دن بھگوان نے اوپر سے جھانکا تو دیکھا کہ زمین پر انسان ہی انسان ہیں۔ اتنے زیادہ انسان یہاں پر پیدا ہو گئے تھے کہ بھگوان ڈر گئے۔ انھیں خیال ہوا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تھوڑے دنوں بعد ساری دنیا میں انسان ہی انسان رہ جائیں۔ چرند پرند، پھل پھول سب ختم ہو جائیں۔ اس نے جو رنگارنگ کے چرند اور پرند پیدا کیے تھے وہ بھی ڈھونڈے سے نہ ملیں۔ اب تو بھگوان بہت پریشان ہوئے۔ پھر خیال کیا کہ یہ سب تو آدمیوں کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ یہ لوگ اگر کھانا کھانا چھوڑ دیں تو پھر سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔

پھر بھگوان نے اپنے جی میں کہا۔ انھی نے تو آدمیوں کو کھانا کھانا سکھایا ہے۔ اسے وہ کیسے بند کر سکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے دوسری تدبیر سوچی بھگوان نے سوچا کہ اگر آدمی اپنی خوراک کم کردے تو اچھا رہے گا۔ اور یہ ترکیب ذہن میں آئی کہ لوگوں کو ہفتہ میں صرف ایک دفعہ کھانا کھانے کا حکم دیا جائے۔

بھگوان نے دنیا پر پھر ایک نظر ڈالی۔ اس طرح کا حکم دینے سے پہلے ایک بار پھر دنیا میں بسنے والوں کو دیکھنا چاہتے تھے۔ انھیں اس دفعہ یہ دیکھ کر بہت تعجب ہوا کہ دنیا کے بہت سے آدمی بھی جانوروں جیسی زندگی گذارتے ہیں۔ انھی کی طرح گندی مٹی میں لت پت رہتے ہیں۔ نہ صفائی کا خیال نہ غلاظت سے بچنے کا دھیان۔ ایسے گندے لوگوں کو دیکھ کر بھگوان نے انھیں غلاظت سے دور رہنے اور نہا دھو کر پاک وصاف ہونے کے لیے بھی ہدایت دینی چاہی۔

بھگوان نے سامنے دیکھا تو بھینس کھڑی تھی۔

بھگوان نے سوچا اسی کے ذریعے دنیا والوں کو اپنا پیغام بھیجا جائے۔

بھگوان نے بھینس کو قریب بلایا اور سمجھایا کہ زمین پر جاکر لوگوں کو بتاؤ کہ بھگوان نے حکم دیا ہے کہ لوگ روز نہایا کریں اور ہفتہ میں ایک بار کھایا کریں۔" اللہ میاں نے بھینس کو بار بار سمجھایا۔ بھینس بے چاری اللہ میاں کی خدمت کرنے کو برسوں سے تڑپ رہی تھی۔ فوراً سر ہلایا اور سیدھی اس دنیا میں چلی آئی۔

دنیا میں بسنے والے انسانوں نے جب نئی چیز دیکھی تو اس کے چاروں طرف جمع ہونے لگے قسم قسم کے پھل پھول وغیرہ لاکر اسے کھلاتے۔ بھینس خوب کھا پی چکی تو بولی۔" میں اللہ میاں کے پاس سے تم لوگوں کے لیے ایک خاص پیغام لائی ہوں اتنا سننا تھا کہ لوگ شور وغل مچانے لگے۔ لوگوں نے بھینس سے درخواست کی کہ وہ جلدی تمام باتیں بتا

بھینس نے پھر سر ہلایا اور کہا:" بھگوان چاہتے ہیں کہ دنیا میں رہنے والے تمام لوگ۔ روز کھایا کریں اور ہفتے میں ایک دفعہ نہایا کریں۔" دنیا میں بسنے والوں نے بھینس سے وعدہ کرلیا کہ وہ ایسا ہی کریں گے۔ اور بھینس خوش خوش آسمان پھر بھگوان کے دربار میں واپس لوٹ آئی۔ بھگوان کو پوری داستان سنائی۔ اپنی آؤ بھگت کی کہانی بھی سنائی۔ بھگوان نے پوچھا:" آخر تم نے لوگوں سے کہا کیا؟" بھینس شرماتے ہوئے بولی:" جو آپ نے حکم دیا تھا" بھگوان نے پوچھا:" میں نے کیا حکم دیا تھا؟ بھینس بولی:" یہی کہ لوگ روز کھایا کریں" بھگوان ہنسے اور کہا" تم نے وہی کہا جس کی تم سے امید تھی، میں نے تو ہفتہ میں ایک دفعہ کھانے کو کہا تھا۔ اور تم نے روز کھانے کی بات بنادی۔ اور پھر بھگوان نے کہا........" جبھی تو کہتے ہیں کہ عقل بڑی یا بھینس"

...مت الاکرام

بوندوں کی دیوالی

آیا ہے بہاروں کا موسم

بوندوں کی شان نرالی ہے
ٹہنی ٹہنی دیوالی ہے
مدہوش پپیہا ہے کتنا
کوئل کتنی متوالی ہے
ڈھولک کی ٹھنک، بجلی کی صدا
گلشن گلشن صحرا صحرا
ہریالی ہی ہریالی ہے
نظاروں کا موسم   آیا ہے بہاروں کا موسم

چلتا ہوا جھولوں کا جادو
اُڑتی ہوئی تانوں کی خوشبو
آکاش کے نیلے مکھڑے پر
بکھرے سے گھٹاؤں کے گیسو
بیتاب سے شاخوں کے پتے
لہراتے سے پیڑوں کے بازو
دن ہیں کہ سفر دریاؤں کا
راتیں ہیں کہ بھٹکے سے آہو
کے اشاروں کا موسم   آیا ہے بہاروں کا موسم
جیسے امرت کی پیالی ہے

آنچل لہرایا کھیتوں نے
میدانوں نے دامن پھیلائے
جھرنوں نے کھول سی دیں آنکھیں
ٹیلے چونکے، نالے جاگے
کاریں تیریں بگلوں کی طرح
یکے سنکے، رکشے دوڑے
جنگل میں سماں ہے منگل کا
بل کھایا دھواں کھنکے پیالے
ندیوں کہساروں کا موسم   آیا ہے بہاروں کا موسم

پیراکوں کے دل گھاٹوں پر
جب دیکھو میلے کا منظر
اک جشن اکھاڑوں میں برپا
اک بھیڑ شوالوں کے اندر
شہنائی کی آوازوں سے
بہکی بہکی ہر راہ گزر
ہر صبح ہے سپنوں کی مالا
ہر شام ہے پھولوں کی چادر
دھرتی کے سنگاروں کا موسم   آیا ہے بہاروں کا موسم

بچوں کے لیے دلچسپ معلوماتی کتابیں

چاچا نہرو	-/۱	حضرت امام حسین رضؓ	۴۵	تین شہزادے	-/۲۰
اصلاحی کہانیاں	-/۴۰	حضرت امام حسن رضؓ	-/۲۵	جادو کی بطخ	-/۴۰
بچوں کی اخلاقی کہانیاں	-/۴۰	حضرت رابعہ بصریؒ	-/۲۵	جادو کا گھوڑا	-/۴۰
بچوں کا ادب	۱/۵۰	حضرت سلمان رضؓ	-/۲۵	جادو کا پھل	-/۳۰
بہادر لڑکا	-/۳۰	حضرت بلال رضؓ	-/۲۵	چڑیوں کی ملکہ	-/۲۰
سلطان ٹیپو شہید	-/۴۰	حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضؓ	-/۲۵	خوفناک جادوگر	-/۴۰
جنگل کی دنیا	-/۳۰	حضرت فاطمۃ الزہرا خاتون جنت رضؓ	-/۲۵	دیو پکڑ دندہ	-/۲۰
دلچسپ لطیفے	-/۴۰	ابھرتا سورج	-/۵۰	ڈاکٹر بوجھ بجھکڑ	-/۲۰
دلچسپ کہانیاں	-/۴۰	زمین کے تارے	-/۵۰	رحم دل پریاں	-/۲۰
ڈاکٹر اقبال	-/۴۰	چمکتے موتی	-/۵۰	رستم و سہراب	-/۲۰
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت	-/۲۵	تین قلندر	-/۴	شیش محل	-/۲
ریل کا سفر	-/۲۵	ایک تھی راجکماری	-/۲۰	شہزادی بدورا	-/۴۰
گھوڑا گھوڑا	-/۴۰	ایک تھی رانی	-/۲۰	شہزادی پری زاد	-/۴۰
مولانا ابوالکلام آزاد	-/۴۰	آدم خور زنگی	-/۴۰	عراق کی شہزادی	-/۲۰
سنہری چڑیا	-/۴۰	افراسیاب کی بیٹی	-/۴۰	لنگڑا دیو	-/۴۰
ننھی منی کہانیاں	-/۴۰	بہادر راجکمار	-/۲۰	مسٹر عقل مند	-/۲۰
سرور دو عالمؐ	-/۵۰	باغی شہزادہ	-/۴۰	مغرور شہزادی	-/۴۰
حضرت صدیق اکبر رضؓ	-/۲۵	بے وقوف پریاں	-/۲۰	ہنس مکھ شہزادہ	-/۲۰
حضرت فاروق اعظم رضؓ	-/۲۵	پریوں کے تحفے	-/۲۰	ہیروں کا جزیرہ	-/۴۰
حضرت عثمان ذی النورین رضؓ	-/۴۵	پھول شہزادی	-/۲۰	جادو کا ہاتھ	-/۲۰
حضرت علی شیر خدا رضؓ	-/۲۵	تیسرا انعام	-/۲۰		

ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال، بمبئی ۳ (بی-آر)

خواجہ معین الدین چشتیؒ

پ کی دتی میں جامعہ سے چار یا پنج میل شہر
ضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا مزار ہے۔
میں ایک بزرگ حضرت قطب الدین بختیار کاکی
ہے۔ یہ سب ایک ہی بزرگ حضرت خواجہ معین
ی کے مرید یا مریدوں کے مرید تھے۔ یہ بات
و بتاتے چلیں کہ حضرت قطب الدین حضرت
ی کے مرید اور خلیفہ تھے۔ ان کے مرید اور
فرید گنج شکر تھے۔ ان کے مرید حضرت خواجہ
اولیا تھے۔ حضرت امیر خسرو دہلوی حضرت
ن اولیا کے مرید تھے۔ آج ہم آپ کو ان سب
ضرت خواجہ اجمیری کا کچھ حال سناتے ہیں۔
ضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ خراسان کے
ٹے سے شہر (سنجر) میں ۱۴ رجب ۵۳۶ھ
رئے۔

۵۵ھ میں آپ کے والد بزرگوار اور والدہ
اں فانی سے رخصت ہو گئیں۔ آپ کو میراث
ن چکی تلی ایک باغ ملا۔ یہی دونوں چیزیں
گذر بسر کا ذریعہ تھیں۔ ایک روز آپ باغ کو پانی دے
رہے تھے کہ حضرت شیخ ابراہیم قندوزیؒ آپ کے باغ
میں آئے۔ خواجہ صاحب کے زمانے میں یہ بہت بڑے
بزرگ تھے۔ خواجہ صاحب نے ان کی بہت عزت کی۔
اور نہایت ادب و احترام کے ساتھ تازہ انگوروں کا
ایک خوشہ پیش کیا۔ حضرت شیخ ابراہیم قندوزیؒ آپ سے
بہت خوش ہوئے انھوں نے اپنی زنبیل سے روٹی کا
ایک ٹکڑا نکالا اور اپنے منہ میں چبا کر خواجہؒ صاحب کے
منہ میں ڈال دیا۔ روٹی کا حلق سے اترنا تھا کہ آپ کو
دنیا کے کاموں سے نفرت ہو گئی اور علم دین حاصل کرنے
کے شوق نے آپ کو بے قرار کر دیا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم
گھر پر ہی مکمل کی تھی اور کم عمری میں قرآن شریف حفظ
کر لیا تھا۔

مکمل دینی تعلیم حاصل کرنے کے لیے کہیں دور
کا سفر کرنا تھا۔ اس وقت بخارا دینی تعلیم کا بہت
بڑا مرکز تھا۔

خواجہ صاحبؒ بخارا تشریف لے گئے۔ بخارا

میں تعلیم مکمل کرکے سمرقند تشریف لے گئے۔ یہ بھی اس زمانے میں دینی تعلیم کا ایک بڑا مرکز تھا۔

دینی تعلیم مکمل ہو چکی تو اب انھیں کسی کامل ولی اللہ کی تلاش ہوئی جو صحیح معنوں میں ان کی رہبری کرسکتا۔ کسی استادِ کامل کی تلاش میں سمرقند کو خیرآباد کہہ کر آپ بغداد تشریف لے گئے۔ راستے میں آپ کا گزر ایک گاؤں (ہارون یا ہاروان) میں ہوا یہاں اس وقت ایک بزرگ حضرت خواجہ عثمان ہارونی رحمتہ اللہ علیہ رہتے تھے۔ آپ حضرت خواجہ عثمان ہارونیؒ کے مرید ہوئے۔ آپ نے اپنے استاد کی خوب خدمت کی۔ استاد کامل اور شاگرد مخلص ہو تو بھلا کمال کیسے پیدا نہ ہو۔ چنانچہ آپ تھوڑے عرصے میں ہی کامل ولی اللہ بن گئے۔

حضرت خواجہ معین الدین چشتی اپنے پیرو مرشد حضرت عثمان ہارونیؒ کی بیس سال تک خدمت کرتے رہے اور اس عرصے میں ان کے ہمراہ کئی مبارک سفر بھی کیے۔ حضرت عثمان ہارونیؒ نے ۵۸۲ھ میں بغداد شریف میں آپ کو اپنا خلیفہ بنایا۔ خلافت ملنے کے بعد آپ اپنے پیرو مرشد سے رخصت ہوئے اور مختلف جگہوں کا دورہ کیا۔ آپ دوبارہ مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔

اور پھر آپ نے مختلف شہروں کا دورہ کیا۔ اور بلخ میں تشریف لائے۔ بلخ کے بعد غزنی کا دورہ کیا۔ اب تک آپ اسلامی ملکوں اور شہروں میں تبلیغ فرماتے رہے تھے۔ اب وقت آگیا تھا کہ آپ ہندوستان میں اسلام پھیلائیں۔ آپ نے ۵۸۶ھ میں ہندوستان تشریف لائے۔ لاہور میں قیام فرمایا اور روحانی علم حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے حضرت داتا گنج بخش رحمتہ اللہ علیہ کے مزار پر حاضری دی۔

جس حجرے میں آپ عبادت کی غرض سے ٹھہرے تھے وہ اب تک درگاہ حضرت داتا گنج بخشؒ کے مبارک احاطے میں موجود ہے۔ لاہور سے روانگی کے وقت آپ نے اپنے مبارک ہاتھوں سے درگاہ کی محراب پر یہ شعر تحریر فرمایا۔

گنج بخش فیض عالم مظہر نور خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را راہنما!

(خواجہ غریب نواز)

لاہور کے بعد آپ نے دہلی کی راہ لی۔ دہلی میں کئی آدمیوں کو مسلمان کیا، اور تھوڑے ہی عرصے میں ہزارہا لوگ مسلمان ہوگئے۔ دہلی سے نکل کر آپ ضلع کرنال، پٹیالہ اور سمانہ کا دورہ کیا۔ ۵۸۷ھ میں اجمیر شریف آئے۔ مریدوں کی ایک جماعت ساتھ تھی آپ کھلے میدان میں ایک درخت کے سائے میں بیٹھ گئے۔ اب اسی میدان میں آپ کی درگاہ شریف ہے۔

اس جگہ اجمیر کے راجا رائے پتھورا کے اونٹ چرنے کے بعد بیٹھا کرتے تھے۔ راجا کے غلاموں نے آپ کو وہاں بیٹھنے سے منع کیا اور کہا کہ یہاں راجا کے اونٹ بیٹھتے ہیں۔ آپ وہاں سے اٹھ کر ایک تالاب کے کنارے چلے گئے۔ جس کو اناساگر کہتے ہیں۔ لیکن،

. کے چاروں طرف مندرہی مندر تھے۔ اور مندر
نہ چاہتے تھے کہ ایک مسلمان تالاب کے کنارے
نا مذہب پھیلائے

انھوں نے آپ کا مقابلہ کرنے کے لیے اس
ے مشہور جادوگر اجے پال کو تیار کیا۔ اجے پال
نڈ کے ساتھ آپ کا مقابلہ کرنے آیا، مگر وہ
روحانی اور اخلاقی طاقت کا مقابلہ نہ کرسکا،
دل سے مسلمان ہوگیا۔ آپ نے اس کا نام
رکھا۔

مغلوں کے زمانے میں دنیا کے لاکھوں انسانوں
انہ مبارک پر آکر فیض حاصل کیا مسلم اور غیر
دشاہ راجے مہاراجے بھی حاضر ہوکر عقیدت
انے پیش کرتے رہے۔ اکبر بادشاہ اور عالمگیر
اجمیر آئے مغلیہ دور کے بادشاہ شاہ جہاں
صاحب زادی جہاں آرا بیگم کو آپ سے دلی
تھی۔ اس نے مزار مبارک کے قریب چاندی
ے والا نہایت خوش نما سنگ تراشی کا بے مثال
نوایا جو اس وقت بھی درگاہ کی شان دوبالا
ہے۔

شاہ جہاں نے مزار کے قریب سنگ مرمر کی
سین و عالی شان اور وسیع مسجد تعمیر کرائی۔
درگاہ کی زینت بنی ہوتی ہے۔ جہاں گیر نے
سے ایک بڑی دیگ تیار کرکے بھیجی۔ کہتے ہیں کہ
تنی بڑی ہے کہ پانچ ہزار آدمی اس سے سیر
ہوکر کھاتے ہیں۔ اکبر بادشاہ نے فتح چتوڑ کی خوشی
میں ایک بہت بڑی دیگ تعمیر کرائی۔ اس کا محیط
تقریباً تیرہ گز ہے۔

سلطان محمد خلجی نے کئی مرتبہ آستانۂ مبارک
پر حاضری دی۔ مزار کے قریب ایک سنگ سرخ کی
عالی شان مسجد بنوائی اور درگاہ کا وہ دروازہ جو
"بلند دروازہ" کہلاتا ہے، تعمیر کرایا۔ غرض ہندوستان
کے بڑے بڑے بادشاہوں نے آپ کے مزار پر حاضری
دی اور عقیدت کے نذرانے پیش کیے۔

اجمیر شریف میں خواجہ صاحب کی درگاہ
دیکھنے کے لائق ہے۔ درگاہ میں جانے کے لیے ویسے
تو کئی راستے ہیں، لیکن عام طور پر لوگ بلند دروازہ
سے درگاہ میں داخل ہوتے ہیں۔ اسی دروازہ کے
ساتھ دو دیگیں ہیں۔ درگاہ کے بڑے گنبد کا کلس
سونے کا ہے۔ اس کلس کا وزن تقریباً سوا من ہے۔
گنبد کے چاروں طرف بجلی کے قمقمے لگے ہیں جو رات کے
وقت درگاہ کی شان کو دوبالا کرتے ہیں۔ درگاہ میں
ایک بڑا سماع خانہ یا قوالی گھر ہے۔ ویسے تو ہر روز
قوالی ہوتی ہے مگر عرس کے موقع پر خاص اہتمام کیا جاتا
ہے۔ آپ کا عرس رجب کی پہلی تاریخ سے چھ تاریخ
تک رہتا ہے۔ دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ ●

سب سے بڑی دولت تندرستی ہے۔

گیت

جناب محمد یوسف پاپا

کھاؤ گاجر، سیب، ٹماٹر

اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ آ۔ با۔ سا۔ دا
چار وٹامن سادہ سادہ
ان کو کھاؤ ہلتھ بناؤ
پھول کے تم کُپّا ہو جاؤ
لیکن اتنا دھیان میں رکھنا
ان چیزوں کو جب بھی چکھنا
رک کر پینا واٹر
کھاؤ گاجر، سیب، ٹماٹر

اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ آ۔ با۔ سا۔ دا
چار وٹامن سادہ سادہ
ان کو تم اپنا لو بھائی
ایسی چیزیں کھا لو بھائی
اس سے طاقت بڑھ جاتی ہے
گھٹتی ندی چڑھ جاتی ہے
کہتے ہیں یہ خادر
کھاؤ گاجر، سیب، ٹماٹر

اے۔ بی۔ سی۔ ڈی۔ آ۔ با۔ سا۔ دا۔
چار وٹامن سادہ سادہ
ان سے ہر دم پیار کرو تم
اپنے کو تیار کرو تم
جن کے باہر کھیت بنے ہوں
میٹھے پھل کے پیڑ لگے ہوں
وہ اچھا ہے کواٹر
کھاؤ گاجر، سیب، ٹماٹر

جیسی نیت ویسا پھل



اب سے بہت دنوں پہلے کی بات ہے ایک
قے میں چھوٹا سا گاؤں تھا۔ اس گاؤں میں
عورت رہتی تھی۔ لوگ اسے للینا کہتے تھے۔
غرض، لالچی اور مکار عورت تھی۔ اس کا گھر
شان دار بنا ہوا تھا۔ پورا محل کا محل،
مانہ شراب کے پیپوں سے اور کھتیاں اناج
رہتی تھیں۔

محل کے سامنے ایک غریب بیوہ کا جھونپڑا
نام جوسیا تھا۔ اس بے چاری کے ایک
بچے تھے۔

دن (نوروز) کے موقع پر بھی جوسیا کے
کا نام تھا۔ اس نے مٹکے میں سے جھاڑ
نکالا اور روٹی پکانے بیٹھ گئی۔ اِدھر
میں کیسی چہل پہل تھی۔ طرح طرح کے پکوان
تھے۔ سب عزیز رشتہ دار اِدھر اُدھر کے
تھے۔ ہنس بول رہے تھے۔ خوب ٹھٹھے لگا
گا رہے تھے، ناچ رہے تھے۔

خدا کا کرنا اسی دن شام کو برف کا طوفان
آیا۔ اس طوفانی موسم میں ایک تھکا ہارا اور لاچار بوڑھا
جنگل میں سے نکلا للینا کے محل کی طرف بڑھا۔ اس
نے دروازہ کھٹکھٹایا اور بڑی عاجزی سے بولا "مائی جی،
ایک تھکے ہارے بوڑھے مسافر کو اپنے گھر میں ٹکا لو۔
خدا تمھارا بھلا کرے گا۔" مگر للینا بوڑھے کو دیکھتے
ہی آپے سے باہر ہو گئی۔ بڑی ترش روئی سے
چیخ کر بولی: "چل ہٹ دور ہو یہاں سے موا، فقٹا،
آج ہی کے دن منحوس صورت دکھانے کو رہ گئی
تھی۔ اس نے جھٹکے سے دروازہ بند کیا اور اندر
چلی گئی۔

بے چارا بوڑھا اس برتاؤ سے روہانسا ہو گیا۔
اس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ سامنے ٹوٹی
پھوٹی جھونپڑی نظر آئی۔ یہ غریب جوسیا کی جھونپڑی
تھی۔ بوڑھا اسی طرف چل پڑا۔ جوسیا نے بوڑھے
کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ عزت کی جگہ بٹھایا اور بڑی
لجاجت سے بولی: "بابا اس وقت ڈھنگ کا کھانا

ہم آپ کو نہ کھلا سکیں گے، جو کچھ روکھی سوکھی ہے حاضر ہے۔ آپ بڑے شوق سے آج کی رات یہاں آرام فرمایئے ۔۔۔ بوڑھے نے جوسیا کو دعائیں دیں اور بچوں کے ساتھ چولھے کے پاس بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں بچوں سے گھل مل گیا اور مذاقیہ نقلیں کر کے انھیں خوب ہنسایا۔

دوسرے دن تڑکے ہی بوڑھا رخصت ہونے لگا۔ جوسیا نے رات کے بچے کھچے روٹی کے ٹکڑے بوڑھے کے تھیلے میں رکھ دیئے۔ بوڑھے نے چلتے وقت کہا: "آج کی صبح جو کام بھی شروع کرو گی وہ بس سورج ڈوبتے ہی ختم ہوگا۔"

جوسیا کچھ سمجھ نہ پائی۔ پر بوڑھے سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اتنے میں ساتوں بچے ہاتھ منہ دھو، دسترخوان کے چاروں طرف بیٹھ گئے۔ جوسیا پریشان ہوگئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بچوں کو کیوں کر بہلائے۔ رات کے بچے کھچے ٹکڑے بوڑھے کے تھیلے میں ڈال چکی تھی۔

اچانک اسے ایک بات یاد آئی۔ اس کے بکس میں لینن کا ایک اچھے قسم کا تھوڑا سا کپڑا رکھا تھا۔ اس نے سوچا لاؤ اسی کو للینا کے ہاتھ بیچ آؤں۔ کچھ پیسے مل جائیں گے۔ ان پیسوں سے بچوں کے پیٹ کا سہارا ہو جائے گا۔

بکس کھول کر اس نے جی میں کہا "لاؤ ذرا اس کو ناپ کر تو دیکھوں کتنا ہوگا۔" پر اب وہ ناپ رہی ہے، ناپ رہی ہے۔ برابر ناپے جا رہی ہے۔ کپڑا ہے کہ ختم ہی نہیں ہوتا۔ ایسا لگتا تھا جیسے سفید دودھ کا دریا ہے جو اس کے بکس سے ابل پڑا ہے۔ تھوڑی دیر میں اس کی جھونپڑی کپڑے سے بھر گئی۔ اور دیکھتے دیکھتے آنگن میں برف کے ڈھیر لگ گئے۔ دوپہر کے وقت جوسیا نے اپنے پڑوسیوں کو مدد کے لیے بلایا۔ اس سفید لینن سے جھونپڑی ٹھسا ٹھس بھری تھی، آنگن بھرا تھا آنگن سے باہر سڑک پر سفید لینن کے ڈھیر کے ڈھیر تھے۔ مزے کی بات یہ کہ بکس میں سے جوسیا کے ناپنے کے لیے کپڑا اُٹھایا تھا جوں کا توں موجود تھا۔

آخر شام ہوئی، سورج کا سرخ گولا پہاڑوں کے پیچھے جا چھپا اور جوسیا کا بکس آپ سے آپ بند ہوگیا۔ جوسیا نے یہ سارا کپڑا بیچ ڈالا۔ بہت بڑی رقم ہاتھ آئی۔ اس نے نیا مکان بنایا اور بال بچوں سمیت بڑے آرام سے رہنے لگی۔

للینا کو جب جوسیا کی یہ کہانی معلوم ہوئی تو بہت پچھتائی۔ اور اپنے کو کوسنے لگی۔ اسے کیا خبر تھی کہ یہ موا بڈھا کھوسٹ جادوگر تھا۔ اس نے دل میں کہا "خیر جو ہوا سو ہوا، اب کے وہ بوڑھا ادھر آنکلا تو وہ ضرور اس کی تلافی کرے گی۔"

آخر خدا خدا کر کے نئے سال کا دن پھر آیا۔ ہر طرف خوشی ہی خوشی، ہر طرف چہل پہل۔ اب کے للینا نے صبح ہی صبح اپنے بچوں کو گاؤں سے باہر بھیج دیا اور تاکید کر دی کہ بڑے میاں کو دیکھتے رہیں۔ اتفاق کی بات۔

ت بھی کو برف کا طوفان آیا۔ بچے بھاگتے ہوئے گھر
ں دوڑے اور بتایا کہ بڑے میاں گاؤں کی طرف
ہیں۔

یہ خوش خبری سنتے ہی للینا دوڑتی ہوئی سڑک
،اور جونہی بڑے میاں نظر آئے بڑھ کر سلام کیا
ی عاجزی سے بولی "کیا آج آپ میرے غریب
ں آرام فرما کر مجھ پر احسان کریں گے"۔ بوڑھے کو
ل کی بات یاد تھی۔ اس نے کہا "بھلا پچھلے
م نے اتنا روکھا پن کیوں دکھایا تھا؟"

للینا جھٹ بولی "بابا پچھلے سال میں نہیں میری
دگی۔ اس زمانے میں گھر کا سارا انتظام اسی کے
تھا۔ ہم دونوں کی شکل و صورت ایک دوسرے سے
تی ہے، مگر ہماری عادتیں بالکل ایک دوسرے
ں ملتیں۔ وہ جس قدر روکھے مزاج کی ہے !!!
میرے دل میں خلوص اور انسانیت کا جذبہ ہے"۔

بوڑھے نے کہا "لوگوں کا دل جیسا ہوتا ہے
نیت ہوتی ہے اسی کے مطابق انہیں پھل ملتا ہے"۔
نا کے یہاں رات گزارنے پر راضی ہو گیا۔ اب
بوڑھے کی خوب آؤ بھگت کی گئی۔ پر اس میں
سے زیادہ بناوٹ جھلکتی تھی۔ دوسرے دن صبح
یہاں سے رخصت ہوتے وقت بوڑھے نے کہا "آج
جو پہلا کام تم شروع کرو گی وہ شام تک ختم
رہ گی۔"

کہے گا۔ اس نے پہلے سے تیاری کر رکھی تھی۔ اپنے بکس میں اون کا ایک بہت قیمتی کپڑا رکھ چھوڑا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے کپڑا نکالنے بکس کی طرف جا رہی تھی، راستے میں پانی سے بھری ہوئی بالٹی رکھی تھی۔ جلدی میں بالٹی میں ٹھوکر لگی، سارا پانی گر گیا۔ ادھر بچوں کو پیاس لگی تھی۔ گھر میں پانی تھا نہیں۔ اس نے سوچا لاؤ پہلے پانی بھر لاؤں۔ پانی بھر کر لوٹی تو سیڑھیوں پر پاؤں پھسلا، بھری بالٹی الٹ گئی۔ للینا الٹے پیروں لوٹی کنوئیں سے دوسری بالٹی بھر کر لائی مگر سیڑھیوں پر پہنچ کر پھر وہی بات ہوئی۔ وہ پھر گئی پھر بھی صورت پیش آئی جھلا گئی اور جھلاہٹ میں نہ جانے کتنی بالٹیاں بھر لائی۔ بہت سنبھل کر بہت احتیاط سے گن گن کر قدم رکھتی۔ مگر باہر نہ جانے کیسے کوئی نہ کوئی بات ہو جاتی اور سارا پانی الٹ جاتا۔ تھک کر اور عاجز آ کر للینا نے بچوں کو مدد کے لیے بلایا۔ پھر ان کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ پڑوسی مدد کے لیے آئے وہ بھی ناکام رہے۔ سارا دن اسی طرح بیت گیا۔

شام ہونے کو آئی تو جوسیا بھی مدد کو پہنچی وہ بھری بالٹی لے کر صحیح سلامت گزر گئی۔ پانی کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہیں گرا۔ پر وہ بالٹی کمرے کے کونے میں رکھنے بھی نہ پائی تھی کہ سورج نے اپنا لال لال چہرہ پہاڑیوں کے پیچھے چھپا لیا۔ للینا بے چاری کو اتنا وقت ہی نہ ملا کہ اپنے کپڑے کی ناپ تول کرتی۔ بوڑھے مسافر

برکھا رانی

جناب شفیع تمنا کلکتوی

(۱)

نجمہ، سلمیٰ، زہرہ، شیریں
آنگن میں سب کھیل رہی تھیں
آنکھ مچولی کھیل تھا ان کا
چور بنی تھی بھولی سلمیٰ
کھیل تھا کتنا پیارا پیارا
فکر تھی کوئی اور نہ غم تھا
اتنے میں جو بادل چھائے
بارش کا سندیسہ لائے
ہوئی پھر اتنے زور کی برکھا
ان کا سارا کھیل ہی بگڑا
چوٹ لگی ان سب کے دل پر
پھر سلمیٰ یہ بولی رو کر
برکھا رانی تم رک جاؤ
ہم بچوں کا دل نہ دکھاؤ

(۲)

برکھا رانی تب یہ بولی
سلمیٰ ہو تم کتنی بھولی
کام یہ سارا ہے اس رب کا
جو ہے خالق مالک سب کا
بولی جب یہ برکھا رانی
سلمیٰ نے بھول اپنی مانی
شرم سے پانی پانی ہو کر
بات یہ فوراً لائی لب پر
سچ ہے رب کے حکم کے آگے
ہمت کس کی جو پر مارے

ب عبداللطیف اعظمی

زرافہ



ہاتھی دیکھنے کے بعد، ہم لوگ آگے بڑھے ،
ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ ان بچوں کو اب کون سا
لوز دکھایا جائے جو ان کے لیے بالکل نیا ہو عجیب د
بھی ہو ۔

بچے ادھر اُدھر دیکھ رہے تھے اور میں گردن جھکائے
ہوا چل رہا تھا، کچھ تھک بھی گیا تھا ۔ آپ جانیے
کھ میلوں میں تو پھیلا ہوا ہے ۔ میں پچاس ترپن
بوڑھا مسلسل چلتے چلتے تھک نہ جاتا تو اور کیا

یکایک بچوں نے شور مچایا تو میں چونک پڑا ،
می سوتے سوتے جاگ پڑے ۔ "ابو! وہ لمبی لمبی
، لمبی گردن والا عجیب و غریب اور خوبصورت جانور
ہے ؟"

نشاط نے سوال کیا ۔ "ہما باجی بتائیں گی،
نے کاربٹ نیشنل پارک میں ضرور دیکھا ہوگا"
خورشید نے ہما پر طنز کیا ۔ "جی! کاربٹ نیشنل
ں دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو، لیکن کتاب میں ضرور
ہے، تصویریں بھی دیکھی ہیں ۔"
ہما نے تو کی، تو کی، جا... دیا

"میں ہی کیا جو بچے انگریزی کے اچھے اچھے
رسالے اور عام معلومات کی کتابیں پڑھتے ہیں، انھوں
نے اس جانور کے بارے میں ضرور پڑھا ہوگا ۔ اس کی
تصویر بھی دیکھی ہوگی ۔"

بات شاید بڑھ جاتی میں جھٹ بول اٹھا "بھئی!
اسے زرافہ کہتے ہیں زرافہ ۔ یہ صرف نائجیریا (افریقہ)
میں ہوتا ہے ۔ افریقہ کا یہ جانور دنیا کے چار سب سے
بڑے جانوروں میں سے ہے ۔ یہ اپنی پوری عمر کو پہنچ
جاتا ہے تو اس کی لمبائی بیس فٹ ہوتی ہے ۔ اس کی
لمبی ٹانگوں کے نیچے ایک آدمی آسانی سے کھڑا ہو سکتا
ہے، اس کا وزن تقریباً دو ٹن ہوتا ہے، اس سے
پہلے مرہم لگا ... ایک ... ۲۷، ۱۰، ۲۸

من کے درمیان ہوتا ہے:

"دیکھو اس کے ہونٹ کس قدر لمبے ہیں۔ ہونٹوں کے اوپر لمبے لمبے بال بھی ہیں۔ ان کی وجہ سے اس کے ہونٹ کانٹوں سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس کی زبان گہری سرخ اور کالی ہوتی ہے اور لمبائی میں تمہارے اسکیل سے کچھ بڑی ہوتی ہے یعنی تقریباً ۱۸ انچ کی، سر پر دیکھو دو چھوٹی چھوٹی آنکھیں بھی ہیں، اس کا پیر یا قدم کوئی ۱۸ انچ لمبا اور خوب چوڑا ہوتا ہے، اس کا جسم بہت بھاری بھرکم ہوتا ہے، اس لیے خوب مضبوط زمین پر چل سکتا ہے۔"

"پھوپھا جان! اس قدر لمبا ہے تو سوتا کیسے ہوگا؟" گڈو نے سوال کیا۔

"یہ کھڑا ہی کھڑا سوتا ہے۔" میں نے جواب دیا اس کے لیے سونا اور اٹھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ اس لیے اس سے بچتا ہے۔"

"زرافہ کی عمر عام طور پر بیس سال ہوتی ہے۔" میں نے بچوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ "افریقہ کے جنگلی قبیلوں کے لوگ اس کا گوشت بہت شوق سے کھاتے ہیں۔ اس کی کھال تقریباً ایک انچ موٹی ہوتی ہے، اس لیے بڑی مشکل سے بندوق کی گولی جسم میں گھس پاتی ہے۔"

"زرافہ عام طور پر جھنڈ کے جھنڈ ایک ساتھ رہتے ہیں، ایک جھنڈ کی تعداد عموماً ساٹھ ستر ہوتی ہے۔ ایک ساتھ رہنے میں وہ اپنے کو زیادہ محفوظ سمجھتے ہیں۔"

"ایک جھول میں کتنے بچے ہوتے ہیں خالو جان" واجدہ نے سوال کیا۔

"صرف ایک بچہ پیدا ہوتا ہے" میں نے جواب دیا۔ "کوئی پندرہ مہینے کے بعد بچہ پیدا ہوتا ہے اور پیدائش کے وقت اس کا وزن تقریباً ۱۲۰ پونڈ اور لمبائی چھ فٹ ہوتی ہے۔ بہت تیزی سے بڑھتا ہے۔ کوئی ۹ مہینے میں پورا جوان ہو جاتا ہے۔"

"کیا شیر ببر زرافہ کا شکار کر سکتا ہے پھوپھا جان؟" پروین نے سوال کیا۔

"شیر ببر اس پر حملہ کرنے نہیں پاتا کہ زرافہ اپنے چاروں پیروں سے اسے مار کر رفو چکر ہو جاتا ہے" میں نے بتایا: "تمھیں چڑیا گھر میں اس کو دوڑتے ہوئے دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا۔ دوڑتے وقت بالکل ایسا لگتا ہے جیسے کوئی لمبے لمبے بانس ٹانگوں میں باندھ کر دوڑ رہا ہو۔ بڑی بڑی گھاس میں صرف اس کی گردن دکھائی دیتی ہے۔ پورا جسم چھپا رہتا ہے۔"

"اس کے دوڑنے کی رفتار کتنی ہوگی پھوپھا جان" پروین نے اس کی ٹانگوں کو غور سے دیکھ کر سوال کیا۔

"بھئی اس کی ٹانگیں بہت لمبی ہیں نا اس لیے اس کے ڈگ بھی بہت لمبے ہوتے ہیں۔ ڈگ سمجھے؟ یعنی خوب لمبے لمبے قدم ڈالتا ہوا، ایک گھنٹے میں ۳۲ میل تک دوڑ سکتا ہے۔"

میں نے محسوس کیا کہ بچے میری باتوں کو زیادہ [illegible]

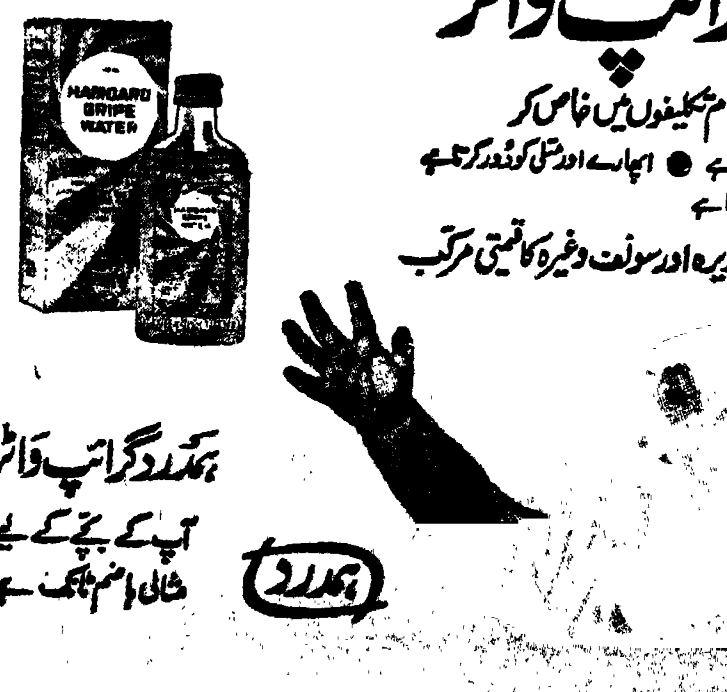
دل چسپ جانور کی طرف ہے" تو میں نے
" اچھا بھئی ایک دل چسپ قصہ سنو!"
ریقہ کے ایک شہر میں پہلی مرتبہ ٹیلیفون
نار لگائے جا رہے تھے۔ یکایک مزدوروں
بند کر دیا۔ انسپکٹر کو بڑی تشویش ہوئی اور
علوم کرنے کے لیے موقع پر پہنچے تو دیکھا کہ چار
زیں تاروں میں پھنسی ہوئی ہیں۔ غالباً وہ
سری طرف جانا چاہتے تھے، مگر اپنی لمبی
و کیا کرتے کہ وہ تاروں میں پھنس گئیں۔
یسا اکثر ہوتا ہے، اس لیے ٹیلیفون کے
نچے لگائے جاتے ہیں کہ زرافہ آسانی
نکل جائے۔"

"کیوں پھوپھا جان! اگر میں زرافہ کے سر پر
بیٹھ جاؤں تو آسانی سے آسمان کو چھو لوں گی؟"
گڈو نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ضرور ضرور، مگر پھر تم اس پر سے اتر نہ سکو گی"
میں نے یہ کہا اور آگے بڑھ گیا —— کافی دیر ہو گئی
تھی اور جانور ابھی بہت باقی تھے۔ ●

جس کو شکست کھانے کا خوف ہو
وہ ہمیشہ شکست کھاتا ہے
(نپولین)

ہمدرد گرائپ واٹر

بچوں کی سب ہی عام تکلیفوں میں خاص کر
پیٹ درد میں سکون دیتا ہے ● اپھارے اور متلی کو دور کرتا ہے
نظام ہضم کی نشوونما کرتا ہے
یا، پودینا، اجوائن، زیرہ اور سونف وغیرہ کا قیمتی مرکب



ہمدرد گرائپ واٹر
آپ کے بچے کے لیے
مثالی ہاضم ٹانک ہے

ہمدرد

جناب آزادؔ بارلوی

آزادی کا دِن

آؤ ہم جاری کریں ایسا چلن آج کے دن
لہلہا جائے محبت کا چمن آج کے دن
شاد و پُرکیف[1] ہو ہر اہلِ وطن آج کے دن
دور ہو جائیں سبھی رنج و محن[2] آج کے دن
لب پہ فریاد نہ ہو آنکھ سے آنسو نہ بہیں
مسکرائیں سبھی گلہائے چمن آج کے دن
اختلافات وچاروں[3] میں اگر ہیں تو رہیں
اختلافات سے پاکیزہ ہو من آج کے دن
جن خیالات سے توہینِ وطن ہوتی ہے
ان خیالات کو پہنائیں کفن آج کے دن
لازمی ہے کہ نئے دور میں باتیں ہوں نئی
ختم ہو جائیں روایاتِ کہن[4] آج کے دن
ہم کو ہر حال میں تزئینِ[5] وطن کرنی ہے
بس یہی سب کے دلوں میں ہو لگن آج کے دن
متحد ہو کے بہر حال ہمیں رہنا ہے
ہم کو آزادؔ یہ لینا ہے وچن[6] آج کے دن

[1] خوشی سے بھرا ہوا [2] تکلیف مصیبت [3] خیالات [4] پرانی [5] سجاوٹ [6] قول، قسم۔



سخی حاتم

ڈرامے کے افراد:

بادشاہ سلامت، وزیر اعظم، حاتم، لکڑہارا، لکڑہارے کی بیوی، ڈھنڈھورچی، اور سپاہی وغیرہ

(پہلا منظر)

(بازار کا منظر۔ آدمی آ جا رہے ہیں، ڈھنڈھورچی ڈھنڈھورا پیٹتا ہے۔ ڈم ڈم ڈم ... ڈم ڈم ڈم ... آدمی ڈھنڈورے کی آواز سن کر ڈھنڈھورچی کے چاروں طرف اکٹھے ہو جاتے ہیں)

ڈھنڈھورچی (اونچی آواز میں)

ملک خدا کا حکومت بادشاہ کی

بادشاہ کا اعلان سن لو کھول کر کان

سب کے بھلے کی ہے یہ بات

نہیں تو پچھتاؤ گے ملو گے ہاتھ

حاتم کو جو بھی پکڑ کر لائے

پانچ ہزار اشرفیاں انعام پائے

ڈم ڈم ڈم .... ڈم ڈم ڈم ....

بھیڑ کا ایک آدمی: "ارے! حاتم تو بے چارا بڑا سخی آدمی ہے۔ غریبوں کے لیے سب کچھ لٹا دیتا ہے۔ بھلا اس سے بادشاہ کیوں ناراض ہو گیا۔ کیا ایسی خطا کی ہے اس نے؟"

دوسرا آدمی: "ارے میاں بادشاہ پھر بادشاہ ہے، پل بھر میں خوش تو پل بھر میں ناخوش"

تیسرا آدمی: "کسی نے حاتم کی چغلی کھائی ہوگی۔ جھوٹی سچی لگائی ہوگی"

چوتھا آدمی: "ایسے نیک انسان کو کون گرفتار کرے گا۔ کون یہ گناہ اپنے سر لے گا؟"

پہلا آدمی: "ارے میاں لالچ بڑی بلا ہے۔ بہتیرے ایسے انسان مل جائیں گے جو

پانچ ہزار اشرفیوں کے لالچ میں بے چارے
حاتم کو گرفتار کرنے میں دیر نہ کریں گے !"

ایک راہگیر دوسرے سے :- "ارے میاں چلو حاتم کو تلاش کرتے ہیں۔ کہیں مل گیا تو اپنا تو کام ہی بن جائے گا !"

دوسرا راہگیر:- "ہاں ہاں چلو۔ ہم دونوں مل کر اسے پکڑیں گے اور آدھا آدھا انعام بانٹ لیں گے۔"

(دوسرا منظر)

(جنگل میں ایک بوڑھا اور اس کی بیوی لکڑیاں چن رہے ہیں۔ بوڑھا بار بار کھانستا ہے۔ قریب ہی ایک پیڑ کے پیچھے حاتم چھپا ہوا ہے)

بڑھیا:- "بھلا ہماری زندگی بھی کوئی زندگی ہے ہم صبح سے شام تک جنگل میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ اس پر بھی دو وقت کی روٹیاں نصیب نہیں ہوتیں ..."

بڑھا:- "ہماری قسمت میں جو لکھا ہے مل جاتا ہے اللہ کا شکر ادا کرو کہ روکھی سوکھی روٹی سے پیٹ پل جاتا ہے۔ اور ہم کسی کے سامنے بھیک کے لیے ہاتھ نہیں پھیلاتے ؛"

بڑھیا:- "کاش! حاتم ہمارے ہاتھ آجائے، تو دن پھر جائیں "

بڑھا:- (ہنستا ہے) تمہارا دماغ شاید خراب ہوگیا ہے۔ کہاں ہم اور کہاں حاتم۔ بھلا وہ ہمارے ہاتھ کیوں آنے لگا۔ کسی دن کوئی درندہ آئے گا اور ہمیں پھاڑ کھائے گا "

(حاتم سب باتیں سنتا ہے اور پیڑ کی آڑ سے نکل آتا ہے)

حاتم :- "لو اب خوش ہو جاؤ۔ تمہاری مراد پوری ہوگئی - میں ہی حاتم ہوں جس کی گرفتاری کے لیے بادشاہ نے پانچ ہزار کا انعام رکھا ہے۔ میرے ہاتھ رسیوں سے باندھ لو اور مجھے بادشاہ کے پاس لے چلو۔ تمھیں پانچ ہزار اشرفیاں مل جائیں گی "

(بوڑھا اور بڑھیا ہکا بکا ہو کر حاتم کو دیکھتے ہیں)

بوڑھا :- "اے میاں کیوں ہم غریبوں کے ساتھ مذاق کرتے ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو... کہاں ہم اور کہاں حاتم۔ شاید تم بھی حاتم کی تلاش میں نکلے ہو ...."

حاتم :- (قریب جاکر) "یقین کرو.... میں ہی حاتم ہوں۔ میں نے تم دونوں کی ساری باتیں سن لی ہیں - میں تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔ تم لوگ مصیبت کے مارے ہو۔ بس مجھے بادشاہ کے پاس لے چلو۔ تم کو انعام مل جائے گا "

بوڑھا :- فرض کیا تم واقعی حاتم ہی ہو تب بھی

میں تم جیسے نیک اور رحم دل انسان کو
مصیبت میں ڈال کر انعام حاصل نہیں
کروں گا!"

با :- "بیٹا تم کو خدا سلامت رکھے، تم یہیں چھپے
رہو۔ ہم تم کو روکھی سوکھی روٹی اور پانی
لا دیا کریں گے۔ کیا عجب جو خدا بادشاہ کا دل
پھیر دے ...... ہم غریب ضرور ہیں، مگر
لالچی نہیں۔ ہماری غریبی کے لیے تم اپنی
قیمتی جان نہ گنواؤ۔"

:- "نہیں نہیں .... تم مجھ پر رحم نہ کھاؤ۔
میری حقیر جان کی قیمت پانچ ہزار اشرفیاں
تو بہت ہیں۔ ایک یا دو اشرفیاں بھی کسی
کو حاصل ہو سکیں تو مجھے خوشی ہوتی۔ بس
اب دیر نہ کرو۔ مجھے لے چلو!"

ما :- "نا بھئی یہ کام مجھ سے کبھی نہیں ہوگا۔ میں
تم کو گرفتار نہیں کرا سکتا۔ لعنت ہے
پانچ ہزار اشرفیوں پر۔"

:- "اچھا اگر تم مجھے نہیں لے چلو گے تو میں
خود جاکر بادشاہ سے کہہ دوں گا کہ تم
دونوں نے مجھے اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا۔"

ما :- "واہ میاں واہ! نیکی کا بدلہ بدی۔ اب
میں کیا کروں! میاں حاتم! معاف کرو
جاؤ۔"

:- "بس جلدی سے میرے ہاتھ باندھ دو۔ دیر
نہ کرو۔"

(چند آدمی حاتم کی تلاش میں ادھر آ نکلتے
ہیں اور وہ اسے پہچان لیتے ہیں)

ایک آدمی :- "پکڑو یہی ہے حاتم!"

دوسرا آدمی :- "میں نے اسے ڈھونڈا ہے!"

تیسرا آدمی :- "میں تو اس کی گھات میں کئی روز
سے تھا۔"

چوتھا آدمی :- "چلو ہٹو۔ میرے ہوتے ہوئے کوئی حاتم
کو ہاتھ نہ لگائے۔ میں نے اس کی تلاش
میں سارا جنگل چھان مارا تب کہیں جاکر
ہاتھ لگا ہے۔"

(ایک دوسرے سے لڑتے ہیں جھگڑتے
ہیں)

(تیسرا منظر)

(بادشاہ کا دربار۔ بادشاہ تخت پر بیٹھا
ہے۔ سامنے حاتم کھڑا ہے۔ اس کے ہاتھ
رسیوں سے بندھے ہیں۔ قریب ہی لکڑہارا
اور بہت سے لوگ کھڑے ہیں)

بادشاہ :- "مابدولت بہت خوش ہیں کہ حاتم گرفتار
کرکے ہمارے حضور میں لایا گیا۔ ہم نے
سنا ہے کہ ہماری رعایا خدا کے بعد حاتم کا
نام لیتی ہے۔ ہم سے زیادہ اس کی عزت
اور تعظیم کرتی ہے۔ اور حاتم ہماری رعایا
کو ہمارے خلاف اکساتا ہے۔ وہ بادشاہ

بننے کے خواب دیکھ رہا ہے "
"ہاں کون ہے وہ بہادر اور خوش نصیب جس نے حاتم کو گرفتار کیا ہے ؟"
ایک آدمی :۔(آگے بڑھتا ہے۔ زمین چومتا ہے) "حضور کا خادم ہوں "
دوسرا آدمی :۔ "نہیں آقا۔ یہ جھوٹا ہے حاتم کو میں نے پکڑا ہے "
تیسرا آدمی :۔ "نہیں نہیں یہ جھوٹ بولتا ہے۔ حاتم کو میں نے پکڑا ہے "
"میں شہر کا مشہور پہلوان ہوں ۔ میں نے بڑی مشکل سے حاتم کو قابو میں کیا ہے "
(کئی آوازیں) نہیں نہیں یہ جھوٹ ہے۔ میں نے حاتم کو پکڑا ہے ۔ میں نے پکڑا ہے)
وزیراعظم :۔ (غصے سے) "خاموش خاموش ! یہ بادشاہ سلامت کا دربار ہے ، مچھلی بازار نہیں "
(لوگ خاموش ہو جاتے ہیں)
بادشاہ :۔ (وزیر سے مخاطب ہو کر) وزیراعظم یہ عجیب ماجرا ہے۔ یہاں تو ہر آدمی دعویٰ کر رہا ہے کہ حاتم کو اسی نے گرفتار کیا ہے ۔ اب انعام کس کو دیا جائے "
وزیراعظم :۔ "حضور والا ۔ حاتم ہی سے دریافت کیا جائے کہ سچ کیا ہے "
بادشاہ :۔ (حاتم سے) "اب تم ہی بتاؤ۔ انعام کسے ملنا چاہئے ؟"
حاتم :۔ (سر جھکاتا ہے) "حضور والا ! مجھے ایک بوڑھے لکڑہارے نے گرفتار کیا ہے۔ انعام اسی کو ملنا چاہئے ! "
بادشاہ :۔ "کہاں ہے وہ بوڑھا ۔ ہمارے سامنے حاضر ہو ! "
بوڑھا :۔ (مجمع سے باہر نکلتا ہے۔ زمین چومتا ہے ۔ وہ بلک بلک کر رو رہا ہے)
بادشاہ :۔ "ارے میاں تم رو رہے ہو ۔ تم کو تو خوش ہونا چاہئے ۔ ہم تم کو پانچ ہزار اشرفیاں انعام میں دیں گے ! "
بوڑھا :۔ (ہچکیاں لے کر) "حضور حاتم کو میں نے گرفتار نہیں کیا بلکہ حاتم نے میری غریبی پر ترس کھا کر اپنے آپ کو میرے حوالے کر دیا ہے ۔ میں نے بہت منع کیا ۔ مگر وہ نہیں مانا ۔ اور مجھے دھمکی دی کہ اگر میں اس کو بادشاہ سلامت کے سامنے نہیں لے چلوں گا تو وہ خود جا کر بادشاہ سے کہہ دے گا کہ بوڑھے نے اسے اپنے گھر میں چھپا رکھا تھا ؛ بس حضور اتنی بات ہے۔ باقی یہ سب دعویدار راستے میں مل گئے اور میرے ساتھ ہو لیے "
حاتم :۔ "حضور والا ! آپ اس بوڑھے کی باتوں پر اعتبار نہ کریں ۔ وہ مجھ پر ترس کھا کر ایسا

۔ رہا ہے۔ انعام اسی کو ملنا چاہیئے"
ضور میں قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں نے
اتم کو نہیں پکڑا۔ آپ خود دیکھ سکتے ہیں
ں بوڑھا اور کمزور انسان بھلا حاتم جیسے
ہادر کو پکڑ سکتا ہوں!"
ر تعجب سے وزیر کی طرف دیکھتا ہے) میاں
تم میں نے تم کو غلط سمجھا تھا۔ تم میری
یا میں سخی ترین انسان ہو۔ مجھے فخر ہے
۔ میری سلطنت میں تم جیسا نیک اور
ریبوں پر رحم کھانے والا انسان بستا ہے۔
ں اپنا حکم واپس لیتا ہوں۔"
حکم دیتا ہے)

"حاتم کو آزاد کر دیا جائے اور حاتم کا مال،
اور جائداد جو ضبط کر لی گئی ہے۔ واپس
کر دی جائے۔"
"اور ان کم بخت جھوٹے دعویداروں
کے سروں پر پانچ پانچ سو جوتیاں لگائی
جائیں۔ اور میاں لکڑ ہارے کو پانچ ہزار
اشرفیاں انعام میں دی جائیں۔"
(حاتم کورنش بجا لاتا ہے)
(پردا گرتا ہے)

آگر آپ کو اردو سے محبت ہے تو
اردو پڑھیے اردو لکھیے۔ اردو بولیے



جناب قربان ایم اے۔ بی۔ ٹی

جگنو



آج کل برسات کا موسم ہے۔ آپ روزانہ رات کو جگنو چمکتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اور آپ میں سے بہت سے بچے تو انھیں پکڑ پکڑ کر خوش ہوتے ہیں۔ بچوں کے شاعر اسماعیل میرٹھی کا یہ شعر تو آپ کو یاد ہوگا ے

چمک دار کیڑا جو بھایا اسے ٭ تو ٹوپی میں جھٹ پٹ چھپایا اسے

ڈاکٹر اقبال نے بھی جگنو پر ایک بہت ہی اچھی نظم لکھی ہے۔ اس کے بھی دو شعر سن لیجیے۔ ے

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں
آیا ہے آسماں سے اڑ کر کوئی ستارہ
یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

جگنو اس قدر دل عزیز کیڑا ہے لیکن اس کے بارے میں ہمیں آپ کو واقفیت بہت کم ہے۔ آئیے ہم اس کے متعلق کچھ دل چسپ باتیں بتائیں۔

پہلی بات تو یہ کہ وہ کس طرح اپنی دم پر چھوٹی سی لالٹین لیے پھرتا ہے۔ دوسرے کیڑوں کی طرح جگنو بھی نر اور مادہ ہوتے ہیں۔ مادہ جگنو کے جسم کے آخری تین حصّوں میں روشنی کا سامان رہتا ہے۔ پہلے دو حصّوں میں روشنی تیار ہوتی ہے۔ اوپری کھال کے نیچے روشنی کی ایک چوڑی پٹی (پلیٹ) رہتی ہے۔ تیسرے حصّے میں صرف دو دھبے ہوتے ہیں جو چمکتے ہیں۔ یہ دھبے نر، مادہ اور ان کے بچوں تک کے اوپر ہوتے ہیں اور زندگی بھر چمکتے رہتے ہیں روشنی کی پٹی یا دھاری صرف مادہ جگنو کے جسم پر ہوتی ہے۔ نر جگنو کے جسم پر صرف دو دھبے ہوتے ہیں۔ اس کی کھال پر ایک سفید سی چیز پھیلی رہتی ہے اس پر چھوٹے چھوٹے دانے ابھرے رہتے ہیں۔ یہی دانے روشنی کا خزانہ ہوتے ہیں۔ نزدیک ہی ہوا کی ایک نلکی رہتی ہے۔ اس نلکی میں شاخیں سی نکلی رہتی ہیں۔ یہ شاخیں روشنی کے ان خزانوں میں گھسی رہتی ہیں۔

اب روشنی جگنو کی سانس سے پیدا ہوتی ہے۔ آپ نے پڑھا ہوگا کہ بہت سی چیزیں ہوا میں مل

. بالکل جلنے لگتی ہیں۔ یہ آکسیجن کی
. جگنو کی روشنی بھی اسی آکسیجن کی
ن ہے۔ اس کی پیٹھ پر جو سفیدی ہوتی
سے ملا ہوا مادّہ ہے۔ جگنو کے سانس
اس سفیدی پر ہوا لگتی ہے اور یہ
زیادہ ہوا لگتی ہے تو زیادہ چمکتی
ہے تو کم چمکتی ہے۔ جگنو سانس
ا کو بند کرلیتا ہے تو روشنی بھی ختم

ن روشنی پر حادثوں۔ مثلاً دھماکا ،
غیرہ کا اثر ہوتا ہے۔ لیکن مادہ
ھاری پر کسی آہٹ کا اثر نہیں ہوتا
تی ہے۔
میں ایک بات اور تعجب کی ہے، اگر
کر یہ دھاری الگ کرلی جائے تب
لی۔ وجہ یہ ہے کہ اس چمک دار
ست ہوا ملتی رہے گی۔ اس کی روشنی
میں نہیں قائم رہتی۔ اس پانی
۔

ے موسم میں جگنو زمین کے اندر چلے
ت زیادہ نیچے نہیں جاتے۔ زمین
روشنی قائم رہتی ہے۔ جگنو دوسرے
ندانی زندگی بسر نہیں کرتے وہ
ا کبھی ... تو ...

اور پھر ان کی طرف بالکل دھیان نہیں دیتے۔ ان کے انڈے بھی چمکتے ہیں اور بچے بھی۔

یہ سن کر آپ تعجب کریں گے کہ جگنو گوشت خور کیڑا ہے۔ چھوٹے چھوٹے گھونگھے اس کا من بھاتا کھاجا ہیں۔ اس کے شکار کرنے کا طریقہ بھی عجیب و غریب ہے۔ گرمیوں کے موسم میں گھونگھے کسی پودے کے سوکھے ٹھنٹھ پر چمٹے رہتے ہیں یا نم گڑھوں کے کنارے گھاس میں رہتے ہیں۔ جگنو پہلے تو گھونگھے کو خول کے اندر غور سے دیکھتا ہے پھر آہستہ سے اپنا ہاتھ باہر نکالتا ہے۔ یہ دو جبڑے ہوتے ہیں جو پیچھے کی طرف کانٹے (ہک) کی طرح مڑے رہتے ہیں۔ کانٹے کے نیچے باریک نلکی رہتی ہے۔ جگنو اس نلکی کو گھونگھے کے خول پر آہستہ آہستہ مار کر آہٹ پیدا کرتا ہے۔ ہر آہٹ کے بعد کچھ وقفہ رہتا ہے۔ پانچ چھ آہٹوں کا یہ اثر ہوتا ہے کہ گھونگھا بے ہوش ہو جاتا ہے۔ اس وقت وہ اس نلکی کے ذریعے اسکے اندر بے ہوش کرنے کے لیے ایک اور زہر داخل کر دیتا ہے۔ ایسا نہ کرے تو کچھ دیر کے بعد گھونگھا ہوش میں آ جائے۔ غرض اس طرح وہ اسے بالکل بے ہوش اور بے حس کر دیتا ہے اور تب مزے سے لے کر اسے کھاتا ہے۔ یوں سمجھیے کہ ہمارے سائنسدان کے کلوروفارم ایجاد کرنے سے بہت پہلے جگنو میاں کلوروفارم کا استعمال جانتے تھے اور استعمال کرتے تھے۔

جناب ملیح انجم اشرفی

لطیفے

ایک سیلزمین ایک اخبار کے دفتر میں گھسا اور بڑی خوش اخلاقی سے بولا۔

"کیا آپ کو ایک ایڈیٹر کی ضرورت ہے؟"

"جی نہیں!"

"پروف ریڈر کی؟"

"نہیں!"

"سیکریٹری کی؟"

"نہیں! اس وقت ہمارے یہاں کوئی جگہ خالی نہیں۔"

"تب" سیلزمین بولا "شاید آپ کو اس کی ضرورت ہے" اس نے اپنے بیگ میں سے دھات کی تختی نکالی جس پر لکھا تھا "کوئی جگہ خالی نہیں۔"

بیگم صاحبہ بازار سے لوٹیں اور نئی ماما سے پوچھا۔

"کیا تم نے میرے کہنے کے مطابق ریفریجریٹر صاف کر دیا تھا؟"

"جی بیگم صاحبہ!" ملازمہ خوش ہو کر بولی "اب اس میں کچھ نہیں ہے۔ ہر چیز بڑے مزیدار تھی۔"

بیگم صاحبہ کے پاس ایک ماما نوکری کی تلاش میں آئی۔ بیگم صاحبہ نے پہلا سوال کیا۔

"تم جانتی ہو کہ مہمانوں کی تواضع کیسے کی جاتی ہے؟"

"جی بیگم صاحبہ میں ان کی خاطر کے دونوں طریقے جانتی ہوں" عورت نے جواب دیا۔

"دونوں طریقے؟" بیگم صاحبہ حیران ہو کر بولیں

"مطلب یہ کہ ایسی خاطر بھی کر سکتی ہوں کہ دوبارہ واپس آئیں۔ اور ایسی بھی کہ کبھی آنے کا نام بھی نہ لیں" ماما نے جواب دیا۔

بیگم صاحبہ کو توتے پالنے کا بہت شوق تھا۔ گھر میں رنگ برنگ کے بہت سے توتے تھے ملازمت کی امیدوار عورت کو ہر طرح سے مناسب پا کر بیگم صاحبہ نے اس سے سوال کیا۔

"کیا تمھیں توتے اچھے لگتے ہیں؟"

"بیگم صاحبہ! میری کوئی خاص پسند نہیں عموماً ہر چیز کھا لیتی ہوں۔"

مالک:- "مجھے اس کام کے لیے ایک ذمہ دار آدمی کی ضرورت ہے۔"

ملازمت کا خواہش مند:- "جی ذمہ دار تو میں ہوں ہی حضور! جہاں بھی میں نے کوئی کام کیا اور جب مجھ سے کوئی غلطی ہوئی انھوں نے کہا کہ تم اس کے ذمہ دار ہو!"

پنچ تنتر کی کہانیاں

جناب رفیق شاستری



کی مٹکی

کسی شہر میں ایک فقیر رہتا تھا۔
اسے بھیک میں بہت سارا آٹا مل گیا۔ جتنادہ
تا تھا اس نے کھالیا۔ جو بچ رہا وہ اس نے
ی مٹکی میں رکھ کر چارپائی کے بائیں طرف
لگی ہوئی کیل سے لٹکا دیا اور چارپائی پر لیٹ

بہت دن بعد بھیک میں اتنا بہت سا آٹا
اس کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ کافی دنوں
اور تکلیف اٹھانے کے بعد ——— یہ آٹا اسے
کے خزانے جیسا لگ رہا تھا۔ طرح طرح کی

میں بھی اسے نہی آٹے کی مٹکی دکھائی دی۔ اس نے سوچا جب آٹا کافی مہنگا ہو جائے گا تو میں اس آٹے کو بیچ کر کافی روپیہ کماؤں گا۔ ان روپیوں سے میں بکری کے دو بچے خریدوں گا۔ تو جینے میں جب وہ بچے بڑے ہو جائیں گے تو میں انھیں بیچ کر ایک گائے خرید لوں گا۔ گائے کا دودھ بیچ کر میں بہت سارا روپیہ جمع کروں گا۔ پھر بھینس خرید لوں گا۔ بھینس کے دودھ سے پھر گھی بناؤں گا۔ گھی بیچ کر میں کافی کماؤں گا پھر اپنا مکان بناؤں گا۔ شادی کروں گا، گھر بساؤں گا۔ میرا ننھا بچہ آنگن میں کھیلے گا۔ ماں اسے کھلائے گی۔ اور میں اس کے کھیل دیکھا کروں گا۔ جب وہ ماں کی گود سے اتر کر میری گود میں آئے گا تو میں اسے کھلاؤں گا۔ باہر جانے کا وقت آئے گا تو میں اسے اس کی ماں کی گود میں دوں گا۔ اگر

خواب میں لات مارتے وقت فقیر کی ٹانگ سچ مچ چل گئی اور وہ مٹکی پر جا لگی۔ مٹکی ٹوٹ کر گر پڑی اور سارا آٹا وہاں پڑی ہوئی مٹی دھول میں مل گیا۔

مٹکی کے ٹوٹنے کے ساتھ فقیر کا خواب بھی ٹوٹ گیا۔

یہ کہانی سننے کے بعد سونے والے نوجوان نے کہا: "یہ بات تو سچ ہے۔ اس میں بھلا اس کا کیا قصور لالچ کی وجہ سے سبھی اپنے کئے کا پھل بھگتتے ہیں۔ کیا تم نے بندر اور شہزادوں کی کہانی نہیں سنی ہے؟"

چکر والے نوجوان نے کہا: "تو بھائی ذرا وہ کہانی بھی سناؤ۔"

سونے والے دوست نے تب شہزادے اور بندروں کی یہ کہانی سنائی۔

کسی شہر میں ایک راجا راج کرتا تھا۔ اس کے بیٹوں کو بندروں سے بہت پیار تھا۔ وہ بندروں سے کھیلتے اور انھیں اچھے اچھے کھانے کھلاتے۔ ان بندروں کا سردار کافی ہوشیار تھا۔ وہ زمانہ دیکھے ہوئے تھا۔ بندروں کو وہ زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتا رہتا۔ سارے بندر اس کا کہنا مانتے۔ شہزادے بھی بندروں کے اس بوڑھے راجا کی کافی عزت کرتے تھے۔

شہزادوں میں جو سب سے چھوٹا تھا۔ اس کی ننھی گاڑی بھیڑیں کھینچتی تھیں۔ گاڑی کو کھینچنے کے لیے راجہ کے محل میں کئی بھیڑیں پلی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک بھیڑ بہت لالچی تھی۔ وقت بے وقت باورچی خانے میں جا گھستی اور جو چیز سامنے آتی اس پر منھ مار دیتی باورچی خانے میں اسے گھسا دیکھ کر باورچی اس کی خوب مرمت کرتے اور کبھی کبھی تو کوئی جلتی ہوئی لکڑی ہی کھینچ کر مار دیتا۔ ایک بار وہی بھیڑ باورچی خانے میں گھس کر کھانے کو جوٹھا کر رہی تھی کہ چولھے پر کھانا پکاتے ہوئے باورچی کی نظر اس پر پڑ گئی اور اس نے وہیں سے ایک جلتی ہوئی لکڑی بھیڑ کے دے ماری۔ نشانا چوک گیا اور وہ بچ نکلی۔ یہ بات کہیں سے بندروں کا بوڑھا سردار بھی دیکھ رہا تھا۔ اس واقعہ کے بعد اس نے بندروں کو جمع کیا اور کہا: "ہمارا یہاں اب رکنا ٹھیک نہیں ہے۔ بھیڑ آج بچ گئی! کیا عجب جو کل بچ سکے ہم لوگوں کو یہاں سے بھاگ نکلنا چاہیئے۔"

یہ بات ہی کچھ ایسی تھی کہ بندروں کی سمجھ میں نہ آئی۔ ایک بندر بولا۔

"مگر جناب بھیڑ کے بچ نکلنے کا ہم سے کیا تعلق؟ ہم تو کبھی باورچی خانے میں جاتے نہیں۔ ہمارے سامنے تو شہزادے خود ایک سے ایک عمدہ کھانا لاتے ہیں اور ہمیں محبت سے کھلاتے ہیں۔"

دوسرے بندروں نے بھی ہاں میں ہاں ملائی اور کہا: "بھیڑ چاہے جلے یا بچے۔ ہمارا اس سے کیا تعلق؟ ہم تو یہاں ٹھاٹ سے زندگی گذارتے ہیں۔ ہم محل چھوڑ کر اور کہیں نہیں جائیں گے۔"

بوڑھا بندر بولا: "اب ہماری جان کا خطرہ ہے۔ ہمیں محل چھوڑ ہی دینا چاہیئے۔"

ے بندر بولا: "بھلا کیا خطرہ ہے ہمیں؟
بات سمجھ میں ہی نہیں آتی۔" تیسرے بندر
سردار سے ذرا خوشامدانہ انداز میں کہا کہ "ہماری
طرح آپ کو نظر آرہا ہے۔ ذرا ہمیں بھی تو بتایئے
؟"

ڑھے سردار نے آنکھ کھولتے ہوئے کہا: "ذرا
ر بھیڑ کو آگ لگ گئی تو وہ سیدھی اصطبل
گی۔ اپنی بالوں والی بھیڑوں کے جسم پر لگی
سے اصطبل میں بھی آگ لگ جائے گی،
سے کئی گھوڑے جل جائیں گے۔ ان گھوڑوں
نے کی راجا کو فکر ہوگی، اور تم جانتے ہو کہ
ے زخم کا علاج بندروں کی چربی سے کیا
بس پھر ہم لوگوں کی خیر نہ ہوگی اور ہمیں مروا کر
گھوڑوں کے زخم پر لگائی جائے گی۔"

جوان بندر بوڑھے بندر کی بات بہت دھیان
ہے تھے۔ جب بوڑھا سردار اپنی بات ختم کر چکا
ر بولا: "دھت تیرے کی۔ کیا دور کی کوڑی
ہ۔ ایسے سوچا جائے تو کوئی کبھی بھی اطمینان
ہ رہ سکے اور ہر وقت اپنی جان کے لالے
ں۔"

دوسرا بندر بولا: "یہ بوڑھا سردار اب خبطی
ڑھاپے میں اس کی عقل ماری گئی ہے۔ جو
باتیں کر رہا ہے۔ ہم تو اسی محل میں رہیں گے
محبت کو کون چھوڑ کر جاتا ہے۔"

تیسرے چوتھے اور پانچویں سبھی بندروں نے
ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا کہ "اس راج محل میں ہمیں
کافی آرام ہے اور ہم کہیں اور نہیں جائیں گے۔"

بوڑھے سردار نے کئی بار سمجھانے کی کوشش کی
مگر نوجوان بندر نہ مانے۔ ہار مان کر وہ بوڑھا بندر وہاں
سے چلا گیا۔ اور چلتے وقت آنکھوں میں آنسو بھر کر کہا۔
"بیوقوفو! تمہیں ایک دن اس لالچ کی بہت سخت سزا
بھگتنی پڑے گی۔ میں تو اب چلا!"

بوڑھے سردار کے جانے کے کچھ ہی دنوں بعد
وہی کچھ ہوا جس کی طرف سے اس نے اپنے نوجوان دوستوں
کو خبردار کیا تھا۔

وہی بھیڑ باورچی خانے میں گھسی اور باورچی
نے اس بار خوب نشانہ تاک کر جلتی ہوئی لکڑی اس کے
اوپر دے ماری۔ بھیڑ کے بدن میں آگ لگ گئی۔ وہ
باورچی خانے سے بھاگی اور سیدھے اصطبل میں گھس گئی۔
اصطبل میں اس کے گھستے ہی بھوسے میں آگ لگ گئی۔
اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ کی لپٹیں آسمان سے باتیں کرنے
لگیں۔ اصطبل کے بہت سے گھوڑے جھلس گئے۔ کچھ
کافی بری طرح جل گئے، کچھ مر گئے اور کچھ رسی تڑا کر
بھاگ کھڑے ہوئے۔

جب آگ بجھی تو جلے ہوئے گھوڑے باہر لائے
گئے۔ گھوڑوں کا علاج کرنے کے لیے وید بلائے گئے۔
وید جی نے یہ کہا کہ گھوڑوں کا علاج بندروں کی
چربی سے ہو سکتا ہے۔

باقی صفحہ ۵۸ پر

دلچسپ اور عجیب

کششی پتھر

سراندیپ کے جزیروں میں ایک بہت خوب صورت پتھر پایا جاتا ہے۔ جسے وہاں کے لوگ "ندباز" اور فارسی میں "جاذب موشاں" کہتے ہیں۔ وہاں چوہے بہت ہوتے ہیں اور بلی وہاں نہیں ہوتی۔ اس لیے لوگ یہ پتھر گھروں میں رکھتے ہیں۔ جو چوہا اس پتھر کے قریب سے گذرتا ہے فوراً بے ہوش ہوکر چند منٹوں میں تڑپ تڑپ کر مر جاتا ہے۔ اور اگر چوہا پتھر کے ساتھ چھو جائے تو اس کے ساتھ ہی چپک کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اور جب تک اسے خود پتھر سے جدا نہ کیا جاتے چپکا رہتا ہے۔

عجیب و غریب کتاب

لندن کا مشہور چھاپہ خانہ "کیمبرج شائر" ایک ایسی کتاب چھاپنے میں مصروف ہے جس کا وزن ایک ٹن ہوگا۔ اس کتاب کی پندرہ جلدیں چھاپی جائیں گی اور ہر جلد میں آٹھ سو صفحے ہوں گے۔ یہ کتاب امریکہ کی ڈھائی ہزار لائبریریوں کی کتابوں کی فہرست کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب پر تقریباً ایک کروڑ روپیہ صرف ہوگا۔ اور اس کی اشاعت سات سال میں مکمل ہوگی۔

دنیا کا سب سے بڑا جوتا

بوسٹن میں ایک بوٹ بنایا گیا ہے۔ جس کا سائز ایک سو اڑسٹھ اور لمبائی پینتیس فٹ ہے۔ اس پر پالش کرنے میں پورا ایک دن صرف ہوجاتا ہے۔ اور بوٹ کو چار آدمی اکٹھے مل کر پالش کرتے ہیں۔

عجیب و غریب لڑکی

لندن کے ایک ہسپتال میں "لوسی آنا" (LOCI AANA) نامی ایک لڑکی کو عجیب قسم کا مرض لاحق ہوگیا ہے۔ ڈاکٹر حیران ہیں اس کی عمر نو سال کی ہے۔ جب سے اسے ہسپتال میں لایا گیا ہے وہ متواتر باتیں کر رہی ہے ایک منٹ کے لیے بھی خاموش نہیں ہوتی۔ مزے کی بات یہ کہ بے تکی باتیں نہیں کرتی۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ زیادہ بولنے کی وجہ سے آہستہ آہستہ اس کی طاقت خرچ ہو رہی ہے اور تھوڑے عرصے میں وہ اس مرض میں مر جائے گی۔

...کشتی

...س میں ایسی کشتی ایجاد ہو رہی ہے۔ جس پر ... ماہی گیر نہیں ہوگا۔ اس کا تعلق کسی ٹاور ...سے ہوگا۔ یہ کشتی پن ڈوبی کی شکل کی ہوگی ...بہت نیچے تک مچھلیوں کو تلاش کرے گی۔ ...ں سمیٹے گی۔ جب مچھلیاں پھنس جائیں گی ...کار آلے کے ذریعہ پتہ چل جائے گا کہ ...ی جا چکی ہیں۔ اور انجینیر مشینوں کی مدد ...کھینچ لے گا۔

...ے لمبی مونچھیں

...نگاپور میں مدراس کا رہنے والا ایک ...ہے اس کی مونچھیں چونسٹھ انچ لمبی ہیں۔ ...اس قدر لمبا ہونے میں چار سال لگے۔ ...عہ اس نے چھ مہینے حجامت نہ بنوائی ...میں دس انچ بڑھ گئیں۔ اب وہ اپنی ...ائش کر کے سینکڑوں روپے کما رہا ہے۔

...ب سے زیادہ وزنی جوڑا

...ی امریکہ میں ایک میاں بیوی کا وزن ... جاتا ہے۔ اس سے زیادہ وزنی جوڑا ...کہیں نہ ملے گا۔ خاوند کا وزن چھ من ...ور بیوی کا وزن ۵ من سولہ سیر۔ خاوند ...سال۔ اور بیوی کی عمر ۳۵ سال ہے۔

...الی مچھلی

...کا سب سے لمبا دریا امریکہ میں ہے۔ اس کا نام مسی سی پی ہے۔ اس میں طرح طرح کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔ ان میں ایک قسم کی مچھلی کتے کی طرح بھونکنے والی ہوتی ہے۔

چوہے کی مہربانی

جرمنی میں ایک جگہ ریلوے لائن میں ایک جنگلی چوہا پھنس گیا۔ اس لیے گاڑی اپنی اصل لائن پر تبدیل نہ ہو سکی اور دوسری لائن پر چلی گئی۔ اس گاڑی کو اصلی لائن پر لانے میں ایک گھنٹہ صرف ہوا۔ گویا چوہے کی مہربانی سے گاڑی ایک گھنٹہ لیٹ ہو گئی۔

مکڑی کا جالا

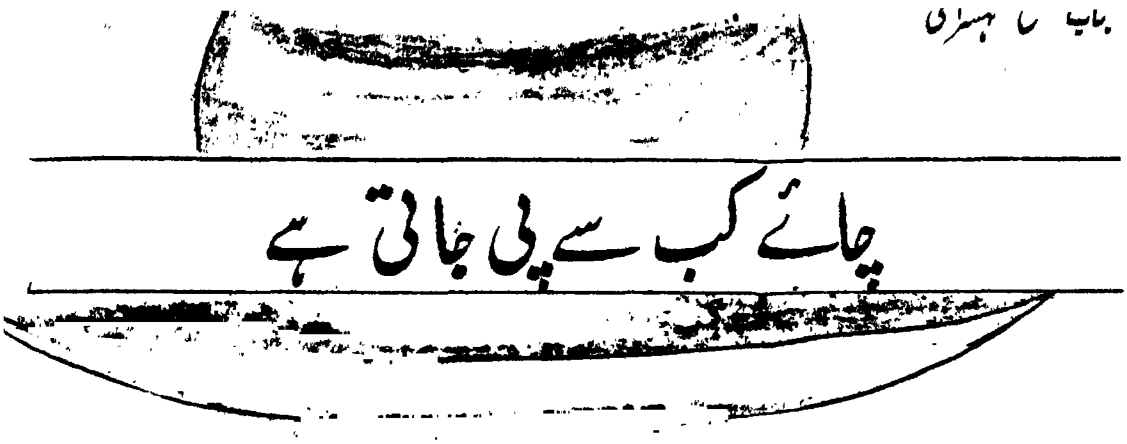
مکڑی کا ایک پونڈ جالا اتنا لمبا ہوتا ہے کہ اگر اسے دنیا کے چاروں طرف لپیٹ دیا جائے تو پانچ بار لپیٹا جا سکتا ہے۔

گیارہ فٹ کے کیچوے

کیچوے تو زمین کے قریب قریب سبھی حصے میں پائے جاتے ہیں۔ لیکن آسٹریلیا میں کیچوے کی ایک ایسی قسم پائی جاتی ہے۔ جس کی لمبائی گیارہ فٹ ہوتی ہے

چیونٹی کتنا وزن اٹھاتی ہے!

ایک چیونٹی اپنے وزن سے پچاس گنا زیادہ وزن اٹھا سکتی ہے۔ اسی تناسب سے اگر ایک آدمی اپنے وزن سے پچاس گنا وزن اٹھانا چاہے تو آٹھ ہزار پونڈ (۳۰۰۰ کلو) وزن اٹھانا پڑے گا۔



چائے کب سے پی جاتی ہے

یہ اس وقت کی بات ہے جب میں چھٹی جماعت میں پڑھتا تھا۔

ایک دن اسکول میں ایک آدمی آیا۔ اس کے ہاتھ میں بڑا سا ہینڈ بیگ تھا۔ وہ سیدھا ہیڈ ماسٹر صاحب کے دفتر میں چلا گیا اور ہم سب کو میدان میں جمع کیا گیا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر میدان میں جمع کرنے کی غرض کیا ہے؟

پھر وہی آدمی ہمارے درمیان آیا اور اس نے بتایا کہ میں چائے کا ایجنٹ ہوں۔ اور چائے کے بارے میں آپ کو کچھ بتانے آیا ہوں۔ میرے ساتھی اس بات سے خوش ہوتے ہوں یا نہ ہوتے ہوں، میں ضرور خوش ہوا کیوں کہ یہ آدمی کوئی نئی بات بتانے والا تھا۔ دوسرے لڑکے تو دھوپ کی تیزی کی وجہ سے طرح طرح کے بہانے بنانے لگے۔ لیکن میں پوری توجہ سے سننے لگا۔

اس ایجنٹ نے بتایا کہ سب سے پہلے چائے کا علم جنگل میں رہنے والے فقیروں کو ہوا تھا۔ آسام کے جنگل میں کچھ سادھو ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہاں کی زمین ڈھلوان ہے۔ اس لیے وہاں پانی مشکل سے ملتا تھا۔ اس لیے پانی کو حفاظت سے رکھا جاتا تھا۔ اتفاق سے ایک بار اس پانی میں چائے کی پتی ہوا میں اڑ کر پڑ گئی ...... اور اس کا عرق اتر گیا۔ جب فقیروں نے پیا تو انھیں محسوس ہوا کہ ان کی تھکن بہت حد تک دور ہو گئی ہے۔ اور پھر ان کے ذریعے ہی چائے عام لوگوں تک پہنچی۔

لیکن آج جب میں چائے کثرت سے پینے لگا ہوں میرے دل میں چائے کی تاریخ جاننے کی خواہش ہوئی کیوں کہ ایجنٹ کی بتائی ہوئی تاریخ جی کو نہ لگی۔ اور اب مطالعے کے بعد اس حقیقت کا پتہ لگا کہ چائے اصل میں چین کی پیداوار ہے۔ اس کا علم چین والوں کو پندرہ سو برس پہلے ہوا تھا۔ اور پندرہ سو برس سے وہاں چائے استعمال کی جارہی ہے چائے کی دریافت کا سہرا وہاں کے ایک بادشاہ کے سر ہے۔ ایک بار وہ کسی مہم سے واپس آرہا تھا، راستے

پیاس لگی۔ وہاں پانی مشکل سے ملتا تھا۔ ی گڈھوں میں جمع تھا اس میں پتیاں پڑی ں۔

جب پیاس برداشت سے باہر ہوگئی تو شاہ اور اس کے ہمراہیوں کو یہی پانی پینا ں بڑی حیرت ہوئی جب پانی پینے کے بعد تھکن میں کمی محسوس کی تجربے کے طور پر انھوں پتّی کو حفاظت سے رکھ لیا۔ اور جب تھک سے پانی میں ملا کر پیتے۔ اس طرح بادشاہ سے چین کے باشندے اس چیز سے واقف ور چائے —— رفتہ رفتہ روس، اور ایران وغیرہ میں بھی چین سے براہ راست ں کے لوگ بھی اس پتّی کو ابال کر پینے لگے۔ ت جی کو لگتی ہے۔ سادھوؤں کی بات تو نٹ صاحب نے خود گڑھ لی تھی۔ پھر ہندوستان ے لانے والے انگریز ہیں۔

سترھویں صدی میں جب انگریز چائے سے ئے تو انھوں نے اسے تیار کرنے کے نئے تیار کیے۔ یعنی اس میں دودھ ملا کر پینے لگے دیکھا دیکھی یہاں کے لوگ بھی دودھ کی نے لگے۔ کہیں کہیں خاص کر دیہاتوں میں شروع میں تو کہتے ہیں انگریز لوگ چائے ابال کر ب دیتے تھے، پتّی کھا جاتے تھے۔ چائے کو یقے پر استعمال کرنے کا طریقہ انھیں بعد میں معلوم ہوا۔

چائے میں دودھ نہیں بلکہ دودھ میں چائے ڈالی جانے لگی۔ لوگ چائے کو چائے کے لیے نہیں بلکہ دودھ اور شکر کے لیے استعمال کرنے لگے۔ سترھویں صدی میں انگریز دنیا کے بیشتر حصّوں پر قابض تھے اس لیے ہر جگہ دودھ کی چائے ہی پی جاتی۔ اور آج دنیا کے اسّی فیصد لوگ چائے میں دودھ ڈال کر استعمال کرتے ہیں، حد تو یہ ہے کہ خود چین کے بعض ساحلی باشندے بھی چائے میں دودھ ڈال کر پینے لگے ہیں۔

انیسویں صدی کے شروع میں جب چائے کی مانگ ساری دنیا میں شروع ہوگئی اور پیداوار کی کمی کے سبب قیمت زیادہ ہوگئی تب ہندوستان کے انگریز کسانوں نے سیلون اور دارجلنگ وغیرہ کے بلند اور مرطوب علاقوں میں چائے کی پیداوار کا تجربہ کیا۔ چین سے چائے کے پودے منگوائے گئے۔ لیکن ہندوستان کی زمین چائے کے موافق نہیں تھی اس لیے چین جیسی سفید اور سبز چائے تو نہ پیدا ہو سکی ہاں اسی شکل و صورت کی سیاہ پتّی ضرور پیدا ہوئی۔ اور اب یہی سیاہ پتّی چائے ہے اور ہم لوگ بڑے شوق سے پیتے ہیں۔ اور اس سیاہ پتّی میں بھی فرق کرتے ہیں کہ سیلون کی چائے دارجلنگ کی چائے سے بہتر ہوتی ہے۔

اور پھر بھی جو چائے مختلف ڈبّوں میں ملتی ہے۔ وہ اصلی پتّی نہیں رہتی ہے۔ وہ پتیاں

نہ جانے کتنی منزلیں طے کرتی ہیں۔ کئی چیزیں ان میں ملائی جاتی ہیں۔ ہوتے ہوتے اصل چائے آدھی سے بھی کم رہ جاتی ہے۔ اور یہی ڈبوں میں بند کی جاتی ہے۔

شاید ہی کوئی ایسا آدمی ہوگا جس نے چائے کبھی پی نہ ہو۔ چائے اس وقت کثرت سے استعمال ہونے والی چیز ہے۔ کسی کے یہاں ملنے جائیے وہ چائے ضرور پلائے گا۔ نہیں پلاتا تو شکایت ہوتی ہے۔ "بڑا بد اخلاق ہے صاحب! ایک پیالی چائے بھی نہیں پلائی۔"

چائے کو میٹھا زہر کہا گیا ہے۔ خاص کر ہندوستان جیسے ملک میں اس سے فائدے کم ہیں۔ نقصان زیادہ ہیں۔ چائے کی تاثیر گرم ہے۔ اور گرم مزاج رکھنے والوں کے لیے زیادہ نقصان دہ ہے۔ چائے نیند کو کم کرتی ہے، پینے والوں کو بد خوابی کے مرض میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اور بد خوابی سے نہ جانے کتنی بیماریاں جنم لیتی ہیں۔ معدہ خراب ہو جاتا ہے آنکھوں کی بینائی پر برا اثر پڑتا ہے۔ سر میں درد رہنے لگتا ہے۔ بھوک مر جاتی ہے اور انسان کی زندگی کے لیے دو اہم چیزوں یعنی کھانے اور نیند سے محرومی کا مطلب تباہی و بربادی ہے۔

چائے سے فائدے بھی ہیں۔

سرد مزاج یا نزلاوی مزاج رکھنے والوں کے لیے یہ اچھی چیز ہے۔ اس سے نزلہ زکام ... بہت حد تک کم ہو جاتا ہے، تھکن دور ہو جاتی ہے۔ تر و تازگی ملتی ہے۔ اور آدمی اپنے اندر کام کی امنگ اور حوصلہ محسوس کرتا ہے۔

چائے میں دودھ ملا دینے سے اس کی گرمی میں کمی ہو جاتی ہے۔ لیکن جو لوگ چائے کو چائے کے لیے پیتے ہیں وہ دودھ ملانے کے بدلے اس میں لیمو نچوڑ دیتے ہیں اس سے چائے کی لذت اور بڑھ جاتی ہے۔ کہتے ہیں روس میں اس کا رواج زیادہ ہے۔ اس طرح کی چائے کا نام ہی رشین ٹی یعنی روس کی چائے پڑ گیا ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ چائے ہندوستان جیسے گرم ملک کے لیے نہیں ہے۔ اس کا فائدہ عارضی ہوتا ہے اور نقصان دائمی۔ اور بھی سچی بات تو یہ ہے کہ حد سے زیادہ استعمال کرنے سے مفید چیز بھی مضر ہو جاتی ہے

تعلیمی تاش

چھوٹے بڑے سب ہی کے لیے ایک دلچسپ کھیل ہے۔
اس کے کھیلنے سے وقت ضائع نہیں ہوتا بلکہ قابلیت بڑھتی ہے

تعلیمی تاش اردو
" " انگریزی
" " ہندی
" " صرف ہندی

یلآز

چائے

واقف ہے اس سے دنیا تم کو بتاؤں بچّو
اس کا تعارف اب میں تم سے کراؤں بچّو

ہر مُلک ہر جگہ کے لوگ اس کے ہیں شناسا
سچ پوچھیے تو یہ بھی شربت ہے ایکتا کا

کالے ہوں یا ہوں گورے سب اس کے ہیں پجاری
مذہب کسی کا کچھ ہو، لگتی ہے سب کو پیاری

بوجھل ہو ذہن کوئی کر دے اُسے شگفتہ
اک پیالی چائے جیسے سب کے لیے ہے تحفہ

جب ہو تھکن کسی کو، بن جائے یہ مسیحا
ہر آدمی کے دُکھ کا کرتی ہے یہ مداوا

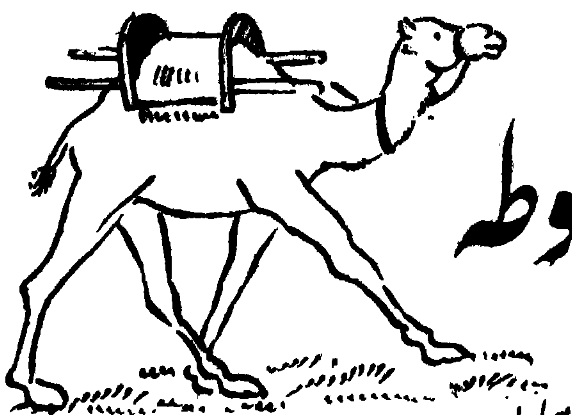
مہمان، دوست، اعزا، ہم دم ہے یہ سبھی کی
یہ تازگی کی دیوی ملکہ ہے اس صدی کی

ہے گھر میں راج اس کا، ہر اک دکان پر ہے
شام و سحر اسی کا قصّہ زبان پر ہے

ہر آدمی کے دل کو یکساں لبھا رہی ہے
یہ راز ایکتا کا ہم کو بتا رہی ہے

اس کی طرح نہ کیوں ہم دنیا کا دل لبھائیں
بن کر نشانِ الفت دنیا کے کام آئیں

مولانا مقبول احمد سیوہاروی



سفرنامہ ابن بطوطہ

(مسلسل)

پڑاؤ لگتے ہی امیروں کے لڑکے سجنیں لے کر آجاتے ہیں آگ جلا کر کباب سینکتے ہیں، چھوٹے سے ڈیرے میں بادشاہ خاص خاص امیروں کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ پھر دسترخوان بچھایا جاتا ہے۔ اور جسے بادشاہ چاہتا ہے اپنے ساتھ کھانے میں شریک کرتا ہے۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ بادشاہ خیمے میں تھا۔ پوچھا "باہر کون ہے؟" سید ناصر الدین مظہر جو بادشاہ کے ندیم تھے بولے، ابن بطوطہ مغربی ہے اور بہت اداس ہے۔

بادشاہ نے سبب پوچھا تو کہا۔

"غریب کی جان ضیق میں ہے۔ بادشاہ نے عذیر کو حکم دیا تھا وہ سفر پر چلا گیا۔ ملک دولت شاہ بھی موجود تھا کہنے لگا۔ "یہ ہر روز عربی میں مجھ سے کچھ کہتا ہے۔ میری سمجھ میں تو کچھ آتا نہیں۔ شاید ناصر الدین سمجھتے ہوں"۔ ناصر الدین اشارہ سمجھ کر بولا "کہتا کیا وہی قرضے کا دکھڑا سنتا ہوگا"

خداوندزادہ بھی حاضر تھا کہنے لگا "بڑا خرچیلا آدمی ہے میری اس کی ماوراالنہر میں ملاقات ہوئی تھی"

بادشاہ نے کہا اچھا جب ہم دارالخلافہ میں جائیں تو تم خزانے سے اس کو روپیہ دلوا دینا۔" بادشاہ نے مجھے دسترخوان پر بلایا۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ میرے بارے میں کیا باتیں ہو چکی ہیں۔ باہر آیا تو ناصر الدین نے کہا۔ "ملک دولت شاہ اور خداوندزادہ کا شکریہ ادا کرو کہ ان دونوں نے تیری سفارش کی ہے"

ایک دفعہ بادشاہ کا گذر میرے خیمے کی طرف ہو گیا۔ میرے ساتھیوں نے دیکھا تو کھڑے ہو کر سلام کیا۔ بادشاہ کو جب یہ معلوم ہوا کہ یہ میرا خیمہ ہے تو مسکرایا اور دوسرے دن مجھے خلعت دے کر شہر جانے کی اجازت دے دی۔

سید ناصر الدین اور ملک صبیح کو بھی خلعت مل گئے۔ اور شہر جانے کی اجازت مل گئی۔

ایک دن بادشاہ نے مجھ سے پوچھا "کیا

صراونٹ پر سوار ہوتے ہیں؟ میں نے کہا
ںوں میں مصر سے مکہ تک جاتے ہیں اور دس
پہنچ جاتے ہیں، نہ اونٹ ہندوستان میں
تے۔ پھر میں نے دلی آکر سانڈنی کی کاٹھی
یان بنواکر بانات سے منڈھوایا۔ اور زرّیں جھول
ریشم کی مہار تیار کرائی۔ رکابیں لگوائیں اور ایک
، جسے حلوہ تیار کرنے میں کمال حاصل تھا مختلف
حلوے بنوائے جس میں ایک حلوہ کھجور کی صورت

حلوہ اور سانڈنی جسے آراستہ کیا گیا تھا بادشاہ
ت میں پہنچا۔ اور لے جانے والے سے کہہ دیا کہ
ت شاہ کے سپرد کر دینا۔ ایک گھوڑا اور
ملک شاہ کے لیے بھیجے یہ سب سامان پہنچا تو ملک شاہ
ناہ سے عرض کیا۔ اخوند عالم آج میں نے ایک
ینر دیکھی ہے"۔ بادشاہ نے کہا کیا؟ "دولت شاہ
کیا" اونٹ پر کاٹھی!!" بادشاہ نے حکم دیا
لاؤ!" سانڈنی کو خیمے میں لے گئے تو بادشاہ
رش ہوا اور آدمی سے کہا "سوار ہو کر دکھاؤ"
وار ہوا اور دوڑ کر دکھایا تو دو دن تو دہم اور ایک
دیا، مجھے جب معلوم ہوا کہ بادشاہ نے اونٹ
دیا ہے تو دو پالان اور بنوائے۔ آگے پیچھے چاندی
زر دوزخانہ دار کم خواب کا جھول ڈلوایا ملمع شدہ
کے گھنگھرو پاؤں میں باندھے۔ گیارہ طباق
کے تیار کرائے بادشاہ نے شکار سے واپس

آکر دربار عام کیا تو یہ سب سامان پیش کر گیا۔ بادشاہ نے طباقوں کو دیکھ کر کہا کیا ان میں حلوہ ہے؟ میں نے کہا جی حضور!! بادشاہ نے کہا اس دن کا حلوہ خوب تھا، مگر اس کا نام کیا ہے؟۔ میں نے کہا حلوہ بہت سی قسم کا ہوتا ہے، حضور کس حلوے کو پوچھتے ہیں۔ بادشاہ نے طباق منگوا کر حلوہ دکھایا۔ میں نے کہا۔ سرکار اسے لقیمات القاضی کہتے ہیں۔ دربار میں بغداد کا ایک سوداگر بھی تھا۔ بادشاہ اسے باپ کہتا تھا۔ اور اس کی بڑی عزت کرتا تھا۔ اس نے مجھے بادشاہ کے سامنے شرمندہ کرنے کے لیے کہا۔ یہ لقیمات القاضی نہیں ہے اور حلوائے جلد الفرس کا طباق اٹھا کر کہا لقیمات القاضی یہ ہے۔

ناصر الدین بردہی سوداگر کے پاس ہی بیٹھا تھا اس کی حاضر جوابی کا تمام دربار لوہا مانتا تھا۔ یہ سوداگر کی ہنسی اڑایا کرتا تھا۔ برجستہ بولا "خواجہ صاحب آپ جھوٹ کہتے ہیں۔ قاضی سچا ہے" بادشاہ نے کہا "یہ کیسے"؟ ناصر الدین نے کہا "یہ قاضی ہے اور قاضی سے بہتر کون جان سکتا ہے کہ اس کا لقمہ کیا ہے"۔ اس پہ بادشاہ ہنس پڑا اور سوداگر اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ کھانے کے بعد حلوہ کھایا گیا اور ہم پان لے کر رخصت ہو گئے۔ ابھی باہر بھی نہ نکلے تھے کہ خزانچی آیا اور بولا۔ "آدمی بھیجو اور رقم اٹھوا منگاؤ۔ میں نے آدمی ساتھ کر دیا۔ شام کو گھر پہنچا تو روپے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔

پچیس ہزار تو مجھے قرض میں دیئے گئے تھے اور بارہ ہزار کے انعام کا حکم ہو چکا تھا

سلطان قطب الدین کا مقبرہ

شاہی دستور ہے کہ میت کا جوتا قبر کے پاس ایک چوکی پر رکھ دیتے ہیں۔ بادشاہ کسی زمانے میں قطب الدین کا ملازم تھا۔ اس لیے جب کبھی سلطان قطب الدین کے مقبرے پر جاتا سلطان قطب الدین کی پاپوش اٹھا کر چومتا اسر پر رکھتا۔ اور جس طرح زندگی میں تعظیم کرتا تھا۔ مقبرے میں پہنچ کر تعظیم بجالاتا۔

سلطان قطب الدین کی بیوہ کی بھی بے حد تعظیم کرتا اور بہن کہتا۔ قاضی مصر کے ساتھ نکاح کر دیا تھا تو قاضی کی تعظیم کرتا،

انہی دنوں سید حسن شاہ کی بغاوت کی خبریں آنے لگیں۔ بادشاہ نے معبر پر چڑھائی کی اور مجھے بلا کر حکم دیا کہ سلطان قطب الدین کے مقبرے کی نگرانی کرتے رہو۔ میں نے کہا مقبرہ کا خرچ زیادہ ہے اور آمدنی کم ہے چار سو ساٹھ آدمیوں کا انتظام کرنا پڑتا ہے۔

بادشاہ نے وزیر کو بلا کر ہدایت کی کہ ایک لاکھ من غلہ اور چاول دے دیئے جائیں۔ اور جب تک مقبرے کی جاگیر کا غلہ آئے اس غلے سے کام چلایا جائے۔ پھر کہا اور کچھ؟ میں نے کہا میرے ہمراہی قیام میں ہیں انھیں معاف کیا جائے اور جس

مکان میں میری رہائش ہے وہ ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اس کی مرمت کی اجازت دی جائے۔" بادشاہ نے کہا۔ "یہ دونوں باتیں منظور ہیں۔ پھر بادشاہ نے شفقت سے کہا۔

"ابن بطوطہ قرض نہ لیا کر اور جتنا میں تجھے دوں اس سے زیادہ خرچ نہ کیا کر۔ ممکن ہے ہمیں خبر نہ ہو اور قرض خواہ تجھے ستائیں۔"

میں نے قدم بوس ہونا چاہا مگر بادشاہ نے میرا سر پکڑ کر روک دیا اور فقط دست بوسی کی اجازت دی۔

میں نے گھر کی درستی شروع کرا دی۔ چھ سو اشرفیاں شاہی خزانے سے ملیں اور کچھ پاس سے لگا مکان کے سامنے ایک مسجد بنوائی اور سلطان قطب الدین کے مقبرے کا انتظام کرنے لگا۔

بادشاہ چاہتا تھا کہ سلطان قطب الدین کا گنبد سو ہاتھ کا تعمیر کیا جائے اور بیس گاؤں وقف کے لیے خریدنے کا مجھے حکم دیا تھا تاکہ دس فیصدی منافع مجھے مل جائے۔ یہ بھی دستور ہے کہ بادشاہوں کی قبر پر ہاتھی گھوڑے بندھے رہتے ہیں اور جو چیزیں ان کی زندگی میں ضروری تھیں رکھی جاتی ہیں ہر وقت صفائی اور سجاوٹ رہتی ہے۔

مقبرے کا انتظام میرے سپرد ہوا تو میں نے ڈیڑھ سو قرآن پڑھنے والے جنھیں ختمی کہتے ہیں ملازم رکھے۔ ایک مدرس رکھا۔ اسّی درویشوں کے لیے کھانے

م کیا فرش بچھانے والے ۔ کھانا کھلانے والے
نے والے ۔ آب دار (سقے) نیزہ بردار،
، طشت دار، حاجب، نقیب، چوب دار،
۔ یہ سب چار سو ساٹھ کا عملہ تھا۔ بادشاہ
، تھی کہ ہر روز بارہ من آٹا اور بارہ من
'یا جائے ۔ میں نے ۳۵ من گوشت پکایا۔
ں اور پانوں کا خرچ الگ تھا۔ دونوں عیدوں
والنبی کے دن ۔ عشرہ کے دن، شبرات میں
، قطب الدین کی وفات کے دن ۔ سو من
سو من آٹا پکوایا اور مسکینوں فقیروں کو کھلایا
ے گھروں میں خوان لگا کر بھیجے جس سے مخط
ں بڑی مدد ملی اور میری بڑی شہرت

ت صحیح جب بادشاہ کے پاس دولت آباد
بڑی تعریف کی اور کہا اگر دو چار نوکر
ل تو دلی کے غریبوں کو ذرا تکلیف نہ
ن کر بادشاہ بہت خوش ہوا اور اپنی پوشش
بھیجا ۔
یر نے دس ہزار من غلہ مجھے دے دیا تھا ۔
ت لکھ دیا تھا کہ امروہہ سے حاصل کیا جائے ۔
یہ کا امیر شمس الدین بدخشانی اور حاکم
۔ میں نے اپنے آدمی بھیجے تو جتنا غلہ لانا
ئے اور عزیز خمار کی شکایت کی مجبوراً
جانا پڑا ۔ امروہہ کا علاقہ دلی سے تین دن
کی مسافت پر ہے ۔ میرے ساتھ ۳۳ آدمی تھے ۔
راستے کی دلچسپی کے لیے میں نے اپنے ساتھ دو گویّے
لے لیے تھے ۔ یہ دونوں بھائی تھے اور بہت اچھا گاتے
تھے ۔ بجنور پہنچ کر تین گانے والے اور مل گئے ۔ یہ بھی
تینوں بھائی تھے اور خوب گاتے تھے ۔ راستہ بڑا پُرلطف
گزرا ۔

امروہہ چھوٹا سا خوب صورت شہر ہے ۔ شہر
کے قاضی شریف علی اور خانقاہ کے شیخ ملنے آئے ۔
عزیز خمار اس وقت افغان پورہ میں تھا ۔
امیر شمس الدین اور امیر خمار کا باہمی جھگڑا بھی
تھا جسے طے کرنے کا مجھے امیر آلمالک اور شہاب الدین
رومی کو اختیار دے دیا گیا تھا ۔
مقدمہ پیش ہوا اور میں نے امیر شمس الدین
کے ملازم کو جس کا نام رضی تھا اسّی کوڑوں کی سزا
دی کیوں کہ اس نے شراب پینے کا اقرار کر لیا تھا ۔ امروہہ
سے افغان پورہ جانے میں ندی پڑتی ہے ۔ کشتی نہیں تھی
اس لیے لکڑی اور گھاس کی کشتی بنا کر اپنا سامان
افغان پورہ بھیجا اور دوسرے دن خود گیا ۔ عزیز خمار
کے بھائی نجیب نے ہمارا استقبال کیا ۔
(باقی آئندہ پڑھیے)

خط و کتابت کرتے وقت اپنا
خریداری نمبر ضرور لکھیے
"منیجر"

جناب سید ن مہر

گراموفون

دیکھیے آج میں ایک بات کہتا ہوں۔ شاید آپ کو یقین نہ آئے اور بہت سے میاں میری بات سن کر مسکرا دیں: ایک معمولی سوئی چٹکی میں دبا کر اور گھومتے ہوئے ریکارڈ پر رکھ کر گانا سن سکتا ہوں، ہے نا عجیب بات! پر آپ خود تجربہ کر کے دیکھ لیجیے!

ایک سوئی لیجیے۔ وہی سینے پرونے کی معمولی سوئی۔ پہلے گراموفون میں چابی بھر دیجیے۔ گراموفون کی پلیٹ پر ریکارڈ رکھ کر چلا دیجیے۔ پھر سوئی کو چھید کی طرف سے چٹکی میں دبا کر ریکارڈ پر رکھ دیجیے۔ اسے لیجیے۔ آنے لگی گانے کی آواز! ہے نا حیرت کی بات!

لیکن اگر آپ یہ جان جائیں کہ ریکارڈ میں آواز کیسے بھر جاتی ہے اور دوبارہ کیسے سنی جاتی ہے تو آپ کی حیرت ختم ہو جائے گی۔

بچپن میں کبھی گراموفون بجتا تو میں سوچ میں پڑ جاتا۔ یہی سمجھ میں آتا کہ اس ڈبے میں شاید چھوٹے چھوٹے بونے قید کر دیے گئے ہیں۔ سوئی چبھتے ہی گانے لگتے ہیں۔ اب جب کبھی بچپن کے اس طفلانہ خیال کی یاد آتی ہے تو بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔ ایک ننھا سا دماغ اور سوچ بھی کیا سکتا تھا۔ شاید آپ میں سے ننھے پیارے کچھ اسی طرح سوچتے ہوں

پھر یہ ریکارڈ بھرنے کی بات چلی کیسے؟

پہلے پہل دو سائنس دانوں۔ اسکاٹ (SCOT) اور کوئنگ (KOENIG) نے آواز کو ریکارڈ کرنے اور اس ریکارڈ سے دوبارہ آواز پیدا کرنے کے تجربے کیے — یہ ۱۸۴۶ء کی بات ہے۔ سو برس سے بھی پہلے کی۔ دونوں سائنس دان اپنے تجربوں میں کسی حد تک کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ مگر پوری کامیابی تو ایڈیسن ہی کو ہوئی۔ ایڈیسن نے اپنی بنائی ہوئی مشین کا نام فونوگراف (PHONOGRAPH) رکھا۔ آج کل کے گراموفونوں میں اس مشین سے کئی گنا زیادہ اچھی آواز نکلتی ہے۔ پھر بھی اہمیت اسی مشین کو حاصل ہے جس نے اس عمارت کو اوپر اٹھانے کے لیے بنیاد کا کام دیا۔ یہ مشین لندن کے عجائب گھر میں حفاظت سے رکھی ہے!

ریکارڈ کرنے کا طریقہ معلوم کرنے سے
سمجھیے کہ آواز کیا چیز ہے ۔ درحقیقت آواز
ہیں ۔ یہ تو وہ لہریں ہیں جو زبان کے ہلنے یا لرزنے
۔ ہوا کی یہ لہریں کان تک پہنچتی ہیں اور
ے سے ٹکراتی ہیں ۔ اس ٹکرانے سے کان کا
رنے لگتا ہے ۔ پردے کی کپکپاہٹ دماغ
دماغ اسے آواز میں بدل دیتا ہے اور
لگتے ہیں ۔ اصل میں یہی عمل ہے سننے
۔ بولنے سے جو لہریں پیدا ہوتی ہیں وہ
کے پردے پر اثر انداز ہوتی ہیں اور یہ
دماغ محسوس کر لیتا ہے ۔ مختلف قسم
میں فرق دماغ خوب محسوس کر لیتا ہے ۔ یہی
ت یا لفظ بننے کا سبب بنتی ہے ۔ ہر سیکنڈ میں
رتی ہے وہ یکساں نہیں ہوتی ۔ لرزشیں کبھی
تی ہیں کبھی کم ۔ اسی کمی بیشی سے حرف بنتے ہیں ۔
واز ریکارڈ کرنے کا طریقہ بھی سن لیجیے :
یک پلیٹ بنائی جاتی ہے ۔ یہ پلیٹ موم
سالوں کو ملا کر بنائی جاتی ہے ۔ آج کل جو
تی ہیں وہ لاکھ اور چیڑہ وغیرہ ملا کر بنائی
سالوں سے پلاسٹک کی پلیٹیں بھی بننے لگی

آواز اسی مختلف مسالوں سے یا پلاسٹک
یٹ میں بھری جاتی ہے ۔ مگر کس طرح
؟

یہ پلیٹ ایک مشین کے ذریعے گھمائی جاتی ہے ۔

پھر ایک پیالے جیسی چیز بنائی جاتی ہے ۔ اس پیالے کا پیندہ ایک جھلی کا ایسے پر کا بنا ہوتا ہے جو ہوا کی ذرا سی لرزش سے کپکپانے لگتا ہے ۔ اسے ڈایافرام کہتے ہیں ۔ ڈایافرام سے منسلک ایک سوئی لگا دی گئی اب پلیٹ پر چکر دار لکیریں کھینچ دی گئیں اور پلیٹ کے اوپر پیالہ اس طرح رکھ دیا گیا کہ نیچے لگی ہوئی سوئی سب سے پہلی لکیر پر آ کر ٹک گئی اور مشین میں چابی بھر کر پلیٹ کو گھما دیا گیا پلیٹ گھومنے اور چکر کھانے لگی ۔ یہ خیال رکھا گیا کہ پلیٹ گھومنے کی رفتار یکساں رہے ۔

یہ سب کچھ ہو چکا تو ہم نے بولنا شروع کیا ۔

بولنے سے ہوا میں لہریں پیدا ہوئیں ، یہ لہریں ڈایافرام سے ٹکرائیں ۔ ان لہروں سے ڈایافرام میں بھی کان کے پردے جیسی ہل چل یا کپکپاہٹ پیدا ہوئی ۔ ڈایافرام کے ساتھ سوئی لگی ہوئی ہے ۔ ڈایافرام کی کپکپاہٹ کا اثر سوئی پر بھی ہوا ۔ یہ سوئی بھی کپکپانے لگی ۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی گھنٹے پر موگری کی چوٹ پڑنے پر گھنٹہ ہلنے لگتا ہے اور وہ تار بھی ہلنے لگتا ہے جس میں گھنٹہ لٹکا ہوا ہے ۔

تو صاحب ہماری زبان جیسے موگری ہوئی یہ گھنٹے نما ہوا کو کپکپانے پر مجبور کر دیتی ہے ۔ یہ ہوا یا اس کی لہریں ڈایافرام کو کپکپا دیتی ہیں ۔ ڈایافرام کے ساتھ سوئی بھی کپکپانے لگتی ہے اور کبھی اوپر اور کبھی نیچے ہوتی ہے ۔ سوئی کے اس طرح اونچے نیچے ہونے سے اس نرم پلیٹ پر گڑھے

پڑجاتے ہیں۔ جیسے جیسے ہم بولتے جاتے ہیں۔ سوئی پلیٹ میں گڈھے ڈالتی جاتی ہے۔ اس طرح پوری پلیٹ میں گڈھے پڑجاتے ہیں تو اسے ٹھنڈا کرنے کے لیے رکھ دیا جاتا ہے۔ ٹھنڈی ہوجانے کے بعد یہ پلیٹ سخت ہوجاتی ہے۔ تو جناب یہ طریقہ ہے پلیٹ میں آواز بھرنے کا۔

اس بھرے ہوئے ریکارڈ سے دوبارہ آواز پیدا کرنے کے لیے اسے گراموفون پر رکھنا پڑتا ہے۔ بنیادی طور پر یوں سمجھیے کہ گراموفون میں وہی ڈایافرام کے پیندے والا پیالہ ہوتا ہے۔ ڈایافرام سے منسلک سوئی چلتے ہوئے ریکارڈ پر رکھی جاتی ہے۔ ریکارڈ کی لکیروں پر پڑے ہوئے گڈھوں کی وجہ سے سوئی اور اس کی وجہ سے ڈایافرام میں کپکپاہٹ پیدا ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہی آواز پیدا ہوجاتی ہے جو ریکارڈ میں بند کی گئی تھی۔

اب آپ اس بھرے ہوئے ریکارڈ پر صرف ایک سوئی رکھیے۔ یہی معمولی سینے والی سوئی۔ اس سوئی کے کپکپانے سے ہوا آگے پیچھے ہٹے گی۔ اب ڈایافرام تو ہے نہیں اس لیے یہ لہریں بہت کمزور ہونگی پر ہوں گی ضرور۔ اس لیے کان کو قریب لانے کے بعد آواز سنائی دے گی۔ اور میں نے جو دعویٰ کیا تھا کہ "محض معمولی سوئی کی مدد سے ریکارڈ کا گانا سن سکتا ہوں" بالکل درست ثابت ہوا۔

گراموفون کی مشین اسی اصول کے مطابق کام کرتی ہے۔ بس اتنا فرق ہوتا ہے کہ ڈایافرام سے بننے والی لہریں ہمارے کانوں تک سیدھی نہیں آتیں بلکہ نلکی میں ہوکر لاؤڈ سپیکر تک جاتی ہیں۔ تاکہ آواز تیز ہو۔ بجلی سے چلنے والا گراموفون ریکارڈ پلیئر کہلاتا ہے۔ ریکارڈ وہی کام دیتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ سوئی کپکپانے سے ایک خاص اصول کے تحت بجلی بنتی ہے۔ یہ بجلی سوئی کی کپکپاہٹ کے کم زیادہ ہونے سے کم زیادہ طاقت میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ بجلی لاؤڈ سپیکر تک جاتی ہے۔ اور وہاں آواز میں بدل جاتی ہے۔ ●

بقیہ جھاڑو

پتہ ہی نہیں چلا اور وہ لوٹ کر ہی نہیں آیا۔"

یہ سن کر ڈیٹو نے نہایت سنجیدگی سے مشورہ دیا۔ "بھئی ٹھیک سے دیکھ لو نہ جانے پھر اس دم دار تارے کے درشن ہوں یا نہ ہوں۔" حسان نے سنجیدگی سے موٹی اماں کی نقل اتارتے ہوئے کہا۔ "اے نوج لعنت بھیجو۔ میں تو کہوں ان سب پہ خاک پڑے جھاڑو پھرے کل کے ہوتے یہ آج ہی غائب ہو جائیں۔ موئے آفت ہی تو لاتے ہیں۔" اور تینوں بھائی ہنسنے لگے۔ ●

کل ہند مضمون نگاری کے انعامی مقابلے کی تاریخیں بدل گئیں

ادارہ بیدار (۲۲۷ ہیری باؤلی حیدرآباد ۲) کی طرف سے جولائی کے پرچے میں کل ہند انعامی مقابلے کا اعلان شائع ہوا تھا مقابلے کی آخری تاریخ ۱۲ جولائی مقرر کی گئی تھی، مگر اب یہ ۳۰ ستمبر تک بڑھا دی گئی ہے

کتابوں کی باتیں

ابوالکلام آزاد

لکھنے والے جناب وقار خلیل

مولانا ابوالکلام آزاد پر یہ کتاب بچوں کے لیے
ہے پڑھنے والوں کی سہولت کے لیے اس چھوٹی سی کتاب
بابوں یا عنوانوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ مولانا آزاد
ن، مولانا کی پیدائش، بچپن کی تعلیم و تربیت،
سے تقریر کا بحث و مباحثہ کا شوق۔ اردو
ے شروع ہوئی، عربی فارسی میں مہارت، ترکی
ے واقفیت، مطالعے کا شوق۔ شاعری سے
باروں کی ایڈیٹری۔ پیری مریدی سے نفرت
میں بڑے بڑے لوگوں سے تعلقات، دیس کی
میں ان کا شریک ہونا اور بھرپور حصہ لینا اور
میں ان کا انتقال۔

مولانا آزاد ہمارے دیس کے ان چند گنے چنے
ں سے تھے جو دنیا میں کبھی کبھی پیدا ہوتے ہیں
ے عالم تھے۔ غیر معمولی طور پر ذہین تھے
سوجھ بوجھ اور سلجھا ہوا دماغ رکھتے تھے۔ بہت
مرنج اور صلح کل تھے۔ اپنے بڑے سے بڑے
کے لیے بھی دل میں گنجائش رکھتے تھے۔ کبھی
کسی کے خلاف انھوں نے ایسی ویسی بات نہیں کہی۔

بڑوں کے لیے مولانا آزاد پر بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ جو سچ پوچھیے تو مولانا آزاد جیسے غیر معمولی اور بھاری بھرکم لوگوں پر بڑوں کے لیے لکھنا بھی کوئی آسان بات نہیں۔ بچوں کے لیے تو اور بھی مشکل ہے۔ وقار خلیل صاحب نے مولانا کی زندگی میں سے ایسی باتوں کو چن لیا ہے جو بچوں کے لیے مفید اور کارآمد ہیں اور پھر انھیں اس ڈھنگ سے پیش کیا ہے کہ بچے ان سے سبق لیں، ان میں ایک طرف ولولہ اور امنگ پیدا ہو دوسری طرف وہ ان سے انسانیت اور شرافت کا سبق سیکھیں کتاب کی زبان بھی بہت سادہ ہے اور دل پر اثر کرنے والی ہے۔ بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ ۳۲ صفحے کی ننھی سی کتاب میں مولانا آزاد کی زندگی کی تمام ضروری باتیں آگئی ہیں۔ اور مصنف کے الفاظ میں یہ سچ مچ روشنی کا مینار بن گئی ہے۔ کتاب کی لکھائی چھپائی پر خاص توجہ کی گئی ہے۔ کاغذ بھی بہت قیمتی لگایا گیا ہے۔ ٹائیٹل پر مولانا آزاد کی تصویر ہے۔ اس تصویر میں انھیں ہنستے کھیلتے بچوں کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ ٹائیٹل کے آخری صفحے پر دو تصویریں اور ہیں۔ یہ بھی تاریخی اہمیت

رکھتی ہیں، ایک میں مولانا حیدرآباد کے مرحوم نظام کے ساتھ کھڑے ہیں۔ دوسری ان کی میت یا جنازے کی تصویر ہے اور آخری دیدار کے لیے ان کی کوٹھی کے باہر رکھی گئی ہے۔ کتاب ۵۰ پیسے میں ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد (دکن) سے مل سکتی ہے۔

میں نے مضمون نویسی کیسے سیکھی!

لکھنے والے: جناب مائل خیرآبادی

یہ اپنے ڈھنگ کی انوکھی کتاب ہے۔ لائق مصنف نے بہت اچھے انداز میں لکھنے کے گُر بتاتے گئے ہیں۔ خوبی کی بات یہ ہے کہ بالکل ابتدا یا یوں کہیے کہ الف بے سے شروعات کی ہے۔ مثلاً پہلے آپ بیتی لکھنے کی مشق کرنا، پھر آنکھوں دیکھا حال لکھنا۔ پھر خط لکھنا۔ پھر قصے لکھنا، کہانیاں لکھنا۔ پھر افسانہ لکھنا۔ اور پھر سب سے آخر میں مضمون لکھنا۔

مائل صاحب نے بتایا ہے کہ آپ کو لکھنے پڑھنے میں کچھ شدبد ہو جائے تو سب سے پہلے آپ بیتی لکھنے کی کوشش کیجیے۔ پھر دھیرے دھیرے اوپر لکھی ہوئی دوسری باتوں کی طرف قدم اٹھائیے۔ انھوں نے یہ سب باتیں اچھی طرح سمجھانے کے لیے قدم قدم پر مثالیں بھی دی ہیں۔ کتاب کو دلچسپ بنانے کے لیے انھوں نے اسے آپ بیتی کی شکل میں پیش کیا ہے۔ پڑھنے والوں کو ایسا لگتا ہے کہ مصنف خود اپنی آپ بیتی سنا رہا ہے۔ اور مضمون نگار یا مصنف بننے کے لیے اسے خود اسی منزل سے گزرنا پڑا ہے۔ اس انداز بیان کی وجہ سے کتاب سچ مچ اتنی دلچسپ ہو گئی ہے کہ پڑھنے والا کتاب شروع کرنے کے بعد ختم ہی کر کے دم لیتا ہے۔ یہی نہیں اس کے دل میں امنگ اور حوصلہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ اور یہ بات بھی کہ مضمون لکھنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں کتاب میں لکھی ہوئی ہدایتوں کے مطابق مشق کی جائے تو ہم بھی مصنف بن سکتے ہیں۔ اور یہ بہت بڑی بات ہے۔ مضمون نویسی سکھانے کے لیے اردو میں اس انداز کی یہ پہلی کوشش ہے۔ اور بہت کامیاب ہے۔ کتاب بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ اس لیے یہ ساری باتیں کل چالیس صفحوں میں آ گئی ہیں۔ لکھائی چھپائی بھی اچھی خاصی ہے۔ ٹائیٹل تین رنگ کا ہے اور بہت خوبصورت ہے۔ پچاس پیسے میں۔ مرکزی مکتبہ جماعت اسلامی ہند سے مل سکتی ہے۔ ●

(بشکریہ آل انڈیا ریڈیو)

بقیہ پنج منتر کا

راجا نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ بندروں کو مار کر ان کی چربی ویدجی کو لا کر دیں۔ راجا کا یہ حکم ہوتے ہی سپاہیوں نے ایک ایک کر کے تمام بندروں کو مار دیا۔

سارے بندروں کے مارے جانے کی خبر جب بوڑھے سردار کو لگی تو اس کے دل میں راجہ سے بدلہ لینے کا خیال پیدا ہوا اور وہ اس کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ ●



ا کی کوششیں

ر

ہر کا وقت تھا، کافی گرمی تھی۔ ایک
ا دوڑتا ہوا ایک باغ میں پہنچا اور ایک
ے کے پاس جا کر اپنا گھوڑا روکا۔ آم خوب
، چور گھوڑے پر کھڑا ہو گیا اور ایک شاخ
اپنے جھولے میں بھرنے لگا۔ باغبان اپنی
بیٹھا ہوا باغ کی دیکھ بھال کر رہا تھا چور
ب لاٹھی لے کر اس کے پاس پہنچا اور کہا کہ
ا چور ہے ہو!"
ڑا باغبان کی آواز سن کر اور اس کی لاٹھی
ی طرف بھاگا۔ گھوڑ سوار نے جھٹ
لی سے پکڑ لیا اور جھولنے لگا۔ اور بولا
ے بھئی میں چور نہیں ہوں تم غلط سمجھ رہے
شریف سوداگر ہوں میرا گھوڑا بدک گیا
رہا تھا اس لیے درخت کی شاخ پکڑ لی۔

رشید احمد اعظمی اعظم گڑھ

چند پھلوں کے خواص

سیب:۔

یہ بہت فرحت بخش پھل ہے۔ دل اور جگر کو طاقت دیتا ہے اور معدہ پر بھی اچھا اثر کرتا ہے۔ اس کا مربّہ بہت مزیدار اور طاقتور ہوتا ہے۔ زیادہ تر دل کے مریضوں کو اس کا مربّہ کھلایا جاتا ہے۔ اس کے پتّوں کا عصارہ (پتّوں کا رس) بچھو کے کاٹے پر لگانے سے بہت فائدہ دیتا ہے۔

ناشپاتی:۔

یہ سرد و تر، دل کو فرحت دینے والا پھل ہے۔ معدہ اور جگر کو طاقت دیتی ہے۔ پیاس کو ختم کرتی ہے۔

کیلا:۔

اس میں غذائیت بہت زیادہ ہے۔ خون بڑھاتا ہے۔ بدن کو موٹا کرتا ہے۔ ہضم دیر سے ہوتا ہے۔ نمک، سونٹھ یا شہد سے آسانی سے ہضم ہو جاتا ہے۔ اس کے درخت کی چھال کو جلا کر زخموں پر چھڑکنے

سے فائدہ ہوتا ہے۔ اور زخم جلدی بھر جاتا ہے۔

سنترہ:۔

یہ سرد تر ہے۔ یہ زیادہ تر دل و جگر کے لیے مفرح ہے۔ ویسے یہ تقریباً سبھی اعضاء کو فائدہ دیتا ہے۔ خفقان کو دور کرتا ہے۔ پیاس کو بجھاتا ہے۔ اس کے چھلکوں کا اُبٹنا چہرے کے رنگ کو صاف کرتا ہے۔ اور سیاہی اور چھائیوں کو دور کرتا ہے۔

لوکاٹ:۔

یہ سرد و تر ہے۔ خون و صفرا کی گرمی اور حدت کو تسکین دیتا ہے۔ اس کے کھانے سے دل کو فرحت ملتی ہے۔

خوبانی:۔

اس کے کھانے سے خون صالح (اچھا) پیدا ہوتا ہے۔ اعضاء رئیسہ میں طاقت آتی ہے۔ پیاس ختم ہوتی ہے۔ اس کے بیجوں کا لیپ بواسیر میں مفید ہے۔

سید اسجد رضا بجنوری

ہوس کا سر

کہتے ہیں مگدھ کا ایک راجہ تھا۔ یہ راجا بہت نیک تھا بہت شریف تھا۔ لوگ اس کے راج میں امن چین سے رہتے تھے۔ یکایک اس راجہ کے جی میں آئی کہ پڑوس کے دیس نیپال کو فتح کر کے اپنی حکومت میں ملا لے۔ پھر کیا تھا بہت سی فوج لے کر بڑھا۔ بھلا اتنی بڑی اور طاقتور فوج کا مقابلہ یہ چھوٹا سا ملک کیسے کر سکتا تھا۔

راجا نے اپنے دیس کے بہت سے عقلمندوں کو بلا کر مشورہ کیا، ان میں ایک بوڑھا تھا۔ اس نے کہا کہ "ٹھہرو میرے پاس ایک جادو ہے"۔ سب لوگ بڑے غور سے اس کی باتیں سننے لگے۔ اس نے کہا کہ کچھ معمولی قسم کی چیزیں جیسے کچھ ٹوٹے پھوٹے برتن لکڑی کے کچھ جڑی بوٹی قسم کی چیزیں مجھے لادو میں مگدھ کے راجا کے پاس تحفے کے طور پر لے جاؤں گا۔

بوڑھے نے مگدھ کے راجہ کی خدمت میں یہ سب چیزیں تحفے میں پیش کیں۔ راجہ اس کی باتوں سے خوش ہوا اور اس کے تحفے قبول کر لیے اور اس سے پوچھا تجھے میں کیا دوں؟ سونا، زیور جو چاہے مانگ۔

بوڑھے نے کہا "حضور! بس اس ہڈی کے وزن کے برابر سونا چاہیئے اور کچھ نہیں" یہ کہہ کر ایک پرانی تھیلی میں سے ایک ذرا سا ہڈی کا ٹکڑا نکالا۔ راجا نے دل میں کہا ارے یہ تو پانچ سات ماشہ سے زیادہ وزن کا نہیں۔ مگر جب وزن کرنے کو ترازو کے پلڑے میں ڈالا گیا تو اس کے وزن کے برابر سارے ملک کا سونا بھی کم معلوم ہونے لگا۔ اب تو سب کو حیرت ہوئی راجہ نے حیرت سے پوچھا: "بوڑھے میاں! بتاؤ تو یہ کیا جادو ہے؟" بوڑھے نے کہا: "حضور اصل میں یہ ہڈی ہوس کے سر کی ہے جو کسی وزن پر راضی نہیں ہو سکتی"۔ راجا سمجھ گیا کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ میں ہوس میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ مجھے کتنا ہی ملے جی نہیں بھرے گا۔ دنیا کا عیش چار دن کی چاندنی ہے۔ یہ سوچ کر وہ جدھر سے آیا تھا اسی طرف لوٹ گیا۔ اور نیپال اس خون خرابے سے بچ گیا۔

(پی لوڈ محمد)

آدھی ملاقات

ماہ اگست کا پیام تعلیم نظر سے گذرا۔ اس شمارے
ن الحق صاحب کا مضمون "زہرہ" بہت پسند آیا
ق صاحب کی "زہرہ" کا حسین و دل کش تصور اور
فر بڑا دلچسپ ہے اور دل فریب بھی۔ موضوع سے
ن کی زبان و بیان میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔
زورِ قلم اور زیادہ۔ آپ احسان الحق صاحب سے
بھیجیے!
خدا کرے آپ بعافیت ہوں۔ احباب سے میرا سلام
کہیے۔ خدا حافظ۔ مخلص

اشفاق پرنسپل ہائر سکنڈری سکول گنج علم

میں ایک طالب علم ہوں۔ امتحانات میں پیش آنے
ت کو جانتا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ اچھے طلبا بھی
سوال و جواب تو ٹھیک کر لیتے ہیں پر عنوانات میں
عنوان چن کر اس پر مضمون لکھنا تقریباً ہر ایک کے
یک مسئلہ ہوتا ہے۔
میں نے سوچا ہے کہ کیوں نہ پیام تعلیم میں ایک سلسلہ
عنوانات" کے نام سے جاری کیا جائے۔ جس میں
تحانوں میں دیئے گئے عنوانات میں سے کسی ایک
ا مضمون لکھا جائے۔

شیخ عبداللہ احمد سلیہ بائی اسکول بمبئی

اگست کے پیام تعلیم کے ٹائٹل کی سادگی کا جواب
نہیں ایسا لگتا ہے کہ نیلے آسمان پر چاند کی طرح پیام تعلیم لکھا
ہوا چمک رہا ہے۔ پچھلے تمام پرچوں کے ٹائٹلوں سے یہ ٹائٹل
نہایت عمدہ اور دل فریب ہے۔ آپ کی مضامین کی ترتیب
کا میں ہمیشہ سے قائل ہوں، گو سب مضمون اچھے ہیں لیکن
کچھ مضمون واقعی آدمی کو سوچنے پر مجبور کر دیتے ہیں جیسے —
جب اور اب! سنہری مچھلی، پنج تنتر اور قسمت کی لکیر!
بہر حال ان سب چاند ستاروں کے درمیان
ایک چیز بہت کھٹکتی ہے وہ یہ کہ آرٹسٹ کی تمام تصاویر
نہ صرف بے کار بلکہ مرمت طلب ہیں، کیا کوئی نئے صاحب
تشریف لائے ہیں! بہر حال اگر نئے ہوں تو انھیں اس
رسالے میں اپنی گوناں گوں کوشش سے اپنی تصاویر اچھی طرح
پیام تعلیم کو مزید "درخشاں" بنانے کے لیے خوب صورت
اور جاذب نظر بنانا چاہئیں!

جہانگیر احمد شمسی کلکتہ ۱۲

میں پیام تعلیم کا تقریب دو برسوں سے خریدار
ہوں اور بلا ناغہ ہر مہینہ پیام تعلیم کا مطالعہ کرتا ہوں۔
اس دفعہ آپ نے خوب محنت کی ہے۔ آپ یقین جانیں
میں نے ایک ہی دفعہ میں خوب چٹخارے لے کر سارا پرچہ چاٹ لیا۔

محمد عیسیٰ منجر کلکتہ ۱۲

جولائی کا پیام تعلیم ملا۔ آپ نے بہت اچھا
کیا جو ٹائیٹل بدل دیا۔ اب کی بار پیام تعلیم پہلے کی
بہ نسبت کافی اچھا رہا۔ کہانیوں میں کبوتر کا گھونسلا،
نانی دین۔ سفرنامہ ابن بطوطہ، اسکاٹش کے لطیفے،
مسٹر گوپچی اور ایک اخباری نامہ نگار، پنچ تنتر کی
کہانیاں کافی اچھی تھیں۔ اتنا اچھا رسالہ نکالنے پر
آپ کو مبارک باد۔ فقط

سید حیدر حسن سحر مرادآباد

ماہ جولائی کا پیام تعلیم دستیاب ہوا۔ بعد
مطالعہ بے حد خوشی ہوئی۔ سرورق بے حد خوبصورت
بنایا گیا ہے۔ خدا کرے ہمارا یہ جریدہ محبوب ترین مقبول
ترین بن کر افق عالم پر تاقیامت چمکتا رہے۔ آمین!

سیکریٹری عالمگیر دارالمطالعہ جھلا شٹر

جولائی کا پیام تعلیم نظر نواز ہوا۔ سرورق کی سادگی
اور دیدہ زیبی دونوں قابل تعریف ہیں۔ اندرون ورق
"بچوں سے باتیں" سے لے کر "بچوں کی کوششیں" تک
بلکہ "ادھر ادھر" سے بھی جو کچھ آپ نے یکجا کر دیا ہے
بے حد دلچسپ سبق آموز اور جاندار ہے۔ بچوں نے
مسٹر گوپچی کو بہت پسند کیا۔ خاکسار

ناوک حمزہ پوری

ماہنامہ پیام تعلیم کا جولائی سنہء کا شمارہ
نظر نواز ہوا۔ سرورق نہایت ہی دیدہ زیب ہے۔
اور امید ہے کہ آپ آئندہ بھی سرورق کو زیادہ سے
زیادہ دیدہ زیب بنانے کی کوشش کریں گے۔

یوسف پاپا کی نظم "ہم ہیں اچھے بچے" حافظ
باقوی کی نظم "تمنا" ابن رضوی کی نظم "برسات کی بہار"
نسیم شاہجہانپوری کی نظم "زندگی" پسند آئی۔ فرحت قمر
کا مضمون "خلا کا پھیلاؤ اور ستارے" محترمہ آصفہ مجیب
کا مضمون "جیب اور اب" و جناب مشیر الحق ندوی کا
مضمون "کناڈا میں شہریت کے آداب" نہایت معلوماتی
مضامین ہیں۔ کہانیاں بھی بچوں کے معیار کو برقرار رکھ کر
لکھی گئی ہیں۔

"پیام تعلیم" کے لکھنے والوں میں سبھی جانے پہچانے
اور مانوس نظر آئے۔ ان کی شرکت پیام تعلیم کی
ترقی و کامیابی کی ضامن ہے۔ خدا کرے آپ کو ہند و
پاک کے تمام ادیبوں کا تعاون حاصل ہو جائے۔

جوبلی نمبر کی تیاریوں کے متعلق جان کر بڑی
خوشی ہوئی۔ اسے نہایت شاندار طور پر شائع کرنے کی
کوشش کریں۔ آپ کا مخلص

کمال الدین صدیقی بہار

عزیزم مختار احمد کے یہاں ماہنامہ پیام تعلیم
کا تازہ شمارہ دیکھنے کا اتفاق ہوا۔
صد تحسین ہیں آپ اور مستحق مبارک باد ہیں
آپ کے بلند حوصلے کہ اس ادب کش دور میں جب کہ
دشمنان اردو، اردو کی بنیاد کو ختم کر دینے کی کوشش
کر رہے ہیں۔ آپ بچوں کے لیے اردو کا اتنا معیاری
رسالہ نکال رہے ہیں۔ آمین خلوص نگار

ممتاز حیدر غازی پوری

اِدھر اُدھر سے

میر خسرو کا ساتسواں یوم پیدائش یا سالگرہ

حضرت امیر خسرو کا نام ہمارے آپ کے لیے جانا بوجھا
ن کی پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں وغیرہ اب بھی بچے
پسند کرتے ہیں۔ رات کو سونے سے پہلے بہت سے
میں اب بھی ان کی پہیلیاں بوجھی جاتی ہیں۔
رہتا ہے۔

حضرت امیر خسرو حضرت خواجہ نظام الدین کے
ر خلیفہ ہیں۔ ان کا مزار بھی حضرت نظام الدین
کے مزار کے پاس ہی ہے۔ ہر سال ان کا عرس
شان سے منایا جاتا ہے۔ اس عرس کو دلی والے
سترھویں کہتے ہیں۔

امیر خسرو فارسی زبان کے بہت پائے کے
ں کہتے ہیں کہ اردو زبان کی طرح یا بنیاد انھی نے
ہے۔ ۱۹۷۲ء میں ان کو پیدا ہوئے سات سو
جائیں گے ان کی یہ سالگرہ یا یوم پیدائش مختلف
ں بہت شاندار طریقے سے منایا جائے گا۔
سوویٹ یونین میں تو ابھی سے تیاریاں شروع
تاجکستان کی جشن کمیٹی کے صدر محمد احمدوف

کی صدارت میں ایک جشن کمیٹی قائم کی گئی ہے۔ اسی جمہوریہ
کی تعلیمی اور تہذیبی وزارت، اخبار نویسوں کی کمیٹی
اور ادیبوں کی انجمن بھی ان تیاریوں میں لے رہی ہیں۔

تاجکستان کے اخباروں نے لکھا ہے کہ امیر خسرو
نے ایک قیمتی ادبی ورثہ چھوڑا ہے۔ انھوں نے تاجک فارسی
ادب کی روایتوں کو قائم اور باقی رکھا ہے۔ متحدہ ہندوستان
میں فارسی شاعری کی ترقی کے لیے بہت کام کیا ہے۔
اپنی دو مشہور فارسی مثنویوں دول رانی اور خضر خاں
میں انسانی بھائی چارے اور بین الاقوامی یا دنیا دوستی
کے اصولوں کو اونچا اور سر بلند کیا ہے۔

پر یہ تو دور دیسوں کی باتیں ہیں۔ خود اپنے
دیس میں کیا تیاریاں ہو رہی ہیں اس کا پتہ شاید بعد میں
چلے۔

پلاسٹک کی پسلیاں پلاسٹک کے جہاز

پلاسٹک بھی آجکل دنیا کے عجائبات میں سے
ہے۔ اس میں بہت سی قیمتی خاصیتیں پائی جاتی ہیں۔
ان سے آپ کے لیے طرح طرح کے کھلونے ہی تیار نہیں
کیے جاتے، اور بھی بہت سے کام لے جا سکتے ہیں۔

عورتوں کے بلاؤز بن سکتے ہیں۔ دور مار راکٹ بن سکتے ہیں۔ خلائی جہازوں کے پرزے، آرے اور اوزار بن سکتے ہیں انسانی جسم کی پسلیاں اور دوسرے عضو بن سکتے ہیں۔ اور جناب پانی کے جہاز بن سکتے ہیں۔ بجلی کے تار بنانے میں ایک ٹن پولی تھلیس چھ ٹن سیسے کے برابر کام دیتا ہے۔ ہوائی جہاز کا ڈھانچہ شیشہ ملی پلاسٹک سے بنایا جائے تو دھات کے ڈھانچے سے زیادہ پائیدار ہوتا ہے۔ پلاسٹک کا فرنیچر اور دوسرا گھریلو سامان تو جرمنی میں عام طور پر دفتروں اور گھروں میں استعمال ہونے لگا ہے۔

دھات کی طرح پلاسٹک میں بھی دوسری چیزیں ملائی جاسکتی ہیں۔ اس طرح کے ملاوٹی پلاسٹک سے بہت ہی پائیدار گلاس بنایا گیا ہے۔ یہی نہیں اس سے ہوائی جہاز، پانی کے جہاز بنانے میں اور بجلی کی انجینرنگ میں بڑے پیمانے پر کام لیا جائے گا۔

سائنس داں تو انسانی جسم کے فاضل عضو یا پرزوں کی بات بھی سوچنے لگے ہیں پلاسٹک کی پسلیاں۔ جلد کے خون کی رگیں۔ کان کے پردے، نرخرا۔ آنکھوں کے چشمے تو علاج معالجے کے سلسلے میں استعمال ہونے لگے ہیں اور یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ ناکارہ اور خراب شدہ عضو کی جگہ مصنوعی عضو استعمال ہو سکتا ہے۔

جرمنی کے ایک منچلے انجنیئر نے تو سولہ میٹر کی ایک کشتی بنا بھی ڈالی۔ یہ کشتی جھینگا مچھلی کے شکار کے لیے استعمال کی جائے گی۔ پر پلاسٹک پر انسان کی تحقیقات کا سلسلہ ابھی جاری ہے۔

یہ اُلّو بے چارا

اپنے دیس میں الّو بے چارا منحوس سمجھا جاتا ہے۔ بے وقوف بھی۔ کبھی کسی بزرگ کو اپنے چھوٹے کی کسی بات پر غصہ آ جائے تو الّو کے خطاب سے نوازتے ہیں۔ ماشاءاللہ صورت شکل بھی دہشت ناک پائی ہے۔ رات کو سنسان جنگل میں طرح طرح کی آوازیں نکالتے ہیں تو اچھے اچھوں کے دل دہل جاتے ہیں۔

پر یورپ میں معاملہ بالکل الٹا ہے۔ ان کی بہت عزت کی جاتی ہے بہت سمجھ دار اور عقل مند سمجھے جاتے ہیں۔ وہاں یہ آہستہ آہستہ ختم ہو رہے ہیں۔

یورپ کے لوگ ان کی نسل کو محفوظ رکھنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ وسطی یورپ کے بڑے الوؤں کے چالیس جوڑے جرمنی کے جنوبی حصے (بویریا) کے جنگلوں میں بسائے گئے ہیں۔ ان میں بہت سے، پہلے چڑیا گھروں میں پیدا ہوئے تھے۔ اور جب چوہوں اور کبوتروں کا شکار کرنا سیکھ گئے تو انھیں جنگلوں میں چھوڑ دیا گیا۔ تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ پیدا ہونے کے چند ہفتوں بعد انھیں بچوں والے الوؤں کے ساتھ چھوڑ دیا جائے تو جنگل کی زندگی سے جلد مانوس ہو جاتے ہیں۔ (تصویر سامنے کے صفحے پر)

وقت کی دھار کے آگے صرف سچائی رہ جائے گی اور سب کچھ بہہ جائے گا۔ [illegible]

Payam - i - Taleem

NEW DELHI-25.



صرف ٹائیٹل فائن پریس دہلی میں طبع ہوا

نئی دہلی

ام تعـ ـیم

اکتوبر ۱۹۶۷ء شمارہ ۹

ایڈیٹر

سین حسان ندوی

تبہ جامعہ لمیٹڈ ○ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

تبہ جامعہ لمیٹڈ ○ اردو بازار دہلی ۶

تبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳

تبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

۴ پیسے ○ قیمت سالانہ روپے

فہرست

بچوں کے لیے دلچسپ معلوماتی کتابیں

ارشادات نبوی	/۴۰	حضرت امیر المعاویہ رض	۱/-	قاتل بادشاہ	/۵۰	سنہری چڑیا	/۴۰
اسلامی مہینے	/۴۰	دین کی پہلی مسلمان عورت	/۵۰	کوہ زمرد کی شہزادی	/۲۵	کبڑا گھوڑا	/۳۰
آداب المعاشرت	/۴۰	شیخ عبدالقادر جیلانی رح	۱/۲۵	گلفام کی انگوٹھی	/۴۰	مولانا ابوالکلام آزاد	/۴۰
پیغمبر انسانیت	/۴۰	شہادت امام حسین رض	/۴۰	ملاح کی سزا	/۲۵	ننھی منی کہانیاں	/۴۰
تلاوت قرآن کی فضیلت	/۴۰	شرعی پردہ	/۲۵	طلسمی دوربین	/۲۵	سرورِ دوعالم ص	/۱۰
تہذیب کیا ہے	۱/۵۰	صدیق اعظم رض	/۹۰	بے پالک شہزادہ	/۲۵	حضرت صدیق اکبر رض	/۲۵
جنت اور دوزخ	۱/۱۵	عورت کی جنت	۱/-	منحوس محل	/۲۵	حضرت فاروق اعظم رض	/۲۵
جانوروں کے حقوق	/۴۰	فاتحہ کا صحیح طریقہ	۱/-	نیلم شہزادی	/۲۵	حضرت عثمان ذی النورین رض	/۲۵
حضرت عائشہ صدیقہ	۱/-	کیا پردہ ملک کی ترقی میں رکاوٹ ہے	/۴۰	نیلا گلاب	/۴۰	حضرت علی شیر خدا رض	/۲۵
حضرت رابعہ بصری	۱/۲۵	مسلمان بہادر لڑکے	/۷۵	بھا چا مہرد	۱/-	حضرت امام حسین رض	/۲۵
حضرت سکینہ بنت حسین رض	/۶۰	مومن کی زندگی قرآن کی روشنی میں	۱/-	اصلاحی کہانیاں	/۴۰	حضرت امام حسن رض	/۲۵
حیات سلمان فارسی رض	/۶۰	نجات المسلمین	/۴۰	بچوں کی اخلاقی کہانیاں	/۴۰	حضرت رابعہ بصری رح	/۲۵
حضرت سیدہ فاطمہ زہرہ رض	/۶۵	انوکھا تحفہ	/۳۵	بچوں کا ادب	۱/۵۰	حضرت سلمان رض	/۲۵
حضرت ابوبکر صدیق رض	/۳۰	بندر کا شہزادی	/۲۵	بہادر لڑکا	/۴۰	حضرت بلال رض	/۲۵
حضرت فاروق اعظم رض	/۴۰	بولتا پہاڑ	/۴۰	ٹیپو سلطان شہید	/۴۰	حضرت خدیجۃ الکبریٰ رض	/۲۵
حضرت عثمان غنی رض	/۵۰	پانچ بہادر دوست	/۲۵	جنگل کی دنیا	/۴۰	حضرت فاطمۃ الزہرا خاتونِ جنت رض	/۲۵
حضرت علی المرتضیٰ رض	/۵۰	جادو کی گڑیا	/۴۰	دلچسپ لطیفے	/۴۰	ابھرتا سورج	/۵۰
حضرت امام حسین رض	/۸۵	چوہدی کا خزانہ	/۲۵	دلچسپ کہانیاں	/۴۰	زمین کے تارے	/۵۰
حضرت عمر عبدالعزیز رض	/۷۵	زمرد پری	/۵۰	ڈاکٹر اقبال	/۴۰	چمکتے موتی	/۵۰
حضرت خدیجہ رض	/۴۰	سونے کی گائے	/۴۰	ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت	/۱۵	تین قلندر	۲/-
حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رض	/۴۰	جنتی شہزادی	/۲۵	ریل کا سفر	/۲۵		

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال بمبئی۔ بی۔ ا۔ ۳

...وں سے باتیں



...چہ جس وقت آپ کے ہاتھوں میں پہنچے گا۔
...ن جوبلی کو کل ایک مہینہ رہ جائے گا (۲۸ اکتوبر
...بر پوری جامعہ میں ابھی سے بہت چہل پہل
...میلا ہر سال اسی مہینے منایا جاتا ہے۔ ہمیشہ
...ل کے لیے سرگرمی کا زمانہ ہے۔ بڑا کچے تو
...رہ منائی جا رہی ہے۔ اس لیے کیا چھوٹا کیا
...کچھ عجیب جوش ہے۔ اُمنگ ہے۔ ولولہ ہے۔
...ح طرح کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کہیں ڈرامے
...رہی ہے۔ کہیں تقریروں کی بیت بازی وغیرہ
...ں ہے۔ طرح طرح کی نمائشوں کی تیاریاں
...سب مل جل کر ہنسی خوشی کام کر رہے ہیں۔ سب کو
...ریوں کا احساس ہے۔ سب اس کوشش میں
...لے ہوتے ہیں کہ ہماری جوبلی زیادہ سے زیادہ
...۔

...ے کا پیام تعلیم بھی جوبلی نمبر نکال رہا ہے۔
...ون آ گئے ہیں۔ کچھ لکھے جا رہے ہیں۔ رنگین
...لیا ہے۔ تصویروں کے لیے بلاک بنوا لیے گئے
...وٹ نہ ہوئی تو انشاء اللہ ۲۵ اکتوبر تک آپ کا
...ہو جائے گا۔

ہماری خواہش ہے کہ جامعہ کے پچھلے زمانے کی کچھ جھلکیاں آپ کے سامنے آ جائیں۔ اور جامعہ کی موجودہ ترقی کے بارے میں بھی آپ کو تھوڑی بہت معلومات ہو جائیں۔ اور یہ سارے مضمون ایسے انداز میں لکھے جائیں کہ آپ دل چسپی سے پڑھیں۔ اور آپ کو اندازہ [illegible] ہو کام صبر و استقلال سے، خلوص، ایثار اور قربانی کے جذبے سے کیا جائے، خدا اس میں برکت دیتا ہے۔ اسے آگے بڑھاتا ہے۔ ترقی دیتا ہے۔

اس جوبلی نمبر میں آپ کی دل چسپی کے لیے دوسرے مضمون بھی ہوں گے۔ اچھی اچھی نظمیں ہوں گی۔ اس کے صفحے بھی عام پرچے سے زیادہ ہوں گے۔ اس لیے قیمت بھی زیادہ ہو گی۔ لیکن سالانہ خریداروں سے زیادہ قیمت نہ لی جائے گی۔ آپ یہ نمبر مفت حاصل کرنا چاہیں تو اکتوبر سے خریدار بن جائیے۔

اور ہاں ابھی ہمیں سالنامہ بھی تو نکالنا ہے۔ اس کے لیے بھی تیاری ساتھ ہی ساتھ جاری ہے۔ مضمون بھی آنے شروع ہو گئے ہیں۔ نظمیں بھی، کہانیاں بھی۔ اور دوسری دل چسپ چیزیں بھی۔

پچھلے پرچے کے مضمون کہانیاں نظمیں سبھی بہت پیامیوں نے پسند کیں۔ عزیزی سلمان سلفی کا مضمون "جہاز" محترمہ آصفہ مجیب کا مضمون "النقرہ" خاص طور سے پسند کیا گیا۔ اس مضمون کی اگلی قسط ایران پر ہوگی بہت دل چسپ ہوگی۔ یہ ایران والا مضمون بھی کافی بڑا ہے۔ گنجائش ہوئی تو جوبلی نمبر میں۔ ورنہ سالنامہ میں پڑھیےگا۔

ہمارے ایک عزیز نے (آدھی ملاقات میں) شکایت کی ہے کہ اکثر مضمون اور نظمیں سپاٹ ہیں۔ تصویریں نہیں بنی ہیں۔ ان کی شکایت صحیح ہے۔ ہمارے آرٹسٹ صاحب اچانک بیمار ہو گئے۔ انتظار کا وقت نہیں تھا، پرچہ چھپنے میں دیر ہو جاتی۔ وہ اب بھی بیمار ہیں۔ دعا کیجیے کہ اس پرچے کی تھوڑی بہت تصویریں بنا سکیں۔

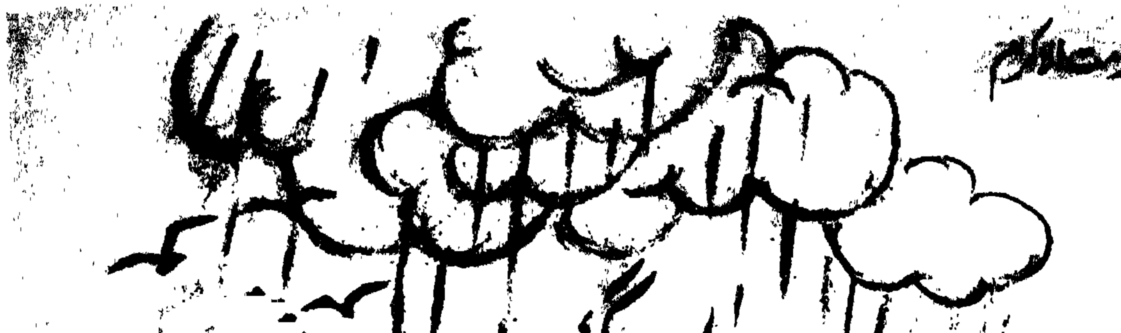
تصویری کہانی پیامیوں نے بہت پسند کی تھی۔ اس مہینے سے اس کا سلسلہ پھر شروع کیا جا رہا ہے۔ اب یہ سلسلہ انشاءاللہ مستقل چلتا رہے گا۔ النقرہ کے علاوہ اس پرچے میں اور بھی دل چسپ مضمون ہیں کہانیاں ہیں۔ محترم حرمت الاکرام صاحب کی ایک بہت اچھی نظم برسات پر پچھلے پرچے میں شائع ہوئی تھی۔ اکتوبر میں برسات کا موسم ختم ہو جائے گا۔ اس پر اس کی رخصتی پر بھی ایک نظم پڑھیے۔ اور دوسری نظمیں بھی بہت مزے کی ہیں۔ کہانیوں میں کوے کا تاج محل۔ انوکھی بارات۔ آنگن میں شکار، سنام دولما۔ آپ کو پسند آئیں گی۔ پڑھیے اور مزے

بچے

پچھلے مہینے مدرسہ ابتدائی اور ثانوی میں انجمنوں کے چناؤ معمول کے مطابق دھوم دھام سے ہوئے۔ مدرسہ ثانوی میں نائب صدر شوکت علی سکریٹری شمشاد احمد اعظمی کھیل کے سکریٹری اکرم مقبول، لائبریرین سید محمد فصیح، منتخب ہوئے۔ اور ہاں مصور کی ایڈیٹر رضیہ سلطانہ اور "امنگ" کی ایڈیٹر زہرہ فاطمہ منتخب ہوئیں۔ ان سب کو مبارک باد۔

انتخاب کے تھوڑے ہی دنوں بعد مسند نشینی کی تقریب بہت شان سے منائی گئی۔ جلسہ ہوا۔ اس میں مزاحیہ انداز میں نئے عہدہ داروں کی جان پہچان کرائی گئی۔ نثر میں بھی، نظم میں بھی۔ اس سلسلے کی تین نظمیں اس پرچے میں پڑھیے۔

اس مہینہ شاخ مکتبہ جامعہ نے تین خریدار اور شاخ مکتبہ دہلی نے دو خریدار، مولانا عبدالدین نے دو خریدار حضرت اخضر بریلوی اور منیرالحسن صاحب نے ایک ایک خریدار مرحمت فرمایا۔ حاجی امام حسن صاحب بمبئی میونسپل اردو ہائی اسکول اُرکمیٹ، مسٹر فاروق احمد نئی دہلی ۲۵، عبدالعزیز صاحب قریشی پینگن گھاٹ واردھا۔ گورنمنٹ جونیر کالج بھینسا عادل آباد۔ آدم خاں صاحب ناظم ہیرن گڑھی دمیورا خود خریدار بنے ہیں۔ •



برسات گئی



رم جھم رم جھم کا ساز گیا
موسم کا وہ انداز گیا
جانے کس دیس گئے بادل
خاموش ہے بوندوں کی چھاگل
وہ کھیت کہاں وہ پیڑ کہاں
ملتا نہیں وہ رنگیں سماں
صبح سرد ہواؤں نے پھیرا
تپتی کرنوں نے آگھیرا
برسات گئی برسات گئی

ندیوں کے کنارے سونے ہیں
باغوں کے نظارے سونے ہیں
موجوں کے وہ ریلے ختم ہوئے
دریاؤں کے میلے ختم ہوئے
سمٹا تالابوں کا دامن
نالوں نے چرایا جیسے بدن
رونق وہ اکھاڑوں کی نہ رہی
وہ سیر پہاڑوں کی نہ رہی
برسات گئی برسات گئی

دھنک کی کھنک خاموش ہوئی
کھیتوں کی لہک خاموش ہوئی
جھولے ہیں نہ پینگیں کچھ بھی نہیں
تفریح کی بہاریں کچھ بھی نہیں
بجلی کی وہ تانیں روٹھ گئیں
نغموں کی اڈائیں روٹھ گئیں
وہ رنگ نہ وہ ہریالی ہے
آکاش دھنک سے خالی ہے
برسات گئی برسات گئی

محترمہ اصغر مجیب

انقرہ

۲۰ اپریل کو بچوں کا دن ایک تہوار کی طرح جسے "بیرام" کہتے ہیں اتاترک کے زمانے سے ہر سال منایا جاتا ہے۔ بڑی تیاریاں ہوتی ہیں۔ ایک دن پہلے اسکولوں کالجوں وغیرہ میں چھٹی ہو جاتی ہے۔ اسکولوں اور سب عمارتوں پر قومی جھنڈے لہرائے جاتے ہیں۔ راشٹرپتی بھون میں بچوں کی پریڈ ہوتی ہے۔ مصطفےٰ کمال کے مجسمے کو خوب ہار پھولوں سے سجاتے ہیں۔ کھیل تماشے، ڈرامے دلچسپی کے سب سامان ہوتے ہیں۔ بڑا جشن رہتا ہے بچوں کی بہار ہوتی ہے۔

شہر سے تھوڑی دور نکلے تو بہت قدرتی مناظر ہیں۔ سرسبز پہاڑ، قدرتی چشمے رواں شمشاد کے پیڑوں کی قطاریں اور جھنڈ جہاں بیٹھ کر بڑا سکھ اور آنند ملتا ہے۔ عام طور سے سیر و تفریح کے لیے لوگ یہاں آتے ہیں۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے پر جہاں کوئی اچھی جگہ دیکھی بیٹھ کر پکنک مناتے ہیں۔ خاص کر اتوار کو موٹریں اور بسیں بھر بھر کر آتی ہیں۔

چبک براج بہت خوب صورت جگہ ہے۔ شہر سے کوئی بارہ میل دور ہے۔ یہاں بند باندھ کر نہر نکالی گئی ہے۔ اتوار کو ہم لوگ گئے۔ امین کے کئی دوست ان کی بیویاں اور بچے سب ساتھ تھے۔ نہر کے کنارے پہنچے۔ نیلے رنگ کا شفاف پانی موجیں مار رہا تھا۔ ہر طرف سبزہ لہرا رہا تھا۔ سامنے پہاڑ اور شمشاد کے درختوں کا حسن دیکھ کر ایسا لگا کہ کشمیر آگئے۔ نہر کے کنارے کنارے بنچیں اور کرسیاں بچھی تھیں۔ لوگ بیٹھے شربت چائے پی رہے تھے۔ قریب ہی اچھے اچھے کئی رسٹورنٹ ہیں وہاں چائے اور کھانے کی میزیں سلیقے سے لگی تھیں۔ لوگ برابر چلے آ رہے تھے۔ یہاں کچھ دیر ٹھہر کے ایک پل پر سے دوسری طرف پہنچے۔ درختوں کے سائے میں فرش بچھایا گیا۔ خوشگوار ہوا تھی اور بڑا سہانا سماں۔ پہاڑوں کا دلفریب منظر ٹولیوں کی ٹولیاں ذرا ذرا دور پر بیٹھی پکنک منا رہی تھیں۔ امین نے کہا پہاڑوں پر چڑھیں گے۔ کچھ لوگ اور ساتھ ہو گئے۔ نزدیک کے پہاڑوں پر گھومے پھرے۔ بچوں کا دیکھنا اس وقت بڑا مشکل تھا۔ کوئی ادھر بھاگا جا رہا تھا کوئی ادھر ذرا نظر سے اوجھل

مان کود یکھنے کے لیے بھاگے۔ کھانے اور چائے
چلا۔ سامنے کشادہ میدان میں آدمیوں کا سمندر
مار رہا تھا۔ پیڑوں میں رسیاں ڈال کر بچوں کے لیے
ے ڈال لیے تھے کچھ جھول رہے تھے کچھ کھیل کود
صروف تھے۔ سب کے چہروں پر خوشی اور تازگی
یسے پھول کھلے ہوں۔ بڑے لڑکے اور لڑکیاں
ں کھیل رہی تھیں۔ چند لوگ حلقہ بنا کے
ں پر بیٹھے تھے۔ بیچ میں چھوٹی بچیاں ناچ
ہیں اور کئی بڑے لڑکے اور لڑکیاں انھیں
خوشی سے تالیاں بجا رہی تھیں۔ کچھ ترکی لڑکیاں
ں طرف دیکھ کر پہلے کھڑی مسکرائیں پھر پاس
ے گئیں، سوزانہ سے خوب باتیں ہونے لگیں۔
ارح کے سوالات کیے سب کے نام پوچھے۔ چائے
سے ان کی تواضع کی گئی۔ ہم لوگوں کو ان سے
ہت خوشی ہوئی۔ شام ہونے لگی اور بونداباندی
ہوئی تب سب واپس ہوئے۔

۲۳ مئی کو مجیب صاحب امریکہ سے (اور
ں جرمنی میں قیام کرکے) واپس آئے۔ امریکہ کے
یادہ شہروں میں ان کا دورہ رہا۔ نیویارک،
کولمبیا، مونٹریال، بوسٹن وغیرہ کی یونیورسٹیوں
ریریں ہوئیں۔ مسلسل سفر سے وہ تھک گئے
ہم لوگوں کو بہت فکر اور انتظار تھا۔ ہندوستانی
سکریٹری گجندر سنگھ صاحب کو جن سے پچھلے
ملاقات ہو چکی تھی اور ان کی بیگم صاحبہ کو بھی
مجیب صاحب کا بڑا انتظار تھا۔ انھوں نے ۳۰ تاریخ
دعوت کے لیے مقرر کر دی تھی اور کارڈ تقسیم ہو گئے
تھے۔ دونوں بہت خوش اخلاق ہیں ایمن اور سوزانہ
سے میل جول رہتا ہے۔ ایک دن دونوں تشریف لائے
چائے کے بعد میں نے پاندان کھولا تو پانوں کی بات
چھڑی کہ اب ختم ہو رہے ہیں۔ بیگم گجندر سنگھ نے کہا۔
"پان آسکتے ہیں اگلے ہفتے ہمارے سامان کا بیگ
ہوائی جہاز سے آئے گا۔ کوئی پان وہاں بھیج دے۔"
ان کی اور بہن مشیر فاطمہ ڈائرکٹر نرسری جامعہ کی
عنایت ہے جنھوں نے دہلی سے پان بھیجنے کی زحمت
گوارا کی ہمیں بہت اچھے تازے پان ملے۔ جس دن
پان آئے مسز گجندر سنگھ خود لائیں ہاتھ میں پانوں کا
بنڈل لیے مسکرا کر کہا "لیجیے امی جان آپ کے پان
آگئے"! وہ مجھ سے بھی زیادہ خوش نظر آرہی تھیں
گجندر سنگھ بھی تھے۔ دونوں نے پان بنوا کر بہت
شوق سے کھائے۔

ان کا شوق دیکھ کر میں دعوت کے دن پان
کی گلوریاں بنائے گئی۔ وہاں اور کئی ہندوستانی بھائی
بہن شوقین نکل آئے۔ سب پان تقسیم ہو گئے۔

دعوت بہت پر تکلف تھی اس کا خاص اہتمام
کیا گیا تھا۔ ہندوستانی سفارت خانے کے لوگوں کے
علاوہ ترکی کے منتخب لوگ، شاعر اور ادیب مدعو تھے۔
افغانستان کے سفیر۔ جو شاعر ہیں۔ ہندوستانی سفیر
باجپائی صاحب اور ان کی بیگم صاحبہ بھی تشریف لائیں۔

باجپائی صاحب نے یہ جان کر کہ ہم لوگ لکھنؤ کے ہیں پوچھا "پوربی بولی تو جانت ہو یہو؟" میں نے کہا "جی ہاں خوب جانت ہیں" انھوں نے پوربی میں خوب باتیں کیں کچھ لطیفے اور چٹکلے بیان کیے۔
کھانے سے پہلے ایک ادبی نشست ہوئی جو کھانے کے بعد خوب جمی۔ شاعروں نے اپنا کلام پیش کیا کچھ بڑے مشہور شاعروں نے غالب اور فیض کی غزلیں ترنم سے سنائیں سب بے حد محظوظ ہوئے۔ محفل کا رنگ ایسا جما کہ اٹھنے کا ارادہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے یہیں ڈیرے ڈال لیں گے۔ بارہ بج گئے کوئی جانے کا نام نہیں لیتا تھا۔ میں اٹھنے لگی تو مسز گجندر سنگھ نے ہاتھ پکڑ کر بٹھا دیا۔ "ایسی جلدی کیا ہے ابھی اور ٹھہریے" آخر مجیب صاحب کے کہنے سے میں نے پہل کی۔ رات آدھی سے زیادہ گذر گئی تب یہ پر لطف محفل برخاست ہوئی۔ چلتے چلتے باجپائی صاحب نے پوربی زبان میں ایک فقرہ کہہ کر ہنسا دیا: "تو پھر میرے یہاں کب ایہو کچھ کڑھی اڑھی پکوادن؟"

اس مرتبہ کئی نئے لوگوں سے اور جن سے پارسال ملاقات ہوئی تھی مل کر بہت خوشی ہوئی۔ مسز بلقان سے مل کر خاص خوشی ہوئی انھوں نے ہماری سواری کے پیچھے پانی بہانے کی ترکی رسم ادا کی تھی جس کا ذکر پہلے ترکی کے سفر کے حالات میں کر چکی ہوں۔ پانی بہانے کا مقصد بہت جلدی پورا ہو گیا۔ ایک سال بعد ہی انقرہ آئے تھے۔

ترکی کے کھانے بہت مزے دار ہوتے ہیں مالکہ مکان مزے مزے کی چیزیں بنا کر کھلاتیں۔ کچھ چیزیں جو وہاں کھائیں اور کچھ جن کے نام لوگوں نے بتائے جو یاد ہیں لکھتی ہوں۔

روٹی کو پیدے کہتے ہیں۔

ڈُلما لوکی میں قیمہ اور چاول بھر کر پکاتے ہیں۔ ڈُلما ہندوستان میں بھی پکاتے ہیں۔ شاید یہ نام اور ترکیب ترکی ہی سے لی گئی۔ مگر اس میں تھوڑا فرق ہو گیا ہے۔ ہم لوگ ڈُلما جو پکاتے ہیں اس میں چاول شامل نہیں ہوتا اور قیمہ میں دھنیا اور مصالحہ ڈالتے ہیں۔ وہاں مصالحہ بالکل نہیں ہوتا۔

یاپراک سرما۔ انگور کے پتوں میں چاول بھر کر لپیٹ کر گھی میں تلتے ہیں۔

کاؤن بودو کوفتہ۔ کزارتما۔ (سالن) کاورمہ (قورمہ)۔ امام بیگن۔ امام بالدی اسے کھا کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ تپلی جان سقہ (بیگن) کارنیارک (بیگن) اِچ پلاؤ۔ چلغوزے اور کشمش ڈال کر پکاتے ہیں۔ آشورہ میٹھا ہوتا ہے۔ حلیم کی طرح کئی چیزیں ملا کر پکاتے ہیں۔ کابلی چنے اور کشمش وغیرہ۔ کدالف۔ سویاں۔ پستہ وغیرہ ڈال کر شیرے میں پکاتے ہیں۔ توکم۔ ایک مٹھائی ہے۔ کبابوں کی کئی قسمیں ہیں۔ تاندر، دونر، بیتی بیتے۔ شیش کباب۔

جون میں سردی کم ہو گئی۔ بہت خوشگوار موسم تھا۔ حاجی بیگ تاش کی تعریفیں سن کر وہاں جانے کا

وہاں ترکی کے ایک بزرگ صوفی حاجی
کا مزار ہے۔ انقرہ سے دو سو ستر کلو میٹر
س زمانہ میں قریب ہی عیسائی رہبانوں
درہبان جو دنیا کو چھوڑ کر صرف خدا کی عبادت
اسی لیے حاجی صاحب نے وہ جگہ اپنے
ہ وہاں رہ کر وہ تبلیغ کا کام کرتے تھے۔
بح سویرے موٹر سے روانہ ہوئے۔ راستہ
بصورت ہے۔ سر بلند پہاڑ، شمشاد
لہیں لاکے پھولوں کی بہار، تختے کے تختے
میلوں سبزہ کی پھبن۔ پھول چمن در چمن،
در تازہ ہوا، چشمے جاری، بہت سے
باغ پڑے۔ ہر بستی میں مسجدیں۔ جن کے
اور شمشاد کے درختوں میں ایک مناسبت

لمبا دریا کزل ارماک پڑا۔ قریب بہت
م کر رہے تھے ان کی چھوٹی سی بستی تھی
ہائے مانگی۔ مزدوروں میں کچھ زور و شور
رہی تھی۔ ایک بوڑھا آدمی بڑھا۔ کچھ
سی کرسیاں بچھی تھیں ان پر بٹھایا۔ اور چائے
چائے لاکر چھوٹی سی میز پر رکھ دی کشتی
س سے پوچھا کشتی ٹوٹی کیوں ہے۔؟
دور کی کوڑی لایا اور سر ہلا کر بولا۔
یا میں ہر چیز ٹوٹی پھوٹی ہے"
کی انتہا نہیں رکھی جا سکتی پھر چائے آئی

چلی گئی۔ بھتیا کے لیے کوکا کولا مانگا۔ بوتلیں ٹھنڈی
کرنے کے لیے زمین میں ایک گڑھے میں رکھی تھیں۔
اس میں سے ایک نکال کر دی۔ کچھ دیر بعد ایک جگہ
انگوروں کی بیل کے سائے میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔

حاجی بیگ تاش پہنچ کر ایک بڑے
ـــــ سے احاطے میں داخل ہوئے۔ ایک طرف
چشمہ ہے۔ شیر کے دہانے سے پانی بہتا ہے۔ ایک
دروازے سے دوسرے احاطے میں داخل ہوئے۔
وہاں سے ایک بہت بڑی عمارت میں جس میں مزار
شریف ہے اور باغ لگا ہے۔

بہت بڑے ہال میں داہنی طرف کے کونے
میں حاجی بیگ تاش کا مزار ہے اور بائیں طرف
نورالدین جیجی کا جو حاجی بیگ تاش کے مریدوں
کے سلسلے کے ایک ممتاز بزرگ تھے ۱۹۲۲ء میں ان کا
انتقال ہوا۔ وہ مصطفےٰ کمال کے ساتھ آزادی کی
جنگ میں شریک تھے۔ اسی وجہ سے مصطفےٰ کمال
کو حاجی بیگ تاش سے کچھ عقیدت ہو گئی وہ وہاں
گئے بھی اور وہاں ان کا مجسمہ بنا ہے۔ باغ کے
اندر سے ایک دوسرے مقام پر گئے جہاں ایک
درخت ہے۔ منتیں ماننے والے اس کی شاخوں
میں منتوں کے تاگے باندھتے ہیں۔ بہت سے تاگے
بندھے ہوئے تھے۔ نئے فیشن کی عورتیں بھی یہاں
آکر منتیں مانتی ہیں۔ ہمارے ساتھ نئی تہذیب کی
دو ترکی خواتین تھیں [illegible]

بھو نے منت کا تاگہ باندھا۔ منت کیا تھی یہ خدا ہی جانے۔ واپسی پر پہلے احاطے میں آئے یہاں میوزیم ہے۔ اس زمانے کی یادگار بہت چیزیں رکھی ہیں۔ بڑا سا ہال ہے جس میں قالین بچھے ہیں۔ ان پر گاؤ تکیہ لگا ہے۔ سب سامان جو استعمال ہوتا تھا جمع ہے۔ حقّے۔ گلپاش جس سے گلاب کا عرق چھڑکا جاتا تھا۔ باورچی خانے میں دیگیں اور برتن ہیں۔ اس سے ملا ہوا کھانے کا کمرہ ہے۔ فرش پر لمبی میز لگی ہے۔ اس پر دسترخوان بچھا ہے۔ پاس ہی ایک قبر بنی ہے سب کی رائے یہ ہوئی کہ یہ باورچی کی قبر ہے۔ پھر کتب خانہ دیکھا۔ نئی اور پرانی کتابوں کا بڑا ذخیرہ ہے۔ قرآن شریف کے دو تین نسخے بہت پرانے ہیں کتابیں اور رسالے پڑھنے کے لیے اور کئی کمرے ہیں۔ شام کو لوٹتے وقت ایک پر فضا جگہ پر چائے پی۔ نو بجے انقرہ آئے۔ انقرہ سے جانے کے کئی دن رہ گئے تھے کہ سومناتھ دھیر صاحب نے جو اطلاعات کے محکمہ کے افسر ہیں مجیب صاحب کے اعزاز میں ایک بڑی دعوت کی۔ وہاں مجیب صاحب کے ایرانی دوست تفضلی صاحب جو ایرانی سفارت خانے میں بڑے عہدے پر ہیں تشریف لائے۔ انھوں نے یہ معلوم کرکے کہ مجیب صاحب ہندوستان واپس جا رہے ہیں ان سے کہا: "یہ کیا غضب ہے کہ آپ تہران سے اڑان کریں اور ایران کی سیر نہ کریں۔ آئیے شیراز اور اصفہان دیکھیے۔" اب ہم لوگ آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ کیا کرنا چاہیے۔ ایسے موقعے روز روز تو آتے نہیں۔ ان کا اصرار بڑھا۔ اور ہم نے ان کی یہ دعوت جو بہت خلوص سے دی گئی تھی منظور کر لی۔ پانچ چھ دن وہاں ٹھہرنے کا پروگرام بنا۔

انقرہ سے واپسی کا منظر بس کیا بتاؤں۔ دونوں بچوں نے ایک ادھر ایک ادھر ہاتھ پکڑ لیا اور زار و قطار رو رہے تھے۔ ساتھ ساتھ چلے۔ جہاز کھڑا تھا مسافر سوار ہو رہے تھے۔ میرے قدم جم گئے بڑی مشکل اماں باپ نے دونوں کو الگ کیا۔ میرا دل بھر آیا۔

اب ہمارا جہاز ایران کی سمت بڑھ رہا تھا۔ ایک نیا تصور لیے نئی سرزمین میں جا رہے تھے جس سے ہمارا قدیم بہت قدیمی رشتہ ہے۔ جس سے ہمارے ملک کی کتنی ملی جلی تہذیبی تاریخی روایتیں وابستہ ہیں اور اتنے انقلاب اور صدیاں بیتنے کے بعد ہندوستان کے چپے چپے پر اس کے کہیں صاف کہیں مٹے مٹے نشان اور چھاپ ملتی ہے۔ ●

کتاب کی کہانی

یہ عجیب و غریب کتاب مکتبہ جامعہ نے ابھی حال میں شائع کی ہے۔ بالکل شروع زمانے سے لے کر اب تک لکھنے کا فن کن منزلوں سے گزرا، پھر کتابیں کس طرح لکھی گئیں کن کن چیزوں پر لکھی گئیں آپ کے لیے بہت قیمتی معلومات مصنف نے جمع کر دی ہیں۔ قیمت ۱/۵۰



برسات

کتنا حسین تر ہے برسات کا زمانہ
ہر دل میں ہیں امنگیں ہر لب پہ اک ترانہ

کلیوں کا مسکرانا چڑیوں کا چہچہانا
دل کو لبھا رہا ہے پودوں کا لہلہانا

پھولوں کے پاس بھنورے پہ گنگنا رہے ہیں
شادابی چمن کا مژدہ سنا رہے ہیں

بارش کی بوند آکر سبزہ اگا گئی ہے
پیاسی زمین کے منہ میں پانی چوا گئی ہے

ٹھنڈی ہوا کے جھونکے کیا خوب آ رہے ہیں
ہر شاخِ گل کو آکر جھولا جھلا رہے ہیں

دل موہ لے رہی ہے آواز پی کہاں کی
کوئل کی کوک میں بھی تاثیر ہے زباں کی

دل میں نثار کوئی رنج و الم نہیں ہے
برسات میں یہ دنیا جنت سے کم نہیں ہے

باغِ ارم ہے گویا جنت نشاں ہے دنیا
برسات تیرے دم سے ہی ضوفشاں ہے دنیا



میں کون ہوں

اپنے نئے گھر میں آکر پہلے تو ان کا جی بہت گھبرایا۔ نیا شہر، نئے لوگ، ہر چیز بدلی ہوئی، یوں کہیے کہ سارا نقشہ ہی بدل گیا تھا۔ ایسے میں ان سب کو اپنا پہلا گھر بڑا یاد آیا۔ دوست یاد آئے۔ اپنا پیارا سا باغ یاد آیا، جہاں بہت سے پیارے پیارے پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ پھلوں کے درخت تھے، جنھیں وہ روزانہ پانی دیا کرتے تھے۔ ہائے کتنا مزا آتا تھا۔ اور ایسی بہت سی یادیں آتی چلی گئیں اور وہ سب اداس ہو گئے۔

سہ پہر کو، کوٹھی کے پیچھے جا کر دیکھا تو وہاں بھی باغ تھا۔ پر ویسا نہیں جیسا ان کا پہلا باغ تھا۔ یہاں تو ایسا لگتا تھا جیسے بہت دنوں سے باغ کی دیکھ بھال ہی نہیں کی گئی تھی۔ کیاریاں تھیں اجڑی اجڑی، کچھ درخت پھلوں کے چند پودے پھولوں کے اور ڈھیر ساری گھاس اور جنگلی جھاڑ جھنکاڑ۔ بس انھوں نے سوچا کہ یہاں تو بڑی محنت کرنا پڑے گی، تب کہیں اس باغ کی حالت ٹھیک ہوگی۔

پھر آپس میں فیصلہ ہوا کہ سب مل کر اس کی اور بنانے سوارنے کی ذمّہ داری لیں اور دیکھ بھال کریں۔ باغ چار حصّوں میں اس طرح تقسیم کر دیا گیا کہ ایک حصّہ بڑے بھائی جان کا، دوسرا آپی کا، تیسرا جمّو بھیّا کا۔ چوتھا حصّہ جو ذرا چھوٹا تھا وہ شمّو کے حصّے میں آیا۔ تینوں بھائی بہن خوش تھے کہ ان کے پاس پھل بھی اور پھول بھی، مگر شمّو بے چاری سب سے چھوٹی تھی، اس لیے اس کے حصّے میں کچھ زیادہ نہ آیا، ایک میٹھے نیم کا درخت ایک بیر کا اور دو تین گیندے کی کیاریاں اور یہاں نیم کے دو چار پودے، سب ہنس کر بولے۔

"لو شمّو رانی تمھارے لیے نیم کے درخت ہیں۔ اس کی نبولیاں کھانا آخر ہیں تو وہ بھی پھل، کڑوے ہی سہی۔"

شمّو کو بہت برا لگا۔

"جی ہاں بڑے آئے سیانے کرنے سب نے تو اچھا اچھا لے لیا اور مجھے خراب دیا، آپ ہی رکھیے اپنے پاس اپنا باغ مجھے نہیں چاہیے۔" وہ روٹھ کر چلی گئی۔

اپنے کمرے میں جاکر شمو پلنگ پر بیٹھ گئی، اور
ڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔ نیم کے چھوٹے چھوٹے پودے
ں میں نظر آ رہے تھے۔ اس نے سوچا کہ وہ کل ہی
سے کہہ کر یہ سارے نیم کے پودے کٹوا دے گی، اور
جگہ خوب اچھے اچھے پھولوں اور بڑھیا پھلوں کے
لگوائے گی آپاجی تب کتنا مزا آئے گا یہ پھل پھول تو
یوں کے پاس بھی نہ ہوں گے اور پھر پتہ چلے گا
مذاق اڑانے کا۔

بڑی دیر تک وہ یہی سوچتی رہی کہ کس قسم
ھول ہونے چاہییں اور کہاں لگنے چاہییں۔۔۔
سے اسے ایسا لگا جیسے کوئی اسے پکار رہا ہے۔
نے مڑ کر دیکھا کوئی بھی نہیں تھا۔ تھوڑی دیر
پھر آواز آئی: "شمیم! اے شمو" پھر اس نے
اُدھر دیکھا کوئی نہ تھا۔ وہ پلنگ پر تکیے سے ٹیک
بیٹھ گئی کہ تیسری بار زور سے آواز آئی۔ "شمو
رے ادھر تو دیکھو تو یہ ایسی بھی کیا ناراضگی!"
نے کھڑکی سے باہر دیکھا ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی
رنگ برنگی تتلیاں ادھر اُدھر اڑ رہی تھیں۔ شمو
حیران ہوئی کہ کون پکار رہا ہے جو دکھائی نہیں
اتنے میں اس کی نظر سامنے والے درخت پر
اس نے دیکھا کہ درخت بہت اونچا ہو رہا ہے۔
وئی سر جھکائے کھڑا ہو اور پھر دھیرے دھیرے
سر اوپر اٹھائے۔ اس کے بعد کیا ہوا کہ وہ پیڑ بہت
پھیلا۔ شاخیں اتنی گھنی جیسے بڑی سی چھتری پھر

اس نے کیا دیکھا کہ شاخوں کے جھنڈ میں سے ایک چہرہ
ابھرا لمبے لمبے بال، بڑی بڑی آنکھیں اور جانتے ہو اس
کے بالوں کا رنگ کیسا تھا؟ نہ سفید نہ کالا نہ بھورا
بس ہرا تھا اور چہرے کا رنگ بھی بالکل انوکھا انوکھا
سا۔ ایسا شمو نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ وہ اچھل پڑی۔

"ہائے اللہ یہ کون ہے؟" اس نے چاہا کہ
کسی کو آواز دے مگر آواز ہی نہ نکلی۔ اس نے ڈرتے
ڈرتے پھر ادھر دیکھا تو وہ چہرہ مسکرا رہا تھا۔ شمو کو
کچھ تسلی ہوئی۔

وہ مسکرایا اپنا سر ہلایا اور بولا: "شمو بٹیا! تم
ہم سے خفا ہو اور دور بھاگنا چاہتی ہو۔ ایسا نہ کرو ہم تو
تمہارے دوست ہیں۔ تمہارے ہی کیا سب انسانوں کے
دوست ہیں، ہم سے گھبراؤ نہیں ہم تمھیں کوئی تکلیف
نہیں دیں گے:

"کیا تمھیں معلوم ہے کہ میرے بہت سے
ساتھی ہیں جو ہر دم میرے ساتھ ہیں، اور جب بھی
ضرورت ہوتی ہے کام آتے ہیں، کچھ ساتھی تو ہمیشہ
ساتھ رہتے ہیں کچھ تھوڑے دنوں کے لیے ہوتے ہیں۔
کہو ملو گی میرے ساتھیوں سے؟"

شمو نے سر ہلا دیا تالی بجنے کی آواز آئی اور
پھر کیا ہوا کہ پیڑ کی شاخوں پر بہت سی چھوٹی چھوٹی
گڑیاں نظر آئیں جو پتیوں کی، رنگ کی رنگ کے
فراک پہنے تھیں وہ شمو کو دیکھ کر ہنسنے لگیں، اوئی اللہ
گڑیاں ہنستی بھی ہیں!" شمو حیران رہ گئی۔ وہ ہنستے

ہنستے بولیں: "ہم سے روٹھو نہیں شمّو۔ ہم تمھارے دکھوں کے دشمن ہیں جب تمھارے خون میں خرابی پیدا ہوجاتی ہے، جسم پر داغ دھبّے پڑ جاتے ہیں، خوب کھجلی ہوتی ہے تو ہمارے ہی پاس سے دوا لی جاتی ہے۔ اس دوا سے فائدہ ہو جاتا ہے۔"

اور یہ کہہ کر وہ پھدکتی پھدکتی نہ جانے کہاں غائب ہوگئیں۔

ہوا ذرا تیز ہوئی تو شمّو نے سنا کہ پھر تالی بجائی گئی اور دیکھتے دیکھتے دھوپ غائب ہوگئی، اودے اودے بادل چھا گئے ٹپ ٹپ بوندیں اور پھر رم جھم رم جھم بارش ہونے لگی۔ پیڑ کی شاخوں پر پھلوں کے گچھے جھومنے لگے، کبھی اِدھر کبھی اُدھر۔ جیسے جھولا جھول رہے ہوں۔ چھوٹے چھوٹے پھل، کوئی گہرے سبز رنگ کے کوئی ہلکے اور کچھ پیلے پیلے پکے پکے۔ اے لو وہ ٹپ ٹپ گرنے لگے۔

شمّو کے منہ میں پانی بھر آیا جی چاہا کہ پھل اٹھا کر لائے اور چکھے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ان گچھوں کے ساتھ ساتھ ننھی ننھی پریاں جھولنے لگیں، پریاں پیاری پریاں جن کے رنگ برنگے جھل مل جھل مل کرتے کپڑے تھے۔ بازوؤں پر ننھے ننھے پر تھے۔ اور سروں پر سنہرے تاج تھے۔

انھوں نے جھانک جھانک کر شمّو کو دیکھا اور بولنے لگیں۔ ان کی آواز ایسی تھی جیسے بہت سے گھنگرو بج رہے ہوں۔ پھر وہ بڑے پیار سے بولیں۔

"شمّو جب تم دوستوں کے ساتھ کھیلتی ہو تو کھیل کود میں مٹی اڑا اڑا کر تمھارے جسم اور سر کے بالوں میں جم جاتی ہے یہ مٹی اگر صاف نہ ہو تو بال گندے ہوجاتے ہیں جوئیں پڑ جاتی ہیں جو تمھیں پریشان کر دیتی ہیں اور اگر ناخن لگ جائے تو سر میں زخم بھی ہو جاتے ہیں کتنا دکھ ہوتا ہے اس کی دوا ہمارے پاس ہے جس میں کچھ خرچ نہیں ہوتا اور آرام بھی ہو جاتا ہے۔"

یہ کہہ کر وہ بھی کہیں غائب ہوگئیں۔

شمّو حیران تھی کہ قصّہ کیا ہے۔ کیا یہ کوئی جادو کا درخت ہے؟ اتنے میں بڑی بڑی آنکھوں اور ہرے بالوں والا چہرہ اوپر آیا اور سر ہلا ہلا کر کہنے لگا۔

"بس تم دو کو دیکھ کر ہی حیران ہوگئیں! ارے بھئی میرے پاس تو بہت سے ساتھی ہیں۔ جو کسی نہ کسی طرح تمھارے کام آتے ہیں تمھیں فائدہ پہنچاتے ہیں!"

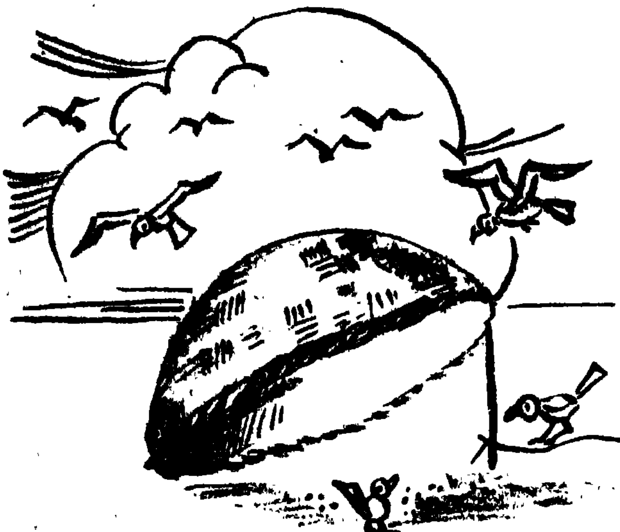
"تم جانو اب دنیا کتنا آگے بڑھ گئی۔ بڑی بڑی ایجادیں ہوگئی ہیں۔ ترقی ہو رہی ہے۔ اور انسان کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے۔ زمین تو زمین آسمان کی باتیں ہونے لگی ہیں۔ ہمارے چندا ماما جو گھور گھور کر ہمیں دیکھا کرتے تھے۔ ان کو جا پکڑ لیے اور پتہ لگا لیا ہے کہ وہاں بڑھیا چرخا کات رہی ہے یا کچھ اور بھی ہے؟ کیا ہے، اور کیسا ہے؟"

"اب تو میری جان پہچان زیادہ نہیں رہی ورنہ پہلے تو بڑے بڑے حکیموں ویدوں سے میرا واسطہ تھا پس تو تمھارا اتنا ہمدرد ہوں کہ اپنی کھال سے۔ کبھی

باقی صفحہ ۴۴ پر

سلمیٰ جاوید

آنگن میں شکار



میرا چھوٹا بھائی قمر بڑا نٹ کھٹ ہے۔ ابھی
رہی کیا ہے بمشکل سے ساڑھے چھ سال کا ہے۔
نٹ کا تو قد ہے، دبلے پتلے، گول چہرہ، پتلی ناک
ہوئی سیاہ آنکھیں، چوڑی پیشانی۔ اور اس پر
ہوئے سیاہ بال - یہ ہے ان کا حلیہ!

ہر ایک سے جھگڑ بیٹھتے ہیں۔ اور پھر منہ پھلا کر
نے میں بیٹھ جاتے ہیں۔ پھر جیسے ہی کسی اچھے
کہانی کی کتاب کا ذکر آتا ہے۔ لڑائی جھگڑا بھول
ی دوڑ کر پاس آجاتے ہیں۔

اپنی تین پہیوں کی گاڑی پر بیٹھ کر پورے
بیسیوں چکر لگاتے ہیں۔ تھک جاتے ہیں تو
پسند رسالہ اٹھا کر دیکھنے لگتے ہیں۔ پیام تعلیم یا
رتی اور رسالہ۔ سب رسالوں کو فر فر پڑھ لیتے
پڑھ چکنے کے بعد جب ان سے پوچھتے ہیں کہ
ھا تو تمام کہانیوں کو گڈمڈ کر کے کچھ کا کچھ بتلا دیتے
جاتا ہے تو منہ پھلا کر کوئی کونہ ڈھونڈ لیتے

دنیا کے تمام بڑے بڑے لوگوں کے فوٹو دیکھ کر
انھیں پہچان لیتے ہیں۔ مگر ایک عادت خراب ہے۔ ہم
سب کی نظریں بچا کر رسالوں کو فائل سے نکال لیتے ہیں
اور اپنی من پسند تصویر کو قینچی سے کاٹ کر اپنی البم میں
رکھ لیتے ہیں۔ اور موقع پا کر گوند سے البم میں چپکا لیتے ہیں۔

'اسٹپ لر' کے تو جیسے دشمن ہیں۔ اگر پا جاتے
ہیں تو بلا وجہ دو کاغذوں کو ملا کر ان کو نتھی کیا کرتے
ہیں۔ ٹائپ رائٹر کی تو خاص طور سے حفاظت کرنی پڑتی
ہے۔ اگر غلطی سے کنجی اسی میں لگی رہ گئی تو ٹپ، ٹپ
ٹپ کر کے ربن اور کاغذ دونوں کا ستیاناس کر دیتے ہیں۔

کھلونوں کا بے حد شوق ہے۔ اتفاق سے
کھلونوں کی ایک بڑی سی دکان مکان سے بالکل ملی
ہوئی ہے۔ 'ٹوائے ہاؤس' کے مالک سے دوستی گانٹھ
رکھی ہے۔ دن میں کسی نہ کسی وقت وہاں جا کر طرح طرح
کے کھلونے دیکھتے ہیں۔ پہلے تو ہر ایک کو خریدنے کے لیے
ضد کیا کرتے تھے۔ مگر اب بہت شرافت سے کبھی کبھی کسی
خاص کھلونے کو [illegible]

اور جیسے ایک بار گرمیوں کی دوپہر تھی۔ سب لوگ اپنے اپنے کمروں میں بند، پنکھے کی ہوائیں آرام کر رہے تھے۔ قمر صاحب کو بھی زبردستی کمرے میں لٹایا گیا۔ سب لوگ سو گئے تو نہیں معلوم کب یہ کمرے کا دروازہ کھول، اور پھر دھیرے سے دروازہ بھیڑ، آنگن میں چلے آئے۔

لو اور گرمی سے بچنے کے لیے گوریا کے کئی جوڑے ادھر ادھر پھدک رہے تھے۔ اور گرا پڑا دانا چگ رہے تھے۔ کچھ لگن میں بھرے ہوئے پانی میں اپنے پر پھڑپھڑا کر نہا رہے تھے۔ قمر صاحب باورچی خانہ کھول کر اندر گئے۔ وہاں سے ایک ڈلیا اٹھائی اور بیچ آنگن میں لا کر چھوٹی سی لکڑی کے سہارے گنجایش رکھی کہ چڑیا اس میں آسانی سے چلی جائے۔ لکڑی میں ایک رسی پھنسا کر اسے دور لے گئے اور باورچی خانے سے پکے ہوئے چاول لا کر ڈلیا میں اندر کی طرف ڈال دیئے اور خود رسی لے کر دور جا کر بیٹھ گئے۔

کافی دیر کے بعد جب ہم سب کی آنکھ کھلی تو کمرے سے قمر میاں غائب تھے۔ تلاش ہوئی تو باہر ملے۔ بہت خوش تھے کیوں کہ ڈلیا کے اندر جب ایک چڑیا دانا کھانے گئی تو انھوں نے ایک جھٹکے سے رسی کھینچ لی تھی۔ اور چڑیا ڈلیا کے اندر پھڑپھڑا رہی تھی۔ چڑیا تو انھوں نے پھنسالی تھی مگر اسے پکڑیں کیسے؟ یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ڈر کے مارے کسی کو جگانے کی ہمت نہ کر سکے۔ ڈانٹ پڑ جانے کا خطرہ تھا۔

جب میں نے کمرے کا دروازہ کھول کر ان کی طرف تاکا تو وہ بڑی محبت سے میرے پاس دوڑتے ہوئے چلے آئے اور کہنے لگے۔

"آپا جی میں نے چڑیا پھنسالی ہے اس کو پکڑ دیجیے۔"

"اچھا! تم نے دوپہر بھر لو اور دھوپ میں اودھم مچائی ہے اور چڑیا پکڑتے رہے ہو۔ اب تمھاری شکایت کرتی ہوں۔" میں نے کہا۔

"نہیں آپا جی! میں نے اودھم نہیں مچائی۔ بڑی خاموشی سے چڑیا ڈلیا میں بند کر لی ہے۔ اس کو پکڑ دیجیے میری آپا جی!" انھوں نے بڑی مسکین صورت بنا کر کہا۔

"تم نے یہ چڑیا پکڑی کیوں؟ یہ تو سب تمھارے گھر میں پلی ہوئی ہیں۔" میں نے کہا۔

"نہیں آپا جی اس کو پکڑ دیجیے میں اس کو پنجرے میں رکھوں گا۔" وہ بولے۔

"مگر میرے اچھے بھیا! یہ تو سب چڑیاں تمھارے ہی گھر میں دن رات رہتی ہیں۔ یہیں انڈے دیتی ہیں، یہیں بچے رکھتی ہیں۔ یہیں گھومتی اور کھاتی ہیں۔ ہر وقت تمھارا جی بہلاتی ہیں۔ اگر تم اس چڑیا کو پکڑ کر پنجرے میں بند کرو گے تو یہ سر پھوڑ پھوڑ کر مر جائیگی اور اس کے بھائی بہن تم کو بددعا دیں گے۔" میں نے کہا

"بددعا دیں گے؟" انھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا: "تو آپا جی! ہم اس چڑیا کو ڈلیا سے چھوڑ دیں۔ مگر اب کس طرح چھوڑیں اسے؟" وہ رونی صورت بنا کر بولے۔

باقی صفحہ ۴۴ پر

مدرسہ شاذی کی انجمن کے سند نشینی کے جلسے میں نئے عہدے داروں کا مزاحیہ انداز میں تعارف یا جان پہچان کرائی جاتی ہے۔ یہ تین نظمیں اسی سلسلے کی ہیں۔ انھیں مدرسے کی بچیوں نے جلسے میں پڑھا تھا۔

ہے بی بی زہرہ　　منھ پر چھایا رہتا ہے کہرہ
روداشت چمکتے　　کھرپے کی مانند دمکتے
ہے ناک نزالی　　جیسے بھنڈی سی چپکالی
ں دونوں آنکھیں　　بورے کے پردے سے جھانکیں
ہرہ کھال ہے بھوری　　جیسے ہو روٹی تندوری
کی ہوئیں مدیرہ[۲]　　اونٹ کے منھ میں جیسے زیرہ
یت اُردو روے　　اشکوں سے اپنا منھ دھوے
ذرا رسالہ　　نیلا، پیلا، بھورا ، کالا

(صبا)

آپ تو ہیں اکرم مقبول　　نام ہے اونچا کام فضول
کھیل کے ناظم بن کر آج　　گدی پر بیٹھے مہراج
دیکھو کیا کرتے ہیں کام　　خدمت میں ہے عرض سلام
سر ہے جیسے سوکھا بیل　　کون لے سرسوں کا تیل
چشم وابرو تیر کمان　　دانت ہیں اور سناک پہان
ہائے تبسم، برق ہی برق　　چاہ زنخداں دل ہو غرق
کرکٹ کے استاد ہیں آپ　　کھیل ہے پورا کھا دیں آپ
بالنگ جب کرتے ہیں حضور　　بال وکٹ سے دس گز دور
دیکھو ساتھی ایسا کھیل　　اور بڑھے آپس میں میل

شاہنواز خاں

پہچان

نام رضیہ رکھ دیا یہ تھی رضا ماں باپ کی　　ناک کیوں ٹیڑھی ہوئی جاتی ہے اس پر آپ کی
آپ کا چہرہ ہے لمبا اور لمبے دانت ہیں　　رخ اگر ہے اک عمارت اس کے کھمبے دانت ہیں
یہ صفت ورثے میں پائی ہے خدا کی دین ہے　　ہم سے کیوں ناراضگی ہے یہ پرائی دین ہے
المصور آپ کی خدمات سے بڑھ جائے گا　　خاک کے ذروں سے اٹھ کر نیم پر چڑھ جائے گا
پینٹنگ کی آپ ماہر ہیں خدایا خیر ہو　　ہر کوئی کہتا ہے یہ اپنا ہو چاہے غیر ہو
گر بنائیں بیل تو تصویر ہاتھی کی بنے　　اور اُلّو کی بناتی ہیں تو ساتھی کی بنے
رنگ اور کاغذ دھرے رہتے ہیں ان کے نام سے　　برش کی دُرگت بنا کرتی ہے ان کے کام سے
بے تکلف آپ ہیں خاموش سنجیدہ متین　　شور کرتی ہیں تو لوگوں کو نہیں آتا یقین
المصور منحصر ہے آپ ہی کی ذات پر　　اس کی خدمت کیجیے ٹرخایئے مت بات پر
آپ سے امید رکھتے ہیں کہ اچھا کام ہو　　ہو خوشی ہم کو بھی حاصل آپ کا بھی نام ہو

ریحانہ پروین

[۱] چہرہ مراد ہے　[۲] ایڈیٹر



محمد علیم الدین جامعی بی اے۔ بی ایڈ

وادی کشتواڑ

یوں تو تم اپنے اسکولوں میں ہمیشہ نئے نئے ملکوں، قوموں کے اور ان کے رسم و رواج کے متعلق پڑھتے رہتے ہو۔ اپنے بھارت دیش کے متعلق بھی تمھیں بہت کچھ معلوم ہے۔ پر اب بھی اپنے ہی ملک میں نہ معلوم کتنے علاقے، کتنی جگہیں اور کتنی قومیں ایسی ہیں جن کا ہم نے کبھی ذکر نہیں سنا۔ ہمارا کشتواڑ بھی ایسا ہی علاقہ ہے۔ جس کا نام آپ شاید پہلی مرتبہ سن رہے ہوں۔

اسے کشتواڑ کیوں کہتے ہیں؟ اصل میں یہ نام دو لفظوں سے مل کر بنا ہے ایک "کشت" دوسرا "واڑ"۔ کشٹھ یا کشت یعنی مصیبت، دکھ تکلیف اور واڑ یعنی علاقہ۔ گویا اس کا مطلب ہوا "مصیبت یا دکھ کا علاقہ"۔ پر بھلا اسے مصیبت کا علاقہ کیوں کہتے ہیں؟ اس کا جواب تمھیں آگے کے صفحوں میں ملے گا۔

ہمارا کشتواڑ بہت بڑا علاقہ ہے۔ ایک زمانے میں اس میں علاقہ واڑون اور مانہال شامل تھے۔ اس وقت اسے ملک کشتواڑ کہا جاتا تھا۔ آج کل بہت بڑی تحصیل ہے۔ لیکن تمام کی تمام پہاڑی ہے اور پیر پنجال کے عظیم الشان پہاڑی سلسلوں سے گھری ہے۔ پیر پنجال ہمالیہ پہاڑ کی ایک بہت بڑی شاخ ہے۔

اس تحصیل کے مشرق میں زنسکار اور لداخ کے علاقے ہیں مغرب میں تحصیل ڈوڈا ہے۔ شمال میں پہاڑوں کے اس پار وادیٔ کشمیر ہے۔ جنوب میں تحصیل بھلاواہ اور ریاست ہماچل پردیش کا علاقہ ہے۔

اب تو آپ سمجھ گئے کہ تحصیل کہاں ہے؟ اگر نہیں سمجھے تو آئیے آپ کو واضح طور سے سمجھاتا ہوں۔ تحصیل کشتواڑ، ریاست جموں کشمیر میں صوبہ جموں کے شمال مشرق میں جموں شہر سے تقریباً ۱۵۰ میل دور پہاڑوں میں واقع ہے۔ کشمیر اپنے قدرتی حسن کی وجہ سے دنیا میں مشہور ہے۔ کشتواڑ بھی قدرتی مناظر اور خدا کی کاری گری کا ایک شاہکار ہے۔

یہ سطح سمندر سے ۵۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ اس کے چاروں طرف پہاڑوں کا عظیم الشان سلسلہ (پیر پنجال ۱۰۰۰۰ سے ۱۵۰۰۰ اونچا) پھیلا ہوا ہے۔ اس خوب صورت وادی کے مشرق میں ناگن شیرو پہاڑ ہے جو تقریباً سارے سال برف سے

رہتا ہے۔ اس کے علاوہ کنگی برن۔ کالم ستر
پیاں پہاڑ کی چوٹیاں ہیں۔ یہاں سے ہرہا
چوٹی نظر آتی ہے جو ہندوستان کا مقدس اور
پہاڑ ہے۔

وادی کشتواڑ کے مغرب میں پوت ناگ اور
ڑی مشہور چوٹیاں ہیں جنوب میں کونتواڑہ
ڑ ہے۔ شمال میں بھنڈار کوٹ کا پہاڑ ہے جس کے
ں دو بڑے دریا آکر ملتے ہیں اور ان دونوں
ے دریائے چناب اپنی پوری شان و شوکت
ڑوں کے سینوں کو چیرتا ہوا کشتواڑ کے مغربی
کے ساتھ ساتھ شمال جنوب کی طرف بہتا

پہاڑوں میں یہ بہت چھوٹا سا معلوم ہوتا
ن میدان میں داخل ہونے پر یہ ایک عظیم الشان
جاتا ہے۔ اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان
جہ سے اس دریا سے آبپاشی کا کام نہیں
سکتا ہے لیکن اس کے ذریعے جنگلوں سے کاٹے
ڑی کے بڑے بڑے شہتیر اور درخت ایک جگہ
ری جگہ آسانی سے بھیجے جا سکتے ہیں۔ اس دریا
ں سارے سال رہتا ہے۔ پہاڑوں سے برف
پگھل کر آتا ہے اور اس لیے بہت ٹھنڈا ہوتا

تحصیل کشتواڑ کی کل آبادی ..... ۸۰ کے لگ بھگ
ہے۔ ہندو مسلمان سکھ سب لوگ یہاں رہتے

ہیں۔ اکثریت کشمیری مسلمانوں کی ہے۔ لوگوں کا عام
پیشہ کھیتی باڑی ہے کمبل بننا، ٹوپیاں بنانا، گھریلو
دستکاریاں اور دوسری کئی چھوٹی موٹی دستکاریاں ہیں۔

کھیتوں میں ہل چلانے کا طریقہ وہی پرانا ہے
جو یہاں کے لیے مفید بھی ہے۔ ہل میں پہاڑی بیل
استعمال ہوتے ہیں۔ ان کا قد بہت چھوٹا ہوتا ہے او
رنگ سیاہی مائل بھورا ہوتا ہے۔ سینگ بہت ہی خطرناک
قسم کے نکیلے ہوتے ہیں۔ سارے بدن پر لمبے لمبے بال
ہوتے ہیں۔ دم تو بالوں کی جھاڑو معلوم ہوتی ہے۔
یہاں کے لوگ اسے "یاک" کہتے ہیں۔ آپ نے جامع مسجد
دہلی کی سیڑھیاں تو ضرور دیکھی ہوں گی بس اسی طرح
سے بے ڈھنگے طور پر پہاڑوں کے ڈھلانوں پر بہت
کافی اونچائی تک سیڑھی نما کھیت بنا کر کاشت
کرتے ہیں۔ قابل کاشت زمین کافی ہے لیکن پانی کی
کمی ہے۔

جنوبی کشتواڑ کی آب و ہوا قدرے خشک ہے۔
بارش بہت کم ہوتی ہے لیکن شمالی کشتواڑ کی ہوا معتدل
ہے، عموماً سردیوں میں سخت سردی ہوتی ہے۔ اور کئی
کئی فٹ برف پڑتی ہے۔ گرمیوں میں تمام تحصیل کے
پہاڑوں کے ڈھلانوں پر مکئی کی کاشت کی جاتی ہے
موسم سرما میں کشتواڑ میں اور آس پاس کے علاقوں میں
گیہوں اور جو کی فصلیں لی جاتی ہیں۔

زعفران یہاں کی خاص پیداوار ہے۔ اس
کی کاشت کے لیے خاص مٹی اور خاص قسم کی آب و ہوا

کی ضرورت ہوتی ہے۔ ریاست جموں کشمیر میں صرف پانپور، بھدرواہ اور کشتواڑ کے علاقوں میں اس کی کاشت کی جاسکتی ہے۔

زعفران کا بیج سال میں ڈھلوان زمین میں پک جاتا ہے اور پھر کیاریوں میں بویا جاتا ہے۔ جولائی اور اگست کے مہینوں میں اس کی بوائی ہوتی ہے اکتوبر کے مہینے میں، زعفران کے پھول نکلتے ہیں۔ جنھیں صبح سویرے دھوپ نکلنے سے پہلے ہی توڑ لیتے ہیں۔ پھر یہ پھول دھوپ میں سکھائے جاتے ہیں اور بعد میں ان میں سے زعفران کے اصلی لچھے توڑ کر الگ کر لیے جاتے ہیں۔ اکتوبر نومبر کی چاندنی راتوں میں بہت سے لوگ ان پھولوں کا نظارہ کرنے دور دور سے آتے ہیں۔ اس پھول کی خوشبو دور دور تک مہکتی ہے۔ زعفران کا استعمال دوائوں میں، پوجا پاٹ اور تلک لگانے میں، امیر لوگ کھانے میں کرتے ہیں۔ یہ بہت مہنگی بکتی ہے۔ عموماً تیس بتیس روپے تولہ تک۔

کشتواڑ کے بہت بڑے رقبے میں جنگلوں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ دیودار، کائرو، فرسنگل، چیڑ، بھوج پتر، شیشم، سنتو، اخروٹ، چیکڑی، بدلو، گھوکھو، کہو اور ٹھانگی کے درخت خاص طور پر مشہور ہیں۔ ان جنگلوں سے حکومت کو لاکھوں روپے سالانہ کی آمدنی ہوتی ہے۔

ہمالیہ کے جنگل یوں سمجھیے کہ جڑی بوٹیوں کے خزانے ہیں۔ لاکھوں قسم کی جڑی بوٹیاں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ کٹھ، پوشکر، پتیش، بنفشہ، گاؤ زبان، لگڑ سنگی، زیرہ سیاہ، دھوپ، بن گگڑی مشک بالا بنیٹھوں، چوب چینی، بیلاڈونا اور بجر بھنگ مشہور ہیں۔ جنگلی جانوروں میں شیر، چیتا، ریچھ، ہرن، بارہ سنگھا، اور پرندوں میں جنگلی مرغ، باکر، چکور اور نیل مشہور ہیں۔

کشتواڑ میں مقدس اور مشہور مقامات بہت سے ہیں۔ خاص طور پر خاص کشتواڑ میں دو آستانے شریف ہیں۔ ایک حضرت شاہ فریدالدین صاحب بغدادیؒ کا آستانہ ہے۔ اور دوسرا ان کے فرزند صالح حضرت شاہ اسرارالدینؒ کا ہے۔ کہتے ہیں کہ ان دونوں بزرگوں کی محنت اور قربانی سے یہاں پر مسلمان پائے جاتے ہیں۔ ہر سال ۲۱، ۲۲، ۲۳ رجون اور ۹، ۱۰ اور ۱۱ نومبر کو عرس ہوتے ہیں۔ ہزارہا زائرین یہاں آکر خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ آب و ہوا کے لحاظ سے آرسی، کالم سند، گلاب گڑھ، اٹھولی، پوردو، اینیٹ، انشن، مغل میدان، ناگن شیر و اٹھن، پھانبرا، سرپھل دیوی خاص طور سے مشہور مقامات ہیں۔ نیلم جو ایک قیمتی پتھر ہے۔ تحصیل کشتواڑ میں علاقہ پاڈر کے قریب پنجل نامی جگہ سے بکثرت نکالا جاتا ہے جس سے حکومت کو ہر سال لاکھوں روپے کی آمدنی ہوتی ہے۔ (باقی آئندہ) ٥

قرآن حکیم پڑھا کرو۔ قرآن قیامت کے روز اپنے پڑھنے والوں کی شفاعت کرے گا۔

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اف خیر



بھروسا رکھو

زندگی کوئی کھلونا تو نہیں ہے بھائی
چند سکّوں میں جو بازار میں مل جاتا ہے
زندگی یوں بھی نہیں ہے کوئی بوسیدہ لباس
کبھی غفلت سے جو پھٹ جائے تو سِل جاتا ہے

○

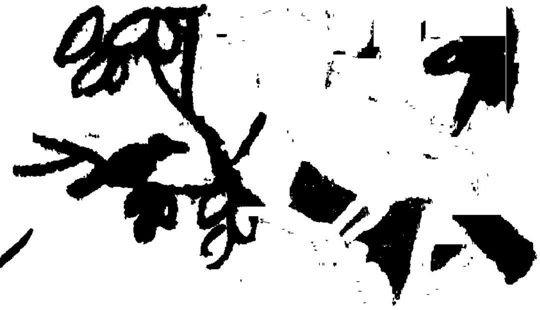
زندگانی ہے وہ آئینہ کہ جس آئینے میں
اک ہمارا ہی نہیں آپ کا چہرہ بھی تو ہے
یوں ہی جینے کی تمنا نہیں رکھتے ہم لوگ
زندگانی کا ہر اک خواب سنہرا بھی تو ہے

○

ہم نے اس ملک کی مٹی کا نمک کھایا ہے
ہم ہی اس ملک کی مٹی کو چمک بخشیں گے
ہم ہی پھولوں کا جنم لیتے رہیں گے ہر سال
ہم ہی اس ملک کی مٹی کو مہک بخشیں گے

○

پھولنے پھلنے تو دو ہم کو نہ الجھا رکھو
کل کے نہرو ہیں ہمیں ہم پہ بھروسا رکھو



کوّے کا تاج محل

محترمہ عائشہ رفیق

بہت دنوں کی بات ہے۔ ایک بہت پرانے برگد کے پیڑ پر ایک چڑیا رہتی تھی، ایک کوا رہتا تھا۔ دونوں میں بہت دوستی تھی۔ ساتھ ساتھ کھاتے تھے ساتھ ساتھ اڑتے تھے اور ساتھ کھیلتے تھے۔

کبھی کبھی بازی لگا کر اڑتے اور نیلے آسمان میں اوپر بہت اوپر اڑتے ہی چلے جاتے۔ بی چڑیا چھوٹی سی تو تھیں۔ بہت جلد تھک جاتی تھیں۔ کوّے میاں انھیں اپنی پیٹھ پر بٹھا لیتے اور نیچے اتر آتے۔

ایک دن صبح ہی سے آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ کوّے میاں اڑتے اڑتے آئے اور بی چڑیا کے گھونسلے میں گھس گئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد بارش ہونے لگی۔

بی چڑیا کا گھونسلا ٹوٹا ہوا تھا۔ بارش کا بہت سا پانی اندر آگیا، دونوں بھیگ گئے۔ جب بارش رکی تو چڑیا نے کوے سے کہا: "اب برسات آگئی ہے۔ ہم لوگوں کو نیا گھونسلا بنا لینا چاہیے"! "نہیں تو روزانہ ایسے ہی بھیگنا پڑے گا۔"

اور بی چڑیا فوراً کام میں لگ گئیں۔ کوّے میاں نے اپنے پر پھڑپھڑائے اور کہنے لگے "ہم تو پہلے کھانا دانا کھا کے اپنا پیٹ بھریں گے، پھر کچھ کام کریں گے۔" اور پھر سے اڑ گئے۔ بی چڑیا تنکے لا لا کر اپنا گھونسلا بنانے لگیں۔ اور جب تک کوّا واپس آئے چڑیا کا گھونسلا آدھا تیار ہو چکا تھا۔

کوے نے اسے دیکھا تو ناک سکیڑ کر بولا "واہ واہ یہ کیا بنایا ہے، گندے سندے چند تنکے جمع کر دیے ہیں اور خوش ہو رہی ہو کہ ہم نے گھر بنا لیا ہے۔ ارے بھئی گھر تو بہت اچھا اور صاف ستھرا ہونا چاہیے۔ اس میں تو بچے کو جی بھی نہ چاہے گا، میرا گھر دیکھنا کتنا اچھا بناؤں گا۔ صاف ستھرا چم چم کرتا ہوا"۔ یہ کہہ کر کوّا اڑ گیا۔ بی چڑیا نے بالکل برا نہیں مانا۔ اپنے کام میں لگی رہیں۔

کوے میاں اڑتے اڑتے، اڑتے اڑتے ایک دکان پر پہنچے وہاں بہت سا نمک پھیلا تھا۔ کوّے میاں نے ایک ڈلی اٹھائی اور لا کر پیڑ کی ایک ڈال پر جما دی۔ پھر دوسری ڈلی لائے وہ اس کے اوپر رکھ دی پھر تیسری لائے وہ اس کے اوپر رکھ دی۔ پھر چوتھی لائے وہ اس کے اوپر رکھ دی۔ اس طرح انھوں نے نمک کی سفید دیواریں کھڑی کر لیں، پھر اڑتے اڑے، اڑتے اڑتے ایک بتاشے والے کی دکان پر پہنچے، ایک بتاشا چونچ میں دبایا اور

لاکر اپنے گھر کی دیواروں پر رکھ دیا۔ پھر گئے ایک اور بتاشا اٹھالائے اسے بھی دیواروں پر رکھ دیا۔ اب یہ بتاشے گیند کی طرح نظر آنے لگے۔ کوّے میاں اپنے آپ ہی جوش میں چلائے: "واہ واہ یہ تو تاج محل بن گیا۔ بس اس کا گیٹ اور بن جائے۔"

پھر اڑتے اڑتے اڑتے ایک حلوائی کی دکان پر پہنچ گئے اور مصری کی دو ڈلیاں اٹھالائے اور اپنے تاج محل میں گیٹ کی طرح انھیں کھڑا کردیا۔ اب تو کوّے کا گھر سچ مچ تاج محل لگ رہا تھا۔ سفید سفید گنبد والا۔ فوراً کوّا اڑتا ہوا چڑیا کے پاس گیا اور دور ہی سے چلایا۔ "بی چڑیا بی چڑیا میرا گھر بن گیا۔ میرا تاج محل بن گیا۔ چلو تم بھی دیکھو۔ اسے دیکھ کر تم بھی بہت خوش ہوگی۔" چڑیا کوّے کے ساتھ ہولی۔ تاج محل دور ہی سے چمک رہا تھا۔ چڑیا اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔ ہر چیز کو ہاتھ لگا کر دیکھا، فرش پر بیٹ کر دیکھا اور بہت تعریف کی۔

پھر اس نے کوّے سے کہا: "دیکھو اب برسات شروع ہوگئی۔ ہم لوگوں کو برسات کے لیے کچھ کھانا جمع کرلینا چاہیے۔ ورنہ بارش میں ہم لوگ کیا کھائیں گے؟"

کوّے میاں بہت جلے: "اوہو اوہو ہو یہ کیا بات کہی۔ ارے بھولی بنّو کیا بارش ہر وقت ہوتی رہے گی؟ جب بارش رکے گی تو جاکر دانا دنکا چن لیں گے۔" یہ کہہ کر کوّا ناچنے لگا۔ اتنا اچھا گھر جو بنایا تھا اس نے۔

بی چڑیا نے کھانا جمع کرلیا۔ اور موسلادھار بارش شروع ہوگئی۔ سب چڑیاں اپنے اپنے گھونسلوں میں چھپی ہوئی تھیں۔ اور کوّے میاں اپنے تاج محل میں بیٹھ کر خوش ہو رہے تھے کہ تھوڑی دیر کے بعد اڑا اڑا دھم تاج محل کا گنبد فرش پر آرہا۔ تھوڑی دیر کے بعد دیواریں بھی گھلنا شروع ہوگئیں نمک بھلا پانی میں کیسے نہ گھلتا؟ اب تو کوّے میاں بڑے پریشان ہوئے۔ بے چارے پانی میں شرابور ہوگئے ان کے پر بھیگنے کی وجہ سے چپک گئے۔ اڑا بھی نہیں جارہا تھا۔ کسی طرح سے گرتے پڑتے بی چڑیا کے پاس پہنچے اور اسے آواز دی۔

چڑیا نے جو کوّے کو اس حال میں دیکھا تو اسے بہت ترس آیا فوراً کوّے کو اپنے گھونسلے میں بلالیا اور کھانے کے لیے کچھ دانے دے دیئے۔ کوّے میاں کو جو آرام ملا تو نیند آگئی۔

سوکر اٹھے تو دیکھا بارش رکی ہوئی ہے اور چڑیا باہر جانے کے لیے تیار ہے۔ چڑیا نے کوّے سے کہا: "میاں کوّے میں باہر جارہی ہوں۔ کچھ دانا دنکا چن لاؤں۔ تم میرے گھونسلے کی نگرانی کرتے رہنا۔"

یہ کہہ کر چڑیا اڑ گئی۔ اب کوّے میاں نے گھونسلا ادھر ادھر سے دیکھنا شروع کیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کونے میں ہرے ہرے چار انڈے رکھے ہیں۔ اب تو کوّے میاں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ انھوں نے دو انڈے تو فوراً چٹ کر ڈالے ایک انڈا نیچے گرادیا۔ اور ایک انڈا جوں کا توں چھوڑ دیا اور ایک کونے میں جا چھپے۔

جب چڑیا واپس آئی تو دیکھا کہ انڈوں کے چھلکے نیچے پڑے ہیں۔ یہ دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ سمجھ گئی کہ میرے انڈے کوے نے کھا ڈالے ہیں۔ وہ غصے میں بھری ہوئی گھونسلے میں داخل ہوئی اور کوے کو ڈھونڈ کر اسے چونچوں سے خوب مارا، خوب مارا اور اسی وقت کوے کو اپنے گھونسلے سے نکال دیا۔

وہ دن اور آج کا دن! آپ نے دیکھا ہوگا کہ کوے اور چڑیا میں اب کبھی نہیں بنتی۔ دوستی تو دور کی بات ہے!

●

بقیہ آنگن میں شکار کا

"ارے بدصورت" ڈلیا کو اس طرح اوپر اٹھاؤ (میں نے اٹھا کر دکھایا) اور چڑیا پھر سے اڑ گئی۔ دیوار پر بیٹھ کر اس نے کچھ دیر چوں چوں کی اور بہت سی چڑیاں اس کے ارد گرد جمع ہو گئیں۔

"دیکھا آپا جی! چڑیا میری تعریف کر رہی ہے اور میرے لیے دعا کر رہی ہے۔"

انھوں نے بڑے فخر سے کہا۔

●

> نبی کریم کا فرمان ہے تم جنت میں نہیں جا سکتے جب تک مومن نہ ہو۔ اور مومن نہیں بن سکتے جب تک باہم محبت نہ رکھو۔ کیا تمھیں ایسی چیز بتادوں کہ اگر تم اسے اپنا لو تو باہم محبت کرنے لگو۔ اپنے اندر اسلام کو رواج دو۔

صفحہ ۴۱ کا بقایا

تمھارے روگ مٹا سکتا ہوں۔ بارش کے زہریلے کیڑے کاٹ کر پھنسیاں پیدا کر دیتے ہیں ان میں پیپ پڑ جاتی ہے اور میری کھال کو گھس کر لگانے سے آرام آجاتا ہے۔ چاہے بچوں کو تکلیف ہو یا بڈھوں کو میں ہر ایک کے کام آتا ہوں۔ سب کا خیر خواہ ہوں۔"

"کیا تمھیں پتا ہے کہ جہاں میں ہوتا ہوں وہاں بیماری کے کیڑے آنے سے ڈرتے ہیں اور ہوا گندی ہونے نہیں پاتی۔ صاف اور تازہ ہوا انسان کے لیے کس قدر ضروری ہے، یہ تو تم کو معلوم ہی ہوگا، تو اب کہو شمیم بیگم کیا خیال ہے۔ کیا اب بھی ہم سے بیزار ہو؟ اب بھی بڑے بڑے کلہاڑوں سے ہمارے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کروگی؟ ہائے غضب ایسا نہ کرنا ارے واہ تم تو کچھ بولتی ہی نہیں، ایسے بیٹھی ہو جیسے کوئی مورت ہو بتاؤ۔ مجھے پہچانا کہ میں کون ہوں؟ میں کون ہوں؟ میں کون ہوں؟"

اور یہ کہتے کہتے اس نے اپنا منہ ہوئے ہوئے جھکایا۔ اور نیچے نیچے غائب ہو گیا۔

شمو نے کروٹ لی تو دیکھا شام ہو گئی تھی درختوں پر بہت سی چڑیاں چوں چوں کر رہی تھیں اور سامنے نیم کے پودوں کی شاخیں ہوا میں جھوم رہی تھیں اور دور بہت دور سے آواز آ رہی تھی۔

"میں کون ہوں بتاؤ میں کون ہوں؟"

●

جناب محمود ردولوی

دریائی گھوڑا



زمین پر چلنے پھرنے والے گینڈے جیسے بھاری بھرکم جانور کی طرح لحیم شحیم (موٹا تازہ) پن گھوڑا یا دریائی گھوڑا (ہپو پوٹمس) بھی کم عجیب نہیں ہوتا۔ یوں تو یہ خشکی کا جانور معلوم ہوتا ہے پر اپنے وقت کا زیادہ حصّہ پانی میں گذارتا ہے۔

پن گھوڑا (ہپو پوٹمس) افریقہ کے دریاؤں میں رہنے والا بھاری بھرکم جانور ہے۔ ہم سے پوچھیے تو اس جیسا کوئی بے ڈھب جانور نہیں۔ عموماً مادہ سے نر کا قد آٹھ دس اِنچ اونچا ہوتا ہے۔ اس کی لمبائی ۱۱ تا ۱۴ (گیارہ سے چودہ) فٹ ہوتی ہے اور وزن پندرہ ہزار پونڈ تک ہوتا ہے۔

پن گھوڑے کا سر بڑا اور وزنی ہوتا ہے۔ آنکھیں دیکھ کر تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے ایک پتھر کی چٹان میں دو بلب جڑ دیے ہوں۔ کان بہت چھوٹے ہوتے ہیں۔ ایک سامنے کی طرف دوسرا پشت کی طرف ملا ہوتا ہے۔ وہ اجنبی جانور کو فوراً پہچان لیتا ہے۔

اس کی ناک کی بناوٹ کچھ قدرتی طور پر ایسی ہے کہ پانی میں غوطہ لگانے کے بعد سر نکالے بغیر ہی سانس لے سکتا ہے۔ لیکن اس کا منہ عجیب ہوتا ہے۔ جمائی لیتے وقت منہ کھلنے پر اس کے گلابی منہ میں چمکتے دانت نظر آتے ہیں۔ جس طرح ہم گنا چھیلتے ہیں اسی طرح آسانی سے وہ مگرمچھ جیسے شکار کی کھال اپنے جبڑے سے چھیل لیتا ہے۔ اس کے منہ میں ایک تربوز ایک بیر جیسا معلوم ہوتا ہے۔ بوڑو گھاس اور نباتات کی قسم کی چار سو پونڈ غذا وہ پیٹ میں بھر لیتا ہے۔

پن گھوڑے کو پانی میں اور زمین پر دونوں جگہ رہنا پسند ہے۔ اس کے جسم سے ایک لیسدار مادہ نکلتا ہے۔ اس کی وجہ سے وہ گھنٹوں پانی میں رہ سکتا ہے اس کی جلد دو اِنچ موٹی ہوتی ہے اور اس میں دو سو ۲۰۰ پونڈ چربی ہوتی ہے۔ جلد پر بال بس نام چار کو ہوتے ہیں، ہاں اوپری ہونٹ، کان اور دم پر کچھ بال ہوتے ہیں۔ ڈھلوان زمین یا دریا کے کنارے آسانی سے چڑھ جاتا ہے۔ چلتے وقت اس کے پیر کے نشان دو متوازی لکیروں کی شکل میں اُبھر آتے ہیں۔

وہ انسان سے زیادہ تیز دوڑ سکتا ہے تیرنے

میں وہ بہت تیز اور چالاک ہوتا ہے۔ دریا کے گہرے پانی کی تہہ سے وہ سانس لینے اوپر آتا ہے۔ پانچ چھ منٹ پانی میں ڈوبا رہتا ہے۔ یہ گھوڑا پانی میں فی گھنٹہ آٹھ میل کی رفتار سے تیر سکتا ہے۔ لکڑی کے موٹے کندے کی طرح پانی کی سطح پر تیرتا ہے۔ خطرہ کا احساس ہوتے ہی پانی میں غوطہ لگا لیتا ہے۔ غوطہ لگانے پر اس کی ناک کے پردے بند ہو جاتے اور اوپر آنے پر کھل جاتے ہیں۔ اور اس میں سے پانی کے فوارے اڑتے ہیں۔

دھیرے دھیرے بہنے والے پانی میں آرام کرنا اسے زیادہ پسند ہے۔ کبھی کبھی دن بھر پانی یا کیچڑ میں پڑا رہتا ہے۔ اور دھوپ میں نہاتا ہے۔ دوسرے جانداروں کے بچے دیکھنے میں بھلے معلوم ہوتے ہیں مگر اس کے بچے بڑے بے ڈول اور بھدے معلوم دیتے ہیں۔ بچوں کی ماں بڑی فکر سے ان کی نگرانی اور پرورش کرتی ہے۔ اور اس کے سر پھرے غصیلے باپ کے قہر سے انھیں بچانے کی فکر رکھتی ہے۔ وہ اس معاملے میں بڑی محتاط رہتی ہے۔

ساڑھے سات ماہ کے بعد وہ بچے دیتی ہے پیدا ہوتے ہی بچوں کا وزن پچاس سے ستر چھتر پونڈ تک ہوتا ہے۔ ایک مہینے بعد ان کا رنگ ماں باپ جیسا نظر آتا ہے۔ وہ پانی میں ڈوب کر اپنی ماں کا دودھ پیتے ہیں۔

دریائی گھوڑے کے بچے چلنا سیکھ لینے سے پہلے تیرنا سیکھتے ہیں۔ وہ اپنے باپ کے خوف اور غضب اور مگرمچھ کے خطرے سے بچنے کے لیے اپنی ماں سے چمٹے رہتے ہیں یا اس کی پیٹھ پر سوار ہوتے ہیں۔

دریائی گھوڑے یا ہنگھوڑے اکثر حملہ کر کے کشتیاں الٹ دیتے ہیں۔ توڑ دیتے ہیں۔ یہ اس وقت کرتے ہیں جب بچے ان کے پاس ہوں۔ مگرمچھ سے ان کا پیدائشی بیر ہے اور کشتی پر مگرمچھ سمجھ کر حملہ کرتے ہیں۔

وہ اپنے بچوں کی پرورش کے معاملے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ دراصل ہنگھوڑا خود خطرناک یا فطرتاً خونخوار جانور نہیں ہے۔ وہ بڑا نرم و نازک طبیعت کا ہے۔ لڑائی سے بچنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ ہاں برسات کے موسم میں دریائی گھوڑوں کے مزاج میں انوکھی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ لیڈری کے لیے انسان کی طرح خونخوار ہو جاتے ہیں۔ آپس میں خوب لڑائی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ لڑائی آٹھ آٹھ گھنٹے چلتی ہے۔ درمیان میں وہ کچھ دیر سستا لیتے ہیں۔ اس لڑائی میں دونوں ایک دوسرے سے ٹکرا کر مر جاتے ہیں۔ گویا اس لڑائی کا انجام دونوں کی موت ہوتا ہے۔ لڑتے وقت وہ اپنے پچھلے پیروں پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے کندھے اور پیر زخمی کرتے ہیں۔ لیڈری سے محروم دریائی گھوڑا اکثر انتقام لینے کے لیے کسی پر حملہ آور ہوتا ہے۔ شاید یہ عادت اس نے انسان سے سیکھی ہو۔ ہر دریائی گھوڑا شیر کی طرح اپنے لیے ندی تالاب یا دریا کا حصہ اور چراگاہ مخصوص کر لیتا ہے۔ وہ گویا اس کی ملکیت ہوتی ہے۔ اور اس پر دوسروں

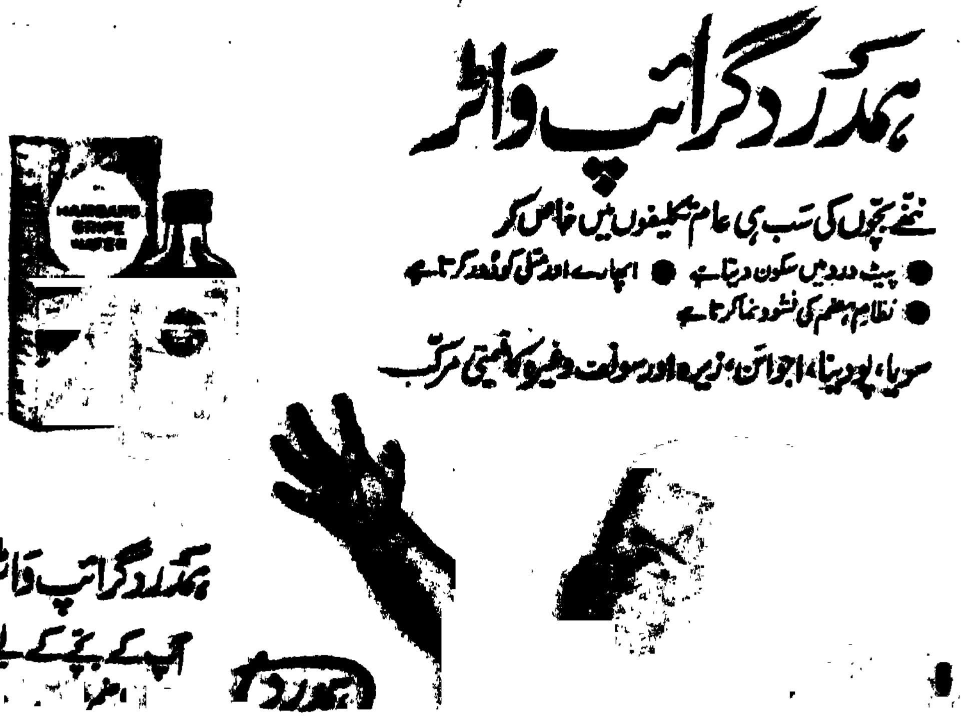
[illegible] ایک آنکھ نہیں بھاتا ۔

پنگھوڑے بڑے شوقین مزاج ہوتے ہیں۔ البرٹ نیشنل پارک کے رواں نڈی نامی مقام پر ایک دریائی گھوڑے نے تہلکہ مچا دیا تھا۔ ایک آوارہ پنگھوڑے نے سیکرٹری (منتظم) کو بدحواس کر دیا تھا۔ بجلی کی روشنی سے متاثر ہوکر وہ بڑے شوق سے پارک کے اس مقام تک پہنچا تھا لیکن پھر وہ خاموشی سے نکل گیا۔

۱۹۲۸ء اور ۱۹۳۰ء کے دوران ہیوبرٹی نامی یلسپن گھوڑی نے غیر معمولی طور پر ہلچل مچا دی تھی۔ اس پن گھوڑی نے اپنی رہائش گاہ سے ناتال تک بارہ ہزار میل کا سفر طے کیا تھا۔ ڈربان شہر میں داخل ہوکر اس نے سائیکل سواروں کو ڈرا دیا تھا۔ اور پولیس کے آنے سے پہلے وہ دریا کی راہ نکل گئی تھی۔ راستے میں اس نے دکانوں اور اسکولوں کو بھی بند کر دیا تھا۔ اس نے ایک ریل گاڑی کو کافی دیر روکے رکھا۔ انجن کی سیٹی اور شور و غل کا اس پر ذرا بھی اثر نہیں ہوا تھا۔ آخر ایک جانور کے ماہر نے بڑی مشکل سے اسے ریل کے راستے سے الگ کیا۔ مگر خوش قسمتی سے اس نے کسی قسم کا جانی نقصان نہیں کیا۔

اس کے بعد اس گھوڑی کے لیے قانون بنا دیا گیا اُسے "راشٹریہ ابھی نیتری" کا خطاب دیا گیا۔ سوائے ان کسانوں کے جن کے کھیت اس نے اجاڑ دیے تھے۔ دوسرے ہزاروں لوگوں کے دل اس نے جیت لیے تھے آخر ایک سرپھرے کسان نے تنگ آکر اسے بندوق کا نشانہ بنا دیا۔ اور جب اس کا ڈاکٹری معائنہ کیا گیا تو وہ بجائے مادہ کے نر نکلا۔

(زونیت سے ترجمہ)



جناب خالد رحیم

بھیّا



مجھے پیٹتے ہیں، رولاتے ہیں بھیّا
صبح و شام انگلش پڑھاتے ہیں بھیّا
کبھی "دل" کے معنی کنواں بولتے ہیں
کبھی "دل" کو اچھا بتاتے ہیں بھیّا
سبق یاد کیسے کروں میں بتاؤ
کہ جب الٹی سیدھی پڑھاتے ہیں بھیّا
اگر پڑھ گیا میں غلط کوئی جملہ
تو مرغا بنا کر جلاتے ہیں بھیّا
شرارت سے میری کبھی روٹھتے ہیں
کبھی مسکرا کر سراہتے ہیں بھیّا
کبھی جادوگر کی، کبھی ٹارزن کی
مزے کی کہانی سناتے ہیں بھیّا
میں ہر رات روتا ہوں سونے سے پہلے
مجھے لوری گا کر سلاتے ہیں بھیّا
مجھے پیارے باپو کے قصے سنا کر
وطن کی محبت سکھاتے ہیں بھیّا
غزل جو سناتا ہوں غالب کی کوئی
مجھے مٹھائی لا کر کھلاتے ہیں بھیّا
کبھی مجھ کو خالد کی نظمیں سنائیں

جناب محمد مسعود صدیقی



سدنام دولما

(ایک تبتی لوک کہانی)

اب سے بہت دنوں پہلے کی بات ہے تبت میں ایک خوب صورت لڑکی رہتی تھی۔ اس کا نام سدنام دولما تھا۔ وہ اس قدر خوب صورت تھی کہ پھولوں میں سب سے زیادہ خوب صورت پھول گلاب بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ تبت کے تمام علاقوں سے نوجوان اس سے شادی کا پیغام لے کر آتے تھے مگر سدنام دولما کے ماں باپ ہامی نہ بھرتے۔ انھیں برابر یہ غم ستاتا رہتا کہ ایک نہ ایک دن سدنام انھیں چھوڑ کر چلی جائے گی۔ وہ ان کی اکلوتی بچی تھی۔

انھیں اس بات کا بھی احساس تھا کہ ان کی سدنام دولما جوان ہو چکی تھی۔ بہت سے نوجوان اس سے شادی کرنا چاہتے ہیں ان میں سے کچھ واقعی بہت اچھے بھی ہیں۔ اس لیے دولما کے لیے اچھے شوہر کا انتخاب بھی اس کے والدین کے لیے ضروری ہو گیا۔

ایک دن دولما کے بوڑھے والدین اس کی شادی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس کی ماں نے اپنے شوہر سے کہا۔

"ہمیں نمان ددنگ کے مندر میں جا کر، دیوتاؤں سے مشورہ کرنا چاہیے۔ اور ان کے مشورہ پر عمل کرنا چاہیے۔" دولما کے باپ نے اپنی بیوی کی رائے سے اتفاق کیا۔ اور دونوں نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ اگلے دن مندر جائیں گے۔

بدقسمتی کی بات۔ تبت کا سب سے بڑا

غنڈہ "کوبانی" اس وقت ان کے گھر کے قریب سے گزر رہا تھا۔ اور اس نے دولما کے ماں باپ کی گفتگو کا ایک ایک لفظ سُن لیا تھا۔ اس بدمعاش نے فوراً ایک منصوبہ بنا یا۔

دوسرے دن دولما کے بوڑھے ماں باپ نمان دونگ کے مندر پہنچے اور دیوتاؤں کے سامنے [illegible] دعائیں مانگنے لگے۔ اچانک انھیں ایک آواز سنائی دی "جو شخص کل صبح سب سے پہلے تمھارے گھر میں داخل ہو۔ دولما کا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دو۔ اس شخص کے ہاتھ میں ایک شال ہوگی۔ یہ شخص دولما کے لیے سب سے اچھا شوہر ثابت ہوگا۔"

دولما کے والدین کمزور اعتقاد کے تو تھے ہی انھوں نے اس آواز کو دیوتا کی آواز سمجھا۔ خوش خوش گھر لوٹے کیوں کہ دولما کی شادی کا مسئلہ تقریباً حل ہو چکا تھا۔ آج کی رات وہ اطمینان کے ساتھ سو سکتے تھے۔

دوسرے روز صبح سویرے دولما کے والدین اپنے ہونے والے داماد کے استقبال کی تیاریاں کرنے لگے۔

اور واقعی انھوں نے ایک آدمی کو اپنے گھر کی طرف آتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں سفید رنگ کی شال بھی تھی۔ جیسے ہی وہ ان کے گھر کے قریب پہنچا۔ وہ اسے خوش آمدید کہنے کے لیے دوڑے لیکن افسوس وہ شخص جوان نہیں تھا۔ اس کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی۔ بدصورت تھا۔ دولما کے والدین کو بڑا صدمہ ہوا۔ وہ سوچنے لگے اب کیا کریں۔ اس بدصورت آدمی سے دولما کی شادی نہ کریں اگر ہم نے انکار کیا تو دیوتا ناراض ہو جائیں گے۔ نہیں نہیں ایسا نہیں کر سکتے۔ لیکن دولما کا کیا ہوگا۔ وہ اس بدصورت بوڑھے آدمی کے ساتھ کیسے زندگی گزارے گی؟

بے چاری دولما نے جب اس بدصورت بوڑھے آدمی کو دیکھا تو اس کے منھ سے چیخ نکل گئی اور وہ بے اختیار رونے لگی۔ اس نے اس بدصورت شخص سے بات کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ اس کا باپ کمزور عقیدہ کا آدمی تھا۔ اسے نمان دونگ کے مندر کے دیوتا کی بات یاد تھی۔ اس نے اپنی بیٹی کا ہاتھ اس بدصورت بوڑھے کے ہاتھ میں دینا منظور کر لیا۔ اسے ڈر تھا کہ انکار کی صورت میں دیوتا ناراض ہو جائیں گے اور اسے سزا دیں گے۔ بدقسمت دولما کو ایک صندوق میں بند کر دیا گیا۔ کوبان اسے اپنی پیٹھ پر لاد کر روانہ ہو گیا۔ ماں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اسے اپنی بیٹی کی حالت پر افسوس تھا لیکن وہ اس کی مدد نہیں کر سکتی تھی۔

کوبان اپنی پیٹھ پر صندوق لادے روانہ ہو گیا۔ وہ خوش خوش چلا جا رہا تھا۔ وہ بہت خوش تھا کہ اسے

خوبصورت دلھن مل گئی ۔ وہ اپنے آپ کو مبارک باد دے
رہا تھا کہ اس کا منصوبہ کامیاب رہا اور دولہا کے
ماں باپ اس کے جال میں پھنس گئے ۔ صندوق میں
جو آواز دولہا کے والدین نے سنی تھی وہ اصل میں
کوبان کی تھی ۔ دیوتاؤں کی آواز نہیں تھی ۔

خوش قسمتی سے ایک ایسی بات ہو گئی کہ دولہا
کو اس ظالم سے نجات مل گئی ـــ کوبان آرام کرنے
کے لیے راستے میں ٹھہرا ۔ اس نے صندوق زمین پر
رکھ دیا اور ایک درخت کے نیچے لیٹ گیا ۔ تھوڑی دیر
بس اس کی آنکھ لگ گئی !۔

اس وقت ایک شکاری وہاں سے گذرا ۔
شکاری نے صندوق کے اندر سے آواز سنی ۔ اس نے
صندوق کھولا ۔ صندوق کھلتے ہی دولہا اس میں سے
ں پڑی ۔ اس نے
رو رو کر شکاری کو اپنی
استان سنائی ۔ شکاری
اس پر رحم آیا ۔ اس نے
پنے شکاری کتے کو صندوق
بند کر دیا اور دولہا
لس کے اس کے گھر لے
ا ۔



ادھر کوبان کی
کھلی اور وہ صندوق اپنی پیٹھ پر رکھ کر روانہ ہو گیا
پہنچ کر اس نے صندوق بستر پر رکھا اور آہستہ سے اسکا ...

ارے ! صندوق کھلتے ہی شکاری کتا جست
لگا کر باہر نکلا اور دانت نکال کر غرانے لگا اور پھر ایک دم
کوبان پر جھپٹ پڑا ۔ کوبان مدد کے لیے چلایا مگر کوئی اس
کی مدد کے لیے نہیں آیا ۔ کوبان کے پڑوسی اس سے
نفرت کرتے تھے ۔ وہ انھیں ڈراتا دھمکاتا رہتا تھا ۔ اس
لیے ان میں سے کوئی بھی اس کی مدد کے لیے نہیں آیا ۔

دوسرے دن پڑوسی کوبان کے مکان کے قریب
سے گذرے تو انھوں نے دیکھا کہ کوبان نیم مردہ زمین
پر پڑا ہوا ہے ۔ کتا کہیں دکھائی نہیں دیتا تھا ۔ غالباً
وہ اپنے مالک کے پاس جا چکا تھا ۔ کوبان کے پڑوسیوں
کو کچھ بھی نہیں معلوم تھا کہ کوبان کے ساتھ کیا ہوا ہے
وہ یہ سمجھے کر بھوتوں نے اسے مار ڈالا ہے ۔ اور وہ
اپنے بدمعاش پڑوسی کے مرنے پر رنجیدہ نہیں
...

جناب عبدالصبور سبتوی

وقت کے ساٹھ منٹ



آپ نے کبھی یہ اندازہ لگایا ہے کہ دنیا میں صرف ایک منٹ میں کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔ اس وقت جب اس مضمون کے الفاظ نظروں سے گذر کر آپ کے ذہن کی طرف سفر کر رہے ہوں گے اس وقت ساری دنیا میں آدھی مخلوق سو رہی ہوگی اور آدھی اپنا پیٹ پالنے کے لیے دوڑ دھوپ میں مشغول ہوگی۔ دیکھیے یہ مضمون لکھنے کی آواز جو کاغذ پر قلم گھسنے کی وجہ سے پیدا ہو رہی ہے میرے علاوہ کسی کو سنائی نہیں دیتی۔ لیکن دنیا بھر میں جتنے قلم کاغذ کے سفید سینے کو سیاہ کر رہے ہیں۔ ان کی آوازوں کو یکجا کیا جائے تو سننے والوں کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں۔

ایک اندازے کے مطابق ایک گھنٹے میں دنیا کے مختلف حصوں میں ایک کروڑ نو لاکھ سے زائد خط لکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح ہمارے بڑے سگریٹ پیتے ہیں تو ہلکا ہلکا دھواں فضا میں پھیل جاتا ہے۔ یہ دھواں اکٹھا ہو جائے تو نیویارک جیسے شہر کو ڈھانپ لے اور پچاس میل مربع کے علاقے میں سورج دکھائی نہ دے۔ ایک گھنٹے کے دوران اکیس لاکھ من تمباکو پی جاتی ہے۔ یہ خوب صورت رنگ برنگی موٹریں جو تتلیوں کی طرح سڑک پر منڈلاتی پھرتی ہیں صرف ایک گھنٹے میں ایک ہزار سات سو تیار ہوتی ہیں۔

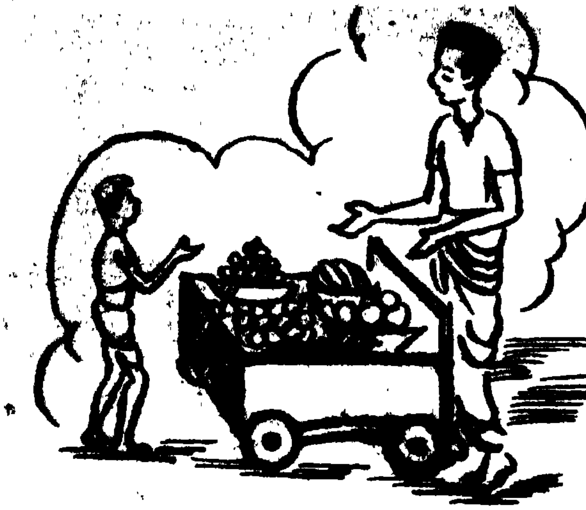
دنیا میں ایک محتاط اندازے کے مطابق ایک گھنٹے کے دوران قہوے کی سات کروڑ پیالیاں ہیں۔ اسی ایک گھنٹے میں مختلف کوئلوں کی کا ایک لاکھ بیس ہزار ایک سو نوے ٹن کوئلہ نکالا اور تیل کے کنوؤں سے پندرہ لاکھ ساٹھ ہزار ٹن ہوتا ہے —— گھڑی کے ڈائل پر گھنٹے کی ہندسے سے دوسرے ہندسے تک پہنچتی ہے تو ہم شمار کرتے ہیں اور اس ایک گھنٹے میں پانچ ہزا چالیس بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اور چار ہزار چھ سو عورت، بچے اس جہاں سے کوچ کر جاتے ہیں۔

صبح کو ہم اخبار پڑھتے ہیں جس کا وزن ہمیں کبھی محہ ہوتا لیکن دنیا بھر میں صرف ایک گھنٹے کے دورا والے اخباروں کا وزن ستر ہزار نو سو پچاسی ٹ جاتا ہے۔ ہر گھنٹے میں پندرہ لاکھ تار بھیجے اور ترانوے ارب ٹیلی فون کیے جاتے ہیں۔

ہر نئے گھنٹے میں ایک ہزار چھ سو پچاس ہوتی ہیں اور اسی مختصر سے وقت میں ایک سو ایک دوسرے کو طلاق دیتے ہیں۔

ہر گھنٹے میں کھائی جانے والی خوراک ایک کروڑ من ہے۔ ایک عام اندازے کے م گھنٹے میں لوگ لاے کروڑ میل سفر کرتے ہیں۔ د

جناب عبدالمتین نیاز



چاٹ والا

پکوان کیا مزے کے لاتا ہے چاٹ والا
لے کر بڑا سا ٹھیلا آتا ہے چاٹ والا

بمبئی کی "بھیل پوری" دلّی کی ہے کچوری
کھا کر انھیں ہوئی ہے ہر اک زباں چٹوری

"رگڑا مسالہ" بچو، جس شخص نے نہ کھایا
سمجھو کہ زندگی کا اس نے مزا نہ پایا

"ٹکیاں یہ آلوؤں کی، آلو چنے کے چھولے"
لذّت جو ان کی پائے گونگا زباں کھولے

دیکھو "دہی بڑے" تو آتا ہے منھ میں پانی
اکثر تو نام ان کا لاتا ہے منھ میں پانی

یوں سرخ سے تلے ہیں یہ پیٹیاں "سموسے"
جو اک نظر بھی دیکھے کھانے کی بات سوچے

"گرما گرم پکوڑے" چٹنی پھر املیوں کی"
اس میں چھپی ہوئی اک دنیا ہے لذّتوں کی

کھانا ضرور بچو! آخر میں "پانی پوری"
اس کو اگر نہ کھاؤ پھر چاٹ ہے ادھوری

لکھی نیاز نے بھی یہ نظم چاٹ کھا کر
سب کو سناؤ بچو! اس کی یہ نظم گا کر

انوکھی بارات



ایک برہمن تھا۔ بہت ہی سیدھا سادہ بہت ہی بھولا بھالا۔ غریب اتنا کہ بدن پر پھٹے کپڑے اور پاؤں میں ٹوٹی پھوٹی جوتی میسّر نہیں تھی۔ میلی سی ایک دھوتی پہنے، ننگے سر ننگے پاؤں صبح سے شام تک ساری بستی میں مارا مارا پھرتا لوگوں کے ہاتھ کی ریکھائیں (لکیریں) دیکھ کر ان کا کام سپھل ہو جانے کی دعا دیتا اور دوسروں کو بگڑی تقدیر بن جانے کی خوش خبری سناتا۔ لیکن اپنی تقدیر کے بگاڑ کو نہ سدھار پاتا۔ مایوس ہو کر در بدر بھیک مانگتا۔

دن بھر محنت کر کے تھوڑا بہت دال دلیا اور کچھ نقد مل جاتا تو خوشی خوشی گھر پہنچ کر اپنی بیوی کو سونپ دیتا۔ سستے زمانے میں اتنا ہی غنیمت تھا کہ دن بھر میں ایک وقت پیٹ بھر جائے۔

مگر اس کی برہمنی بڑی تیز مزاج بہت عیش پسند بڑی خود غرض تھی۔ میاں مرے یا جئے اسے ہر حالت میں اچھا کھانا قیمتی کپڑے اور ہر وقت کا بناؤ سنگھار چاہیے۔ جھونپڑی میں رہ کر محلوں کے خواب دیکھتی۔ اور برہمن کے ساتھ غلاموں سے برا برتاؤ کرتی۔ جس دن برہمن تھوڑی بھیک لیکر آتا یا کسی مجبوری سے بھیک مانگنے نہ جاتا تو غریب کی جان پر قیامت ٹوٹ پڑتی خوب جلی کٹی

ایک دن برہمن کی طبیعت خراب ہو گئی زکام اور بخار! بے چارہ چلنے پھرنے سے مجبور ہو گیا کے سر میں بہت درد تھا۔ اور بخار کی شدت سے پھنکا جا رہا تھا۔ مگر اس حالت میں بھی برہمنی نے اسے نہ بیٹھنے دیا اور بھیک کا تھیلا ہاتھ میں پکڑا کر باہر دھکیل دیا۔ وہ بے چارا بڑی مشکل سے ایک قدم سنبھال کر رکھتا ہوا آہستہ آہستہ چلنے کی کوشش تھا کہ تھوڑی دور چل کر بخار اور تیز ہو گیا اور سر چکرا اور بڑی ہمت اور کوشش کر کے بھی آگے نہ بڑھ ایک سائے دار درخت کے نیچے پیڑ کے تنے سے ٹک بیٹھا اور بے ہوش ہو کر وہیں گر گیا۔

جب ذرا ہوش آیا تو بخار کچھ کم ہو گیا تھا۔ بھی ڈھل چکا تھا۔ کمزوری اور نا طاقتی اب بھی اتنی ز تھی کہ لکڑی کا سہارا لے کر گرتا پڑتا بڑی مشکل سے پہنچ پایا۔

یہاں آکر دیکھا تو برہمنی گھر میں تالا ڈال سیر سپاٹے کو چلی گئی تھی مرتا کیا نہ کرتا۔ اپنے ہی در

پر چوکیدار بن کر دو گھنٹے تک پہرہ دیتا رہا۔ بڑی دیر بعد جب برہمنی واپس آئی تو برہمن کو خالی ہاتھ دیکھ کر برس پڑی اور کہنے لگی "آگ لگ جائے ایسے گھر میں اوس پڑے ایسے نکھٹو گھر والے پر کہ صبح سے شام ہو گئی چولھا پٹ پڑا ہے۔ اور یہ موا منحوس خالی ہاتھ ہلاتا ہوا گھر آگیا۔ وہیں کہیں مرتا کم بخت تو، آئے دن کی مصیبت سے تو پیچھا چھوٹ جاتا"

اس نے یہ کہہ کر کواڑ بند کر لیے اور اندر سے کنڈی لگا دی برہمن باہر کھڑا ہوا تکلیف کے مارے کراہ رہا تھا۔ جب دیر تک دروازہ نہیں کھلا تو اس نے سوچا کہ اس سے تو یہی اچھا ہے کہ یہاں سے کہیں دور منھ کالا کر جاؤں اور وہاں جا کر مر رہوں۔ اس چنڈالن کو اپنا منہ نہ دکھاؤں۔

برسات کا موسم، رات کا وقت، بادل میں چھپی ہوئی دھندلی چاندنی، بخار سے ٹوٹا بدن، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے بستی سے دور نکل کر جنگل کی راہ لی۔ وہ اپنی دھن میں برہمنی کو برا بھلا کہتا ہوا چلا جا رہا تھا کہ اس کے ننگے پاؤں پر ایک بڑے سے کالے سانپ نے منہ رکھ دیا۔ پہلے تو وہ اچھل کر دور ہٹ گیا پھر سوچا چلو یہ بھی اچھا ہوا کہ جلد ہی موت کا سامنا ہو گیا۔ اب مجھے اپنی جان دینے کے لیے دور نہیں جانا پڑے گا۔ نہ جانے کب تک میں پردیس میں بھٹکتا پھرتا۔ اس سانپ کو ہاتھ سے پکڑ لوں جس سے قصہ ہی تمام ہو جائے۔ نہ ہو گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ سانپ ابھی زمین پر پڑا تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور جھک کر سانپ کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ لیکن سانپ نے اسے کاٹا نہیں بلکہ جلدی سے برہمن کے کاندھے سے لٹکی ہوئی جھولی میں گھس گیا۔

برہمن نے سوچا شاید اس وقت یہ زیادہ تھکا ماندہ ہو گا، واپس لوٹ چلوں اور دن نکلے کسی کمہار سے ایک ہانڈی لے کر سانپ کو اس میں بند کر کے اوپر سے ہانڈی کا منہ ڈھانک دوں۔ گھر پہنچ کر ہانڈی چھینکے پر ٹانگ دوں۔ جب برہمنی اس میں ہاتھ ڈالے گی تو یہ سانپ اسے فوراً ڈس لے گا اور اس طرح سے ہمیشہ کے لیے اس بلا سے میرا پیچھا چھوٹ جائے گا۔

دوپہر کے وقت وہ گھر واپس آیا۔ چپنی سے ڈھکی ہوئی ہانڈی چھینکے پر ٹانگ دی۔ پھر برہمنی سے ہنس کر کہا۔ "اری سنتی ہے اپتر میشری! دیکھ آج تیرے لیے کیا بڑھیا پرساد لایا ہوں، جسے دیکھتے ہی خوشی سے ناچنے لگے گی۔"

برہمنی تھی ہوشیار ہاتھ ڈالنے سے پہلے۔ چھینکے سے ہانڈی اتار کر ڈھکنا کھولا اور بھی حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر رہ گئی۔ "ارے یہ لال لال چمکیلا گول انڈا جیسا پتھر کہاں سے اڑا لائے تم؟ میں اسے اپنی چوٹی میں باندھوں گی تو میری سکھیاں دیکھ کر اچنبھے میں پڑ جائیں گی۔ یہ تو بڑا سندر ہے۔ بہت ہی زیادہ سندر ..... "

لو اب جلدی سے اشنان کر کے چوکے میں آجاؤ آج ساونی ہے۔ میں نے پڑوسن سے دودھ لا کر کھیر پوری بنائی ہے۔"

برہمن نے اپنی پتنی (بیوی) کو سر سے پاؤں تک غور سے دیکھ کر تعجب سے کہا۔ "لا ہانڈی لا۔۔۔

جلدی سے ہانڈی اس کے ہاتھ سے لے کر دیکھی تو ایک چراغ جیسا روشن سرخ اٹھا! دیکھتے ہی اس کی باچھیں تو کھل گئیں۔ مسکرا کر کہنے لگا۔ "اری پگلی سوتے میں کوئی چندرچوڑی کاٹ کرے جائے گا اسے۔ یہ تو بہت ہی سندر ہے لا میں لے بازار میں ...... جاکر بیچ آؤں کچھ کھانے پینے کے پیسے مل جائیں گے۔"

برہمنی بولی: "میں بھی تمہارے ساتھ بازار چلوں گی پتی دیو (شوہر) کہیں اکیلے نہ چلے جانا کوئی چور اچکا لے بھاگے گا اسے یا کوئی اونے پونے دام دے کر ٹھگ لے گا تمہیں۔ تم ٹھہرے سیدھے آدمی، چلے آؤ گے اپنا سا منہ لے کر۔"

دونوں کھانا کھا کر بازار گئے۔ بستی میں تو کوئی خریدار ملا نہیں۔ تلنگے میں بیٹھ کر ایک بڑے شہر میں جا پہنچے اور سیدھے صرافہ بازار میں گھس گئے۔ چھوٹے جوہریوں نے کم قیمت لگائی اور بڑے دکانداروں نے اس سے کچھ زیادہ۔ مگر برہمن کے راضی ہو جانے پر بھی برہمنی اسے بیچنے پر تیار نہیں ہوئی۔ بات سو دو سو روپے سے لے کر پانچ ہزار تک جا پہنچی۔ برہمنی اور آگے چل کر شہر کے سب سے بڑے مہاجن کی دکان پر گئی۔ یہ مہاجن دیانتدار آدمی تھا۔ اس نے پتھر کو خوب غور سے دیکھ کر کہا: "یہ تو انمول چیز ہے پنڈت جی! میں اپنی حیثیت کے مطابق دس ہزار روپیہ دے سکتا ہوں۔ اس سے زیادہ میرے پاس پونجی نہیں ہے۔" دس ہزار کا نام سن کر برہمنی کے منہ میں پانی بھر آیا اس نے کہا۔ "بہت اچھا تم اسے خرید لو سیٹھ جی!"

برہمن سے مہاجن نے سوال کیا "مگر لائے کہاں سے؟ پہلے پولس میں رپٹ (رپورٹ) پڑے گی نہیں تو تمہارے ساتھ میں بھی پھانس جاؤں گا۔"

برہمن نے اطمینان کے ساتھ جواب دیا: "مجھے جنگل میں پڑا ہوا ملا تھا۔ ایک سانپ نے سے دیا تھا میں نے اسے مار کر اس پر قبضہ جمالیا۔" ان کی سن کر پولیس کے دو آدمی دکان پر آ گئے اور لگے "تمہیں تھانے میں چلنا پڑے گا۔ سمجھے یہ تو چور کا مال ہے۔ کہیں ایسے قیمتی پتھر سانپ اگلا کرتے؟"

برہمن اور برہمنی دونوں سپاہیوں کے ساتھ پولیس تھانے میں پہنچے۔ تھانیدار نے جب اس پتھر کو دیکھا تو اس کی آنکھیں چوندھیا گئیں۔ کہنے لگا: "دونوں کو حوالات میں بند کر دو حوالدار۔ پکے چور کسی بڑے رئیس کے یہاں ڈاکا ڈال کر اس پتھر کو لائے ہیں۔" برہمنی دھاڑیں مار مار کر رونے لگی برہمن نے تھانیدار کے پاؤں پکڑ کر کہا: "حضور ہم غریب ضرور ہیں مگر چوری نہیں کرتے بھیک مانگ کر اپنا پیٹ بھر لیتے ہیں دیا (مہربانی) کر کے ہمارا لعل واپس کر دیجیے۔ جان و مال کو دعا دیتے رہیں گے سرکار!"

تھانیدار پر ان کی آہ وزاری اور چیخ پکار کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس نے لعل کو سرکاری تجوری میں بند کر کے دونوں کو تھانے سے باہر نکلوا دیا۔ برہمن

جاکر بیچ سڑک پر غش کھا کے گر گیا اور برہمنی کی روتے روتے بری حالت ہو گئی۔ سڑک پر تماشائیوں کی بھیڑ لگ گئی سب لوگ زبانی ہمدردی کر رہے تھے مگر تھانیدار سے ٹکر لینے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ ابھی یہ دونوں وہیں موجود تھے کہ دور سے چار گھوڑوں کی ایک خوب صورت گاڑی آتی ہوئی نظر آئی۔ جس میں ریشمین پردے لگے ہوئے تھے اور اوپری حصے میں سرکاری نشان بنا ہوا تھا۔ جھنڈا لہرا رہا تھا۔

وہاں کھڑے ہوئے لوگوں نے ایک زبان ہو کر کہا۔ سرکار کی سواری آ رہی ہے۔ آج بڑا اچھا دن ہے کہ ہم ان کے شبھ (مبارک) درشن کریں گے۔ بڑے دیالو ہیں ہمارے مہاراج۔ گاڑی قریب آ گئی مہاراج کی جے کار پکاری جانے لگی۔ سڑک کے کنارے لگی ہوئی بھیڑ کو چیرتی پھاڑتی ہوئی برہمنی سڑک پر نکل آئی اور راستے میں لیٹ کر زور زور سے چیخنے لگی "دہائی ہے مہاراج کی۔ دہائی ہے سرکار کی۔ مجھے بچاؤ میں لٹ گئی داتا۔"

لوگوں نے اسے کھینچ کر کھڑا کرنا چاہا مگر وہ مچل کر زیادہ رونے چلانے لگی۔ راجا کی گاڑی وہاں رک گئی۔ نیچے اتر آئے اور انھوں نے پوچھا "کیا ہوا اس عورت کیا ہوا ہے؟" برہمنی نے اٹھ کر ان کے پاؤں چھوتے کہنے لگی سرکار! آپ کے تھانیدار نے زبردستی لعل چھین لیا۔ اور برہمن کو مار پیٹ کر بھگا دیا!"

(باقی ۱۰/ ص ۳ ۱۲۱ گلہ ماہ

باقی مضمون سدنام دولما کا

ادھر شکاری دولما کو لے کر اس کے بوڑھے ماں باپ کے پاس پہنچا۔ وہ اپنی بیٹی کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے شکاری کا شکریہ ادا کیا۔ دولما کو یہ نیک اور شریف شکاری بہت پسند آیا اور اس کے والدین نے بھی اسے پسند کر لیا۔ اس نے دولما کے والد اور والدہ سے درخواست کی کہ وہ دولما کی شادی اس کے ساتھ کر دیں۔

دولما کے والدین فوراً راضی ہو گئے اور کچھ دنوں بعد ان کی شادی ہو گئی۔ ●

تعلیمی تاش کی قیمتیں

تعلیمی تاش اردو	1/40
" " انگریزی	1/40
" " ہندی	1/90
" " اردو انگریزی	1/90
" " اردو ہندی	1/90
" " ہندی انگریزی	1/40
" " بچوں کا تاش اردو	1/12
" " " " ہندی	1/12
" " ہندی سکھانے والے کارڈ	-/75
" " نیا تاش پڑھے اور بے پڑھے کھیل سکتے ہیں	1/25

جناب فوق فاروقی

پیٹولڑکے کا گیت



ڈٹ کے کھلاؤ مجھ کو تم دودھ اور ملائی
اے میری پیاری بہنوں اے میرے اچھے بھائی
ڈیڈی یہ التجا ہے لڈو خرید لاؤ
ممی بٹھا کے مجھ کو نعم پیار سے کھلاؤ
حلوہ بنے جو گھر میں سب میرے نام کر دو
بھر جائے پیٹ میرا بس اتنا کام کر دو
اے میرے دوستو کچھ خاطر سے کام لے لو
اک سیر گاجریں لو، ڈیڑھ سیر جام لے لو
رامو ترے ٹفن میں کھانا لذیذ ہوگا!
ڈبے میں تیرے شاید زردہ عزیز ہوگا
شیلا کچوری پوری لاتی ہے اپنے گھر سے
کھانے نہ دے گی وہ کچھ بس دیکھ لوں نظر سے
ہوگا یہ پیٹ خالی نیت تو کچھ بھرے گی
مانا کہ مجھ پہ دنیا الزام یہ دھرے گی
کہلایا جاؤں گا میں پیٹو زمانے بھر کا
کیا فکر کہ جو راشن کم ہوگا میرے گھر کا
کھاؤں گا خوب ڈٹ کے ہر روز میں تو کھانا
لے کر مزے لکھیں گے شاعر مرا افسانہ

مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ ابن بطوطہ

جس دریا سے ہم پار ہو کر آئے۔ اس کا پانی رسات میں نہیں پیتے۔ نہ جانوروں کو پلاتے ہیں۔ اگرچہ تین دن دریا کے کنارے پر ٹھہرے۔ مگر پانی بیا۔ کہتے ہیں کہ یہ دریا ہمالیہ سے نکلا ہے۔ ہمالیہ اڑ میں سونے کی کانیں ہیں۔

افغان پور میں میرے پاس حیدری فقیروں ایک گروہ آیا جنھوں نے پہلے قوالی سنی۔ پھر جلتی ں میں گھس گئے۔ اس سے پہلے میں ذکر کر چکا ہوں بادشاہ معبر چلا گیا تھا۔ جب وہ تلنگانہ سے را تو شاہی فوج میں وبا پھیل گئی۔ اس لیے دولت د واپس آگیا۔ اور پھر گنگا کے کنارے پڑاؤ ڈال دیا بھی وہاں گیا تھا۔ ان ہی دنوں میں عین الملک ی ہو گیا تھا۔ اور میں بھی بادشاہ کے ساتھ ن الملک کی بغاوت کو دبانے میں شریک جنگ تھا ہی دنوں میں حضرت سید سالار مسعود غازی کی قبر یارت نصیب ہوئی۔ اور پھر بادشاہ کے ساتھ آگیا۔

محکمہ جاسوسی

بادشاہ نے جاسوسی کا انتظام اتنا مکمل کر رکھا تھا کہ دلّی کے ہر گھر کا حال رتّی رتّی اسے معلوم رہتا تھا۔ وہ باخبر رہتا تھا کہ امیروں کے پاس کن کن لوگوں کی نشست رہتی ہے۔ اور خود امیر کہاں کہاں جاتے ہیں اور کن کن پارٹیوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس نظام کا سلسلہ اس طرح جاری تھا کہ ہر ایک امیر کے پاس اندر اور باہر کے کام کرنے کے لیے چھوکریاں اور غلام رہتے تھے۔ اور جتنا بڑا امیر ہوتا اتنی ہی تعداد میں یہ عملہ ہوتا تھا۔ لونڈی غلام محکمہ جاسوسی سے وابستہ تھے۔ اور جاسوسی کا افسر اعلیٰ براہ راست بادشاہ کو رپورٹ دیتا تھا۔

محکمہ جاسوسی میں مہترانیاں جو ہر گھر میں جاتی تھیں زیادہ کارآمد ثابت ہوتی تھیں۔ وہ ہر چھوٹے بڑے گھر میں بلا تکلف جاتی تھیں اور چھوکریوں سے بھید کی باتیں معلوم کر لیتی تھیں اور پھر افسر اعلیٰ تک پہنچا دیتی تھیں۔ بادشاہ ان امیروں کی بعض

ایسی باتوں سے آگاہ تھا۔جس کا بیان کرنا بھی
شائستگی کے خلاف ہے۔

بادشاہ شیخ شہاب الدین جام سے ناراض تھا
اور اتفاق یہ کہ میں بھی ایک دو مرتبہ جہاں شیخ دلّی
کے باہر رہتے تھے گیا تھا۔بادشاہ نے شیخ کو گرفتار
کیا تو یہ بھی معلوم کیا کہ شیخ سے ملنے کے لیے شاہی
مقربین میں سے کون لوگ جاتے ہیں۔اور جب
ان لوگوں کی فہرست پیش کی گئی تو میرا بھی ان میں نام
تھا۔اتنی ہی بات پر بادشاہ نے حکم دے دیا کہ چار
پہرے داروں کا پہرا میرے دیوان خانہ پر لگا دیا جائے۔

سچ ہے کہ بادشاہوں کا قرب اور شعلہ زن
آگ کے برابر بیٹھنا خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔
گاہے بسلامے برنجیدو گاہے بہ دشنامے خلعت دہند
والی بات ہے۔کبھی گالی سے خلعت بخش دیں اور
کبھی سلام کرنے سے خفا ہو جائیں۔پہرے کا مطلب
یہ تھا کہ اب میری جان کی خیر نہیں ہے۔

میں نے حسبنا اللہ و نعم الوکیل پڑھنا شروع
کیا اور صبح سے شام تک ۳۳ ہزار بار پڑھا۔رات
کو زنان خانے میں بھی نہیں گیا۔اور پانچ دن کا روزہ
رکھ کر روزانہ ایک ایک کلام مجید ختم کیا۔اور پانی
سے روزہ افطار کیا۔پھر چار دن کا روزہ رکھا۔روزانہ
ایک ایک کلام مجید ختم کیا۔شیخ قتل ہو گیا تو پہرہ اٹھا
اس واقعہ سے میرا جی کھٹا ہو گیا اور میں نے ٹھان لی کہ
سب ٹھاٹ باٹ چھوڑ کر درویشی اختیار کر لوں۔پھر

شیخ کمال الدین غازی کی خدمت میں چلا
جو کچھ میرے پاس تھا لٹا دیا اور شیخ کی
گذاری اختیار کر لی۔شیخ کی حالت یہ تھی کہ
بیس بیس دن کا روزہ رکھتے تھے۔مگر میں طے
رکھنا چاہتا تو روک دیتے اور فرماتے کہ عباد
اپنے نفس پر زیادہ سختی نہ کرو،

ابھی کچھ نقدی اور سامان میرے
اور مجھے ہر وقت اس کا بوجھ محسوس ہوتا تھا
ایک دن سب کچھ لٹا کر اور اپنے شان دار کپڑے
درویش کو دے کر اس کی گدڑی پہن لی۔اور
خدمت میں پانچ مہینہ رہ کر ریاضت کرتا ر
بادشاہ کو خبر پہنچی تو اس نے مجھے
اس وقت بادشاہ سہسرام میں تھا۔مجھ سے بڑ
اور محبت سے دوبارہ ملازمت کے لیے کہا۔م
انکار کیا اور حج بیت اللہ کی خواہش ظاہر
بادشاہ نے منظور کر لیا۔پھر میں ایک خانقا
ٹھہر گیا جسے ملک بشیر کی خانقاہ کہتے ہیں۔

یہ جمادی الثانی کا آخری مہینہ تھ
۷۴۲ھ سال تھا۔رجب سے ۱۷ شعبان
میں نے چلّہ کیا اور رفتہ رفتہ پانچ دن کا روزہ
لگا۔پانچویں دن پھیکے چاول کھا لیتا تھا۔دن
قرآن پاک کی تلاوت کرتا۔اور رات بھر نفلیں
چالیس دن پورے ہو چکے تھے کہ بادشاہ نے میر
ایک گھوڑا لونڈیاں غلام کپڑے اور خرچ کا

عجیب بات کہ شاہی لباس پہننے سے مجھ گرانی محسوس ہوئی اور جو سکون گدڑی میں تھا زرق برق لباس میں نہ تھا

چین کا سفر

جس زمانہ میں بادشاہ نے پہاڑ پر حملہ کیا تھا پہاڑ کی بہت سی عمارتیں ٹوٹ پھوٹ گئی تھیں ان ہی میں سم مل کے مندر بھی تھے۔ شاہ چین ان مندروں کو نئے سرے سے بنانا چاہتا تھا۔

سم مل وہ جگہ ہے جہاں ہر سال چین والے یاترا کرتے ہیں۔ شاہ ہند نے جواب میں لکھا تھا۔ کہ جدید عمارتیں اور مندر بنانے کی انھیں اجازت دی جاتی ہے۔ جو حکومت کو ٹیکس دیتے ہیں (یہ ٹیکس جزیہ کے طور پر لیا جاتا ہے اور جن لوگوں سے یہ ٹیکس لیا جاتا ہے انھیں "ذمی" کہتے ہیں) شاہ چین نے جو تحفے بھیجے تھے ان کی تفصیل یہ ہے۔

غلام اور لونڈیاں	۱۰۰
کم خواب کے تھان	۵۰۰
مشک	۵ من
جواہرات سے مرصع خلعت	۵
سونے کے ترکش	۵
تلواریں	۵

جواب میں جو تحفے شاہ ہند نے بھیجے ان کی تفصیل یہ ہے۔

غلام	۱۰۰
گانے والی لونڈیاں	۱۰۰
اونی کپڑے کے تھان	۱۰۰
شیرباف کے تھان	۱۰۰
صلاحیہ کے تھان	۱۰۰
مرغر کے تھان	۵۰۰
رومی کتان کے تھان	۱۰۰
بغیر آستین کے چوغے	۱۰۰
خیمے	۶
چاندی کے شمع دان	۴
ریشم کے تھان	۱۰۰
سونے کے شمع دان	۴
سونے کے طشت	۴
سونے کے لوٹے	۴
چاندی کے طشت	۴
زریں خلعت شاہی	۱۰
ٹوپیاں جواہر نگار	۱۰
ترکش طلا کار جن پر ایک پرموتی جڑے ہوتے ہیں	۱۰
دستانے جن پر موتی جڑے ہوئے تھے۔	۱۰
نوجوان غلام	۱۵

یہ تمام سامان کافور شرب دار کی تحویل میں دیا گیا۔

کافور بادشاہ کا خاص غلام تھا۔ شرب دار کا مطلب یہ کہ یہی کافور بادشاہ کے پینے کا پانی اور دوسرے پینے کی چیزوں کا مہتمم تھا۔ امیر زنجانی

(ظہیرالدین) کو حکم دیا گیا کہ میرے ساتھ جائیں، یہ
بڑے فاضل آدمی تھے۔ سمندر تک پہنچانے کے
لیے امیر محمد بردی کو ایک ہزار سواروں کے ساتھ روانہ
کیا۔ کہ خشکی کے سفر میں ہماری اور سامان کی حفاظت
کریں۔

چین کے سفیر کی جماعت ایک سو پندرہ
آدمیوں کی تھی۔ یہ بھی ہمارے ساتھ تھی۔ ان کے
سردار یعنی سفیر کا نام ترسی تھا۔

بادشاہ نے یہ بھی حکم دیا کہ راستہ بھر ہم
سب سرکاری مہمان رہیں گے اور کھانے پینے کا
خرچ بذریعہ سرکار ہوگا۔

سفر کی تاریخیں

ہندوستان کا رواج ہے کہ جب کہیں سفر
تے ہیں تو دوسری، ساتویں، بارھویں، سترھویں
ستائیسویں تاریخ میں سفر کرتے ہیں۔ ہم بھی ستائیسویں
کو چلے۔

سب سے پہلے ہمارا پڑاؤ تلپت میں ہوا۔
جو دہلی سے سات آٹھ میل دور ہے۔ پھر آؤ میں۔
پھر بیانہ میں۔

بیانہ بڑا خوب صورت شہر ہے۔ بازار بھی
خوب صورت ہیں۔ جامع مسجد بھی شان دار ہے۔
مظفر بادشاہ کی دایہ کا بیٹا بیانہ کا حاکم ہے۔

بیانہ کے بڑے عالموں میں امام عز الدین
زبیری ہیں۔ میری ان کی ملاقات ہوئی۔

یہاں سے ہم کول (علی گڑھ)
میں آموں کے باغ بہت زیادہ ہیں ہمارا
سے باہر میدان میں ہوا۔

یہاں حضرت شیخ شمس الدین
ہوئی جنھیں تاج العارفین کہتے ہیں نابینا
عمر ہے۔

خبر ملی کہ شہر جلالی کو باغیوں
ہے اور وہاں کے لوگ تنگ ہیں۔ ہم نے باغ
جتھے پر حملہ کر دیا اور ان سب کو مار ڈالا۔
سوار اور تین ہزار پیادے تھے۔ ۲۳ سوار
پیدل ہمارے بھی مارے گئے اور بادشاہ
کافور بھی مارا گیا۔ جس کے سپرد سفارت کا
تھا۔ ہم نے اس واقعہ کی اطلاع بادشاہ
اور جواب کے انتظار میں ٹھہر گئے۔

ربانی دل جب سفر کے

خدا سے وہی بندے ڈرتے ہیں جو علم رکھتے

حضرت محمدؐ

جب تک تیرا اترانا اور غصہ کرنا باقی رہے۔
آپ کو اہل علم میں شمار نہ کر

حضرت غوث الاعظم

علم کے ساتھ عمل کرو۔ کیوں کہ بے عمل عالم۔
جان جسم ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہ

اب بدرالدین



اے مرے ساتھیو!

و عرفاں کی مشعل جلاتے چلو   اے مرے ساتھیو اے مرے دوستو
جس جہاں میں جہالت کی ظلمت نہ ہو
جس میں تنگی نہ ہو اور غربت نہ ہو
بی رنگین دنیا بساتے چلو   اے مرے ساتھیو اے مرے دوستو
ہر گھڑی بلبلیں گیت گاتی رہیں
اور کلیاں ہنسیں مسکراتی رہیں
بسا گلشن یہاں لہلہاتے چلو   اے مرے ساتھیو اے مرے دوستو
زندگی اپنی قدرت کا انعام ہے
اس میں کچھ کر دکھانا بڑا کام ہے
کام کرنے کی عادت بناتے چلو   اے مرے ساتھیو اے مرے دوستو
سب سے مل کے رہو بن کے شیریں سخن
رشک کرنے لگیں سارے اہل وطن
منوں کو گلے سے لگاتے چلو   اے مرے ساتھیو اے مرے دوستو
ایسی خوشبو بنو مہکے سارا چمن
ایسی شمع بنو جگمگائے وطن
سب کو پیغام اپنا سناتے چلو   اے مرے ساتھیو اے مرے دوستو



جناب رفیق شاستری

پنچ تنتر کی کہانیاں



بندروں کے بوڑھے راجا کو جب پتہ چلا کہ اس کی آل اولاد کو راجا کے سپاہیوں نے مار ڈالا ہے تو اس کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک اٹھی، وہ رات دن اسی فکر میں رہنے لگا کہ کس طرح راجا سے بدلہ لے۔ ایک دن وہ اسی فکر میں جنگل میں مارا مارا پھر رہا تھا کہ اسے ایک تالاب دکھائی دیا۔ اس نے دیکھا کہ تالاب کی طرف جانے والے آدمی کے قدموں کے نشان تو موجود ہیں مگر واپس آنے کا ایک بھی نشان نہیں ہے۔ اس نے اس سے اندازہ لگایا کہ اس تالاب میں جو بھی گیا وہ زندہ سلامت واپس نہیں آیا۔ تالاب کے کنارے ایک پیڑ کے اوپر بیٹھ کر اس نے ساری صورت حال کا جائزہ لیا اور یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی کہ اس تالاب میں ضرور کوئی نہ کوئی آدم خور مگرمچھ رہتا ہے جو تالاب پر آئے ہوئے آدمیوں کو گھسیٹ کر تالاب میں کھینچ لیتا ہے۔ اور پھر جان سے مار دیتا ہے۔

بوڑھے بندر نے سوچا کہ ذرا اس بات کی تصدیق بھی ہو جانی چاہیئے۔ وہ خود تالاب کے کنارے جاکر کسی طرح کا خطرہ مول لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ وہ ایک بڑی سی نلکی لے آیا پیڑ پر بیٹھا بیٹھا اس نلکی کو تالاب میں ڈال کر سے پانی پینے لگا۔ تالاب میں مگرمچھ کو آہٹ کہ کوئی تالاب میں سے پانی پی رہا ہے۔ بہت سے کوئی شکار ہاتھ نہیں آیا تھا۔ پانی کی گڑگڑ سن کر اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر میں مگرمچھ واپس آیا ا نے دیکھا کہ وہاں تالاب کے کنارے کوئی مو نہیں ہے۔ مگر پھر بھی پانی کی گڑگڑاہٹ ہ ہے۔ اب جو مگرمچھ نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھا تو بندر نلکی سے پانی کھینچ رہے ہیں۔ مگرمچھ بندر اس ہوشیاری سے بہت خوش ہوا۔ وہ مگر پہنچا ہوا تھا۔ اس نے بندر سے کہا کہ میں تمہار اس ہوشیاری سے بہت خوش ہوا۔ تم کوئی ا چیز مجھ سے مانگ لو۔ تم جو بھی خواہش ظاہر کرو وہ میں پوری کر دوں گا۔

بوڑھے بندر نے پوچھا: مگر پہلے مجھے یہ بتا دیجئے کہ آپ ایک وقت میں کتنا کچھ ہضم کر

مگرمچھ نے کہا: "یہ نہ پوچھو۔ پانی کے اندر سیکڑوں شیروں اور آدمیوں کو ہڑپ کر سکتا ہوں مگر تالاب سے باہر تو ایک مرغے کو بھی ہڑپ کرنا میرے بس سے باہر ہے۔"

بوڑھا بندر بولا: "ایک راجا سے میری دشمنی ہے، میں اس کے پورے خاندان کا خاتمہ کرانا چاہتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ کسی طرح وہ سب ایک بار تالاب تک آجائیں تاکہ آپ ان سب کا خاتمہ کر دیں!"

مگرمچھ نے اسے ایک مالا دی اور کہا کہ تم یہ مالا پہن کر راجا کے محل میں چلے جانا۔ وہاں لوگ اس مالا کی چمک دمک دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے۔"

بندر وہ مالا پہن کر راجا کے محل میں پہنچا جس نے وہ مالا دیکھی حیران رہ گیا۔ اتنی قیمتی مالا تو آج تک کسی نے نہ دیکھی تھی۔ راجا نے دیکھا تو پوچھا کہ یہ مالا تمھیں کہاں سے ملی۔

بندر نے جواب دیا کہ حضور یہاں سے دور بہت دور ایک تالاب ہے اس تالاب میں اتوار کے دن سورج نکلنے سے پہلے جو غوطہ لگاتا ہے اسے اس طرح کی مالا مل جاتی ہے۔"

یہ بات سن کر راج محل اور راجہ کے تمام عزیز و اقارب اس تالاب میں اتوار کی صبح غوطہ

کے دماغ میں بھی یہ بات نہیں آئی کہ کہیں یہ بات ممکن بھی ہو سکتی ہے۔

سنیچر کے دن شام کو ہی راجا کے بال بچے اور اس کے تمام عزیز و اقارب تالاب میں غوطہ لگانے کے لیے نکل پڑے۔ صبح ہونے سے پہلے ہی یہ لوگ تالاب کے کنارے پہنچ گئے۔

راجا نے سب سے پہلے مالا لینے کے لیے غوطہ لگانے کے لیے کہا۔ مگر بندر نے منع کر دیا اور کہا کہ "حضور پہلے اور لوگوں کو مالا لینے دیجیے۔ ہم اور آپ بعد میں غوطہ لگائیں گے اور ایسی جگہ غوطہ لگائیں گے جہاں بہت سی مالائیں ملیں گی۔"

تالاب میں جو گیا وہ ڈوب گیا۔ ایک ایک کر کے سب ڈوب گئے۔ جو گیا واپس نہ آیا۔ راجا تالاب کے باہر کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے مگر تالاب کے اندر جانے والوں کے واپس نہ آنے سے انھیں فکر بھی ہو رہی تھی۔ انھوں نے بندر سے پوچھا کہ "بھئی یہ کیا ماجرا ہے کہ ابھی تک کوئی واپس نہیں آیا؟"

بندر فوراً ایک اونچی شاخ پر چڑھ گیا اور وہاں سے بولا: "تمھارے سارے عزیز و اقارب کو اس تالاب میں رہنے والا ایک شیطان ہڑپ کر چکا ہے۔ اب ان کا انتظار بے سود ہے۔ تم نے میرے بال بچوں کا خاتمہ کرایا تھا میں نے تمھارے

لے لیا۔ اب تم راج محل واپس جاؤ۔ یہاں اب کس کا انتظار کر رہے ہو؟"

راجہ غصّے سے پاگل ہو رہا تھا۔ مگر اب کر بھی کیا سکتا تھا۔

راجہ کے واپس جانے کے بعد مگرمچھ تالاب کے اوپر آیا اور اس نے بندر کی ہوشیاری کی تعریف کی۔

x — x — x — x — x — x

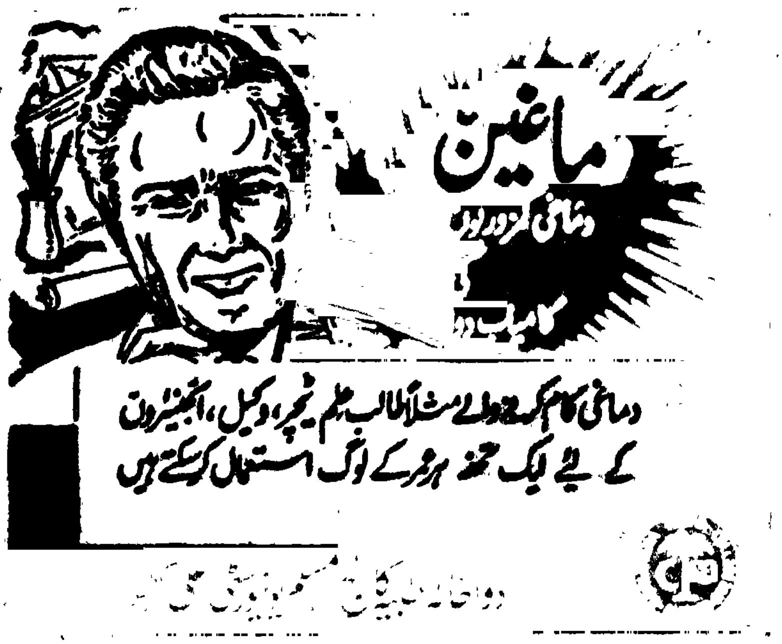
یہ کہانی سننے کے بعد سونے والے نوجوان نے چکّر والے نوجوان سے گھر واپس جانے کی اجازت مانگی۔ چکّر والے نوجوان نے کہا۔

"مجھے اس طرح پریشانی میں چھوڑ کر تم کہاں جاتے ہو؟ دوستوں کا کیا یہی فرض ہے۔ تم اتـ سنگ دل نہ بنو۔"

سونے والے نوجوان نے کہا کہ بھئی تمھیں اس مصیبت سے نجات دلانا میرے بس سے باہر ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ تمھیں مصیبت سے چھڑانے میں کہیں خود نہ عذاب میں مبتلا ہو جاؤں۔ اب میرا یہاں سے دور چلا جانا ہی ٹھیک ہے نہیں تو کہیں میرا بھی یہی حال نہ ہو جائے جو راکشش کے پنجے میں پھنسے ہوئے بندر کا ہوا تھا۔"

چکّر والے نوجوان نے کہا۔ "وہ راکشش کیا بات کہی تم نے؟ تب سونے والے نوجوان نے کہانی سنائی۔

(باقی آئندہ)



جناب عالیجاہ المنی خاں

دل چسپ اور عجیب

وینیزولا میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جس کے تنے میں سوراخ کرنے سے دودھ جیسا سفید میٹھا رس نکلنے لگتا ہے۔ یہ دودھ کا درخت کہلاتا ہے۔ اسی طرح جنوبی سمندری جزیروں میں روٹی کے درخت پائے جاتے ہیں۔ اس کے پھول مزے اور شکل میں ڈبل روٹی کی طرح ہوتے ہیں۔ انھیں ڈبل روٹی کی طرح سینک کر کھایا جاتا ہے۔

اوہیو (امریکہ) کے روپرٹ نام کے ایک شخص کے پاس ایک گائے تھی اس کا نام اس نے "مولی" رکھا تھا۔ اس گائے کا رنگ بالکل سفید تھا۔ ایک بال بھی کالا نہ تھا۔ اچنبھے کی بات یہ کہ اس گائے کا دودھ بالکل سیاہ رنگ کا ہوتا۔ اس کا مکھن بھی بالکل سیاہ ہوتا تھا مزے اور خاصیت میں یہ بالکل سفید دودھ جیسا ہوتا تھا۔ "مولی" کا کالا دودھ کیمسٹوں کے لیے بھی حیرت کا باعث بنا ہوا تھا۔

شامی نارڈ کا ایک شہری فینے لینڈن سات فٹ چار انچ اونچا تھا۔ روس کے میکنو کی اونچائی سات فٹ ڈھائی انچ تھی۔ امریکہ کا وڈلو آٹھ فٹ ساڑھے سات انچ لمبا تھا۔

برما میں زرّافے جیسی گردن والی لڑکیاں بہت خوب صورت سمجھی جاتی ہیں۔ ان لڑکیوں کی گردن میں بچپن سے ہی کئی موٹے موٹے چھلّے پہنا دیے جاتے ہیں۔ اور ان چھلّوں کی تعداد بڑھاتے جاتے ہیں جس سے گردن لمبی ہوتی جاتی ہے۔

جرمنی کے ایک قصبے میں ہیلفورڈر نام کی ایک جھیل ہے۔ اس کے پانی میں دو ذائقے ہیں۔ جھیل کی سطح کا پانی بہت میٹھا ہے لیکن سطح سے تقریباً تین فٹ نیچے کا پانی بالکل کھارا ہے۔

ایک ایک ہاتھ میں چھ چھ انگلیوں والے آدمی تو بہت دیکھے گئے ہیں۔ لیکن امریکہ کے ٹکساس شہر میں ایک آدمی ہے جس کے ایک ایک ہاتھ میں بارہ بارہ انگلیاں ہیں۔ اس آدمی کا کہنا ہے کہ اس کی ماں اور تیرہ بھائیوں کی چھ چھ انگلیاں ہیں۔ صرف وہی ایک

ایسا ہے جس کے ہاتھوں میں بارہ بارہ انگلیاں ہیں۔

پانڈیچری کے قریب ایک گاؤں میں ایک شخص کا نام مسٹر ۵ اسمتھ تھا یہ نام اس کے ماں باپ نے اس لیے رکھا تھا کہ گاؤں میں اسمتھ نام کے پچاس ساٹھ آدمی تھے۔ اس نے اپنے بیٹے کے نام کو سارے گاؤں میں نمایاں کرنے کے لیے یہ عجیب وغریب نام رکھا تھا۔

کولمبیا کے ایک شخص جولس واکر نے نوّے فٹ اونچے مینار کی شکل میں ایک یادگار بنائی تھی۔ اس کا نام اس نے بستر کی یادگار رکھا۔ اس مینار کی چوٹی پر ایک پتھر کا پلنگ رکھا تھا۔ اور مینار کے نچلے حصّے میں موٹے الفاظ میں لکھا تھا

"یہ یادگار بستر کی یاد میں بنائی گئی ہے
دنیا کی اکثریت اسی پہ پیدا ہوئی
اسی پر مری۔ ہم میں سے ہر شخص اپنی
زندگی کا کم از کم ۱/۳ حصہ بستر پہ
ضرور گزارتا ہے۔ ہمیں بستر کا احترام
اور یادگار لازم ہے۔"

"جولیس واکر"

آسمان سے مینڈک اور مچھلی برسنے کی بات مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ پہلے ۱۶۰۰ سالوں میں ستر سے زیادہ بار مینڈک اور مچھلیوں کی بارش ہوئی۔

برلن کے پروفیسر کونارڈ لالدنس بطخوں (کی بولی) نہ صرف سمجھ لیتے ہیں بلکہ بول بھی لیتے ہیں۔ (اپنی تحقیق) پوری کرنے کے لیے پچھلی گرمیوں میں وہ بویریا (کی ایسی) جگہ رہے جہاں جنگلی بطخیں کثرت سے پائی جاتی (ہیں)۔ اب وہ نہ صرف بطخوں سے بات کرتے ہیں بلکہ (بطخیں انہیں) اپنا دوست ماننے لگی ہیں۔ ایک بار وہ سائیکل (پر) گھر جا رہے تھے اچانک سائیکل سے گر پڑے۔ (بطخیں جو) ان کے ساتھ باتیں کرتی ہوئی چل رہی تھیں (انہیں) گھیر کر بیٹھ گئیں اور تب تک وہاں سے نہیں (ہٹیں) تک وہ دوبارہ سائیکل پر سوار ہو کر نہ چل پ(ڑے)۔

اس گول دائرے میں سرخ نشان کا مطلب (ہے) کہ ...... کے بعد آپ کی مدّت خریداری ختم ہو جائے (گی)۔ براہ کرم مبلغ چھ روپے کا منی آرڈر اس تاریخ تک بھیج دیجیے۔ تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر (لکھنا نہ) بھولیے۔ آپ کا خریداری نمبر......

سید آفتاب امین چشتی اجمیری

بڑھیا نے ریچھ کی پٹائی کی



انکل پیٹر اپنے کنبے کے بچوں میں بہت مقبول تھے ۔ وہ سردیوں کی ٹھنڈی راتوں میں آگ کے قریب، آرام سے بیٹھ جاتے ۔ اور بچے ان سے کہانی کی فرمائش کرتے ۔ ایک بار دسمبر کی ایک سرد رات کو باہر برف نے تمام زمین کو اپنے آغوش میں ڈھانپ لیا تھا۔ اور سرد ہوائیں آتش دان کی چمنی سے ٹکرا کر عجیب و غریب آوازیں پیدا کر رہی تھیں ۔ انکل پیٹر اپنے مخصوص کونے میں بیٹھے تھے ۔ اور تمام بچے ان سے کہانی کی فرمائش کر رہے تھے ۔



۲ "ہمیں ریچھ کی کہانی سنائیے" سب بچے چلاتے ۔ "اچھا! تو سنو" انکل پیٹر بولے "ایک بار ایک بڑی بی شمال کے بالائی میدان میں ایک گھنے جنگل کے سرے پر ایک خوبصورت گھر ۔۔۔ ہے ۔



۳ ان بڑی بی کا ایک پالتو ریچھ تھا ۔ وہ ریچھ بڑی بی کو جنگل میں پڑا ملا تھا ۔ اس وقت یہ بہت چھوٹا تھا اور اسے مدد کی ضرورت تھی ۔ بڑی بی اور ان کے بڈھے باورچی نے شیشی کی مدد سے دودھ پلا پلا کر اسے پالا تھا ۔



۴ پر یہ کافی عرصہ پہلے کی بات ہے۔ اب تو یہ ریچھ کافی تن درست تھا۔ بالکل دیو کا دیو لگتا تھا۔ یہ اب اتنا طاقتور تھا کہ ایک گائے کو اپنے پنجوں میں اٹھا کر آسانی سے لے جا سکتا تھا۔ پر وہ بہت شریف ریچھ تھا۔



۵ تین ننھے منے کیمپ اکثر اس کے سا
اس کے ساتھ ہر قسم کا مذاق کرتے یہاں تک کہ
تک کھینچ ڈالتے۔ محلے کے بچے اس پر سواری
اس نے کبھی کسی کو نقصان نہ پہنچایا۔



۶ اس نے کبھی گوشت کا مزہ نہ چکھا۔ ہاں پھل اور شہد شوق سے کھاتا۔ ایک دفعہ اس نے شہد کی مکھیوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس کی سزا بھگتنی پڑی اور اس نے پھر کبھی ایسا نہ کیا



۷ وہ سارا دن آتا اور رہتا ہاں رات میں
پہنا دی جاتی تھی یا اتوار کے دن جب کہ بڑی
سے ملنے چلی جاتی تھیں جو پہاڑی جھیل کے اس
بڑی بی کا خیال تھا کہ ریچھ کا جنگل ہے ، مارے سامنے



ریچھ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس کی مالکہ اتوار کے
ن اسے زنجیر پہناتی تھی اور اس کے سر پر تھپکی دے کر
عادت کرتی تھی کہ وہ واپسی پر اس کے لیے سیب لاتے
ں شرط یہ تھی اس کی غیر حاضری میں اچھی طرح رہے۔



۹ ایک دن اتوار کو بڑھیا نے اسے زنجیر پہنائی اور
بہن کے گھر روانہ ہوگئی۔ اس نے آدھا راستہ طے کیا تھا کہ اچانک
اسے اپنے پیچھے کسی شاخ کے ٹوٹنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے مڑ کر دیکھا
اور یہ جان کر حیران رہ گئی کہ ریچھ پوری رفتار سے اس کی طرف آ رہا ہے۔



اگلے ہی لمحے وہ اس سے آن ملا۔ بڑھیا کو دعوت
یں جانا تھا۔ اس کے پاس اتنا وقت نہ تھا کہ ریچھ کو واپس
ھر چھوڑ کر آتی۔ وہ یہ چاہتی تھی کہ وہ اس کے ہمراہ نہ جائے
س کا خیال تھا کہ ریچھ کا زنجیر تڑا کر بھاگ آنا اس کی حکم عدولی تھی۔



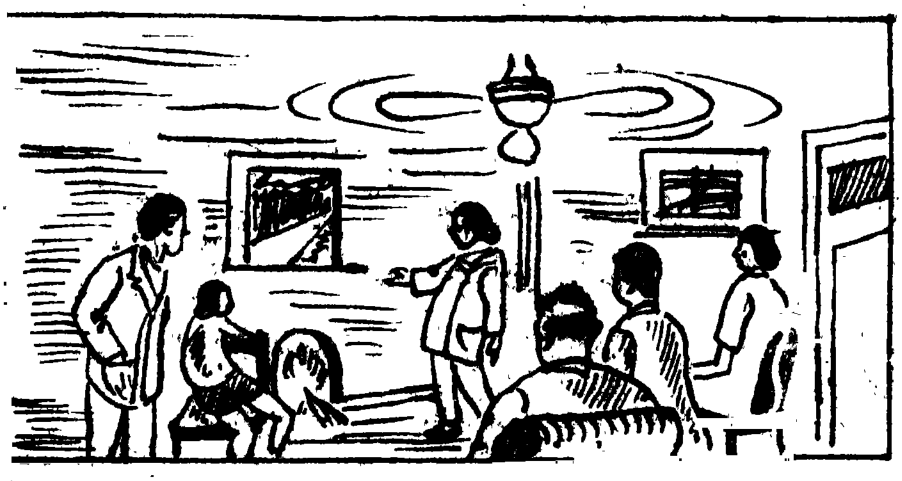
اس نے اسے واپس جانے کا حکم دیا اور اپنی
چھڑی کی مدد سے اسے ڈرایا۔ ریچھ ایک لمحہ کے لیے رک
گیا اور شرارت بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگا لیکن معلوم
ہوتا تھا کہ وہ واپس نہیں جانا چاہتا تھا۔ بڑی بی نے یہ دیکھ کر
اپنی چھڑی اس کی ناک پر اس زور سے ماری کہ وہ دو ٹکڑے ہوگئی۔



۱۲ اس واقعہ کے بعد بڑی بی گھر پہنچیں تو دیکھا کہ ریچھ معمول کے مطابق اپنی جگہ پر بیٹھا ہے۔ بڑھیا کا غصہ ابھی ٹھنڈا نہ ہوا تھا وہ ریچھ کے پاس آئی اور کہنے لگی: "تمھیں کوئی سیب نہیں ملے گا۔ اور تم دو دن تک زنجیر میں بندھے رہو گے۔"



۱۳ بوڑھا باورچی اس ریچھ کو اپنے بیٹوں کو تھا یہ باتیں سن کر باورچی خانے سے واپس آیا خواہ مخواہ ناراض ہو رہی ہو" باورچی نے کہا "یہ تو کے بعد اپنی جگہ خاموشی سے بیٹھا رہا یقیناً وہ کوئی اور



۱۴ بچے دل چسپی کے ساتھ یہ کہانی سن رہے تھے۔ اس کے خاتمہ پر انھوں نے ایک گہرا سانس لیا۔ "کیسی دل چسپ تھی" جین نے کہا "بڑھیا جنگل میں ریچھ کی پٹائی نہ کرتی اگر وہ یہ جانتی کہ یہ اس کا اپنا ریچھ نہیں ہے۔" "ہنری بھی شاید اس کی اسی غلط فہمی یا ہمدردی نے اس کی جان بچائی۔" انکل پیٹر نے کہا۔ "اب ہمیں کوئی اور کہانی سنائیے۔" ڈیوڈ نے کہا "اسی طرح کسی جانور کی کہانی۔" جین نے کہا "لیکن کسی بڑے جانور کی نہ ہو ہمیں اس سے خوف آتا ہے۔" ننھے ٹونی نے کہا۔ "اچھا میں تمھیں خرگوش کی کہانی سناتا ہوں۔" انکل پیٹر بولے۔

جناب عبد المنان نسیم شولاپوری۔

دلاور کا ساتھی



بہت خوبصورت ہے کتے کا بچہ — بڑا بھولا بھالا، بہت پیارا پیارا
سفید و سیاہ بال اس کے بدن کے — بہت نرم ہیں جیسے ریشم کے گالے
دلاور میاں شاد ہیں اس کو پا کر — نہ جانے کہاں سے ہیں لائے اٹھاکر
دلاور میاں جب بلائیں تو جائے — انہیں دیکھ کر اپنی دم کو ہلائے
اُسے پیار کرتے ہیں وہ آتے جاتے — اُسے "ٹائیگر" نام سے ہیں بلاتے
خبر گیری کرتے ہیں مکتب سے آکر — پلاتے ہیں دودھ اپنے پیسے بچا کر
اسے اپنے ہاتھوں سے نہلاتے بھی ہیں — کھلاتے بھی ہیں اور ٹہلاتے بھی ہیں
"ملاؤ ذرا ہاتھ" کہتے ہیں اکثر — وہ دیتا ہے ہاتھوں میں پنجہ اٹھاکر
ہے گھنگرو لگا ایک پٹہ گلے ہیں — بجے جب وہ چھم چھم تو آئے مزے میں
وہ ہر دم اچھل کود اپنی مچائے — نکل جاتا ہے دوڑ میں سب سے آگے
کبھی مرغیوں کے ہے پیچھے لپکتا — گدھوں کو جو دیکھے تو ہے بھونک اٹھتا
ہے آواز بے حد خطرناک اس کی — ابھی سے محلے میں ہے دھاک اس کی
بڑا ہو کے دے گا وہ راتوں کو پہرہ — رہے گا کسی کو نہ چوروں کا خطرہ

وہ اپنے محلے کا راجا بنے گا
کسی اجنبی کو بھی آنے نہ دے گا

جناب خلیق انجم اشرفی

لطیفے



نائی (حجامت بناتے وقت) کیوں سرکار آپ کتنے بھائی ہیں ؟"

گاہک :۔ ابھی تک تو تین سمجھو۔ اگر تمھارے استرے سے بچ گیا تو چار ہو جائیں گے ۔"

—— × ——

بھولا رام جی دودھ والے کو دو مہینے سے پیسے نہیں دے پائے ۔ جب تیسرے مہینے دودھ والا پیسوں کے لیے اڑ گیا تو بولے " دیکھو بھائی ۔ میرا ایک چیک کیش ہونے والا تھا ۔ وہ اب تک نہیں ہوا ۔ اور میرے دو دوستوں نے میرا قرض واپس دینے کا وعدہ کیا تھا ، لیکن اب تک نہیں دیا ۔ اس لیے تم دو دن اور رک جاؤ ۔ پیسے ملتے ہی پہلے تمھیں دوں گا ۔ سمجھ گئے نا !"

" میں تو سمجھ گیا صاحب " دودھ والا گردن ہلا کر بولا " لیکن یہ تو بتایئے کہ میں اپنی بھینس کو کیسے سمجھاؤں گا ؟"

—— × ——

سیٹھ جی نے اپنے بیٹے کو لاٹری کے ٹکٹ خرید کر دیتے ہوئے پوچھا ۔ " بیٹا اگر تمھیں اس پر ڈھائی لاکھ کا انعام مل جائے تو کیا کرو گے ؟"

" آپ کا ایک روپیہ فوراً واپس کر دوں گا ۔" بیٹے

نے جلدی سے جواب دیا ۔

—— × ——

ایک استاد نے شاگرد کی نوٹ بک جانچنے کے بعد اس پر یہ نوٹ لکھ دیا " ایسا لکھو کہ پڑھا جا سکے ۔"

شاگرد نے یہ نوٹ دیکھا تو بہت دیر تک اسے سمجھنے کی کوشش کی اس کے بعد سیدھا استاد کے پاس گیا اور بولا " ماسٹر صاحب ۔ آپ نے میری نوٹ بک پر یہ کیا لکھا ہے ؟"

—— × ——

حامد :۔ کیوں کیا ہوا ؟ تم بہت پریشان نظر آتے ہو ؟"

محمود :۔ " کیا کروں دوست بڑی مصیبت میں ہوں ۔ میری عینک کہیں کھو گئی ہے ۔ اور جب تک وہ نہ مل جائے میں اسے ڈھونڈ بھی نہیں سکتا ۔"

—— × ——

نوکر :۔ صاحب ! دکان دار بل کے پیسے لینے آیا ہے۔

صاحب " تو تم نے کہا نہیں کہ صاحب باہر گئے ہیں

نوکر " صاحب کہا تو تھا مگر وہ مانتے ہی نہیں

صاحب " اچھا تو پھر میں خود ہی جا کر کہے دیتا ہوں

جناب سطوت رسول

برسات

برسات آ رہی ہے، برسات آ رہی ہے
جنگل میں ہوگا منگل
باغوں میں ہوں گے جھولے
گائیں گے سب ملہاریں
بچے خوشی سے پھولے
برسات آ رہی ہے، برسات آ رہی ہے۔
ہر سُو نئی بہاریں
جھم جھم پڑیں پھواریں
پانی میں بھیگتی ہیں
بگلوں کی وہ قطاریں
برسات آ رہی ہے، برسات آ رہی ہے
میداں ہرے بھرے ہیں
کہسار ہیں نہائے
کل تک جہاں تھا سوکھا
گلزار ہیں نہائے
برسات آ رہی ہے، برسات آ رہی ہے
پانی میں کھیلتی ہے
بچوں کی مست ٹولی
کیچڑ اچھالتے ہیں
کہتے ہیں سب یہ بولی
برسات آ رہی ہے، برسات آ رہی ہے

چھپّر ٹپک رہے ہیں
پانی کا شور دیکھو
گھنگھور ہیں گھٹائیں
اور ان کا زور دیکھو
برسات آ رہی ہے، برسات آ رہی ہے
سڑکوں پہ چل رہے ہیں
کیسا سنبھل سنبھل کے
وہ دور جا پڑا ہے
کوئی اُدھر پھسل کے
برسات آ رہی ہے، برسات آ رہی ہے
گر کر کوئی اُٹھا ہے
کوئی سنبھل رہا ہے
چھاچھوں انڈ رہا ہے
پانی ابل رہا ہے
برسات آ رہی ہے، برسات آ رہی ہے
سطوت کا سارے بچے
یہ گیت گا رہے ہیں
برسات ہے مزے کی
تانیں اڑا رہے ہیں
برسات آ رہی ہے، برسات آ رہی ہے۔

بچوں کی کوششیں

اچھی باتیں

۱ غصہ عقل کا دشمن ہے۔
۲ مطالعہ بہترین مشغلہ ہے۔
۳ دوسروں کا انجام دیکھ کر سبق حاصل کرو۔
۴ تکبر اور غرور انسان کو ذلیل کر دیتا ہے۔
۵ اپنی عزت چاہتے ہو تو دوسروں کی عزت کرو۔
۶ صحت کا خیال نہ رکھنا اپنے جسم کے ساتھ دشمنی کرنا ہے۔
۷ جاہلوں کی صحبت سے پرہیز کرو۔
۸ صبح کی ہوا خوری سو دواؤں کی ایک دوا ہے۔
۱۰ جواب دینے سے پہلے سوچو تاکہ بعد میں شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔
۱۱ کسی کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کیا معلوم۔ اس میں کیا کیا گن ہیں۔
۱۲ انسان کا سب سے بڑا خیر خواہ اس کا نیک کام ہے۔
۱۳ خوش خلقی تمہاری عزت میں ترقی کا باعث ہے۔
۱۴ کام شروع کرنے سے پہلے دماغ کو یکسو کر لینا چاہیئے

عقیلہ احمد یاسمین ماوراں حوراء اور

لطیفے

پہلا : ۔ اگر مٹی نہ ہوتی تو گھر کس چیز سے بنتا؟
دوسرا : ۔ کیا خوب! مٹی نہ ہوتی تو گھر اینٹ سے بن

محمد عدیل اند

ایک بچہ تھا۔ تمہاری ہی طرح نہ بھولا بھالا۔ لیکن جس طرح تمہارے ماں باپ بھائی اور دوسرے رشتہ دار موجود ہیں اس کا کوئی نہ تھا۔ چار سال کی عمر میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے، بوڑھ نے کچھ دنوں تک ساتھ دیا لیکن آٹھ سال کی عمر بھی اسے دنیا میں اکیلا چھوڑا اس دنیا سے سدھ اب دنیا میں اس کا سوائے اللہ کے کوئی دوسرا نہ ر دو سال تک ماں باپ کے چھوڑے ہوئے سامان سے پاتا رہا۔ لیکن جب وہ سارا سامان ختم ہو گیا تو بے کو فاقے کی نوبت آ گئی۔ ۱۰، ۱۱ سال کی عمر کب تک بھو آخر بھیک مانگنا شروع کر دیا۔ دن بھر در در کی ٹھوکر اور شام کو جو کچھ روکھی سوکھی ملتی کھا کر سو جاتا۔ ا بہت دن گزر گئے۔

ایک دن سڑک کے کنارے کھڑا آنے والوں کو امید بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

یک مال دار آدمی سامنے سے گزرا، بھکاری بچہ دو چار پیسوں کی امید میں جلدی سے اس کے پاس پہنچا اور خدا واسطے کا سوال کیا۔ وہ بھی کوئی نیک آدمی تھا۔ س نے دو پیسے دے دیئے۔ اور آگے بڑھ گیا۔ اور بچہ وہیں کھڑا اسے دعائیں دیتا رہا۔ اتفاق سے مالدار آدمی کا یمتی چمڑے کا بٹوہ سڑک پر گر گیا۔ لیکن اسے پتہ نہ چلا۔ ابر چلتا رہا۔ بچے نے فوراً پرس دیکھ لیا اور دوڑ کر اٹھا یا، پرس نوٹوں سے بھرا تھا۔ اس نے مال دار آدمی کی طرف یکھا جو بے خبر جا رہا تھا۔ اب وہ کیا کرے۔ اس نے ذرا ے ذرا سوچا اور مال دار آدمی کے پیچھے دوڑا اور پرس ں کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ مال دار آدمی نے بوکھلا کر پوچھا تمھیں یہ کہاں سے ملا؟" بھکاری بچے نے پوری بات نا دی۔ مال دار آدمی بچے کی دیانتداری سے بہت خوش ہوا اسے گلے سے لگا لیا۔ اور بڑی شفقت سے اس کا م پوچھا۔ بچہ نے سب کچھ بتا دیا۔ مال دار آدمی نے ہا" اچھا بتاؤ اس کے انعام میں تم یہ سب روپے لوگے یں تمھیں نوکری دلا دوں؟" بچے نے جواب دیا۔ "جناب روپے زندگی کا ساتھ تو دے نہیں سکتے کچھ روز بعد روپے ختم ہو جائیں گے۔ اور پھر؟ اس لیے اگر نوکری دیجیے تو مہربانی ہوگی۔" مالدار آدمی کو بچے کا جواب سند آیا اور وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے گیا، اس کا کپڑے یک بہت بڑا مل تھا، اس نے بچے کو اسی میں نوکر دیا۔ کچھ ہی دنوں میں اس نے کافی جانکاری حاصل لی، مالدار آدمی نے بچے کی [illegible] کر ایک خاص آدمی کی ماتحتی میں کر دیا، جو اسے بُنائی کے بارے میں بتاتا تھا۔ کچھ ہی عرصہ میں وہ اچھی طرح کپڑا بننے لگا۔ اور پھر آہستہ آہستہ اتنا ماہر ہو گیا کہ اس کا شمار مل کے بہترین کاریگروں میں ہونے لگا۔ کچھ اور عرصہ گذر گیا۔

اس کی دیانتداری، نظم و ضبط، اخلاق و کردار اور پھر کاریگری دیکھ کر مالدار آدمی اتنا خوش ہوا کہ اُسے مل کا منیجر بنا دیا، اور اب وہ اسی مل کا حصہ دار بھی ہے۔ اس کا شاندار بنگلہ ہے کار ہے نوکر چاکر ہیں۔ وہ چین کی زندگی گزار رہا ہے، لیکن اس کی ایمان داری، اور اخلاق میں اب بھی کوئی فرق نہیں آیا۔

محمد عرفان فاروقی

جانوروں اور پرندوں کی عمریں

چیونٹی — ایک سال سانپ — ۱۰ سال
مرغا — ۱۴ سال بلّی — ۱۵ سال
چیتا — ۲۰ سال کوّل — ۱۸ سال
کتا — ۲۰ سال مور — ۲۴ سال
گائے — ۲۵ — سال
گھڑیال — ۳۰۰-۴۰۰ "
بندر — ۲۵ "
گھوڑا — ۵۰ "
شیر — ۷۰ "
بھالو — ۵۰ "
کوّا — ۱۰۰ "

سید مظفر باسط کشمیری

کتابوں کی باتیں



دہلی لکھنے والے ڈاکٹر مجاہد حسین زیدی

ضخامت ۸۴ صفحے۔ سائز ۲۰×۳۰/۱۶ لکھائی چھپائی بہت اچھی بلاک کی نو تصویریں، دہلی کے آٹھ شہروں کا نقشہ۔ ٹائٹل دو رنگ کا۔ قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ: مکتبہ جامعہ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔

یہ دہلی جہاں سے ہم آپ باتیں کر رہے ہیں بہت پرانا شہر ہے بہت ہی پرانا۔ اس تاریخی شہر نے اچھے برے ہر طرح کے دن دیکھے ہیں۔ یہ بار بار اجڑی ہے۔ اجڑ کر پھر بسی ہے۔ یوں سمجھیے کہ ساتواں شہر پرانی دلی ہے جو اب بھی آباد ہے۔ آٹھواں شہر نئی دہلی ہے جو بہت تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔

اس تاریخی شہر نے بہت سے راجوں مہاراجوں کو دیکھا ہے۔ بادشاہوں کو دیکھا ہے۔ ان راجاؤں نے بادشاہوں نے وقتاً فوقتاً اپنے شوق یا اپنی سہولت کے لیے نئے نئے شہر آباد کیے ہیں۔ ان شہروں میں سے اب بہت سے کھنڈر ہو گئے ہیں۔ پھر بھی ان میں قلعے ہیں، شاندار مقبرے ہیں، مینار ہیں، مسجدیں ہیں، مندر ہیں۔ ان تاریخی عمارتوں کو دیکھنے سارے ہندوستان کے ہندوستان کے باہر کے لوگ کھنچے چلے آتے ہیں اور ان شان دار عمارتوں کو دیکھ کر عش عش کرتے ہیں۔ یہ ساری پرانی تہذیب کی نشانیاں ہیں۔ ہر عمارت اس زمانے کے ... اور زمانے کی تہذیب کی

کی چھاپ ہے

یوں تو پرانی دلی پر بہت سی کتابیں ہیں۔ اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ لکھنے والے خود تاریخ کے ہیں انھوں نے ان عمارتوں کو خود اپنی آنکھ سے دیکھا۔ کتاب لکھی ہے۔ بہت سادہ بہت آسان اور بہت دل چسپ انداز میں لکھی ہے۔ شروع کے آٹھوں شہروں کا نقشہ ہے اور پھر الگ سے ان تاریخی شہروں کا مختصر حال اور خاص کا ذکر ہے۔ آخر میں ایک ضمیمہ ہے اس میں دلی کے تاریخ وار نام ہیں۔ سب سے آخر میں مسجد کا نقشہ ہے۔ خاص خاص عمارتوں کی تصویر سے کتاب کی دل چسپی اور فائدہ بہت بڑھ (بشکریہ آل انڈیا ر

تیس مار خاں کے کارنامے: لکھنے وا
ضخامت ۸۸ صفحے۔ سائز وہی ۲۰×۳۰/۱۶ بچو والا۔ لکھائی چھپائی صاف ستھری۔ ٹائٹل دو قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے۔ ملنے کا پتہ: جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵۔

شکار پور نامی گاؤں میں اللہ دیا ا صاحب رہتے تھے۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے

میں چھوٹا موٹا کتب خانہ بھی تھا۔ اس میں سورماؤں، بہادروں والی کہانیاں زیادہ تھیں۔ بس انھی کو پڑھ کر للہ دیا صاحب کے سر میں کیا سمایا کہ میں بھی سورما بن سکتا ہوں دور دور میرا نام ہوگا۔ اور بھی شہزادیاں میرے کارنامے سن کر مجھ سے محبت کرنے لگیں گی۔ پھر کیا تھا کسی کباڑیے کے ہاں سے لوہے کا زرہ بکتر خریدا۔ ایک گھوڑا خریدا اور چل پڑے اپنی مہم پر۔ تیس مار خاں بننے۔ کبھی گاؤں سے باہر نہ نکلے تھے۔ اس لیے قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں تھوڑے ہی دنوں میں ان کی حماقتوں کے چرچے ہونے لگے۔ لوگوں نے خوب خوب ان سے دل چسپی لی۔ ادھر دوستوں اور ہمدردوں نے انھیں اس دلدل سے نکالنا چاہا پر یہ اپنے حال میں مست تھے۔ کسی کی نہ سنتے تھے۔ انھیں ایک ساتھی ترم خاں مل گئے۔ ان کے کارنامے بھی بہت شان دار ہیں۔ غرض یہ دونوں جہاں جاتے مار کھاتے۔ آخر ایک سورما سے مقابلہ ہوا۔ شرط یہ ٹھہری کہ ہار گئے تو سورما بننے کا خیال چھوڑ دیں گے۔ بے چارے ہار گئے۔ زرہ بکتر اتارنا پڑا۔ ان کا مقابل ان کا ایک دوست تھا وہ انھیں گھر لے آیا اس طرح یہ ایڈونچر ختم ہوا۔ بڑی دل چسپ اور ایڈونچرس کہانی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ مزے دار حماقتوں سے بھری ہوئی ہے۔ ندیم صاحب نے اسے بچوں کی زبان میں لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ پڑھنے والا بس پڑھتا چلا جاتا ہے اور کہانی ختم کرکے ہی دم لیتا ہے۔

(شکریہ آل انڈیا ریڈیو)

ماہنامہ **کتاب** کا افسانہ نمبر اکتوبر میں شائع ہو رہا ہے

مشتملات پر ایک نظر

افسانے، طنز و مزاح، ڈرامے

راجندر سنگھ بیدی، کرشن چندر، عصمت چغتائی، رضیہ سجاد ظہیر، قاضی عبد الستار، ڈاکٹر محمد حسن، جیلانی بانو، کوثر چاند پوری، اقبال متین، غیاث احمد گدی، مسیح الحسن رضوی، جوگندر پال، رتن سنگھ، ستیش بترہ، مجتبیٰ حسن، کلام حیدری، حامدی کاشمیری، عوض سعید، ظفر اوگانوی، اکرام جاوید، سریندر پرکاش، جاوید، رشید امجد، صادق، سمیع آہوجہ، مظہر الاسلام، اعجاز راہی، محمد منشا یاد، انور رشید، اظہر افسر، حمید سہروردی، اکرام باگ، اختر یوسف، نزہت نوری، بانو سرتاج، عابد سہیل۔

○ سندھی کہانی ○ مراٹھی کہانی ○ ہندی کہانی
○ بنگلا کہانی ○ اڑیا کہانی ○ فرانسیسی کہانی
○ ۴ مضامین

افسانوی ادب کے مسائل پر ۲ سمپوزیم

• دس افسانوی مجموعوں اور افسانوی ادب سے متعلق کتابوں پر تبصرہ

• متعدد تصاویر • صفحات ۲ سو سے زائد • قیمت ۳ روپے

زر سالانہ دس روپے بھیج کر آپ یہ مفت حاصل کر سکتے ہیں۔

افسانہ نمبر

رجسٹری سے حاصل کرنے کے لیے ایک روپیہ مزید بھیجیے

ماہنامہ **کتاب** ۱ کیسر مارکیٹ لکھنؤ ۳

بچوں کے لیے دلچسپ معلوماتی کتابیں

چاچا نہرو	۱/-	حضرت امام حسینؓ	۲۵/-	تین شہزادے
اصلاحی کہانیاں	۳۰/-	حضرت امام حسنؓ	۲۵/-	جادو کی بیلچ
بچوں کی اخلاقی کہانیاں	۳۰/-	حضرت رابعہ بصریؒ	۲۵/-	جادو کا گھوڑا
بچوں کا ادب	۱/۵۰	حضرت سلمانؓ	۲۵/-	جادو کا پھل
بہادر لڑکا	۴۰/-	حضرت بلالؓ	۲۵/-	چڑیوں کی ملکہ
سلطان ٹیپو شہید	۳۰/-	حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ	۲۵/-	خوفناک جادوگر
جنگل کی دنیا	۴۰/-	حضرت فاطمۃ الزہرا خاتون جنتؓ	۲۵/-	دیو پیکر درندہ
دل چسپ لطیفے	۳۰/-	ابھرتا سورج	۵۰/-	ڈاکٹر بوجھ بجھکڑ
دل چسپ کہانیاں	۳۰/-	زمین کے تارے	۵۰/-	رحم دل پریاں
ڈاکٹر اقبال	۳۰/-	چمکتے موتی	۵۰/-	رستم و سہراب
ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت	۳۵/-	تین قلندر	۲/-	شیش محل
ریل کا سفر	۲۵/-	ایک ننھی راجکماری	۲۰/-	شہزادی بدورا
کبڑا گھوڑا	۳۰/-	ایک ننھی رانی	۲۰/-	شہزادی پری زاد
مولانا ابوالکلام آزاد	۲۰/-	آدم خور زنگی	۳۰/-	عراق کی شہزادی
سنہری چڑیا	۴۰/-	افراسیاب کی بیٹی	۴۰/-	لنگڑا دیو
ننھی منی کہانیاں	۴۰/-	بہادر راجکمار	۲۰/-	مسٹر عقل مند
سرور دو عالمؐ	۵۰/-	باغی شہزادہ	۴۰/-	مغرور شہزادی
حضرت صدیق اکبرؓ	۲۵/-	بے وقوف پریاں	۲۰/-	ہنس مکھ شہزادہ
حضرت فاروق اعظمؓ	۲۵/-	پریوں کے تحفے	۲۰/-	ہیروں کا جزیرہ
حضرت عثمان ذی النورینؓ	۲۵/-	پھول شہزادی	۲۰/-	جادو کا ہاتھ
حضرت علی شیر خداؓ	۲۵/-	تیسرا انعام	۲۰/-	———

آدھی ملاقات

اس بار (یعنی ستمبر) کا ٹائٹل بھی خوب ہے۔ لیکن پچھلے مہینے کے ٹائٹل کے پایہ کا نہیں۔ پچھلے مہینے کا ٹائٹل تو بہت ہی خوب تھا۔ "آدھی ملاقات" کے صفحات سے پتہ چلتا ہے کہ ٹائٹل کے معاملے میں ہر ایک کی پسند ایک ہی رہی۔

مضامین اور کہانیوں کا معیار حسب معمول اونچا ہے۔ لیکن اس بار ایک بڑی کمی یا غلطی یہ نظر آئی کہ شروع کے دو تین مضامین اور نظموں سے تصاویر غائب ہیں۔ اب پتہ نہیں آپ نے ان کے لیے تصاویر بنوائی ہی نہیں، یا کاتب صاحب تصاویر کو چپکانا بھول گئے۔ دوسری بات ہی زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ جس انداز سے کتابت کی گئی ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ تصاویر کے لیے جگہ چھوڑی گئی ورنہ کم از کم نظموں کے گرد حاشیے وغیرہ ضرور ہوتے۔

بہر حال اس طرح کی غلطی محض نظر چوک جانے کی بنا پر نہیں ہو سکتی اس لیے افسوسناک ہے۔ آئندہ اگر کاتب صاحب خیال رکھیں تو بہتر ہے۔ ورنہ رسالہ کا سارا حسن چوپٹ ہو کر رہ جائے گا۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اتنے عمدہ مضامین

اور دل فریب بن سکتا ہے لیکن ابھی تو یہ محض خیال [illegible] ہے۔ اس اردو کش دور میں ایک رسالہ کا مستقل پابندی وقت سے شائع ہوتے رہنا ہی اس کی کامیابی کی دلیل ہے۔ اور اس پر اگر معیار نہ صرف قائم رہے بلکہ ہر شمارہ پچھلے شمارے سے بڑھ کر ہو تو یہ اور بڑی کامیابی ہے۔ اور خدا کا شکر ہے کہ پیام تعلیم ایسے ہی کامیاب رسالوں کی فہرست میں ہے۔

دو ماہ سے مسلسل آپ کی کہانیاں آرہی ہیں۔ پیام تعلیم کے لیے یہ بڑا نیک شگون ہے۔ آپ بہت کم لکھتے ہیں اس کا شکوہ مجھے ہی نہیں بہت سے پیامیوں کو ہوگا۔ آپ کی مصروفیتیں بجا ہیں لیکن اپنی سادہ اور پر لطف زبان کا مزہ کم از کم ہم لوگوں کو چکھا ہی دیا کیجیے! اس بار کی کہانی بالکل نئی تھی اور بہت مزے دار۔

مرزا سلمان کا مضمون مزہ دے گیا۔ وقت اور حالات کے مطابق مضامین شائع کرنے میں بھی آپ کا جواب نہیں۔ برسوں بعد COMET یا دم دار ستارہ دکھائی دیا اور آپ نے اتنا مزے دار مضمون لکھوا لیا۔ "قوالی" بہت عمدہ اور سبق آموز ہے۔ بحیثیت مجموعی یہ شمارہ بہت خوب ہے۔ امید ہے کہ آئندہ شمارہ اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہوگا۔

خلیق انجم اشرفی

پیام تعلیم کی سنجیدگی آپ کی دانشمندی پر مبنی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی پیام تعلیم دلچسپ مضامین سے آراستہ ہو کر ہم تک آتے گا۔ اور ہم اس سے لطف اندوز ہوں گے۔ شکریہ

پیام تعلیم کا تازہ شمارہ ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ جناب مرزا سلطان صاحب نے جس انوکھے انداز سے ستاروں کا علم بیان کیا ہے وہ واقعی قابلِ تعریف ہے۔ محترمہ آصفہ مجیب صاحب کا مضمون "النقرہ" کافی اچھا ہے۔ جناب یوسف پاپا صاحب نے جس انداز سے وٹامن کا سبق اپنے گیت میں دیا ہے۔ اسے پڑھ کر واقعی رال ٹپکنے لگتی ہے۔ گراموفون، زرافہ، جگنو، غرض پیام تعلیم کا ہر مضمون کافی افادیت کا حامل ہے۔ سفر نامہ ابن بطوطہ اور پنچ تنتر کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ خدا کرے جوبلی نمبر کے لیے آپ کی کوششیں اور ہماری دعائیں بارآور ثابت ہوں۔

خواجہ معین الدین چشتیؒ والے مضمون میں ایک بات نظروں میں کھٹکتی ہے۔ کاتب صاحب نے ان کی تاریخ وفات پر قلم پھیر دیا۔ اور مضمون میں اس کا ذکر نہیں کیا۔ آپ کا شکر گزار ہوں کہ مضمون کو وقت پر دے دیا۔

سید آفتاب امین چشتی اجمیری مظفرآباد

ماہ اگست کا شمارہ پڑھا۔ بہت سے مضامین مبارک باد کے مستحق ہیں۔ جناب غلام حیدر، ام اے۔ (جامعی) کا لکھا ہوا "سنہری مچھلی" بہت پسند آیا۔ میں انھیں مبارک باد پیش کرتی ہوں۔

اس رسالے کے ذریعے بچوں میں مطالعہ کا ذوق پیدا ہے۔ پھر آپ کی محنت بھی تو قابلِ داد ہے۔ مبارکباد قبول فرمایئے۔

پچھلے ماہ یعنی جولائی کا ٹائٹل بھی خوب تھ بار کا ٹائٹل بہت پسند آیا۔ صرف مجھے نہیں بلکہ ہر بچے کو۔ مبارک باد قبول فرمایئے۔ آپ کی کہانی اس سے پہلے بھی ملا نصرالدین کے لطائف میں مح کی صورت میں پڑھ چکا تھا۔ لیکن آپ کی زبان او نے واقعتاً اسے ایک نیا حسن ایک نیا مزا بخش دیا سے بہت لطف اندوز ہوا۔ دوسری کہانیا اچھی ہیں۔ اور مضامین تو ہر بار ہی آپ چھا کر دیتے ہیں۔

بہت ہی افسوسناک بات یہ ہے کہ اس کی غلطیاں بہت ہیں اور کتابت بھی بہت خراب سوائے ایک مضمون "دل چسپ اور عجیب" کے کی کتابت اچھی نہیں۔ وہ تو کہیے صاف ستھری چھپائی جا تک کتابت کا عیب چھپا لیا ہے، ورنہ بڑی مشـ کاتب صاحب سے کہیے ذرا ہاتھ سنبھال کر لکھیں لکھے کو ایک بار پھر اگر دیکھ بھی لیا کریں تو ہم لوگوں ان کا کرم ہوا۔ ہم تہہ دل سے ان کے مشکور ہوں پیارے پیارے مضامین اور کہانیاں محض کتابت اور غلطیوں کی نذر ہو جائیں تو کس پیامی کو اور پیـ کے عاشق کو افسوس نہ ہوگا۔

نظم "برسات" پر بنی ہوئی تصویر بہت پـ اس کے علاوہ بھی آرٹسٹ صاحب نے جگہ جگ فن کا اچھا مظاہرہ کیا ہے۔ ان آرٹسٹ صاحب

اِدھر اُدھر سے



جرمنی کی مشہور بندرگاہ ہیمبرگ میں ہر سال جنوری میں طرح طرح کی کشتیوں کی نمائش کی جاتی ہے۔ اس سال بائیس ملکوں کی پانچسو کمپنیوں نے اس نمائش میں حصّہ لیا۔ اس نمائش میں جنوبی جرمنی کے کسی موجد کی ایک ڈبکنی۔ یا غوطہ خور کشتی بھی دیکھنے میں آئی۔ یہ مشینی دھاگے کی بنی ہوتی ہے۔ یہ ۱۰ء۲ میٹر لمبی ہے ۶۱ر۱ میٹر چوڑی ہے اور ۴۳ر۱ میٹر اونچی ہے۔ وزن کل سولہ ۱۶ من ہے۔ پچاس میٹر کی گہرائی تک پانی کے اندر جاسکتی ہے۔ قیمت ۸ ہزار مارک سے دس ہزار مارک تک ہے۔ متوسط درجے کا موٹر بھی اتنے ہی میں ملتا ہے۔ (تصویر ٹائٹل کے صفحہ ۲ پر)

(اطلاعات جرمنی)

دہلی میں پرندوں اور چھوٹے جانوروں کا ایک ہسپتال ہے۔ یہ اسپتال لال قلعے کے سامنے ہے۔ اپنی قسم کا انوکھا اسپتال ہے مگر اس میں علاج کرنے والے سب مرد ہیں۔ جرمنی میں عورتیں بھی اس علاج میں مہارت پیدا کرنے لگی ہیں۔ تصویر میں دیکھئے لیڈی ڈاکٹر صاحبہ امریکن چوہوں کے علاج معالجے و دوا دارو میں لگی ہوئی ہیں۔

(تصویر ٹائٹل کے دوسرے صفحے پر)

(اطلاعات جرمنی)

ٹائٹل کے صفحہ ۳ کی تصویر کو دیکھ کر شاید آپ ناک بھوں چڑھائیں پر یہ ہے عجیب و غریب عمارت۔ سب سے عجیب تو اس کا زینہ ہے۔ اس زینے میں سیڑھیاں نہیں ہیں۔ یہ خود ہی آہستہ آہستہ اونچا ہوتا جاتا ہے۔ یہ عمارت جرمنی کے مشہور کاروباری مرکز ڈسل ڈروف کے قریب کارتھ نامی بستی میں بوڑھے لوگوں کے رہنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ بھول بھلیّوں جیسے اس چکّردار زینے میں جگہ جگہ بنچیں بھی بچھی ہیں تاکہ بوڑھے لوگ راستے میں سستا لیا کریں۔ اس گھر میں ۱۵۰ بوڑھے رہتے ہیں۔

(اطلاعات جرمنی)

جرمنی میں ہوائی جہاز بنانے والے انجینئر ہیمبرگ سے میونخ تک مسافروں اور سامان کو لانے لے جانے کا ایک ایسا ذریعہ سوچ رہے ہیں جو چار سو کلومیٹر کی رفتار سے سفر کرسکے۔ یہ ریل ہوگی، مگر پٹریوں پر نہیں چلے گی۔ برق مقناطیسی اصولوں پر چلنے والی یہ ریل گاڑی ہوا کے تکیوں کے بل پر بڑے بڑے سلیپروں پر سے گزرا کرے گی (تصویر ٹائٹل کے صفحہ ۳ پر)

(اطلاعات جرمنی)

انگلستان کے اسکولوں کے لڑکے۔ ہندوستان

میں کرکٹ کے دس میچ کھیلیں گے۔ ان میں پانچ میچ آل انڈیا الیون سے کھیلیں گے۔ یہ میچ دسمبر اور جنوری کی مختلف تاریخوں میں ہوں گے۔ انگلستانی ٹیم مقررہ وقت سے تین دن پہلے (۱۹ نومبر کو) ہندوستان پہنچ رہی ہے تاکہ آگرے کی سیر کر سکے اور تاج محل دیکھ سکے۔ آل انڈیا الیون سے ان کے میچ دہلی (۵ دسمبر) بمبئی (۱۱ دسمبر) احمد آباد (۱۹ دسمبر) کلکتہ (۳۰ دسمبر) اور مدراس (۱٦ جنوری) میں کھیلے جائیں گے۔ دوسرے پانچ میچ امرتسر یا جالندھر، پونا، اندور، کٹک اور بنگلور میں ہوں گے۔

(اسٹیٹس مین)

ہندوستان میں سیر و سیاحت کے زمانے میں، لوگ عام طور پر ہم سے پوچھتے ہیں امریکہ میں عام ضرورتوں کی چیزوں کے دام کیا ہیں۔ ہم انھیں بتانے اور سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انھیں بتاتے ہیں کہ فلاں چیز اتنے ڈالر، اتنے سینٹ میں ملتی ہے۔ یا ہندوستانی سکے کے حساب سے اتنے روپے میں ملتی ہے۔ مگر یہ بات ان کے دل پر جمتی نہیں اس لیے کہ اوسط درجے کے امریکن مزدوروں کو اپنے کام کی ہندوستانی مزدوروں کے مقابلے میں اجرت کئی گنا زیادہ ملتی ہے اور وہ ایسی چیزیں خرید سکتے ہیں جن کی قیمت زیادہ ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں امریکن حکومت کے مزدوری محکمے کے اعداد و شمار پر نظر دوڑاتی ان میں اور باتوں کے علاوہ ایک بات بہت دلچسپ بتائی گئی ہے۔ امریکہ کے اوسط درجے کے مزدور کو کتنی دیر کی محنت یا مزدوری کے بعد ملتی ہے اس سے کیا چیز خرید سکتا ہے۔ مثلاً ایک ... خریدنے کے لیے مزدور کو پانچ منٹ کام کرنا پڑے ... جوتے کا اچھا جوڑا خریدنے کے لیے چھ گھنٹے ۵۲ منٹ کام کرنا پڑے گا۔ نیچے کچھ مثالیں دی جاتی ہیں۔

ایک کلو مکھن کے لیے ۳۵ منٹ کام کرنا پڑ...
ایک درجن انڈوں کے لیے ۱۲ " " "
ایک لٹر دودھ کے لیے ۵ " " "
ایک کلو چاول کے لیے ۱۰ " "
چھپے ہوئے سوتی کپڑے
(٦ گز لمبا ایک گز چوڑا) کے لیے ۵۴ " "
کام کے وقت پہننے کی پتلون کے لیے۔ ایک گھنٹہ ۴۴ منٹ کام
اونی سوٹ کے لیے ۲۴ " ۱۲
ٹرانسسٹر ریڈیو (میز والا) کے لیے ۵ "
ریفریجریٹر کے لیے ۹۳ "
بیس سگریٹوں کے پیکٹ کے لیے ۷ "
ایک کلو آٹے کے لیے ۴ "
ایک کلو آلو کے لیے ۲ "
بال بنوائی کے لیے ۴٦ "
ایک کلو کافی کے لیے ۳۳ " ۳۳ "
" " چائے " ۵۲ "
نئی موٹر کار کے لیے ۲٦ ہفتے دو دن ۵۲

اب آپ ہندوستان کے کسی مزدور کی کمائی کا مقابلہ کرکے د... تجربہ دلچسپ رہے گا کرکے دیکھیے۔ (امریکن ر...

D. 1457 OCTOBER 1970

Payam - i - Taleem

NEW DELHI-25.



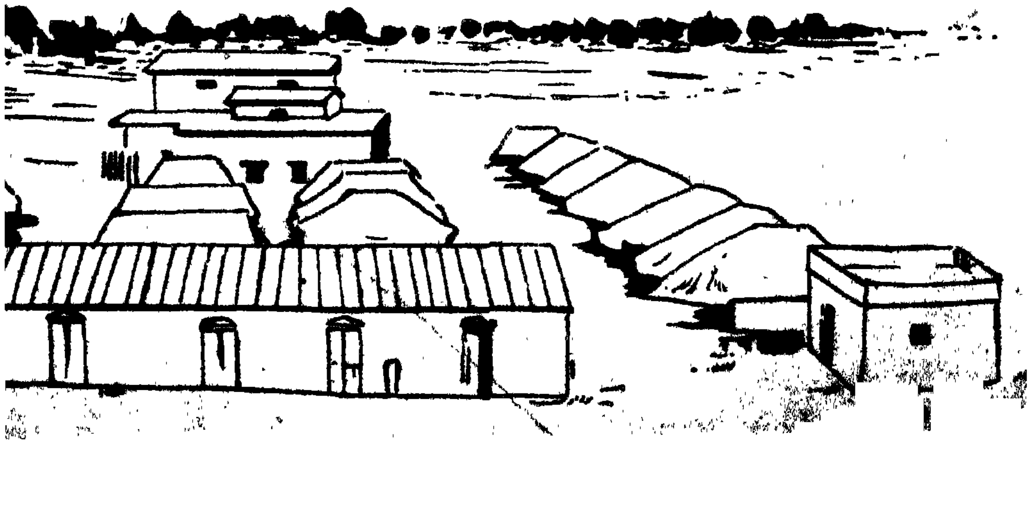
صرف ٹائیٹل فائن پریس دہلی میں طبع ہوا



4 NOV 1970

پیامِ تعلیم

جامعہ گولڈن جوبلی نمبر



ریاستہائے میسور، مدھیہ پردیش، جموں کشمیر و ہریانہ کے تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ



ماہنامہ

پیامِ تعلیم

نئی دہلی

جلد ۷

نومبر ۱۹۷۰ء

شمارہ ۱۱

محمد حسین حسّان ندوی

صدر دفتر — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ — جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

شاخ — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ — اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

شاخ — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ — پرنس بلڈنگ۔ بمبئی ۳

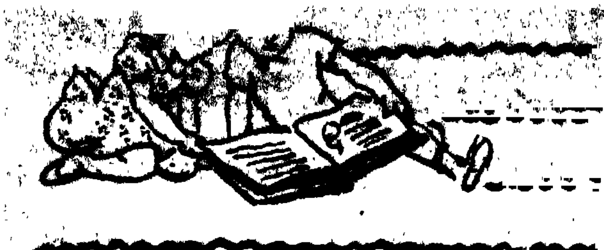
شاخ — مکتبہ جامعہ لمیٹڈ — شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے سالانہ چندہ ۶ روپے

قیمت خاص نمبر ایک روپیہ

پرنٹر پبلشر سید احمد علی نے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں
چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شائع کیا

فہرست



بچوں سے باتیں

جامعہ کو پہ گولڈن جوبلی یہ جشن زرّیں مبارک، جامعہ کے بچّوں، بچیوں، لڑکوں اور نوجوانوں کو مبارک، جامعہ کے استادوں اور تمام کارکنوں کو مبارک، ان پُرانے بزرگوں ساتھیوں، اور رفیقوں کو مبارک جنھیں اپنی زندگی میں خوشی کا یہ دن دیکھنا نصیب ہوا۔ جو سچ پوچھیے تو انھی کے ایثار، قربانی، مسلسل کوشش اور مستقل مزاجی کی بدولت جامعہ پروان چڑھی ہے۔ تیزی سے ترقی کی طرف بڑھ رہی ہے۔

ان سب بزرگوں نے ایک طرح سے بنجر زمین میں ناموافق حالات میں اک باغ لگایا — اپنے خون پسینے سے اسے سینچا۔ اب یہ باغ گل و گلزار بن گیا ہے۔ خوب لہلہا رہا ہے۔ برگ و بار لا رہا ہے۔ ان کی پرخلوص کوششیں کامیاب ہو رہی ہیں۔ اس سے بڑھ کر خوشی کی بات اور کیا ہو سکتی ہے۔

اس موقع پر ان بزرگوں کی یاد دل میں بار بار کسک پیدا کر رہی ہے جو جامعہ کی خدمت کرتے کرتے اللہ کو پیارے ہوئے۔ سب سے بڑھ کر تو خود قبلہ ذاکر صاحب مرحوم۔ مولانا اسلم جیراج پوری مرحوم، پروفیسر کیلاٹ مرحوم۔ شفیق صاحب مرحوم۔ مولانا سعد الدین انصاری مرحوم محمد عتیق صاحب مرحوم۔ اختر فاروقی مرحوم۔ ان کے علاوہ اور دوسرے بزرگ جن کے نام اس وقت ذہن میں نہیں۔

ہم ان سب کا تھوڑا تھوڑا حال لکھنا چاہتے تھے لیکن ممکن نہ ہوا۔ وقت کم تھا۔ ان مرحومین پر لکھنے والے خال خال۔ جناب برکت علی فرق نے نوازش فرمائی۔ شفیق صاحب مرحوم پر ایک اچھا مضمون لکھ دیا۔

محترمہ مشیر فاطمہ (اہلیہ عتیق صاحب) سے عتیق صاحب کا حال لکھنے کی خواہش کی گئی۔ پہلے تو انھوں نے معذرت کر دی لیکن بعد میں انھیں کچھ فرصت مل گئی اور ایک اچھا سا مضمون مرحمت فرما دیا۔ ان کی معذرت کا حال ہمارے منیجر صاحب کو معلوم ہوا تو انھوں نے عتیق صاحب مرحوم کے پرانے ساتھی اور مخلص دوست ڈاکٹر سلامت اللہ سے درخواست کی۔ ڈاکٹر صاحب نے باوجود مصروفیت کے حامی بھر لی۔ یہ دونوں مضمون آگے پیچھے ملے۔ دونوں میں کچھ باتیں مشترک ہیں۔ لیکن دونوں کے انداز الگ ہیں۔ اور ان دونوں کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت جو مخلص لوگ جامعہ میں آتے محض خدمت کے جذبے سے آتے تھے۔ محترم سلامت صاحب کا مضمون دسمبر میں پڑھیے گا۔

جوبلی نمبر کے سلسلے میں سب سے پہلا مضمون محترم نوری صاحب کا ملا۔ یہ ہمارے لیے بڑا نیک شگون تھا۔ پھر جامعہ کالج

... اپ ... محترم صاحب نے ارشاد فرمایا ... یہ
مضمون آپ کے معیار سے بہت اونچا تھا۔ عاقل صاحب کو خود
اس کا احساس ہوا اور انھوں نے دوسرا مضمون مرحمت
فرمایا "قلندری جامعہ" ان کا پہلا مضمون "کتاب نما"
کے جوبلی نمبر میں شائع ہو رہا ہے۔ کتاب نما کا یہ خاص نمبر ہوگا۔

اور پھر ہمارے محترم بزرگ مولانا مقبول احمد صاحب نے
ایک دلچسپ مضمون بھیجا۔ اس میں انھوں نے بتایا کہ جامعہ کے لیے
چندہ کرنے کے لیے کیا کیا جتن کرنا پڑتے تھے۔

ہمارے پرانے ساتھی محمد طیب صاحب بی اے۔ جامعہ چیف
اکاؤنٹنٹ نے اپنے ذہن اپنی یاد پر زور ڈال کر سائیکلوں پر
کشمیر کے سفر کا حال لکھا۔ یہ اب سے چالیس بیالیس برس پہلے
کی بات ہے۔ اور اب آزادی ملنے کے بعد اس مہم جوئی یا مہم بازی
یعنی پہاڑیوں پر چڑھنے کے شوق نے کتنی غیر معمولی ترقی کی ہے
اس کا دلچسپ حال سالنامے میں پڑھیے گا۔ بہرحال اُس
زمانے میں اس طرح کے ایڈونچر کا خیال بھی لوگوں کو نہیں
آتا تھا۔ اور شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہو کہ طیب صاحب اور ان
کے ساتھیوں کی حیثیت پائنیرس کی ہے۔

پھر مولانا عبدالسلام قدوائی استاد دینیات
جامعہ کالج، جناب احمد علی صاحب استاد مدرسۂ ابتدائی جامعہ،
جناب عبدالغفار مدہولی استاد ٹیچرس کالج، ابو سعید انصاری
صاحب نے اپنے اپنے انداز میں جامعہ کی جھلکیاں دکھائی ہیں۔

جمیل قریشی صاحب کا کرنل ... مطالعہ بیر
کا حال بہت اچھے انداز میں لکھا ہے۔

اس سلسلے میں محترمہ آصفہ مجیـ
طور پر پڑھنے کی چیز ہے۔ یہ اتنا دلچسپ ہے
بغیر ختم کیے بنا آپ کو چین نہ آئے گا۔ ہاں معیـ
... ٹیچرس کالج نے اپنے مضمون میں جامعہ
کر دی ہے۔ یہ بھی پڑھنے کی چیز ہے محترم
نے اپنے مضمون میں ۴۷ء کے جامعہ کی ترقی

ہندوستان کے بڑے بڑے اردو
وقتاً فوقتاً جامعہ پر نظمیں لکھی ہیں۔ سید منیرالحـ
بڑی محنت اور جاں فشانی سے ان میں سے
جمع کر کے ہمیں مرحمت فرمائی ہیں۔ یہ بھی اس پر

ان کے علاوہ محترمہ سیدہ فرحت، رشـ
صاحب، ناوک حمزہ پوری صاحب اور دوسرے
شاعروں کی مزے مزے کی نظمیں پڑھیے۔

ہم نے پچھلے پرچے میں اس بات کی طرف
کیا تھا کہ وقت کم ہے اتنے کم وقت میں جوبلی نمبر کے لیے
فراہم کرنا مشکل ہوگا۔ خیال تھا کہ ۲ ، یا زیادہ
صفحے کافی ہوں گے انھی صفحوں میں ہمارے مستقل
(پنچ تنتر وغیرہ) بھی اور دوسری چیزیں بھی شامل

تھوڑا تھوڑا کر کے ہم نے اتنے مضمون آگئے کہ صفحے پھیلانے پڑے
اور پچھلے ناکمل مضمونوں (کشتوارا اور انوکھی شادی) کے
لیے بھی جگہ نہ نکل سکی۔ اب یہ سب دسمبر کے پرچے میں شائع ہوں گے۔

اور اب ہمیں دسمبر کے پرچے کی تیاری کرنا ہے۔
سالنامے کی تیاری کرنا ہے۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ
سالنامے کے لیے ہمارے پاس بہت ہی اچھے اچھے بہت
ہی دلچسپ مضمون آگئے ہیں اور سلسلہ جاری ہے۔ ہمارا سالنامہ
بھی ان شاء اللہ بہت شاندار رہوگا۔

یہ سب کچھ ہم آپ کے لیے کر رہے ہیں۔ آپ بھی
تھوڑا سا ہاتھ بٹائیے ہمارے بزرگ ہمارے ساتھی تھوڑی سی توجہ
کریں تو رسالے کی اشاعت کہیں سے کہیں پہنچ سکتی ہے۔

اے لیجیے باتوں باتوں میں ایک بات بتانا تو ہم
بھول ہی گئے۔ بہت ہی اہم بات! مکتبہ کے نئے جنرل منیجر
صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ بھلا کون صاحب؟ وہ صاحب
جنھوں نے مہاراشٹر میں آپ کے پیام تعلیم کو مقبول بنانے
میں وہ کارنامہ انجام دیا ہے جو ہمارے خواب و خیال میں بھی
نہیں تھا۔ پیام تعلیم کے انھی صفحوں میں ان کی نوازشوں کا ذکر
نہ جانے کتنی بار آچکا ہے۔ اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے یہ ہیں
جناب شاہد علی خاں صاحب سابق انچارج شاخ مکتبہ جامعہ بمبئی۔

ان کی تجارتی سوجھ بوجھ انتظامی اہلیت کی بنا پر
بمبئی کی شاخ ایک مثالی چیز بن گئی تھی۔ اسی لیے کمپنی کے
ڈائرکٹروں کی نظر انتخاب پھر کے انھی پر پڑی۔ ہم اپنی اور
آپ کی طرف سے انھیں دلی مبارکباد دیتے ہیں۔ شاہد صاحب
کو کام کرنے کے لیے بڑا میدان ملا ہے۔ یقین ہے کہ وہ
انشاء اللہ یہاں بھی اتنے ہی کامیاب رہیں گے۔

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اپنے نئے پروگرام میں مکتبہ
نے بچوں کے ادب کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ اب وہ
آپ کے لیے کہانیوں کی کتابیں بچوں کے ناول اور آپ
کی دلچسپی کی دوسری چیزوں پر کتابیں لکھوانے کی اسکیم بنا
رہے ہیں۔ پیام تعلیم کی ترقی کی طرف بھی خاص توجہ فرمائیں
گے۔ پیام تعلیم کے لیے نیک شگون ہے۔

پچھلے دنوں ان حضرات نے آپ کے پیام تعلیم کی
سرپرستی فرمائی۔ شہاب الدین کاظمی صاحب بہار شریف
نعیم الحسن صاحب مالک پرتاپ گڑھ، محمود احمد صاحب اعظم گڑھ
سہیل مرزا صاحب ترکمان گیٹ دہلی، اردو ہائی اسکول
بالاپور، بزم اردو کمیٹی دربھنگا، محمد محفوظ الحق صاحب مالک
بہار شریف، گورنمنٹ پرائمری اسکول مراد نگر حیدرآباد
شبیر احمد صاحب صدیقی اجین، نونہال لائبریری، آر
بوائز اسکول بکرمی، آزاد لائبریری فیض آباد مونگیر
ہیڈ ماسٹر صاحب ام، ام اردو ہائی اسکول گوپال گنج۔

باقی ص

بچوں کے لیے دلچسپ مضامین

کتاب کی کہانی
(معلومات)
سید احمد حسن

انسان نے کب کیوں اور کیسے لکھنا اور پڑھنا سیکھا؟ کتاب کی ابتدا کیسے ہوئی؟ موجودہ صورت تک پہنچنے میں کن کن منزلوں سے گزرنا پڑا؟... یہ سب جاننے کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بہت ضروری، اچھوتی معلومات ہیں اور بڑے دلچسپ انداز میں لکھی گئی ہیں۔
قیمت:۔

رسول پاک
مولانا عبدالواحد

رسول پاک صلعم کون تھے؟ کہاں کے رہنے والے تھے؟ آپ نے انسانوں کو کیا تعلیم دی ان سوالوں کا جواب اس کتاب میں موثر انداز میں دیا گیا ہے۔ بڑے بچوں کے لیے سیرت پر ایک اچھی کتاب ہے۔ قیمت

سرکار دو عالم
محمد حسین حسان

سرورِ کائنات پر بڑے بچوں کے لیے ایک ایسی کتاب جسے بے انتہا مقبولیت حاصل ہوئی۔ پڑھانے والوں نے بھی پسند کیا اور پڑھنے والوں نے بھی۔
قیمت:۔

مسلمان بیبیاں:۔
مولانا اعجاز الحق قدوسی

اس کتاب میں صحابیاتؓ کے مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی حالات بیان کیے گئے ہیں۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت، مذہبی اور اخلاقی معلومات کے سلسلے میں یہ کتاب بہت مفید ثابت ہوئی ہے۔ قیمت:۔ ۵

بڑ دادا کی کہانی:۔
محمد عبدالغفور

ایک بہت بوڑھے بڑ کے درخت نے یہ کہانیاں بچوں کو سنائی ہیں۔ ان کہانیوں میں کئی برس کی تاریخ پوشیدہ ہے۔ ایسی تاریخ جو بڑی بڑی کتابوں میں بھی شاید آپ کو نہ مل سکے۔ قیمت:۔ ۶

چٹانوں کی کہانی:۔
محمد امین

زمین کے اندر چھپی ہوئی ہر چٹان زمین کی تاریخ کا ایک اہم ورق ہے۔ اس کتاب میں ایسی ہی چٹانوں کا حال بیان کیا گیا ہے جن کے ذریعے ہم زمین کی کروڑوں سال پرانی تاریخ معلوم کر سکتے ہیں۔ قیمت

خبر رسانی کے طریقے:۔
رفیعہ منظور الامین

اس کتاب میں بچوں کو بہت سیدھے سادے انداز میں یہ بتایا گیا ہے کہ ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلی گراف، ٹیلی پرنٹر اور ٹیلی فون کے ذریعے خبریں ایک جگہ سے دوسری جگہ کیسے بھیجی جاتی ہیں۔ کتاب دلچسپ بھی ہے مفید بھی۔ قیمت

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی ۲۵، دہلی ۶، بمبئی ۳، علی گڑھ

مسز سعیدہ فرحت

جشنِ جوبلی

آؤ! کہ آج جشنِ مسرت منائیں ہم — گیت و خوشی کے ساز پہ جی بھر کے گائیں ہم
آؤ! کہ وجہ جشنِ مسرت بتائیں ہم — پچاس سال کی یہ کہانی سنائیں ہم
یہ جامعہ جو آج ہے مشہورِ روزگار — کچھ خادمانِ قوم کی ہے پیاری یادگار
خونِ جگر سے سینچا گیا ہے یہ گلستاں — اہلِ نظر رہے ہیں سدا اس کے پاسباں
اجملؔ سا ان میں کوئی مسیحائے قوم تھا — محمودؔ جیسا ساتھ میں بابائے قوم تھا
اس کے معاونوں میں محمد علی بھی تھے — انصاریؔ جیسے صاحبِ دل آدمی بھی تھے
ذاکر حسین جیسے تھے معمارِ جامعہ — خوشبو سے جن کی مہکا ہے گلزارِ جامعہ
گاندھی سا رہنما بھی رہا اس کا راہبر — کی اس کی سرپرستی جواہر نے عمر بھر
کچھ اور ہستیاں بھی رہی ہیں شریکِ کار — ایثار جن کا کر گیا بنیاد استوار
قربانیوں کی راہ میں پیچھے ہٹے نہیں — نام و نمود کے لیے آگے بڑھے نہیں
خدمت میں جامعہ کی گزاری ہے زندگی — سرشار وہ رہے ہیں محبت میں قوم کی
متحدہ قومیت کا نشاں ہے یہ جامعہ — حبِّ وطن کا بحرِ رواں ہے یہ جامعہ
لاکھوں دیے جلائے ہیں اس اک چراغ نے — مہکائے کتنے پھول ہیں اس ایک باغ نے
تعلیمی تجربوں کی رہی ہے یہ پیشوا — طوفان میں رہی ہے سفینے کی ناخدا
کتنے دلوں کو جذبۂ خدمت عطا کیا — علم و عمل کی راہ کو روشن بنا دیا
گلزارِ جامعہ کو مبارک بہار ہو — آب و ہوا زمانے کی اب سازگار ہو

فرحت کہیں بھی ہم ہوں مگر جامعہ کے ہیں
زیرِ اثر یہ قلب و نظر جامعہ کے ہیں

جناب سید محمد ٹونکی

زندگی

برادر محترم سید محمد ٹونکی صاحب نے یہ کہانی عجیب و غریب انداز میں لکھی ہے۔ بیمار تھے مگر ہماری درخواست پر اتنی زحمت فرمائی۔ کہانی مختصر بہت ہے پھر آخر میں نامکمل ہے کاش اسے وہ آگے بڑھا سکتے۔ آپ کے لیے تو اتنا بھی تبرک بہت ہے۔ اسے پڑھ کر آپ کو اندازہ ہوگا کہ یہ ادارہ جو ماشاءاللہ اب یونی ورسٹی کے درجے تک پہنچ گیا ہے۔ کس طرح قایم ہوا کس بے سرو سامانی کی حالت میں اس کی بنیاد پڑی

ایڈیٹر

انگریز لڑائی جیتے اور جرمن ہارے فتح کے نشے میں وہ ایسا کچھ کر گئے جس کا سان گمان بھی نہ تھا، ظلم کی بھی حد ہوتی ہے۔ آواز اٹھی "ظالم حکومت کا بائی کاٹ کرو" نوجوان جوش سے بھر گئے۔ ام۔ اے۔ او کالج علی گڑھ کے طلباء میں بھی نعرہ لگا "انگریز سرکار سے کوئی واسطہ نہ رکھو" کالج کے انتظام کرنے والوں میں بات چیت ہوئی۔

پرنسپل: سیکرٹری صاحب یہ کیسی ناسمجھی کی بات ہے کہ انگریزوں کی حکومت کا بائی کاٹ کرو۔ جس حکومت نے جرمنی جیسی طاقت کے پرخچے اڑا دئے بھلا اس سے کوئی ٹکر لے سکتا ہے۔

سکریٹری: انگریزوں کی حکومت تو پہلے ہی دنیا کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی تھی۔ اب تو جرمنی کے علاقوں پر بھی قبضہ ہو گیا ہے۔ کیا ٹھکانا ہے۔ ان کی طاقت کا۔ ان کے حکم کو کوئی ٹال سکتا ہے! ہمارا کالج تو سرکار برطانیہ کا وفاد

پرنسپل: جی ہاں پروفیسر، استاد نوکر چاک کے وفادار ہیں۔ ہاں کچھ لڑکے محمد علی کے بہ میں آگئے ہیں۔ شر فساد کے اندیشہ سے کا کردیا۔ اب سوچتا ہوں کہ بورڈنگ بھی بند نوکروں چاکروں کو چھٹی دے دوں تو جو گنتی رہ گئے ہیں وہ بھی چلے جائیں گے۔

سکریٹری: آپ فوراً نوٹس نکال تاکہ جو لڑکے اپنی دیدہ دلیری سے رہ گئے بھی چلے جائیں اور کالج میں سرکار کے خ کوئی فتنہ نہ اٹھے۔

نوٹس جاری ہو گیا۔ بورڈنگوں پر ڈال دیے گئے۔ باورچیوں، بیروں، بھشتیو مہتروں کو حکم دے دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے گھ کو جائیں مگر جن کو باپ کا گوسوں بھر اپنے

ڈرا سکا۔ وہ جیالے کہاں بھاگنے والے تھے ۔ڈٹے رہے۔ پکی بارک (سر سید کورٹ) پر قبضہ کر کے ڈیرا ڈال دیا۔ ملازموں میں سے بھی کچھ نے کہا۔ "جہاں یہ وہاں ہم"۔

---

۳۱ اکتوبر ۱۹۲۰ء کی ابھی پو نہیں پھٹی ہے کہ سید رؤف پاشا اپنے کمرے سے پیشاب کرنے نکلے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں سایہ نظر آتا ہے آنکھیں ملتے ہیں تو سنگینیں تانے سپاہی کھڑا ہے۔ ادھر ادھر دیکھتے ہیں تو یہاں سے وہاں تک سپاہی ہیں۔ پیشاب کیا۔ کمرے میں آئے ساتھی کو جگایا اور ہنستے ہوئے کہا۔ "آپ کے غلام دروازے پر حاضر ہیں"۔

دھیرے دھیرے اندھیرا چھٹتا گیا۔ چڑیاں چہچہانے لگیں۔ لڑکے اٹھتے گئے اور نماز کی ایسی تیاری کرتے گئے گویا سنگینیں تانے سپاہی پکی بارک میں ہیں ہی نہیں۔ جب دن نکل آیا تو معلوم ہوا پکی بارک ہی نہیں کالج کو آنے والی سب سڑکیں بند ہیں۔ ہر سڑک پر سنگینیں تانے سپاہی ہیں۔ نہ صرف شہر سے آنے والی بلکہ باہر سے آنے والی سڑکوں، راستوں اور پگ ڈنڈیوں تک کی ناکہ بندی ہے۔

کالج کے سکریٹری، ضلع مجسٹریٹ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور سپاہیوں نے اولڈ بوائز لاج کو بھی گھیر لیا ہے۔ اور مولانا محمد علی سے (جو بخار میں مبتلا ہیں) کہتے ہیں "یہاں سے نکلو اور اپنے ساتھ ان سرکش لڑکوں کو بھی لے جاؤ۔"

محمد علی:۔ یہ کالج میرا ہے اور ان لڑکوں کے لیے ہے اور میں کیوں نکلوں؟

ضلع مجسٹریٹ:۔ یہ سکریٹری صاحب کہتے ہیں کہ تم نے اور تمھارے لڑکوں نے ناجائز قبضہ کر رکھا ہے۔ تم کو یہاں سے نکال دیا جائے۔

محمد علی:۔ ہم نے پُرامن رہنے کا عہد کیا ہے ہم مار پیٹ نہیں کریں گے لیکن ایسے جائیں گے نہیں۔

ضلع مجسٹریٹ:۔ میں تم کو دفعہ ۱۴۴ کے تحت حکم دیتا ہوں کہ تمھارا قبضہ مجرمانہ ہے۔ تم کو یہاں سے نکالا جائے گا۔

محمد علی:۔ ہم نے ابھی تک قانون توڑنے کا فیصلہ نہیں کیا۔ اس وقت بھی نہیں توڑیں گے۔

اطلاع ملتی ہے اور وہ طالب علم جو اٹھ کر پانی نہیں پیتے تھے اپنا اپنا بستر خود باندھتے ہیں۔ ضلع مجسٹریٹ کہتا ہے کہ ہم سامان باندھنے کے لیے آپ کو آدمی اور لے جانے کو ٹرک دیتے ہیں۔ جواب ملتا ہے نہ مفت کی سواری چاہیے نہ بے دام نوکر۔ صبح ناشتہ نہیں کیا، دوپہر ڈھلنے کو ہے مگر کندھوں پر سامان رکھ کر گاڑیوں پر پہنچایا جا رہا ہے۔ دوپہر بعد مولانا محمد علی آ گئے ہیں، اور یہ سو سے زیادہ طلبا ان کے پیچھے لاج سے مارچ کرتے ہوئے کرشنا آشرم پہنچے ہیں (یہ کوٹھی الوپ شہر کو جاتے ہوئے منٹو سرکل کے چوراہے کے بعد بائیں ہاتھ پر آتی ہے)

کسی کو کمرے میں جگہ مل گئی کسی نے اپنا بستر برآمدے میں لگا لیا۔ مغرب ہوتے ہوتے دو ایک چھولداریاں ایک آدھ خیمہ آگیا۔ کچھ اُن میں چلے گئے۔

مغرب ہوئی علاؤالدین نے اذان دی، شام کا سناٹا ۔ کھلا میدان یہاں سے وہاں تک سوائے منٹو سرکل کے کوئی عمارت نہیں منٹو سرکل بھی خالی۔ فتح کی کیا ستی ہو گی جو علاؤالدین کی اللہ اکبر میں تھی۔ معلوم ہوتا تھا بس وہی ہے اور اس کے سامنے دنیا کی حکومتیں ہیچ ہیں سب نے نماز پڑھی، کھانا کھایا۔ ایک ہی دسترخوان پر لڑکے، ملازم، محمد علی کھانا کھا رہے تھے۔ کھانا کھا چکے عشا کی نماز پڑھی۔ اور زمین پر بستر بچھا کر سب سو رہے۔

یکم نومبر کی صبح پرکیف تھی۔ تارے ایک ایک کرکے ڈوبتے جا رہے تھے۔ اُجالا پھیل رہا تھا۔ ہلکی ہلکی ہوا میں چڑیوں کا چہچہانا نئی زندگی کا پیام سنا رہا تھا۔ اِدھر زمین پر بھی ستی کے ترانے تھے۔ قمرالدین نے ہنستے ہوئے کہا۔ "ذاکر صاحب مبارک ہو۔ بشیر نے سنایا، سنگینیں لائے تھے ڈرانے کے لیے۔" قاضی انعام اللہ بولے۔ "چاہتے تھے کہ فساد ہو تاکہ جامعہ ملیہ قایم نہ ہونے پائے۔" اس طرح اپنی اپنی رائے دے رہے تھے کہ پھر علاؤالدین کی اذان کی آواز گونج گئی۔ سب نے صبح کی نماز پڑھی۔ لوٹنے لگے تو محمود نے تان اٹھائی۔

دہر میں مسلم ہے حق کی آزمایش کے لیے
تمغۂ ایماں نہیں ملتا ستایش کے لیے
آزمایش ہے نشانِ بندگانِ محترم
جانچ ہوتی ہے اسی کی جس پہ ہوتا ہے کرم

پھر کیا تھا کورس ہونے لگا۔ اور سب کے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک چاہتا ہے کہ امر سخت ہو۔

ناشتے سے فارغ ہونے کے بعد د ہوا۔ یہاں نہ داخلے کے لیے کوئی عرضی دی گ فارم بھر گیا تھا۔ زمین پر دری بچھی تھی جس بیٹھے تھے۔ سامنے محمد علی (مولانا) تھے حلف اُٹھایا کہ جب تک آزادی نہیں ملے گی کا ساتھ نہیں دوں گا۔ مولانا نے ان کا نام لکھا اور داخلے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ بارہ مبارک باد کے تار آنے لگے مشہور بھگت پادری سی ایف اینڈریوز کا تار ہے۔ "آپ کو آپ کے طالب العلموں کو اِس جرأت مبارک باد پیش کرتا ہوں اور اپنی خدمات بحیثیت جامعہ کے لیے پیش کرتا ہوں۔" ان کے علاوہ انجمنوں۔ خلافت کمیٹی کے صدر۔ کانگریس سکریٹری کے تار ملے۔ اخباروں کے نمائند الہ آباد کے انڈی پینڈنٹ میں سرخی دی گئی "نان ک تحریک کا پیارا نونہال جامعہ ملیہ"۔ جن کے نہایت پرسکون پروقار، نئی ذمہ داری کے سے سرشار ہیں۔" لیڈروں میں حکیم اجمل خاں انصاری۔ مولانا آزاد۔ گاندھی جی آئے لڑک

ملے۔ محمد علی نے کہا "مجھے ان پر فخر ہے کہ ہندوستان کے طلبا میں سب سے پہلے انھوں نے انگریزوں کی حکومت سے تعلق توڑا۔

میرٹھ سے خیمے لائے اور لگائے گئے کیونکہ جو لڑکے کسی وجہ سے ۳۱ اکتوبر کو موجود نہ تھے وہ آئے اور اسلامیہ کالج لاہور۔ پشاور، عباسیہ کالج بہاولپور سے بھی طلبا آنے لگے اور آتے گئے۔ اب تعلیم بھی شروع ہوگئی۔ نیم کا پیڑ، اس کے سایے میں کھُری زمین پر محمد علی بیٹھے ہیں اور ان کے شاگرد بھی۔ محمد علی تاریخ یا انگریزی ادب پڑھا رہے ہیں۔ اشرف اٹھتے ہیں اور کہتے ہیں "مولانا یورپ کے لوگوں کا خیال صحیح ہے کہ ہم پارلی منٹ میونسپلٹی وغیرہ سے بالکل ناآشنا تھے۔ لکشمی نرائن اسے نہیں مانتے۔ بحث ہوتی ہے۔ غرض آزادی سے سب اپنے اپنے خیالات ظاہر کرتے ہیں۔ اور تعلیم میں رٹائی نہیں ہوتی غور و فکر کی تربیت ہوتی ہے۔

محمد علی کے علاوہ دو استاد اور ہیں مولانا رشید احمد سید شریف اور حسن محمد حیات جو اپنے فیشن کی وجہ سے لارڈ کہلاتے تھے چونکہ اسکول کے بچے نہیں آئے ہیں۔ اس لیے حیات صاحب کسی کلاس کو نہیں پڑھاتے۔ البتہ مولانا رشید احمد صاحب عربی۔ فارسی سب جماعتوں کو پڑھاتے ہیں۔ نومبر کے آخر میں خواجہ عبدالحئی صاحب اور مولوی سید محمد شرف الدین صاحب بھی استادوں میں شریک ہوگئے۔ خواجہ صاحب تفسیر پڑھانے لگے اور مولوی شرف الدین صاحب اُردو فارسی۔

پہلی جنوری ۱۹۲۱ء کی صبح آزادی کی تھی ناگپور میں کانگریس کے اور خلافت کے اجلاس ہوئے اور ایسے ہوئے کہ پنڈال سے باہر دور دور تک آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے۔ بڈھے کم اور جوان زیادہ۔ وکیل اور بیرسٹر عام لوگوں میں ایسے جیسے اُردو پر سفیدی۔ ان سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ ایک سال میں سوراج لینا ہے۔ صدیوں کی غلامی کے بعد آزادی کی کرن پھوٹی۔ جوش کا عالم یہ کہ علی گڑھ جیسے چھوٹے شہر میں عام جلسے میں پانچ چھ ہزار سے کم کا مجمع نہ ہوتا۔

جامعہ کے لیے بھی مبارک مہینہ تھا۔ کرشنا آشرم تو یورڈنگ ہوگیا۔ ڈگی کی کوٹھی مل گئی وہاں دفتر اور کلاسیں ہونے لگیں۔ لڑکوں کی تعداد بڑھی اور استادوں کی بھی مولانا اسلم جیراجپوری، عبدالمجید خواجہ صاحب۔ ڈاکٹر محمد علی شاہ صاحب، کے سنتانم۔ کرپا ندھی۔ ڈاکٹر محمد عالم صاحب۔ مولانا سورتی صاحب۔ ڈاکٹر لطیف سعید صاحب شریک ہوئے۔ سید نور اللہ اور ذاکر صاحب کو بھی ابتدائی کلاسیں پڑھانے کو ملیں۔ یونین کے جلسے ہونے لگے کے سنتانم اور کرپا ندھی جی کی مدد سے جامعہ کے طلبا نے اپنے ہاتھوں سے لکھ کر اور کارٹون بنا کر رسالہ نکالا۔

ہفتے اور مہینے گزرتے گئے طے کیا گیا کہ ۶ اپریل سے ۱۳ اپریل تک قومی ہفتہ منایا جائے۔ جامعہ کے طلبا کی ٹولیاں بنائی گئیں اور انھیں علی گڑھ کی تمام تحصیلوں میں بھیج

دیا گیا۔ تحصیل کھیر کی ٹولی میں عصیم خاں، لکشمی نرائن، کنور محمد اشرف، سید محمد لوٹنگی ہیں۔ اس زمانے میں بسوں کا تو سوال ہی نہ تھا۔ کچی سڑکیں جن پر دھول اڑتی رہتی۔ کبھی کبھار یکہ مل جاتا۔ اس کا انتظار کون کرتا پیدل چل دیے شادی پور پہنچے شام ہوگئی۔ گاؤں والوں نے ہاتھ منھ دھونے کو پانی لاکر دیا۔ پھر کوئی موٹی روٹی اور پیاز لایا۔ کوئی روٹی اور ارہر کی دال۔ ہم سب نے کھائی، بات چیت کی اور سویرے جلسہ کرنے کی تجویز ہوئی۔ صبح کو جلسہ شروع ہوا ہے کہ خبر آتی ہے پولس آرہی ہے۔ گاؤں کے غریب بے پڑھے لکھے ڈرتے ہیں۔ لکشمی اٹھ کر کہتے ہیں دیکھو عصیم خاں سرحد کے پٹھان آزادی کی لڑائی لڑنے آئے ہیں اور تم ڈرتے ہو۔ جب سوراج ملے گا تو گاؤں پر تمہارا ہی راج ہوگا۔ یہ سنتے ہی سب جم کر تقریریں سنتے اور کانگریس کمیٹی بنانے کا وعدہ کرتے ہیں۔

قومی ہفتہ کے ختم ہونے کے بعد طلبا سے پوچھا جاتا ہے کہ کون تعلیم جاری رکھے گا اور کون قومی کام کے لیے جائے گا۔ صرف دس پندرہ لڑکے تعلیم جاری رکھنا چاہتے ہیں۔ باقی سب قومی کام کے لیے جانا چاہتے ہیں اور ان کی ٹریننگ شروع ہوتی ہے شام کو پانچ سے ٹہل۔ عظیم خاں نکلتے ہیں تو میدان میں محمد علی کھڑے ہیں لڑکوں سے کہتے ہیں تم گرمی کی وجہ سے نہیں نکلتے لو دیکھو مولانا میدان میں کھڑے ہیں۔ سب لڑکے نکل آئے ہیں اور عصیم خاں نے لائن بنا کر چپ راست سے مارچ شروع کردی ... مولانا دیکھتے ہیں کہ کسی کا قدم نہیں ملتا سلان سے نکل کر اپنی ٹانگ سے ان کی ٹانگ باندھتے اور ساتھ مارچ کرا کر قدم ملانا سکھاتے ہیں اور یہی ٹریننگ دی جاتی ہے۔

لیجیے پانچ مئی آگئی صبح سات بجے سب ... سے فارغ ہوکر آگئے مولانا محمد علی نے سب کو ہدایتیں دینا شروع کیں۔ سامان کے لیے قلی نہ کرنا۔ فاصلہ ... تو سواری نہ کرنا۔ جہاں جاؤ وہاں کے حالات ... تقریر کرتے وقت شور ہو تو گھبرانا نہیں۔ بیچ ... لڑکے سوال کرتے اور اپنے شکوک دور کرتے ہیں ... کے عبدالقیوم بار بار سوال کرتے ہیں "ہمیں جی کھتریاز ... اتحاد کیسے ہو سکتا ہے" ڈھائی بجے تک یہ سلسلہ ... ہے چھ مئی کی صبح سے قومی کام کے لیے جتھے روانہ ہیں۔ قاضی انعام اللہ، رفیق احمد خاں، قمرالدین ... انعام اللہ ہاشمی صوبہ متوسط ناگپور جبل پور ... قدوائی۔ سید رؤف پاشا۔ اکبر علی خاں، محمو... وغیرہ مدراس۔ عبدالباسط۔ محمد سلطان، البشیر ... اشفاق علی مقیم الزماں بمبئی۔ بابو بھاجل الر... عبدالکریم وغیرہ بنگال۔ انعام الحق، پیر الٰہی ... سندھ محمد عالم۔ میر قلم عصیم خاں، عبدالقیوم، عبدالقادر، غلام محمد، نذیر نیازی، عبدالمجید و ابو سعید خاں، سید محمد جعفری، سید محمد لوٹنگی مامون الرشید وغیرہ صوبہ متحدہ میں کام کرنے بھیجے گئے ہیں۔

جتھے روانہ ہوگئے پنجاب میں کام کرنے

لاہور کے اسٹیشن پر اترا ہے پنجاب کے مشہور لیڈر ظفر علی خاں صاحب اس وقت اسٹیشن پر ہیں وہ ان کو ٹرین سے اترتے۔ لاین بناتے اور پیدل جاتے دیکھتے ہیں دوسرے دن ان کے اخبار زمیندار میں نوٹ شایع ہوتا ہے "میں نے کیا دیکھا" ام۔ اے۔ او کالج کے وہ لڑکے جو بڑھیا سے بڑھیا کپڑے کا لباس پہنتے تھے۔ آج موٹی کھادی کا کرتہ پاجاما پہنے ہیں۔ اس پر اس سے موٹی کھادی کا چوغہ ہے۔ جو خود اٹھ کر پانی نہیں پیتے تھے۔ بیرا آکر پلاتا تھا جن کے اسٹیشن اترنے پر قلی دوڑتا تھا کہ "میاں سامان میں اٹھاؤں گا" لاہور کے اسٹیشن پر اترتے ہیں۔ قلی ڈھونڈتے ہیں۔ انھوں نے منع کر دیا ہے۔ کپڑوں اور سامان کا تھیلا پیٹھ پر ہے اور کاغذات کا پہلو میں ایک ایک کر کے اترے ہیں۔ لاین بنائی ہے اور پیدل مارچ کر کے دفتر کو چلے گئے ہیں۔ حیران ہوں اتنے سے دنوں میں کایا کیسے پلٹ گئی "

اتر پردیش میں کام کرنے والوں کا مرکز میرٹھ تھا۔ وہاں سے فتح پور ہنسوہ بھیجا گیا۔ دفتر میں معلومات کی کہ ضلع میں کون کون سے قصبے ہیں معلوم ہوا کھاگا بند کی روڈ۔ شاہ کوٹ۔ ایرایاں۔ پوچھ گچھ کے بعد معلوم ہوا۔ دفتر کے پاس یکوں کا اڈا ہے جہاں سے ایرایاں کے یکے ملتے ہیں ہم آنے فی سواری لیتے ہیں۔ یکہ میں پانچ بیٹھے ہوئے تھے چھٹے طالب علم بیٹھے اور چل دیئے۔ مسافر آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ آج کیسا کا

مقدمہ تھا وکیل نے بڑا جور لگایا پر منصف ایک نہ مانی — دوسرے نے کہا۔ میرے مقدمہ کی تاریخ بدل گئی۔ آج بڑا جلوس نکلا تھا۔ جلوس کا ذکر سنتے ہی طالب علم پوچھتے ہیں۔ کہو بھئی ایرایاں میں کوئی اخبار پڑھتا ہے۔ ایک نے کہا۔ ہاں جی انگریجی کا آوے ہے دوسرے نے کہا۔ اجی جمہدار بھی آوے ہے۔ بڑے میاں پڑھتے ہیں۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ ایرایاں کا اڈا آ گیا۔ پاس ہی نان بائی کی دکان تھی۔ ایک طالب علم گیا باتیں کیں۔

طالب علم :- کہو میاں بھٹیارے کیا کھانا ہے۔

بھٹیارہ :- میاں مسافر۔ سالن روٹی۔ ساگ گوشت دال روٹی کھاؤگے تو یاد کروگے ایرایاں میں کسی بھٹیارے کے ہاں کھانا کھایا تھا۔

طالب علم :- کیا لوگے۔

بھٹیارا :- اجی کیا لوں گا۔ دو آنے سالن روٹی کے ڈیڑھ آنا دال روٹی کا۔ روٹیاں جتنی کھاؤ۔

طالب علم :- سالن روٹی دو اور یہ تو بتاؤ یہاں کوئی سرائے بھی ہے۔

بھٹیارا :- میاں مسافر سرائے تو ہے نہیں پاس میں چھوٹی سی مسجد ہے۔

کھانا کھایا۔ نماز پڑھی چوغہ کا بستر چھوٹے تھیلے کا تکیہ بنا کر سو رہے۔ صبح ہوئی۔ فارغ ہو کر اخبار پڑھنے والے صاحب کو تلاش کیا معلوم ہوا کہ جن رئیس کی بڑی حویلی ہے۔ وہی اخبار منگاتے ہیں۔ حویلی پر اطلاع کرائی جاتی ہے۔ اندر بلایا جاتا ہے۔

بیچوں بیچ ایک تخت ہے۔ اس پر چاندنی بچھی ہے بیچ میں گاؤ تکیہ ہے جس سے لگے رئیس بیٹھے ہیں۔ تخت کے اِدھر اُدھر دو بڑے کتے کھڑے ہیں۔ طالب علم سلام کرتا اور کہتا ہے یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ آپ انڈی پنڈنٹ پڑھتے ہیں۔ آپ کو تحریک سے ہمدردی ہے۔

رئیس:- ہمدردی تو ہے لیکن یہاں کل ہی پولیس نے تلاشیاں لی ہیں۔

طالب علم:- میری تو آپ سے اتنی درخواست ہے کہ آپ ڈھنڈھورچی کو بلوا دیں وہ قصبے میں ڈھنڈھورا پیٹ دے میں اس کو پیسے دے دوں گا۔

رئیس:- (غصے سے) یہ بھی اچھی کہی آپ جلسہ کر کے چلی دیں اور یہاں پولیس شریفوں کی آبرو ریزی کرتی رہے۔

طالب علم چپکے سے اٹھ آتا ہے مگر اِدھر اُدھر گھوم کر پتا لگاتا ہے۔ ایک آدھ بھلا آدمی بات سنتا ہے اور ڈھنڈھورا پٹوانے کا وعدہ کرتا ہے۔ لوگ جمع ہوتے ہیں بڑے بوڑھے کہتے ہیں یہ لڑکا کیا بتائے گا دوسری طرف سے آواز آتی ہے بات سن لو جی ——

غرض جلسہ شروع ہوتا ہے۔ تقریر کے بعد فارم بھرنے اور ممبر بننے کی درخواست کی جاتی ہے۔ بیس پچیس آدمی وہیں فارم بھرتے۔ چندہ دیتے ہیں۔ انہی میں سے صدر و سکریٹری کا چناؤ کر کے کمیٹی بنا دی جاتی ہے صدر دفتر کا پتہ ان کو دے دیا جاتا ہے۔ اور شاہ کوٹ کی راہ لی جاتی ہے۔

جولائی کا مہینہ ہے۔ مولانا محمد علی پٹنہ آئے ہیں اور ڈاکٹر سید محمود صاحب کی کوٹھی شیرستان میں ٹھہرے ہیں۔ صبح کا وقت ہے حسن محمد حیات صاحب باہر برآمدے میں اخبار پڑھ رہے ہیں۔ اخبار میں سرخی دیکھتے ہیں "پہلا طالب علم گرفتار" خوشی ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں محمد مبارک ہو۔ تمہارا بیٹا عبداللطیف گرفتار ہو گیا"

باقی آئندہ

کون تھے

حضرت خواجہ معین الدین چشتی رحمۃ اللہ

اور

انھوں نے ہندوستان کو کیا دیا

خواجہ صاحب نے سماجی اقتصادی اور انسانی مسا[ئل] کی جو تعلیم دی اس نے اس زمانے کے اور بعد کے ہند[وستانی] سماج پر کیا اثرات چھوڑے اور آج ان کے اس پ[یغام] کا اعادہ کیوں ضروری ہے!

یہ سب جاننے کے لیے

روزنامہ الجمعیۃ کا خواجہ غریب نواز [نمبر] پڑھیے۔ قیمت مع محصول رجسٹری تین روپے

منگوانے کا پتہ:- منیجر اخبار الجمعیۃ گلی قاسم جان

علم حاصل کرو علم سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز نہیں ہے

جناب ناوک حمزہ پوری



جامعہ کا طالب علم

ہے درسگاہِ جامعۂ ملیہ کی جاں - بچہ ہو یا جواں
ہندوستاں کی آن ہے بھارت کا پاسباں - بچہ ہو یا جواں

ساری رگوں میں اس کی شجاعت کا ہے لہو - بجلی پئے عدو
زندہ کرے گا حیدؓر و ارجن کی داستاں - بچہ ہو یا جواں

قومیت اس کی جان ہے، جمہوریت جگر - فطرت کا خوش سیَر
بھارت کا ہے سپوت محبت کا ہے نشاں - بچہ ہو یا جواں

سیّد ہو یا پٹھان ہریجن کہ برہمن - ہے عاشقِ وطن
آپس میں ہے یوں جیسے ہو دو قالب ایک جاں - بچہ ہو یا جواں

اپنے وطن کی آن ہے، جانِ وطن ہے یہ - شانِ وطن ہے یہ
ہے دوستوں کا دوست عدو کو بلائے جاں - بچہ ہو یا جواں

ماں باپ کی ہے آنکھوں کی ٹھنڈک یہ باتمیز - استاد کا عزیز
عزت بڑوں کی کرتا ہے، چھوٹوں پہ مہرباں - بچہ ہو یا جواں

اپنے پرائے سارے کا رکھتا ہے دل میں پاس - اللہ کی ہے آس
شیریں زباں ہے، دوستوں کا ہے مزاج داں - بچہ ہو یا جواں

جنت نشاں بنائے گا ہندوستاں کو پھر - اس گلستاں کو پھر
سکہ جما کے آئے گا جائے گا یہ جہاں - بچہ ہو یا جواں

محترمہ آصفہ مجیب

قطرے سے گہر ہونے تک

اس پرچے کے شروع میں برادرِ محترم سید محمد ٹونکی صاحب کا مضمون آپ نے پڑھا ہوگا "زندگی"۔ ٹونکی صاحب نے جامعہ کی زندگی کا بالکل شروع کی زندگی کا نقشہ کچھ اس طرح کھینچا ہے کہ مضمون نے ایک شاہ کار کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ نیچے ایک اور شاہ کار ملاحظہ فرمایئے۔ محترمہ آصفہ مجیب نے قرول باغ اور جامعہ نگر کی زندگی کا حال بتایا ہے۔ لوگ کس قدر تنگی ترشی سے گذر بسر کرتے تھے۔ کام کی دھن، کام کی لگن اس قدر تھی کہ مالی دشواریوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔

قوم یا ادارہ ایسے ہی ایثار پیشہ ایسے ہی مخلص۔ لوگوں کی بدولت بنتا ہے، آگے بڑھتا ہے ترقی کرتا ہے ... محترمہ آصفہ مجیب نے یہ سب باتیں ایسے بھولے بھالے انداز میں ایسی سادہ اور گھریلو زبان میں بتائی ہیں کہ رشک آتا ہے۔ ہماری درخواست پر انھوں نے ایسی اچھی چیز لکھ دی ہے۔ یہ احسان شکریے سے بالاتر ہے۔ — ایڈیٹر

جامعہ نے عمر کے پچاس سال طے کیے جشن زریں کا مبارک دن آیا بہت شکر اور خوشی کا مقام ہے۔ شروع میں جب یہ چند بھویں کے بنگلوں میں قائم ہوئی تو اس کی بساط کیا تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ تعمیر کا یہ خواب کبھی پورا ہوگا یا نہیں۔ اس کی کوئی حقیقت بھی ہے!

آبِ باراں کا ننھا سا قطرہ خدا کی قدرت سے سیپی میں جا کر موتی بن کر چمکا۔

ساتھ ساتھ بہت سی باتوں کا خیال آتا لوگوں کا جنھوں نے دنیا کا سکھ چین اپنے پر حرام اس کو بنانے میں عمریں کھپا دیں۔ کیسے کٹھن دو دراز سالوں کی پرسوز گردشوں کے بعد یہ نقش ابھرا۔ کا جشنِ زریں ہے۔

[illegible]

[illegible] نے جامعہ کو جانے

میں [illegible] کا [illegible] ہے

[illegible] اس کی کوئی مثال شاید ہی ملے۔ جامعہ کی تاریخ

[illegible] میں لکھی جائے [illegible] میں سے ہو

[illegible] شخصیتوں کے کارناموں پر مکمل اشاعت ہو۔ ان کے گن

گائے جائیں۔ مگر [illegible] سب لوگوں نے مل کر سالوں تک جو

دکھ [illegible] کی وہ مسلسل داستان کہیں نہ

سمائے گی۔ یہ [illegible] ہے۔

[illegible] آپہنچا ہے

(سو سال کا راستہ کبھی ایک آن میں طے ہوتا ہے)

میں نے پہلی بار جامعہ کو دیکھا یا اس کی تھوڑی

سی جھلک ان چند شخصوں میں دکھا رہی ہوں [illegible] میں

قرول باغ میں ایک چھوٹے سے مکان میں [illegible]

کے ڈھول کی آواز سنائی دیتی ہے۔

سنا تھا کہ [illegible] مجیب صاحب نے

والد صاحب سے [illegible] کہ جامعہ کا [illegible] کھولا

تھا۔ اس میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] یہاں آ کر دیکھا۔

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] نے [illegible] تھا

کہ ان حالات میں کچھ نہیں کر سکتے۔ انھوں نے اسے چھوڑ

دینا چاہا۔ لیکن چند [illegible] نے [illegible]

کی [illegible] اس کا بھاری بوجھ اپنے اوپر

اٹھا لیا تھا اور اس [illegible] میں پہلا قدم رکھا تھا۔

سب نے اپنی تنخواہیں کم کر دیں۔ جامعہ کے اراکین نے عہد

کیا کہ بیس سال تک ڈیڑھ سو سے زیادہ نہ لیں گے۔

ڈیڑھ سو کیسے اور گھٹا کر سو ہوئے۔ پھر پچاس اس کے

بعد صفر۔

مجیب صاحب نے جب [illegible] کی [illegible] کے

خیال سے [illegible] عبدالحق کے ساتھ مل کر

"روسی ادب" [illegible] میں اس کے [illegible]

سے کام چلا۔ اس کے [illegible]

[illegible] کے مطابق "[illegible]" کتاب [illegible]

گھر سے [illegible] اب اس میں سب [illegible]

کیا کریں۔ مگر [illegible] کچھ کہا نہ جاتا۔ نہ کسی کو [illegible]

[illegible] سا جواب

ملتا۔ مجیب میاں [illegible] آثار [illegible]

[illegible]

سب سے [illegible] تھا کہ [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible] جاتا۔

[illegible]

دروازے پر کپڑے والے کھڑے ہو کر نیچے آتے ان سے پکا
کر لیتے امتحان کے پرچوں سے جو روپیہ ملتے ان سے چیلیں
میں جب گھر جاتے کوئی حیثیت کا کپڑا بنا لیتے مجیب صاحب
کھدر پہنتے تھے گرمیوں میں دیکھ کر وحشت ہوتی۔ اتنے
موٹے کپڑے، کھادی بھنڈار سے جو سب سے مہین سوت
کا کتا ہوا کپڑا ملتا روپے سوا روپے گز ہوتا وہی خرید کر
اس کے کرتے بناتی۔ مکان کا کرایہ ۳۵ روپے کس
طرح ادا ہوتا۔ کئی کئی مہینے چڑھ جاتے تو ان پچاس
روپیوں سے جن کی شکل کبھی دکھائی نہ دیتی۔ جامعہ سے
بہت مشکل سے کئی کئی مہینہ بعد ادا کیا جاتا۔

کبھی سینما جانے کی سوچتے پھر خیال آتا کرتا نگے
کا کرایا وغیرہ لگا کر پانچ روپے صرف ہوں گے۔ اتنے
میں تو ہم گوشت کے دام مہینہ بھر کے چکا دیں گے۔ یہ
سوچ کر چپکے بیٹھ رہتے۔ نہ کوئی تفریح تھی نہ خوشی نہ
اطمینان۔

گھر کی روایت کے مطابق ایک بوا ساتھ کر دی
گئی تھیں۔ پانچ روپے مہینہ پر دیس میں آنے کی وجہ سے
ان کے مقرر ہوئے۔ قرول باغ میں کئی بوڑھیاں کھانا
پکانے کی نوکری ادھر ادھر کرتی پھرتیں۔ ایک مجیدن تھی
کبھی وہ کبھی کوئی دوسری مل جاتی مگر مقصودا بوا کو
ان کا کام پسند نہ آتا۔ ان سے بنتی نہ تھی لڑ بھڑ کر نکال
دیتیں اور سارا کام سر پہ اٹھا لیتیں۔ جھاڑو برتن کرتیں سودا
سلف لاتیں کھانا بھی پکاتیں اور کبھی بازار سے لکڑی لاد
کر خود ہی لاتیں۔ مجھے ان سے بہت سہارا تھا۔ میں اس
قسم کے کاموں کی عادی نہیں تھی نہ کھانا پکانا آتا
سوا خاص خاص چیزوں کے جو اپنے شوق سے پکا
مجیب صاحب کے کھانے کا خاص خیال
لیکن وہ کچھ نہ کہتے اگر دال بھی ہوتی تو خوشی سے کھا۔
صفائی وغیرہ کا انھیں بہت خیال تھا۔ گھر ٹھیک ہو
کرسی ہو۔ کھانے پینے میں یوروپین طریقوں کے
تھے وہ کھانے پر بیٹھتے تو سب سے پہلے انگلی سے
رگڑ کر دیکھتے کہ کہیں اس میں گرد وغبار تو نہیں۔
چھری کانٹے کو صاف کرنے لگتے۔ کھانا چاہے دو
کھالیں لیکن چاہئیں اگر دو ایک منٹ کی دیر ہو
ناگوار خاطر ہوتی پریشان ہو کے ٹہلنے لگتے۔ تنہ ...
ذاکر صاحب کبھی کبھی ان کو "جامعہ کا رئیس اعظم" کہ
مجھے ہنسی بھی آتی اور جی بھی جلتا یہ کیسے رئیس اعظم
بقول مرزا غالب

دل کے خوش کرنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

تھوڑے لوگوں کے پاس گھر تھے زیادہ تر
بورڈنگ میں رہتے تھے۔ اکثر بال بچوں کو اپنے گھر
چھوڑ رہتے۔ مہینوں تنخواہیں نہ ملتیں تکلیفیں اٹھاتے
شکایت کسی کی زبان پر نہیں تھا۔ سب ایک ہی کشتی
سوار معلوم ہوتا طوفان نوح کا مقابلہ کر رہے ہیں
طوفانوں کے تھپیڑے سہہ رہے ہیں۔ چند ماہ گ
بے سہاگ وعدہ بجی تھی ۱۹۳۲ء میں مجیب صاحب
شفیق الرحمن صاحب قدوائی مرحوم گرمیوں
میں بلوچستان چندا مانگنے گئے۔ کوئی دو ڈ

مہینہ بعد واپس آئے مگر ہاتھ کچھ تھوڑا ہی سا آیا۔

چار چار آنے آٹھ آٹھ آنے مہینے کے چھوٹے چھوٹے چندوں سے کام چلایا جاتا کبھی کسی ریاست وغیرہ سے کچھ روپیہ آجاتا تو سب جامعہ کے کاموں میں خوشی سے لگا دیتے تنخواہیں نہ لیتے۔ بیوی بچوں پر جو گذر رہی تھی سو گذر رہی تھی عیش و آرام کجا دنیا کی نعمتیں کیسی معمولی ضرورتیں بھی پوری نہیں ہو سکتی تھیں۔ جیسے سوکھے ساون ویسے ہرے بھادوں۔ کاموں کے بوجھ اور فکروں میں سب سدھ بدھ بھول گئے۔

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے
دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے

اس ناداری کی حالت میں اوکھلے میں سستی زمین مل رہی تھی جامعہ کی عمارتوں کے لیے خرید لی گئی تاکہ جامعہ کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کر سکیں۔

یہ علم و عمل کا چراغ جلا رہے تھے اور چراغ تلے اندھیرا تھا سب کے ذمہ بہت بہت کام تھے سر اٹھانے کی فرصت نہ ملتی کیونکہ کام کرنے والے تھوڑے تھے اور کام زیادہ۔

مجیب صاحب خازن تھے۔ بڑے نازک وقت میں یہ کام پڑا تھا۔ ذاکر صاحب کی علالت اور غیر حاضری کے زمانے میں اکثر شیخ الجامعہ کے فرائض انجام دیتے۔ ان کے کاموں کی کبھی کوئی حد کوئی شمار نہیں تھا وہ پہر کو وہیں سے گھر آکر کھانا کھاتے۔ نہ سونے کا وقت ٹھیک تھا کام ہی ان سب کا مقصد تھا۔ کام ہی اس کا صلہ دیتا

کے کام پیسے سے چلتے ہیں۔ یہاں کا نرالا دستور تھا۔ کام اتنا اچھا ہو کہ پیسہ اس پر نچھاور ہو۔

بیویوں میں بیگم ذاکر حسین ہم سے پہلے آئیں۔ ہمارے مکان سے ذرا دور ان کا مکان تھا۔ پہلی مرتبہ میں ملنے گئی تو شام کا وقت تھا وہ باورچی خانہ میں کھانا پکا رہی تھیں۔ فوراً اٹھ کر آئیں اور بہت اخلاق سے ملیں صحن میں پلنگ بچھے تھے ہم لوگ اس پر بیٹھ گئے۔

بعد میں اختر حسن فاروقی صاحب اپنی بیوی کو لائے اختر صاحب ڈرائنگ کی تعلیم دیتے تھے۔ خاک ار منزل کی بورڈنگ کے کمرے میں دونوں رہتے وہیں گھر گرہستی کا سامان تھا۔ مگر بڑے سلیقے سے رہتے اور اسے آراستہ بھی کرتے تھے۔

بیگم اختر حسن بڑی ہنس مکھ اور خوش مزاج تھیں۔ ان سے میرا بڑا جی بہلتا ہنس بول کر اچھا وقت گذر جاتا شام کو دونوں ساتھ ٹہلنے نکلتے کبھی صبح کو بھی اور جونہی بیوی جامعہ میں آتیں ان سے ملنے پہنچ جاتے۔ اختر حسن صاحب اپنے دوستوں میں کسی کی بیوی کے آنے کی اطلاع پاتے تو فوراً ہم دونوں کو خبر کرتے کہ جائیے وہ آئی ہیں اور ہم اسی دن پہنچ جاتے۔

بیگم سعد صاحب مرحوم سے میں پہلی بار تھوڑے دن مکان ملنے سے پہلے بشیر منزل کے بورڈنگ میں رہی تھیں تب ملی تھی۔ میرے کمرے کے پاس ان کا کمرہ تھا۔ میں گئی تو ان کے کئی چھوٹے چھوٹے بچے تھے۔ کوئی رو رہا تھا کسی کی آنکھیں آگئی تھیں کسی کا پیٹ چل گیا تھا وہ

پڑھائی اور تفریح ہوتی تھیں۔ کچھ دنوں بعد بیگم صالحہ عابد حسین
کی جامعہ برادری میں اضافہ ہوا۔ پھر اور کچھ بیبیاں آ گئیں۔ ہم
سب آپس میں ملتے جلتے اور ایک دوسرے کے دکھ درد میں
شریک رہتے۔ سچ تو یہ ہے جامعہ میں رفاقت، خلوص اور
ہمدردی کا بڑا سہارا تھا۔

ایک گھر بیگم مولانا محمد علیؒ کا تھا۔ وہ ہم سب پر
بہت مہربان تھیں۔ اپنے یہاں بلاتیں، دعوتیں کرتیں۔ ان
کے ساتھ زنانہ کلب کے جلسوں میں شریک ہوتے۔

باہر کی دنیا ہمیں بالکل الگ معلوم ہوتی۔ وہاں
سب کچھ تھا، یہاں کچھ بھی نہیں۔ مگر ہم اُف نہیں کر سکتے تھے۔
ہماری داد فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ پیسے کا نام زبان
پر لانا گناہ قرار دیا گیا تھا۔ جامعہ دین ایمان تھی، جامعہ قبلہ و
کعبہ۔ اس کے لیے جینا و کھپنا معراج تھی۔ ہم اپنے کو اس
فضا میں ڈھالنے کی کوشش کرتے کہ یہی اصل زندگی ہے
مگر کسی نہ کسی طرح چلانا، بچوں کی پرورش، عجیب ہی حالت رہتی۔
۱۹۳۲ء میں لوگوں کے کہنے سننے سے گھر سے باہر کے لیے تیس روپے
بڑھے۔ تو اتنی ہو گئے "امیر مالی، مست فقیر حال مست"۔
۱۹۳۸ء تک بس اسی حال میں گزر بسر ہوئی۔

جامعہ کی ایک اپنی عمارت تعلیمی مرکز تھی۔ اس میں
اکثر جلسے ہوتے۔ لوگ تقریریں کرنے آتے۔ گاندھی جی، پنڈت نہرو،
مسز سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر اقبال وغیرہ۔ باہر کے لوگ بھی
آتے۔ رونق ہی رونق رہتی۔ ادیبہ خالدہ خانم ترکی سے
آئی تھیں۔ انھوں نے ہمیں کچھ [illegible]۔
بہت بانی اسلام النبی کے جلسے ہوتے۔ بڑے

بڑے مشاعرے بہت ہوتے [illegible]
[illegible] کے لیے [illegible]
کے لیے لوگوں کو سبق اور اخلاق کے مسلمانوں کی بات
نصیحت ہوتی۔ مجیب صاحب کے ڈرامے کھیلے جاتے۔
ڈاکٹر عابد حسین کا "پردۂ غفلت"، مولانا کا [illegible]
مدنی علی صاحب کا "شیر پر لڑکا"۔

مس فلپسبورن جرمن خاتون کے انتظام
خواتین کا ایک بڑا جلسہ ہوا۔ بیگم ڈاکٹر انصاری صاحبہ
صدارت کی۔ بیگم آصف علی نے جامعہ کے مقاصد پر [illegible]
کی۔ ہال خواتین سے بھرا تھا۔ جلسے کے بعد بچوں کی
پر ایک فلم دکھائی گئی۔ مس فلپسبورن صاحبہ اپنی
پر بہت خوش تھیں۔ ۱۹۳۵ء میں ریاست حیدرآباد نے ایک
رقم دی تو اوکھلا میں جامعہ کی پہلی عمارت مدرسہ ابتدائی
کا سنگ بنیاد رکھا گیا جو سب سے چھوٹے بچے [illegible]
نے رکھا۔ خالدہ خانم صاحبہ موجود تھیں۔ امیر جامعہ
انصاری صاحب اور بہت لوگ شہر سے آئے۔ اوکھلا جشن
ہوا۔ اس کے بعد چائے پلائی گئی۔ ۱۹۳۶ء میں عمارت
پوری طور پر بنی نہیں تھی کہ مدرسہ ابتدائی وہاں منتقل
اور مدرسہ ثانوی بننے کے بعد چند عمارتیں اور بنیں۔
۱۹۳۸ء میں پوری جامعہ وہاں بس گئی اور اب [illegible]
ہے۔ تھوڑا سا اس زمانہ کا حال بھی [illegible]

پیام تعلیم کا چندہ ہمیشہ پیشگی آنا چاہیے
اس میں آپ کو بہت سی [illegible]

حبیبہ سحر

فرزندانِ جامعہ کے نام



(۱)

اس جامعہ کا ہند میں اک خاص ہے مقام　　تعلیم میں کیا ہے نمونے کا اس نے کام
طالب ہوں علم کے وہ کہ استادِ ذی کرام　　تہذیب ہی سے آدمی ہوتے ہیں نیک نام
آتے ہیں جو یہاں انھیں دیتی ہے یہ پیام
ایسے بنو، بلند ہو انسانیت کا نام

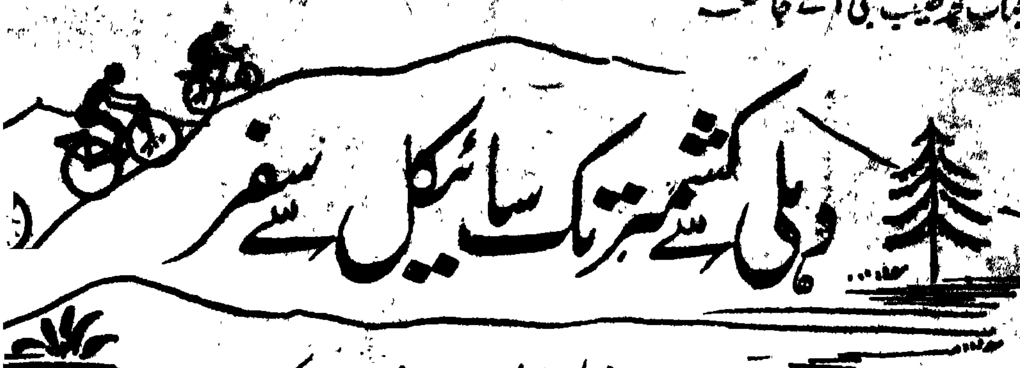
(۲)

جاکر یہاں سے اک نئی دنیا بساؤ گے　　بن کر سفیر اس کے جہاں بھر میں جاؤ گے
انسانیت کا تم ہی نمونہ دکھاؤ گے　　اخلاق سے تم اپنے وہ جادو جگاؤ گے
حیرت سے تم کو دیکھیں گے دنیا کے خاص و عام
اور جامعہ کو مانیں گے تہذیب کا امام

(۳)

قائم کروگے اس کا جہاں میں تم اک وقار　　تاریخ ہے منیر بڑی اس کی شاندار
قوموں میں دوستی کا بڑھاؤ گے اعتبار　　ہے یہ دعا ہماری، کرو اور تابدار
حاصل جو اس کو علم کی دنیا میں ہے مقام
رکھنا ہے سربلند تمھیں بھی اسی کا نام

جناب محمد طیب بی اے جامعہ



دہلی سے کشمیر تک سائیکل سے سفر

برادرم طیب صاحب نے یہ دلچسپ مضمون ہماری درخواست پر لکھا ہے۔ باوجود غیر معمولی مصروفیت اور بیماری کے لکھا ہے۔ لیکن بہت مختصر ہے۔ اس سفر میں اور بھی بہت سے واقعات پیش آئے لیکن طیب صاحب کو یاد نہیں رہے۔

اس سفر کا اہتمام برادرم محترم محمد حفیظ الدین کے ہاتھ میں تھا۔ انھوں نے بتایا کہ کشمیر سے واپسی پر سبزی منڈی کے قریب ان مہم بازوں کا بہت شاندار استقبال ہوا تھا۔ ڈاکٹر سعید مرحوم کی نظم اسی موقع پر پڑھی گئی تھی۔

دوسری دلچسپ بات یہ بتائی کہ مضمون نگار صاحب نے سفر سے چند ہی دن پہلے سائیکل پر چڑھنے کی مشق شروع کی تھی۔

ایڈیٹر

لگ بھگ چالیس سال پہلے کی بات ہے، جامعہ کو قرول باغ آئے ہوئے کوئی چار سال ہوئے ہوں گے جامعہ کے چند طالب علموں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ سائیکلوں سے کہیں دور کا سفر کیا جائے۔ یہ خیال کس وجہ سے پیدا ہوا یہ بات اب یاد نہیں ہے لیکن عالم یہ تھا کہ نہ تو سفر کا سامان مہیا تھا، نہ سفر کرنے کے سلسلے میں معلومات تھیں نہ سفر کا کوئی تجربہ تھا۔

ہمارے اس خیال کی اطلاع جناب حامد علی خاں صاحب مرحوم (سابق — منیجر مکتبہ) کو ہوئی تو بہت خوش ہوئے۔ وہ اس قسم کے کاموں کے بہت شوقین تھے۔ انھوں نے روز ہمارے پاس آنا شروع کیا۔ سفر کی اونچ نیچ سمجھائی اور اس پر آمادہ کیا کہ کشمیر چلنا چاہیے۔

حکومت کے دفتروں سے بڑی جدوجہد راستوں کے وہ نقشے حاصل کیے گئے جو دفتر کے علاوہ اور کسی کو نہیں دیے جاتے۔ منصوبے پروگرام تیار ہوئے، غرض ہم لوگوں کے دل میں بیٹھ گئی کہ یہ سفر کرنا ہے۔

شروع میں تو کوئی بیس طالب علم لیے آمادہ تھے۔ لیکن آخر میں صرف تین رہ

ایک مسعود اختر، جو اب جامعہ تعلیمی کراچی میں ہیڈ ماسٹر ہیں، دوسرے محمد اقبال (ڈاکٹر محمد عالم صاحب دلاہور کے صاحب زادے معلوم نہیں آج کل کہاں ہیں) اور تیسرے ہیں۔ سالار قافلہ جناب حامد علی خاں صاحب تھے جو اب اس دنیا میں نہیں ہیں اور دراصل ان ہی کا یہ کارنامہ ہے۔

تقریباً آٹھ سو میل کا سفر تھا۔ ایسے لمبے سفر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ آدمی کو مشکلات میں ثابت قدم رہنے کا سبق ملتا ہے۔ جو ذرائع میسر آتے ہیں ان سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور آپس میں کوئی اختلاف پیدا ہو جائے تو اسے اچھے انداز میں برداشت کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ اگر ان میں سے ایک بات پر بھی عمل نہ کیا جائے تو منزل پکڑنی دوبھر ہو جاتی ہے۔

اپنے اپنے گھروں سے اجازت منگائی گئی، تیاری شروع ہوئی اور سامان فراہم کیا گیا۔

تین قمیصیں، تین نیکر، ایک وردی، ایک چادر، تین دستی رومال، ایک ہیٹ، دو موزے، ایک کپڑے کا جوتا، ایک تولیہ، ایک پلیٹ، ایک درمیانی سائز کا تھرماس، ایک چاقو، ایک ٹارچ، ایک سیٹی اور ایک بانس کی لاٹھی۔ یہ سامان ہر ایک کے لیے الگ الگ ضروری تھا۔ ایک اسٹو، ایک پتیلی، صابن اور سائیکل کی مرمت کا کچھ سامان مشترک تھا اور تھوڑا تھوڑا ہر ایک کے حصے میں لگا دیا گیا تھا۔ یوں اندازاً ہر ایک کا سامان الگ الگ پانچ کلو ہو گا۔ سری نگر کے لیے گرم کپڑے پارسل سے بھیج دیئے گئے تھے۔

گرمیوں کی تعطیل شروع ہونے کے بعد ہم لوگ روانہ ہوئے۔ جامعہ کی چھوٹی سی برادری نے جس میں جناب قبلہ ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم بھی شامل تھے، البشیر منزل (جامعہ کا ہوسٹل) کے گیٹ پر تالیوں کی گونج میں ہمیں خدا حافظ کہا۔ ہندوستان ٹائمز اخبار کا نمائندہ اور ان کا فوٹوگرافر بھی موجود تھا۔

ہم سیالکوٹ اور جموں کے راستے سے سری نگر گئے تھے۔ جموں سے سری نگر تک کا یہ راستہ بہت دشوار گذار ہے لیکن بہت خوبصورت بھی ہے۔ اس لیے ہم نے یہ طے کیا تھا کہ جموں کی طرف سے جائیں گے اور راولپنڈی کی طرف سے واپس آئیں گے۔ سری نگر ہم اٹھارہ دن میں پہنچے تھے اور راولپنڈی کی طرف سے بارہ دن میں واپسی ہوئی تھی۔

ہم بہت آہستہ آہستہ چلتے تھے، ایک گھنٹے میں تقریباً آٹھ میل، صبح ۴ بجے سفر شروع کرتے تھے اور آٹھ نو بجے تک پچیس تیس میل طے کر لیتے تھے ہر ایک گھنٹے کے بعد دس پندرہ منٹ کے لیے کسی درخت کے سایہ میں آرام بھی کر لیتے تھے۔

ہمیں زیادہ تر مخالف ہوا کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا کسی دن ہوا کی مخالفت کم ہوتی تھی تو کچھ زیادہ

ہم لوگ کر لیتے تھے۔ ۱ بجے سے ۳/۴ بجے
سہ پہر تک آرام اور ۳/۴ بجے سے ۷ بجے شام تک
پھر بیس پچیس میل کا سفر۔ اس طرح تقریباً پچاس
میل اور کبھی کبھی ساٹھ میل طے ہو جاتے تھے۔ جہلم
سے سری نگر تک پہاڑ پر چڑھنا تھا۔ اس علاقے
میں ایسا بھی ہوا کہ دن بھر میں صرف پانچ چھ میل طے
ہوئے اور زیادہ تر سائیکلوں کو دھکیلتے ہوئے پیدل
چلنا پڑا لیکن اگر راستہ ڈھلوان ملا تو بغیر پیڈل
چلائے موٹر سائیکل کی طرح بہت سے میل طے ہو گئے
اور اوسط پورا ہو گیا۔ دھیرے دھیرے چلنے اور ۱ بجے
سے ۴ بجے تک آرام کرنے سے تھکن بھی کم ہوتی تھی اور
سفر بھی بہت سا ہو جاتا تھا۔

سفر بہت طویل تھا، اس سفر میں ہم عجیب و
غریب واقعات سے دوچار ہوئے لیکن اس وقت
میں آپ کو صرف دو واقعے سناؤں گا۔ ایک وہ
جو شروع میں پیش آیا اور دوسرا وہ جو واپسی میں
ہوا۔ مئی کا مہینہ تھا اور سفر کا پہلا دن تھا کہ ہم سونی پت
پہنچے۔

راستے میں جہاں جہاں پڑاؤ کرنا تھا وہاں
کے ایسے لوگوں کے پتے حاصل کر لیے گئے تھے جو جامعہ
سے واقف تھے لیکن کرنال کے کسی صاحب کا پتہ
نہ مل سکا تھا۔ سونی پت میں ایک صاحب نے کہا
کہ میرے بھانجے گورنمنٹ اسکول کرنال میں ڈرائنگ
ماسٹر ہیں، ان کے یہاں چلے جائیے اور میرا نام
بتا دیجئے آپ کے ٹھہرنے کا [illegible]
ان ڈرائنگ ماسٹر صاحب کا [illegible]
[illegible] بھی کیا تھا۔ اتفاق کی بات کہ [illegible]
لیکن ہم نے کرنال پہنچ کر پوچھنا شروع کیا کہ
اسکول کے ڈرائنگ ماسٹر صاحب کہاں رہتے ہیں
پوچھتے پوچھتے اور مختلف راستوں پر گھومتے
بالآخر ان کے یہاں پہنچ گئے۔ وہ ایک [illegible]
چھوٹے سے مکان میں رہتے تھے۔ وہ ایسی وضع
کے تھے جیسے مدرسہ ثانوی میں حافظ محمد اسحاق [illegible]
خیاطی کے استاد تھے۔ بھولی سی صورت۔
پر سجدہ کا نشان، صرف ٹھوڑی پر کچھ بال [illegible]
سے رنگے ہوئے تھے، سر پر سفید عمامہ اور
اونچا مخملی پاجامہ۔ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ڈرائنگ
صاحب اور یہ وضع!

خیر ہم نے کہا کہ سونی پت میں آپ کے
صاحب ملے تھے۔ انھوں نے آپ کا پتہ بتایا۔
بہت خوش ہوئے اور ہمارے قیام کے انتظام
میں مصروف ہو گئے۔

ان کے مکان کے برابر [illegible]
کھلا میدان تھا جس میں کسی اور شخص کی [illegible]
ٹال تھی۔ اس کا ایک حصہ انھوں نے صاف کر کے
چھڑکاؤ کر کے پلنگ بچھا دیے۔

مغرب کے بعد کھانا [illegible]
آپ کس وقت روانہ ہوں گے [illegible]

۴ بجے سفر شروع کر دیں گے تاکہ لو چلنے سے پہلے پہلے ۲۵، ۳۰ میل طے کر لیں۔

کہنے لگے: "میرا انتظار کیجیے گا۔ میں رخصت کرنے آؤں گا۔"

ہم نے کہا بھی کہ آپ یہ زحمت نہ کریں۔ لیکن وہ نہ مانے اور صبح ہمارے اٹھنے سے پہلے ہی آ گئے۔ ہم نے جلدی جلدی تیاری کی اور جب چلنے لگے تو انھوں نے ایک بڑی سی گرم گرم پتیلیا ہمارے حوالہ کی اور کہا: "یہ ناشتہ ہے راستہ میں کام آئے گا۔ ایک بات اور کہنی چاہتا ہوں، آپ کو جن صاحب کا پتہ بتایا گیا تھا وہ میں نہیں ہوں۔ لیکن اس خیال سے کہ آپ کہیں لوٹ نہ جائیں میں نے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ یہ تو بڑی سعادت کی بات ہوتی ہے کہ کوئی کسی کے یہاں مہمان آئے اور اسے مہمان نوازی کا موقع ملے۔"

ان کے یہ الفاظ آج تک میرے کانوں میں گونج رہے ہیں اور صورت بھی اس طرح یاد ہے جیسے انھیں پرسوں دیکھا ہو۔

اب دوسرا واقعہ بھی سن لیجیے۔ یہ میں آپ کو پہلے بتا چکا ہوں کہ ہماری واپسی راولپنڈی کے راستہ سے ہوئی تھی۔ راولپنڈی پہنچنے کے لیے ہم کوہ مری سے میدان کی طرف آ رہے تھے یہ راستہ بہت تیز ڈھلان کا ہے۔ سائیکلیں موٹر سائیکل کی طرح چل رہی تھیں اور ہمارا کام صرف اتنا تھا کہ ہم بریک سنبھالے رہیں۔ ڈھلان ختم ہونے کے بعد ابھی تھوڑی ہی دور گئے تھے کہ ایک چڑھائی پھر آ گئی۔ اب ہمیں اپنی محنت سے آگے بڑھنا تھا۔ سبینہ ہنڈل تک پہنچ گیا اور میں پوری طاقت سے پیڈل گھماتے رہے تھے ہم سڑک کے بائیں کنارے تھے اور اسی طرف بہت گہرا کھڈ تھا۔ سائیکل کے ہنڈل پر پلاسٹک کا جو کور ہوتا ہے وہ میری سائیکل کے بائیں طرف کا شاید ڈھیلا ہو گیا تھا۔ اس وقت زور لگانے میں وہ پھسل کر باہر آ گیا اور بایاں ہاتھ ہنڈل سے الگ ہو گیا۔ بس پھر کیا تھا داہنے ہاتھ کے زور سے سائیکل ایک دم بائیں طرف کو مڑ گئی اور کھڈ کی طرف روانہ! کھڈ کے اندر میں آگے آگے اور سائیکل پیچھے پیچھے۔

کھڈ کے ڈراونے منظر اور اس لڑھکنے کے باوجود میرے حواس درست تھے۔ اچانک مجھے ایک پتھر نظر آیا جو میرے لڑھکنے کی سیدھ میں مجھ سے ذرا آگے خوب باہر کو نکلا ہوا تھا اور کچھ ہموار سا بھی تھا۔ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تو اس کا کنارہ میرے ہاتھ میں آ گیا اور میں اس پر رک گیا۔ برابر سے سائیکل لڑھکتی جا رہی تھی، غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ اس کی طرف گیا پہیئے کی ایک تیلی میرے ہاتھ میں آئی اور سائیکل بھی ایک جگہ ٹھہر گئی۔

کچھ دیر کے بعد میں نے دیکھا کہ مسعود اختر اور محمد اقبال ایک لمبے راستہ سے میری طرف آنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میرے پاس پہنچ کر انھوں نے

پوچھا! کیا حال ہے؟ یہ الفاظ میں نے سنے اور ان
کی طرف دیکھا بھی لیکن کوشش کے باوجود میں جواب
نہیں دے سکا۔

اب انھوں نے اپنے سہارے سے مجھے کھڑا
کیا، اور حامد صاحب کی ہدایت کے مطابق مجھ سے پیشاب
کرنے کی فرمائش کی۔ میں نیکر کے بٹن کھولے بغیر زمین
پر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر بٹن کھولنے کے فرائض بھی مسعود اختر
ہی نے انجام دیے۔ بہت دیر تک بیٹھے رہنے کے بعد
مجھے بہت ذرا سا پیشاب ہوا لیکن اب اتنے حواس
ہوگئے تھے کہ میں ان کے سہارے دھیرے دھیرے
چل سکتا تھا۔

محمد اقبال میری سائیکل اٹھا کر روانہ ہوئے
اور میں اور مسعود اختر ان کے پیچھے پیچھے اوپر چڑھنے
کی کوشش کر رہے تھے۔

سڑک پر ہم پہنچے تو حامد صاحب نے میرا
معائنہ کیا اور اندازہ کیا کہ کوئی قابل ذکر چوٹ نہیں
آئی ہے۔ چنانچہ اب ہم آہستہ آہستہ پیدل چل پڑے
اور مسعود اختر نے اپنی اور میری سائیکل سنبھال لی۔

کچھ دور چلے تھے کہ سڑک کے کنارے دودھ
والے کی ایک دوکان نظر آئی، وہاں گرم گرم دودھ پیا
اور اب میں اس قابل تھا کہ پھر سائیکل پر بیٹھ جاؤں۔
سفر پھر شروع ہوگیا، اب منزل بھی قریب ہی آگئی تھی۔

ڈاکٹر سعید احمد صاحب بریلوی نے ایک
منظوم مبارک باد لکھی تھی، جو ہمارے استقبالیہ جلسہ
میں پڑھی گئی تھی۔ اس مبارک باد میں اس واقعہ
کے متعلق یہ شعر تھا۔

گر پڑے سجدہ میں اہل جامعہ نے جب سنا
غار میں گر کر سلامت بچ گئے طیب میاں

نیشنل بک ٹرسٹ کا تازہ کارنامہ

یہ اردو میں باپو یعنی مہاتما گاندھی کی ایک
طرح سے مکمل کہانی ہے بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ فا
مصنف نے بڑی خوبی سے باپو کے زندگی کے حالات
بہت ہی پُراثر اور دل چسپ انداز میں لکھنے کی کوشش
نیشنل بک ٹرسٹ نے کتاب اپنے معیار کے م
غیر معمولی توجہ سے شائع کی ہے۔ بہترین لکھائی آفسیٹ
چھپائی۔ ہر صفحہ پر کئی کئی رنگوں کی تصویریں ٹائٹل
صفحہ پر باپو کی تصویریں کئی کئی رنگوں میں۔
کتاب دو حصوں میں ہے۔ دونوں حصے چونسٹھ
چونسٹھ صفحوں کے ہیں۔ دوسرا حصہ بھی اسی اہتمام
ہے۔ ٹائیٹل دونوں کے الگ الگ ہیں۔ قیمت ہر حصے
ڈیڑھ روپیہ ہے۔ شان دار گٹ اپ کو دیکھتے ہوئے کچھ

اسی ادارے کی بچوں کی یہ کتابیں بھی بہت جلد چھپ
کشمیر، پرندوں کی دنیا، ہماری ندیوں کی کہا
کی چوٹیوں پر، جنت کی سیر، اور دوسری کہانیاں
کہانیاں، ہماری ریلیں، ہندوستان میں غیر ملکی س
ہر کتاب کی قیمت ایک روپیہ پچاس پیسے
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

جناب عادل جعفری



یہ آرزو ہے بڑے ہو کے جامعہ میں پڑھیں

جگہ ہے ایک نئی دہلی میں بہت مشہور
سُنا تو ہوگا کبھی نام او کھلے کا ضرور
وہی جہاں ہے، خدا رکھے، جامعہ سُنیے
پڑے کبھی نہ کوئی اُس پہ سانحہ، سُنیے
یہ بات اپنی جگہ سچ ہے یہ وہیں پر تھی
یہ ابتدا میں علی گڑھ کی سرزمین پر تھی
خیال ذہن میں گاندھی کے پہلے آیا تھا
اِسے محمدؐ علی نے وہیں بسایا تھا
جہاں یہ آج ہے آباد شان و شوکت سے
قرول باغ میں تھی اس سے پہلے عزت سے
بڑے ذہین، بہت نیک دل کے بچّے نے
رکھی تھی اس کی بنا ایک ننھے بچّے نے
نکھر سنور گئی محمودؒ کی دعاؤں سے
بچی رہی یہ سبھی طرح کی بلاؤں سے

اِسے توانا کیا کیسے کیسے کس بل نے
جمال سیٹھ نے مختار اور اجمل نے
تمام عمر جو اس جامعہ کے کام آئے
زباں پہ بارے خدایا اب ان کے نام آئے
اِسے سنوارا بنایا بڑے جیالوں نے
مجیب و عابد و ذاکر سے باکمالوں نے
جدھر ہو منزلِ مقصود ہم اُدھر کو بڑھیں
یہ آرزو ہے بڑے ہو کے جامعہ میں پڑھیں
خدا پرست بنیں، قوم کا خیال کریں
وطن سے پیار کریں اور بے مثال کریں
جو خاص طور سے سیکھیں یہاں، وہ عام کریں
جہاں بھی جائیں وہاں جامعہ کا نام کریں

ابو سعید کے قلم سے

جامعہ کی کہانی
ایک طالب علم کی زبانی

میں جامعہ میں جب آیا اس وقت میری عمر کوئی ۱۲/ ۱۳/ ۱۴ سال رہی ہوگی۔ شروع میں۔ میں اکیلا ہی اسکول کا طالب علم تھا۔ اس لیے کہ علی گڈھ کالج سے جتنے طلبا چھوڑ کر آئے وہ سب کے سب کالج یا یونیورسٹی کے تھے۔
مجھے وہ شروع کا زمانہ اچھی طرح یاد ہے جب کہ مولانا محمد علی اپنے ساتھیوں کو لے کر اولڈ بوائز لاج سے نکالے گئے۔ وہ بھی کس شان سے نکالا جاتا تھا! معلوم ہوتا تھا کہ ایک اقلیم کی فتح کے لیے جا رہے ہیں۔ یہ بے سروسامان قافلہ علی گڈھ کالج سے نکل کر منٹو سرکل کے ایک کھلے میدان میں جا بسا، جہاں صرف 'کرشنا آشرم' کے نام سے کسی ہندو کی ایک کوٹھی تھی۔ اور اس نے بغیر حکومت کے خوف وخطر کے ان مجاہدین کو قیام کے لیے دیدی۔ مگر وہ کافی نہ تھی۔ مجبوراً اس کے اردگرد خیمے ڈالے گئے۔ جو یہاں سے تو نہ مل سکتے تھے، میرٹھ سے کرائے پر آئے۔ پھر کیا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے ایک بستی بس گئی!
شروع شروع میں تو زیادہ تر علی گڈھ کالج کے نکلے ہوئے طلبا تھے۔ لیکن اس کے ساتھ اسلامیہ کالج پشاور اور اسلامیہ کالج لاہور کے طلبا بھی آکر شریک

ابتدا میں کوئی باقاعدہ تعلیم نہ ہوتی تھ
صرف مولانا محمد علی کے لکچر ہوتے تھے جو زیادہ تر ڈاکٹر اقبال کی مثنوی 'اسرار خودی' پر مبنی ہوتے تھے۔ کبھی کبھی مولانا محمد علی خود بھی رونے لگتے اور طلبا کو بھی رلا دیتے تھے۔ ان ان لکچروں کے علاوہ باہر سے مولانا حمید الدین فراہی ا دار المصنفین اعظم گڈھ سے مولانا سعید انصاری صاح قرآن اور تاریخ اسلام پر لکچر دینے کے لیے بلائے جاتے۔ میں بھی ان لکچروں میں شریک ہوتا۔ اگرچہ میری سمجھ میں بہت کچھ نہ آتا لیکن ان استادوں کے خلوص اور طلبا جوش کا مجھ پر بھی اثر ہوتا۔
اس وقت دینی جذبہ اس قدر غالب تھا کہ
جامعہ کے ایک لائق اور فاضل استاد کے ایک واق کبھی نہیں بھولتا۔ ہم جب علی گڈھ سے آئے تو ایک دینی گہرے جذبے کے ساتھ آئے اور ہماری صورت و میں بڑی تبدیلی ہوگئی لیکن ایک دن میں تو ساری کا پلٹ جاتی! ہم میں اکثروں کے سر پر انگریزی بال یہ کوئی بڑا گناہ بھی نہ تھا لیکن مولانا محمد سورتی صاح جو بڑے کٹر اہل حدیث تھے، انھیں یہ بھی گوارا نہ تھ

صبح جب آنکھ کھلی تو طلبار کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔
اور انھوں نے مولانا محمد علی سے اس کی شکایت کی۔ مولانا
محمد علی اگرچہ مولانا سورتی کا بڑا احترام کرتے تھے لیکن بولے
کہ مولانا! مَن تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ بس یہی ایک سر کے بال رہ گئے
تھے!

انھی مولانا کا ایک اور واقعہ بھی یاد آتا ہے۔
ایک بار ہم سب لوگ شہر سے کتابیں خریدنے گئے۔ ایک
بڑی ڈاڑھی والے کتابوں کے دکاندار تھے' جہاں ہر قسم
کی کتابیں مل سکتی تھیں۔ سب لوگ تو اندر اپنے اپنے مذاق
کی کتابیں دیکھنے میں لگے ہوئے تھے لیکن مولانا سورتی ایک
قینچی ہاتھ میں لیے کتابوں میں سے تصویریں کاٹ رہے
تھے۔ اس دکاندار نے جو یہ دیکھا تو چیخ کر بولا کہ "ہائے
مولانا! یہ کیا کر رہے ہیں؟" بولے "تصویریں رکھنا حرام ہے"!
اس نے کہا "مولانا! حرام و حلال کا مسئلہ کہیں اور حل کیجیے۔
میری دکان تو تباہ نہ کیجیے"!

ان واقعات کے ذکر سے میرا منشا یہ تھا کہ جامعہ
کی ابتدائی زندگی میں مذہب کا کتنا گہرا اثر تھا لیکن
دوسری طرف لوگوں میں صبر اور رواداری بھی اسی درجہ تھی
جتنی ان مذہبی لوگوں میں مذہبی شدت اور غلو تھا۔ اس کا
نتیجہ یہ تھا کہ ان علی گڈھ کے نیچریوں اور سیدیوں پر کچھ تو
سچا مذہبی رنگ چڑھا اور کچھ ان کٹر اور مذہبی علمار پر
زمانہ کی تجدد پسندی کا اثر پڑا۔ یہی مولانا سورتی جب
ایک بار یہی حماسہ (عربی کلام کا مجموعہ) پڑھا رہے تھے
[illegible]

تصویر بھی ہوتی تو کیا اچھا تھا!"

جوں جوں جامعہ آگے بڑھی' کالج سے ہائی اسکول
اور ہائی اسکول سے پرائمری جماعتوں کا اضافہ ہوتا گیا۔
ابتدا میں سب ایک ساتھ مل جل کر رہتے تھے۔ کوئی چھوٹے
بڑے کی تمیز نہ تھی۔ اس کا مجھ پر بہت اثر پڑا۔ میں بہت
سی باتیں شاید یوں نہ کرتا۔ لیکن اپنے سے بڑوں کو دیکھ کر
میں نے بہت کچھ سیکھا۔ اور اسی طرح بڑے طلبار بھی ہماری
وجہ سے بعض باتیں کرنی چاہتے لیکن نہ کر سکتے تھے۔
پھر جامعہ کی تعلیمی زندگی میں ہم لوگ ایک قلمی پرچہ نکالتے
تھے جس کا پہلے نام تو "الرشید" تھا۔ شاید رشید احمد صدیقی
کے نام پر رکھا گیا ہو۔ جو پہلے بہت آیا جایا کرتے تھے۔
لیکن بعد میں اس کا نام 'جوہر' رکھا گیا جو مولانا محمد علی کا
تخلص تھا۔ سچ پوچھیے تو علی گڈھ کے تمام زمانہ قیام میں
مولانا محمد علی جامعہ کی روح رواں تھے۔ لیکن اب نہ
جانے کیوں لوگ ان کے نام سے بھاگتے ہیں! اور ان کو
اور ان کے زمانے کو بھلا دینا چاہتے ہیں!

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ اس پرچہ کا نام
نہ صرف مولانا محمد علی کے تخلص پر رکھا گیا تھا۔ بلکہ اس کا
نصب العین بھی مولانا کے ایک شعر سے واضح کیا گیا تھا۔

نقدِ جاں نذر کرو سوچتے کیا ہو جوہر
کام کرنے کا یہی ہے تمھیں کرنا ہے یہی

اور یہ حقیقت میں شعر و شاعری کی بات نہیں ہے بلکہ ہماری
تمام زندگی اسی جذبہ اور اسی اثر میں ڈوبی ہوئی تھی۔
[illegible]

طلبا نے فیصلہ کیا کہ ہفتہ میں جو "ڈرائی" (خاص کھانا) ملا کرتی ہے، وہ بند کر کے اس رقم کو ان مظلومین کی امداد کے لیے بھیج دیا جائے۔ یوں تو یہ ایک معمولی فیصلہ تھا۔ نہ یہ رقم کچھ بہت بنتی اور نہ مظلومین کا اس سے کچھ بھلا ہوتا۔ لیکن اس سے ان کے جذبۂ ایثار اور قربانی کا پتہ چلتا ہے۔

لیکن اس سے زیادہ قابل ذکر جو بات ہے وہ یہ کہ جب اس وقت کے شیخ الجامعہ نے یہ بات سنی تو دوڑ کر آئے اور ایک جلسہ کر کے آنکھوں میں آنسو بھرے بولے "یہ نہیں ہو سکتا کہ ہفتہ میں ایک وقت طلبا کو جو صرف منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے کوئی معمولی سی چیز کھانے میں مل جاتی ہے، وہ بھی بند کر دی جائے۔ میں اس کے بقدر رقم اپنی جیب سے دیتا ہوں، لیکن 'ڈرائی' جاری رہے گی۔"

ع یہ قصہ جب کا ہے جب آتش جواں تھا

تو اس قلمی پرچے کی بات ہو رہی تھی۔ تھا تو وہ ایک ہزد ورقی پرچہ، لیکن طلبا کی زندگی کا مکمل ترجمان تھا۔ اور اپنی بے لوث ترجمانی اور خلوص و ذہانت کی وجہ سے جامعہ کے ارباب حکومت پر اس کا بہت اثر تھا۔ ایک بار طلبا کی ایک معمولی سی شکایت پر جو مجھے اس وقت صحیح یاد نہیں آ رہی ہے، اس نے ارباب جامعہ کو توجہ دلائی۔ پرچہ اپنے وقت پر نکلا، کتب خانہ میں رکھا گیا اور فوراً اس کا چرچا ہوا۔ دفتر کے کارکنوں کو ہدایت ہوئی کہ فوراً اس کا ازا لہ کیا جائے اور شام تک وہ شکایت رفع ہو گئی!

کاش ان اچھی روایتوں کو ہم اپنے سینے سے لگائے

قلمی پرچہ جوہر کی طرح ہماری ایک انجم
بھی تھی جس میں بڑے معرکے کے مباحثے اور جلسے ہو
ایک مرتبہ ایک مباحثہ ہوا جس کا عنوان تھا "جا
چلانے والے طلبا ہیں اور صرف طلبا" اس
گرما گرم بحث ہوئی۔ استادوں نے بھی مخالفت
کارکنوں نے بھی، لیکن مباحثہ کا اصل منشا یہ
استاتذہ میں جامعہ کے طلبا آجائیں اور کارکنوں
میں بھی وہ شامل ہو جائیں تو پھر جو پالیسی او
طے پائے، اس میں جامعہ ہی کی چھاپ ہو گی۔

لیکن 'انجمن اتحاد' کے ایک اور جلس
کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ایک بار مولانا محمد
چھوٹ کر جامعہ آئے شفیق الرحمٰن قدوائی صا
کے نائب صدر تھے۔ مولانا کی خدمت میں ایک
پیش کیا گیا جس میں ان کی قربانیوں اور سیاسی خد
بہت سراہا گیا، اور دبی زبان سے کہیں یہ بھی کہہ د
جامعہ کی طرف بھی مزید توجہ دینے کی ضرورت ہے،
جامعہ کا کام ابھی بہت کچھ کرنے کو باقی ہے اور اس
یہ مصرع بھی لکھ دیا گیا تھا۔ ع

وہ جو ہم رکھتے تھے اک حسرت تعمیر سو ہے

بس کیا تھا۔ مولانا محمد علی چڑھ بیٹھے "ہم نے تعمیر
کیا تھا جس کی حسرت باقی ہو، ہم تو فتح مکہ چاہتے
پر اگر سیاسی طاقت سے نہ کر سکے تو اخلاقی قوت سے
اس سے کم سے کم مولانا محمد علی کا جامعہ
[illegible]

جناب رشید الوحیدی ام۔اے

نئے آنے والوں سے

جامعہ کے ابتدائی اور ثانوی مدرسوں میں سال کے شروع میں نئے آنے والے طالب علموں کا خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ انھیں خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ مدرسہ ابتدائی میں ہمیشہ کی طرح اس سال بھی ۱۵ ستمبر کو یہ تقریب بہت اہتمام سے منائی گئی۔ محترم شیخ الجامعہ (وائس چانسلر) پروفیسر محمد مجیب صاحب جلسے کے صدر تھے۔ بچوں کی حکومت کے عہدے داروں نے تقریریں کیں محترم شیخ الجامعہ نے آخر میں نئے آنے والوں کو اور دوسرے بچوں کو بہت اچھی اچھی نصیحتیں کیں۔ جلسے میں مزے دار قوالی بھی ہوئی۔ دو نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ ان میں سے ایک نظم آپ بھی پڑھیے۔ یہ جناب رشید الوحیدی صاحب ام۔ اے۔ نے لکھی ہے۔ مدرسۂ ابتدائی کی ایک بچی نے اسے بہت اچھے انداز میں پڑھا تھا۔ دوسری نظم سید منیر الحسن صاحب کی ہے یہ بھی بہت اچھی ہے کسی اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔

ایڈیٹر

ساتھیو آنا مبارک جامعہ میں آپ کا — فخر سے اونچا رہے سر آپ کے ماں باپ کا

جامعہ کیا ہے بڑی دلچسپ ہے یہ داستان — خود ہی پڑھ لینا بڑے ہو کر یہاں فرصت کہاں

ہے وطن اصلی علی گڑھ اب ہے دہلی میں قیام — ہے ترقی پر خدا کے فضل سے اب صبح و شام

اک ہمارے رہنما تھے ڈاکٹر ذاکر حسین — کیسے بتلاؤں کہ کیا تھے ڈاکٹر ذاکر حسین

جامعہ کے واسطے کتنی اٹھائیں مشکلیں — سن کے حیرت ہوگی یہ قصہ کسی سے گر سنیں

یوں سمجھ لو جامعہ کے واسطے زندہ رہے
زندگی بھر جامعہ کو روشنی دیتے رہے

ساتھیو جب جامعہ کا آسرا جاتا رہا
جامعہ یوں رہ گئی طوفان میں جیسے دیا

کردیا سامان قدرت نے حفاظت کا عجیب
ڈاکٹر صاحب کے اک ساتھی پروفیسر مجیب

آکے میداں میں اٹھایا بوجھ سارا آپ نے
جامعہ کو دے دیا بڑھ کر سہارا آپ نے

جامعہ کا بوجھ شیخ الجامعہ پر آ پڑا
کام تھا گرچہ بڑا لیکن سہارا مل گیا

آپ کی محنت سے بگڑے کام پھر بننے لگے
پھر بہار آئی چمن میں پھول پھر کھلنے لگے

ہر طرف اک زندگی کی روشنی آئی نظر
غم سے مرجھائے ہوئے چہروں پہ ہے بادِ سحر

کس قدر شفقت محبت ہم سے فرماتے ہیں آپ
جب کبھی ہم تکلیف دیتے ہیں چلے آتے ہیں آپ

ہم ابھی چھوٹے ہیں پر اللہ کا احسان ہے
ہر ترقی کا ہمارے واسطے سامان ہے

اب میں اپنے ساتھیوں سے ہو رہا ہوں ہم کلام
جو ابھی آئے ہیں جن کا چند دن سے ہے قیام

آپ ابھی آئے ہیں گھبرائیں گے کچھ دن دوستو
آپ کو ماں باپ یاد آئیں گے کچھ دن دوستو

پر یہاں کی زندگی میں جلد کھو جائیں گے آپ
جامعہ سے جلد ہی مانوس ہو جائیں گے آپ

باپ ماں سے بڑھ کے ہیں استاد کی یاں شفقتیں
علم کا چرچا ہے ہر سو دوستوں کی رونقیں

صاف ستھری بورڈنگ ہے کھیل کا میدان ہے
"دل کے بہلانے کو غالب" ہر طرف سامان ہے

وقت پر کھانا، پڑھائی، کھیل، سونا، جاگنا
جس طرف چاہا، اچھلنا، کودنا اور بھاگنا

سچ بتاؤ دوستو یہ سب مزے گھر پر کہاں
گھر پہ ہر دم کام کرنا اور سننا گھرکیاں

ہم یہاں پڑھ لکھ کے جب اپنے وطن کو جائیں گے
باپ ماں خوش ہوں گے اور احباب ملنے آئیں گے

ملک کی خدمت کریں گے جاں ہتھیلی پر لیے
ہم وطن کے واسطے ہوں گے وطن اپنے لیے

مولانا مسعود احمد سید بہاری

چند پرانی یادیں

حسین صاحب، آپ لکھتے ہیں کہ میں جامعہ کی پرانی یادیں کھنگالوں، کن یادوں کو جن میں حیرت بھی ہے، مسرت بھی ہے، تاریخ بھی ہے۔ عبرت و موعظت بھی ہے۔

اے مصحفی میں روؤں کیا اگلی صحبتوں کو
بن بن کے میل ایسے لاکھوں بگڑ گئے ہیں

شفیق الرحمٰن قدوائی جیسے مخلص کہاں ہیں۔ خدا انھیں بہشت بریں میں مقام اعلیٰ نصیب فرمائے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کہاں ہیں۔ جنھوں نے دنیا کو بھی سنبھالا اور دین کو بھی آراستہ کیا۔ ان جیسا فنکار کہاں سے آئے گا۔ خدا انھیں مقامات بلند تک پہنچائے اور اپنی رحمتیں نازل کرے پھر حامد صاحب جیسے کارکن جنھوں نے مکتبہ کو مکتبہ بنایا۔ کسے یاد کریں اور کس کی باتیں کریں۔ اسی دور کی ایک کہانی ہے۔ جسے لکھ رہا ہوں، جی چاہے تو جوبلی نمبر کے کسی کونے میں ڈال دیجیے پڑھنے والوں کو کچھ نہ کچھ مل ہی جائے گا۔

انگریز کا زمانہ تھا۔ وردھا اسکیم کا غلغلہ ہوا تو کچھ ایسے تھے جنھوں نے منھ بنایا۔ کچھ نے آوازے کسے۔ کچھ غور و فکر کرنے لگے۔ اسکیم کے بانی اگرچہ مہاتما گاندھی تھے لیکن روح رواں ڈاکٹر ذاکر تھے۔

ڈاکٹر ذاکر اور جامعہ دونوں ایک ہی جسم کے دو نام تھے۔

یہ وہ وقت تھا کہ جامعہ عوام کی امداد کی ضرورت مند تھی۔ اور یہ ضرورت جہاں دوسرے صوبے پوری کرتے تھے، بہار کے صوبے کا بھی اس میں بڑا حصہ تھا۔ اور پھر اتفاق دیکھیے کہ یہ وہی زمانہ تھا جبکہ حلقہ ہمدردان جامعہ کے مہتمم بہار کے دورے پر جا رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ بہار والے وردھا اسکیم کے سلسلہ میں ڈاکٹر ذاکر یعنی جامعہ سے بہت ناراض ہیں۔ پھر بھی منظور صاحب فاروقی کو پٹنہ بھیج دیا گیا۔

میں حیدرآباد میں بعض ضروری کاموں میں مصروف تھا کہ شفیق الرحمٰن مرحوم کا خط ملا۔ منظور صاحب پٹنہ سے ناراض ہو کر شاہ آباد اپنے وطن میں مقیم ہیں آپ آئیے اور انھیں منا کر اپنے ساتھ بہار لے جائیے یہ تھا مضمون کا خلاصہ۔

شفیق صاحب کا خط دیکھتے ہی میں نے اپنے کام چھوڑ دیے اور حیدرآباد سے چل پڑا۔ دہلی پہنچا تو شفیق صاحب نے منظور صاحب کی خفگی کی پوری روداد سنائی۔ وردھا اسکیم سمندر نازیہ تازیانہ یہ تھا کہ ڈاکٹر فردوسی جو پٹنہ میں ہماری جماعت کے سب سے بڑے مخلص و معاون تھے

انھوں نے منظور صاحب سے کہہ دیا کہ مقبول صاحب آجائیں گے تو کام ٹھیک ہو جائے گا۔ مختصر یہ کہ میں دو تین روز بعد دوسرے ہی دن شاہ گیا پہنچ گیا۔ منظور صاحب اپنے قدیم وطن میں تھے۔ گھر کے پچھواڑے اپنے آموں کے باغ میں چارپائی بچھائے بیٹھے تھے۔ میں اچانک پہنچا اور السلام علیکم کا نعرہ بلند کیا۔ تو بے ساختہ کھڑے ہو کر لپٹ گئے۔

خاطر مدارات اور کھانوں کے بیان کا تو موقع کیا ہے۔ اصل مسئلہ پر گفتگو ہونے لگی اور میں نے انھیں رضامند کر لیا کہ پٹنہ ساتھ چلیں۔ اہتمام سفر ہونے لگا۔ اور دوسرے دن سامان سفر بندھ گیا۔ بھاری ناشتہ دان بھر گیا۔ منظور صاحب کے ساتھ جہاں ناشتہ دان تھا پاندان بھی تھا اور پیچوان سفر تھا۔ اور وہ جب بھی پان کھاتے تھے۔ بڑے تکلف و صفائی سے کھاتے تھے۔ چلتے تو معلوم ہوتا کہ کسی چھوٹے موٹے جاگیردار کا سامان ساتھ جا رہا ہے۔ راستہ بڑے لطف سے گذرا

پٹنہ پہنچے تو صبح کا وقت تھا۔ یکہ پر سامان لاد کر ڈاکٹر فردوسی کے دولت کدہ پر پہنچے۔

ڈاکٹر صاحب نے ہمیں دیکھا تو نعرۂ مسرت سے پرجوش استقبال کیا۔ اور بولے "اب کام ہو جائے گا"

ناشتہ کے بعد مجلس مشاورت منعقد ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے تمام اثرات کا نقشہ کھینچ کر بتا دیا جو دودھا سکیم نے بہار والوں کے اردگرد کھینچ رکھا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے مجھ سے کہا۔ اس وقت آپ کے ساتھ میرے جانے کا بالکل موقع نہیں ہے۔ فضل حسین صاحب ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر آپ کے دوستوں میں محمد یونس ہیں گو ملنسار بہت ہیں۔ بڑے افسر ہیں۔ ان پر ان کا کافی اثر ہے۔ ان کی رفاقت ہو گی تو کام میں سہولت ہو گی۔ اسی ہفتے انھوں نے ایک نیا موٹر خریدا ہے۔

میں نے منظور صاحب سے کہا۔ لو بھئی۔ موٹر سواری اور رقموں کی یاد بھلا دی۔

فضل صاحب کے بنگلے پہنچے تو انھوں نے کشادہ دلی سے ہمارا خیر مقدم کیا۔

رسمی گفتگو کے بعد میں نے کہا: "سنا ہے آپ نے ہفتے نیا موٹر خریدا ہے"۔

بولے "جی ہاں کیا آپ کو درکار ہے۔" میں نے کہا فقط موٹر نہیں موٹر اور موٹر والے دونوں کی ضرورت ہے۔ تھوڑا سا وقت جامعہ کو دیجئے اور ہمارے ساتھ مہم پر چلیے"۔

بے چاروں کو اتنا لحاظ تھا کہ وفقا کے ناساز ہونے پر بھی مخالفت میں ایک لفظ نہ کہا اور ساتھ پر راضی ہو گئے۔

پہلا حملہ پٹنہ کے ایک زمیندار کے گھر پر دن کے ۹ بجے ہوں گے۔ زمیندار صاحب پر بیٹھے منہ دھو رہے تھے۔ سیاہ فام داڑھی تھی صاف اور سر بھی صاف۔

کمشنر صاحب نے پہلا تعارف کرایا تو بولے۔ "یہاں تو کانگریس کی مخالفت سے

[illegible] مشکل ہو رہا ہے۔ آپ جامعہ کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ اس وقت معاف کر دیجیے۔ یہ جواب کلکٹر صاحب کو ناگوار گزرا اور چہرہ تمتما گیا۔ میں نے کہا ذرا ٹھہریے مجھے زمیندار صاحب کو ایک کہانی سنانی ہے۔ اور زمیندار صاحب سے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ یہ کہانی انگریزوں کے ابتدائی دور کی ہے۔ جب بڑے بڑے شریف النفس انگریز ہندوستان کی حکمرانی کے لیے بھیجے جاتے تھے۔ ان ہی میں سے کسی انگریز کے ہاں مقدمہ آیا جس میں دعویٰ تھا کہ میرے کھیت میں فلاں کسان کی بھینس آ گھسی اور میرے کھیت کو تہہ و بالا کر ڈالا۔ انگریز اردو جانتا تھا۔ پیشکار ایک تعلیم یافتہ مولوی صاحب تھے۔ پیشکار صاحب نے استغاثہ کا مضمون سنا تو عدالت نے فوراً کے فوراً تین مہینے قید محض کا بھینس کے مالک کو حکم سنا دیا۔ بھینس کا مالک کسان موجود تھا۔ پیشکار نے صاحب کا حکم سنا تو کھڑا ہو کر اور ہاتھ ہلا کر بولا۔ واہ صاحب تین مہینے، مجھے نا منظور ہے۔ ایک دن کی بھی سزا منظور نہیں۔ کسان کا لب و لہجہ اور ہاتھ ہلانے کا کچھ ایسا انداز تھا کہ صاحب نے پیشکار سے پوچھا۔ یہ کیا کہتا ہے؟

پیشکار بے چارا حیران کہ بتائے تو کیا بتائے۔ مگر کہا "سرکار یہ کہتا ہے کہ مجھے یہ سزا نامنظور ہے۔" نہ جانے صاحب پر کیا اثر پڑا۔ بولا "کیوں منظور نہیں ہے؟"

پیشکار نے کسان سے پوچھا "کیوں منظور نہیں ہے؟" تو کھڑے ہو کر پھر ہاتھ ہلانے لگا۔ ایک گھڑی بھی منظور نہیں۔ تو میرے بیلوں کو کون چرائے گا اور میری بھینس کو چارہ اور سانی کون کھلائے گا؟ میں اکیلا آدمی! تانا مجھے ہرگز منظور نہیں۔" نہ جانے انگریز کو کسان کی کون سی ادا پسند آئی کہ سزا کا حکم کاٹ کر چھوڑ دینے کا حکم لکھ دیا۔

یہ تمام کہانی سنا کر میں کھڑا ہو گیا اور زمیندار صاحب کا کالا بھجنگ ہاتھ پکڑ کر اور جھٹکا دے کر بولا۔ ہمیں آپ کا حکم منظور نہیں۔ گھر میں جائیے۔ جامعہ کے بچوں کے لیے کہا جا رہا ہے۔ میری لڑکی یا لڑکے کی شادی نہیں ہے۔

کیا آپ نے اپنا کھانا پینا بند کر رکھا ہے۔ کیا آپ نے اپنے نوکروں کی تنخواہیں بند کر رکھی ہیں۔ جائیے اور اٹھیے۔

خدا کی قدرت کہ میرے انداز گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ زمیندار صاحب گھر میں گئے اور پلیٹ میں چاندی کے روپے رکھ کر فضل حسین صاحب کو پیش کیے۔ یاد نہیں کتنے تھے۔ میں نے کہا۔ دروازہ بند رہے گا یا کھلا رہے گا۔ بولے کھلا رہے گا۔ جب جی چاہے آئیے۔

ادھر تو میری اور زمیندار صاحب کی مخاطبت تھی ادھر فضل صاحب اور منظور صاحب مشکل سے ہنسی روکے بیٹھے تھے۔ اٹھ کر موٹر کی طرف چلے تو دونوں ہنستے ہنستے موٹر کی سیٹ پر گر پڑے۔

میں نے فضل صاحب سے کہا۔ فضل صاحب اس وقت مقصود چندہ لینا نہ تھا بلکہ مقصود یہ تھا کہ ہمیں آپ بھی بسم اللہ غلط دیکھ کر ہمارا ساتھ نہ چھوڑ دیں۔

فضل صاحب بولے سچ تو یہی ہے کہ اگر آپ

اس وقت یہ کرامت نہ دکھاتے تو آپ کے حق میں موٹر چھوڑ کر یقیناً چل دیتا۔ اب تو جہاں بھی آپ چلیں گے ساتھ ساتھ ہوں۔

میں نے کہا حضرت ہمارا کوئی قرضہ تو ہے نہیں مگر ہم اس لیے شیر رہتے ہیں کہ اپنے لیے نہیں مانگتے۔ مسلمان بچوں کے فلاح و بہبود کی خاطر مارے مارے پھرتے ہیں

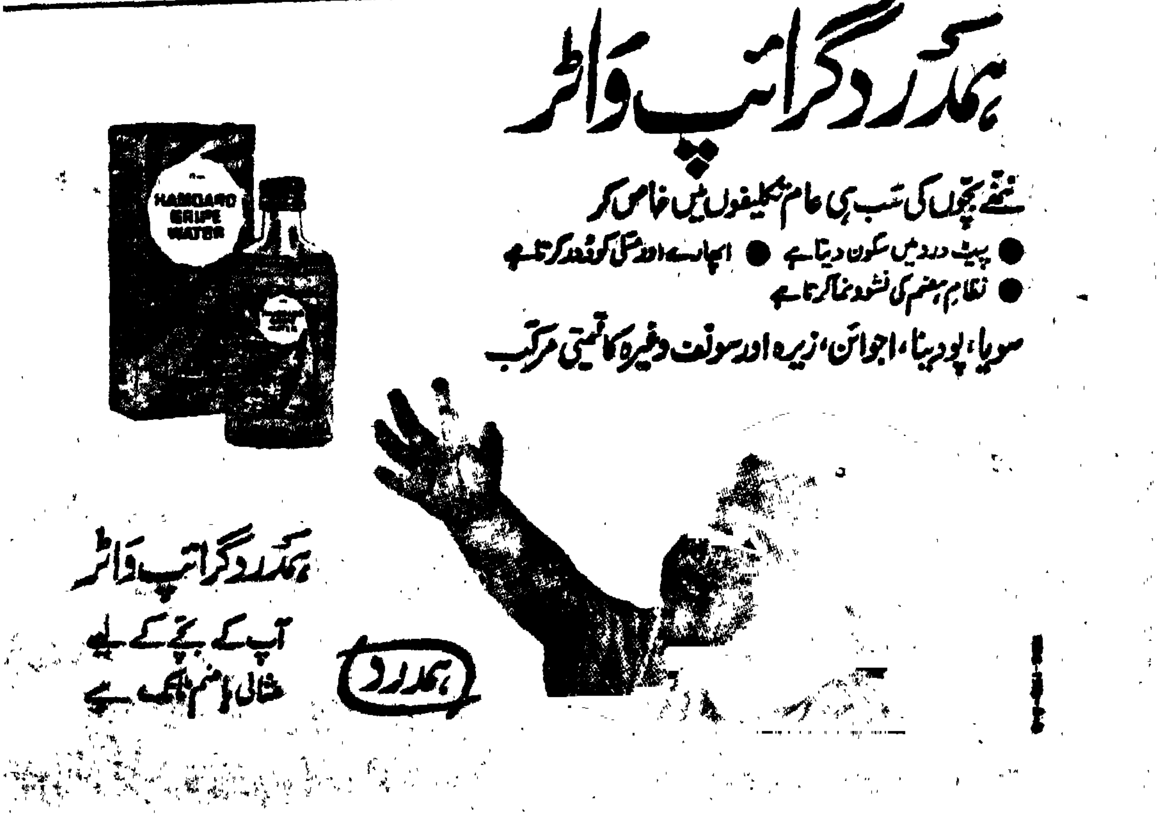
پہل کر فقیروں کا ہم بھیس غالب

تماشائے اہل کرم دیکھتے ہیں

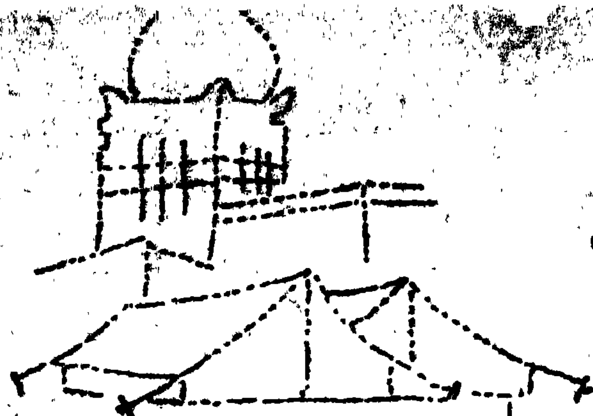
پھر مدت تک یہ لطیفہ منظور صاحب لوگوں کو سناتے رہے اور ڈاکٹر فردوسی تو پہلے ہی میرے ثنا خواں تھے۔ ●

جیسے پچھلے باتیں

ایچ۔ام۔قدوس صاحب جمشید پور، ضلع اردو ہائی اسکول کولہ، جناب لیاقت عبداللہ صاحب کالستہ رتنا گری گورنمنٹ مڈل اسکول من پورہ گلبرگہ۔ جناب محمد مسیح الدین حیدرآباد۔ جناب محمد شمس الاسلام صاحب رفیع گنج گیا اور اوران حضرات نے پیام تعلیم کے خریدار مرحمت فرمائے محمد خلیق صاحب ایک خریدار (عزیزہ فوزیہ رسولی، شاخ بمبئی تین خریدار (۱) کنیز فاطمہ کیمپ والا بمبئی (۲) اُردو اسکول لائبریری جہا بیشور (۳) اُردو اسکول سومیشور، رئیس احمد خاں صاحب انچارج شاخ دہلی (سعیدہ خاتون مدرسہ لطیف اعظمی صاحب اور میمونہ نسیم صاحبہ ایک ایک خریدار مرحمت فرمایا۔



جناب احمد علی صاحب استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ



خیموں سے عمارت تک

ابتدائی، اور ثانوی اور سہ تعلیمی مرکز نمبر ا کے جو بچے ۱۹۴۴ء کی جوبلی میں شریک ہوتے تھے اور جنھوں نے اس جوبلی کی پہل پہل دیکھی تھی۔ انھیں اس کا نقشہ یاد ہوگا۔ دُور تک مہمانوں کے لیے خیمے ہی خیمے لگے تھے۔ ایک ٹیلے پر بیماروں کے لیے ہمدرد دواخانہ کی طرف سے دواؤں کا انتظام تھا۔ اور حکیم میرن صاحب ہمہ وقت اس دواخانے میں موجود رہتے تھے۔ مہمانوں کے خیموں کے ایک طرف خیمے لگاکر کھانا پکانے اور مہمانوں کو کھانا کھلانے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اور عبدالحئی صاحب (حال مقیم کراچی) اس ڈائننگ حال کے روحِ رواں تھے۔ مہمانوں کے خیموں کے بالکل بیچ میں ایک بڑا خیمہ لگاکر ریڈنگ روم کے لیے جگہ کا انتظام کیا گیا تھا۔ اسی میں ایک طرف مہمانوں کے بیٹھنے کا انتظام بھی ہونے والا تھا۔ خاکسار اسی خیمے کے ایک گوشے میں برکت علی صاحب فراق کی اجازت سے مقیم تھا۔

پرانی دلّی میں کرفیو لگا ہوا تھا اس لیے خیمے میں لگانے کے لیے ضروری فرنیچر نہیں آسکا تھا جبلی کے خاص جلسہ کے دن کے [illegible] تیاریاں مکمل نہیں سوائے خیمے کی آرائش کے۔ اس [illegible] ذاکر صاحب وغیرہ لوگوں کو لے کر آئے اور خیمہ [illegible] تھا تو دیکھا کر خاکسار ایک میز پر بیٹھا کیلا کھا رہا ہے۔ ذاکر صاحب نے فوراً پردہ گرادیا اور یہ کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔ "کرفیو کی وجہ سے فرنیچر کا غالباً انتظام نہ ہوسکا۔"

اسی دن عبدالقدیر صاحب (قرولباغ والے) نے مجھے اپنی موٹر سائکل پر بٹھایا اور فرنیچر کی تلاش میں نئی دلی پہنچے۔ یہاں کرفیو نہیں تھا اور تمام دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ اتفاق سے بنارس کے ایک فرنیچر صاحب مل گئے۔ ان سے بچپن کی ملاقات تھی۔ انھوں نے پوچھا اس کرفیو میں کیسے آنا ہوا؟ ہم نے اپنی ضرورت بتائی تو وہ ایک فرنیچر والے کی دکان پر لے گئے۔ بات چیت کے بعد کچھ رقم فرنیچر کے مالک کو پیشگی دی ہم لوگ واپس آگئے۔ چھ بجے شام تک سارا ضروری فرنیچر جس کا آرڈر دیا گیا تھا آگیا، اور خیمے میں لگا دیا گیا۔ عبدالقدیر صاحب صبح ہی صبح اپنی موٹر سائیکل پر جاکر بہت سے اردو، ہندی اور انگریزی اخبارات اور رسالے نئی دہلی سے لے آئے اور برکت علی صاحب فراق نے انھیں میزوں میں سے ایک لمبی میز پر لگا دیا جس کے دونوں طرف کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔

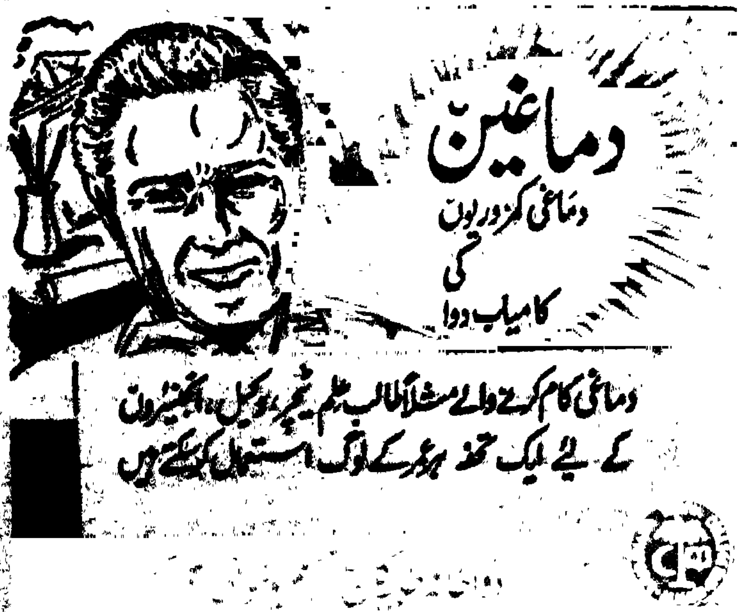
ریڈنگ روم دوسرے دن [illegible] ہوگیا۔ پردہ [illegible] اخبار پڑھنے والے حضرات جمع تھے کہ دوسرے

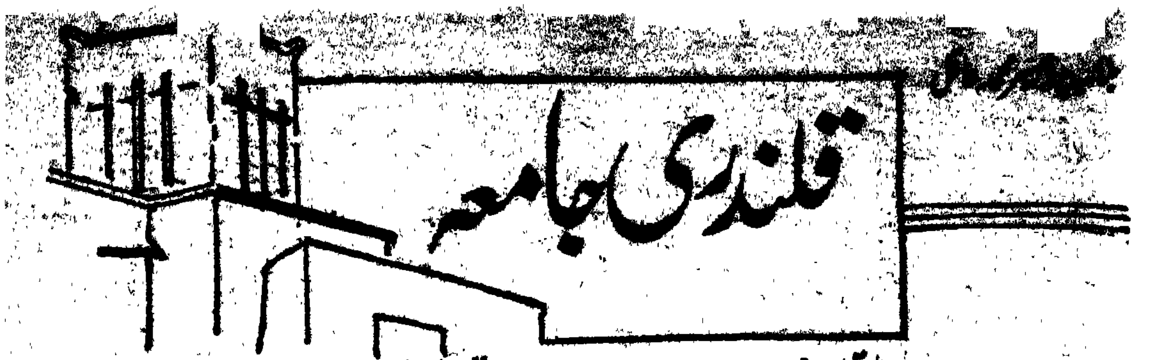
دن پھر ذاکر صاحب تشریف لاتے، کہنے لگے آپ لوگوں نے کیا بنا لیا؟ کل تو کچھ بھی نہ تھا۔ احمد علی صاحب پھیلا کھلا رہے تھے۔ تھوڑی دیر بیٹھے اخبار پڑھا پھر دوسرے خیمے میں آئے اور مہمانوں سے ملاقات کی۔ دیر تک باتیں کرتے رہے اور پھر چلے گئے۔

اس وقت کے طلبا جو اب جوان ہوں گے اس جوبلی میں اگر شرکت کریں گے تو مہمانوں کے خیموں، ریڈنگ روم اور شفا خانے کے خیموں کی جگہ جامعہ کی زیر تعمیر مسجد، ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کا مزار، جامعہ کی زیر تعمیر لائبریری، جامعہ کالج اور ہوسٹل کی عمارتیں دیکھیں گے۔ جہاں جوبلی کے جلسوں کے لیے رام پور سے آیا ہوا بڑا پنڈال لگا تھا وہاں بھی ایک نامکمل عمارت کھڑی ہے۔ یہ عمارتیں ہی اس جوبلی میں جامعہ کی گذشتہ پچیس سال کی ترقی کی نشان دہی کر رہی ہیں۔

غزل خوانی کے مقابلے میں نیشنل ہائی اسکول کی شاندار کامیابی

ستمبر [illegible]ء کے آخری ہفتے میں، ڈاکٹر ذاکر کالج پھلواری میں شعبۂ اردو و فارسی کے زیر اہتمام، شاعر شباب شکیل مرحوم کی یاد میں غزل خوانی کا ایک مقابلہ منعقد ہوا تھا۔ جس کے ڈاکٹر این ایس گورڈیکر ایم۔ اے پی۔ ایچ ڈی اس پروگرام میں مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ہوئے اور متعدد اسکولوں اور کالجوں کے طلبا و طالبات نے اس میں حصہ لیا تھا۔ نیشنل ہائی اسکول دا پولی درتا گیری کے دو طلبا، ابراہیم زین الدین مقدم (بارہویں) اور رفیق مقدم (نہم) نے اس مقابلے میں اول اور سوم درجہ انعامات کے ساتھ وہ شیلڈ بھی جیت لی جو غزل خوانی میں مجموعی طور پر بہترین مظاہرے کے لیے رکھی گئی تھی۔ ہم دونوں ہونہار فنکاروں کو مبارکباد پیش کرتے ہیں





قلندری جامعہ

جامعہ یعنی یونیورسٹی تعلیم و تحقیق کے سب سے اونچے مرکز کا نام ہے۔ عام طور پر یونیورسٹیوں کو حکومت اور امیروں اور تنظیموں کی سرپرستی اور مالی امداد حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے ان کے پاس پیسے کی کمی نہیں ہوتی۔ اچھے سے اچھے استادوں کو بڑی سے بڑی تنخواہیں دے کر انھیں ملازم رکھ سکتی ہیں۔ عالیشان عمارتیں بنوا سکتی ہیں، کتابوں کے بڑے سے بڑے ذخیرے اپنے کتب خانوں میں جمع کر سکتی ہیں۔ اپنی تجربہ گاہوں اور ورک شاپوں میں قیمتی سے قیمتی سازوسامان اکٹھا کر سکتی ہیں۔ اپنے استادوں اور طالب علموں کے رہنے سہنے، کھانے پینے، علاج معالجے، سیر و تفریح اور دوسری ضرورتوں اور آسائشوں کے لیے سب انتظام کر سکتی ہیں۔ اپنی دنیا الگ بسا سکتی ہیں جس میں علم و فن کو بچانے بڑھانے اور پھیلانے کے زیادہ سے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔

ان یونیورسٹیوں کو چلانے والے ہوشیار اور زمانہ شناس لوگ ہوتے ہیں۔ جبھی یہ اپنے سب کام کامیابی سے چلا سکتے ہیں۔ آسودگی، خوش حالی اور فارغ البالی ان تعلیمی اداروں کا طرۂ امتیاز ہوتی ہے۔ پر کیا جامعہ ملیہ اسلامیہ بھی ایسی ہی کوئی یونیورسٹی تھی اور ہے؟ نہیں۔ یہ باغیوں، انقلابیوں، نئے خواب دیکھنے والوں، نئی تمناؤں اور آرزوؤں کو پالنے والوں، موجودہ حالات سے غیر مطمئن اور ان کے بدلنے کے لیے بے چین اور بے تاب رہنے والوں اور نئے راستوں اور نئی منزلوں کی تلاش جستجو میں سرگرداں لوگوں کی یونی ورسٹی ہے۔

اس کی بنیاد ان لوگوں نے رکھی جو ہندوستان کی زندگی میں ایک ہمہ گیر اور ہمہ جہت انقلاب لانا چاہتے تھے ——— اس وقت جو نظام تعلیم رائج تھا — اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے بالکل ناکافی اور ناموزوں تھا۔ وہ موجودہ تعلیم کے نظام کو پوری طرح بدلنا چاہتے تھے۔ لیکن اس کی جگہ کس نظام کو دیں اس کے بارے میں اُن کے خیالات صاف اور واضح نہیں تھے۔

انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بہت سے طالب علموں کو ورغلا کر نکالا تھا۔ وہ اب ان کے ساتھ تھے۔ ان میں ایک طالب علم ایسا تھا۔

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

انھوں نے اسے یورپ کے ملکوں میں تلاش و تحقیق کے

ہے رہتے کہ وہاں سے نظام تعلیم کا ایک ایسا نقشہ ذہن نشین کرلائے جس سے ملک کی انقلابی ضرورتیں پوری کی جاسکیں۔ یہ تھے ڈاکٹر ذاکر حسین۔

ذاکر صاحب جرمنی گئے۔ کئی سال برلن یونی ورسٹی میں وہاں کے ممتاز پروفیسروں کی صحبت میں صرف کیے۔ مشاہدہ اور مطالعہ کیا۔ روشن ضمیر پہلے سے تھے۔ عقل سلیم میں اور چار چاند لگ گئے۔ سخت محنت اور ریاضت سے تعلیم کی روح اور بنیاد کو دریافت کیا۔ اس کو اپنے ملک میں عملی شکل دینے کے منصوبے بنائے۔ اور وہیں دو ایسے رفیقوں کو چنا جن کے ساتھ مل کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کا کام چلانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ یعنی ڈاکٹر سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب۔

ہندوستان لوٹے تو جامعہ ملیہ اسلامیہ کے خستہ اور بے جان جسم میں ایک نئی زندگی اور طاقت پیدا کی۔ حکومت، رئیسوں یا امیروں کی کوئی سرپرستی یا مالی امداد حاصل نہیں تھی۔ اپنے انقلابی مقاصد کو قربان کرکے یہ امداد حاصل کرنے کے لیے ذاکر صاحب تیار نہیں تھے۔ اسے "پیسے" کی جامعہ نہیں بنا سکتے تھے۔ اس لیے "بے پیسے" کی جامعہ بنائی۔

کیا "بے پیسہ" کی جامعہ بن سکتی ہے؟۔

ذاکر صاحب کا جواب تھا: "کردم ہوشد" میں نے کیا اور وہ ہوگئی۔

جامعہ بنانے میں ابتدائی چیز آدمی ہیں۔ پیسے کی حیثیت اس کے بعد کی ہے۔ ذاکر صاحب نے کچھ آدمیوں کو اکٹھا کیا تھا اور انھوں نے جامعہ [illegible] بنا دیا۔

آدمیوں میں اول تو خود ذاکر صاحب تھے نمبر پر ڈاکٹر سید عابد حسین۔ تیسرے نمبر پر پرو مشرقی علوم میں علامہ سورتی۔ مولانا محمد اسل ایک مدت تک خواجہ عبدالحی اور مولانا شرف پرنسپل گیلانی۔ نوجوانوں میں ڈاکٹر عبدالعلیم محمد سرور، نذیر نیازی۔ ذاکر صاحب کے بھا خاں جو عثمانیہ یونیورسٹی میں تھے۔ محمود صاحب یونیورسٹی میں تھے۔ لیکن جامعہ سے قریبی تعلق بھی جامعہ گروپ میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ صاحب دوسرے اور لوگ تھے۔ باہر کے بہا مفکر اور شعراء جو جامعہ کے ذریعہ اپنے اشاعت کرنے لگے۔

ان سب نے مل کر جامعہ ملیہ اور مرتبہ اتنا بلند کر دیا کہ جتنی بہت پیسے سے نہیں ہو سکتا۔ انھوں نے اردو لٹریچر سے اپنی دھاک دور دور بٹھا دی۔ مکتبہ اردو اکادمی رسالہ جامعہ معیاری ادب ادب، مذہب، فلسفہ، تاریخ، سیاسیات کتابیں اور مضامین شائع ہونے لگے۔ تاریخ الامت کی بہت سی جلدیں اور کتابیں، خواجہ عبدالحی کی تفسیر کی کتابیں اور نذیر نیازی کے مضامین اور کتابیں اس

معیاری ادب کی اشاعت کرنے لگے اور ملک کے مذہبی تصنیف وتالیف کے مختلف حلقوں میں ان کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ اس طرح ادب میں عربی، انگریزی، جرمن اور فرنچ کتابوں سے معرکتہ الآرا ترجمے تالیف اقتباس، منفرد مضامین تنقید وغیرہ کیے گئے۔ جس میں ڈاکٹر سید عابد حسین کا حصہ غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے۔ معاشیات میں ذاکر صاحب نے خود معرکتہ الآرا تصانیف لکھیں اور اس میدان میں پہلی مرتبہ داخل ہوکر اتنی بلند سطح پر پہنچے کہ اپنے لیے یونیورسٹی کا درجہ اور مرتبہ تسلیم کرا سکے۔ یہی بات کم وبیش مجیب صاحب کے بارے میں کہی جاسکتی ہے۔ اور جامعہ کے دوسرے رفقا بھی اپنی بساط کے مطابق تصنیف و تالیف اور لکچرز اور ریڈیو براڈ کاسٹ میں لگے رہے۔ بین الاقوامی شہرت رکھنے والے ممتاز لوگوں کے توسیعی خطبات کا جامعہ میں انتظام کیا گیا۔

اردو کا سب سے بڑا کام اس وقت انجمن ترقی اردو اور عثمانیہ یونیورسٹی کررہی تھیں۔ ان دونوں کے پاس بہت پیسہ تھا۔ مذہبیات پر تحقیق و تالیف کا کام دار المصنفین اعظم گڈھ میں ہوتا تھا۔ لاہور کی اورینٹل سوسائٹی۔ اور حیدرآباد میں اسی قسم کے مشرقی مذہبی تحقیقات وغیرہ کے ادارے تھے۔ یہ سب جامعہ کے کاموں کی جانب متوجہ ہونے کے لیے مجبور ہوئے اور انجمن ترقی اردو اور عثمانیہ یونیورسٹی

سب سے زیادہ کام ڈاکٹر سید عابد حسین نے کیا۔ ان کاموں میں جامعہ کے دوسرے لوگ بھی شرکت کرتے رہے۔

جامعہ کے استادوں کی تعداد مختصر تھی۔ لیکن مختصر تعداد جتنا کام کرنے میں تیار ہوئی اتنا دوسرے ادارے جن کے پاس وسائل بے شمار تھے۔ اور جن کے کارکنوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ اور جنھیں سرکار، امیروں اور رئیسوں کی پوری سرپرستی حاصل تھی نہیں کرپائے۔

جامعہ نے یہ سب کام "بے پیسے" یا بہت کم پیسے سے کیا۔

جامعہ کالج کے طلبا کی تعداد تو ذاکر صاحب کے لوٹنے کے بعد بھی زیادہ نہیں بڑھی۔ مگر اس میں دوسرے صوبوں اور دوسرے ملکوں کے طالبعلموں کی نمائندگی ہوتی۔ جس نے اسے کل ہند، اور کل عالم یونیورسٹی بنادیا۔ مدراس (تامل ناڈ) کرالا۔ حیدرآباد (آندھرا) مدھیہ پردیش، بمبئی بنگال آسام، بہار یو۔پی پنجاب سرحدی صوبہ ہندوستان کے سب صوبوں سب مذہبوں کے طالب علم کے علاوہ افغانی، ایرانی سعودی عرب، نجد، انڈونیشیا، ملایا، چین، برما وغیرہ سے بھی طالب علم آتے۔

بورڈنگ ہاؤس کی زندگی، پی۔ٹی منظم۔ کھیل کود اور مقابلے، ڈسپلن، سب معیاری درجہ کا ہوتا تھا۔

کالج کے مقابلے میں ثانوی اور ابتدائی

میں جامعہ نے غیر معمولی جوہر دکھائے۔ اور ملک میں اور ملک سے باہر بہت شہرت اور نیکنامی حاصل کی۔ یہ ایسے میدان تھے خاص کر ابتدائی تعلیم کا اقامتی نظام جس طرف پہلے ہندوستان میں بہت کم توجہ کی گئی تھی۔ یہاں اس عمر کے بچّوں کی اقامتی زندگی کو جس مثالی اور معیاری انداز میں تنظیم دی گئی وہ سارے ہندوستان کے لیے ایک نمونہ اور مثال بن گئی۔

مدرسہ ابتدائی میں پراجیکٹ اور ثانوی میں تفویض کے طریقوں کو رائج کر کے ایسے تعلیمی تجربے کیے گئے۔ جو یہاں کے ٹریننگ کالجوں کے لیے بہت مفید ثابت ہوئے۔ نئی تعلیم کے پیش رو، ہر اول اور موجد کی حیثیت سے جامعہ کو ہر طرف سے خراج تحسین وصول ہونے لگا۔

بچّوں کے ادب، بچّوں کی کہانیاں، ڈرامے اور دیگر تعلیمی سامان اور بچّوں کا رسالہ "پیام تعلیم" جاری کرنے میں بھی جامعہ نے پہل کی اور ملک میں ایک بہت بلند اور ممتاز مقام حاصل کر لیا۔ یہ کام غالباً بے پیسے "نہیں کیے گئے کیوں کہ استادوں، مصنّفوں اور ایڈیٹروں وغیرہ کی واجبی اور جائز اجرت کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو بقیہ اخراجات کے لیے پیسہ بچّوں کے والدین سے وصول ہونے لگا تھا۔

لیکن بصورت مجموعی "دورِ ذاکر" کی جامعہ کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں کام معاوضہ کے لیے نہیں ... [illegible] ... سمجھ کر جاتا تھا

مہتر اور چپراسی سے لے کر شیخ الجامعہ تک سب ا[illegible] ایسی جماعت کے رکن تھے جو اپنا کام ایک مذہبی سمجھ کر انجام دیتی تھی۔ جن میں ایک برادری جیسی مساوات اور آزادی کارفرما تھی۔

بڑے پروفیسر اور محقق ہوں یا ثانوی یا ابتدائی کے مدرس یا دفتروں کے مہر اور دارالاقامہ کے چپراسی اور بیرے، باورچی۔ سب برابر سمجھے جاتے تھے۔ اور ہر ایک میں اپنی ایک آن، شان، سیرت و کردار تھا۔ اپنی عزّتِ نفس تھی جس کو ہر [illegible] تسلیم کرتا تھا۔

باہمی ہمدردی اور رفاقت کا یہ عالم تھا سب کے دکھ سکھ اور شادی غمی میں سب برابر کے ہوتے تھے۔ اس زمانے کی جامعہ میں زندگی کی مثالی جھلکیاں دیکھنے میں آئیں اس کے خواب لوگوں نے ضرور پہلے بھی دیکھے تھے اور اب بھی رہے ہیں۔ حقیقتاً یہ چیز ممکن ہو سکتی ہے اس شہادت وہی لوگ دے سکتے ہیں جنھوں نے ا[illegible] دور کی جامعہ میں زندگی گزاری ہے۔

شیخ الجامعہ ذاکر حسین، خازن مجیب ص[illegible] اور دوسرے ذمّہ دار کارکنوں کو جو کھری کھری منہ در منہ دفتر کی کرسی پر بیٹھے بیٹھے سُنا پڑتی تھیں اور جس خندہ پیشانی سے وہ انھیں برداشت کرتے وہ واقعی اگلے وقتوں کی روایتوں کو زندہ رکھنے [illegible] تھے

جناب کیف احمد صدیقی

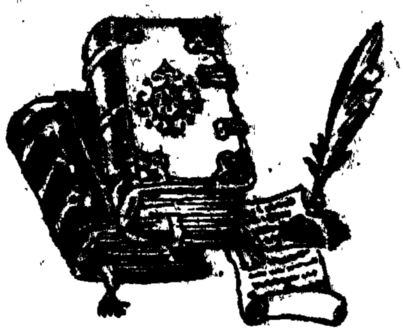


چاچا نہرو

۱۴ نومبر کو پنڈت جی جنم دن ہے۔ یہ نظم اسی تقریب میں شائع کی جا رہی ہے۔

بھارت ماں کی شان تھے نہرو
فخرِ ہندوستان تھے نہرو
ظاہر میں اک راہ نما تھے
باطن میں کیا جانے کیا تھے
کہنے کو انسان تھے نہرو
فخرِ ہندوستان تھے نہرو
پیر و جواں کے دل کی دھڑکن
اُن کی ضعیفی بھی تھی بچپن
بچوں کا ارمان تھے نہرو
فخرِ ہندوستان تھے نہرو
گاندھی جی کے سچے چیلے
جیل میں رہ کر بھی دکھ جھیلے
باپو کی پہچان تھے نہرو
فخرِ ہندوستان تھے نہرو
جنگ کے دشمن پیار کے حامی
ہر عالم میں حق کے پیامی
امن و اماں کی جان تھے نہرو
فخرِ ہندوستان تھے نہرو
تھا ان کا میدان سیاسی
پھر بھی ادب سے تھی دلچسپی
علم و ہنر کی کان تھے نہرو
فخرِ ہندوستان تھے نہرو
بھارت ماں کی شان تھے نہرو

جناب جمیل احمد قریشی



جامعہ لائبریری

آپ نے کتاب اور کتب خانہ یا لائبریری کے بارے میں پیام تعلیم کے کسی پچھلے پرچے میں ضرور پڑھا ہوگا[1] یوں بھی آپ یہ تو یقیناً جانتے ہوں گے کہ لائبریری کیا ہوتی ہے۔ یہ آپ کو اچھی اچھی کتابیں اور رسالے پڑھنے کا موقع دیتی ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی لائبریریوں کے نام آپ نے سنے ہوں گے مثلاً امریکہ کی لائبریری آف کانگریس، روس کی لینن لائبریری، انگلستان کی برٹش میوزیم لائبریری وغیرہ۔

ہمارے ہندوستان میں بھی کافی لائبریریاں ہیں ان میں سے چند تو ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ کچھ ایسی بھی ہیں جن کو دیکھنے اور جن سے فائدہ اٹھانے کے لیے دنیا کے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ کلکتہ کی نیشنل لائبریری، پٹنہ کی خدا بخش لائبریری، حیدرآباد کی آصفیہ لائبریری، رام پور کی رضا لائبریری، علی گڑھ کی مولانا آزاد لائبریری، دہلی کی نیشنل آرکائیو لائبریری اور جامعہ لائبریری۔ ویسے دہلی میں اور بھی کئی ا مشہور ہیں۔ مثلاً پبلک لائبریری، ہارڈنگ لائبریر

ہر اسکول، یونیورسٹی، کالج میں لائبریر ہوتی ہے۔ ہر شہر میں ایک نہیں کئی کئی لائبریریا موجود ہوتی ہیں۔ اور اب تو گاؤں گاؤں لائبریریاں رہی ہیں۔ چلتی پھرتی لائبریریاں بھی آپ نے د ہوں گی۔

کتابوں کی تعداد، اچھی عمارت اور لائبر میں بہت سے آدمیوں کے کام کرنے سے لائبریر اچھی نہیں ہوتی تو پھر اس کے اچھے ہونے کا معی کیا ہے؟ معیار یہ ہے کہ کس قسم کی کتابیں ہیں ا کس قدر استعمال ہوتی ہیں۔ یہی باتیں لائبریری اہمیت بڑھاتی ہیں۔ کتابیں پڑھنے کے لیے ہوتی اس لیے بہت سے لوگوں کو پڑھنے کا موقع ملنا چا

جامعہ لائبریری بھی ہندوستان کی چند گنی مشہور لائبریریوں میں سے ہے۔ بلکہ اپنے نادر ذخیروں کی وجہ سے ساری دنیا میں جانی پہ جاتی ہے۔ کتابیں لکھنے والے اور تحقیق کرنے وا

---

[1] ۱۹۶۹ء کے سالنامے میں "دنیا کی سب سے بڑی لائبریری" کے عنوان سے بہت دلچسپ اور معلوماتی مضمون شائع ہوا ہے۔

دور دور سے یہاں آتے رہتے ہیں۔

یہ لائبریری اب "جامعہ مرکزی کتب خانہ" کے نام سے مشہور ہے اس میں عربی فارسی اور اردو کی سینکڑوں ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ رسالوں کے پرانے فائل ہیں۔ خاص لوگوں کے ذاتی ذخیرے اور خط ہیں۔ اور کچھ لوگوں کے تبرکات ہیں۔ اور بھی کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جو دوسری جگہ نہیں ملیں گی۔

کتابوں کی تعداد بہت زیادہ تو نہیں ہے لیکن ہزاروں کتابیں ایسی ہیں جو اب نایاب ہیں دوسری جگہ مشکل سے ملتی ہیں یا نہیں ملتی ہیں۔ جامعہ کے بانیوں نے شروع سے اس بات کا خیال رکھا ہے کہ چیز تھوڑی ہو لیکن اچھی ہو۔ لائبریری کے بارے میں اب یہ اس کی ...لی بن گئی ہے۔

جامعہ ملیہ ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ میں ...م ہوئی۔ اس کے قائم کرنے والوں کو شروع سے ہی خیال تھا کہ ایک اچھی سی لائبریری بھی بنائیں۔ ...ع شروع میں اس لائبریری کا کل ذخیرہ وہ تھا جو ...نا محمد علی جوہر کی ذاتی کتابیں تھیں۔ یہ سب کتابیں ...ے الماری میں رکھی جا سکتی تھیں۔ اس کے بعد کوشش ...ی کہ لوگوں سے درخواست کر کے کتابیں تحفے کے طور پر ...ل کی جائیں۔ اس کوشش میں کامیابی ہوئی پہلے ...د استادوں اور طالب علموں نے اپنی اپنی کتابیں لائبریری ...ے دیں اور دوسرے لوگوں سے حاصل کرنے کی طرف ...بریری اور کتابیں ملتی رہیں۔ کچھ بڑے بڑے ذخیرے

بھی ملے۔ بیگم انصاری صاحبہ نے ڈاکٹر انصاری صاحب مرحوم کا ذخیرہ جامعہ کو دے دیا۔ مولانا محمد علی جوہر، مفتی انوار الحق، سیف اللہ بھٹی، سید جالب دہلوی، عبد المجید خواجہ، حکیم اجمل خاں اور جگر مراد آبادی کے قیمتی اور گراں قدر عطیے اس لائبریری کے نام کو چار چاند لگاتے ہیں۔

یہ لائبریری بہت سی کتابیں خریدتی بھی رہی ہے لیکن عطیوں کا سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ دوسرے ملکوں سے بھی ایک دو کتابیں آتی رہتی ہیں۔ مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین سابق وائس چانسلر جامعہ کو اس لائبریری سے خاص دل چسپی رہی ہے۔ مرحوم اپنی زندگی میں برابر کچھ نہ کچھ دیتے رہتے تھے۔ اب ان کے انتقال کے بعد بھی ان کے گھر سے کبھی نہ کبھی تھوڑی بہت کتابیں آتی رہتی ہیں۔ مرحوم حافظ نبی احمد کا نام بھی اس لائبریری کے لیے ذخیرہ اکٹھا کرنے اور محفوظ کرنے کے سلسلے میں ہمیشہ یاد رہے گا۔

علی گڑھ سے جامعہ جب دہلی آئی تو اس کی چھوٹی سی لائبریری بھی ساتھ آئی۔ دہلی سے قریب ایک نئی کالونی قرول باغ میں ایک کوٹھی اس کے لیے بھی مخصوص تھی ۱۹۲۵ء میں یہ لائبریری نہ صرف جامعہ کے استادوں اور طالب علموں کے استعمال کے لیے تھی بلکہ عام لوگ اس میں پڑھنے آتے تھے۔ اور باقاعدہ اس کے ممبر بن سکتے تھے۔ اور یہ ایک پبلک لائبریری کی طرح لوگوں کو پڑھنے کا موقع دیتی تھی۔

اس کا ریڈنگ روم خاص طور سے بہت شاندار تھا۔ ملکوں ملکوں کے علمی رسالے اور اخبار ریڈنگ روم میں آتے تھے اور دور دور سے لوگ انھیں پڑھنے آتے تھے۔ ۱۹۴۷ء تک یہ لائبریری قرول باغ میں رہی۔ کچھ ضروری کتابیں جامعہ نگر میں آگئی تھیں۔ ۱۹۴۷ء کی افراتفری کا شکار یہ بھی ہوئی۔ شکر ہے کہ نقصان زیادہ نہیں ہوا۔ زیادہ تر کتابیں محفوظ رہیں۔ اور پھر اسی زمانے میں جیسے تیسے یہ جامعہ نگر لائی گئی۔ یہاں اس کے لیے کوئی خاص عمارت نہیں سکی تھی ایک عمارت سے دوسری عمارت میں منتقل ہوتی رہی اور اس کا ذخیرہ کئی عمارتوں میں بٹتا رہا۔ تھوڑے دنوں بعد اس کا زیادہ تر ذخیرہ ادارہ تعلیم و ترقی کی عمارت میں آگیا جہاں جامعہ کے اساتذہ اور طالب علموں کو اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع مل رہا ہے ہمارے موجودہ شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کی کوششوں کے طفیل اس کی نئی عمارت تیزی سے بن رہی ہے! یہ نئی عمارت کافی بڑی ہے۔ ذاکر صاحب کے مزار کے قریب تعمیر ہو رہی ہے۔ امید ہے دو تین ماہ میں پوری کی پوری لائبریری اپنے نئے اور مستقل مکان میں بس جائے گی۔ پچھلے چند سالوں ——— میں کافی کثیر رقم اچھی کتابیں اور رسالے خریدنے پر خرچ کی گئی ہے۔ جامعہ کا ہر طالب علم، ہر کارکن اور ہر استاد اس کا ممبر بن سکتا ہے۔ اور کتابیں گھر پر پڑھنے کے لیے لے سکتا ہے۔ اس کا موجودہ نظام مختصراً اس طرح ہے۔

۱ ۔ عام اسٹاک سیکشن

۲ ۔ مخطوطات پرانے زمانے کی ہاتھ کی لکھی کتابیں۔)

۳ ۔ مشرقیات کا شعبہ

۴ ۔ ریڈنگ روم اور کتابیں جاری کرنے

۵ ۔ ٹیکنیکل سکشن

۱۔ عام اسٹاک میں کتابیں سلیقے اور لوہے کی الماریوں میں رکھی گئی ہیں۔ یہ مضمون کے اعتبار سے رکھی گئی ہیں۔ کیٹلاگ سے کتاب لے کر کتاب آسانی سے نکالی جاسکتی ہے۔ آپ کچھ شاید کیٹلاگ کا مطلب اچھی طرح سمجھ گئے ہوں۔ یہ لائبریری کی کنجی کہی جاتی ہے۔ اس میں کتاب کا نام اور اس کے لکھنے والے وغیرہ کی تفصیل ایک خاص قسم کے کارڈ پر لکھی ہوتی ہے۔ یہ کارڈ کیٹلاگ میں مصنف کے نام کے پہلے حرف کے ساتھ کتاب کے نام کے پہلے حرف کے حساب سے رکھے جاتے ہیں۔ جس طرح آپ اپنی لغت یا ڈکشنری میں دیکھتے ہیں اسی طرح تھوڑے وقت میں لائبریری میں کیا کتاب ہے اور کیا نہیں ہے اس کا پتہ لگ جاتا ہے۔ جس طرح خانوں میں رکھے ہوتے ہیں اسی طرح کتابیں الماریوں میں لگی ہوتی ہیں۔ اس سیکشن میں تقریباً پچاس ہزار کتابیں ہیں۔ مختلف ملکوں کی تاریخی کتابوں اور مذہبی کتابوں کا اچھا ذخیرہ ہے۔ دنیا کی دوسری زبانوں کی کتابیں بھی اچھی خاصی تعداد میں ہیں۔ جرمنی، فرانسیسی، اطالوی اور روسی زبانوں

۲۔ مخطوطات اور خطوط کا حصہ

ہاتھ کی لکھی ہوئی عربی، فارسی اور اردو زبان
کتابیں حفاظت سے الماریوں میں محفوظ رکھی ہوئی ہیں۔
زبان میں کئی سو کتابیں ہیں جن میں سے بہت سی ایسی
ں جو صرف جامعہ لائبریری میں ہی ملیں گی۔
تقریباً دو ہزار خطوط "مولانا محمد علی جوہر کلیکشن"
جن میں حکیم اجمل خاں، مولانا شوکت علی، ڈاکٹر انصاری
ذخیرہ بھی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو جامعہ کے بانی ہیں۔
خطوط میں بہت سے ایسے ہیں جو دوسرے لوگوں نے
کو لکھے ہیں۔ یہ خطوط تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور بہت
ہیں۔ دوسرے لوگ جن کے خطوط شامل ہیں وہ ہیں
ہاتما گاندھی، پنڈت جواہر لعل نہرو، ان کے والد
ی لعل نہرو، سر محمد اقبال، محمد علی جناح، ڈاکٹر سیف الدین
کچلو۔ رفیع احمد قدوائی، مولانا آزاد، محترمہ نے
نت اور بہت سے دوسرے۔ کچھ خطوط وائس رائوں کے
۔

۳۔ شعبہ مشرقیات

عربی، فارسی اور اردو کی پرانی اور نئی کتابیں
حصہ میں رکھی ہیں۔ ہزاروں کتابیں ایسی ہیں جو
نایاب ہیں۔ ہماری لائبریری اپنے اس ذخیرے کی
سے بہت اہمیت رکھتی ہے۔ ہر زبان میں کئی ہزار
ابیں ہیں۔ اردو، فارسی، اور عربی کے پرانے رسالوں
فائلیں بھی موجود ہیں۔ اردو کے تو سیکڑوں رسالوں

۴۔ ریڈنگ روم

ایک بڑے سے ہال میں اخبار رسالے پڑھنے اور
کورس کی کتابوں کے مطالعہ کرنے کا انتظام ہے۔
ریفرینس (حوالہ) کی سینکڑوں کتابیں اس طرح رکھی
گئی ہیں کہ وہاں بیٹھ کر پڑھنے والے آسانی سے فائدہ
اٹھا سکیں۔ ایک طرف کورس کی کتابیں بھی رکھی گئی ہیں
جو جاری بھی کی جاتی ہیں۔ نئے رسالے بھی بہت سے
آتے ہیں۔ جو ایک خاص الماری میں پڑھنے کے لیے
رکھے جاتے ہیں۔ ایک طرف کیٹلاگ رکھا ہے جس کے
بارے میں پہلے بتا چکے ہیں۔ اسی ریڈنگ روم میں ایک
شاندار شوکیس بھی رکھا ہے۔

اس شوکیس کو اچھا خاصہ بڑا ہے۔ اوپر کے
حصے میں بڑا سا شیشہ لگا ہے "گوشۂ جگر" کے نام سے
پکارتے ہیں۔ اس میں جگر مرادآبادی کی ڈائریاں،
یادداشتیں، کتابیں، رسالے، ان کی سندیں، ساہتیہ اکیڈمی
کا دیا ہوا انعام، ان کا چشمہ، بٹوا (چھالیہ تمباکو وغیرہ
رکھنے کا) چاندی کی زبان صاف کرنے کی جیبی وغیرہ
رکھی ہیں۔

ریڈنگ روم کے دروازے کے قریب کتابیں
اور رسالے جاری کرنے کا انتظام ہے۔ ہر ممبر آسانی
سے اپنی پسند کی کتاب ایک خاص وقت کے لیے جاری
کرا سکتا ہے۔ طالب علموں کو جس قدر کتابیں جاری ہو سکتی
ہیں اتنے ہی کارڈ دیے جاتے ہیں۔ جو اپنے کارڈ دے کے

ہوتی اور جاری ہوتی رہتی ہیں۔

ٹیکنیکل سیکشن اور دفتر

یہاں لائبریری نظام کی نگرانی، کتابوں کے حاصل کرنے اور ان کو استعمال کے قابل بنانے کا کام ہوتا رہتا ہے۔ کیٹلاگ کارڈ بھی یہیں بنتا ہے۔ اور پرانی کتابوں کی درستگی اور جلدیں بنوانے کا انتظام اسی سیکشن کے سپرد ہے۔

نئی عمارت۔

آپ پڑھ چکے ہیں کہ جامعہ مرکزی کتب خانہ کی نئی عمارت کافی بڑی ہوگی۔ اس میں دس کمرے تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے ہوں گے۔ دو کمرے ڈارک روم ہوں گے۔ یہاں مشین کی مدد سے کتابیں فلم سے پڑھی جا سکیں گی۔ ایک کمرہ مخطوطات (ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابوں) اور خطوط وغیرہ کے لیے ہے۔

ریڈنگ روم دو بڑے ہال ہوں گے۔ ایک میں نصابی اور حوالے کی کتابیں ہوں گی۔ اسٹاک تین منزلہ بڑے بڑے کمروں میں ہوگا۔ رسالوں اور اخبار کے لیے علیحدہ کمرہ ہے۔ اسی طرح دوسرے کاموں لیے علیحدہ علیحدہ کمرے ہوں گے۔

یہ عمارت تقریباً پانچ لاکھ روپے سے تیار ہوگی۔ اور ۳۴ ہزار مربع فٹ زمین گھیرے گی۔ اس کے آگے ہری ہری گھاس کے لان اور پھولوں کی خوبصورت کیاریاں ہوں گی جو لائبریری میں آنے والوں کو "خوش آمدید" کہیں گی۔

جامعہ کی زندگی، عام دنیا کی زندگی سے مختلف تھی۔ اس کا طریقۂ کار، اس کے میل جو[ل] باہمی تعلقات کے اصول، اس کی ہمدردیاں، دلجوئیاں، اس کی غلطی کی گرفت اور ڈسپلن پر محبت اور اہنسا کے طریقوں سے اصرار، اس[قدر] مختلف تھا کہ اب محسوس ہوتا ہے کہ "اٹوپیا" یا مثالی بستی میں زندگی گذار رہے [تھے۔] پورا لینا اور کام کا پورا معاوضہ نہ دینا اور اسے غیر معمولی بات نہ سمجھنا اور ڈسپلن میں ذرا سی بھی کمی نہ آنے دینا اور کام اور فرض کو ذاتی اور خاندانی مطالبہ پر کسی درجہ مقدم رکھنا یہ "جامعہ" کی امتیازی خصوصیات تھیں۔ یہ سب لائق عمل بن گئی تھیں کہ خود ذاکر صاحب کا ایک بہترین نمونہ اور مثال پیش کرتے رہتے تھے۔ اس کے بعد کسی کو ذرا بھی دم مارنے، چون و چرا کرنے کا موقع نہیں تھا۔ اور جو کبھی تھا اس کو سخت پشیمانی اور ملامتِ نفس کا پڑتا تھا۔ قرول باغ کی جامعہ اس قلندری کا بہترین دور کہی جا سکتی ہے۔

اب جامعہ آہستہ آہستہ "پیسہ" والی جا رہی ہے۔ لیکن موقع موقع پر وہ پرانی ادا چمکتا دمکتا رہتا ہے۔ بچوں کے میلے کے زمانے میں کو کیسے ... [illegible]

شفیق صاحب مرحوم

— مرحوم شفیق صاحب جامعہ کے چند انے گنے کام کرنے والوں میں سے تھے۔ جو سچ پوچھیے تو انھی جیسے بزرگوں کے ایثار و قربانی اور ان کے انتھک کام کی بدولت یہ جامعہ جامعہ بنی ہے۔ یہ مضمون ہم نے خاص طور پر ان کے شاگرد اور قریبی ساتھی برکت علی فراق سے لکھوایا ہے برکت علی صاحب نے شفیق صاحب کے ساتھ لگ بھگ بارہ تیرہ سال گذارے ہیں۔ اسی لیے انھیں مضمون لکھنے میں خاصی پریشانی اٹھانی پڑی ہے۔ اس عجیب وغریب اور پہلودار شخصیت پر کچھ لکھنا آسان نہیں ہے شفیق صاحب استاذ بھی رہے ہیں۔ بورڈنگ کے نگران بھی رہے ہیں۔ ابتدائی مدرسہ (قرول باغ) کے منتظم بھی رہے ہیں۔ شعبہ ہمدرداں جامعہ اور ادارہ تعلیم و ترقی کے ناظم بھی رہے ہیں اور آخر میں وزیر تعلیم بھی رہے ہیں۔ شفیق صاحب مرحوم نے ان میں سے جو کام بھی ہاتھ میں لیا ہے ایسا لگتا تھا جیسے وہ بس اسی کام کے لیے بنے ہیں۔ ان کی زندگی کا ایک پہلو اور بھی تھا۔ بہت ہی خوشگوار پہلو۔ ہر وقت اپنے کام سے کام رکھنے پر بھی وہ ہر وقت باغ و بہار رہتے تھے۔ یہ چیز جیسے ان کی زندگی میں رچ بس گئی تھی۔ خود خوش رہتے تھے اور دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرتے تھے۔

برکت صاحب نے ان سب باتوں کو ایک چھوٹے سے مضمون میں سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے باوجود کوشش کے مضمون لمبا ہوگیا ہے۔ اس کی دو قسطیں کرنا پڑی ہیں۔ دوسری قسط اگلے پرچے میں پڑھیے گا۔

ایڈیٹر

"کیا آپ لوگ سگریٹ پیتے ہیں؟"

"ج..... ج ... جی .... نہیں تو" ہم دونوں
کے حلق سوکھ گئے تھے۔ ہم نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔
ہوسٹل کے کمرے میں اسٹوو کے یکایک بجھ جانے
سے یوں ہی دھواں بھر گیا تھا۔ ہمارے سگریٹ کے دھوئیں
نے اس میں اور اضافہ کر دیا تھا۔ بالکل دم گھٹنے والی فضا
پیدا ہو گئی تھی۔

جیسے کوئی پینترا بدلتا ہے، وہ یکایک تیزی سے
ہم دونوں کے پیچھے آ گئے اور جلدی سے ہماری قمیصوں
کے دامن جھاڑ دیے۔ ہم دونوں نے جلتی ہوئی سگریٹ
پیچھے چھپائی تھی۔ اور اس سے ہماری قمیصوں کے
پچھلے دامن جلنے شروع ہو گئے تھے۔

ہم دونوں قریب قریب پتھر ہو چکے تھے۔

وہ ہمیں اسی حال میں چھوڑ کر کمرے سے باہر
چلے گئے۔

تھوڑی دیر تک ہم دونوں ایک دوسرے کی
طرف چپ چاپ دیکھتے رہے جیسے سکتہ ہو گیا ہے۔ کسی
کے منہ سے ایک آواز بھی نہ نکلی۔ یکایک ابن جان خاں
ابل پڑے۔ "ہم تم سے کہا تھا یہاں سگریٹ مت پیو۔
باہر چل کر پئیں گے مگر تم نہیں مانا۔"

"خاں صاحب، یہ تو جو کچھ ہونا تھا ہو گیا، اب یہ
سوچو آگے کیا ہوگا۔ بُرے پکڑے گئے۔" میں نے کہا۔

"ہم دونوں کو ہوسٹل سے باہر نکال دیا جائے گا
اور کیا ہوگا۔" ابن جان نے گھبراہٹ کے لہجے میں کہا۔

"یہ تو بہت بُرا ہوگا۔" میں بھی کچھ کم حواس باختہ نہیں
تھا۔ "ہوسٹل سے باہر نکال دیے جائیں گے تو ا
پردیس میں رہیں گے کہاں اور پڑھیں گے کیسے۔"

"تم جہنم میں جاؤ۔ ہم تو گھر چلا جائے گا۔"
ابن جان خاں بہت غصّے میں تھے۔ تم ہم کو بھی۔

ہم دونوں انٹرمیڈیٹ میں پڑھتے تھے
مرکزی کوٹھی کے جسے محمد علی ہوسٹل بھی کہتے تھے
کمرے میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں جامعہ کا
ہوسٹل میں طالب علم اپنے ناشتے کا انتظام خود کر
تھے۔ جمعہ کا دن تھا چھٹی تھی۔ ہم دونوں دروازہ
اسٹوو پر چائے اور دلیہ پکا رہے تھے۔ سگریٹ پیتے
مگر بہت کم، اور وہ بھی جامعہ کے احاطے کے با
کسی جنگلی جھاڑی میں چھپ چھپا کر، اس دن نہ جا۔
سوجھی کہ دونوں نے دلیہ پکاتے وقت سگریٹ بھی
لی تھی۔

ناشتہ تو کیا کرتے۔ بھوک ہی ختم ہو گئی
یوں ہی دو چار چمچے دلیہ کھا کر چائے پی رہے تھے کہ
کا دروازہ پھر کھلا اور یکایک آواز آئی۔
"یہ لو بھئی، ایک پیکٹ تم، اور ایک پیکٹ تم
ختم ہو جائے تو مجھ سے کہنا، میں اور منگوا دوں گا۔
یہ تین پیسے والی سگریٹ نہ پیو۔"

ہم دونوں بت بن گئے تھے۔

"ہاں، ہاں، لو، میں خود دے رہا ہوں سمجھ
"جی، اب ہم سگریٹ کبھی نہیں پئیں گے۔
کر دیجیے۔" میری زبان سے نکلا۔

"یہ بھی غلط!" وہ مسکراتے ہوئے بولے۔
"تم ایسا وعدہ کررہے ہو جسے پورا نہیں کر سکتے۔ دیکھو! سگریٹ بری چیز نہیں ہے۔ صرف نقصان وہ ہے۔ اس سے پھیپھڑا خراب ہو جاتا ہے۔ بڑی چیز جھوٹ بولنا ہے اور چوری کرنا ہے۔ وعدہ ہی کرنا ہے تو یہ وعدہ کرو کہ آئندہ نہ جھوٹ بولو گے اور نہ چوری کرو گے..."

"جی...... چوری...؟؟"

"ہاں بھئی چوری، تم دونوں جھوٹ بھی بولے اور چوری بھی کی۔ جھوٹ یہ کہ پوچھنے پر انکار کیا۔ اور چوری یہ کہ جلتی ہوئی سگریٹ کو پیچھے لے جاکر قمیض کے دامن میں چھپایا۔"

ہم دونوں بس رونے کے قریب تھے۔

انھوں نے کہا، "دیکھو، سگریٹ پینا ہو تو پیو، اس سے نقصان ہوتا ہے ہم اس کا علاج کرلیں گے، لیکن جھوٹ اور چوری سے روح بیمار ہوتی ہے اور روح کی بیماری کا کوئی علاج نہیں۔"

یہ تھے شفیق صاحب۔ محمد علی ہوسٹل کے وارڈن اور کالج میں معاشیات کے استاد۔ ہنستا ہوا روشن کتابی چہرہ، اور اس کی متوازی گھنی اور سیاہ درمیانی داڑھی۔ بڑا سا سر، چوڑی پیشانی۔ جس کے اوپر بائیں طرف کو کسی قدر جھکی ہوئی گاندھی ٹوپی۔ کھدر کا کرتا، پاجامہ اور صدری پہنے ہوتے۔ اور کندھے پر چادر تہہ کیا ہوا لمبا سا دوشالہ سینے پر دونوں طرف لٹکتا ہوا۔ پاؤں میں پمپ جوتا اور آنکھوں پر عینک۔ بھرا بھرا سا درمیانہ جسم، مسکراتی ہوئی آنکھیں۔ اور قد مناسبت سے کسی قدر کم۔ پورا نام شفیع الرحمٰن قدوائی۔

۲ طالب علمی اور جامعہ کی خدمت

۱۹۲۰ء میں گاندھی جی، مولانا محمد علی اور دوسرے قومی لیڈروں کی دعوت پر ذاکر صاحب کی رہنمائی میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے جن طلبا نے یونیورسٹی کی تعلیم چھوڑ کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نام سے ایک قومی درس گاہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ ان میں شفیق صاحب بھی آگے آگے تھے۔ وہ یونیورسٹی میں بی۔ اے کے طالب علم تھے اور رئیس لڑکوں کے ہوسٹل میں بڑے ٹھاٹ باٹ سے رہتے تھے۔ ہوسٹل کے ملازموں کے علاوہ ان کی خدمت کے لیے ان کا اپنا بھی ایک نوکر تھا۔ شفیق صاحب نے اس وقت یونیورسٹی ہی نہیں چھوڑی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنی زندگی کا وہ امیرانہ رنگ ڈھنگ بھی چھوڑ دیا۔ ان کے دوستوں سے سنا ہے کہ وہ ان سے اس بات کو چھپایا کرتے تھے کہ وہ ایک رئیس خاندان کے فرد ہیں۔

جامعہ سے شفیق صاحب نے ۱۹۲۵ء میں بی۔ اے پاس کیا اور کالج کی تعلیم سے فارغ ہوتے ہی جامعہ کے استادوں میں شامل ہو گئے۔ ان سے میرا تعلق سب سے پہلے ۱۹۳۳ء میں ہوا جب وہ انٹرمیڈیٹ میں معاشیات پڑھاتے تھے۔ اور کالج کے بورڈنگ، محمد علی ہوسٹل کے اتالیق تھے۔

دسمبر ۱۹۲۷ء میں امیرِ جامعہ حکیم اجمل خاں صاحب کے انتقال کے بعد جامعہ کے اوپر بہت بُرے دن آگئے تھے اور اس کے بند ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ذاکر صاحب اس وقت شیخ الجامعہ تھے۔ انھوں نے جامعہ کو قومی لیڈروں کا سہارا لیے بغیر قائم رکھنے اور چلانے کا فیصلہ کیا۔ ان کی اس مہم میں جامعہ کے جن استادوں اور کارکنوں نے ان کا ساتھ دیا۔ ان میں شفیق صاحب مرحوم بھی شامل تھے۔ بلا کسی شرط کے خدمت کرنے کے عہدنامے پر سب سے پہلے شاید انھی نے دستخط کیے تھے۔

۳۔ جامعہ کے بھکاری

یہ فیصلہ ہونے کو تو ہو گیا لیکن سرمایے کے نام سے بس اللہ کا نام تھا۔ ذاکر صاحب اور شفیق صاحب جامعہ کے لیے چندہ جمع کرنے نکلے۔ بڑی مشکل سے ریاست حیدرآباد سے ایک ہزار روپیہ ماہوار کی امداد منظور ہوئی۔ لیکن ۱۹۳۰ء میں آزادی کی جنگ چھڑی اور شفیق صاحب اس میں کود پڑے۔ تو یہ امداد بند ہو گئی۔ شفیق صاحب جیل سے نکلے اس خبر سے انھیں صدمہ ہوا اور انھوں نے قوم سے امداد مانگنے کا پروگرام بنایا" اور شعبۂ ہمدردانِ جامعہ" کے نام سے چندہ جمع کرنے کی ایک باقاعدہ تحریک شروع کر دی۔ ہمدردانِ جامعہ کی اس تحریک میں شفیق صاحب اور ان کے ساتھی خود گھر گھر چندہ مانگنے جایا ہی کرتے۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں انھوں نے جامعہ کے طالب علموں کو بھی اس میں شریک کیا۔ ہر طالب علم کو جو اس تحریک میں شامل ہونا چاہتا، جامعہ کے لٹریچر کا ایک سیٹ جسے انھوں نے بڑے اہتمام سے تیار کیا تھا اور طالب علم کی ہمت اور حوصلے کے مطابق مناسب تعداد میں "ہمدردی" (چندے کا وعدہ کرنے کا فارم) دے کر اُسے ہدایات دیتے تھے۔ ان ہدایات میں "چندہ، کا گُر" خاص طور پر سمجھاتے:

"دیکھیے، لوگ کبھی کبھی جوش میں آکر چندے کی بڑی بڑی رقموں کا وعدہ کر لیتے ہیں، لیکن جب جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے تو وعدے سے کم دینا شان خلاف سمجھتے ہیں اور دوسری طرف پورا چندہ دینا محسوس ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چپ ہو کر بیٹھ رہتے ہیں، اس لیے آپ جب کسی کے پاس چندہ مانگنے جائیں اور وہ کسی بڑی رقم کا وعدہ کرے تو اس سے کہیے یہ رقم زیادہ ہے، آپ کا نام سن کر اور بھی بہت لوگ مانگنے آئیں گے، جامعہ ہی کو اتنی رقم دے دی تو دوسرے آپ کے فیض سے محروم ہو جائیں گے۔ خواہش ہے کہ آپ کم سے کم رقم لکھیں" (باقی آئندہ)

ایک طالبِ علم کی کہانی

دہلوی حمد کی یہ کتاب دلچسپ بھی ہے اور سبق آموز بھی جس سے بچے اور بڑے سبھی کچھ نہ کچھ سیکھتے ہیں۔ اس کتاب پر مرکزی سرکار سے انعام بھی مل چکا ہے۔ قیمت ؎



جامعہ کی یہ بستی بڑی مشکل سے بسائی گئی ہے۔ اس نے کئی انقلاب دیکھے ہیں۔ بہت سی موجوں کے تھپیڑے کھائے ہیں۔ اس کی جگہ بدلی ہے۔ علی گڑھ سے قرول باغ دہلی آئی، دہلی سے جامعہ نگر (اوکھلا) آئی۔ مگر تعلیم کے میدان میں اس نے اپنا مقام نہیں بدلا۔

ہماری زبان (اردو) کے شاعروں نے اپنی بہترین نظموں میں جامعہ کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ اس کے جو گن گائے ہیں، اس سے جامعہ کی عظمت کا اور ملک و قوم کے لیے جو خدمت اس نے انجام دی ہیں ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس طرح ہمارے شاعروں کی یہ نظمیں جامعہ کی پچاس سالہ زندگی کی آئینہ دار ہیں۔ یہ بڑی ہی دل کش بھی خوب صورت اور دلنشین ہیں۔ ان میں آپ جامعہ کے ہر دور کی جھلک دیکھ سکتے ہیں۔

اس تھوڑے سے وقت میں ہم کو جن شاعروں کی نظمیں حاصل ہوسکی ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) جامعہ کا یوم تاسیس ..... لسان القوم حضرت صفی لکھنوی مرحوم
(۲) ہماری جامعہ ..... حضرت مولانا شرف الدین صاحب مرحوم
(۳) جامعہ کا سنگ بنیاد ..... پروفیسر حافظ محمد اسلم صاحب

شاعروں کی نظر میں

جے راجپوری مرحوم

جامعہ ملیہ اسلامیہ ..... حضرت آسد ملتانی مرحوم

(۵) جامعہ کا پرچم ..... جناب مولانا شفیع الدین صاحب نیر

(۶) معجزہ ..... ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری

(۷) جمال جامعہ ..... شاعر حیات جناب یحییٰ اعظمی صاحب

(۹) جامعہ کا ترانہ ..... جناب محمد خلیق صاحب صدیقی لکچرار جامعہ کالج۔

(۱۰) جامعہ کی کہانی ..... سید منیر الحسن منیر (مرتب)

اس تمہید اور فہرست کے بعد ان کی نظمیں پیش خدمت ہیں۔ کس درجے اور مرتبے کی ہیں۔ اس کا فیصلہ کرنا آپ کا کام ہے۔ ہم نے تو یہ تحفہ پیام تعلیم کے جوبلی نمبر کے ذریعے آپ تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔ امید ہے کہ اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

مرتب

جامعہ کا یومِ تاسیس

لسان القوم حضرت صفی لکھنوی مرحوم

یہ نظم حضرت صفی نے جامعہ کے یومِ تاسیس کے موقع پر ۲۹ اکتوبر ۱۹۲۶ء کو قرول باغ کے ایک جلسے میں پڑھی تھی جو جامعہ کا یوم تاسیس منانے کے لیے منعقد کیا گیا تھا۔

یومِ تاسیسِ جامعہ ہے آج — نطق مہمانِ جامعہ ہے آج
جامعہ درس گاہِ اسلامی — دل کشا شاہ راہِ اسلامی
قابلِ قدر ادارۂ ملی — زیبِ آغوشِ خطۂ دلی
اپنی تعلیم پھر نصاب اپنا — کیوں نہ کالج ہو کامیاب اپنا
یونہی جب تک کہ بادہ نوش ہیں — ہاتھ سے شیخِ جامعہ کے پئیں
جامعہ کی بنا پڑے جلدی
آئیں پھر ہم قرول باغ صفی

ہماری جامعہ

حضرت مولانا شرف الدین صاحب یاسؔ

مولانا شرف الدین صاحب نے یہ نظم ۱۹۳۲ء میں لکھی۔ اس میں آپ جامعہ کے "مرزا پھویا" سے ملاقات کریں گے۔ دیکھیے کس سادگی سے واقعات کو نظم کیا ہے۔

دہلی میں ہے ایک مدرسہ — جامعہ اس کا نام ہے بیٹا
تم کو وہاں میں پہنچا دوں گا — خوب وہاں پر پڑھنا لکھنا
ابا کا جب سنا یہ کہنا — دھک سے کلیجہ ہو گیا میرا

ـه اس سے مراد جامعہ کی اپنی عمارت ہے۔



سسکیاں لے کر رونے لگا میں آنسو لیے منہ دھونے لگا میں
دی اماں نے مجھ کو تسلّی یہں آنے پر ہو گیا راضی

....

مجھ کو ابّا جامعہ لاتے دیکھنے مجھ کو بچّے آئے
پیار سے مجھ کو پاس بلایا اور اک اچھا قصہ سنایا
مجھ سے کہا بہلا لو دل کو ساتھ میں آؤ کھیلو کودو
پنجرا اچھا یہ کیسا ہے طوطا اس میں پلا ہوا ہے
لے لو مدھولی صاحب آئے ہاتھ میں کچھ تصویریں لائے
روز ہمیں ہیں تاش دکھاتے اور کہانی ایک سناتے

....

اب یہ کیسی بجی ہے گھنٹی یہ گھنٹی ہے باغیچے کی
کھیلنا پڑھنا کھیت کی محنت لگ گئی سب کاموں میں طبیعت
گھر پر سب یہ حال لکھوں گا خوش خبری ابّا کو دوں گا
جامعہ میں آرام سے ہیں ہم اور خوش اپنے کام سے ہیں ہم
جامعہ کا ہر کام ہو اچھا
دنیا بھر میں ہو اس کا چرچا

جامعہ کا سنگ بنیاد

از

پروفیسر حافظ محمد اسلم صاحب جیراجپوری مرحوم

یہ نظم جامعہ نگر (اوکھلا) دہلی میں جامعہ کی پہلی عمارت کا سنگ بنیاد رکھے جانے کی تقریب پر مولانا نے پڑھ کر سنائی تھی۔ اس عمارت کا سنگ بنیاد ایک چھوٹے سے بچّے نے رکھا تھا۔ یہ بات یکم مارچ ۱۹۳۵ء کی ہے۔ افسوس کہ مکمل نظم نہ مل سکی صرف اس کے دو شعر حاضر ہیں۔

گو نہیں ساقی مگر ساقی کا جامِ آتشیں!
رات دن گردش میں رندوں کی بھری محفل میں ہے
عشرتِ شاہی میں بھی حاصل نہیں پرویز کو!
وہ مزا جو کوہکن کی سعیٔ[1] بے حاصل میں ہے

جامعہ ملّیہ اسلامیہ

(کو دیکھ کر ایک شاعر کے قلبی تاثرات)

از

حضرت اسد ملتانی مرحوم۔

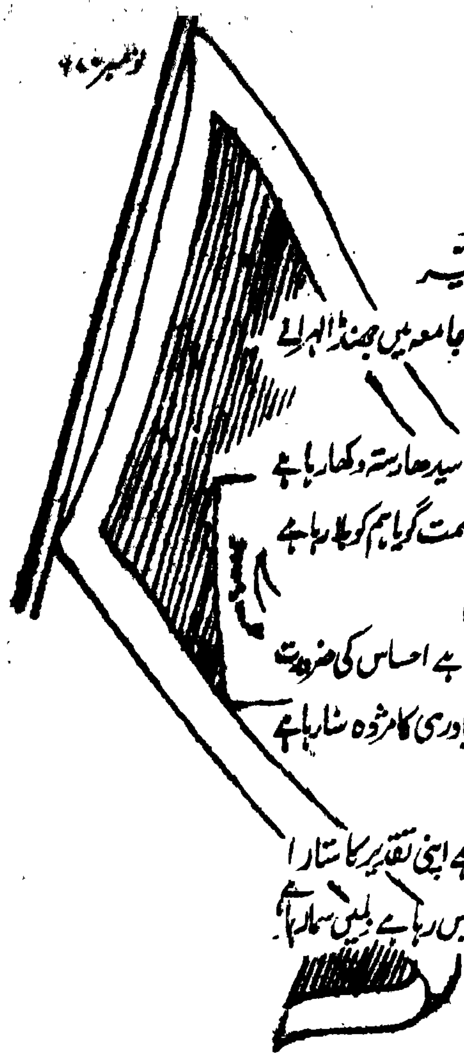
یہ نظم اسد صاحب نے ۱۹۴۲ء میں جامعہ کے ایک مشاعرے میں پڑھ کر سنائی تھی۔ اس وقت جامعہ اپنی تعلیمی بستی جامعہ نگر میں آباد ہو چکی تھی۔

کسی دن جامعہ کو آکے دیکھو — اگر تم کو خدا نے دل دیئے ہیں
یہاں استاد ہیں ایسے جنھوں نے — سمندر علم و عرفاں کے پئے ہیں
پڑے تھے علم کے دامن میں جو چاک — قلم کی نوک سے وہ سب سئے ہیں
کئی میداں ہیں علمی رہبری کے — جو اہلِ جامعہ نے سر کئے ہیں
خلاف اس کے جو ناداں ہیں انھوں نے — کبھی کچھ شور و شر بھی کر لیے ہیں
مگر اہلِ بصیرت جامعہ کو — خلوصِ دل سے آنکھوں پر لیے ہیں
عمارات[2] اس کی آکر دیکھیے تو — کہ کیا جنگل میں منگل کر دیئے ہیں

نہیں یہ اجلے اجلے اس کے گنبد
ہمائے علم نے انڈے دیئے ہیں

[1] مولانا نے یہ "سعیٔ بے حاصل" کوہکن کی رعایت سے لکھی ہے۔ ورنہ جامعہ کے استادوں نے یہ تقریب "سعیٔ مشکور" رکھ کر سنائی تھی۔

[2] جامعہ اب جس جگہ آباد ہے۔ پہلے یہ علاقہ بالکل غیر آباد اور جنگل تھا۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔



جامعہ کا پرچم

از. مولانا شفیع الدین صاحب نیّر

نیّر صاحب نے یہ نظم سنہ ۱۹[illegible]ء میں لکھی. جو آج بھی جامعہ میں جھنڈا لہرانے کے وقت ذوق و شوق کے ساتھ پڑھی جاتی ہے۔

تعلیم و تربیت کا نقشہ جما رہا ہے — علم و عمل کا سیدھا رستہ دکھا رہا ہے
کچھ اس طرح فضا میں یہ لہلہا رہا ہے — خدمت کی سمت گویا ہم کو بلا رہا ہے

یہ جامعہ کا پرچم، یہ جامعہ کا پرچم

ہم کو بتا رہا ہے رازِ عروجِ ملت — ہم کو جتا رہا ہے احساس کی ضرورت
لازم ہے یہ کہ سیکھیں ہم فرضِ آدمیت — قدرت کی یاوری کا مژدہ سنا رہا ہے

یہ جامعہ کا پرچم، یہ جامعہ کا پرچم

اس کی بلندیوں سے ظاہر ہے یہ اشارا — شاید یہی ہے اپنی تقدیر کا ستارا
ٹوٹے ہوئے دلوں کا اس دیس میں سہارا — آنکھوں میں بس رہا ہے بلیں سما رہا ہے

یہ جامعہ کا پرچم، یہ جامعہ کا پرچم

معجزہ

از:. ابوالاثر حضرت حفیظ جالندھری

اب جامعہ کو قائم ہوئے پچیس سال پورے ہو چکے تھے. جامعہ اس کم عمری کے باوجود مشرق میں ایک روشن شمع کی حیثیت اختیار کر چکی تھی. شاعر حفیظ کے لیے یہ بات کسی معجزے سے کم نہ تھی. چنانچہ حضرت حفیظ نے اپنی یہ نظم جامعہ کی سلور جوبلی کے خاص جلسے کے موقع پر ۱۷ نومبر سنہ ۱۹۴۶ء کو پڑھ کر سنائی. اس جلسے کی صدارت نواب صاحب بھوپال مرحوم نے فرمائی. اور ہندوستان کے تمام بڑے بڑے لوگ یعنی حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت جواہر لال نہرو، شری راج گوپال آچاریہ، قائد اعظم محمد علی جناح، نواب زادہ لیاقت علی خان، امیر جامعہ عبدالمجید خواجہ، سر شیخ عبدالقادر، مولانا سید سلیمان ندوی وغیرہ نے شرکت فرمائی. یہ جلسہ بھی شیخ الجامعہ ذاکر صاحب کی گراں قدر

شخصیت کا ایک اعجاز تھا۔ ایسے نمائندہ مجمع میں حضرت حفیظ نے اپنی یہ نظم سنائی۔ پوری نظم تو نہ مل سکی صرف ایک شعر دستیاب ہوا۔ بہر حال اس ایک شعر سے ہی نظم کی اٹھان اور اس اثر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ شعر یہ ہے۔

یہ امت جب کبھی اپنی زیاں کاری کو جانے گی
وجود اس جامعہ کا معجزہ سے کم نہ مانے گی

جمالِ جامعہ

از:۔ شاعر حیات جناب کلیمؔ اعظمی صاحب

جامعہ کے جشن سیمیں (سلور جوبلی) کے موقع پر کلیمؔ صاحب نے یہ نظم نومبر ۱۹۷۶ء میں بڑے ہی دلکش انداز میں کہی۔

دیارِ شرق میں یہ جامعہ وہ بیتِ حکمت ہے
مسلّم دانشِ مغرب کو بھی خود جس کی عظمت ہے

ادب آموزِ ملت ہے ہنر افروزِ ملت ہے
کہ نصب العین اس کا مذہب و دانش کی خدمت ہے

یہی ہے ابتدائے آفرینش سے شعار اس کا
ہے ذرہ ذرہ ایوان کا آئینہ دار اس کا

وہ جس کا مدّعا تعلیم بھی ہے۔ تربیت بھی ہے
جہان عصر کے فکر و نظر کی حریت بھی ہے!!
شغف آداب نو کا علم دیں کی معرفت بھی ہے
وہ جس کا امتیاز" اسلامیت بھی ملیت" بھی ہے

دیا ہے درس نو جس نے وطن کے نکتہ دانوں کو
حیاتِ تازہ دی ہے جس نے ملت کے جوانوں کو

مبارک ہو مبارک ایسی کی چہرہ افروزی
مبارک ہو مبارک یہ ادب کی جشن افروزی
مبارک ہو مبارک یہ کمالِ حکمت آموزی
مبارک ہو مبارک یہ جمالِ دانش اندوزی

بجا ہے غرقِ تابش اب جو یہ ایوان سارا ہے
رخِ لیلائے دانش بے نقاب اب جلوہ آرا ہے

سنیں آکر کہاں ہیں ہنسنے والے گوشِ عبرت سے
صدا یہ آرہی ہے صاف انصاری کی تربت سے
کہ اے بادِ صبا کہہ دے مسیحِ ملک و ملت سے
لحد میں سونے والے پیکرِ تمکین و عبرت سے

کہ جس بیمارِ غم کی آپ نے کی تھی مسیحائی
خود آکر دیکھئے اے کاش آج اس کی توانائی

جھکے سجدے میں سر کیوں کر نہ اہلِ نیایش کا
کہ سر اونچا ہوا علم و ادب کے فخر و نازش کا
ادا ہو کس زباں سے شکر یارب اس نوازش کا
کہ ہے پچیسواں سال آج اس ایوانِ دانش کا

ملا صد شکر معراجِ ادب کا مرتبہ اس کو
بجا ہے آج اگر کہیے وطن کا قرطبہ اس کو

جامعہ کا ترانہ

از: جناب محمد خلیق صاحب

آج کل جامعہ میں خلیق صاحب کا لکھا ہوا یہ ترانہ بہت مقبول ہے اور جامعہ کے جلسوں میں بڑے ذوق و شوق اور تیاری کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔

دیارِ شوق میرا، شہرِ آرزو میرا

ہوئے تھے آکے یہیں خیمہ زن وہ دیوانے — اٹھے تھے سن کے جو آوازِ رہبرانِ وطن
یہیں پہ شوق کی بے ربطیوں کو ربط ملا — اسی نے ہوش کو بخشا جنوں کا پیراہن
یہیں پہ لالۂ صحرا کو یہ سراغ ملا — کہ دل کے داغ کو کس طرح رکھتے ہیں روشن

دیارِ شوق مرا، شہرِ آرزو میرا

یہ اہلِ شوق کی بستی یہ سرپھروں کا دیار — یہاں کی صبح نرالی یہاں کی شام نئی
یہاں کی رسم و رہِ میکشی جدا سب سے — یہاں کے جام نئے طرحِ رقصِ جام نئی
یہاں پہ تشنہ لبی میکشی کا حاصل ہے — یہ بزمِ دل ہے یہاں کی صلائے عام نئی

دیارِ شوق مرا، شہرِ آرزو میرا

یہاں پہ شمعِ ہدایت ہے صرف اپنا ضمیر — یہاں پہ قبلۂ ایمان کعبۂ دل ہے
سفر ہے دین یہاں کفر ہے قیام یہاں — یہاں پہ راہ روی خود حصولِ منزل ہے
شناوری کا تقاضا ہے نذرِ طوفاں — کنارِ موج میں آسودگیٔ ساحل ہے

دیارِ شوق مرا، شہرِ آرزو میرا

جامعہ کی کہانی

از منیر الحسن منیرؔ

جامعہ کو قائم ہوئے ۲۹ اکتوبر سنہ ۱۹۷۰ء کو پچاس سال پورے ہو جائیں گے
اس نظم میں جامعہ کی پچاس سالہ زندگی پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

کہانی جب بھی اس کی ارتقا کی یاد آتی ہے — فضا میں ہر طرف اک روشنی سی پھیل جاتی ہے
ندا اس کی پیامِ حریت بن کر کے آتی ہے — عمل کی تابناکی اس کو روشن کرتی جاتی ہے
وہ جوہر جامعہ کو جس نے اک قوتِ عطا کی ہے — حقیقت یہ ہے اس پر جان بھی اپنی فدا کی ہے
بچا کر لاتی ہے جو قوم کو ذہنی غلامی سے — یہی اب منزلیں طے کر رہی ہے تیز گامی سے
ارادے اس میں شیخ الہند کے کروٹ بدلتے ہیں — مسیح الملک کے ایثار میں آکر جو ڈھلتے ہیں
گراں مایہ سہی وہ اک شخصیت یعنی کہ انصاری — بنامِ جامعہ جس نے لگا دیں قوتیں ساری

حقیقت بن کے اب اس خواب کے نقشے ابھرتے ہیں
جہاں پر خوش سوادی روح پرور رنگ ابھرتے ہیں

قوم نے سونپی تھی آخر اس کی سرداری
ہے جن کے فیض سے ہر ذرہ یاں کا ایک چنگاری

نتیجہ یہ ہوا اس کا جماعت اک بنی ایسی
وفاداری کا جس نے عہد باندھا پیش قدمی کی

غرض جو ان کے بانی تھے وہ انساں تھے عجب جن کے
یہاں پہ لے کے آئے اچھے اچھے لوگ وہ چن کے

پھر اس کشتی کے بن کر ناخدا ذاکر حسین آئے
جو تہذیب و تمدن کی وراثت ساتھ میں لائے

تلاطم خیز طوفانوں سے جو اس کو بچا لائے
انھی کے دست و بازو بن کے عابد اور مجیب آئے

پھر اس کی آبیاری اس طرح کی سوز پنہاں سے
کہ سلور جوبلی بن کر یہ نکلی تھی رگِ جاں سے

یہاں تعلیم بنیادی کے نکتے سب کو سمجھاتے
رموز اس کے پھر اپنوں اور بیگانوں کو بتلاتے۔

اگرچہ راہ میں لمحات نازک بار بار آتے
مگر منزل بہ منزل چل کے اب تک کامگار آتے

مجیب باصفا نے بوجھ اب اس کا سنبھالا ہے
ترقی کی نئی اک راہ پر اب اس کو ڈالا ہے

رواداری سے اس کو اور بھی اونچا اٹھایا ہے
اور اس کے جشن زریں کا نیا مژدہ سنایا ہے۔

مکتبہ جامعہ نے بچوں کے لیے بہت سی عمدہ مذہبی کتابیں شائع کی ہیں۔ یہ کتابیں مسلمانوں کے ہر طبقہ میں پسند کی گئی ہیں اور لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہو چکیں۔ آج بھی یہ کتابیں بہت سے مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہیں۔

ہندی کی تعلیم عام ہونے کے باعث اس کی ضرورت سمجھی گئی کہ ان کتابوں کو ہندی رسم الخط میں شائع کیا جائے تاکہ وہ بچے جو صرف ہندی پڑھ رہے ہیں اپنے مذہب سے ناواقف نہ رہ سکیں۔ سرِ دست دو کتابیں "ہمارے نبیؐ" اور "حضرت محمدؐ" ہندی پڑھنے والے بچوں کے لیے بہت احتیاط سے شائع کی گئیں ہیں۔

ہمارے نبیؐ ــــ ۴۸ پیسے

حضرت محمدؐ ــــ ۴۸ پیسے

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

عبدالسلام قدوائی ندوی

جامعہ میں چند دن
کچھ خوشگوار یادیں

جامعہ کا نام یوں تو کانوں میں پہلے ہی پڑ چکا تھا مگر واقفیت کسی قدر ۱۹۲۴ء میں ہوئی جب میرے ایک دوست محمد اکبر صاحب (لکچرر عربی کلکتہ یونیورسٹی) ندوہ سے جامعہ گئے۔

ندوہ میں جہاں تک وہ پڑھ چکے تھے۔ اس کا سلسلہ جامعہ میں جاری رکھنا ممکن نہ ہو سکا۔ اس لیے چند دن بعد وہ ندوہ واپس آگئے۔ واپسی میں جامعہ کا لٹریچر بھی ساتھ لائے تھے۔ اسے دیکھ کر مجھے جامعہ سے سرسری واقفیت ہو گئی۔

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد لکھنؤ میڈیکل کالج کی محفل میلاد میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ وہاں جامعہ کے ایک پرانے طالبعلم سے ملاقات ہوئی۔ نام تو یاد نہیں رہا۔ مگر ان کی دھندلی سی صورت اب بھی ذہن میں ہے۔ موقع کی مناسبت سے انھوں نے جامعہ کے میلاد کا ذکر کیا اور کہا کہ وہاں پہلے بہت سے مقرر وہ صفات بیان کرتے ہیں جو ایک معیاری پیغمبر میں ہونی چاہئیں۔ پھر خواجہ عبدالمجید[1] اپنی تقریر میں یہ ثابت کرتے تھے کہ یہ سب اعلیٰ صفات محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں پورے طور پہ پائی جاتی تھیں۔

اس کے بعد مجھے خود جامعہ سے لگاؤ ہو گیا اور میں اس کے بارے میں مزید معلومات حاصل کرتا رہا۔ جامعہ تحریک ترک موالات[2] کی بدولت قائم ہوئی تھی۔ دو سال تک تو بڑا جوش رہا اور قوم جامعہ کی طرف متوجہ رہی۔ لیکن اس تحریک کا اثر جیوں جیوں کم ہوتا گیا جامعہ بھی کمزور ہوتی گئی۔ ۱۹۲۵ء میں تو نوبت آگئی کہ اسے بند کر دینے کی تجویزیں ہونے لگیں۔ مگر گاندھی جی کی توجہ، حکیم اجمل خاں کی کوششوں اور کے طالب علموں اور استادوں کی ہمت سے جامعہ زندہ رہ گئی۔

حکیم صاحب اسے علی گڑھ سے دہلی لے آئے۔ کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب برلن سے آگئے اور نئے جوش اور ولولے کے ساتھ کام شروع ہوا۔

---

[1] اس زمانہ میں شیخ الجامعہ تھے۔

[2] اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ انگریزی حکومت سے تعاون نہ کیا جائے، تعلیمی بائیکاٹ اسی کا ایک حصہ تھا۔

نومبر ۱۹۲۶ء میں کانپور میں حکیم اجمل خاں صاحب کی صدارت میں ندوہ کا سالانہ جلسہ ہوا۔ پہلی مرتبہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کو یہیں دیکھا۔ جلسہ کے بعد ذاکر صاحب لکھنؤ آئے۔ اور دو تین دن ندوہ میں قیام کیا۔ یہاں ان کی تقریر سنی، ملنے اور بات چیت کرنے کا موقع ملا۔

چار برس کے بعد ۱۹۳۰ء میں ندوہ کی تعلیم ختم ہو گئی تو جامعہ آنے کا خیال ہوا۔ لیکن داخلہ کی دشواری کے ساتھ مالی مشکلات بھی راہ روک رہی تھیں۔

آخر اپنے حالات لکھ کر ڈاکٹر صاحب کو بھیجے۔ ان کے جواب سے ہمت بندھی اور اللہ کا نام لے کر ہم تین دوست (ایس احمد جعفری، عبدالمجیب سہالوی اور میں) جامعہ پہنچ گئے۔

ڈاکٹر صاحب محبت سے ملے اور ہم لوگوں کا داخلہ درجۂ خاص میں ہو گیا۔ اس درجہ میں عربی مدرسوں کے فارغ طلبہ داخل ہوتے تھے۔ اور انگریزی زبان اور نئے علوم کی تعلیم حاصل کرتے تھے اور پھر ضروری قابلیت ہو جانے کے بعد انٹر اور بی اے کا امتحان دے دیتے تھے۔

کئی سال ہم لوگ جامعہ میں رہے انگریزی زبان اور نئے علوم سے تھوڑی بہت جو بھی واقفیت ہے وہ صرف جامعہ کا فیض ہے۔

جامعہ میں عربی مدرسوں کے طالب علموں کی تعلیم کا خاص اہتمام تھا مولانا محمد علی اور جامعہ کے دوسرے بانیوں نے مدرسوں کی اصلاح کی طرف خاص توجہ کی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ دینی اور دنیاوی تعلیم میں کچھ تال میل پیدا ہو تاکہ دینی عالم کچھ دنیا کو بھی سمجھیں، اور نئے تعلیم یافتہ بھی دینی تعلیم سے واقف ہوں۔ جامعہ کے بنانے اور چلانے والے چاہتے تھے کہ نئے اور پرانے لوگوں کے درمیان جامعہ ایک سنگم (پل) کا کام دے۔

مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کے ساتھ جامعہ میں دوسرے فرقوں کے لیے بھی ان کی تعلیم کا انتظام تھا۔ اردو کے ساتھ ہندی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ جامعہ کے لوگوں میں تعصب تو نام کو بھی نہیں تھا۔ مختلف مذہبوں اور تہذیبوں کے لوگ اس طرح محبت کے ساتھ میل جل کر رہتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب ایک خاندان کے لوگ ہوں۔ استادوں اور طالب علموں میں بھی باپ بیٹوں کا سا تعلق تھا۔ لڑکے استادوں کا ادب کرتے تھے اور استاد شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔

ہم لوگ ۱۹۳۰ء میں جامعہ میں داخل ہوئے تھے۔ اس زمانے میں ملک میں ۱۹۲۰ء اور ۱۹۲۱ء کے درمیان بھائی چارہ کی فضا نہ تھی۔ جا بجا فساد بھی ہو جاتے تھے اور طالب علموں اور استادوں کے درمیان جھگڑے بھی ہونے لگے تھے۔ لیکن جامعہ کے اندر محبت اور خلوص کی فضا بدستور قائم تھی۔

ایک مرتبہ جامعہ کے ایک پرانے طالب علم کیلاش ناتھ کول نے ملک میں فرقہ وارانہ جھگڑوں سے تنگ آکر ڈاکٹر ذاکر حسین سے کہا کہ ڈاکٹر صاحب

اس عداوت و اختلاف کے زمانے میں ہمارے جیسے
لوگ کہاں رہیں؟ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا: "جامعہ
میں آجائیے"۔

ڈاکٹر صاحب کے اس قول میں کچھ مبالغہ
نہیں تھا۔ واقعی جامعہ میں سکون اور اطمینان اور
محبت و اعتماد کی ایسی ہی فضا موجود تھی۔

۱۳ اپریل کو جلیان والا باغ کی یاد منائی
جاتی تھی۔ جہاں انگریزی حکومت کی طرف سے نہتے اور
پرامن ہندوستانیوں پر گولیوں کی بوچھار کی گئی تھی اور
انھیں بہت بری طرح ستایا اور مارا گیا تھا۔

اس دن جامعہ کے تمام ملازموں کو چھٹی دے
دی جاتی تھی۔ بھنگی، خاکروب، چوکیدار، بھشتی، بیرا
سب کی چھٹی ہوتی تھی اور ان کا کام طالب علم اور استاد
کرتے تھے۔ کمروں میں جھاڑو دینا، نالیوں کی صفائی،
کنوئیں سے پانی بھر کر بورڈنگ میں لانا، کھانا پکانا۔
سارے کام طالب علم اور استاد کرتے۔

سب سے مشکل کام پاخانوں کی صفائی کا
تھا۔ یہ کام کالج کے بورڈنگ کے نگران شفیق الرحمن
صاحب قدوائی مرحوم اپنے ذمّے لیا کرتے تھے۔ ان
کے ساتھ کچھ طالب علم بھی لگ جاتے تھے۔ لڑکے اور
استاد مل کر کھانا پکاتے۔ جب کھانا تیار ہو جاتا تو
چھوٹے بڑے سب ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھاتے۔

مجھے قرول باغ کے زمانے کا بھنگی اب تک
یاد ہے۔ وہ خاص طور سے اس کھانے میں شریک ہوتا
تھا۔ سب ایک ساتھ کھانا کھاتے ایک گلا
پانی پیتے اور اپنے عمل سے ثابت کرتے کہ سب
بھائی بھائی ہیں۔ شام کو جلسہ ہوتا اور شیخ
موقع کی مناسبت سے ایک مؤثر تقریر کرتے۔
زمانے میں قرول باغ میں جامعہ کی صرف ایک
ہی تھی جو تعلیمی مرکز نمبر ۱ کہلاتی تھی۔ ڈاکٹر
کا خیال تھا کہ ایسے بہت سے تعلیمی مرکز بنائے
جو ملک کے گوشے گوشے میں پھیلے ہوں۔

ایک مرتبہ جامعہ کے یوم تاسیس
پر انھوں نے اپنے اس خیال کو ظاہر بھی کیا۔
تعلیم اور طالب علموں کے رہنے کے لیے اور دوسری
ضرورت کے لیے بہت سے مکان کرائے پر
گئے تھے۔ گلشن منزل، البشیر منزل، خاکسار
جوہر منزل، مرکزی کوٹھی ان عمارتوں کے نام
چار مرکزی کوٹھیوں کے ایک حصّے میں دفتر
کتب خانہ تھا۔ کالج کا بورڈنگ ہاؤس تھا۔
کے قریب تھی۔ قریب ہی بنگالی کوٹھی تھی۔ جو
کا کام دیتی تھی۔

جامعہ کی مالی حالت حکیم اجمل خاں
کے بعد بہت خراب ہو گئی تھی۔ حکومت مخالف تھی۔
حاصل کرنے میں دشواری تھی۔ اس لیے شفیق الرحمن
کی رائے ہوئی کہ سارے ملک میں جامعہ کے ہمدرد
حلقے بنائے جائیں۔

پہلے لوگوں کو یہ کام بہت مشکل معلوم

تھا لیکن شفیق الرحمن مرحوم نے اپنی محنت اور کوشش
سے اس مشکل کو آسان کر دیا۔ [illegible] ادارے کی
آمدنی ہونے لگی۔ اور اس کے بعد حکومت کی سختی اور
مخالفت کے باوجود جامعہ کا کام آگے بڑھنے لگا۔ قومی
رہنما جامعہ کے کارکنوں پر اعتماد کرتے تھے۔ ان کی تائید
سے بھی کام کرنے والوں کا حوصلہ بڑھتا تھا۔

شفیق صاحب مرحوم نے بالغوں کی تعلیم و تربیت
کی جانب بھی توجہ کی اور ان پڑھوں کو پڑھانے کے
علاوہ عوام کی زندگی سدھارنے اور ان کے اندر
سوجھ بوجھ پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ شفیق
صاحب کا قائم کیا ہوا یہ ادارہ تعلیم و ترقی کے نام سے
بہت عرصہ تک قائم رہا اور ہزارہا بالغوں کو پڑھانے
کے علاوہ معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لیے سینکڑوں
معلوماتی کتابیں شائع کیں۔ ان کوششوں کا اثر سارے
ملک پر پڑا۔ اور بالغوں کی تعلیم و تربیت کے لیے
بڑے پیمانہ پر کام ہونے لگا۔

جامعہ نے اردو زبان کو ذریعۂ تعلیم قرار
دیا تھا اس کا اثر یہ تھا کہ یہاں کے طالب علم اردو زبان کو
بہتر سمجھتے تھے۔ کتابوں کی تیاری اور اشاعت کے لیے
ایک مکتبہ اور پریس قائم کیا۔ ہم لوگوں کے زمانے میں
حامد علی خاں صاحب مرحوم اس کے منیجر تھے۔

مکتبہ جامعہ نے بڑی شہرت حاصل کی اور
کتابوں کو سلیقہ اور خوب صورتی کے ساتھ شائع
کرنے کا نیا طرز قائم کیا۔ مکتبہ نے اردو کے ساتھ ہندی

میں بھی متعدد کتابیں شائع کیں۔

ایک مرتبہ بابو پرشوتم داس ٹنڈن جامعہ
آئے تو انھوں نے مکتبہ میں ہندی کی یہ کتابیں دیکھ کر
ان کی بہت تعریف کی۔

اوپر ذکر آ چکا ہے کہ جامعہ کی مالی حالت اچھی
نہ تھی۔ کبھی کبھی تو روزمرہ کی چیزوں کا حاصل کرنا بھی
مشکل ہوتا۔ اکثر دکانداروں کا کئی کئی مہینے کا قرض چڑھ جاتا
اور کبھی کبھی وہ سامان دینا بند کر دیتے تو طالب علم اور
کارکن بھی سخت پریشانی میں مبتلا ہو جاتے۔ اس
پریشانی کو دور کرنے کے لیے ایک اتحادی دکان
کا خیال ہوا۔ حافظ فیاض صاحب رجسٹرار جامعہ نے
اس خیال کو پسند کیا اور ان کی توجہ سے کواپریٹو اسٹور
قائم ہو گیا۔ اس اسٹور سے جامعہ والوں کی ضرورتیں پوری
کرنے کے علاوہ طالب علموں میں تجارتی سوجھ بوجھ بھی
پیدا کی جاتی تھی۔

ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب کی سرکردگی میں
اردو اکادمی بھی اسی زمانے میں قائم ہوئی۔ اس کے
علمی جلسے اور مشاعرے آج بھی یاد کیے جاتے ہیں۔
ملک کے نامور اشخاص ان جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔
مشاعروں میں چوٹی کے شاعر شریک ہوتے۔
مثلاً اصغر گونڈوی۔ صفی لکھنوی، حسرت موہانی،
جگر مرادآبادی۔ سائل دہلوی، حفیظ جالندھری،
ظریف لکھنوی، جوش ملیح آبادی، [illegible]، ساغر
دہلوی۔ کس کس کے نام گنائے جائیں۔ شاعر جب اس

جامعہ

زمانے کے کئی مشہور شاعر جو جامعہ کے مشاعروں میں شریک ہوئے۔

اسی زمانے میں توسیعی خطبات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور ہندوستان کے نامور اصحاب کے علاوہ ڈاکٹر انصاری مرحوم کی کوششوں سے ترکی کے سابق امیر البحر حسین رؤف پاشا، ڈاکٹر بہجت وہبی اور خالدہ ادیب خانم نے مورکے کے خطبے دیے۔ خالدہ خانم کے خطبے "ترکی میں مغرب و مشرق کی کشمکش" کے نام سے چھپ بھی گئے ہیں اور آج بھی ترکی کی تاریخ پر کام کرنے والے ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

جلسوں میں جامعہ کا حسن انتظام دیکھنے کے لائق ہوتا تھا۔ وقت کی پابندی کا تو یہ حال تھا کہ ایک منٹ کی دیر بھی نہیں ہونے پاتی تھی............ اس میں صدر کا لحاظ بھی نہیں کیا جاتا تھا۔ ایسا کئی مرتبہ ہوا کہ مقررہ صدر صاحب وقت پر نہ پہنچ سکے تو ان کی جگہ دوسرا صدر بنا دیا گیا مگر جلسہ شروع ہونے میں دیر گوارا نہیں کی گئی۔

اسی زمانے میں اداروں کو چلانے کے لیے مالدار اور صاحب اثر اشخاص کو انتظامی کمیٹی کا صدر اور عہدہ دار بنایا جاتا تھا۔ چند سال جامعہ میں بھی یہی دستور رہا لیکن پھر جامعہ نے اس بارے میں بھی اپنی نئی راہ نکالی۔ اس نے اپنے کارکنوں اور استادوں ہی کو انتظامی اختیارات دے دیے۔ طلبہ بھی اپنی بورڈنگوں کا انتظام خود ہی کرتے تھے۔ بورڈنگ کا

نگران صرف مشیر رہتا تھا۔

شروع سال میں گرمیوں کی چھٹیوں سے پہلے جب سب اکٹھا ہوتے تو صحت یا تعلیم، نماز، صفائی اور کھانے کے مانیٹر منتخب کیے جاتے۔ ان سب کا سربراہ ہاؤس ماسٹر کہلاتا تھا۔ یہ لوگ خود لیڈر بناتے تھے اور تمام انتظامی کام انجام دیتے تھے۔

ہاؤس ماسٹر روزانہ ڈائری لکھتا تھا۔ ڈائری نگران کے پاس جاتی تھی اور اس کی روشنی میں نگران اپنی ڈائری بھی لکھتا تھا اور روزانہ شیخ الجامعہ کے پاس بھیجتا تھا۔ اس طرح شیخ الجامعہ چھوٹی چھوٹی باتوں سے باخبر رہتا تھا۔

جامعہ کی ورزش بھی اس زمانے میں دیدنی تھی۔ قرول باغ میں پہاڑوں کے درمیان ایک بڑا میدان تھا۔ نماز کے بعد صبح سورج نکلنے سے پہلے چھوٹے بڑے سب طالب علم اس میدان میں جمع ہو جاتے اور کیلاٹ صاحب کی ہدایت کے مطابق ورزش کرتے۔ اپنی عمر کے اعتبار سے طلبہ کی الگ الگ قطاریں ورزش کرتیں۔ سارا میدان بھرا ہوتا۔ جو لوگ باہر سے آتے وہ یہ سماں دیکھنے کے لیے صبح صبح میدان میں آ جاتے۔ کیلاٹ صاحب خود بھی ورزش میں شریک ہوتے۔ اگرچہ اس زمانے میں ان کو دمہ کا مرض شروع ہو چکا تھا اور سانس پھولنے لگتی تھی۔ گرمی ہو، سردی ہو، برسات ہو، کبھی ورزش میں ناغہ نہیں کیا۔

کھیلوں کے نگراں بھی کیلاٹ صاحب ہی تھے۔

کیلاٹ صاحب ورزش کو بہت ضروری سمجھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ جس کا جسم کمزور ہوگا اس کا دماغ بھی کمزور ہوگا۔

ایک زمانے میں وہ کالج کے بورڈنگ کے اتالیق بھی ہو گئے تھے۔ وہ خود عیسائی تھے لیکن مسلمان لڑکوں کو نماز کی تاکید کرتے تھے۔ اگر کوئی غفلت کرتا تو بازپرس کرتے۔ بڑی محبت سے سمجھاتے اور اسلامی تاریخ کے حوالے دیتے۔ اور کہتے کہ تمھارے بزرگوں نے دنیا میں ایسے اہم کام کیے ہیں تم انھیں کے جانشین ہو۔ اپنے بزرگوں کے کارناموں کو یاد رکھو اور ان کے نقشِ قدم پر چلو۔

محمد تقی نام کے ایک مسلمان بچے کو انھوں نے پالا تھا۔ اپنے لڑکے کی طرح اس سے محبت کرتے بڑی توجہ سے اس کو اسلامی تعلیم دلاتے نماز کی تاکید کرتے۔ عجیب مخلص انسان تھے۔ میں اس زمانہ میں بیمار تھا آنتوں کے غدود میں ورم ہو گیا تھا۔ کوئی سخت ورزش نہ کرسکتا تھا۔ کیلاٹ صاحب نے اپنی شفقت سے میدان میں ٹہلنے اور ہلکی ورزش کا انتظام کیا

بورڈنگ کی اتالیقی کے زمانے میں طلبا رکے خیالات کی کرکٹ ورزش بھی کراتے ہیں اور میدانی کھیلوں کی بھی تاکید کرتے ہیں لیکن ہم لوگوں کو اس ورزش نقصان پہنچاتا ہے۔

لڑکے تو شاید ورزش میں تخفیف چاہتے تھے مگر کیلاٹ صاحب نے کھانے کی زرتی کا اعلان کر دیا۔ روزانہ کھانے کے ساتھ پھل اور تیسرے پہر ایک ایک پیالہ یخنی ملنے لگی۔ رات کو سوتے وقت آدھ سیر دودھ ملتا۔ لڑکوں نے کہا کہ صاحب ہم اس کی قیمت کہاں سے ادا کریں گے۔ کیلاٹ صاحب کو معلوم تھا کہ لڑکوں کی مالی حالت اچھی نہیں ہے۔ فرمایا۔ "تم لوگ بے فکر ہو کر کھاؤ پیو قیمت کا انتظام میں کروں گا"

اور انھوں نے واقعی لڑکوں سے ایک پیسہ بھی زاید نہیں لیا۔ معلوم نہیں کس طرح انتظام کرتے تھے۔ میں ایک سال ان کی نگرانی میں رہا ہوں۔ بورڈنگ کا ایسا اچھا انتظام اور تعلیم کی طرف ایسی توجہ شاید ہی کبھی ہوئی ہو۔ کافی وقت بورڈنگ کی دیکھ بھال اور طلبہ سے تبادلۂ خیالات میں صرف کرتے تھے۔

بچوں کے مقبول و معروف شاعر
کیف احمد صدیقی
کی
بچوں کی نظموں کا مجموعہ
"دل چسپ نظمیں"

جناب [illegible] صاحب

تاروں سے

ننھے ننھے، پیارے پیارے
چم چم، چم چم نیلے نیارے
ہلکے پھلکے نور کے دھارے
نیل گگن کے راج دُلارے
جگمگ، جگمگ، جگمگ تارے
آجاؤ تم گھر جو ہمارے
تم ہو ہمارے ہم ہوں تمہارے

آؤ، آؤ، چھت پر آؤ
آ نہ سکو تو ہاتھ بڑھاؤ
اپنے ہاتھوں کھاؤ، کھلاؤ
دودھ، ملیدہ اور پلاؤ
جگمگ، جگمگ، جگمگ تارے
آجاؤ تم گھر جو ہمارے
تم ہو ہمارے، ہم ہوں تمہارے



کوٹھے میں وہ میری چھڑی ہے
اور یہ دس پیسے کی گھڑی ہے
گیند ہماری کتنی بڑی ہے
کھیلنے کو ہر چیز پڑی ہے
جگمگ، جگمگ، جگمگ تارے
آجاؤ تم گھر جو ہمارے
تم ہو ہمارے، ہم ہوں تمہارے

میں ہوں پڑا اس خاک کے گھر میں
تم ہو بسے آکاش نگر میں
لاکھ ہو دوری بیچ ڈگر میں
پھر بھی نہیں وہ میری نظر میں
جگمگ، جگمگ، جگمگ تارے
آجاؤ تم گھر جو ہمارے
تم ہو ہمارے، ہم ہوں تمہارے
رات میں کیوں تم آتے ہو؟
دن میں کہاں چھپ جاتے ہو؟
اپنے گھر کیا کھاتے ہو؟
نور کہاں سے پاتے ہو؟
جگمگ، جگمگ، جگمگ تارے
آجاؤ تم گھر جو ہمارے
تم ہو ہمارے، ہم ہوں تمہارے
تم کو ہو گی معلومات
مجھ کو بتا دو اتنی بات
کیا ہے دن اور کیا ہے رات؟
جاڑا، گرمی اور برسات؟
جگمگ، جگمگ، جگمگ تارے
آجاؤ تم گھر جو ہمارے
تم ہو ہمارے، ہم ہوں تمہارے



بچوں کے لیے عمدہ اور دل چسپ کتابیں

رابندر ناتھ ٹیگور
مشہورِ عالم ہندوستانی ادیب، شاعر اور فن کار۔ ٹیگور کی زندگی کے حالات ... بچوں کے لیے اس سے بہتر کوئی اور کتاب اُردو میں اب تک نہیں لکھی گئی۔
قیمت :-

میر انیس
یہ کتاب اُردو کے مشہور شاعر اور باکمال مرثیہ گو حضرت میر انیس پر بچوں کے لیے لکھی گئی ہے۔ میر انیس کی زندگی کے مکمل حالات بھی ہیں۔ ان کی شاعری کی خصوصیات بھی بتائی گئی ہے اور ان کے کلام کا ... گیا ہے۔
قیمت

سمندر کے نیچے
سلطانہ آصف

اس کتاب میں گہرے سمندر میں بسنے والے عجیب و غریب جانداروں اور انوکھے پیڑ ... حال قصّے کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ "سمندر کے کنارے" کی طرح یہ کتاب بھی معلومات سے بھری ہوئی ہے۔

اس نے کیا کہنہ جانا
آصف مجیب

ایک کتاب میں دو کہانیاں۔ دونوں مزیدار اور سبق آموز۔ عمدہ کتابت، صاف ... اور رنگین ٹائٹل۔
قیمت :-

تانبیل خاں
محمد حسین حسن

پچھورے میاں کی مزے دار آپ بیتی۔ کوئی انھیں پکڑ کر پانی کے جہاز پر لے گیا۔ جہاز ڈوب گئے، پھر کیا ہوا۔ یہ کہانی میں پڑھیے۔ بڑے مزے دار کہانی ہے۔
قیمت :-

تیس مار خاں کے کارنامے
...

وعدہ ہاں تیس مار خاں اور ان کے مریل گھوڑے ... کے کارنامے ہمارا نامے اتنے مزے دار ایسے دل چسپ کہ آپ ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جائیں گے۔ قیمت :-

تین اناڑی
...

گرو، بیلو اور ... تین بچے کیسی کیسی انوکھی شرارتیں کرتے ہیں ... ناول بالکل بچوں کی زبان میں لکھا گیا ہے۔



ٹیپو

یہ ڈراما مدرسہ ابتدائی جامعہ کے بچے موجودہ جشن جوبلی کے موقع پر اسٹیج کر رہے ہیں۔ یہ ڈراما رات کو دکھایا جائے گا۔

منظر ۱ :- والئی میسور سلطان حیدر علی کے محل کا اندرونی حصہ۔

حیدر علی بسترِ مرگ پر پڑا کراہ رہا ہے، اس کے درباری اُمراء آس پاس کھڑے ہیں۔

حیدر علی :- آہ! (کراہتا ہے)۔ آہ

دیوان پورنیا :- عالم پناہ۔

حیدر علی :- آہ ٹیپو۔

پورنیا :- اب تکلیف کیسی ہے عالم پناہ۔

حیدر علی :- فتح علی۔ ٹیپو۔

پورنیا :- میں حضور کا نمک خوار، پورنیا ہوں عالم پناہ، شہزادہ ٹیپو لشکر کے ساتھ بائیں گھاٹ میں مقیم ہیں۔

حیدر علی :- ٹیپو اب تک نہیں آیا!

میر قاسم :- عالم پناہ حضور کی ناسازئ مزاج کی اطلاع شہزادۂ عالم کو بھیج دی گئی ہے، اب حضور کی تکلیف کیسی ہے۔

حیدر علی :- اس وقت ہمیں کوئی تکلیف نہیں میر قاسم، تکلیف ہے تو بس یہی کہ اپنے لختِ جگر فتح علی کو دیکھنے سے پہلے ان آنکھوں کی روشنی ختم ہو جائے گی۔

پورنیا :- ایسا خیال نہ فرمائیے عالم پناہ، حضور ہم نمک خواروں کے سروں پر صد و سی سال سلامت رہیں۔

حیدر علی :- غلام علی شوستری۔

شوستری :- عالم پناہ۔

حیدر علی :- سید غفار

سید غفار :- عالم پناہ۔

حیدر علی :- میر قاسم اور دیوان پورنیا، مہا مرزا خاں تم لوگ سدا میرے فتح علی کا خیال رکھنا میرے بعد تم ــــ ٹیپو کے اسی طرح رہبر و مشیر رہو گے جس طرح میرے رہ چکے ہو تم ــــ جانتے ہو اگر اس وقت ہمارا کوئی دشمن ہے تو وہ انگریز ہیں جو اپنی طاقت، فریب، چالوں اور مکاری سے ہماری سرزمین کو ہم سے چھینے

[illegible] مسلسل کوشش کر رہے ہیں ہمیشہ
ان سے چوکنا رہنا اور میرے ٹیپو کا ساتھ
دینا۔ میرے بعد یہ ضرور سر اٹھائیں گے،
[illegible] سازشیں پھیلیں گی۔ وعدہ کرو
کہ اس سرزمین کی حفاظت کے لیے تم
اپنی جان کی بازی لگا دو گے۔

پورنیا :۔ آپ اطمینان رکھیں حضور۔

میر قاسم :۔ ہم سب قسم کھاتے ہیں عالم پناہ کہ سرزمین
میسور کو بدیسی طاقت کے پنجے سے بچانے
کے لیے ہم اپنے خون کا آخری قطرہ بھی بہا
دیں گے۔

حیدر علی :۔ کریم شاہ۔ کریم شاہ کہاں ہے؟

کریم شاہ :۔ ابا حضور۔

حیدر علی :۔ ہمارا مرزا ٹیپو کے پائیں گھاٹ سے لوٹنے
تک شاید دس دن لگیں۔ اس وقت تک
میسور کے تخت کا خالی رہنا مناسب نہیں،
ٹیپو کے سرنگاپٹم واپس ہونے تک
کریم شاہ تخت و تاج سنبھالے گا کریم شاہ

کریم شاہ :۔ ابا حضور۔

حیدر علی :۔ میں جانتا ہوں تم اپنے بڑے بھائی کا
سدا ادب لحاظ کرتے رہے ہو، میرے
بعد بھی اس سے کوئی سرتابی نہ کرو گے،
ٹیپو کے یہاں پہنچنے تک ہر کام ایسا ہی چلتا
رہنا چاہیے، جیسا ہمارے دورِ حکومت

میں تھا۔

کریم شاہ :۔ ابا حضور آپ کیا فرما رہے ہیں؟
ہمارے سر پر [illegible] بزرگ سایہ
رہیں گے۔ طبیب صاحب نے [illegible]
آپ بہت جلد اچھے ہو جائیں گے

حیدر علی :۔ کریم شاہ، ہم جانتے ہیں اس
موت کے پنجے میں گرفتار ہیں آخر
[illegible] ہیں۔ تم سے کچھ آخری باتیں
[illegible] ہیں۔

کریم شاہ :۔ ابا حضور!

حیدر علی :۔ تم رقص و سرود کے دلدادہ
لیکن یاد رکھو دشمن کے تن بے سر
کو ناچتا دیکھ کر ایک سچے سپاہی کو
کا لطف آتا ہے، توپ و تفنگ
آہنگِ سرود سے کہیں زیادہ مزہ
تلوار کی جھنکار پائل کی جھنکار سے
انگیز ہے۔

کریم شاہ :۔ ابا حضور!

حیدر علی :۔ یاد رکھو مردوں کی مسند
گھوڑے کی زین ہے۔ بہادر
جنگ کے جیت لینے سے جو خوشی حاصل
ہے وہ کسی جشن [illegible]
خدا گواہ ہے [illegible]
اور فرزند پائیں [illegible]

خدا کی تائید سے ہفت اقلیم کو فتح کر ڈالوں

آہ ۔

کریم شاہ:۔ ابا حضور!

حیدر علی:۔ آہ ٹیپو۔ ٹیپو کاش ہماری آنکھیں فتح علی کو دیکھ سکتیں، فتح علی، ٹیپو، ــــ ٹیپو ــــ

(حیدر علی کراہتا ہوا دم توڑ دیتا ہے)

(محل کی روشنیاں بجھ جاتی ہیں)

دوسرا منظر

پائیں گھاٹ میں ٹیپو کا خیمہ

(خیمہ سے باہر سرپٹ گھوڑا دوڑنے کی آواز سنائی دیتی ہے اور پھر ہانپتا ہوا ہما مرزا دائیں جانب سے خیمے میں داخل ہوتا ہے)

ہما مرزا:۔ خادم کورنش بجا لاتا ہے۔

ٹیپو:۔ کیا خبر ہے مرزا خاں، بڑے ہراساں دکھائی دیتے ہو۔

ہما مرزا:۔ غلام ایک نہایت منحوس خبر لے کر حاضر ہوا ہے۔

ٹیپو:۔ کیا خبر ہے، ابا حضور بخیریت ہیں؟

ہما مرزا:۔ شہزادۂ عالم، حضور عالی وقار سلطان حیدر علی ہمیں داغ مفارقت دے گئے۔

ٹیپو:۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

ہما مرزا:۔ اپنی آخری سانس تک وہ آپ کو یاد کرتے رہے۔

ٹیپو:۔ ناسازیٔ مزاج کی اطلاع ہمیں ملی تھی، لیکن خدا گواہ ہے ہم کبھی سوچ بھی نہیں سکتے تھے، کہ اس قدر جلد ابا حضور ہم سے بچھڑ جائیں گے، اور سایۂ خداوندی ہمارے سر سے چھن جائے گا۔

ہما مرزا:۔ سلطان مرحوم کی وصیت کے مطابق شہزادۂ خورد کریم شاہ کو سلطنت کے امور سونپے گئے ہیں۔

ٹیپو:۔ خدا کا شکر ہے۔

ہما مرزا:۔ لیکن خادم حضور کو واپس سرنگا پٹم لے جانے کے لیے حاضر ہوا ہے

ٹیپو:۔ نہیں، نہیں مرزا خاں یہ کیوں کر ممکن ہے۔

ہما مرزا:۔ سارے امراؤ رؤسا اور اعیانِ سلطنت حضور والا کے منتظر ہیں۔

ٹیپو:۔ لیکن مرزا خاں جب ابا مرحوم نے کریم شاہ کو امورِ سلطنت سونپے ہیں تو ہم سرنگا پٹم پہنچ کر کیا کریں گے۔

ہما مرزا:۔ حضور سلطان مرحوم کا یہ ارشاد تھا کہ شہزادۂ بزرگ کی واپسی میں شاید دن لگیں اس وقت تک تخت کا خالی رہنا مناسب نہیں، شہزادہ والا کے سرنگا پٹم لوٹنے تک شہزادۂ خورد کریم شاہ امورِ سلطنت سنبھالیں گے، وہ امیر و وزیرِ سلطنت جو

سلطان مرحوم کے سرہانے موجود تھے۔ ان
الفاظ کے گواہ ہیں، خادم وہ عرضیاں بھی ساتھ
لایا ہے جو حضور کی واپسی کے لیے اعیانِ دولت
نے خدمتِ عالی میں پیش کی ہیں، حضور فوراً
کوچ کا قصد کریں۔

ٹیپو :۔ یہ سب کچھ درست ہے ہمامرزا خاں مگر ہم
سوچ رہے ہیں۔

ہمامرزا :۔ حضور والا کا پائیں گھاٹ سے سرنگا پٹم
کی طرف روانہ ہو جانا از حد ضروری ہے،
سلطان مرحوم کا نے پالک ایاز خاں جس کو سابق
میں حیدر نگر اور کوڑیال بندر کا حکمران بنایا
گیا تھا سب کے سب قلعے انگریزوں کے حوالے
کر کے خود بہت ساز و جواہر اور نقد روپیہ
لے کر بذریعہ جہاز بمبئی روانہ ہو گیا ہے،

ٹیپو :۔ کیا ایاز خاں نے قلعے انگریزوں کے حوالے
کر دئے؟

ہمامرزا :۔ جی ہاں حضور والا اب حیدر نگر اور کوڈیال
بندر کے علاقوں اور قلعوں پر انگریز قابض
ہیں، اس کے علاوہ دوسرے بیسیوں
بدخواہ سلطان مرحوم کے انتقال کی خبر پا کر
سر اٹھانے کی کوشش کر رہے ہیں اور بغاوت
پر آمادہ ہیں۔

ٹیپو :۔ کون بغاوت پر آمادہ ہیں؟

ہمامرزا :۔ کیا عرض کروں شہزادہ سلامت آپکی شا

نے، جو سرکاری ڈاک کا نگران
ڈاک کا سلسلہ بگاڑ دیا ہے، قلہ
ل کرنمک حرامی اور بغاوت پر
نواب عبدالعلیم خاں افغان
داماد سید محمد خاں نے پیادہ
مچھلی پٹم کے انگریزوں سے تو
(ہمامرزا خریطے سے مختلف عرضیا
خطوط نکالتا ہے)
یہ میری رائے نہیں حضور والا،
بڑے امیر و وزیروں کا مشورہ
میں اپنے ساتھ لایا ہوں۔ اور جو
آوری کے منتظر ہیں، سب کے سب
پر اصرار ہے کہ حضور فوراً سرنگا
لائیں اور تخت و تاج سنبھالیں

ٹیپو :۔ درست ہے۔ کل صبح سورج
پہلے ہم سرنگا پٹم کی جانب روانہ

ہمامرزا :۔ سرِ حاسداں زیرِ پائے تو باد
(حاسدوں کے سر تیرے پیروں کے نیچے ہوں)
ہمہ عیشِ عالم برائے تو باد
(دنیا کا عیش تیرے لیے ہو)

تیسرا منظر

لارڈ کارنی والس کا محل

لارڈ کارنی والس ایک اونچی کرسی

اس کرسی کے آس پاس کئی خوب صورت پرانے طرز کی کرسیاں ہیں جن میں لال مخمل جڑا ہوا ہے۔

چوبدار:۔ (دائیں جانب سے داخل ہوکر) حضور لارڈ کارنی والس کی خدمت میں سلطان ٹیپو کے درباری امراء، میر قاسم اور میر صادق باریابی چاہتے ہیں۔

کارنی والس:۔ اجازت ہے۔

(دائیں جانب سے میر صادق و میر قاسم داخل ہوتے ہیں)

میر قاسم:۔ حضور لارڈ کارنی والس کی خدمت میں تسلیمات۔

میر صادق:۔ لارڈ صاحب کو تسلیمات۔

کارنی والس:۔ ویل میر صادق، میر قاسم ہم تم لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ بیٹھیے بیٹھیے۔ ادھر آیئے ـــــ رنگ راؤ۔

رنگ راؤ:۔ (ایک کالا بھجنگ شخص جو نہایت سفید لباس میں ملبوس ہے کرسی سے اٹھ کر) حضور والا۔

کارنی والس:۔ ہم نے جو خط ایسٹ انڈیا کمپنی اور حکومت برٹین کو لکھا تھا۔ اس کا مطلب میر قاسم اور میر صادق کو سمجھاؤ۔ (ایک بہت بڑا موڑا ہوا موٹا سا کاغذ رنگ راؤ کو دیتا ہے)

رنگ راؤ:۔ حضور لارڈ کارنی والس کا ارشاد ہے کہ پچھلے چند برسوں میں پیش آنے والے حالات سے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح ہو چکی ہے کہ ہم سلطان ٹیپو کا خاتمہ کیے بغیر انڈیا میں اپنے قدم نہیں جما سکتے۔ حیدر علی اور ٹیپو نے جس طرح جگہ جگہ انگریز سپاہیوں کو شکستیں دی۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ میسور انڈیا کا سب سے اہم قلعہ ہے۔

کارنی والس:۔ سمجھتا ہے؟

میر صادق:۔ بہت اچھی طرح حضور بہت اچھی طرح۔

رنگ راؤ:۔ سلطان حیدر کے مرنے کے بعد نظام اور مرہٹہ فوج پر برتری ثابت کرکے ٹیپو کی ہمتیں بہت بڑھ گئی ہیں، اب وہ پیرس اور قسطنطنیہ کے حکمرانوں سے خط وکتابت کر رہا ہے۔ نظام اور مرہٹہ حکومت میں بھی ایسے بے شمار امیر پائے جاتے ہیں جو ٹیپو کے اس قدر معتقد ہیں کہ اسے انگریزوں کو ہندوستان سے بھگانے والا آدمی سمجھتے ہیں۔

کارنی والس:۔ یس۔ دوسرا صفحہ۔

رنگ راؤ:۔ اگر ہم ٹیپو کو کسی طرح نہ ہرا سکے تو انڈیا میں ہم نے اب تک جو کچھ حاصل کیا ہے وہ سب ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا یہاں تک کہ تاجروں کی حیثیت سے بھی ہماری کوئی جگہ نہ ہوگی۔

کارنی والس :- ہم سب راز کا بات تم سے بولتا۔

میر قاسم :- بجا ہے حضور۔

رنگ راؤ :- ٹیپو سلطان ہر میدان میں ہمارا دشمن ہے، وہ صنعت و تجارت کے گر جانتا ہے، انڈیا کی مارکٹ میں میسور کی بنائی ہوئی چیزوں کی دن بدن مانگ بڑھ رہی ہے، ڈر ہے اگر اگر سلطان ٹیپو کو چند سال بھی امن و چین کے مل گئے تو میسور صنعت و تجارت میں ہم سے بہت آگے نکل جائے گا۔

کارنی والس :- ٹھیک ہے؟

میر صادق :- بجا ہے حضور۔

کارنی والس :- آگے بتاؤ۔

رنگ راؤ :- اب بھی یہی حال ہے کہ یہاں کی بنی ہوئی چیزیں مثلاً ریشمی کپڑا، برتن یورپ کے اچھے سے اچھے کارخانوں کے سامان سے مقابلہ کرسکتے ہیں، اب تک انڈیا میں ہماری کامیابی کی وجہ ہماری سمندری طاقت تھی ٹیپو پہلا شخص ہے جس نے انڈیا کی اس کمزوری کو جان لیا ہے اور اس وقت میسور میں ہزاروں تجارتی و جنگی جہاز بنائے جا رہے ہیں۔ جہاز بنانے کے لیے جس لکڑی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ میسور کے جنگلوں میں بے حد پائی جاتی ہے۔

کارنی والس :- سب راز کا بات ہے۔

میر قاسم :- بجا ہے حضور۔

رنگ راؤ :- میسور کی آسودہ حالی نے انڈ
دوسرے علاقوں کے لوگوں کی توجہ بھی
جانب کھینچ لی ہے۔ اگر ہم کچھ دن لوٹ
کرتے رہے تو وہ دن دور نہیں جب ٹیپو
سے سارا ہندوستان چھوڑنا پڑے
صرف دو ہی راستے ہیں یا تو ہندوس
چھوڑ دیں یا پھر بغیر کسی تاخیر کے میسـ
چڑھائی کر دیں۔

میر صادق :- لیکن حضور لارڈ صاحب

کارنی والس :- تھوڑا راز کا بات اور سـ
بولو، ہم جانتا ہے چڑھائی کر کے کلرٹا
ہم میسور نہیں جیت سکتا، ٹیپو کو بھی
سکتا، کیسے لڑیگا، کیسے جیتے گا
ہیں بتائے گا۔ ہاں آگے بتاؤ رنگ

رنگ راؤ :- ایسٹ انڈیا کمپنی جنگ کے
سے ڈرتی ہے۔ لیکن ہم کمپنی پر یہ
واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ صرف بـ
کالی کٹ، کنانور اور منگلور کی قیمـ
جنگ کے اخراجات سے کہیں زیادہ
صرف مالابار کے گرم مسالے اور صـ
صندل کی لکڑی سے ہم اس قدر
کرسکتے ہیں جس کا حساب نہیں لـ

کارنی والس :- ٹھیک ہے؟

میر قاسم: نہایت درست ہے حضور۔

رنگ راؤ: نظام اور مرہٹوں کے ساتھ بار بار جنگ کر کے سلطان ٹیپو زر و جواہر ہی نہیں اپنی طاقت بھی کم کرتا چلا جا رہا ہے۔ اب نظام ٹیپو کو اپنا دشمن سمجھتا ہے اگر ہم نے نظام کا ہاتھ نہیں تھاما تو وہ ٹیپو کی طرف رفاقت کا ہاتھ بڑھائے گا ہم کو اگر یہاں حکومت کرنی ہے تو نہ صرف ہمیں منہ مانگا روپیہ چاہیے بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی سے ہر قسم کی مدد بھی۔

کارنی والس: ہم تم کو اپنا مارا راز بول ڈیا، کچھ نہیں چھپایا۔ اب ہم یہ چاہتا کہ تم لوگ بھی اپنے ڈل کے اندر کچھ نہ چھپائے، سب بول ڈے۔ جو جو ہم پوچھے گا سب بول ڈے گا

میر صادق: بجا ہے حضور ہم اسی لیے حاضر ہوئے ہیں۔

میر قاسم: لارڈ صاحب سارے حالات سے بخوبی واقف ہیں، میری حقیر رائے میں ٹیپو کو شکست دینا اور میسور کو فتح کر لینا اس قدر آسان نہیں جتنا حضور والا خیال کرتے ہیں۔

کارنی والس: اس کا فکر چھوڑو۔ ہم جانتا ہے، ہم کام نکالنے کا بہت ڈھنگ جانتا ہے۔ تم ہمارا ساتھ ڈے گا تو ہمارا ہر کام آسان ہو جائے گا، تم جو مانگے گا ہم تم کو ڈے گا۔ جو چاہے گا کمپنی سے تم کو ڈلوائے گا۔ منظور ہے؟

میر صادق: منظور ہے منظور ہے۔

میر قاسم: جی ہاں منظور ہے حضور والا۔

کارنی والس: اب تم جا سکتا، کل رات پھر اسی وقت یہیں بات چیت ہوگا۔ پورا تیاری کا ساتھ آنا۔

میر قاسم: جی ہاں حضور والا۔

(دونوں دائیں جانب بڑھتے ہیں)

چوتھا منظر

سلطان ٹیپو کے محل کا اندرونی حصہ

درمیان میں سونے کا تخت ہے جس کی پشت پر ہما کندہ کیا ہوا ہے آس پاس ٹیپو کے امیر اور درباری رفقاء بیٹھے ہیں۔

ٹیپو: سید غفار، میر قاسم، میر معین الدین، دیوان پورنیا، اور دوسرے امراء ہم نے آپ لوگوں کو اپنے اس محل میں صرف اس لیے بلایا ہے کہ ہم آپ لوگوں کو صاف صاف بتا دیں کہ ہمارے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ میسور کی جنگ سرنگا پٹم کی چار دیواری میں لڑی جا رہی ہے، فرنگیوں کی چالیں روز نت نیا گل کھلا رہی ہیں۔ نظام علی خان اور محمد علی والا جاہی کے کورگ اور ٹراونکور کے جو مکتوب وصول ہوئے ہیں۔ ان کے مضمون سے بھی آپ لوگوں کو واقفیت

حاصل ہے، ۵ر فروری سے لارڈ کارنیوالس
ایک عظیم لشکر کے ساتھ قلعہ سرنگاپٹم سے پانچ
میل کے فاصلے پر پڑاؤ ڈالے پڑا ہے، ایک
طرف گولا باری جاری ہے۔ دوسری طرف
وہ صلح نامہ پیش کرتا ہے۔

پورنیا:۔ کیا ہم حضور سے فرنگیوں کے پیش کردہ
صلح نامہ کی شرطیں معلوم کر سکتے ہیں۔

ٹیپو:۔ شرائط ہیں، نصف سلطنت فرنگیوں
کے حوالے کر دی جائے، دو کروڑ روپیہ ادا
کیا جائے، ایک کروڑ ابھی مل جائے باقی
چھ مہینے کی مدت میں اور ـــــ اور اپنے
چار بیٹے فوج کے چار بڑے افسروں کے ساتھ
بطور یرغمال فرنگیوں کے حوالے کر دیے
جائیں ـــــ مدت ہے اڑتالیس گھنٹے۔
ہم اپنا فیصلہ دینے سے پہلے آپ لوگوں
کی رائے بھی جاننا چاہتے ہیں۔

میر صادق:۔ ہم حضور کے خادم ہیں حضور کے حکم
اور فیصلے پر جان نچھاور کرنا ہمارا پہلا اور
آخری فرض ہے۔

ٹیپو:۔ پورنیا۔

پورنیا:۔ نمک خوار باادب درخواست کرے گا۔
حضور والا کو موجودہ حالات میں دشمن کی
شرائط کو قبول کر لینا ہی مناسب ہے۔

ٹیپو:۔ میر صادق۔

میر صادق:۔ خادم دیوان پورنیا کا ہم خیال ہے۔
حضورِ والا جن حالات سے ہمارا وط
دوچار ہے ان حالات میں ہم دشمن کو ز
دنوں تک سرنگاپٹم سے دور نہیں رکھ سـ

ٹیپو:۔ سید غفار۔

میر قاسم:۔ یہ بالکل درست ہے حضورِ والا کہ د
کی پیش کردہ شرائط توہین آمیز ہیں
لیکن ہو سکتا ہے چند دنوں بعد ہم اس
بھی زیادہ کڑی شرطیں ماننے پر مجبور ہو
مصلحتِ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ ہم ا
شرطوں کو قبول کر لیں۔

سید غفار:۔ حضورِ والا میں باادب عرض کروں گا
کہ انگریز ہمیں بار بار دھوکا دیتے آئے ہ
موجودہ پیش کردہ صلح نامہ ان کا آخری ص
نامہ نہیں، مجھے باوثوق ذرائع سے پتہ چ
ہے کہ جب حضورِ والا کے صاحبزادے انگریز
کے قبضے میں ہوں گے تو جنرل ہیرس ان
بھی بدتر شرائط منوانے کی کوشش کرـ

ٹیپو:۔ دلاور خاں۔

دلاور خاں:۔ خادم کو سرنگاپٹم کے ان چالیس
ہزار سرفروشوں کی جرأت و ہمت پر پ
اعتماد ہے جو آپ کے ایک اشارہ پر جا
کی بازی لگا سکتے ہیں، حضورِ والا ہم دشمن
سے ٹکر لیں گے۔ ایسی کسی شرط کو قبول نہیں

کریں گے، جس سے ہماری آن پر کوئی حرف
آتا ہو میرے حقیر خیال میں حضورِ والا اب
صرف دو ہی راستے ہیں یا تو ہم اپنے دشمن
سے مقابلہ کریں گے اور ثابت کر دیں گے کہ
اس سرزمین کا بچہ، بوڑھا جوان ہر فرد اپنی
آزادی کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہے یا پھر
بے غیرتی اور غلامی کی وہ زندگی قبول کریں
گے جو خودکشی کے برابر ہے۔

ٹیپو:۔ دلاور خاں ہم تمہارے جذبات کی دل سے
قدر کرتے ہیں، دشمن ہمارے وطن کی سرحدوں
تک کیسے پہنچ گیا۔ اور ہمارے فوجی عہدہ
داروں نے کس طرح اپنے فرائض ادا کیے
اس پر سوچ بچار کرنے کا میں سمجھتا ہوں یہ
وقت نہیں ہے، جو کچھ ہو گیا وہ ہو گیا،
شرائط کے مطابق مجھے چار کیا اپنے سارے
لڑکوں کو دشمن کے حوالے کر دینے میں کوئی
عذر نہیں اگر وہ ہمارے وطن کے ہر لڑکے
کے روشن مستقبل کی ذمہ داری لے سکتے
ہیں۔

میر صادق حضور والا۔

ٹیپو:۔ روپیہ پیسہ ہی اگر ان کا مقصد ہے تو ہم سارا
خزانہ ان کے سپرد کر سکتے ہیں، نصف
سلطنت کیا اگر وہ ہمارے رفیق و مونس
بن جاتے تو ہم ساری سلطنت ان پر سے
نثار کر دیتے لیکن ایسا نہیں ہے حضور
میرے لڑکے کے روپیہ یا اقتدار ہی نہیں
چاہتے بلکہ ہمارے وجود ہی کو اس سرزمین
سے ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ میسور ہی نہیں
سارے ہندوستان کو وہ ذلت و غلامی کی
زنجیروں میں جکڑ لینا چاہتے ہیں اور وہ
منصوبے رکھتے ہیں جن سے صدیوں تک
ہم اپنا سر اوپر نہ اٹھا سکیں، اب ایک
ہی راستہ ہے کہ اپنے وطن کے چپے چپے کی
حفاظت کے لیے ہمیں جان کی بازی لگانی
ہے، اور جو ہم سے متفق نہیں ہے وہ اس
محل سے چپ چاپ چلا جا سکتا ہے،
بخدا ہم اس سے کچھ نہیں کہیں گے، کچھ نہیں
پوچھیں گے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ خود
کو اور آنے والی نسلوں کو نیلام کرنے جا رہا
ہے۔ وہ جا سکتا ہے۔

پانچواں منظر

لارڈ کارنی والس کے محل کا وہی حصہ ہے
جو منظر ۲ میں ہے

چوبدار:۔ دائیں طرف سے داخل ہو کر حضورِ
والا میر صادق، میر قاسم اور دیوان پورنیا
حاضر ہونا چاہتے ہیں۔

لارڈ کارنی والس:۔ آنے دو۔ آنے دو۔

پورنیا:۔ ہم حضورِ والا کی خدمت میں کورنش بجا لاتے ہیں۔

کارنی والس:۔ اوہ ویل ویل پورنیا، میر صادق میر قاسم آیئے آیئے، اب کپڑا سے اپنا چہرہ چھپانے کی ضرورت نہیں۔ ہم لوگ اب اپنے دوستوں میں کھڑا ہے۔ سنا کل ٹیپو بہت زوردار اسپیچ دیا،

میر صادق:۔ بہت زوردار لارڈ صاحب بہت زوردار۔

کارنی والس:۔ ڈیئر، اِدھر ہمارا سب ٹیاری مکمل ہے۔

میر صادق:۔ ہماری بھی سب تیاریاں مکمل ہیں لارڈ صاحب۔

کارنی والس:۔ کیا کرے گا۔ اِدھر اُدھر دیکھنا کا ضرورت نہیں، سب اپنا آدمی ہے۔

میر قاسم:۔ قلعہ کا جنوب مغربی حصہ نہایت کمزور ہے، انگریز فوج اس طرف گولا باری کرے گی جس سے فصیل کی دیوار بآسانی ٹوٹ جائے گی۔

کارنی والس:۔ ٹھیک ہے۔

میر قاسم:۔ میر قمر الدین اور میر معین الدین بھی ہمارے ساتھ ہیں حضورِ والا۔

کارنی والس:۔ ویل۔

میر صادق:۔ جیسے ہی قلعہ کی دیوار میں شگاف پڑے گا۔ میر معین الدین اور میر قمر الدین کے سپاہی انگریز فوج کا مقابلہ نہیں کریں گے بلکہ سفید جھنڈا دکھا کر انھیں اطلاع دی جائے گی کہ کمپنی کی فوج اندر آسکتی ہے۔

میر قاسم:۔ میں نے قلعہ کے اطراف کی خندق کا پانی کم کرانے کا پورا انتظام کر لیا ہے تاکہ بآسانی فوج اندر آسکے۔

میر صادق:۔ مدافعت کی لڑائی شروع ہو تو فوج میں تنخواہوں کی تقسیم کا اعلان کرا دیا جائے گا۔

پورنیا:۔ صرف ٹیپو اور گنے چنے سپاہی ہوں گے جو انگریزی فوج کا مقابلہ کریں گے۔

کارنی والس:۔ ہمارے سپاہیوں کو کیسے معلوم ہوگا کہ یہ ٹیپو ہے؟

پورنیا:۔ میں سلطان ٹیپو کے سر پر ہری چھتری لگا کر دکھا دوں گا کہ یہی ٹیپو ہے۔

کارنی والس:۔ ویل، ویل ٹیاری ٹھیک ہے۔ اب رات کو حملہ کرنے کی ضرورت نہیں، ڈن کو ہوگا۔

میر قاسم:۔ ہاں حضورِ والا حملہ دن میں ہی ہوگا۔

کارنی والس:۔ ڈن میں ہوگا۔ ڈن کے ایک بجے، مئی کی چار تاریخ کو۔

پورنیا:۔ چار مئی کو؟

کارنی والس:۔ یس۔ چار تاریخ ۹۹ء سب کی قسمت کا دروازہ کھلنے کا ہے

ٹیپو کا آخری دن ہوگا۔ سب تیاری ٹھیک ہے۔ اب تم لوگ جا سکتا۔

چھٹا منظر

قلعہ سرنگاپٹم کا ایک حصّہ

باہر توپوں کے دھماکے اور شور سُنائی دیتا ہے۔

سب کے سب فوجی لباس میں ہیں۔

ٹیپو: ۔ پورنیا یہ شور کیسا ہے؟

پورنیا: ۔ بہت افسوس ناک خبر ہے حضور، قلعہ کی جنوب مغربی دیوار پر دشمنوں نے گولا باری کردی جس سے ایک بہت بڑا شگاف اس دیوار میں پڑ گیا ہے۔

ٹیپو: ۔ فوراً کمک بھیجو۔

میر قاسم: ۔ (ہانپتا ہوا آتا ہے) حضور فرنگی قلعہ میں گھس آئے ہیں۔

ٹیپو: ۔ فرنگی؟ میر معین الدین، قمرالدین اور سید غفّار کے سپاہی کہاں ہیں؟

میر قاسم: ۔ سید غفّار شہید ہو گئے حضور!

ٹیپو: ۔ آہ ہمارا دستِ راست بچھڑ گیا۔

میر قاسم: ۔ حضور میرے خیال میں آپ قلعہ کے شمالی راستے سے باہر نکل جائیں۔ فوراً، باہر سواری کا انتظام موجود ہے، بہ عافیت

ٹیپو۔ میر قاسم تم۔ تم ہمیں یہ مشورہ دے رہے ہو، فوراً گھوڑا حاضر کیا جائے میں فرنگیوں کی طرف جاؤں گا۔ سو سال کی گیدڑ کی زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی کہیں بہتر ہے۔ افسوس ہم نے ان لوگوں پر اعتماد کیا جو قطعاً اعتماد کے قابل نہ تھے۔ میر قاسم اس مشورہ کا پھل تمھیں ہی نہیں تمھاری نسلوں کو بھی ملے گا۔

(تلوار میان سے نکال کر دائیں جانب جاتا ہے)

(ذرا سی دیر بعد زخموں سے چور واپس ہوتا ہے)

(سر سے خون بہہ رہا ہے، پس منظر لڑائی کا شور جاری ہے)

ٹیپو: ۔ آہ (گر پڑتا ہے)

دلاور: ۔ حضورِ والا آپ بُری طرح زخمی ہو چکے ہیں۔

ٹیپو گھبراؤ نہیں دلاور خاں، ٹیپو میں اب بھی بہت جان باقی ہے، وہ مجھے اپنی مکاری کا نشانہ بنا چکے ہیں۔

ایک انگریز سپاہی: ۔ (دائیں جانب سے آتا ہے) ویل سونے کا پیٹی سونے کا پیٹی اڈر لاؤ۔

ٹیپو: ۔ ٹیپو ابھی زندہ ہے تو ابھی ٹیپو کی کمر سے

اس کی بیٹی نہیں چھین سکتا ۔

(ٹیپو تلوار گھونپ دیتا ہے اور سپاہی ٹیپو پر فائر کرتا ہے)

. . . .

ٹیپو :۔ آہ اے خاکِ وطن گواہ رہنا تیرے ٹیپو نے آخری سانس تک تیری حفاظت کی ــــ حفاظت کی۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ

کارنی والس :۔ (دائیں جانب سے لارڈ کارنوالس آتا ہے) وہاں کدھر ہے ٹیپو ۔

میر صادق :۔ لارڈ صاحب اس کی لاش آپ کے سامنے ہے ۔

. . . .

کارنی والس :۔ یہ ــــ یہ ٹیپو کی لاش نہیں انڈیا کا لاش ہے (قہقہہ لگاتا ہے) آخر ہم نے ٹیپو کو مار ڈالا ۔

دلاور :۔ ٹیپو کو آپ نے نہیں مارا لارڈ صاحب ہم نے مارا ہے ۔ ہماری خود غرضیوں نے مارا ہے ، جہالت، جھوٹی شان اور چند ٹکوں کی خاطر بک جانے والے ضمیر نے مارا ہے ۔ آہ نسلِ حیدر شہیدِ اکبر شد ۔

کارنی والس :۔ یہ کون ہے ؟

میر صادق :۔ ٹیپو کا ایک فدائی ہے حضور ۔

کارنی والس :۔ شوٹ کر دو ۔

(میر قاسم پستول نکال کر فائر کر دیتا ہے)

دلاور :۔ آہ ــــ میرے سلطان ۔ میرے ٹیپو ، میرا آخری سلام قبول ہو ۔ آہ ،

سچی کہانیاں

(ہر کتاب کی قیمت ۔۳۰ پیسے)

خاک کا پتلا	حضرت آدمؑ کی
نبی کا بیٹا	حضرت نوحؑ اور کنعان کی
خدا کی اونٹنی	حضرت صالحؑ کی
آگ کا چمن	حضرت ابراہیمؑ کی
بیٹے کی قربانی	حضرت اسماعیلؑ
مچھلی والے نبی	حضرت یونسؑ کی
بادشاہ کا خواب	حضرت یوسفؑ کی
طالوت اور جالوت	حضرت داؤدؑ کی
سبا کی شہزادی	حضرت سلیمانؑ کی
چپ کا دروازہ	حضرت زکریاؑ اور یحییٰؑ کی
صبر کا پھل	حضرت ایوبؑ کی
جنت کا پھل	حضرت عیسیٰؑ کی

(ہر کتاب کی قیمت ۵۵ پیسے)

لاٹھی کا سانپ	حضرت موسیٰؑ کی
آخری نبیؐ	حضرت محمد صلعم کی

پیغمبروں کی کہانیاں :۔ حبیب اللہ خاں صاحب

اس کتاب میں چودہ کہانیاں ہیں جن میں اور آخری نبی محمدؐ کے علاوہ چند مشہور پیغمبروں کے دلچسپ اور مختصر حالات آسان زبان میں لکھے بچوں کے علاوہ بڑے بھی اس سے اپنی معلومات میں اضافہ کر سکتے ہیں ۔

قیمت ــــــ ۳/۵۰

مکتبہ جامعہ، جامعہ نگر نئی دہلی ۲۵

طبیبی کا مطمح نظر اعلیٰ معیار





پہلے صرف شاہوں اور رؤسا کے لیے مخصوص تھی،
اب اُس عوامی دور میں طبیبی دواخانہ نے عام کردی ہے۔

طبیبی کی تیار کردہ شاہی خاندان بھر کے لیے بہترین ٹانک ہے۔ دل، دماغ، اعصاب کو تقویت دیتی ہے۔ معدہ اور جگر کی اصلاح کر کے بکثرت خونِ صالح پیدا کرتی ہے تمام جسم میں طاقت و توانائی کی نئی لہریں دوڑا کر صحت کو قابلِ رشک بنا دیتی ہے —

دی طبیبی دواخانہ اندور پرائیویٹ لمیٹڈ

چوک بازار اُجین   مہارانی روڈ   اندور
رجسٹرڈ آفس   ۵۱ بوہرہ بازار   اندور
شاخ:- ۷۷- محمد علی روڈ بمبئی ۳ فون: ۳۲۴۸۸۳



محمد عتیق احمد (مرحوم)

محمد عتیق احمد ۱۲ فروری ۱۹۱۲ء کو بنارس کے
پاس ایک گاؤں میں پیدا ہوئے۔ بچپن کا زمانہ دیہات
میں گزرا۔ پانچ سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔
ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ پھر بنارس کے گورنمنٹ کوئن
میرس کالج سے ہائی اسکول کیا۔ ۱۹۳۲ء میں علی گڑھ
مسلم یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۹ء تک وہاں سے
ایم۔ ایس۔ سی (سال اوّل) ایل ایل بی۔ اور بی ٹی کی
تعلیم حاصل کی ۱۹۳۹ء میں جامعہ آ گئے۔

۱۹۳۲ء۔ ۱۹۳۹ء تک کا زمانہ ہندوستان
کی سیاسی زندگی میں بڑی ہل چل کا زمانہ تھا۔ ویسے تو
علی گڑھ میں اس وقت مسلم لیگ کا زیادہ اثر تھا لیکن
کچھ ترقی پسند استاد اور طالب علم کانگریس کے حامی
تھے۔ اس میں جامعہ کے پرانے استاد اور طالب علم بھی
تھے۔ ڈاکٹر محمد اشرف۔ سید محمد ٹونکی وغیرہ قومی تعلیمی
پروگرام کے حامی تھے۔ ان لوگوں کا ترقی پسند طالب علموں
پر کافی اثر تھا۔ عتیق صاحب بھی ترقی پسند گروپ سے
تعلق رکھتے تھے۔

جس سال یہ لوگ بی ٹی کر رہے تھے۔ ذاکر صاحب
بنیادی تعلیم کے صدر کی حیثیت سے ملک میں مشہور

ہو چکے تھے۔ جامعہ کے ترقی پسند طریقۂ تعلیم سے عتـ
صاحب اور سلامت اللہ صاحب کافی متاثر ہوـ
ٹونکی صاحب کے توسط سے یہ دونوں جامعہ آ گئـ
سلامت اللہ صاحب استادوں کے مدرسے میں پڑھـ
لگے۔ اور عتیق صاحب نے ابتدائی مدرسہ میں کام شرـ
کیا۔ ششم جماعت کو پڑھاتے اور عالی منزل کے اـ
تھے ۵۰ روپے ماہانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ لیکن اس بـ
صرف تیس روپے ملتے۔ جامعہ میں ترقی پسند تعلـ
منصوبے۔ کام کرنے کی آزاد اور کھلی فضا۔ ملکـ
بہترین ماہرین تعلیم ڈاکٹر ذاکر حسین، ڈاکٹر عابد حسـ
اور پروفیسر مجیب صاحب کے ساتھ کام کرنے کاـ
ان چیزوں نے ان کو اتنا متاثر کیا کہ شروع ہی میں جاـ
میں ساری عمر کام کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اسی لیے شادـ
کے لیے بھی یہ شرط رکھی کہ جامعہ کی پرآشوب زندـ
کا ساتھ دینا ہوگا۔ قلق تو اس بات کا ہے کہ میں انـ
پرآشوب زندگی کا ساتھ نہ دے سکی ہاں جامعہ مـ
ضرور وقت گذارا۔

عتیق صاحب کو روزمرہ کی سائنس سے بہت
دلچسپی تھی۔ بچپن کی دیہات کی قدرتی فضا

ود سائنس کی تعلیم کی وجہ سے جامعہ کے قدرتی ماحول نے ان کے لیے کام کی ایک دل چسپ فضا پیدا کر دی تھی۔ بچوں کے ساتھ آس پاس کے علاقوں کا دورہ کرتے۔ جانوروں، کیڑے، مکوڑوں، پرندوں اور پودوں کا مشاہدہ ان کی زندگی کا محبوب مشغلہ تھا۔

پہلے ہی سال مدرسہ ابتدائی میں چڑیا گھر بنایا۔ اس زمانے میں جامعہ نگر میں مکھیوں اور مچھروں کی بڑی افراط تھی۔ بچوں کے لیے صحت و صفائی پر پروجیکٹ چلاتے۔ مچھر اور مکھی پر استادوں کے مدرسے کے لیے بڑے دل چسپ سبق تیار کرتے۔

۱۹۴۱ء میں ایک سال کے لیے علی گڑھ چلے گئے۔ ایم ایس سی کرنے کے بعد ۱۹۴۳ء میں مدرسہ ابتدائی کے نگراں بنا دیے گئے۔ ۱۹۴۹ء تک نگراں رہے۔ اسی زمانے میں بنیادی تعلیم کو آزمایا جا رہا تھا۔ جامعہ میں پروجیکٹ میتھڈ اور کام کے ذریعہ تعلیم کو سائنٹفک اصولوں پر چلایا گیا۔ مرغی خانہ، باغبانی دانچہ اور بنک کے مستقل پروجیکٹس کے تعلیمی پہلو کو نمایاں کیا جاتا۔ چھوٹے بچوں کو جمہوریت کی عملی تعلیم بھی دی جاتی۔ اس زمانے میں مدرسہ ابتدائی کی بڑی شہرت تھی۔ ۱۹۴۶ء میں جشن سیمیں کے سال مدرسہ ابتدائی میں ایک ہزار داخلے کی درخواستیں آئیں اور صرف چالیس طالب علم داخل کیے جا سکے۔

جشن سیمیں کے موقع پر مدرسہ ابتدائی کی نمائش میں سائنس میوزیم سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ جامعہ نگر کے آس پاس کے کیڑے مکوڑے، پرندے ان کے انڈے اور مختلف قسم کے سانپ سب کو بوتلوں میں محفوظ کیا جاتا تھا۔ اور یہ سب عتیق صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

جشن سیمیں کے بعد سب استاد تین چار مہینے کی مسلسل محنت سے تھک گئے تھے۔ جوبلی کا ہنگامہ ختم ہونے کے بعد عتیق صاحب نے فیصلہ کیا: مدرسہ کا سارا کام بچوں کے سپرد کر کے استاد ایک دن کی پک نک منائیں۔ غالباً یکم دسمبر ۱۹۴۴ء کو "ایک دن کا مدرسہ" پہلی بار ہوا۔ تب ہی سے "ایک دن کا مدرسہ" کا سلسلہ شروع ہوا۔

۱۹۴۸ء میں ڈاکٹر رادھا کرشنن کی کمیٹی نے ہندوستان کی یونیورسٹیوں کا جائزہ لیا۔ اس وقت یہ کمیٹی جامعہ بھی آئی۔ مدرسہ ابتدائی کی طرف سے عتیق صاحب نے ایک رصدگاہ بنائی جس میں چاند سورج اور ستاروں کا نقشہ تھا۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن اس نقشے سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ اب اسی جگہ ڈاکٹر ذاکر حسین کا مقبرہ ہے۔

۱۹۵۱ء میں جامعہ میں جغرافیہ کے لکچرر مقرر ہوئے ایک سال بعد ہی ہم دونوں اعلیٰ تعلیم کے لیے لندن چلے گئے۔ ہم دونوں نے ساتھ ایجوکیشن کا ڈپلوما کیا۔ میں تو ایک سال بعد واپس آ گئی وہ ایم۔ اے۔ کرنے کے لیے رک گئے۔ سنہ ۱۹۶۱ء تک ایم اے کی THESIS پر کام کرتے رہے۔ اس کے بعد مالی پریشانیوں کی وجہ سے لندن کے سیکنڈری موڈرن اسکول میں نوکری کر لی۔ خیال تھا کہ قرض ادا کرنے کے بعد جامعہ واپس آ جائیں گے۔ لیکن خدا کو کچھ اور منظور تھا۔

لندن میں جنرل سائنس کے استاد تھے۔ وہی ان کا پسندیدہ مضمون ہ اس مضمون کو بڑے شوق سے پڑھاتے اور سبق کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ہر قسم کا ساز و سامان (TEACHING AIDS) استعمال کرتے۔ لندن کی کملونوں اور کتابوں کی دکان سے اس کے لیے سامان اکٹھا کرتے۔

ہمیشہ ذہن میں جامعہ کا مدرسہ ابتدائی ہوتا کہ یہ چیزیں وہاں کیسے استعمال کی جاسکتی ہیں۔ لندن کے سائنس اور نیچرل ہسٹری میوزیم اور سائنسی تعلیم کی ہر نمائش کو بڑے شوق سے دیکھتے اور وہاں کی اکثر کیٹلاگ اور سامان مجھے بھیجا کرتے۔

جامعہ کے بچوں کے لیے ایک سائنس میوزیم کا نقشہ تیار کیا تھا۔ لیکن کس کو معلوم تھا کہ ان کی یہ دلی تمنا کبھی پوری نہ ہو سکے گی۔ بیماری سے پہلے ہی اکرام صاحب (لیکچرر ٹیچرز کالج) سے کہا تھا کہ میں مدرسہ ابتدائی کو لندن کے اسکولوں سے بہتر سمجھتا ہوں۔ یہ چیزیں جامعہ چلی جائیں تو کام آجائیں گی۔ یہاں تو بے کار پڑی ہیں۔ اپنی ساری کتابیں اور تعلیمی سامان جامعہ کو دینے کی وصیت کی۔ کتابوں کا پارسل تو بمبئی پہنچ گیا ہے۔

لندن میں سترہ سال سے زیادہ کا عرصہ گزارا لیکن وہاں کی زندگی سے کبھی بھی خوش نہیں رہے۔ وطن کی یاد اور جامعہ میں کام کرنے کی تمنا ان کو ہمیشہ ستاتی رہی۔ اسی لیے جامعہ کو اپنی آخری آرامگاہ بنانے کی وصیت کی۔ اور خدا نے ان کی یہ آخری آرزو پوری کر دی۔ ان کا جسدِ خاکی جامعہ کے ایک کونے میں آرام کر رہا ہے۔

اور اب سالنامہ!

جوبلی نمبر آپ نے پڑھا ہوگا۔ پسند بھی ہوگا۔ اب جنوری میں سالنامہ پڑھیے۔ کی تیاریاں شروع ہو گئی ہیں بہت سے مـ آ بھی گئے ہیں۔ بہت ہی اچھے اچھے دل چسپ ہیں۔ ابھی اور آرہے ہیں مضمون بھی کہانیاں بھی نظمیں بھی بلاک تصویریں بھی ہوں گی۔

یہ سالنامہ بھی کافی ضخیم ہوگا۔ زیادہ ہوگی لیکن سالانہ خریدار بننے والوں یہ زائد قیمت نہ لی جائے گی۔ سالانہ چندہ روپے ہے۔ آج ہی منی آرڈر کر دیجیے۔ رجسٹری سے منگانا ہو تو ایک روپیہ اور بھیج

مینیجر پیامِ تعـ

جناب کیف سہسرامی

ماموں چاند



چاند سے اپنا روپ ملا کر بھائی کا رشتہ جوڑا تھا
برسوں پہلے امی نے یہ علم کا تارا توڑا تھا
کہتی تھیں اے مُنّے دیکھ! تیرے چندا ماموں ہیں
میں کہتا تھا کتنے اچھے میرے چندا ماموں ہیں
یہ باتیں اس وقت کی ہیں جب ہم سب چھوٹے بچّے تھے
لیکن ماں کی گود میں بھی ہم بات کے کتنے سچّے تھے!
آج یہی تو کہتے ہیں سب چاند زمین کا بھائی ہے
انسانوں کا ماموں بن کر جس نے شہرت پائی ہے
اور صدیوں سے سب کی مائیں یوں ہی کہتی آئی ہیں
چاند کو اپنے مُنّے کا ماموں ہی کہتی آئی ہیں
آخر امریکہ کے مُنّے جا کر چاند کو چھو آئے
امّی نے جو بات کہی تھی وہ سچ ثابت کر لائے
یعنی امریکہ کے بیٹے اپنے ہی ننہال گئے
اپنی امّی کے میکے اور ابّا کی سسرال گئے
"امّی! کیسے جان گئی تھیں، تم بھی کوئی نجومی ہو؟
چاند سے کیوں کر واقف تھیں، کیا سیاروں میں گھومی ہو؟"
چاند، زمین کا گہرا رشتہ سچ مچ بہت پرانا ہے
آج کی یہ سچائی ہمارے بچپن کا افسانا ہے

جناب عبدالغفار مدھولی

اپنے شاگردوں سے

جامعہ کے پرانے کام کرنے والوں میں غفار صاحب مدھولی نے تاریخی حیثیت حاصل کرلی ہے۔ ان کا یہ مضمون ہم اس لیے شائع کررہے ہیں کہ اس میں ان کی آپ بیتی کی کچھ جھلکیاں ہیں۔ دوسرے ان اداروں (خصوصاً استادوں کے مدرسے) کی مختصر سی تاریخ آگئی ہے۔ یعنی یہ کہ یہ ادارے جو اس وقت اتنے شان دار نظر آرہے ہیں ان کی ابتدا یا شروعات کتنے چھوٹے پیمانے پر ہوئی اور محض کام کرنے والوں کے خلوص، ایثار اور مستقل مزاجی کی بدولت دیکھتے دیکھتے یہ کیا سے کیا بن گئے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

ایڈیٹر

اکتوبر کا مہینہ آتا ہے جامعہ کے بارے میں جان کاری کی باتیں ہوتی ہیں۔ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ میں بھی جامعہ کا پرانا طالب علم اور پرانا استاد ہوں تو مجھے بھی کچھ کہنا پڑتا ہے۔

میں نے سوچا کہ شاگردوں کے کالج یعنی استادوں کے مدرسے سے سمن دے کر کے (ربط دے کر) کچھ باتیں بتائی جائیں تو سمجھنے میں سہولت رہے گی۔ اس وقت آپ اردو کم جانتے ہیں میں لے پیام تعلیم میں چھپوا دوں گا۔ جب آپ سکنڈ ایئر میں جائیں گے اسے پڑھ لیجیے گا۔ اب تو میری زبانی سنیے۔

۶ر جون ۱۹۲۳ء کو ایک غریب ود[illegible] ناطے (طالب علم کی حیثیت سے) میں جامعہ [illegible] نہیں ملا۔ اس لیے داخلہ بھی نہ لے سکا۔ ا[illegible] اُپائے (علاج) تھا کہ میں محنت مزدوری کر[illegible] اپنے پیروں پر کھڑا ہو جاؤں۔

اس زمانے میں جامعہ کے پاس ا[illegible] تلارام صاحب۔ ہاشم صاحب ڈپارٹمنٹ[illegible] ڈپارٹمنٹ کپڑا بننے کا تھا۔ علی گڑھ کے[illegible]

کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا۔ گویا ۱۹۲۶ء سے ہی جامعہ میں بنیادی تعلیم کی نیو رکھ دی گئی تھی۔

میں نے چھاپے خانے میں آٹھ روپے ماہوار پر ایک مزدور کی حیثیت سے نوکری کر لی۔ منیجر صاحب سے اجازت لے لی تھی کہ آٹھویں جماعت میں پارٹ ٹائم تعلیم پایا کروں گا۔

بال سبھا اس زمانے میں بھی تھی۔ میں نے اس میں حصہ لینا شروع کیا اور ایسی انعامی تقریریں کیں کہ شیخ الجامعہ نے جلدی ہی میرا وظیفہ منظور کر کے مجھے باقاعدہ طالب علم بنا لیا۔

اس زمانے میں جامعہ اسٹور آج کل کی طرح بنیادی تعلیم سے ہٹا ہوا نہیں تھا۔ بلکہ جامعہ کے لڑکے اس میں کام کرتے تھے۔ میں اس زمانے کی مسز ودا کے ڈپارٹمنٹ کا ایک اچھا طالب علم تھا۔ اس لیے جامعہ اسٹور میں مجھے بھی کام کرنے کا موقع ملا۔

پنڈت جواہر لال نہرو کہا کرتے تھے کہ ہر سے کے بچوں کو دوپہر میں اچھا بھوجن (کھانا) ملنا چاہیے۔ لیکن اسی زمانے میں جامعہ اسٹور سے اپنے کام کے معاوضے میں صبح صبح دودھ ملائی کھانے کے لیے ملتی تھی۔

اسماعیل صاحب کا ڈپارٹمنٹ اس زمانے میں بڑے زوروں پر تھا۔ کیوں کہ ایک عیسائی استاد مسٹر آتی۔ سے کیلاٹ اس کے انچارج تھے۔ جو بعد میں جامعہ کے پرنسپل بھی رہے۔

کیلاٹ صاحب کہا کرتے تھے کہ میرا بس چلے تو میں آدھے نمبر پڑھائی کے اور آدھے نمبر کھیلوں کے رکھوں۔

بنیادی تعلیم والے بھی جسمانی تربیت پر بہت زور دیتے ہیں۔ اگرچہ میں نے کسی خاص کھیل کی کبھی مشق نہیں کی۔ لیکن کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کرنے میں۔ خاص طور پر میچوں میں بڑا لطف آتا تھا۔

۱۹۳۷ء میں گاندھی جی نے یہ بات کہی کہ ہماری تعلیم کا انتظام ہمارے ہاتھوں میں ہونا چاہیے اس کے لیے ذاکر کمیٹی نے لوگوں کے سامنے سجھاؤ رکھے۔ لیکن جامعہ والے جن کی رہنمائی گاندھی جی، محمد علی اور اس وقت کے امیر جامعہ خواجہ عبدالمجید صاحب کر رہے تھے ۱۹۲۰ء سے ہی ہمیں اس راہ پر چلا رہے تھے۔ بس اتنی کسر تھی کہ جو کام ہم کرتے تھے اسے ربط دے کر سبق دے کر ہمیں نہیں پڑھایا جاتا تھا۔

اس طرح ہنسی خوشی ہم کام کر رہے تھے۔ کہ ۱۹۲۵ء میں اسہیوگ اندولن (آزادی کی تحریک) مدھم پڑ گیا۔ ہمارے ساتھیوں اور استادوں کے سامنے بڑی مشکلات آگئیں۔ ایک وقت ایسا آیا کہ علی گڑھ میں جامعہ ٹوٹتی دکھائی دینے لگی۔ جو لوگ دھن کے پکے ہوتے ہیں وہ اپنی ہار آسانی سے نہیں مانتے۔

حکیم اجمل خاں صاحب نے جن کا سبق آج کل ہندی کی ریڈروں میں ہے۔ دہلی میں طبیہ کالج

چلا رہے تھے۔ گاندھی جی کے مشورے سے جامعہ کو دلی
بلا لیا۔

جب لڑکوں کو یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بہت
خوش ہوئے۔ ایک تو اس لیے کہ جامعہ ٹوٹنے سے بچ
گئی دوسرے یہ کہ اب بھارت کی راجدھانی میں پڑھنے
جائیں گے۔ خانہ بدوش اپنی زندگی کو اسی طرح دلچسپ
بنا لیتے ہیں۔ یہ منتقلی چھٹیوں میں ہوئی کچھ لڑکے اس
کام کے لیے روک لیے گئے۔ ان میں سے ایک میں بھی
تھا۔

مجھے یاد تو نہیں میرے ایک استاد کا کہنا ہے
کہ میں نے دفتر کے پرانے قلم دوات بھی سامان کے ساتھ
پیک کرا دیے تھے۔ اپنی پاٹھ شالا (درس گاہ) کی
چیزوں سے ہمیں کتنی محبت تھی!!

دلی کے ایک ویران محلے 'قرول باغ' میں آباد
ہوئے۔ جی ہاں اس وقت ہندوراؤ کے باڑے سے قرول
باغ تک پہنچنے میں سنسان راستوں سے گزرنا پڑتا تھا۔

ذاکر صاحب، مجیب صاحب، عابد صاحب
اس وقت جرمنی میں تعلیم پا رہے تھے۔ انھوں نے ہمارے
استادوں کو لکھا کہ کسی نہ کسی طرح جامعہ کو چلاتے رہیں۔
ہم واپس آکر آپ کی مدد کریں گے۔

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی عالی شان عمارتوں
سے نکلے ہوئے لوگ پہلے تو علی گڑھ جامعہ کے جھونپڑوں میں
رہے۔ کوئی پانچ سال تک۔ پھر ۱۹۲۵ء میں دلی میں
کرائے کی عمارتوں میں پہنچے۔ پھر ایک سال بعد جرمنی

میں تعلیم پائے ہوئے یہ تینوں استاد دلی آ گئے
جرمنی بڑے کام کا ملک ہے۔ یہ
کرنے لگے۔ ان میں سب سے چھوٹے مجیب
یہ خالی وقت میں وائلن بجا کر اپنا دل بہلا
ان کے ساتھی رام چندرن جی کا (جو آج کل
ٹرسٹ کے ناظم ہیں) ان پر اتنا اثر پڑا کہ یہ ش
(سبزی خور) بن کر اپنا بھوجن (کھانا) آپ
کرنے لگے۔

مجھے شاکھاہاری (سبزی خور) لوگ
ہے۔ اس لیے میں کبھی کبھی ان کے یہاں جا
تھا کہ یہ لوگ اپنے بھوجن (کھانے) کو کس ط
بناتے ہیں۔

اس وقت جامعہ نے گائیڈنس گروپ
جاری کیا تھا۔ یعنی جامعہ کے طلبا کے کئی گر
گئے تھے۔ ہر ایک گروپ ایک استاد کی نگرانی میں
گیا تھا۔

مجیب صاحب کے گروپ کے طلبا
شرافت، محبت، علم دوستی، مہمان نوازی، گھر
سنوارنے کی عادت سے بہت متاثر تھے۔

ذاکر صاحب لوگوں کو پرکھنے میں بہت
رکھتے تھے۔ انھوں نے جس کو جیسا پایا۔ ویسا
سپرد کر دیا۔

میں چھوٹی جماعتوں میں پڑھانے لگا تھا
چادروں کے پردے بنا کر ڈراموں کی ابتدا ہم

ایک دن ذاکر صاحب مجھ سے کہنے لگے "اب آپ اپنی ٹریننگ کر لیجیے یا اس کے لیے پنجاب کے ایک نارمل اسکول چلے جائیے" میں نے ایسا ہی کیا۔

اس وقت تک جامعہ میں پہلی جماعت سے کالج تک کا انتظام درمیانی انتظام کے ساتھ شیخ الجامعہ صاحب کے ہاتھ میں تھا۔

جب میں موگا سے واپس آیا تو ذاکر صاحب نے کہا "جناب جس کا ڈر تھا وہی ہو چکا ہے۔ اب سنبھالیے اپنے بچوں کو" اس طرح پہلی دفعہ پرائمری جماعتوں کا انتظام سے کیا گیا۔ یہاں میں نے "کہانی کا طریقہ" اور "پروجیکٹ میتھڈ" سے پڑھانے کا کام ساتھیوں کی مدد سے چلایا۔

اس پرائمری مدرسے کی کہانی لمبی ہے۔ میں نے یہ مدرسہ ابتدائی کی کہانی کے نام سے چھپوائی ہے۔

اگلی بات سنانے سے پہلے یہ اور بتا دوں کہ سنہ ۱۹۲۶ء ں بھی جامعہ پر ایسی ہی مصیبت آئی جیسی سنہ ۱۹۲۵ء میں۔ لیم اجمل خاں صاحب کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ استادوں تی کئی مہینے تنخواہ نہیں ملتی تھی۔ سوال تھا کہ اب کیا ر۔ ذاکر صاحب اور ان کے ساتھیوں نے طے کیا کہ معہ کو چلانے والی ایسی جماعت بنائیں جس میں ممبر یادہ تر جامعہ کے استاد ہوں اور یہ عہد کریں کہ ۲۰ سال ب ڈیڑھ سو روپے ماہوار سے زیادہ تنخواہ نہیں ں گے۔ میری تنخواہ ۳۰ روپے تھی میں نے بھی ۲۵ روپے کرا لیے۔

جب ابتدائی کا انتظام الگ ہوا تو ہائی اسکول جسے مدرسہ ثانوی کہتے ہیں ایک الگ شعبے کی حیثیت سے کام کرنے لگا۔ اس وقت کے رجسٹرار ارشاد الحق صاحب (جن کے بیٹے جنید الحق صاحب ہمارے کالج میں ہیں) اس کے ہیڈ ماسٹر بنائے گئے۔

سعید انصاری صاحب کی کوششوں سے انفرادی طریقۂ تعلیم جسے ڈالٹن پلان کہتے ہیں اس مدرسے میں رائج کیا گیا۔

ابتدائی کی چھٹی جماعت اور ہائی اسکول کی ساتویں جماعت میں زیادہ فرق نہیں ہوتا ہے۔ ہم نے چھٹی جماعت کے ساتھ چوتھی یا پانچویں کے بڑے لڑکے اور ہائی اسکول والوں نے ساتویں کے ساتھ آٹھویں کے چھوٹے لڑکے شامل کر کے ابتدائی اور ہائی اسکول کے طرح طرح کے مقابلے شروع کیے۔ مثلاً بیت بازی (انتاکشری) جلسہ مباحثہ یعنی (داد و داد) کھیلوں کے مقابلے وغیرہ۔ یہ بات اتنی پکی ہوئی کہ آج بھی آپ ہاکی میں ابتدائی کے لڑکوں کو ہائی اسکول سے مقابلہ کرتے ہوئے دیکھیں گے۔

جامعہ میں جتنے شعبے آج آپ کو بڑی بڑی عمارتوں میں بہت سے لوگوں کو ساتھ کام کرتے دکھائی دیتے ہیں یہ چند مفلس مگر دل کے دھنی استادوں نے قائم کیے ہیں۔

ذرا اس مثال پر غور کیجیے۔ ایک دن ذاکر صاحب نے مجھ سے کہا "غفار صاحب۔ اب استادوں کا مدرسہ

بھی قائم کرنا چاہیے۔ آپ چپکے سے علی گڑھ جائیے
وہاں دو چار دن رہ کر دیکھیے کہ کام کس طرح ہوتا ہے۔
دہلی کا تجربہ آپ کو ہے علی گڑھ بھی دیکھ لیجیے۔ پھر
استادوں کے مدرسے کی ایک تفصیلی اسکیم پیش کیجیے"۔

یہ بات آج سے ۳۵ برس پہلے یعنی ۱۹۳۹ء
کی ہے۔ جب کہ آپ لوگ پیدا بھی نہیں ہوئے تھے میں
نے کہا: "ڈاکٹر صاحب میں مڈل پاس ہوں۔ چلا تو جاؤں
لیکن کسی پڑھے لکھے آدمی کو ساتھ کر دیجیے"۔

اس وقت جامعہ میں ٹرینڈ استاد دو چار ہی
رہے ہوں گے؟ ڈاکٹر صاحب نے کہا: میں نے جرمنی
کے ابتدائی مدرسے دیکھے ہیں۔ آپ جس مدرسہ ابتدائی کو
چلا رہے ہیں وہ بھی دیکھ رہا ہوں۔ آپ کا کام آپ کی
سند ہے۔ آپ جو اسکیم پیش کریں گے اس پر کوئی اعتراض
نہیں کرے گا۔ کیونکہ آپ کی دلیلوں کے پیچھے۔ مدرسہ
ابتدائی ہوگا"۔

میں نے سوچا" ایک جوہری میری ہمت
بڑھا رہا ہے کیوں نہ بارش کا پہلا قطرہ بننے کی کوشش
کروں!! میں علی گڑھ چلا گیا۔ وہاں سے آکر اس حد
تک تفصیل پیش کی کہ مجوزہ استادوں کے مدرسے کا
ٹائم ٹیبل بھی بنا دیا۔

ذاکر صاحب نے کہا: میں نے آپ کو اسی لیے
چنا ہے کہ آپ اسکیم میں کوئی چیز باقی نہیں چھوڑیں
گے! کچھ اور بھی باتیں سوچی گئیں۔ ان دنوں سعید انصاری
صاحب تعلیم پانے امریکہ گئے ہوئے تھے۔ طے پایا کہ

آپ کی واپسی پر یہ مدرسہ قائم کیا جائے چنانچہ
صاحب کی واپسی پر یہ کلاسیں ان کے حوالے کر
گئے۔ آپ اس کے پہلے پرنسپل بنائے گئے۔

یہ اتفاق دیکھیے کہ ۱۹۳۶ء میں وارد
جی اسی زمانے میں اس اسکیم کی بنیاد پر اگست
میں اس کا افتتاح یعنی اوگھاٹن ہوا۔ روپیوں کی
زمانے میں تھی لیکن سعید انصاری صاحب نے
سے اس مدرسے کو خود کفیل یعنی آتم نربھر بنا ہی لیا
صاحب کی یہ بات جامعہ میں بڑے فخر سے دیکھی
ہے۔

۱۹۳۶ء میں اوکھلا میں صرف ایک عمارت
تھی اس میں مدرسہ ابتدائی کے بچوں کے ساتھ میں
یہاں چلا آیا۔ لیکن ہفتہ میں ایک دو دن ماہ
کے طریقہ کی تعلیم دینے کے لیے قرول باغ میں است
کے مدرسے جایا کرتا تھا۔

اوکھلا سے قرول باغ تک کے سفر میں
لطف آتا تھا۔ وہاں آپ جیسے شاگرد میرے ا
رہتے تھے۔ ان کا اصرار تھا ماسٹر جی یہیں رہ جا
ابتدائی کے بچوں کی یہ دھمکی کہ اگر ایسا ہوا تو ہم
کریں گے۔ میں زندگی کے اس حصے کو بھول نہیں
جان بوجھ کر سنا رہا ہوں کہ آپ بھی اپنے جیون کو
سکھی بنا سکیں۔

مدرسہ ابتدائی اور استادوں کے مدر
نکہ اس انداز میں اس لیے بھی کہہ رہا ہوں کہ آپ

میں بھی ایک ادھا ایک (استاد) ہوں۔ آپ تو پھر بھی میٹرک پاس، بی اے پاس ہیں۔ میں مڈل پاس ہوں مجھ جیسے شخص کے واقعات سے آپ کی ہمت بندھے گی۔ آپ کو اپنے کاموں میں مشکلات نظر آئیں گی تو آپ ہمت نہیں ہاریں گے۔"

استادوں کا مدرسہ ایک سال تک قرول باغ میں رہا۔ اسے گاؤں کے واتاورن (ماحول) میں کام کرنا تھا۔ جامعہ نگر میں عمارتیں نہیں تھیں لیکن کام کو آگے بڑھانے، ٹھیک طرح سے چلانے کے لیے عمارتوں کا انتظار ہے تو کام کی ترقی دھیمی پڑجاتی ہے۔ جوش کم ہوجاتا ہے۔ اس لیے یہ طے ہوا کہ جیسے بھی ہو جامعہ نگر میں یہ مدرسہ منتقل ہوجائے۔

اسٹور کے ساتھ جو بہت سے کوارٹر اب نظر آتے ہیں، یہ صرف چند تھے۔ یہاں استاد اور لڑکوں کا رہنا تجویز ہوا۔ اس عمارت میں جس میں آپ پڑھتے ہیں صرف چار کمرے بنے ہوئے تھے۔ اسی حالت میں یہ مدرسہ جولائی ۱۹۳۹ء میں یہاں منتقل ہوا۔

ذاکر صاحب اپنے طور پر ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتے تھے جو جامعہ کے کاموں کو آگے بڑھائیں۔ علی گڑھ کی چند ملاقاتوں میں ذاکر صاحب نے سلامت صاحب کی ذہانت اور تیزی کا اندازہ لگا لیا تھا۔

۱۹۳۰ء میں جب سلامت صاحب نے بی ٹی کا امتحان پاس کیا تو ذاکر صاحب نے پوچھا "کہیے اب کیا ارادے ہیں؟" سلامت صاحب نے کہا "قومی کام کرنا چاہتا ہوں۔" ذاکر صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں کہا "گھاس کھودنا بھی قومی کام ہوسکتا ہے۔" یہ بتائیے کہ آپ کے اس جواب کی تفصیل کیا ہے۔ آپ نے کہا "ایک مدرسہ قائم کرنے کا ارادہ ہے۔" ذاکر صاحب بولے "تو پھر دہلی تشریف لائیے۔ آپ کو آپ کی پسند کا کام مل جائے گا۔"

اس زمانے میں جب کوئی شخص جامعہ میں کام کرنے آتا تھا تو اس کی تنخواہ اس کے رہنے سہنے کا معاملہ اس بارے میں کوئی کچھ نہیں بتاتا تھا۔ یہ اس کی پہلی آزمائش ہوتی تھی۔

سلامت صاحب اسٹور کے پاس ایک ایسے کمرے میں رہنے لگے جہاں کئی چارپائیاں تھیں۔ مشکل سے ایک چارپائی کی جگہ ملی۔ آپ کے بعد سعید صاحب کے ساتھیوں میں ابوالکلام صاحب، تلارام صاحب کا اضافہ ہوا۔ بس ایک دو سال کا فرق سمجھیے۔ اس بے سروسامانی کی حالت میں بھی ہم نئے نئے کاموں کی ابتدا کرتے چلے گئے۔ کیمپ فائر، کھیلوں کے مقابلے، تعلیمی سیریں، عید، دیوالی کی دعوتیں، استاد شاگردوں کا گھل مل کر کام کرنا۔ یہ سب کام برابر آگے بڑھتے گئے۔

یہاں تک سلسلہ آگے بڑھ چکا تھا۔ مرحوم شفیق الرحمن صاحب قدوائی کی نگرانی میں شعبہ ہمدرداں یعنی جامعہ کی مدد کرنے والوں کا شعبہ قائم ہوچکا تھا۔ جامعہ کے تمام شعبے جامعہ نگر میں منتقل ہوگئے۔

اسی زمانے میں جامعہ کا تیسرا دور شروع ہوتا ہے۔ پہلا دور علی گڑھ کا، دوسرا قرول باغ، تیسرا

جامعہ نگر کا۔ اس زمانے کی کہانی سنانے والے بہت ملیں گے۔

قصہ کا زمانہ ہمیشہ سہانا نظر آتا ہے۔ لیکن ہمارا مقصد زمانہ پر چھوڑا ہے تو بے مقصد بھی ہوتا ہے۔ لوگوں کو چھیڑنا ہو تو کہا کرتے ہیں "کیا کر رہے ہو، گھاس کھود رہے ہو"!! لیکن ذاکر صاحب نے گھاس کھودنے کو بھی ایک فرض بنا دیا تھا۔ اس لیے میں اپنے شاگردوں سے کہوں گا کہ بے سروسامانی کی حالت میں بھی یہ سوال پیدا نہیں ہوتا ہے کہ کیا کریں کیسے کریں۔ اپنی جگہ آپ پیدا کیجیے۔ اپنا کام آپ سوچیے کیجیے۔

عزیزو! ہندوستان آزاد ہونے سے پہلے میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ آزادی ملتے ہی یہ ہو جائے گا۔ لیکن آزادی ملنے کے بعد معلوم ہوا کہ زمانہ جانے کب ہوگا۔

اس کے اسباب بھی ہیں۔ ملک میں غریبی بہت ہے۔ آبادی بڑھتی جا رہی ہے۔ سیلاب اور سوکھا پریشان کرتے ہیں۔ موٹے لوگوں کی ہوس بڑھتی جاتی ہے۔ ان حالات میں آپ نے انتظار کی راہ اختیار کی تو آپ کا ذہن بغاوت کی باتیں سوچنے لگے گا۔

آپ یہاں سے فارغ ہو کر جب گاؤں میں جائیں گے تو وہاں مدرسوں کے لیے نہ تو اچھی عمارتیں ملیں گی۔ نہ ساز و سامان۔ اب دو ہی راستے ہیں۔ رہا تو آپ کر سکتے ہیں۔ اپنا جیون سکھی بنانے کے اپائے (تدبیر یا علاج) سوچیں۔ آخری بات کے لیے جامعہ کی ابتدائی زندگی آپ کی ہمت بڑھائے گی۔

یہ دیس ۶۰ کروڑ انسانوں کا دیس۔ آپ جیسے نوجوانوں کی نراشا (مایوسی) و نا امیدی اور سوکھے سے بھی زیادہ تباہی لائے گی۔ اس لیے کام وقت اس بات کو ہمیشہ دھیان میں رکھیے کہ آپ کو ہے سنوارنا ہے۔ ایشور (خدا) نے جو آپ کو صلاحیت دی ہیں انھیں کام میں لائیے۔ یہ سب سے بڑا دیش ہے اور اپنے دیس کا ہے۔ دکھ کے ساتھ سکھ ہے۔ سے نہ ڈریے تو سکھ ملے گا۔ جب آپ کچھ نہ کچھ کریں گے تو حکومت آپ سے غافل نہ رہے گی۔

تعلیمی تاش کی قیمتیں

تعلیمی تاش اردو	1/60
" انگریزی	1/40
" ہندی	1/90
" اردو انگریزی	1/90
" اردو ہندی	1/90
" ہندی انگریزی	1/90
" بچوں کا تاش اردو	1/12
" " ہندی	1/12
" ہندی سکھانے والے کارڈ	/75
" نیا تاش بڑے اور بے پڑھے سب کھیل سکتے ہیں	1/25

آیا مہینہ رمضاں کا

جناب رؤف خیر

توبہ کریں آیا ہے مہینہ رمضاں کا
سجدہ کریں آیا ہے مہینہ رمضاں کا

ویسے بھی بہت کھیلا ہے اب اور کیا کھیلیں
کچھ دیر ذرا درد کی لذت بھی تو جھیلیں
روزوں کے مزے بھی ذرا اس ماہ میں لے لیں

توبہ کریں آیا ہے مہینہ رمضاں کا
سجدہ کریں آیا ہے مہینہ رمضاں کا

ہم اپنی طرف سے تو شرارت نہ کریں گے
گالی بھی کوئی دے گا تو چپ چاپ سہیں گے
ہم روزے کی حالت میں کسی سے نہ لڑیں گے

توبہ کریں آیا ہے مہینہ رمضاں کا
سجدہ کریں آیا ہے مہینہ رمضاں کا

دل آپ کا گر کے مدینے میں نہیں ہے
ایمان اگر آپ کے سینے میں نہیں ہے
پھر کچھ بھی تو اس پاک مہینے میں نہیں ہے

توبہ کریں آیا ہے مہینہ رمضاں کا
سجدہ کریں آیا ہے مہینہ رمضاں کا

ٹوٹی ہوئی سانسوں پہ بھروسا ہے کہاں کا
ہر لمحہ بکھر جاتا ہے اک خواب جہاں کا
قسمت ہی سے ملتا ہے مہینہ رمضاں کا

توبہ کریں آیا ہے مہینہ رمضاں کا
سجدہ کریں آیا ہے مہینہ رمضاں کا

[illegible]

جامعہ کی کہانی



دلّی شہر سے دور جمنا کے کنارے سرسبز و شاداب درختوں کے سائے میں ایک چھوٹی سی تعلیمی بستی ہے۔ یہ جامعہ نگر کہلاتی ہے۔ جامعہ نگر کی اس بستی میں ایک چھوٹی سی درسگاہ ہے۔ جو جامعہ ملیہ اسلامیہ کہلاتی ہے۔ ۲۹ر اکتوبر ۱۹۷۰ء کو اس کی عمر پچاس برس ہوگئی۔ اس لیے اس سال جامعہ کی طرف سے 'جشن زریں' منایا جارہا ہے۔

جامعہ کی تاریخ مختصر بھی ہے اور واقعات سے بھرپور بھی یہ دوسری درسگاہوں کی طرح قائم نہیں ہوئی بلکہ سیاسی ہل چل سے اس کی ابتدا ہوئی۔ یہ سیاسی ہل چل پورے ملک میں تھی۔ ہندو مسلمان دونوں اس میں شریک تھے۔ انگریزوں کے خلاف مورچہ ملک کے اندر بھی تھا اور ملک کے باہر بھی۔ انگریز ترکوں کی خلافت کو ختم کرنا چاہتے تھے۔ اور اسلامی حکومتوں کے حصے بخرے کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس کے خلاف مسلمانوں میں بہت شدید غصہ تھا۔ دھیرے دھیرے یہ غصہ احتجاج میں بدل گیا۔

نومبر ۱۹۱۹ء میں ایک کمیٹی قائم کی گئی جو خلافت تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ اس کمیٹی نے جون کا ۱۹۲۰ء میں مسلمانوں کے سامنے ایک عملی پروگرام پیش کیا یہی پروگرام ترک موالات کہلاتا ہے۔ ادھر گاندھی جی نے انگریزوں کے خلاف عدم تعاون کی تحریک کی۔ اس طرح ہندو مسلمان دونوں نے مل کر انگریزوں کے خلاف ایک مورچہ قائم کردیا۔ لوگ سرکاری نوکریاں چھوڑنے لگے۔ اور برطانیہ کے بنے ہوئے مال کا بائیکاٹ شروع ہوگیا۔ مولانا محمد علی مولانا شوکت علی (جو علی برادران کے نام سے مشہور تھے) اور گاندھی جی نے ملک کا دورہ کرنا شروع کر دیا۔ جگہ جگہ جلسے ہوئے اور انگریزوں کے خلاف ایک مکمل تحریک شروع ہوگئی۔

انہی سب باتوں سے متاثر ہوکر ۲۹ر اکتوبر ۱۹۲۰ء کو جمعہ کے دن علی گڈھ کالج کے چند نوجوان طالب علموں اور چند استادوں نے کالج چھوڑ دیا۔ اور ایک نئی درس گاہ قائم کی جو جامعہ ملیہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ علی گڈھ کالج اور جامعہ کے درمیان فاصلہ تو بہت کم تھا پر راہ بہت کٹھن تھی لیکن ان جوانوں میں حوصلہ تھا۔ ہمت تھی۔ سر سے کفن باندھ کر کالج سے نکل پڑے۔ اس شان سے کہ دیکھنے والوں کے دل دہل گئے۔ ادھر ادھر پولیس کے سپاہی سنگینیں لیے کھڑے تھے۔ بیچ میں طالب

نظار تھی۔ قطار کے آگے آگے ایک نوجوان جھنڈا لیے بے خطر آگے بڑھ رہا تھا۔

اس جماعت میں طالب علموں کے علاوہ کچھ بزرگ بھی تھے۔ بزرگوں نے کہیں سے خیموں کا انتظام کیا اور ایک میدان میں نصب کر دیا۔ انھی خیموں میں ان جوشیلے نوجوانوں کا قافلہ اترا۔ پوری بے سر و سامانی کے عالم میں۔ نہ کھانے پینے کا انتظام نہ سونے بیٹھنے کا۔ دوپہر ہو گئی تھی۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں کہ کیا ہونے والا ہے۔ لیکن تھوڑی دیر میں کیا دیکھتے ہیں کہ دیگوں میں پکا ہوا کھانا شہر سے چلا آ رہا ہے۔ شہر کے لوگوں نے ان مجاہدین کے لیے پہلے سے ہی کھانے پینے کا انتظام کر رکھا تھا۔ اس مہمان نوازی کا کیا کہنا۔ ان نوجوانوں کی ہمتیں اور بڑھ گئیں۔ اور زیادہ جوش و خروش سے کام شروع ہو گیا۔

جامعہ کی رسمِ افتتاح شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی۔ پہلے شیخ الجامعہ مولانا محمد علیؒ بنائے گئے۔ پڑھائی لکھائی کا انتظام بھی ہو گیا۔ کے ایم پانیکر، کیلاٹ صاحب، مسٹر ایس طاسی اس محمدی صاحب۔ مولانا سورتی مرحوم، مولانا اسلم جیراجپوری مرحوم، خواجہ عبدالحیٔ مرحوم اور بہت سے مشہور اور قابل استاد جمع ہو گئے تھے۔ خود مولانا محمد علی بھی وقتاً فوقتاً پڑھایا کرتے تھے۔ تقریباً سبھی لڑکے کالج سے نکل آئے تھے۔ اس لیے انھی کی تعلیم کا زیادہ خیال تھا۔ کچھ لڑکے ثانوی کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ذاکر صاحب کے بھائی محمود حسین خاں صاحب اور چند دوسرے لڑکے ثانوی کے طالب علم تھے۔ لیکن پڑھائی کا ٹھیک ٹھیک ڈھنگ سے انتظام دہلی آکر ہوا۔

صحیح معنوں میں جامعہ کا تعلیمی دور ۱۹۲۵ء سے شروع ہوا۔ جب علی گڑھ سے قرول باغ دہلی میں منتقل ہوئی۔ دلّی میں جامعہ کو ملک کے مشہور حکیم مسیح الملک اجمل خاں صاحب، ڈاکٹر مختار احمد انصاری صاحب کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ پھر گاندھی جی بھی جامعہ کے کاموں میں دلچسپی لینے لگے اور یہاں آکر مدرسے اور کالج کی جماعت بندی کی گئی۔ ابتدائی جماعتوں سے لے کر اونچی جماعتوں کا ایک نصاب بنایا گیا۔ تعلیم کے ساتھ ساتھ صنعت و حرفت کو خاص طور سے جگہ دی گئی۔ غرض اب جامعہ صحیح معنوں میں ایک آزاد قومی تعلیم کا ادارہ بن گئی۔ لیکن چونکہ انگریزی حکومت جامعہ کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتی تھی۔ اس لیے جامعہ کی سندیں منظور نہیں کی جاتی تھیں اور بہت تھوڑے سے طالب علم جامعہ میں پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ لیکن جو بھی ایک بار جامعہ میں طالب علم کی یا استاد کی حیثیت سے آجاتا پھر وہ یہیں کا ہو کر رہ جاتا۔

۱۹۲۶ء میں جامعہ کی باگ ڈور ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب نے سنبھال لی۔ آپ اسی سال جرمنی سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے جامعہ واپس آئے تھے۔ اپنے ساتھ پروفیسر محمد مجیب صاحب اور ڈاکٹر عابد حسین صاحب کو بھی لائے تھے۔ ان دونوں حضرات نے بھی اس قومی خدمت کو اپنا لیا۔ اس طرح جامعہ ایک نئے حوصلے

کے ساتھ شروع ہوئی۔ ۱۹۲۸ء میں انجمن جامعہ ملیہ قائم ہوئی اس کا ایک دستور بنا۔ اس دستور کے مطابق اس کے مقاصد مقرر ہوئے۔ مقاصد کو مختصر لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ہندوستانیوں، خاص طور سے مسلمانوں میں ایسی تعلیم پھیلانا جو دین کے لیے بھی مفید ہو اور دنیا کے لیے بھی مفید ہو۔ اور ساتھ ہی ساتھ قوم اور ملک کی ضرورت کے مطابق ہو۔

۲۔ امتحان لینا اور سند دینا۔

۳۔ مختلف علوم سے متعلق کتابیں لکھنا اور شائع کرنا۔

۴۔ تعلیم کے نئے نئے تجربہ کرنا۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جامعہ نے مختلف ادارے قائم کیے۔ چھ برس سے لے کر ۱۲ برس تک کے بچوں کے لیے ایک مدرسہ ابتدائی مدرسے کے نام سے قائم کیا۔ یہاں تعلیم و تربیت دونوں کو تعلیم کا جز بنایا گیا۔ نصاب تعلیم مرتب کیا گیا۔ بچوں کا بینک، بچوں کی دکان، بچوں کا خوانچہ اور مرغی خانہ یہ چار شعبے کاروباری تعلیم کے لیے کھولے گئے۔ گردو پیش کی زندگی سے واقفیت پیدا کرنے کے لیے میوزیم قائم کیا گیا۔ اقامتی زندگی لازمی قرار دی گئی۔ غرض بچوں کی تعلیم کے لیے ایک جیتا جاگتا ماحول تیار کیا گیا۔

بڑے بچوں کے لیے مدرسہ ثانوی قائم کیا گیا۔ جہاں تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ صنعت حرفت کا بھی انتظام کیا گیا۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے جامعہ کالج پہلے سے

اسی کے ساتھ یہ بھی سوچا گیا کہ جب اچھے استاد نہیں پیدا کیے جائیں گے اس وقت تعلیم نہیں دی جا سکتی۔ اس لیے استادوں کی کے لیے استادوں کا مدرسہ قائم کیا گیا۔ کتابیں چھ بیچنے کے لیے بھی ایک شعبہ کھولا گیا جو مکتبہ جامعہ سے مشہور ہے۔ بڑوں اور بچوں کے لیے اس نے بہت اچھی اچھی کتابیں شائع کی ہیں۔ بچوں کے رسالہ نکالا جو "پیام تعلیم" کے نام سے پورے مشہور ہے۔ اس طرح جامعہ میں ایک مکمل تعلیم کیا گیا۔ اور ایک انوکھی تعلیمی فضا پیدا کی گئی۔

۱۹۳۵ء میں جامعہ قرول باغ سے او قریب منتقل ہو گئی۔ جمنا کا کنارہ، کھلی فضا، شہر سے دور ایک نئی بستی قائم کی گئی۔ جامعہ نگر نا یہاں مدرسوں اور کالجوں کی نئی عمارتیں بنائی گئیں کے میدان کا انتظام ہوا۔ بورڈنگ ہاؤس اور اسا رہنے کے لیے کوارٹر بنائے گئے۔ غرض ایک ایسی بسائی گئی جو صحیح معنوں میں تعلیمی بستی کہی جا سکتی

۱۹۴۵ء میں جامعہ کی عمر ۲۵ برس ہو گ لیے جشن سیمیں منانے کا منصوبہ بنایا گیا۔ یہ منصو میں پورا ہوا۔ پچھلے کاموں کا جائزہ لیا گیا۔ اور بنائے گئے۔ جلسے ہوئے تقریریں ہوئیں نمائشیں گئیں۔ اور تفریحی پروگرام کیے گئے۔ غرض ایک وہ چہل پہل رہی کہ آج تک لوگوں کے دلوں پر نقش

جشن سیمیں کے بعد ملک میں ایک زبردست انقلاب آیا۔ ملک تقسیم ہوگیا۔ قتل وخون کا بازار گرم ہوگیا۔ ہندو مسلمان سکھ سبھی پاگل ہوگئے۔ ایسا لگتا تھا کہ جامعہ کے دن پورے ہوگئے۔ اب یہ بند ہوجائے گی۔ لیکن جامعہ کے کارکنوں نے ہمت نہ ہاری۔ انھوں نے پناہ گزینوں میں کام کرنا شروع کردیا۔

وہ بھی عجیب دور تھا کسی کو یہ اندازہ نہ تھا کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ جامعہ رہے گی یا بند ہوجائے گی۔ ہر شخص پریشان تھا۔ لیکن اس پریشانی میں بھی جامعہ والوں نے آس کا دامن نہ چھوڑا۔ خدا خدا کرکے یہ ہنگامہ ہلکا ہوا۔ جامعہ کا کام پھر سے شروع ہوا۔ کچھ پرانے لوگ چلے گئے کچھ نئے ساتھی آگئے۔ غرض جامعہ نے ایک نئے سرے سے جنم لیا۔ لیکن ابھی پورے طور پر سنبھلنے بھی نہ پائی تھی کہ ذاکر صاحب علی گڈھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے عہدے پر بلا لیے گئے۔ پروفیسر محمد مجیب نے جامعہ کا انتظام سنبھال لیا۔ اور آج تک سنبھالے ہوئے ہیں۔ سنہ ۱۹۶۳ء میں جامعہ کو یونیورسٹی کا درجہ مل گیا۔ ۴۷ء کے بعد جامعہ میں نئے ادارے کھلنے شروع ہوگئے تھے۔ اس وقت مندرجہ ذیل تعلیمی ادارے ہیں۔

۱۔ نرسری
۲۔ مدرسہ ابتدائی
۳۔ جامعہ ہائر سیکنڈری اسکول
۴۔ جامعہ کالج
۵۔ استادوں کا مدرسہ
۶۔ اسکول آف سوشل ورک
۷۔ انسٹی ٹیوٹ آف سول انجینیرنگ
۸۔ آرٹ انسٹی ٹیوٹ (یہ اب ٹیچرس کالج کا ایک شعبہ ہوگیا ہے)

اقامتی زندگی جامعہ کی تعلیم کا ایک اہم حصہ ہے۔ ابتدائی مدرسے سے لے کر اعلیٰ تعلیم کے اداروں تک اقامتی زندگی کو لازمی قرار دیا گیا۔ لیکن عمارتوں کی کمی کے سبب سب طالب علموں کے رہنے سہنے کا انتظام نہیں ہوسکا۔ لڑکیوں کے لیے بھی صرف ایک اقامت گاہ ہے۔ جو جامعہ میں لڑکیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کے لیے ناکافی ہے۔ امید ہے جشن زریں کے بعد اس کام کو اہمیت دی جائے گی اور تمام طالب علموں کے لیے اقامت گاہوں کا انتظام کیا جائے گا۔ ٥

اس سرخ نشان کا مطلب ہے کہ اس مہینے کے بعد آپ کی مدتِ خریداری ختم ہوگئی ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے پیارے پیام تعلیم کی سرپرستی جاری رکھیں گے۔ براہ کرم مبلغ چھ روپے کا منی آرڈر اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک ضرور بھیج دیجیے تاکہ یہ سلسلہ قائم رہے۔ آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا۔ اور افسوس کے ساتھ بند کردیں گے۔ منی آرڈر کوپن پر اپنا خریداری نمبر لکھنا نہ بھولیے۔ آپ کا خریداری نمبر ہے "مینیجر"

[illegible]

کیسی دل چسپ اور مزیدار کتابیں ہیں

آسنے کا پتلا	-/۳۰	وطنی نظمیں	-/۸۵	ٹلّو میاں
میں گھر جاؤں تو کیسے	-/۲۵	ہماری نعت	-/۳۰	چنن منن
مٹی کا پرستان	-/۳۰	یادگار انگوٹھی	-/۳۵	چھنگو منگو
مکھن کا ڈبّا	-/۲۵	انار راجا	-/۲۵	ڈھول کا بول
مزدور کا بیٹا	-/۵۰	انوکھی چھتری	-/۳۵	ریڈیو کا بھوت
میاں مٹھو	-/۳۵	بونے کا بٹوا	-/۲۵	شیر خاں کے معرکے
نئی کہانیاں	-/۵۰	بدھو کی بیوی	-/۳۵	طلسمی مینا
ہوشیار حسن	-/۲۵	بلخ شہزادی	-/۳۵	عید کے کھلونے
اسلامی نظمیں	-/۶۵	بونے کا انصاف	-/۳۰	کھلو میاں
بچوں کا کھلونا	-/۷۵	بُڑھی کی چھڑی	-/۳۵	گھر کا آئینہ
بچوں کا تحفہ اوّل	-/۵۰	پرستان کی سیر	-/۲۵	گلگلے کی دوڑ
بچوں کا تحفہ دوم	-/۷۵	پیسے کا صابن	-/۳۵	گھی شکر
نبی کا تحفہ	۱/-	پاپ کی ناؤ	-/۳۵	غالب کی کہانی
کے گیت	-/۶۵	تارا کا ڈنڈا	-/۲۵	

بچوں کے مقبول ادیب اطہر پرویز صاحب کی دلچسپ اور معلوماتی کتا

انمول رتن	۱/۵۰	مصنوعی چاند	۱/۵۰	ہندوستان شاہراہ ترقی پر
بجلی اور چراغ	۱/۶۳	گلیلی گلیلیو	۱/-	شہر اور گاؤں
بدن کی کہانی	۱/۲۵	اکبر بیربل کے لطیفے	-/۶۰	ایٹم کیا ہے
ہماری کھیتی باڑی	۱/۲۵	خلا کا سفر	۱/۲۵	سورج کا گھرانا
نجومی آپا	-/۷۵	توانائی کا راز	۱/۲۵	

جامعہ ملیہ آزادی کے بعد

جامعہ ملیہ اسلامیہ کے معنی شاید بہت سے پیامی بچے نہ جانتے ہوں۔ 'جامعہ' کے معنی ہیں 'یونیورسٹی' 'ملیہ' کے معنی ہیں قومی یا نیشنل اور 'اسلامیہ' کے معنی تو جانتے ہی ہوں گے یعنی اسلام سے تعلق رکھنے والی۔

بالکل شروع میں جب جامعہ قائم ہوئی تو انگریزی میں اس کا نام تھا: "نیشنل مسلم یونیورسٹی" اور بریکٹ میں اردو میں لکھا جاتا تھا 'جامعہ ملیہ اسلامیہ' اب یہی بریکٹ کا نام مشہور ہو گیا۔ انگریزی میں بھی یوں لکھتے ہیں۔

جامعہ قائم ہوئی تو اس کے کام کرنے والوں کے ذہن میں شروع سے یہ بات تھی کہ اس کو یونیورسٹی بنایا جائے گا۔ یونیورسٹی کسے کہتے ہیں؟ یونیورسٹی اسے کہتے ہیں جس میں نئے پرانے علوم و فنون کی اونچی سے اونچی تعلیم دی جائے۔ مثلاً ایم اے، اور پی ایچ ڈی تک کی۔

مگر جامعہ چونکہ انگریزی حکومت کے خلاف قائم ہوئی تھی اور یہاں سے پڑھ کر نکلنے والوں کو حکومت کے کسی دفتر میں نوکری نہیں ملتی تھی نہ حکومت کی کسی یونیورسٹی میں داخل ہو سکتے تھے۔ اس لیے ہائی اسکول کے بعد جامعہ میں بہت کم طالب علم رہ جاتے تھے۔ صرف وہی جن کو نہ تو حکومت کی ملازمت کرنی ہوتی تھی نہ کسی اور یونیورسٹی میں پڑھنے کا ارادہ ہوتا تھا۔

سنہ ۱۹۳۶ء میں جب میں جامعہ میں پڑھنے آیا تھا تو کالج میں زیادہ سے زیادہ ۱۵، ۲۰ طالب علم تھے۔ جب تک انگریزی حکومت ہندوستان سے چلی نہیں گئی جامعہ میں بی اے سے زیادہ نہ تو تعلیم کا انتظام ہوا نہ ہائی اسکول کے بعد زیادہ تعداد میں یہاں پڑھنے والے تھے۔

خدا خدا کر کے سنہ ۱۹۴۷ء میں آزادی ملی۔ شروع کے چند سالوں میں حکومت بہت پریشان رہی۔ وہ جامعہ کی طرف کوئی توجہ نہ کر سکی۔ مگر پھر جلد ہی اس نے اس کی ڈگریوں کو بھی منظور کر لیا اور اس کے اخراجات کے لیے پیسے بھی دینے لگی۔ اس کی وجہ سے جامعہ بھی آہستہ آہستہ ترقی کے راستے پر آگے بڑھنے لگی۔

آزادی سے پہلے ہمارے پاس پڑھانے اور طالب علموں کے رہنے کے لیے صرف تین بڑی عمارتیں تھیں۔ ایک مدرسہ ابتدائی کی جو سنہ ۱۹۳۶ء میں تیار ہوئی، دوسرے استادوں کے مدرسے کی جس کی بنیاد سنہ ۱۹۳۹ء میں رکھی گئی۔ اور اسی سال اگست سے یہاں پڑھائی شروع ہو گئی۔ تیسری عمارت جس میں ثانوی کی پڑھائی بھی ہوتی تھی اور طالب علم رہتے بھی تھے، سنہ ۱۹۴۰ء میں مکمل ہوئی۔ بس یہی کل تین بڑی عمارتیں تھیں۔ مگر آزادی کے بعد بہت سی عمارتیں بن گئی ہیں۔ طالب علموں میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا اور تقسیم کے

آگے کم دی جانے لگی ہے کہ صحیح معنوں میں اب
جامعہ یونیورسٹی کہلانے کی مستحق ہے۔

حکومت نے اسے یونیورسٹی مان بھی لیا ہے۔ پھر بھی جامعہ نے اتنی ترقی نہیں کی ہے جتنی کرنی چاہیے تھی۔ عمارتوں کی کمی اب بھی ہے۔ اور بہت سے مضمونوں میں ایم اے پی ایچ ڈی کرنے کا انتظام نہیں ہے۔

جہاں تک عمارتوں کا تعلق ہے پچھلی تین عمارتوں کے علاوہ پڑھانے اور طالب علموں کے رہنے کے لیے سات بڑی عمارتیں بن گئی ہیں۔ ان میں سے ایک استادوں کے مدرسے کے طالب علموں کا ہوسٹل ہے، دوسرا ہوسٹل لڑکیوں کا تیسرا کالج کے لڑکوں کا، چوتھی عمارت میں آرٹس انسٹی ٹیوٹ کے طالب علموں کی پڑھائی بھی ہوتی ہے اور وہ رہتے بھی ہیں۔ اور پانچویں عمارت میں کالج کا دفتر، لائبریری اور کچھ کلاسیں اور چھٹی عمارت میں کالج کے طالب علم پڑھتے ہیں اور ساتویں میں آج کل مرکزی کتب خانہ ہے اور مرکزی دفاتر ہیں۔ ان کے علاوہ اسٹاف کے رہنے کے لیے بہت سے کوارٹر ہیں۔ ایک اوپن ایر تھیٹر ہے۔ ایک ورک شاپ ہے اور انجینیرنگ اور اسکول آف سوشل ورک کی کلاسوں کے لیے چھوٹی چھوٹی بہت سی عمارتیں ہیں۔ اس وقت مرکزی کتب خانے کے لیے ایک شان دار عمارت بن رہی ہے، جو قریب قریب مکمل ہو گئی ہے۔

گولڈن جوبلی کے لیے اس کا کچھ حصہ استعمال کے لیے شاید مل بھی جائے۔ سائنس کی عمارت بنیادوں سے اوپر آ گئی ہے۔

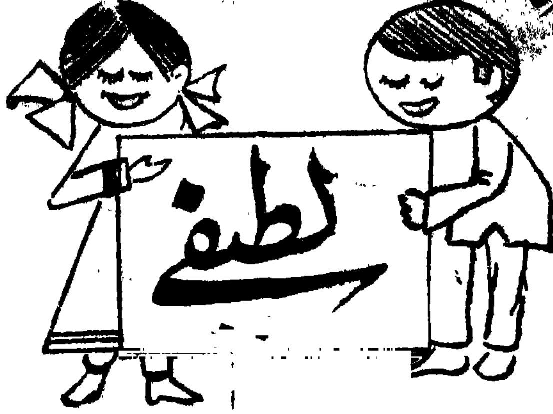
تیسری عمارت سب سے اہم مسجد ہے جس
تیاری کے زمانے میں اسے بھی بنانے کا فیصلہ کی
اس کی چھت پڑنے کو رہ گئی ہے۔ بہت شان دار

مگر کسی یونیورسٹی کی اصل ترقی صرف عمار
نہیں ظاہر ہوتی۔ طالب علموں اور پڑھائی سے ہو
آزادی سے پہلے کے مقابلے میں طالب علموں کی تعد
تین چار گنا اضافہ ہوا ہے۔ اسی طرح تعلیم میں ترا
ہے۔ پہلے سائنس کی تعلیم نہیں تھی، اب بی ایس سی
پڑھائی جاتی ہے۔ بہت سے مضمونوں میں آنرز کا
کیا گیا ہے۔ تاریخ میں ایم اے، پی ایچ ڈی اور تع
ایم ایڈ اور پی ایچ ڈی بھی تعلیم ہونے لگی ہے۔ اور
بن جائیں گی تو ایم ایس سی اور دوسرے مضامین می
ایم اے اور پی ایچ ڈی کی تعلیم ہونے لگے گی۔

ایک اور خوش خبری سنائیں۔ ہمارے محبو
شیخ الجامعہ اور امیر الجامعہ اور ملک کے سابق ص
ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی یاد میں اسلامی علوم کی تحق
کام کے لیے حکومت نے ابھی حال میں تین لاکھ ر
دیے ہیں۔ اس نئے ادارے کا نام ہوگا 'ذاکر حس
سنٹر آف اسلامک اسٹڈیز'

ہم نے مختصر طور پر جو کچھ لکھا ہے اس سے یہ نہ
لینا کہ جامعہ کے حوصلے پورے ہو گئے۔ ابھی تو بہت کام باقی
اور ابھی بہت کچھ کرنا ہے۔ جامعہ کا اصل مقصد صرف
یونیورسٹی بننا نہیں تھا۔ اس سے بہت بڑا مقصد جامعہ والوں
سامنے تھا اور ہے اور اس کے لیے کوششیں جاری ہیں

جناب [illegible] اشرفی



۱

پاگل خانے کے ڈاکٹر نے ایک مریض کو کچھ لکھتے دیکھ کر پوچھا "ارے بھئی، یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

"اپنے آپ کو ایک خط لکھ رہا ہوں" مریض نے جواب دیا۔

"اوہ۔ تو تم نے خود کو کیا لکھا ہے؟" ڈاکٹر نے بڑی دلچسپی سے پوچھا۔

"عجیب آدمی ہیں آپ بھی۔ بھلا میں یہ اس وقت تک کیسے جان سکتا ہوں جب تک مجھے یہ خط ڈاک سے نہ ملے" پاگل نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

۲

نوکر (جہاز کے کپتان سے) "کپتان صاحب کیا آپ کسی ایسی چیز کو گم ہوا کہیں گے جس کے بارے میں آپ کو معلوم ہو کہ [illegible]"

"نہیں [illegible] کیسے ہو سکتا ہے"

"اچھا جناب۔ تو آپ کی چاندی کی کیتلی سمندر کی تہہ میں ہے"

۳

استاد جماعت میں پڑھا رہے تھے کہ ہمارے کپڑے سوت سے بنتے ہیں۔ سبق ختم کر کے انھوں نے ایک لڑکے سے پوچھا۔

"اچھا بتاؤ تمھاری یہ نیکر کس چیز سے بنی ہے؟"

لڑکے نے جو اونگھ رہا تھا گھبرا کر جواب دیا۔

"ابا جان کی پتلون سے"

۴

بس کنڈکٹر (مسافر سے) "اتنی جگہ خالی پڑی ہے آخر آپ بیٹھ کیوں نہیں جاتے؟"

مسافر "معاف کیجیے۔ میں یہاں بیٹھنے نہیں آیا۔ مجھے جلدی گھر پہنچنا ہے"

۵

استاد: ۔ آم کب [illegible] ہیں؟

ایک [illegible] لڑکا: ۔ جب مالی [illegible]

... کیونکہ [illegible] اس بچے کی [illegible]

ان کا بیٹا [illegible] ہو گیا

سب [illegible] بچوں کی تعلیم [illegible]

لیکن [illegible] بھی ماں باپ اپنے بچوں کو

زندگی میں بہتر مواقع فراہم نہیں کر سکے۔

اگر آپ اپنے خاندان کو صرف تین تک محدود رکھیں تو اپنے

بچوں کو بہتر تعلیم دلا سکتے ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کے لئے مختلف طریقے

استعمال [illegible] آپ کو [illegible] ویلفیئر [illegible]

دستیاب ہیں [illegible] کی پہچان [illegible] سے

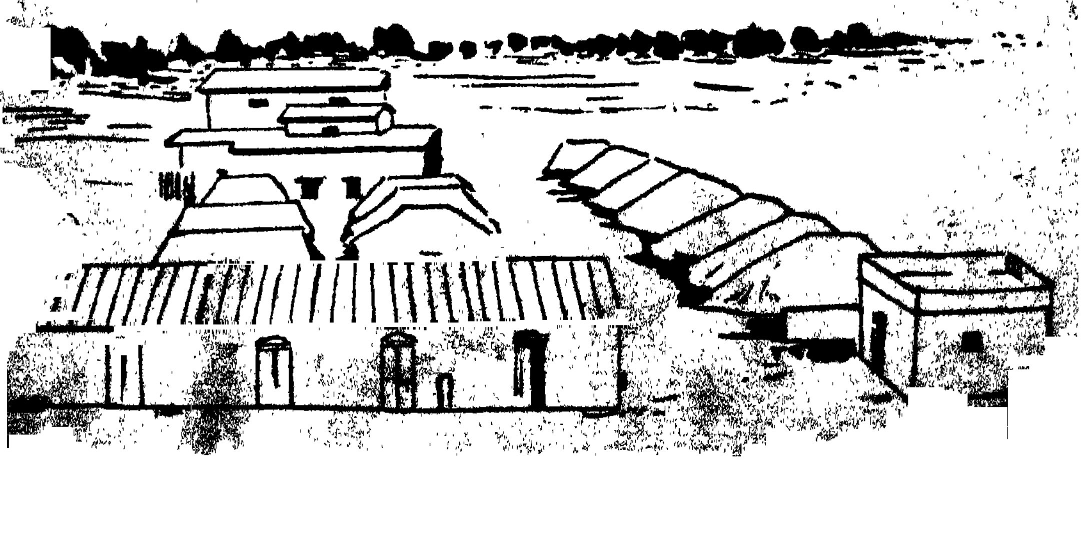
ہو سکتی ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی بہتر تعلیم کے لئے





پیامِ تعلیم



ریاستہائے میسور، مدھیہ پردیش، اڈیسہ، جموں کشمیر و ہریانہ
کے تعلیمی اداروں کے لیے منظور شدہ

ماہنامہ
پیامِ تعلیم
نئی دہلی

جلد ۷ دسمبر ۱۹۷۰ء شمارہ ۱۲

ایڈیٹر
محمد حسین حسّان ندوی

صدر دفتر۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ جامعہ نگر، نئی دہلی ۲۵
شاخ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶
شاخ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ پرنسس بلڈنگ بمبئی ۳
شاخ۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

قیمت فی پرچہ ۶۰ پیسے سالانہ چندہ چھ روپے

پرنٹر پبلشر سید احمد فکی نے جمال پرنٹنگ پریس دہلی میں چھپوا کر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ کے لیے جامعہ نگر نئی دہلی سے شایع کیا۔

فہرست

بچوں کی دلچسپ معلوماتی کتابیں

ارشادات نبوی	-/۴۰	حضرت امیر معاویہؓ	۱/-	سونے کی گائے	-/۴۰	ریل کا سفر	
اسلامی جینے	-/۴۰	دین کی پہلی مسلمان عورت	-/۵۰	ضدی شہزادی	-/۲۵	کبڑا گھوڑا	
آداب المعاشرت	-/۴۰	شیخ عبد القادر جیلانیؒ	۱/۲۵	قاتل بادشاہ	-/۵۰	سنہری چڑیا	
پیغمبر انسانیت	-/۴۰	شہادت امام حسینؓ	-/۴۰	کوہ زمرد کی شہزادی	-/۲۵	مولانا ابوالکلام آزاد	
تلاوتِ قرآن کی فضیلت	-/۴۰	شرعی پردہ	-/۲۵	گلفام کی انگوٹھی	-/۳۰	ننھی منی کہانیاں	
تہذیب کیا ہے	۱/۵۰	صدیق اعظمؓ	-/۹۰	لالچ کی سزا	-/۲۵	سرورِ دو عالمؐ	
جنت اور دوزخ	۱/۲۵	عورت کی جنت	۱/-	طلسمی دوربین	-/۲۵	حضرت صدیق اکبرؓ	۵
جانوروں کے حقوق	-/۴۰	فاتحہ کا صحیح طریقہ	۱/-	لے پالک شہزادہ	-/۲۵	حضرت فاروق اعظمؓ	۵
حضرت عائشہ صدیقہؓ	۱/-	کیا پردہ ملک کی ترقی میں		منحوس محل	-/۲۵	حضرت عثمان ذی النورینؓ	۵
حضرت رابعہ بصری	۱/۲۵	رکاوٹ ہے؟	-/۴۰	نیلم شہزادی	-/۲۵	حضرت علی شیر خداؓ	۵
حضرت سکینہ بنت حسینؓ	-/۶۰	مسلمان بہادر لڑکے	-/۷۵	نیلا گلاب	-/۳۰	حضرت امام حسینؓ	۵
حضرت سلمان فارسیؓ	-/۶۰	مومن کی زندگی قرآن		چاچا نہرو	۱/-	حضرت امام حسنؓ	۵
حیات ابوہریرہؓ	-/۶۰	کی روشنی میں	۱/-	اصلاحی کہانیاں	-/۳۰	حضرت رابعہ بصریؒ	۲۵
حضرت ابوبکر صدیقؓ	-/۳۰	نجات المسلمین	-/۴۰	بچوں کی اخلاقی کہانیاں	-/۳۰	حضرت سلمانؓ	۲۵
حضرت فاروق اعظمؓ	-/۴۰	انوکھا تحفہ	-/۲۵	بچوں کا ادب	۱/۵۰	حضرت بلالؓ	۲۵
حضرت عثمان غنیؓ	-/۵۰	بنار شہزادی	-/۲۵	ٹیپو سلطان شہید	-/۳۰	حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ	۲۵
حضرت علی المرتضیٰ	-/۵۰	بولتا پہاڑ	-/۳۰	جنگل کی دنیا	-/۴۰	حضرت فاطمۃ الزہراؓ خاتون جنت	۵
حضرت امام حسینؓ	-/۶۵	پانچ بہادر دوست	-/۲۵	دلچسپ لطیفے	-/۳۰	ابھرتا سورج	۵۰
حضرت عمر بن عبد العزیزؒ	-/۵۰	جادوگر کی گڑیا	-/۳۰	دلچسپ کہانیاں	-/۳۰	زمین کے تارے	۵۰
حضرت خدیجہؓ	-/۴۰	چوری کا خزانہ	-/۲۵	ڈاکٹر اقبال	-/۳۰	چمکتے موتی	۵۰
حضرت ابوعبیدہ بن الجراحؓ	-/۴۰	زمرد پری	-/۵۰	ڈاکٹر ذاکر حسین سیرت و شخصیت	-/۳۵	تین قلندر	۱/-

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ پرنسس بلڈنگ نزد جے جے ہسپتال بمبئی ۳

بچوں کی باتیں

سب سے پہلے تو آپ عید کی مبارک باد قبول کیجیے۔ اس عید کو کوئی "عید الفطر" کہتا ہے۔ کوئی "چھوٹی عید" اور کوئی "رمضان والی عید" (رمضان کے بعد جو آتی ہے)

روزوں کا مہینہ پورے سال میں بڑی چہل پہل کا مہینہ ہے۔ خوب عبادت کی جاتی ہے۔ کلام پاک کی تلاوت ہوتی ہے۔ تیس روزے رکھنے کے بعد چاند کی پہلی تاریخ کو جو یہ خدا نے خوشی کا دن رکھا ہے تو یہ ایک طرح سے اس پورے مبارک مہینے میں عبادت وریاضت کا انعام ہے۔ جبھی تو آپ رمضان کی ۲۹ تاریخ کو کس شوق سے آسمان پر نظر گاڑ دیتے ہیں اور چاند ہو جاتا ہے تو کیسی خوشی مناتے ہیں۔ یہ خوشی آپ سب کو مبارک!

جامعہ کی پچاس سالہ جوبلی آئی بھی گذر بھی گئی۔ خیر و خوبی سے گذر گئی۔ وقت کم تھا لیکن جامعہ والوں نے اسے کامیاب بنانے کے لیے رات دن ایک کر دیا۔ یہ کام بہت سلیقے سے، بہت شان سے، بہت اہتمام سے انجام پایا۔ اس جوبلی کی مختصر رپورٹ یا روداد کسی دوسری جگہ پڑھیے۔

اس تقریب میں جامعہ کے کئی اداروں نے کئی خاص نمبر بھی نکالے۔ کالج کے لڑکوں نے اپنے قلمی رسالے "پتنگ" کا چھپا ہوا نمبر بہت اہتمام سے نکالا۔ کیا مضمون کیا لکھائی چھپائی، کیا تصویریں سب معیاری تھیں۔ کالج نے رسالہ "جامعہ" کا خاص نمبر نکالا یہ بھی ہر اعتبار سے اپنے معیار کے مطابق تھا۔ مکتبہ جامعہ نے کتاب نما کا خاص نمبر نکالا۔ اس میں پروفیسر عاقل صاحب کا مضمون پڑھنے کی چیز ہے۔ اور پھر ـــــ آپ کے پیام تعلیم کا جوبلی نمبر نکلا۔ اس کے بارے میں ہم آپ کی رائے کے منتظر رہیں گے۔

جوبلی نمبر کے مضمون ہمیں بہت بعد میں ملے۔ کچھ مضمون بہت بڑے تھے۔ ان کی دو قسطیں کی گئیں۔ محترمہ آصفہ مجیب کا مضمون (قطرے سے گہر ہونے تک) پورا کا پورا چھپنا چاہیے تھا۔ لیکن آخر آخر میں اسے بھی دو قسطوں میں کرنا پڑا۔ یہ سب مضمون اس پرچے میں شامل ہیں۔ اور یہ پرچہ بھی جوبلی نمبر کا ضمیمہ بن گیا ہے۔

اس کے علاوہ اکتوبر میں چند مضمون شائع ہوئے تھے۔ یہ نامکمل رہ گئے تھے (کشتواڑ۔ انوکھی بارات وغیرہ) ان کی آخری قسطیں اس پرچے میں پڑھیے۔ تصویری کہانی آپ کو بہت اچھی لگی تھی۔ جوبلی نمبر میں گنجائش کی کمی کی وجہ سے شائع نہ ہو سکی تھی وہ بھی اس پرچے میں شامل کی جا رہی ہے۔ عید پر دو اچھی نظمیں اور دوسری نظمیں پڑھیے۔

آج کل دہلی میں فلو (ایک انوکھا بخار) وبائی شکل میں پھیلا ہوا ہے۔ ہوتے ہوتے یہ میرے گھر میں داخل ہو گیا۔ نزلہ زکام اور سانس کی تکلیف پہلے سے تھی اس بخار

مسرت لیے ہر طرف عید آئی

دیا عید کا چاند جس دم دکھائی   بڑی دھوم بچوں نے گھر میں مچائی
خبر عید آنے کی سب کو سنائی   کوئی چہچہایا کوئی چہچہائی
مسرت لیے ہر طرف عید آئی

یہ چاند آگیا کیا نظر آسماں پر   خوشی چھا گئی طفل و پیر و جواں پر
مبارک سلامت ہے سب کی زباں پر   ہے چھوٹوں کی جانب بڑوں کی بڑائی
مسرت لیے ہر طرف عید آئی

سلام اور آداب کا شور ہر سو   دعا پر دعائیں. سلامت رہے تو
دکانوں پہ رونق گھروں میں ہے ہاہو   وہ بچوں کی ضدیں سے ان کی لڑائی
مسرت لیے ہر طرف عید آئی

نئے کپڑے میرے کہاں ہیں وہ اماں؟   پہن کر انھیں میں مناؤں گی خوشیاں
بتاؤ بھلا کب پکیں گی سویاں   شمیم آئے گی آئے گی منی بائی
مسرت لیے ہر طرف عید آئی

اٹھاتے ہیں ناز آج کے دن ہمارے   ہمیں پیار کرتے ہیں گھر والے سارے
بنے رہتے ہیں سب کی آنکھوں کے تارے   نہیں ہوتی اس دن ہماری پٹائی
مسرت لیے ہر طرف عید آئی

ہیں میرے بھی بھائی بہن چھوٹے چھوٹے   بڑوں سے ملیں گے مجھے جتنے پیسے
میں ان میں سے ان کے بھی کر دوں گا حصے   کروں گا غریبوں سے بھی کچھ بھلائی
مسرت لیے ہر طرف عید آئی

گلے لوگ ملتے ہیں پڑھ کر دوگانہ   یہ ہے دوستی کا عجب اک بہانہ
نہ کیوں فائدہ اس سے پائے زمانہ؟   نظر اس میں آتی ہے سب کی بھلائی
مسرت لیے ہر طرف عید آئی

وطن میں یہی رسم پھیلاؤں گا میں   محبت سے دل سب کے گرماؤں گا میں
ملا کر گلے ایک ہو جاؤں گا میں   یہ وعدہ ہے مفتوں نہیں خودستائی
مسرت لیے ہر طرف عید آئی



قطرے سے گہر ہونے تک

نئی بستی جامعہ نگر

بستی بسنا کھیل نہیں ہے بستے بستے بستی ہے۔

آپ نے پرانی کہانیوں میں یہ کہاوت سنی ہوگی۔ جنگل بیابان کف دست میدان نہ آدم نہ آدم زاد۔ سوا خدا کی ذات" یہ حالت یہاں کی تھی اور یہ مثل اس پر پوری اترتی تھی ہر طرف بنجر زمین، اونچے نیچے ٹیلے، جو اب بھی کہیں کہیں موجود ہیں کہیں ایک سایہ دار درخت نہیں سبزہ نہیں جدھر دیکھو جھاڑ جھنکار کیکر کی جھاڑیاں تھیں کانٹے دار چاروں طرف کانٹے بچھے ہوئے، جو پاؤں میں چبھتے اور کپڑوں میں الجھتے تھے چھوٹی چھوٹی جھر بیریوں کے پیڑ تھے جنھیں بچے شوق سے توڑ کر کھاتے۔

نہر کی طرف چھیروں کے تھوڑے سے گھر تھے۔ کچھ گھر دودھ کا کاروبار کرنے والے گھوسیوں کے تھے اور بس ہو کا عالم۔ جامعہ والوں کا ایک آدھ گھر تھا جس سے بن پڑا دو ایک کمرے بنوا کے چہار دیواری کھنچوالی۔ استادوں کا مدرسہ ایک کونے پر۔ ادھر حافظ فیاض صاحب کا مکان اور میرا ادھ بنا گھر جو تین چار برس سے بن رہا تھا۔

مجیب صاحب کو باغ لگانے کا بڑا شوق تھا وہ قرول باغ سے جب ادھر آتے پیڑ لگوا جاتے جو سو جاتے۔ وہ ایک پیڑ ہمارے یہاں اس زمانے کی یادگار کھڑے ہیں۔

رات کو وہ سناٹا کہ بس "اللہ سے سنا آواز نہیں آتی" ہو حق پڑا رہتا۔ رات کو گیدڑ ہمارے احاطے میں گھس آتے۔ شام ہی سے بچے دبک گھروں میں بیٹھ رہتے ما لیسے ہیں نئے گھر میں آنے کی خوشی پر خاک پڑ جاتی۔ رہی سہی کسر یہاں آکر پوری ہوگئی۔ سب جنگل میں منگل منانے لگے۔

کھلی فضا تو بے شک اچھی لگتی مگر ایسی فضا کیا کہ مکھیاں بھن بھن کر رہی ہیں ہر طرف ان کا بھنبھنانا ہوا تھا شام سے مچھر جان کو نوچتے کسی طرح بچانہ چھوڑ دیمک کا خدا بھلا کرے ہر جگہ صفائی ہوئی نئے نئے چوکھٹ کھوکھلے کر دیے۔ رات کو نیچے کی روشنی رزانی ہمرک کر

زمین پر گر گئی۔ صبح کو غائب یا اللہ جن اٹھانے گئے کہ پری
اب غور سے دیکھتے ہیں تو ساری دیمک نے چاٹ ڈالی۔
کتے رات کو جوتے اٹھائے جاتے۔ اب ڈھونڈھتے ہیں تو
کہیں باہر ایک ادھر پڑا ایک اُدھر پڑا۔ راستہ چلتے سانپ
بھی اٹھائے ملتے۔ خدا ہی نگہبان تھا نہ روشنی نہ پانی۔
کنویں کھودے گئے۔ اور لیمپ لالٹینیں ٹمٹمانے لگیں مگر
لڑائی جو چھڑی تھی سو مٹی کا تیل ناپید مشکل سے مہینہ
میں ایک ڈیڑھ بوتل ہر ایک کے حصہ میں آتی۔

رات کو پڑھنا لکھنا مصیبت ہو گیا۔ اندر بیٹھو تو
گھٹن باہر بیٹھ کر کام کرو تو ہوا کے وہ جھکڑ کہ خدا کی پناہ
لیمپ یا لالٹین کہاں ٹھہر سکتی تھی۔ کیڑے پتنگے آکر
نوچیں بدن سُجا دیں۔ بے چارے بچوں کے جب وہ کام
کریں تو اسپنیشن فلائی کے بڑے بڑے چھالے پڑ جائیں۔
دھندلی روشنی سے آنکھیں الگ خراب ہوں۔

بیویوں کی آزمائش پر آزمائش نہ گوشت نہ
ترکاری بچوں اور مردوں کو کیا کھلائیں سارا دن یہی
سوچتے گذر جاتا کہ یہ چیزیں کہاں سے منگوائیں۔ ایک
گوشت والا جامعہ میں آتا مدرسوں کی ضرورت سے
بچتا تو دے دیتا ورنہ صاف جواب دیتا۔ ترکاری منگا کے
رکھیں تو سڑ جائے۔ آتے آتے آدھی خراب ہو جائے۔
ایک پیسے کی جگہ دو اٹھیں۔ ایک نمک کی کنکری بعض وقت
چاہو تو نہ ملے۔ آٹا یا گیہوں تو خیر اکٹھا بھر لیا جاتا اور
جامعہ اسٹور سے مل جاتا۔

سواری کا کوئی انتظام نہیں لے دے کے ایک
کھڑ کھڑ یا بس چلتی تھی جو راستہ میں کہیں بگڑ جاتی
کئی کئی گھنٹے راستہ میں پڑے ہوتے ہیں۔ بتو جی
نے بڑا نیک کام کیا ایک تانگا چلایا۔ مگر ایک اناڑی
ہمارے کھاتے مل جاتا یہی غنیمت تھا۔ ذاکر صاحب
مجیب صاحب اس پر اکثر مسافت طے کرتے۔ آندھی
لو اور طوفان میں جب لوٹ کر آتے تو گھوڑے کی جولا
لے شاباشی دیتے اور انعام بخشتے۔

رات کو شہر سے آنے میں زرا دیر ہوتی ا
ٹھہرتا کیونکہ نئی دہلی سے اوکھلا تک سب سنسان
تھا کوئی آبادی نہیں تھی کبھی کبھی لوٹ مار کے واقعے
ہو جایا کرتے۔

ایک دن جون کی چل چلاتی دوپہر میں لو
جھکڑ چل رہے تھے۔ ٹھیک دو بجے دونوں صاحبان
تانگے پر گاندھی جی سے ملنے گئے۔ وہ ان دنوں بھنگی
میں ٹھہرے تھے۔ کام ضروری تھا اور اسی وقت کا
تھا۔ دو ڈھائی گھنٹے تانگے پر لگ جاتے تھے میں بہت
گھبرائی کہ خدا ہی خیر کرے۔ ایک دن کھیل کھیل میں
کی آنکھ میں سخت چوٹ لگی کوئی سواری نہ ملی تو مجیب
ریڑھی پر اسے ڈاکٹر کو دکھانے شہر لے گئے۔

رہتے سہتے یہاں کا نقشہ بدلنے لگا۔ ایک دن
صبح صبح ذاکر صاحب مجیب صاحب ڈاکٹر عابد حسین صاحب
سڑک کا افتتاح کرنے گئے۔ اسٹاف کوارٹرس سے چوڑی
جامعہ کی عمارتوں تک جاتی ہے۔ یہاں پہلے اونچے نیچے
ٹیلے تھے۔ وہاں پتھروں پر پھاوڑے چلائے اور راستہ

اور طالب علم بھی شریک ہو گئے۔ بہت دلچسپ منظر تھا بعد میں مزدور لگے تو یہ سڑک ذرا چلنے کے قابل ہوئی اور بہت عرصہ بعد ہموار ہوئی۔ اب تو پکی بن گئی ہے اور کوئی پہچان نہیں سکتا کہ پہلے یہاں ٹیلے اور پتھر تھے۔ درخت نصب کرنے کی رسم ہوئی۔ ٹیچرس کالج اور ذاکر صاحب کے مکان کے سامنے جو سڑک ہے اس کے دونوں طرف گل مہر خوبصورت درخت جب ہی لگائے گئے۔ پھر ایک دم سب پھولتے تو بہار آ تی۔ پھر لوگوں نے اپنے اپنے گھروں میں چھوٹے چھوٹے باغیچے لگائے اور کچھ پھلوں کے پیڑ۔ سبزہ نظر آنے لگا۔

اس زمانے میں جب ذاکر صاحب کا گھر بن گیا تھا وہاں رہنے لگے تھے۔ ایک دن ہمارے یہاں تشریف لائے۔ ہمارا اوپر کا حصہ نیا بنا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کوٹھے پر برآمدے میں کھڑے ہو کر انھوں نے جامعہ کی بستی پر نظر ڈالی اور ادھر ہاتھ کا اشارہ کر کے ہم سے مخاطب ہو کر خواب کی سی کیفیت میں کہا "دیکھیے۔ ۔ ۔ ۔ یہ سب ہمیشہ ایسے نہیں رہے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ایک زمانہ آئے گا جب یہاں دودھ کی نہریں بہیں گی۔ چاہے ہم نہ ہوں"، ان کی نظروں میں آرزو فکر اور حقیقت کی نہ معلوم کتنی تابانیاں ہیں۔ وہ یوں ہی امیدوں کے دیے جلاتے اور حوصلہ ہمت بڑھانے والی باتیں کیا کرتے۔

ایک دفعہ مجیب صاحب کسی سوچ میں تھے مایوسی کے لہجے میں ذاکر صاحب سے کہا۔

"میری عمر کے چالیس سال گذر گئے ۔ ۔ ۔ اب تک کیا کیا؟" ذاکر صاحب نے انہیں غور سے دیکھ کر فرمایا۔

" انسان کی اصل زندگی چالیس سال کے بعد شروع ہوتی ہے "۔

مجیب صاحب کو حیدرآباد عثمانیہ یونیورسٹی سے تاریخ تمدن ہند لکھنے کو ملی تھی۔ لیکن جامعہ کے کاموں سے لکھنے کی فرصت بالکل نہ ملتی چھوٹے بڑے سب ہی کام نپٹانا پڑتے کبھی ذاکر صاحب کی ناسازی طبیعت کی وجہ سے کبھی ان کا بار ہلکا کرنے کے خیال سے وہ ان تھک کام کرتے رہتے کتاب ڈھائی سال میں لکھ کر دینا تھی اور کئی سال گذر گئے کبھی کبھی بہت فکرمند ہو جاتے۔ ایک دن انھوں نے ذاکر صاحب سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا "ایک سال میں صرف ایک باب ہوتا ہے"۔ انھوں نے کہا "اگر بیس سال بھی گذر جائیں تو کیا ہے"۔ ان سب کا مقصد ایک ہی تھا۔ جامعہ تاریخ تمدن ہند ادھوری ہی رہی۔ جب بہت تقاضے ہوئے تو جتنی لکھ سکے اتنی ہی یونیورسٹی کو دے دی

جامعہ کا پودا جو خونِ دل سے سینچا جا رہا تھا برگ و بار لا رہا تھا۔ جامعہ والوں کی خدمت اور کوشش کو سب مانتے تھے اور ان کے کام کی قدر کرتے تھے جس سے کچھ مشکلیں آسان ہوئیں ۴۷ء میں جو ہنگامہ ہوا اس میں جامعہ بچ تو گئی لیکن بڑی سخت آزمائش اور امتحان کا وقت تھا۔ گاندھی جی اور پنڈت جی دوڑ دوڑ کر آتے۔ جامعہ والوں کی ہر طرح تسلی تشفی کرتے۔ ایسے وقت جب چاروں طرف ایک آگ سی لگی تھی۔ اس کا بچ جانا قدرت کا ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے مگر حالت کیا تھی جیسے سب کچھ لٹ گیا ہو کئی استاد علاوہ

سے مجبور ہو کر چلے گئے تھے۔ نہ طالب علم رہے مصیبت پھٹ پڑی تھی۔ اور پچیس سال کا یہ دور جامعہ کو ایک ہولناک وقت کے سپرد کر کے چلا گیا۔

نیا دور نئے کاموں اور نئی نئی ذمہ داریوں کو دیکھتے ہوئے بہت اہم اور روشن ہے اس مشکل زمانہ میں خدا کے بھروسے پر جامعہ والے اسی سچی لگن سے جس سے اب تک دیس کی سیوا کرتے رہے۔ زیادہ ہمت اور مضبوط ارادوں سے خدمت اور بھلائی کے کاموں میں لگ گئے۔ انھوں نے ہمت نہیں ہاری۔

علم اور تہذیب کی دھجیاں اُڑ گئی تھیں شرافت اور انسانیت ختم ہو گئی تھی۔ اور کہیں سسکیاں لے رہی تھی۔ ہر طرف آہیں سنائی دے رہی تھیں۔ جامعہ نے پریم اور محبت سے سب سے رشتہ جوڑا۔ بھائی چارہ رواداری کے طریقے برت کر دلوں کی کدورت مٹائی اور سکون و اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ پھر زندگی کا نقشہ جو بالکل بگڑ گیا تھا۔ بننے کی امید پیدا ہوئی۔ جامعہ بہت سے زخمی اور دکھی دلوں کا سہارا بنی جہاں اتنی اپنائیت اور ہمدردی تھی اور اس طرح سب مل جل کر رہتے کہ جیسے اپنوں میں رہ کر دکھ درد مٹ جاتے ہیں۔ زخم بھرنے لگے۔ گاؤں میں مدرسے کھول کر انسانیت اور شرافت کا چلن سکھایا اور چاروں طرف پریم اور محبت کی روح پھونکی۔

اپنی پرانی روایتوں کو لیے ہوئے نئی ذمہ داریوں اور حالات میں جامعہ کی نئی تعمیر شروع ہوئی۔ بہت بڑے کام ہوئے۔ بڑی کوششوں اور جتن سے تعلیم اور ترقی کے شوق اور منصوبے عملی شکل میں اجاگر ہوئے۔ بہت نئے نئے شعبے کھلے۔ جامعہ نرسری، اورل انسٹی ٹیوٹ، انجینیرنگ کالج۔ آرٹ انسٹی ٹیوٹ، سائنس کی تعـ[illegible]

حکومت کی قدر اور توجہ سے مادی وسیلو[illegible] مدد ملی اسی سے خشک ریتیلی زمین کی چمن بندی کچھ ہوئی۔ مدتوں کی جانفشانی کے بعد جامعہ والوں کو سانس لینا نصیب ہوا۔ زندہ رہنے کا سامان ز[illegible] اور کچھ کام کرنے کا۔ ملک کی آزادی کے بعد پیہم مستحکم عزم اور کوششوں سے جامعہ کا ہر قدم ترقی کی منزلوں کی طرف بڑھتا رہا۔ یہ دور پوری طرح [illegible] کہلانے کا مستحق ہے۔

شوق اور عمل پیہم کا سلسلہ اب بھی جاری[illegible] اب سوچتے ہیں کہ پہلا زمانہ کیسے گزارا تو حیرت ہوتی[illegible] اور اس حالت پر جواب ہے۔ خدا کا شکر کیجیے [illegible] جامعہ ایک گل زار ہے، آب دار بے بہا موتی ہے دانش اور تہذیب کا ایک چشمہ ہے جس سے پریم کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ جوق در جوق نونہالانِ وطن سے سیراب ہوتے ہیں۔ خدا کرے یہ فیض جاری [illegible] اور ہمارے دیس کے بچے اور بچیاں وطن کی نئی[illegible] ہر طرف بہار ہی بہار ہو۔ اور پورا دیس ایک[illegible] ہو۔ (آمین)

چندہ ہمیشہ منی آرڈر سے بھیجیے۔

جناب خاور جمیل پوری

انوکھی برکات



(سلسلے کے لیے اکتوبر ۱۹۷۰ء کا پیام تعلیم دیکھیے۔)

راجہ نے تعجب سے کہا۔ "لعل؟ یعنی تمہارا پتھر؟"
برہمن ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا اور کہنے لگا۔
"نہیں سرکار! لال رنگ کا بہت ہی قیمتی پتھر!"

"اچھا تم دونوں ہمارے ساتھ محل میں چلو!"

راجہ نے یہ کہہ کر گاڑی بان کو واپسی کا حکم دیا اور محل میں واپس پہنچ کر برہمن سے اس کی فریاد سنی۔ برہمن نے سب کچھ سچ سچ بتا دیا۔ راجہ نے تھانیدار کو بلا کر جب برہمن کا لعل دیکھا تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی وہ اچنبھے میں آگیا وہ خود قیمتی پتھروں کی قدر و قیمت جانتا تھا۔ اس نے اندازہ لگایا کہ میرے خزانے میں اس لعل کے مقابلے کا دوسرا لعل موجود نہیں ہے۔

راجا نے تھانیدار کو اس کی بد دیانتی کی سزا دی اور اپنے خزانے کا منہ کھلوا دیا اور کہا: "سونے کی جتنی اینٹیں تم دونوں سے لے جاتے بنے اٹھا کر لے جاؤ۔" برہمنی نے سمجھداری سے کام لیا اور کہا "ان داتا ہمارے یہ بھاگ نہیں کہ سرکار کے خزانے کو ہاتھ لگائیں۔" یہ سن کر راجا بہت خوش ہوا اور اس نے اشرفیوں کے بہت سے توڑے اور قیمتی پوشاکیں دونوں کو دیں۔ دونوں نہال ہو گئے۔ اور گھر واپس آکر امیروں جیسی زندگی کے منصوبے بنانے لگے۔

ادھر راجہ اس بیش قیمت لعل کو پا کر بہت خوش تھا۔ اس نے سونے کا ایک خوب صورت ڈبہ بنوایا اور اس لعل کو اس میں حفاظت کے ساتھ رکھ کر اسے اپنے خاص کمرے میں رکھوا دیا۔ وہ روزانہ صبح اٹھ کر سب سے پہلے صندوق کھول کر لال کے درشن کرنے لگا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ جب سے یہ لعل آیا ہے دن دونی رات چوگنی خوشیوں کی اور بہت سی برکتوں کی بارش ہونے لگی ہے۔

راجہ نے اپنی رانی کو اس لعل کے درشن کرائے تو وہ اس کو دیکھ کر پھولی نہ سمائی اور اسے اٹھا کر اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ وہ بھی اسے اپنی خوش قسمتی کا سبب سمجھ رہی تھی۔

راجہ کے کوئی اولاد نہیں تھی لعل کے آنے سے ان دونوں کو یقین سا ہو چلا تھا کہ اس لعل کی برکت سے بہت جلد ان کی مراد پوری

ایک دن جب راجہ نے صندوق کھولا تو وہ مارے خوشی کے اچھل پڑا۔ لعل کی جگہ صندوق میں ایک چھوٹا سا خوبصورت بچہ لیٹا ہوا انگوٹھا چوس رہا تھا۔

راجہ نے بچے کو جلدی سے اٹھا لیا اور رانی کو بلوا کر کہا۔ "مبارک ہو پرماتما نے ہمیں یہ پھول سا بچہ دے دیا۔" رانی اسے اپنی گود میں لے کر پیار کرنے لگی۔

راجہ کے یہاں لڑکا پیدا ہونے کی خبر آن کی آن میں سارے شہر میں پھیل گئی۔ محل پر نوبت، نقارے بجنے لگے۔ راجہ کی طرف سے سات دن تک نگر بھوج کھلایا گیا۔ خوب دل کھول کر خیرات کی گئی، انعام بانٹا گیا۔ سارے شہر میں دن عید رات شب برات ہو گئی۔ کئی دنوں تک دیوالی کی طرح گھروں، دکانوں پر روشنی کی گئی، شیرینی تقسیم ہوئی۔

راجہ اور رانی نے اس بچے کا نام لعل رکھ دیا۔ اور اسی نام سے شہرت پائی۔ دن بیتتے گئے۔ لعل دن دونا رات چوگنا بڑھتا گیا۔ جوان ہونے تک وہ خوب لکھ پڑھ کر ہوشیار اور راج کا کام سنبھالنے کے قابل ہو گیا۔

تب راجہ نے پڑوس کے ایک راجہ کی لڑکی "ہیرا" کے ساتھ اس کی شادی کر دی اور راج سنگھاسن (تخت و تاج) شہزادے کے حوالے کر کے خود پرماتما کی یاد میں لگ گیا۔ لعل نے بڑی قابلیت اور ہمدردی اور انصاف سے حکومت کی۔ رعیت، اس کو دعا دیتی اور گھر والے سب اس پر جان چھڑکتے تھے۔ ہیرا بھی اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی تھی۔ لعل کے دل میں بھی

ہیرا کی محبت اور عزت بہت زیادہ تھی۔ لیکن ایک دن ہیرا کو نہ جانے کیا سوجھی تو اس نے لعل سے کہا۔ "تم مجھے اپنی ذات تو بتاؤ؟"

لعل نے جواب دیا۔ "میں راجہ کا لڑکا ہوں جو ذات راجہ کی ہے وہی میری بھی ہے۔" ہیرا نے پھر کہا۔ "یہ تو میں جانتی ہوں پر مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم ان کی اولاد نہیں ہو۔ راجہ نے تمھیں گود لے لیا تھا۔"

لعل نے اسے سمجھایا۔ "گود بھی اپنی ہی ذات کے بچے لیے جاتے ہیں۔ یہ بات تو تمھارے پتاجی کو شادی سے پہلے پوچھ لینی چاہیے تھی۔ فرض کرو کہ میری ذات میں کچھ کھوٹ نکل آئے تو کیا تم مجھے چھوڑ دو گی؟"

"نہیں نہیں" ہیرا نے گھبرا کر کہا۔ "یہ تو کبھی نہیں ہو سکتا۔ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ۔ آپ میرے پتی دیو (خاوند) اور میں آپ کی داسی (باندی) ہوں۔ ہم دونوں کا موت زندگی کا ساتھ ہے۔"

"تو پھر کاہے کو بیکار سوال کر رہی ہو؟" لعل نے مسکرا کر اس سے پوچھا۔

ہیرا نے کہا۔ "یہ میری طبیعت کا معاملہ ہے میں کسی بھی طرح تم سے ذات پوچھے بنا نہ مانوں گی۔ کیا تم نہیں بتاؤ گے؟"

لعل نے کہا۔ "بتا دینے سے تمھیں بہت افسوس ہوگا۔ عمر بھر پچھتانا پڑے گا۔ خود سوچ سمجھ لو پہلے۔"

ہیرا نے لاپروائی سے جواب دیا۔ "اس میں افسوس کرنے اور پچھتانے کی کیا بات ہے؟"

وہ تو تمھیں بتانا پڑے گی۔"

لعل نے اسے بہتیرا سمجھایا، ڈرایا دھمکایا مگر عورت ذات تھی اپنی بات پر اڑ گئی۔ اور ضد کرنے لگی کہ چاہے اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے میں معلوم کر کے رہوں گی۔

لعل نے اس وقت بات ٹال دی کچھ جواب دیئے بغیر وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ ہیرا نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ وہ اٹ واٹی کھٹ واٹی لے، منھ اندھیرے پلنگ پر لیٹ گئی۔ آخر کار لعل نے مجبور ہو کر ہار مان لی اور اس سے کہہ دیا کہ اگر تم نہیں مانتی ہو تو آج رات کو بارہ بجے محل کے سامنے والے کھلے میدان میں میرے ساتھ چلنا وہاں تمھیں اپنی ذات بتاؤں گا۔

آدھی رات ہوئی رانی راجہ کے ساتھ محل سے باہر آئی تو کیا دیکھتی ہے کہ میدان میں صاف ستھری زمین پر پانی چھڑکا ہوا ہے۔ اور اس پر طرح طرح کے خوشبودار پھولوں کا فرش بچھایا گیا ہے۔ چاروں طرف سے اعلیٰ درجہ کے عطروں کی لپٹیں آ رہی ہیں۔ ایک طرف مٹی کے کورے برتنوں میں خوب اونٹا ہوا دودھ بھرا ہوا ہے۔ پھولوں کے ایک اونچے سے چبوترے پر ایک سکورہ عطر لے ہوئے دودھ کا ان برتنوں کے علاوہ رکھا ہے۔

چاروں طرف سے بڑے بڑے سانپ پھنکارتے ہوئے آ کر پھولوں کے فرش پر کنڈلی مار کے بیٹھ جاتے ہیں۔ اتنے میں ایک بہت خوبصورت گلدار سانپ دوسرے سانپ پر سوار ہو کر آتا ہے۔ اسے دیکھتے ہی سارے سانپ پھن اٹھا کر سلامی دیتے ہیں۔ جب وہ اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے اور کورے سکورے میں رکھا ہوا معطر دودھ پی لیتا ہے تو دوسرے سانپ بھی برتنوں میں منہ ڈال کر خوب پیٹ بھر کے دودھ پیتے ہیں۔ سانپوں کا راجہ لعل کی طرف غور سے دیکھتا ہے اور سر کے اشارے سے اسے اپنے قریب بلاتا ہے۔ ہیرا ڈر کے مارے چیخ مار کر بھاگ جانا چاہتی ہے لعل کی آواز ان کے کان میں آتی ہے" دیکھو اب بھی مان جاؤ نہیں بہت پچھتاؤ گی۔ ہیرا اپنی بدحواسی کو چھپا کر اطمینان کے ساتھ جواب دیتی ہے۔" میں یہ سب شعبدے بازی سمجھ رہی ہوں کبھی نہ مانوں گی جو کہہ چکی سو کہہ چکی۔"

"اور جو میں نہ بتاؤں تو؟" لعل نے ذرا ناراض ہو کر کہا۔" تو میں ان سانپوں میں کود کر اپنی جان دے دوں گی" ہیرا نے یہ آخری فیصلہ سنا دیا۔ یہ سنکر لعل نے آخری سلام کیا اور آگے بڑھ کر سانپوں کے راجہ کا دودھ پیا ہوا سکورہ اٹھا لیا اور اس کے کونوں پر لگا ہوا دودھ چاٹ گیا۔ پھر وہ وہیں گر پڑا اور تھوڑی دیر میں لوٹ پوٹ کر سانپ بن گیا۔ سارے سانپ خوشی سے پھنکارنے لگے۔ ہیرا دہشت سے کانپ اٹھی زور سے چیخی اور بے ہوش ہو کر گر پڑی۔

کچھ ہوش آیا تو اپنے محل میں تھی اور بہت سی لونڈیاں، باندیاں اس کی تیمارداری کر رہی تھیں۔ "کیا ہو گیا تھا آپ کو؟" ایک سہیلی نے پوچھا" مگر وہ جواب دیئے بغیر پلنگ سے اتر کر محل سے باہر کی طرف بھاگی۔ داسیوں نے اسے روکنے کی بہت

کوشش کی مگر اس نے باہر نکل کر دم لیا۔ لیکن اب یہاں مرجھاتے ہوئے پھولوں، ٹوٹتے ہوئے مٹی کے برتنوں کے سوا اور کچھ نہ تھا۔

وہ اپنی بے وقوفی پر بہت پچھتائی اور بدحواسی کے عالم میں دیوانوں کی طرح دوڑ کر سانپوں کا جھوٹا دودھ چاٹنا چاہا کہ اس کے سسر نے ہاتھ پکڑ کر کہا۔ "کیا غضب کر رہی ہو بیٹی؟" ہیرا نے کہا "اپنے کیے کا بھوگ بھوگنے (سزا بھگتنے) دیجیے پتا جی میں پاپن اسی لائق ہوں آپ مجھے مر جانے دیں پتا جی تو بڑی کرپا ہوگی آپ کی۔" پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اور سسر کے گرفت سے نکلنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہنے لگی۔ "مجھے چھوڑ دیجیے پتا جی نہیں تو میں پتھروں سے سر توڑ کر مر جاؤں گی۔"

راجہ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ "اس طرح رونا دھونا بیکار ہے۔ ذرا صبر سے کام لو اور بھگوان کا نام جپ کر اسی سے پرارتھنا کرو، خوب خیرات کرو لنگر جاری کرا دو۔ غریبوں اور محتاجوں کی مدد کرو۔ بھگوان تمھاری سہائتا کرے گا۔ (خدا تمھاری مدد کرے گا)

ہیرا نے اسی دن سے راجہ کی ہدایت پر عمل شروع کر دیا۔ دور دور سے غریب غربا بھوکے پیاسے آتے اور کھا پی کر کپڑا اور نقدی لے کر دعائیں دیتے ہوئے واپس جاتے تھے۔

بچے بچے کی زبان پر یہی دعا تھی کہ پرماتما

جاری دیالو رانی کی مراد جلدی سے پوری کر دے

یہ سلسلہ کئی مہینوں سے جاری تھا کہ ا
دن دور سے آنے والا ایک مسافر بدحواسی کی
میں دوڑتا ہوا آیا اور اس نے ہیرا کے سامنے
سے رات کو جنگل میں ٹھہرنے پر اسی طرح کا وا
بتایا جیسا ہیرا نے محل سے باہر آدھی رات کو دیکھا
اس میں اتنی بات اور زیادہ تھی کہ سانپوں کے با
کے ساتھ ایک سانپ غمگین صورت بناتے ہو
ٹہلتا ہوا اور بھی تھا جس نے سانپوں کی اس
میں شرکت نہیں کی اور سانپوں کے بادشاہ نے ا
میزبان کو بہت بڑا انعام دینے کا وعدہ بھی کیا

ہیرا کو جب یہ خبر سنائی گئی تو اس نے تو
مسافر کو بلا کر سارا واقعہ سنا اور کہا "اچھا کیا تم ہم
وہ جگہ بتا سکتے ہو؟ اگر ہمارا کام پورا ہو گیا تو تمھ
دامن موتیوں سے بھر دیا جائے گا۔"

مسافر نے کہا۔ "ضرور آج ہی چلیے میں
کی سیوا (خدمت) کے لیے ہر وقت حاضر ہوں

ہیرا اپنے سسر کے مشورے سے بہت
سپاہی پیادے، لونڈیاں غلام اور ضروری سامان
لے کر اس جنگل کی طرف چل دی۔ مسافر اور ہیرا
سسر بھی ساتھ تھے۔

وہاں پہنچ کر مسافر نے جیسا بھی بتایا تھا
کر دیا گیا۔ آدھی رات کو سانپوں کی جماعت آئی
سانپوں کے ساتھ ان کا بادشاہ اور اس کے

بار بار پھن پٹکنے والا سانپ بھی تھا۔ جب بادشاہ اور اس کے ساتھی دو دو مرتبہ چکھ چکے تو ایک آواز آئی "جس نے ہماری دعوت کی ہے جو ہم سے مانگے وہی پائے گا۔"

ہیرا نے آگے بڑھ کر کہا: "مجھے اپنے ساتھ آنے والا سانپ عنایت ہو جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

بادشاہ نے اپنا پھن زمین پر پٹک کر کہا۔

"افسوس مدتوں گم رہ کر تو میرا بھانجا مجھے ملا تھا اور تم اسے دوبارہ مجھ سے جدا کر دینا چاہتی ہو۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا اور جو کچھ مانگو گی دے دیا جائے گا۔"

ہیرا نے بڑی عاجزی سے ہاتھ جوڑ کر عرض کیا: "سرکار کو اپنی بات یاد ہے۔ بڑے آدمی کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔" راجہ نے تھوڑی دیر بعد جواب دیا "مگر پہلے میں اس سے یہ بھی تو پوچھ لوں کہ تمہارے ساتھ جانے پر تیار بھی ہے۔" یہ کہہ کر اس نے بھانجے کی طرف مڑ کر اپنی زبان میں کچھ کہا اور جب اس نے سر ہلا کر انکار کر دیا تو بادشاہ ہیرا سے مخاطب ہوا۔

"میں بہت مجبور ہوں بیٹی! میں اپنی بہن کو سمجھا دوں گا مگر سے زبردستی تمہارے حوالے کیسے کر دیا جائے۔ یہ تو جانے پر راضی ہی نہیں ہوتا۔"

ہیرا کے ہوش اڑ گئے اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بندھ گئیں وہ سانپوں کے بیچ میں کودنے ہی جا رہی تھی کہ بوڑھے راجہ نے سامنے آ کر کہا: "کیا اپنے بوڑھے باپ کا کہنا بھی نہ مانو گے بیٹا؟" سانپ نے فوراً اپنا سر ہلا کر رضامندی کا

اظہار کیا اور بادشاہ نے اس کا اشارہ سمجھ کر ایک پھنکار ماری تو وہ سانپ سے انسان کے روپ میں آگیا اور لپک کر اپنے باپ کے پاؤں چھو لیے ہیرا نے اس سے اپنے قصور کی معافی چاہی تو اس نے آگے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ ہیرا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی اور اس کے قدموں پر جھک گئی۔

اسی وقت خوشی کے نقارے بجنے لگے مسافر کو بہت سا انعام دے کر رخصت کر دیا۔ توپوں نے سلامی دی اور بڑی دھوم دھام سے "نئی بارات" جنگل سے روانہ ہو کر شہر کی طرف چلی۔ ●

اس سرخ نشان کا مطلب ہے کہ اس مہینے سے آپ کی مدت خریداری ختم ہو رہی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ آپ اپنے محبوب پیام تعلیم کی سرپرستی جاری رکھیں گے۔

براہ کرم مبلغ چھ روپے کا منی آرڈر اس مہینے کی ۲۵ تاریخ تک بھیج دیجیے۔ اگر ہمیں آپ کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں ملی تو ہم سمجھیں گے کہ آپ کو پرچہ پسند نہیں آیا۔ اور افسوس کے ساتھ اس سلسلے کو بند کر دیں گے۔

"ایڈیٹر"



جناب کیفؔ احمد صدیقی

مستقبل کی آواز

ابھی ہم لوگ بچّے ہیں مگر اک دن جواں ہوں گے
ہمیں اک دن وقارِ مادرِ ہندوستاں ہوں گے

ہمیں گوتم، ہمیں گاندھی، ہمیں ذاکر، ہمیں نہرو
ہمیں چشتی، ہمیں نانک، ہمیں حیدر، ہمیں ٹیپو
ہمیں اپنے وطن کی سرحدوں کے پاسباں ہوں گے
ابھی ہم لوگ بچّے ہیں مگر اک دن جواں ہوں گے

ہمیں میں کوئی ٹیچر اور کوئی ڈاکٹر ہوگا
کوئی تعلیم کا افسر، کوئی انجینیر ہوگا
ہمیں ہر چیز کے محرم، ہمیں سائنس داں ہوں گے
ابھی ہم لوگ بچّے ہیں مگر اک دن جواں ہوں گے

ہمیں روشن کریں گے چاند کا ہر رازِ پوشیدہ
ہمیں ظاہر کریں گے حق کی ہر آوازِ پوشیدہ
ہمیں قدرت کے ہر رازِ نہاں کے رازداں ہوں گے
ابھی ہم لوگ بچے ہیں مگر اک دن جواں ہوں گے

ہمیں میں سور و تلسی، غالب و ٹیگور بھی ہوں گے
ہمیں کیا کیفؔ ہم لوگوں سے بہتر اور بھی ہوں گے
کہ جو دنیا کے گلشن میں بہارِ جاوداں ہوں گے
ابھی ہم لوگ بچے ہیں مگر اک دن جواں ہوں گے
ہمیں اک دن وقارِ مادرِ ہندوستاں ہوں گے

جناب محمد شمیم الدین بی اے جامعہ



کشتوار

(اکتوبر ۱۹۷۰ء سے سلسلہ ملائیے)

یہاں پر پھل بھی کثرت سے پیدا ہوتے ہیں۔ سیب، ناشپاتی، بہی، بگوگوشہ، آڑو، آلو بخارا، انار، انگور (کالا) شاہ بری، خوبانی، ساڑھیاں، اور گلاس خاص طور پر مشہور ہیں۔ اسی طرح خشک میووں میں اخروٹ، بادام اور چلغوزہ۔ زیادہ تر پھل دوسرے علاقوں کو بھیجے جاتے ہیں۔

باشندے ۔ یہاں کے لوگ بہت ہی سیدھے سادے ہیں۔ لیکن زمانے کے بدلتے ہوئے رنگ کا اثر یہاں بھی نظر آتا ہے۔ عموماً محبت اور خلوص کے ساتھ پیش آتے ہیں۔ طبیعت کے کچھ کمزور ہیں۔ آپ سے کسی کام کا وعدہ کرنے کے بعد بمشکل ہی اسے پورا کر پائیں گے لڑائی جھگڑے سے دور رہتے ہیں۔ چوری ڈکیتی، قتل، غارت کی بری عادتوں سے یہاں کے لوگ محفوظ ہیں۔

سردیوں میں پٹو کے بنے ہوئے گرم کوٹ کا استعمال عام ہے۔ زیادہ سردی ہو تو اس کے اوپر کمبل اوڑھ کر کانگڑی لے لیتے ہیں۔ مٹی کے ایک برتن پر بید کی لکڑی اس طرح چڑھاتے ہیں کہ باوجود اس میں آگ رکھنے کے باہر سے گرم نہیں ہوپاتی۔ اس کو کمبل کے اندر سینے کے پاس ہاتھ سے پکڑے رہتے ہیں گویا لکڑی کی انگیٹھی ہوتی ہے۔

کشتوار کے کمبل خاص طور سے مشہور ہیں۔ یہ بہت پتلے لیکن دوہرے ہوتے ہیں اور اپنی گرمی کے لیے مشہور ہیں کوئی کمبل ڈیڑھ سو روپے سے کم میں نہیں بکتا۔ غریب لوگ اپنی ٹانگوں پر پٹیاں خوب کس کر لپیٹ لیتے ہیں اور گھاس کی بنی ہوئی چپلوں کا استعمال کرتے ہیں۔

یہاں کی خاص غذا چاول ہے۔ خشک چاول پکا کر اوپر سے سبزی، ترکاری یا دال ڈال کر کھاتے ہیں۔ سبزیوں میں کرم کا ساگ عام ہے روٹی کا استعمال بھی کرتے ہیں لیکن بہت کم۔ اسی فیصدی آبادی نسوار لینے کی بری طرح عادی ہے۔ تمباکو اور چائے عام ہے۔ لیکن چائے نمکین استعمال کی جاتی ہے۔ ہوٹلوں میں میٹھی چائے بھی مل جاتی ہے۔ یہاں اسے لپٹن کہتے ہیں۔ بغیر چائے کی پتی کو دیسی چائے کہتے ہیں بہت ہی خوش رنگ اور خوشبودار ہوتی ہے۔ ایک دفعہ میں نے ایک صاحب کو چائے پر بلایا اور لپٹن یعنی میٹھی چائے بنا کر پیش کی انھوں نے پینے سے انکار کر دیا اور کہنے لگے حضرت اگر ہم نے اس کو پی لیا تو سمجھ لیجیے کہ بخار میں مبتلا ہو جائیں گے

میں حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہ گیا۔ دیسی چائے کے علاوہ قہوہ بھی عام ہے۔ اس میں شکر ڈالی جاتی ہے۔ لیکن دودھ نہیں ڈالا جاتا۔ خوشبودار بنانے کے لیے چھوٹی الائچی اور دار چینی کا استعمال کرتے ہیں۔ چائے ہو یا قہوہ اور چائے کسی بھی وقت پی جائے اس کے ساتھ کھانے کی کسی چیز کا استعمال ضرور کرتے ہیں۔ چائے کے پیالے میں چوڑ کر ڈال دیتے ہیں اور بعد میں چمچہ سے یا ہاتھ سے کھاتے ہیں۔

عام بول چال کشتواڑی ہے۔ جو کشمیری سے ملتی جلتی ہے۔ میرے اندازے کے مطابق اس زبان میں سنسکرت، فارسی اور عربی کے الفاظ کی شکل کو بگاڑ کر استعمال کیا گیا ہے۔ ان پڑھ لوگ اردو بالکل نہیں بول سکتے ہیں۔ چھوٹے بچے بھی نہیں بول سکتے۔ میں اسکول میں ایک ماسٹر کی حیثیت سے پڑھاتا ہوں تو انھیں سمجھانے میں بڑی دشواری پیش آتی ہے۔ عورتیں بھی اردو نہیں بول پاتیں۔ ہاں پڑھے لکھے حضرات چاہے، مسلمان ہوں یا ہندو، مرد ہوں یا عورت اردو بول سکتے ہیں۔ بہت کم لوگ ڈاڑھی رکھتے ہیں۔ عموماً کلین شیو رہتے ہیں۔ عورتوں میں بے پردگی کا عام رواج ہے۔ ہاں کسی مولوی یا ڈاڑھی والے کو دیکھ لیں تو فوراً حیا کا پردہ ڈالنے کی ناکام کوشش کرتی ہیں۔ وہ بھی صرف باہر کے لوگوں سے۔

گندگی سے یہاں کے لوگوں کو زیادہ نفرت نہیں ہے۔ گھروں میں پاخانہ نہیں ہوتا۔ مرد عورت سب باہر جاتے ہیں۔ ہاں چھوٹے بچوں کو گھر میں ہ یا چھت پر پاخانہ کرا لیتے ہیں اور پھر اسے صا یا اٹھانے کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کیو ہی پیروں میں لگ لگ کر ختم ہو جاتا ہے۔ یا اکثر بڑے بوڑھے بھی سویرے سویرے گلی کو حاجت کرتے ہوئے نظر آ جاتے ہیں۔ یہاں کے ل کے عادی ہیں لہذا انھیں گندگی کا احساس ہوتا۔

رسم و رواج یا تہوار

ہندوستا تہواروں، رسم و رواج کی بگڑی ہوئی شکل د ہے۔ اس کی وجہ شاید اس کے علاوہ کچھ نہیں باقی ہندوستانی علاقوں سے ہمیشہ سے الگ ت آج سے دس بارہ سال پہلے یہاں پر آنے ج کوئی راستہ نہیں تھا۔ لوگ مہینوں پیدل سف جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے۔ اور آج کل ہے وہ بھی گویا پل صراط ہے۔ ہر لمحہ موت کھڑی نظر آتی ہے۔

یہاں عید ہو یا بقرعید، محرم ہو یا ہولی ہو یا دیوالی۔ ہر تہوار ایک نئے ڈھنگ جاتا ہے۔ یہاں کے مسلمان ہر مہینے میں کو بڑا دن ضرور مناتے ہیں۔ پچھلی مرتبہ عید الف کی۔ مجھے کسی طرح بھی یقین نہیں آتا کہ و تھی۔ اور کس طرح آپ کو بتاؤں کہ وہ ع ہماری طرف تو خوب نہا دھو کر صاف کپڑ

کپڑوں میں عطر لگاتے ہیں۔ گھروں میں طرح طرح کے مزے مزے کے کھانے پکتے ہیں، سویاں پکتی ہیں۔ دوگانہ پڑھنے کے لیے جاتے ہیں۔ پھر دوستوں کی، عزیزوں کی ٹولیاں کی ٹولیاں قہقہے بکھیرتی ہوئی آتی ہیں اور تقریباً سارے دن یہ سلسلہ چلتا ہے، لیکن یہاں اس طرح کی کوئی بات نظر نہیں آتی روزمرّہ کے کپڑوں میں بغیر نہائے جاکر نماز پڑھ آتے ہیں۔ نہ کوئی گلے ملتا نظر آتا ہے نہ کچھ رونق معلوم ہوتی ہے کھانوں میں بھی کوئی اہتمام نہیں نظر آتا کوئی کسی کے گھر نہیں جاتا۔

خلاصہ یہ کہ کسی طرح بھی "عید کا دن" ہونے کا یقین نہیں ہوتا۔ ہر فرض نماز کے بعد اور جمعہ سے پہلے اور بعد میں مسجد میں خوب زور زور سے درود پڑھتے ہیں کہ نماز پڑھنے والا اپنی نماز ہی بھلا بیٹھتا ہے۔

ایک نئی بات سنیے "ختمات" پڑھنے کا یہاں عام رواج ہے۔ جس میں اولیاء اللہ سے مدد مانگی جاتی ہے جیسے "شیئاً للہ" کچھ اللہ کے واسطے کہتے ہیں۔ اگر آپ ایسا نہیں کرتے تو آپ مسلمان نہیں ہیں۔ اگر آپ آہستہ آہستہ درود پڑھتے ہیں تو سمجھا جائے گا کہ آپ جاہل ہیں اور آپ مسلمان نہیں ہیں۔ اگر آپ آستانوں پر جاکر مرادیں نہیں مانگتے تو آپ مسلمان نہیں ہیں۔

اگر کسی گھر میں موت ہوجائے تو میت کی تجہیز وتکفین کے بعد چوتھے دن "قرآن خوانی" کے لیے بلایا جاتا ہے۔ جب تقریباً نصف پارہ پڑھ لیتے ہیں دسترخوان بچھا کر پڑھنے والوں کو قہوہ اور ایک خاص قسم کی روٹی کھانے کو دی جاتی ہے اور قرآن پڑھنے والے تلاوت چھوڑ کر ادھر متوجہ ہوجاتے ہیں۔ اگر آپ ایسا نہ کریں تو بداخلاق اور جاہل سمجھے جائیں گے۔ قہوہ سے فارغ ہونے کے بعد بقیہ پارہ پڑھا جاتا ہے اور اس کو ختم کرکے مرحوم کی روح کو ثواب پہنچایا جاتا ہے۔ مختلف سورتیں پڑھتے ہیں اور پھر دعائے مغفرت مانگ کر دسترخوان کی طرف متوجہ ہوجاتے ہیں۔ کیوں کہ پہلے ہی سے آپ کے سامنے پیالے رکھ دیتے ہیں اور اس میں نمکین چائے ہوگی۔ خاص شکل وصورت کی موٹی موٹی چار روٹیاں ہوں گی۔ ان پر حلوہ رکھا ہوتا ہے۔ تھوڑا بہت کھاکر باقی بچی ہوئی روٹی اور حلوہ کو رومال میں باندھ کر اپنے ساتھ گھر لے جاتے ہیں۔

ختم ●

بقیہ آدھی ملاقات

یہ سلسلہ جاری رکھیے۔

ٹائٹل کا رنگ مجھے پسند نہیں آیا۔ بحیثیت مجموعی یہ شمارہ مواد کے لحاظ سے عمدہ ہے، صوری اعتبار سے اسے غنیمت کہا جاسکتا ہے۔ آپ کا خادم

خلیق انجم اشرفی

بھتنے نے پکڑ لیا



ایک لڑکا تھا اس کا نام وانیا تھا، ایک دن وہ اپنے گھر میں بالکل اکیلا بیٹھا تھا اور ڈر رہا تھا۔ یکایک اسے ایسا لگا کہ تندور کے پاس کوئی سانس لے رہا ہے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا چیز سانس لے رہی ہے۔ اس نے سوچا ضرور یہ کوئی بھتنا ہے۔ وہ تندور پر سے کودا، جہاں وہ لیٹا تھا اس کا پاؤں چمٹے پر پڑا، چمٹا اچھل کر اس کی ناک پر لگا، اب تو وہ اور بھی ڈرا۔ جھپٹ کر دروازے پر پہنچا، باہر نکل کر اس نے ایک گہری سانس لی اور بھاگنا چاہا مگر دروازے نے اس کو ایسا پکڑا کہ چھوڑا ہی نہیں، تب تو اس نے چلانا شروع کیا، "ارے دوڑو، ارے دوڑو، ارے لینا، مجھے بھتنے نے پکڑا"

بہت سے لوگ دوڑے دوڑے آئے کہ دیکھیں بھئی وانیا کو کس نے پکڑ لیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ اس کی گھاس کی چپل کی ڈوری کھل گئی ہے اور دروازے میں اٹک گئی ہے۔ اسی لیے وہ نہیں بھاگ پاتا

پھر لوگوں نے دروازہ کھولا، اندر گئے دیکھا تو چمٹا تندور کے پاس پڑا تھا۔ بیچ میں آٹے کا تسلا رکھا تھا۔ [illegible] خمیر اٹھ رہا تھا۔ خمیر اٹھنے سے بلبلے بن رہے تھے۔ اور پھر بلبلہ جب پھوٹتا تو ایک آہ بھرتا تھا۔ بھئی وہ کیا خوب بھتنا تھا۔

سب بچے بڑے اس پر خوب ہنسے اور پھر اس کا نام "بزدل وانیا" پڑ گیا۔

جناب برکت علی فراق

شفیق مرحوم

(۲)

پھر شفیق صاحب اتنے پر ہی بس نہیں کرتے تھے ہر طالب علم کا پتہ، اور جس تاریخ میں وہ جہاں جہاں ہوگا اس جگہ کا پتہ لکھ لیتے۔ اور خط و کتابت کے ذریعے اس سے تعلق قایم رکھتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چھٹیوں میں گھوم گھوم کر ہم سب نے، کسی نے سو، کسی نے پچاس، کسی نے دس ہی یا پانچ ہمدرد بنا لے۔ اور سیشن شروع ہونے پر کچھ رقمیں بھی جمع کرائیں۔

چندہ کا وعدہ لے کر جامعہ کے ان ہمدردوں کو یونہی چھوڑ نہیں دیا جاتا تھا انھیں اس بات کا یقین دلانے کے لیے کہ جس کام کے لیے انھوں نے چندہ دیا ہے وہ برابر ہو رہا ہے شفیق صاحب ان سے برابر تعلق بھی قایم رکھتے تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے "ہمدرد جامعہ" کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ جس میں ایک حصّے میں چندہ دینے والوں کی فہرست ہوتی تھی اور ایک حصّے میں جامعہ کے مختصر حالات ہوتے تھے۔

ہمدرد جامعہ کی تحریک کا یہ سلسلہ تقریباً چھ سال تک جاری رہا۔ اس مدّت کے بعد جب شفیق صاحب نے یہ کام چھوڑ کر ایک دوسرے کام کو اپنے ذمّے لے لیا تو اس وقت دس ہزار سے زیا[دہ] آدمی جامعہ کے ہمدرد ہو گئے تھے۔ اور ان کے چندہ سے جامعہ کو ڈیڑھ دو ہزار روپے ماہوار کی خالص آمدنی ہونے لگی تھی۔

بالغوں کے استاد

ہندوستان کو پوری آزادی ۱۹۴۷ء میں م[لی] لیکن آدھی آزادی ۱۹۳۶ء ہی میں مل گئی تھی۔ اس وقت آزادی کی لڑائی میں حصّہ لینے والے ہندوستانیوں کو [صو]بوں میں آزادی سے حکومت کرنے کا موقع مل گیا تھا۔ انھ[وں] نے ملک کی خدمت کے جوش میں جہاں اور بہت سے اچھے کام اپنے ہاتھ میں لیے تھے وہاں یہ بھی اعلان کیا کہ بڑی عمر کے تمام ان پڑھ لوگوں کو پڑھنا لکھنا سکھا[ئیں] گے۔ اس کام پر صوبوں کی قومی حکومتوں نے بہت روپیہ خرچ کیا لیکن انھیں اپنے مقصد میں کامیا[بی]

نہیں ہوئی اور قوم کا لاکھوں روپیہ برباد ہوگیا۔

جامعہ میں بڑی عمر کے ان پڑھ لوگوں کو پڑھانے کا سلسلہ بھی ایک عرصے سے جاری تھا۔ لیکن ابھی تک اس کا کوئی ڈھنگ نہیں بنا تھا اور نہ کام پابندی سے ہوتا تھا۔ جامعہ شروع تو ہوئی تھی آزادی کے سپاہی تیار کرنے کے لیے۔ لیکن آگے چل کر گاندھی جی کے مشورہ پر اس نے قومی تعلیم میں تجربے کرنا اپنا مقصد بنا لیا تھا۔ قومی تعلیم کی تجربہ گاہ میں کام کرنے والوں کی حیثیت سے جامعہ کے استادوں اور کارکنوں نے سوچا کہ قوم کا اتنا سرمایہ صرف اس وجہ سے برباد ہوا کہ لوگوں کو اس کام کا تجربہ نہیں تھا۔ اگر انھیں اس کام کی صحیح راہ نہ دکھائی گئی تو اسی طرح بربادی ہوگی اور قوم بدنام ہو جائے گی۔

انھی خیالات کی بنیاد پر جامعہ نے ۱۹۳۸ء میں ادارہ "تعلیم و ترقی" کے نام سے تعلیم بالغان (بڑی عمر کے لوگوں کی تعلیم) کا ایک شعبہ قائم کیا۔ اور شفیق صاحب کو اس کا انچارج بنایا۔ شفیق صاحب بڑی عمر کے لوگوں کو تعلیم دینے کا کچھ تجربہ پہلے کر چکے تھے۔ اس زمانے میں تعلیم بالغان کا مطلب صرف یہ سمجھا جاتا تھا کہ جن لوگوں نے تعلیم نہیں پائی ہے اور بڑے ہو گئے ہیں، انھیں تھوڑا سا پڑھنا لکھنا سکھا دیا جائے۔ مگر شفیق صاحب صرف اتنی ہی تعلیم کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ انھوں نے کہا تھا کہ تعلیم نہ ہونے کی وجہ سے انسان کی زندگی میں بہت سی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ جو تعلیم ان خرابیوں کو دور کرنے کا سبب کرے وہی صحیح معنی میں تعلیم بالغان ہے۔ اسی خیال کی بنیاد پر ا[illegible] بالغوں کی تعلیم میں تجربے کرنے کی تحریک شروع ک[illegible] ادارہ تعلیم و ترقی ۱۹۳۸ء میں قائم ہوا۔ شفیق صاحب اپنے انتقال کے وقت تک اس ک[illegible] کرتے رہے۔ اس عرصے میں اس شعبے نے تعلیم[illegible] بہت سے تجربے کیے۔ اور ان تجربوں کی اتنی شہ[illegible] ہوئی کہ آزادی ملنے کے چند سال بعد جب حکومت[illegible] اس کام کی ذمہ داری اپنے اوپر لی تو انھی تجربوں[illegible] کی رہنمائی کی اور اس نے وہ کام بڑے پیمانے پر شروع کیے جو شفیق صاحب ادارہ تعلیم و ترقی [illegible] پیمانے پر بہت پہلے انجام دے چکے تھے۔

دہلی کے وزیر تعلیم

۱۹۵۱ء میں متحدہ اقوام کے تعلیمی شعبے [illegible] "یونسکو" کہتے ہیں، شفیق صاحب کو ان کے کاموں[illegible] تجربوں کی بنیاد پر انڈونیشیا میں عوام کی تعلیم کا[illegible] بنا کر بھیجا۔ وہ وہاں ایک سال رہے۔ یونسکو[illegible] چاہتے تھے کہ وہ ایک سال اور ڈائرکٹر رہیں لیکن[illegible] ادارہ تعلیم و ترقی میں اپنے ادھورے کام کو پورا کرنے[illegible] بے چین تھے۔ وہاں سے واپس آنے والے ہی تھ[illegible] ہندوستان میں الیکشن کی تیاریاں ہونے لگیں۔ شفیق صاحب کے دوستوں نے فیصلہ کیا کہ ان کو[illegible] کی اسمبلی کی ممبری کے لیے کھڑا کریں۔ اس پر[illegible] کاغذات پر انھیں دستخط کرنے تھے۔ ان کے ایک

ان کاغذات کو لے کر انڈو نیشیا گئے۔ مگر شفیق صاحب نے ممبری کے لیے کھڑے ہونے سے انکار کر دیا۔ اب ان کے دوستوں نے ذاکر صاحب سے ان کو تار دلوایا کہ وہ ممبری کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ ذاکر صاحب کے کہنے سے انھوں نے مجبوراً کاغذات پر دستخط تو کر دیے لیکن اس بات کی پوری کوشش کی کہ الیکشن میں ہار جائیں۔ اس زمانے میں وہ دلّی آئے بھی نہیں۔ لیکن دلّی کے لوگوں نے پھر بھی انھیں ووٹ دیے اور وہ ممبر بن گئے۔

اسمبلی کے ممبر بن جانے کے بعد اب لوگوں نے انھیں وزیر تعلیم بننے کی دعوت دی۔ انھوں نے بہت پیچھا چھڑایا، لیکن دوستوں کا اصرار بھی اتنا ہی بڑھتا گیا اور آخر وہ دلّی کے وزیر تعلیم بن گئے۔

پارلیمنٹ اور اسمبلیوں میں قاعدہ ہوتا ہے کہ ایک پارٹی کے ممبر جس کے ممبروں کی تعداد آدھے سے زیادہ ہوتی ہے، وزیر بنتے ہیں اور حکومت کا کام کرتے ہیں اور دوسری پارٹیوں کے ممبر بات بات پر ان کی مخالفت کرتے ہیں اور اسمبلی میں برابر جھگڑا ہوتا رہتا ہے۔ یہاں بھی یہی سب کچھ ہوتا تھا۔ لیکن دلّی کی حکومت میں شفیق صاحب کے جو ساتھی تھے ان کا کہنا ہے کہ جب حکومت کے لوگوں اور مخالف پارٹی کے ممبروں کے درمیان جھگڑا بڑھ جاتا اور تیز تیز باتیں ہونے لگتیں تو شفیق صاحب مسکراتے ہوئے کھڑے ہوتے اور اردو کے شعروں اور مزے دار چٹکلوں کا نمک مرچ لگا کر ایسے دل چسپ انداز میں تقریر کرتے کہ دونوں کا غصّہ ٹھنڈا ہو جاتا اور وہ پھر سنجیدگی سے باتیں اور بحث کرنے لگتے۔

صوبہ دلّی کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے شفیق صاحب نے ایک بہت بڑا کام کیا۔ انھوں نے ہدایت کر دی کہ اسکولوں میں جو بچّہ بھی پڑھنے کی غرض سے آئے اُسے داخل کرنے سے انکار نہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ سال میں ایک دن وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا یوم پیدائش (۱۴ نومبر) اس مقصد کے لیے مقرر کیا کہ اسکولوں کے سب طالب علم ایک جگہ جمع ہو کر کھیلیں کودیں اور خوشیاں منائیں۔ انھوں نے پنڈت جی کو بھی تیار کیا کہ وہ اُس دن بچّوں کے اس میلے میں آکر ان کی ہمّت افزائی کیا کریں۔ بچوں کی طرف سے پنڈت جی کو "چاچا نہرو" کا خطاب بھی شفیق صاحب ہی کی ایجاد ہے۔

شفیق صاحب بچّوں کی تعلیم میں اور بھی بہت سی نئی باتیں کرنے کی اسکیمیں سوچ رہے تھے کہ اسی درمیان میں موت کے بے رحم ہاتھوں نے انھیں قوم سے چھین لیا اور ۳۰ راپریل ۱۹۵۳ء کو ۳۵ سال دو ماہ کی عمر میں اللہ میاں نے انھیں اپنے پاس بلا لیا۔

نوجوانوں کے معلّم

"شفیق صاحب، آپ نے اپنے صاحبزادے (صدیق الرحمٰن قدوائی) کے بارے میں کیا سوچا ہے؟"

ایک دوست نے بات چیت کے دوران ان سے پوچھا۔
"مجھے کیا سوچنا ہے!" شفیق صاحب نے جواب دیا "میرا کام تو ایک دوست کی حیثیت سے اُسے مشورہ دینا ہے"۔
"دوست کی حیثیت سے" دوست نے تعجب کے لہجہ میں پوچھا۔
"جی ہاں دوست کی حیثیت سے" شفیق صاحب نے دوست کے لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "اس عمر میں انسان اپنے دوست کے سوا کسی پر بھروسا نہیں کرتا۔ اسی کو وہ اپنا ہمدرد سمجھتا ہے اور اسی سے اپنے دل کی باتیں کرتا ہے۔ دوست کے سوا اور کسی کو وہ خاطر میں نہیں لاتا، چاہے وہ باپ ہو یا استاد، یہاں تک کہ وہ خدا سے بھی بغاوت کر بیٹھتا ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی سچ مچ اس کا ہمدرد ہے تو اسے بزرگ بن کر نہیں دوست بن کر اس کے سامنے آنا چاہیے۔ باپ کی حیثیت سے میرا ابھی یہی فرض ہے"۔

صدیق الرحمٰن قدوائی صاحب ہی کا بیان ہے کہ "جب والد صاحب انڈونیشیا میں تھے تو میں نے انھیں ایک خط لکھا۔ ان کی ہدایت تھی کہ جب میں ان کو خط لکھوں تو ہندوستان کے حالات کا صرف ذکر ہی نہ کروں بلکہ ان کے اوپر اپنی رائے بھی لکھوں۔ اس خط میں جامعہ کا بھی ذکر آ گیا۔ اور میں نے جامعہ کے کاموں پر بھی تنقید کر ڈالی۔ والد صاحب میری ان

باتوں کو صحیح نہیں سمجھتے تھے مگر یہ بھی نہیں کہ ان کے لیے مجھے لعنت ملامت۔ نے میرے خط کا جواب اس طرح دیا:
"جامعہ کی بدعنوانیوں کو کہ گنا دوگے۔ .... دیکھو کیا اودھم مچا ہے، اور کو دیا کیوں یہ ہی میں دیکھو کیا کیا تماشا یہاں ہو رہا یہاں جنوب مشرقی ایشیا کا حال پوچھو۔ اس میں بھی مجھے جامعہ کی کی جھلک نظر آتی ہے۔ لیکن خدا کرے کی تمام بدعنوانیوں کے باوجود تم اس ضرور پاس ہو جاؤ۔ ...."
نوٹ، اور ٹکٹ صرف تمھارے لیے ہوں۔ عتیق میاں کو الگ بھیجوں گا۔ تمھارا کیا ٹھکانا، ان کا حصہ بھی اور پھر اس کا الزام جامعہ کے سر منڈ

اپنا کام اپنے ہاتھ

شفیق صاحب جتنے بڑے آد کامیابی کی جس منزل پر پہنچ گئے تھے اس میں ان کی کوئی تحریری یادگار موجود نہیں یہ ہے کہ وہ کام کے عاشق تھے۔ کا کی روح سمجھتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ اگر راستے میں رکاوٹ ڈالتا ہے تو اسے

ت گنوانے کے بجائے صرف کام کی طرف توجہ کرنی
ہیے۔ اور کام ہی کے میدان میں علم کو تلاش کرنا چاہیے
علم اور کام کو ساتھ ساتھ قدم ملا کر چلنا چاہیے
دونوں ایک دوسرے سے جتنے ہی الگ ہوں گے
ہی انسانی زندگی خالی خالی کھوکھلی اور پھیکی ہوگی۔
میت کی کشتی کو وہی علم خطرناک لہروں سے بچا سکتا
ے جسے کام کے سمندر میں بے دھڑک تیرنا آتا ہو۔
ا ہی سچ پوچھیے تو وہ سمندر ہے جس میں علم کے
ے موتی ہاتھ آتے ہیں۔"

شفیق صاحب جب اکیلے ہوتے —— اور
زیادہ تر اکیلے ہی رہے، بال بچوں کو اپنے ساتھ
ت کم رکھا۔ تو اپنا کھانا اپنے ہاتھ سے پکاتے۔
ن خود دھوتے، کمرے میں جھاڑو خود دیتے، اور
پنے اپنے کپڑے بھی خود ہی دھوتے تھے۔
ایک موقع پر مجھے بھی انھوں نے کھانے میں
ریک کیا، مزے لیتے ہوئے بولے "کہیے کتنا عمدہ
نا پکاتا ہوں۔"
"بہت عمدہ، واقعی۔" میں نے یونہی سا جواب
۔ میں طے کیے بیٹھا تھا کہ میں برتن دھو کر پوچھوں
گا "کہیے میں برتن کتنا صاف دھوتا ہوں؟"
کھانا ختم ہوا۔ میں نے جھپٹ کر سب برتن
اٹھا لیے۔ شفیق صاحب نے مجھے روک دیا اور خود
سب برتن لے کر واش بیسن کی طرف لپک گئے۔ چند
منٹ میں واپس آکر بولے:
"جتنے اچھے برتن میں دھو سکتا ہوں، آپ
دھو ہی نہیں سکتے۔ اسی لیے میں نے آپ کی درخواست
منظور نہیں کی۔"
اب بھلا میں کیا کہتا!

شفیق صاحب کے ایک بھانجے ہیں —
وارث رشید فریدی۔ انھوں نے شفیق صاحب کے انتقال
کے بعد رسالہ "تعلیم و ترقی" کے ایڈیٹر کو اپنا ایک دلچسپ
واقعہ لکھا تھا۔
"۱۹۴۲ء کی بات ہے۔ میں لکھنؤ کے تعلیمی کالج
میں پڑھتا تھا۔ لکھنؤ میں مسلم کانفرنس ہونے والی تھی۔
ماموں صاحب خاص میرے کمرے میں ٹھہرے۔ کمرے کی
حالت بہت خراب تھی۔ کتابیں، بستر، موزے الماری
پر، کپڑے میز اور کرسی پر۔ میں کالج جا چکا تھا۔ ماموں
صاحب نے جھاڑو منگائی، کمرے کو صاف کیا، کپڑے

بالغوں کی تعلیم کا ماہوار رسالہ جسے شفیق صاحب نے ۱۹۵۰ء میں جاری کیا تھا۔ ہندی اور اردو دونوں میں چھپتا تھا۔
بالغان کا کام کرنے والوں کے حلقے میں اس کی بڑی دھوم تھی۔ اس میدان میں کام کرنے والے اس سے بہت فائدہ اٹھاتے
اسے اپنا رہنما سمجھتے تھے۔ اس مضمون کے مصنف اس کے ایڈیٹر اور رفیق شاستری صاحب (پنچ تنتر والے) اس
[illegible] افسوس کہ ۱۹۶۹ء میں یہ رسالہ بند ہوگیا۔ ایڈیٹر

درست کیے۔ کتابیں الماری میں رکھیں۔ بستر ٹھیک کیا غرض ہر چیز قاعدے سے اپنی اپنی جگہ پہنچ گئی۔ میں کالج سے واپس آیا تو دیکھا کہ ماموں صاحب آئینے کی طرح صاف کمرے میں لیٹے ہوئے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"وارث! تمھاری ساری تربیت بے کار گئی مجھے نہیں معلوم تھا کہ تعلق داروں کی صحبت میں رہ کر جامعہ کی ساری تعلیم یوں بھول جاؤ گے۔ بڑے شرم کی کی بات ہے کہ اپنے کام کے لیے دوسروں کے محتاج رہو۔ توبہ، توبہ!"

انڈونیشیا سے انھی وارث قدوائی صاحب کو شفیق صاحب نے ایک خط میں لکھا تھا۔

"تم لوگ نوکریوں کے پیچھے مارے مارے پھرتے ہو۔ بڑی نوکریاں ملتی نہیں ہیں اور نوکری ڈھونڈنے میں تم کو شرم آتی ہے۔ یاد رکھو، جس دن تم نوکریاں ڈھونڈنے کے لیے تیار ہو جاؤ گے، سمجھو کہ سونا بن گئے۔"

کارکنوں کے افسر نہیں معلّم

یاد نہیں آتا کہ کیا موقع تھا بس اتنی بات دماغ میں محفوظ رہ گئی ہے کہ کام میں کوئی ایسی غلطی ہو گئی تھی جو شفیق صاحب کو ناگوار تھی۔ میں اس وقت ایک تعلیمی مرکز کا انچارج تھا۔ مجھے تین دن تک مرکز نہیں جانے دیا۔ ایک دن تو میں خاموش بیٹھا رہا۔ دوسرے

دن بھی جب انھوں نے اجازت نہیں دی تو میر[ا] ہو گیا کسی قدر غصے کی حالت میں ان کے پاس [گیا]

"آپ مجھے حرام خوری سکھانا چاہتے ہیں؟ اگر آپ میرے کام سے مطمئن نہیں ہیں تو مجھے [الگ کر] دیجیے۔ لیکن یہ کیا کہ بیچ میں لٹکائے ہوئے ہیں ان دو دنوں کی تنخواہ نہیں لوں گا۔ آپ مجھے الگ [کر] دیجیے۔ اپنے گزر بسر کے لیے کوئی اور نوکری کر لو[ں گا] لیکن حرام خوری مجھ سے نہیں ہو گی۔"

"کھڑے کیوں ہیں، بیٹھتے کیوں نہیں؟" [انھوں نے بڑی] سنجیدگی سے کہا۔

"آپ جب تک اِدھر یا اُدھر فیصلہ نہ[یں کر دیں] گے میں نہیں بیٹھوں گا۔" میری آنکھوں میں آنس[و تھے۔ وہ] خود بھی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور سینے سے [لگاتے] ہوئے بولے۔

"آپ کی تربیت کے لیے یہ سزا ضرور[ی تھی۔] میں سزا ہر شخص کو نہیں دیتا۔ جسے اپنا سمجھتا [ہوں] اسی کو سزا بھی دیتا ہوں، جائیے کام کیجیے۔ [کام] عبادت ہے اور دیکھیے، آپ بالغوں کی تعلیم [کا کام] کرتے ہیں نا؟"

"جی ہاں!" میرے آنسو تھم گئے تھے۔

"مگر آپ خود بھی تو بالغ ہیں، تربیت ا[ور تعلیم] کی ضرورت آپ کو بھی ہے یا نہیں؟"

"جی یقیناً!"

"میں جب اپنے کسی ساتھی کو کوئی کام سو[نپتا ہوں]

بعد تو میری نظر اس بات پر نہیں رہتی کہ وہ کام کتنا ہوا۔ میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس کی اپنی تربیت کس حد تک ہوئی۔ اس کی شخصیت میں کتنا نکھار آیا۔ آپ کو کام دے کر آپ کی شخصیت میں بھی نکھار دیکھنا چاہتا ہوں۔ جائیے امر کر جائیے۔"

"آپ لوگوں نے کل کھانا کیوں نہیں کھایا؟"
شفیق صاحب نے پوچھا ان کی آنکھوں میں وہی کیفیت تھی جو شریر بچوں کی اصلاح کے موقع پر ہوا کرتی ہے۔

"آپ نے ہم لوگوں کو دعوت ہی کب دی تھی۔ بچا کھچا کھانے کے لیے کیا ہم ہی لوگ رہ گئے ہیں؟" ہم لوگوں کو سچ مچ صدمہ اور ملال تھا۔

شفیق صاحب کے یہاں کچھ بہت زیادہ معزز "مہمان" آئے تھے اور انھوں نے ان کی بڑی شاندار دعوت کی تھی۔ ہمارے ساتھیوں میں جو صاحب ہم لوگوں کے لیے کھانا پکاتے تھے، ان کو بھی انھوں نے دعوت کا انتظام کرنے کے لیے بلا لیا تھا۔

چنانچہ اس دن رات کو ہم لوگوں نے ہوٹل میں کھانا کھایا تھا۔

"کیا میرے بچے نہیں ہیں۔ یہ صدیق، توفیق اور وارث وغیرہ کون ہیں؟"

ہم لوگ خاموش تھے۔

"کیوں میاں شاکر، یہ لوگ مہمان کے ساتھ کھانے میں شریک تھے؟" شاکر صاحب بھی جو کھانا پکاتے تھے۔ اتفاق سے آ گئے تھے۔

"جی نہیں! ان لوگوں نے تو بعد میں کھانا کھایا۔" شاکر صاحب نے ان کی تائید کی۔

"تو پھر لائیے رات کا کھانا، ان سب کو کھلائیے یہی ان کی سزا ہے۔" شاکر صاحب کھانا لینے چلے گئے۔

ہم لوگ چپ چاپ کھانا کھانے لگے۔ اسی درمیان میں شفیق صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا:

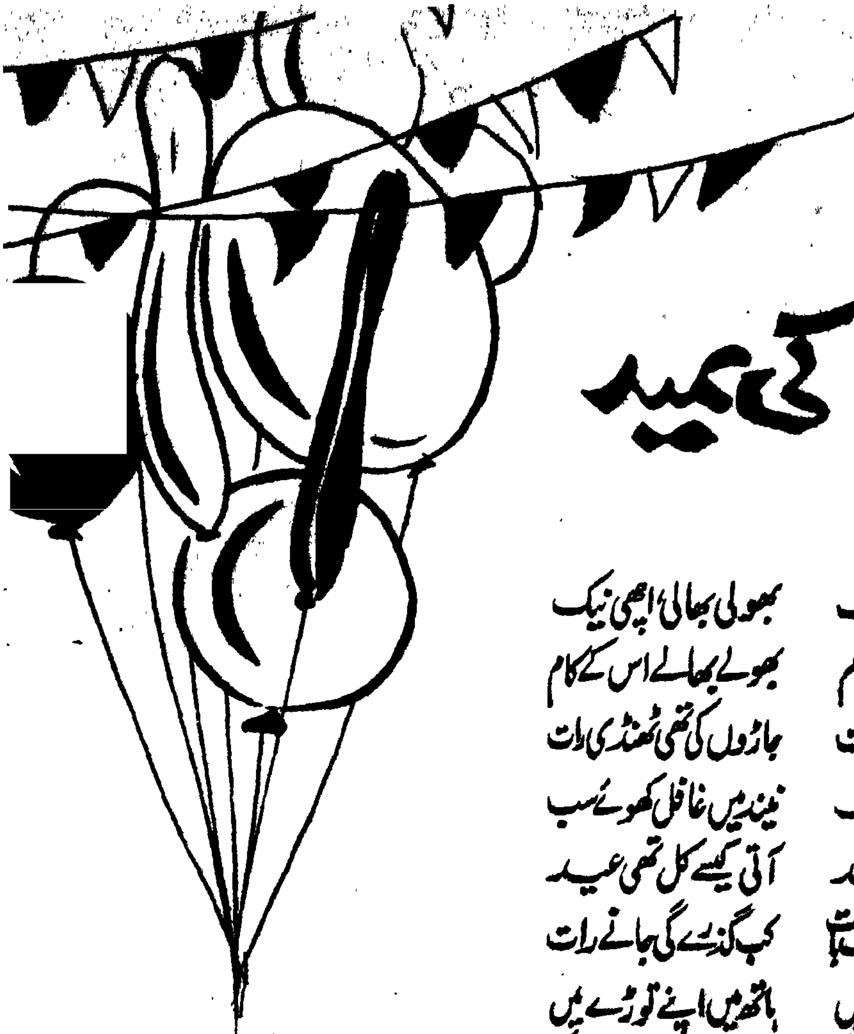
"کسی خاندان میں دیکھا ہے، گھر کے چھوٹوں کو مہمان کے ساتھ کھانا کھاتے؟؟"

دراصل یہی اپنایت کا جذبہ تھا جس کے اثر سے شفیق صاحب نے اپنی تعلیم و ترقی کی تحریک میں ایسے ایسے لوگوں سے کام لیا ـــــ اور وہ بھی اس شان سے کہ کسی کو کھانے پینے تک کا ہوش نہیں رہتا تھا ـــــ جن سے کبھی کسی کام کی امید نہیں ہو سکتی تھی۔

شفیق صاحب بہت جلد ـــــ صرف ۵۳ سال کی عمر میں ـــــ ہم سے جدا ہو گئے، ورنہ ملک کے اوپر نفرت اور جہالت کی جو گھٹا چھائی ہوئی ہے وہ بہت حد تک چھٹ جاتی۔

کیا خوب آدمی تھا، خدا مغفرت کرے۔

جواب طلب خط کے لیے ۱۰ پیسے کے ٹکٹ بھیجیے۔
"مینیجر"



جناب کوثر اعظمی

زیبا کی عید

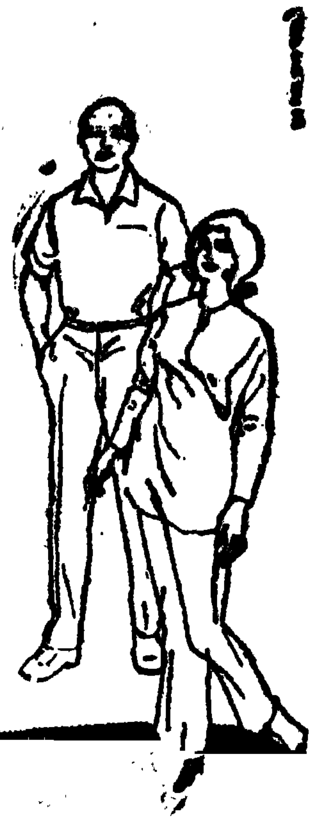
ننھی منی، بچی ایک — بھولی بھالی، اچھی نیک
زیبا رانی اس کا نام — بھولے بھالے اس کے کام
اک دن کی ہے یہ تو بات — جاڑوں کی تھی ٹھنڈی رات
لمبی تانے سوئے سب — نیند میں غافل کھوئے سب
زیبا کو نہ آئی نیند — آتی کیسے کل تھی عید
سوچ رہی تھی بس اک بات — کب گذرے گی جانے رات
کل پہنوں گی جوڑے میں — ہاتھ میں اپنے توڑے میں
گڑیاں دن بھر کھیلوں گی — بھول نہ ہرگز جاؤں گی
لے کر پیسے ابو سے — میل کروں گی بتو سے
لے آؤں گی مونگ پھلی — گھوم آؤں گی گلی گلی
پھر کھائیں گے مل جل ہم — نیما، بتو، تپتو، ہم
لیکن بتو بڑا شریر — بنتا ہے وہ بڑا امیر
مل جل کھانا جانے کیا — بات کسی کی مانے کیا
سب کرتے ہیں اس کو پیار — بانٹ کے دوں گی اسکو چار
بس بھیا بس اور نہیں — چپکے کھاؤ شور نہیں
چھلکے تو پھر خیر نہیں — مونگ پھلی ہے بیر نہیں
اور نہ وہاں رہ جاؤ جی — آنکھ نہ لو، دکھلاؤ جی
مت کہنا اب باجی تم — بہت بڑے ہو با...
ارے ارے مت مجھے پھلانگ — ہائے رے اللہ ٹوٹی...
پھر وہ چیخم دھاڑ ہوئی — بستی سب بیدار...
آ کر اتی بھاگم بھاگ — بولیں زیبا زیبا جا...
کیا ہے بیٹی دیکھ نہ رو — کروٹ ادھر بدلا...
تب زیبا کو پتہ چلا — خواب تھا سب جو دیکھ...
بولی اے لاحول ولا — بتو رانی پا...
سو جاؤ لو آئی نیند
کل ہے بجو اپنی عید

پینٹ گھر میں کوئی بھی پہنئے۔
ہر پینٹ 'سینفورائزڈ'
کی چھاپ دیکھ کر خریدیں

·SANFORIZED·
REGD TD MK

سلیکس ہوں یا ٹرینڈیا بیل باٹم سٹریٹ پائپ ہوں یا ڈینس یا عام پینٹ یا پھر [illegible]
پرانی طرز کی سادی پتلون ۔ گھر میں کوئی بھی پینٹ پہنئے، کوئی بھی خریدیے۔ ہر پینٹ پر سینفورائزڈ
کی چھاپ ضرور دیکھ لینی چاہیئے۔

شہرۂ آفاق ٹریڈ مارک 'سینفورائزڈ' آپ کے کپڑے نہ سکڑنے کی قابل اعتماد
گارنٹی ہے۔ اس چھاپ والے لباس خواہ وہ سوتی ہوں یا سوت ملے کپڑوں سے بنے
ہوں، متعدد بار دھلنے کے باوجود بھی اپنی اصلی ناپ کو برقرار رکھیں گے



مولانا مقبول احمد سیوہاروی

سفرنامہ
ابنِ بطوطہ

ایک دن کا ذکر ہے کہ میں کچھ آدمیوں کے ساتھ سوار ہو کر باہر گیا۔ گرمی کا موسم تھا، سامنے باغ نظر آیا۔ اور ہم سب باغ میں چلے گئے۔ اتنے میں شور و غل کی آواز آئی۔ معلوم ہوا کہ لیٹروں نے باغ پر حملہ کر دیا ہے۔ ہم نے پیچھا کیا تو سب بھاگ گئے۔ میرے ساتھی انھیں چاروں طرف ڈھونڈنے دوڑے اور ہم فقط چار آدمی رہ گئے۔ اتنے میں جھاڑیوں میں سے نکل کر سواروں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ دو آدمی بھاگ گئے اور تین رہ گئے۔ مجھے راستہ معلوم نہ تھا پھر بھی گھوڑے کو ایڑ لگائی اور گھوڑا ہوا ہو گیا۔ گھوڑا بھاگا تو میری رکابی تلوار گر گئی۔ تلوار کا دستہ سونے کا تھا۔

(ہندوستان میں ہر سپاہی کے پاس دو تلواریں رہتی ہیں۔ ایک ترکش میں اور ایک زین میں، زین کی تلوار کو 'رکابی' کہتے ہیں۔)

آگے خندق تھی، اور میں خندق میں اتر کر لیٹروں سے چھپ گیا۔ خندق میں نالہ تھا جس کے دونوں طرف درخت جھکے ہوئے تھے اور بیچ میں راستہ تھا۔ مجھے بالکل خبر نہ تھی کہ راستہ کہاں گیا ہے۔ بس چلتا رہا۔ کچھ اور چلا تھا کہ مجھے چالیس آدمیوں نے گھیر لیا ان کے ہاتھوں میں تیر اور تیر تھے۔ میرے بدن پر زرہ نہ تھی اس لیے ڈرا کہ اگر بھاگوں گا تو یہ مجھے تیر دں سے چھید ڈالیں گے۔ اسی میں بچت ہے کہ رحم کی درخواست کروں اور زمین پر لیٹ کر اشارہ کیا کہ میں تمھارا قیدی ہوں۔ انھوں نے گرفتار کر لیا، اور کپڑے اتار کر پاجامہ قمیص اور چوغہ چھوڑ دیا۔ پھر جھاڑی سے نکل کر ایک نہر پر پڑاؤ ڈال دیا۔ اور مجھے ارڈ کی روٹیاں کھانے کو دیں۔ ان کے ساتھ دو مسلمان بھی تھے، دونوں نے فارسی میں مجھ سے باتیں کیں اور کہا "اب تجھے قتل کیا جائے گا بچاؤ کی فقط یہ صورت ہے کہ سردار کو رحم آجائے۔ میں نے سردار کی بڑی خوشامد کی مگر وہ کچھ بولا نہیں!! اور تین آدمیوں کو میری نگرانی پر مقرر کر دیا۔ ایک ان میں سیاہ فام تھا۔ ایک بوڑھا اور ایک بوڑھے کا بیٹا۔ یہ تینوں آدمی مجھے اٹھا کر ایک غار میں لے گئے۔ اور رات کو اسی غار میں رہے۔ بوڑھے اور کالے کو، اگرچہ بخار چڑھا ہوا تھا، رات بھر میری نگرانی کرتے رہے۔ صبح کو نہر پر چلنے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ اب مجھے قتل کریں گے۔ میں نے بوڑھے کی خوشامد کی اور اپنی قمیص کی دونوں آستینیں اس کو دے دیں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ تم قیدی کا؟

جانا بتا دیا۔ شہر پر اور بھی بہت سے لوگ موجود تھے۔ ان میں ایک خوب صورت نوجوان تھا۔ اس نے مجھ سے اشارہ سے پوچھا کیا میں تجھے چھوڑ دوں؟ میں نے اپنا چوغا اتار کر اسے دے دیا۔ اور اس نے ٹکری دے کر مجھے راستہ بتا دیا۔ اور میں اس ڈر سے کہ کوئی دیکھ نہ لے تیزی سے بھاگ کر بانس کے جنگل میں گھس گیا اور جب تک سورج نہ چھپ گیا اور خوب اندھیرا نہ ہوگیا باہر نہ نکلا۔ اندھیرا ہوتے ہی بانس کے جنگل میں سے نکلا اور نوجوان کے بتائے ہوئے راستے پر چل پڑا، اور تنہائی رات تک کہیں نہ رکا۔ آخر ایک پہاڑی کے نیچے پہنچ کر سو گیا صبح تک سوتا رہا۔ صبح ہوتے ہی پھر چلنا شروع کر دیا پہاڑی پر بیروں کے درخت تھے جن کے بیر کھائے۔

راستے میں کانٹے ہی کانٹے تھے جس سے میرے پاؤں لہولہان ہوگئے۔ پہاڑی سے اتر کر باؤلی میں پانی پیا۔

باؤلی

ایسے کنوئیں کو باؤلی کہتے ہیں جس میں پانی تک جانے کے لیے سیڑھیاں بنی رہتی ہیں۔ ایسی باؤلیاں امیر لوگ بنواتے ہیں اور ان کے چاروں طرف گنبد بھی بنوا دیتے ہیں۔

باؤلی کے کنارے پر کچھ سرسوں کی جڑیں پڑی تھیں۔ شاید کسی نے [illegible] کی [illegible] میں کچھ شاخیں میں نے کھائیں۔ اور کچھ باندھ کر رکھ لیں۔ اور ارنڈ کے پیڑ کے نیچے سو گیا۔ آہٹ ہوئی تو آنکھ کھل گئی۔

چالیس زرہ پوش ہتھیار بند سوار تھے۔ انھوں نے مجھے نہیں دیکھا اور کھیت میں چلے گئے۔ میں بھی کھیت میں چھپا رہا، اور جب تک وہ لوگ باؤلی میں غسل کرتے چھینٹیں اڑاتے اور کھیلتے رہے باہر نہ نکلا۔ رات ہوگئی اور ان کی آواز نہ آئی تو باہر نکل کر گھوڑے کے نشانوں پر چل پڑا۔ رات چاندنی تھی اس لیے راستہ چلنے میں دشواری نہ تھی۔ کچھ دور جاکر دوسری باؤلی ملی، جہاں میں نے سرسوں کے باقی پتے جنھیں باندھ کر ساتھ رکھا تھا کھائے اور پانی پی کر باؤلی کے گنبد میں سو گیا۔ گنبد میں گھاس کے پتے پڑے تھے۔ جنھیں شاید جانوروں نے ڈال دیا ہوگا۔ رات میں سانپ کی جیسی سرسراہٹ بھی محسوس ہوئی مگر میں نے پروا نہ کی۔

صبح کو سڑک لی گئی اور چند اجاڑ گاؤں سے نکل کر کھجوروں کے جھنڈ میں سے گزرا جہاں ایک تالاب اور کچا گھر بنا ہوا تھا۔ کچھ دیر سستا کر آگے بڑھا تو بیلوں کے چلنے کے نشان نظر آئے۔ آگے چلا تو ایک بیل پر کمبل اور رلی رکھی تھی۔ یہ علاقہ باغیوں کا تھا میں نے اسے چھوڑ کر دوسرا راستہ اختیار کیا۔

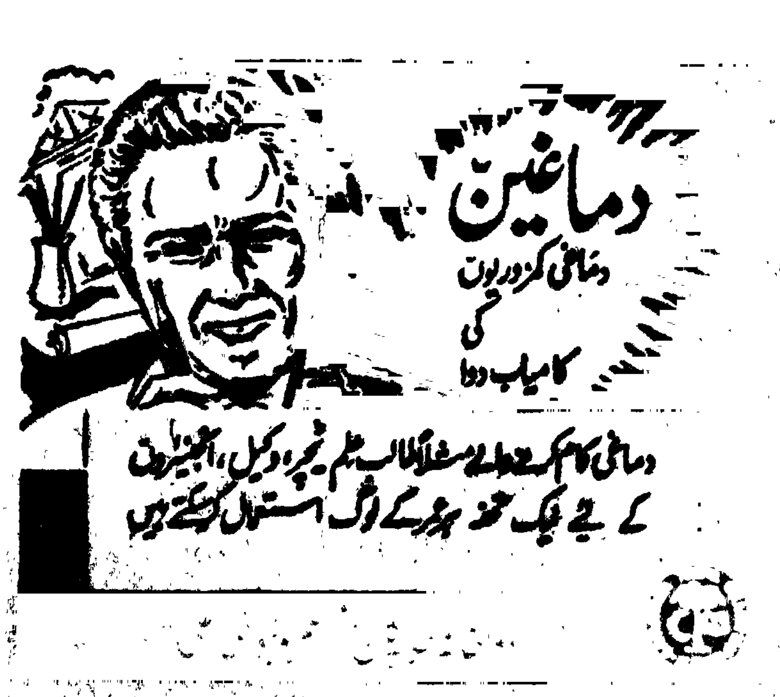
سات دن اسی طرح مارا مارا پھرتا رہا۔ فرنگ گاؤں میں پہنچا تو کوئی کھانا تو کیا دیتا۔ تلوار سے دھمکایا گیا۔ دھمکانے والوں کو کچھ نہ ملا تو میں نے اپنی قمیص جس کی آستین پھٹی ہوئی تھی دے دی۔ پیاس سے بے تاب تھا کنوئیں پر فقط رسی تھی میں نے اپنا موزہ باندھ کر

پھر اور [illegible] چوس کر پیاس بجھالی ۔

مصیبت ختم ہو گئی:

اسی حالت میں حیران پریشان بیٹھا تھا کہ سلام علیکم کی آواز آئی اور ایک سیاہ فام بزرگ نظر آئے جن کے ایک ہاتھ میں عصا ایک ہاتھ میں لوٹا اور کندھے پر جھولی تھی مجھ سے حال پوچھا تو میں نے عرض کیا کہ بھٹک گیا ہوں ۔ بولے میں بھی راستہ بھول گیا ہوں ۔ پھر انھوں نے لوٹے سے پانی کھینچا، جھولی سے بھنے ہوئے چنے اور پڑ مل دیئے کہ تھوڑے سے کھا کر پانی پیو ۔ پھر وضو کیا ۔ میں نے اور انھوں نے نماز پڑھی ۔ میں نے نام پوچھا تو انھوں نے بتایا کہ میرا نام قلب فارح (خوش دل) ہے ۔ میرا حال اس وقت ایسا تھا کہ

سر کا نہ جاتا تھا ۔ بزرگ نے کہا میرے کند
ہو جاؤ ۔ میں نے کہا آپ کمزور اور بوڑھے ہیں ۔ م
کیوں کر اٹھا سکتے ہیں ۔ مگر انھوں نے قسم د
فرمایا حسبنا اللہ و نعم الوکیل پڑھتے چلو اور مجھے
پر سوار کر کے چل پڑے ۔ مجھے ان کے کندھے پ
اور پتہ نہ چلا کہ وہ مجھے کتنی دور کندھے پر چڑھا کر
زمین پر اتارا تو آنکھ کھلی ۔ بزرگ کا کہیں پتہ
بزرگ نے جہاں مجھے اتارا وہ ایک آ
تھا ۔ اور حاکم سلطان تھا ۔ گاؤں کا نام تاج
حاکم کو میری خبر پہنچی تو مجھے اپنے گھر لے گیا ۔ نہلایا
گرم گرم کھانا کھلایا ۔ پہننے کو کپڑے اور سواری
دیا ۔



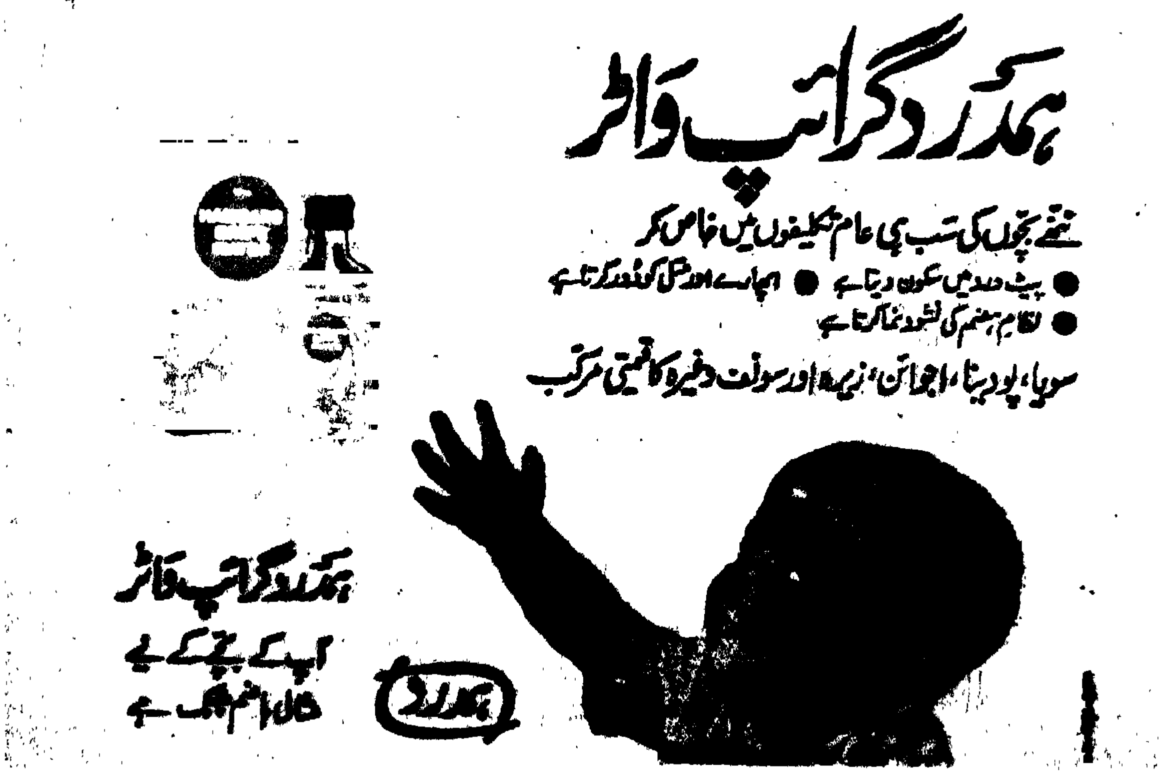
میں حیران ہو گیا کیوں کہ یہ میرے ہی کپڑے تھے
حاکم نے بتایا کہ ایک مصری سرکاری کیمپ سے جو کول میں
پڑاو ڈالے پڑا ہے۔ یہ کپڑے دے گیا ہے۔

میں سوچنے لگا الٰہی!! یہ کون تھا جو مجھے اپنی
گردن پر سوار کر کے یہاں لایا۔ یکایک مرشدی شیخ
عبداللہ کی بات یاد آئی جنھوں نے اسکندریہ میں مجھ
سے کہا تھا۔

"میرے بھائی دل شاد ہندی سے
تیری ملاقات ہوگی اور وہ مجھے
ایک بڑی مصیبت سے بچائے گا!"

ہو نہ ہو یہ دل شاد ہی تھے۔ قلب فارح کا
ترجمہ خوش دل اور دل شاد ہوتا ہے۔ افسوس کہ زیادہ
دیر ان کی رفاقت میسر نہ آئی اور کوئی بات نہ ہو سکی۔ اس
رات چل کر میں کیمپ میں پہنچ گیا، میرے ساتھی مجھے
دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔ بادشاہ کا جواب بھی آچکا تھا
کہ سفر جاری رکھا جائے۔ اور بچانے کا فورشراب دار
کے اپنے غلام سنبل کو بھیج دیا تھا۔

کوئیل سے ہمارا پڑاؤ برج پوٹہ میں ہوا۔ یہاں
خانقاہ کے شیخ سے ملاقات ہوئی جو صورت و سیرت
کے بہت اچھے تھے۔ محمد عرفان نام تھا۔ فقط ایک
تہمد باندھے تھے۔ معلوم ہوا کہ محمد عریاں مصری کے
مرید ہیں۔ عشاء کی نماز کے بعد جتنا کھانا پک جاتا
غریبوں میں تقسیم کر دیتے تھے اور چراغ کی بتی بھی پھینک
دیتے تھے۔



برج پورہ سے ہم کالی ندی اور کالی ندی سے قنوج پہنچے۔ قنوج بڑا شہر ہے۔ اور یہاں کا قلعہ بہت مضبوط ہے۔ فصیل بھی بہت اونچی ہے۔ قنوج میں ہماری ملاقات شیخ معین الدین باخوری سے ہوئی، فیروز بدخشانی یہاں کا حاکم ہے۔

قنوج کی شکر بہت مشہور ہے اور دہلی تک جاتی ہے۔ اچھی بھی ہوتی ہے اور سستی بھی۔ ہم قنوج میں تین دن ٹھہرے۔

بادشاہ کو اطلاع دی گئی تھی کہ ابن بطوطہ کا پتہ نہیں ہے۔ سفارت کے ساتھ کسے بھیجا جائے۔ شاہی حکم پہنچا کہ اگر ابن بطوطہ کا پتہ معلوم نہ ہو تو وجیہہ الملک قاضی دولت آباد سفارت پر جائے گا۔

قنوج سے چل کر مہتول، وزیر پور، بجالسہ، موری پہنچے، موری اگرچہ چھوٹا سا شہر ہے مگر بازار اچھے ہیں۔ یہاں میری ملاقات شیخ قطب الدین غازی سے ہوئی۔ ان کی عمر ڈیڑھ سو برس کی ہے۔ چلّے کرتے رہتے ہیں اور چالیس دن میں فقط چار کھجوریں کھاتے ہیں۔

دلّی میں بھی ایک بزرگ شیخ رجب برقعی کو میں نے دیکھا تھا۔ کہ وہ چالیس کھجوریں لے کر چلّے میں بیٹھتے ہیں۔ اور جب باہر آتے تو تیرہ کھجوریں بچا کر لاتے۔ موری سے شہر مرہ پہنچے، یہاں کا گیہوں بہت اچھا ہوتا ہے۔ لمبا دانہ، زرد رنگ اور موٹا، چین کے سوا ایسا گیہوں میں نے کہیں نہیں دیکھا۔ یہاں کا گیہوں دلّی بھی جاتا ہے۔ مرہ مالوہ کا شہر ہے۔

مرہ سے ہم علاپور پہنچے۔ علاپور کا حاکم حبشی تھا۔ لمبا تڑنگا اور خوب موٹا۔ پوری بکری ایک ہی نشست میں کھا جاتا تھا۔ اوپر سے تین پاؤ گھی پیتا تھا۔

یہاں سے ہم گوالیار گئے۔ یہ بڑا شہر ہے، اس کا قلعہ بھی بہت مضبوط ہے۔ پہاڑی چٹان پر بنا ہوا ہے۔ اونچائی تین سو فیٹ اور لمبائی پونے دو میل ہے۔ قلعہ کے دروازہ پر پتھر کا ہاتھی اور مہاوت کھڑا ہے۔ شہر کا حاکم احمد بن شیر خاں فاضل ہے۔

گوالیار سے چل کر ہم براون گئے۔ جہاں کا حاکم محمد بن سرم ترکی ہے۔ شہر کے باہر اکثر جنگلی جانور رہتے ہیں۔ کبھی کبھی شہر کا دروازہ بند ہونے کے بعد بھی گھس آتا ہے اور آدمیوں کو پھاڑ کھاتا ہے۔ محمد توفیری اس شہر کے باشندے نے مجھ سے کہا کہ میرے ہمسائے کے بچے کو چارپائی سے اٹھا کر ایک شیر لے گیا۔ یہ قصّہ بھی سنایا کہ ایک دفعہ بارات آئی ایک باراتی اٹھ کر باہر گیا۔ شیر نے اسے پھاڑ ڈالا۔ ساتھی ڈھونڈنے گئے تو لاش بازار میں پڑی ہوئی تھی۔ خون پی لیا تھا اور گوشت چھوڑ دیا تھا۔ کہتے ہیں شیر کا یہی طریقہ ہے۔

(باقی آئندہ)

خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیجئے۔
"ایڈیٹر"

ڈریگن

جناب ڈاکٹر کمار چند شرت،
ایم اے، پی ایچ ڈی



گریک زبان میں ایک لفظ "ڈریکن" ہے، جس کا مطلب ہے تیز نظر یا خونخوار آنکھوں والا۔ یہ نام ان آنکھوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جو آنکھیں چمک دار ہوتی ہیں۔ ڈراونی ہوتی ہیں۔ لاطینی زبان میں یہی لفظ "ڈریکو" اور انگریزی میں ڈریگن بن گیا۔

پہلی صدی کے ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ ڈریگن ہندوستان کا ایک بہت بڑا سانپ تھا۔ یہ اتنا بڑا ہوتا تھا کہ ایک ہاتھی کو آسانی سے اپنی پیٹ میں لے سکتا تھا۔ مگر بعد میں ڈریگن کو سانپ کی شکل کا ہوتے ہوئے بھی ٹانگ اور پر والا مان لیا گیا۔ اس کی سانس سے آگ نکلتی تھی اور وہ غاروں میں رہتا تھا۔ اس کے بعد ٹانگ [illegible] ڈھونڈ نکلو، چھوٹا

DRACOVOLACO یا اڑنے والا ڈریگن آج بھی جاوا میں پایا جاتا ہے اور اسے گرگٹ کہتے ہیں۔

۱۶۷۳ء میں ایک جرمن طبیب HAYN اور ایک ماہر آثار قدیمہ VOLLGEND کو ہنگری کے غار سے چند کھوپڑیاں ملیں۔ انھیں ڈریگن کا بتایا گیا ہے۔ اپنے مضامین میں دونوں نے ڈریگن کی کھوپڑیوں کی مصوری بھی کی ہے اور اس کے جسم کا خاکہ تیار کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ غاروں میں دریافت شدہ ہڈیاں کسی پرانے ڈریگن کی تھیں۔

جب یورپ کے سیاح چین پہنچے تو انھوں نے وہاں LUNG نامی جانور کی کہانیاں سنیں لیکن جب انھوں نے LUNG کی تصویر دیکھی تو یہ انگریزی ڈریگن تھا تبھی انھوں نے سوچا کہ ڈریگن دنیا کے قریب قریب تمام حصوں میں پایا جاتا ہے۔ البتہ کہیں کہیں اس کا رنگ روپ بدلا ہوا ہے۔ مثلاً یورپ میں ڈریگن کو "شر" اور چین میں "خیر" سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ دونوں جگہ یہ جانور جسمانی ہیئت کے اعتبار سے ایک جیسا ہے لیکن چینی ڈریگن کا تعلق پانی سے رہا ہے۔

مشرقی ملکوں میں آج بھی ڈریگن پایا جاتا ہے۔ ۱۹۱۲ء کے بعد ڈریگن کی ایک اور قسم "کوموڈو ڈریگن" کا بھی پتہ چلا ہے۔ لیکن جہاں تک تاریخ کا سوال ہے ڈریگن اب آخری سانسیں لے رہا ہے یعنی اس کا وجود ختم ہوتا جا رہا ہے۔

تصویری کہانی

جناب سید امین چشتی اجمیری



انکل پیٹر نے اپنی کہانی یوں شروع کی۔ "تم نے گلہری تو دیکھی ہوگی۔ گلہری کے چھوٹے جسم پر لچھے دار اور گھنے بالوں کی دم بہت بھلی معلوم ہوتی ہے۔ کسی زمانے میں یہی حلیہ خرگوش میاں کا تھا اس کے جسم پر ایسی دم بہت بھلی لگتی تھی۔



لیکن خرگوش میاں کی لمبی اور خوبصورت دم کٹ کر چھوٹی ہوگئی۔ محض اپنی شرارت کی وجہ سے۔ یہ قصہ کچھ اس طرح سینکڑوں برس پہلے خرگوش میاں ایک دریا کے کنارے رہتے تھے۔ منہ اندھیرے وہ دریا کی سیر کرتے۔ دریا کے پار ایک مالی کا باغ تھا۔



۳ یہ بہار کے موسم کا ذکر ہے۔ ہر طرف ہریالی تھی۔ باغ میں طرح طرح کے پھول پھل اور میوے لگے تھے۔ دریا پر کوئی پل نہ تھا جس کی مدد سے وہ دریا پار کرتے۔ وہ حسرت سے باغ کی طرف دیکھتے اور اس سوچ میں رہتے کہ کسی طرح باغ پہنچ جاؤں۔



۴ تاکہ یہ لذیذ میوے کھانے کو ملیں۔ آخر ان کے ذہن میں ایک ترکیب آئی انھوں نے سوچا بی بطخ سے مدد لینی چاہیے۔ وہ مجھے ضرور پار کرادے گی۔ انھوں نے بی بطخ کے پاس جاکر دل کی بات کہی۔ بی بطخ نے کہا "میں ضرور تمھیں پار لے جاتی مگر تمھارا وزن اتنا ہے کہ تم [illegible]



۵ بی لطخ کے کہنے پر خرگوش میاں بھائی سارس کے پاس گئے۔ سارس نے ان کی بات سن کر کہا "میں تو کنارے پر کھڑے ہو کر ہی شکار کرتا ہوں بھلا تمھیں لے کر بیچ دریا میں کیسے جاؤں؟ مجھے افسوس ہے کہ میں تمھاری مدد نہیں کر سکتا۔" خرگوش میاں اداس ہو گئے۔



۶ خرگوش میاں دریا پار جانے کی نئی نئی ترکیب سوچتے مگر ان کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ بی لطخ اور بھائی سارس نے ان کا دل توڑ دیا تھا۔ ایک دن وہ دریا کے کنارے کھڑے گہری سوچ میں غرق تھے کہ اچانک ان کی نظر ایک مگرمچھ پر پڑی۔ اسے دیکھتے ہی خرگوش میاں کی سمجھ میں ایک ترکیب آگئی۔



۷ انھوں نے مگرمچھ کو آواز دے کر قریب بلایا اور کہنے لگے "میاں مگرمچھ میں سمجھتا ہوں کہ خشکی پر رہنے والے جانوروں کی تعداد پانی میں رہنے والے جانوروں سے زیادہ ہے۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ میرے دوستوں کی تعداد تمھارے دوستوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔"



۸ مگرمچھ نے جو یہ سنا تو کہا "اے ننھے منھ سنبھال — کیوں بڑ ہانکتے ہو۔ کہاں تم اور کہاں ہم۔ جاؤ اپنا کام کرو بڑے آئے میرے دوستوں کو کم کرنے والے" خرگوش نے عاجزی سے کہا "مگرمچھ میاں اس میں ناراضگی کی کیا بات ہے ہم اپنے دوستوں کو کل جمع کر کے گنتی



۹ مگرمچھ نے کہا "ٹھیک ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے پانی میں غوطہ لگایا اور غائب ہو گیا۔ خرگوش میاں اپنی ترکیب کی کامیابی پر خوش ہو کر ناچنے لگے۔ اب وہ بے چینی سے دوسری صبح کا انتظار کرنے لگے۔ وہ دریا پار جانے کے لیے بے چین تھے۔



۱۰ دوسرے دن مگرمچھ اپنے دوستوں کے ساتھ آگیا۔ مگر دوست تعداد میں اتنے زیادہ تھے کہ ان کی لائن ایک کنارے سے دو... تک جا لگی۔ مگرمچھ نے خرگوش سے کہا "لو میرے دوستوں کی گنتی کر لو" خ... انتظار میں تھا۔ وہ پہلے مگرمچھ کی پیٹھ پر کود کر بولا "ایک" پھر دو...



۱۱ اس طرح وہ ایک ایک کر کے سارے مگرمچھوں کی پیٹھ پر کودا اور گنتی پوری کرنے لگا۔ آخری مگرمچھ کی پیٹھ پر کود کر اس نے گنتی پوری کی۔ اور پھر کنارے کی طرف ایک لمبی جست لگائی۔ پھر اس نے ایک قہقہہ مارا "ہاہا دیکھا میں نے کس طرح بے وقوف بنایا۔ اب میں دوسرے کنارے پر [illegible]



۱۲ "اور یہی میری آرزو تھی"۔ مگرمچھوں نے جو یہ سنا تو ... آیا۔ آخری مگرمچھ نے، جو کنارے کے قریب تھا خرگوش کو ... ادھر خرگوش نے جست لگائی۔ مگر مگرمچھ تیزی سے خرگوش ... پہنچ گیا۔ خرگوش کی دم مگرمچھ کے منہ میں آ گئی۔



۱۳ خرگوش تیزی میں تھا اس لیے اس کی دم میں ایک زبردست جھٹکا لگا اور وہ جڑ کے قریب سے علیحدہ ہوگئی۔ خرگوش قلابازی کھاکر دور جاگرا۔ گرنے کی وجہ سے وہ بے ہوش ہوگیا جب ہوش آیا تو معلوم ہوا کہ دم غائب ہے اور بے پناہ درد ہو رہا ہے۔



۱۴ وہ تکلیف سے چلانے لگا۔ باغ کا مالی اس کی آواز سن کر آیا اس کی خیریت پوچھی۔ اس نے سارا ماجرا سنایا۔ مالی نے کہا دیکھا تمھیں اپنے کیے کی سزا مل گئی اگر تم وعدہ کرو کہ آئندہ ایسی شرارت نہ کروگے تو میں تمھیں ٹھیک کرسکتا ہوں۔ خرگوش



۱۵ مالی نے اس کی مرہم پٹی کی اور اسے نرم روئی کے گدے پر سلادیا صبح جب خرگوش کی آنکھ کھلی تو اس کا درد ختم ہوچکا تھا۔ اس نے مالی کا شکریہ ادا کیا۔ مالی نے اسے کھانے کو پھل دیے اور اس طرح خرگوش میاں کی دلی آرزو پوری ہوگئی۔ اس دن ہی سے خرگوش انسانوں کے ساتھ رہنے لگا۔

(لوک کہانی)



۱۶ "آہا کتنی مزے دار کہانی تھی" سنہری نے رائے دی۔ خرگوش کی بے وقوفی نے اسے دم سے محروم کردیا۔" پیٹر بولا۔ "اچھا اب کسی اور جانور کی کہانی سنائیے جس نے ایسی ہی بے وقوفی کی ہو" ڈیوڈ نے کہا۔ اچھا اب میں کل تمھیں بندر اور کچھوے کی کہانی سناؤں گا۔ اب تم لوگ جاکر سوجاؤ۔

(باقی آئندہ)





جادو کا فوارہ

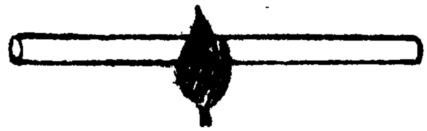
آپ نے کبھی کبھی کسی کھلونے والے یا پان والے
کی دکان پر چھوٹے چھوٹے فوارے چلتے ہوئے دیکھے ہوں
گے اور آپ کی بھی خواہش ہوتی ہوگی کہ اسطرح کا فوارہ
خود بنائیں۔ دکانوں والے فوارے بنانا کوئی مشکل کام
نہیں۔ یہ دکان دار کسی بڑے برتن میں پانی بھر کر
اونچی جگہ پر رکھ دیتے ہیں۔ اس کے بعد ایک ربر
کی پتلی نلی لے کر اس برتن کے پانی میں ڈال دیتے
ہیں۔ ربڑ کی نلی کے دوسرے سرے پر ڈراپر یا جیٹ
نلی جوڑ دیتے ہیں ربر کی نلی میں پانی چڑھنے لگتا ہے
اور وہ ڈراپر میں سے ہوتا ہوا تیزی سے فوارے کی
شکل میں باہر نکلنے لگتا ہے۔

آیئے آج ہم آپ کو ایک دوسری قسم کا فوارہ
بنانے کی ترکیب بتائیں۔ اس کے لیے کسی برتن میں
پانی بھر کر کسی اونچی جگہ پر رکھنے کی ضرورت نہیں۔
بلکہ بند بوتل میں سے پانی اپنے آپ فوارے کی شکل میں
نکلنے لگے گا۔ اس جادو کے فوارے کو بنانے کے لیے
نیچے لکھی ہوئی چیزیں جمع کر لیجیے۔

موٹے شیشے کی بڑی بوتل (روح افزا یا سکواش
وغیرہ کی) ایک چھید والا کارک جو بوتل
پوری طرح فٹ ہو سکے۔ کارک کا چھید ا
چاہیئے کہ اس میں جیٹ نلی یا ڈراپر فٹ
ڈراپر یا جیٹ نلی، ایسٹک ایسڈ، پٹنگ
پانی، موم۔

اس موٹے شیشے کی بوتل کے منہ
کارک فٹ کر دیجیے۔ اس کے چھید میں جیٹ
فٹ کر دیجیے کہ اس کا جیٹ والا سرا کارک
اور باقی بوتل کے اندر۔ اگر کارک چھید والا
تو خود ہی چھید کر لیجیے۔ اس کی آسان ترکیب
کہ کارک کو زمین پر ڈال کر اوپر سے جوتے
ڈالتے ہوئے اسے لڑھکائیے۔ لڑھکانے۔
نرم پڑ جائے گی۔ پھر کوئی کیل یا تار لے کر اس
کر لیجیے۔ پھر اس میں جیٹ نلی فٹ کر دیجیے
کو اس طرح بوتل میں ڈالیے کہ اس کا سرا
پیندی سے تقریباً آدھا انچ اوپر رہے۔ اگر
نہ مل سکے تو آپ خود ہی جیٹ نلی بنا سکتے
تو ڈراپر سے بھی کام چل سکتا ہے۔ اگر جیٹ

چاہیں تو اس کے لیے ایک شیشے کی سیدھی نلی لے لیجیے اور اسے بلو پائپ (ایک طرح کا لیمپ) کی لو پر رکھ کر دھیرے دھیرے گھماتے ہوئے گرم کر لیجیے۔ لو سیدھی نلی کے ایک سرے سے تقریباً ۱½-۲ انچ دوری پر لگے۔



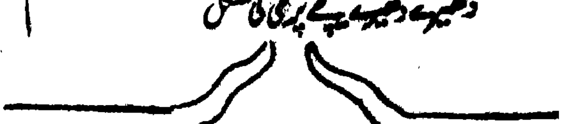
بلو پائپ پر نلی کو گرم کرنا

گرم ہو کر نلی کا شیشہ نرم پڑ جائے گا اور ل ہو جائے گا اب اسے لو پر سے ہٹا کر دونوں سروں کو احتیاط سے دھیرے دھیرے کھینچیے۔ کھینچتے وقت جلدی نہ کیجیے گا ورنہ جیٹ نلی کی شکل بگڑ جائے گی اور آپ اس سے کام نہ لے سکیں گے۔

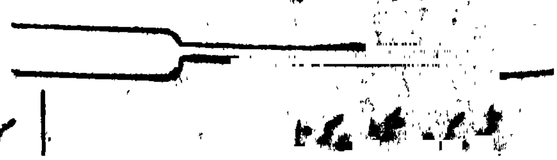
جب نلی ٹھنڈی ہو جائے تو اس کے پتلے حصے کو بیچ میں سے شیشہ کاٹنے والی آری سے کاٹ کر دو ٹکڑے کر لیجیے۔ اس طرح ایک چھوٹی اور ایک بڑی جیٹ نلیاں بن جائیں گی۔

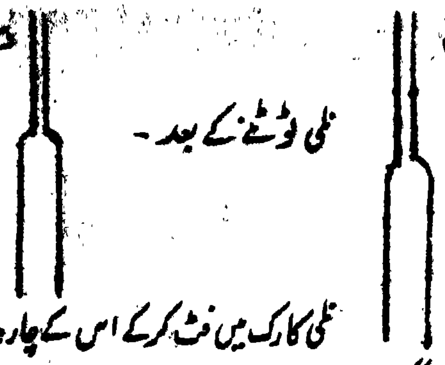


دھیرے دھیرے کھینچنے پر نلی کی شکل



جلد بازی کا نتیجہ





نلی ٹوٹنے کے بعد۔

نلی کارک میں فٹ کر کے اس کے چاروں طرف پگھلا ہوا موم لگا دیجیے۔ جس سے ہوا بوتل کے اندر نہ جانے پائے۔

اب ایسٹک ایسڈ اور پانی برابر مقدار میں ملا کر بوتل میں ڈال دیجیے۔ یہ مرکب بوتل میں تقریباً تین چوتھائی بھر دیجیے۔ سوڈیم بائی کاربونیٹ کا ایک چمچہ پتنگ بنانے کے کاغذ میں لے کر اس کی پڑیا بنا لیجیے اور اسے بوتل میں ڈال کر فوراً بوتل بند کر دیجیے۔ بند کرنے کے کچھ دیر بعد پتنگ کا کاغذ تو گل جائے گا اور سوڈیم بائی کاربونیٹ، پانی اور ایسٹک ایسڈ کے مرکب میں مل جائے گا۔ اس کے ملتے ہی پانی تیزی سے فوارے کی شکل میں باہر نکلنے لگے گا۔

اس کھیل کو کرنے کے لیے کچھ احتیاطیں بھی لازمی ہیں۔ اسے کھلی جگہ میں کمرے سے باہر کرنا چاہیے۔ ایسٹک ایسڈ اور پانی کا مرکب آپ کے کپڑوں پر نہ گرے، نہیں تو کپڑے خراب ہو جائیں گے۔

اچھا آیئے آخر میں اس جادوئی فوارے کی قلعی بھی کھول دیتے ہیں کہ پانی کیسے اوپر کی طرف اپنے آپ فوارے کی شکل میں نکلنے لگتا ہے؟

جب ایسٹک ایسڈ اور پانی کے مرکب میں سوڈیم بائی کاربونیٹ ڈالا جاتا ہے تو کاربن ڈائی

بڑوں کی کوششیں

جامعہ ملیہ اسلامیہ
جامعہ نگر نئی دہلی
۱۱ر اپریل ۱۹۷ء

پیاری سہیلی، آداب

دو سال تم سے دور ضرور رہی مگر ان دو سالوں میں میں نے یہاں کے ماحول سے جو باتیں سیکھی ہیں۔ ان سے میرے خیالات تو بدل ہی رہے ہیں۔ ساتھ ہی یہ باتیں میری زندگی میں کام آنے والی ہیں — اگر تم بھی یہاں کے ماحول کی نئی باتیں سنو گی تو تمھارے خیالات اور جذبات بھی بدلے بنا نہ رہیں گے۔ جب سننا ہی چاہتی ہو تو سنو۔

یہاں کے سماجی ماحول میں مجھے سب سے اچھی جو بات لگی وہ ہے استاد اور شاگردوں میں گہرا تعلق۔ ان کے کاموں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید استاد کا جیون شاگرد کے لیے ہی ہے۔ میں بھی استاد بننے والی ہوں استاد بننے کے لیے مجھے یہ ایک نیا سبق ملا ہے۔

یہاں کے ماحول کی ایک اور خاص بات آپس میں بھید بھاؤ نہ ہونا ہے۔ یہاں آنے سے پہلے میں سوچا کرتی تھی نہ جانے مسلمان کیسے شاید بڑے کڑے اور لمبی داڑھیاں ہونگی ان کی خیال تھا کہ یہ لوگ دوسری قوم کے لوگوں سے نفرت کرتے ہوں گے۔ مگر اب اپنے ہی خیالوں پر ہنسی آتی خیال ہے کہ جس آدمی میں بھی انسانیت ہے ہے۔ چاہے وہ ہندو ہو یا مسلمان۔

یہاں کے ماحول نے اب تو مجھے بھی لیا ہے۔ سب ایک دوسرے کو آداب کرتے نہیں یہ لوگ تو غیر کو بھی سلام کر لیتے ہیں۔ غیر کو اپنا بنا لیتی ہے کتنی اچھی بات ہے یہ اکثر ان لوگوں سے ہی نمستے کرتے ہیں جنھیں اب میرے جذبات مجھے ایسا کرنے سے روک

میری اچھی سہیلی! جامعہ کے سماجی ہی نہیں قدرتی ماحول نے بھی میرا من موہ لیا پرسکون ماحول میں نے کہیں نہ پایا تھا۔ کالج طرف ہرے بھرے کھیت ہمیشہ مجھے کچھ نہ کچھ مجبور کرتے رہتے ہیں۔ اب تو صرف ایک مہینہ سوچتی ہوں کیا گھر آکر بھی میں ایسا ماحول شاید نہیں یہاں کے ایسے ماحول میں پڑھ

بہت مزہ آتا ہے۔

دکھانے یہاں دیکھنے کی چیز ہے کل کل کی آواز کرتے ہوئے بہتا پانی دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے دنیا کی جنت یہیں ہے۔ طرح طرح کی آوازیں کرتے ہوئے پرندے نہ جانے اپنی بولی میں کیا کہہ جاتے ہیں۔ وہ تو اڑ جاتے ہیں مگر پیچھے چھوڑ جاتے ہیں اپنی یاد۔

کہنے کو تو بہت سی باتیں ہیں جو یہاں کے ماحول میں مجھے اچھی لگی ہیں۔ نہ دل ان اچھی باتوں کو بیان کر سکتا ہے اور نہ قلم سب کچھ لکھ سکتا ہے۔ میں سمجھتی ہوں انسان کہیں سے کچھ لے کر جاتا ہے تو وہاں کے لوگوں کے اچھے خیالات اور جذبات ہی لے کر جاتا ہے تو پھر میں بھی تو یہی کچھ لے کر آ رہی ہوں۔

میری طرف سے ماتا جی کو نمستے۔ چھوٹے بھائی دیپک کو پیار۔

تمہاری سہیلی
کانتا دیوی
بیسک دوسرا سال
جامعہ

....

جی پی ہوسٹل
جامعہ نگر دہلی ۶/اپریل ۱۹۷۰ء

پیاری ونود

تمہارا خط ملا، سماچار معلوم ہوئے۔ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ تمہارے پیپر اچھے ہو گئے۔ ہمارے پیپر بھی اگلے مہینے میں شروع ہو رہے ہیں۔

ان دو سالوں کے دوران مجھے تمہاری یاد بہت آتی رہی۔ وہ دن یاد آئے جب ہم دونوں مل کر کھاتے پیتے اٹھتے بیٹھتے تھے۔ گیارہ سال ایک ساتھ رہے۔ اب تو میرا اور تمہارا راستہ الگ الگ ہو گیا۔ یہ تو دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔ ماں باپ اپنے بچھڑ جاتے ہیں۔ بھائی بہنوں اور دوستوں میں ہمیشہ رہنا ناممکن ہے۔ یہ تو خدا کا بنایا ہوا قانون ہے۔

اب میں یہاں کے بارے میں اپنے کچھ خیالات پیش کرتی ہوں۔ جیسا کہ تم نے اپنے پچھلے خط میں لکھا تھا تو سنو! مجھے یہ کالج بہت پسند آیا۔ یہاں پر سب ہی مذہب کے لوگ بہت محبت سے مل جل کر رہتے ہیں۔ کسی کو بھی فرق کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ ذات پات اونچ نیچ کا فرق نہیں ہے۔ یہاں پہ استادوں اور طلباء کا بات چیت کرنے کا طریقہ باپ بیٹی جیسا ہے۔ ہم کسی بھی وقت کسی استاد سے اپنی مشکل پیش کر سکتے ہیں۔

یہاں پر کلچرل پروگرام بھی ہوتا رہتا ہے۔ لوک گیتوں کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ یہاں پر ہاتھ کا کام بھی سکھایا جاتا ہے۔ میں نے ایک غالیچہ بُنا ہے گھر آنے پر تمھیں بھی ایک آسن کر دوں گی۔ بنیادی تعلیم دینے پر زور دیا جاتا ہے۔ جو چھوٹے بچوں کے لیے بہت فائدہ مند ہے۔

ھی کی اپنے آنے والے وقت میں ایسی ہی
تعلیم دینے کی کوشش کروں گی۔

یہاں پر لڑکے اور لڑکیوں کی اکٹھی تعلیم
ہونے پر کسی طرح کی بھی کوئی شکایت نہیں ہوتی۔
جیسا کام کریں ویسے نمبر مل جاتے ہیں۔
اپنے پرائے کا فرق نہیں ہوتا۔

یہاں کے قدرتی ماحول کے بارے میں تو اور
بھی بڑھ چڑھ کر اچھی باتیں ہیں۔ جمنا کا کنارا اور زیتون
کا سایا دل کو بھا لیتا ہے۔ جب آئے تھے تو سوچتے
تھے کہ دو سال کیسے کٹیں گے۔ پر اب پتہ بھی نہ چلا
اور دو سال بیت گئے۔ اس کے چاروں اور (طرف)
ہرے بھرے کھیت دل کو بھاتے رہتے ہیں۔
خاموشی رہتی ہے جو پڑھائی کے لیے بہت
اچھی ہے۔

اب جانے کے تھوڑے دن رہ گئے ہیں
جی نہیں چاہتا مگر یہ تو خدا کا قانون ہے کہ ایک
ساتھ ایک استھان (جگہ) پر نہیں رہ سکتے۔
اچھا بہت وقت ہو گیا ہے۔ نمستے۔
بابا اور امی کو آداب۔ اشوک کو پیار۔

تمھاری سہیلی
سنترا دیوی
بیسک دوسرا سال
جامعہ

بقیا بچوں سے باتیں

نے اور بھی استعمال کر دیا اور جلسے میں منیر صاحب
اور اتفاق کی بات ان پر اور بہت سے کام اور
دعا کیجیے کہ اگلا پرچہ وقت پر نکال سکوں۔

اس مرتبہ مکتبہ جامعہ بمبئی کی شاخ۔
بدر الدین صاحب استاد مدرسہ ابتدائی جامعہ نے
مجید صاحب استاد مدرسہ ثانوی جامعہ نے د
مرحمت فرمائے۔

نواب زادہ ابو الحسن اسد الدین محمد
خاں (محمد گڑھ) محمد رفیق عالم قریشی (گیا)۔
شیخ صاحبہ (حیدرآباد) صدیق نیشنل انٹر
بھیت) انصاری لائبریری (خیرآباد اعظم گڑھ)
اقبال (نرہٹ گیا) عبد الجبار (دیناپور پٹنہ)
نے۔

بقایا صہ ۳۹ کا

آکسائڈ گیس پیدا ہوتی ہے اس گیس کے د
پانی بوتل کے باہر فوارے کی شکل میں نکلنے
بھی ہے فوارہ کا فوارہ۔

لطیفے

جناب [illegible]



دہلی کے ایک درزی نے اپنی دکان کے سائن بورڈ پر لکھوایا "دلی کا سب سے اچھا درزی" اس کے پاس ہی دوسرے درزی نے دکان کھولی تو سائن بورڈ لکھوایا "ہندوستان کا سب سے اچھا درزی" تیسرے نے دکان کھولی اور دونوں کے سائن بورڈ دیکھے تو اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ سائن بورڈ پر کیا لکھوائے آخر بہت سوچ بچار کے اس نے لکھوایا "محلے کا سب سے اچھا درزی"

~~~~~ ❖ ~~~~~

غائب دماغ پروفیسر :۔ آج میری چھتری کھو گئی۔

بیوی :۔ آپ کو کیسے پتہ چلا؟

پروفیسر :۔ بارش بند ہونے پر جب میں نے چھتری بند کرنے کو ہاتھ بڑھایا تو پتہ چلا کہ وہ ہاتھوں میں تھی ہی نہیں۔

~~~~~ ❖ ~~~~~

ایک شریر لڑکے نے اپنے استاد کی میز پر گدھے کی تصویر بنا کر رکھ دی۔ استاد کلاس میں آئے تو تصویر دیکھ کر مسکرا دیے اور پھر بولے "بچو! تم میں سے کسی نے اپنی بڑی خوبصورت تصویر یہاں رکھ دی ہے، لیکن وہ لڑکا بڑا شرمیلا معلوم ہوتا ہے۔ بھلا تصویر کے نیچے اس نے اپنا نام کیوں نہیں لکھا۔

~~~~~ ❖ ~~~~~

"آج سے سو برس پہلے سائنس والوں نے پتہ لگایا کہ آدمی ہوا کے بغیر نہیں جی سکتا" سائنس کے استاد نے کلاس میں پڑھاتے ہوئے کہا۔

"تو ماسٹر صاحب! سو برس پہلے لوگ کیسے جیتے تھے؟" ایک لڑکے نے فوراً سوال کیا۔

~~~~~ ❖ ~~~~~

"ابا جان! کیا سیاہی بہت مہنگی ہوتی ہے؟" گڈو نے پوچھا۔

"نہیں تو بیٹے"

"پھر آپ کے کوٹ پر مجھ سے تھوڑی سی سیاہی گر گئی تو امی اس قدر ناراض کیوں ہو رہی ہیں"

~~~~~ ❖ ~~~~~
~~~~~

آدھی ملاقات

پیام تعلیم کا خریدار ہوں، انشاءاللہ آگے بھی رہوں گا۔ کل ہی رسالہ ملا۔ بہت انتظار تھا اسی۔ لیے آج صبح تک ختم کر کے دل کو تسکین کر لی اور دل تو یہ چاہتا ہے مضامین اتنے بڑے ہوں کہ ایک ماہ سے دوسرے ماہ تک چلتے رہیں۔ اب آپ کا ماہنامہ کم سے کم ۸ یا ۹ لوگوں کے ہاتھوں میں جائے گا۔ اس لیے جلدی ختم کر کے چھوٹوں کو دے دیتا ہوں، جو تقریباً ایک ماہ تک لطف اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ انھیں میری طرح زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑتا۔ البتہ چھوٹوں میں تو مصیبت ہی آجاتی ہے۔ بھائی جان دہلی سے ابھی رسالہ نہیں آیا۔ "پیام" خواجہ معین الدین چشتی "سفرنامہ ابن بطوطہ" قابل تعریف ہیں۔ تھوڑے ہی وقفے میں آپ نے "پیام تعلیم" کو اتنا دلچسپ بنا دیا ہے کہ ہر چھوٹا بڑا بغیر ختم کیے نہیں چھوڑتا۔ خدا تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ دن دونی رات چوگنی ترقی دے۔ آمین!

محمد نسیم الدین رضا انٹر کالج رام پور

اب کی بار کا پیام تعلیم کا ٹائٹل بہت خوب صورت ہے۔ یعنی سادہ اور پرکار۔ اندر مضامین، کہانیاں اور نظمیں بہت خوب صورت ہیں۔ حرمت الاکرام صاحب کی نظم "برسات گئی" تو واقعی بڑی پیاری نظم ہے۔ اور سلمیٰ جاوید صاحبہ کی کہانی بھی بے حد پسند آئی۔ آپ کا پر تو بس بچپن یاد آجاتا ہے۔

اب کی بار جب کبھی حیدرآباد تشریف لائیں تو مجھے نیاز حاصل کرنے کا موقع دیجیے گا۔ آپ کی بڑی تمنا ہے۔ (پچھلی دفعہ کی طرح چپکے سے، جائیے گا)

آپکا بھائی

رؤف خیر ہ

پیام تعلیم مجھے بے حد پسند ہے۔ اور پابندی سے پڑھتا ہوں۔ جب بھی لائبریری اتفاق ہوتا ہے تو بڑی سی میز پر سب سے پہلے نظر "پیام تعلیم" کو تلاش کرتی ہیں۔ اس میں آپ ابن بطوطہ اور پنچ تنتر کی کہانیاں کی جو قسطیں شائع کر رہے میری خصوصی توجہ کا باعث ہیں۔ اگر آپ بعد میں کو کتابی صورت میں شائع کر دیں تو بڑا اچھا ہوگا۔ ویسے مجھے بھی پسند ہے، لیکن میرے دوست شا خاں صاحب کا بھی بہت اصرار تھا کہ میں اس مضمون بھیجوں۔ چنانچہ آج ایک مضمون خاص تیار کر کے آپ کو بھجوا رہا ہوں۔

آخر میں ناانصافی ہوگی کہ اگر میں اس اعتراف نہ کروں، آپ بے حد محنت اور لگن

پیام تعلیم مرتب کرتے ہیں۔ گویہ ایک رسمی بات ہو جاتی ہے۔ لیکن ابھی تک حقیقت کے اظہار کے لیے کوئی غیر رسمی طریقہ بھی تو ایجاد نہیں ہوا ہے۔ مخلص

رشید الدین

رسالہ "پیام تعلیم" ایک عرصے سے میرے زیر مطالعہ ہے۔ یوں تو بچوں کے لیے شائع ہونے والے بہت کم درجہ رسالے ہیں، اور جو ہیں ان میں پیام تعلیم کا اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں ایک نمایاں رول رہا ہے۔ ہر وہ گھر جو مشرقی معاشرے اور تہذیب سے پیار کرتا ہے ستھرے ادب اور صحت مند مواد کو پسند کرتا ہے۔ اس گھر کے سبھی افراد کے لیے "پیام تعلیم" یقیناً پورے معیار پر اترنے والا پرچہ ہے۔

آپ کا

فخر الدین عارفی

اکتوبر کا پیام تعلیم نظر نواز ہوا، ہر مضمون کہانی اور نظم بے حد دل چسپ اور عمدہ ہے۔ پیام تعلیم ہر ماہ نکھرتا جا رہا ہے۔ پیام تعلیم کی روز افزوں ترقی کے لیے دعا گو ہوں۔ فقط

عبدالمنان نسیم شطاپور

زمانہ جس طرح آگے بڑھ رہا ہے، اسی طرح پیام تعلیم بھی زمانے کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ اکتوبر کا پرچہ ملا۔ دل دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ ہمارے گھر میں سبھی لوگوں نے پرچہ پسند کیا۔ اس میں جناب مسعود صدیقی کا لکھا ہوا "سدنام دوملا" اور محترمہ سلمہ جاوید کا "آنکھ مچولی کا شکار" بہت پسند آیا۔ میرے چھوٹے بھائی ریاض کو "اسے میر ساتھیو" نظم پسند آئی۔ ہمیں امید ہے کہ آئندہ بھی پیام تعلیم دل چسپ مضامین سے آراستہ ہو کر ہم تک آئے گا۔ فقط

سید سراج احمد انگا

تصاویر اس بار تقریباً ہر مضمون اور نظم پر ہیں اور اچھی ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ ہمارے آرٹسٹ صاحب تندرست ہو گئے ہوں اور جوبلی نمبر میں انھوں نے خوب اچھی اچھی تصویریں بنائی ہوں۔ اسے خوب نکھلا اور سنوارا ہو۔ کتابت غنیمت ہے۔ ابھی بہت توجہ کی ضرورت ہے۔ اس بار کتابت کی غلطیاں معمول سے زیادہ ہیں۔ ایک جگہ املا کی غلطی دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوا۔ پتہ نہیں یہ مضمون نگار کا کارنامہ ہے یا کاتب صاحب کا، ملاحظہ ہو جناب عالیجاہ النبی خان صاحب کا مضمون "دل چسپ اور عجیب" صفحہ ۴۴ کے کالم ۲ میں سطر ۱ "ذائقے" کو "ضائقے" لکھا ہے۔ کہانی "دو کھی بات" پر کہانی کار کا نام ہی غائب ہے۔ فہرست سے معلوم ہوا کہ یہ کہانی جناب حماد جیل پوری کی ہے۔

جہاں تک مضامین اور نظموں کا تعلق ہے۔ ایک سے ایک بڑھ کر ہیں۔ مجھے "مضمون میں کون ہوں" اپنی ندرت بیان کی بنا پر بہت پسند آیا۔ "جان پہچان" کی نظمیں بہت دل چسپ ہیں۔ آپ نے انھیں دے کر بڑا اچھا کیا۔ جناب رفعت خیر کی نظم "سر و سار کھو" فکر انگیز ہے۔ اس بار آپ نے خالی جگہوں پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان دین کے اقوال دے کر بڑا اچھا کام کیا ہے۔

بقیہ صفحہ ۵۰ پر

گولڈن جوبلی کی رپورٹ

جامعہ ملیہ کی بنیاد ۲۹۔ اکتوبر ۱۹۲۰ء کو پڑی تھی۔ اسی لیے ہر سال اکتوبر کی آخری تاریخوں میں جامعہ میں بڑی چہل پہل رہتی ہے۔ یوم تاسیس کے کانووکیشن یا سند بانٹنے کے جلسے ہوتے ہیں۔ تعلیمی میلا ہوتا ہے اس میں نمائشیں ہوتی ہیں۔ یہ سال جامعہ کی زندگی کا پچاسواں سال تھا۔ اس لیے قدرتی طور پر زیادہ اہتمام کیا گیا۔ علمی جلسے ہوئے، سمپوزیم ہوئے، سمینار ہوئے۔ ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر نمائشیں ہوئیں "ذاکر نمائش" اور "ہندوستان میں مسلم تہذیب" کی نمائش تو دیکھنے والوں کو بہت دنوں تک یاد رہیں گی۔ گاندھی ٹرافی نہرو ٹرافی اور بیت بازی کے مقابلوں نے اس تقریب کی دلچسپیوں کو اور بڑھا دیا تھا۔

مدرسہ ابتدائی اور مدرسہ ثانوی کے لڑکوں لڑکیوں اور استادوں نے اس سلسلے میں غیر معمولی توجہ، انہماک اور دلچسپی سے کام لیا۔ مدرسہ ثانوی نے بہت سے مفید پروجیکٹ چلائے۔ ڈرامے کی بیت بازی کی گاندھی ٹرافی کے مقابلوں کی، نہرو ٹرافی کے مقابلوں کی تیاری کے لیے تقریباً دن رات ایک کر دیا۔

مدرسہ ابتدائی میں تمام درجوں نے بلکہ ہر درجے کے سکشنوں نے اپنے اپنے الگ پروجیکٹ چلا[ئے]۔ ایک ڈراما ٹیپو سلطان بڑی کامیابی سے پیش کیا۔ نہرو [ٹرافی] میں شرکت کی تیاری کی

ڈراموں کا سلسلہ چاروں دن رہا۔ ابتدا[ئی] ثانوی کے علاوہ ٹیچرس کالج۔ جامعہ ڈرامیٹک سو[سائٹی] طلبائے قدیم نے اپنے اپنے ڈرامے کامیابی کے ساتھ اَ[سٹیج کیے]

اس مرتبہ میلے کی سجاوٹ بھی انوکھے انداز میں بہ[ت] خوش نما بہت دل فریب تھی۔ جناب ابوالکلام صاحب ان کے ساتھیوں نے مہینے بھر پہلے سے تیاریاں شروع [کر دی] تھیں۔ بجلی کا انتظام بھی اس مرتبہ غیر معمولی طور پر [اچھا] رہا۔ جناب اقبال صاحب اور ان کے ساتھی بجا طو[ر پر] تعریف کے مستحق ہیں۔

نیچے مدرسہ ابتدائی کے بچوں کے کاموں کی [مختصر] سی رپورٹ دی جاتی ہے۔ یہ ہمیں جناب گلزار رسول صا[حب] اور سید منیر الحسن صاحب کی کوشش سے وقت سے [پہلے] ملی ہے۔ مدرسہ ثانوی کی رپورٹ کا آخری وقت تک انتظار رہا۔ ممکن ہوا تو یہ اگلے پرچے میں دی جا[ئے] گی۔

ایڈیٹر

ڈرامہ ٹیپو سلطان

۲۷ اکتوبر کو مدرسہ ابتدائی کا یہ ڈرامہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ جن بچوں نے اس ڈرامے میں حصہ لیا انھوں نے اس سے پہلے کبھی اتنے بڑے مجمعے میں کوئی پروگرام پیش نہیں کیا تھا۔ یہ ان کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا۔ بچوں نے بڑی خوبصورتی اور کامیابی کے ساتھ اس ڈرامے کو اسٹیج کیا۔ دیکھ کر ہر ایک حیران اور ششدر رہ گیا۔

ڈراما میک اپ، سیٹ اپ، اداکاری، منظر کشی، مکالمے، میوزک، (موسیقی) اور غرض ہر اعتبار سے بہت کامیاب اور جاندار تھا۔ یوں تو ہر کردار نے اپنا اپنا پارٹ بہت خوبی کے ساتھ انجام دیا۔ لیکن کارنی والس (ناظم الدین ششم الف) حیدر علی (محمد اسد ششم ب) ٹیپو سلطان (محمد عمار ششم ب) کریم شاہ (حامد حسین پنجم الف) دلاور خان (صابر خان ششم الف) سادھو (محمد علی ششم ب) پورنیا (مشتاق احمد ششم الف) میر قاسم (خلیل اللہ ششم ب) بہامرزا (مذکر خاں ششم ب) رنگ راؤ (دلشاد احمد ششم ب) میر صادق (احمد ندیم پنجم الف) سید غفار (شاہ محمد صدیق ششم ب) نے تو کمال ہی کر دیا۔

جس وقت جنگ کا بگل بجا اور یہ منظر سامنے آیا اور فوجوں نے ایک دوسرے پر حملہ کیا۔ اس وقت پورے پنڈال میں عجیب قسم کا کیف چھایا ہوا تھا۔ اور ہر ایک۔ بچوں کی حیرت انگیز اداکاری کو بُت بنا ہوا دیکھ رہا تھا۔ جوں ہی آخری منظر پیش ہوا اور اختتامی ڈرامے کے ہیرو ٹیپو سلطان کی وطن دوستی میہا دری، خود داری، دلیری اور شیر دلی کے جذبے کو اپنے دل میں لیے ہوئے اٹھنے ہی والے تھے کہ ٹیپو سلطان (محمد عمار) اسٹیج سے اتر کر تماشائیوں کے ہجوم میں کھو جاتے ہیں اور شیخ الجامعہ پروفیسر محمد مجیب صاحب کے ہمراہ (جو خود بھی چوٹی کے ڈرامہ نگار، ادیب اور اس فن کے ماہر ہیں۔) دوبارہ مع اپنے تمام ساتھی اداکاروں کے اسٹیج پر نمودار ہوتے ہیں۔ جن کو دیکھ کر پنڈال کے تمام حاضرین تحسین و آفریں کے الفاظ کہتے ہوئے خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔

سید شمیر الحسن منیر

نہرو ٹرافی کے مقابلے

مدرسہ ابتدائی جامعہ کے اہتمام میں ہونے والے نہرو ٹرافی کے یہ مقابلے دہلی میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرتے جا رہے ہیں۔ یہ مقابلے بچوں کے لیے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان سے نہ صرف پنڈت جواہر لال نہرو کی یاد تازہ رہتی ہے بلکہ بچوں کو اپنی صلاحیتوں کے ظاہر کرنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ان مقابلوں میں مڈل تک کے بچے حصہ لیتے ہیں۔ اس مرتبہ ان مقابلوں میں بیس اسکولوں نے حصہ لیا۔ نہرو ٹرافی کا یہ چھٹا مقابلہ تھا۔

پروگرام کے مطابق مقابلے دو حصّوں میں کرائے گئے۔ پہلے حصّے میں (۱) مضمون نگاری (۲) پینٹنگ

...دری اس اسٹالوں کی بولیاں بولنے کے مقابلوں کا فائنل ہوا۔ اور جشن نہرو کے موقع پر (۴) نظم خوانی (۵) کہانی کہنے (۶) اسکٹ یا نقل (۷) ایکشن سانگ اور (۸) فوک ڈانس کے مقابلوں کا فائنل ہوا۔

جو اسکول پورے مقابلوں میں حصّہ لیتا ہے اور سب سے زیادہ نمبر حاصل کرتا ہے وہ ٹرافی کا مستحق بن جاتا ہے۔ لیکن مدرسہ ابتدائی ان مقابلوں کا کنوینر ہونے کی وجہ سے اوّل آنے پر بھی ٹرافی نہیں لیتا بلکہ دوم آنے والے اسکول کو ٹرافی پیش کر دیتا ہے۔

اس مرتبہ محترمہ بیگم پروفیسر محمد مجیب صاحب نے انعاموں کی تقسیم کی۔ جج صاحبان کے فیصلہ کے مطابق مدرسہ ابتدائی اوّل آیا تھا مگر روایت کے مطابق گورنمنٹ گرلس ہائر سکنڈری اسکول کالکاجی کے بچوں نے حاصل کی۔ یہ دوم آئے تھے۔ انفرادی انعامات جن طلبا اور اسکولوں نے حاصل کئے اس کی تفصیل یہ ہے

(۱) مضمون نگاری:۔ اوّل۔ اندرا۔ گرلس ہائر سکنڈری اسکول کالکاجی۔ اوّل۔ حامد حسین، مدرسہ ابتدائی جامعہ
دوم۔ نندنا۔ گرلس ہائر سکنڈری اسکول لاجپت نگر
سوم۔ کرو پر سنگھ۔ بوائز مڈل اسکول مالویہ نگر

(۲) پینٹنگ یا مصوری:۔ اوّل۔ محمد سلیمان۔ مدرسہ ابتدائی جامعہ
دوم۔ سریندر۔ گرلس ہائر سکنڈری اسکول کالکاجی۔ سوم۔ سمن گرلس ہائر سکنڈری اسکول ۲۔ لاجپت نگر

(۳) جانوروں کی بولیاں۔ اوّل۔ انوار یوسف۔ مدرسہ ابتدائی جامعہ۔ دوم۔ ہر پرے سنگھ۔ ایم بی پرائمری اسکول نیتاجی نگر
سوم۔ ہریندر۔ بوائز مڈل اسکول مالویہ نگر

(۴) نظم خوانی کا مقابلہ: اوّل۔ مشتاق احمد۔ مدرسہ ابتدائی جامعہ۔ دوم۔ بنٹی۔ گرلس ہائر سکنڈری اسکول لاجپت نگر

سوم۔ سرسوتی۔ گنج گرلس ہائر سکنڈری اسکول مارگ دہلی

(۵) کہانی کا مقابلہ:۔ اوّل۔ محمد سعید خان۔ مدرسہ جامعہ۔ دوم۔ ہرکشن کمار۔ ایم بی پرائمری اسکول نیتا...
سوم۔ سنیپ کمار۔ بوائز مڈل اسکول مالویہ نگر

(۶) اسکٹ یا نقل:۔ اوّل۔ ریحان اور ساتھی۔ ابتدائی جامعہ۔ دوم۔ ارون کمار۔ کمرشیل ہائر سکنڈری اسکول۔ دہلی۔ سوم سکھ بیر سنگھ۔ بوائز مڈل اسکول مالویہ نگر دہلی

(۷) ایکشن سانگ:۔ سینٹ زیویر اسکول دہلی
مدرسہ ابتدائی جامعہ دوم۔ دوم گرلس ہائر سکنڈری اسکول مالویہ نگر دوم گرلس مڈل اسکول حوض خاص
سوم ایم۔ بی پرائمری اسکول نیتاجی نگر۔

اسی آئٹم میں چار انعامات حوصلہ افزائی جن اسکولوں کو دیئے گئے وہ یہ ہیں۔
(۱) ایم سی پرائمری اسکول کالکاجی۔ (۲) کمرشیل ہائر سکنڈری اسکول دریا گنج دہلی (۳) گرلس ہائر سکنڈری اسکول گنج (۴) گرلس ہائر سکنڈری اسکول راج نواس مارگ

(۸) فوک ڈانس:۔ اوّل۔ گرلس ہائر سکنڈری اسکول کالکاجی دوم۔ گرلس ہائر سکنڈری اسکول مالویہ نگر ہائر سکنڈری اسکول جنگ پورہ۔

اس آئٹم میں بھی تین خصوصی انعام حوصلہ افزائی کے لیے جن اسکولوں کو دیئے گئے وہ یہ ہیں۔
(۱) گرلس مڈل اسکول حوض رانی۔ (۲) کیمبرج اسکول (۳) بنگالی بوائز ہائر سکنڈری اسکول ملی پور روڈ۔

جس وقت پروگرام ختم ہوا ہر ایک اس کی تعریف کر رہا تھا


زندہ طلسمات
کے
چند قطرے
ZINDA TILISMATH
کھانسی
ہیضہ
سردی
پیچش
زکام
دردِ سر
اور جسمانی درد وغیرہ کو آرام پہنچاتے ہیں
منجن فاروقی
دانتوں کو صاف اور
مضبوط بناتا ہے
تیار کردہ کارخانہ زندہ طلسمات حیدرآباد (دکن)